وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ

(اردو)

تیسیر القرآن

صحیح احادیث کی روشنی میں

TAISEER UL QURAN

مترجم و مختصر مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمہ اللہ

مکتبہ السلام سٹریٹ نمبر ۲۰ وسن پورہ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

❀❀❀ توجہ فرمائیں! ❀❀❀

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب............

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (UPLOAD) کی جاتی ہیں۔
- متعلقہ ناشرین کی اجازت کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات کی نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

❀❀❀ تنبیہ ❀❀❀

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر
تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں

ٹیم کتاب وسنت ڈاٹ کام

webmaster@kitabosunnat.com

www.KitaboSunnat.com

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ

تیسیر القرآن
(اُردو مفصّل)

جلد سوم

سورۂ مریم تا سورۂ صٓ

مُترجم و مفسّر
فضیلۃ الشیخ مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمہ اللہ

نظر ثانی
الشیخ عبدالوکیل علوی حفظہ اللہ

اشرافِ
ڈاکٹر حبیب الرحمٰن کیلانی حفظہ اللہ

مکتبۃ السلام
سٹریٹ ۲۰ وسن پورہ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تیسیر القرآن (اردو مفصل)

اس تفسیر کی 4 جلدیں ہیں۔

✿ جلداول سورۃ الفاتحہ تا سورۃ الانعام ✿ جلدسوم سورۃ مریم تا سورۃ ص
✿ جلددوم سورۃ الاعراف تا سورۃ الکہف ✿ جلدچہارم سورۃ الزمر تا سورۃ الناس

ترجمہ وتفسیر ______ مولانا عبدالرحمن کیلانی رحمہ اللہ
خطاطی قرآنِ مجید ______ مولانا عبدالرحمن کیلانی رحمہ اللہ
تعداد ______ 2200
طبع ______ محرم الحرام 1432
کمپوزنگ ______ اشرف خلیل / حسن
اہتمام ______ پروفیسر نجیب الرحمن کیلانی
ناشر ______ ڈاکٹر حافظ شفیق الرحمن کیلانی ۔ انجینئر حافظ عتیق الرحمن کیلانی
مطبع ______ انٹرنیشنل دارالسلام پرنٹنگ پریس لاہور فون: 37232400
ہدیہ ______ 550 روپے

ناشر: مکتبۃ السلام
سٹریٹ نمبر: 20، وسن پورہ لاہور فون: 042-37844157 , 0321-8869902

ڈسٹری بیوٹر

دارالسلام
کتاب وسنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
ریاض • جدہ • شارجہ • لاہور
لندن • ہیوسٹن • نیویارک
DARUSSALAM

ھیڈ آفس و مرکزی شوروم 36 - لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ، لاہور
فون: 711 1023 , 711 0081 , 723 2400 , 724 0024 فیکس: 735 4072
E-mail: darussalampk@hotmail.com Website: www.dar-us-salam.com

شوروم اردو بازار اقراء سنٹر، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور فون: 712 0054 فیکس: 732 0703

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

ہر زمانے میں اسلام کی نعمت و دولت انسانوں تک پہنچنے کے دو ہی ذرائع ہیں۔ ایک اللہ تعالیٰ جل جلالہ کا کلام اور دوسرے اس کے مبعوث کئے ہوئے انبیاء و رسل کی شخصیتیں، جن کو اس نے اپنے کلام پاک کی تبلیغ و تعلیم اور تفہیم کے لئے واسطہ اور ذریعہ بنایا اور عملی قیادت و رہنمائی کے لئے منتخب فرمایا تاکہ ان کے ذریعہ اور توسط سے انسانی افراد اور معاشرے کا تزکیہ کرے اور معاشرتی بگاڑ کی اصلاح کرے۔

ان دونوں کا باہمی تعلق لازم و ملزوم کا ہے۔ کسی ایک کو دوسرے سے الگ اور جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایک کو دوسرے سے جدا کر دیا جائے تو نہ دین کا صحیح فہم حاصل ہو سکتا ہے اور نہ ہدایت ہی سے مستفید ہوا جا سکتا ہے۔

پرانے دور کی طرح آج کے دور جدید میں بھی انسان کو اگر نعمت اسلام مل سکتی ہے تو وہ بھی دو ذرائع ہی سے مل سکتی ہے۔ ایک اللہ جل جلالہ کا پاک کلام جو اس وقت صرف قرآن کریم کی صورت میں موجود ہے اور دوسرا اسوۂ نبوت کی صورت میں جو اب صرف محمد ﷺ کی سیرت مطہرہ میں محفوظ ہے۔ آج اسلام کا صحیح فہم اگر حاصل ہو سکتا ہے تو اس کی واحد صورت ایک ہی ہے کہ قرآن مجید کو اس کے لانے والے سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے سمجھا جائے۔ اسی کے اسوہ اور سیرت کی روشنی میں اس کا فہم حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ جس نے یہ طریقہ اختیار کیا توقع ہے کہ وہ دین کا صحیح فہم حاصل کرنے میں کامیاب و کامران ہو جائے گا۔ اور جس نے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کیا وہ دین کا صحیح فہم پانے میں ناکام و نامراد رہے گا اور راہ راست پانے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

اس حقیقت سے شاید ہی کسی صاحب فہم و فراست آدمی کو انکار ہو کہ قرآن حمید اور سیرت مصطفیٰ ﷺ دونوں ہی بحر ناپید کنار ہیں۔ اگر کوئی انسان یہ چاہے کہ ان کے معانی و مفاہیم، اور فوائد و برکات کا کماحقہ احاطہ کر لے گا تو یہ اس کے لئے ممکن نہیں۔ بس جس چیز کی کوشش اور سعی ممکن ہے وہ صرف اتنی ہی ہے کہ آدمی زیادہ سے زیادہ ان کا صحیح فہم و ادراک حاصل کرنے کی کوشش کر کے روح دین تک رسائی پانے کی تگ و دو کرے۔

اسی نکتہ کو سامنے رکھتے ہوئے تیسیر القرآن کے مفسرؒ نے خود قرآن کریم کا حتی المقدور صحیح فہم سمجھنے کے بعد اولاد آدم کو سمجھانے کی کوشش کی ہے اور وہ اس مقصد میں ماشاء اللہ العزیز نہایت کامیاب نظر آتے ہیں۔

قرآن کریم کی عربی، اردو اور دیگر زبانوں میں تفسیروں کی اتنی بہتات اور کثرت ہے کہ جنہیں شمار کرنا مشکل ہے۔ ہر تفسیر کا اپنا اسلوب بیان اور طرز نگارش الگ اور جدا ہے "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" کا سماں ہے۔ عربی زبان تو ان شروح و تفاسیر کا اصل منبع و ماخذ ہے۔ اردو میں بھی اللہ جل جلالہ کے بے شمار بندوں نے تفاسیر کے رنگا رنگ گلدستے سجا دیئے ہیں۔ ایسا ہی ایک گلدستہ تیسیر القرآن کی صورت میں جلوہ نما ہے۔ اس کی نمایاں ترین خصوصیت اور امتیازی وصف آیات قرآن کا صحیح و مرفوع احادیث کے ساتھ تفسیر بیان کرنا ہے۔ تفسیر بالرائے سے حتی الامکان اجتناب سے کام لیا گیا ہے۔ یہی وصف و امتیاز اس کے مقبول عام ہونے میں نمایاں کردار ادا کر رہا ہے اور تھوڑے عرصہ میں توقع سے کہیں زیادہ پذیرائی ہو رہی ہے۔

اس تفسیر کے مقبول ہونے میں جہاں متذکرہ بالا وصف نے کلیدی کردار ادا کیا ہے وہاں موصوف نے بیشتر مقامات پر تفسیری حواشی کے ساتھ ساتھ تفصیل طلب، دینی، علمی، معاشی و معاشرتی اور روزمرہ کے نئے نئے پیدا شدہ یا پیدا کردہ مسائل پر جو تسلی

بخش علمی گفتگو کی ہے اس کا حصہ کچھ کم نہیں۔ مثلاً جنت ودوزخ کے احوال وکیفیات، علم ہیئت کے اصولوں کی روشنی میں سیاروں کی محوری اور سالانہ گردش، زمین اور سورج کا باہمی ربط و تعلق، مناسک حج اور قربانی کے مسائل، رجم اور لعان سے متعلقہ احکام واقعہ افک کا پس منظر اور پیش منظر اور منافقین کا گھناؤنا کردار، استیذان سے متعلق احکام، نیز پردہ کے احکام، ملک یمین سے تمتع، مسئلہ ختم نبوت اور مرزا قادیانی کی تردید کے دلائل، مومنین کی صفات، اطاعت والدین، تلاوت قرآن کریم اور حفظ کے فوائد اور اس کی برکتیں۔ بعث بعد الموت پر عقلی ونقلی دلائل سے سیر حاصل بحث، اللہ رب العزت کی قدرتوں، اس کے احسانات وانعامات پر خوب کلام کیا ہے۔ بالخصوص منکرین حدیث کے نظریات کی خوب خبر لی ہے۔ ان کے نظریات کے رد میں دلائل کے انبار لگا دیئے ہیں۔

بات کو سمجھانے کا جو ملکہ اور قدرت اللہ تعالیٰ نے موصوف کو عطا فرمائی اس کی بدولت موصوف نے مشکل سے مشکل دقیق سے دقیق مسائل کو نہایت آسان زبان، سنجیدہ اسلوب اور شستہ انداز میں ایسے ڈھب سے بیان کر دیا ہے کہ عام قاری اپنی ذہنی استطاعت کے مطابق آسانی سے اخذ کر لینے میں معمولی سے دشواری ودقت محسوس نہیں کرتا۔ یہ بات تیسیر القرآن کے عوام وخواص قارئین کے مراسلات، خطوط، ٹیلی فون اور بالمشافہ گفتگو اور بات چیت سے نمایاں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہمیں ایسی مفید تفسیر کی طباعت واشاعت کی اہم ذمہ داری سے بخیر وخوبی عہدہ بر آ ہونے کی سعادت وتوفیق سے نوازا، ہر مرحلہ اور موقعہ پر ہماری رہنمائی اور دستگیری فرمائی۔ اس جلد سے پہلے اول اور دوم جلدیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ اب یہ تیسری جلد قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت سے بہرہ مند ہو رہے ہیں اور اول ودوم دونوں جلدوں میں انسانی بساط واستطاعت کی حد تک کوشش کے باوجود قارئین نے کچھ اغلاط کی نشاندہی فرمائی ہے جس پر ہم اپنے کرم فرما قارئین کے صمیم قلب سے شکر گزار ہیں اور ان کے لئے بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں دین ودنیا کی بھلائیوں اور سرفرازیوں سے نوازے آمین۔ اسی طرح تیسری جلد کے بارے میں بھی توقع رکھتے ہیں کہ قارئین کرام بصد شوق اس کا مطالعہ فرمائیں گے۔ دوران مطالعہ جو جو غلطیاں ان کے علم میں آئیں۔ ہمیں ان کی نشاندہی سے مطلع فرمائیں۔ ہم ان شاء اللہ آئندہ دوسری اشاعت میں ان کی صحت کا پورا اہتمام کریں گے۔

اس موقعہ پر ہم جناب عبدالوکیل علوی صاحب کا شکریہ ادا نہ کرنا حق تلفی سمجھتے ہیں جنہوں نے تیسیر القرآن کی ساری جلدوں میں استعمال شدہ احادیث کے ماخذ کی صحت کے ساتھ ساتھ متعدد مقامات پر واقعات اور اسماء الرجال اور اماکن کی درستگی فرمائی، نیز بہت سے محاورات اور اردو عبارات کو بھی درست کیا اور بعض مقامات پر عربی متن کے ترجمہ کی صحت کا بھی اہتمام کیا۔

اللہ جل جلالہ کے حضور صدق دل سے عرض گزار ہیں کہ ہمارے ساتھ اس کام میں جس قدر جس کسی نے اشاعت، تصحیح اور بہتر تجاویز پیش کرنے میں مدد فرمائی ہے کہ وہ انہیں بھرپور جزائے خیر سے نوازے اور صاحب تفسیر کو کروٹ کروٹ راحت وسکون بخشے اور ان کے درجات بلند فرمائے اور انہیں اپنے صالح اور مقرب بندوں میں شامل فرما کر جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور اس کار خیر کو ہم سب کے لئے ذریعہ نجات بنائے۔ آمین

نجیب الرحمٰن کیلانی۔ جامع مسجد الایمان۔ شاہ فرید آباد۔ ملتان روڈ لاہور۔ فون: ۷۸۴۴۱۵۷

فہرست مضامین تیسیر القرآن

سورۃ مریم تا سورۃ ص

سورۃ مریم

سورة صٓ

۹۸ آیاتها سُورۃ مریم مکیۃ رکوعها ۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کٓهٰیٰعٓصٓ ۝ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِیَّا ۝ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِیًّا ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ

کلمات ۹۶۸ آیت ۹۸ (۱۹) سورہ مریم[۱] مکی[۲] ہے (۴۴) رکوع ۶ حروف ۳۶۸۶

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

ک۔ہ۔ی۔ع۔ص (۱) یہ آپ کے پروردگار کی اس رحمت کا ذکر ہے جو اس نے اپنے بندے زکریا[۳] پر کی تھی۔(۲) جب زکریا نے اپنے پروردگار کو چپکے[۴] چپکے پکارا (۳)

[۱] اس سورۃ کا نام مریم اس لئے ہے کہ اس میں سیدہ مریم کے حالات کا تفصیلی ذکر آیا ہے اور یہی ایک خاتون ہیں جن کا قرآن میں نام مذکور ہے اور کم از کم تیس مقامات پر ان کا نام آیا ہے۔

[۲] ہجرتِ حبشہ:۔ یہ سورت مکہ میں ہجرت حبشہ یعنی ۵ نبوی سے پیشتر نازل ہوئی تھی۔ قریش کے ناروا مظالم اور سختیوں میں مسلمان پس رہے تھے اور کوئی غلام تھا یا آزاد، کمزور تھا یا قوی سب مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ بالآخر آپؐ نے حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ وہاں کا عیسائی بادشاہ جسے مسلمان نجاشی کہتے تھے۔ اپنے عدل کی وجہ سے مشہور تھا اور حبشہ کی طرف ہجرت کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ وہاں تبلیغ کے لئے میدان کھلا تھا۔ چنانچہ پہلی دفعہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں جو وفد حبشہ کو روانہ ہوا اس میں گیارہ مرد اور چار عورتیں شامل تھیں۔ ان عورتوں میں سیدنا عثمان کی بیوی یعنی رسول اللہ ﷺ کی بیٹی رقیہ بھی شامل تھیں۔ اسی موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: "سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بعد یہ پہلا جوڑا ہے جو اللہ کی راہ میں ہجرت کے لئے نکلا" رفتہ رفتہ ان مہاجرین کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ چند ہی ماہ میں ۸۳ مرد اور ۱۱ عورتیں حبشہ کو منتقل ہو گئے جن میں سات غیر قریشی مسلمان بھی تھے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ میں صرف ۴۰ آدمی رہ گئے۔ اس صورت حال نے کفار مکہ کو سخت بے چین کر دیا۔ کیونکہ ہجرت کرنے والے تقریباً سب ہی کسی نہ کسی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ کسی کا بیٹا، کسی کا داماد، کسی کی بیٹی، کسی کی بہن وغیرہ تھے۔ اس صدمہ سے متاثر ہو کر کچھ لوگ تو مسلمان ہوئے اور زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جنہوں نے مسلمانوں پر سختیوں میں مزید اضافہ کر دیا۔ ایک تجویز طے ہوئی کہ جیسے بھی بن پڑے مہاجرین حبشہ کو یہاں واپس مکہ لایا جائے۔

ہجرتِ حبشہ اور قریشی وفد کی ناکامی:۔ اس غرض کے لئے دو ماہرین سفارت عبداللہ بن ابی ربیعہ (ابو جہل کا ماں جایا بھائی) اور عمرو بن عاص (فاتح مصر، جو ابھی تک اسلام نہ لائے تھے) کا انتخاب کیا گیا۔ یہ دونوں بادشاہ اور پادریوں کے لئے تحفے تحائف لے کر حبشہ پہنچے۔ پہلے پادریوں سے ملے اور انہیں تحفے تحائف دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ جب ہم بادشاہ کے سامنے اپنی عرضداشت پیش کریں تو وہ ان کی ہاں میں ہاں ملا دیں۔ چنانچہ دوسرے دن اس وفد نے بادشاہ کے سامنے حاضر ہو کر نذرانے پیش کرنے کے بعد عرض کی کہ ہمارے چند مجرموں نے مکہ سے بھاگ کر آپ کے ہاں پناہ لی ہے۔ وہ ہمیں واپس کر

دیئے جائیں۔ ساتھ ہی رشوت خور درباریوں اور پادریوں نے ہاں میں ہاں ملا دی۔ مگر نجاشی انصاف پسند انسان تھا۔ ان کی باتوں میں نہ آیا اور کہہ دیا کہ جب تک میں ان لوگوں کی بات نہ سن لوں ان کی واپسی کا کیسے حکم دے سکتا ہوں۔ چنانچہ مسلمانوں کو بلایا گیا اور ان سے صورت حال دریافت کی گئی۔ مسلمانوں نے سیدنا جعفر طیار کو اپنا نمائندہ یا ترجمان مقرر کیا۔ انہوں نے بتایا کہ ہم فلاں فلاں قسم کی گمراہیوں میں مبتلا تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے درمیان نبی مبعوث کیا جس پر ہم ایمان لے آئے تو یہ لوگ ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئے۔ انہی لوگوں کے ظلم وستم سے تنگ آ کر ہم نے آپ کے ملک میں پناہ لی ہے۔ نجاشی کہنے لگا: تمہارے نبی پر جو کلام نازل ہوا ہے۔ اس کا کچھ حصہ تو سناؤ چنانچہ سیدنا جعفر طیار نے اسی سورۂ مریم کی ابتدائی آیات تلاوت فرمائیں جن میں سیدنا زکریا اور سیدہ مریم کا ذکر ہے۔ یہ کلام سن کر نجاشی پر رقت طاری ہو گئی۔ سنتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا حتیٰ کہ اس کی داڑھی تر ہو گئی اور جب سیدنا جعفر طیار نے تلاوت ختم کی تو کہنے لگا: یہ کلام اور وہ کلام جو سیدنا عیسیٰؑ پر نازل ہوا دونوں ایک ہی منبع سے پھوٹے ہیں۔ واللہ! میں ان لوگوں کو تمہارے حوالہ نہ کروں گا“

نجاشی کے انکار پر قریشی وفد سخت مایوس ہو گیا اور موجودہ صورتحال پر غور کرنے کے لئے سر جوڑ بیٹھے۔ عمرو بن عاص یکدم پکار اٹھا کہ بادشاہ سے دوبارہ ملاقات کی جائے میں کل ایسی بات پیش کروں گا جس سے یقیناً ہم کامیاب ہوں گے۔ چنانچہ دوسرے دن عمرو بن عاص نے رسائی حاصل کر کے بادشاہ سے کہا: حضور آپ کو یہ بھی علم ہے کہ یہ لوگ سیدنا عیسیٰؑ کے متعلق کیا اعتقاد رکھتے ہیں؟

بادشاہ نے اس سوال کے جواب کے لئے دوبارہ مسلمانوں کو بلا بھیجا۔ انہیں بھی اس بات کی خبر ہو گئی تھی۔ بہر حال انہوں نے یہ طے کر لیا کہ حالات جیسے بھی پیش آئیں ہمیں سچی بات ہی کہنا چاہئے اور جب نجاشی نے یہ سوال کیا تو سیدنا جعفر طیار کہنے لگے کہ ”عیسیٰؑ اللہ کے بندے، اس کے رسول، روح اللہ اور کلمۃ اللہ تھے“ یہ جواب سن کر نجاشی نے ایک تنکا اٹھایا اور کہا: ”واللہ! جو کچھ تم نے کہا: عیسیٰؑ اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں“ نجاشی کے اس تبصرہ پر درباری لوگ برہم ہوئے مگر نجاشی نے اس کی کچھ پروا نہ کی۔ قریشی سفارت مکمل طور پر ناکام ہو گئی۔ نجاشی نے ان کے تحائف انہیں واپس کر دیئے اور مسلمانوں کو امن و اطمینان سے اس ملک میں رہنے کی اجازت دے دی۔

[۳] سیدنا زکریا اور یحییٰ علیہما السلام نیز سیدہ مریم اور عیسیٰ علیہما السلام کے واقعات پہلے سورۂ آل عمران کے رکوع نمبر ۳ اور ۴ میں گزر چکے ہیں۔ ان کے حواشی بھی مدنظر رکھے جائیں۔

سیدنا یحییٰ اور سیدنا عیسیٰ علیہما السلام دونوں کی پیدائش خرق عادت کے طور پر ہوئی تھی۔ مگر چونکہ سیدنا یحییٰ کی پیدائش نسبتاً کم خرق عادت ہے۔ اس لئے اسے بطور تمہید پہلے ذکر کیا گیا ہے۔

[۴] اس کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں۔ مثلاً رات کی نماز تہجد میں جب انسان کو کوئی دیکھ نہیں رہا ہوتا اور وہ بڑی دلجمعی اور سکون کے ساتھ اپنے پروردگار کو پکارتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ کہ بڑھاپے اور مایوسی کی عمر میں ایسی بات کی درخواست کی کہ اگر دوسرے لوگ سن لیں تو مذاق اڑائیں۔ اس لئے آہستہ آواز سے دعا کی۔ تیسرے یہ کہ جب سیدہ مریمؑ کے پاس بے موسم میوے دیکھے تو دل ہی دل میں اللہ کو پکارنے لگے۔

الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَاۗىِٕكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝۴ وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ

وَّرَاۗءِيْ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝۵ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ڰ وَاجْعَلْهُ

رَبِّ رَضِيًّا ۝۶ يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِۨ اسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝۷ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ

اور کہا: ”میرے پروردگار! میری ہڈیاں بوسیدہ ہو چکیں اور بڑھاپے کی وجہ سے سر کے بال[۵] سفید ہو گئے، تاہم اے میرے پروردگار! میں تجھے پکار کر کبھی محروم نہیں[۶] رہا۔(۴) میں اپنے پیچھے اپنے بھائی بندوں (کی برائیوں سے) ڈرتا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے تو اپنی جناب سے مجھے ایک وارث عطا فرما(۵) جو میرے اور آلِ یعقوب کا وارث بنے اور اے میرے پروردگار! اسے پسندیدہ[۸] انسان بنانا“(۶)

(اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا:) زکریا! ہم تمہیں ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہوگا۔ اس سے پیشتر اس نام کا کوئی دوسرا آدمی ہم نے پیدا[۹] نہیں کیا۔(۷) زکریا نے عرض کی: میرے پروردگار! میرے ہاں لڑکا

[۵] اشتعل الرأس کا لفظی معنی سر کا شعلہ مارنا ہے مگر یہ بطور محاورہ استعمال ہوا ہے اور یہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب بڑھاپے کی وجہ سے سر کے بال سفید اور چمکدار ہونے لگیں۔

[۶] اس کا ایک مطلب تو وہ ہے جو ترجمہ میں مذکور ہوا۔ یعنی جب بھی میں نے تجھ سے دعا کی وہ ہمیشہ قبول ہوتی رہی اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اے پروردگار جب بھی تو نے مجھے کسی کام کے کرنے کے لئے پکارا تو میں ہمیشہ بجالاتا رہا اور کبھی شقی ثابت نہیں ہوا۔

[۷] ۞ سیدنا زکریا کا بیٹے کے لئے دعا کرنا:۔ یعنی لڑکا طلب کرنے سے میری اصل غرض یہ ہے کہ وہ میرا صحیح جانشین ثابت ہو۔ کیونکہ دوسرے میرے بھائی بند جو مجھے نظر آرہے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو میرے بعد دعوت دین اور تبلیغ کے کام کو سنبھال سکے۔

[۸] ۞ علماء انبیاء کے وارث ہیں:۔ یہاں وراثت سے مراد علمِ دین کی وراثت ہے۔ کیونکہ انبیاء کی یہی وراثت ہوتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد نبوی ہے "ان العلماء هم ورثة الانبياء" (بخاری، کتاب العلم، باب العلم قبل القول والعمل) "یعنی علماء حضرات ہی انبیاء کے وارث ہوتے ہیں" پھر میرے اس لڑکے کو اپنا پسندیدہ بھی بنایا اس کا یہ مطلب ہے کہ اس کے اخلاق و کردار اس قدر پاکیزہ ہوں کہ وہ سب لوگوں کی نظر میں مقبول و محبوب اور پسندیدہ ہو۔

[۹] ۞ یحییٰ اللہ کا اپنا تجویز کردہ نام:۔ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول کر کے بیٹے کی بشارت دی تو ساتھ ہی نام بھی خود ہی تجویز فرمادیا اور نام بھی ایسا انوکھا کہ پہلے کسی آدمی کا یہ نام نہیں رکھا گیا تھا۔ یحییٰ: دعائیہ نام ہے یعنی اللہ کرے تادیر زندہ رہے۔ جیسے ہمارے ہاں جیونا یا جیونی نام رکھتے ہیں اور عرب میں عائش اور عائشہ، نیز اسم بمعنی صفت بھی ہو سکتا ہے جیسے ولله الاسماء الحسنىٰ کے معنی "اللہ کے بہترین نام" بھی ہو سکتے ہیں اور "بہترین صفات" بھی، اس لحاظ سے اس کا معنی یہ ہوگا کہ ایسی اچھی سیرت والا آدمی پہلے کوئی نہیں ہوا۔

لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝۸ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ
هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ۝۹ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا
تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۝۱۰ فَخَرَجَ عَلٰي قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا
بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ۝۱۱ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝۱۲ۙ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ

کیسے ہوگا جبکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بڑھاپے [۱۰] کی حد کمال کو پہنچ چکا ہوں" (۸) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "ہاں ایسا ضرور ہوگا۔ تیرا پروردگار یہ کہہ رہا ہے کہ یہ میرے لئے آسان سی بات ہے، اس سے پہلے میں تجھے [۱۱] پیدا کر چکا ہوں جبکہ تو کوئی چیز بھی نہ تھا" (۹) زکریا نے عرض کیا: "پروردگار! پھر میرے لئے کوئی نشانی مقرر کردے" اللہ تعالیٰ نے فرمایا "تیرے لئے نشانی [۱۲] یہ ہے کہ تو مسلسل تین رات تک لوگوں سے گفتگو نہ کر سکے گا" (۱۰) چنانچہ (جب وہ وقت آ گیا) زکریا اپنے حجرہ سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آئے تو انہیں اشارہ سے کہا کہ "صبح و شام تسبیح بیان کیا کرو" (۱۱) (اللہ تعالیٰ نے یحییٰ کو بچپن میں ہی حکم دیا ہے کہ) "اے یحییٰ! کتاب (تورات) پر مضبوطی سے عمل پیرا ہو جاؤ" اور ہم نے اسے بچپن میں ہی قوت فیصلہ [۱۳] عطا کر دی تھی۔ (۱۲) ہم نے اسے اپنی

[۱۰] سیدنا زکریا علیہ السلام کے تعجب کی وجہ:۔ یعنی جب دعا کی تھی اس وقت تو تعجب نہ ہوا اور جب قبول ہو گئی اور بشارت ملی تو تعجب کرنے لگے۔ اور یہ تعجب اس لئے نہ تھا کہ آپ کو اللہ کی قدرت میں شک تھا ورنہ ایسی دعا ہی نہ کرتے بلکہ یہ تعجب اس فطری داعیہ کی بنا پر تھا کہ انسان کی عادت ہے کہ جب وہ کوئی غیر معمولی خوشخبری سنے تو مزید اطمینان اور مزید خوشی کے حصول کے لئے اس بات کو کرید کرید کر بار بار پوچھتا ہے۔

[۱۱] یہاں خلقتك سے مراد سیدنا زکریا علیہ السلام بھی ہو سکتے ہیں اور سیدنا آدم علیہ السلام بھی۔ دونوں صورتوں میں اس واقعہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی حیران کن قدرت کاملہ کا اظہار ہوتا ہے نیز یہاں تو پھر وسائل (یعنی سیدنا زکریا اور ان کی بیوی) موجود ہیں۔ ان کی زائل شدہ قوتوں کو از سر نو زندہ یا بحال کر دینا اللہ کے لئے کچھ مشکل نہیں۔

[۱۲] سیدنا زکریا علیہ السلام کا حمل کی علامت پوچھنا:۔ یعنی ایسی نشانی جس سے معلوم ہو جائے کہ اب حمل قرار پا گیا ہے۔ چنانچہ علامت یہ بتائی گئی کہ تمہاری قوت گویائی بحال رہنے کے باوجود تم لوگوں سے بات چیت نہ کر سکو گے البتہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے زبان چلتی رہے گی۔ چنانچہ جب وہ وقت آ گیا تو آپ ہر وقت ذکر الٰہی میں مشغول رہنے لگے۔ اور دوسروں کو اشارہ سے تاکید کر دی کہ کہ ہر وقت اللہ کی یاد میں مشغول رہیں اور اللہ کا شکر ادا کرنے میں ان کے ساتھ شریک ہوں۔

[۱۳] سیدنا یحییٰ علیہ السلام کے اوصاف:۔ یعنی اللہ کی کتاب کو خود بھی سیکھو دوسروں کو بھی سکھاؤ۔ اس کے احکام پر خود بھی پوری طرح عمل کرو دوسروں کو بھی اس کی دعوت دو۔ یہی وہ مشن تھا جس کے لئے سیدنا زکریاؑ نے دعا کی تھی۔ چنانچہ اللہ نے سیدنا یحییٰ کو سن رشد پر پہنچتے ہی منصب نبوت پر سرفراز فرما کر یہ حکم دے دیا تھا۔ اور ساتھ ہی قوت فیصلہ، قوت اجتہاد، تفقہ فی الدین، معاملات میں صحیح رائے قائم کرنے کی صلاحیت اور معاملات میں فیصلہ کرنے کا اختیار بھی دے دیا گیا۔

وَّزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ﴿١٣﴾ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿١٤﴾ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ
يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿١٥﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿١٦﴾
فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ڞ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿١٧﴾ قَالَتْ

ع ٢

مہربانی سے[١٤] نرم دل اور پاک سیرت بنایا اور وہ فی الواقع پرہیز گار تھے۔(١٣) وہ اپنے والدین سے ہمیشہ اچھا سلوک کرتے تھے اور کسی وقت بھی جابر اور نافرمان[١٥] نہ ہوئے۔(١٤) اس دن پر سلامتی ہو جس دن بھی وہ پیدا ہوئے اور اس دن بھی جب[١٦] وہ مریں گے اور اس دن بھی جب دوبارہ زندہ اٹھایا جائے گا۔(١٥) اور (اے پیغمبر!) اس کتاب میں مریم کا حال بھی ذکر کیجئے۔ جب وہ اپنے گھر والوں سے الگ ہو کر مشرقی جانب گوشہ نشین ہو گئی تھی۔(١٦) اور پردہ ڈال کر ان سے چھپ[١٧] گئی تھی۔ اس وقت ہم نے اس کی طرف اپنی روح[١٨] (فرشتہ) کو بھیجا جو ایک تندرست انسان کی شکل میں مریم کے سامنے آگیا۔(١٧) وہ بولی اگر تمہیں کچھ

[١٤] حنانا سے مراد مہربانی، شفقت اور محبت کی وہ قسم ہے جو ماں کو اپنے بچہ سے ہوتی ہے۔ یعنی سیدنا یحییٰؑ لوگوں کے حق میں اس قدر ہمدرد، غمگسار اور نرم دل تھے جیسے ماں اپنی اولاد کے حق میں ہوتی ہے۔ پاکیزہ اخلاق کے مالک اور ہر وقت اللہ سے ڈرتے رہتے تھے۔ حدیث میں ہے کہ سیدنا یحییٰؑ نے نہ کبھی کوئی گناہ کا کام کیا اور نہ گناہ کا ارادہ کیا اور اللہ کے ڈر سے روتے رہنے کی وجہ سے ان کے رخساروں پر نشان پڑ گئے تھے۔

[١٥] بڑھاپے کی اولاد، اور بالخصوص ایسی اولاد جو اللہ سے دعائیں مانگ مانگ کر حاصل ہو، کے عادات و اطوار ماں باپ کے زیادہ لاڈ پیار کی وجہ سے اچھے نہیں ہوتے لیکن یحییٰؑ میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ وہ ماں باپ کے انتہائی فرمانبردار، ان سے بہتر سے بہتر سلوک کرنے والے تھے۔ نافرمانی یا سرکشی کی ان میں بو تک نہ تھی۔

[١٦] انسان پر تین ہی مشکل گھڑیاں پیش آتی ہیں۔ جو بہر حال مشکل ہوتی ہیں۔ ایک پیدائش کا وقت اس کے اپنے آپ پر اور اس کی ماں پر۔ دوسرے موت کا وقت اور تیسرے بعث الموت کا وقت گویا اللہ تعالیٰ کی نظروں میں بھی وہ اس قدر پسندیدہ تھے کہ اس دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی کوئی وقت ایسا نہیں آیا یا نہیں آئے گا جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر سلامتی نازل نہ ہوتی ہو۔

[١٧] ۞ سیدہ مریم کی بیت المقدس کے حجرہ میں عبادت:۔ سیدنا یحییٰؑ کی خرق عادت پیدائش کے بعد اب سیدنا عیسیٰؑ کی معجزانہ بغیر باپ پیدائش کا آغاز ہو رہا ہے۔ سیدہ مریمؑ بیت المقدس کے مشرقی جانب کے ایک حجرہ میں گوشہ نشین ہو کر اللہ کی عبادت میں مشغول رہا کرتیں۔ پھر اس کمرہ میں بھی ایک پردہ ڈال لیا تاکہ دوسرے لوگوں سے بھی الگ تھلگ رہ کر پوری یکسوئی سے ذکر و فکر میں مشغول رہ سکیں اور اس کا دوسرا مطلب یہ لیا گیا ہے کہ جب جوان ہوئیں تو انہیں حیض آگیا اور بہت زیادہ شرم محسوس ہوئی تو اس وقت سب لوگوں سے پردہ کر لیا۔ پھر اسی علیحدگی میں غسل حیض بھی کیا۔

[١٨] یہاں روح سے مراد فرشتہ ہے۔ سیدنا جبریل ایک نوجوان اور خوبصورت مرد کی شکل میں اسی پردہ کے مقام پر نمودار ہو گئے

إِنِّيْٓ أَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿۱۸﴾ قَالَ إِنَّمَآ أَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِأَهَبَ لَكِ غُلٰمًا
زَكِيًّا ﴿۱۹﴾ قَالَتْ أَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ أَكُ بَغِيًّا ﴿۲۰﴾ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ
رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿۲۱﴾ فَحَمَلَتْهُ

اللہ کا خوف ہے تو میں تم سے اللہ کی پناہ [۱۹] مانگتی ہوں۔" (۱۸) وہ بولے: "میں تو تمہارے پروردگار کا بھیجا [۲۰] ہوا ہوں اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہیں ایک پاک سیرت لڑکا دوں" (۱۹) وہ بولیں: "میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا جبکہ مجھے کسی انسان [۲۱] نے چھوا تک نہیں اور میں بدکار بھی نہیں" (۲۰) وہ بولے ہاں! ایسا [۲۲] ہی ہوگا تمہارے پروردگار نے فرمایا ہے کہ میرے لئے یہ آسان سی بات ہے اور اس لیے بھی (ایسا ہوگا) کہ ہم اس لڑکے کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں اور وہ ہماری طرف سے رحمت ہوگا اور یہ کام ہو کے رہے گا" (۲۱) چنانچہ مریم کو

اور فرشتے جب انسانی شکل میں نبیوں یا برگزیدہ ہستیوں کے پاس آتے ہیں تو عموماً خوش منظر صورتوں میں ہی آتے ہیں۔

[۱۹] ❁ سیدہ مریم اور جبرئیل کا مکالمہ:۔ یہ صورت حال دیکھ کر سیدہ مریمؑ سخت خوفزدہ ہوگئیں اور ان کے لئے یہ انتہائی نازک وقت تھا۔ خود بھی نوجوان تھیں، سامنے نوجوان اور خوش شکل مرد کھڑا تھا۔ تنہائی تھی، کوئی دوسرا پاس موجود بھی نہ تھا۔ نووارد کا نورانی چہرہ دیکھ کر اندازہ کیا کہ آدمی تو کوئی پرہیزگار ہی معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا اسے اللہ کا واسطہ دے کر کہا کہ میں تیری طرف سے رحمٰن کی پناہ میں آتی ہوں۔ یعنی اس بات سے کہ تو مجھ پر کسی قسم کی دست درازی کرے۔

[۲۰] فرشتے نے جواب دیا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اگر میرے متعلق کوئی برا خیال آیا ہے تو اسے نکال دو۔ میں آدمی نہیں بلکہ تمہارے پروردگار کا فرستادہ فرشتہ ہوں اور اس لئے آیا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تجھے ایک پاکیزہ لڑکا عطا کروں۔ یہاں جبریلؑ نے لڑکا عطا کرنے کی نسبت جو اپنی طرف کی ہے تو اس سے یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ فرشتے اللہ کے شریک ہیں اور اللہ نے انہیں کچھ اختیارات تفویض کر رکھے ہیں جیسا کہ مشرکین سمجھتے ہیں یا مشرکین مکہ سمجھتے تھے۔ کیونکہ یہاں ساتھ ہی یہ وضاحت موجود ہے کہ "میں تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں" یعنی اس کام پر مامور ہوا ہوں۔ مجھے اس کام کا حکم دیا گیا ہے۔ گویا مدبرات امر کام کی نسبت کبھی براہ راست اللہ کی طرف کرتے ہیں، کبھی اپنی طرف اور جب اپنی طرف کریں تو وہ بھی حقیقتاً اللہ ہی کی طرف ہوتی ہے۔ جیسے اسی واقعہ کی نسبت ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کرتے ہوئے فرمایا: ﴿فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا﴾ (۶۶:۱۲)

[۲۱] یعنی سیدہ مریم کا پہلا خوف تو دور ہوگیا کہ یہ کوئی بدکار آدمی نہیں بلکہ اللہ کا فرستادہ فرشتہ ہے اب حیرت اس بات پر ہوئی کہ لڑکا ہو کیسے سکتا ہے؟ جب تک کسی مرد سے صحبت نہ ہو خواہ یہ بالجبر کی صورت میں ہو یا بالرضا کی صورت میں؟ اور یہ دونوں باتیں یہاں مفقود تھیں۔

[۲۲] ❁ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش خود ایک معجزہ تھی:۔ یعنی ناممکن ہونے کے باوجود ممکن ہے اور ایسا ہو کے رہے گا کیونکہ اللہ کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ اور یہ اس لئے ہوگا کہ ہم اس لڑکے کو تمام لوگوں کے لئے ایک زندہ جاوید معجزہ بنا دیں۔ پھر یہ لڑکا ہماری طرف سے تمہارے لئے از راہ رحم و کرم عطیہ بھی ہے اور تمام لوگوں کے لئے بھی رحمت ثابت ہوگا۔

فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿٢٢﴾ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِىْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿٢٣﴾ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِىْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿٢٤﴾ وَهُزِّىْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿٢٥﴾

اس[۲۳] بچے کا حمل ٹھہر گیا اور وہ اس حالت میں ایک دور کے مکان میں علیحدہ جا بیٹھیں (۲۲) پھر زچگی کی درد انہیں ایک کھجور کے تنے تک لے آئی تو کہنے لگیں، کاش میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی اور میرا[۲۴] نام و نشان بھی باقی نہ رہتا۔ (۲۳) اس وقت درخت کے نیچے سے (فرشتے نے) انہیں پکار کر کہا کہ ": غمزدہ نہ ہو، تمہارے پروردگار نے تمہارے نیچے ایک چشمہ بہادیا ہے۔ (۲۴) اور اس کھجور کے تنہ کو زور سے ہلاؤ وہ آپ پر تازہ پکی ہوئی کھجوریں گرائے گا۔ (۲۵)

واضح رہے کہ تخلیق کے لئے چار ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

ایک یہ کہ ماں اور باپ دونوں سے پیدا ہو، یہ صورت عام ہے اور سب انسان یا جاندار ایسے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ دوسری یہ کہ ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہو۔ اس طرح سیدنا آدمؑ کو پیدا کیا گیا۔ تیسری یہ کہ صرف مرد سے پیدا ہو۔ جیسے سیدہ حواؑ کو آدم سے پیدا کیا گیا۔ اور چوتھی یہ کہ صرف عورت سے پیدا ہو۔ یہ صورت ابھی تک وجود میں نہ آئی تھی جو سیدنا عیسیٰؑ کی پیدائش سے پوری ہو گئی۔

[۲۳] ❁ سیدہ مریم میں روح جبرئیل نے پھونکی تھی یا اللہ تعالیٰ نے؟ روایات میں ہے کہ یہ کہہ کر سیدنا جبریل نے سیدہ مریمؑ کی قمیص کے گریبان میں روح پھونکی جسے سورۂ تحریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا﴾ یعنی یہ روح ہم نے پھونکی تھی۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ جبریلؑ نے یہ کیوں کہا تھا "تاکہ میں تجھے ایک پاکیزہ لڑکا عطا کروں" اس نفخہ جبریل یا نفخہ الٰہی سے سیدہ مریم کو حمل قرار پا گیا۔ اسی وجہ سے آپ کو روح اللہ کہتے ہیں۔

❁ حمل کی وجہ سے سیدہ مریم کا بیت المقدس سے چلے جانا:۔ جب آپ حاملہ ہو گئیں تو اب شرم کے مارے وہاں رہنا گوارا نہ کیا اور آپ بیت المقدس کا حجرہ چھوڑ کر دور کسی مقام پر چلی گئیں۔ کہتے ہیں کہ یہ مقام بیت اللحم تھا جو وہاں سے تقریباً آٹھ میل دور ہے۔

[۲۴] یعنی زچگی کے درد سے بے تاب ہو کر اٹھیں اور ایک کھجور کے تنے کا سہارا لیا۔ کیفیت یہ تھی ایک تو دردزہ کی شدت کی تکلیف، دوسرے تنہائی و بیکسی، تیسرے اشیائے خوردنی اور دیگر ضروریات کا فقدان۔ حتیٰ کہ پانی تک موجود نہ تھا اور سب سے زیادہ پریشان کن بات آئندہ بدنامی اور رسوائی کا تصور تھا۔ اب سب باتوں سے آپ اس قدر پریشان ہوئیں کہ بے اختیار منہ سے یہ الفاظ نکل گئے۔ کاش میں آج سے پہلے ہی مر چکی ہوتی اور لوگوں کے حافظہ سے بھی اتر چکی ہوتی۔

جو حضرات معجزات کے منکر ہیں۔ وہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کو قرآنی تصریحات کے علی الرغم فطری پیدائش قرار دیتے ہیں اور اس سلسلہ میں انہیں اناجیل کی روایات قبول کرنے میں بھی کچھ باک نہیں ہوتا۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ انجیل میں تو فقط سیدہ مریمؑ کی یوسف نجار سے منگنی کا ذکر ہے مگر یہ حضرات باقاعدہ نکاح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور

فَكُلِي وَاشْرَبِي وَقَرِّي عَيْنًا ۚ فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا فَقُولِي إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَٰنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنسِيًّا ﴿٢٦﴾ فَأَتَتْ بِهِ قَوْمَهَا تَحْمِلُهُ ۖ قَالُوا يَا مَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ﴿٢٧﴾ يَا أُخْتَ هَارُونَ مَا كَانَ أَبُوكِ امْرَأَ سَوْءٍ وَمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا ﴿٢٨﴾ فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ ۖ قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ

پس کھاؤ [۲۵]، پیو اور اپنی آنکھ ٹھنڈی کرو پھر اگر تو کسی آدمی کو دیکھے تو کہہ دینا کہ ”: میں نے اللہ کے لئے روزہ کی نذر مانی ہے لہٰذا آج کسی انسان سے [۲۶] بات نہ کروں گی“ (۲۶) پھر وہ اس بچے کو اٹھائے اپنی قوم میں آئیں تو وہ کہنے لگے: ”مریم تو تو بہتان [۲۷] والی چیز لائی ہے۔ (۲۷) اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ کوئی برا آدمی تھا اور نہ ہی تیری ماں بدکار تھی“ (۲۸) مریم نے اس بچے کی طرف اشارہ کر دیا تو وہ کہنے لگے: ”ہم اس سے

سیدہ مریم کے اس جملہ ”کاش میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی اور میرا نام و نشان بھی باقی نہ رہتا“ کی تعبیر یہ پیش کرتے ہیں کہ یہ جملہ انہوں نے دردزہ کی شدت کی وجہ سے کہا تھا۔ یہ تعبیر اس لحاظ سے غلط ہے کہ دردِزہ ہر عورت کو ہوتی ہے اور ہر وضع حمل کے وقت ہوتی ہے۔ لیکن صرف اس درد کی بنا پر کسی عورت نے کبھی موت کی آرزو نہیں کی۔ بلکہ عورتیں ایسے موقعوں پر ہمیشہ یہ درد خوشی کے ساتھ برداشت کرتی ہیں بالخصوص اس صورت میں کہ بچہ بھی پہلونٹی کا ہو اور پھر اولاد بھی نرینہ ہو۔ لہٰذا منکرین معجزات یا نیچری حضرات کی یہ تاویل صرف اللہ کی آیات کا مذاق ہی نہیں بلکہ تجربہ کی کسوٹی پر بھی غلط ثابت ہوتی ہے۔

[۲۵] ۞ زچگی کے دوران خوردونوش کے لئے اللہ کی معجزانہ مدد:۔ جس کھجور کے درخت کے تنے سے سیدہ مریم نے سہارا لیا تھا وہ قدرے بلندی پر واقع تھا اس کے نیچے سے پھر اسی فرشتہ کی آواز سنائی دی جس نے لڑکے کی بشارت دی تھی اور جس کی بشارت شاید اس وقت سیدہ مریم بھول گئی تھیں۔ اور وہ آواز یہ تھی کہ ذرا نیچے تو دیکھو اللہ نے ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا چشمہ جاری کر دیا ہے یہ تمہارے پینے کے لئے ہے اور اسی کھجور کے تنے کو زور سے ہلاؤ تو تازہ پکی کھجوریں جھڑنے لگیں گی۔ یہ سیدہ مریم کے کھانے کا سامان کیا گیا اور یہ دونوں چیزیں معجزانہ طور پر پیدا کی گئی تھیں۔ جو اس حالت زچگی کے لئے ایک سادہ غذا بھی تھی اور مناسب و متوازن بھی۔

[۲۶] ۞ پیدائش کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے امداد کی صورتیں اور چپ کا روزہ:۔ اللہ کی مہربانی سے بچہ پیدا ہو گیا۔ فرشتہ کی آمد سے تنہائی میں کمی واقع ہوئی۔ کھانے پینے کا سامان بھی مہیا ہو گیا اور چوتھی اور سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ بدنامی سے بچاؤ کی کیا صورت ہو اور لوگ جو دیکھیں گے اور پوچھیں گے تو انہیں کیا جواب دیا جائے۔ اس کا علاج اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لیا اور فرشتے نے سیدہ مریم کو ہدایت کی کہ اگر تو کسی آدمی کو دیکھے تو اس کو اشارہ سے یہ کہہ دینا کہ میں نے آج چپ کا روزہ رکھا ہوا ہے۔ لہٰذا کسی آدمی سے بات کرنا مجھے منع ہے۔ واضح رہے کہ چپ کا روزہ پہلی امتوں میں مشروع تھا مگر شریعتِ محمدیہ میں مشروع نہیں۔ ایسے روزہ میں انسان ذکر اذکار اور اللہ سے دعا وغیرہ تو کر سکتا تھا، مگر لوگوں سے بات چیت نہیں کر سکتا تھا جیسا کہ سیدنا زکریاؑ کو بھی سیدنا یحییٰ علیہ السلام کے حمل کی علامت ایسا ہی تین دن کا روزہ بتایا گیا تھا۔ ایسے روزہ میں فرشتوں سے بات چیت ممنوع نہیں تھی۔

[۲۷] ۞ یہود کی بہتان تراشیاں:۔ جس وجہ سے سیدہ مریم اس دور کے مکان میں جا گزیں ہوئی تھیں وہ تو پورا ہو چکا۔ اب

مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿٢٩﴾ قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ﴿٣٠﴾ وَجَعَلَنِي
مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنْتُ وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ﴿٣١﴾ وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي

کیسے کلام کریں جو ابھی [۲۸] گود کا بچہ ہے؟" (۲۹) بچہ بول اٹھا۔ میں اللہ کا بندہ [۲۹] ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔ (۳۰) اور جہاں کہیں بھی میں رہوں اس نے مجھے بابرکت بنایا ہے اور جب تک میں زندہ رہوں مجھے نماز اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ (۳۱) اور یہ بھی کہ میں اپنی والدہ سے بہتر سلوک کرتا رہوں۔ نیز

وہ اسے اٹھائے ہوئے اور فرشتہ کی ہدایت کو پلے باندھے ہوئے اپنی قوم کے لوگوں کے ہاں آگئیں۔ اس امید پر کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے پہلے بروقت مدد فرمائی ہے اب بھی کوئی راہ نکال دے گا۔ جب وہ اپنے لوگوں کے پاس بچہ کو اٹھائے ہوئے پہنچیں تو انہوں نے بچہ کو دیکھ کر بغیر کچھ پوچھے ہی طعن وملامت شروع کردی اور آسمان سر پر اٹھالیا اور کہا کہ ہارون جیسے پاکیزہ خاندان کی اولاد ہوتے ہوئے یہ تو نے کیا گل کھلا دیا تم نے ہمارے پورے خاندان کی ناک کٹوا دی اور ہماری عزت خاک میں ملا دی۔ غرض بھانت بھانت کی بولیاں بولی جارہی تھیں۔ کسی نے کہا کہ تمہاری ماں (عمران کی بیوی) بھی ایک پاکباز اور عفیفہ عورت تھی اور باپ (عمران) بھی بڑا شریف آدمی تھا۔ پھر تجھ میں یہ بری خصلت کہاں سے آگئی؟ غرض جتنے منہ اتنی باتیں ہوتی رہیں اور سیدہ مریم خاموشی اور تحمل سے یہ باتیں سنتی رہیں اور یہ باتیں کچھ غیر متوقع بھی نہ تھیں۔

۞ سیدہ مریم ہارون کی بہن کیسے تھیں؟ کہتے ہیں کہ سیدہ مریم کے ایک بھائی کا نام بھی ہارون تھا۔ اسی وجہ سے لوگوں نے سیدہ مریمؑ کو اے ہارون کی بہن کہا تھا۔ ممکن ہے یہ بات بھی صحیح ہو مگر اس سے بہتر توجیہ وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے اسی توجیہ کی تائید عام محاورۂ عرب سے بھی ہوتی ہے۔ نیز درج ذیل حدیث بھی اسی توجیہ کی تائید کرتی ہے۔

سیدنا مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں کہ آپؐ نے مجھے نجران کے عیسائیوں کی طرف (مناظرہ کے لئے) بھیجا تو انہوں نے کہا: "تم جو یا اخت ھارون پڑھتے ہو تو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ میں تو کافی مدت ہے؟ (پھر مریم ہارون یعنی موسیٰؑ کے بھائی، کی بہن کیسے ہوئی؟) اور میں نہیں سمجھتا تھا کہ انہیں کیا جواب دوں۔ پھر میں نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا اور انہیں بتایا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "تم نے انہیں یہ نہ بتایا کہ وہ لوگ اپنے سے پہلے کے نبیوں اور بزرگوں کے نام رکھا کرتے تھے" (یعنی موسیٰ کے بھائی ہارون اور تھے اور مریم کا بھائی ہارون اور تھا) (ترمذی، ابواب التفسیر)

[۲۸] سیدہ مریمؑ نے فرشتہ کی ہدایت کے مطابق ان کی کڑوی کسیلی باتوں میں سے کسی کا جواب نہ دیا بلکہ اس نومولود بچے کی طرف اشارہ کردیا کہ یہ خود جواب دے گا۔ اس بات پر لوگ اور زیادہ برہم ہوئے اور کہنے لگے ایک تو خود مجرم ہو دوسرے ہمارا مذاق اڑاتی ہو۔ یہ بچہ جو ابھی پیدا ہوا ہے بھلا ان باتوں کا کیا جواب دے سکتا ہے؟

[۲۹] ۞ سیدنا عیسیٰ نے کلام فی المھد سے اپنی والدہ کی بہتان سے مکمل بریت کردی:۔ تب اس نومولود بچے کو اللہ نے اپنی قدرت کاملہ سے قوت گویائی عطا فرمائی اور پہلی بات جو اس نے کی وہ یہ تھی کہ "میں اللہ کا بندہ ہوں" بالفاظ دیگر میں نہ اللہ ہوں اور نہ ابن اللہ ہوں اور یہ ایسی بنیادی بات تھی جو بعد میں اس کے پیروکاروں میں ہی متنازعہ فیہ بن گئی۔ کسی نے انہیں اللہ ہی کہہ دیا اور کسی نے اللہ کا بیٹا۔ آپ نے اپنے اس معجزانہ کلام کے آغاز میں ہی اس کی تردید فرمادی تھی۔ نیز یہ بھی بتایا کہ "اللہ

جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿٣٢﴾ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدتُّ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا ﴿٣٣﴾ ذَٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ ﴿٣٤﴾ مَا كَانَ لِلَّهِ أَن يَتَّخِذَ مِن وَلَدٍ ۖ سُبْحَانَهُ ۚ إِذَا

اللہ نے مجھے جابر اور بدبخت نہیں بنایا۔(۳۲) مجھ پر سلامتی ہو جس دن میں پیدا ہوا اور اس دن[۳۰] بھی جب میں مروں گا اور اس دن بھی جب میں زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا۔(۳۳) یہ ہے عیسیٰ بن مریم کا قصہ۔ یہی سچی بات ہے جس میں وہ جھگڑا[۳۱] کر رہے ہیں۔(۳۴) اللہ تعالیٰ کو یہ شایاں نہیں کہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے وہ (ایسی باتوں سے)

نے مجھے کتاب دی ہے اور اپنا نبی بھی بنایا ہے" اس کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ نے مجھے کتاب تورات کا علم عطا فرمایا اور دوسرا یہ کہ اللہ مجھے کتاب انجیل بھی عطا فرمانے والا ہے اور نبوت بھی۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا یہ کلام دراصل ان کی سب بہتان تراشیوں کا مکمل جواب تھا اور اس کلام میں ان کی والدہ سیدہ مریمؑ کی مکمل بریّت کا اظہار مقصود تھا یعنی اگر ایک نومولود بول سکتا ہے اور ایسا مبنی بر حقیقت کلام کر سکتا ہے تو یہ بھی عین ممکن ہے کہ وہ پیدا بھی معجزانہ طور پر بن باپ کے ہوا ہو۔ بالفاظ دیگر اسی عمر میں ایسے کلام کرنے کے معجزہ سے معجزانہ پیدائش کی توثیق مقصود تھی۔

[۳۰] سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے اس وقت کے کلام کے باقی نکات یہ تھے کہ میں جہاں کہیں بھی رہوں گا اللہ کی مہربانی سے اس کی برکات میرے شامل حال رہیں گی اور مجھے یہ بھی تاکیدی حکم دیا گیا ہے کہ جب تک زندہ رہوں باقاعدگی کے ساتھ نمازیں اور زکوٰۃ ادا کرتا رہوں۔ اور اپنی والدہ سے بہتر سلوک کرتا رہوں (صرف والدہ کا ذکر اس لئے کیا کہ آپ کا والد تھا ہی نہیں ورنہ اس کا بھی ضرور ذکر کرتے) اللہ نے میری سرشت میں نہ سرکشی رکھی ہے اور نہ بدبختی۔ جب میں پیدا ہوا تھا تو اس دن بھی اللہ نے مجھ پر سلامتی نازل فرمائی تھی اور مرتے وقت حتیٰ کہ مرنے کے بعد اٹھتے وقت یعنی اس دنیا میں بھی اور اگلے جہان میں بھی بہر حال اللہ مجھ پر سلامتی نازل فرمائے گا۔ یہ تھا وہ پورا کلام جو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے اس وقت کیا تھا جبکہ آپ کی والدہ پر الزام تراشیاں کی جا رہی تھیں۔

۞ گود میں کلام کرنے والے تین بچے:۔ واضح رہے کہ بخاری و مسلم دونوں میں ایک طویل حدیث موجود ہے جس میں یہ مذکور ہے کہ بنی اسرائیل کے تین بچوں نے مہد میں کلام کیا تھا۔ ان میں سے ایک تو یہی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ ان کے مخاطب یہود تھے اور آپ کے اس کلام کا مقصود پہلے بیان ہو چکا ہے۔ دوسرا ابن جریج راہب کا قصہ ہے جسے بالخصوص مسلم نے بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ابن جریج راہب پر زنا کی تہمت لگائی گئی تو انہوں نے اللہ سے بریت کی دعا کی پھر حرامی نومولود بچہ کو کچوکا لگا کر پوچھا کہ بتاؤ کہ تمہارا باپ کون ہے؟ تو بچہ بول اٹھا کہ فلاں چرواہا ہے۔ اس طرح اللہ نے ابن جریج راہب کو زنا کی تہمت سے بری فرما دیا۔ اور تیسرے بچہ کی مخاطب اس کی ماں تھی جو سامان دنیا پر ریجھی ہوئی تھی تو بچہ نے بول کر اپنی ماں کی گمراہ کن غلط فہمی کو دور کر دیا۔

اور مہد میں کلام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بچہ شیر خوارگی کے عالم میں کلام کرے جب کہ ابھی اس نے کلام کرنا نہ سیکھا ہو۔ اور یہ مہد کا کلام تینوں واقعات میں صرف ایک ہی بار وقوع پذیر ہوا۔ یہ نہیں کہ ان بچوں نے اس عالم میں متعدد بار کلام کیا ہو۔

[۳۱] ۞ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں افراط و تفریط میں مبتلا فرقے' ان کے جھگڑے اور کلام فی المہد کے اہم نکات:۔

قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٣٥﴾ وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٣٦﴾ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿٣٧﴾

پاک ہے۔ جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو بس یہ کہہ دیتا ہے کہ "ہو جا" تو وہ [۳۲] ہو جاتی ہے۔(۳۵) اور (آپ انہیں بتائیں کہ) اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے لہٰذا اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔(۳۶) پھر مختلف گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا۔ پس ایسے کافروں کے لئے ہلاکت ہے جو بڑے دن کی حاضری کا انکار کر[۳۳] رہے ہیں۔(۳۷)

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی حقیقت بالکل یہی ہے جو یہاں بیان کر دی گئی۔ لیکن اہل کتاب نے اس میں کئی اختلاف اور جھگڑے کھڑے کر دیئے۔ یہود نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اتنا گھٹایا کہ نعوذ باللہ انہیں ولد الزنا قرار دے کر اس پر دلائل پیش کرنے لگے اور نصاریٰ نے ان کا درجہ اس قدر چڑھایا کہ انہیں عین اللہ قرار دے لیا یا کچھ دوسرے انہیں ابن اللہ کہنے لگے اور اپنے ایسے عقائد کے دلائل پیش کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ دونوں گروہ افراط و تفریط اور غلو فی الدین میں مبتلا ہیں۔ جو کچھ اصل حقیقت تھی وہ یہاں بیان کر دی گئی ہے۔ پھر اس اصل حقیقت کے بیان ہو جانے کے بعد اب مسلمانوں کے ایک فرقہ نے جو معجزات کے منکر ہیں اس حقیقت سے اختلاف کیا اور کہنے لگے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بھی معجزانہ طور پر نہیں بلکہ عام فطری دستور کے مطابق ہوئی تھی اور قرآن کے بیان کے علی الرغم قرآن ہی کی معنوی تحریف کر کے ایسے دلائل ڈھونڈنے لگے۔ ایسے تمام لوگوں کا اور ان کے اختلاف کا اب قیامت کے دن فیصلہ ہو گا۔ (سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ پیدائش کے منکرین کے سلسلہ میں دیکھئے سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۵۵ کا حاشیہ)

اور عیسائی حضرات اللہ کو باپ سیدہ مریم کو ماں اور سیدنا عیسیٰؑ کو بیٹا کہتے ہیں۔ مگر سیدہ مریم کو اللہ کی بیوی نہیں کہتے۔ یعنی ماں باپ مان کر بھی ان کے ہاں سیدنا عیسیٰؑ کی پیدائش کا وہ طریقہ نہیں جو والدین کے واسطہ سے ہوتا ہے۔ پھر اگر کوئی بات خرق عادت ماننا ہی ہے تو بدوں باپ پیدائش مان لینے میں کیا اشکال ہے؟

[۳۲] اللہ کو بیٹے یا کسی مددگار کی قطعاً ضرورت نہیں:۔ اللہ تعالیٰ کو کسی کو بیٹا بنانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، کیونکہ جب سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ہی یہ کارخانہ کائنات ٹھیک طرح چل رہا تھا تو پھر بیٹا بنانے کی ضرورت کہاں سے آگئی؟ علاوہ ازیں ایسی باتیں اللہ تعالیٰ کی شان کے شایان بھی نہیں ہیں وہ اس قسم کی کمزوریوں اور مجبوریوں سے بالاتر اور پاک ہے نیز جب اس کے سارے کام فقط کن کا حکم دینے سے ہو جاتے ہیں۔ فوراً اسباب و وسائل مہیا ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور وہ چیز ہو کے رہتی ہے تو پھر اسے کسی کو بیٹا یا شریک بنانے کی ضرورت بھی کیا ہے؟

[۳۳] سیدھی راہ یہ ہے کہ میرا اور تمہارا یعنی سب لوگوں کا خالق اور پروردگار صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اب جو لوگ اس سیدھی راہ میں رخنے ڈالتے، اللہ کے لئے بیٹے، پوتے، بیٹیاں یا دوسرے شریک تجویز کرتے، پھر ان پر بحثیں کر کے جدا جدا فرقے بنا رہے ہیں انہیں قیامت کے دن کی ہولناک تباہیوں سے خبردار کیجئے اور اس ہلاکت سے ڈرایئے جو اس دن انہیں یقیناً پیش آنے والی ہے۔

اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾ وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ

نصف الاخر

جس دن وہ ہمارے پاس آئیں گے اس روز وہ خوب سن رہے اور دیکھ رہے ہوں گے۔ لیکن یہ ظالم آج کھلی گمراہی [۳۴] میں پڑے ہیں۔(۳۸) نیز انہیں پچھتاوے کے دن سے ڈرائیے جبکہ ہر کام کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اور (آج تو) یہ لوگ غفلت [۳۵] میں پڑے ہیں اور ایمان نہیں لا رہے۔(۳۹) بلاشبہ ہم ہی زمین اور اس پر موجود سب چیزوں کے [۳۶] وارث ہوں گے اور انہیں ہمارے ہاں

[۳۴] یعنی آج اس دنیا میں انہیں دیکھنے اور سننے کا فائدہ ہے مگر نہ دیکھتے ہیں اور نہ سنتے ہیں۔ مگر قیامت کے دن خوب دیکھ اور سن رہے ہوں گے مگر اس دن دیکھنے اور سننے کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اس دن وہ ایسی ایسی باتیں سنیں گے جن سے ان کے جگر پھٹ جائیں گے اور ایسے منظر دیکھیں گے جن سے ان کے چہروں پر سیاہی اور مردنی چھا جائے گی۔

[۳۵] ۞ یوم حسرت اور موت کو مینڈھے کی شکل میں ذبح کرنا:۔ کافروں کے پچھتانے کے مواقع تو بہت ہوں گے۔ مگر آخری موقع غالباً وہ ہوگا جب اہل جنت کو جنت جانے کا اور اہل دوزخ کو دوزخ میں جانے کا فیصلہ سنا دیا جائے گا جیسا کہ درج ذیل حدیث میں آیا ہے:

''سیدنا ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: (قیامت کے دن) موت کو ایک چتکبرے مینڈھے کی شکل میں لے کر آئیں گے۔ پھر ایک پکارنے والا پکارے گا: ''اے اہل جنت!'' وہ ادھر دیکھیں گے تو فرشتہ کہے گا: ''تم اس مینڈھے کو پہچانتے ہو؟'' وہ کہیں گے ''ہاں''۔ یہ موت ہے اور ہم سب اس کا مزہ چکھ چکے ہیں'' پھر وہ پکارے گا، ''دوزخ والو!'' وہ لوگ بھی گردن اٹھا کر ادھر دیکھنے لگیں گے تو فرشتہ کہے گا: ''تم اس مینڈھے کو پہچانتے ہو؟'' وہ کہیں گے: ''ہاں! یہ موت ہے، ہم سب اس کو دیکھ چکے ہیں''۔ اس وقت وہ مینڈھا ذبح کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد وہ فرشتہ کہے گا: ''جنت والو! تمہیں ہمیشہ بہشت میں رہنا ہے اور دوزخ والو! تمہیں بھی ہمیشہ دوزخ میں رہنا ہے۔ اب کسی کو موت نہیں آئے گی۔ پھر آپؐ نے یہ آیت پڑھی ﴿وانذرھم یوم الحسرۃ...... لایومنون﴾ (بخاری۔ کتاب التفسیر، ترمذی، ابواب التفسیر)

اس دن کافر سب کچھ خوب دیکھ رہے ہوں گے اور سن بھی رہے ہوں گے مگر ہر طرف سے ناامید ہو کر حسرت سے اپنے ہاتھ کاٹیں گے۔ مگر اس وقت کچھ فائدہ نہ ہوگا''

[۳۶] یعنی اس دن نہ کسی کا مُلک باقی رہے گا نہ مِلک باقی رہے گی۔ ہر چیز براہِ راست مالکِ حقیقی کی طرف لوٹ جائے گی۔ وہی علی الاطلاق ہر چیز کا مالک و مختار ہوگا۔ اور وہی ہر چیز کا وارث ہوگا۔ مُلک و مِلک کے لمبے چوڑے دعویٰ رکھنے والے وہاں خالی ہاتھ اللہ کے سامنے پیش ہوں گے۔

ع ۲ عَلَيْهَا وَإِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿٤٠﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِبْرٰهِيْمَ ۬ۥ إِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿٤١﴾ إِذْ قَالَ

ہی لوٹ کر آنا ہے۔(۴۰) اور اس کتاب میں سیدنا ابراہیم کا قصہ [۳۷] بیان کیجئے بلاشبہ وہ راست باز [۳۸] انسان اور ایک نبی تھے۔(۴۱)

[۳۷] سیدنا ابراہیمؑ کے قصہ کا روئے سخن بالخصوص قریش مکہ کی طرف ہے۔ جو اپنے آپ کو دین ابراہیم کا پیروکار بتاتے تھے۔ انہیں بتایا یہ جارہا ہے کہ وہ مشرک نہیں بلکہ توحید پرست تھے۔ انہوں نے اپنے مشرک آباء واجداد کی تقلید کو چھوڑ دیا تھا۔ تمہیں بھی چھوڑ دینا چاہئے۔ مشرک قوم اور مشرک باپ نے طرح طرح کی دھمکیاں دیں مگر انہوں نے شرک کی باتیں تسلیم کرنے پر گھر بار چھوڑنے اور ترک وطن کو ترجیح دی۔ ایک تم ہو جو اپنے شرک پر اتنے مصر ہو کہ توحید پرستوں کو اذیتیں دے دے کر انہیں ہجرت پر مجبور کر دیا ہے۔ پھر تمہارے اس اتباع دین ابراہیمی میں کون سی صداقت ہے؟

[۳۸] اور سیدنا ابراہیمؑ تو قول کے سچے اور اپنی عملی زندگی میں بھی راست باز انسان تھے اور صدیق ہونے کے علاوہ وہ نبی بھی تھے۔ بعض لوگ اسی آیت سے استدلال کر کے بخاری کی درج ذیل حدیث کی صحت کا انکار کر دیتے ہیں:

❁ سیدنا ابراہیم کے تین جھوٹ والی حدیث پر اعتراض اور اس کا جواب:۔ ”سیدنا ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ سیدنا ابراہیمؑ نے کبھی جھوٹ نہ بولا سوائے تین مرتبہ کے۔ دو مرتبہ تو اللہ کے واسطے ان کا یہ کہنا کہ انی سقیم اور یہ کہنا کہ بل فعله كبيرهم هذا (۲۱:۶۳) یہ دونوں اللہ کے لئے تھے اور آپؐ نے فرمایا کہ ایک دن وہ اور (ان کی بیوی) سارہ اس حال میں جا رہے تھے کہ ایک ظالم بادشاہ پر ان کا گزر ہوا۔ کسی نے بادشاہ سے کہا کہ یہاں ایک شخص آیا ہے جس کے ساتھ اس کی خوبصورت بیوی بھی ہے۔ اس بادشاہ نے سیدنا ابراہیمؑ کو بلوا بھیجا اور سارہ کی بابت پوچھا کہ یہ کون ہے؟ سیدنا ابراہیمؑ نے کہہ دیا: ”یہ میری بہن ہے“ پھر وہ سارہ کے پاس گئے اور کہا: سارہ! اس وقت روئے زمین پر میرے اور تمہارے سوا کوئی مومن نہیں ہے اور اس ظالم نے مجھ سے پوچھا تھا تو میں نے کہہ دیا کہ یہ میری (دینی) بہن ہے۔ پس تم مجھے جھوٹا نہ کرنا“ (بخاری۔ کتاب الانبیاء۔ باب قول اللہ واتخذ الله ابراهيم خليلا)

۱۔ ان تین جھوٹوں میں سے دو کا ذکر تو قرآن کریم میں موجود ہے۔ بتوں کو توڑا تو آپ نے تھا لیکن پوچھنے پر کہہ دیا کہ اس بڑے بت نے انہیں توڑا ہے اس طرح جب ان کی قوم جشن منانے نکلی اور آپ کو ساتھ لے جانے کو کہا تو آپ نے کہہ دیا کہ میں بیمار ہوں۔ پھر اسی وقت جا کر ان کے بت بھی توڑ ڈالے تو پھر بیمار کیسے تھے؟ کیا یہ باتیں خلاف واقعہ نہیں تھیں؟ لہذا معترضین کا اصل رخ قرآن کی طرف ہونا چاہئے نہ کہ حدیث کی تکذیب کی طرف۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ نے خود ابتداءً وضاحت سے یہ الفاظ فرما دیئے کہ ”سیدنا ابراہیمؑ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا“ یہ ان کے فی الواقع صدیق ہونے کی بہت بڑی شہادت ہے کہ ان سے ۱۷۵ سالہ زندگی میں تین سے زیادہ مرتبہ جھوٹ سرزد نہیں ہوا۔ اب آپ اپنی زندگی کے شب و روز پر نگاہ ڈالئے کہ آپ ساری زندگی میں نہیں بلکہ صرف ایک دن رات میں کتنی مرتبہ جھوٹ بولتے ہیں اور دانستہ بھی اور نادانستہ بھی اور پھر خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ اگر ایک شخص سے ۱۷۵ سال کی زندگی میں تین سے زیادہ جھوٹ سرزد نہ ہوں تو اس کو صدیق کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ پھر ان تینوں واقعات کے لئے ٹھوس بنیادیں بھی موجود

لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ﴿٤٢﴾ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ
الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿٤٣﴾ يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ

جب انہوں نے اپنے باپ سے کہا: "ابا جان! آپ ایسی چیزوں کی عبادت کیوں کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں[٣٩]، نہ دیکھتی ہیں اور نہ تمہارے کسی کام آسکتی ہیں۔(٤٢) ابا جان! میرے پاس ایسا علم[٤٠] ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا۔ لہٰذا میرے پیچھے چلئے میں آپ کو سیدھی راہ بتاؤں گا۔(٤٣) ابا جان! شیطان کی عبادت[٤١] نہ کیجئے وہ تو

ہیں۔ یعنی ان میں دو جھوٹ تو آپ نے مشرکین پر حجت قائم کرنے اور کلمۂ حق کو سربلند کرنے کے بولے جیسا کہ حدیث بالا سے ثابت ہے اور تیسرا جس کا ذکر حدیث میں ہے وہ آپ نے اپنی جان بچانے کے لئے بولا تھا۔ شاہ مصر کا دستور یہ تھا کہ وہ حسین عورت کو زبردستی چھین لیتا۔ اگر اس کے ساتھ اس کا خاوند ہوتا تو اسے مروا ڈالتا اور اگر اس کے ساتھ بھائی یا کوئی دوسرا رشتہ دار ہوتا تو اس سے عورت تو چھین لیتا مگر اس کی جان سے درگزر کرتا تھا۔ اب اگر سیدنا ابراہیمؑ نے اپنی جان بچانے کی خاطر جھوٹ بولا بھی تھا (حالانکہ وہ بھی ایک طرح سے جھوٹ نہیں بنتا جیسا کہ حدیث کے الفاظ بتا رہے ہیں) آخر اس میں قیامت کون سی آگئی؟ جان بچانے کی خاطر اگر مردار تک کھا لینا جائز ہے تو جھوٹ بولنا کیوں جائز نہیں ہو سکتا۔ وہ کون سی شریعت ہے جس میں اس قدر سختی روا رکھی گئی ہو۔ جان بچانے کے لئے تو اللہ نے کلمہ کفر تک کہہ دینے کی بھی اجازت دے دی ہے بشرطیکہ دل میں کوئی ایسی بات نہ ہو (١٤:٣٨) تو پھر کیا جھوٹ بولنا اس سے بھی بڑا جرم ہے؟ جھوٹ گناہ اس صورت میں ہے جب اس کی زد کسی کے حقوق پر پڑتی ہو اور جتنی زیادہ زد پڑتی ہو اتنا ہی زیادہ کبیرہ گناہ بنتا جاتا ہے۔ ہمیشہ سچ بولنا اور جھوٹ سے بچنا شریعت کا ایک بڑا بھاری کلیہ ہے لیکن استثناء اس میں بھی موجود ہے جبکہ اصلاح اور خیر کا پہلو نمایاں ہو اور شریعت کی نگاہوں میں وہ فی الواقع اصلاح اور خیر ہو۔ مثلاً میاں بیوی کے درمیان صلح کرانے کے لئے شریعت نے باتیں بنانے اور جھوٹ بول کر صلح کرا دینے کو گناہ نہیں بلکہ مستحسن قرار دیا ہے۔ اسی طرح جہاد میں دشمن کو ہراساں کرنے کے لئے بھی ایسی باتوں کی اجازت ہے۔ حالانکہ لغوی لحاظ سے ان باتوں پر بھی لفظ کذب کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

[٣٩] ۞ سیدنا ابراہیم کا اپنے باپ کو بت پرستی کی قباحتیں سمجھانا:۔ مروجہ شرک کی دو بڑی اقسام ہیں ایک بت پرستی دوسرے پیر پرستی۔ پیر خواہ زندہ ہو یا فوت شدہ۔ زندہ پیر کم از کم دیکھ تو سکتا ہے اور سن بھی سکتا ہے اور مادی وسائل کے ذریعہ مدد بھی کر سکتا ہے۔ مگر سیدنا ابراہیمؑ کی قوم تو بت پرست تھی۔ جو نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں۔ نہ حرکت کر سکتے ہیں بلکہ وہ اپنے وجود تک کے لئے انسانوں کے محتاج ہیں۔ پھر وہ دوسروں کی حاجت روائی اور مشکل کشائی کیا خاک کر سکتے ہیں؟

[٤٠] یعنی علم وحی الٰہی، جس میں انسان کی دنیوی زندگی کے لئے مکمل ہدایات موجود ہوتی ہیں اور آخرت میں محاسبے کا تفصیلی ذکر ہوتا ہے۔

[٤١] یعنی شیطان کی اطاعت کرنا دراصل اس کی عبادت کرنا ہے، ورنہ معروف معنوں میں تو شیطان کی کوئی بھی عبادت نہیں کرتا۔ شیطان نے تو تمہارے باپ آدم کو سجدہ کرنے کے بارے میں اللہ کی نافرمانی کر لی تھی۔ مگر آدم کو سجدہ نہیں کیا

لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿۴۴﴾ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ﴿۴۵﴾
قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ﴿۴۶﴾ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ
سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴿۴۷﴾ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ
عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَاۗءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ﴿۴۸﴾ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗٓ

اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے۔(۴۴) ابا جان! مجھے خطرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے آپ کو سزا[۴۲] ملے گی اور آپ شیطان کے ساتھی بن جائیں گے۔(۴۵) باپ نے جواب دیا: "ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے برگشتہ ہو گیا ہے؟ اگر تو (اس کام سے) باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کردوں گا اور (بہتر یہ ہے کہ) تو ایک طویل مدت کے لئے[۴۳] (میری آنکھوں سے) دور چلا جا"(۴۶) ابراہیم نے جواب دیا: "ابا جان! آپ پر سلام ہو۔ میں اپنے پروردگار سے آپ کے لئے بخشش کی دعا کروں گا۔ بلاشبہ میرا پروردگار مجھ پر مہربان ہے(۴۷) میں آپ لوگوں کو بھی چھوڑے جارہا ہوں اور ان کو بھی جنہیں تم لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہو اور میں تو اپنے پروردگار ہی کو پکاروں گا مجھے امید ہے کہ میں اپنے پروردگار کو پکار کر محروم[۴۴] نہ رہوں گا"(۴۸) پھر جب سیدنا ابراہیم (علیہ السلام) ان لوگوں کو چھوڑ کر چلے گئے اور ان چیزوں کو بھی جنہیں وہ اللہ کے سوا پوجتے تھے۔ تو ہم نے

تھا۔ پھر بھی تم اسی کی فرمانبرداری کرتے ہو؟

[۴۲] اللہ کی طرف سے کوئی جسمانی سزا ملے یا نہ ملے یہ تو ضرور ملے گی کہ اگر تم شیطان ہی کی اطاعت کرتے رہے تو تمہیں کبھی ہدایت نصیب نہ ہوگی۔ پھر تم ہمیشہ کے لئے شیطان ہی کے ساتھی بن جاؤ گے۔

[۴۳] ۞ باپ کا سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو گھر سے نکال دینا:۔ باپ آذر جو درباری مہنت، بت تراش اور بت فروش تھا، بھلا بیٹے کے کہنے پر اپنی معاش اور اپنے منصب سے کیسے دستبردار ہو سکتا تھا۔ آپ کی اس پند و نصیحت کے جواب میں کہنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے تم اپنے آبائی دین سے برگشتہ اور بدعقیدہ ہو چکے ہو۔ ایسی بے دین اولاد کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ اگر تم نے اپنا رویہ نہ بدلا تو میں تمہیں سنگسار کردوں گا اور بہتر یہ ہے کہ تم فوراً میری آنکھوں سے دور ہو جاؤ اور میرے گھر سے نکل جاؤ۔

[۴۴] ۞ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کے لئے دعائے مغفرت کا وعدہ:۔ چنانچہ سیدنا ابراہیمؑ نے گھر سے نکل جانے میں ہی اپنی اور اپنے دین کی عافیت سمجھی۔ مگر اپنے باپ کے حق میں اتنے خیر خواہ اور نرم دل تھے کہ جاتی دفعہ کسی ناراضگی کا اظہار کرنے کے بجائے اس کے لئے امن و سلامتی کی دعا کی اور وعدہ کیا کہ میں تمہارے لئے اپنے پروردگار سے بخشش کی دعا کرتا رہوں گا اور کرتے بھی رہے پھر آپ کو بذریعہ وحی معلوم ہو گیا کہ مشرک کی کسی صورت بخشش نہیں ہو سکتی تو آپ ایسی دعا کرنے سے رک گئے جیسا کہ سورہ توبہ میں گزر چکا ہے۔

رکوع ۳

اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ ؕ وَ کُلًّا جَعَلۡنَا نَبِیًّا ﴿۴۹﴾ وَ وَہَبۡنَا لَہُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِنَا وَ جَعَلۡنَا لَہُمۡ لِسَانَ صِدۡقٍ عَلِیًّا ﴿۵۰﴾ وَ اذۡکُرۡ فِی الۡکِتٰبِ مُوۡسٰۤی ۫ اِنَّہٗ کَانَ مُخۡلَصًا وَّ کَانَ رَسُوۡلًا نَّبِیًّا ﴿۵۱﴾ وَ نَادَیۡنٰہُ مِنۡ جَانِبِ

انہیں اسحاق عطا کیا اور (اس کے بعد) یعقوب [۴۵] بھی۔ ان سب کو ہم نے نبی بنایا تھا۔(۴۹) ہم نے ان سب کو اپنی رحمت سے نوازا تھا اور ذکر خیر سے سربلند [۴٦] کیا تھا۔(۵۰) نیز اس کتاب میں موسیٰ کا قصہ بھی بیان کیجئے۔ بلاشبہ وہ ایک برگزیدہ انسان اور رسول [۴۷] نبی تھے۔(۵۱) ہم نے انہیں کوہِ طور کی داہنی [۴۸] جانب سے پکارا اور

[۴۵] ہجرت کے بعد اللہ کا ابراہیم علیہ السلام کو اولاد عطا کرنا:۔ جب آپ نے اللہ کی راہ میں اپنے گھر کو اور گھر والوں کو خیر باد کہتے ہوئے ہجرت اختیار کی تو اللہ نے ان کا نعم البدل اولاد کی شکل میں انہیں عطا فرمایا۔ جو بہر حال چھوڑے ہوئے رشتہ داروں سے بہتر تھے تاکہ غریب الوطنی کی وحشت دور ہو اور انس و سکون حاصل کریں، اولاد بھی ایسی جو سب نبی تھے۔ سیدنا اسحاق بھی نبی پھر ان کے بیٹے یعقوبؑ بھی نبی پھر انہی کی اولاد سے یعنی بنی اسرائیل میں سینکڑوں نبی پیدا ہوئے۔

[۴٦] سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی تمام مذاہب میں یکساں مقبولیت:۔ تمام مذاہب و ملل ان کی تعظیم و توصیف کرتے ہیں اور انہیں سے اپنے اپنے مذہب کا رشتہ جوڑتے ہیں اور انہیں ذکر خیر سے یاد کرتے ہیں۔ جیسا کہ امت محمدیہ بھی ہمیشہ اپنی نمازوں میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کی آل پر درود پڑھتے ہیں تو ساتھ ہی سیدنا ابراہیمؑ اور ان کی آل پر بھی درود پڑھتے ہیں۔ فی الحقیقت یہ سیدنا ابراہیمؑ کی دعا ﴿واجعل لی لسان صدق فی الاخرین﴾ (۲٦:۸۴) کی مقبولیت کا ثمرہ ہے۔

[۴۷] نبی اور رسول کا فرق:۔ سیدنا اسحاق اور یعقوبؑ کی اولاد میں سے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا ذکر غالباً اس وجہ سے کیا جارہا ہے کہ آپ اولوالعزم پیغمبر، مشرع اعظم اور قد آور شخصیت ہیں اور آپ ﷺ کو فرمایا جارہا ہے کہ آپؐ لوگوں سے ان کا ذکر کیجئے۔ آپ اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری میں انتہائی مخلص تھے۔ آپ نبی بھی تھے اور صاحب شریعت رسول بھی۔ نبی اور رسول میں فرق یہ ہے کہ نبی عام ہے، اور رسول خاص۔ یعنی ہر رسول نبی تو ہوتا ہے مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔ روایات کے مطابق رسولوں کی تعداد صرف ۳۱۳ یا ۳۱۵ تھی جبکہ انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ (نبی اور رسول کے فرق کے لئے دیکھئے سورہ مائدہ کی آیت نمبر ٦۷ کا حاشیہ)

[۴۸] سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا طور الایمن جا پہنچنا:۔ جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام سیدنا شعیب علیہ السلام کے ہاں سے فارغ ہو کر مدین سے مصر کی طرف جارہے تھے تو یہ آواز ان کی دائیں طرف سے ہوئی کیونکہ وہ طور جو بیت المقدس کے پاس ہے مدین سے مصر آنے والوں کی دائیں طرف پڑتا ہے اور وہی طور مراد ہے، سویس کا طور مراد نہیں کیونکہ وہ بائیں طرف پڑتا ہے۔

الطُّورِ الْأَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿٥٢﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ أَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿٥٣﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِسْمٰعِيْلَ ۚ إِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿٥٤﴾ وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ

راز کی گفتگو کرنے کے لئے اسے قرب[۴۹] عطا کیا۔(۵۲) اور اپنی مہربانی سے ان کے بھائی ہارون کو نبی بنا کر اسے (مدد کے طور پر)[۵۰] دے دیا۔(۵۳) نیز اس کتاب میں اسماعیل کا قصہ بیان کیجئے۔ وہ وعدے کے سچے اور[۵۱] رسول نبی تھے۔(۵۴) وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ ادا[۵۲] کرنے کا حکم دیتے تھے اور اپنے

[۴۹] سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی:۔ قربنٰہ نجیّا۔ کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم نے اسے راز کی بات کہنے کے لئے اپنے پاس بلا لیا، دوسرا یہ کہ ہم نے راز کی بات کہہ کر اسے اپنا مقرب بنا لیا اور تیسرا یہ کہ ہم نے سیدنا موسیٰ کو آسمانوں پر اٹھا لیا اور انہوں نے قلم چلنے کی آواز سنی جو لوح محفوظ پر چلتی ہے۔ سیدنا ابن عباسؓ اور تابعین کی ایک جماعت سے یہی مطلب منقول ہے۔

[۵۰] سیدنا ہارون علیہ السلام کب نبی بنے؟ سیدنا ہارون، سیدنا موسیٰ کے بھائی تھے، عمر میں تین سال بڑے تھے۔ بڑے پرہیزگار انسان تھے اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی نسبت فصیح اللسان بھی تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ کو فرعون جیسے جابر بادشاہ کے پاس جانے، اسے راہ راست کی طرف دعوت دینے اور بنی اسرائیل کی رہائی کے مطالبہ کے لئے بھیجا تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی کہ میرے بھائی ہارون کو بھی نبوت عطا فرما اور اس عظیم ذمہ داری کے کام میں اسے میرا مددگار بنا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰؑ کی دعا قبول فرما کر اور نبوت عطا کر کے انہیں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ کر دیا۔

[۵۱] سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے اوصاف و خصائل:۔ سیدنا ابراہیمؑ کے دوسرے اور بڑے بیٹے سیدنا اسماعیلؑ ذبیح اللہ تھے۔ یہ نبی تھے اور رسول بھی جبکہ سیدنا اسحاق نبی تھے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ سیدنا اسماعیلؑ عرب حجاز کے مورث اعلیٰ ہیں (تفصیل کے لئے سورۂ ابراہیم کی آیت نمبر ۳۷ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیے) آپ کو ابراہیمی شریعت دے کر بنی جرہم کی طرف مبعوث کیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ انہی کی اولاد سے ہیں آپ کا صادق الوعد ہونا مشہور تھا۔ اللہ سے یا بندوں سے جو وعدہ کیا اسے ضرور پورا کرتے تھے۔ خواہ اس وعدہ وفائی میں جان تک قربان کرنی پڑے۔ باپ سیدنا ابراہیمؑ نے اللہ کی راہ میں جان کی قربانی کے لئے کہا تو فوراً تیار ہو گئے اور وعدہ کیا کہ میں اس معاملہ میں بھی انشاء اللہ صبر کروں گا۔ چنانچہ آپ نے کمال اطاعت کا مظاہرہ کر کے یہ وعدہ بھی پورا کیا۔

[۵۲] اصلاح کا آغاز گھر سے ہونا چاہئے:۔ اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ اصلاح اور دین کی دعوت کا آغاز اپنے بعد اپنے گھر سے کرنا چاہئے پھر بتدریج اس کا حلقہ وسیع کرتے جانا چاہئے۔ اور یہی سب پیغمبروں اور سلف صالحین کا دستور رہا ہے۔ دوسری یہ کہ نماز اور زکوٰۃ ایسے اہم ارکان اسلام ہیں۔ جن کا حکم تمام انبیاء کی شریعتوں میں موجود رہا ہے۔

وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۵۶﴾ وَّرَفَعْنٰهُ
مَكَانًا عَلِيًّا ﴿۵۷﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۤ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا
مَعَ نُوْحٍ ۡ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَاۗءِيْلَ ۡ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۭ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ

پروردگار کے نزدیک ایک پسندیدہ انسان تھے۔(۵۵) نیز اس کتاب میں ادریس کا بھی ذکر کیجئے: وہ ایک راست باز[۵۳] انسان اور نبی تھے۔(۵۶) اور ہم نے انہیں بلند مقام پر اٹھالیا تھا۔(۵۷) یہ وہ انبیاء ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا تھا۔ وہ آدم کی اولاد سے اور ان لوگوں سے تھے جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں[۵۴] سوار کیا تھا اور ابراہیم اور اسرائیل کی اولاد سے تھے اور ان لوگوں سے تھے جنہیں ہم نے ہدایت عطا کی تھی اور برگزیدہ کیا تھا۔ جب انہیں اللہ تعالیٰ کی

[۵۳] سیدنا ادریس کا زمانہ اور مرکز تبلیغ:۔ سیدنا ادریسؑ سیدنا نوحؑ سے بہت پہلے مبعوث ہوئے تھے آپ کا مرکز تبلیغ بابل تھا۔ آپ کی قوم ستارہ پرست اور مظاہر پرست تھی۔ آپ علم ہندسہ، حساب اور نجوم میں ماہر تھے۔ نیز قلم سے لکھنا، کپڑا سینا، ناپ تول کے آلات اور اسلحہ کا بنانا انہی کے دور میں شروع ہوا۔ آپ بلند پایہ خطیب تھے اور ہرمس الہرامسہ کا خطاب پایا۔ آپ کی قوم نے آپ کی دعوت ماننے سے انکار کردیا اور مخالفت پر اتر آئے۔ آخر آپ ہجرت کرکے مصر چلے آئے۔ جہاں بہت سے لوگ آپ پر ایمان لے آئے۔ معراج کی رات رسول اللہ ﷺ کی آپ سے چوتھے آسمان پر ملاقات ہوئی تھی۔

[۵۴] سلسلہ نبوت کا اختصاص:۔ مذکورہ بالا انبیاء میں سے صرف سیدنا ادریسؑ ہیں جو نوح علیہ السلام سے پہلے مبعوث ہوئے لہٰذا آپ صرف اولاد آدم سے ہوئے، باقی سب انبیاء یا تو نوح علیہ السلام کی اولاد سے تھے یا ان لوگوں کی اولاد سے جو نوح علیہ السلام کے ہمراہ کشتی میں سوار ہوئے تھے اور سلسلہ نبوت یوں چلتا ہے کہ آدمؑ کی پیدائش سے پیشتر یہ سلسلہ نبوت جنوں میں تھا پھر چونکہ آدم اشرف المخلوقات تھے تو سلسلہ نبوت سیدنا آدم اور ان کی اولاد کی طرف منتقل ہوگیا۔ پھر یہ سلسلہ نوح اور اولاد نوح سے مختص ہوا پھر سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد سے، پھر اس کے بعد یہ سلسلہ اسرائیل (یعقوب) کی اولاد سے مختص ہوا۔ صرف نبی آخر الزمان سیدنا اسماعیل کی اولاد سے تھے اور ان انبیاء پر یہ انعام اس لئے ہوا کہ یہی لوگ اپنے اپنے دور کی بہترین شخصیات تھے اور ان لوگوں کا یہ حال تھا کہ جب انہیں اللہ کی آیات سنائی جاتیں تو ان کے دلوں پر رقت طاری ہوجاتی، اللہ کے انعامات کو یاد کرکر کے ان کے سر جھکے جاتے تھے۔ پھر وہ اللہ سے ہر وقت ڈرتے بھی رہتے تھے اور اللہ کی آیات سنتے تو ان کے ڈر میں مزید اضافہ ہوجاتا اور وہ روتے ہوئے اللہ کے سامنے سربسجود ہوجاتے تھے۔

علماء کا اجماع ہے کہ اس آیت پر سجدہ کرنا چاہئے تاکہ ان مقربین کے طرز عمل کو یاد کرکے ان سے ایک طرح کی مشابہت حاصل ہوجائے اور حدیث میں ہے کہ قرآن کی تلاوت کرو تو روؤ اور اگر رونا نہ آئے تو (کم از کم) رونے کی صورت بنالو،

الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُكِيًّا ۩ ﴿٥٨﴾ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا

الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿٥٩﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ

الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ﴿٦٠﴾ جَنّٰتِ عَدْنِ ِۨالَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّهٗ

آیات سنائی جاتیں تو وہ روتے ہوئے سجدہ میں گر جاتے تھے۔(۵۸) پھر ان کے بعد ان کی نالائق اولاد ان کی جانشین بنی جنہوں[۵۵] نے نماز کو ضائع کیا اور اپنی خواہشات کے پیچھے لگ گئے۔ وہ عنقریب گمراہی کے انجام[۵۵۔الف] سے دوچار ہوں گے۔(۵۹) البتہ ان میں سے جس نے توبہ کر لی، ایمان لایا[۵٦] اور اچھے عمل کئے تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ بھر بھی حق تلفی نہ ہو گی۔(٦٠) وہ جنت ایسے ہمیشہ رہنے والے باغات ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے وعدہ کر رکھا ہے اور انہیں کسی نے دیکھا نہیں۔ بلاشبہ

(شرح السنة بحواله مشكوٰة، كتاب الفتن، باب صفة النار و اهلها۔ الفصل الثانی)

[۵۵] ۞ نماز کی اہمیت اور تعلق باللہ:۔ ارکان اسلام میں سے سب سے اہم رکن نماز ہے۔ جس سے ایک مسلمان کا اللہ کے ساتھ تعلق قائم رہتا ہے۔ اگر نماز چھوڑ دی جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ سے انسان کا تعلق منقطع ہو گیا۔ اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے نماز جان بوجھ کر چھوڑی وہ کافر ہو گیا اور اسی لئے نماز کو باقاعدگی کے ساتھ ادا کرنے کی کتاب و سنت میں بار بار تاکید آئی ہے۔ حتیٰ کہ نماز نہ مریض کو معاف ہو سکتی ہے نہ سفر میں اور نہ میدان جنگ کے مختلف حالات میں' حالات کے مطابق شریعت نے رخصتیں تو دی ہیں مگر نماز کو کسی بھی حالت میں ترک نہیں کیا جا سکتا۔

نمازوں کے ضائع کرنے سے مراد صرف یہ نہیں کہ انہوں نے نماز چھوڑ دی تھی، بلکہ نماز کو جماعت سے ادا نہ کرنا۔ بروقت ادا نہ کرنا، سستی اور بے دلی سے ادا کرنا، بغیر سوچے سمجھے جلد جلد ٹھونگیں مار لینا وغیرہ وغیرہ سب باتیں نماز کو ضائع کرنے کے ضمن میں آتی ہیں۔

[۵۵۔الف] ۞ غیّ کا مفہوم:۔ اللہ سے تعلق منقطع ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان اپنی خواہشات کا پیروکار اور غلام بن جاتا ہے اور یہی کچھ شیطان چاہتا ہے اور ایسے شخص کے لئے گمراہی کی راہیں کھلتی جاتی ہیں اور بعض لوگوں نے اس کا یوں ترجمہ کیا ہے کہ عنقریب یہ لوگ غیّ میں ڈالے جائیں گے۔ حدیث میں ہے کہ غیّ دوزخ میں ایک وادی یا نالہ ہے جس میں دوزخیوں کا لہو اور پیپ بہے گا اور اس میں زانی، شراب خور، سود خور اور ماں باپ کو ستانے والے ڈالے جائیں گے۔ گویا نمازیں ضائع کرنے والے بھی اسی وادی میں ڈالے جائیں گے۔

[۵٦] ۞ نماز کا تارک ایماندار نہیں رہتا جب تک توبہ نہ کرے:۔ ان الفاظ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نمازوں کو ضائع کرنے اور اپنی خواہش کے پیچھے لگنے والا ایماندار نہیں رہتا۔ ایسے گنہگاروں میں سے بھی جو شخص اللہ کے حضور رجوع کرے، توبہ کرے، آئندہ پھر وہ کام نہ کرے بلکہ اس کے بجائے اعمال صالحہ بجا لائے، تو ایسے لوگوں کے سابقہ گناہ تو بالکل معاف کر دیئے جائیں گے۔ مگر ان کے سابقہ نیک اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور حدیث میں آیا ہے کہ جس نے توبہ کر لی وہ ایسا

كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ﴿٦١﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ۭ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿٦٢﴾

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿٦٣﴾ وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا

اس کا وعدہ پیش آ کے رہے گا۔(۶۱) اس جنت میں وہ امن اور سلامتی کی باتوں کے علاوہ کوئی بیہودہ بات[۵۷] نہ سنیں گے اور وہاں انہیں صبح و شام[۵۸] ان کا رزق ملتا رہے گا۔(۶۲) یہ ہے وہ جنت جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے اس کو بنائیں گے جو پرہیزگار رہا ہو[۵۹]۔(۶۳) اور (اے نبی!) ہم (فرشتے) آپ کے پروردگار کے حکم کے بغیر نازل[۶۰] نہیں

ہے کہ گویا اس نے وہ گناہ کیا ہی نہ تھا (ابن ماجہ، ابواب الزہد، باب ذکر التوبة)

[۵۷] ❁ لغو سے مراد:۔ بیہودہ بات سے مراد جھوٹی بات، غیبت، چغلی، تمسخر، فتنہ و فساد، یا شرارت کی بات، بے معنی بات یا گندی اور شہوانیت کی بات اور گالی گلوچ سب کچھ شامل ہے۔ گویا جنت کا معاشرہ ایسا پاکیزہ معاشرہ ہوگا کہ ان باتوں میں سے کوئی بات بھی وہاں نہ پائی جائے گی اور لفظ سلما کا ایک مطلب تو وہی ہے جو ترجمہ میں مذکور ہے۔ اور اس لفظ کا دوسرا مطلب لفظ لغو کی ضد کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ یعنی اہل جنت آپس میں ایسے پیار، محبت اور خلوص سے رہیں گے جو ہر طرح کے معاشرتی عیوب و نقائص سے پاک ہوگا۔ اور ایسے پاکیزہ معاشرہ کی قدر و قیمت صرف وہ آدمی جان سکتا ہے جو خود تو پاکیزہ خصلت ہو لیکن اسے کسی گندے معاشرے میں رہنا پڑا ہو۔

[۵۸] یعنی روحانی غذائیں بھی جیسے تسبیح و تہلیل اور ذکر و اذکار اور جسمانی بھی اور ان دونوں طرح کی غذاؤں کا ذکر کتاب و سنت میں بکثرت موجود ہے۔

[۵۹] یعنی ہمارے باپ سیدنا آدم علیہ السلام کا اصل مسکن تو جنت ہی تھا۔ لیکن اس کی وارث آدمؑ کی صرف وہ اولاد ہوگی جس نے یہ دنیا کی زندگی اللہ سے ڈر کر گزاری ہوگی اور کفر و شرک سے بچتے رہے ہوں گے۔ وراثت تو دور کی بات ہے۔ اللہ کے نافرمانوں اور مشرکوں کو جنت میں داخل بھی نہ ہونے دیا جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جنت کو ایسے لوگوں پر حرام کر دیا ہے۔

[۶۰] ❁ فرشتوں کا نزول اللہ کے حکم کے تحت:۔ اس آیتٗ کے شان نزول اور تفسیر کے لئے درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیے:

(۱) سیدنا ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جبریلؑ سے پوچھا: ''تم ہمارے پاس جیسے آیا کرتے ہو اس سے زیادہ دفعہ کیوں نہیں آتے؟'' اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ ﴿وما نتنزل الا بامر ربك......﴾ (بخاری، کتاب التفسیر، ترمذی، ابواب التفسیر)

(۲) ❁ اللہ سے کوئی بات بھولی ہوئی نہیں:۔ سیدنا ابودرداء کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جو چیز اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کر دی وہ حلال ہے اور جو حرام کی وہ حرام ہے اور جس سے سکوت اختیار کیا وہ معاف ہے۔ لہٰذا تم اللہ کی دی ہوئی معافی قبول کرو۔ کیونکہ اللہ بھولنے والا نہیں، پھر آپؐ نے یہ آیت پڑھی: ﴿وما كان ربك نسيًا﴾ (المستدرک للحاکم، سندہ صحیح ج۲ ص۳۷۵)

بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿٦٤﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ۭ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿٦٥﴾ ع وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ
لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ﴿٦٦﴾ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْـًٔا ﴿٦٧﴾ فَوَرَبِّكَ

ہوا کرتے۔ جو کچھ ہمارے سامنے ہے اور جو ہمارے پیچھے ہے اور جو ان کے درمیان ہے سب اسی کا ہے اور آپ کا پروردگار بھولنے والا نہیں ہے۔(۶۴) وہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب چیزوں کا مالک ہے لہٰذا اسی کی بندگی کیجئے اور اسی کی بندگی پر ڈٹ [۶۱] جائیے کیا آپ (کوئی اور بھی) اس کا ہم نام [۶۲] جانتے ہیں۔(۶۵)

انسان یہ کہتا ہے کہ جب میں مر جاؤں گا تو کیا پھر سے زندہ کر کے (قبر سے) نکال لایا جاؤں [۶۳] گا؟(۶۶) کیا انسان کو یہ یاد نہیں رہا کہ اس سے پہلے ہم نے اسے پیدا کیا جبکہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔(۶۷) آپ کے پروردگار کی قسم!

(۳) آپؐ نے فرمایا: ”بے شک اللہ نے کچھ فرائض مقرر کیے ہیں انہیں ضائع نہ کرو اور کچھ چیزوں سے روکا ہے، ان کی اہانت نہ کرو اور کچھ چیزوں سے تم سے درگزر کیا ہے، بھول کی بنا پر نہیں لہٰذا تم ان میں چھان پھٹک نہ کرو۔ (دار قطنی، بحوالہ الموافقات للشاطبی مترجم ج ۱ ص ۲۱۹)

ہوا یہ تھا کہ ایک دفعہ آپ ﷺ اور صحابہ کو اللہ کی طرف سے حالات کے مطابق احکام و ہدایت کی شدید ضرورت تھی۔ پھر جب کافی دیر بعد جبریل علیہ السلام متعلقہ ہدایات و احکام لے کر آئے تو بعد میں آپؐ نے جبریل علیہ السلام سے ضمناً یہ بات بھی کہہ دی۔ جس کے جواب میں جبریل علیہ السلام نے یہ وضاحت فرما دی کہ ہم کوئی بااختیار شخصیت نہیں ہیں بلکہ اللہ کے حکم کے بندے ہیں جب ہمیں حکم ملے تب ہی آسکتے ہیں اور آپ کا پروردگار سب کچھ دیکھ رہا ہے وہ بھولنے والا نہیں، بلکہ اس دیر میں بھی اس کی مصلحتیں مضمر ہوتی ہیں۔

[۶۱] اس کا ایک مطلب تو ترجمہ میں بیان ہوا ہے کہ پورے عزم و استقلال سے اس کی عبادت کرتے رہئے اور اس کے احکام بجالاتے رہئے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کرنے کی راہ میں جو مشکلات پیش آئیں انہیں صبر و استقلال اور ثابت قدمی سے برداشت کیجئے۔

[۶۲] ۞ کوئی چیز اللہ کی ہم نام نہیں:۔ یعنی اللہ کسی دوسری ہستی یا چیز کا نام نہیں۔ اللہ صرف اس ہستی کا نام ہے جو خالق و مالک ارض و سماوات ہے۔ کوئی دوسرا اس کا ہم نام نہیں اور اگر لفظ اسم کو صفت کے معنی میں لیا جائے جیسے کہ ﴿وللہ الاسماء الحسنیٰ﴾ میں لیا جاسکتا ہے اور اللہ کے جتنے اچھے اچھے نام ہیں وہ ایک دو کے سوا سب صفاتی ہی ہیں تو اس صورت میں اس کا معنی اس کا ”ہم پلہ“ یا ”ہم پایہ“ یا ”جوڑ کا“ ہوگا۔ یعنی کوئی دوسری ایسی ہستی موجود نہیں جس میں اللہ کی سی صفات پائی جاتی ہوں۔

[۶۳] یعنی وہ شیطان جن کے یہ فرمانبردار اور چیلے بنے ہوئے ہیں۔ انہیں یہ پٹی پڑھاتے رہتے ہیں۔ کہ کھاؤ، پیو اور عیش کر لو۔ کیونکہ یہ زندگی تو سب کے سامنے ہے مگر دوسری زندگی ایک موہوم خیال اور غیر یقینی ہے۔ کیونکہ جو مر گیا وہ مٹی میں مل کر مٹی ہو گیا۔ ان میں سے آج تک کوئی بھی دوبارہ زندہ ہو کر واپس نہیں آیا۔

لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿۶۸﴾ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ
اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ﴿۶۹﴾ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ﴿۷۰﴾ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا
وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿۷۱﴾ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴿۷۲﴾

ہم انہیں اور ان کے ساتھ شیطانوں کو ضرور جمع کر لائیں گے۔ پھر ان سب کو گھٹنوں کے بل جہنم کے ارد گرد حاضر کر دیں گے۔ پھر ہر گروہ میں سے ایسے لوگوں کو کھینچ نکالیں گے جو اللہ تعالیٰ کے مقابلہ پر سخت سرکش بنے ہوئے تھے۔(۶۹) پھر ہم ان لوگوں کو بھی خوب جانتے ہیں جو جہنم میں پہلے داخل ہونے کے زیادہ[۶۴] مستحق ہیں۔(۷۰) تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کا جہنم پر گزر نہ[۶۵] ہو۔ یہ ایک قطعی طے شدہ بات ہے جسے پورا کرنا آپ کے پروردگار کے ذمہ ہے۔(۷۱) پھر ہم پرہیزگاروں کو تو (جہنم سے) نجات دیں گے مگر ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے۔(۷۲)

[۶۴] یعنی ان شیطانوں میں سے بھی ان کے سرغنوں اور لیڈروں کو الگ نکال لیں گے اور انہیں سب سے پہلے جہنم رسید کریں گے اور زیادہ سزا دیں گے۔ کیونکہ انہوں نے خود گمراہ ہونے کے علاوہ دوسروں کو بھی گمراہ کیا تھا۔

[۶۵] ❁ پل صراط سے ہر ایک کو گزرنا ہے:۔ یعنی ہر شخص کو خواہ وہ مسلم ہو، کافر، نیک ہو یا بد ایک دفعہ ضرور جہنم کے کنارے لا کھڑا کیا جائے گا اور یہ اللہ کی طرف سے ایسی طے شدہ بات ہے جس کا کبھی خلاف نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ درج ذیل احادیث سے واضح ہے:

(۱) "سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سب لوگ دوزخ پر پہنچیں گے پھر اپنے اپنے اعمال کے لحاظ سے واپس ہوں گے۔ پہلا گروہ تو بجلی کی چمک کی طرح نکل جائے گا، دوسرا ہوا کی طرح، تیسرا گھڑ سوار کی طرح، چوتھا اونٹ کی طرح، پانچواں دوڑنے والے کی طرح اور چھٹا جیسے آدمی پیدل چلتا ہو" (ترمذی، ابواب التفسیر)

(۲) "اور سیدنا ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! یہ پل صراط کیا چیز ہے؟" آپؐ نے فرمایا: وہ ایک پل ہے جسے جہنم کی پشت پر رکھیں گے۔ یہ پل پھلوان کے گرنے کا مقام ہے۔ اس پر سنسیاں ہیں۔ آنکڑے ہیں، چوڑے چوڑے کانٹے ہیں، ان کا سر خم دار سعدان کے کانٹوں کی طرح ہوگا جو نجد کے ملک میں ہوتے ہیں۔ مسلمان اس پر سے پلک جھپکنے کی طرح، بجلی کی طرح، آندھی کی طرح، تیز گھوڑوں کی طرح اور سانڈنیوں کی طرح گزر جائیں گے۔ بعض صحیح و سلامت وہاں سے بچ کر نکل جائیں گے اور کچھ زخمی ہو کر اور چھل چھلا کر اور بعض دوزخ میں گر پڑیں گے۔ آخری شخص جو پل صراط سے پار ہوگا اسے کھینچ کھینچ کر پار کریں گے۔ پھر جو لوگ خود نجات پا جائیں گے وہ ان دوزخ میں گرے ہوئے مسلمانوں کے لئے اللہ سے مطالبہ اور تقاضا کرنے لگیں گے حتیٰ کہ جس کے دل میں رائی بھر بھی ایمان ہوگا اللہ اسے دوزخ سے نکال لے گا۔ بشرطیکہ اس نے اللہ سے شرک نہ کیا ہو۔ (بخاری، کتاب التوحید، باب وجوہ یومئذ ناضرۃ.......... طویل حدیث سے اقتباس)

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَيُّ الْفَرِيقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَ
أَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿٧٣﴾ وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّن قَرْنٍ هُمْ أَحْسَنُ أَثَاثًا وَرِئْيًا ﴿٧٤﴾ قُلْ مَن كَانَ فِي
الضَّلَالَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمَٰنُ مَدًّا ۚ حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ إِمَّا الْعَذَابَ وَإِمَّا السَّاعَةَ
فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضْعَفُ جُندًا ﴿٧٥﴾ وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى ۗ وَ

اور جب ان پر ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو کافر ایمان والوں سے کہتے ہیں کہ: بتاؤ ہم دونوں گروہوں میں سے کس کی حالت بہتر ہے اور کس کی مجلس اچھی ہے۔(٧٣) حالانکہ ہم ان سے پہلے کئی ایسی قومیں ہلاک کر چکے ہیں جو سازوسامان اور ظاہری[٦٦] شان و شوکت کے لحاظ سے ان سے بہتر تھیں۔(٧٤) آپ ان سے کہئے کہ: جو شخص گمراہی میں پڑا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے ایک مدت تک ڈھیل دیتے جاتے ہیں تا آنکہ یہ لوگ وہ کچھ دیکھ لیتے ہیں جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے، خواہ یہ عذاب الٰہی ہو یا قیامت ہو، اس وقت انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس کا حال[٦٧] برا ہے اور کس کا جتھا کمزور ہے۔(٧٥) اور جو لوگ راہ راست پر چلتے ہیں اللہ انہیں مزید

❁ ورود سے مراد دخول نہیں:۔ بعض روایات میں وارد کے معنی دخول لئے گئے ہیں یعنی ہر شخص کو کم از کم ایک دفعہ ضرور جہنم میں داخل ہونا ہوگا۔ یہ بات درست نہیں۔ ایک تو ایسی روایات سنداً ناقابل اعتماد ہیں۔ دوسرے خود قرآن کریم اور بہت سی صحیح احادیث کے خلاف ہیں اور تیسرے لغوی لحاظ سے بھی یہ مفہوم غلط ہے۔ ورود کا معنی کسی جگہ پر جا پہنچنا ہے۔ اس میں داخل ہونا نہیں۔ (اسی سورہ کا حاشیہ نمبر ٧٧ ملاحظہ فرمایئے)

[٦٦] ❁ مال و دولت کے پیمانوں سے دوسروں کی قدر و قیمت متعین کرنا۔ مال و دولت کی فراوانی اللہ کی رضا کی دلیل نہیں:۔ یوم آخرت کا انکار کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے کسی مقام پر تو کافر قرار دیا ہے اور کسی پر مشرک، مشرکین مکہ بھی آخرت کے منکر تھے۔ اس قسم کے منکروں اور دنیا دار لوگوں کا عمومی نظریہ یہی رہا ہے کہ اس دنیا میں مال و دولت کا مہیا ہونا اللہ تعالیٰ کی مہربانی کی دلیل ہے اور اسی مال و دولت اور جاہ کے پیمانوں سے لوگوں کی قیمت کا اندازہ لگاتے ہیں۔ اپنا بھی اور دوسروں کا بھی۔ مشرکین مکہ کا بھی یہی انداز فکر تھا۔ انہیں جب ان کے انجام سے مطلع کیا جاتا تو ان کا یہ جواب ہوتا تھا کہ ہمارے مکانات، فرنیچر، طرز بود و باش اور ہماری مجالس تم لوگوں سے بہتر نہیں؟ اور اگر ہم باطل پر ہوتے جیسا کہ تم ہمیں کہتے ہو تو ہم تم سے ہر لحاظ سے بہتر کیسے ہو سکتے تھے؟ ان لوگوں کے اس نظریہ کو رد کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ معیار ہی غلط ہے۔ اس لئے کہ جو قومیں تم سے پہلے ہم نے تباہ کی ہیں وہ تم سے شان و شوکت اور سازوسامان غرض ہر لحاظ سے بہتر تھیں اور ان پر عذاب الٰہی کا نزول ہی اس بات کی دلیل ہے کہ سازوسامان کی بہتری کے باوجود اللہ تعالیٰ ان سے ناراض تھے۔

[٦٧] ❁ انعامات کی فراوانی سے آزمائش:۔ اسکے بجائے اصل صورت حال یہ ہوتی ہے کہ جو لوگ دنیا کے سازوسامان میں دل لگا کر اس کی دلفریبیوں پر ریجھ گئے ہوں اللہ تعالیٰ ان پر مزید انعامات کی بارش کئے جاتے ہیں اور اس انداز سے ان کی

الْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَیْرٌ مَّرَدًّا ﴿۷۶﴾ اَفَرَءَیْتَ الَّذِیْ كَفَرَ بِاٰیٰتِنَا وَ
قَالَ لَاُوْتَیَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۷۷﴾ اَطَّلَعَ الْغَیْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۷۸﴾ كَلَّا سَنَكْتُبُ مَا

ہدایت[٦٨] عطا کرتے ہیں اور باقی رہنے والی نیکیاں ہی آپ کے پروردگار کے نزدیک ثواب[٦٩] اور انجام کے لحاظ سے بہتر ہیں۔(٧٦) بھلا آپ نے اس شخص کی حالت[٧٠] پر بھی غور کیا جو ہماری آیات کا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے مال اور اولاد ضرور دیا جائے گا؟(٧٧) کیا اسے غیب کا پتہ چل گیا ہے یا اس نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد لے رکھا[٧١] ہے؟(٧٨) ایسا ہرگز نہیں ہوگا جو کچھ یہ کہہ رہا ہے

آزمائش کرتے ہیں۔ پھر اس کی بھی ایک حد مقرر ہوتی ہے۔ اگر اس عرصہ میں وہ اللہ کی طرف رجوع کرلیں اور دین حق کی طرف لوٹ آئیں تو فبہا ورنہ انہیں عذاب سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور ایسا عذاب دنیا میں بھی آسکتا ہے جیسا کہ سابقہ اقوام پر آچکا ہے اور اگر دنیا میں بچ جائیں تو قیامت کو تو ضرور انہیں اس سے سابقہ پڑنے والا ہے۔ اس وقت انہیں قدر عافیت معلوم ہوجائے گی اور یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ حقیقتاً خوشحالی کس فریق کا مقدر ہے اور سوسائٹی کے لحاظ سے کون بہتر ہے۔؟

[٦٨] <u>ہر واقعہ مومن کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے:</u>۔ کافروں کی تو خوشحالی سے آزمائش ہوتی ہے اور ہر نعمت اور خوشحالی کے موقعہ پر ان کی گمراہی میں مزید اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس مومنوں کے لئے ہر آزمائش مزید ہدایت کا سبب بن جاتی ہے۔ کوئی بھلائی اور نعمت ملے تو اللہ کا شکر بجالاتے ہیں اور دکھ پہنچے تو صبر واستقلال کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ غرض ہر حال میں وہ صابر وشاکر رہتے ہیں اور ہر نیا واقعہ وہ جیسا بھی ہو، ان کی مزید ہدایت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

[٦٩] اس کی تشریح کے لئے سورہ کہف کی آیت نمبر ٤٦ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیے۔

[٧٠] <u>خباب بن ارت ؓ کی مزدوری آخرت کو دینے والا:</u>۔ اس آیت کا روئے سخن ایک قریشی سردار عاص بن وائل سہمی سے ہے۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

”سیدنا خباب بن ارت کہتے ہیں کہ میں مکہ میں لوہار کا پیشہ کیا کرتا تھا۔ میں نے عاص بن وائل سہمی کے لئے ایک تلوار بنائی۔ میں اس کی مزدوری مانگنے کے لئے عاص کے پاس گیا وہ کہنے لگا۔ میں اس وقت تک تجھے مزدوری نہیں دوں گا۔ جب تک تو محمد (ﷺ) سے پھر نہ جائے۔ میں نے کہا ”جب اللہ تجھے موت دے گا پھر تجھے زندہ کرے گا، میں تو اس وقت تک بھی محمد ﷺ کا انکار نہیں کروں گا“۔ وہ کہنے لگا: ”اچھا اگر اللہ مجھے مرنے کے بعد زندہ کرے گا تو پھر مجھے مال اور اولاد بھی دے گا (اس وقت میں تمہارا احساب چکادوں گا) اس وقت اللہ نے یہ آیات نازل فرمائیں‘ (بخاری، کتاب التفسیر، ترمذی، ابواب التفسیر)

اسی عاص بن وائل کے بیٹے سیدنا عمرو بن عاص ؓ ہیں۔ جب یہ ابھی اسلام نہیں لائے تھے تو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی واپسی کا مطالبہ کرنے والے قریشی وفد کے نمائندے تھے۔ پھر جب اسلام لائے تو اسلام کی بیش بہا خدمات سرانجام دی تھیں۔

يَقُولُ وَنَمُدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿٧٩﴾ وَنَرِثُهُ مَا يَقُولُ وَيَأْتِينَا فَرْدًا ﴿٨٠﴾ وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ
اللَّهِ آلِهَةً لِيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا ﴿٨١﴾ كَلَّا سَيَكْفُرُونَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿٨٢﴾ أَلَمْ تَرَ
أَنَّا أَرْسَلْنَا الشَّيَاطِينَ عَلَى الْكَافِرِينَ تَؤُزُّهُمْ أَزًّا ﴿٨٣﴾ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ إِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿٨٤﴾ يَوْمَ نَحْشُرُ

ع ۷

ہم [۷۲]اسے لکھ لیں گے اور اس کے عذاب میں مزید اضافہ کریں گے۔(۷۹)

اور جن باتوں کے متعلق یہ کہہ رہا ہے (مال اور اولاد) ان کے وارث[۷۳] تو ہم ہوں گے اور یہ اکیلا ہی ہمارے پاس آئے گا۔(۸۰) نیز ان لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود بنا رکھے ہیں تاکہ وہ ان کے مددگار[۷۴] بنیں۔(۸۱) ایسا ہرگز نہ ہوگا وہ معبود تو ان کی عبادت[۷۵] سے ہی انکار کر دیں گے بلکہ الٹا ان کے مخالف بن جائیں گے۔(۸۲) آپ دیکھتے نہیں کہ ہم نے کافروں پر شیطان چھوڑ رکھے ہیں جو انہیں ہر وقت (مخالفتِ حق پر) اکساتے رہتے ہیں۔(۸۳) سو آپ ان پر (نزولِ عذاب کے لئے) جلدی نہ کیجئے۔ ہم ان کی گنتی (کے دن) شمار کر رہے ہیں[۷۶]۔(۸۴)

[۷۱] یعنی کیا اسے غیب کے حالات پر، جو دوسری زندگی میں پیش آنے والے ہیں۔ یہ اطلاع ہو گئی ہے کہ واقعی اسے اس دوسرے عالم میں بھی ایسے ہی مال و دولت ملے گا۔ جیسا اس دنیا میں اس کے پاس موجود ہے یا اس نے اللہ تعالیٰ سے کوئی وعدہ لے رکھا ہے کہ وہ اسے دوسرے عالم میں ضرور مال و دولت عطا کرے گا اور وہاں وہ اپنے قرض خواہ کا حساب بے باق کر سکے گا۔

[۷۲] یعنی اس کے نامۂ اعمال میں اس کا یہ غرور کا کلمہ بھی ضرور درج کر لیا جائے گا اور اس کے گناہوں کی سزا پر اس کی اس جسارت کے گناہ کا مزید اضافہ کیا جائے گا۔

[۷۳] یعنی جس مال و دولت کی یہ اب بات کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ یہیں دنیا میں ہی دھرا رہ جائے گا اور بالآخر یہ سب کچھ ہماری ہی ملکیت میں آ جائے گا اور یہ شخص بالکل خالی ہاتھ ہمارے پاس حاضر ہوگا۔ البتہ اس کے گستاخانہ کلمات اور بدکرداریاں ضرور اس کے ساتھ آئیں گی۔ جن کی اسے قرار واقعی سزا ملے گی۔

[۷۴] ۞ عز کا لغوی مفہوم:۔ لفظ عز کا معنی یہ ہے کہ ان کے معبود ان کے لئے سبب عزت بن جائیں گے اور عزت سے مراد عربی زبان میں کسی شخص کا ایسا طاقتور اور بالادست ہونا ہے جس پر کوئی ہاتھ نہ ڈال سکے۔ (ضد ذلت) اور ان کے معبودوں کا ان کے لئے سبب عزت ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ ان کی حمایت پر ہوں گے جس کی وجہ سے ان کا کوئی مخالف ان پر ہاتھ نہ ڈال سکے گا۔

[۷۵] یعنی وہ کہہ دیں گے کہ ہم نے ان سے کب کہا تھا کہ وہ ہماری عبادت کیا کریں۔ نیز ہمیں تو آج تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ ہماری عبادت کرتے بھی رہے ہیں یا نہیں؟

[۷۶] جو لوگ شیطان کے فریب میں آ جاتے ہیں تو پھر شیطان انہیں اپنی انگلیوں پر نچاتے رہتے ہیں۔ اس طرح ان کی گمراہی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے وہ جو کام کرتے ہیں سرکشی اور نافرمانی کا ہی کرتے ہیں اور ہم یہ سب کچھ ان کے نامۂ اعمال میں محفوظ کرتے جا رہے ہیں۔ لہذا آپ ان کے بارے میں جلدی نہ کریں اور اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے دن

الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿٨٥﴾ وَّنَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ إِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿٨٦﴾ لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ
إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿٨٧﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿٨٨﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ﴿٨٩﴾ تَكَادُ
السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿٩٠﴾ أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿٩١﴾ وَمَا يَنْبَغِي

وقف لازم

جس دن ہم پرہیزگاروں کو اکٹھا کریں گے کہ وہ رحمٰن کے مہمان بنیں۔(۸۵) اور مجرموں کو پیاسے[۷۷] (جانوروں کی طرح) جہنم کی طرف ہانک لے جائیں گے۔(۸۶) اس دن کوئی بھی کسی کی سفارش نہ کرسکے گا، مگر جس نے اللہ تعالیٰ سے عہد[۷۸] لیا ہو۔(۸۷) اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ رحمٰن کی اولاد ہے۔(۸۸) یہ تو اتنی بُری بات تم گھڑ لائے ہو۔(۸۹) جس سے ابھی آسمان پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ دھڑام سے گر پڑیں۔(۹۰) اس بات پر انہوں نے رحمٰن کے لئے اولاد کا[۷۹] دعویٰ کیا (۹۱) حالانکہ رحمٰن

گنے جاچکے ہیں۔ لہٰذا آپ ان پر عذاب کے لئے جلدی نہ کریں جتنے ان کی مہلت کے دن باقی ہیں وہ پورے ہو لینے دیں۔

[۷۷] ❁ وِرد کے معنی:۔ وِرد کے معنی کسی شخص کا پانی پینے یا پانی لینے کے لئے پانی کی جگہ، گھاٹ، کنویں یا چشمے پر جانا ہے (اور اس کی ضد صَدَر ہے یعنی پانی لے کر یا پانی سے سیراب ہو کر واپس جانا) اور ورد کے معنی گھاٹ بھی ہے اور پیاسا بھی جسے پانی کی تلاش ہو اور یہ پیاسے مجرم چاہتے تو یہ ہوں گے کہ کسی طرح پانی کے گھاٹ پر پہنچیں اور پانی کی جستجو کرتے کرتے وہ جا پہنچیں گے جہنم پر۔ دوسری راہ انہیں کوئی نظر ہی نہ آئے گی۔

[۷۸] ❁ سفارش کی کڑی شرائط:۔ اس ذو معنی جملہ کے دو مطلب ہیں۔ ایک تو سفارش صرف اس شخص کے حق میں کی جاسکے گی جس نے اپنے آپ کو مستحق شفاعت بنائے رکھا ہو۔ ایسے لوگوں کے لئے اللہ کا عہد ہے کہ ان کے حق میں سفارش قبول کی جائے گی اور یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے کبھی شرک نہ کیا ہوگا۔ اللہ کے فرمانبردار ہوں گے مگر کبھی کبھی ان سے گناہ بھی سرزد ہوگئے ہوں گے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ سفارش صرف وہ لوگ کرسکیں گے جنہیں اللہ تعالیٰ سفارش کرنے کی اجازت دیں گے اور یہی اللہ کا عہد ہے۔ ان لوگوں کو سفارش کرنے کی ہرگز اجازت نہیں ہوگی جن سے مشرکوں نے اپنی توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔

[۷۹] یہود کے نزدیک عزیرؑ اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں۔ مشرکین مکہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے اور دوسرے مشرکین کے دیوتا اور دیویاں سب اللہ کے بیٹے اور بیٹیاں یا ان کی اولاد ہے۔ گویا ان لوگوں نے اللہ کی نسل ہی چلادی۔ اللہ تعالیٰ کے حق میں یہ اس قدر گستاخانہ بات ہے کہ اگر آسمان زمین اور پہاڑ وغیرہ ہول کے مارے پھٹ پڑیں اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں تو کچھ عجب نہیں۔ اس گستاخی پر اگر اللہ کا غضب بھڑک اٹھے اور زمین و آسمان کے پرخچے اڑ جائیں۔ نظام عالم تباہ و برباد ہو جائے تو سب کچھ ممکن ہے۔ یہ تو محض اس کا حلم ہے جو ایسی بیہودہ بات سن کر بھی دنیا کو یکدم تباہ نہیں کر رہا۔ چنانچہ سیدنا ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (گویا یہ حدیث قدسی ہے) کہ ابن آدم نے مجھے جھٹلایا اور اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے اور ابن آدم نے مجھے گالی دی اور اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔

لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿۹۳﴾ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿۹۴﴾ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿۹۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا

کے شایان شان[۸۰] نہیں کہ وہ کسی کو اولاد بنائے۔(۹۲)

آسمان اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ سب رحمٰن کے حضور غلام[۸۱] بن کر آئیں گے۔(۹۳) رحمٰن نے ان سب چیزوں کا ریکارڈ رکھا ہے اور ان کی پوری گنتی کر رکھی ہے۔(۹۴) یہ سب قیامت کے دن اس کے حضور تن تنہا حاضر ہوں گے۔(۹۵) یقیناً جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اچھے کام کر رہے ہیں، عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے لئے (لوگوں کے دلوں میں) محبت[۸۲] پیدا کر دیں گے۔(۹۶) پس (اے نبی) ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان میں آسان بنا دیا ہے تاکہ آپ اس سے پرہیزگاروں کو بشارت دیں اور

اس کا جھٹلانا تو یہ ہے کہ وہ یہ کہتا ہے کہ میں اسے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا۔ گالی دینا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ میری اولاد ہے حالانکہ میں اس سے پاک ہوں کہ کسی کو بیوی یا بچہ بناؤں" (بخاری، کتاب التفسیر، سورہ مریم، زیر آیت متعلقہ، نیز سورہ اخلاص)

[۸۰] اللہ کی اولاد قرار دینا اللہ کو گالی دینے کے مترادف ہے:۔ شایاں اس لئے نہیں کہ اولاد باپ کی نہ مخلوق ہوتی ہے نہ مملوک بلکہ اس کی شریک اور ہم جنس ہوتی ہے۔ اور اللہ ایسے تمام نقائص سے مبرا ہے نہ اس کا کوئی ہم جنس ہے نہ شریک۔ سب اسی کی مخلوق، مملوک اور اس کے عاجز بندے اور غلام ہیں۔ علاوہ ازیں اسے اولاد کی ضرورت بھی نہیں۔ اولاد سے جو جو مفادات وابستہ ہوتے ہیں ان میں سے کسی ایک کی بھی اسے احتیاج نہیں۔

[۸۱] یعنی جو غلام یا بندہ ہو وہ بیٹا نہیں ہو سکتا اور جو بیٹا ہو وہ اس کا بندہ اور غلام نہیں ہو سکتا۔ اب جس ہستی کے پہلے ہی سب غلام و محتاج ہوں اس کو اولاد کی ضرورت بھی کیا ہے؟ اور وہ اس کی اولاد بن کیسے سکتے ہیں؟

[۸۲] انبیاء اور صالحین سے لوگ محبت اور بدکرداروں سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟:۔ یہ آیت اس دور میں نازل ہوئی جب صحابہ کرامؓ مجبور و مقہور تھے۔ قریشی سرداروں کے ہاتھوں ستم رسیدہ تھے اور ان کی نگاہوں میں حقیر تھے۔ اس آیت میں ان کے لئے ایک بہت بڑی خوشخبری بھی ہے اور پیشین گوئی بھی پھر ایک وقت آیا جب صحابہ کرامؓ کو اللہ تعالیٰ نے وہ عزت عطا فرمائی کہ سارا جہان ان سے محبت رکھنے اور ان کے گن گانے لگا۔ آج تک یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔ یہ بات صرف صحابہ کرامؓ سے ہی مخصوص نہیں بلکہ جو بھی ایماندار اعمال صالحہ بجالائے گا۔ ابتداءً خواہ لوگ اس کی طرف متوجہ نہ ہوں یا اسے اس راہ میں تکلیفیں بھی پہنچیں لیکن جلد ہی اللہ تعالیٰ انہیں عزت بخشیں گے اور لوگوں میں ان کی مقبولیت اور محبت پیدا ہو جائے گی۔ اس کے برعکس بے ایمان اور بدکردار لوگوں کی خواہ ابتدا میں کتنی ہی عزت ہو لیکن وہ بالآخر لوگوں کی نظروں سے گر

لُدًّا ﴿٩٧﴾ وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ۖ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ أَحَدٍ أَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿٩٨﴾ ع

کج بحثی [۸۳] کرنے والوں کو ڈرائیں۔(۹۷) ہم ان سے پہلے کئی قومیں ہلاک کر چکے ہیں۔ کیا آپ ان میں سے کسی کا نشان پاتے ہیں یا ان میں سے کسی کی بھنک بھی آپ کو سنائی دیتی ہے؟(۹۸)

جاتے ہیں۔ اور لوگ ان سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ یہ سب کچھ کیسے اور کیوں ہوتا ہے اس کی تفسیر درج ذیل حدیث میں ملاحظہ فرمائیے:

"سیدنا ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو جبریل کو پکار کر کہتے ہیں کہ میں فلاں بندے سے محبت رکھتا ہوں تم بھی اس سے محبت رکھو۔ پھر جبریلؑ آسمان میں پکارتے ہیں۔ پھر اہل زمین میں اس کی محبت نازل کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا یہی مطلب ہے اور جب اللہ کسی بندے سے ناراض ہو جاتے ہیں تو جبریلؑ سے کہتے ہیں: میں فلاں بندے سے ناراض ہوں تم بھی اس سے ناراض ہو جاؤ۔ پھر یہی بغض اس کے لئے اہل زمین میں نازل کیا جاتا ہے" (ترمذی، ابواب التفسیر)

[۸۳] قوما لدًا سے مراد ہٹ دھرم، جھگڑالو اور کج بحثی کرنے والے قریشی سردار ہیں۔ جو ہر بات میں مین میخ نکالنے کے عادی تھے۔ انہیں ہی یہ تنبیہ کی جا رہی ہے کہ تمہارے جیسی بہت سی اقوام کو ہم نے یوں تہس نہس کر دیا کہ ان کا نام و نشان تک صفحۂ ہستی سے مٹ چکا ہے۔ اور ان کی شیخیوں، گستاخیوں اور لن ترانیوں کی آج بھنک تک سنائی نہیں دیتی۔

۱۳۵ آیاتھا سُوْرَةُ طٰهٰ مَكِّيَّةٌ رکوعھا ۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰهٰ ۝١ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝٢ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝٣ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۝٤ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝٥ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي

کلمات ۱۳۵۱ آیت ۱۳۵ (۲۰) سورہ طٰہٰ مکی [۱] ہے (۴۵) رکوع ۸ حروف ۵۴۶۶

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

طٰہٰ (۱) ہم نے آپ پر یہ قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت [۲] میں پڑ جائیں (۲) یہ تو ہر اس شخص کے لئے نصیحت ہے جو (اللہ سے) ڈرتا ہے (۳) یہ اس ذات کی طرف سے نازل ہوا جس نے زمین اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا۔ (۴) رحمٰن نے اپنے عرش پر قرار [۳] پکڑا ہے (۵) جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور جو کچھ زمین میں ہے اور

[۱] یہ سورت سورۂ مریم کے بعد بلکہ ہجرتِ حبشہ کے بعد نازل ہوئی تھی اور ہجرت حبشہ ۵ نبوی میں ہوئی تھی۔ نیز یہ سورۃ سیدنا عمرؓ کے اسلام لانے سے پہلے نازل ہوئی تھی، عام روایت کے مطابق یہی سورت سن کر سیدنا عمرؓ کے دل میں اسلام جاگزیں ہوا تھا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ۶ نبوی میں اسلام لائے تھے۔

[۲] ❁ قرآن اتنا ہی پڑھنا چاہئے جتنا دل کی خوشی سے پڑھا جائے:۔ یعنی یہ قرآن اس لئے نہیں اتارا گیا کہ آپ لوگوں کی ہدایت کے سلسلہ میں سارے جہان کا دردسر مول لے لیں۔ آپ کا کام صرف یہ ہے کہ اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچا دیں۔ پھر جس کسی کے دل میں کچھ بھی اللہ تعالیٰ کا خوف ہوگا۔ وہ ضرور اس قرآن کی ہدایت کو قبول کرے گا اور یہ اس کے لئے یاددہانی کا کام دے گا اور جو لوگ اللہ سے بے خوف ہو چکے ہیں وہ اگر اس کی ہدایت کو قبول نہیں کرتے تو آپ کو اس بارے میں پریشان نہ ہونا چاہئے اور نہ ان کے غم میں اپنے آپ کو ہلکان کر دینا چاہئے۔ قرآن کے نزول کا مقصد آپ کو مشقت میں ڈالنا ہرگز نہیں۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ ان دنوں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ رات کو کھڑے ہو کر بہت زیادہ قرآن پڑھا کرتے تھے۔ آپ کی اس محنت اور ریاضت کو دیکھ کر کافر کہتے تھے کہ قرآن کیا اترا ہے بے چارے محمد (ﷺ) مصیبت میں پڑ گئے۔ اس وقت یہ آیت اتری۔ اور کافروں کی بات کا جواب بھی دیا گیا کہ اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے یہ مصیبت نہیں، بلکہ نصیحت اور یاددہانی ہے۔ رحمت ہے نور ہے۔ اور جو شخص جس قدر قرآن شوق اور نشاط سے پڑھنا چاہے اتنا ہی پڑھ لے۔ اگر کوئی زیادہ پڑھتا ہے تو وہ اپنی رضا و رغبت سے پڑھتا ہے محنت اور مشقت سمجھ کر نہیں پڑھتا۔

[۳] استوٰی علی العرش کا بیان سورۂ اعراف آیت نمبر ۵۴ کے حاشیہ میں گزر چکا ہے۔ عرشِ الٰہی کے متعلق جو کچھ نصوص سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پائے ہیں۔ جنہیں خاص فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور بالخصوص قیامت کے دن آٹھ فرشتے اسے اٹھائے ہوئے ہوں گے اور یہ عرش سب آسمانوں کے اوپر ہے اور انہیں قبہ کی طرح گھیرے ہوئے ہے۔

الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ﴿٦﴾ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ﴿٧﴾ اَللّٰهُ
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ﴿٨﴾ وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ﴿٩﴾ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ

جو کچھ ان دونوں کے درمیان [۴] ہے اور جو کچھ زمین کی انتہائی گہرائی [۵] میں ہے ان سب چیزوں کا وہی مالک ہے (۶)
اگر آپ بلند آواز سے بات کرتے [۶] ہیں تو وہ تو چپکے سے کہی ہوئی بات بلکہ اس سے بھی خفی تر بات کو جانتا ہے۔ (۷)
اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اس کے سارے ہی نام [۷] اچھے ہیں (۸)
اور کیا آپ کو [۸] موسیٰ کی خبر بھی پہنچی ہے؟ (۹) جب اس نے آگ دیکھی تو اپنے گھر

[۴] زمین اور آسمان کے درمیان کیا کچھ ہے؟:۔ زمین و آسمان کے درمیان بھی اللہ کی بے شمار مخلوق موجود ہے۔ مثلاً ہوا، بادل، اڑنے والے پرندے اور ہوائی جہاز، آسمان سے زمین کی طرف اترنے والے فرشتے اور زمین سے آسمان کی طرف پرواز کرنے والے فرشتے، بدروحیں، فضا میں ہر وقت گردش کرنے والے سیارے، ٹوٹنے والے ستارے یہ چیزیں تو وہ ہیں جن کا ہمیں کسی نہ کسی طرح علم ہے۔ اور جو انسان کے علم میں نہیں آئیں ان کی تعداد اور ان کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

[۵] اللہ کی مخلوق کہاں کہاں ہے؟ ثریٰ کے لغوی معنی صرف گیلی مٹی ہے جو زمین کی تہوں میں ہے۔ اور یہ لفظ عموماً ثریا (کہکشاں) کے مقابلہ میں آتا ہے۔ ثریا سے مراد انتہائی بلندی اور ثریٰ سے مراد انتہائی پستی یا گہرائی لی جاتی ہے۔ گویا چار چیزیں یہاں مذکور ہوئیں۔ ایک آسمان اور ان میں رہنے والی مخلوق، دوسرے زمین اور اس پر رہنے والی مخلوق تیسرے آسمانوں اور زمین کے درمیان کی مخلوق اور چوتھے زمین کا اندرونی حصہ اور وہاں کی موجود مخلوق۔ ہر طرح کی مخلوق کا خالق و مالک اللہ ہی ہے اور وہ سب اسی کے قبضہ قدرت و اختیار میں ہیں۔

[۶] اخفیٰ اور سرّ کا لغوی فرق:۔ اخفی کا لفظ سرّ سے زیادہ ابلغ ہے۔ سرّ کا معنی پوشیدہ یا راز کی بات ہے۔ جو آپ کسی دوسرے سے کہہ دیں اور اسے تاکید کر دیں کہ وہ اور کسی کو نہ بتائے۔ اور اخفیٰ سے مراد وہ بات یا وہ خیال ہے جو کسی کے دل میں آئے لیکن وہ کسی سے بھی اس کا ذکر تک نہ کرے۔ اس سے پہلی آیت میں اللہ کی وسعت قدرت و تصرف اور اختیار بیان کیا گیا تھا۔ اس آیت میں لامحدود وسعت علم کا بیان ہوا ہے۔ یعنی قریش کو بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تمہاری سب سازشوں، شرارتوں اور کارستانیوں سے پوری طرح واقف ہیں۔

[۷] اسماء الحسنیٰ:۔ اسماء سے مراد نام ہیں۔ اور احادیث صحیحہ میں ننانوے نام مذکور ہیں۔ جبکہ کتاب و سنت کا استقصاء کرنے پر کئی اور نام بھی ملتے ہیں۔ اور اسماء سے مراد صفات بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے یہ سب نام اللہ تعالیٰ کی صفات ہی کا اظہار کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ سب صفاتی نام ہیں۔ مگر ان میں سے دو نام ایسے ہیں جو صرف اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، کسی دوسری مخلوق کے یہ نام نہیں ہو سکتے۔ ایک اللہ اور دوسرا رحمٰن۔

[۸] قرآن کے انداز بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قدر تفصیل کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کا قصہ پہلی بار اسی سورہ میں بیان ہوا ہے اور قرآن کے مخصوص طرزِ بیان کی بنا پر اس میں قریش کے کئی اعتراضات کے جواب از خود آ گئے ہیں جو وہ وقتاً فوقتاً

لِاَهۡلِهِ امۡكُثُوۡۤا اِنِّیۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا لَّعَلِّیۡۤ اٰتِیۡكُمۡ مِّنۡهَا بِقَبَسٍ اَوۡ اَجِدُ عَلَی النَّارِ هُدًی ﴿۱۰﴾ فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوۡدِیَ یٰمُوۡسٰی ﴿ؕ۱۱﴾ اِنِّیۡۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخۡلَعۡ نَعۡلَیۡكَ ۚ اِنَّكَ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًی ﴿ؕ۱۲﴾ وَ اَنَا اخۡتَرۡتُكَ فَاسۡتَمِعۡ لِمَا یُوۡحٰی ﴿۱۳﴾ اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ

والوں[۹] سے کہا: ٹھہرو! مجھے آگ نظر آئی ہے۔ شاید میں وہاں سے آپ کے لئے کوئی انگارا لاسکوں یا مجھے وہاں سے راستہ کا ہی پتہ چل جائے۔(۱۰) جب وہ وہاں پہنچے تو انہیں آواز آئی، موسیٰ میں تمہارا پروردگار ہوں۔ اس وقت تم طویٰ کے مقدس میدان میں ہو۔ لہٰذا جوتے اتار لو(۱۲) اور میں نے تمہیں (نبوت کے لئے) چن لیا ہے لہٰذا جو وحی کی جاتی ہے اسے غور سے[۱۰] سنو(۱۳) بلاشبہ میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی الٰہ نہیں لہٰذا میری ہی عبادت کرو اور میری یاد کے

کرتے رہتے تھے۔

[۹] سیدنا موسیٰ کا آگ لینے کے لئے جانا:۔ اس قصہ کا آغاز اس وقت سے کیا جا رہا ہے جب موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا کی گئی تھی۔ آٹھ دس سال آپ مدین میں شعیب علیہ السلام کے پاس رہے وہاں آپ کا نکاح شعیب علیہ السلام کی بیٹی سے ہوا تھا۔ طے شدہ مدت گزارنے کے بعد آپ کو خیال آیا کہ اب اپنے آبائی وطن مصر کی طرف چلنا چاہئے۔ دوران سفر آپ کو رات آگئی۔ شدید سردی کا موسم تھا۔ بیوی ساتھ تھی اور وہ حاملہ تھی۔ سخت اندھیرا تھا لہٰذا آپ راستہ بھی بھول گئے اور کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کریں۔ سخت پریشانی کا عالم تھا۔ اتنے میں آپ کو دور کہیں سے آگ دکھائی دی۔ جو اس بات کی علامت تھی کہ ضرور وہاں کوئی آدمی بھی موجود ہوگا۔ چنانچہ آپ نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم تو یہیں ٹھہرو، میں وہاں آگ والوں کے پاس جاتا ہوں تاکہ ان لوگوں سے راستہ کا اتا پتا پوچھ سکوں دوسرے کچھ آگ کے انگارے بھی لیتا آؤں گا۔ تاکہ تم آگ تاپ سکو۔

[۱۰] موسیٰ علیہ السلام کا اتفاقاً وادی طویٰ میں پہنچنا:۔ جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک درخت میں آگ بھڑک رہی ہے۔ پاس نہ کوئی آدم ہے نہ آدم زاد۔ آگ جوں جوں بھڑکتی ہے درخت مزید سرسبز ہو جاتا ہے۔ اس عجیب نظارہ کو دیکھ ہی رہے تھے کہ اس میں سے ایک آواز آئی کہ ''اے موسیٰ! میں تمہارا پروردگار تم سے ہم کلام ہو رہا ہوں۔ تم اس وقت طویٰ کے مقدس میدان میں پہنچ چکے ہو۔ لہٰذا اپنے جوتے اتار لو۔ اس آواز کی کیفیت یہ تھی کہ یہ معلوم ہی نہ ہو سکتا تھا کہ کس سمت سے آواز آرہی ہے۔ دائیں سے آرہی ہے یا بائیں سے آگے سے یا پیچھے سے، اوپر سے یا نیچے سے۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام اس آواز کو سننے کے لئے ہمہ تن گوش بن گئے۔ اس آواز نے پہلے جملہ میں اپنا تعارف کرایا۔ دوسرے جملے میں یہ بتایا کہ تم جو راہ بھول چکے تھے تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے اس وقت تم طویٰ کے صاف ستھرے میدان میں کھڑے ہو اور یہاں پہنچنے کے لئے ہی تم راہ بھولے تھے۔ تیسرے جملہ میں یہ ہدایت دی کہ اپنے جوتے اتار لو۔ ممکن ہے کہ آپ کے جوتوں کو راستہ میں کچھ گندگی اور آلائش لگ گئی ہو۔ ورنہ جوتے اگر نئے یا صاف ستھرے ہوں تو جوتوں سمیت مسجد تک جانا تو درکنار نماز ادا کرنا بھی جائز ہے۔ تاہم ادب کا تقاضا یہی ہے کہ کسی مقدس مقام میں داخل ہوتے وقت جوتے اتار لئے جائیں۔

لِذِكْرِيْ ﴿۱۴﴾ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ﴿۱۵﴾ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا
مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ﴿۱۶﴾ وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۱۷﴾ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا

لئے نماز قائم کرو(۱۴) قیامت یقیناً آنے والی ہے میں اسے ظاہر [۱۱] کرنے ہی والا ہوں تا کہ ہر شخص اپنی کوشش کا بدلہ پائے۔(۱۵) لہٰذا جو شخص قیامت پر ایمان نہیں لاتا اور اپنی خواہش کے پیچھے لگا [۱۲] ہوا ہے وہ تمہیں قیامت (کے ذکر) سے روک نہ دے ورنہ تم بھی ہلاک ہو جاؤ(۱۶) اے موسیٰ تمہارے داہنے [۱۶] ہاتھ میں کیا ہے؟(۱۷) موسیٰ نے جواب دیا: "یہ

[۱۱] ❁ خفی کا لغوی مفہوم:۔ اخفیھا۔ خفی کا معروف معنی چھپنا اور پوشیدہ ہونا ہے اور اخفی کا معنی چھپانا۔ اس لحاظ سے اس کا معنی یہ ہوگا۔ "میں اسے چھپائے ہوئے ہوں" پھر یہ لفظ لغت ذوی الاضداد سے بھی ہے۔ جس کا معنی ہے ظاہر کر دینا، کہتے ہیں خفی المطر الفارة، یعنی بارش نے چوہے کو بل سے نکال کر ظاہر کر دیا یا بے نقاب کر دیا ہم نے دوسرے معنی کو اس لئے ترجیح دی ہے کہ اس سے مطلب زیادہ واضح ہوتا ہے۔

گویا جو آواز اس میدان میں آ رہی تھی وہ اللہ کی طرف سے وحی ہو رہی تھی اور قرآن کی صراحت کے مطابق اللہ کا بندے سے ہم کلام ہونا بھی وحی ہی کی تین قسموں میں سے ایک قسم ہے۔ آپ گئے تو تھے آگ لینے کو اور اللہ کی مہربانی یہ ہوئی کہ آپ کو پیغمبری عطا ہو گئی اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ حتیٰ کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو خود بھی پہلے علم نہ تھا کہ آپ کو نبوت عطا ہونے والی ہے اور اس وحی میں آپ کو سب سے پہلے دین کی نہایت اہم اور بنیادی باتیں بتائی گئیں۔

❁ اسلام کی بنیادی تعلیمات:۔ پہلی یہ کہ اللہ ہی اس کائنات کا خالق و مالک ہے۔ یہ کائنات از خود ہی وجود میں نہیں آ گئی۔ دوسری یہ کہ اس کائنات کی تخلیق و تملیک میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں۔ تیسری یہ کہ ان باتوں کے نتیجہ میں عبادت کا وہ اکیلا ہی مستحق ہے اور نماز اللہ سے تعلق قائم رکھنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ لہٰذا اللہ کو یاد رکھنے کے لئے نماز قائم کرنا ضروری ہے۔ اس سے کبھی غفلت نہ کرنا چاہئے اور اگر بھول جائے تو جب یاد آئے نماز ادا کرنا ضروری ہے اور چوتھی یہ ہے کہ قیامت یقیناً آنے والی ہے اور جلد ہی آنے والی ہے۔ تاہم اس کا معین وقت بتانا خلافِ مصلحت ہے اور قیامت قائم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر انسان کو اس کے اچھے یا برے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے۔ یہ وہ اصول دین ہیں جو سیدنا آدمؑ سے لے کر نبی آخر الزمان تک تمام انبیاء و رسل کو وحی کئے جاتے رہے اور ان میں کبھی تغیر و تبدل واقع نہیں ہوا۔

[۱۲] اور پانچویں یہ بات کہ جو شخص روز آخرت پر ایمان نہیں لاتا اور اس کا ذہن اللہ کے سامنے جوابدہی کے تصور سے خالی ہوتا ہے وہ اپنی خواہشات کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ دنیا کی دلچسپیوں اور دل فریبیوں میں ایسا مستغرق ہوتا ہے کہ اسے اللہ کبھی بھولے سے یاد نہیں آتا۔ لہٰذا تم ایسے لوگوں کی صحبت سے پرہیز کرو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے ساتھ تمہیں بھی لے ڈوبیں۔ یہ تھیں وہ بنیادی تعلیمات جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو نبوت کے آغاز میں ہی بتا دی گئیں اور یہ پانچویں ہدایت بالخصوص اس لئے دی گئی کہ آپ ایک جابر، سرکش اور دنیا پرست حکمران کے پاس اللہ کا پیغام لے کر جانے والے تھے اور اس کام کے لئے ایسی استقامت اور ثابت قدمی کی ضرورت تھی جو اقامت دین کے لئے ضروری ہے۔

[۱۳] ❁ اللہ کی موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلامی:۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ سے یہ سوال اس لئے نہیں کیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کو پتا

وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿۱۸﴾ قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿۱۹﴾ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿۲۰﴾ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴿۲۱﴾ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ

میری لاٹھی[۱۴] ہے، میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اپنی بکریوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں (علاوہ ازیں) میرے لیے اس میں اور بھی کئی فوائد[۱۵] ہیں (۱۸) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: موسیٰ! اسے (زمین پر) ڈال دو" (۱۹) پھر جب موسیٰ نے اسے (زمین پر) پھینکا تو یکدم وہ سانپ بن کر دوڑنے لگا۔ (۲۰) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اسے پکڑ و اور ڈرو نہیں۔ ہم جلد ہی اسے اس کی پہلی حالت[۱۶] پر لے آئیں گے۔ (۲۱) اور ذرا اپنا ہاتھ اپنی بغل میں دباؤ۔ یہ بغیر کسی تکلیف کے چمکتا[۱۷] ہوا

نہ تھا کہ یہ میری لاٹھی ہے۔ بلکہ اس لئے کیا تھا کہ اسی لاٹھی کی ہیئت بدلنے والی تھی اور موسیٰ علیہ السلام کو پہلے خود یہ یقین دلانا مقصود تھا کہ وہی تمہاری لکڑی کی لاٹھی اژدھا بن سکتی ہے جسے تم ہر وقت اپنے پاس رکھتے ہو۔

[۱۴] ۞ وحی الٰہی کی لذت:۔ اللہ تعالیٰ کے سوال کا جواب اتنا ہی کافی اور مکمل تھا کہ "یہ میری لاٹھی ہے" مگر اس آواز میں کچھ ایسی لذت تھی کہ ان لذت کے لحات کو موسیٰ علیہ السلام طول دینا چاہتے تھے۔ لہذا ساتھ ہی اور بھی کئی متعلقہ باتیں بتادیں تاکہ انہیں کچھ دیر مزید ہم کلامی کا شرف حاصل رہے۔

[۱۵] مثلاً اپنی بھیڑوں کو ہانکتا ہوں، ریوڑ کی حفاظت کرتا ہوں، درندوں کے حملہ سے بچاتا اور ان کا تعاقب کرتا ہوں نیز ان کے لئے اس سے پتے جھاڑتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔

[۱۶] سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم کی تعمیل میں عصا کو زمین پر جو پھینکا تو وہ اسی وقت سانپ بن گیا اور سانپ بنتے ہی دوڑنے بھی لگا۔ جب وہ آپ کی طرف آیا تو آپ خود بھی اس سے خوف زدہ ہوگئے کہ کہیں گزند نہ پہنچائے۔ یہ صورت حال دیکھ کر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ اب اسے جرأت کر کے پکڑ لو تو تمہارے ہاتھ لگاتے ہی پھر یہ اپنی پہلی حالت پر آجائے گا یعنی تمہارا وہی پہلا عصا بن جائے گا۔

۞ عصائے موسیٰ کے سانپ کے نام اور اوصاف:۔ لاٹھی کے اس طرح سانپ بن جانے کے لئے قرآن نے مختلف مقامات پر تین الفاظ استعمال کئے ہیں (۱) اس مقام پر حیۃ کا لفظ ہے جو ہر قسم کے سانپ کے لئے بولا جاسکتا ہے۔ (۲) جانّ یعنی سفید پتلا اور لمبا سا سانپ، سانپ کی سنک (۲۷:۱۰) اور (۳) بہت بڑا سانپ۔ اژدھا (۷:۱۰۷) یعنی لاٹھی جب پھینکی جاتی تو پہلے وہ پتلا سا سانپ بنتی تھی۔ پھر لحظہ بہ لحظہ اس کے جسم میں اضافہ بھی ہونے لگتا تھا۔ تاآنکہ وہ بہت بڑا سانپ بن جاتی تھی۔

[۱۷] دوسرا معجزہ یہ دیا گیا کہ آپ اپنی بغل میں اپنا دایاں ہاتھ رکھتے پھر نکالتے تو وہ اس قدر چمکتا ہوا نکلتا تھا کہ اس سے نگاہیں خیرہ ہوجاتی تھیں۔ اس سے نہ تو سیدنا موسیٰ کو کچھ تکلیف ہوتی تھی اور نہ ہی یہ کسی بیماری کی علامت تھی اور یہ اس وقت تک چمکتا رہتا تھا جب تک آپ دوبارہ اسے اپنی بغل میں نہ لے جاتے تھے۔

بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ﴿۲۲﴾ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴿۲۳﴾ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۴﴾ ع

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿۲۵﴾ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۲۶﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿۲۷﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿۲۸﴾

وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿۲۹﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿۳۰﴾ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿۳۱﴾ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۳۲﴾ كَيْ

نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۳﴾ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۴﴾ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿۳۵﴾ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ

نکلے گا۔ یہ دوسری نشانی ہے۔ (۲۳) یہ اس لئے کہ ہم تمہیں اپنی بڑی بڑی [۱۸] نشانیاں دکھانے والے ہیں (۲۴) اب تم فرعون کے پاس جاؤ (کیونکہ) وہ [۱۹] سرکش ہوگیا ہے۔ (۲۵) موسیٰ نے عرض کیا! پروردگار! میرا سینہ کھول دے۔ (۲۵) اور میرے لئے میرا کام آسان بنادے۔ (۲۶) اور میری زبان سے (لکنت کی) گرہ کھول دے۔ (۲۷) تاکہ وہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔ (۲۸) اور میرے لئے میرے خاندان میں سے ایک مددگار مقرر کردے۔ (۲۹) ہارون کو جو میرا بھائی ہے۔ (۳۰) اس سے میری کمر کو مضبوط کر۔ (۳۱) اور اسے میرے کام میں شریک کردے۔ (۳۲) تاکہ ہم تسبیح بیان کریں۔ (۳۳) اور خوب خوب تیرا [۲۰] چرچا کریں۔ (۳۴) بلاشبہ تو ہمیں (ہر آن) دیکھ رہا ہے۔ (۳۵) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: موسیٰ! جو کچھ تم

[۱۸] یہ دو معجزات تو نبوت ملنے کے ساتھ ہی سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو دے دیئے گئے اور ساتھ ہی یہ وعدہ بھی کیا گیا کہ آئندہ بھی عندالضرورت ہم آپ کو اپنے معجزات دکھاتے رہیں گے۔ اور یہ دونوں معجزے آپ کو نبوت کی صداقت کے طور پر دیئے گئے تھے۔ پہلے معجزے میں جبروت الٰہی کا اظہار مقصود تھا۔ جو فرعون جیسے سرکش بادشاہ کے لئے ضروری بات تھی اور دوسرے معجزہ میں ہدایت کے روشن راستے کی طرف اشارہ تھا جو مقصود انبیاء علیہم السلام ہے۔

[۱۹] موسیٰ علیہ السلام پہلے ہی مدین سے مصر کو جا رہے تھے۔ راستہ میں یہ واقعہ پیش آ گیا۔ آپ کو نبوت عطا کی گئی اور دو معجزات عطا کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اب جاؤ اور جا کر مصر کے بادشاہ فرعون سے جا کر ٹکر لو۔ وہ اللہ کا نافرمان اور خدائی کا دعوے دار بنا بیٹھا ہے اس کو راہ راست کی دعوت دو۔ اور فرعون جیسے جابر اور قاہر بادشاہ سے مقابلہ کے لئے آپ کو جو سروسامان عطا کیا گیا وہ صرف یہ دو معجزات تھے۔ اسی بات سے معلوم ہوجاتا ہے کہ انبیاء ورسل پر جو ذمہ داری ڈالی جاتی ہے وہ کس قدر گرانبار ہوتی ہے۔ اس حکم کے بعد آپ نے اپنے اہل وعیال سے کیا سلوک کیا؟ اس بارے میں کتاب وسنت خاموش ہیں۔ اغلب خیال یہی ہے کہ وہ اپنے ساتھ مصر لے گئے ہوں گے۔

[۲۰] ۞ سیدنا موسیٰ کے چار مطالبات :۔ اللہ کا یہ حکم سن کر آپ نے اپنی حالت کا جائزہ لیا اور چند معروضات پیش کردیں۔ ایک یہ کہ مجھے اتنا حوصلہ عطا فرما کہ میں یہ کام سرانجام دے سکوں اور مجھے اس کام کے کرنے کی توفیق عطا فرما۔ دوسرے یہ کہ میری زبان سے لکنت دور کردے۔ کہتے ہیں کہ بچپن میں آپ نے اپنی زبان پر آگ کا کوئلہ رکھ لیا تھا جس سے آپ کی زبان میں گرہ پڑگئی تھی اور آپ ہکلا کر بات کرتے تھے۔ اس گرہ کو دور کردینے کی آپ نے درخواست کی تاکہ میں وضاحت سے بات کرسکوں اور لوگ میری بات آسانی سے سمجھ سکیں اور تیسرے یہ کہ اس گرانبار ذمہ داری کے کام کے لئے مجھے ایک مددگار بھی عطا فرما اور چوتھے یہ کہ اس کام کے لئے مناسب ترین آدمی میرا بھائی ہارون ہے۔ اس کو بھی نبوت عطا فرما اور میرے

يٰمُوسٰى ﴿٣٦﴾ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرٰى ﴿٣٧﴾ إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّكَ مَا يُوحٰى ﴿٣٨﴾ أَنِ اقْذِفِيهِ فِي التَّابُوتِ فَاقْذِفِيهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّي وَعَدُوٌّ لَّهُ ۚ وَ

نے مانگا وہ تمہیں دیا جاتا ہے (۳۶) اور ہم نے تم پر ایک اور مرتبہ بھی احسان [۲۱] کیا۔ (۳۷) (وہ وقت یاد کرو) جبکہ جب ہم نے تمہاری ماں کی طرف تیز اشارہ کیا جو وحی کے ذریعہ کیا جاتا ہے (۳۸) کہ "تم اس بچے (موسیٰ) کو صندوق میں رکھو پھر اس (صندوق) کو دریا [۲۲] میں ڈال دو۔ دریا اس کو ساحل پر پھینک دے گا جسے میرا اور اس (موسیٰ) کا دشمن اٹھا لے گا۔

ہمراہ کردے۔ وہ مجھ سے فصیح اللسان بھی ہے۔ پھر ایک ایک دو گیارہ والا معاملہ ہے۔ کم از کم ہم دونوں تو ایک دوسرے کے مونس و غمگسار ہوں گے۔ پھر ہم مل کر ہی تیری تسبیح و تقدیس اور ذکر بھی کرتے رہا کریں گے۔

[۲۱] ❁ مطالبات کی منظوری:۔ یعنی جو کچھ درخواستیں تم نے پیش کی ہیں وہ سب کی سب منظور کی جاتی ہیں۔ ان احسانات کے علاوہ پہلے بھی ہم تم پر احسان کر چکے ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ایک ایک کر کے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو وہ احسانات یاد دلاتے ہیں جو ان کی پیدائش سے لے کر تا حال ان پر کئے گئے تھے اور ان کی تفصیل سورہ قصص میں بیان ہوئی ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ تم خاص اسی مہم کے لئے پیدا کئے گئے ہو اور اسی کام کے لئے ہماری زیر نگرانی تمہاری پرورش ہوتی رہی ہے۔ فرعون جیسے جابر بادشاہ سے ٹکر لینے کے لئے جن صفات کی ضرورت تھی۔ وہ تمہیں ودیعت کر کے اس کام کے لئے تمہارا انتخاب کر لیا ہے۔

[۲۲] ❁ سیدنا موسیٰ کی پیدائش اور صندوق میں ڈالنا:۔ ہوا یہ تھا کہ فرعون کو ایک ڈراؤنا سا خواب آیا جس کی تعبیر اسے درباری نجومیوں نے یہ بتائی کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص پیدا ہونے والا ہے جو تمہاری سلطنت کو تہ و بالا کر دے گا اور تمہاری ہلاکت کا موجب بنے گا اس کا توڑ فرعون نے یہ سوچا کہ آئندہ بنی اسرائیل کے ہاں جتنے لڑکے پیدا ہوں ان کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالا جائے اور اس حکم کی تعمیل کے لئے اس نے اپنے تمام اہل کاروں کو ہدایات جاری کر دیں اور دائیوں کی یہ ذمہ داری تھی کہ جس وقت کسی بنی اسرائیل کے فرد یا سبطی کے ہاں لڑکا پیدا ہو وہ فوراً حکومت کو اس کی اطلاع کرے۔

❁ تقدیر کے سامنے تدبیر کی ناکامی:۔ دراصل فرعون کی اپنی سلطنت کو بچانے کی یہ تدبیر کہ بنی اسرائیل کے ہاں ہر نئے پیدا ہونے والے بچے کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالا جائے، اس کی حماقت اور ناعاقبت اندیشی پر مبنی تھی۔ وجہ یہ ہے کہ جو تعبیر نجومیوں نے بتائی تھی اس کے متعلق دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ وہ تعبیر غلط ہو۔ اس صورت میں اسے کسی تدبیر کی ضرورت ہی نہ تھی۔ دوسری یہ کہ وہ تعبیر درست ہو۔ اس صورت میں بھی فرعون کی کسی تدبیر کا کچھ فائدہ نہ تھا۔ اس لئے کہ تدبر سے اس تعبیر کو تبدیل کیا جا سکتا ہو تو وہ تعبیر درست کیسے قرار دی جا سکتی ہے۔ یہی دوسری صورت فرعون سے پیش آئی۔ اس کی اس ظالمانہ تدبیر کے باوجود تقدیر غالب آئی اور جو کچھ اللہ کی مشیت میں تھا وہ ہو کے رہا۔

فرعون کا یہ وحشیانہ حکم ایک طویل عرصہ سے بنی اسرائیل پر ڈھایا جا رہا تھا۔ جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو ان کی والدہ اس بچے کے قتل کے تصور سے سخت مغموم ہو گئیں۔ یکدم ان کے دل میں اللہ تعالیٰ نے یہ خیال ڈال دیا کہ اس بچے کی پیدائش کی خبر اہل کاروں کے پاس پہنچنے سے پیشتر ہی اسے ایک تابوت میں بند کر دے۔ پھر اس تابوت کو دریائے نیل کی موجوں کی سپرد کر دیا جائے۔ اس طرح ایک تو بچہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہونے کے منظر کی اذیت سے بچ جائیں گی

اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ﴿۳۹﴾ اِذْ تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى
مَنْ يَّكْفُلُهٗ ۭ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۥ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ

پھر (اے موسیٰ) میں نے تم پر اپنی طرف سے محبت ڈال دی (کہ جو کوئی تمہیں دیکھے پیار کرنے لگے) اور یہ اس لئے کیا کہ میری نگرانی میں تمہاری پرورش [۲۳] ہو۔ (۳۹)

جب تمہاری بہن (لب ساحل تمہارے ساتھ ساتھ) چل رہی تھی۔ (اور جب فرعون نے صندوق اٹھالیا) تو انہیں کہنے لگی: کیا میں تمہیں ایسے شخص کا پتہ دوں جو اس بچے کی (ٹھیک طرح) پرورش کر سکے؟ پھر ہم نے تمہاری ماں کے پاس لوٹا دیا تا کہ وہ اپنی آنکھ ٹھنڈی [۲۴] کرے اور غمزدہ نہ رہے۔ نیز تم نے ایک آدمی کو مار ڈالا تھا تو ہم نے

دوسرے ممکن ہے اللہ تعالیٰ اس بچے کی زندگی کی کوئی اور صورت پیدا کر دے۔

[۲۳] ❁ تابوت کا فرعون کے سامنے پیش کیا جانا:۔ تابوت کو دریا کی موجوں کے حوالے کرنے تک کا کام تو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے سرانجام دیا۔ اس سے بعد کے سب کام اللہ تعالیٰ کے اپنے کارنامے ہیں اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر احسانات ہیں۔ دریا کی موجوں نے تابوت کو دریائے نیل کی اس شاخ کے رخ دھکیل دیا جس پر فرعون کا محل واقع تھا۔ اس مقام پر ایک لہر اٹھی۔ جس نے اس تابوت کو ساحل پر فرعون کے محل کے پاس پھینک دیا۔ پھر اتفاق کی بات کہ یہ تابوت فرعون کے سامنے پیش کیا گیا جو اے موسیٰ! میرا بھی دشمن تھا اور تمہارا بھی دشمن تھا۔ میرا اس لحاظ سے کہ وہ میرا نافرمان تھا اور میرے مقابلہ پر اپنی خدائی کا دعویدار بن بیٹھا تھا اور تمہارا اس لئے کہ وہ تمہیں جان سے ہی ختم کر دینا چاہتا تھا۔ پھر میں نے تمہاری ایسی پیاری صورت بنا دی تھی کہ جو بھی تمہیں دیکھتا تمہیں پیار کرنے لگتا تھا اور اس کا دل تمہاری محبت سے بھر جاتا تھا۔ یہی بات تمہاری زندگی کا ذریعہ بن گئی اور یہ سب کچھ میری نگرانی میں اور میرے ارادہ سے ہو رہا تھا۔

[۲۴] ❁ فرعون کے ہاں موسیٰ علیہ السلام کی تربیت:۔ پھر تمہاری تربیت کا یہ سامان کیا کہ جب تمہاری والدہ نے تابوت کو دریا کے حوالے کیا تو اس نے اپنی بیٹی یعنی تمہاری بہن کو یہ تاکید کر دی تھی کہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ چلتی جائے اور اس تابوت کی نگرانی کرتی رہے کہ اس تابوت کا کیا انجام ہوتا ہے۔ تا آنکہ اسے پتہ چل گیا کہ تم فرعون کے گھر میں پہنچ گئے ہو۔

ایسا پیارا بچہ دیکھ کر فرعون کی بیوی آسیہ نے اپنے خاوند سے کہا کہ ہمارے ہاں اولاد نہیں، کیوں نہ ہم اسے اپنا بیٹا ہی بنا لیں۔ بالآخر اس نے اپنے خاوند فرعون کو اس بات کا قائل کر لیا۔ اب سوال یہ تھا کہ کون سی انا یا دائی سیدنا موسیٰؑ کو دودھ پلائے۔ جو بھی انا لائی جاتی سیدنا موسیٰ اس کا دودھ پینے سے انکار کر دیتے تھے۔ بڑا ٹیڑھا مسئلہ بن گیا تھا۔ جب یہ بات عام ہوئی تو سیدنا موسیٰ کی بہن نے وہاں حاضر ہو کر کہا۔ میں تمہیں ایک انا کی نشاندہی کرتی ہوں مجھے امید ہے کہ یہ بچہ اس کا دودھ ضرور پی لے گا۔ چنانچہ موسیٰ کی بہن نے اپنی ماں کا اتا پتا بتایا۔ اسے بلایا گیا۔ تو بچہ فی الواقع اس کا دودھ پینے لگا۔ پھر فرعون اور اس کی بیوی نے یہ بچہ سیدنا موسیٰ کی ماں کے ہی حوالہ کر دیا اور اس کی سرکاری خزانہ سے تنخواہ بھی مقرر کر دی گئی۔ اور اسے بچہ سمیت واپس اپنے گھر بھیج دیا گیا۔ اس طرح اے موسیٰ! ہم نے حیرت انگیز طریقے سے تمہاری پرورش کا بندوبست کر دیا۔ تم خود بھی

الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۵ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ۵ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰي قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ﴿۴۰﴾
وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ﴿۴۱﴾ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿۴۲﴾ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ

تمہیں اس غم سے نجات [۲۵] دی پھر تمہیں مختلف آزمائشوں سے گزارا۔ پھر تم کئی سال مدین والوں کے ہاں ٹھہرے رہے۔ پھر اب تم اے موسیٰ! تقدیر کے مطابق ٹھیک اپنے [۲۶] وقت پر یہاں آ گئے (۴۰) اور میں نے تمہیں اپنے کام [۲۷] کا بنا لیا ہے۔ (۴۱)

اب تم اور تمہارا بھائی دونوں میرے معجزات لے کر جاؤ اور میرے [۲۸] ذکر میں کوتاہی نہ کرنا۔ (۴۲) ہاں، فرعون کے ہاں جاؤ،

اپنی ماں کے پاس پہنچ گئے۔ تربیت بھی ہونے لگی اور تمہاری ماں کی آنکھیں بھی ٹھنڈی رہیں۔ اس طرح ہم نے تمہیں موت کے منہ سے بچایا اور بچپن میں تمہاری تربیت کا انتظام اسی فرعون کے ہاتھوں کروایا جو تمہاری ہی جان کے درپے تھا۔

[۲۵] سیدنا موسیٰ کے ہاتھوں ایک قبطی کا مر جانا:۔ اس واقعہ کی تفصیل تو سورہ قصص میں آئے گی۔ اجمال یہ ہے کہ سیدنا موسیٰ کے ہاتھوں ایک قبطی (فرعونی) نادانستہ طور پر مارا گیا تھا۔ آپ نے اسے صرف مکا مارا تھا جس سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ تو ہم نے تمہیں مدین کی راہ دکھائی اور اس کے نتیجہ میں جو تمہیں سزا کے طور پر اپنی موت کا خطرہ تھا اس سے نجات دی۔ اس کے بعد بھی تم پر کئی آزمائشوں کے ادوار آئے۔ جن میں ہم تمہاری مدد کرتے رہے۔

[۲۶] تقدیر کے مطابق اسباب خود بنتے چلے جاتے ہیں:۔ تم مدین پہنچے تو بالکل ایک اجنبی مسافر تھے۔ پھر ہم نے تمہارے لئے ایسے سامان مہیا کر دیئے کہ تم مدین میں شعیب علیہ السلام کے پاس باعزت طور پر رہنے لگے۔ سالہا سال ان کی بکریاں چرائیں۔ اس سے بھی تمہاری تربیت مقصود تھی۔ پھر شعیبؑ کی بیٹی سے تمہارا نکاح ہوا تو تمہاری یہ ضرورت بھی پوری ہو گئی۔ پھر مدین میں معینہ مدت گزارنے کے بعد تمہیں اپنے وطن واپس جانے کا خیال آیا۔ سردیوں کی طویل اور اندھیری رات میں تم بال بچوں سمیت سفر کر رہے تھے تو راستہ بھول گئے۔ اور اب تم آگ دیکھ کر ادھر آ گئے ہو کہ راستہ کا اتا پتا معلوم کرو۔ اور اپنے گھر والوں کے لئے کچھ آگ کے انگارے لے جاؤ تو یہ سب کچھ اتفاقاً ہی نہیں ہو گیا۔ بلکہ تم ٹھیک ہماری مشیت اور اندازہ کے مطابق یہاں پہنچے ہو۔ ہمیں تم کو یہاں اسوقت اور اس حال میں لانا مقصود تھا تو تمہارے لئے حالات ہی ایسے پیدا کر دیئے کہ تم ازخود یہاں پہنچ گئے۔

[۲۷] یہ تمہاری تربیت کا سارا اہتمام اسی غرض کے تحت کیا گیا ہے کہ تمہیں اس مہم کے لئے فرعون کے پاس بھیجا جائے اور میں نے اسی کام کے لئے تمہاری اس انداز سے تربیت کی ہے۔

[۲۸] اللہ کے ذکر کا فائدہ:۔ پہلے صرف سیدنا موسیٰ کو یہی بات کہی تھی کہ فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ اس نے سر اٹھا رکھا ہے۔ اب جب سیدنا ہارونؑ کو بھی نبوت عطا کر کے ان کا مددگار بنا دیا گیا تو ان دونوں سے وہی بات کہی گئی اور اب ان دونوں کو تاکید کی کہ میرے ذکر میں کوتاہی نہ کرنا کیونکہ اللہ کا ذکر ہی وہ چیز ہے جو اللہ والوں کی کامیابی کا ذریعہ اور دشمن کے مقابلہ میں بہترین ہتھیار ہے۔ اس سے اللہ کی طرف لو لگائے رکھنے اور اللہ پر بھروسہ کرنے کی صفت پیدا ہوتی ہے۔ پھر اس راہ میں جو مصائب پیش آئیں ان کو صبر و استقلال سے برداشت کرنے کی قوت پیدا ہوتی ہے۔

طَغٰى ﴿٤٣﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿٤٤﴾ قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ
اَنْ يَّطْغٰى ﴿٤٥﴾ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴿٤٦﴾ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ

وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے۔ (۴۳) دیکھو، اسے نرمی سے بات کہنا، شاید وہ نصیحت قبول کر لے [۲۹] یا (اللہ سے) ڈر جائے۔" (۴۴) ان دونوں نے عرض کیا: "اے پروردگار! ہم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ وہ ہم پر زیادتی کرے یا مزید سرکشی [۳۰] اختیار کرے" (۴۵) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ڈرو مت! میں تمہارے ساتھ ہوں، سب کچھ سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ (۴۶) لہٰذا اس کے پاس جاؤ اور اسے کہنا کہ: ہم تیرے رب کے رسول ہیں لہٰذا بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ [۳۱]

[۲۹] ❁ **دعوت کے لئے نرم لہجہ رکھنا ضروری ہے:۔** کسی کے راہ راست پر آنے اور اسے قبول کرنے کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دعوت کو پوری طرح سمجھ کر حق بات قبول کر لے اور دوسری یہ کہ اپنے برے انجام سے ڈر کر سیدھا ہو جائے۔ یہ دونوں باتیں بتا دیں اور انہیں تاکید کر دی کہ فرعون سے جو بات کہیں نرمی کے لہجہ میں کہیں۔ کیونکہ سختی سے بات کرنے سے بسا اوقات الٹا اثر ہوتا ہے۔ مخاطب اصل بات سمجھنے کی بجائے طرزِ تخاطب اور لہجہ کی بنا پر ضد اور مخالفت پر اتر آتا ہے۔ گویا تبلیغ اور دعوت دین کا کام کرنے والوں کے لئے یہ ایک نہایت اہم سبق ہے۔

[۳۰] ❁ **فرعون کے ہاں جانے کے خدشات:۔** مصر پہنچ جانے کے بعد جب دونوں بھائی فرعون کے ہاں جانے کو تیار ہوئے اور فرعون جیسے جابر اور خودسر بادشاہ کے پاس جا کر اسے دعوت دینے کا خیال کیا تو اپنے پروردگار سے عرض کیا کہ ہم تعمیل ارشاد کو حاضر ہیں مگر اس بات سے ڈرتے ہیں کہ وہ ہماری بات سننے پر آمادہ بھی ہو گا یا نہیں یا بات سن لینے پر غصہ سے بھڑک نہ اٹھے گا یا ہم پر بھی دست درازی کرے یا آپ کی شان میں مزید گستاخانہ باتیں کہنے لگے۔ جس سے اصل مقصد ہی فوت ہو جائے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ کیونکہ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں سب کچھ سن اور دیکھ رہا ہوں۔ وہ تمہارا بال بھی بیکا نہ کر سکے گا۔

[۳۱] ❁ **فرعون کو دعوت دینے کے پانچ نکات:۔** گویا فرعون کے سامنے دعوت کا پانچ نکاتی پروگرام ان پیغمبروں کو دیا گیا۔ ان میں سے چار تو دعوت دین کے بنیادی نکات اور ایک مطالبہ ہے۔ پہلی بات یہ تھی کہ اسے کہنا کہ ہم تمہارے پروردگار کے رسول ہیں۔ اس میں دو نکات آ گئے۔ ایک یہ کہ لوگوں کے پروردگار تم نہیں بلکہ وہ ذات ہے جو ہر چیز کا، ہمارا اور خصوصاً تمہارا بھی پروردگار ہے، دوسرا نکتہ یہ تھا کہ کہ ہم دونوں اسی پروردگار کے بھیجے ہوئے تیرے پاس آئے ہیں خود نہیں آئے۔ گویا اس ایک جملہ میں توحید و رسالت کا ذکر آ گیا۔ تیسرا نکتہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل پر ظلم کرنا چھوڑ دے اور انہیں اپنی غلامی سے آزاد کر اور انہیں ہمارے ہمراہ کر دے تاکہ وہ آزادانہ زندگی بسر کر سکیں اور یہ تیسرا نکتہ خاص اس قوم کے حالات کے مطابق تھا۔ چوتھا نکتہ یہ تھا کہ جو شخص اس راہِ ہدایت یعنی اللہ کی توحید اور ہماری رسالت پر ایمان لے آئے گا اور اللہ ہی کی عبادت اور ہماری اطاعت کرے گا اس کے لئے اس دنیا میں امن اور سلامتی ہو گی اور آخرت میں بھی۔ اور پانچواں نکتہ یہ تھا کہ ہمیں بذریعہ وحی اس بات کی خبر دی گئی ہے کہ جو شخص ہماری دعوت سے منہ پھیرے گا آخرت میں اس کے لئے عذاب ہو گا۔ گویا چوتھے اور پانچویں نکتہ میں ایمان کے نہایت اہم جزء ایمان بالآخرت کی دعوت پیش کی گئی تھی۔ اور ساتھ ہی یہ

مَعَنَا بَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ وَلَا تُعَذِّبۡهُمۡۖ قَدۡ جِئۡنَٰكَ بِـَٔايَةٖ مِّن رَّبِّكَۖ وَٱلسَّلَٰمُ عَلَىٰ مَنِ ٱتَّبَعَ ٱلۡهُدَىٰٓ ﴿٤٧﴾
إِنَّا قَدۡ أُوحِيَ إِلَيۡنَآ أَنَّ ٱلۡعَذَابَ عَلَىٰ مَن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ﴿٤٨﴾ قَالَ فَمَن رَّبُّكُمَا يَٰمُوسَىٰ ﴿٤٩﴾ قَالَ رَبُّنَا ٱلَّذِيٓ
أَعۡطَىٰ كُلَّ شَيۡءٍ خَلۡقَهُۥ ثُمَّ هَدَىٰ ﴿٥٠﴾ قَالَ فَمَا بَالُ ٱلۡقُرُونِ ٱلۡأُولَىٰ ﴿٥١﴾ قَالَ عِلۡمُهَا عِندَ رَبِّي فِي

جانے کے لئے چھوڑ دے اور انہیں تکلیف نہ دے۔ ہم تیرے پاس تیرے پروردگار کی نشانی لے کر آئے ہیں اور جو شخص ہدایت کی پیروی کرے اس کے لئے سلامتی ہے (۴۷) ہماری طرف یہ وحی کی گئی ہے کہ جو شخص اسے جھٹلائے گا اور منہ موڑے گا، اس کے لئے یقیناً عذاب ہے۔ (۴۸) فرعون نے جواب دیا: ''موسیٰ! تمہارا پروردگار ہے کون؟ (۴۹) موسیٰ نے کہا: ''ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی [۳۲] صورت خاص عطا کی پھر اس کی رہنمائی کی۔ (۵۰) فرعون نے کہا: تو پھر جو نسلیں گزر چکی ہیں وہ کس حال میں [۳۳] ہیں؟'' (۵۱) موسیٰ نے جواب دیا: ان کا علم میرے

بات کہہ دینا کہ ہمارا یہ دعویٰ رسالت بے دلیل نہیں بلکہ ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لے کر آئے ہیں۔

[۳۲] فرعون کا سیدنا موسیٰ سے پہلا سوال کہ تمہارا پروردگار کون ہے؟:۔ جب فرعون کے پاس پہنچ کر ان دونوں بھائیوں نے اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقہ پر اس کی دعوت پیش کی تو فرعون نے جو پہلا سوال یا اعتراض کیا وہ اس کی اپنی دکھتی رگ تھی۔ وہ خود خدائی کا دعوے دار تھا اور لوگوں کو اس نے یہی یقین دلایا ہوا تھا کہ وہی ان کا پروردگار ہے۔ فرعون بلاشبہ اس بات کا قائل تھا کہ زمین و آسمان اور موجودات کو اللہ نے پیدا کیا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی سیاسی و قانونی حاکیت کا وہ منکر تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ میرے اوپر کوئی ایسی بالاتر ہستی نہیں جس کا حکم مجھ پر چلتا ہو اور مجھے اس کا حکم ماننا ضروری ہو۔ لہذا اس نے فوراً یہ سوال کر دیا کہ ''ایسا تمہارا پروردگار ہے کون؟'' چونکہ فرعون اللہ تعالیٰ کی توحید ربوبیت کا قائل تھا، اس لئے سیدنا موسیٰ نے اس کا جواب ہی ایسا دیا جو ربوبیت سے تعلق رکھتا تھا۔ اور وہ جواب یہ تھا کہ میرا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو ایک خاص ساخت عطا کی۔ پھر اس کا وظیفہ بھی اسے سمجھا دیا اور اس کی جبلت میں رکھ دیا۔ اس نے مچھلی پیدا کی تو اسے پانی میں تیرنا بھی سکھا دیا، پرندے پیدا کئے تو انہیں اڑنا بھی سکھا دیا۔ بچہ پیدا کیا تو اسے فوراً ماں کے پستان سے چمٹنا اور دودھ پینے کا طریقہ بھی سکھا دیا۔ اگر اللہ تعالیٰ ان چیزوں کی ایسی رہنمائی نہ کرتا تو اس کے علاوہ کوئی بھی انہیں سکھا نہیں سکتا تھا۔ واضح رہے یہاں اللہ تعالیٰ نے خلق کل شی نہیں بلکہ اعطی کل شی خلقه فرمایا ہے۔ جو یہ معنی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی پیدائش کے وقت اسے ایک خاص شکل و صورت عطا فرمائی اور وہی اس کے لئے مناسب تھی۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے جس جس مقام پر انسان کی آنکھیں ناک اور کان یا دوسرے اعضاء بنائے تو وہی مقامات ان اعضاء کے لئے مناسب تھے۔ اگر ان کو ادھر اُدھر کر دیا جاتا تو ہر چیز بدصورت ہوتی اور اس کا حلیہ بھی بگڑا ہوا ہوتا۔

[۳۳] فرعون کا دوسرا سوال کہ پہلی امتیں کس حال میں ہیں؟:۔ اس پہلو سے لاجواب ہو کر فرعون نے دوسرا سوال جو کیا وہ اس کی انتہائی شرارت پر مبنی تھا۔ جس سے وہ اپنی تمام رعیت کو ان رسولوں کے خلاف بھڑکانا اور ان میں مذہبی تعصب پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس کا سوال یہ تھا کہ اگر صورت حال یہی ہے کہ جو توحید و رسالت کی دعوت تم لے کر آئے ہو اس کو ماننے والوں کے لئے امن و سلامتی ہے اور جو اس دعوت پر ایمان نہیں رکھتے تو ان کو دردناک سزا ملے گی تو بتاؤ جو ہمارے باپ دادا فوت ہو چکے ہیں وہ کس حال میں ہیں؟

كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى (۵۲) الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّ
اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۭ فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى (۵۳) كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى (۵۴) مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى (۵۵) وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا ع ۲

پروردگار کے پاس ایک کتاب میں [۳۴] ہے۔ میرا رب [۳۵] نہ چوکتا ہے اور نہ بھولتا ہے (۵۲) وہی جس نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا اور اس میں تمہارے چلنے کو راستے بنائے اور اوپر سے پانی برسایا۔ پھر اس بارش سے مختلف قسم کی پیداوار نکالی۔ (۵۳) کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ اس (طریقِ کار) میں اہلِ عقل کے لئے بہت سی [۳۶] نشانیاں ہیں۔ (۵۴) اسی زمین سے ہم نے تمہیں پیدا کیا اور اسی میں تمہیں واپس لے جائیں گے اور اسی سے تمہیں دوبارہ [۳۷] نکالیں گے۔ (۵۵)

[۳۴] اگر فرعون کے اس سوال کا جواب موسیٰ علیہ السلام یوں دیتے کہ وہ سب کے سب گمراہ تھے اور انہیں دوزخ کا عذاب ہوگا۔ تو اگرچہ یہ جواب صحیح تھا مگر فرعون کے سارے درباری غصہ سے بھڑک اٹھتے اور فوراً ان دونوں کے خلاف متحد ہو جاتے اور فرعون اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔ مگر موسیٰ علیہ السلام نے جواب ایسا حکیمانہ دیا جو مبنی برحقیقت بھی تھا اور کسی کے تعصبانہ جذبات کو ٹھیس بھی نہ پہنچتی تھی۔ آپ نے واضح الفاظ میں جواب دیا کہ جو لوگ گزر چکے ہیں ان کے حالات جاننے کی ہمیں ضرورت نہیں وہ جانیں اور ان کا پروردگار جانے۔ ہمیں صرف اپنی فکر کرنا چاہیے کہ ہم کون سا طرزِ زندگی اختیار کرتے ہیں اور ہمارا انجام کیسا ہوگا؟

[۳۵] ۞ اللہ سے بھول چوک ناممکن ہے:۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو پیدا کرنے کے سلسلے میں ان کی ہدایت کا جو قانون بنایا ہے نہ اس میں وہ بھولتا یا چوکتا ہے اور نہ کسی کو اس کے اچھے یا برے اعمال کی جزا و سزا دینے میں۔ قرآن کے اس مقام پر سیدنا موسیٰ کا ذکر ختم کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فرعون اور سیدنا موسیٰ کا پہلا مکالمہ ختم ہو رہا ہے اور آگے چند آیات میں جو دلائل توحید دیے جا رہے ہیں اور پند و نصائح پیش کئے جا رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور سب لوگوں کے لئے ہیں۔

[۳۶] ۞ تمام مخلوق کی روزی کا بندوبست:۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام جاندار مخلوق کی روزی کا خواہ وہ انسان ہوں یا حیوانات ہوں ایسا مستقل اور مستحکم نظام پیدا کر دیا ہے جس سے تمام مخلوق کو روزی مہیا ہوتی رہتی ہے۔ اگر بارش کا دیوتا کوئی اور ہوتا اور نباتات کا کوئی دوسرا تو ان میں ہمیشہ کی مطابقت محال تھی۔ اور کچھ عرصہ بعد تمام مخلوق بھوک سے ہی مر جاتی۔ اللہ کا یہ نظام پیداوار اور اس پیداوار کے عوامل، یعنی سورج کی حرارت، ہواؤں کا چلنا، سمندر سے بخارات کا اٹھنا، موزوں موسم میں بارش کا نزول پھر اس سے زمین کا لہلہا اٹھنا ان سب باتوں میں ایسی ہم آہنگی ہے جس سے ہر صاحب بصیرت اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ اس کائنات کی مدبر و منتظم صرف ایک ہی ہستی ہو سکتی ہے۔

[۳۷] ۞ انسان کا زمین سے دائمی تعلق:۔ اس آیت میں انسان پروارد ہونے والی تین کیفیات کا ذکر کیا گیا ہے اور ان تینوں کا تعلق زمین سے ہے۔ اللہ نے انسان کو زمین یا مٹی سے پیدا کیا اور اس کی تمام تر ضروریات اسی سے متعلق کر دیں۔ پیدائش سے لے کر موت تک یہ ایک مرحلہ ہوا۔ دوسرا مرحلہ موت سے قیامت تک ہے۔ اس مرحلے میں انسان اسی زمین میں دفن ہوتا ہے اور اکثر لوگوں

كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَأَبَىٰ ﴿٥٦﴾ قَالَ أَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ أَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يَا مُوسَىٰ ﴿٥٧﴾ فَلَنَأْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهِ
فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهُ نَحْنُ وَلَا أَنتَ مَكَانًا سُوًى ﴿٥٨﴾ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّينَةِ

(غرض) ہم نے فرعون کو اپنی نشانیاں [۳۸] دکھائیں مگر وہ انہیں جھٹلاتا رہا اور کوئی بات تسلیم نہ کی۔ (۵۶) موسیٰ سے کہنے لگا کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہمیں ہمارے ملک سے [۳۹] نکال دے؟ (۵۷) سو ہم بھی اس قسم کا جادو لاتے ہیں لہٰذا اپنے اور ہمارے درمیان (مقابلہ کیلئے) ایک وقت مقرر کر لے جس کی خلاف ورزی نہ تم کرو نہ ہم کریں۔ اور اس جگہ پہنچنا (دونوں کے لئے) یکساں [۴۰] ہو" (۵۸) موسیٰ نے جواب دیا: "اچھا یہ وعدہ [۴۱] عید کا دن ہے

کی میت مٹی بن کر مٹی ہی میں رَل مل جاتی ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ انبیاء کے اجسام کو مٹی نہیں کھاتی اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی سب لوگوں کو مٹی کھا جاتی ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء کے جسم کو تو بہر حال نہیں کھاتی اور بعض دوسرے لوگ بھی ایسے ہو سکتے ہیں جن کے اجسام ان کی قبروں میں محفوظ ہوں۔ اور تیسرا مرحلہ بعث بعد الموت ہے۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ اس مٹی میں ملے ہوئے ذرات کو جمع کر کے سب لوگوں کو زندہ کر کے اپنے حضور حاضر کرے گا۔ گویا پہلے دو مراحل تیسرے مرحلہ کے لئے دلیل کا کام دیتے ہیں۔

[۳۸] فرعون سے موسیٰ علیہ السلام کی پہلی ملاقات کے بعد یہاں درمیان کے کئی مراحل کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ اسی دوران موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو اپنی رسالت کی دلیل میں کئی نشانیاں بھی دکھائیں۔ جن کا ذکر قرآن میں متعدد مقامات پر آیا ہے جب ملک پر کوئی آفت نازل ہوتی تو وہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے کہتا کہ اپنے پروردگار سے دعا کرو۔ اگر یہ آفت دور ہو گئی تو ہم تم پر ایمان لے آئیں گے۔ پھر جب سیدنا موسیٰ کی دعا سے وہ آفت دور ہو جاتی تو وہ وعدہ خلافی کرتا اور پھر سے اکڑ جاتا تھا اور ایسا معاملہ کئی بار پیش آتا رہا۔ اور حقیقت یہ تھی کہ فرعون کو سیدنا موسیٰ کی رسالت کا یقین تو ہو چکا تھا مگر وہ اپنے اقتدار سے کسی قیمت پر الگ ہونے کو تیار نہ تھا۔ لہٰذا ہر بار انکار کر دیتا تھا۔

[۳۹] فرعون کے اس قول سے اس کی بدحواسی پورے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ ورنہ اس کے ملک میں سینکڑوں جادوگر موجود تھے جو لوگوں کو اور اسے بھی اپنی شعبدہ بازیاں دکھاتے اور انعام و اکرام حاصل کر کے چلے جاتے تھے۔ ان میں سے کسی کے متعلق کبھی فرعون کو ایسا خیال نہ آیا تھا کہ یہ قحط بھی لا سکتے ہیں اور فرعون کو ملک بدر بھی کر سکتے ہیں۔ اور جو موسیٰ علیہ السلام کو جادوگر کہنے کا ڈھونگ رچا رکھا تھا تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ اس کی رعایا ان سے متاثر ہو کر ان پر ایمان نہ لے آئے۔

[۴۰] موسیٰ علیہ السلام خود بھی ایسا مقابلہ چاہتے تھے تاکہ عام لوگوں کے ذہنوں پر جو فرعون کے جھوٹے پروپیگنڈا کے اثرات پڑ رہے تھے وہ زائل ہو سکیں۔ اور لوگ خود حق اور باطل میں امتیاز کر سکیں۔

[۴۱] ❁ جادوگری کا مقابلہ اور موسیٰ علیہ السلام کی دو شرطیں:۔ فرعون کا یہ چیلنج دراصل موسیٰ علیہ السلام کے دل کی آواز تھی۔ مگر ایسا کھلے میدان میں مقابلہ کرانا ان کے وسائل سے خارج تھا۔ فرعون نے چیلنج کیا تو آپ نے اسے غنیمت سمجھتے ہوئے فوراً قبول کر لیا۔ اور ساتھ دو باتیں یا شرائط اور بھی کہہ ڈالیں۔ ایک تو یہ مقابلہ صرف کھلے میدان میں ہی نہیں بلکہ سالانہ جشن کے دن ہونا چاہئے۔ جبکہ لوگ ہر طرف سے کھنچ کر دار السلطنت میں میلہ دیکھنے آتے ہیں۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس مقابلہ کو

وَاَنْ یُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿۵۹﴾ فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿۶۰﴾ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا
تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿۶۱﴾ فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَ
اَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿۶۲﴾ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا
بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿۶۴﴾ قَالُوْا

اور لوگ چاشت کے وقت جمع ہوں" (۵۹) چنانچہ فرعون لوٹ گیا اور اپنے سارے ہتھکنڈے [۴۲] جمع کئے اور مقابلہ پر آ گیا۔ (۶۰) اس وقت موسیٰ نے لوگوں سے کہا: "تم پر افسوس! اللہ کے ذمہ جھوٹی باتیں نہ لگاؤ ورنہ وہ عذاب سے تمہیں غارت کر دے گا۔ کیونکہ جس نے بھی جھوٹ [۴۳] گھڑا، ناکام ہی رہا۔ (۶۱) پھر اس معاملہ میں وہ (آل فرعون) آپس میں جھگڑنے لگے اور خفیہ [۴۴] مشورہ کرنے لگے۔ (۶۲) آخر کچھ لوگوں نے کہا: "یہ دونوں جادوگر ہیں اور چاہتے یہ ہیں کہ جادو کے زور سے تمہیں تمہارے ملک سے نکال دیں اور تمہارے مثالی طریقِ زندگی کو ختم کر دیں۔ (۶۳) لہٰذا اپنی سب تدبیریں اکٹھی کر دو اور متحد ہو کر مقابلہ میں آؤ اور سمجھ لو کہ جو آج غالب رہا وہ جیت گیا" (۶۴) پھر (موسیٰ سے)

دیکھ سکیں۔ اور دوسرے یہ کہ یہ مقابلہ دن کی صاف روشنی میں چاشت کے وقت ہونا چاہئے تاکہ لوگوں کو اس مقابلہ کے دیکھنے اور اس سے نتیجہ اخذ کرنے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہ رہے۔

[۴۲] یہ مقابلہ صرف جادوگروں کی ہار جیت کا مسئلہ نہ تھا بلکہ دراصل یہ مسئلہ فرعون کے برسراقتدار رہنے یا نہ رہنے کا تھا۔ لہٰذا ملک بھر کے ماہر جادوگروں کو اکٹھا کرنے کے لئے اس نے اپنے مقدور بھر جتن کر لئے اور وعدہ کے دن فرعون ان جادوگروں اور اپنے لاؤ لشکر سمیت میدان مقابلہ میں بروقت پہنچ گیا۔ اسی طرح سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور ان کا بھائی بھی بروقت پہنچ گئے۔

[۴۳] ۞ مقابلہ سے پہلے فرعونیوں کو موسیٰ علیہ السلام کی تنبیہ:۔ موسیٰ علیہ السلام نے اکابرین قوم فرعون کو مخاطب کرتے ہوئے ایک بار پھر تنبیہ کی اور فرمایا: شامت کے مارو! اب بھی سمجھ جاؤ اور معجزہ کو جادو نہ بتاؤ۔ جب کہ تم حقیقت کو پوری طرح سمجھ چکے ہو تو دوسروں کی آنکھوں میں دھول نہ ڈالو۔ اور جو شخص حق کو سمجھ لینے کے بعد اس کا انکار کرے گا اللہ اسے اپنے عذاب سے دوچار کر دے گا۔ تمہارا جھوٹا پروپیگنڈا جھوٹ ہی ثابت ہوگا اور جھوٹ کبھی تادیر چل نہیں سکتا۔

[۴۴] ۞ اکابرین فرعون میں اختلاف:۔ اکابرینِ قوم فرعون پر آپ کی نصیحت کا خاصا اثر ہوا اور وہ آپس میں اختلاف کرنے لگے۔ ایک فریق کہتا تھا کہ ان پیغمبروں کا مقابلہ کرنا اپنی شکست کو دعوت دینا ہے۔ دوسرا کہتا تھا کہ ابھی اس مقابلہ کو ملتوی کر دیا جائے جبکہ مقابلہ کے دیکھنے کے لئے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ اس حال میں یہ اکابرین علیحدہ چلے گئے اور سر جوڑ بیٹھے تاکہ کسی ایک فیصلہ پر اتفاق رائے ہو جائے۔ اس مشورہ میں ماہر جادوگروں کو بھی شریک کیا گیا ان میں سے بعض کہنے لگے کہ ایسے نورانی چہرے جادوگر نہیں ہو سکتے۔

يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى (٦٥) قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ
يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى (٦٦) فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى (٦٧) قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ
الْاَعْلٰى (٦٨) وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ۭ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى (٦٩)

کہنے لگے: ''موسیٰ تم ڈالتے ہو یا پہلے ہم ڈالیں؟[۴۶]'' (۶۵) موسیٰ نے کہا: ''تم ہی ڈالو'' پھر ان کے جادو کے اثر سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی رسیاں اور لاٹھیاں یکدم دوڑنے لگی ہیں۔ (۶۶) یہ دیکھ کر موسیٰ اپنے دل میں[۴۷] ڈر گئے۔ (۶۷) ہم نے (وحی کے ذریعہ) اسے کہا: ڈرو مت، غالب تم ہی رہو گے (۶۸) جو کچھ تمہارے دائیں ہاتھ میں ہے اسے پھینک دو جو کچھ ان جادوگروں نے بنا رکھا ہے وہ سب کچھ ہڑپ کر جائے گا[۴۸]۔ انہوں نے تو صرف جادو کی فریب کاری ہی بنائی ہے اور جادوگر جہاں بھی (حقیقت کے مقابلہ میں) آئے کامیاب نہیں ہوسکتا۔ (۶۹)

[۴۵] ۞ **فرعونیوں کے خفیہ مشورے اور مقابلہ کے وقت متحد رہنے کی تلقین:۔** اس علیحدہ مجلس میں ان لوگوں نے، جو جادوگروں کو اکٹھا کرنے میں پیش پیش تھے، اس بات پر زور دیا کہ اب اختلاف کرنے کا موقع نہیں رہا۔ اب تو سب کو اس مقابلہ کے انعقاد پر متفق ہونا ہی بہتر ہے۔ مقابلہ نہ کرنا یا اسے ملتوی کرنا دونوں باتیں ہمارے لئے نقصان دہ اور ہماری شکست کے مترادف ہیں۔ کچھ دوسروں نے کہا کہ اگر تم نے مقابلہ نہ کیا یا تم ہار گئے تو سمجھ لو کہ تمہاری شامت آجائے گی۔ حکومت تم سے چھن جائے گی۔ بنی اسرائیل کے تم غلام بن جاؤ گے۔ پھر جو سلوک وہ چاہیں تم سے کریں تمہیں اس ملک میں رہنے بھی دیں یا نکال باہر کریں۔ تم انہیں کے رحم و کرم پر ہو گے۔ تمہاری یہ تہذیب اور تمدن، تمہاری یہ ثقافت اور عیش و طرب کی محفلیں ایسی سب چیزوں کا جنازہ نکل جائے گا۔ لہٰذا اب صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرو اور جادوگروں کی خوب حوصلہ افزائی کرو اور یہ سمجھ لو کہ آج کا دن شعبدہ بازی کے مقابلے کا دن نہیں بلکہ تمہاری ہار جیت کا دن ہے۔ جو ہار گیا سو مارا گیا اور جو جیت گیا بالآخر اسی کا بول بالا ہوگا۔

[۴۶] ۞ **مقابلہ میں جادوگروں کی پہل:۔** اس اتحاد کے بعد جادوگر میدان مقابلہ میں آگئے اور موسیٰ سے کہنے لگے: پہلے تم اپنا شعبدہ دکھاؤ گے یا ہم پہل کریں؟'' انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے یہ استفسار از راہ تکریم کیا تھا جیسا کہ مقابلہ میں اکثر یہ دستور چلتا ہے۔ اس کا جواب موسیٰ نے یہ دیا کہ پہلے تم ہی اپنے شعبدے دکھاؤ۔ ان کا یہ جواب از راہ تکریم نہیں تھا۔ کیونکہ جادوگر کوئی قابل عزت شے نہیں ہوتا۔ بلکہ اس لئے تھا کہ حق نکھر کر سامنے آجائے۔ باطل اپنا جتنا زور لگا سکتا ہے لگا لے پھر اگر اس کے بعد حق اس پر غالب آگیا تو سب لوگ حقیقت کو جان لیں گے۔

[۴۷] ۞ **بذریعہ وحی کامیابی کی بشارت:۔** قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر ہے کہ جادوگروں نے بہت بڑا جادو پیش کیا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں ان جادوگروں کی لاٹھیاں اور رسیاں لوگوں کے سامنے سانپوں کی طرح حرکت کر رہی تھیں اور ایسے سانپوں سے میدان مقابلہ بھر گیا تھا۔ ان سانپوں نے لوگوں کو دہشت زدہ کر دیا تھا اور فرعون اور اس کے خاص درباری ان جادوگروں کے کارنامے پر دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے اور ان کی داد دے رہے تھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام خود بھی دل میں ڈرنے لگے تھے کہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس مقابلہ کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی کہ ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور یہ بشارت بھی سنا دی کہ تم ہی کامیاب رہو گے۔

[۴۸] ۞ **شعبدہ بازی کا اہلاک:۔** بس تم اتنا کام کرو کہ اس میدان میں اپنا عصا پھینک دو۔ یہ عصا ایک بہت بڑا اژدھا بن کر

فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ﴿۷۰﴾ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۭ اِنَّهٗ
لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ
جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ﴿۷۱﴾ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰي مَا جَاۗءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ

چنانچہ (یہ منظر دیکھ کر) جادوگر بے ساختہ سجدہ میں گر پڑے۔ کہنے لگے: ''ہم ہارون اور موسیٰ کے پروردگار پر ایمان[۴۹] لے آئے''(۷۰) فرعون بول اٹھا: ''تم میری اجازت کے بغیر ہی اس پر ایمان لے آئے، یقیناً موسیٰ تمہارا بڑا گرو ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا[۵۰] ہے۔ اب میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں میں کٹوا دوں گا اور کھجور کے تنوں میں تمہیں سولی چڑھاؤں گا اور تمہیں خوب معلوم ہو جائے گا کہ ہم دونوں (میں اور موسیٰ) میں سے کس کی سزا اشدید تر اور دیرپا ہے''(۷۱)

جادوگر کہنے لگے: ''جس ذات نے ہمیں پیدا کیا ہے اور جو کچھ ہمارے پاس واضح دلائل آ چکے ہیں ان پر ہم تجھے

ان سب نقلی اور مصنوعی سانپوں کو ہڑپ کر جائے گا اور اس میدان میں اس اژدھا کے سوا کوئی چیز نہ رہ جائے گی۔ جادوگروں کی شعبدہ بازیاں، ان کی لاٹھیاں اور رسیاں کسی چیز کا وجود تک باقی نہ رہے گا۔ وجہ یہ ہے کہ بعض علماء نے تلقف ما صنعوا کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ عصا سے بنا ہوا اژدھا جس طرف رخ کرتا اور جہاں جہاں پہنچتا وہاں سے شعبدہ کا اثر ختم ہوتا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ آخر میں جادوگروں کی وہ لاٹھیاں اور رسیاں ہی میدان میں رہ گئیں۔ جو جادوگر اپنے ساتھ لائے تھے۔ ہمارے خیال میں یہ دوسری توجیہ درست نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ تلقف کا معنی نگل جانا یا نوالہ بنالینا تو لغوی لحاظ سے درست ہے لیکن یہ لفظ باطل کرنے یا بنانے کے معنوں میں نہیں آتا۔

[۴۹] ۞ جادوگروں کا ایمان لانا:۔ جادوگروں نے غالباً پہلے سیدنا موسیٰ کے عصا کو اژدھا بنتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ انہیں بس اتنا ہی بتایا گیا تھا کہ ایک شخص جادو کے زور سے اپنی لاٹھی کو سانپ بنا دیتا ہے اور تمہیں اس کا مقابلہ کرنا ہے اور جادوگروں نے جب بچشم خود یہ دیکھ لیا کہ عصا سے بنا ہوا اژدھا ان کے بنے ہوئے سانپوں کو نگل بھی گیا ہے تو انہیں معلوم ہو گیا کہ یہ بات جادو کے علم کی بساط سے باہر ہے۔ اور موسیٰ و ہارون جادوگر نہیں بلکہ فی الواقع اللہ کے رسول ہیں اور جب ان پیغمبروں نے فتح کی خوشی میں اللہ کے سامنے سجدہ شکر ادا کیا تو جادوگر بھی بے اختیار ان کے ساتھ سجدہ ریز ہو گئے اور بھری مجلس میں ان رسولوں پر اپنے ایمان لانے کا اعلان بھی کر دیا (معجزہ اور جادو کے فرق کے لئے دیکھئے سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۱۳ کا حاشیہ)

[۵۰] ۞ فرعون نے ایمان لانے والے جادوگروں کو اتنی سخت دھمکی کیوں دی؟ ایک تو فرعون اور اس کے حواری مقابلہ کے میدان میں مات کھا چکے تھے جسے لوگوں کی ایک کثیر تعداد نے بچشم خود دیکھ لیا تھا۔ دوسرے یہ ستم ہوا کہ جن جادوگروں کے بل بوتے پر یہ مقابلہ رچایا گیا تھا وہ کوئی عذر معذرت کرنے کے بجائے خود ایمان لے آئے تو اس دوہری شکست نے فرعون کو بیخ پا کر دیا۔ اور لوگوں کو مزید کچھ عرصہ کے لئے الو بنائے رکھنے اور موسیٰ علیہ السلام کی دعوت سے بچائے رکھنے کے لئے یہ تدبیر سوچی کہ ان جادوگروں کو ہی غداء اور جاسوس قرار دیا جائے اور اعلان کر دیا کہ فی الواقع یہ جادوگر موسیٰ کے شاگرد معلوم ہوتے

وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝۷۲ۭ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝۷۳ اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ۭ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰي ۝۷۴ وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰۗىِٕكَ

کبھی ترجیح نہیں دے سکتے۔ لہٰذا جو کچھ تو کرنا چاہتا ہے کر لے۔ تو تو بس اس دنیا کی زندگی کا ہی خاتمہ کر سکتا ہے[۵۱]۔ (۷۲)
بلاشبہ ہم اپنے پروردگار پر ایمان لا چکے ہیں تاکہ وہ ہماری خطائیں معاف کر دے اور وہ جادو بھی جس پر تو نے ہمیں مجبور کر دیا تھا۔ اور اللہ ہی بہتر اور سدا باقی رہنے والا ہے" (۷۳) بات یہ ہے[۵۲] کہ جو شخص مجرم بن کر اپنے پروردگار کے پاس آئے گا اس کے لئے جہنم ہے جس میں وہ نہ مرے گا[۵۳] اور نہ جئے گا۔ (۷۴) اور جو مومن بن کر آئے اور اس نے اعمال بھی

ہیں اور ان دونوں کا مشن ایک ہی تھا۔ تبھی تو جادوگروں نے فوراً گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔ لہٰذا اے جادوگرو! میں تمہیں ایسی اور ایسی سزا دوں گا جسے تمہاری نسلیں بھی یاد رکھیں گی اور تمہیں موسیٰ پر ایمان لانے کا انجام خوب معلوم ہو جائے گا۔ تم ایمان لا کر یہ سمجھ رہے ہو کہ تم ہی نجات پانے والے ہو اور دوسرے لوگ جو موسیٰ پر ایمان نہیں لائے وہ ابدی عذاب میں مبتلا رہیں گے سو ابھی تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس کا عذاب سخت اور تادیر رہنے والا ہے۔

[۵۱] ۞ جادوگروں کی جرأت ایمانی: اس سزا کے اعلان پر جادوگر فرعون سے بڑی جرأت سے کہنے لگے: تم جو چاہے سمجھو ہم نے تو وہی بات کہی ہے جس کی ہمارے ضمیر نے شہادت دی ہے۔ ہم سب کچھ سمجھ سوچ کر ایمان لائے ہیں۔ لہٰذا اب تم جو سزا دینا چاہو دے لو۔ زیادہ سے زیادہ تم یہی کچھ کر سکتے ہو کہ ہمیں جان سے مار ڈالو گے، اور اس بات کی اب ہمیں پروا نہیں رہی۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری سابقہ خطائیں معاف فرما دے اور بالخصوص اس گناہ کو جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا اور ہم ان پیغمبروں کے مقابلہ پر اتر آئے۔ کہتے ہیں کہ جب جادوگروں نے سیدنا موسیٰ اور سیدنا ہارون کی شکل و صورت دیکھی تو سمجھ گئے کہ یہ جادوگر نہیں ہو سکتے یہ مقابلہ نہ کرنا چاہئے پھر فرعون کے ڈر سے ایسا کیا۔

یہ ہے ایمان اور کفر کا فرق۔ یہی جادوگر مقابلہ سے پہلے فرعون کے سامنے جی حضور، جی حضور کہتے تھکتے نہ تھے۔ کہ فتح ہونے کی صورت میں اس سے انعام و اکرام ملنے کی التجا بھی کر رہے تھے اور فرعون انہیں ایسے وعدے بھی دے رہا تھا مگر جب ایمان لے آئے تو اسی جابر بادشاہ کے سامنے اکڑ کر اس جرأت سے بات کرتے ہیں کہ اگر وہ سولی چڑھا دینے کی دھمکیاں دیتا ہے تو اس کی پروا تک نہیں کرتے۔

[۵۲] ایمان لانے والے جادوگروں کا بیان ختم ہو کر اب یہ آیت اور اس سے اگلی دو آیات اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ جن میں ساتھ ہی ساتھ تذکیر و نصائح اور ارشادات کا سلسلہ بھی حسب دستور چل رہا ہے۔

[۵۳] دنیا کی تکلیفیں خواہ کس قدر زیادہ اور سخت ہوں موت ان سب کا خاتمہ کر دیتی ہے اور دوزخ میں کافر کو سب سے بڑی جو سزا ملے گی وہ یہ ہوگی کہ اسے موت نہیں آئے گی۔ وہ موت کو ایسی مصیبت کی زندگی پر ترجیح دے گا اور اس کا مطالبہ بھی کرے گا مگر اسے موت نصیب نہ ہوگی۔ اور زندگی موت سے بھی بدتر ہوگی۔

لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ﴿٧٥﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴿٧٦﴾ۧ وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ڏ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ﴿٧٧﴾ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ

٣ ع ١٢

نیک کئے ہوں تو ایسے ہی لوگوں کے لئے بلند درجات ہیں۔(۷۵) (اور) سدا بہار باغات جن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اس شخص کے لئے جزا ہے جو (گناہوں سے) پاک[۵۴] رہا۔(۷۶) اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ "میرے بندوں کو راتوں رات لے کر نکل جاؤ۔ پھر ان کے لئے سمندر میں خشک راستہ بناؤ۔ تمہیں نہ تو تعاقب کا خوف ہو اور نہ (ڈوب جانے کا) ڈر ہو"(۷۷) پھر فرعون نے اپنے لاؤ لشکر سمیت ان کا پیچھا کیا تو سمندر نے انہیں یوں ڈھانپ لیا[۵۵]

[۵۴] یعنی فاسد عقائد سے، اخلاق رذیلہ سے، گندے خیالات سے اور برے اعمال سے اپنے آپ کو بچائے رکھا۔ ایمان لانے کے بعد اچھے عمل کرتے رہے، انہیں نعمتوں والی جنت میں بلند درجات عطا کئے جائیں گے۔

[۵۵] سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور بنواسرائیل کی بحر احمر کے ساحلی راستے سے شام و فلسطین کو ہجرت:۔ اس مقام پر جادوگروں کے مقابلہ کے بعد پھر بہت سے واقعات چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ دریں عرصہ آپ کی تبلیغ سے بہت سے اسرائیلی اور غیر اسرائیلی آپ پر ایمان لا چکے تھے۔ لیکن ان ایمان لانے والوں کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ بالخصوص بنی اسرائیل کے لئے تو وہی سزا شروع ہو چکی تھی جو موجودہ دور کے فرعون کے باپ نے اپنے دور میں بنی اسرائیل کو دی تھی۔ یعنی بنی اسرائیل کے ہاں جو لڑکے پیدا ہوں فوراً مار ڈالے جائیں اور لڑکیوں کو زندہ رکھا جائے۔ اگرچہ باپ اور بیٹے دونوں کے مقاصد میں فرق تھا۔ باپ یہ چاہتا تھا کہ بنی اسرائیل میں سے میری سلطنت کو زیر و زبر کرنے والا بچہ پیدا ہوتے ہی مار ڈالا جائے اور بیٹے کا مقصد یہ تھا کہ موسیٰ اور ہارون جو بنی اسرائیل کی آزادی کا اور ہمراہی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ تو ان کی نسل ہی ختم کر دو تاکہ اس مطالبہ کی نوبت ہی نہ آئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ارادے پورے ہو کے رہتے ہیں اور وہ خود ہی ان کے لئے راہ بتا دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی کہ آج میرے بندوں کو لے کر راتوں رات نکل جاؤ۔ آپ نے دارالسلطنت کے مختلف مقامات میں بکھرے ہوئے ایمان لانے والوں کو انتہائی خفیہ طریقہ سے اطلاع کر دی۔ ان میں غیر اسرائیلی بھی شامل تھے۔ اگرچہ تھوڑے سے تھے اور ایک مخصوص مقام بتا دیا گیا کہ رات کے فلاں وقت فلاں مقام پر سب لوگ اکٹھے ہو جائیں۔ وہاں سے ہجرت کر کے آپ شام و فلسطین کی طرف جانا چاہتے تھے۔ جو بنی اسرائیل کا آبائی وطن تھا وہ سیدنا یوسفؑ کے زمانہ میں یہاں آ کر آباد ہوئے تھے اور اس دور تک ان کی نسل کے افراد ایک لاکھ سے بہت زیادہ ہو چکے تھے۔ سیدنا موسیٰ نے اس قافلہ کو لے کر بحر احمر کا رخ اختیار کیا۔ ان دنوں نہر سویز موجود نہیں تھی اور آپ کا ارادہ یہ تھا کہ بحر احمر کے کنارے کنارے چل کر جزیرہ نمائے سینا میں داخل ہو جائیں گے۔

فرعونیوں کا تعاقب:۔ ابھی اس سمندر کے کنارے کنارے ہی جا رہے تھے کہ فرعون اپنے لاؤ لشکر سمیت ان کے تعاقب میں سر پر آ پہنچا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ سامنے سمندر تھا اور پیچھے فرعون کا لشکر۔ ہر طرف موت نظر آ رہی تھی۔ بنی اسرائیل یہ صورت حال دیکھ کر سخت گھبرا گئے اور کہنے لگے: "موسیٰ! ہم تو مارے گئے" اس وقت اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ پر وحی نازل فرمائی

مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿٧٨﴾ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ﴿٧٩﴾ يٰبَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ
مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ﴿٨٠﴾ كُلُوْا مِنْ
طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ
غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ﴿٨١﴾ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿٨٢﴾

جیسے ڈھانپنے کا حق تھا۔ (۷۸) اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ ہی کیا، سیدھی راہ [۵۶] نہ دکھائی۔ (۷۹) اے بنی اسرائیل! ہم نے تمہیں تمہارے دشمن سے نجات دی اور طور کی دائیں جانب تمہیں (کتاب دینے کا) وعدہ دیا اور تم پر من اور سلویٰ اتارا۔ (۸۰) (اور کہا کہ) ہم نے جو پاکیزہ چیزوں کا تمہیں رزق دیا ہے اس سے کھاؤ اور کھا کر سرکشی [۵۷] نہ کرو۔ ورنہ تم پر میرا غضب نازل ہوگا اور جس پر میرا غضب نازل ہوا وہ تو گر کر ہی رہا۔ (۸۱) اور جو شخص توبہ کرے، ایمان لائے، اچھے عمل کرے اور راہ راست پر گامزن رہے تو اس سے میں یقیناً بہت درگزر کرنے والا ہوں۔ (۸۲)

کہ اپنا وہی سانپ بن جانے والا عصا سمندر کے پانی پر مارو۔ عصا کو پانی پر مارنا تھا کہ سمندر میں کشادہ سڑک بن گئی۔ پانی کی ایک دیوار ایک طرف کھڑی تھی اور دوسری طرف اللہ نے ہواؤں کو حکم دیا جس سے نچلی زمین خشک ہوگئی اور اس سڑک کے راستہ سے بنی اسرائیل اس سمندر کو عبور کر گئے۔

❁ **فرعونیوں کی غرقابی:۔** یہ لوگ ابھی دوسرے کنارے پر پہنچے ہی تھے کہ فرعون کا لشکر بھی کنارے پر پہنچ گیا۔ اس نے کھلا راستہ دیکھا تو فوراً اپنے گھوڑے اس میں ڈال دیئے۔ بنی اسرائیل دوسرے کنارے کھڑے یہ سب صورت حال دیکھ رہے تھے۔ اور سخت دہشت زدہ تھے۔ جب فرعون کا لشکر عین وسط میں پہنچ گیا تو اللہ تعالیٰ نے پانی کو رواں ہونے کا حکم دے دیا۔ پانی بڑے زور سے غراتا ہوا بہہ نکلا۔ اب فرعون اور فرعونیوں کو اپنی موت نظر آنے لگی تو فرعون فوراً پکار اٹھا کہ ''میں بنی اسرائیل کے رب پر ایمان لاتا ہوں'' مگر اب ایمان لانے کا وقت گزر چکا تھا۔ اس طرح فرعون کا یہ سارا اعظیم الشان لشکر اس سمندر کی تہہ میں ڈوب گیا اور اوپر سے سمندر اپنی پوری روانی سے بہنے لگا اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل پر بیک وقت تین احسان فرمائے (۱) فرعونیوں سے نجات، (۲) سر پر کھڑی موت کے بعد زندگی، (۳) دشمن کی مکمل طور پر ہلاکت۔ اور یہ واقعہ ۱۰ محرم کو پیش آیا تھا۔

[۵۶] اپنی قوم کے سامنے فرعون کا دعویٰ تو یہ تھا کہ میں تمہیں سیدھی راہ دکھاتا ہوں۔ مگر وہ سیدھی نہ تھی بلکہ گمراہی کی تھی اور ظاہری طور پر بھی وہ قوم کے آگے چلا تو انہیں سمندر میں لا ڈبویا اور قیامت کو بھی اپنی قوم کے آگے آگے چلے گا تو انہیں جہنم میں جا داخل کرے گا۔

[۵۷] ❁ **میدان تیہہ میں بنی اسرائیل پر اللہ کے انعامات:۔** یہاں پھر کئی تفصیلات کا ذکر چھوڑ دیا گیا ہے، جو دوسرے مقامات پر موجود ہے۔ مثلاً اسی سفر میں بنی اسرائیل نے ایک مندر میں بعض لوگوں کو بت پوجتے دیکھا تو کہنے لگے۔ موسیٰ! ہمیں بھی اس طرح کا ایک الٰہ یعنی محسوس خدا کا مجسمہ بنا دو۔ جس پر موسیٰ علیہ السلام نے انہیں ڈانٹ پلائی۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے انہیں اس سفر ہجرت کا مقصد بتایا کہ تمہیں اپنے آبائی وطن کو غیروں کے قبضہ سے آزاد کرانا اور خود وہاں آباد ہونا ہے تو کہنے لگے! موسیٰ! وہاں تو

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿٨٣﴾ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ
لِتَرْضٰى ﴿٨٤﴾ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿٨٥﴾

اور اے موسیٰ! ”کون سی چیز تمہیں اپنی قوم سے پہلے یہاں لے آئی؟“ (۸۳) موسیٰ نے عرض کیا: ”وہ لوگ بھی میرے پیچھے آ ہی رہے ہیں اور میں نے آپ کے حضور آنے میں اس لئے جلدی کی تا کہ آپ مجھ سے [۵۸] خوش ہو جائیں“ (۸۴) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”ہم نے تیرے بعد تیری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا اور انہیں سامری [۵۹] نے گمراہ کر دیا ہے“ (۸۵)

بڑے طاقتور اور جنگجو قسم کے لوگ آباد ہیں۔ ہم ان سے جنگ نہیں کر سکتے۔ ہاں اگر وہ وہاں سے نکل جائیں تو پھر ہم داخل ہو سکتے ہیں یا پھر تم اور تمہارا رب جا کر ان سے جنگ کرو۔ ہم میں اتنی ہمت نہیں۔ ان کی اس بزدلانہ حرکت کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا کے طور پر یہ حکم دیا کہ اب تم یہیں اسی میدان میں چالیس سال تک بھٹکتے پھرو۔ جس سے مقصد ان کی بزدلی کا علاج اور ان میں جرأت پیدا کرنا تھا۔ ایک تو جنگل کی زندگی ویسے ہی دلیر بنا دیتی ہے۔ دوسرے بڑے بوڑھے سب بزدل اتنے عرصہ میں مرکھپ جائیں گے اور جو نئی نسل پیدا ہو گی وہ غلامی کے بجائے آزادانہ فضا میں پرورش پائے گی وہ جرأت مند پیدا ہو گی۔

اس بیابان میں نہ رہنے کو مکان تھے اور نہ کوئی چیز کھانے کو ملتی یا پیدا ہوتی تھی نہ کہیں پانی کے چشمے یا گھاٹ تھے پھر یہ بنی اسرائیل بھی لاکھ سے زائد نفوس پر مشتمل تھے۔ اللہ نے بنی اسرائیل کے ان مسائل کا حل ایسے معجزانہ انداز میں فرمایا کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ دھوپ کے وقت بادل سائبان کی طرح ان پر چھا جاتے مگر برستے نہیں تھے۔ اور رات کو غائب ہو جاتے۔ اسی میدان میں اللہ تعالیٰ نے ان کے کھانے کو من وسلویٰ نازل فرمایا اور پانی کے بارہ چشمے جاری کر دیئے۔ ان واقعات کی تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ یہ سب نعمتیں عطا کرنے کے بعد اللہ نے انہیں حکم دیا کہ اب نہ زیادتی کرنا اور نہ سرکشی۔ زیادتی یہ تھی کہ ذخیرہ اندوزی کر کے دوسرے لوگوں کو ان کے حق سے محروم نہ بنا دینا اور سرکشی نہ کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اللہ کی ان نعمتوں کے ملنے پر اس کا شکر ادا کرتے رہنا اور اس کے عبادت گزار اور فرمانبردار بندے بن کر رہنا اور اگر اب بھی تم نے سرکشی کا راستہ اختیار کیا تو یاد رکھو کہ پھر تم پر اللہ کا عذاب نازل ہو گا جو تمہیں تباہ و برباد کر دے گا۔

[۵۸] سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا اپنے ہمراہیوں سے پہلے طور پر پہنچ جانا: اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ فرمایا تھا کہ کوہ طور کے دامن میں پہنچ کر چالیس راتیں وہاں بسر کرنا تو تمہیں بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے کتاب تورات عطا کی جائے گی۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل میں سے ستر آدمی اپنے ہمراہ لئے اور طور کی جانب روانہ ہو گئے۔ لیکن آپ کو اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور ہم کلامی کا کچھ اتنا زیادہ اشتیاق تھا کہ آپ اپنے ہمراہیوں کو پیچھے چھوڑ کر سب سے پہلے منزلِ مقصود پر جا پہنچے۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ ”تمہیں اتنی کیا جلدی تھی کہ اپنے ہمراہیوں کو پیچھے چھوڑ کر پہلے ہی یہاں آ پہنچے؟“ عرض کیا وہ لوگ بھی میرے پیچھے پیچھے یہاں پہنچ ہی رہے ہیں اور مجھے تیری ملاقات کا اشتیاق ان سے پہلے یہاں کھینچ لایا ہے۔ پھر اسی موقعہ پر آپ نے اپنے پروردگار سے درخواست کی تھی کہ اے میرے پروردگار! مجھے اپنا آپ دکھا دے اور یہ واقعہ سورۂ بقرہ میں پوری تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔

[۵۹] بنی اسرائیل کی گئوسالہ پرستی اور لفظ السامری کی تحقیق:۔ جب آپ کوہِ طور پر عبادت میں مصروف تھے اور اس انتظار میں تھے کہ چالیس دن پورے ہونے پر اللہ تعالیٰ کتاب ہدایت عطا فرمائیں تو اسی دوران آپ کی قوم نے آپ کے بعد پھر سے بچھڑے کی

فَرَجَعَ مُوسَىٰٓ إِلَىٰ قَوْمِهِۦ غَضْبَٰنَ أَسِفًا ۚ قَالَ يَٰقَوْمِ أَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ
أَفَطَالَ عَلَيْكُمُ ٱلْعَهْدُ أَمْ أَرَدتُّمْ أَن يَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَخْلَفْتُم
مَّوْعِدِى ﴿٨٦﴾ قَالُوا۟ مَآ أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلَٰكِنَّا حُمِّلْنَآ أَوْزَارًا مِّن زِينَةِ ٱلْقَوْمِ فَقَذَفْنَٰهَا
فَكَذَٰلِكَ أَلْقَى ٱلسَّامِرِىُّ ﴿٨٧﴾ فَأَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهُۥ خُوَارٌ فَقَالُوا۟ هَٰذَآ إِلَٰهُكُمْ وَإِلَٰهُ مُوسَىٰ

چنانچہ موسیٰ رنج کے مارے غصہ سے بھرے ہوئے اپنی قوم کی طرف واپس آئے اور ان سے کہا اے میری قوم! تم سے تمہارے پروردگار نے اچھا وعدہ نہ کیا تھا؟ کیا یہ زمانہ تم پر لمبا ہو گیا تھا یا تم یہ چاہتے تھے کہ تم پر تمہارے پروردگار کا غضب [۶۰] نازل ہو۔ لہٰذا تم نے میرے وعدہ کی خلاف ورزی کی؟" (۸۶) وہ کہنے لگے: ہم نے کچھ اپنے اختیار سے آپ سے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کی بلکہ (قبطی) قوم کے زیورات ہم پر لاد دیئے گئے تھے جنہیں ہم نے (آگ میں) ڈال دیا۔ پھر اسی طرح سامری نے بھی زیور (آگ میں) ڈال دیا۔ (۸۷) پھر وہ اس (ڈھلے ہوئے سونے سے) ایک بچھڑے کا جسم بنا لایا جس سے بیل کی سی [۶۱] آواز نکلتی تھی وہ لوگ کہنے لگے تمہارا اور موسیٰ کا الٰہ تو یہی ہے،

عبادت شروع کر دی۔ سامری نے ان کے لئے ایک بچھڑا تیار کیا اور یہ لوگ اس کی پوجا پاٹ میں لگ گئے۔

اس واقعہ کی اطلاع اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو وہیں کوہ طور پر دے دی۔ آپ کو اس اطلاع سے اپنی قوم پر غصہ تو بہت آیا مگر وہاں کا قیام بھی انتہائی ضروری تھا۔ لہٰذا آپ اپنے نفس پر جبر کر کے معینہ مدت تک وہیں رکے رہے۔

لفظ السامری سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ اس شخص کا اصلی نام نہیں تھا بلکہ کوئی خاص سامری شخص تھا۔ جیسا کہ پہلے تعریف کا ال موجود ہے۔ دوسرے آخر میں یائے نسبتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ سامر یا تو اس کے وطن کا نام تھا یا پھر سامر یا سمر اس کے کسی جد امجد کا نام تھا۔ جیسا کہ عرب میں اس کا عام دستور ہے۔

[۶۰] ۞ طور سے واپسی پر سیدنا موسیٰ کے بنی اسرائیل سے تین سوال:۔ موسیٰ علیہ السلام کتاب تورات لے کر جب واپس آئے تو سخت غضب ناک تھے۔ آپ نے آتے ہی اپنی قوم سے پے در پے تین سوال کئے۔ ایک یہ کہ اللہ نے جو تمہاری ہدایت کے لئے کتاب دینے کا وعدہ فرمایا تھا تو یہ گمراہی کی راہ تم نے از خود کیوں اختیار کی؟ کیا تمہیں اللہ کی ہدایت پسند نہیں تھی؟ دوسرا سوال یہ تھا کہ اللہ نے جتنی مدت بعد کتاب دینے کا وعدہ کیا تھا، کیا اسمیں کچھ تاخیر ہو گئی تھی، یا اس وعدہ کو طویل مدت گزر چکی تھی اور تم انتظار کرتے کرتے تھک گئے تھے پتہ نہیں کہ اللہ سے کب ہدایت آتی ہے یا آتی بھی ہے یا نہیں اس بنا پر تم نے خود ہی اپنے لئے ایک راہ تجویز کر لی اور اگر یہ دونوں درست نہیں تو پھر کیا تم ایسے شرکیہ کام کر کے اللہ کے غضب کو دعوت دینا چاہتے ہو؟ یہ گئو سالہ پرستی کا مرض ابھی تک تمہارے دلوں سے نکلا نہیں؟

[۶۱] ۞ قوم کا گئو سالہ پرستی پر عذر لنگ:۔ قوم نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کے سوالوں کا یہ جواب دیا کہ ہم نے عمداً کچھ ایسا قصد نہیں کیا تھا بلکہ ہوا یہ تھا کہ اس طویل سفر میں زیورات کا بوجھ ہمارے لئے ناقابل برداشت بن گیا تھا لہٰذا ہم چاہتے تھے کہ بجائے اس کے کہ ہمارے سب افراد یہ بوجھ اٹھائے رکھیں انہیں کیوں نہ اکٹھا کر کے پگھلا کر اس کی اینٹیں بنا لی جائیں تا کہ اس

فَنَسِيَ ﴿۸۸﴾ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ ۴ ع ۱۳
هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا
لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ﴿۹۱﴾ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ

موسیٰ تو بھول گیا (جو طور پر چلا گیا) (۸۸) کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ نہ تو وہ ان کی بات کا جواب دیتا ہے[۶۲] اور نہ ہی ان کے نفع ونقصان کا کچھ اختیار رکھتا ہے۔ (۸۹) اور اس سے پیشتر ہارون انہیں یہ کہہ چکے تھے کہ ''اس (بچھڑے کے جسم) سے تمہاری آزمائش کی جا رہی ہے۔ بلاشبہ تمہارا پروردگار رحمٰن ہی ہے لہٰذا میری پیروی کرو اور میرے حکم کی اطاعت کرو۔ (۹۰) وہ کہنے لگے: جب تک موسیٰ ہمارے پاس واپس نہیں آجاتا، ہم تو اسی کی پرستش کرتے رہیں[۶۳] گے'' (۹۱) (جب موسیٰ واپس آئے تو ہارون سے کہا) ''ہارون! جب تم انہیں گمراہ ہوتے دیکھ رہے تھے تو انہیں منع کرنے سے

کی نقل وحرکت میں آسانی ہو جائے اور دوسرے سامان کے ساتھ گدھوں اور بیلوں پر لادا جا سکے۔

اور اس میں ہر ایک کے زیور کی مقدار الگ الگ لکھ لی جائے اور جب کہیں مقیم ہوں گے تو اپنے اپنے حصہ کا سونا پھر سے بانٹ کر زیور بنوائے جا سکتے ہیں۔ اس خیال سے ہم سب لوگوں نے اپنے اپنے زیور اتار پھینکے اور اسی طرح سامری نے بھی اپنا زیور اس مجموعہ میں شامل کر دیا۔ سونے کو پگھلانے کا کام سامری کے ذمہ تھا۔ اس نے یہ شرارت کی کہ بجائے اس کے زیورات کو پگھلا کر سونے کی اینٹیں بناتا، اس کو بچھڑے کی شکل دے دی۔ پھر کچھ ایسا کرتب دکھایا کہ اس میں سے بچھڑے کی سی آواز بھی نکلتی تھی اور کہنے لگا کہ حقیقتاً تو یہی تمہارا الٰہ ہے۔ جو سونا پگھلانے پر آپ سے آپ اس شکل میں نمودار ہو گیا ہے۔ یہ لوگ مصر میں چونکہ بڑی مدت تک فرعونیوں کی دیکھا دیکھی بیل کی پرستش کرتے رہے تھے اور ابھی تک ان کے ذہن پوری طرح صاف نہیں ہوئے تھے لہٰذا جاہل عوام نے فوراً سامری کی آواز پر لبیک کہی اور کہنے لگے کہ اصل میں ہمارا اور موسیٰ کا بھی الٰہ تو یہ تھا۔ موسیٰ پتا نہیں طور پر کیا لینے گیا ہے؟ چنانچہ یہ معاملہ ہمارے اختیار سے باہر ہو گیا اور اکثریت کی دیکھا دیکھی ہمیں بھی یہی راہ اختیار کرنا پڑی۔

[۶۲] یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے یعنی ان بدبختوں کو اتنی بھی سمجھ نہ آئی کہ اگر اس میں سے بچھڑے کی سی آواز نکلتی بھی ہے تو وہ کیا ان کے سوال کا جواب دے سکتا ہے؟ بلکہ وہ تو سنتا بھی نہیں پھر جواب کیا دے گا؟ اور جو چیز نہ سن سکے نہ جواب دے سکے وہ کسی کا کیا بگاڑ سکتی ہے یا سنوار سکتی ہے؟ نیز وہ الٰہ کیسے ہو سکتی ہے؟

[۶۳] ۞ گؤسالہ پرستوں کی سیدنا ہارون کو دھمکی:۔ جب یہ لوگ گؤسالہ پرستی میں مبتلا ہونے لگے تو ہارون علیہ السلام نے بروقت ان کو تنبیہ کی تھی۔ یہ بچھڑا قطعاً تمہارا الٰہ نہیں ہے، تمہارا الٰہ صرف وہی ذات ہو سکتی ہے جو تمہارا خالق و مالک اور تمہارا پروردگار ہے۔ لہٰذا اس گؤسالہ پرستی سے باز آؤ اور میری بات مان لو اور سامری کے فریب میں نہ آؤ مگر یہ مدتوں سے بگڑی ہوئی قوم بھلا سیدنا ہارون جیسے نرم مزاج آدمی کے حکم کو کیا سمجھتی تھی؟ کہنے لگے: تم آرام سے بیٹھو اور اپنی خیر مناؤ۔ موسیٰ آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ سر دست ہم اس کام کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

[۶۴] ۞ سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور سیدنا ہارون علیہ السلام کا مکالمہ:۔ موسیٰ علیہ السلام قوم کی طرف سے یہ عذر لنگ سن کر اسی غصہ کی حالت

ضَلُّوْٓا ﴿۹۲﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿۹۳﴾ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ
خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۴﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ
يٰسَامِرِيُّ ﴿۹۵﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا
وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿۹۶﴾ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۠ وَاِنَّ

تمہیں کس بات نے روکے رکھا؟ (۹۲) کہ تم لوگ میری پیروی نہ کرو؟ کیا تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی [۶۴] کی؟'' (۹۳) ہارون نے جواب دیا: ''اے میرے ماں جائے بھائی! میری داڑھی اور میرے سر کے بال نہ پکڑو۔ مجھے اس بات کا اندیشہ تھا کہ تم آکر یہ نہ کہو کہ تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ [۶۵] ڈال دی اور میری بات کا لحاظ نہ رکھا'' (۹۴) پھر موسیٰ نے (سامری کی طرف متوجہ ہو کر) کہا: ''بتاؤ، سامری! تمہارا کیا معاملہ ہے؟'' (۹۵) سامری نے کہا: ''میں نے وہ چیز دیکھی جو دوسروں کو نظر نہ آئی۔ چنانچہ میں نے رسول کے نقشِ قدم سے ایک مٹھی اٹھالی [۶۶]۔ پھر اسے (بچھڑے کے جسم میں) ڈال دیا۔ میرے نفس نے مجھے ایسا ہی سجھایا تھا'' (۹۶) موسیٰ نے اسے کہا: ''جاؤ' تمہارے لئے زندگی بھر یہ سزا ہے کہ (دوسروں سے) کہتے

میں اپنے بھائی ہارون کی طرف متوجہ ہوئے اور جوش غضب میں ان کی داڑھی اور سر کے بال پکڑ لئے اور کہنے لگے۔ میں تمہیں اپنا نائب بنا کر گیا تھا اور یہ تاکید کی تھی کہ ان لوگوں کے حالات پر کڑی نظر رکھنا تو پھر جب تم نے انہیں شرک میں مبتلا ہوتے دیکھا تو تم نے انہیں منع کیوں نہ کیا؟ آخر وہ کون سی بات تھی جو تمہارے آڑے آ گئی تھی کہ تم نے انہیں منع بھی نہ کیا؟ کیا تم میری اس تاکید کو یکسر بھول گئے تھے کہ اس بگڑی ہوئی قوم پر کڑی نظر رکھنا اور ان کی اصلاح کی پوری کوشش کرتے رہنا۔

[۶۵] سیدنا ہارون اگرچہ عمر میں بڑے تھے تاہم منصب کے لحاظ سے چھوٹے تھے۔ علاوہ ازیں سیدنا موسیٰ جلالی طبیعت کے مالک اور سخت جوش غضب میں تھے۔ لہذا اسی غضب سے مغلوب ہو کر سیدنا ہارون کی داڑھی اور سر کے بالوں کو پکڑا تھا۔ سیدنا ہارون بڑے تحمل سے کہنے لگے کہ پہلے میری بات سن لو اور میری داڑھی پکڑ کر دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دو۔ بات یہ تھی کہ جب یہ لوگ شرک میں مبتلا ہوئے تو میں نے انہیں پوری سختی سے روکا تھا۔ لیکن چونکہ اکثریت اس شرک میں مبتلا تھی لہذا انہوں نے مجھے دبا لیا اور مجھے جان سے مار ڈالنے کے درپے ہو گئے تھے اور ان میں اکثر میرے دشمن بن گئے تھے۔ اب اگر میں اس معاملہ میں مزید سختی اختیار کرتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ان میں خانہ جنگی چھڑ جاتی، پھر ان کی اصلاح کی کوئی بھی صورت باقی نہ رہ جاتی۔ لہذا مجھے بھی آپ ہی کا انتظار تھا کہ اب ان لوگوں کا کیا علاج کیا جانا چاہئے؟

[۶۶] سامری سے سوال و جواب:۔ سیدنا موسیٰ اپنی قوم سے اور پھر اپنے بھائی ہارون سے مخاطب ہونے کے بعد اب سامری سے مخاطب ہوئے اور پوچھا: بتاؤ سامری! یہ کیا معاملہ ہے؟ واضح رہے کہ قرآن نے یہاں خطب کا لفظ استعمال کیا ہے جو کسی ناگوار صورت حال کو دریافت کرنے کے لئے آتا ہے۔ نیز یہ سامری اگرچہ بظاہر سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا تھا مگر وہ ایک منافق اور فتنہ پرداز اور ہوشیار انسان تھا جو کفر و شرک کو اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھا۔ وہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی کھل کر مخالفت تو کر نہ سکتا تھا مگر اس تاک میں رہتا تھا کہ کوئی موقعہ ملے تو قوم کو پھر سے اپنے آبائی دین یعنی گؤسالہ پرستی کی طرف لے جائے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں اسے ایسا موقعہ میسر آ گیا تھا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے سوال پر کہنے لگا: بات یہ ہے کہ میں نے ایک ایسی چیز دیکھ لی تھی جسے دوسرے نہیں دیکھ سکتے تھے اور وہ یہ تھی کہ فرعون کی موت کے وقت جب جبریل آئے تھے تو میں نے ان کی آمد کو محسوس کر لیا تھا اور ان کے پاؤں کے نیچے سے

لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿٩٧﴾ اِنَّمَآ اِلٰــهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿٩٨﴾ كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ

رہو گے کہ مجھے [۶۷] نہ چھونا اور تمہارے لیے عذاب کا ایک وقت ہے جو تجھ سے کبھی نہیں ٹل سکتا۔ اور اپنے الٰہ کی طرف تو دیکھ، جس کے آگے تو معتکف [۶۸] رہتا تھا، کہ ہم کیسے اسے جلا ڈالتے ہیں پھر اس (کی راکھ) کو کیسے دریا میں بکھیر دیتے ہیں۔ (۹۷) تمہارا الٰہ تو صرف وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں جس کا علم ہر چیز کو محیط ہے'' (۹۸)

(اے نبی) اسی طرح ہم گزرے ہوئے لوگوں کی خبریں آپ سے بیان کرتے ہیں۔ نیز ہم نے اپنے ہاں

مٹھی بھر مٹی اٹھالی تھی۔ جب میں نے بچھڑے کی شکل بنائی تو اس میں یہ مٹی بھر دی تھی۔ یہ اسی مٹی کی کرامت تھی کہ جب بچھڑا تیار کیا گیا تو اس میں سے بچھڑے کی سی آواز بھی آنے لگی اور یہ سب کچھ میں نے اس لئے کیا کہ میں اس مٹی کی کچھ کرامت دیکھنا چاہتا تھا۔

❁ سامری کے بیان کی حقیقت:۔ یہ تو تھا سامری کا وہ بیان جو اس نے موسیٰ علیہ السلام کے سوال کے جواب میں دیا۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اس کا یہ بیان بھی فریب کاری پر مشتمل تھا۔ وہ صرف یہی نہیں چاہتا تھا کہ پھر سے بت پرستی اور گئو سالہ پرستی کو فروغ دے بلکہ حقیقتاً وہ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں خود لیڈر بننا چاہتا تھا۔ آدمی ہوشیار تھا۔ سیدنا ہارون علیہ السلام کو کمزور دیکھ کر اس نے اپنی ہوشیاری سے اپنے لئے میدان ہموار کر لیا تھا۔ یعنی سامری کا اصل مقصد سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں اپنی لیڈری چمکانا تھا۔ اور اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی راہ اور اغراض و مقاصد سے اس کی راہ جدا گانہ ہو لہذا اس نے قوم کو اسی پرانی گئو سالہ پرستی کی راہ پر ڈال دیا جس سے وہ پہلے ہی مانوس تھے اور اس کے دلدادہ تھے۔ اس طرح وہ فی الواقع سیدنا موسیٰ کی عدم موجودگی میں قوم کا لیڈر بن گیا تھا۔ اور یہی بات سیدنا ہارون علیہ السلام کے بیان سے ظاہر ہوتی ہے۔ اگر سیدنا ہارون اس شرک کو روکنے میں سختی سے کام لیتے تو قوم دو دھڑوں میں بٹ جاتی اور ان میں خانہ جنگی بپا ہو جاتی پھر حالات قابو سے باہر ہو جاتے۔

بعض علماء نے یہاں رسول سے مراد خود موسیٰ علیہ السلام لئے ہیں۔ اس صورت میں یہ جواب سامری کی انتہائی مکاری پر دلالت کرتا ہے، کہ اس طرح اس نے سیدنا موسیٰ کی خوشامد کر کے انہیں بھی اپنے حق میں نرم کر لینے کی ایک کوشش کی تھی۔ قرآن کریم کے انداز سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ سامری کا یہ بیان سب اس کے اپنے مکر و فریب پر مشتمل تھا۔ رہی یہ بات کہ بچھڑے میں آواز کیسے پیدا ہو گئی تھی۔ تو یہ بات بھی چنداں مشکل نہ تھی۔ جب اس بچھڑے کے کھلے ہوئے منہ سے ہوا آر پار ہوتی تو اس سے بچھڑے کی سی آواز آنے لگتی تھی۔ جیسے باجے میں منہ سے پھونک مارنے سے مختلف قسم کی آوازیں نکلنے لگتی ہیں یا جیسے برقی گھنٹی کا سوئچ دبانے سے اس سے مختلف قسم کی گھنٹیوں سے مختلف قسم کی اوازیں آتی ہیں۔ اور ان مختلف آوازوں کا تعلق باجے اور برقی گھنٹی کی اندرونی ساخت سے ہوتا ہے۔ اسی طرح سامری نے بچھڑے کے جسم کے اندر پترے اس ترتیب سے رکھ دیئے تھے کہ جب ہوا اس کے جسم سے آر پار گزرتی تو وہ آواز نکالنے لگتا تھا۔

[۶۷] ❁ سامری کی دنیا میں سزا:۔ یعنی اس کو موسیٰ علیہ السلام نے اچھوت قرار دے دیا کہ کوئی شخص اس سے کسی قسم کا بھی تعلق نہ رکھے۔ پھر اس کے لئے مزید سزا یہ تھی کہ وہ خود دوسروں سے کہتا تھا کہ مجھ سے پرے رہنا، مجھ سے بچ کر رہنا، مجھے ہاتھ نہ لگانا، میں ناپاک ہوں لہذا مجھے نہ چھونا۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اگر کوئی سامری کو ہاتھ لگاتا یا اسے چھوتا تو سامری اور چھونے والے دونوں کو تپ چڑھ جاتی تھی۔ لہذا سامری اس بات پر مجبور تھا کہ دوسروں سے کہے کہ مجھے ہاتھ نہ لگانا، ساتھ ہی موسیٰ علیہ السلام نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ یہ نہ سمجھنا کہ تمہارے اس جرم کی سزا پوری ہو چکی بلکہ آخرت میں جو تجھے عذاب ہونے والا ہے وہ بھی کبھی ٹل نہ سکے گا۔

[۶۸] یہ تو رہا تیرا انجام اور اب ہم تیرے الٰہ کا جس کا تو دن رات مجاور بنا بیٹھا رہتا تھا، یہ حشر کرنے والے ہیں کہ اس سونے اور مٹی

اَنْبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَیْنٰکَ مِنْ لَّدُنَّا ذِکْرًا ﴿۹۹﴾ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ یَحْمِلُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وِزْرًا ﴿۱۰۰﴾
خٰلِدِیْنَ فِیْهِ ؕ وَسَآءَ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ حِمْلًا ﴿۱۰۱﴾ یَّوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِیْنَ یَوْمَئِذٍ زُرْقًا ﴿۱۰۲﴾
یَّتَخَافَتُوْنَ بَیْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿۱۰۳﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَقُوْلُوْنَ اِذْ یَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِیْقَةً اِنْ

سے آپ کو ذکر[۶۹] (قرآن) عطا کیا ہے۔(۹۹) جو شخص اس سے اعراض کرے گا وہ قیامت کے دن گناہ کا بوجھ[۷۰] اٹھائے ہوئے ہوگا۔(۱۰۰) وہ ہمیشہ اسی حال میں رہیں گے اور قیامت کے دن ایسا بوجھ اٹھانا کیسا برا ہوگا(۱۰۱) جس دن صور[۷۱] پھونکا جائے گا ہم اس دن مجرموں کو اکٹھا کریں گے تو وہ (دہشت کے مارے) نیلگوں[۷۲] ہو رہے ہوں گے۔(۱۰۲) وہ آپس میں چپکے چپکے کہیں گے کہ ہم (دنیا میں) یہی کوئی دس دن ٹھہرے ہوں گے۔(۱۰۳) ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ وہ کہیں گے۔ جبکہ ان میں سے بہتر رائے والا[۷۳] یہ کہے گا کہ تم تو بس

کے بت کے ہم پہلے ٹکڑے ٹکڑے کریں گے پھر ان کو جلا کر راکھ بنا دیں گے۔ اور پھر اس راکھ کو دریا میں پھینک دیں گے تاکہ تجھے اور پیروکاروں سب کو یہ معلوم ہو جائے کہ جو خدا اپنی بھی حفاظت نہیں کر سکتا وہ دوسرے کا کیا سنوار سکتا ہے یا بگاڑ سکتا ہے؟

[۶۹] اس سورۃ کا آغاز بھی ذکر سے کیا گیا تھا۔ یعنی ہم نے یہ ذکر اس لئے نہیں نازل کیا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں بلکہ یہ تو ڈرنے والوں کے لئے یاددہانی ہے۔ یہاں اسی اصل موضوع کی طرف عود کیا گیا ہے۔ جو کہ نوع انسان کی ہدایت ہے۔ درمیان میں جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ذکر کیا گیا تو اس میں بھی یہی رنگ غالب نظر آتا ہے۔

[۷۰] وزر بمعنی گناہ کا بوجھ یا پاپ کی گٹھڑی۔ اب جو شخص عمر بھر نہ قرآن کے نزدیک آئے، نہ اس کی کوئی ہدایت ماننے کو تیار ہو تو لامحالہ اس کی زندگی شتر بے مہار کی طرح ہوگی جو اللہ کی نافرمانیوں اور گناہوں پر مشتمل ہوگی۔ لہذا اسے اپنے اعمال کا ناقابل برداشت بوجھ اٹھانا پڑے گا۔ اس دنیا میں تو ایسے بوجھ کا تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن وہاں اس بوجھ کو مادی شکل دے دی جائے گی اور وہ اس بوجھ تلے پس رہا ہوگا۔

[۷۱] ۞ صور کے معنی اور اس کی ترقی یافتہ شکلیں:۔ صور کے معنی قرنا، نرسنگھا اور بوق ہے اور یہ چیزیں دور نبویؐ میں رائج تھیں۔ ضروری نہیں کہ صور کی بھی یہی شکل و صورت ہو بلکہ قرآن ایسے لفظ استعمال کرتا ہے جس سے انسانی ذہن اس اصل چیز سے قریب تر کسی چیز سے متعارف ہو۔ اسی غرض کے لئے فوج میں بگل استعمال ہوتا ہے۔ جس سے لشکر کو اکٹھا یا منتشر کیا جاتا ہے۔ ہوائی حملہ کے خطرہ کے دوران سائرن بھی اسی سے ملتی جلتی چیز ہے۔ روزہ کو بند کرنے اور کھولنے کے وقت بھی سائرن کا استعمال ہوتا ہے۔ شرعی نقطۂ نظر سے بگل یا سائرن کا جواز ہے یا نہیں؟ بعض علماء نے اسے ناجائز قرار دیا ہے۔ بہر حال افطاری اور سحری کے وقت بگل یا ناقوس کی بجائے اذان کہنا ہی مسنون ہے۔ سائرن سے ملتی جلتی یا اس سے بھی ترقی یافتہ شکل نفخہ صور کی ہوگی۔

[۷۲] اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ جب دہشت کے مارے آنکھیں پتھرا جاتی ہیں تو ان پر نیلگوں سفیدی غالب آ جاتی ہے۔ اور دوسرا معنی یہ ہے سارا بدن ہی نیلگوں ہو جائے گا۔ یعنی دہشت کے مارے خون تو خشک ہو جائے گا اور جسم پر نیلاہٹ غالب آنے لگے گی۔

[۷۳] یہاں ٹھہرنے سے مراد دنیا کی زندگی بھی ہو سکتی ہے اور برزخ کی زندگی بھی۔ انسان کی عادت ہے کہ اسے خوشی کے لحات قلیل

لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿١٠٤﴾ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿١٠٥﴾ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿١٠٦﴾ لَّا تَرٰى
فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴿١٠٧﴾ يَوْمَىِٕذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ

دنیا میں ایک ہی دن ٹھہرے تھے۔(۱۰۴) لوگ آپ سے پہاڑوں [۷۴] کے بارے میں پوچھتے ہیں (کہ قیامت کو ان کا کیا بنے گا؟) آپ ان سے کہئے کہ میرا پروردگار انہیں دھول بنا کر اڑا دے گا۔(۱۰۵) اور زمین کو ایسا صاف میدان بنا دے گا۔(۱۰۶) کہ آپ اس میں کوئی نشیب و فراز نہ دیکھیں [۷۵] گے۔(۱۰۷) اس دن لوگ پکارنے والے [۷۶] کے پیچھے چلے آئیں گے۔ کوئی اس سے انحراف نہ کر سکے گا۔ اور رحمٰن کے آگے سب آوازیں دب جائیں گی اور ہلکی سی [۷۷]

بھی نظر آتے ہیں اور قریب بھی۔ بیسیوں برس پہلے کے واقعات اسے یوں معلوم ہوتے ہیں جیسے کل کی بات ہے اور قیامت کے دہشت ناک احوال دیکھ کر یہ تصور اور بھی بڑھ جائے گا کوئی اس زندگی کو ہفتہ عشرہ قرار دے گا اور جو سب سے زیادہ سمجھدار ہوگا وہ پہلے کی تردید کرتے ہوئے اس زندگی کو صرف ایک دن کی زندگی بتائے گا۔

[۷۴] یعنی نفخۂ صور اول سے اگر انسان اور دوسری جاندار چیزیں مر بھی جائیں گی تو پہاڑوں جیسی سخت چیز پر اس نفخۂ کا کیا اثر ہوگا؟ یہ سوال دراصل ایسے جاہلوں کی طرف سے ہی ہو سکتا ہے۔ جنہوں نے اللہ کی اس پیدا کردہ کائنات اور اس کے نظام میں کبھی غور ہی نہیں کیا، آج کے انسان کے لئے یہ ایک بالکل مہمل سوال ہے۔ اگر سیاروں کی گردش اور ان کی کششِ ثقل میں معمولی سی بھی گڑبڑ ہو جائے تو پہاڑوں کا کیا ذکر ہے۔ سارے ستارے ایک دوسرے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو سکتے ہیں۔ قیامت کو یہی کیفیت ہوگی اور اس وقت پہاڑوں کی دھول اڑ رہی ہوگی۔

[۷۵] ❁ نفخۂ صور اول کے اثرات:۔ یعنی پہاڑوں کو پیوند خاک بنا دیا جائے، سمندروں کو پاٹ دیا جائے گا۔ زمین کے سب نشیب و فراز ختم کر دیئے جائیں گے اور وہ ایک بالکل ہموار اور وسیع میدان کی طرح بن جائے گی۔ اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ﴾ (۱۴:۴۸) ''یعنی اس دن یہ زمین ایسی نہ رہے گی جیسی تم آج دیکھ رہے ہو، بلکہ اس میں تبدیلی پیدا کر دی جائے گی''

[۷۶] ❁ نفخۂ صور ثانی کے اثرات:۔ یہ داعی اللہ کا مقرر کردہ فرشتہ اسرافیل ہوگا۔ اس دنیا میں تو ان لوگوں نے اللہ کے داعی کی بات کو سننا بھی گوارا نہ کیا بلکہ اس کی مخالفت ہی کرتے رہے مگر اس دن اللہ کے داعی کی آواز پر سراپا عمل بن جائیں گے اور جو کچھ وہ کہے گا ٹھیک اسی طرح کرتے جائیں گے۔ وہ کہے گا کہ چلو میدان حشر کی طرف تو سب ادھر دوڑ پڑیں گے۔ اور اس داعی کی آواز اور حکم کو پوری طرح سمجھ بھی رہے ہوں گے۔

[۷۷] اس دن سب لوگ اللہ تعالیٰ کی یا اس فرشتہ کی آواز اور حکم کو ہمہ تن گوش بن کر سن رہے ہوں گے، کسی کو اونچی آواز سے کسی دوسرے سے کوئی بات پوچھنے کی بھی ہمت نہ رہے گی۔ اس دن یا تو ان کے قدموں کی چاپ کی آواز سنائی دے سکے گی یا اس کھُسر پُسر اور کانا پھوسی کی آواز جو وہ اس دن کی ہولناکیوں سے بچنے کے لئے آپس میں کریں گے۔

فَلَا تَسْمَعُ إِلَّا هَمْسًا ﴿١٠٨﴾ يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ﴿١٠٩﴾
يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ﴿١١٠﴾ وَعَنَتِ الْوُجُوهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّومِ ۖ وَقَدْ
خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿١١١﴾ وَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَلَا هَضْمًا ﴿١١٢﴾
وَكَذَٰلِكَ أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا وَصَرَّفْنَا فِيهِ مِنَ الْوَعِيدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ أَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿١١٣﴾

آواز کے سوا تو کچھ نہ سن سکے گا۔(۱۰۸) اس دن سفارش کچھ فائدہ نہ دے گی مگر جسے رحمٰن اجازت [۷۸] دے دے اور اس کی بات سننا پسند کرے۔(۱۰۹) وہ لوگوں کا اگلا پچھلا حال [۷۹] سب کچھ جانتا ہے لیکن دوسرے لوگ اسے نہیں جان سکتے (۱۱۰) سب چہرے اس زندہ و پائندہ ہستی کے سامنے جھک جائیں گے اور جس نے ظلم کا بوجھ اٹھایا۔ وہ نامراد ہوا (۱۱۱) اور جو شخص نیک اعمال کرے اور وہ مومن ہو تو اسے [۸۰] بے انصافی یا حق تلفی کا ڈر نہ ہوگا (۱۱۲) اسی طرح ہم نے قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا اور طرح طرح سے وعید بیان کئے ہیں تاکہ لوگ پرہیزگاری اختیار کریں یا ان میں غور و فکر کی عادت [۸۱] پیدا ہو۔(۱۱۳)

[۷۸] ❁ سفارش کی تین شرائط اور اس کی وجوہ:۔ یعنی اس دن سفارش ہوگی ضرور مگر اس کے لئے تین شرائط ہوں گی۔ ایک تو وہی شخص سفارش کر سکے گا جس کو اللہ کی طرف سے سفارش کرنے کی اجازت مل جائے گی۔ دوسرے اسی شخص کے حق میں کر سکے گا جس کے حق میں سفارش اللہ کو منظور ہوگی۔ تیسرے وہ صرف ایسی بات کے لئے ہی سفارش کر سکے گا جسے اللہ سننا پسند فرمائے گا۔

[۷۹] ❁ سفارش کا عوامی عقیدہ لغو ہے:۔ اس آیت میں سفارش پر عائد کردہ پابندیوں کی وجہ بیان فرما دی گئی ہے کہ لوگوں کے اعمال اور ان کے حالات جن میں وہ اعمال سرزد ہوئے اور ان کی نیتوں کا علم تو صرف اللہ کو ہے۔ دوسرے کسی کو نہیں ہو سکتا۔ اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے ایک شخص کسی افسر کو جا کر کہے کہ آپ کا فلاں ماتحت آدمی میرا دوست ہے لہٰذا اس کا فلاں قصور معاف کر دیجئے تو وہ جواب میں کہے گا کہ آپ واقعی میرے دوست ہیں لیکن یہ شخص پہلے جتنے قصور کر چکا اس کا آپ کو علم ہے؟ اس کا ریکارڈ پہلے ہی بہت گندا ہے۔ لہٰذا اسے معاف کرنا بھی ظلم کے مترادف ہے۔ بالکل یہی اصول وہاں بھی کارفرما ہوگا یہ ممکن نہ ہوگا کہ کوئی بزرگ اللہ کے حضور یوں سفارش کرنے لگیں کہ یا اللہ اسے معاف فرما دیں کیونکہ یہ میرا خاص آدمی ہے۔ اس طرح سفارش کے اس عقیدہ کی جڑ کٹ جاتی ہے جو عام لوگوں نے اپنے معبودوں یا پیروں سے وابستہ کر رکھا ہے کہ وہ چونکہ اللہ کے مقرب ہیں لہٰذا سفارش کر کے ہمیں بچا لیں گے۔

[۸۰] ❁ اعمال کا بدلہ ملنے کے لئے شرائط:۔ یعنی اعمال کی جزا کے لئے دو شرائط کا ہونا ضروری ہے۔ ایک ایمان بالغیب کے تمام اجزاء پر ایمان لانا، دوسرے ایسے اعمال صالحہ جو شریعت کی پابندیوں کو ملحوظ رکھ کر بجا لائے گئے ہوں۔ مثلاً ان میں ریاکاری نہ ہو، سنت کے مطابق ہوں اور بعد میں احسان جتلا کر یا شرک کر کے ان اعمال کو برباد نہ کر دیا گیا ہو۔ ایسے اعمال کا بدلہ ضرور ملے گا اور پورا پورا ملے گا، ان میں ہرگز کسی طرح کمی نہیں کی جائے گی۔

[۸۱] یعنی قرآن میں جو قیامت کے احوال اور برے اعمال کی سزائیں بتائی گئی ہیں۔ تو ان سے مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنے برے اعمال کے نتائج سے ڈر جائیں اور ان میں تقویٰ پیدا ہو اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو کم از کم ان کے دلوں میں کچھ سوچ ہی پیدا

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ

زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾ وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ ۶ ع ۱۱/۱۵

اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾ فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ ھٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا

پس اللہ بادشاہ حقیقی ہی بلند شان والا ہے۔ اور قرآن کی وحی پوری ہونے سے پہلے اسے پڑھنے میں جلدی نہ کیجئے اور دعا کیجئے کہ ''اے میرے پروردگار! مجھے مزید [۸۲] علم عطا کر'' (۱۱۴) اور اس سے بیشتر ہم نے آدم سے ایک عہد لیا تھا مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اس کا ایسا عزم [۸۳] نہ پایا۔ (۱۱۵)

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم کو سجدہ [۸۴] کرو تو ابلیس کے سوا سب نے اسے سجدہ کیا مگر اس نے حکم نہ مانا (۱۱۶) لہٰذا ہم نے آدم سے کہا کہ یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے۔ یہ خیال رکھنا کہ وہ کہیں تمہیں جنت

ہو جائے۔ ممکن ہے یہ سوچ ان کی ہدایت کا سبب بن جائے اور ان کے ذریعہ پھر دوسروں کو ہدایت ہو۔

[۸۲] ۞ وحی کو توجہ سے سننے کا حکم:۔ ابتداءً جب آپؐ پر سیدنا جبرائیل وحی لے کر نازل ہوتے تو آپ ساتھ ہی ساتھ وحی کے الفاظ کو اس خیال سے دہرانے لگتے تھے کہ بعد میں بھول نہ جائیں۔ اس طرح وحی کے اگلے مضمون سے توجہ یا ہٹ جاتی تھی یا کٹ جاتی تھی۔ اسی بات کا ذکر سورۂ قیامۃ میں بھی آ چکا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ آپ ساتھ ساتھ اس کو یاد رکھنے اور زبان چلانے کی کوشش نہ کیا کیجئے۔ تمہارے سینہ میں اسے محفوظ رکھنا اور پھر زبان سے انہیں الفاظ کی ادائیگی کروا دینا ہمارا ذمہ ہے۔ جب وحی نازل ہو رہی ہو آپ بس پوری توجہ سے اسے سنا کیجئے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ایسی عادت ابھی تک آپ میں پوری طرح راسخ نہ ہوئی تھی۔ لہٰذا اسی بات کا دوسرے انداز میں اعادہ کیا گیا اور یہ ہدایت بھی کی گئی کہ ساتھ ہی ساتھ آپ یہ دعا بھی کرتے رہئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے قرآن کریم میں اور زیادہ سمجھ اور بیش از بیش علوم و معارف عطا فرما۔

[۸۳] ۞ بھول چوک انسان کی فطرت میں شامل ہے' سیدنا آدمؑ نے بھول کر غلطی کی تھی:۔ یہاں سیدنا آدمؑ کے بھولنے کا ذکر، ذکر کی مناسبت سے فرمایا۔ یعنی چونکہ بھول جانا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار بار ذکر یا یاددہانی نازل کی جاتی رہی ہے۔ اور اس فطرت انسانی کا آغاز ان کے باوا آدم سے ہی ہو گیا تھا۔ ان کا عزم اتنا مضبوط نہ تھا کہ وہ ہر وقت اللہ سے کئے ہوئے عہد کو یاد رکھتے۔ چنانچہ ایک طویل مدت کے بعد جب کہ سیدنا آدمؑ اس عہد کو بھول ہی چکے تھے۔ شیطان کا داؤ چل گیا اور آپ شیطان کے فریب میں آ گئے۔ اس مطلب سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بھول چوک انسان کی فطرت میں داخل ہے اور اس کا دوسرا مطلب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے بھول چوک کر اللہ کی نافرمانی کی تھی۔ ان کا ارادہ نافرمانی کا ہرگز نہیں تھا۔ اور اس مطلب کا نتیجہ آدمؑ کی سرکشی سے بریت ہے۔ ربط مضمون کے لحاظ سے پہلا مطلب ہی درست معلوم ہوتا ہے۔

[۸۴] آدم و ابلیس کا قصہ سورۂ بقرہ، اعراف اور دیگر کئی مقامات پر پہلے ہی گزر چکا ہے۔ اور آئندہ بھی آئے گا، مگر ہر مقام پر اتنا ہی ذکر کیا گیا جتنا موقع کے لحاظ سے مناسب تھا۔ گویا اس قصہ کے مختلف اجزاء سے مختلف نتائج پیش کئے گئے ہیں۔

مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾ فَوَسْوَسَ
اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰۤاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ
لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ ثُمَّ

سے نکلوا نہ دے پھر تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ (۱۱۷) یہاں تو تمہیں نہ بھوک ستاتی ہے نہ ننگے رہتے ہو۔ (۱۱۸) نہ پیاس لگتی ہے اور نہ دھوپ [۸۵]۔ (۱۱۹) پھر شیطان نے آدم کے دل میں وسوسہ ڈالا اور کہا ''آدم! میں تمہیں وہ درخت نہ بتاؤں جس سے ابدی زندگی اور لازوال [۸۶] سلطنت حاصل ہوتی ہے۔'' (۱۲۰) آخر ان (دونوں) نے اس درخت کا پھل کھا لیا جس سے ان کے ستر کے مقامات ایک دوسرے کے آگے کھل گئے تو وہ جنت کے پتوں سے [۸۷] انہیں ڈھانکنے لگ گئے۔ اور آدم نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی لہٰذا وہ بھٹک گئے۔ (۱۲۱) پھر ان کے پروردگار نے انہیں

[۸۵] ❁ جنت میں بلامشقت ہر طرح کا آرام تھا:۔ جنت میں انسان کی ضروریات کا سامان بھی موجود تھا اور ان کے علاوہ عیش و عشرت کے لئے وافر نعمتیں بھی موجود تھیں اور سیدنا آدم علیہ السلام کو بتایا یہ گیا تھا کہ اگر تم شیطان کے فریب میں آ گئے تو نہ صرف یہ کہ تم سے جنت کی نعمتیں چھین لی جائیں گی بلکہ تمہیں اپنی ضروریات زندگی مہیا کرنے کے لئے جدوجہد بھی کرنا پڑے گی اور ان کے لئے مشقت بھی اٹھانا ہوگی۔ مثلاً دھوپ اور بارش سے بچاؤ کے لئے مکان بنانا ہوگا اور کھانے پینے کے لئے کوئی ذریعہ معاش اختیار کرنا ہوگا اور پہننے کے لئے لباس کی ضرورت بھی پیش آئے گی اور تمہاری زندگی کا بیشتر حصہ انہیں باتوں کے حصول میں صرف ہو جائے گا۔ جنت کی دوسری نعمتیں تو کم ہی کسی کو میسر آئیں گی۔ لہٰذا اللہ کے حکم کو دھیان کے ساتھ یاد رکھنا اور شیطان کے فریب میں نہ آ جانا۔

[۸۶] ❁ کیا شیطان نے پہلے حوا کو بہکایا تھا؟ شیطان آدم کا بڑا ہوشیار اور مکار دشمن تھا اس نے وسوسہ ہی ایسا دلفریب ڈالا جس نے آدم کے دل کو موہ لیا۔ علاوہ ازیں مدت مدید گزرنے کی وجہ سے سیدنا آدمؑ اپنے پروردگار سے کیا ہوا وعدہ بھول ہی چکے تھے۔ شیطان نے پٹی یہ پڑھائی کہ اگر تم اس درخت کا پھل چکھ لو گے تو اس جنت میں ہمیشہ کے لئے مقیم ہو جاؤ گے اور تمہیں ابدی زندگی حاصل ہو جائے گی اور جنت کی نعمتوں پر تمہارا تصرف و اختیار قائم و دائم رہے گا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس مقام پر شیطانی وسوسہ کی نسبت صرف سیدنا آدمؑ کی طرف کی گئی ہے اور ایک دوسرے مقام پر دونوں کی طرف کی ہے۔ اس لئے کہ اس معاملہ میں حوا کی حیثیت صرف بالتبع تھی۔ لیکن بائبل کی روایت یوں ہے کہ شیطان نے پہلے سیدہ حوا کو بہکایا۔ پھر حوا نے سیدنا آدمؑ کو پھل کھانے پر آمادہ کر لیا۔ بائبل کی اس روایت کو بعض مفسرین نے بھی نقل کر دیا۔ جب کہ یہ روایت قرآن کی اس آیت کے مطابق غلط قرار پاتی ہے۔

[۸۷] ❁ پھل چکھنے کا فوری ردعمل:۔ جنت کا پھل کھانے کا ردعمل فوری طور پر تو یہ ہوا کہ ان سے جنت کا لباس چھین لیا گیا اور آدم و حوا دونوں بے حجاب ہو گئے اور انہیں ایک دوسرے کے مقامات ستر نظر آنے لگے اور سخت شرم محسوس ہوئی تو جنت کے درختوں کے پتے ایک دوسرے پر چپکا کر مقاماتِ ستر کو ڈھانپنے لگے۔ ابھی بھوک اور پیاس کا احساس تو کچھ دیر کے بعد ہی ہونا تھا۔ اور انہیں فوراً پتا چل گیا کہ شیطان انہیں جُل دے گیا اور وہ اس کے فریب میں آ گئے ہیں۔ اس وقت انہیں اللہ سے کیا ہوا وعدہ یاد آ گیا اور فوراً اللہ کی

اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا
يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ
فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ

برگزیدہ کیا، ان کی توبہ قبول کی اور ہدایت بخشی۔(۱۲۲) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم دونوں (یعنی انسان اور شیطان) سب[۸۸] یہاں سے نکل جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے۔ پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ تو گمراہ ہوگا اور نہ تکلیف[۸۹] اٹھائے گا۔(۱۲۳) اور جو میری یاد سے منہ موڑے گا تو اس کی زندگی تنگ[۹۰] ہو جائے گی اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے۔(۱۲۴) وہ کہے گا: ''اے میرے پروردگار! تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا حالانکہ میں (دنیا میں) آنکھوں والا[۹۱] تھا؟'' (۱۲۵)

طرف رجوع کیا اور توبہ استغفار کرنے لگے۔

[۸۸] ۞ کون کس کا دشمن؟ فریق کون کون ہیں؟۔ اس مقام پر تثنیہ استعمال ہوا ہے۔ جس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک مطلب ترجمہ میں واضح ہے کہ ایک فریق آدم وحوا تھے اور دوسرا فریق شیطان اور خطاب کے لحاظ سے ان فریقوں میں ان کی اولاد بھی شامل ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ ایک فریق آدم، دوسرا حوا ہو، **جمیعا** کا معنی سب کے بجائے ''مل کر، اکٹھے یا ایک ساتھ'' کیا جائے اور خطاب آدم وحوا کی اولاد سے ہو۔ اور ان کی اولاد میں دشمنی اس طرح ہوگی کہ ان کی اولاد میں سے ایک فریق اللہ کا فرمانبردار بن کر رہے گا اور دوسرا شیطان کا تابع فرمان۔ ان دونوں فریقوں میں حق و باطل کی جنگ جاری اور دشمنی قائم رہے گی۔

[۸۹] **یشقیٰ** کے بھی دو مطلب ہیں ایک یہ کہ وہ جنت کی راہ سے بھٹکے گا نہیں اور نہ اس سے محروم ہو کر دوزخ کی تکلیفیں اٹھائے گا۔ بلکہ سیدھا جنت میں پہنچ جائے گا جو اس کا اصل وطن تھا اور اس لفظ کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ بدبختی میں مبتلا نہ ہوگا۔ دنیا میں بھی اس کا مقدر اسے ضرور ملے گا اور آخرت میں تو وہ بہر حال خوش نصیب ہوگا۔

[۹۰] ۞ زندگی تنگ ہونے سے مراد؟ **معیشۃ ضنکا** کا یہ مطلب نہیں کہ ان پر ہمیشہ تنگ دستی غالب رہے گی۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ انہیں قناعت اور قلبی سکون کبھی میسر نہ آئے گا۔ اور اگر مالدار ہوں گے تو ہمیشہ ننانوے کے چکر میں پڑے رہیں گے۔ نہ رات کو سکون نصیب ہوگا اور نہ دن کو اور اگر تنگ دست ہیں تو اپنی تکلیفوں اور مصیبتوں پر واویلا کرتے رہیں گے اور جزع فزع میں ہی ان کی زندگی بسر ہو جائے گی اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ کافر کے پاس خواہ کتنا ہی مال و دولت ہو خیر اس میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ یہی مال و دولت چند روزہ عیش کے بعد اس کے لئے وبال جان بن جائے گا اور بعض مفسرین نے اس سے قبر کی برزخی زندگی مراد لی ہے۔ یعنی قیامت سے پہلے ہی ان پر تنگی کا ایسا دور آئے گا کہ قبر کی زمین بھی ان پر تنگ کر دی جائے گی اور یہ تفسیر بعض صحابہ سے مروی ہے۔ بہر حال اس لفظ کے تحت یہ سب صورتیں داخل ہو سکتی ہیں۔

[۹۱] ۞ اعمال کا بدلہ ممثل شکل میں:۔ یعنی اس کا اعتراض یہ تھا کہ دنیا میں تو میں بینا تھا اور ہر چیز کو دیکھ سکتا تھا آج مجھے اندھا بنا کر کیوں اٹھایا جا رہا ہے۔ اس کو جواب یہ دیا جائے گا کہ تو دنیا میں میری آیات دیکھنے سے اندھا بنا رہا تھا۔ آنکھیں عطا کرنے کا مقصد

كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۲۵﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾ وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ
مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ﴿۱۲۷﴾ اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا
ع قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۱۲۸﴾ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ
سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ

اللہ تعالیٰ فرمائے گا: جس طرح [۹۲] ہماری آیات تمہارے پاس آئیں تو تو نے انہیں بھلا دیا تھا، اسی طرح آج
تو بھی بھلا دیا جائے گا۔(۱۲۶) اور جو شخص بھی حد سے بڑھ جائے اور اپنے پروردگار کی آیات پر ایمان نہ لائے، ہم اسے اسی
طرح سزا دیں گے اور آخرت کا عذاب تو شدید اور باقی رہنے والا ہے۔(۱۲۷) کیا انہیں اس بات سے کوئی رہنمائی نہ ملی کہ ان
سے بیشتر ہم کئی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جن کے (برباد شدہ) ٹھکانوں میں یہ چلتے پھرتے ہیں۔ بلاشبہ اس میں اہل
عقل کے لئے بہت سی [۹۳] نشانیاں ہیں۔(۱۲۸) اور اگر تیرے پروردگار کی بات پہلے سے طے شدہ نہ ہوتی اور مہلت مقرر نہ
کی جا چکی ہوتی تو ان پر فوری عذاب آنا [۹۳۔الف] لازمی تھا۔(۱۲۹) لہٰذا جو کچھ یہ کہتے ہیں اس پر صبر کیجئے اور اپنے پروردگار کی

صرف یہی نہیں تھا کہ تو اپنے مطلب کی چیزیں دیکھے۔ بلکہ اصل مطلب یہ تھا کہ تو اللہ کی آیات کو دیکھے۔ اس لحاظ سے تو دنیا میں اندھا ہی بنا رہا۔ تیرے اس فعل کا نتیجہ ہی ممثل شکل میں تیرے سامنے آیا ہے۔ تو اب تعجب کیوں کرتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ ابتدائے حشر کا ذکر ہے۔ بعد میں اس کی آنکھیں کھول دی جائیں گی تو وہ دوزخ اور احوال محشر کا ٹھیک ٹھیک معائنہ کر سکے گا۔

[۹۲] یعنی اللہ تعالیٰ یہ جواب دیں گے کہ ہم اسی طرح لوگوں کو ان اعمال کا اس سے ملتا جلتا ہی ممثل صورت میں بدلہ دیا کرتے ہیں۔ تو نے ہماری آیات سن کر ان سنی کر دی تھی اور ہمیں بھول ہی گیا تھا۔ آج ہم بھی تمہیں بھلائے دیتے ہیں اور تو ہماری رحمت سے دور ہی رہے گا۔ یہ سزا تو وہ ہے جو تمہیں تمہارے اعمال کے مطابق اس میدانِ محشر میں دی جا رہی ہے اور جو عذاب تمہیں ابھی مزید دیا جانے والا ہے وہ اس سے سخت تر بھی ہو گا اور ہمیشہ باقی رہنے والا بھی، جو کبھی ختم نہ ہو گا۔

[۹۳] اس آیت کے مخاطب مشرکین مکہ ہیں۔ جن میں سابقہ اقوام کی ہلاکت کے چرچے زبان زد تھے اور وہ اپنے تجارتی سفروں کے دوران ان کے تباہ شدہ کھنڈرات بچشم خود ملاحظہ بھی کر سکتے تھے۔ اگر وہ ان کے حالات میں کچھ بھی غور و فکر کرتے تو انہیں معلوم ہو سکتا تھا کہ بالآخران کا اپنا بھی ویسا ہی انجام ہو سکتا ہے۔ لہٰذا وہ چاہتے تو انہیں واقعات سے کافی عبرت حاصل کر سکتے تھے۔

[۹۳۔الف] قانون امہال و تدریج کی مصلحتیں:۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں تدریج و امہال کا قانون کام کرتا ہے۔ ان پر عذابِ الٰہی کے نزول میں بھی وہی قانون کارفرما ہے۔ اور اس قاعدہ میں بہت سی مصلحتیں مضمر ہوتی ہیں۔ یعنی جس طرح ہر کام کے سرانجام پانے کے لئے ایک مقررہ مدت درکار ہوتی ہے۔ اسی طرح عذاب الٰہی کا بھی وقت مقرر ہے۔ جس کی چند شرائط ہیں۔ اور اگر یہ قانون جاری و ساری نہ ہوتا تو ان کے اعمال واقعی اس قابل ہیں کہ انہیں فوری طور پر تباہ و برباد کر دیا جاتا۔ اس قانون تدریج و امہال میں کیا مصلحتیں ہیں اور اگر اس قانون کا لحاظ نہ رکھا جائے تو اس میں کیا نقصانات ہیں، ان کا

طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَ قَبۡلَ غُرُوۡبِہَا ۚ وَ مِنۡ اٰنَآیِٔ الَّیۡلِ فَسَبِّحۡ وَ اَطۡرَافَ النَّہَارِ لَعَلَّکَ تَرۡضٰی ﴿۱۳۰﴾

وَ لَا تَمُدَّنَّ عَیۡنَیۡکَ اِلٰی مَا مَتَّعۡنَا بِہٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡہُمۡ زَہۡرَۃَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۬ۙ لِنَفۡتِنَہُمۡ فِیۡہِ ؕ وَ

حمد[۹۴] کے ساتھ تسبیح کیجئے، سورج کے طلوع اور غروب ہونے سے پہلے اور رات کے کچھ اوقات میں تسبیح کیجئے اور دن کے کناروں پر[۹۵] بھی، اس طرح امید ہے کہ آپ[۹۶] خوش ہو جائیں گے۔(۱۳۰)

اور آپ ان چیزوں کی طرف نظر بھی نہ اٹھائیے جو ہم نے مختلف قسم کے لوگوں کو دنیوی زندگی کی زینت کے لئے دے رکھی ہیں تا کہ ان چیزوں کے ذریعہ ہم انہیں آزمائش میں ڈالیں اور آپ کے پروردگار کا رزق[۹۷]

ذکر پہلے حواشی میں کیا جا چکا ہے۔ لہذا اب تکرار کی ضرورت نہیں۔

[۹۴] ۞ صبر اور نماز کے فوائد:۔ مصائب و مشکلات کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرنے کے لئے قرآن نے متعدد مقامات پر دو باتوں پر زور دیا ہے۔ ایک صبر اور دوسرے نماز۔ صبر سے مراد احکام الٰہی کو پورے استقلال کے ساتھ بجالاتے رہنا بھی ہے اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا بھی۔ اور نماز سے بندے کا اللہ سے تعلق پیدا ہوتا ہے اور وہ اللہ پر توکل کرنا سیکھتا ہے اور جوں جوں یہ تعلق بڑھتا جاتا ہے اللہ پر توکل میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اسی توکل سے مشکلات کو برداشت کرنے کی ہمت و جرأت پیدا ہوتی ہے۔

[۹۵] ۞ پانچوں نمازوں کے اوقات:۔ حمد کے ساتھ تسبیح اور محض تسبیح دونوں سے یہاں مراد نماز ہے کہ یہ عرب میں عام دستور ہے کہ کسی چیز کا کوئی خاص جزء بول کر اس سے مراد کل لیا جاتا ہے اور اس کی مثالیں بہت ہیں۔ سورج کے طلوع سے پہلے سے مراد فجر کی نماز ہے اور غروب سے پہلے کی نماز عصر ہے۔ رات کے کچھ اوقات سے مراد نماز عشاء ہے اور نماز تہجد بھی جو آپ پر تو فرض تھی لیکن دوسروں کے لئے سنت مؤکدہ ہے۔ اور ان کے کنارے تین ہی ہو سکتے ہیں، صبح، شام اور زوال آفتاب، صبح سے مراد فجر کی نماز ہے جس کا ذکر پہلے ہی آ چکا، شام سے مراد نماز مغرب اور زوال آفتاب سے مراد ظہر کی نماز ہے۔ گویا اس ایک آیت سے ہی پانچوں فرض نمازیں اور ان کے اوقات ثابت ہو جاتے ہیں اور اس آیت کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کو کسی وقت بھی اللہ کی یاد اور تسبیح و تہلیل سے غافل نہ رہنا چاہئے۔

[۹۶] یعنی صبر اور نمازوں کے قیام کے نتائج اتنے شاندار حاصل ہوں گے کہ آپ ان پر خوش ہو جائیں گے اور فی الواقع ان کے ایسے شاندار نتائج نکلے جو سب دنیا نے دیکھ لئے اور ایسے نتائج کا ذکر قرآن کی اور بھی بہت سی آیات میں مذکور ہے۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس دنیا کے بعد آخرت کو اتنا بلند مقام عطا ہوگا جس پر آپ خوش ہو جائیں گے۔ جیسے آپ کا قیامت کے دن انبیاء سمیت سب لوگوں کے لئے اللہ کے حضور سفارش کرنا اور آپ کو مقام محمود عطا ہونا وغیرہ۔

[۹۷] ۞ رزق کا وسیع تر مفہوم:۔ یہاں رزق سے مراد صرف کھانے، پینے کی چیزیں ہی نہیں بلکہ رزق کا لفظ اپنے وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے اور اس لفظ کا اطلاق ہر اس خداداد نعمت پر ہوتا ہے جو جسمانی یا روحانی اعتبار سے انسان کی تربیت کا باعث بن سکے۔ یعنی اللہ نے آپ کو جو قرآن کریم، منصب رسالت، فتوحات عظیمہ، اور آخرت کے اعلیٰ ترین مراتب عطا فرمائے

رِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿١٣١﴾ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۭ لَا نَسْــَٔــلُكَ رِزْقًا ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿١٣٢﴾ وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿١٣٣﴾ وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ

ہی بہتر اور پائندہ تر ہے۔(١٣١) اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیجئے اور خود بھی اس پر ڈٹ [٩٨] جائیے۔ ہم آپ سے رزق نہیں مانگتے، وہ تو ہم خود [٩٩] تمہیں دیتے ہیں اور انجام پرہیزگاری کا ہی [١٠٠] بخیر ہوتا ہے۔(١٣٢) کافر کہتے ہیں کہ ہمارے پاس اس کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ کیا ان کے پاس پہلے صحیفوں میں [١٠١] واضح دلیل نہیں آچکی؟(١٣٣) اور اگر ہم انہیں اس سے پیشتر عذاب سے ہلاک کر دیتے تو وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ "ہمارے

ہیں ان کے مقابلہ میں اس چندروزہ زندگی کے ساز وسامان کی کیا حقیقت ہے۔ لہذا آپ کو اس ساز وسامان کی طرف اور دنیا میں مستغرق لوگوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا چاہئے۔ کیونکہ اللہ کا دیا ہوا ایسا رزق ہی ہر لحاظ سے بہتر اور پائیدار ہے۔

[٩٨] ۞ گھر والوں کو بھی نماز کا حکم دینا ضروری ہے:۔ یعنی خود نمازوں پر پابند رہنے کے علاوہ آپ کو اپنے گھر والوں کو بھی ان کی پابندی کا حکم دینا چاہئے۔ پھر اس بات پر سختی سے عمل درآمد کرانا چاہئے۔ اس سے آپ کے مشن کو مزید تقویت پہنچے گی۔ اگرچہ اس آیت میں خطاب آپ کو ہے تاہم حکم عام ہے۔ اسی لئے آپ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ بچہ جب سات برس کا ہو جائے تو اسے نماز ادا کرنے کو کہو اور اگر دس سال کا ہونے پر بھی اسے نماز کی عادت نہ پڑے تو اسے مار کر نماز پڑھاؤ۔ (ابوداؤد، بحوالہ مشکوۃ، کتاب الصلوۃ۔ الفصل الثانی)

[٩٩] عرب میں یہ دستور تھا کہ مالک اپنے غلاموں کو کمائی کے لئے بھیجتے۔ پھر ان سے یہ کمائی خود وصول کرتے یا پھر غلام پر اس کی قابلیت کے مطابق روزانہ یا ماہانہ ایک رقم مقرر تھی کہ اتنی رقم تو وہ بہرحال کما کر اپنے مالک کو دے گا اور اگر کچھ زائد کما لے تو وہ اس کا اپنا ہوگا جس طرح ہمارے ہاں کسی چیز کا روزانہ یا ماہانہ کرایہ یا ٹھیکہ مقرر کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ سے اور مسلمانوں سے یہ فرماتے ہیں کہ ہم تم سے کچھ رزق نہیں مانگتے، حالانکہ تم سب میرے بندے اور غلام ہو۔ بلکہ وہ تو ہم خود تمہیں دیتے ہیں اور یہ ہمارا ذمہ ہے۔ تمہارا کام بس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی فرمانبرداری میں لگے رہو۔ جو رزق تمہارے مقدر میں ہے وہ تمہیں مل کے ہی رہے گا۔

[١٠٠] ۞ تقویٰ کا انجام ہمیشہ بہتر ہی ہے:۔ اور یاد رکھو کہ جو شخص تقویٰ اختیار کرے گا؟ اس دنیا میں بھی اس کا انجام بہتر ہوگا اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں اس کی انجام کی بہتری کا ذکر ایک دوسری آیت میں یوں بیان فرمایا کہ دنیا میں جب کوئی متقی شخص کسی مشکل میں پھنس جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس سے نکلنے کی راہ پیدا کر دیتا ہے۔ نیز ایسی جگہ سے اسے رزق مہیا کرتا ہے جہاں سے اس کا وہم وگمان بھی نہیں ہوتا (٦٥: ٢،٣) علاوہ ازیں اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مثلاً اگر ایک متقی شخص کاروبار کرتا ہے تو اس کی ساکھ قائم ہوتی ہے اور کسی کی ساکھ قائم ہو جانا اللہ کا بہت بڑا فضل اور انعام ہے اور انجام کار وہی کامیاب رہتا ہے۔ غرض یہ جملہ ایک ایسی آفاقی صداقت (Universal Truth) ہے کہ جس اعتبار سے بھی اس کا تجربہ کیا جائے درست ہی ثابت ہوگا۔

[١٠١] ۞ آپ کی بعثت سے اہل مکہ پر اتمام حجت:۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ پہلے صحیفوں اور آسمانی کتابوں میں آپ کی علامات اور آپ کی آمد کی بشارات موجود تھیں اور بعض انصاف پسند لوگوں نے برملا اس بات کا اعتراف بھی کیا تھا کہ یہ وہی نبی

إِلَيْنَا رَسُولًا فَنَتَّبِعَ ءَايَٰتِكَ مِن قَبْلِ أَن نَّذِلَّ وَنَخْزَىٰ ﴿۱۳۴﴾ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ
فَتَرَبَّصُوا۟ ۖ فَسَتَعْلَمُونَ مَنْ أَصْحَٰبُ ٱلصِّرَٰطِ ٱلسَّوِىِّ وَمَنِ ٱهْتَدَىٰ ﴿۱۳۵﴾ ع ۸ / ۱۷

پروردگار! تو نے ہمارے پاس رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم ذلیل ورسوا ہونے سے [۱۰۲] پہلے ہی تیری آیات کی پیروی کر لیتے۔(۱۳۴) آپ ان سے کہئے کہ: ”ہر ایک انجام کار کا منتظر ہے لہٰذا تم بھی انتظار کرو۔ جلد ہی [۱۰۳] تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ (ہم میں سے) کون راہ راست پر ہے اور کون ہدایت یافتہ ہے“ (۱۳۵)

آخر الزمان ﷺ ہیں جن کی سابقہ کتابوں میں بشارات دی گئی تھیں اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن جیسا واضح معجزہ مل جانے کے بعد اب یہ کون سی نشانی چاہتے ہیں اور قرآن ایسی کتاب ہے جو اگلی کتابوں کے ضروری مضامین کا محافظ اور ان کی صداقت پر حجت بھی ہے اور گواہ بھی۔

[۱۰۲] یعنی یہ قرآن بھی بطور حجت اور کافروں کا یہ اعتراض رفع کرنے کے لئے اتارا گیا ہے کہ اگر ہم پر بھی یہود و نصاریٰ کی طرح اللہ کی طرف سے ہدایت کی کوئی کتاب نازل ہوتی تو ہم یقیناً ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔ نیز ہم نے ان میں رسول اس لئے بھی بھیجا ہے کہ وہ ذلت و رسوائی کے بعد یہ نہ کہنے لگیں کہ اگر ہمارے پاس کوئی رسول آتا تو ہم یقیناً اس کی فرمانبرداری کرتے۔ اللہ کے احکام بجالاتے اور ہمیں یہ رسوائیاں نہ دیکھنا پڑتیں۔

[۱۰۳] یعنی اب تم بھی اور ہم بھی بلکہ سارے کا سارا عرب اس انتظار میں ہے کہ دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ لہٰذا انتظار کرو۔ عنقریب سب کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم میں سے کون سا فریق سیدھی راہ پر گامزن ہے؟ زمانہ کی گردش کس پر پڑتی ہے اور تباہ کون ہوتا ہے؟

سُوْرَةُ الْأَنْبِيَاءِ مَكِّيَّةٌ
١١٢ آیاتھا رکوعھا ٧

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ ۝١ مَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِم مُّحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ ۝٢ لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ وَأَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِينَ

کلمات ١١٨٧ آیت ١١٢ (٢١) سورہ الانبیاء مکی ہے (٧٣) رکوع ٧ حروف ٥١٥٤

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔

لوگوں کے حساب کا وقت قریب[١] آ پہنچا ہے جبکہ وہ ابھی تک غفلت میں منہ موڑے[٢] ہوئے ہیں۔(١) جب بھی ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے کوئی نئی نصیحت آتی ہے تو اسے سن تو لیتے ہیں مگر کھیل میں پڑے[٣] رہتے ہیں (اس میں غور نہیں کرتے)(٢) ان کے دل تو اور باتوں میں منہمک ہیں اور یہ ظالم خفیہ

[١] آپ کا آخری نبی ہونا قربِ قیامت کی علامت ہے:۔ یعنی قیامت کا وقت قریب آگیا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نبی آخر الزمان کی بعثت ہی اس بات کی علامت ہے کہ زمین میں بنی آدم کی آبادی کا آخری دور ہے۔ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شہادت کی اور وسطی انگلی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ”میں اور قیامت ایسے ہی ہیں جیسے یہ دو انگلیاں“ (بخاری: کتاب الرقاق، باب قول النبی بعثت انا والساعة کھاتین......) اس حدیث کے بھی دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ جتنی لمبائی شہادت کی انگلی کی ہے۔ یہ سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر مجھ تک کا زمانہ ہے اور جتنی وسطی انگلی شہادت کی انگلی سے بڑی ہے یہ مجھ سے لے کر قیامت تک کا زمانہ ہے۔ اس لحاظ سے تقریباً پانچ حصے عرصہ گزر چکا ہے اور ایک حصہ باقی ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ان دو انگلیوں کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں۔ اسی طرح میرے بعد تا قیامت کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا۔ یہ بات بھی قربِ قیامت کی علامت ہوئی۔ نیز اس جملہ کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ان کی موت کا وقت قریب ہے اور موت کے ساتھ ہی ان کا حساب اور جزاء و سزا کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اگرچہ یہ حساب اور جزاء و سزا کا سلسلہ قیامت کی نسبت بہت ہلکے پیمانہ پر ہوگا اور اس مطلب پر دلیل آپ ﷺ کا یہ ارشاد مبارک ہے کہ جو شخص مر گیا، اس کی قیامت قائم ہوگئی۔ (مشکوٰۃ۔ کتاب الفتن۔ باب فی قرب الساعة)

[٢] یعنی پیغمبر تو انہیں ان کے برے انجام کی خبر دے رہا ہے لیکن وہ کچھ ایسے بدمست ہوئے ہیں کہ ایسی بات سننا بھی نہیں چاہتے۔

[٣] نئی نصیحت سے مراد کوئی نئی سورت ہے۔ یعنی جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو اسے سن کر بھی ان سنی کر دیتے ہیں۔ دنیا کے کاروبار اور مشاغل میں ایسے منہمک ہیں کہ ان آیاتِ الٰہی میں غور کرنے کی نہ انہیں فرصت ملتی ہے اور نہ اس کی ضرورت یا اہمیت سمجھتے ہیں۔ پس اپنے دنیا کے دھندوں میں ہی مست رہتے ہیں۔

ظَلَمُوا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝ قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۡ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۢ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚ

مشورے کرتے ہیں کہ: "کیا یہ تمہارے جیسا بشر[4] ہی نہیں، پھر تم دیکھتے بھالتے (اس کے) جادو میں کیوں پھنستے ہو؟" (۳) (رسول نے) کہا کہ: آسمان اور زمین میں[5] جو بات بھی ہو رہی ہو میرا پروردگار اسے خوب جانتا ہے کیونکہ وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ (۴) بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ (قرآن کی آیات) پراگندہ خواب ہیں، بلکہ یہ اس کی اپنی خود ساختہ چیز ہے، بلکہ یہ شاعر[6] ہے، ورنہ اسے ہمارے

[4] سرداران قریش نے قرآن کے جادو سے بچنے کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کیں؟ قریش مکہ قرآن کی دعوت کے شدید مخالف تھے لیکن اس کے انداز بیان، فصاحت و بلاغت اور جادو کی سی تاثیر کے وہ خود بھی معترف تھے اور قرآن کو اسی لحاظ سے جادو کہتے تھے اور اس جادو کو روکنے کا طریقہ ابتداءً انہوں نے یہ اختیار کر لیا تھا کہ سب قریشی سرداروں نے مل کر یہ معاہدہ کیا کہ جہاں تک ہو سکے قرآن کے سننے اور پڑھنے پر پابندی لگا دی جائے۔ سننے پر پابندی تو انہوں نے اپنے آپ پر لگائی تھی مگر یہ قریشی سردار خود بھی اس پابندی کو نبھانہ سکے اور خود بھی چوری چھپے قرآن سن لیتے تھے کیونکہ ان کے دل اور ان کے کان قرآن کی لذت سے محظوظ ہونا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ تین سردار رات کے وقت کعبہ کے گرد کھڑے ہو کر آپ کا قرآن سن رہے تھے۔ بعد میں یہ راز فاش ہو گیا تو ان میں سے ایک سردار نے ابو جہل سے پوچھا کہ "جو قرآن تم نے سنا ہے اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟" اس نے اس سوال کا صحیح جواب دینے کے بجائے بات کا رخ دوسری طرف موڑ دیا اور کہا کہ "ہم اور بنی عبد مناف سب باتوں میں ایک دوسرے کے ہم پلہ تھے، اب ہم ان کے نبی کو تسلیم کر کے ان کی اس برتری کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں" (ابن ہشام: ص ۱۰۸) ابو جہل کے اس جواب سے دو باتوں کا صاف طور پر پتا چلتا ہے۔ ایک یہ کہ سب قریشی سردار قرآن کی تاثیر سے متأثر تھے اور دوسری یہ بات کہ آپ ﷺ کی نبوت کو تسلیم کرنے میں صرف یہ بات آڑے نہیں آ رہی تھی کہ آپ بشر تھے بلکہ اس کی اور بھی کئی وجوہ تھیں۔

اور قرآن کو اونچی آواز سے پڑھنے پر پابندی ان لوگوں نے مسلمانوں پر لگا رکھی تھی۔ کیونکہ انہیں یہ خطرہ تھا کہ قرآن سن کر ان کی عورتیں اور ان کے بچے متاثر ہو جاتے ہیں اور یہ پابندی مسلمانوں پر ہجرت نبوی تک قائم رہی۔ علاوہ ازیں ایک تدبیر انہوں نے یہ اختیار کی تھی کہ جب کہیں قرآن پڑھا جا رہا ہو تو وہاں خوب شور و غل مچاؤ تاکہ قرآن کی آواز کسی کے کان میں پڑنے ہی نہ پائے۔ یہ تھے وہ طریقے جو انہوں نے اس جادو کے شر سے بچنے کے لئے اختیار کیے تھے۔

[5] ایسی تدابیر اختیار کرنے کے بارے میں ان کے درمیان جو خفیہ مجلسیں منعقد ہوتیں اور سازشیں تیار ہوتی تھیں وہ طشت از بام تو ہو ہی جاتی تھیں۔ آپ ﷺ نے ان سب باتوں کے جواب میں صرف اتنا ہی کہا کہ کوئی بات خواہ کتنی ہی رازداری سے کی جائے، میرا پروردگار اس سے پوری طرف واقف ہے۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ تھا کہ تمہاری ان ساری سرگرمیوں کے باوجود اللہ اپنے دین کی دعوت کے کام کو آگے بڑھاتا رہے گا اور تمہاری کوئی تجویز کارگر نہ ہونے پائے گی۔

[6] ولید بن مغیرہ کے ہاں مجلس مشاورت:۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ کی مخالفت کی حد تک تو سارے قریشی سردار متفق

تھے لیکن انہیں یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آپ کو کہیں تو کیا کہیں۔ جادوگر کہیں، آسیب زدہ کہیں، کاہن کہیں یا شاعر کہیں۔ لوگوں کو کیا کہہ کر اس (محمد ﷺ) سے باز رکھیں۔ چنانچہ اسی غرض کے لئے قریشی سردار ولید بن مغیرہ کے پاس گئے جو ابوجہل کا چچا تھا اور حرب بن امیہ کی وفات کے بعد قریش کی سیادت اسی کے ہاتھ میں آئی تھی۔ سوال یہ سامنے آیا کہ اس نبی کی دعوت کو کس طرح غیر مؤثر بنایا جاسکتا ہے تاکہ باہر سے آنے والے حجاج اس شخص کے شر سے محفوظ رہ سکیں۔ ولید بن مغیرہ سمجھدار آدمی تھا۔ بولا "اس سلسلہ میں اپنی اپنی تجاویز پیش کرو"

ایک شخص نے کہا: ہم کہیں گے کہ "یہ شخص کاہن ہے" ولید کہنے لگا: واللہ! یہ شخص کاہن نہیں۔ اس کے کلام میں نہ کاہنوں جیسی گنگناہٹ ہے، نہ قافیہ نہ کوئی اور تک بندی، وہ کاہن کیسے ہو سکتا ہے؟

دوسرے نے کہا: ہم کہیں گے "وہ دیوانہ ہے" ولید کہنے لگا، بخدا وہ پاگل بھی نہیں۔ ہم نے پاگلوں کو بھی دیکھا ہے۔ اس کے اندر نہ پاگلوں جیسی دم گھٹنے کی کیفیت ہے، نہ الٹی سیدھی حرکتیں ہیں اور نہ ان جیسی بہکی بہکی باتیں ہیں"

تیسرے نے کہا: ہم کہیں گے "وہ شاعر ہے" ولید کہنے لگا، "وہ شاعر بھی نہیں۔ ہمیں رجز، ہجز، قریض، مقبوض، مبسوط سارے ہی اصنافِ سخن معلوم ہیں۔ اس کی بات بہر حال شعر نہیں ہے"

چوتھے نے کہا: ہم کہیں گے کہ وہ جادوگر ہے "ولید نے کہا، وہ جادوگر بھی نہیں۔ یہ شخص نہ تو ان کی طرح جھاڑ پھونک کرتا ہے اور نہ گرہ لگاتا ہے"

۞ **دعوتِ قرآن کو روکنے کیلئے قریش مکہ کی معاندانہ سرگرمیاں:۔** تب لوگوں نے جھنجھلا کر کہا: پھر تم ہی اپنی بے داغ رائے پیش کرو" وہ کہنے لگا۔ مجھے ذرا سوچ لینے دو۔ بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے اپنی رائے پیش کی کہ تم لوگ یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ شخص ایسا کلام پیش کرتا ہے جو ایسا جادو ہے جس سے بھائی بھائی سے، باپ بیٹے سے، شوہر بیوی سے جدا ہو جاتا ہے۔ اور کنبے، قبیلے میں پھوٹ پڑ جاتی ہے" چنانچہ اس تجویز پر متفق ہو کر سب لوگ رخصت ہو گئے۔

چنانچہ اس تجویز پر عمل درآمد کے لئے قریش نے ایک گیارہ رکنی کمیٹی تشکیل دی جس کا سربراہ ابولہب تھا۔ جہاں کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ کے لئے پہنچتے، وہاں ابولہب بھی پیچھے پیچھے پہنچ جاتا اور کہتا: لوگو! اس شخص کی بات پر کان نہ دھرنا، یہ بے دین ہے اور ایسا کلام پیش کرتا ہے جس سے کنبے قبیلے میں دشمنی پڑ جاتی ہے۔ ان لوگوں کی معاندانہ سرگرمیوں کا نتیجہ ان کی خواہش کے بالکل برعکس نکلا۔ اسلام اور پیغمبر اسلام کا نام ان کے ذریعہ عرب کے گوشے گوشے میں پہنچ گیا اور لوگوں میں جستجو پیدا ہو گئی کہ آخر ایسے شخص کی بات تو ضرور سننا چاہئے۔ اس طرح دشمنوں نے وہ کام تھوڑے ہی عرصہ میں کر کے دکھا دیا جو مسلمان شائد مدت تک نہ کر سکتے۔ کافروں کی ایسی معاندانہ سرگرمیوں سے ہی اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے خیر کا پہلو پیدا کر دیا۔

۞ **نضر بن حارث کے کارنامے:۔** ابولہب کے علاوہ ایک دوسرا شخص نضر بن حارث تھا جس کا طریق کار ابولہب سے بالکل جداگانہ تھا۔ ایک دفعہ وہ سرداران قریش سے کہنے لگا: اے قریشیو! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے سب سے زیادہ پسندیدہ،

فَلْيَأْتِنَا بِآيَةٍ كَمَا أُرْسِلَ الْأَوَّلُونَ ﴿٥﴾ مَا آمَنَتْ قَبْلَهُم مِّن قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا ۖ أَفَهُمْ يُؤْمِنُونَ ﴿٦﴾ وَمَا
أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ ۖ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٧﴾ وَمَا
جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوا خَالِدِينَ ﴿٨﴾ ثُمَّ صَدَقْنَاهُمُ الْوَعْدَ فَأَنجَيْنَاهُمْ وَمَن

پاس کوئی ایسا معجزہ[٧] لانا چاہئے جیسا کہ پہلے رسول (معجزات دے کر) بھیجے گئے تھے۔(٥) حالانکہ جس بستی کو بھی ہم نے ان سے پہلے ہلاک کیا وہ ایمان نہیں لائی تھی۔ تو کیا اب یہ ایمان لائیں گے ؟(٦) اور (اے نبی) آپ سے پہلے ہم نے جتنے رسول بھیجے، وہ سب مرد ہی تھے جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔ لہٰذا اگر تم لوگ یہ بات نہیں جانتے تو اہل الذکر (اہل کتاب) سے پوچھ لو۔(٧)

ہم نے ان (رسولوں کے) جسم ایسے نہیں بنائے تھے جو کھانا نہ کھاتے ہوں اور وہ ہمیشہ رہنے[٨] والے بھی نہ تھے۔(٨) پھر ہم نے ان رسولوں سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کر دیا۔ ہم نے انہیں بھی بچا لیا اور جس جس

سچے اور امانت دار آدمی تھے، اب اگر وہ اللہ کا پیغام لے کر آئے ہیں تو تم کبھی انہیں شاعر کہتے ہو، کبھی کاہن، کبھی پاگل اور کبھی جادوگر کہتے ہو۔ حالانکہ وہ نہ شاعر ہے نہ کاہن ہے، نہ پاگل ہے اور نہ جادوگر ہے۔ کیونکہ ہم ایسے لوگوں کو خوب جانتے ہیں۔ اے اہل قریش! سوچو، تم پر یہ کیسی افتاد آ پڑی ہے" پھر اس افتاد کا حل جو نضر بن حارث نے سوچا وہ یہ تھا کہ خود حیرہ گیا۔ وہاں سے بادشاہوں کے حالات اور رستم و اسفندیار کے قصے سیکھے۔ پھر یہ بھی ابولہب کی طرح ہر اس مقام پر جا پہنچتا جہاں پیغمبر اسلام ﷺ تبلیغ کے لئے جاتے۔ وہاں پہنچ کر یہ اپنے قصے سنا کر لوگوں سے پوچھتا کہ آخر کس بنا پر محمد ﷺ کا کلام مجھ سے بہتر ہے ؟" اس کی سرگرمیوں کا بھی وہی اثر ہوا جو ابولہب کی سرگرمیوں کا ہوا تھا۔

[٧] یعنی وہ معجزہ کا مطالبہ تو اس طرح کرتے ہیں کہ جیسے وہ ایمان لانے کو بالکل تیار بیٹھے ہیں بس صرف ایک معجزہ دیکھنے کی ہی کسر باقی رہ گئی ہے۔ حالانکہ اقوام سابقہ کی ہلاکت کا سبب ہی یہ بنا تھا کہ انہوں نے معجزہ کا مطالبہ کیا جو انہیں دیا گیا مگر وہ پھر بھی ایمان نہ لائے تھے۔ اب اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ معجزہ دیکھ کر ایمان لے ہی آئیں گے ؟ یہ بھی سابقہ اقوام کی طرح اپنی ہلاکت کے درپے ہو چکے ہیں ؟

[٨] ۞ سب انبیاء مرد تھے کھانا کھایا کرتے تھے اور سب اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں: اب کفار مکہ کے ایک بنیادی اعتراض کا جواب دیا جا رہا ہے۔ اعتراض یہ تھا کہ یہ نبی ہم ہی جیسا ایک بشر ہے۔ سب بشری کمزوریاں اور بشری تقاضے اس میں بھی موجود ہیں جو ہم میں ہیں۔ وہ ہماری طرح ہی کھانے پینے اور چلنے پھرنے کا محتاج ہے اور ہماری طرح نکاح شادیاں بھی کرتا ہے۔ مزید یہ کہ اسے نہ تو کوئی دنیوی جاہ و حشم میسر ہے اور نہ ہی کوئی فرشتہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ ان سب باتوں کا انہیں جواب یہ دیا گیا کہ تم لوگ جو اہل کتاب سے پوچھ پوچھ کر اس نبی سے کئی طرح کے سوال اور کئی طرح کے اعتراض کرتے ہو تو ایک سوال یہ بھی پوچھ لو کہ آیا موسیٰ علیہ السلام بشر تھے یا نہیں ؟ ان کے جواب سے تمہیں تسلی ہو جائے گی کہ موسیٰ علیہ

نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٩﴾ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿١٠﴾ وَكَمْ قَصَمْنَا
مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿١١﴾ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا
يَرْكُضُوْنَ ﴿١٢﴾ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿١٣﴾ قَالُوْا

کو ہم نے چاہا اسے بھی اور حد [۹] سے آگے بڑھنے والوں کو ہلاک کر دیا۔(۹) (لوگو) ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا ہی ذکر [۱۰] ہے۔ کیا تم سمجھتے نہیں۔(۱۰) کتنی ہی ایسی بستیاں ہیں جن کے رہنے والے ظالم تھے تو انہیں ہم نے پیس کے رکھ دیا اور ان کے بعد دوسرے لوگ [۱۱] پیدا کر دیئے۔(۱۱) پھر جب ان کو ہمارا عذاب محسوس ہوا تو لگے وہاں سے بھاگنے۔(۱۲) (ہم نے کہا) بھاگو نہیں بلکہ اپنے مکانوں اور اس عیش و عشرت کے سامان کی طرف لوٹ آؤ جس سے تم مزے اڑا رہے تھے شاید تم سے (حقیقت حال کے متعلق) سوال [۱۲] کیا جائے۔(۱۳)

السلام خود بھی اور ان کے علاوہ دوسرے تمام انبیاء بھی سب کے سب بشر ہی تھے۔ سب بشری تقاضے ان کے ساتھ بھی لگے ہوئے تھے۔ کھانے پینے کے علاوہ وہ سب کے سب موت سے بھی دوچار ہوئے اور آج ان میں سے کوئی بھی زندہ موجود نہیں ہے۔ (نیز دیکھئے سورۂ نحل کا حاشیہ ۴۴۔الف)

[۹] البتہ یہ بات ہر نبی سے پیش آتی رہی کہ اس کی دعوت پر کچھ لوگوں نے لبیک کہا اور زیادہ قرآن کے مخالف بن گئے۔ پھر ہم نے اپنے انبیاء اور مومنوں سے فتح و نصرت کے جو وعدے کئے تھے وہ سب پورے کر دیئے اور ایسے لوگوں کو ہم نے بروقت اپنے عذاب سے بچا بھی لیا تھا۔ لیکن جن لوگوں نے سرکشی کی راہ اختیار کی تھی۔ ان سب کو ہلاک کر ڈالا تھا۔ یہ بات بھی تم اے قریش مکہ! ان اہل کتاب سے پوچھ سکتے ہو۔

[۱۰] ❁ قرآن میں جو کچھ مذکور ہے تمہیں سے تعلق رکھتا ہے:۔ یعنی اس میں کوئی نرالی داستانیں اور کسی عجیب و غریب ملک کے حالات نہیں ہیں بلکہ تم ہی جیسے لوگوں کے حالات مذکور ہیں۔ تمہارا اپنا ہی حال بیان کیا گیا ہے۔ تمہاری ہی نفسیات اور تمہارے ہی معاملات زندگی زیر بحث ہیں۔ تمہاری ہی فطرت اور ساخت، آغاز اور انجام پر گفتگو ہے۔ تمہارے ہی اخلاقی اوصاف میں سے اچھے اور برے اخلاق کے فرق کو نمایاں کر کے دکھایا جا رہا ہے اس کتاب میں کوئی ایسی چیز نہیں جسے سمجھنے سے تمہاری عقل عاجز ہو۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے کہ اگر تم کچھ بھی غور و فکر کرو تو اس میں تمہارے لئے نصیحت اور تمہارا بھلا ہی بھلا ہے۔

[۱۱] یعنی یہ نہیں ہوا تھا کہ ظالم قوموں کو ہلاک کرنے کے بعد یہ زمین بے آباد اور ویران رہ گئی تھی۔ جبکہ اس زمین کو ہم نے فوراً دوسرے لوگ لا کر آباد کر دیا تھا اور اس کا اگر کچھ نقصان پہنچا تھا تو صرف ظالموں ہی کو پہنچا تھا۔

[۱۲] یعنی اب اپنی مجالس کی مسندوں پر کیوں براجمان نہیں ہوتے۔ تاکہ لوگ آپ کے سامنے اپنی درخواستیں پیش کریں۔ اپنے مسائل حل کروائیں۔ آپ سے مشورے کریں۔ آپ کی رائے پوچھیں۔ اب کہاں جاتے ہو یہیں بیٹھو اور کچھ نہیں تو کم

يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴﴾ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ﴿۱۵﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۱۶﴾ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ

وہ کہنے لگے ہائے افسوس! ہم ہی خطا کار تھے۔(۱۴) وہ یہی پکارتے رہے تا آنکہ ہم نے انہیں کٹی ہوئی کھیتی کی طرح بنا دیا[۱۳] اور وہ بجھ کر وہیں ڈھیر ہو گئے۔(۱۵) اور ہم نے آسمان، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے انہیں محض کھیل کے طور پر نہیں[۱۴] پیدا کیا۔(۱۶) اگر ہمارا مقصود کھیل ہی ہوتا تو اگر ہم چاہتے تو اپنے ہاں

از کم بعد میں آنے والوں کو یہی بتا دینا کہ تم پر عذابِ الٰہی کیسے آیا تھا؟ اور کس کس قسم کے حالات پیش آئے تھے؟

[۱۳] عذابِ الٰہی جب آجائے اس وقت ایمان لانے سے رک نہیں سکتا: اللہ کے نافرمان اور سرکش لوگوں کی ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ ڈنڈے کے بغیر سیدھے نہیں ہوتے۔ ان پر جب عذابِ الٰہی آجاتا ہے اور موت اپنے سامنے کھڑی دیکھتے ہیں۔ تو اس وقت اپنے گناہوں کا بھی اعتراف کرنے لگتے ہیں اور ایمان بھی لانے پر فوراً تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر جس طرح عذابِ الٰہی یک دم نہیں آن پڑتا اور اس کے آنے کے لئے تدریج و امہال کا قانون مقرر ہے اس طرح اس کے لئے ایک قانون یہ ہے کہ جب آجائے تو پھر واقع ہو کے رہتا ہے پھر ٹل نہیں سکتا اور اس قوم کا صفحہ ہستی سے نام و نشان تک مٹا دیا جاتا ہے۔

[۱۴] دنیا کس لحاظ سے کھیل تماشا ہے؟ دنیادار اور اللہ کی یاد سے غافل انسان ہمیشہ یہی سمجھتے رہے ہیں کہ یہ دنیا بس ایک کھیل تماشا ہے۔ ہم یہاں عیش و عشرت کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لیے یہاں ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ جتنی عیش و عشرت اپنے لئے مہیا کر سکتا ہے اور جس طرح کر سکتا ہے، کر لے۔ گویا دنیادار لوگوں کا منتہائے مقصود ہی یہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے بھی دنیا کو متعدد مقامات پر کھیل تماشا قرار دیا ہے مگر یہ بات صرف اس پہلو سے کہ یہ چند روزہ دنیا آخرت کے مقابلہ میں ایک کھیل تماشا کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ تھوڑی مدت بعد فنا ہو جانے والی ہے اور آخرت کی زندگی دائمی اور پائیدار ہے لہٰذا تمہیں اپنی تمام تر توجہ دنیا پر مرکوز کرنے کے بجائے آخرت پر مرکوز کرنی چاہئے۔ یہاں اس مقام پر صرف دنیا کی زندگی پر نہیں بلکہ کائنات کے پورے نظام کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ یہ کچھ کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ جس میں اس دنیا کی زندگی بھی شامل ہے جو زمین و آسمان ہی کے سہارے قائم ہے۔ اور انسان کی تمام ضروریات زمین، ہوا، سورج اور بادلوں وغیرہ سے وابستہ ہیں۔ زمین میں اشرف المخلوقات یعنی انسان کو پیدا کیا تو صرف اس لئے نہیں کہ وہ اسے کھیل تماشا سمجھتے ہوئے جیسے چاہے یہاں زندگی گزار کر یہاں سے رخصت ہو جائے اور اس سے کچھ مؤاخذہ نہ ہو۔ خالق کائنات بس یہی تماشا دیکھتا رہے کہ اس دنیا میں لوگ کیسے ایک دوسرے پر ظلم کر رہے ہیں اور وہ بس دیکھ کر اسے محض تفریح طبع کا ہی سامان سمجھتا رہے۔ جیسا کہ رومی اکھاڑے میں ہوتا تھا کہ انسانوں کا درندوں سے مقابلہ کرایا جاتا تھا اور درندے جس انداز سے انسانوں کو پھاڑ کھاتے تھے۔ بادشاہ اور اس کے درباری یہ منظر دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ اور یہ ان کی تفریح طبع کا سامان تھا۔ ایسی بات ہرگز نہیں۔ اگر اللہ کو محض تفریح طبع ہی منظور ہوتی تو اس کے کئی اور بھی طریقے ہو سکتے تھے جن میں ظلم و جور کا نام و

اِنۡ كُنَّا فٰعِلِيۡنَ ﴿۱۷﴾ بَلۡ نَقۡذِفُ بِالۡحَـقِّ عَلَى الۡبَاطِلِ فَيَدۡمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ‌ ؕ وَلَـكُمُ الۡوَيۡلُ
مِمَّا تَصِفُوۡنَ ﴿۱۸﴾ وَلَهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ ؕ وَمَنۡ عِنۡدَهٗ لَا يَسۡتَكۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِهٖ
وَلَا يَسۡتَحۡسِرُوۡنَ‌ ﴿۱۹﴾ يُسَبِّحُوۡنَ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفۡتُرُوۡنَ ﴿۲۰﴾ اَمِ اتَّخَذُوۡۤا اٰلِهَةً مِّنَ الۡاَرۡضِ

ہی ایسا کر سکتے تھے اگر ہم کرنے والے ہوتے(۱۷) بلکہ ہم باطل[۱۵] پر حق کی ضرب لگاتے ہیں تو حق باطل کا بھیجا نکال دیتا ہے اور باطل شکست کھا کر بھاگ اٹھتا ہے اور تمہارے لئے ہلاکت ہے ان باتوں کی وجہ سے جو تم بیان کرتے ہو۔(۱۸)

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے اور جو مخلوق (فرشتے) اس کے حضور میں ہیں وہ اس کی بندگی سے اکڑتے نہیں اور نہ ہی وہ اکتاتے[۱۶] ہیں۔(۱۹) وہ دن رات اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور کبھی دم نہیں لیتے۔(۲۰) کیا انہوں نے زمین میں ایسے الٰہ بنا رکھے ہیں جو انہیں (عذابِ الٰہی سے مر جانے کے بعد)

نشان تک نہ ہوتا نہ ہی انسان جیسی کوئی ذی شعور اور صاحب ارادہ واختیار مخلوق پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔

[۱۵] ❁ تخلیقِ کائنات کا مقصد:۔ بلکہ تخلیقِ کائنات کا اصل مقصد یہ ہے کہ یہاں میدانِ کارزار گرم ہو۔ حق وباطل کا معرکہ جاری رہے۔ حق باطل پر حملہ آور ہو اور اس کا کچومر نکال کر بھاگنے پر مجبور کر دے۔ پھر جن لوگوں نے حق کا ساتھ دیا ہو۔ اللہ انہیں اپنے انعامات سے نوازے اور اہلِ باطل کو تباہ وبرباد کر دے۔

❁ باطل کی شکست کیسے؟ جبکہ بسا اوقات باطل ہی غالب نظر آتا ہے:۔ یہاں ایک اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ اکثر ہم دیکھتے ہیں کہ باطل قوتیں ہی غالب نظر آتی ہیں اور حق دبا رہتا ہے۔ انبیاء یا بعض دوسرے مصلحین آتے ہیں حق وباطل کا معرکہ ہوتا ہے اور حق غالب آ جاتا ہے لیکن تھوڑی دیر بعد پھر باطل سر نکال لیتا ہے اور حق دب جاتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حق کی راہ صرف ایک ہے اور وہ ہے اللہ کی وحدانیت اور اس کائنات پر صرف اسی کا مکمل اقتدار واختیار۔ جبکہ باطل کی راہیں لاتعداد ہیں۔ وہ اپنے روپ کو بدلتی رہتی ہیں اور اپنے الٰہ بھی۔ حق آتا ہے تو باطل کی راہوں کو مٹا دیتا ہے پھر باطل کسی نئے روپ میں از سر نو جنم لیتا ہے۔ کبھی الٰہ بتوں کو ٹھہرایا جاتا ہے، کبھی شمس وقمر کو، کبھی ستاروں کو، کبھی فرشتوں کو، کبھی جنوں کو، کبھی انسانوں کو، کبھی ان کے آستانوں اور مزاروں کو اور کبھی شجر وحجر وغیرہ کو۔ تو یہ سب راہیں حق کے مقابلہ میں مغلوب ہی رہی ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک حق کی راہ ایک ہی رہی ہے اور موجود رہی ہے۔ آج بھی موجود ہے اور قیامت تک موجود رہے گی۔ توحید کے پرستار قیامت تک موجود رہیں گے۔ خواہ ان کی تعداد کتنی ہی تھوڑی ہو۔ جبکہ باطل کے تمام راستے ہمیشہ سے بگڑتے اور حق سے زک ہی اٹھاتے رہے ہیں۔ اور حق اکثر اوقات دبا رہنے کے باوجود بھی قائم اور برقرار رہتا ہے۔ گویا حق کو جو استقلال میسر ہے وہ باطل کو کبھی نصیب نہیں ہوتا۔

[۱۶] ❁ فرشتوں کے وظائف:۔ یعنی فرشتے اللہ کی ایسی مخلوق ہے۔ جو ہر آن اللہ کی تسبیح وتحمید میں مشغول رہتے ہیں اور وہ اللہ کی بندگی کو ناگوار سمجھ کر نہیں کرتے بلکہ نہایت خوشدلی سے بجالاتے ہیں۔ قرآن نے یہاں یستحسرون کا لفظ استعمال

هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿٢١﴾ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا

زندہ[١٧] اٹھا کھڑا کریں گے ؟(٢١) اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا کوئی اور بھی الٰہ ہوتے تو ان دونوں کا نظام درہم برہم[١٨] ہو جاتا، لہٰذا جو کچھ یہ لوگ بیان کرتے ہیں ان سے اللہ پاک ہے جو عرش کا مالک

فرمایا ہے اور استحسار ایسی تھکاوٹ یا اکتاہٹ کو کہتے ہیں جو کسی ناگوار کام کے کرنے سے لاحق ہوتی ہے۔ اور ان کی یہ تسبیح بالکل ایسے ہی بلا وقفہ ہوتی ہے جیسے انسان مسلسل سانس لیتا ہے اور اس میں کبھی وقفہ نہیں ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا انسان کی تخلیق سے مقصود محض اپنی عبادت ہی ہوتی تو فرشتے یہ کام بطریقِ احسن بجالا رہے تھے۔ لیکن اصل مقصد یہ تھا کہ یہاں حق و باطل کا معرکہ بپا ہو اور وہ انسان کو پیدا کرنے اور اسے عقل اور قوت ارادہ و اختیار دینے سے ہی ہو سکتا تھا اور انسانوں کی آزمائش اسی طرح ہو سکتی تھی۔

[١٧] الٰہ وہی ہو سکتا ہے جو زندگی بخشے:۔ يُنْشِرُوْنَ کا مطلب ہے کسی بے جان چیز میں روح پھونک کر اسے زندہ کرنا، جلا دینا، اس لحاظ سے اس جملہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو وہ ہے جو ترجمہ میں بیان کیا گیا ہے کہ آیا ان کے معبودوں میں یہ طاقت ہے کہ جب وہ عذاب الٰہی سے ہلاک ہو جائیں تو ان کے معبود انہیں دوبارہ زندہ کر دکھائیں۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ کیا ان میں یہ طاقت ہے کہ وہ کسی بھی مادہ اور بے جان چیز میں روح پھونک کر اسے زندہ بنا دیں۔ اور اگر وہ یہ کام نہیں کر سکتے تو پھر وہ الٰہ کیسے بن سکتے ہیں؟

[١٨] اگر اللہ کے سوا اور بھی الٰہ ہوں تو کائنات کا نظام درہم برہم ہو جائے:۔ بڑی موٹی سی بات ہے کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں۔ ایک اقلیم کے دو فرمانروا نہیں ہو سکتے۔ حتیٰ کہ کوئی بھی ادارہ اس وقت تک چل ہی نہیں سکتا جب تک کہ اس کا کرتا دھرتا صرف ایک شخص نہ ہو۔ بلکہ ایک گھر تک کا بھی انتظام اس وقت تک چل نہیں سکتا جب تک کہ سربراہ ایک نہ ہو۔ اور اگر میاں بیوی میں بھی اقتدار کی جنگ ہو تو اس کا نظام بھی تباہ و برباد ہو جائے گا۔ پھر اس عظیم کارخانہ کائنات کے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کے سربراہ ایک سے زیادہ ہوں؟ چونکہ یہ ایسی عام مثال ہے جس سے ہر شخص کو سابقہ پڑتا ہے۔ لہٰذا اس کے مختلف پہلوؤں پر ہر شخص خود بھی غور کر سکتا ہے یہاں تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔ جاہل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح ایک بادشاہ نے اپنے تحت بے شمار امیر وزیر رکھے ہوتے ہیں جو تدبیر مملکت میں اس کی مدد کرتے ہیں اور وہ اس کے محکوم ہی ہوتے ہیں۔ اس کے برابر کی چوٹ نہیں ہوتے یہی صورت ہمارے معبودوں کی ہے۔ اللہ نے کچھ برگزیدہ ہستیوں کو کچھ اختیارات تفویض کر رکھے ہیں۔ جو اس کے محکوم اور اس کے بندے ہی ہیں۔ تاہم اللہ نے انہیں بھی کچھ اختیارات تفویض کر رکھے ہیں۔ اس دلیل میں سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کی معرفت کو سمجھا ہی نہیں۔ بادشاہ ایک عاجز مخلوق ہے۔ وہ خود نہ ہر ایک کی فریاد سن سکتا ہے اور نہ سلطنت کا انتظام چلا سکتا ہے۔ اسے مددگاروں کی احتیاج ہے، ان کے بغیر اس کا کام چل ہی نہیں سکتا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ ایسی تمام کمزوریوں

يَصِفُوْنَ ﴿۲۲﴾ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿۲۳﴾ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ
قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا
يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ

ہے۔(۲۲) جو کچھ وہ کرتا ہے اس سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا البتہ ان سے ضرور[19] باز پرس ہو گی۔(۲۳) کیا انہوں نے اللہ کے علاوہ دوسرے الٰہ بنا رکھے ہیں؟ آپ ان سے کہئے: ”اس پر اپنی کوئی دلیل[20] تو لاؤ“ یہ ذکر (قرآن) ان لوگوں کے لئے نصیحت ہے جو میرے ساتھ ہیں اور یہ ذکر (تورات وانجیل وغیرہ) ان لوگوں کے لئے بھی جو مجھ سے پہلے تھے۔ مگر ان میں سے اکثر حق بات کو جانتے نہیں لہٰذا اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔(۲۴) اور آپ سے پہلے ہم نے جو بھی رسول بھیجا اس کی طرف[21] یہی وحی کرتے رہے کہ ”میرے سوا

سے پاک ہے۔ اسے کسی طرح کے مددگاروں کی ضرورت نہیں۔ وہ ہر ایک کی فریاد خود سنتا ہے اور قبول کرتا ہے اور سارے نظام کائنات کو خود ہی چلا رہا ہے اور ان کاموں کے لئے اسے کسی کی مطلق احتیاج نہیں ہے اور جو فرشتے مدبراتِ امر ہیں۔ انہیں بھی کچھ اختیارات تفویض نہیں کئے گئے بلکہ وہ اللہ ہی کے حکم کے پابند اور اس حکم کے سامنے مجبور و بے بس ہوتے ہیں۔

[19] جو مسئول ہے وہ الٰہ نہیں ہو سکتا:۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کائنات کا ایسا مطلق العنان اور مختار کل فرمانروا ہے کہ کائنات میں جو کچھ بھی کرے کسی کے سامنے جوابدہ نہیں۔ جبکہ اس کے سوا جتنی بھی مخلوق ہے سب اس کے سامنے جوابدہ ہیں۔ اور الٰہ وہی ذات ہو سکتی ہے جس میں یہ صفت بدرجہ اتم پائی جاتی ہو۔ یعنی وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہو۔ اور جس سے باز پرس ہو سکتی ہے وہ الٰہ نہیں ہو سکتا۔

[20] کسی الہامی کتاب سے شرک کی تائید نہیں ہو سکتی:۔ پہلے دو دلائل عقلی تھے جو اثبات توحید اور شرک کے ابطال پر پیش کئے گئے تھے۔ اب نقلی دلیل کا ذکر کیا کہ ان سے پوچھو کہ ان معبودوں کے جواز پر تمہارے پاس کوئی نقلی دلیل ہے؟ اگر ہے تو لاؤ دکھاؤ۔ یہ قرآن بھی موجود ہیں۔ جو میرے دور کے لوگوں اور میرے بعد آنے والوں کے لئے الہامی کتاب ہے اور تورات وانجیل بھی موجود ہیں جو مجھ سے پہلے کے لوگوں کے لئے راہ ہدایت تھیں۔ ان میں سے کسی میں بھی یہ بات لکھی ہوئی دکھادو کہ اللہ نے فلاں فلاں کو فلاں فلاں اختیارات تفویض کر رکھے ہیں۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ کوئی فرمانروا اگر اپنے لئے کوئی نائب یا مددگار یا میر وزیر مقرر کرتا ہے تو ان کا ریکارڈ بھی اس کے پاس موجود ہوتا ہے لیکن لوگوں کی اکثریت اتنی جاہل ہے کہ ان باتوں کی طرف غور ہی نہیں کرتی۔ بس تقلیدِ آباء کی گھسی پٹی راہ پر اندھا دھند بھاگے جا رہی ہے۔

[21] مشرکوں سے ایسی دلیل کے مطالبہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے خود ہی یہ وضاحت فرمادی کہ میں نے تو جو بھی رسول بھیجا اس کی طرف یہی وحی کرتا رہا کہ میرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ پھر ان منزل من اللہ کتابوں میں کوئی ایسی بات نکل بھی کیسے سکتی ہے جس میں شرک کے لئے جواز کی سند موجود ہو؟ اور اتفاق کی بات ہے کہ سابقہ الہامی کتب میں اگرچہ بہت سی تحریف ہو چکی ہے پھر بھی وہ توحید ہی کے دلائل مہیا کرتی ہیں ان میں ایسی کوئی بات نہیں ملتی جس سے شرک کی تائید ہو سکے۔

أَنَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّآ أَنَا۠ فَاعْبُدُونِ ﴿٢٥﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَٰنُ وَلَدًا ۗ سُبْحَانَهُ ۚ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ ﴿٢٦﴾

لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُم بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ ﴿٢٧﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا

يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ وَهُم مِّنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ ﴿٢٨﴾ وَمَن يَقُلْ مِنْهُمْ إِنِّي إِلَٰهٌ مِّن دُونِهِ

کوئی الٰہ نہیں۔ لہٰذا صرف میری ہی عبادت کرو'' (۲۵) (مشرکین) کہتے ہیں کہ رحمٰن کی اولاد [۲۲] ہے۔ اللہ ایسی باتوں سے پاک ہے، بلکہ وہ تو اس کے معزز بندے ہیں۔ (۲۶) وہ اس کے حضور بڑھ کر نہیں بولتے بس اسی کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ (۲۷) اللہ ان بندوں کے سامنے کے (ظاہری) احوال کو بھی جانتا ہے اور پوشیدہ احوال کو بھی۔ اور وہ صرف اسی کے حق [۲۳] میں سفارش کر سکیں گے جس کے لئے اللہ راضی ہو اور وہ ہمیشہ اس کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں۔ (۲۸) اور ان میں سے جو شخص یہ کہے کہ: ''اللہ کے علاوہ میں بھی الٰہ [۲۴] ہوں'' اسے

[۲۲] فرشتے اللہ کی اولاد نہیں بلکہ اللہ کے فرمانبردار بندے ہیں:۔ یہ خطاب صرف مشرکین مکہ کو ہے جو فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ کیونکہ آگے اسی بات کی وضاحت آ رہی ہے۔ یہ فرشتے اللہ کے دست بستہ غلام ہیں اور معزز اس لحاظ سے ہیں کہ ہر وقت اللہ کی تسبیح و تقدیس میں مشغول رہتے ہیں۔ وہ باادب اتنے ہیں کہ اللہ کے حضور کوئی بات ہی نہیں کرتے بس صرف حکم کے منتظر رہتے ہیں۔ اور جب انہیں کوئی حکم دیا جاتا ہے تو فوراً اس کی تعمیل کرتے ہیں۔

[۲۳] فرشتوں کی سفارش اور شفیع پر پابندیاں:۔ مشرکین مکہ دو وجوہ سے فرشتوں کی عبادت کرتے تھے۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کی اولاد ہیں۔ دوسرے اس لئے کہ وہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں اور اللہ کے حضور ہمارے قرب کا ذریعہ ہیں۔ اس کے جواب میں اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ سفارش نہیں کریں گے کیونکہ کتاب و سنت کی رو سے انبیاء و صالحین فرشتوں اور خود قرآن کا سفارش کرنا ثابت ہے۔ بلکہ یوں فرمایا کہ وہ سفارش صرف اس کے حق میں کر سکیں گے جس کے حق میں سفارش اللہ کو منظور ہو اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ فرشتوں کو علم غیب نہیں ہے۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ جس کے حق میں وہ سفارش کر رہے ہیں اس کے اعمال کی کیا صورت اور کیفیت ہے اور یہ حالات صرف اللہ ہی کو معلوم ہیں۔ اس لئے سفارش صرف انہی کے حق میں کر سکیں گے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ اجازت دے گا اور وہ اللہ سے ڈرتے بھی رہتے ہیں پھر اللہ کی اجازت کے بغیر سفارش کیسے کر سکیں گے۔ اب اگر کسی کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ اسے سفارش کی اجازت ملے گی بھی یا نہیں۔ پھر بالخصوص فلاں شخص کے حق میں ملے گی یا نہیں تو پھر ایسے بے اختیار شفیع اس بات کے مستحق کیسے ہو سکتے ہیں کہ ان کے آگے سر نیاز خم کیا جائے اور اپنی حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لئے ان کے آگے دست سوال دراز کیا جائے یا انہیں پکارا جائے۔

[۲۴] ان سب باتوں کے باوجود اگر کوئی شخص بالفرض اپنی خدائی کا دعویٰ کرتا ہے۔ جیسا کہ فرعون اور نمرود جیسے کئی سرکش انسانوں نے کیا تھا تو یہ ان کا اللہ تعالیٰ پر افتراء ہے اور وہ دوہرے تہرے مجرم ہیں۔ ان ظالموں کو ہم جہنم میں پھینک دیں گے اور ان کے جرائم کے مطابق انہیں قرار واقعی سزا دیں گے۔

فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَجَعَلْنَا فِي
الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۠ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَجَعَلْنَا

ہم جہنم کی سزا دیں گے اور ہم ظالموں کو ایسے ہی سزا دیتے ہیں۔(۲۹)

کیا کافروں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ آسمان اور زمین آپس میں گڈ مڈ[۲۵] تھے پھر ہم نے انہیں الگ الگ کیا اور ہر جاندار[۲۶] چیز کو پانی سے زندگی بخشی کیا پھر بھی یہ لوگ (اللہ تعالیٰ کی خلاقی) پر ایمان نہیں لاتے؟(۳۰) اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنائے تاکہ وہ انہیں لے کر ہچکولے نہ کھائے[۲۷]۔ نیز اس میں کشادہ[۲۸] راہیں بنا دیں تاکہ لوگ راستہ معلوم[۲۹] کر لیں۔(۳۱) اور آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا۔ پھر

[۲۵] رتق اور فتق کا لغوی مفہوم:۔ اس آیت میں رتق اور فتق کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اور یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ رتق کے معنی دو چیزوں یا کئی چیزوں کا مل کر جڑ جانا اور چسپیدہ ہونا ہے اور فتق کے معنی ایسی گڈ مڈ شدہ اور جڑی ہوئی چیزوں کو الگ الگ کر دینا ہے۔ اس آیت میں کائنات کا نقطہ آغاز بیان کیا گیا ہے کہ ابتداءً صرف ایک گڈ مڈ اور کئی چیزوں سے مخلوط مادہ تھا۔ اسی کو کھول کر اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان اور دوسرے اجرامِ فلکی کو پیدا فرمایا۔

[۲۶] ہر چیز کی تخلیق پانی سے ہے:۔ ہر وہ چیز جس میں زندگی کے آثار پائے جاتے ہوں اس کی زندگی کا سبب پانی ہی ہوتا ہے اور اس میں نباتات، حیوانات سب شامل ہیں۔ اور ایسی تمام اشیاء پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا ہے جیسے فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَاۗبَّةٍ مِّنْ مَّاۗءٍ﴾ (۲۴:۴۵) اس لحاظ سے اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ہر چیز کی پیدائش میں پانی کی موجودگی ضروری ہے اگرچہ یہ غالب عنصر کے طور پر نہ ہو۔ جیسے انسان کی پیدائش میں غالب عنصر مٹی ہے اور جنوں کی پیدائش میں آگ۔ اور اس کا تیسرا مطلب یہ ہے کہ تمام موجودات میں پانی کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ جیسا کہ کتاب و سنت میں یہ صراحت ہے کہ ایک وقت ایسا تھا جب صرف پانی ہی پانی تھا اور اس پر اللہ کا عرش تھا اور پانی کے علاوہ کوئی دوسری چیز موجود نہ تھی۔ پھر ہر طرح کی تخلیق کا آغاز پانی سے ہی ہوا۔ حتیٰ کہ جمادات میں بھی پانی کا کچھ نہ کچھ حصہ موجود ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ جڑی ہوئی ہے اگر اس سے پانی کو ختم کر دیا جائے تو وہ چیز ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔

[۲۷] اس جملہ کی تشریح کے لئے دیکھئے سورۂ نحل کی آیت نمبر ۱۵ کا حاشیہ۔

[۲۸] آغازِ کائنات:۔ یعنی پہاڑ پیدا کئے۔ پھر ان میں وادیاں اور ندی نالے بن گئے۔ انہیں ندی نالوں سے نشیب و فراز کو معلوم کر کے انسان کو ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ تک پہنچنے کے لئے راستوں کی نشاندہی ہوتی گئی۔ پھر اس زمین میں اور کئی طرح کی علامات پیدا کر دیں۔ کہیں گھاٹیاں ہیں، کہیں چھوٹے پہاڑ، کہیں درے، کہیں بڑے بڑے پہاڑ اور ندی نالے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کی ساخت بھی ایسی بنا دی ہے کہ ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ تک پہنچنے کی راہ بن جاتی ہے یا بنائی جا سکتی ہے۔

[۲۹] اس جملہ کے بھی دو مطلب ہیں۔ ایک تو واضح ہے کہ زمین میں چلنے پھرنے کے لئے راہ پا لیں۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے

السَّمَآءَ سَقۡفًا مَّحۡفُوۡظًا ۚۖ وَّ هُمۡ عَنۡ اٰيٰتِهَا مُعۡرِضُوۡنَ ﴿۳۲﴾ وَ هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ وَ
الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِىۡ فَلَكٍ يَّسۡبَحُوۡنَ ﴿۳۳﴾ وَمَا جَعَلۡنَا لِبَشَرٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ الۡخُلۡدَ ؕ اَفَا۟ئِنۡ

بھی یہ لوگ اللہ کی نشانیوں کی طرف توجہ[۳۰] نہیں کرتے۔(۳۲) وہی تو ہے جس نے رات اور دن، اور سورج اور چاند کو پیدا کیا یہ سب (سیارے اپنے اپنے) مدار میں تیر رہے[۳۱] ہیں۔(۳۳)

(اے نبی) آپ سے پہلے بھی ہم نے کسی انسان کے لئے دائمی زندگی تو نہیں رکھی، اگر آپ مر جائیں تو کیا یہ

کہ اللہ کی ان نشانیوں میں غور و فکر کر کے اللہ کی معرفت اور حقیقتِ حال معلوم کر سکیں۔

[۳۰] کائنات میں اللہ تعالیٰ کی ایسی بے شمار نشانیاں موجود ہیں جن میں غور کرنے سے بآسانی انسان اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ ان اشیاء کو پیدا کرنے والی اور ان میں نظم و ضبط برقرار رکھنے والی ضرور کوئی نہ کوئی ہستی موجود ہے جو اتنی بااختیار، علیم اور مقتدر ہے کہ ان تمام اشیاء پر کنٹرول کر رہی ہے اور وہ ایک ہی ہو سکتی ہے اور یہ لوگ جو کسی نئی نشانی یا کسی نئے معجزہ کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان نشانیوں کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے اگر وہ توجہ دیتے تو پھر انہیں کسی معجزہ کے مطالبہ کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

[۳۱] اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نام تو دو سیاروں سورج اور چاند کا لیا اور بعد میں فرمایا "سب (اپنے اپنے) فلک میں تیر رہے ہیں۔ جس سے بہت سے حقائق کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) سَبَحَ کے معنی پانی یا فضا میں تیرنا یا تیز رفتاری سے گزر جانا ہے۔ گویا سیارے فضا یا خلا میں تیز رفتاری سے گردش کر رہے ہیں۔

(۲) ❁ شمس و قمر کی گردش:۔ سورج اور چاند کے علاوہ بھی جتنے سیارے ہیں وہ سب کے سب محو گردش ہیں۔

(۳) ❁ زمین کی گردش کے متعلق مختلف نظریات:۔ چاند کی طرح سورج بھی یقیناً محو گردش ہے۔ یہاں ایک نہایت اہم سوال سامنے آتا ہے۔ جو یہ ہے کہ آیا ہماری زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد گھوم رہا ہے یا سورج ساکن ہے اور زمین اس کے گرد گھوم رہی ہے؟ یہ ایسا سوال ہے جس کے جواب میں آج تک چار مختلف نظریات پیش آ چکے ہیں۔ ابتدائی نظریہ یہی تھا کہ ہماری زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد گھومتا ہے۔ جیسا کہ بظاہر سب کو نظر آتا ہے۔ تقریباً ساڑھے پانچ سو سال قبل مسیح میں یونان کے ایک فلاسفر اور ہیئت دان نے یہ نظریہ پیش کیا کہ سورج ساکن ہے اور ہماری زمین اس کے گرد گھوم رہی ہے۔ نیز ہماری زمین کے علاوہ اور بھی بہت سے سیارے ہیں جو سورج کے گرد گھوم رہے ہیں۔ بعد ازاں چوتھی صدی قبل مسیح میں بطلیموس فلاسفر نے علم ہیئت کے متعلق وہی پہلا نظریہ پیش کیا کہ حقیقت میں ہماری زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ بطلیموس علم ہندسہ ہیئت اور نجوم میں استاد وقت اور یکتائے روزگار تھا۔ اس نے اجرام فلکی کی تحقیق کے لئے ایک رصد گاہ بھی تیار کی ہوئی تھی۔ علم ہیئت پر اس کی کتاب "مجسطی" نہایت معتبر سمجھی جاتی ہے۔ یہ تیسرا بطلیموسی نظریہ اپنے تمام معتقدات سمیت تقریباً ۱۸۰۰ سو سال تک دنیا بھر میں مشہور و مقبول رہا۔ بالآخر یورپ کے ایک ہیئت دان کوپرنیکس

(۱۴۷۳ء۔ ۱۵۴۳ء) نے سولہویں صدی کے آغاز میں یہ نظریہ پیش کیا کہ سورج متحرک نہیں بلکہ ساکن ہے اور ہماری زمین اپنے محور کے گرد بھی گھومتی ہے اور سورج کے گرد بھی سال بھر میں ایک چکر لگاتی ہے۔ لیکن کوپرنیکس کے بعد ایک دوسرے ہیئت دان ٹیکو براہی نے کوپرنیکس کے نظریے کو رد کر دیا اور تھوڑی سی ترمیم کے بعد اسی پہلے بطلیموسی نظریہ کو ہی صحیح قرار دیا۔ جس میں زمین کو ساکن قرار دیا گیا ہے اور سورج اور دوسرے تمام سیارے اس کے گرد حرکت کر رہے ہیں۔ بعد ازاں اٹلی کے ایک ہیئت دان گیلیلیو نے ایک دوسرے ہیئت دان (ہالینڈ) کی مدد سے کئی قسم کی دوربینیں تیار کر کے اجرام فلکی کا مشاہدہ کیا تو کوپرنیکس کے نظریہ کو بہت درست پایا۔ جو اس بارے میں چوتھا نظریہ تھا۔ بعد ازاں کئی ہیئت دانوں نے اس نظریہ کی تائید کی اور آج کے دور میں یہی نظریہ رائج اور درست سمجھا جا رہا ہے کہ سورج ساکن ہے اور نو ستارے اس کے گرد گھوم رہے ہیں اور یہ امکان بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ ممکن ہے کہ ہمارا سورج اپنے پورے خاندان (نظامِ شمسی) سمیت اپنے سے کسی بڑے سورج کے گرد گھوم رہا ہو۔

زمین کی گردش کے متعلق ہمیں کتاب و سنت میں کوئی صراحت نہیں ملتی کہ آیا وہ ساکن ہے یا متحرک؟ البتہ دلائل سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ زمین بھی ایک سیارہ ہے اور گول ہے لہٰذا وہ بھی کل کے حکم میں داخل ہو اور حرکت کر رہی ہو۔ البتہ سورج کے متعلق کتاب و سنت میں بالصراحت مذکور ہے کہ وہ حرکت کر رہا ہے اور اس حرکت سے مراد محض محوری گردش ہی نہیں۔ بلکہ جریان یا سَبَحَ کے الفاظ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرنا اور کرتے جانا مراد ہے۔ گویا موجودہ ہیئت دانوں کا احتمال محض احتمال نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ سورج معہ اپنے خاندان اپنے سے کسی بڑے سورج (یعنی شمس الشموس یا ثابت الثوابت) کے گرد گھوم رہا ہے۔

(۴) ❁ افلاک اور ان کی گردش:۔ اس آیت میں فلک کا استعمال ہوا ہے۔ جس کا ترجمہ گو اردو زبان میں آسمان ہی کر لیا جاتا ہے تاہم اس سے مراد وہ سات آسمان نہیں جن کی تعداد کتاب و سنت میں (سبع سماوات) بتائی گئی ہے۔ بلکہ اس سے مراد سیاروں کے مدار (Orbits) یا وہ راستے ہیں جن پر وہ گھوم رہے ہیں۔ بطلیموسی نظریہ کے مطابق سیارے سات تھے اور افلاک بھی سات ہی تھے۔ پہلے فلک پر چاند دوسرے پر عطارد، تیسرے پر زہرہ، چوتھے پر سورج، پانچویں پر مریخ، چھٹے پر مشتری اور ساتویں پر زحل ہے۔ ان سات افلاک کو سات سیاروں سے منسوب کیا گیا ہے۔ پھر ان کے اوپر آٹھواں فلک ہے جس کو فلک ہشتم، فلک ثوابت اور فلک البروج بھی کہتے ہیں۔ اس آٹھویں فلک کے دائرہ کو ۱۲ حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ کو ایک برج قرار دیا ہے۔

۵۔ بطلیموسی نظریہ کے مطابق صرف سیارے ہی محو گردش نہیں بلکہ یہ افلاک بھی گردش کرتے ہیں۔ اور ان سیاروں اور افلاک کی گردش کے انسانی زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جیسا کہ غالب کے درج ذیل شعر سے بھی معلوم ہوتا ہے۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان ...... ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اس آیت میں سیاروں کی گردش کا تو ذکر موجود ہے لیکن یہ بھی بتا دیا گیا کہ یہ فلک (مدار) گردش نہیں کرتے۔

مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴿۳۴﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ
وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ
اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۶﴾ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا

ہمیشہ زندہ [۳۲] رہیں گے؟(۳۴) ہر جاندار کو موت کا مزا چکھنا ہے اور ہم تو تمہیں اچھے اور برے حالات (دونوں طرح) سے آزماتے ہیں [۳۳] اور بالآخر تمہیں ہماری طرف لوٹنا ہے۔(۳۵)

اور جب کافر آپ کو دیکھتے ہیں تو بس مذاق ہی اڑاتے ہیں (کہتے ہیں) کیا یہی وہ شخص ہے جو تمہارے معبودوں کا ذکر کیا کرتا ہے؟" جبکہ وہ خود رحمٰن [۳۴] کے ذکر کے منکر ہیں۔(۳۶) انسان جلد باز مخلوق ہے عنقریب میں تمہیں

[۳۲] ہجرتِ حبشہ اور کفار کی پریشانی:۔ جب کفارِ مکہ کے ظلم و ستم اور چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر ۸۰ کے قریب مسلمان حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ تو قریش مکہ کے سب گھروں میں کہرام مچ گیا۔ کیونکہ مشکل ہی سے کوئی گھرانا ایسا بچارہ گیا ہوگا جس کے کسی لڑکے یا لڑکی نے ہجرت نہ کی ہو۔ ان لوگوں کو اپنی ایذا رسانیوں کا تو خیال تک نہ آتا تھا مگر یہ ضرور سمجھتے تھے کہ ہمارے گھروں کی بربادی کا باعث صرف یہ شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ لہٰذا وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اگر یہ شخص مر جائے تو ہمارے گھر پھر سے آباد ہو سکتے ہیں۔ پھر وہ آپ کے لئے موت کی بددعا بھی کرتے تھے۔ اس آیت میں انہی لوگوں کو مخاطب کر کے بتایا جا رہا ہے کہ موت ہر ایک کو آنے والی ہے۔ پہلے بھی سب لوگ گزر چکے اور اس نبی کو بھی اپنے وقت پر موت آنے والی ہے۔ مگر تم بتاؤ کہ تم موت سے بچ سکتے ہو۔ وہ تو تمہیں بھی آ کے رہے گی اور کیا معلوم کہ تم سے اکثر اس سے پہلے ہی مر جائیں۔

[۳۳] فتنہ کا مفہوم:۔ فتنہ سے مراد ایسی آزمائش ہے جس کا انسان کو پتہ بھی نہ چلے اور وہ اندر ہی اندر اپنا کام کئے جا رہی ہو۔ جیسے مال اور اولاد اور دوسری مرغوبات کی محبت انسان کے لئے فتنہ ثابت ہوتی ہے۔ اس آیت میں خیر سے مراد مال و دولت کی فراوانی اور خوشحالی کا زمانہ ہے اور شر سے مراد تنگ دستی اور بدحالی کا دور۔ اور اللہ تعالیٰ ہر حال میں ہی انسان کی آزمائش کرتا رہتا ہے۔ ایک مومن تو خوشحالی کے اوقات میں اللہ کا شکر ادا کر کے اور تنگ دستی کے دور میں مصائب پر صبر کر کے اس آزمائش میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے دنیوی اور اخروی انعامات کا مستحق بن جاتا ہے۔ لیکن ایک دنیادار پر جب مال و دولت کی فراوانی اور خوشحالی کا دور آتا ہے تو اس کا دماغ ہی درست نہیں رہتا اور اس میں فرعونیت اور تکبر آ جاتا ہے اور دوسروں کو حقیر سمجھنے لگتا ہے اور اگر برے دن آ جائیں تو صبر کرنے کے بجائے کفر و شرک کی راہوں پر جا پڑتا ہے اور در در پر اپنی ناک رگڑنے لگتا ہے۔ اس طرح وہ دنیا و آخرت میں اللہ کے غضب کا مستحق بن جاتا ہے۔

[۳۴] مشرکوں کا اپنے معبودوں کو آپ سے برتر سمجھنا اور آپ کا مذاق اڑانا:۔ مشرکین مکہ کے نزدیک ان کے اپنے معبودوں کی شان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں بہت ارفع و اعلیٰ تھی۔ لہٰذا وہ آپ کو دیکھ کر ازراہِ مذاق و استہزاء یوں کہتے کہ دیکھو یہ شخص ہے جو تمہارے معبودوں کی باتیں کرتا ہے (یعنی ان کے مقابلہ میں اس کی اوقات ہی کیا ہے؟) حالانکہ آپ

تَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۳۷﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۳۹﴾ بَلْ

اپنی نشانیاں دکھادوں گا لہٰذا جلدی کا مطالبہ [۳۵] نہ کرو۔(۳۷) نیز وہ (مسلمانوں سے) کہتے ہیں: اگر تم سچے ہو تو وعدہ (عذاب) کب پورا ہوگا۔(۳۸) کاش یہ کافر لوگ اس وقت کا علم رکھتے جب وہ آگ سے نہ تو اپنے چہروں [۳۶] کو بچا سکیں گے اور نہ اپنی پشتوں کو اور نہ ہی انہیں کہیں سے مدد مل سکے گی۔(۳۹) بلکہ وہ عذاب

ان کے معبودوں کو نہ گالی دیتے تھے اور نہ برا بھلا کہتے تھے۔ اور کہتے تھے تو صرف یہ کہتے تھے کہ تمہارے یہ معبود تمہارا نہ کچھ بگاڑ سکتے ہیں اور نہ سنوار سکتے ہیں۔ اور اسے ہی وہ اپنے لئے سب سے بڑی گالی سمجھتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے نزدیک آپ کے اس نظریہ سے ان کے معبودوں کی، ان کی اپنی اور ان کے آباؤ واجداد کی سب کی توہین ہو جاتی تھی۔ اب وہ سنجیدگی سے معاملہ کو سمجھنے کی کوشش تو کرتے نہیں تھے۔ مگر ضد اور تعصب میں آکر آپ کا مذاق اڑانے لگتے تھے۔ اور اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ جب اس ہستی کا ذکر ہوتا جو فی الواقع ہر ایک کے نفع و نقصان کی مالک ہے تو انہیں یہ تکلیف شروع ہو جاتی کہ اللہ اکیلے کا کیوں ذکر کرتا ہے اور ہمارے معبودوں کو کیوں ساتھ شامل نہیں کرتا، حالانکہ اللہ کو وہ خود بھی اپنے معبودوں سے بڑا معبود سمجھتے تھے اور جب موت سامنے کھڑی نظر آتی تو اسے ہی پکارتے تھے۔ لہٰذا اللہ اکیلے کو پکارنے میں بھی تکلیف ہوتی تھی۔ اور رحمٰن کے لفظ سے تو انہیں ویسے بھی چڑ تھی جیسا کہ پہلے سورہ رعد کی آیت نمبر ۳۰ کے حاشیہ نمبر ۳۹ میں گزر چکا ہے۔

[۳۵] ۞ انسان کی جلد بازی کی آرزو اور اس کا جواب:۔ یعنی جلد بازی انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ وہ چاہتا یہ ہے کہ جو خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی ہے وہ جلد از جلد وقوع پذیر ہو جائے۔ خواہ یہ خواہش اچھی ہو یا بری۔ اس آیت میں چونکہ انسان کی فطرت کا ذکر ہوا ہے۔ لہٰذا اس آیت کے مخاطب مسلمان بھی ہو سکتے ہیں اور کافر بھی۔ بات یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلام کے سلسلہ میں قرآن میں مذکور وعید سنائی کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرو گے، ان کا مذاق اڑاؤ گے یا یہ راستہ روکو گے تو تم پر اللہ کا عذاب آئے گا۔ جیسا کہ سابقہ اقوام پر آچکا ہے۔ اب کافر یہ سوچتے تھے کہ اس دعوت کا علی الاعلان انکار بھی کر رہے ہیں اور صرف انکار ہی نہیں ان مسلمانوں پر سختیاں بھی کر رہے ہیں۔ اور اتنی مدت گزر چکی ہے ہمارا تو بال بھی بیکا نہیں ہوا۔ لہٰذا اب وہ بے باک ہو کر کہنے لگے کہ یہ روز روز کی تکرار چھوڑو اور جس عذاب کی دھمکی دے رہے ہو وہ لے کیوں نہیں آتے؟ اور ممکن ہے کہ بعض مسلمانوں کو بھی یہ خیال آتا ہو کہ ان ظالموں پر اگر فوراً عذاب آجائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ ہر کام کا میرے ہاں ایک اندازہ مقرر ہے اور وقت معین ہے۔ لہٰذا اپنے وقت پر تمہیں ایسی سب نشانیاں دکھا دی جائیں گی اور ان نشانیوں کے وقوع پذیر ہونے کی داغ بیل آپ کے واقعہ ہجرت سے ہی پڑ گئی تھی۔

[۳۶] یعنی ان کے اس مطالبہ کی وجہ صرف یہ ہے کہ جس آگ کے عذاب سے انہیں ڈرایا جاتا ہے اس پر ان کا یقین ہی نہیں۔ اگر ان پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے اور وہ اس ہولناک گھڑی کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیں تو کبھی ایسی درخواست نہ کریں۔ پھر جب وہ وقت سامنے آجائے گا اور انہیں آگے سے پیچھے سے، دائیں سے بائیں سے، اوپر سے، نیچے سے غرض ہر طرف سے

تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۴۰﴾ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ

بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۱﴾ قُلْ مَنْ ع ۳

يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ۭ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۲﴾ اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ

تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ۭ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ﴿۴۳﴾ بَلْ مَتَّعْنَا

هٰٓؤُلَاۗءِ وَاٰبَاۗءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۭ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ

یکدم ان پر آپہنچے گا جو ان کے اوسان خطا کر دے گا پھر نہ تو یہ اسے دفع کر سکیں گے اور نہ ہی انہیں کچھ مہلت ملے گی۔(۴۰) (اے نبی) آپ سے پہلے رسولوں کا بھی مذاق اڑایا جا چکا ہے۔ مگر ان کا مذاق اڑانے والے اسی چیز میں خود گھر گئے جس کا[۳۷] وہ مذاق اڑاتے تھے۔(۴۱) آپ ان سے پوچھئے: کون ہے جو رات اور دن میں رحمٰن (کے عذاب) سے تمہاری حفاظت[۳۸] کرتا ہے؟ بلکہ یہ لوگ تو اپنے پروردگار کے ذکر تک سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔(۴۲) کیا ان کے کچھ ایسے الٰہ ہیں جو ہمارے مقابلہ میں ان کو بچا سکیں؟ وہ تو خود اپنی بھی مدد نہیں کر سکتے اور نہ انہیں ہماری تائید حاصل ہے۔(۴۳) بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ہم نے انہیں اور ان کے آباء واجداد کو طویل مدت[۳۹] تک سامانِ زیست سے فائدہ پہنچایا۔ کیا یہ دیکھتے نہیں کہ ہم زمین کو اس کی مختلف سمتوں سے

آگ گھیرے ہوئے ہوگی تو اس سے بچاؤ کی انہیں کوئی صورت نظر نہ آئے گی۔ اور آج جو کچھ یہ باتیں بنا رہے ہیں اس دن ایسے حواس باختہ ہوں گے کہ ان میں سے کوئی بات بھی انہیں یاد نہ رہے گی۔

[۳۷] اللہ کے جس عذاب کی وعید کا مذاق اڑاتے تھے۔ اسی عذاب میں پھنس گئے۔ ان کا مذاق خود انہی پر الٹ پڑا اور اس کے وبال میں ایسے گرفتار ہوئے کہ اب دوسرے لوگ ان کا مذاق اڑانے لگے۔

[۳۸] ان کافروں کی کرتوتیں تو اس لائق ہیں کہ انہیں کسی وقت بھی رات کو یا دن کو اللہ کا عذاب آلے۔ یہ تو اللہ کی رحمت واسعہ اور اس کی خاص مہربانی ہے کہ لوگوں کی خطاؤں پر فوری گرفت نہیں کرتا۔ اور اگر اس کا عذاب آجائے تو ان کے پاس وہ کون سا ذریعہ ہے جس سے وہ اللہ کے عذاب سے بچ سکیں گے؟ یا وہ کون سی ہستی ہے جو اللہ کے علاوہ انہیں عذاب سے بچا سکتی ہے۔ دراصل یہ اللہ کے قانون تدریج و امہال کا، جو لوگوں کے لئے سراسر رحمت ہے، مذاق اڑا رہے ہیں۔ حالانکہ انہیں چاہئے یہ تھا کہ ایسے مالک کے احسان مند ہوتے جو ان کی خطاؤں کے باوجود مہلت دیئے جاتا ہے۔ لیکن ان کی یہ حالت ہے کہ اس کا ذکر تک سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔

[۳۹] ۞ خوشحالی انسان کو اللہ سے غافل کر دیتی ہے:۔ یعنی ان قریش مکہ کی حالت یہ ہے کہ ایک طویل مدت سے ان پر سختی کا کوئی دور نہیں آیا۔ کعبہ کی تولیت کی بنا پر ان کی عرب بھر میں عزت ہے۔ ان کے تجارتی قافلوں پر کوئی بھی قبیلہ ڈاکہ ڈالنے کی جرأت نہیں کرتا۔ بلکہ جس قافلے کو یہ لوگ پروانۂ راہداری دے دیں۔ وہ بھی لوٹ مار سے محفوظ و مامون ہو جاتا ہے۔

أَطْرَافِهَا ۚ أَفَهُمُ الْغَالِبُونَ ﴿٤٤﴾ قُلْ إِنَّمَا أُنذِرُكُم بِالْوَحْيِ ۚ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَاءَ إِذَا مَا
يُنذَرُونَ ﴿٤٥﴾ وَلَئِن مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُولُنَّ يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿٤٦﴾
وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ۖ وَإِن كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ

گھٹاتے چلے آرہے ہیں۔ پھر کیا یہی غالب [۴۰] رہیں گے۔(۴۴) آپ ان سے کہئے کہ: میں تو وحی کے ذریعہ ہی تمہیں ڈراتا ہوں۔ مگر جنہیں ڈرایا جائے وہ ہی بہرے [۴۱] ہوں تو وہ پکار کو نہیں سن سکتے۔(۴۵) اور اگر انہیں تیرے پروردگار کے عذاب کی ایک لپٹ بھی چھو جائے تو فوراً بول اٹھیں۔ افسوس! یقیناً ہم ہی ظالم تھے۔(۴۶) اور ہم روز قیامت انصاف [۴۲] کے ترازو رکھیں گے اور کسی کی کچھ بھی حق تلفی نہ ہوگی اور اگر کسی کا رائی کے

سردی اور گرمی کے تجارتی سفروں کی بنا پر بہت دولت کما رہے ہیں اور آسودہ حال ہیں۔ اسی آسودہ حالی نے انہیں اللہ اور اس کی یاد سے غافل بنا دیا ہے۔ اب ان کے دماغ اس وقت تک درست نہیں ہو سکتے جب تک یہ اللہ کے عذاب کا مزا نہ چکھ لیں۔

[۴۰] زمین کو گھٹانے کا مطلب:۔ یہ لوگ بچشم خود دیکھ رہے ہیں کہ اسلام کو روکنے کی ان کی ساری تدبیروں اور کوششوں کے باوجود اسلام دن بدن بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے اور جوں جوں اسلام پھیل رہا ہے ان پر از خود عرصۂ حیات تنگ ہوتا جا رہا ہے اور ان کی پریشانیوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ جس علاقہ میں اسلام آگیا وہاں سے کفر رخصت ہوا اور کفر کی سرزمین گھٹ گئی۔ اور یہ سلسلہ بدستور جاری رہے گا کفر کا علاقہ یا سرزمین گھٹتی، سمٹتی اور سکڑتی جائے گی اور اسلام کی سرزمین بڑھتی جائے گی۔ جس کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود کیا اب بھی وہ اس وہم میں مبتلا ہیں کہ وہ اسلام کو دبا لینے میں کامیاب ہو جائیں گے اور بالآخر انہیں کا بول بالا رہے گا؟

[۴۱] اصل بات ہے کہ یہ ابھی تک اندھے اور بہرے بنے ہوئے ہیں۔ نہ وقت کی آواز کو سنتے ہیں اور نہ ہی وقت کی رفتار دیکھنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں اور اگر انہیں اللہ کا پیغام سنایا جائے اور اخروی انجام سے ڈرایا جائے تو سننے کی زحمت تک گوارا نہیں کرتے۔ یہ لوگ دراصل لاتوں کے بھوت ہیں۔ جب تک انہوں نے اللہ کے عذاب کا مزا نہ چکھا، اپنی خواب غفلت سے کبھی بیدار نہ ہوں گے۔ اس وقت وہ اپنی خطاؤں اور کوتاہیوں کا اعتراف تو کرنے لگیں گے۔ مگر اس وقت ان کے اعتراف کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

[۴۲] اعمال کا وزن کیسے ہوگا' میزان الاعمال کی حقیقت:۔ اس آیت میں مَوَازِيْنَ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو میزان بمعنی ترازو کی جمع ہے۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہر شخص کے لئے الگ الگ ترازو رکھا جائے اور دوسرا یہ کہ مختلف اعمال کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف ترازو ہوں۔ یہ حقیقت تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اعمال کی حقیقت کا صحیح صحیح اندازہ کرنے کے لئے کس قسم کا ترازو استعمال ہوگا۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص پورے خشوع و خضوع کے ساتھ وقت پر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے۔ دوسرا بھی جماعت میں شامل ہوتا ہے مگر گرانبار طبیعت کے ساتھ اور اللہ کی یاد کی بجائے دوسرے ہی خیالات میں مستغرق رہتا ہے اور اس کی نماز ایسے ہوتی ہے جیسے کوئی خودکار آلہ ہو جس کا سوئچ دبا دیا گیا ہو۔ اب ظاہر ہے کہ اجر کے لحاظ سے ان دونوں کی نمازوں میں نمایاں فرق ہے اگرچہ ظاہری شکل و صورت ایک ہی جیسی ہے۔ پھر یہ باطنی معاملات ایسے ہیں جن کا صحیح علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا کہ فلاں شخص کے فلاں عمل میں حقیقت کتنی ہے اور وزن تو اعمال کے

مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ
وَضِيَاۗءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ

دانہ برابر بھی عمل ہو گا تو وہ بھی سامنے لائیں گے اور حساب کرنے کو ہم کافی ہیں۔(۴۷) اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ اور ہارون کو جو کتاب (تورات) دی تھی وہ (حق و باطل میں) فرق کرنے والی تھی اور ایسے پرہیز گاروں کے لئے روشنی اور نصیحت [۴۳] تھی۔(۴۸) جو اپنے پروردگار سے بن دیکھے ڈرتے ہیں اور وہ روز

حقائق کا ہو گا جیسے ایک دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ٰالْحَقُّ﴾ (۸:۷)

❁ حدیثِ بطاقہ:۔ اور اس بات کی تائید اس حدیث سے بھی ہو جاتی ہے جو حدیث بطاقہ کے نام سے مشہور ہے۔ یعنی قیامت کے دن ایک شخص کو پکارا جائے گا جس کے ننانوے گناہوں کے دفتر ہوں گے اور اس سے پوچھا جائے گا کہ دیکھو کہ ان دفتروں کے مندرجات درست ہیں اور میرے کراماکاتبین نے تجھ پر کچھ زیادتی تو نہیں کی؟ وہ کہے گا اے پروردگار! یہ سب کچھ درست ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ پوچھے گا کیا تمہاری کچھ نیکیاں بھی ہیں؟ وہ کہے گا، کوئی نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تمہاری نیکیاں بھی ہیں اور آج کے دن کسی پر ظلم نہیں ہو گا۔ پھر اس کے لئے ایک پرچی نکالی جائے گا جس پر اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ درج ہو گا۔ وہ کہے گا اے پروردگار ان ننانوے گناہ کے دفتر کے مقابلہ میں اس پرچی کی کیا حقیقت ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: آج تجھ پر کچھ زیادتی نہیں ہو گی۔ چنانچہ میزان الاعمال کے ایک پلڑے میں گناہوں کے ننانوے دفتر رکھے جائیں گے اور دوسرے میں یہ پرچی تو گناہوں کا پلڑا اوپر اٹھ جائے گا اور پرچی والا نیکیوں کا پلڑا بھاری نکلے گا۔ (ابن ماجہ، ابواب الزھد، باب مایرجی من رحمۃ اللہ یوم القیامۃ) اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اعمال کے حقائق کو تولنے میں ہر ایک کے ساتھ پورا پورا عدل وانصاف ہو گا۔ پھر اس کے مطابق ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہئے لفظ عدل یا قسط کی ضد ظلم ہے اور ظلم اللہ تعالیٰ کی شان کے منافی ہے۔ لہٰذا نہ تو یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کے چھوٹے سے چھوٹے عمل کا بھی بدلہ نہ دے اور نہ یہ ممکن ہے کہ عمل کے لحاظ سے اجر کم عطا فرمائے۔ اور یہ دونوں ظلم کی صورتیں ہیں۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کے عمل کا اجر عدل سے بڑھ کر عطا فرمائے اور اس صفت کا نام احسان ہے۔ جو عدل سے بھی برتر صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس معاملہ میں جو چاہے کر سکتا ہے۔ وہ کسی کو عمل سے زیادہ اجر دے۔ کسی کی خطائیں معاف ہی کر دے۔ اور اگر حقوق العباد کا معاملہ ہو تو بندوں کو اپنی طرف سے ان کے حق عطا کر کے مجرم کو معاف کر دے۔ یہ تو سب کچھ ممکن ہے لیکن اللہ سے ظلم ممکن نہیں۔

اور تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہمیں حساب لینا آتا ہے۔ ہم اعمال کے حقائق کی تعیین کو بھی خوب جانتے ہیں اور کسی کے رائی بھر عمل کو بھی اور اس سلسلہ میں ہمیں کسی مددگار کی بھی ضرورت نہیں اور ﴿كَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ﴾ کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہمارا لیا ہوا حساب آخری اور فیصلہ کن ہو گا۔ جس کی نہ کوئی پڑتال کرنے کا حق رکھتا ہے اور نہ ہی کہیں اس کے خلاف اپیل ہو سکے گی۔ کوئی دوسرا اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں کسی کی کچھ بھی مدد نہ کر سکے گا۔

[۴۳] ❁ تورات کی صفات:۔ یعنی یہ ہدایت اور انذار کا سلسلہ قریش مکہ سے ہی مختص نہیں، پہلی قوموں کی طرف بھی ہم

مُشْفِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ۭ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ
اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ ع ۴

قیامت[۴۴] سے ڈرتے رہتے ہیں۔(۴۹) اور یہ (قرآن) بھی ایسی ہی بابرکت نصیحت[۴۵] ہے جسے ہم نے اتارا ہے۔ پھر کیا تم اس سے انکار کرتے ہو؟(۵۰) اور اس سے بھی پہلے[۴۶] ہم نے ابراہیم کو ہوشمندی بخشی تھی اور ہم اس (کے حال) سے خوب واقف تھے۔(۵۱) جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ: یہ مورتیاں

رسول اور اپنی کتابیں نازل کرتے رہے ہیں۔ انہی کتابوں میں سے سر فہرست تورات ہے جو ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی تھی۔ یہ حق و باطل میں امتیاز کرنے والی کتاب تھی۔ ان کے آپس میں اختلافات کی حقیقت واضح کر کے صحیح راہ کی نشاندہی کرتی تھی۔ اور اس کی روشنی میں سیدھا راستہ صاف صاف نظر آنے لگتا تھا۔ نیز وہ اولاد آدم کو بھولا ہوا سبق یاد دلانے والی نصیحت تھی۔ اور اس میں پند و نصیحت کے وافر اسباق موجود تھے۔

[۴۴] اگرچہ یہ کتاب سب لوگوں کے لئے نازل کی گئی تھی۔ مگر اس سے فائدہ اور نصیحت تو صرف ان لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو اللہ پر بن دیکھے ایمان لاتے ہیں اور اس کی ہدایت کے طالب ہوتے ہیں اور آخرت کے دن اللہ کے حضور پیش ہونے اور اپنے اعمال کی باز پرس سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اور انہیں ہر وقت یہی فکر دامنگیر رہتی ہے اور باز پرس کی فکر انہیں اس دنیا میں انتہائی محتاط زندگی گزارنے پر آمادہ کرتی رہتی ہے۔

[۴۵] ۞ قرآن کی صفات بمقابلہ تورات:۔ اور یہ قرآن جسے ہم نے اے قریشیو! تمہاری طرف نازل کیا ہے یہ تورات سے بھی زیادہ بابرکت ہے۔ جس میں سابقہ تمام آسمانی کتب کی خوبیاں بھی موجود ہیں اور ان سب کا خلاصہ بھی اس میں آگیا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں انسان کی ہدایت سے متعلق ہر چیز کو پوری تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے۔ گویا یہ قرآن فرقان بھی ہے، ضیاء اور نور بھی ہے، ذکر اور تذکرہ بھی ہے اور قیامت تک کے لوگوں کے لئے رحمت اور باعث رحمت بھی ہے۔ پھر بھی اگر تم ایسی بابرکت کتاب کا انکار کرتے ہو تو تمہاری بدبختی میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

[۴۶] ۞ رُشد کا مفہوم:۔ رُشد سے مراد ایسی ہوش مندی ہے۔ جس سے انسان اپنے فائدہ و نقصان، نیک و بد اور خیر و شر میں امتیاز کرنے اور فائدہ کی بات کو قبول کرنے اور نقصان کی بات کو رد کرنے کے قابل ہو جائے۔ خواہ یہ نفع و نقصان دنیوی ہو یا اخروی ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام سے بہت مدت پہلے ہم نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو ہوش مندی اور عقل سلیم عطا کی تھی۔ وہ زمانے کے رسم و رواج کے پیروکار نہیں تھے۔ بلکہ ہر بات کے نفع و نقصان کو خود سوچنے کے عادی تھے۔ اور ہم ان کے حالات سے خوب واقف تھے اور جانتے تھے کہ وہ فی الواقع رسالت الٰہی کے مستحق ہیں۔ لہٰذا ہم نے انہیں نبوت عطا فرمائی۔ اگرچہ یہ ہوش مندی بھی ہم نے ہی انہیں عطا کی تھی۔

[۴۷] یہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ہوش مندی کا تقاضا تھا کہ جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں کو بے جان اور

الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَاۗءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ
اَنْتُمْ وَاٰبَاۗؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴿۵۵﴾
قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ڮ وَاَنَا عَلٰي ذٰلِكُمْ

کیا ہیں جن کے آگے تم بندگی کے لئے[۴۷] بیٹھے رہتے ہو؟(۵۲) وہ کہنے لگے: ''ہم نے اپنے آباء و اجداد[۴۸] کو ان کی عبادت کرتے ہی پایا ہے'' (۵۳) (سیدنا) ابراہیم نے کہا: پھر تو تم بھی اور تمہارے آباء واجداد بھی کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو'' (۵۴) وہ کہنے لگے: ''کیا تو ہمارے پاس کوئی سچی بات[۴۹] لایا ہے یا ویسے ہی دل لگی کر رہا ہے'' (۵۵) اس نے جواب دیا: ''(دل لگی نہیں) بلکہ (سچی بات یہی ہے کہ) تمہارا پروردگار وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے جس نے انہیں پیدا کیا[۵۰] اور میں اس

ساکت و صامت بتوں کے سامنے سجدہ ریز دیکھا تو فوراً دل میں سوچنے لگے کہ ان بے جان پتھروں کے سامنے، جو نہ حرکت کر سکتے ہیں، نہ سنتے ہیں، نہ بولتے ہیں۔ سجدہ کرنے کا فائدہ کیا ہے؟ ایسی چیزوں کو سجدہ کرنا تو سراسر انسانیت کی توہین اور تذلیل ہے۔ قوم کی اس انسانیت سوز حرکت پر وہ مدتوں دل ہی دل میں کڑھتے اور نفرت کرتے رہے۔ بالآخر انہوں نے اپنی طبیعت کے تقاضا سے مجبور ہو کر اپنے باپ اور اپنی قوم سے یہ سوال کر ہی دیا کہ مجھے بھی تو کچھ بتاؤ کہ جن بے جان مورتیوں کے سامنے تم بیٹھ کر ان کی عبادت میں مشغول رہتے ہو اس کا فائدہ کیا ہے؟

[۴۸] تقلیدِ آباء کی مذمت:۔ اب اگر بتوں کے سامنے عبادت کرنے کا کوئی عملی فائدہ ہوتا یا ان کے پاس کوئی معقول جواب ہوتا تو قوم کے لوگ یقیناً سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو بتا کر انہیں مطمئن کر دیتے۔ لیکن انہیں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال کا اس بات کے سوا کوئی جواب میسر نہ آیا کہ چونکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو بھی ایسا ہی کرتے پایا ہے، لہٰذا ہم بھی ان کی اتباع میں یہی کچھ کر رہے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے سوال کا معقول جواب نہیں تھا کیونکہ اس پر پھر بھی سوال پیدا ہوتا تھا کہ تمہارے باپ دادوں کو ان کی پرستش سے کیا فائدہ ہوا تھا؟ جواب تم اس فائدہ کی توقع میں ان کی عبادت کر رہے ہو۔ اور اس مقام پر سوال کی اہمیت یہ ہے کہ قریش مکہ بھی بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ اور جب ان سے یہی سوال کیا جاتا تو ان کا جواب بھی بعینہ یہی کچھ ہوتا تھا۔ مزید برآں وہ اپنے آپ کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پیروکار بھی کہتے تھے۔ گویا یہ سوال ''گفتہ آید در حدیث دیگراں'' کے مصداق قریش مکہ سے بھی تھا۔

[۴۹] گویا قوم ابراہیم کو اپنے اس بت پرستی کے مذہب کی حقانیت پر اتنا پختہ یقین تھا کہ یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتی تھی کہ کوئی شخص اس مذہب کی مخالفت بھی کر سکتا ہے۔ لہٰذا وہ سیدنا ابراہیم سے پوچھنے لگے کہ تم نے جو ہم پر بتوں کی پرستش کی بنا پر صریح گمراہی کا فتویٰ لگایا ہے یہ بات صدق دل اور سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہے ہو یا ویسے ہی کچھ دل لگی کرنے کا خیال آگیا تھا؟

[۵۰] سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ یہ دل لگی کی بات نہیں بلکہ میں فی الواقع یہی کچھ سمجھتا ہوں کہ یہ پتھر کے بت جو

مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝﴿۵۶﴾ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝﴿۵۷﴾ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ۝﴿۵۸﴾ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ

بات پر گواہی دیتا ہوں۔(۵۶) اور اللہ کی قسم! میں تمہارے چلے جانے کے بعد تمہارے بتوں سے ضرور دو دو ہاتھ [۵۱] کروں گا۔(۵۷) چنانچہ بڑے بت کو چھوڑ کر باقی سب بتوں کو ابراہیم نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تاکہ وہ اس (بڑے بت) [۵۲] کی طرف رجوع کریں۔(۵۸) وہ کہنے لگے: "ہمارے معبودوں کا یہ حال کس نے کر دیا؟ بلاشبہ وہ

اپنے بھی نفع و نقصان کے مالک نہیں وہ تمہارے نفع و نقصان کے مالک کیسے بن سکتے ہیں۔ اور میں تو اپنے نفع و نقصان کا مالک صرف اپنے اس پروردگار کو سمجھتا ہوں جس نے ہم سب کو بھی اور زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے اور ان پر پورے اختیار کے ساتھ حکمرانی کر رہا ہے اور میں یہ بات محض وہم و گمان کی بنا پر نہیں بلکہ پورے وثوق کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔

[۵۱] سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے دل میں سوچا کہ یہ لوگ باتوں سے تو اپنی گمراہی کو سمجھتے نہیں۔ اب انہیں کسی عملی تجربہ سے سمجھائے بغیر چارہ نہیں۔ لہٰذا اللہ کی قسم کھالی۔ کہ جب یہ لوگ اپنے بتوں کے پاس سے غیر حاضر ہوئے تو پھر میں ان کے مشکل کشاؤں کی خبر لوں گا۔ اب اتفاق کی بات کہ ان کے جشن نوروز یعنی قومی میلہ کا دن قریب آگیا تو یہ سب لوگ اس میلہ پر چلے گئے۔ اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو ایسا موقع میسر آگیا جس کا انہیں انتظار تھا۔

[۵۲] ❁ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا بتوں کو توڑنا:۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی قوم سیارہ پرست تھی۔ اور انسانی زندگی پر سیاروں کے اثرات کے انتہائی معتقد تھے۔ انہیں سیاروں مثلاً سورج، چاند، زہرہ، عطارد، مشتری، مریخ اور زحل وغیرہ کی ارواح کی ایک مخصوص شکل انہوں نے متعین کر رکھی تھی۔ اور اسی شکل کے مجسمے بنائے جاتے تھے جن کی یہ لوگ پوجا کرتے تھے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ہوش مندی کی ابتدا میں پہلا تجربہ اپنی ذات پر کیا تھا اور دیکھا تھا کہ یہ سیارے یہ چاند اور یہ سورج کیا میری زندگی پر کچھ اثر انداز ہوتے ہیں یا نہیں۔ اور تجربہ سے انہیں یہی ثابت ہوا تھا کہ ایسی باتیں سب انسانی توہمات ہیں۔ اسی بنا پر قلبی یقین کے ساتھ وہ اپنی قوم سے مجادلہ اور مقابلہ پر اتر آئے تھے۔ ان لوگوں کا جشن نوروز اس دن ہوتا تھا جب سورج برج حمل میں داخل ہوتا تھا اور آج کل کے حساب سے یہ دن یکم اپریل کا دن بنتا ہے اور یہی موسم بہار ہوتا ہے اور معتدل موسم ہوتا ہے۔ جشن نوروز پر جب سب لوگ جانے لگے تو پہلے اپنے بتوں کے سامنے نذر و نیاز کی مٹھائیاں رکھیں۔ پھر بت خانہ کو جانے لگے تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو بھی اس میلہ میں شمولیت کی دعوت دی تو آپ علیہ السلام نے آسمان کی طرف نگاہ دوڑائی جیسے سیاروں کی چال دیکھ رہے ہوں اور کہہ دیا کہ میں تو بیمار ہوں لہٰذا مجھے ساتھ لے جا کر اپنے رنگ میں بھنگ نہ ڈالو۔ اور مجھے یہیں رہنے دو۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے سیاروں کی طرف نگاہ اس لئے نہیں کی تھی کہ آپ ان کے اثرات پر یقین رکھتے تھے بلکہ اس لئے دوڑائی تھی کہ آپ کی ستارہ پرست قوم آپ کے اس عذر کو معقول سمجھ لے۔

جب یہ سب لوگ میلہ پر چلے گئے تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے لئے یہی سنہری موقعہ تھا۔ آپ نے ایک تبر یا کلہاڑا لیا بت خانہ کا دروازہ کھولا اور انکے بتوں کو مار مار کر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ البتہ بڑے بت کو چھوڑ دیا۔ اور کلہاڑا اس کے کندھے پر

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۹﴾ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى
اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۲﴾ قَالَ
بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۳﴾ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا

بڑا ظالم ہے۔(۵۹) (بعض) لوگ کہنے لگے : ہم نے ایک نوجوان کو ان بتوں کا ذکر کرتے سنا تھا جس کا نام ابراہیم [۵۳] ہے۔(۶۰) وہ کہنے لگے : پھر اسے لوگوں کے سامنے لاؤ [۵۴] تاکہ وہ دیکھ لیں (کہ ہم اس سے کیا کرتے ہیں)(۶۱) (جب ابراہیم آگئے تو) انہوں نے پوچھا: ابراہیم! ہمارے معبودوں سے یہ کارستانی تم نے کی ہے؟(۶۲) ابراہیم نے جواب دیا: نہیں بلکہ ان کے بڑے (بت) نے ہی یہ کچھ کیا ہوگا۔ لہٰذا انہیں (ٹوٹے ہوئے بتوں) سے ہی پوچھ لو۔ اگر بولتے [۵۵] ہوں؟ (۶۳) پھر انہوں نے اپنے دل میں سوچا تو (دل میں) کہنے لگے:

رکھ دیا تاکہ یہ معلوم ہو کہ یہ سب کارستانی اس بڑے بت کی ہے۔

آیت کے الفاظ ہیں ﴿ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴾ (تاکہ وہ لوگ اس کی طرف رجوع کریں) الیہ کی ضمیر اس بڑے بت کی طرف بھی ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بت کے کندھے پر کلہاڑا رکھنے سے بھی ان کا اپنا یہی مقصود تھا نیز یہ لوگ سخت مشکل کے وقت بڑے بت ہی کی طرف رجوع کرتے تھے اور الیہ کی ضمیر خود سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی طرف بھی ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ مابعد کی دو آیات سے معلوم ہوتا ہے۔

[۵۳] جب ان لوگوں نے میلہ سے واپس آکر اپنے مشکل کشاؤں کی یہ خستہ حالی دیکھی تو انہیں بہت دکھ ہوا۔ انہیں یہ خیال تک نہ آیا کہ بڑے بت کے کندھے پر جو کلہاڑا ہے تو شاید اسی بڑے خدا نے چھوٹے خداؤں کو تہس نہس کر دیا ہو۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بت تو اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتے، توڑ پھوڑ کا کام کیسے کر سکتے ہیں؟ اور یہی کچھ سیدنا ابراہیم علیہ السلام انہیں سمجھانا چاہتے تھے۔ انہیں خیال آیا تو صرف یہ کہ جس کسی نے یہ کام کیا ہے وہ بڑا ظالم ہے۔ اب ان مشکل کشاؤں کی ناراضگی سے ہم پر قہر نازل ہو کے رہے گا اور اس قہر سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم اس ظالم کا سراغ لگائیں اور اسے قرار واقعی سزا دیں۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام چونکہ کئی لوگوں کے سامنے یہ اظہار خیال کر چکے تھے کہ "یہ بے جان پتھر کی مورتیاں نہ تمہارا کچھ بگاڑ سکتی ہیں اور نہ سنوار سکتی ہیں لہٰذا ان کی عبادت کرنا صریح گمراہی اور انسانیت کی توہین ہے" لہٰذا بعض لوگوں کو فوراً یہ خیال آگیا کہ یہ کارستانی ابراہیم کی ہی ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی شخص ہماری نظر میں ایسا نہیں جو ہمارے ان معبودوں کے حق میں اس قدر گستاخ واقع ہوا ہو۔

[۵۴] پھر جب اس "ظالم" کی نشان دہی ہو چکی تو کچھ لوگ کہنے لگے کہ اس کو جو کچھ سزا دینا چاہتے ہو وہ سب لوگوں کے سامنے علی الاعلان دی جانی چاہئے۔ تاکہ لوگوں کے دل اپنے معبودوں کی طرف سے ٹھنڈے ہوں اور سزا بھی ایسی عبرت ناک ہونی چاہئے کہ آئندہ کسی کو ان مشکل کشاؤں کی شان میں گستاخی کرنے کی جرأت نہ ہو۔

[۵۵] چنانچہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو سب لوگوں کے سامنے بر سر میدان لایا گیا اور ان سے پہلا سوال جو ہوا تو وہ اعتراف جرم

إِنَّكُمْ أَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٦٤﴾ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٥﴾
قَالَ أَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ﴿٦٦﴾ أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا
تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٧﴾ قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ

ظالم تو تم خود ہو۔(۶۴) پھر لاجواب ہو کر شرم کے مارے سر نگوں ہو گئے۔ اور کہنے لگے یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ یہ (بت) بولتے نہیں۔(۶۵) (اس پر ابراہیم نے) کہا: پھر کیا تم ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہو[۵۶] جو نہ تمہیں کچھ فائدہ دے سکیں اور نہ نقصان پہنچا سکیں۔(۶۶) تف ہے تم پر اور ان پر بھی جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو۔ کیا تم ذرا بھی نہیں سوچتے؟ (۶۷) وہ بولے: "اگر تمہیں کچھ کرنا ہے تو ابراہیم کو جلا ڈالو[۵۷] اور (اس طرح) اپنے

سے متعلق تھا۔ کیونکہ جب تک مجرم کا جرم ہی ثابت نہ ہو سزا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سیدنا ابراہیم سے پوچھا گیا کہ: آیا ہمارے مشکل کشاؤں کو تم ہی نے توڑا پھوڑا ہے؟ اس سوال کا جواب سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے یہ دیا کہ قرینہ کی شہادت تو یہ ہے کہ یہ سب کارستانی بڑے بت کی ہے۔ جس نے کلہاڑا اپنے کندھے پر اٹھا رکھا ہے۔ ممکن ہے بڑے خدا کو تمہارے جانے کے بعد چھوٹے خداؤں پر غصہ آگیا ہو اور اس نے انہیں تہس نہس کر دیا ہو۔ اور اس سوال کا اصل حل یہ ہے کہ ان مظلوم اور ٹوٹے پھوٹے مشکل کشاؤں سے ہی پوچھ لو کہ ان پر کس نے یہ ظلم روا رکھا ہے اور یقین جانو کہ اگر وہ بولتے ہیں تو یقیناً تم کو اس سوال کا جواب دے دیں گے۔

[۵۶] مشکل کشاؤں کی بے بسی:۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے اس جواب پر مجمع میں جمع شدہ سب لوگوں کو اپنے مشکل کشاؤں کی بے بسی کا ٹھیک طور پر احساس ہو گیا اور لوگوں کے پاس ماسوائے شرمندگی اور خاموشی کے اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ لگے اپنے گریبانوں میں جھانکنے کہ اب اس بات کا کیا جواب دیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام دراصل یہی کچھ چاہتے تھے اور یہ جو کچھ ہوا یہ سیدنا ابراہیمؑ کی توقعات اور منشاء کے عین مطابق تھا۔ تبلیغ اور رد شرک کا جو سنہری موقعہ اس وقت ہاتھ آیا تھا شاید اس سے پہلے کبھی نہ آیا ہو۔ چنانچہ اس وقت آپ نے اس بھرے مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ تو تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ تمہارے مشکل کشا اپنا بھی دفاع نہیں کر سکتے تو پھر وہ تمہاری کیا مشکلیں دور کر سکتے ہیں یا تمہیں کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور افسوس تو تم لوگوں پر ہے جو یہ باتیں جانتے ہوئے بھی ایسے مشکل کشاؤں کی عبادت کیے جا رہے ہو جو اپنے ظالم سے بھی بدلہ لینے کی طاقت نہیں رکھتے۔

[۵۷] سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکنا:۔ عقلی میدان میں جب قوم سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے سامنے نادم اور لاجواب ہو گئی تو اب "ڈنڈے کے استعمال" کی باتیں ہونے لگیں۔ اور جہلاء کا ہمیشہ سے یہی دستور رہا ہے کہ جب دلیل و حجت کے میدان میں پٹ جائیں تو ضد بازی پر اتر آتے ہیں اور اپنی اکثریت کے بل بوتے پر قوت کے استعمال پر اتر آتے ہیں۔ اب صورت حال یہ تھی کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا باپ آزر خود بت تراش، بت فروش اور عراق کے بادشاہ نمرود کا درباری مہنت تھا۔ اب اگر وہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی بات مانتا تو اس کا روزگار' اس کی آمدنی کے ذرائع اور دربار میں اس کا مرتبہ و مقام سب کچھ ختم ہو تا تھا۔ لہٰذا قوم کے لوگوں سے بڑھ کر آزر ہی سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے دین کا دشمن بن گیا تھا۔ اب ان

فَعِلِيْنَ ﴿٦٨﴾ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿٦٩﴾ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ

معبودوں کی امداد کرو" (۶۸) ہم نے آگ کو حکم دیا: "اے آگ! تو ابراہیم پر ٹھنڈی[۵۸] اور سلامتی والی بن جا" (۶۹) وہ تو چاہتے

لوگوں نے متفقہ طور پر یہ طے کیا کہ جیسے بھی ہو سکے اپنے مشکل کشاؤں کی عزت اور وقار کو بچاؤ اور اس کا بہتر حل یہ ہے کہ ابراہیم کو بھڑکتی آگ میں جلا کر اسے صفحہ ہستی سے ختم کر دو۔ چنانچہ اس غرض کے لئے سرکاری سطح پر ایک بہت بڑا الاؤ تیار کیا گیا اور ایک فلاخن کے ذریعہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اس کے اندر پھینک دیا گیا۔

[۵۸] مفسرین کہتے ہیں کہ جب سیدنا ابراہیمؑ کو الاؤ میں ڈالا جانے لگا تو جبرئیل علیہ السلام حاضر ہوئے اور کہا کہ "کہو تو آپ کی مدد کروں؟" سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کہا: مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں۔ مجھے میرا اللہ کافی ہے" پھر جبرئیل علیہ السلام نے کہا: "اچھا اپنے اللہ سے دعا ہی کرو" سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: "میرا اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور مجھے یہی کافی ہے" اب اللہ تعالیٰ نے اپنے اس مخلص بندے کی یوں مدد فرمائی کہ آگ کو حکم دے دیا کہ ابراہیم علیہ السلام کے لئے ٹھنڈی ہو جا مگر اتنی ٹھنڈی بھی نہیں کہ ٹھنڈک کی وجہ سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو تکلیف پہنچے بلکہ صرف اس حد تک ٹھنڈی ہو کہ سیدنا ابراہیم آگ کے درمیان صحیح وسالم رہ سکیں۔ یہ آگ جو کئی دنوں میں تپائی گئی تھی اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو بھی کئی دن اس آگ میں رکھا گیا مگر آپ کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ جو رسیاں آپ کی مشکیں باندھنے کے لئے استعمال کی گئی وہ تو جل گئیں مگر آپ کے جسم کو کچھ گزند نہ پہنچا۔ مفسرین کہتے ہیں کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام بعد میں فرمایا کرتے تھے کہ وہ دن کیا آرام و راحت کے دن تھے جب میں آگ میں رہا تھا۔

❁ معجزہ کا انکار دراصل قدرتِ الٰہی کا انکار ہے:۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ یہ واقعہ خرق عادت یا عام معمول (Routine) کے خلاف ہے جس میں حاوی سبب اور مسبب کے درمیانی رشتہ کو منقطع کر دیا گیا ہے۔ آگ کا خاصہ ہر چیز کو جلا دینا اور بھسم کر دینا ہے اور یہ خاصہ آگ سے اللہ تعالیٰ نے سلب کر لیا تھا۔ اب جن لوگوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے لئے بھی کوئی خرقِ عادت کام کرنا یا معجزہ رونما کرنا یا سبب اور مسبب کے درمیانی تعلق کو منقطع کر دینا ممکن نہیں ہے۔ اور اسی بنا پر وہ ایسے واقعات کی دور از کار تاویلیں کرنے لگتے ہیں تا آنکہ انہیں طبعی امور کے تابع بنا کے چھوڑیں تو ہم ان سے یہ پوچھتے ہیں کہ آخر وہ اللہ تعالیٰ کو ماننے کی بھی زحمت کیوں گوارا کرتے ہیں۔ طبعی امور پر تو نیچری، دہریے اور وجود باری تعالیٰ کے منکر سب ہی یقین رکھتے ہیں۔ اور اگر وہ ایسا کام اس لئے کرتے ہیں کہ جدید زمانے کا عقل پرست طبقہ بھی ایسے تاویل کردہ واقعہ کو ماننے پر آمادہ ہو جائے تو یہ اور بھی بری بات ہے قرآن اس لئے نازل نہیں ہوا تھا کہ ہر زمانہ کے نظریات کے مطابق ڈھال لیا جایا کرے۔ قرآن نے اللہ تعالیٰ کا جو تعارف کرایا ہے وہ یہ ہے کہ طبعی قوانین کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے ان میں استثناء کا بھی اور بوقت ضرورت وہ اپنے ان بنائے ہوئے قوانین میں تبدیلی بھی کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ لہٰذا اللہ اور قرآن پر ایمان لانے والوں پر قطعاً یہ فرض نہیں کیا گیا کہ وہ ہر دور کے لوگوں سے قرآن کے مضامین کو منوا کے چھوڑیں۔ خواہ اس کام کے لئے انہیں کیسی غیر معقول اور دور از کار تاویلیں کرنی پڑیں۔ سر سید احمد خان نے اس واقعہ کے متعلق لکھا کہ یہ کفار کا فقط ابراہیم علیہ السلام کو جلانے یا مارنے کا ارادہ تھا لیکن اس پر عمل نہیں ہوا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اتنی ہی بات تھی تو اللہ تعالیٰ کو یہ فرمانے کی

کیا ضرورت تھی۔ ﴿قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ﴾ اب اس سے آگے چلئے حافظ عنایت اللہ اثری صاحب چونکہ حدیث کو بھی مانتے ہیں اور بخاری کی مرفوع حدیث حِيْنَ اُلْقِيَ فِي النَّارِ کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ مگر پھر بھی ان کی طبیعت اس واقعہ کو ماننے پر آمادہ نہیں ہوتی اور سخت گرانبار نظر آتی ہے۔ چنانچہ وہ خود ہی ایک سوال اٹھا کر اس کا جواب دیتے ہیں۔ جسے ہم ناظرین کی دلچسپی کے لئے یہاں درج کر رہے ہیں:

سوال: کیا ابراہیم علیہ السلام کو سچ مچ آگ میں ڈالا گیا تھا یا وہ صرف کفار کے فتنہ و فساد کی آگ تھی۔ جسے اللہ پاک نے ٹھنڈا کر دیا۔ قرآن میں اگرچہ ارادہ القاء آیا ہے مگر بخاری میں مرفوعاً حِيْنَ اُلْقِيَ فِي النَّارِ آیا ہے؟" (بیان المختار ص ۱۱۵)

جواب: ہو سکتا ہے وہ فتنہ و فساد کی آگ ہو جسے اللہ پاک نے ٹھنڈا کر دیا ہو جیسا کہ وہ فرماتا ہے ﴿كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ﴾ (۵: ۶۴) یہ لوگ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف فتنہ و فساد کی آگ بھڑکاتے اور سلگاتے رہتے ہیں۔ جسے ہم ہی بجھاتے اور ٹھنڈا کرتے رہتے ہیں" (حوالہ ایضاً)

اس آیت اور اس کے ترجمہ میں اثری صاحب نے مندرجہ ذیل مغالطے دیئے ہیں:

(۱) اس آیت میں اوقدوا کا استعمال کنایتاً اور محاورتاً ہے ورنہ لڑائی کی آگ حقیقتاً ایسی نہیں ہوتی جس میں لکڑی وغیرہ جل جائیں یا وہ دوسری چیزوں کو جلا کر راکھ بنا ڈالے۔

(۲) قرآن کریم نے حرّقوہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے یعنی ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال کر جلا دو۔

(۳) اطفأ کے معنی بجھانا تو ٹھیک ہے مگر ٹھنڈا کرنا نہیں ہے۔ آپ نے اس کا اضافہ کر کے اشتباہ پیدا کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔

(۴) قرآن کریم کے الفاظ ﴿بَرْدًا وَّسَلٰمًا﴾ (یعنی ٹھنڈی بھی ہو جا اور سلامتی والی بھی) اس میں بجھنے کا ذکر تک نہیں۔ کہ سرے سے آگ ہی بجھ جائے اور ابراہیم علیہ السلام جلنے سے بچ جائیں۔ اور یہی وہ الفاظ ہیں جو ان حضرات کے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر ابراہیم علیہ السلام آگ میں ڈالے ہی نہیں گئے تھے تو پھر اللہ کا یہ حکم کیا معنی رکھتا ہے؟

اب اثری صاحب کے جواب کا دوسرا حصہ سنیے جو حدیث سے متعلق ہے۔ فرماتے ہیں "اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سچ مچ انہوں نے آگ میں جلا دینے کا ارادہ کر لیا اور القی فی النار الحدیث سے بھی پیدا شدہ خطرناک حالات سے مصادقت مراد ہے کہ کام بالکل تیار تھا۔ مگر اللہ پاک نے آپ کو بال بال بچا لیا" (حوالہ ایضاً)

۞ **معجزہ کی اثری تاویل اور اس کا جواب:۔** کچھ سمجھے آپ کہ مصادقت سے کیا مراد ہے؟ یعنی ابراہیم علیہ السلام آگ سے بچے اور ہٹے رہے اور آگ ابراہیم علیہ السلام سے بچی اور ہٹی رہی یعنی آگ میں پڑنے کے باوجود دونوں نے ایک دوسرے کو چھوا نہیں" اب سوال یہ ہے کہ یہ تو پھر معجزہ کی صورت بن گئی۔ کہ آگ کے الاؤ میں پڑنے کے باوجود نہ آگ نے آپ کو چھوا اور نہ آپ نے آگ کو چھوا اور یہی کچھ ہم کہتے ہیں۔ آپ کی مثال تو "آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا" والی بن گئی کہ ایک معجزہ کی تاویل کرتے کرتے ایک دوسرے معجزہ میں جا پھنسے۔ البتہ اثری صاحب کے خیال میں یہ ناممکن ہے کہ ابراہیم علیہ السلام آگ میں پڑے اور آگ اپنا جلانے کا کام نہ کرے اور یہی بات اللہ کی قدرت سے بھی انکار ہے اور قرآن و حدیث کو تسلیم کرنے سے بھی۔

الْاَخْسَرِيْنَ ۝۷۰ وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ۝۷۱ وَوَهَبْنَا
لَهٗٓ اِسْحٰقَ ۭ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۝۷۲ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ
بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاۗءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝۷۳
وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰۗىِٕثَ ۭ اِنَّهُمْ
كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ۝۷۴ وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ۭ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۷۵ وَنُوْحًا اِذْ ع ۵

تھے کہ ابراہیم[۵۹] کو دکھ پہنچائیں مگر ہم نے انہیں ہی نقصان میں ڈال دیا۔(۷۰) اور ہم ابراہیم اور لوط کو ان سے بچا کر اس سر زمین (شام) کی طرف لے گئے جس میں ہم نے اہل عالم[۶۰] کے لئے برکتیں رکھی ہیں۔(۷۱) پھر ہم نے ابراہیم کو اسحاق عطا کیا اور یعقوب اس پر مزید۔ ان میں سے ہر ایک کو ہم نے صالح بنایا تھا۔(۷۲) نیز ہم نے انہیں پیشوا بنا دیا جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے اور ہم نے ان کی طرف نیک اعمال کرنے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وحی کی اور وہ سب[۶۱] ہمارے عبادت گزار تھے۔(۷۳) اور لوط کو ہم نے حکمت اور علم عطا کیا اور اس بستی سے نجات دی جس کے رہنے والے گندے کام کرتے تھے۔ بلاشبہ وہ بہت برے اور نافرمان لوگ تھے۔(۷۴) اور لوط کو ہم نے اپنی رحمت میں[۶۲] داخل کر لیا۔ کیونکہ وہ بڑے صالح بندے تھے۔(۷۵) اور نوح کو

حدیث کو تسلیم کرنے سے بھی۔

[۵۹] یعنی مشرک تو اپنے معبودوں کی گستاخی کا اس صورت میں بدلہ لینا چاہتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام کو اذیت ناک موت سے دوچار کر کے صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دیں۔ لیکن آپ کا آگ کے درمیان رہ کر کئی دنوں کے بعد زندہ سلامت نکل آنا ساری قوم کے لئے ایک نیا چیلنج بن گیا اور انہیں معلوم ہو گیا کہ ابراہیم کو نقصان پہنچانا ان کے بس سے باہر ہے۔ اور یہ بات ان کے لئے اور بھی زیادہ دل شکنی کا باعث بن گئی۔

[۶۰] سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ سیدنا لوط علیہ السلام کی ہجرت:۔ یہ واقعہ دیکھ کر بھی سیدنا لوط علیہ السلام کے سوا کوئی شخص بھی سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر ایمان نہ لایا۔ سیدنا لوط علیہ السلام سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بھائی حاران کے بیٹے یعنی سیدنا ابراہیم کے بھتیجے تھے۔ جب قوم سے دشمنی ٹھن گئی تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو عراق سے شام کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ شام کا علاقہ بابرکت اس لئے ہے کہ دنیوی لحاظ سے یہ بہت زرخیز اور شاداب خطہ زمین ہے۔ اور روحانی لحاظ سے اس لئے کہ یہی خطہ دو ہزار سال تک انبیاء کا مسکن و مدفن رہا ہے۔

[۶۱] سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بڑھاپے کی عمر میں اولاد کے لئے دعا کی تو اللہ نے سیدنا اسحاق عطا فرمایا پھر سیدنا ابراہیم کے جیتے جی سیدنا اسحاق کے ہاں سیدنا یعقوب پیدا ہوئے اور تینوں نبی تھے اور یہ تو واضح ہے کہ نبی اپنے دور کا صالح ترین فرد ہوتا ہے اور ان سب انبیاء کی شریعتوں میں نماز اور زکوٰۃ ایسے ہی فرض تھی جیسے شریعت محمدیہ میں فرض کی گئی ہے البتہ جزئیات کا اختلاف ہوتا ہی رہا ہے۔

[۶۲] سیدنا لوط علیہ السلام اور آپ علیہ السلام کی بدکردار قوم کا قصہ پہلے سورہ اعراف آیت نمبر ۸۰ تا ۸۹، سورہ ہود آیت نمبر ۷۷ تا ۹۲ اور سورہ حجر آیت نمبر ۶۰ تا ۷۲ میں گزر چکا ہے۔ متعلقہ حواشی ملاحظہ فرما لئے جائیں۔

نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۷۷﴾ وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِى الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴿۷۸﴾

بھی (اپنی رحمت میں داخل کیا) جبکہ ان سب سے پہلے انہوں نے (ہمیں) پکارا تو ہم نے ان کی دعا قبول کی اور انہیں اور ان کے گھر والوں [۶۳] کو شدید بے چینی سے نجات دی (۷۶) اور ان لوگوں کے خلاف ان کی مدد کی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا۔ وہ لوگ بھی بہت برے تھے لہذا ہم نے ان سب [۶۴] کو غرق کر دیا۔ (۷۷)

اور داؤد اور سلیمان کو بھی (یہی نعمت دی تھی) جب وہ ایک کھیتی کے بارے میں فیصلہ کر رہے تھے جسے کچھ لوگوں کی بکریاں [۶۵] اجاڑ گئی تھیں اور جب وہ فیصلہ کر رہے تھے تو ہم انہیں دیکھ رہے تھے۔ (۷۸)

[۶۳] سیدنا نوح علیہ السلام کا قصہ بھی سورہ اعراف اور سورہ ہود میں گزر چکا ہے وہ حواشی بھی سامنے رکھے جائیں۔

[۶۴] دنیا میں پہلی مشرک قوم، قوم نوح تھی:۔ سیدنا نوح علیہ السلام کا مرکز تبلیغ عراق میں دریائے دجلہ و فرات کا درمیانی علاقہ تھا۔ آپ پہلے نبی ہیں جنہوں نے شرک کے خلاف جہاد کیا۔ آپ کی بعثت سے پہلے آپ کی قوم بت پرستی میں مبتلا ہو چکی تھی اور تاریخ انسانیت میں یہ پہلی قوم تھی جس نے بت پوجنا شروع کئے تھے۔ آپ کی قوم انتہائی ضدی اور ہٹ دھرم واقع ہوئی تھی۔ آپ نے ان کے خلاف ساڑھے نو سو سال جہاد کیا۔ مگر چند آدمیوں کے سوا کوئی آپ پر ایمان نہ لایا۔ بلکہ آپ کی اور آپ کے گنتی کے چند پیروکاروں کی زندگی اجیرن بنا رکھی تھی۔ آپ کے اتنے طویل عرصہ کے لئے صبر و برداشت کی داد دینا پڑتی ہے۔ ایک دفعہ آپؑ نے نہایت مغموم لہجہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی: ﴿فَدَعَا رَبَّهٗ اَنِّىْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ﴾ (۵۴:۱۰) یعنی اے میرے پروردگار میں ان لوگوں سے دب گیا ہوں سو اب تو ہی ان سے میرا بدلہ لے۔ اور ایک دفعہ ان کی ضد، ہٹ دھرمی سے نہایت مایوس ہو کر یہ دعا کی: پروردگار! زمین پر کافروں کا کوئی بھی گھرانہ باقی نہ رہنے دے۔ کیونکہ جو اولاد یہ جنیں گے وہ بھی فاجر اور کافر ہی ہوگی۔ جس سے ایمان لانے کی کوئی توقع نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا۔ اس وقت روئے زمین پر صرف یہی علاقہ انسانوں سے آباد تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا طوفان بھیجا جس میں تمام کافر ڈوب کر مر گئے اور سیدنا نوح علیہ السلام اور ان کے متبعین کو اللہ تعالیٰ نے کشتی پر سوار کر کے بچا لیا۔

[۶۵] نفش کا لغوی مفہوم:۔ اس آیت میں نفش کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا معنی رات کے وقت بکریوں کا بغیر چرواہے کے چرنے کے لئے منتشر ہونا ہے۔ (مفردات القرآن) ہوا یہ تھا کہ کچھ لوگوں کی بکریاں کسی کی کھیتی کو رات کے وقت چر کر اجاڑ گئی تھیں۔ کھیتی والے نے داؤد علیہ السلام کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا۔ آپ نے مدعا علیہ کو بلایا تو اس نے واقعہ کا اعتراف کر لیا۔ اب از روئے انصاف و قانون پورا ہرجانہ بکریوں کے مالک پر پڑتا تھا۔ اس سلسلہ میں شرعی قاعدہ یا قانون درج ذیل حدیث سے واضح ہوتا ہے۔

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی اونٹنی ایک باغ میں گھس گئی اور اسے خراب کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ دن کو

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۡ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ

اس وقت ہم نے سلیمان کو صحیح فیصلہ سمجھا دیا جبکہ ہم نے قوتِ فیصلہ اور علم[٦٦] دونوں کو عطا کیا تھا اور داؤد کے ساتھ ہم نے

باغوں کی نگہبانی باغ والوں کے ذمہ ہے۔ اور رات کو جو مویشی خراب کریں تو ان کے مالک ان کا ہرجانہ دیں۔ (مالک، ابوداؤد، ابن ماجہ بحوالہ مشکوۃ۔ کتاب البیوع، باب الغصب والعاریۃ فصل ثانی)

۞ اجڑی کھیتی کے متعلق سیدنا داؤد اور سلیمان کا فیصلہ:۔ اور یہی شرعی قاعدہ اس دور میں بھی تھا اب یہ اتفاق کی بات تھی کہ جتنا کھیتی کا نقصان ہوا تھا اس کی قیمت کے لگ بھگ بکریوں کی قیمت بنتی تھی۔ چنانچہ سیدنا داؤد علیہ السلام نے یہ فیصلہ کیا کہ بکریوں والا اپنی بکریاں کھیتی والے کو دے دے۔ تاکہ اس کے نقصان کی تلافی ہو جائے۔ سیدنا سلیمان بھی پاس موجود تھے انہوں نے اس فیصلہ سے اختلاف کیا اور کہا کہ میرے خیال میں یہ فیصلہ یوں ہونا چاہئے کہ بکریوں والا اپنی بکریاں کھیتی والے کو دے دے مگر یہ بکریاں کھیتی والے کے پاس بطور رہن ہوں گی۔ کھیتی والا ان کی پرورش بھی کرے اور ان سے دودھ اور اون وغیرہ کے فوائد بھی حاصل کرے۔ اور اس دوران بکریوں والا کھیتی کی نگہداشت کرے اور اس کی آبپاشی کرے تا آنکہ وہ کھیتی اپنی پہلی سی حالت پر آجائے اور جب کھیتی پہلی حالت پر آجائے تو بکریوں والے کو اس کی بکریاں واپس کر دی جائیں۔ اس فیصلہ سے کھیتی والے کے نقصان کی بھی تلافی ہو جاتی تھی اور بکریوں والے کا بھی کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا سلیمان علیہ السلام کے اس فیصلہ کو سیدنا داؤد نے بھی درست تسلیم کیا اور اپنے فیصلہ سے رجوع کر لیا۔ یہی وہ فیصلہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ فیصلہ سلیمان علیہ السلام کو ہم نے سمجھایا تھا۔

[٦٦] اب دیکھئے کہ سیدنا داؤد علیہ السلام اور سیدنا سلیمان علیہ السلام دونوں نبی ہیں۔ اور دونوں کو اللہ نے قوتِ فیصلہ بھی عطا کی تھی اور علم نبوت بھی۔ اس کے باوجود سیدنا داؤد سے فیصلہ میں اجتہادی غلطی ہو گئی۔ یعنی قاضی خواہ نہایت نیک نیتی سے فیصلہ کرے اس سے اجتہادی غلطی کا امکان ہے۔ اب اس سلسلہ میں درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیے:

حسن بصری کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام دونوں کو قوت فیصلہ اور علم دیا تھا۔ پھر اللہ نے سلیمان علیہ السلام کی تو تعریف کی اور داؤد پر ملامت نہیں کی (اگرچہ وہ فیصلہ درست نہ تھا) اور قرآن میں اللہ تعالیٰ ان دونوں پیغمبروں کا ذکر نہ کرتا تو میں سمجھتا ہوں کہ قاضی لوگ تباہ ہو جاتے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے سلیمان کی تو درست فیصلہ پر تعریف کی اور داؤد علیہ السلام کو (ان کی اجتہادی غلطی پر) معذور رکھا۔ (بخاری۔ کتاب الاحکام۔ باب متیٰ یستوجب الرجل القضاء)

(٢) ۞ اجتہاد اگر درست ہو تو مجتہد کیلئے دوہرا اجر ہے اور غلطی ہو جائے تو بھی ایک اجر ہے:۔ سیدنا عمرو بن عاص سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب حاکم اجتہاد کر کے کوئی فیصلہ کرے اور وہ فیصلہ درست ہو تو اس کو دو اجر ملیں گے اور اگر (بہ تقاضائے بشریت) فیصلہ میں غلطی کر جائے تو بھی اس کو ایک اجر ملے گا" (بخاری، کتاب الاعتصام۔ باب اجر الحاکم اذا اجتھد فاصاب او اخطا)

(٣) ۞ تین قسم کے قاضی اور علم کے بغیر فیصلہ کرنے والا جہنمی ہے:۔ سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

وَالطَّيْرَ ۚ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۷۹﴾ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ

پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر [۶۷] کر دیا کہ وہ ان کے ہمراہ تسبیح کیا کریں اور یہ تسخیر ہم ہی کرنے والے تھے۔ (۷۹)
اور ہم نے داؤد کو تمہارے (فائدہ کے) لئے زرہ بنانے کی صنعت سکھا دی تھی تاکہ تمہیں لڑائی کی زد سے

فرمایا: قاضی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک جنتی ہے اور دو جہنمی۔ جنتی وہ قاضی ہے جو حق کو پہچان جائے اور اس کے مطابق فیصلہ دے مگر جو شخص حق کو پہچاننے کے باوجود خلاف حق فیصلہ دے وہ جہنمی ہے۔ اسی طرح وہ بھی جہنمی ہے جو علم کے بغیر لوگوں کے فیصلے کرنے بیٹھ جائے۔ (ابوداؤد۔ کتاب القضاء۔ باب فی القاضی یخطی)

جو سیدنا داؤد علیہ السلام اور سیدنا سلیمان علیہ السلام کے متعلق ایک واقعہ احادیث میں بھی مذکور ہے جو بالکل اسی نوعیت کا ہے۔ جو درج ذیل ہے:

شیر خوار بچے کے متعلق دونوں کا فیصلہ:۔ سیدنا ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: (بنی اسرائیل میں) دو عورتیں تھیں ان کا ایک ایک بچہ تھا۔ بھیڑیا آیا اور ایک بچہ اٹھا لے گیا اب دونوں آپس میں جھگڑنے لگیں۔ ایک نے کہا کہ تیرا بچہ لے گیا اور دوسری نے کہا نہیں، تیرا بچہ لے گیا۔ آخر دونوں فیصلے کے لئے سیدنا داؤد علیہ السلام کے پاس آئیں۔ انہوں نے بچہ بڑی عمر والی کو دلا دیا۔ پھر یہ دونوں عورتیں دوبارہ فیصلہ کے لئے سیدنا سلیمان علیہ السلام کے پاس آئیں اور اپنا اپنا دعویٰ پیش کیا اس وقت سیدنا سلیمان علیہ السلام صرف گیارہ برس کے تھے۔ انہوں نے حکم دیا: ایک کلہاڑی لاؤ میں اس بچہ کو آدھا آدھا کر کے دونوں کو دے دیتا ہوں۔ یہ سن کر کم عمر والی عورت بولی "اللہ آپ پر رحم کرے ایسا نہ کیجئے۔ یہ بچہ اسی بڑی عمر والی کا ہے۔ پھر سیدنا سلیمان علیہ السلام نے بچہ چھوٹی عمر والی کو دلا دیا۔ (بخاری۔ کتاب الفرائض۔ اذا ادعت المراۃ ابنا)

قرینہ کی شہادت:۔ یعنی سیدنا داؤد علیہ السلام نے اس لحاظ سے بڑی عورت کے حق میں فیصلہ دے دیا کہ ایک تو وہ بڑی تھی اور دوسرے بچہ اس کے قبضہ میں تھا۔ لیکن جو فیصلہ سیدنا سلیمان علیہ السلام نے دیا وہ عین فطرت انسانی کے مطابق تھا۔ جب سیدنا سلیمان علیہ السلام نے بچے کو دو ٹکڑے کر کے ایک ایک ٹکڑا دونوں کو دینے کا فیصلہ کیا تو حقیقی ماں جو چھوٹی عورت تھی فوراً اپنے بچے کے دو ٹکڑے ہونے پر تلملا اٹھی۔ اور اس نے یہ سوچ کر کہ میرا بچہ زندہ رہے خواہ میرے پاس نہ رہے فوراً کہنے لگی کہ بچہ اس بڑی عورت کا ہے۔ اسے دے دیا جائے۔ لیکن بڑی عمر والی عورت خاموشی سے یہ فیصلہ سنتی رہی۔ اس کا بچہ ہوتا تو اسے کچھ تکلیف ہوتی یہ صورت حال دیکھ کر سیدنا سلیمان علیہ السلام نے چھوٹی عورت کے حق میں فیصلہ کر کے بچہ اسے دلا دیا۔ فیصلہ کے وقت ایسی باتیں سوجھ جانا سیدنا سلیمان علیہ السلام کے لئے خالصتاً اللہ تعالیٰ کی دین تھی۔

[۶۷] سیدنا داؤد علیہ السلام کی خوش الحانی:۔ سیدنا داؤد علیہ السلام کی خوش الحانی زبان زد عام و خاص بن چکی ہے اور لحن داؤدی کا لفظ محاورتاً استعمال ہوتا ہے۔ آپ کی آواز اس قدر سریلی اور خوشگوار تھی کہ جب آپ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے گیت گاتے تو ساری کائنات مسحور ہو جاتی اور وجد میں آنے لگتی تھی۔ پہاڑوں میں گونج پیدا ہوتی اور یوں معلوم ہوتا کہ پہاڑ بھی آپ کے ساتھ ساتھ حمد و ثنا کے گیت گا رہے ہیں۔ یہی حال طیور کا تھا جہاں آپ حمد و ثنا کے گیت گاتے وہاں پرندے اکٹھے ہو جاتے اور آپ کے ہمنوا بن جاتے تھے اور ان معنوں کی تائید اس حدیث سے بھی ہو جاتی ہے:۔

ابوموسیٰ اشعری کی خوش الحانی:۔ ایک دفعہ سیدنا ابوموسیٰ اشعری جو نہایت خوش الحان تھے، اپنی سریلی آواز میں قرآن کی

فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ

بچائے۔ پھر کیا تم شکر گزار[۶۸] بنتے ہو؟(۸۰) نیز ہم نے سلیمان کے لئے تند و تیز ہوا کو مسخر کر دیا تھا جو اس کے

تلاوت کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں سے گزر ہوا تو ان کی آواز سن کر ٹھہر گئے اور دیر تک آپ کی تلاوت سنتے رہے، جب انہوں نے تلاوت ختم کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: لقد اوتی مزماراً من مزامیر اٰل داود.......... یعنی اس شخص کو سیدنا داؤد کی خوش الحانی کا ایک حصہ ملا ہے۔ (بخاری۔ کتاب فضائل القرآن۔ باب حسن الصوت بالقراءة)

آپ کی خوش الحانی اور آپ کی تسبیحات میں پہاڑوں اور پرندوں کے ساتھ دینے کا ذکر سورہ سبا کی آیت نمبر ۱۰ اور سورہ ص کی آیت نمبر ۱۸ میں بھی آیا ہے۔ پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح کیسی تھی اور سیدنا داؤد کے وہ کس طرح ہمنوا بن جاتے تھے یہ پوری کیفیت اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

چونکہ پہاڑوں اور پرندوں کا سیدنا داؤد کے ساتھ مل کر تسبیحات کا پڑھنا اور ہم آہنگ ہونا ایک خرقِ عادت امر ہے لہٰذا پرویز صاحب کو ان باتوں کی تاویل کی ضرورت پڑ گئی اور اپنی تفسیر مفہوم القرآن میں یٰجِبَالُ (اے پہاڑو) کا مفہوم بیان فرمایا "اے سرکش سردارو"! گویا اللہ میاں کو سرکش سرداروں کے لئے جبال کے علاوہ کوئی لفظ نہیں ملتا تھا اور سورہ ص کی آیت نمبر ۱۹ میں یہی مضمون آیا تو بمصداق دروغ گورا حافظہ نباشد وہاں جبال کا مفہوم "پہاڑی قبائل" بیان فرما دیا۔ اور الطیر کا مفہوم قبیلہ طیر بیان فرمایا اور اوّبی کا مفہوم بیان فرمایا کہ "داؤد کے ساتھ تم بھی نہایت سرگرمی سے قانونِ خداوندی کی اطاعت کرو" (لغات القرآن ج ۱ ص ۲۸۳) حالانکہ پرویز صاحب خود اسی لغات میں اوّب کا معنی بالارادہ رجوع کرنا لکھ چکے ہیں۔ یعنی اے پہاڑو اور پرندو! داؤد کی طرف بالارادہ رجوع کرو اور اس مقام پر نہایت سرگرمی سے قانونِ خداوندی کی اطاعت کا مفہوم بیان فرمایا۔ ذرا سوچئے کہ اس مفہوم میں قانونِ خداوندی قرآن کے کس لفظ کا معنی یا مفہوم ہو سکتا ہے اور نہایت سرگرمی سے اطاعت کس لفظ کا؟ سچ فرمایا تھا اقبال نے:

احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآن کو بنا دیتے ہیں پاژند

[۶۸] ۞ سیدنا داؤد اور لوہے کی ڈھلائی اور زرہ سازی:۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زرہ سازی کے موجد سیدنا داؤد علیہ السلام ہیں۔ اس کی مزید تفصیل سورہ سبا میں یوں ہے: ﴿وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ﴾ (۳۴: ۱۰، ۱۱) یعنی ہم نے داؤد علیہ السلام کے لئے لوہے کو نرم بنا دیا تھا اور انہیں ہدایت کی تھی کہ پورے ماپ کی زرہیں بنائیں اور اس کی کڑیوں میں اندازے کے ساتھ جوڑ لگائیں۔ آپ کے لئے لوہے کو نرم کرنے کے دو معنی لئے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ کے ہاتھ میں لوہا موم کی طرح نرم ہو جاتا تھا اور آپ جس طرح چاہتے اس کی زنجیریں بنا کر زرہیں تیار کر لیتے تھے اور دوسری توجیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو لوہے کے پگھلانے کا اور ڈھلائی کا کام سکھا دیا تھا۔ آپ کا زمانہ اندازاً ۱۰۱۰ ق م سے ۹۴۵ ق م تک ہے۔ جبکہ یہی زمانہ لوہے کا زمانہ (Iron Age) کہلاتا ہے۔ اس سے بیشتر جو لوہے سے تلواریں اور نیزے یا دوسری اشیاء بنائی جاتی تھیں اس کا طریق کار یہی تھا کہ لوہے کو آگ میں تپایا جاتا اور جب وہ آگ کی طرح سرخ ہو جاتا تو اسے کوٹ کاٹ کر ایسی اشیاء تیار کر لی جاتی تھیں۔ لوہے کی ڈھلائی کے فن سے بھی اگرچہ چند ایک اقوام واقف ہو چکی تھیں تاہم یہ

بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ۝ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ

حکم سے اس سرزمین[۶۹] کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکت رکھی ہے اور ہم ہر چیز کو خوب[۷۰] جانتے ہیں۔(۸۱) شیطانوں کو بھی اس کے تابع بنا دیا تھا جو اس کے لئے (سمندر میں موتی، جواہرات نکالنے کے لئے)

سب کچھ صیغہ راز میں ہی رکھا جاتا تھا اور جنگی اغراض کے لئے لوہے کی زرہیں بنانے کا کام داؤد علیہ السلام نے ہی شروع کیا تھا۔ لڑائی کے دوران اپنی حفاظت کے لئے زرہ چونکہ ایک نہایت اہم ہتھیار ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ کیا تم اللہ کی اس نعمت کا شکر ادا کرتے ہو کہ اس نے سیدنا داؤد علیہ السلام کے ذریعہ بنی نوع انسانی کو زرہ سازی کا فن سکھا دیا۔ واضح رہے کہ سیدنا داؤد علیہ السلام بیت المال سے کچھ بھی نہیں لیتے تھے بلکہ اپنی ہاتھ کی کمائی پر ہی گزر اوقات کرتے تھے۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہوتا ہے:

سیدنا ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: داؤد علیہ السلام پر زبور کا پڑھنا اتنا آسان کر دیا گیا تھا کہ وہ جانور پر زین کسنے کا حکم دیتے اور ابھی زین پوری طرح کسی بھی نہیں جاتی تھی کہ آپ زبور پڑھ چکتے اور آپ کی گزر اوقات صرف اپنے ہاتھ کی کمائی پر تھی۔ (بخاری، کتاب الانبیاء باب قول الله تعالىٰ و آتينا داؤد زبورا)

[۶۹] سیدنا سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا کی تسخیر:۔ پہلے سیدنا داؤدؑ اور سیدنا سلیمان علیہ السلام کے فیصلے کا ذکر ہوا۔ بعد میں ان پر انعامات کا۔ سیدنا سلیمان علیہ السلام کو ایک معجزہ تو یہ عطا ہوا کہ تند و تیز ہوا ان کے لئے مسخر کر دی گئی تھی۔ وہ ہوا کو جس طرح کا حکم دیتے وہ آپ کی تابع فرمان رہتی اور اس طرح آپ ایک ماہ کا سفر صرف چند گھنٹوں یعنی ۳ سے ۶ گھنٹوں کے درمیان کر لیا کرتے تھے۔ قرآن کریم کی تصریحات سے یہی کچھ ثابت ہے اور اس کی ایک توجیہ، جو عام طور پر مشہور ہے، یہ کی گئی ہے کہ آپ نے ایک بہت بڑا تخت بنوایا تھا۔ جب آپ چاہتے اس پر خود بھی آپ کے اعیان سلطنت بھی بیٹھ جاتے اور بھی جسے چاہتے اس پر بٹھا لیتے، پھر ہوا کو حکم دیتے تو وہ اس تخت کو اٹھا لیتی اور جب یہ تخت زمین سے خاصا بلند ہو جاتا تو آپ اپنے مطلوب مقام پر شام کا سفر کیا کرتے تھے اور جہاں آپ کو اترنا ہوتا تو آپ ہوا کو حکم دیتے تو وہ نرمی سے چلنے لگتی اور جہاں آپ چاہتے وہاں اتر جاتے تھے۔ اس طرح جو کام آج کے ہوائی جہاز پٹرول کے ذریعہ کرتے ہیں۔ سیدنا سلیمان علیہ السلام یہی کام ہوا سے لیا کرتے تھے۔ اور اس کی رفتار بھی تقریباً وہی ہوتی تھی جو آج کل ہوائی جہازوں کی ہے۔ اس دور میں یہ ایک معجزہ تھا مگر آج کے دور میں ایک عادی اور معمول کی چیز بن چکا ہے اور اس سفر کی دوسری توجیہ یہ کی جاتی ہے کہ سیدنا داؤد کو تو اللہ تعالیٰ نے لوہے کی ڈھلائی کا کام سکھایا تھا۔ جبکہ سلیمان علیہ السلام کو لوہے کے علاوہ تانبے کی ڈھلائی کا فن بھی سکھا دیا تھا اور آپ کے دور میں یہ کام آپ کی نگرانی میں وسیع پیمانہ پر ہوتا تھا۔ جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر فرمایا ﴿ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ﴾ (۳۴:۱۲) (یعنی ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لئے پگھلے ہوئے تانبے کے چشمے بہا دیئے تھے) جس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ کے دور میں لوہے اور تانبے کی مصنوعات نے خاصی ترقی کی تھی اور آپ ان کی وسیع پیمانہ پر تجارت کیا کرتے تھے۔ آپ کے بحری بیڑے یمن سے شام اور شام سے یمن آتے جاتے تھے۔ اور چونکہ ہوا آپ کے تابع فرمان تھی لہذا یہ بیڑے برق رفتاری سے سفر کرتے اور ایک ماہ کا سفر چند گھنٹوں میں طے کر لیتے تھے۔

[۷۰] یعنی ہم یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ کون کس بات کا اہل ہے اور یہ بھی کس چیز مثلاً ہوا سے ہی کیا کیا کام لیا جا سکتا ہے۔

عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ۝ وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَ

غوطہ لگاتے[۷۱] اور اس کے علاوہ اور بھی کئی کام کرتے تھے اور ہم ہی ان سب کے محافظ[۷۲] تھے۔(۸۲) اور یہی نعمت ہم نے ایوب کو بھی دی تھی جب انہوں نے اپنے پروردگار کو پکارا: "مجھے بیماری لگ گئی[۷۳] ہے اور تو سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے" (۸۳) چنانچہ ہم نے ان کی دعا قبول کی اور جو بیماری انہیں لگی تھی اسے دور کر دیا۔

[۷۱] جن سے مراد دیہاتی لوگ۔ جنوں پر حکومت:۔ جو حضرات معجزات کی تاویل کرنے کے عادی ہیں اور جب تک وہ انہیں طبعی امور کے تابع نہ بنا لیں انہیں چین نہیں آتا۔ وہ اس آیت میں شیطانوں سے مراد دیہاتی طاقتور انسان لیتے ہیں۔ حالانکہ دیہاتی طاقتور لوگ بھی انسان ہی ہوتے ہیں ان کے دیہاتی یا طاقتور ہونے سے ان کی نوع نہیں بدل جاتی۔ دنیا میں جتنی بھی فلک بوس عمارتیں ہیں یا بھاری کام ہوتے ہیں۔ یہ سب کام دیہاتی طاقتور ہی سرانجام دیتے ہیں۔ یہ شہری نازنینوں کا کام نہیں ہوتا۔ اور دیہاتی طاقتور ہر بادشاہ بلکہ ہر سرمایہ دار کو آسانی سے میسر آ سکتے ہیں۔ پھر اس میں سیدنا سلیمان علیہ السلام کی کیا خصوصیت رہی جن کے خادمین میں اللہ نے بطور خاص جنوں کا نام لیا ہے۔

[۷۲] یعنی ہم نے ان شیطانوں کو سلیمان علیہ السلام کے تابع فرمان بنا رکھا تھا۔ وہ نہ ان کی حکم عدولی کر سکتے تھے اور نہ ان کے ہاں سے بھاگ سکتے تھے اور یہ سلیمان علیہ السلام کا کوئی ذاتی کمال نہ تھا بلکہ شیطان ان کے تابع فرمان رہنے پر اس لئے مجبور تھے کہ ہم خود ان کے محافظ تھے۔

[۷۳] سیدنا ایوب کس دور میں مبعوث ہوئے؟ یا کس علاقہ میں مبعوث ہوئے؟ آپ نے تبلیغ کا فریضہ کتنا عرصہ سرانجام دیا؟ اور آپ کے ساتھ آپ کی قوم نے کیا سلوک کیا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کی تفصیل کتاب و سنت میں مذکور نہیں۔ قیاس سے آپ کے دور نبوت کی جو تعیین کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ سیدنا یوسف علیہ السلام اور سیدنا شعیب علیہ السلام کے درمیانی زمانہ میں یعنی تقریباً ڈیڑھ ہزار قبل مسیح مبعوث ہوئے تھے۔

سیدنا ایوب کی بیماری اور صبر:۔ کتاب و سنت نے سیدنا ایوب کی جس خصوصیت سے ہمیں متعارف کرایا ہے وہ آپ کا صبر ہے۔ آپ کا ابتدائی زمانہ نہایت خوشحالی کا دور تھا۔ مال کی سب اقسام: اولاد، بیویاں، جائیداد غرضیکہ سب کچھ وافر مقدار میں عطا ہوا تھا اور آپ کثرتِ اموال و اراضی میں مشہور تھے۔ اس دور میں آپ ہمیشہ اللہ کا شکر بجا لاتے رہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو دوسری طرح آزمانا چاہا اور آپ پر ابتلاء کا دور جو آیا کہ ہر چیز ہاتھ سے نکل گئی۔ اور اپنا یہ حال تھا کہ کسی طویل بیماری میں مبتلا ہو گئے اور ایسے بیمار پڑے کہ ایک بیوی کے سوا سب نے ساتھ چھوڑ دیا۔ بلکہ لوگوں نے اپنی بستی سے باہر نکال دیا۔ اس ابتلاء کے طویل دور میں آپ نے صبر و استقامت کا ایسا بے مثال مظاہرہ کیا جو ضرب المثل بن چکا ہے۔ صحیح روایات کے مطابق آپ کے ابتلاء کا دور ۱۲ سال ہے۔ پھر جب اللہ سے اپنی بیماری کے لئے دعا کی تو اس دعا میں شکوہ و شکایت نام کو نہیں۔ بلکہ عرض مدعا نہیں، کسی چیز کا مطالبہ نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی انتہائی صابر، قانع اور خوددار آدمی اپنے مالک کو کوئی بات یاد

مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ
كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَذَا النُّوْنِ

اور انہیں ہم نے صرف اس کے اہل و عیال ہی نہ دیئے بلکہ ان کے ساتھ اتنے ہی[۷۴] اور بھی دیئے اور یہ ہماری طرف سے خاص رحمت تھی اور (اس میں بھی) عبادت گزاروں[۷۵] کے لئے ایک سبق تھا۔(۸۴)

اور اسمٰعیل، ادریس اور ذوالکفل[۷۶] کو بھی نعمت دی تھی اور یہ سب بڑے صابر تھے۔(۸۵) اور ان سب کو ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا۔ بلاشبہ یہ صالح بندے تھے۔(۸۶) اور مچھلی والے[۷۷] (یونس) کو بھی ہم

کرار ہا ہو۔ کہا تو صرف اتنا کہا کہ پروردگار! میں طویل مدت سے بیمار ہوں اور تو ارحم الراحمین ہے۔

[۷۴] ❁ چشمہ کا ظہور اور اس میں نہانے سے صحت کی بحالی:۔ جب سیدنا ایوبؑ اس صبر کے امتحان میں بھی پوری طرح کامیاب ہوگئے تو رحمت باری تعالیٰ جوش میں آگئی۔ آپ کی یہی بے مطالبہ دعا یوں مقبول ہوئی کہ اللہ نے اسی مقام پر ایک چشمہ رواں کر دیا۔ آپ کو صرف یہی حکم ہوا کہ اپنا پاؤں زمین پر مارو۔ پاؤں مارنے کی دیر تھی کہ چشمہ پھوٹ پڑا۔ جس کا پانی میٹھا، ٹھنڈا، شفا بخش اور جلدی امراض کو دور کرنے والا تھا۔ آپ اس میں غسل فرمایا کرتے اور اسی کا پانی پیتے رہے۔ آپ کی بیماری، جلد کی بیماری تھی جو اس طرح غسل کرنے اور پانی پیتے رہنے سے جلد ہی دور ہوگئی اور جتنا مال و دولت اور آل اولاد اللہ تعالیٰ نے آپ کو پہلے عطا فرمائی تھی۔ اس سے دگنی عطا فرمادی اور یہ اللہ کی رحمت اور آپ کے صبر کا پھل تھا۔

[۷۵] عبادت گزاری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسان خوشحالی کے دور میں اللہ کا شکر بجالاتا رہے اور تنگی اور تنگدستی کے دور میں صبر و استقامت سے کام لے۔ جیسا کہ سیدنا ایوب علیہ السلام نے نمونہ پیش کیا تھا اس جملہ میں سبق یہ ہے کہ جو شخص بھی اس طرح اللہ کا عبادت گزار بنتا ہے۔ ایوب علیہ السلام کی طرح اللہ تعالیٰ اسے بھی پہلے سے زیادہ انعامات سے نوازتا ہے۔

[۷۶] ❁ ذوالکفل کون تھے؟:۔ ذوالکفل کے حالات بھی کتاب و سنت میں کم ہی مذکور ہوئے ہیں۔ آپ کی نبوت میں اختلاف ہے۔ یعنی آپ نبی تھے یا نہیں۔ مگر چونکہ آپ کا ذکر انبیاء کے ہی درمیان آیا ہے اس لیے گمان غالب یہی ہے کہ آپ نبی تھے۔ آپ الیسع کے خلیفہ تھے۔ آپ کا لقب ذوالکفل (بمعنی صاحبِ نصیب) اور نام بشیر بن ایوب ہے۔ شام کا علاقہ ہی آپ کی دعوت کا مرکز ہے۔ عمالقہ شاہ وقت بنی اسرائیل کا سخت دشمن تھا۔ آپ نے اس سے بنی اسرائیل کو آزاد کرایا۔ پھر وہ بادشاہ بھی مسلمان ہوگیا اور حکومت آپ کے سپرد کی۔ جس کے نتیجہ میں شام کے علاقہ میں ایک دفعہ پھر خوب اسلام پھیلا۔

[۷۷] ❁ نون کا لغوی مفہوم:۔ سیدنا یونس کو قرآن میں اس مقام پر ذالنون کہا گیا ہے اور سورۃ القلم میں صاحب الحوت۔ حوت اسم جنس ہے جس کا اطلاق ہر قسم کی چھوٹی بڑی مچھلی پر ہو سکتا ہے۔ جبکہ نون سب سے بڑی (وہیل مچھلی) کو کہتے ہیں۔ (مفردات القرآن) اور آپ کا یہ لقب اس لئے ہوا کہ آپ ایک مدت مچھلی کے پیٹ میں رہے۔ زندہ و سلامت رہے اور اس دوران اللہ کی تسبیحات پڑھتے رہے۔

❁ سیدنا یونس مچھلی کے پیٹ میں اور آپ کی دعا:۔ آپ اہل نینوا کی طرف مبعوث ہوئے۔ آپ کا زمانہ بعثت نویں صدی ق م

اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ۭ وَكَذٰلِكَ نُـــْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾ وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّ

نے اپنی رحمت میں داخل کیا جب وہ غصہ سے بھرے ہوئے (بستی چھوڑ کر) چلے گئے انہیں یہ گمان تھا کہ ہم ان پر گرفت نہ کر سکیں گے، پھر انہوں نے اندھیروں میں پکارا کہ: "آپ کے سوا کوئی الٰہ نہیں آپ پاک ہیں میں ہی قصور وار تھا۔(۸۷) تب ہم نے ان کی دعا کو قبول کیا اور انہیں اس غم سے نجات دی اور ہم اسی طرح ایمان رکھنے والوں کو نجات [۷۸] دیا کرتے ہیں۔(۸۸) اور زکریا کو بھی، جب انہوں نے اپنے پروردگار کو پکارا: "اے میرے

ہے۔ حسبِ معمول قوم نے آپ کی دعوت کا انکار کیا۔ آپ نے قوم کے مسلسل انکار پر اللہ کے عذاب سے ڈرایا۔ اور جب قوم نے کہا کہ جس عذاب کی دھمکی دیتے ہو وہ لے کیوں نہیں آتے تو آپ نے ازخود ہی انہیں چالیس دن بعد عذاب آنے کی وعید سنا دی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے چالیس دن کا کوئی وعدہ نہیں فرمایا تھا۔ پھر جب یہ مدت گزرنے کو ہوئی اور عذاب کی کوئی علامت نہ دیکھی تو غم اور غصہ کی وجہ سے وہاں سے فرار کی راہ اختیار کی تاکہ قوم انہیں جھوٹا نہ کہے۔ کشتی میں سوار ہوئے تو وہ ہچکولے کھانے لگی۔ کشتی والوں نے قرعہ ڈالا اور اس قرعہ کے نتیجہ میں سیدنا یونس کو سمندر میں پھینک دیا۔ ایک بہت بڑی مچھلی پہلے ہی منہ کھولے ہوئے تھی۔ اس نے آپ کو نگل لیا۔ مچھلی کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ وہ آپ کو چبائے نہیں۔ اس طرح اس بڑی مچھلی کے پیٹ میں رہے۔ اس دوران آپ ہر وقت اللہ کی تسبیح اور اپنے گناہوں کے اعتراف میں مشغول رہے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس مشکل سے نجات دی۔ اور مچھلی نے آپ کو برلبِ ساحل اگل دیا۔ جب ذرا طاقت آئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دوبارہ اسی قوم یعنی اہلِ نینوا کی طرف بھیجا۔

اب دوسری طرف صورت حال یہ پیش آئی کہ جب سیدنا یونس مفرور ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے سیدنا یونس علیہ السلام کے قول کو پورا کر دیا اور وقت معینہ پر اہلِ نینوا کو عذاب کے آثار نظر آنے لگے تو وہ سب لوگ بچے، بوڑھے، جوان عورتیں مرد مل کر کھلے میدان میں نکل آئے اور اللہ کے حضور گڑگڑائے اور توبہ کی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ عذاب ٹال دیا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ میں یہ ایک ہی استثناء ہے کہ آیا ہوا عذاب ٹل گیا ہو۔ اب اس قوم کی طرف جب یونس علیہ السلام آئے تو وہ پہلے ہی نرم ہو چکی تھی۔ لہٰذا آپ کی تبلیغ کا خاطر خواہ فائدہ ہوا۔

[۷۸] یعنی اللہ تعالیٰ کو عاجزی سے پکارنے پر اللہ تعالیٰ کا سابقہ خطاؤں کو معاف کر کے مزید انعامات سے نوازنا سیدنا یونس علیہ السلام سے ہی مخصوص نہیں بلکہ جو بھی ایماندار لوگ ہمیں اس طرح پکاریں گے ہم انہیں مصائب سے نجات دیں گے۔ سیدنا یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں یہ دعا کرتے رہے ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ احادیث میں اس دعا کی بہت فضیلت آئی ہے اور امت نے شدائد و مصائب میں اس دعا کو بہت مجرب پایا ہے۔

أَنتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ ﴿٨٩﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَوَهَبْنَا لَهُ يَحْيَىٰ وَأَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا ۖ وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ ﴿٩٠﴾ وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴿٩١﴾

پروردگار! مجھے تنہا نہ چھوڑیں اور بہترین وارث [۷۹] تو آپ ہی ہیں" (۸۹) سو ان کی بھی ہم نے دعا قبول کی اور انہیں یحییٰ عطا کیا اور ان کی بیوی کو اولاد کے قابل بنا دیا یہ سب لوگ بھلائی کے کاموں کی طرف لپکتے تھے اور ہمیں شوق اور خوف سے [۸۰] پکارتے تھے اور یہ سب ہمارے آگے جھک جانیوالے تھے۔ (۹۰) اور اس عورت کو بھی، جنہوں نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی۔ پھر ہم نے اپنی روح سے ان کے اندر پھونکا [۸۱] اور انہیں اور ان کے بیٹے کو تمام اہل عالم کیلئے ایک نشانی بنادیا [۸۲]۔ (۹۱)

[۷۹] سیدنا زکریا علیہ السلام اور ان کا اولاد کے لئے اپنے پروردگار کو پکارنے کا ذکر پہلے سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۳۷ اور سورہ مریم کی ابتدا میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔ وہاں سے حواشی دیکھ لئے جائیں۔

[۸۰] جنت کی امید اور متصوفین:۔ بعض صوفی حضرات کہا کرتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت جنت کی توقع یا اس کے عذاب کے خوف سے کرتا ہے وہ اصلی محب نہیں ہے اور اپنے اس نظریہ کو اتنا پھیلایا کہ عوام الناس بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے:

؎ سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے — او بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

حالانکہ اللہ تعالیٰ انبیاء کی یہ صفت بیان فرما رہے ہیں کہ وہ ہمیں توقع اور خوف سے پکارا کرتے تھے۔ گویا اس آیت میں ایسے متصوفین کا مکمل رد موجود ہے۔ کیونکہ انبیاء سے بڑھ کر اللہ کا محب اور کون ہو سکتا ہے؟

[۸۱] سیدہ مریم اور سیدنا زکریا پر یہود کا الزام:۔ جب اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم کا پتلا بنا کر اسے سنوار لیا تو اس میں اپنی روح میں سے کچھ پھونکا جس سے انسان میں قوت ارادہ اختیار اور قوت تمیز و استنباط ودیعت کی گئی۔ پھر توالد و تناسل کے ذریعہ یہی اوصاف تمام اولاد آدم میں منتقل ہوئے اور یہ اوصاف ایسے ہیں جو کسی دوسری مخلوق میں نہیں پائے جاتے۔ بعد ازاں اللہ نے اپنی روح کو سیدہ مریم کے ہاں بھیجا۔ یہی روح سیدہ مریم کے سامنے متمثل ہو کر ایک تندرست انسان کی شکل بن گئی۔ اسی روح نے اپنے آپ کو سیدہ مریم علیہا السلام کے سامنے "تیرے پروردگار کا رسول" کہا اور اسی روح نے (جو مفسرین کے قول کے مطابق جبریلؑ تھے) سیدہ مریم سے کہا کہ میں اس لئے آیا ہوں کہ "تجھے ایک پاکیزہ لڑکا عطا کروں" چنانچہ اسی روح نے سیدہ مریم کے گریبان میں پھونک ماری جس سے سیدہ مریم کو حمل قرار پا گیا۔ (سورہ مریم) اسی واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر بھی اور سورہ تحریم کی آیت نمبر ۱۲ میں ان الفاظ سے تعبیر فرمایا کہ "ہم نے مریم میں اپنی روح سے پھونکا" اسی لئے آپ کو روح اللہ و کلمۃ اللہ کہا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی ہر مقام پر یہ وضاحت فرما دی کہ سیدہ مریم نے فی الواقع اپنی عصمت کی پوری پوری حفاظت کی تھی۔ ایسی وضاحتوں کے باوجود یہود نے سیدہ مریم پر تہمت زنا لگا دی اور اس کو سیدنا زکریا علیہ السلام سے منسوب کر دیا۔ صرف اس لیے کہ آپ علیہ السلام سیدہ مریم علیہا السلام کے کفیل تھے۔ یہ تو یہود کی کارستانی تھی اور نصاریٰ دوسری انتہا کر جا پہنچے اور انہوں نے سیدنا عیسیٰ کو اللہ یا اللہ کا بیٹا یا تین خداؤں میں کا تیسرا قرار دے دیا۔ گویا آپ کی اس معجزانہ پیدائش سے یہود و نصاریٰ غلو کا شکار ہو کر گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔

[۸۲] سیدنا عیسیٰ کی بن باپ کے پیدائش کے منکرین:۔ بدقسمتی سے مسلمانوں میں بھی کچھ لوگ ایسے پیدا ہو چکے ہیں جو

إِنَّ هَٰذِهِۦٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَٰحِدَةً وَأَنَا۠ رَبُّكُمْ فَٱعْبُدُونِ ﴿٩٢﴾ وَتَقَطَّعُوٓا۟ أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ

یہ (انبیاء کی جماعت) ہی تمہاری امت ہے جو ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا پروردگار ہوں لہٰذا میری ہی [۸۳] عبادت کرو۔ (۹۲) اور لوگوں نے اپنے (دین کے) معاملہ کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا [۸۴] مگر ہر

سیدنا عیسیٰ کی بن باپ پیدائش کے قائل نہیں۔ اور یہ وہی طبقہ ہے جو جدید زمانے کی عقل پرستی سے ذہنی طور پر ہر وقت مرعوب رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ مریم میں فرمایا "تاکہ ہم اس (عیسیٰ کی پیدائش) کو لوگوں کے لئے ایک نشانی بنادیں" (۱۹:۲۱) اور اس مقام پر فرمایا کہ "ہم نے سیدہ مریم اور اس کے بیٹے دونوں کو جہان والوں کے لئے نشانی بنادیا" نیز سورہ مومنون کی آیت نمبر ۵۰ میں فرمایا: "اور ہم نے ابن مریم (سیدنا عیسیٰ) کو اور ان کی ماں کو نشانی بنادیا" اب ان حضرات سے سوال یہ ہے کہ اگر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش معمول کے مطابق ماں اور باپ دونوں کے ملاپ سے ہوئی تھی تو سیدہ مریم اور عیسیٰ ابن مریم دونوں لوگوں کے لئے یا جہان والوں کے لئے ایک نشانی کیسے بن سکتے تھے؟

[۸۳] ۞ سب انبیاء کی مشترکہ تعلیم کیا تھی؟:۔ اس مقام پر امت کا لفظ دین کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ نیز اس آیت میں تمام بنی نوع انسان یکساں مخاطب ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انبیاء کے دین کے اصول ہمیشہ ایک ہی رہے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ ہر چیز کا پروردگار صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ لہٰذا وہی عبادت کا مستحق ہے۔ اور اسی کو توحید کہتے ہیں۔ پھر اسی توحید کا لازمی نتیجہ یہ بھی تھا کہ اس توحید کو ماننے والوں اور صرف اللہ کی عبادت کرنے والوں کو اچھا بدلہ دیا جائے اور اس کا خلاف کرنے والوں یعنی مشرکوں کو سخت سزا دی جائے۔ گویا روزِ آخرت اور جزا و سزا پر ایمان رکھنا بھی اسی عقیدہ توحید کے تسلیم کرنے کا تقاضا ہے۔ نماز اور زکوٰۃ اور روزہ وغیرہ عبادت ہی کی اہم شکلیں ہیں۔ اور اللہ کی عبادت توقع اور خوف کے ساتھ کرنا چاہئے۔ اولاد اور رزق وغیرہ اللہ ہی سے طلب کرنا چاہئے۔ اور مشکل کے وقت صرف اللہ ہی کو پکارنا چاہئے، اسی سے فریاد کرنا چاہئے۔ انبیاء خود بھی کوئی بااختیار ہستیاں نہیں ہوتیں بلکہ وہ بھی ہر معاملہ میں اللہ ہی کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ یہ اصول دین سب انبیاء میں مشترک رہے ہیں۔ رہیں جزئیات تو ان جزئیات میں اس دور کے تقاضا کے مطابق اختلاف بھی واقع ہوتا رہا ہے۔

[۸۴] ۞ بزرگوں کی شان میں غلو اور شرکیہ عقائد کی اشاعت سے فرقہ بازی:۔ یہ دین کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے والے عموماً مذہبی پیشوا قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ خواہ یہ علمائے کرام ہوں یا مشائخ عظام اور اس سے ان کا مقصد عموماً حصول مال و جاہ ہوتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیسیوں مقامات پر فرمایا کہ عالم الغیب اور حاضر و ناظر، حاجت روا اور مشکل کشا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اور یہی تمام انبیاء کا مشترکہ دین تھا۔ اب یہ حضرات یہ ثابت کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ انبیاء اور ہمارے بزرگان کرام سب ہی غیب کی خبریں جانتے ہیں اور اپنے اپنے مریدوں کے احوال پر حاضر و ناظر ہوتے ہیں۔ وہ بزرگ خواہ زندہ ہوں یا فوت ہو چکے ہوں۔ ان کو پکارا جائے یا ان سے فریاد کی جائے تو وہ بھی لوگوں کی فریادیں سنتے اور ان کی امداد کو پہنچ جاتے ہیں۔ ان باتوں پر وہ اپنا سارا زور صرف کرتے، ایسے واقعات اور قصے تراش کر انہیں عوام میں اتنا مشہور کر دیتے ہیں کہ وہ الٹا توحید پرستوں کی شامت لے آتے ہیں اور اس سے ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کی گدیاں بحال رہیں اور نذرانے وصول ہوتے رہیں۔ لوگ ان کے در دولت پر حاضری دیتے رہیں۔ اور یہ حضرات انہیں مشکل کشائی اور حاجت روائی کے سبز باغ

كُلٌّ إِلَيْنَا رَاجِعُونَ ﴿٩٣﴾ فَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهِ وَإِنَّا
لَهُ كَاتِبُونَ ﴿٩٤﴾ وَحَرَامٌ عَلَىٰ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿٩٥﴾ حَتَّىٰ إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ
وَمَأْجُوجُ وَهُم مِّن كُلِّ حَدَبٍ يَنسِلُونَ ﴿٩٦﴾ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ

ایک کو ہماری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے(۹۳) پھر جو شخص نیک عمل کرے اور وہ مومن ہو۔ تو اس کی کوشش کی ناقدری نہیں ہو گی اور ہم اس (کے ہر عمل) کو لکھتے جا رہے ہیں۔(۹۴) اور جس بستی کو ہم نے ہلاک کر دیا ہو اس کے لئے ممکن نہیں کہ وہ (ہمارے پاس)[۸۵] لوٹ کر نہ آئیں (بلکہ انہیں آنا پڑے گا)(۹۵) یہاں تک کہ یاجوج اور ماجوج[۸۶] کھول دیئے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے نیچے کو دوڑتے آئیں گے۔(۹۶)

اور سچا وعدہ (قیامت) نزدیک آجائے گا تو اس وقت کافروں کی آنکھیں یکایک پتھرا جائیں گی

دکھاتے رہیں اور قیامت کے دن شفاعت کر کے انہیں بخشوا دینے کا یقین دلاتے ہیں۔ کتاب و سنت کی رو سے یہ سب راہیں شیطانی راہیں ہیں۔ انبیاء کے مشترکہ دین کے خلاف ہیں۔

❁ **بے کار بحثوں سے تفرقہ بازی اور علماء کا کردار:۔** پھر بعض دفعہ علماء کی طرف سے ایسی بحثیں چھیڑ دی جاتی ہیں جن کا دین سے کچھ تعلق نہیں ہوتا نہ ان کا دین میں کچھ مقام ہوتا ہے اور نہ ہی ان پر کوئی عملی فائدہ مرتب ہوتا ہے مثلاً یہ کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ اللہ تعالیٰ جو ہر چیز پر قادر ہے وہ جھوٹ بھی بول سکتا ہے یا نہیں؟ یا یہ کہ کوا حلال ہے یا حرام؟ یا نصاریٰ میں یہ ایک مسئلہ مدتوں زیر بحث رہا کہ عیسیٰ علیہ السلام خمیری روٹی کھایا کرتے تھے یا فطیری؟ یا اصحاب کہف کی تعداد کتنی تھی؟ پھر ایسے مسائل پر بحث وجدال اور مناظرے ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ دونوں طرف سے کتابیں بھی لکھی جاتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ پوری قوم کے وقت کا ضیاع ہے۔ اور ایسے مسائل عموماً اس وقت علماء کی طرف سے کھڑے کئے جاتے ہیں جب قوم عملی انحطاط کا شکار ہو رہی ہو اور علماء کا عوام کی توجہ اپنی طرف مبذول رکھنا مقصود ہو۔ یہ سلسلہ بھی بالآخر فرقہ بازی پر منتج ہوتا ہے جو کتاب و سنت کی رو سے کفر و شرک اور اللہ کا عذاب ہے۔

[۸۵] اس آیت کے کئی مطلب بیان کئے جاتے ہیں اور وہ اپنی اپنی جگہ سب ہی درست معلوم ہوتے ہیں۔ ایک تو وہی ہے جو ترجمہ سے واضح ہے۔ بعض مجرم بستیوں کو ہم ہلاک کرتے ہیں۔ تو یہ ان کے جرائم کا پورا بدلہ نہیں ہوتا۔ انہیں قیامت کو یقیناً ہمارے پاس حاضر ہونا ہے۔ اس وقت ہم انہیں ان کے جرائم کی سزا دیں گے اور یہ ناممکن ہے کہ وہ ہمارے پاس نہ آئیں۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہم صرف اسی بستی کو ہلاک کرتے ہیں۔ جن کے متعلق ہمیں یقین ہوتا ہے کہ اپنے برے اعمال سے کبھی باز نہیں آئیں گے۔ اور تیسرا مطلب یہ ہے کہ ہلاک شدہ بستیوں کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ ہم انہیں دوبارہ زندہ کر کے واپس دنیا میں بھیج دیں تاکہ وہ اب اچھے اعمال بجا لا سکیں اور تلافی مافات کر سکیں۔

[۸۶] ❁ **یاجوج ماجوج کی یورش اور علاماتِ قیامت:۔** اس آیت کا سابقہ آیت سے ربط یہ ہے کہ جس دن یاجوج ماجوج کو کھول دیا جائے گا اور قیامت قائم ہو جائے گی۔ اس وقت لازماً ان تباہ شدہ بستی والوں کو ہمارے حضور پیش ہونا پڑے گا۔ یہ ناممکن

أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِينَ ﴿٩٧﴾
إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُونَ ﴿٩٨﴾ لَوْ كَانَ

(اور وہ کہیں گے) افسوس! ہم تو اس (سچے وعدہ) سے غفلت میں ہی پڑے رہے[۸۷] بلکہ ہم خطاکار تھے۔(۹۷) (اللہ تعالیٰ فرمائیں گے) تم بھی اور جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے رہے سب جہنم کا ایندھن[۸۸] ہیں۔ وہیں تم کو جانا ہے۔(۹۸) اگر

ہے کہ وہ ہمارے حضور پیش نہ ہوں۔ اس لحاظ سے پہلا مطلب ہی زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔

یاجوج ماجوج کے کچھ حالات تو سورہ کہف کی آیت نمبر ۹۴ کے تحت مذکور ہوئے ہیں۔ مزید یہ کہ سد ذوالقرنین کا زمین بوس ہونا اور یاجوج ماجوج کا حملہ آور ہونا قرب قیامت کی علامات میں سے ایک علامت ہے۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

سیدنا حذیفہ بن اُسید غفاری کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم آپس میں قیامت کے متعلق باتیں کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ: قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تم یہ دس نشانیاں نہ دیکھ لو گے۔ پھر آپ نے بالترتیب ان سب کا ذکر فرمایا۔ دھواں، دجال کا خروج، دابۃ الارض کا ظاہر ہونا، آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا، سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا نزول، یاجوج ماجوج کی یورش، تین مقامات پر زمین کا دھنس جانا، مشرق میں، مغرب میں اور جزیرہ عرب میں اور ان نو نشانیوں کے بعد ایک آگ پیدا ہوگی جو لوگوں کو یمن سے نکالے گی اور انہیں ان کے اجتماع کے مقام (شام) کی طرف لے جائے گی۔ (مسلم، کتاب الفتن واشراط الساعۃ)

اور جب یہ دیوار ٹوٹے گی تو یاجوج ماجوج یوں حملہ آور ہوں گے جیسے کوئی شکاری جانور قفس سے آزاد ہو کر اپنے شکار پر جھپٹتا ہے یہ لوگ اپنی کثرت اور اژدھام کی وجہ سے ہر بلندی و پستی پر چھا جائیں گے۔ جدھر دیکھو انہی کا ہجوم نظر آئے گا۔ ان کا بے پناہ سیلاب ایسی شدت اور تیز رفتاری سے آئے گا کہ کوئی انسانی طاقت اسے روک نہ سکے گی۔ یوں معلوم ہوگا کہ ان کی افواج پہاڑ اور ٹیلوں سے پھسلتی اور لڑھکتی چلی آرہی ہیں۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ یاجوج ماجوج دونوں قومیں آپس میں متحد ہو کر ایسی شورش بپا کریں۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ یہ دونوں قومیں آپس میں ہی بھڑ جائیں پھر ان کی لڑائی ایک عالمگیر فساد کا موجب بن جائے۔

[۸۷] ❁ قیامت بدترین لوگوں پر قائم ہوگی:۔ یعنی یاجوج ماجوج کی یورش کے بعد جلد ہی قیامت بپا ہو جائے گی۔ قیامت کے واقع ہونے سے پہلے سب نیک لوگوں کو اٹھا لیا جائے گا۔ چنانچہ عبداللہ بن عمرو بن عاص فرماتے ہیں کہ قیامت ان لوگوں پر قائم ہوگی جو اللہ کی مخلوق سے بدترین ہوں گے۔ (مسلم، کتاب الامارۃ باب لاتزال طائفۃ من امتی۔۔۔۔۔) اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے جو روایت ہے اس میں شرار الخلق کے لئے بجائے شرار الناس کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی قیامت ان لوگوں پر آئے گی جو لوگوں میں سب سے بدتر ہوں گے (مسلم کتاب الفتن واشراط الساعۃ) تو یہ بدترین لوگ جب قیامت واقع ہونے کا منظر دیکھیں گے تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ اس وقت وہ حسرت و یاس سے کہیں گے کہ ہم تو بھولے ہی رہے۔ پھر خود ہی کہنے لگیں گے کہ یہ صرف بھول ہی نہیں بلکہ یہ ہماری خطا تھی کہ ہم نے پیغمبروں کی بات نہ مانی ورنہ انہوں نے تو سمجھانے میں کچھ کسر نہ چھوڑی تھی۔

[۸۸] ❁ معبودانِ باطل جہنم میں:۔ یعنی مشرکوں کو ان کے معبودوں یعنی بتوں سمیت جہنم میں ڈال دیا جائے گا اور یہ بت عموماً پتھر کے ہوتے تھے۔ اسی مضمون کو اللہ نے سورہ بقرہ میں فرمایا ﴿وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ جہنم کا ایندھن آدمی بھی

هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ۭ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٩٩﴾ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿١٠٠﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰۗىِٕكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿١٠١﴾ لَا

یہ (معبود) واقعی الٰہ ہوتے تو کبھی جہنم میں نہ جاتے ان سب کو ہمیشہ جہنم میں رہنا ہو گا۔(۹۹) وہ وہاں اس طرح پھنکاریں گے کہ اس میں اور کوئی آواز نہ سن سکیں گے۔(۱۰۰) بلاشبہ جن لوگوں کے لئے ہماری طرف سے پہلے ہی بھلائی[۸۹] مقدر ہو چکی ہے وہ دوزخ سے دور رکھے جائیں گے۔(۱۰۱)

ہوں گے اور پتھر بھی اور ان معبودوں کو جہنم میں دیکھ کر ان کے پوجنے والوں کی تکلیف اور حسرت میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا۔ ایک اس لئے کہ جن معبودوں سے وہ کئی طرح کی توقعات وابستہ کئے ہوئے تھے وہ ایسے بے بس ثابت ہوئے کہ انہی کی طرح جہنم میں جل رہے ہیں اور دوسرے اس لئے کہ وہ جہنم کا ایندھن بن کر ان پجاریوں کے آگ کے عذاب کو مزید بھڑکانے کا باعث بن رہے ہیں۔

[۸۹] کون سے معبود جہنم سے بچائے جائیں گے:۔ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ مشرکین سب اپنے معبودوں سمیت جہنم کا ایندھن بنیں گے تو مشرک کہنے لگے کہ ہم تو ان بتوں کے علاوہ فرشتوں کو بھی پوجتے ہیں۔ اسی طرح عیسائیوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اور یہود نے عزیر علیہ السلام کو معبود بنا رکھا ہے تو کیا یہ فرشتے اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور سیدنا عزیر علیہ السلام سب جہنم میں جائیں گے؟ اس سوال کا جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیا کہ جو شخص بھی خود یہ چاہتا ہو کہ اس کی عبادت کی جائے وہ یقیناً جہنم میں جائے گا۔ اور اسی سوال کا جواب اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں نازل فرمایا اور ہر دو جواب کی رو سے فرشتے، سیدنا عیسیٰ علیہ السلام، سیدنا عزیر علیہ السلام اور ان کے علاوہ تمام ہستیاں بھی مستثنیٰ قرار دے دی گئیں۔ جو خود تو اللہ کے نیک بندے اور صرف اللہ ہی کے عبادت گزار تھے لیکن بعد میں لوگوں نے انہیں پوجنا شروع کر دیا۔ جیسا کہ احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ سیدنا نوح علیہ السلام کی قوم جن پانچ بتوں، ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو پکارتے تھے وہ حقیقتاً اللہ کے عبادت گزار بندے تھے۔ اور انہیں دیکھ کر اللہ یاد آتا تھا۔ بعد میں شیطان نے لوگوں کو یہ پٹی پڑھائی کہ ان بزرگوں کے مجسمے بنا کر اپنے پاس رکھ لیا کرو تاکہ تمہیں اللہ کی عبادت میں وہی مزا آئے جو ان بزرگوں کی موجودگی میں آتا تھا۔ چنانچہ ابتداءً ان کے مجسمے اس غرض سے تراشے گئے تھے پھر بعد کے لوگوں نے انہی مجسموں کی عبادت شروع کر دی۔ (بخاری، کتاب التفسیر) اور اس طرح شیطان اپنے مشن میں کامیاب ہو گیا اور بنی نوع انسان میں شرک کا آغاز ہوا۔

پھر شرک صرف یہی نہیں ہوتا کہ انسان کسی کے سامنے سجدہ کرے یا ایسے آداب بجا لائے جو اللہ کے لئے مختص ہیں یا ان کے سامنے قربانی یا نذر و نیاز دے بلکہ کسی بھی چیز کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھ کر اسے پکارا جائے تو یہ بھی واضح شرک ہے۔ اور ایسے "بزرگوں" کی بھی اس دنیا میں کمی نہیں جو اس قسم کی تعظیم و تکریم کے متمنی ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی فی الواقع جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ اور جن لوگوں کو بعد میں معبود بنا دیا گیا حالانکہ وہ خود ان باتوں سے منع کرتے رہے انہیں جہنم کی ہوا بھی نہ لگے گی۔

يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿١٠٢﴾ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ
الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿١٠٣﴾ يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاۗءَ كَطَيِّ
السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۭ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ۭ وَعْدًا عَلَيْنَا ۭ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿١٠٤﴾ وَلَقَدْ كَتَبْنَا
فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿١٠٥﴾ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا

وہ اس کی آہٹ تک نہ [۹۰] سنیں گے اور وہ اپنی دل پسند نعمتوں میں ہمیشہ رہیں گے۔(۱۰۲) یہ انتہائی گھبراہٹ کا وقت انہیں غمگین نہیں کرے گا اور فرشتے آگے بڑھ کر ان سے ملیں گے (اور کہیں گے) یہی وہ دن [۹۱] ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔(۱۰۳) اس دن ہم آسمان کو یوں لپیٹ دیں گے جیسے تحریروں کا طومار لپیٹ دیا جاتا ہے۔ جس طرح ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی تھی اسی طرح اس کا اعادہ [۹۲] کریں گے۔ یہ ہمارے ذمہ ایک وعدہ ہے اور ہم یہ کر کے رہیں گے (۱۰۴) اور زبور میں ہم نے نصیحت کے بعد یہ لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث [۹۳] میرے نیک بندے ہوں گے۔(۱۰۵)

[۹۰] ان آیات میں مشرکوں اور ان کے معبودوں کے انجام کے مقابلہ میں نیک لوگوں کے احوال کا ذکر کیا گیا ہے۔ خواہ انہیں کسی نے معبود بنا رکھا تھا یا نہیں۔ ایسے لوگ جہنم سے اتنے دور رکھے جائیں گے کہ وہ اہل دوزخ کی کسی قسم کی چیخ و پکار یا آہٹ تک نہ سننے پائیں گے اور ان سے بہت دور رہ کر اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں میں سے اپنی حسب پسند نعمتوں کے مزے اڑائیں گے۔

[۹۱] قیامت کے دن گھبراہٹوں سے وہ قطعاً پریشان حال نہ ہوں گے بلکہ انہیں مکمل اطمینان میسر ہوگا۔ اس لئے یہ سب کچھ ان کے عقائد اور ان کی توقعات کے مطابق ہو رہا ہوگا۔ فرشتے آکر انہیں سلام کریں گے اور جنت میں داخل کرنے کے لئے خود ان کے استقبال کو آئیں گے اور کہیں گے کہ جس دائمی راحت و مسرت کا دنیا میں تم سے وعدہ کیا جاتا رہا آج اس کے پورا ہونے کا وقت آگیا ہے۔

[۹۲] ❁ کائنات کا انجام کیا اور کیسے ہوگا؟ یعنی آسمانوں کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔ اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر یوں ارشاد فرمایا: ﴿وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ﴾ یعنی تمام آسمانوں کو لپیٹ کر اللہ تعالیٰ اپنے دائیں ہاتھ میں لے گا اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق کا آغاز کیا تھا اسی طرح موجودہ زمین و آسمان کی ایک ایک چیز کو ختم کر کے نئی زمین، نئے آسمان اور نئی کائنات کو وجود میں لایا جائے گا۔

[۹۳] ❁ صالحین کی نئی تعبیر --- خلافتِ ارضی اور صالحین کی بحث:۔ اس آیت کے معنی کی بعض اہل مغرب کے شیدائیوں نے نہایت غلط تعبیر پیش کی ہے۔ وہ اس آیت میں صالحون سے مراد اللہ تعالیٰ کے فرمانروا اور نیک بخت بندے مراد نہیں لیتے بلکہ ان کے نزدیک صالحون سے مراد صلاحیت رکھنے والے لوگ ہیں۔ یعنی جو لوگ بھی اس وقت روئے زمین پر حکمرانی کر رہے ہیں یا حکمران کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہی اللہ کے نزدیک صالح ہیں۔ خواہ وہ بدکردار ہوں، کافر ہوں حتیٰ کہ اللہ

لِقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ﴿١٠٦﴾ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٧﴾ قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ

بلاشبہ اس (ارشادالٰہی) میں عبادت گزاروں[۹۴] کے لئے ایک بڑی خبر ہے۔(۱۰۶) اور ہم نے آپ کو تمام دنیا والوں کے لئے رحمت[۹۵] بنا کر بھیجا ہے۔(۱۰۷) آپ ان سے کہہ دیجئے کہ: "میری طرف جو وحی کی جاتی ہے وہ

تعالیٰ کی ہستی کے بھی منکر ہوں اور یہ نظریہ کتاب و سنت کی مجموعی تعلیم کے سراسر منافی ہے۔ حالانکہ اس آیت اور اس سے پہلی آیات میں اخروی زندگی اور جنت کا ذکر ہو رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جنت اور جنت کی زمین کے وارث صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ کے فرمانبردار اور صالح لوگ ہیں اور اس معنی کی تائید سورہ زمر کی درج ذیل آیت سے بھی ہو جاتی ہے:

﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ﴾ (۳۹: ۷۴)

"اور اہل جنت کہیں گے کہ ہر طرح کی تعریف اللہ کو سزاوار ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ پورا کر دیا اور ہمیں زمین کا وارث بنا دیا ہم جنت میں جہاں چاہتے ہیں وہیں رہتے ہیں"

رہی اس دنیا کی وراثت تو اس کے متعلق فرمایا:

﴿اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ﴾ (۷: ۱۲۸) "زمین اللہ تعالیٰ ہی کی ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے" گویا اس موجودہ دنیا میں زمین کی وراثت کے لئے ضروری نہیں کہ وہ نیک لوگوں کو ہی ملے۔ بلکہ بدکردار اور فاسق و فاجر بھی اس پر قابض ہو سکتے ہیں۔

ہاں اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ضرور ہے کہ جو ایماندار اپنے دعوے ایمان میں اور صالح اعمال کرنے میں سچے اور مخلص ہیں۔ حق و باطل کے معرکہ میں اللہ انہیں ہی کامیاب کرتا ہے۔

❁ خلافت ارضی کے لئے شرائط:۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (۳: ۱۳۹) "اور اگر تم (اپنے اقوال و اعمال میں) مومن ہو تو تم ہی غالب رہو گے" اور ایسے ہی لوگوں کے حق میں اللہ نے فرمایا:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (۲۴: ۵۵)

"تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کیے ان سے اللہ نے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انہیں زمین میں ایسے ہی خلیفہ بنائے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا"

یعنی اللہ تعالیٰ کا وعدہ نام نہاد مسلمانوں کے لئے حکمرانی کا نہیں بلکہ سچے ایمانداروں اور فرمانبرداروں سے خلافت ارضی کا وعدہ ہے جو اقتدار ملنے کے بعد دنیادار قسم کے حکمران نہیں بلکہ اللہ کی زمین پر اللہ کا نظام خلافت قائم کرنے والے ہوں۔

[۹۴] یعنی عبادت گزاروں کے لئے ان آیات میں ایک بڑی خوشخبری ہے کہ اگر وہ ان آیات پر عمل پیرا ہوں گے تو یقیناً اپنی منزل مقصود کو پا لیں گے۔

[۹۵] ❁ آپ ﷺ اہل جہان کے لئے رحمت کیسے ہیں؟۔ اس آیت کا دوسرا معنی یہ ہے کہ یہ جہان والوں پر اللہ تعالیٰ کی

اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ وَاِنْ اَدْرِيْٓ

یہ ہے کہ تمہارا اللہ صرف ایک ہی اللہ ہے۔ پھر کیا تم سر تسلیم خم [۹۶] کرتے ہو؟" (۱۰۸)

پھر اگر وہ منہ موڑلیں تو ان سے کہئے کہ: "میں نے تم سب کو علی الاعلان [۹۷] خبردار کر دیا ہے۔ اور میں نہیں

رحمت ہے کہ اس نے آپ ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ مطلب دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے کہ آپ ﷺ کی ذات بابرکات اور آپ کی بعثت دراصل پوری نوع انسانی کے لئے رحمت ہے۔ آپ ہی کے ذریعہ غفلت میں پڑی ہوئی اور راہ بھٹکی ہوئی انسانیت کو ایسا علم نصیب ہوا جو حق وباطل کی راہوں کو ممیز کر کے سیدھی راہ دکھاتا اور اس پر چلاتا ہے۔ جس سے انسان نے دنیا کی زندگی اچھے طور پر گزارنے کے اصول اور ڈھنگ سیکھے۔ پھر اس راہ پر چلنے سے انسان کی اخروی زندگی بھی سنور جاتی ہے۔ آپ کی یہ مہربانی تو ان لوگوں پر تھی جو آپ پر ایمان لائے اور بدکرداروں اور کافروں کے لئے آپ کی ذات باعث رحمت تھی چنانچہ ارشادِ باری ہے ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ﴾ (۸: ۳۳) یعنی "جب تک آپ ان کافروں کے درمیان موجود ہیں اللہ ان پر عذاب نازل نہیں کرے گا" علاوہ ازیں آپ ہی کی دعا کی وجہ سے خسف اور مسخ اور بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے والے عذاب موقوف ہوئے اور مسلمانوں پر آپ کی رحمت کی داستان تو اتنی طویل ہے جس کا حصر یہاں ممکن نہیں۔ قرآن نے واضح الفاظ میں بتادیا کہ آپ مومنوں کے حق میں رحمت بھی تھے اور رحیم بھی۔

کفار مکہ آپ کی بعثت کو اپنے لئے ایک مصیبت سمجھتے اور کہتے تھے کہ اس شخص نے ہماری قوم میں پھوٹ ڈال دی ہے اور باپ سے بیٹے کو اور بھائی سے بھائی کو غرض سب قریبی رشتہ داروں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے رکھ دیا ہے۔ ان کے اسی قول کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نادانو! جس ہستی کو تم مصیبت سمجھ رہے ہو۔ مسلمان تو درکنار وہ تمہارے لئے بھی اللہ کی رحمت ہے۔ کیونکہ علوم نبوت اور تہذیب وانسانیت کے جو اصول وہ پیش کر رہا ہے ان سے سب مسلم وکافر اپنے اپنے مذاق کے موافق مستفید ہو رہے ہیں۔

[۹۶] جہاں والوں کے لئے آپ ﷺ کے رحمت ہونے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ لوگوں کو زندگی بھر تکلیفیں سہہ سہہ کر بحکمِ الٰہی خالص توحید کی دعوت دیتے رہے۔ اور مؤحد کے لئے اللہ کا وعدہ یہ ہے کہ اسے آخرت میں ایک نہ ایک دن ضرور دوزخ کے عذاب سے نجات مل جائے گی خواہ وہ کتنا ہی گنہگار ہو۔ درج ذیل حدیث اسی آیت کی وضاحت کرتی ہے۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "میری اور لوگوں کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے آگ روشن کی اور جب اس کی روشنی ارد گرد پھیل گئی تو کیڑے اور پتنگے اس آگ میں گرنے لگے۔ اب وہ شخص انہیں آگ سے دور ہٹانے لگا (تاکہ جلنے سے بچ جائیں) مگر وہ مانتے ہی نہیں اور اس آگ میں گھستے، گرتے اور مرتے جاتے ہیں۔ اسی طرح میں تمہیں تمہاری کمروں سے پکڑ کر تمہیں آگ سے دور کھینچتا ہوں اور کہتا ہوں کہ دوزخ سے بچ جاؤ لیکن لوگ ہیں کہ سنتے ہی نہیں اور اس میں گرے پڑتے ہیں (" بخاری۔ کتاب الرقاق۔ باب الانتهاء عن المعاصی)

[۹۷] اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ کا معنی یہ ہے کہ میں نے تم کو برابری کی سطح پر خبردار کر دیا ہے۔ یعنی تمہیں دو باتوں میں سے کسی بھی ایک کا اختیار ہے۔ چاہے میری دعوت کو قبول کر لو اور چاہے تو انکار کر دو۔ انکار کی صورت میں تم پر عذاب آئے گا ضرور،

أَقَرِيبٌ أَمْ بَعِيدٌ مَّا تُوعَدُونَ ﴿١٠٩﴾ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُونَ ﴿١١٠﴾
وَإِنْ أَدْرِي لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿١١١﴾ قَالَ رَبِّ احْكُم بِالْحَقِّ وَرَبُّنَا
الرَّحْمَٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ﴿١١٢﴾ ع النصف ۱۹

جانتا کہ جو وعدہ تم سے کیا جاتا ہے وہ نزدیک ہے یا دور۔(۱۰۹) اللہ تعالیٰ وہ باتیں بھی جانتا ہے جو آواز بلند کی جاتی ہیں اور وہ بھی جنہیں تم چھپا کر کرتے ہو۔(۱۱۰) اور میں نہیں جانتا کہ شاید یہ (عذاب میں تاخیر) تمہارے لئے ایک فتنہ ہو[۹۸] اور تمہیں ایک معینہ مدت تک مزے اڑانے کا موقع دیا جا رہا ہو۔(۱۱۱) (آخر کار) پیغمبر نے کہا: ”اے میرے پروردگار! حق کے ساتھ فیصلہ کر دے۔ اور (لوگو!) جو کچھ تم بیان کرتے ہو اس کے مقابلہ میں ہمارا پروردگار رحمٰن ہی ہے جس سے مدد[۹۹] طلب کی جا سکتی ہے“(۱۱۲)

لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ عذاب کب آئے گا؟ جلد آئے گا یا دیر سے آئے گا کیونکہ میں عالم الغیب نہیں ہوں۔

[۹۸] البتہ یہ بات ضرور کہوں گا کہ اگر تم پر عذاب آنے میں تاخیر ہو رہی ہے تو اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ تم سچے ہو اور اللہ تم سے راضی ہے۔ بلکہ یہ تاخیر تمہارے گناہوں میں اضافہ کا سبب بن کر تمہارے حق میں وبالِ جان بن سکتی ہے۔ اِلا یہ کہ تم اس دوران سنبھل جاؤ اور ہوش کے ناخن لو۔

[۹۹] انبیاء کی اپنی قوم سے مایوسی پر دعا: اکثر انبیاء جب اپنی زندگی بھر اللہ کی طرف دعوت دینے کے بعد کافروں کی طرف سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے ایسی ہی یا ان الفاظ سے ملتے جلتے الفاظ میں دعا کی کہ یا اللہ! اب تو ہی ان کافروں کے اور ہمارے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ فرما دے۔ چنانچہ اس رسول (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی کافروں کو مخاطب کر کے فرمایا: کہ جس طرح تم اللہ کی آیات کا مذاق اڑاتے رہے ہو اور مسلمانوں کو اپنی تضحیک اور ظلم و ستم کا نشانہ بناتے رہے ہو تو اس کے ردِ عمل کے طور پر ہم اپنے پروردگار کی طرف ہی رجوع کرتے ہیں جو نہایت مہربان ہے اور ایسے مشکل اوقات میں اسی سے مدد طلب کرنا چاہئے۔

٧٨ آیاتھا سُوْرَۃُ الْحَجِّ مَدَنِیَّۃٌ رکوعھا ١٠

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَۃَ السَّاعَۃِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ① یَوْمَ تَرَوْنَھَا تَذْھَلُ کُلُّ
مُرْضِعَۃٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ کُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَھَا وَتَرَی النَّاسَ سُکٰرٰی وَ
مَا ھُمْ بِسُکٰرٰی وَلٰکِنَّ عَذَابَ اللّٰہِ شَدِیْدٌ ② وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ

کلمات ١٢٨٣ آیت ٧٨ (٢٢) سورہ الحج مدنی ہے (١٠٣) رکوع ١٠ حروف ٥٤٢٢

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرتے رہو بلاشبہ قیامت کا زلزلہ بڑی (ہولناک) چیز ہے۔(١) اس دن تم دیکھو گے کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی اور ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا اور تو لوگوں کو مدہوش دیکھے گا حالانکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب[١] ہی بڑا سخت ہو گا۔(٢)

[١] علم ہیئت کے موجودہ نظریہ کے مطابق ہماری زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ سورج سے زمین کا فاصلہ ٩ کروڑ ٣٠ لاکھ میل ہے۔ اور زمین سورج کے گرد جتنے عرصہ میں ایک چکر ختم کرتی ہے اسے ہم سال کا عرصہ کہتے ہیں۔ اس حساب سے ہماری زمین سورج کے گرد چھیاسٹھ ہزار چھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم رہی ہے۔ پھر اس فضائے بسیط میں صرف ہماری زمین ہی محوِ گردش نہیں بلکہ تمام سیارے اسی طرح گردش میں مصروف ہیں۔ ان سب کے مدار الگ الگ ہیں اور ان سیاروں میں کششِ جذب وانجذاب رکھ دی گئی ہے۔ جن کی وجہ سے ان میں ٹکراؤ پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ سب کام اللہ تعالیٰ کے کنٹرول اور اس کی تدبیر کے تحت ہو رہے ہیں۔ ہر سیارہ اور ہر چیز اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین کی اس شدت سے پابند ہے کہ ان کی رفتار میں سرِمو فرق آتا ہے اور نہ ہی ان میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے اور یہ سب ایسے امور ہیں جنہیں ہر انسان بچشمِ خود دیکھ رہا اور ان کی شہادت دے رہا ہے۔ قربِ قیامت کی علامات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سورج مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہو گا۔ بالفاظ دیگر سورج الٹی چال چلنے لگے گا۔ جسے ہم موجودہ نظریہ کے مطابق یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ زمین الٹی چال چلنے لگے گی اور بعض سیاروں کے الٹی چال چلنے کا نظریہ ہیئت دانوں میں معروف ہے۔ بطلیموسی نظریہ کے مطابق پانچ سیارے زحل، مشتری، مریخ، زہرہ، عطارد ایسے ہیں جو سیدھی چال چلتے چلتے الٹی چال چلنے لگتے ہیں۔ پھر کچھ مدت بعد سیدھی چال چلنے لگتے ہیں۔ اور ان سیاروں کو "خمسہ متحیرہ" کہتے ہیں۔ الٹی چال چلنے اور پھر سیدھی چال پر رواں ہونے کی تصدیق قرآن کریم کی درج ذیل آیت سے بھی ہو جاتی ہے۔

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ الْجَوَارِ الْکُنَّسِ﴾ (٨١: ١٥۔١٦) "سو میں ان ستاروں کی قسم کھاتا ہوں جو سیدھی چال چلتے چلتے یکدم پیچھے ہٹ جاتے ہیں (اور) ان کی جو سیدھی چال چلتے تھوڑا سے ہٹ جاتے ہیں (اور ان کی بھی) جو غائب ہو جاتے ہیں"

۞ قیامت کیسے بپا ہو گی اور سیاروں کا آپس میں ٹکرا جانا اور اس کی دہشت:۔ پھر جب اللہ تعالیٰ قیامت بپا کرنے کا ارادہ فرمائے گا تو صرف اتنا ہی ہو گا کہ کسی ایک سیارہ سے کشش جذب وانجذاب کو سلب کر لے اور ہماری زمین کسی دوسرے سیارے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے۔ اب آپ اندازہ فرمائیے کہ اگر دو ریل گاڑیاں یا دو تیز رفتار بسیں آپس میں ٹکرا جائیں تو کیا حشر بپا ہوتا ہے۔ اور جب ہماری زمین جو چھیاسٹھ ہزار چھ سو میل فی گھنٹہ کی سی برق رفتاری سے محوِ گردش ہے۔ کم وبیش اسی رفتار والے سیارے سے ٹکرا جائے گی تو کیا حشر بپا ہو گا۔ یہی منظر ان دو آیات میں پیش کیا گیا ہے کہ اس دھماکہ کی دہشت سے ہر حاملہ کا حمل ساقط ہو جائے گا اور لوگ یوں مخبوط الحواس ہو جائیں گے جیسے کوئی نشہ آور چیز پی رکھی ہے۔ اس منظر کی ہولناکی کو بعض دوسری آیات میں یوں پیش کیا گیا ہے "اس وقت زمین کو ریزہ ریزہ اور پاش پاش کر دیا جائے گا" (۸۹: ۲۱) "زمین اپنے خزانے جیسے تیل، گیسیں اور معدنیات وغیرہ اپنے اندر سے نکال کر باہر پھینک دے گی اور خالی ہو جائے گی" (۸۴: ۴) پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کی طرح اڑتے پھریں گے اور لوگ یوں بدحواس ایک دوسرے پر پڑتے ہوں گے جیسے روشنی کے گرد پتنگے گرے پڑتے ہیں (۱۰۱: ۴۔۵) غرض قیامت کے واقع ہونے پر دہشت اور ہولناکی کے منظر کو قرآن میں اور بھی بہت سے مقامات پر ذکر کیا گیا ہے۔

قیامت کا دن دراصل ایک طویل دور کا نام ہے اور از روئے قرآن اس دن کی مدت ہمارے موجودہ حساب کے مطابق پچاس ہزار سال ہے۔ اس طویل عرصہ میں کئی اوقات ایسے آئیں گے جن کی دہشت اور ہولناکی اور گھبراہٹ اسی طرح کی ہو گی۔ چنانچہ درج ذیل حدیث میں جس دہشت اور گھبراہٹ کا ذکر ہے وہ یقیناً قیامت کے بپا ہونے کا موقع نہیں بلکہ کوئی اور ہی وقت ہے۔ اور اس دہشت اور گھبراہٹ کا سبب بھی قیامت کا زلزلہ یا دھماکہ نہیں بلکہ اس کا سبب جہنم میں جانے کا خدشہ ہے۔

۞ یاجوج ماجوج کا جہنم میں حصہ:۔ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن آدم علیہ السلام سے فرمائیں گے اے آدم! "وہ کہیں گے" پروردگار! میں حاضر ہوں جو ارشاد ہو" پھر ایک فرشتہ آواز سے پکارے گا "اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ اپنی اولاد سے دوزخ جانے والوں کا حصہ نکالو" وہ عرض کریں گے: پروردگار! دوزخ کے لئے کتنا حصہ (نکالوں؟) راوی کہتا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "ایک ہزار میں سے نو سو ننانوے" یہ ایسا سخت وقت ہو گا کہ حاملہ اپنا حمل گرا دے گی اور بچہ بوڑھا ہو جائے گا اور تم لوگوں کو مدہوش دیکھو گے حالانکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب ہی بڑا سخت ہو گا" یہ بات صحابہ پر بہت دشوار گزری اور ان کے چہرے متغیر ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: نو سو ننانوے تو یاجوج وماجوج سے ہوں گے اور ایک تم سے ہو گا۔

۞ اہلِ جنت کا نصف امتِ مسلمہ ہو گی:۔ پھر تم تو تمام خلقت میں ایسے ہو گے جیسے کسی سفید بیل کے پہلو میں ایک کالا بال ہو یا کسی کالے بیل کے پہلو میں ایک سفید بال ہو۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ تم سب لوگ اہل جنت کا چوتھا حصہ ہو گے" (یہ سن کر خوشی سے) ہم نے اللہ اکبر کہا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "تم جنت کا تیسرا حصہ ہو گے" ہم نے پھر اللہ اکبر پکارا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "تم اہل جنت کا آدھا حصہ ہو گے" ہم نے پھر اللہ اکبر کہا۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ﴿۳﴾ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۴﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۭ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَاۗءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ

اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے [۲] میں بغیر علم کے بحث کرتے اور [۳] ہر سرکش شیطان کی اتباع کرنے لگتے ہیں۔(۳) ایسے لوگوں کی قسمت میں یہ لکھ دیا گیا ہے جو شخص شیطان کو اپنا دوست بنائے گا، وہ اسے گمراہ کر کے چھوڑے گا اور جہنم کے عذاب کی راہ دکھائے گا۔(۴)

لوگو! اگر تمہیں موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے [۴] میں کوئی شک ہے تو (تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ) ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے جو منقش بھی ہوتی ہے اور نقش کے بغیر بھی، تاکہ ہم تم پر (اپنی قدرت کو) واضح کر دیں۔

پھر ہم جس نطفہ کے متعلق چاہتے ہیں اسے رحموں میں ایک خاص مدت تک جمائے رکھتے ہیں، پھر تمہیں بچہ

[۲] ۞ **اللہ اور اس کی صفات میں جھگڑا:۔** اس سورت کے آغاز میں جو قیامت کے بپا ہونے کے وقت کی دہشت کا ذکر کیا گیا ہے یہ بطور تمہید ہے اور اس سے اصل مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرا کر ان باتوں سے پرہیز کی تلقین کی جائے جو اللہ کے غضب کا موجب بنتی ہیں۔ جیسا کہ مشرکین مکہ نے اللہ تعالیٰ کے جملہ اختیارات و تصرفات کو اپنے بتوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اس آیت میں فی اللہ سے مراد اللہ کی ہستی نہیں ہے۔ کیونکہ مشرکین اللہ کی ہستی کے قائل تھے۔ جھگڑا صرف اس بات میں تھا کہ مشرکین یہ کہتے تھے کہ ہمارے معبودوں کو بھی حاجت روائی اور مشکل کشائی کے کچھ نہ کچھ اختیارات حاصل ہیں جب کہ وحی الٰہی ان کے اس عقیدے کی مکمل تردید کر دیتی تھی۔

[۳] یعنی جو بھی شیطان یا شیطان سیرت انسان انہیں کسی شرکیہ فعل یا بدعی عقیدہ و عمل کی دعوت دیتا ہے تو اسے یوں تسلیم کرتے ہیں جیسے پہلے ہی اس کی اتباع کرنے کو تیار بیٹھے تھے۔ حالانکہ یہ بات طے شدہ ہے کہ جو شخص بھی شیطان کی رفاقت کا دم بھرے گا اور اس کی اتباع کرے گا تو وہ اسے ایسا گمراہ کرے گا کہ اسے جہنم میں پہنچا کے چھوڑے گا۔

[۴] ۞ **توحید باری تعالیٰ پر دلائل:۔** مشرکین مکہ سے اولین جھگڑا تو ان کے بتوں کے خدائی اختیارات سے تعلق رکھتا تھا اور دوسرا جھگڑا یہ تھا کہ دین ابراہیمی کے پیروکار ہونے کا دعویٰ رکھنے کے باوجود بعث بعد الموت کا یقین نہیں رکھتے تھے لہٰذا اب ایسے دلائل دیئے جا رہے ہیں جو بعث بعد الموت پر پوری رہنمائی کرتے ہیں۔

سب سے پہلی دلیل تو انسان کا اپنا وجود ہے۔ آدم کے پتلے کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے بنایا۔ مٹی بے جان چیز ہے۔ جب اس میں اللہ نے اپنی روح پھونکی تو وہ جیتا جاگتا انسان بن گیا۔ پھر آگے توالد و تناسل سے آدم کی اولاد پھیلی۔ اب جو چیزیں یا غذائیں

انسان کھاتا ہے وہ سب زمین سے حاصل ہوتی ہیں۔ انہیں غذاؤں سے کہیں انسان کا گوشت بنتا ہے، کہیں ہڈیاں، کہیں عضلات بنتے ہیں پھر اسی غذا سے نطفہ بھی بنتا ہے اور اس نطفہ کے ایک قطرہ میں ہزاروں جاندار جرثومے ہوتے ہیں۔ اب دیکھئے زمین بھی بے جان چیز ہے اور یہ غذائیں جو انسان نے استعمال کیں وہ بھی بے جان تھیں۔ لیکن اللہ نے انہی بے جان چیزوں سے زندہ اور متحرک جراثیم پیدا کر دیئے۔ پھر ان ہزاروں جرثوموں میں کوئی ایک آدھ جرثومہ عورت کے خلیہ بیضہ سے ملتا ہے تو انسان کی تخلیق کا عمل شروع ہو جاتا ہے وہ بھی اس صورت میں کہ اللہ کو منظور ہو۔ ورنہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مرد اور عورت کے ملاپ کے بعد بھی حمل قرار نہیں پاتا۔ حالانکہ مرد اور عورت دونوں کے نطفہ میں پوری پوری صلاحیت موجود ہوتی ہے۔

❁ رحمِ مادر میں انسان کی تخلیق:۔ پھر رحم مادر کے تہ بہ تہ اندھیروں میں انسان کی جس طرح تخلیق ہوتی ہے اور جن جن مراحل سے وہ گزرتا ہے ان میں سے اللہ نے صرف ان مراحل کا ذکر فرمایا ہے جو بالعموم عام انسانوں کے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں اور اس مشاہدہ کی صورت اسقاطِ حمل ہے۔ نطفہ کے بعد جما ہوا خون، پھر اس کے بعد جما ہوا خون گوشت کے لوتھڑے میں تبدیل ہوتا ہے۔ مگر اس پر کسی قسم کا کوئی نقش نہیں ہوتا۔ پھر اس گوشت کے لوتھڑے میں آنکھ، ناک، کان، ہاتھ، پاؤں وغیرہ سب اعضاء کے نقوش بننے لگتے ہیں پھر اسی لوتھڑے میں ہڈیاں اور عضلات بنتے چلے جاتے ہیں تا آنکہ مقررہ وقت کے بعد انسان کا بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اللہ چاہے تو وہ لڑکا بن جاتا ہے اور چاہے تو لڑکی بن جاتی ہے اور سب امور اور مراحل اللہ کی زبردست نگرانی میں طے ہوتے جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے۔

سیدنا انس کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے عورت کے رحم پر ایک فرشتہ مقرر کر رکھا ہے، جو کہتا ہے، پروردگار! اب نطفہ پڑا۔ پروردگار اب یہ خون بن گیا۔ پروردگار اب یہ لوتھڑا بن گیا پھر جب اللہ اس کی پیدائش کے متعلق فیصلہ کر دیتا ہے تو فرشتہ پوچھتا ہے کہ یہ مرد ہے یا عورت؟ بدبخت ہے یا نیک بخت؟ اس کی روزی کیا ہے؟ اور اس کی عمر کیا ہے؟ پھر ماں کے پیٹ میں ہی یہ سب کچھ لکھ دیا جاتا ہے۔“ (بخاری کتاب الحیض۔ باب قول اللہ مخلّقة و غير مخلّقة)

❁ بعث بعد الموت پر سب سے بڑی دلیل انسان کی اپنی پیدائش ہے:۔ اب انسان کی غفلت شعاری کا یہ حال ہے کہ کوئی کارنامہ خواہ کتنا ہی محیر العقول ہو اگر وہ عادت بن چکا ہو تو اس میں غور کرنے کی زحمت تک گوارا نہیں کرتا۔ مگر اس جیسی یا اس سے کم محیر العقول بات جو ابھی وقوع پذیر نہ ہوئی ہو اس کا فوراً انکار کر دیتا ہے۔ بعث بعد الموت کا واقعہ انسان کی اپنی پیدائش سے کچھ زیادہ محیر العقول نہیں ہے۔ لیکن انسان کا انکار صرف اس بنا پر ہوتا ہے کہ وہ ابھی وقوع پذیر نہیں ہوا۔

پھر یہ بات کیا کم حیرت انگیز ہے کہ جب انسان کا بچہ پیدا ہوتا ہے تو جوانی تک اس کے جسم، اس کی عقل اور اس کی قوت ہر چیز میں اضافہ ہوتا جاتا ہے لیکن جوانی کے بعد انسان وہی پہلی سی غذائیں بلکہ پہلے سے اچھی غذائیں کھاتا ہے۔ لیکن اس کی عقل اور قوت میں کمی واقع ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس کا قدو قامت ایک مقررہ حد تک جا کر رک جاتا ہے پھر اس میں انحطاط رونما ہونے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اعضاء کے اضمحلال کے علاوہ اس کی عقل بھی ماؤف ہو جاتی ہے، سیکھی ہوئی باتیں بھول جاتا ہے اور بہکی بہکی بچوں کی سی باتیں کرنے لگتا ہے کیا یہ شواہد ایسے نہیں ہیں کہ جو کچھ اللہ چاہتا ہے وہی کچھ ہوتا ہے نیز یہ کہ جو کچھ اللہ چاہتا ہے وہ اس کے کرنے کی پوری قدرت رکھتا ہے؟ پھر آخر بعث بعد الموت سے انکار کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاۗءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُـحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ

بنا کر نکالتے ہیں، پھر (تمہاری پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی بھرپور جوانی کو پہنچو۔ پھر تم میں سے کسی کی تو روح قبض کرلی جاتی ہے اور کسی کو بدترین عمر (انتہائی بڑھاپے) تک زندہ رکھا جاتا ہے تاکہ وہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔ اور تم دیکھتے ہو کہ زمین خشک پڑی ہوتی ہے۔ پھر جب ہم نے اس پر مینہ برسایا تو وہ حرکت میں آئی اور پھول گئی اور ہر قسم کی پُربہار[۵] چیزیں اگانا شروع کردیں۔(۵) یہ سب کچھ اس لئے (ہوتا ہے) کہ اللہ ہی حق[۶] ہے، وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔(۶) اور قیامت یقیناً آنے والی ہے اس میں کوئی

[۵] نباتات سے معاد پر دوسری دلیل:۔ یہ معاد یا بعث بعد الموت پر دوسری دلیل ہے۔ مختلف قسم کی نباتات اور اجناس کے بیج زمین میں بکھرے پڑے ہوتے ہیں جنہیں ہواؤں نے یا پرندوں نے جگہ جگہ پھیلا دیا تھا۔ اسی طرح بے شمار چیزوں کی جڑیں بھی جگہ جگہ پیوند خاک ہوئی پڑی تھیں۔ جن میں نباتاتی زندگی کا کوئی ظہور موجود نہ تھا۔ مگر جونہی ان پر بارش کے چھینٹے پڑے تو ہر طرف زندگی لہلہانے لگی۔ ہر مردہ جڑ اپنی قبر سے جی اٹھی اور ہر بے کار پڑا ہوا بے جان بیج ایک زندہ پودے کی شکل اختیار کر گیا اور یہ احیائے اموات کا ایسا عمل ہے جسے ہر انسان موسم بہار میں اور موسم برسات میں خود مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ یہی صورت انسان کے جسم کی ہے۔ جس کا بدن گل سڑ جاتا ہے اور اس کے جی اٹھنے کا موسم نفخہ صور ثانی ہے۔ جب یہ موسم آجائے گا تو ہر انسان اپنے اپنے مدفن سے زندہ اٹھا کھڑا کر دیا جائے گا۔

[۶] اللہ کے حق ہونے کے تین مطلب:۔ اس جملہ کے تین مطلب ہو سکتے ہیں اور تینوں ہی درست ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں حق کا معنی سچا ہے۔ یعنی ان دونوں مثالوں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعث بعد الموت کو حتمی اور یقینی قرار دے رہے ہیں تو اس کی بات بالکل سچی ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی اپنی ذات ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ اس کا وجود کوئی فرضی وجود نہیں جسے عقلی اشکالات کی وجہ سے تسلیم کر لیا گیا ہو جیسا کہ فلاسفروں کا خیال ہے جو علت و معلول کی کڑیاں جوڑتے جوڑتے جب عاجز آجاتے ہیں تو ایک ہستی کو واجب الوجود یا علت العلل (First Cause) تسلیم کرنے لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ ایک زندہ جاوید ہستی ہیں جو ہر چیز میں اپنی مرضی سے تصرف کرتے ہیں اور ہر چیز پر کنٹرول رکھے ہوئے ہیں اور تیسرے یہ کہ اس کائنات میں جو کچھ ظہور پذیر ہو رہا ہے وہ ٹھوس حقائق پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ساری کائنات اور اس کائنات میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات کو محض تفریح طبع کے لئے پیدا نہیں کیا۔ اور ان تینوں معانی پر قرآن کی دوسری بے شمار آیات شاہد ہیں۔

وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى
وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ

شک و شبہ نہیں اور اللہ تعالیٰ ضرور ان لوگوں کو زندہ [٧] کر کے اٹھائے گا جو قبروں میں پڑے ہیں۔(٧) اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو بغیر علم [٨]، ہدایت اور روشنی بخشنے والی کتاب کے اللہ کے بارے میں بحث کرتے ہیں۔(٨) (اور ازراہِ تکبر حق سے) اپنا پہلو موڑتے ہیں تاکہ دوسروں کو اللہ کی راہ سے بہکا دیں ایسے شخص کے لئے دنیا

[٧] ان آیات میں چند در چند حقائق بیان ہوئے ہیں جو یہ ہیں:

(١) اللہ تعالیٰ کی ہستی ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ وہ علیم و خبیر ہستی ہے۔ کائنات میں جملہ تصرفات اسی کی حکمت اور قدرت کے تحت واقع ہو رہے ہیں۔

(٢) اللہ تعالیٰ مردہ اشیاء سے زندہ اشیاء کو پیدا کر سکتے ہیں۔ پھر زندہ اشیاء کو مردہ اشیاء میں تبدیل کرتے ہیں اور پھر انہیں زندگی بخش سکتے ہیں مثلاً انسان کو اس نے ایک مشت خاک سے پیدا کیا ہے۔ پھر انسان کا نطفہ بھی بے جان اشیاء سے بنتا ہے۔ جس میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں انسان کا جسم اور اس کی غذائیں جن مادوں سے مرکب ہیں وہ سب بے جان مادے ہیں۔ مثلاً انسانی جسم اور اس کی غذائیں سب کچھ نمکیات لوہا، چونا، کوئلہ اور چند گیسوں سے مرکب ہے۔ انہیں ہی ترکیب دے کر اللہ نے جیتے جاگتے انسان پیدا کر دیئے۔ پھر مرنے کے بعد یہی انسانی جسم مٹی میں تحلیل ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس بات پر پوری قدرت رکھتے ہیں کہ انہیں بے جان مادوں سے انسان کو نئے سرے سے پیدا کر دے۔

(٣) ❁ صفاتِ الٰہی سے اخروی زندگی پر دلائل:۔ تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ اگر اسے ایسی قدرت حاصل نہ ہوگی تو وہ ہرگز ایسے کام نہیں کر سکتا تھا۔ پھر ان کاموں میں اس کی حکمت کو بھی خاصا دخل ہے۔ مثلاً اس نے اگر نطفہ کے جراثیم میں انسان بننے کی استعداد رکھی ہے تو اس کے ساتھ ہی ساتھ پیدا ہونے والے بچہ میں اپنے والدین کی شکل، عقل اور قوت جسمانی کا بھی عکس موجود ہوتا ہے۔ اور ان باتوں میں نومولود کی اپنے والدین سے کافی حد تک مشابہت بھی پائی جاتی ہے۔ گویا مادہ کے علاوہ والدین کی پوشیدہ قوتیں بھی جنین میں منتقل ہو جاتی ہیں اور ان کا ظہور بچہ کے بالغ ہونے پر ہوتا ہے۔

(٤) اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کائنات میں بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو قوتِ ارادہ و اختیار اور قوت تمیز و عقل اس لئے عطا کی ہے کہ آیا وہ اس کائنات میں اللہ کا فرمانبردار بندہ بن کر رہتا ہے یا نافرمان اور باغی بن کر زندگی گزارتا ہے۔ انسان کی اپنی یہ حالت ہے کہ جب وہ کسی کو کوئی ذمہ داری سونپتا ہے یا اجرت پر کوئی مزدور یا غلام رکھتا ہے تو اس کا محاسبہ بھی کرتا ہے لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات کا بھی محاسبہ نہ کریں کہ کون شخص اس کا حکم بجا لاتا ہے اور کون اس کی حکم عدولی کرتا ہے۔ اسی محاسبہ کے لئے اخروی زندگی کا قیام ضروری ہے اور یہی عقل و حکمت اور عدل کا تقاضا ہے اور دنیا کی مختصر سی زندگی چونکہ اعمال کی جزا و سزا کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ لہٰذا اس لحاظ سے بھی قیامت اور روزِ جزا کا قیام ضروری ہے۔

[٨] ❁ بدیہی علم کیا چیز ہے؟ اس آیت میں علم کے لفظ کا اطلاق شرعی زبان میں عموماً وحی الٰہی پر ہوتا ہے مگر یہاں علم سے

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿٩﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿١٠﴾ ع ۱/۸

میں رسوائی ہے اور قیامت کے دن ہم اس کو جلا دینے والے عذاب کا مزا چکھائیں گے۔(۹) (اور کہیں گے) یہ تیرے اپنے ہی اعمال کا بدلہ ہے جو تو نے آگے بھیجے تھے ورنہ [9] اللہ اپنے بندوں پر کبھی ظلم نہیں کرتا۔(۱۰)

مراد فطری یا پیدائشی یا بدیہی علم ہے جو ہر انسان کو حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ہر جاندار کو اپنی زندگی کے بقاء کے لئے کھانے پینے کی ضرورت ہوتی ہے یا یہ کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ یا یہ کہ کل ہمیشہ اپنے جزء سے بڑا ہوتا ہے یا یہ کہ آگ میں جو چیز ڈالی جائے، آگ اسے جلا دیتی ہے یہ ایسے امور ہیں جن کے لئے کسی عقلی یا نقلی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نہ ہی کوئی شخص ایسے امور کے لئے دلیل کا مطالبہ کرتا ہے اور ھدی سے مراد عقلی دلیل ہے۔ مثلاً اسی کائنات کا مربوط نظام اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کو پیدا کرنے والی اور اسے کنٹرول میں رکھنے والی کوئی مقتدر علیم اور خبیر ہستی ہو۔ یا یہ کہ ہر چیز کا کوئی بنانے والا ہونا ضروری ہے۔ یا یہ کہ اگر کہیں راستہ میں اونٹ کی مینگنی پڑی ہوتی ہے تو وہ اس بات پر عقلی دلیل ہوتی ہے کہ یہاں سے کوئی اونٹ گزرا ہے اور کتاب منیر سے مراد کوئی نقلی یا سمعی دلیل ہے۔ یعنی ایسی دلیل جو کسی الہامی کتاب میں مذکور ہو۔ مثلاً یہ کہ اس کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور اس کے تصرف و اختیار میں یا اس کی ذات و صفات میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں اور قرآن کریم و احادیث ایسے سمعی یا نقلی دلائل سے بھرے پڑے ہیں۔

❁ **علم ہدایت اور کتاب کے بغیر اللہ کے بارے میں جھگڑا:** اب جو لوگ اللہ کی ذات یا اس کے اختیارات و تصرفات یا اس کی دوسری صفات کے بارے میں بحث یا کج بحثی یا جھگڑے کرتے ہیں۔ ان کے پاس نہ تو کوئی بدیہی یا تجرباتی دلیل (علم) ہوتا ہے۔ نہ کوئی عقلی دلیل (ھدی) ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی سمعی، نقلی (کتاب منیر) دلیل ہوتی ہے۔ ان کی بحث فقط برائے بحث یا کج بحثی ہوتی ہے۔ ان کے پاس یہ بات کہنے کے سوا کوئی جواب نہیں ہوتا کہ چونکہ ہمارے آباء و اجداد ایسا کرتے آئے ہیں۔ لہٰذا ہم بھی ایسا کرتے ہیں یا کرتے رہیں گے اور ظاہر ہے کہ یہ دلیل کوئی قسم نہیں اور اس جواب کا ماحصل یہی ہے کہ اگر بزرگوں نے گمراہی کی راہ اختیار کی تھی تو ان کی یہ گمراہی نسلاً بعد نسل ان کی اولاد در اولاد میں منتقل ہوتی چلی جائے۔ ان لوگوں کا اس جھگڑے سے اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو بھی ایمان و یقین کی راہ سے دور رکھیں اور اپنی طرح ان کو بھی گمراہ کر کے چھوڑیں۔ ایسے بغض و عناد رکھنے والوں کو اللہ تعالیٰ اس دنیا میں ذلیل اور رسوا کرے گا اور اخروی عذاب تو بہر حال اس سے شدید تر ہوگا۔

[9] ایسا شخص دراصل تین جرائم کا مرتکب ہوتا ہے ایک تو اس نے جہالت، تعصب اور ہٹ دھرمی کی بنا پر وحی الٰہی کا انکار کیا۔ جبکہ اس کے پاس نہ کوئی تجرباتی دلیل تھی، نہ عقلی اور نہ نقلی۔ دوسرے تکبر اور پندارِ نفس کا مظاہرہ کیا اور تیسرے اور لوگوں کو بھی راہ حق سے دور رکھنے کا سبب بنا۔ لہٰذا اس عذاب شدید سے پیشتر واضح طور پر بتا دیا جائے گا کہ یہ تمہارے اپنے ہی بھیجے ہوئے اعمال کا بدلہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کسی کو خواہ مخواہ عذاب دینے کا شوق نہیں رکھتے اور نہ ہی کسی پر ظلم کرنا اللہ کے شایان شان ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ⑪ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ⑫ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۭ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ⑬ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو کنارے پر (کھڑا ہو کر) اللہ کی عبادت کرتا[۱۰] ہے۔ اگر اسے کچھ فائدہ ہو تو (اسلام سے) مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر کوئی مصیبت پڑ جائے تو الٹا پھر جاتا ہے۔ ایسے شخص نے دنیا کا بھی نقصان اٹھایا اور آخرت کا بھی۔ یہ ہے صریح خسارہ۔(۱۱) وہ اللہ کے سوا اسے پکارتا ہے جو نہ اسے تکلیف پہنچا سکتا ہے اور نہ فائدہ دے سکتا ہے۔ یہ ہے گمراہی کی انتہا۔(۱۲) وہ اس کو پکارتا ہے جس کا نقصان[۱۱] اس کے نفع سے زیادہ قریب تر ہے۔ بہت برا ہے اس کا مددگار اور بہت برا ہے[۱۲] اس کا رفیق۔(۱۳) جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے یقیناً اللہ انہیں ایسے

[۱۰] منافق دنیا اور آخرت دونوں جگہ بڑے خسارے میں رہتے ہیں:۔ یعنی کفر اور اسلام کی سرحد پر ہی کھڑا رہتا ہے۔ اسلام میں داخل ہوتا ہی نہیں اور اس انتظار میں وہاں کھڑا ہے کہ اگر اسلام لانے سے کوئی مادی فائدہ پہنچنے کی توقع ہے تو پھر تو اسے اسلام گوارا ہے لیکن اگر اسلام میں داخل نہ ہونے میں کوئی مشکل یا مادی نقصان نظر آ رہا ہو تو اس سرحد سے فوراً کفر کی طرف نکل بھاگے۔ جیسا کہ عموماً منافقوں کا حال ہوتا ہے۔ گویا ایسے لوگوں کا مطمح نظر صرف مادی فوائد ہوتے ہیں۔ وہ جس طرف نظر آئیں ادھر ہی لڑھک جاتے ہیں۔ ایسے لوگ دینی اور دنیوی دونوں لحاظ سے خسارہ میں رہتے ہیں۔ دینی نقصان تو واضح ہے کہ ایسے لوگ جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں داخل کیے جائیں گے اور دنیوی نقصان یہ ہوتا ہے کہ نہ کافر انہیں اپنا ہمدرد اور ساتھی سمجھتے ہیں اور نہ مسلمان، دونوں طرف سے ان کی ساکھ تباہ ہو جاتی ہے اور بمصداق "دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا" انہیں کبھی بھی پذیرائی اور عزت نصیب نہیں ہوتی۔

[۱۱] یعنی اس قسم کے منافقین کو جب اسلام میں داخل ہونے میں کوئی مشکل یا مصیبت نظر آتی ہے، کافروں اور مشرکوں کی طرف جانے میں کوئی مادی فائدہ نظر آتا ہے تو فوراً اس کنارے سے اتر کر مشرکوں کی صف میں جا شامل ہوتے ہیں اور ایسے بتوں یا آستانوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جن کے اختیار میں دوسروں کا نفع و نقصان تو کیا ہو گا وہ اپنی بھی مدافعت نہیں کر سکتے۔ ایسے لوگوں کا نقصان تو یقینی ہے کہ انہوں نے دنیوی مفاد کی خاطر اپنا ایمان ضائع کر دیا اور جس دنیوی فائدہ کی خاطر انہوں نے یہ گمراہی کی راہ اختیار کی وہ فائدہ غیر یقینی ہے کبھی وہ توقع پوری ہو بھی جاتی ہے اگر اللہ کو منظور ہو تو بسا اوقات جس فائدہ کی خاطر اپنا ایمان بھی بھینٹ چڑھایا تھا وہ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

[۱۲] اس جملہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جس نے بھی اسے راستے پر ڈالا خواہ وہ کوئی انسان تھا یا شیطان وہ اس کا بدترین کارساز اور برا ساتھی ثابت ہوا اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن مشرک اور بت پرست اپنے معبودوں کو بھی جہنم میں پڑے دیکھ کر یہ جملہ کہیں گے کہ جن سے ہم نے کئی قسم کی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں یہ تو بہت برے کارساز اور

جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ⑭ مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَاۗءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ

باغات میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہہ رہی ہیں۔ بلاشبہ اللہ جو چاہے [۱۳] وہی کرتا ہے۔(۱۴) جو شخص یہ خیال کرتا ہو کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی مدد نہیں کرے گا [۱۴] (اور دوسروں کی طرف رجوع کرے) اسے چاہئے کہ آسمان تک ایک رسی لٹکائے پھر اسے کاٹ ڈالے اور دیکھے کہ کیا اس کی یہ تدبیر اس چیز کو

برے ساتھی ثابت ہوئے جو جہنم کا ایندھن بن کر ہماری تکلیف میں مزید اضافہ کا باعث بن گئے ہیں۔

[۱۳] یعنی اللہ تعالیٰ کے اختیارات لامحدود ہیں۔ وہ چاہیں تو ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو ان کے اعمال کے مقابلہ میں سینکڑوں گنا زیادہ معاوضہ اور بدلہ دیں۔ چاہے تو ان کی سب چھوٹی موٹی خطائیں معاف کر دیں۔ البتہ ایک بات اس سے مستبعد ہے وہ یہ ہے کہ وہ بندوں پر کسی بھی طرح کا ظلم نہیں کرتے۔ اس سلسلہ میں وہ اپنے اختیارات کو استعمال نہیں کرتے بلکہ عدل کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہیں۔

[۱۴] اس آیت میں ایسا خیال کرنے والے سے مراد وہی منافق ہے جو کفر اور اسلام کی سرحد پر کھڑے ہو کر اللہ کی عبادت کرتا ہے مگر اللہ کی رضا پر راضی اور شاکر نہیں رہتا۔ اور جب اسے کفر و شرک کی صف میں شامل ہونے میں کوئی مفاد نظر آتا ہے تو فوراً ادھر لڑھک آتا ہے اور انہیں حقیر دنیوی مفادات کی خاطر اللہ کو چھوڑ کر دوسرے آستانوں پر جاتا اور در در کی خاک چھانتا ہے۔ مگر پھر بھی اسے وہ مفادات حاصل نہیں ہوتے تو الٹا اللہ اور اس کی تقدیر کو کوسنے لگتا ہے۔ اسے چاہئے کہ وہ اللہ کی تقدیر کو بدلنے کی خاطر اپنی مقدور بھر کوشش کر کے دیکھے اور جو کچھ وہ کر سکتا ہے کر دیکھے اور بتائے کہ کیا ایسے کرنے سے وہ اللہ کی تقدیر کو بدلنے میں کامیاب ہو سکا ہے؟ اس آیت میں جو آسمان کی طرف رسی تانے اور پھر اسے قطع کرنے کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ بطور محاورہ ہیں ان سے لفظی معنی مراد نہیں ہیں۔ اور ایسے الفاظ تقریباً ہر زبان میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً اردو میں اس محاورہ کے قریب المعنی الفاظ یہ ہیں "بے شک وہ الٹا سیدھا ہو کر دیکھ لے" اور پنجابی میں ایسا محاورہ بالکل صحیح مفہوم ادا کرتا ہے اور وہ محاورہ ہے "تتے توے تے گھیسی پیا کرے" یعنی خواہ وہ گرم گرم توے پر اپنی مقعد رگڑے۔ ان سب محاوروں کا مفہوم ایک ہی جیسا ہے کہ وہ اپنی مقدور بھر کوشش کر کے دیکھ لے۔

❁ تقدیر کے مقابلہ میں تدبیر کسی کام نہیں آسکتی:۔ اس آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین نے ﴿لَنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ﴾ سے "ہ" سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مراد ہے اور مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے دنیوی اور اخروی فتح و نصرت کے جو وعدے کر چکے ہیں وہ ضرور پورے ہو کر رہیں گے خواہ کفار و مشرکین کو یہ بات کتنی ہی ناگوار اور غصہ دلانے والی ہو۔ اور وہ اس نصرتِ ربانی کو روکنے کے لئے اپنی انتہائی کوششیں صرف کر کے دیکھ لیں حتیٰ کہ آسمان میں ایک رسی تان کر اوپر چڑھیں اور وہاں سے وحی الٰہی اور آسمانی امداد کو منقطع کر آئیں۔ پھر دیکھیں کہ ان کی ایسی تدبیروں سے وہ وحی الٰہی اور نصرتِ ربانی آنا بند ہو جاتی ہے جس پر وہ اس قدر پیچ و تاب کھا رہے ہیں۔

يُذْهِبَنَّ كَيْدُهُ مَا يَغِيظُ ﴿١٥﴾ وَكَذَٰلِكَ أَنزَلْنَاهُ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَأَنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يُرِيدُ ﴿١٦﴾ إِنَّ

دفع کر سکتی ہے جو اسے غصہ دلاتی ہے؟ (خواہ وہ کتنی ہی کوشش کرے تقدیر کے فیصلے کو بدل نہیں سکتا) (۱۵) اسی طرح کی واضح آیات سے ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور اللہ یقیناً ہدایت اسے ہی[۱۵] دیتا ہے جسے وہ چاہتا ہے۔ (۱۶) جو لوگ ایمان لائے[۱۶] اور جو یہودی ہوئے[۱۷] اور صابی[۱۸] اور

یہ تفسیر کسی حد تک دل لگتی تو ہے مگر اس مقام پر سیاق و سباق اس تفسیر کا ساتھ نہیں دیتے۔ اس سے پہلے بھی منافقوں اور مشرکوں کا ذکر چل رہا ہے اور بعد میں بھی کافروں اور مشرکوں ہی کا ذکر ہے۔ اور درمیان میں جو مومنوں کی بشارت سے متعلق کوئی آیت آجاتی ہے تو وہ اللہ کی اس سنت کے مطابق ہے کہ جہاں کافروں اور مشرکوں کو ڈرایا جارہا ہو وہاں مومنوں کی بشارت کا بھی ذکر آجائے اور اس کے برعکس بھی۔

[۱۵] یعنی اگرچہ قرآن میں ایسے بے شمار واضح دلائل موجود ہیں پھر بھی ان دلائل سے ہر شخص کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی بلکہ اسے ہی نصیب ہوتی ہے جس کے متعلق اللہ کی مشیت ہو۔ مشیت الٰہی صرف انہیں نصیب ہوتی ہے جو خود ہی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ ضدی، ہٹ دھرم، متکبر اور نافرمان قسم کے لوگوں کو نہ اللہ کی مشیت نصیب ہوتی ہے اور نہ ہی اللہ کا یہ قانون ہے کہ وہ جبراً کسی کو ہدایت دیں۔

[۱۶] یعنی کسی بھی اللہ کے رسول پر ایمان لائے۔ کیونکہ تمام انبیاء و رسل کے اصول دین ایک ہی رہے ہیں۔ (تفصیل کے لئے اسی سورہ کی آیت نمبر ۹۲، ۹۳ کے حواشی ملاحظہ فرمالیجئے) اس لحاظ سے ہر نبی پر ایمان لانے والے مسلمان ہوئے اور اسلام اور ایمان کا صرف یہ فرق ہے کہ اسلام کا تعلق ظاہری اعمال سے ہوتا ہے اور ایمان کا دل سے۔ اللہ اور اس کے رسول کی جس قدر اطاعت کی جائے، ایمان اتنا ہی پختہ ہوتا جاتا ہے اور جتنا ایمان پختہ ہوتا جاتا ہے اطاعت کی مزید توفیق نصیب ہوتی رہتی ہے۔ گویا اسلام اور ایمان دونوں ایک دوسرے سے مربوط اور ایک دوسرے کے ممد و معاون ہوتے ہیں۔

[۱۷] ۞ بنی اسرائیل میں سے کونسا فرقہ یہودی کہلایا ہے:۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر جو لوگ ایمان لائے تھے وہ بھی مسلمان ہی تھے اور بنی اسرائیل کی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں انہیں یہود نہیں کہا جاتا تھا۔ یہود تو وہ اس وقت کہلائے جب ان کے مذہب میں بھی ان کے بدعی عقائد شامل ہوگئے اور انہوں نے کتاب اللہ میں تحریف کر ڈالی۔ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق ان کی نسبت یعقوب علیہ السلام کے بڑے بیٹے یہودا کی طرف ہے۔ مگر یہ توجیہ دو لحاظ سے درست معلوم نہیں ہوتی ایک یہ کہ اس لحاظ سے یہودی ایک قبیلہ تو کہلا سکتے ہیں ایک مذہب نہیں کہلا سکتے ہیں۔ حالانکہ یہودی ایک مذہب کا نام ہے کسی قبیلہ کا نام نہیں اور دوسرے اس لحاظ سے یہودیوں میں تمام بنی اسرائیل شامل ہیں صرف یہودا کی اولاد کی اولاد نہیں۔ اور بعض علماء کے خیال کے مطابق بنی اسرائیل سیدنا عیسیٰ علیہ السلام تک بنی اسرائیل ہی کہلائے تھے۔ بعد میں نصاریٰ کے مقابلہ میں ان کا نام یہودی پڑ گیا۔

[۱۸] ۞ صابی کون ہیں؟ صابی دراصل وہ ستارہ پرست اور سورج پرست قوم ہے جس نے اپنے معبودوں کی حمایت میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا تھا۔ یہ لوگ اپنے آپ کو سیدنا نوح کا پیروکار بتاتے ہیں اور باقی بعد میں آنے والے سب انبیاء کے

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي

عیسائی[۱۹] اور آتش پرست[۲۰] اور جو مشرک ہیں[۲۱]، اللہ تعالیٰ ان سب کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ[۲۲] کردے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر شاہد ہے۔(۱۷) کیا تم دیکھتے نہیں کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین

منکر ہیں۔ بعد میں صبأ کا لفظ دین میں تبدیل کرنے یا آبائی مذہب سے روگردانی کرنے کے معنوں میں استعمال ہونے لگا اور ایک گالی کی حیثیت اختیار کر گیا۔ چنانچہ مشرکین مکہ بھی اسلام لانے والوں کو اسی لقب سے نوازتے تھے اور کہتے تھے کہ فلاں شخص صابی ہو گیا ہے۔ یعنی بے دین اور لامذہب ہو گیا ہے۔ جیسا کہ ہندوستان میں توحید کی طرف رجوع کرنے والوں کو وہابی کے لقب سے نوازا جانے لگا ہے۔

[۱۹] **عیسائیوں کے مختلف نام:۔** سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور ان پر نازل شدہ کتاب انجیل کے پیروکار۔ ابتداءً ان کا نام ناصری یا گلیلی تھا۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ناصرہ ضلع گلیل میں پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ یہود انہیں ایک بدعتی فرقہ کی حیثیت سے ناصری یا گلیلی کہہ کر پکارتے تھے۔ قرآن میں ان کا نام نصاریٰ مذکور ہے۔ اور اسے بھی ناصرہ سے منسوب قرار دیا جا سکتا ہے اور اس کی دوسری توجیہ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاریا حواریوں نے ﴿نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ (۳: ۵۲) کا اقرار کیا تھا۔ لہٰذا یہ لوگ نصاریٰ کہلائے۔ بعد میں انہوں نے اپنے لئے عیسائی کا لقب پسند کر لیا ان لوگوں نے بھی بعد میں بہت سے بدعی عقائد شامل کر لئے جیسے عقیدہ تثلیث، الوہیت مسیح اور کفارہ مسیح وغیرہ۔

[۲۰] **مجوس کا تعارف:۔** مجوسی بھی آتش پرست اور ستارہ پرست لوگ تھے اور صابی فرقہ کی طرح اپنے آپ کو سیدنا نوح کے پیروکار بتاتے ہیں اور باقی پیغمبروں کے منکر ہیں۔ ان کے نزدیک نیکی اور بدی کے خدا الگ الگ ہیں۔ نیکی کا خدا یا خالق یزدان ہے اور بدی کا خدا یا خالق اہرمن ہے۔ یہ لوگ اپنی الہامی کتابوں کا نام ژند اور اوستا بتاتے ہیں۔ مزدک نے ان کے مذہب اور اخلاق کو بری طرح مسخ کر کے رکھ دیا تھا حتیٰ کہ حقیقی بہن سے نکاح بھی ان کے ہاں جائز قرار دیا گیا۔

[۲۱] مشرک سے مراد مشرکین مکہ اور دوسرے ممالک کے مشرکین ہیں۔ جو مندرجہ بالا گروہوں کے ناموں میں سے کسی نام سے منسوب نہیں۔ اگرچہ موحد مسلمانوں کے سوا مندرجہ بالا سب مذاہب میں شرک کی کوئی نہ کوئی قسم ضرور پائی جاتی ہے۔

[۲۲] اس کا یہ مطلب نہیں کہ قیامت سے پہلے ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ اختلاف کہاں واقع ہوا ہے اور کون سا فرقہ کس قدر حق پر ہے۔ کیونکہ اصول دین ہمیشہ ایک ہی رہے ہیں اور تمام الہامی کتابوں میں مذکور ہیں اگرچہ تورات اور انجیل یا بائبل میں تحریف ہو چکی ہے۔ پھر بھی ان میں اصول دین کا سراغ لگایا جا سکتا ہے اور یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ فلاں فرقہ کا فلاں عقیدہ درست ہے اور فلاں باطل ہے۔ مگر یہاں اس دنیا میں کوئی بھی فرقہ مذہبی تعصب کی بنا پر حق کو تسلیم کر لینے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا قیامت کے دن خود اللہ تعالیٰ نہ صرف یہ کہ ان باتوں کا فیصلہ کر دے گا بلکہ اس فیصلہ کا نفاذ بھی کر دے گا۔

السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ
مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ
مَا يَشَآءُ ۩ ۞ السجدۃ ۱۸ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۫ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ

میں ہے اور سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، چوپائے اور لوگوں کی ایک کثیر تعداد اللہ کے حضور [۲۳] سر بسجود ہے اور بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں۔ اور جسے اللہ ذلیل وخوار [۲۴] کرے اسے کوئی عزت دینے والا نہیں اور اللہ وہی کچھ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے [۲۵]۔ (۱۸)

یہ دو فریق ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کے بارے میں [۲۶] جھگڑا کیا۔ ان میں سے جنہوں نے کفر کیا ان کے

[۲۳] کائنات کی ہر چیز کے سجدہ ریز ہونے کا مطلب:۔ ساری کائنات میں انسان اور جن ہی مکلف مخلوق ہیں اور انہیں کو قوتِ ارادہ واختیار دیا گیا ہے باقی مخلوق تکوینی طور پر اللہ کے حضور ہر وقت سجدہ ریز رہتی ہے اور ان کے سجدہ کا مطلب یہ ہے کہ جس کام پر اللہ نے انہیں لگا دیا ہے یا جو خدمت ان کے ذمہ کر دی ہے اور جو قوانین ان کے لئے مقرر کر دیئے ہیں ان سے وہ سرِ مو تجاوز نہیں کرتے اور انسانوں میں سے بھی ایک کثیر طبقہ ایسا ہے جس نے اپنے ارادہ کو اللہ کی مرضی کے تابع بنا دیا ہے اور برضا ورغبت اللہ کی فرمانبرداری کرتے ہیں اور اس کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ تاہم انسانوں کا ایک کثیر طبقہ ایسا بھی ہے جس نے اس اختیار کا غلط استعمال کیا اور باقی تمام مخلوق کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی بجائے اللہ کے احکام کے مقابلہ میں سرکشی کی راہ اختیار کی۔ اور اس امتحان میں ناکام رہا جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تھا۔ ایسے لوگوں کو یقیناً اس سرکشی کی سزا عذابِ الیم کی صورت میں بھگتنا پڑے گی۔

[۲۴] یعنی اللہ کے احکام سے روگردانی اور اس کے حضور سجدہ سے سرکشی کا لازمی نتیجہ ذلت اور رسوائی ہے۔ اور اللہ کے نافرمانوں کو بسا اوقات دنیا میں ہی یہ برا نتیجہ دیکھنا پڑتا ہے اور اگر دنیا میں بچ بھی جائے تو آخرت میں اسے ضرور اس نتیجہ سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اور کوئی طاقت اسے اس سزا سے بچا نہ سکے گی۔

[۲۵] اس سورہ حج میں دو سجدہ تلاوت ہیں۔ آیت نمبر ۱۸ پر پہلا سجدہ ہے اور یہی سجدہ متفق علیہ ہے۔ جو ہر پڑھنے والے اور سننے والے کو ادا کرنا چاہئے تاکہ وہ بھی کائنات کی جملہ اشیاء کے ساتھ سجدہ میں ان کے ہم آہنگ اور شریک ہو جائے۔

[۲۶] یعنی جھگڑنے اور لڑائی کرنے والے دو فریقوں میں سے ایک فریق تو اللہ کے فرمانبرداروں اور مسلمانوں کا ہے اور دوسرا کافروں کا۔ اور اس کافروں کے فریق میں وہ سب گروہ شامل ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا یعنی یہودی، صابی، عیسائی، مجوس، مشرکین اور ان کے علاوہ وہ لوگ بھی جن کا اس آیت میں ذکر نہیں ہے جیسے ہندو، سکھ، بدھ مت، اللہ کی ہستی کے منکر یعنی نیچری اور دہریے وغیرہ سب اس دوسرے فریق میں شامل ہیں۔ ان دونوں فریقوں میں باعث نزاع مسئلہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات ہیں۔ فریق اول تو اللہ کی صفات بالکل اسی طرح تسلیم کرتا ہے جس طرح اللہ نے خود بیان فرمائی ہیں۔ پھر وہ اللہ کا فرمانبردار اور اس کے حضور سجدہ ریز بھی رہتا ہے۔ دوسرے فریق میں ہر طرح کے لوگ شامل ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی یہ فریق اول کے

مقابلہ میں گٹھ جوڑ بھی کر لیتے ہیں۔ پھر یہ فریق صرف بحث و مناظرہ میں ہی ایک دوسرے کے مدمقابل نہیں بنتے بلکہ میدان جہاد و قتال میں بھی ان کی یہی صورت ہوتی ہے اور سیدنا علی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ آیت اتری ہی ان لوگوں کے حق میں تھی جو غزوۂ بدر میں مقابلہ کے فریق بنے تھے۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہوتا ہے۔

قیس بن عباد کہتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "قیامت کے دن میں سب سے پہلے پروردگار کے سامنے دوزانو بیٹھ کر اپنا مقدمہ پیش کروں گا" قیس کہتے ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کے سلسلہ میں اتری۔ جو بدر کے دن مبارزت کے لئے نکلے تھے۔ یعنی (مسلمانوں کی طرف سے) علی رضی اللہ عنہ، حمزہ رضی اللہ عنہ اور عبیدہ رضی اللہ عنہ بن حارث اور (کافروں کی طرف سے) شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ، اور ولید بن عتبہ۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

۞ بدر میں دعوتِ مبارزت:۔ اس حدیث میں میدانِ بدر میں مبارزت کا اجمالی ساذکر ہوا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب لشکر کفار کو اس بات کا علم ہو گیا کہ تجارتی قافلہ بخیریت مکہ پہنچ گیا ہے تو سرداران قریش میں سے ایک سنجیدہ طبقہ کی رائے یہ تھی کہ اب جنگ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ جس مقصد کے لئے ہم نکلے تھے وہ حاصل ہو چکا۔ عتبہ بن ربیعہ اور حکیم بن حزام ایسے لوگوں میں سے تھے۔ اس جنگ کا ایک سبب ایک حضرمی کا قتل بھی تھا۔ جو وادیٔ نخلہ کے واقعہ میں مسلمانوں سے قتل ہو گیا تھا۔ حکیم بن حزام، عتبہ بن ربیعہ کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے۔ اگر تم چاہو تو لوگوں کو جنگ اور خونریزی سے بچا کر بہت بڑی نیکی کما سکتے ہو۔ عتبہ نے پوچھا وہ کیا تجویز ہے؟ حکیم بن حزام (جو بعد میں اسلام لے آئے تھے اور جلیل القدر صحابی ہیں) نے کہا کہ اس حضرمی کی دیت تم خود ادا کر دو۔ تو قصاص کا اضطراب جو لوگوں میں پھیلا ہوا ہے۔ از خود ختم ہو جائے گا۔ عتبہ نے اس تجویز کو بخوشی قبول کر لیا۔ پھر یہ دونوں حضرات جنگ بندی کے سلسلہ میں ابو جہل کے پاس گئے جو ایک متکبر، سرکش اور مشتعل مزاج سردار تھا۔ اسے یہ رائے قطعاً پسند نہ آئی۔ اس نے عتبہ کو کہا کہ تم اس لئے جنگ سے فرار چاہتے ہو کہ تمہارا ایک بیٹا مسلمان ہو چکا ہے اور تم اب بزدلی دکھا رہے ہو؟ عتبہ یہ بزدلی کا طعنہ برداشت نہ کر سکا اور کہنے لگا کہ کل معلوم ہو جائے گا کہ بزدل کون ہے؟ دوسری طرف ابو جہل نے حضرمی کے قبیلہ کو مشتعل کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لشکر کفار میں جنگ کی عمومی فضا پیدا ہو گئی اور جنگ نہ ہونے کا امکان ختم ہو گیا۔

دوسرے دن جب دونوں لشکر مقابلہ پر آ گئے تو یہی عتبہ بن ربیعہ اپنے بھائی شیبہ بن ربیعہ اور بیٹے ولید بن عتبہ کو لے کر نکلا اور ھل من مبارز (کوئی مقابلہ کے لئے سامنے آتا ہے؟) کا نعرہ لگایا۔ مسلمانوں کے لشکر سے تین انصاری صحابہ مقابلہ کے لئے نکلے تو عتبہ نے چیخ کر پوچھا من انتم؟ من القوم؟ (یعنی تم کون لوگ اور کس قوم سے ہو؟) انہوں نے اپنے نام بتائے تو عتبہ نے کہا: تم ہمارے جوڑ کے نہیں ہو ہم تم سے لڑنے نہیں آئے۔ پھر چیخ کر پکارا: محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہماری توہین نہ کرو۔ ہم ان کاشت کاروں سے لڑنے نہیں آئے۔ ہمارے مقابلہ میں ان لوگوں کو بھیجو جو ہمارے ہمسر اور ہمارے جوڑ کے ہوں۔ اور ایک روایت میں آیا کہ اس موقع پر عتبہ کے مسلمان بیٹے ابو حذیفہ نے اپنے باپ کے مقابلہ پر نکلنا چاہا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں روک دیا۔ پھر سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ، سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبیدہ رضی اللہ عنہ بن حارث مقابلہ کے لئے نکلے۔ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ نے عتبہ کو جلد ہی ٹھکانے لگا دیا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے شیبہ کو جہنم واصل کیا۔ لیکن سیدنا ابو عبیدہ بن حارث کا ولید بن عتبہ سے سخت مقابلہ ہوا۔ دونوں کا بیک وقت ایک دوسرے پر کاری وار ہوا۔ سیدنا ابو عبیدہ کی ٹانگیں کٹ گئیں اور وہ

مِّنْ نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿١٩﴾ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ﴿٢٠﴾ وَلَهُمْ

مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿٢١﴾ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۗ وَذُوْقُوْا

عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿٢٢﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۭ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا

لئے آگ کے کپڑے کاٹے جائیں[۲۷] گے اور ان کے سروں پر اوپر سے کھولتا پانی ڈالا جائے گا۔(۱۹) جس سے ان کی کھالیں گل جائیں گی اور وہ کچھ بھی جو ان کے بطنوں میں ہے۔(۲۰) نیز ان کے لئے لوہے کے ہنٹر ہوں گے۔(۲۱) جب بھی وہ رنج کے مارے دوزخ سے نکلنا چاہیں گے تو اسی میں لوٹا دیئے جائیں گے (اور انہیں کہا جائے گا کہ) چکھو اب جلانے والے عذاب کا مزا(۲۲) وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے اللہ تعالیٰ یقیناً انہیں ایسے باغات میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہہ رہی ہیں وہاں انہیں سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے آراستہ[۲۸] کیا

گر پڑے تو سیدنا حمزہؓ اور سیدنا علیؓ آگے بڑھے اور ولید کا کام تمام کر کے ابو عبیدہ کو، جو دم توڑ رہے تھے، اٹھا کر لے آئے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے چلو وہاں پہنچ کر انہوں نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ میرے متعلق کیا ارشاد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تمہیں یقیناً جنت ملے گی" اس اطلاع پر ان کے چہرے پر بشاشت آگئی اور کہا: کاش آج ابو طالب زندہ ہوتے تو وہ دیکھ لیتے کہ میں نے اپنی بات سچ کر دکھائی ہے اور اپنی جان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نچھاور کر دی ہے۔

[۲۷] اہل دوزخ کا لباس، طعام اور دوسری سزائیں:۔ یعنی فریق دوم کے لئے جنہوں نے کفر اور سرکشی کی راہ اختیار کی ان کے لباس بھی کسی آتش گیر مادہ سے بنے ہوئے ہوں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ﴾ (۱۴:۵۰) یہ لباس بھڑک کر ان کے جسموں سے چمٹ جائے گا اور سر کے اوپر سے کھولتا ہوا جو پانی ڈالا جائے گا وہ اس آگ کو بجھائے گا نہیں بلکہ آگ کو مزید بھڑکانے کا باعث بن جائے گا۔ اس سے ان کے چمڑے گل کر گر پڑیں گے تو فوراً نئی جلد پیدا کر دی جائے گی۔ تاکہ ان کے عذاب میں کمی واقع نہ ہو۔ پھر یہی کھولتا ہوا پانی ان کے دماغ کی راہ سے جسم کے اندر پہنچے گا جس سے سب انتڑیاں کٹ جائیں گی۔ مزید برآں انہیں لوہے کے ہنٹروں سے پیٹا بھی جائے گا جب وہ دوزخ سے نکل بھاگنے کی کوشش کریں گے تو فرشتے انہیں ہنٹر مار مار کر پھر دوزخ میں دھکیل دیں گے اور ساتھ ہی انہیں یہ بتاتے جائیں گے کہ یہ تمہارے ہی اعمال کا بدلہ ہے۔ اب بھاگتے کیوں ہو اور یہ دائمی عذاب کا مزا تمہیں چکھنا ہی پڑے گا۔

[۲۸] اہل جنت کا لباس اور دوسری نعمتیں:۔ عہد نبوی میں یہ رواج عام تھا کہ شاہانِ وقت اور بڑے بڑے رئیس لوگ سونے اور جواہرات کے مرصع زیور پہنتے تھے۔ حتیٰ کہ ہمارے زمانہ میں بھی ہندوستان کے مہاراجے اور نواب ایسے زیور اور ریشمی لباس پہنتے ہیں۔ یہاں یہ تصور دلانا مقصود ہے کہ اہل جنت کو وہاں ہر وہ راحت آرام اور عیش و عشرت حاصل ہو گی جس کا کوئی انسان تصور کر سکتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جنت کی نعمتوں کی حقیقت کو سمجھنا بھی اس وقت ناممکن ہے۔ جیسا کہ

حَرِيرٌ ﴿٢٣﴾ وَهُدُوا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوا إِلَىٰ صِرَاطِ الْحَمِيدِ ﴿٢٤﴾ إِنَّ الَّذِينَ
كَفَرُوا وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً

جائے گا اور وہاں ان کا لباس ریشم کا ہوگا۔(۲۳) (یہ وہ لوگ ہوں گے) جنہیں پاکیزہ کلمہ [۲۹] (توحید) کو قبول کرنے کی راہ دکھائی گئی تھی نیز انہیں ستودہ صفات (اللہ تعالیٰ) کی راہ کی ہدایت دی گئی تھی۔(۲۴) بلاشبہ جو لوگ کافر ہیں اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے اور مسجدِ حرام (کی زیارت) [۳۰] سے روکتے ہیں۔ وہ (مسجدِ حرام) جس میں ہم نے وہاں کے باشندوں اور باہر سے آنے والوں کے حقوق برابر رکھے ہیں [۳۱] اور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ "ایسی ہوں گی جنہیں نہ کسی آنکھ نے آج تک دیکھا، نہ کانوں نے سنا۔ حتیٰ کہ کسی کے دل میں ان کا خیال تک بھی نہیں آسکتا" (مسلم۔ کتاب الجنة و صفة نعيمها واهلها)

[۲۹] اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ ہے کہ اس آیت کو اس دنیا سے متعلق سمجھا جائے۔ اس صورت میں جو مطلب ہوگا وہ ترجمہ سے ہی واضح ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسے آخرت سے متعلق سمجھا جائے جیسا کہ پہلے اہلِ جنت کا ذکر چل رہا ہے۔ اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کی ایسے مقام کی طرف رہنمائی کی جائے گی جہاں فرشتے انہیں سلام کہیں گے۔ مبارک باد پیش کریں گے۔ وہاں کسی قسم کی بک بک اور جھک جھک نہ ہوگی اور یہ ایسی راہ ہوگی جہاں پہنچ کر اہل جنت ستودہ صفات اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا میں ہی ہمیشہ مشغول رہا کریں گے۔

[۳۰] ❁ مسلمانوں پر کعبہ میں داخلہ کی پابندیاں فتح مکہ تک قائم رہیں:۔ مراد کفار مکہ ہیں، جنہوں نے مسلمانوں پر یہ پابندیاں لگا رکھی تھیں کہ وہ نہ بیت اللہ میں نماز ادا کر سکتے ہیں۔ نہ طواف کر سکتے ہیں اور نہ حج و عمرہ کے ارکان بجالا سکتے ہیں۔ ایک تو وہ خود مشرک اور کافر تھے۔ کعبہ کو بھی بتوں کی نجاستوں سے بھر رکھا تھا۔ پھر مزید یہ کہ توحید پرستوں پر سب راہیں مسدود کر رکھی تھیں۔ چودہ سو مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں عمرہ کرنے آئے تو ان سے جنگ کی ٹھان لی۔ اور حدیبیہ کے مقام تک پہنچ کر ان کو عمرہ کرنے سے روک دیا گیا اور مسلمانوں پر یہ پابندیاں فتح مکہ تک بدستور جاری رہیں۔ فتح مکہ کے بعد جب کفر کا زور ٹوٹ گیا تو یہ پابندیاں از خود ہی ختم ہو گئیں۔ ایسے لوگوں کے متعلق ہی ارشاد ہوا ہے کہ آخرت میں انہیں دردناک عذاب کا مزا چکھنا ہوگا۔

[۳۱] یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے حقوق ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ مکہ اور باہر سے آنے والے لوگوں کو برابر کے حصہ دار قرار دیا ہے۔ اور آیا ان حقوق کا اور ان کی برابری کا تعلق صرف بیت الحرام یا کعبہ سے ہے یا پورے حرمِ مکہ سے۔

جہاں تک صرف بیت اللہ کا تعلق ہے اور اس میں نماز، طواف اور ارکانِ حج بجالانے کا تعلق ہے تو اس میں اہلِ مکہ اور بیرونی حضرات کے اس حق عبادت میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ اہل مکہ کو قطعاً یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ بیرونی حضرات کو حرم میں داخل ہونے، نمازیں ادا کرنے، طواف کرنے یا ارکان حج و عمرہ بجالانے سے روکیں۔ کیونکہ اس حق میں اہل مکہ اور بیرونی حضرات سب برابر کے حصہ دار ہیں۔ اختلاف اس بات میں ہے کہ آیا اس حق کا تعلق پورے حرم مکہ سے بھی ہے یا نہیں؟ یعنی

الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ۭ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٥﴾ وَاِذْ

جو کوئی ازراہِ ظلم مسجد حرام میں کجروی[۳۲] اختیار کرے گا (ایسے سب لوگوں کو) ہم دردناک عذاب چکھائیں گے۔(۲۵)

کیا پورے حرمِ مکہ کے دروازے باہر سے آنے والے حضرات کے لئے کھلے رہنے چاہئیں کہ وہ جب چاہیں حرم مکہ کے اندر جس جگہ چاہیں آکر ڈیرے ڈال دیں اور رہیں سہیں اور ان سے کوئی کرایہ وغیرہ بھی وصول نہ کیا جائے؟ اور اس اختلاف کی دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ ارکانِ حج میں سے بیشتر کا تعلق صرف بیت اللہ سے نہیں بلکہ حرمِ مکہ سے ہے۔ صفا، مروہ، منیٰ، مزدلفہ، عرفات، مشعر الحرام سب بیت اللہ کی حدود سے باہر ہیں جبکہ حرمِ مکہ میں داخل ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود بعض مقامات پر مسجدِ حرام کا ذکر کرکے اس سے حرمِ مکہ مراد لیا ہے۔ مثلاً ارشاد باری ہے:

❁ حرمِ مکہ میں بیرونی مسافروں کے حقوق:۔ ﴿ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ (۲:۱۹۶) "یعنی یہ رعایت اس شخص کے لئے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے رہنے والے نہ ہوں" اور یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی شخص مسجد حرام کے اندر رہائش پذیر نہیں ہوتا۔ یہاں لازماً مسجد حرام سے مراد حرمِ مکہ ہی ہو سکتا ہے۔

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (۲:۲۱۷) "اور مسجد حرام سے روکنا اور اس کے باشندوں کو وہاں سے نکالنا ماہ حرام میں جنگ کرنے سے بڑا گناہ ہے"

پھر اس سے اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا حرم میں زمین اور مکان کی خرید و فروخت اور اس سے آگے ان کی ملکیت و وراثت بھی جائز ہے یا نہیں۔ اور یہ بات تو احادیث سے ثابت ہے کہ اسلام سے پہلے مکہ کے مکانات اور زمینوں پر لوگوں کے حقوق ملکیت و وراثت اور حقوق بیع و اجارہ قائم تھے جو اسلام کے بعد بھی قائم رہے اور اسلام نے انہیں منسوخ نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد عقیل نے آپ ﷺ کے مکان پر قبضہ کر لیا۔ پھر اسے بیچ بھی دیا۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے دوران آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ آپ ﷺ کہاں قیام فرمائیں گے تو آپ ﷺ نے فرمایا: عقیل نے ہمارے لیے مکان چھوڑا کب ہے کہ اس میں رہیں (بخاری۔ کتاب المناسک۔ باب توریث دُور مکة و بیعها وشراء ها)

❁ حرمِ مکہ میں جائیداد کی خرید و فروخت کا جواز:۔ سیدنا عمرؓ کے زمانہ میں نافع بن عبدالحارث نے مکہ میں صفوان بن امیہ سے ایک گھر جیل خانہ بنانے کے لئے اس شرط پر خریدا کہ اگر سیدنا عمرؓ اس خریداری کو منظور کریں گے تو بیع پوری ہو گی۔ بصورتِ دیگر صفوان کو چار سو دینار کرایہ کے مل جائیں گے" (بخاری۔ کتاب فی الخصومات۔ باب الربط والحبس فی الحرم) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حرم میں مکانوں کی خرید و فروخت بھی جائز ہے اور کرایہ لینا بھی۔

ان سب امور کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مکہ اور منیٰ میں مکانوں کا کرایہ نہ لینا مستحب ہے۔ تاہم اس کے جواز سے انکار مشکل ہے۔ اور امام بخاری کا اپنا موقف یہ ہے کہ حرم مکہ میں مکانوں کی خرید و فروخت اور وراثت وغیرہ سب کچھ جائز ہے جیسا کہ عنوان باب توریث دُور مکة و بیعها وشراء ها" سے معلوم ہو رہا ہے۔

[۳۲] یعنی جو شخص جان بوجھ کر مکہ میں بے دینی یا شرارت کی کوئی بات کرے گا یا اس کے احترام کو ملحوظ نہ رکھے گا تو اس کو کسی

بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۲۶﴾ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ

اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے ابراہیم کے لئے بیت الحرام کی جگہ تجویز[۳۳] کی تھی (اور انہیں کہا تھا کہ) میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنانا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے صاف ستھرا[۳۴] رکھنا۔(۲۶) نیز یہ کہ لوگوں میں حج کا عام اعلان[۳۵] کردو کہ وہ تمہارے

دوسرے مقام پر یہی جرائم کرنے کی نسبت سے دوگنی سزا ملے گی۔ مکہ کی حرمت کے پیش نظر وہاں جو کام کرنے ممنوع ہیں وہ یہ ہیں۔

❁ حرم مکہ میں کون کون سے کام کرنا ممنوع ہیں؟:۔ حرم مکہ کو اللہ نے امن کی جگہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا وہاں:

۱۔ نہ فوج کشی جائز ہے نہ جدال و قتال حتیٰ کہ بلا ضرورت کوئی ہتھیار اٹھانا بھی ممنوع ہے۔ اگر کوئی مجرم بھی حرم میں پناہ لے لے تو جب تک حرم میں ہے اس سے تعرض نہ کیا جائے گا۔

۲۔ حرم مکہ کے جانور محفوظ و مامون ہیں۔ نہ ان کا شکار کیا جاسکتا ہے اور نہ انہیں شکار کے لئے ہانکا جاسکتا ہے۔ البتہ موذی جانوروں کو حرم میں بھی مارنے کی اجازت ہے۔

۳۔ حرم مکہ کے پودے درخت اور گھاس وغیرہ بھی محفوظ و مامون ہیں۔ البتہ بعض اقتصادی ضروریات کے پیش نظر اذخر گھاس کاٹنے کی اجازت دی گئی۔

۴۔ حرم مکہ سے کوئی گری پڑی چیز بھی اٹھانا روا نہیں۔ الا یہ کہ اٹھانے والا مالک کو پہنچانتا ہو اور وہ اسے پہنچادے۔

مندرجہ بالا امور میں بیشتر کام ایسے ہیں جو دوسرے مقامات پر کرنے جائز ہیں مگر حرم مکہ میں کعبہ کی حرمت کی وجہ سے کرنے جائز نہیں۔ پھر ایسے کام مثلاً الحاد، بے دینی اور شرارت کے کام جو دوسرے مقامات پر بھی ممنوع ہیں انہیں اگر حرم مکہ میں کیا جائے تو یہ جرم کتنا شدید ہو جائے گا؟ پھر اس نسبت سے اس کی سزا میں بھی اضافہ ہو گا۔

[۳۳] ❁ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے مکہ صرف توحید پرستوں کے لئے بنایا تھا:۔ سیدنا آدم علیہ السلام نے سب سے پہلے کعبہ کو تعمیر کیا تھا جس کے اب نشانات بھی زمین بوس ہو چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آندھی چلائی جس سے اوپر کی مٹی اور ریت اڑ کر دور چلی گئی اور کعبہ کی بنیادیں ننگی اور ظاہر ہو گئیں۔ انہی بنیادوں پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے اسمٰعیل کو ساتھ ملا کر کعبہ کی تعمیر شروع کی تھی۔ اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ اس گھر کی بنیادیں خالص توحید پر رکھو۔ کوئی شخص یہاں آکر اللہ کی عبادت کے سوا کوئی مشرکانہ رسوم بجا نہ لائے۔ لیکن مشرکین مکہ نے جو دین ابراہیمی کی پیروی کے مدعی تھے۔ اس ہدایت کی ایسی نافرمانی کی کہ وہاں تین سو ساٹھ بت لا کھڑے کئے بالآخر فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے اس گھر کو بتوں کی نجاست سے پاک فرمایا۔

[۳۴] ❁ مساجد کی صفائی سے مراد صرف ظاہری صفائی نہیں بلکہ شرک سے صفائی بھی ہے:۔ اللہ کے گھروں یعنی مساجد کو صاف ستھرا رکھنا اتنا افضل عمل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولوا العزم انبیاء کو خصوصاً اس کام کی ہدایت کی۔ صفائی سے مراد ظاہری صفائی بھی ہے اور احادیث میں اس کی بھی تاکید آئی ہے۔ لیکن اللہ کے گھروں کی اصل پاکیزگی اور صفائی یہی ہے کہ وہاں اللہ کے سوا کسی دوسرے کو نہ پکارا جائے اور نہ ہی وہاں اللہ کے بجائے اللہ کے پیاروں کا ذکر اذکار اور کرامات بیان کی جائیں۔

[۳۵] جب کعبہ کی تعمیر مکمل ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم کو حکم دیا کہ لوگوں میں اعلان عام کردو کہ وہ حج کے لئے یہاں

يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ﴿٢٧﴾ لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۖ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ

پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور چھریرے[۳۶] بدن کے اونٹوں پر سوار ہو کر آئیں۔(۲۷)

تاکہ لوگ وہ فائدے[۳۷] مشاہدہ کریں جو یہاں ان کے لئے رکھے گئے ہیں اور جو جانور ہم نے انہیں عطا کئے ہیں ان پر مقررہ دنوں میں اللہ کا نام لیں[۳۸] (ذبح کریں) پھر انہیں خود بھی کھائیں[۳۹] اور تنگ دست

آئیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کہنے لگے یہاں میری آواز کون سنے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم اعلان کر دو۔ آواز پہنچا دینا میرا کام ہے۔ چنانچہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ایک پہاڑ پر کھڑے ہو کر پکارا: لوگو! اللہ نے تم پر حج فرض کیا ہے۔ لہٰذا حج کو آؤ۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ آواز ہر اس شخص اور اس روح تک پہنچا دی جس کے لئے حج مقدر تھا اور اس کی روح نے اس اعلان پر لبیک کہا۔

[۳۶] ضامر کا لغوی مفہوم:۔ یہاں ضامر کا لفظ استعمال ہوا ہے اور ضامر وہ جانور ہے جو خوراک کی کمی کی وجہ سے نہیں بلکہ سدھانے اور مشق کی کثرت اور کسرت کی وجہ سے دبلا پتلا اور چھریرے بدن والا ہو جائے اور سبک رو، یا سبک خرام ہو تاکہ مقابلہ میں آگے نکل سکے۔ اور جو جانور بھوک کی کمی کی وجہ سے دبلا ہو اسے عجف کہتے ہیں۔ عرب میں ضامر کا لفظ عموماً اونٹ کے لئے مختص ہو گیا خواہ وہ نر ہو یا مادہ اور اونٹ کا نام بطور خاص اس لیے لیا گیا کہ اس زمانہ میں اور اس علاقہ میں اونٹ ہی آمد و رفت اور نقل و حرکت کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔

[۳۷] حج کے فوائد و برکات:۔ یہ فائدے صرف دینی ہی نہیں بلکہ اس اجتماع حج سے کئی قسم کے سیاسی، اقتصادی، معاشی اور تمدنی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ اور تمام مسلمانوں کو ایک مرکز وحدت میسر آتا ہے۔ یہ حج ہی کی برکت تھی کہ قریش مکہ کو جو بیت اللہ کے متولی تھے پورے عرب میں ایک امتیازی مقام حاصل تھا۔ اور یہ حج کی برکت تھی کہ لوٹ مار کے دور میں بھی کم از کم چار مہینے لوگ امن و امان سے سفر کر سکتے تھے۔ یہ حج ہی کی برکت تھی کہ مکہ ایک عالمی تجارتی منڈی بن گیا تھا۔ اس تجارت سے اگرچہ بیرونی حضرات بھی خاصا فائدہ اٹھاتے تھے تاہم سب سے زیادہ فائدہ اہل مکہ ہی کو پہنچتا تھا اور یہ حج کی برکت ہے کہ یہاں سے اٹھائی ہوئی آواز دنیا کے کونے کونے میں پہنچ جاتی تھی۔

[۳۸] ایام معلومات سے بعض علماء نے یکم سے دس ذی الحجہ تک کے دن مراد لئے ہیں۔ مگر یہ اس صورت میں جبکہ اللہ کے ذکر کو عام سمجھا جائے اور اگر اللہ کا نام لینے کو قربانی کے جانوروں سے متعلق سمجھا جائے تو یہ بعض کے نزدیک ۱۰ ذی الحجہ اور اس کے بعد کے دو دن ہیں۔ اور بعض کے نزدیک تین دن یعنی ۱۳ ذی الحجہ کی عصر تک ان کے نزدیک قربانی کرنا جائز ہے۔

بهيمة الانعام سے مراد اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری وغیرہ ہیں، جن کی قربانی دی جاتی ہیں اور یہ اسی صورت میں حلال ہوں گے جبکہ ذبح کرتے وقت ان پر اللہ کا نام لیا جائے۔ اگر اللہ کے سوا کسی اور کا نام بھی لیا جائے یا عمداً اللہ کا نام چھوڑ دیا جائے تو ایسے ذبح شدہ جانور کا کھانا حلال اور جائز نہ ہو گا۔ اور اگر ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا بھول جائے تو قربانی جائز اور حلال ہی رہے گی جب یاد آئے اسی وقت ہی اللہ کا نام لے لیا جائے۔ اگرچہ ذبح کے وقت کی کئی دعائیں منقول ہیں۔ تاہم مختصر سے مختصر الفاظ جو قربانی کے وقت کہے جا سکتے ہیں، یہ ہیں بسم الله الله اكبر

[۳۹] وہ امور جو دور جاہلیت میں نیکی سمجھے جاتے تھے مگر اسلام نے ان میں اصلاح کی:۔ جاہلی دور میں کئی کام ایسے

الْفَقِيرَ ﴿٢٨﴾ ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴿٢٩﴾

محتاج [۴۰] کو بھی کھلائیں۔(۲۸) پھر اپنا میل کچیل [۴۱] دور کریں اور اپنی نذریں [۴۲] پوری کریں اور اس قدیم گھر کا طواف [۴۳] کریں۔(۲۹)

تھے۔ جنہیں نیکی کے کام اور معروف سمجھ کر بجالایا جاتا تھا۔ مگر اسلام نے ان میں اصلاح کی۔ جیسے سفر حج میں حجامت نہ کرنا، پیدل روانہ ہونا، مشکل کے وقت بھی قربانی کے جانور پر سوار نہ ہونا، سفر سے واپسی پر گھر کے پچھواڑے سے داخل ہونا، ننگے ہو کر طواف کرنا، صفا و مروہ کے طواف کو اچھا نہ سمجھنا، عرفات کے قیام کو ضروری نہ سمجھنا، ایسے ہی امور میں سے ایک یہ بات تھی کہ وہ قربانی کے گوشت سے خود کچھ نہیں کھاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ کہہ کر ان کی غلط فہمی کا ازالہ فرمادیا۔

[۴۰] قربانی کے گوشت کی تقسیم:۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ قربانی کے گوشت سے غنی قسم کے لوگ کھا ہی نہیں سکتے۔ بلکہ یہ ہے کہ محتاجوں اور فقراء و مساکین کو ضرور شامل کیا جائے۔ اور خود کھانے کا بھی یہ مطلب نہیں کہ اس میں سے ضرور ضرور کھایا جائے بلکہ یہ ہے کہ قربانی کا گوشت خود کھانے میں کچھ حرج نہیں ہے۔ اور اس سلسلہ میں سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کا قول یہ ہے کہ ایک حصہ خود رکھ لو۔ ایک حصہ اپنے ہمسایوں اور رشتہ داروں میں تقسیم کردو اور ایک حصہ فقراء مساکین میں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ تینوں حصے برابر برابر ہوں۔ بلکہ حسب ضرورت اس میں کمی بیشی کی جاسکتی ہے اور بہتر یہ ہے کہ اپنے لئے حصہ تیسرے سے کم رکھا جائے اور فقراء کے لئے تیسرے حصہ سے زیادہ۔

[۴۱] یعنی دس ذی الحجہ کو قربانی کرنے کے بعد حج کرنے والے حضرات حجامت بنوائیں، ناخن کٹوائیں، نہائیں دھوئیں، اور راستے کی گرد اور میل کچیل دور کریں۔ اور احرام کھول کر عام لباس پہن لیں۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ احرام کھولنے کے بعد احرام کی دوسری پابندیاں تو ختم ہو جاتی ہیں مگر اپنی بیوی کے پاس جانا اس وقت تک جائز نہیں ہوتا جب تک آدمی طواف افاضہ نہ کرلے۔ جس کا ذکر اسی آیت کے آخری جملہ میں ہے۔

[۴۲] یعنی جو بھی نذر کسی حاجی نے اس موقع کے لئے مانی ہو۔ اور بعض کے نزدیک نذر سے مراد وہی قربانی یا قربانیاں ہیں جن کا حاجی نے ارادہ کر رکھا ہو۔

[۴۳] بیت العتیق کے معانی:۔ عتیق کا ایک معنی "آزاد" ہے۔ اس لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس گھر پر کسی ظالم اور جابر بادشاہ کا قبضہ نہیں ہو سکتا اور ایسے حملہ آوروں کا وہی حشر ہو گا جو اصحاب الفیل کا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ یاجوج ماجوج کی یورش کے بعد بھی تاقیامت بیت اللہ کا طواف اور حج آزادانہ طور پر ہوتا رہے گا۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن زبیر کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "بیت اللہ کا نام بیت العتیق اس لئے ہوا کہ اس پر کبھی کوئی ظالم غالب نہیں ہوا" (ترمذی، ابواب التفسیر)

قیامت کے نزدیک کعبہ کو گرانے والا:۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "کہ (قیامت کے قریب) ایک لشکر کعبہ پر چڑھ آئے گا۔ جب وہ بیداء کے کھلے میدان میں پہنچیں گے تو سب کے سب اول سے آخر تک زمین میں دھنسا دیئے جائیں گے" (بخاری۔ کتاب البیوع۔ باب ما ذکر فی الاسواق) البتہ قیامت کے بالکل نزدیک ایک چھوٹی پنڈلیوں والا کالا حبشی کعبہ کو گرانے آئے گا اور وہ اسے گرادے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: گویا میں کعبہ کے گرانے والے کو دیکھ

رہا ہوں، ایک کالا پھڈا (قدم کے اگلے حصہ کو قریب اور ایڑیوں کو دور کر کے چلنے والا آدمی) اس کا ایک ایک پتھر اکھیڑ رہا ہے" (بخاری، کتاب المناسک، باب هدم الكعبة) اور عتیق کا دوسرا معنی ہر وہ چیز ہے جس کے قدیم ہونے کے باوجود اس کی شرافت، نجابت اور احترام میں کوئی فرق نہ آئے۔ زندہ جاوید۔ اسی لحاظ سے کعبہ کو بیت العتیق کہتے ہیں۔

دس ذی الحجہ کو رمی الجمار، قربانی، غسل اور احرام کھولنے کے بعد بیت اللہ کا طواف کرنا ضروری ہے اور اس طواف کو طواف افاضہ یا طواف زیارت کہتے ہیں اور یہ طواف حج کا رکن ہے اور واجب ہے۔ احرام کی پوری پابندیاں اس طواف کے بعد ہی ختم ہوتی ہیں۔ اور اگر طواف کرنے والا بیمار یا لاغر ہو تو سوار ہو کر بھی طواف کیا جاسکتا ہے چنانچہ حج اور قربانی کے کچھ احکام تو سابقہ چار آیات میں مذکور ہو چکے اور کچھ آئندہ آیات میں بتائے جا رہے ہیں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہاں کچھ متعلقہ مسائل اور احادیث بھی درج کر دی جائیں اور وہ حسب ذیل ہیں:

حج اور قربانی کے متعلق احادیث اور مسائل:۔

۱۔ براء بن عازب ؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے عید الاضحیٰ کے دن خطبہ کے دوران فرمایا: "آج کے دن ہمیں پہلے نماز ادا کرنا چاہئے۔ پھر واپس جا کر قربانی کرنا چاہئے۔ جس نے اس طرح کیا وہ ہماری سنت پر چلا اور جس نے قربانی (نماز سے پہلے) کر لی۔ اس کی قربانی ادا نہیں ہوئی بلکہ اس نے اپنے گھر والوں کے لئے گوشت کی خاطر بکری کاٹی" اس پر ابو بردہ ؓ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! میں نے تو نماز سے پہلے ہی ذبح کر لیا اور اب میرے پاس کوئی بکری نہیں صرف ایک جذعہ (پٹھیا) ہے جو مسنّۃ (دوندی یا دو سال کی) سے بہتر ہے" آپ ﷺ نے فرمایا: "اچھا اب وہ قربانی کر لو اور تمہارے بعد کسی کو ایسا کرنا کافی اور درست نہ ہوگا" (بخاری۔ کتاب الاضاحی۔ باب الذبح بعدالصلوٰة)

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ قربانی نماز عید کے بعد ہی ہو سکتی ہے۔ دوسرے اگر بکری قربانی دینا ہو تو اس کا مسنّۃ ہونا ضروری ہے۔

۲۔ سیدنا یونس بن مالک ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو چتکبرے مینڈھے قربانی کئے۔ میں نے دیکھا آپ اپنا پاؤں ان کے منہ کے ایک جانب رکھے ہوئے بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر اپنے ہاتھ سے ذبح کر رہے تھے۔ (بخاری۔ کتاب الاضاحی۔ باب من ذبح الاضاحی بیده)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ (۱) قربانی کا جانور خوبصورت اور موٹا تازہ ہونا چاہئے (۲) ایک شخص ایک سے زیادہ قربانیاں بھی دے سکتا ہے۔ (۳) جانور کو لٹا کر اور اسے خوب قابو کر کے ذبح کرنا چاہئے۔ (۴) ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا ضروری ہے۔ (۵) اپنی قربانی اپنے ہاتھ سے کرنا افضل ہے۔

۳۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: ہم منیٰ میں تھے کہ گائے کا گوشت لایا گیا، میں نے پوچھا: "یہ کہاں سے آیا ہے" صحابہ نے عرض کیا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیبیوں کی طرف سے ایک گائے قربانی کی ہے" (بخاری۔ کتاب الاضاحی۔ باب الاضحیة للمسافرو النساء)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ (۱) صاحب استطاعت کو اپنے گھر والوں کی طرف سے الگ قربانی دینا سنت ہے۔ (۲) حج کرنے والوں کو قربانی منیٰ کے مقام پر کرنا چاہئے۔

۴۔ سیدنا نافع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اسی مذبح میں قربانی ذبح کیا کرتے تھے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے (بخاری۔ کتاب الاضاحی۔ باب الاضحیٰ والمنحر بالمصلیٰ)

یعنی منیٰ کا سارا علاقہ بھی مذبح نہیں۔ بلکہ قربانی مذبح خانہ میں جا کر کرنا چاہئے۔

۵۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج (۱۰ھ) کی کیفیت بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ: ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نحر کی جگہ آئے تو تریسٹھ (۶۳) اونٹ اپنے دست مبارک سے نحر کئے باقی سینتیس (۳۷) حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیئے جو انہوں نے نحر کئے۔ اور ان کو اپنی قربانی میں شریک کیا“ (مسلم۔ کتاب الحج۔ باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ (۱) دو آدمی مل کر بھی قربانی کر سکتے ہیں۔ (۲) قربانی جتنی زیادہ سے زیادہ کوئی دے سکتا ہو، دینا چاہئے۔

۶۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”قربانی کے دن اللہ تعالیٰ کو انسان کے عملوں میں خون بہانے سے بڑھ کر کوئی عمل محبوب نہیں ہے“ (ترمذی۔ مع تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۳۵۲)

۷۔ سیدنا عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں دس سال رہے اور ہمیشہ قربانی کرتے رہے“ (ترمذی حوالہ ایضاً)

۸۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص استطاعت رکھتا ہو۔ پھر قربانی نہ کرے وہ ہماری عید گاہ میں نہ آئے“ (ابن ماجہ، کتاب الاضاحی۔ اردو ص ۳۸۱ مطبوعہ مکتبہ سعودیہ، کراچی)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قربانی اگرچہ ہر مسلمان پر واجب نہیں تاہم صاحب استطاعت کے لئے سنت مؤکدہ ضرور ہے۔

۹۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: مسنّۃ (بکری وغیرہ جو ایک سال کی ہو کر دوسرے میں لگی ہو) کی قربانی کرو۔ البتہ جب ایسا جانور نہ مل رہا ہو۔ تو جذعۃ دنبہ (جو چھ ماہ کا ہو کر ساتویں میں لگا ہو) کر لو“ (مسلم۔ کتاب الاضاحی۔ باب سنّ الاضحیۃ)

۱۰۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حجۃ الوداع) میں سو اونٹ قربانی کئے اور مجھے حکم دیا کہ ان کا گوشت بانٹ دوں۔ میں نے سارا گوشت بانٹ دیا۔ پھر آپ نے فرمایا: ان کی جھولیں بھی بانٹ دو میں نے وہ بھی بانٹ دیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کھالیں بانٹنے کا حکم فرمایا، میں نے وہ بھی بانٹ دیں۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان میں سے کوئی بھی چیز قصاب کو مزدوری میں نہ دو“ (بخاری۔ کتاب المناسک۔ باب لایعطی الجزار من الھدی شیئا)

۱۱۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ عیدالاضحیٰ کے دن عید میں شریک ہونے کے لئے دیہات سے (محتاج) لوگ آ گئے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”قربانی کے گوشت سے تین دن تک کے لیے رکھ لو۔ باقی خیرات کر دو۔ (تاکہ محتاجوں کو بھی کھانے کو گوشت مل جائے) بعد میں لوگوں نے عرض کیا کہ: ہم اپنی قربانیوں کی کھالوں سے مشکیں بناتے تھے اور ان میں چربی پگھلاتے تھے“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ”تو اب کیا ہوا؟“ صحابہ نے عرض کیا: آپ نے تین دن سے زیادہ قربانی کا گوشت کھانے سے منع فرما دیا تھا“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں نے تمہیں ان محتاجوں کی وجہ سے منع کیا تھا جو اس وقت موقع پر آ گئے تھے۔ اب تم کھاؤ بھی، صدقہ بھی کرو اور رکھ بھی سکتے ہو“ (مسلم۔ کتاب الاضاحی۔ باب النھی عن اکل لحوم الاضاحی بعد

ثلاث و نَسْخِہِ)

۱۲۔ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قربانی کا گوشت توشہ کر کے مدینہ تک آئے۔ ابوسفیان نے کہا اس حدیث میں قربانی سے مراد ہدی (مکہ میں کی ہوئی قربانی) ہے۔ (بخاری، کتاب الاضاحی۔ باب ما یوکل من لحوم الاضاحی وما یتزود منھا)

۱۳۔ زیاد بن جبیر کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا۔ وہ ایک شخص کے پاس آئے جس نے نحر کرنے کے لئے اپنا اونٹ بٹھایا تھا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس اونٹ کو کھڑا کر اور پاؤں باندھ دے (پھر نحر کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی سنت ہے۔ (بخاری۔ کتاب المناسک۔ نحر الابل مقیدۃ)

۱۴۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کا احرام باندھ کر نکلے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ اونٹ اور گائے (کی قربانی) میں سات سات آدمی شریک ہو جائیں" (مسلم۔ کتاب الحج باب جواز الاشتراك فی الھدی)

۱۵۔ سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم تہامہ کے علاقہ میں ذوالحلیفہ کے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ وہاں ہمیں بکریاں اور اونٹ ملے ہم نے جلدی کر کے گوشت کاٹ کر ہنڈیاں چڑھا دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں وہ ہنڈیاں اوندھا دینے کا حکم دیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس بکریاں ایک اونٹ کے برابر رکھیں۔ (مسلم۔ کتاب الاضاحی۔ جواز الذبح بکل ما انھر الدم الاالسنّ......)

اس حدیث کو امام مسلم نے کتاب الاضاحی میں درج کر کے یہ اجتہاد کیا ہے کہ اونٹ کی قربانی میں دس آدمی تک شریک ہو سکتے ہیں جبکہ گائے، بیل میں صرف سات آدمی ہی شریک ہو سکتے ہیں۔

۱۶۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص حالت احرام میں شکار کرے اور اسے اس کا بدلہ دینا ہو تو اس بدلہ کے جانور یا نذر کے جانور میں سے کچھ نہ کھائے۔ باقی سب میں سے کھا سکتا ہے۔ (بخاری۔ کتاب المناسک۔ باب ما یاکل من البدن)

۱۷۔ ۞ <u>قربانی کے جانور پر سوار ہونا تعظیم کے منافی نہیں:۔</u> سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا جو قربانی کا اونٹ ہانک رہا تھا (اور خود پیدل چل رہا تھا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: "اس پر سوار ہو جا" وہ کہنے لگا: "یہ قربانی کا جانور ہے" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ فرمایا: "اس پر سوار ہو جا" وہ پھر کہنے لگا: "یہ قربانی کا جانور ہے" آپ نے تیسری بار اسے فرمایا: ارے کم بخت اس پر سوار ہو جا" (بخاری۔ کتاب المناسک۔ باب رکوب البدن)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت قربانی کے جانور پر سوار ہونا شعائر اللہ کی تعظیم کے منافی نہیں۔

۱۸۔ ۞ <u>پیدل حج کرنا کارِ ثواب نہیں:۔</u> سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بوڑھے کو دیکھا جو اپنے دونوں بیٹوں کا سہارا لئے چل رہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: "اسے کیا ہوا ہے؟" لوگوں نے کہا: "اس نے پیدل کعبہ کو جانے کی منت مانی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اللہ کو اس بات کی حاجت نہیں کہ وہ اپنے آپ کو تکلیف دے" اور اسے حکم دیا کہ وہ سوار ہو جائے۔ (بخاری۔ کتاب العمرۃ۔ باب من نذر المشیۃ الی الکعبۃ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پیدل سفر حج کار ثواب نہیں بلکہ مکروہ کام ہے اور اگر کسی نے ایسی نیت کی بھی ہو تو اسے

پورا نہ کرنا چاہئے۔

۱۹۔ سیدنا انس بن مالک فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ جب مزدلفہ سے منیٰ میں آئے تو پہلے جمرہ عقبہ پر گئے اور کنکریاں ماریں۔ پھر اپنی قیام گاہ پر تشریف لائے۔ پھر قربانی کی۔ پھر حجام سے سر مونڈنے کو کہا پہلے داہنی طرف سے پھر بائیں طرف سے پھر وہ بال آپ ﷺ نے صحابہ کو دے دیئے۔ (مسلم۔ کتاب الحج۔ باب ان السنة یوم النحران یرمی ثم ینحر)

یوم النحر کے کاموں کی از روئے سنت ترتیب یہ ہے پہلے رمی (۲) بعد میں قربانی (۳) حجامت اور احرام کھولنا۔ (۴) طواف افاضہ یا طواف الزیارۃ تاہم ان کاموں میں تقدیم و تاخیر ہو جائے تو کچھ حرج نہیں، جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

۲۰۔ ۞ یوم النحر: مناسک حج میں تقدیم و تاخیر:۔ سیدنا عبداللہ بن عباس ؓ فرماتے ہیں ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: میں نے رمی سے پہلے طواف الزیارۃ کر لیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی حرج نہیں اور ایک شخص نے کہا میں نے شام ہو جانے کے بعد رمی کی آپ ﷺ نے فرمایا: کچھ حرج نہیں ایک نے کہا: میں نے قربانی سے پہلے سر منڈوا لیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کچھ حرج نہیں۔ (بخاری۔ کتاب المناسک، باب الذبح قبل الحلق)

۲۱۔ سیدنا ابو ہریرہ ؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: یا اللہ سر منڈوانے والوں کو بخش دے" لوگوں نے عرض کیا: "اور بال کترانے والوں کو؟" آپ ﷺ نے دوبارہ فرمایا: "یا اللہ بال منڈوانے والوں کو بخش دے" لوگوں نے پھر کہا، اور بال کترانے والوں کو؟" غرض آپ نے تین بار سر منڈوانے والوں کے لئے بخشش طلب فرمائی اور چوتھی بار فرمایا اور بال کترانے والوں کو بھی" (بخاری۔ کتاب المناسک۔ باب الحلق والتقصیر عند الاحلال)

۲۲۔ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب تم ذی الحجہ کا چاند دیکھو اور تم میں سے کوئی قربانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اسے چاہئے کہ (قربانی کرنے تک) نہ حجامت بنائے اور نہ ناخن کاٹے" (مسلم۔ کتاب الاضاحی۔ باب النهی من دخل علیه عشر ذی الحجة......)

۲۳۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیا اور دسویں تاریخ کو ہی طواف الزیارۃ کر لیا۔ پھر ام المومنین سیدہ صفیہ کو حیض آ گیا۔ آپ ﷺ نے ان سے صحبت کرنا چاہی۔ تو میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! وہ تو حائضہ ہیں" آپ ﷺ نے فرمایا: "گویا اس نے ہمیں یہاں روک دیا؟" لوگوں نے کہا "وہ دسویں تاریخ کو طواف الزیارۃ کر چکی ہیں" آپ ﷺ نے فرمایا: "پھر کیا ہے چلو نکلو" (بخاری۔ کتاب المناسک۔ باب الزیارة یوم النحر)

اس حدیث سے طواف الزیارۃ کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ جب تک حاجی طواف الزیارۃ نہ کر لے اس کا حج مکمل نہیں ہوتا۔ نہ وہاں مکہ سے رخصت ہو سکتا ہے۔

۲۴۔ سیدنا ابو ہریرہ ؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ ﷺ نے خطبہ کے دوران ارشاد فرمایا: "لوگو! تم پر حج فرض ہے۔ لہٰذا حج کرو" ایک شخص (اقرع بن حابس) کہنے لگا: کیا ہر سال یا رسول اللہ!؟ آپ خاموش رہے۔ اس شخص نے تین بار یہی سوال کیا پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "اگر میں ہاں کہہ دیتا تو تم پر ہر سال حج فرض ہو جاتا اور تم یہ حکم بجا نہ لا سکتے۔ لہٰذا مجھے وہاں چھوڑ دو جہاں میں تم کو چھوڑ دوں (بات کرنا بند کر دوں) کیونکہ تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہوئے کہ انہوں نے اپنے نبیوں

ذٰلِكَ ۖ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا

یہ (تھا کعبہ کا مقصد) اور جو شخص اللہ کی احترام والی[۴۴] چیزوں کی تعظیم کرے تو یہ بات اس کے پروردگار کے ہاں اس کے لیے بہتر ہے۔ نیز تمہارے لئے چوپائے حلال کئے گئے ہیں ماسوائے ان کے جو تمہیں بتائے[۴۵]

سے بہت سوال کئے اور ان سے بہت اختلاف کرتے رہے۔ تو جب میں تمہیں کسی بات کا حکم دوں تو جتنا ہو سکے اسے بجالاؤ۔ اور جب میں کسی بات سے منع کروں تو اس سے رک جاؤ" (مسلم۔ کتاب الفضائل۔ باب توقیرہ ﷺ وترک اکثار سواله عما لاضرورة اليه الخ، ابن ماجہ باب اتباع السنة آخری حدیث)

۞ قربانی کو مالی ضیاع سمجھنے والے مسلمان:۔ حج اور بالخصوص قربانی کے مسائل کی یہ تفصیل اس لیے دینا پڑی کہ مسلمانوں میں سے ہی کچھ لوگ ایسے پیدا ہو چکے ہیں جو کہ قربانی کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ کبھی وہ یہ کہتے ہیں کہ قربانی صرف مکہ میں ہے اور حاجیوں کے لئے ہے اور ہم لوگ جو ہر شہر اور ہر بستی میں قربانیاں کرتے ہیں ان کا کوئی حکم نہیں۔ کہیں وہ اسے گوشت اور مالی ضیاع سے تعبیر کرتے ہیں اور کبھی یہ درد اٹھنے لگتا ہے کہ جتنی رقم قربانیوں پر خرچ کی جاتی ہے اتنی رقم سے محتاجوں کے لئے کئی رہائشی منصوبے بنائے جا سکتے ہیں۔ اور کبھی کہتے ہیں کہ جتنی رقم کسی قربانی پر صرف ہوتی ہے اتنی رقم صدقہ میں صرف کر دی جائے تو بہتر ہے۔ مندرجہ بالا احادیث میں ان کی ان سب باتوں کا جواب اور تردید موجود ہے۔ ایسے لوگ دراصل مغربیت اور مغربی تہذیب سے مرعوب، اس کے شیدائی اور کھاتے پیتے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ اگر قربانی سے دگنی رقم سینما بینی اور اپنی عیاشیوں پر خرچ کر دیں تو وہ ان کے نزدیک مالی ضیاع نہیں ہوتا۔ لیکن قربانی میں انہیں کئی طرح کے نقصانات نظر آنے لگتے ہیں۔ بہر حال ان کے سب اقوال "خوئے بدرا بہانہ بسیار" کا مصداق ہوتے ہیں۔ انہیں محتاجوں اور فقیروں سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی اور اگر بالفرض حکومت کوئی ایسا منصوبہ بنا بھی لے تو وہ خود کبھی اس فنڈ میں کچھ دینا گوارا نہ کریں گے۔ ان کی اصل غرض صرف یہ ہوتی ہے کہ قربانی نہ کرنے کے باوجود بھی وہ مسلمانوں کی نظروں میں بخیل اور "چور" نہ سمجھے جائیں۔ (ایسے لوگوں کے دلائل کی تفصیل اور ان کی تردید کے لئے دیکھئے میری تصنیف آئینہ پرویزیت حصہ سوم)

[۴۴] حُرُمٰتِ اللّٰهِ سے مراد اللہ کی حرام کردہ اشیاء بھی ہیں اور قابل احترام اشیاء یعنی شعائر اللہ بھی۔ یعنی ان سب چیزوں کی حرمت و احترام کا پورا پورا خیال رکھنا چاہئے اور تعمیر کعبہ کا اولین مقصد یہ تھا کہ اسے شرکیہ اعمال و افعال اور بتوں کی نجاستوں سے پاک و صاف رکھا جائے۔ اور قریش مکہ نے ایسی نجاستوں کا بھی مطلق خیال نہ رکھا اور جو لوگ اللہ کی توحید کے قائل تھے ان کے بیت اللہ میں داخلہ پر بھی پابندیاں لگا دیں۔ گویا اللہ کے گھر اور اس کے شعائر کی ہر طرح سے توہین کی۔ نیز اس مقام پر حرمات سے مراد عموماً حج، عمرہ، کعبہ، قربانی اور احرام سے متعلق احکام ہیں۔ جیسے کسی سے لڑائی جھگڑا کرنے، احرام کی حالت میں شکار کرنے اور صحبت کرنے سے بچنا اور ایسے احکام کا پورا پورا پاس رکھنا ضروری ہے اور یہ چیز ان کے حق میں اور اللہ کے ہاں بڑی خوبی اور نیکی کی بات ہے۔

[۴۵] ۞ چار بنیادی حرام اشیاء:۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام چرنے والے چوپائے انسان کے لئے حلال قرار دیئے ہیں ماسوائے ان چیزوں کے جن کا ذکر پہلے کئی مقامات پر آ چکا ہے اور وہ ہیں مردار خواہ وہ جانور کسی بھی طریقہ سے مر گیا ہو (۲) خون بالخصوص

يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ﴿۳۰﴾
حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ

جا چکے ہیں۔ لہٰذا بتوں کی گندگی[۴۶] سے بچو اور اینچ پیچ والی بات سے بھی بچو[۴۷]۔(۳۰) اللہ کے لئے یکسو[۴۸] ہو جاؤ اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک بنایا تو وہ ایسے ہے

وہ خون جو ذبح کرتے جانور کے جسم سے نکلتا ہے۔ (۳) خنزیر کا گوشت جس کی ہر چیز نجس اور اس کا استعمال ممنوع ہے۔ (۴) ہر وہ جانور یا چیز جو غیر اللہ کے نام پر مشہور کی جائے اس جملہ میں یہ بتانا مقصود ہے کہ مشرکین مکہ نے جو بحیرہ وصیلہ، سائبہ اور حام قسم کے مویشی حرام قرار دے رکھے ہیں۔ یہ قطعاً اللہ کی طرف سے حرام کردہ نہیں ہیں۔

[۴۶] یعنی آستانوں کی آلائشوں اور بتوں کی پرستش سے یوں بچو جیسے انسان گندگی کے ڈھیر سے بچتا ہے اور اسے اس گندگی کے نزدیک جانے سے بھی گھن آتی ہے۔ تمام جانور اللہ کی مخلوق و مملوک ہیں۔ لہٰذا اسی کے نام پر اور اسی کے لئے کعبہ کی نیاز ہو سکتے ہیں۔ کسی بت یا دیوی یا آستانہ پر ذبح کیا ہوا جانور مردار کی طرح حرام اور نجس ہے۔ لہٰذا ایسے کاموں سے بچنا ضروری ہے۔

[۴۷] ❁ زُور کا لغوی معنی:۔ قول الزور میں دونوں الفاظ بڑے وسیع معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ زور کے معنی صرف جھوٹ نہیں بلکہ ہر وہ بات ہے جو حق سے ہٹی ہوئی ہو اور اس کی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ قول الزور کے مقابلہ میں قرآن میں قولاً سدیداً کے الفاظ آئے ہیں یعنی ایسی بات جس میں کوئی رخنہ، ابہام، ہیرا پھیری اور پیچیدگی نہ ہو اور قول الزور ایسی بات ہے جس میں یہ باتیں یا ان میں سے کوئی ایک موجود ہو اور صاحب فقہ اللغۃ کے نزدیک زُور ایسا جھوٹ ہے جسے بنا سنوار کر پیش کیا جائے کہ وہ بھلا اور درست معلوم ہو۔ اس لحاظ سے اللہ کے پیدا کئے ہوئے جانوروں کو غیر اللہ سے نامزد کر کے انہیں ذبح کرنا، بلادلیل شرعی حلال کو حرام بنانا اور حرام کو حلال بنا لینا یہ سب قول الزور ہی کی اقسام ہیں اور افتراء علی اللہ بھی ہیں۔

❁ شہادتِ زُور کبیرہ گناہ ہے:۔ پھر قول الزور کی ایک قسم شہادۃ الزور ہے۔ یعنی ایسی شہادت جس میں ہیرا پھیری سے کام لیا جائے۔ اہم واقعہ کو غیر اہم اور غیر اہم کو اس طرح اہم بنا کر پیش کیا جائے جس سے کسی ایک فریق کی حق تلفی ہو جائے اور اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ اور یہ اتنا بڑا گناہ ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک کے برابر قرار دیا ہے۔ جیسا کہ یہاں اس آیت میں شرک کے ساتھ ہی قول الزور کا ذکر کیا گیا ہے۔ نیز عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ اپنے والد سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں تمہیں بڑے بڑے گناہ بتاؤں؟“ ہم نے عرض کیا: ”یا رسول اللہ! ضرور بتایئے“ فرمایا: ”اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا“ اس وقت آپ تکیہ لگائے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا: ”جھوٹ بولنا، جھوٹی گواہی دینا، سن لو! جھوٹ بولنا، جھوٹی گواہی دینا“ آپ برابر یہی الفاظ دہراتے رہے۔ یہاں تک کہ میں سمجھا کہ آپ ﷺ چپ ہی نہ ہوں گے“ (بخاری۔ کتاب الادب باب عقوق الوالدین من الکبائر)

[۴۸] ❁ حنیف کا لغوی معنی:۔ حنفاء حنیف کی جمع ہے۔ اور حنف یعنی تمام باطل راہوں کو چھوڑ کر استقامت کی طرف مائل

أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ ﴿٣١﴾ ذَٰلِكَ وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى
الْقُلُوبِ ﴿٣٢﴾ لَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴿٣٣﴾ وَلِكُلِّ

جیسے وہ آسمان[۴۹] سے گرے پھر اسے پرندے اچک لے جائیں یا ہوا اسے کسی دور دراز مقام میں لے جا کے پھینک دے۔(۳۱) یہ (سب امور قابلِ اجتناب ہیں) اور جو شخص اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے تو یہ بات[۵۰] دلوں کے تقویٰ سے تعلق رکھتی ہے۔(۳۲) تمہیں ان (قربانی کے جانوروں) سے ایک مقررہ[۵۱] وقت تک فائدہ اٹھانے کا حق ہے پھر ان (کے ذبح کرنے) کی جگہ اسی قدیمی گھر (بیت اللہ) کے پاس ہے۔(۳۳)

ہونا (مفردات القرآن) اور حنیف وہ شخص ہے جو تمام باطل راہوں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی سیدھی راہ کی طرف آ جائے۔ اور وہ سیدھی راہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، عبادت و تصرفات میں کسی بھی چیز کو ذرہ برابر بھی شریک نہ سمجھا جائے۔

[۴۹] شرک انسانیت کی توہین ہے اور اس کی مثال جیسے کوئی بلندی سے نیچے پٹخ دیا جائے:۔ انسان تمام مخلوقات سے اشرف و افضل پیدا کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کے لئے سزاوار یہی بات ہے کہ وہ صرف اور صرف اپنے خالق و مالک کے سامنے سر جھکائے اسی سے اپنی حاجات طلب کرے اور اسی کی عبادت کرے۔ اب اگر وہ اللہ کو چھوڑ کر کسی بھی چیز کی عبادت کرے، اس کے آگے سر جھکائے یا حاجات طلب کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک اعلیٰ چیز اپنے سے کمتر درجہ کی چیز کے سامنے جھک گئی یا اگر وہ کسی انسان کے سامنے سر جھکائے تو بھی مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے ہی جیسی محتاج مخلوق کے آگے جھک رہا ہے اور یہ بھی انسانیت کی تذلیل ہے۔ ایسے شخص کی مثال یہ ہے جیسے وہ توحید کی بلندیوں سے شرک کی پستیوں میں جا گرا۔ اور اب وہ اپنے جیسے دوسرے مشرکوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ جو اسے کبھی کسی در پر جانے کا مشورہ دیں گے کبھی کسی دوسرے کے آستانہ پر جانے کا۔ حتیٰ کہ یہ شکاری پرندے اسے مکمل طور پر گمراہ اور بے ایمان کر کے ہی چھوڑیں گے۔ اور اگر وہ ان سے کسی طرح بچ بھی گیا تو اللہ کے مقابلہ میں اس کی اپنی خواہشاتِ نفس ہی گمراہی کے گڑھے میں جا گرانے کو کافی ہیں۔ اور اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی بذات خود بھی شرک ہی کی ایک قسم ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے۔

﴿أَفَرَأَيْتَ الَّذِي مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ﴾ (۲۵: ۴۳) "یعنی اگر وہ دوسرے مشرکوں کے ہتھے نہ بھی چڑھے تو اس کا اپنا نفس ہی اسے گمراہ کرنے کو کافی ہے"

[۵۰] یعنی جس شخص کے دل میں اللہ کا تقویٰ اور اللہ کی محبت جاگزیں ہو وہ ان چیزوں کا ضرور ادب کرے گا جو اس کے نام سے منسوب ہیں یا جنہیں شعائر اللہ کہا جاتا ہے۔ ان چیزوں کی توہین یا بے حرمتی، بے ادبی وہی شخص کر سکتا ہے جس کے دل میں نہ اللہ کا خوف ہو اور نہ اس کی محبت ہو۔ واضح رہے کہ اللہ کے نام منسوب کردہ اشیاء کی تعظیم یا ادب کرنا شرک نہیں بلکہ عین توحید ہے۔ شرک یہ ہے کہ اللہ کے سوا دوسروں کے نام منسوب کردہ چیزوں کا ایسے ہی ادب واحترام کیا جائے جیسا کہ اللہ کی طرف منسوب اشیاء کا کیا جاتا ہے۔

[۵۱] قربانی کے جانور سے فائدہ اٹھانا:۔ یہ مقررہ وقت وہ وقت ہے جب قربانی کا جانور حرم کی حدود میں یا مذبح میں پہنچ

أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ﴿٣٤﴾ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ

ہم نے ہر امت کے لئے قربانی کا ایک طریقہ [۵۲] مقرر کر دیا ہے تاکہ جو جانور ہم نے انہیں عطا کئے ہیں ان پر وہ اللہ کا نام لیا کریں (ان مختلف طریقوں کے باوجود تم سب کا دین ایک ہی ہے کہ) تمہارا الٰہ صرف ایک ہی الٰہ ہے لہٰذا اسی کے فرمانبردار بن جاؤ اور (اے نبی) آپ اللہ کے حضور حاضری [۵۳] دینے والوں کو بشارت دے دیں۔(۳۴) اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور اگر انہیں کوئی مصیبت

جائے۔ اس سے ان قربانی کے جانوروں سے بھی کئی طرح کے فائدے اٹھائے جا سکتے ہیں۔ مثلاً بوقت ضرورت ان پر سوار ہونا، ان کا دودھ دوہنا، ان کی اون حاصل کرنا ان سے نسل چلانا وغیرہ وغیرہ۔ جیسا کہ اسی سورہ کی آیت نمبر ۲۹ کے تحت درج شدہ حدیث نمبر ۱۷ سے واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کا جانور ہانکنے والے ایک شخص کو اس پر سوار ہو جانے کا تاکید سے حکم دیا تھا۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قربانی کے جانوروں سے فائدہ حاصل کرنا تعظیم کے منافی نہیں بلکہ تعظیم کا تعلق دل سے ہے۔ دل میں ان اشیاء کی محبت اور قدر ضرور ہونی چاہئے۔ نیز قربانی کے جانوروں سے کوئی فائدہ حاصل نہ کرنا مشرکوں کا کام تھا کہ جس جانور کو کسی بت کے نام منسوب کرتے تو اس سے کچھ فائدہ حاصل کرنے کو گناہ سمجھتے تھے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہ وضاحت فرما دی۔

بعض مفسرین نے مقررہ وقت سے مراد یہ لی ہے کہ جب تک جانور کو اللہ کے نام منسوب نہ کر دیا جائے یا ہدی نہ بنا دیا جائے۔ یہ مراد اس لئے درست نہیں کہ اللہ کے نام منسوب کرنے سے تو فوائد حاصل نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پھر اس آیت میں اجازت کس چیز کی دی جا رہی ہے نیز محولہ بالا حدیث بھی اس اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لئے کافی ہے۔

[۵۲] ❁ قربانی سب انبیاء کی شریعت کا جزو رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام انبیاء کی شریعتوں میں اللہ کے حضور قربانی پیش کرنا ایک لازمی جزو رہا ہے۔ اگرچہ اس قربانی کی تفصیلات اور جزئیات میں اختلاف رہا ہے۔

❁ غیر اللہ کی قربانی یا نذر و نیاز شرک ہے:۔ اب اگر کوئی شخص اللہ کے علاوہ کسی دوسری چیز کے سامنے یا دوسری چیز کے لئے قربانی پیش کرے گا۔ تو یہ شرک فی العبادت ہے کیونکہ قربانی اور نذر و نیاز سب مالی عبادتیں ہیں۔ لہٰذا یہ عبادات کسی دوسرے کے لئے بجا لانا یا ان میں کسی دوسرے کو شریک کرنا عین شرک ہے۔ اسی لئے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ تمہارا الٰہ تو صرف ایک ہی الٰہ ہے۔ پھر دوسروں کو اس کی عبادت میں کیوں شریک بناتے ہو؟

[۵۳] ❁ خبت کا لغوی مفہوم:۔ یہاں لفظ مخبتین استعمال ہوا ہے۔ اور خبت النار بمعنی آگ کا شعلہ ختم ہو جانا اور کوئلہ یا انگارہ پر راکھ کا پردہ چڑھ جانا ہے۔ (مفردات القرآن) اور مخبت سے مراد ایسا شخص ہے جس نے اللہ کے احکام کے سامنے اپنے پندارِ نفس اور خواہشاتِ نفس کو ختم کر دیا ہو۔ نیز اس کے معنوں میں عاجزی اور نرمی اور تواضع سب کچھ شامل ہوتا ہے۔

[۵۴] ان کے دل اس بات سے سہم جاتے ہیں کہ مبادا ان سے کوئی کام اللہ کی مرضی اور منشا کے خلاف سرزد ہو جائے۔ عمداً

وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالْبُدْنَ
جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَاۗىِٕرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ڰ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَاۗفَّ ۚ فَاِذَا

پہنچے تو اس پر صبر کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں[۵۴] اور اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے[۵۵] اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔(۳۵) اور قربانی کے اونٹوں[۵۶] کو ہم نے تمہارے لئے اللہ کے شعائر بنادیا ہے جن میں تمہارے لیے بہتری ہے۔ لہٰذا (ذبح کے وقت) انہیں صف بستہ[۵۷] کھڑا کر کے ان پر اللہ کا نام لو۔ پھر جب

شرکیہ افعال بجالانا تو بڑی دور کی بات ہے اور اس آیت میں مصیبت پر صبر کرنا، نماز کے قیام اور خرچ کرنے کا ذکر اس لحاظ سے ہے کہ سفرِ حج میں عموماً تکلیفیں بھی پیش آتی رہتی ہیں۔ نمازوں کے قضا ہونے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے اور خرچ بھی خاصا اٹھتا ہے۔ لہٰذا یہ فرمادیا کہ اللہ کے حضور متواضع رہنے والوں میں یہ سب خوبیاں موجود ہوتی ہیں۔ یہ مطلب تو ربط مضمون کے لحاظ سے ہے تاہم ان کا حکم ہر حالت میں عام ہے۔

[۵۵] رزقِ حرام کی نسبت اللہ نے اپنی طرف نہیں کی:۔ یہاں رزق سے مراد حلال اور پاکیزہ کمائی ہے کیونکہ رزقِ حرام کی نسبت اللہ تعالیٰ نے کبھی اپنی طرف نہیں فرمائی۔ نہ رزقِ حرام سے صدقہ یا قربانی یا سفرِ حج کے اخراجات قابل قبول ہوتے ہیں۔ اور خرچ کرنے سے مراد اللہ کی راہ میں یا اللہ کے احکام کے تابع رہ کر خرچ کرنا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص اسراف و تبذیر سے کام لیتا ہے یا سینما بینی اور فحاشی کے کاموں پر خرچ کرتا ہے تو یہ انفاق کی شرعی اصطلاح کی ذیل میں ہرگز نہیں آتے۔ بلکہ ایسے سب کام گناہوں کے کام ہیں۔

[۵۶] بدن کا لغوی مفہوم:۔ بُدن کے لفظ کا اطلاق لغوی طور پر ہر عظیم الجثہ جانور پر ہو سکتا ہے۔ تاہم عرب میں یہ لفظ اونٹوں کے لئے ہی مختص ہو گیا ہے۔ پہلے شعائر اللہ کا عمومی ذکر ہو رہا تھا۔ اب یہ ذکر کیا گیا کہ قربانی کے اونٹ بھی اللہ کے شعائر سے ہیں اور ان میں تمہارے لئے بہت سے فائدے اور بھلائیاں ہیں۔ تم ان پر سواری کرتے ہو۔ بار برداری کا کام لیتے ہو۔ دودھ اور اون اور بچے حاصل کرتے ہو۔ حتیٰ کہ ان کی کھالوں اور ہڈیوں سے بھی کئی طرح کے فوائد حاصل کرتے ہو اور چونکہ قربانی کے اونٹ قابل تعظیم ہیں لہٰذا ذبح کے وقت انہیں ہر ممکن سہولت پہنچاؤ۔

[۵۷] لفظ صواف دو معنوں میں استعمال ہو رہا ہے ایک تو ترجمہ سے ہی واضح ہے یعنی اگر قربانی کے اونٹ زیادہ ہوں تو پہلے انہیں صف بستہ کھڑا کر لیا جائے۔ پھر باری باری نحر کیا جائے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ انہیں کھڑے کھڑے ہی نحر کیا جائے۔ انہیں بٹھا کر ذبح نہ کیا جائے۔ جیسا کہ اسی سورہ کی آیت نمبر ۲۹ کے تحت درج شدہ حدیث نمبر ۱۳ سے واضح ہے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اونٹ کا اگلا بایاں پاؤں رسی سے باندھ دیا جائے۔ پھر کسی نیزے، برچھے یا تیز دھار آلہ کو اس کے گلے یا سامنے کے حصہ میں چبھو دیا جائے۔ تاکہ کھڑے کھڑے ہی ان کا خون نکل جائے۔

وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۗ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ﴿٣٦﴾ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۗؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۭ

ان کے پہلو زمین پر ٹک [۵۸] جائیں تو انہیں خود بھی کھاؤ اور قناعت کرنے والے [۵۹] کو بھی اور مانگنے والے کو بھی کھلاؤ۔ ہم نے ان جانوروں کو ایسے ہی تمہارے لئے تابع [۶۰] بنا دیا ہے تاکہ تم اللہ کے شکر گزار بنو۔ (۳۶)

اللہ کو قربانی کے جانوروں کا نہ تو گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون، بلکہ اسے [۶۱] تو تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اسی طرح

[۵۸] خون نکلنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اونٹ از خود اپنے کسی دائیں یا بائیں پہلو پر گر پڑے گا۔ اس کی کھال اس وقت تک نہ اتاری جائے جب تک تڑپنا بند نہ کر دے۔ یا زندگی کی کچھ بھی رمق اس میں باقی ہو۔

[۵۹] ۞ قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ عرصہ کے لیے بھی رکھا جا سکتا ہے:۔ یعنی حاجت مند بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ کہ جو کچھ اللہ نے انہیں دے رکھا ہے، اسی پر صابر و شاکر رہتے ہیں۔ اور ضرورت مند ہونے کے باوجود کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتے اور بعض حالات میں عام لوگوں کو ان کی احتیاج کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ حقیقتاً ایسے ہی لوگ صدقات و خیرات کے صحیح مستحق ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو احتیاج سے مجبور ہو کر لوگوں سے سوال کرنے لگتے ہیں۔ اس قربانی کے گوشت میں دو طرح کے لوگوں کو اللہ نے کھلانے کا حکم دیا ہے۔ ایک عیدالاضحیٰ کے موقعہ پر مدینہ کے آس پاس رہنے والے محتاج لوگ بکثرت مدینہ آ گئے۔ تو آپ نے صحابہ کو حکم دے دیا کہ کوئی شخص تین دن سے زیادہ قربانی کا گوشت رکھ نہیں سکتا۔ جو کچھ زائد ہو سب خیرات کر دیا جائے۔ لیکن یہ حکم صرف ان محتاجوں کی آمد کی وجہ سے تھا جو بعد میں منسوخ ہو گیا۔ (مسلم۔ کتاب الاضاحی۔ باب النهی عن اكل لحوم الاضاحی بعد ثلاث و نسخه) تاہم ایسے نسخ کا مطلب اتنا ہی ہوتا ہے کہ اگر آج بھی ویسے ہی حالات سامنے آ جائیں کہ محتاج بکثرت ہوں جو خود قربانی دینے کے قابل نہ ہوں یا اتفاقاً اکٹھے ہو جائیں تو آج بھی وہی پہلا حکم ہی لاگو ہوگا۔

[۶۰] ۞ انسان کے لئے جانوروں میں خوئے غلامی:۔ یعنی اپنے عظیم الجثہ جانوروں کو جو طاقت کے لحاظ سے ان سے کئی گنا بڑھ کر ہیں، تمہارے لئے ایسا مسخر بنا دیا ہے کہ وہ ان سے طرح طرح کے فائدے حاصل کرتا ہے اور بوقت ضرورت انہیں ذبح بھی کر ڈالتا ہے مگر وہ اس کے سامنے چون و چرا کرنے کی جرأت نہیں رکھتے اللہ کی ان نعمتوں کے لیے تمہیں اللہ کا شکر گزار اور اطاعت گزار بننا چاہیے۔

[۶۱] مشرکین کی یہ عادت تھی کہ جب وہ کسی بت کے نام پر کوئی قربانی کا جانور ذبح کرتے تو اس کا گوشت اس کے سامنے رکھ دیتے اور اس کا خون بت کے جسم پر مل دیتے تھے۔ بتوں کے سامنے رکھا ہوا گوشت تو بتوں کے مجاوروں کے کام آتا تھا اور وہی ان بتوں کو بعد میں صاف بھی کر ڈالتے تھے۔ اور جب وہ اللہ کے نام کی قربانی کرتے تو بھی گوشت کعبہ کے سامنے لا رکھتے اور خون کعبہ کی دیواروں سے لتھیڑ دیتے یا اس پر اس خون کے چھینٹے ڈالتے۔ گویا ان کے خیال کے مطابق قربانی کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس کا گوشت اور خون پیش کر دیا جائے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس جاہلی نظریہ کی تردید

كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ۗ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ

ہم نے انہیں تمہارے تابع کر دیا ہے تاکہ اللہ نے جو تمہیں راہ دکھائی ہے اس پر (شکر کے طور پر) اس کی بڑائی بیان کرو[۶۲]۔ اور (اے نبی!) آپ نیکو کار لوگوں کو بشارت[۶۳] دے دیجئے۔(۳۷) جو لوگ ایمان لائے

کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کو نہ تمہارے قربانی کے جانوروں کے گوشت کی ضرورت ہے اور نہ خون کی۔ خون تو ویسے ہی حرام اور ناپاک چیز ہے اور گوشت تم خود ہی کھا سکتے ہو اور دوسروں کو بھی کھلاؤ۔ اللہ تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ تم نے کس نیت، خلوص اور محبت کے ساتھ اللہ کے حضور یہ قربانی پیش کی ہے۔ تمہاری نیت میں جس قدر خلوص اور تقویٰ ہوگا وہی اللہ کے حضور اس قربانی کی قدر و قیمت ہوگی۔

۞ قربانی کی قبولیت کی شرائط اور نیت کے فتور کی صورتیں:۔ بعض لوگ قربانی محض رسم کے طور پر بجالاتے ہیں۔ بعض اس لئے کہ ہمارے بچے آخر دوسروں کی طرف سے گوشت آنے کا کیوں انتظار کرتے رہیں۔ اور بعض دولتمند اس لئے کرتے ہیں کہ دوسرے لوگ انہیں طعنہ نہ دیں۔ اور بعض اس لئے کوئی موٹا، عمدہ اور قیمتی جانور قربان کرتے ہیں کہ لوگوں میں ان کی شہرت ہو۔ اور بعض بخل سے کام لے کر کوئی کمزور اور عیب دار قسم کا جانور قربان کر دیتے ہیں۔ ایسے سب لوگوں کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ آیا اس بندہ نے جو قربانی کی ہے وہ اللہ کی احسان مندی اور شکر بجا لاتے ہوئے شوق و محبت سے کی ہے یا نہیں۔ اگر کسی کی نیت ہی لنگڑی لولی ہو تو اگر وہ کوئی موٹا تازہ جانور بھی قربان کرے گا تو اس کا اسے کتنا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟۔

[۶۲] بڑائی بیان کرنے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تہ دل سے انسان اللہ تعالیٰ کو بزرگ و برتر سمجھے۔ دوسرے یہ زبان سے بھی اس کا اقرار کرتا رہے۔ اور اس مقام پر اس کا مطلب یہ ہے کہ ذبح کے وقت بسم اللہ، اللہ اکبر یا بسم اللہ واللہ اکبر اور شکر کی ادائیگی کے لئے اللھم منك ولك (یعنی اے اللہ! یہ قربانی کا جانور آپ نے ہی عطا کیا تھا اور آپ کی رضا کے لئے ہی میں اسے قربان کر رہا ہوں) پڑھنا چاہئے۔

[۶۳] ۞ حج نہ کرنے والوں کو حاجیوں سے مماثلت کے احکام:۔ جب ستم رسیدہ مسلمان ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ آئے تو انہیں کئی قسم کے غم اور تفکرات لاحق تھے۔ گھر بار اور اپنا وطن مالوف چھوڑنے کا غم مدینہ میں آب و ہوا کی ناسازگاری، ذریعہ معاش کی فکر، کفار مکہ کی ایذا رسانیوں کی یاد جو انہیں بے چین کر دیتی تھی۔ مزید ستم یہ کہ مدینہ میں آنے کے بعد بھی کفار مکہ نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ علاوہ ازیں ایک بڑا غم مسلمانوں کو بیت اللہ شریف سے دور ہو جانے کا تھا۔ جسے اب وہ دیکھ بھی نہ سکتے تھے جبکہ مناسک حج و عمرہ بجا لانا تو دور کی بات تھی۔ انہیں حالات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ خود ان کی طرف سے کافروں کی مدافعت کر رہا ہے اور وہ بتدریج ایسے حالات پیدا کر دے گا کہ مسلمانوں کے لئے سب راہیں کھل جائیں گی۔ اور ان کے دشمن ہی بالآخر خائب و خاسر ہوں گے۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کو کئی ایسے احکام دیئے گئے جن سے ان کی مناسک حج و عمرہ بجا لانے کی حسرت کی کسی حد تک تلافی ہو سکتی تھی۔ اور ان احکام میں حج کرنے والوں سے مماثلت بھی پائی جاتی تھی۔ مثلاً مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ ان میں ہر صاحب استطاعت ۱۰ ذی الحجہ کو قربانی کیا کرے چنانچہ

عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ۝۳۸ۧ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝۳۹ۙ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا

ہیں بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کی طرف سے (دشمنوں سے) مدافعت کرتا ہے۔ یقیناً اللہ کسی خائن اور ناشکرے[۶۴] کو پسند نہیں کرتا۔(۳۸) جن لوگوں سے لڑائی کی جاتی رہی ہے۔ انہیں اب لڑائی (جہاد) کی اجازت دی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ مظلوم[۶۵] ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد[۶۶] پر قادر ہے۔(۳۹) جنہیں ان کے گھروں سے ناحق نکالا گیا

رسول اللہ ﷺ مدینہ میں دس سال قربانی دیتے رہے نیز مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ جو شخص قربانی کا ارادہ رکھتا ہو وہ یکم ذی الحجہ یعنی چاند دیکھنے سے لے کر قربانی کرنے تک نہ حجامت بنوائے اور نہ ناخن کٹوائے۔ نیز یہ کہ مسلمان کسی دوسرے کے ہاتھ بھی اپنا قربانی کا جانور بیت اللہ شریف بھیج سکتے ہیں۔ نیز ایام تشریق میں وہ بھی اسی طرح تکبیرات پڑھا کریں جس طرح حاجی حضرات ان دنوں میں اللہ کو یاد کرتے ہیں۔

[۶۴] اللہ تعالیٰ اہل حق کا فریق اس لیے بنتے ہیں کہ فریق ثانی خائن اور بددیانت بھی ہے اور ناشکرا بھی۔ بددیانت اور خائن اس لحاظ سے کہ اللہ نے انہیں کعبہ کی تولیت کی امانت سپرد کی تو انہوں نے اہل حق کو کعبہ میں داخل ہونے پر پابندی عائد کر دی اور ناشکرے اس لحاظ سے ہیں کہ ان کو سب نعمتیں تو اللہ نے دی ہیں مگر انہوں نے اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے اپنی ساری نیاز مندیاں اور عبادتیں بتوں کے لئے وقف کر دیں۔

[۶۵] ۞ جہاد کی اجازت کی پہلی آیت:۔ مکہ میں جب مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھائے جا رہے تھے تو اس وقت بعض جرأت مند صحابہ نے ان کافروں سے جنگ کرنے کی اجازت طلب کی تھی مگر اس وقت اللہ نے انہیں ایسی اجازت نہیں دی۔ بلکہ صبر و استقامت سے ظلم کو برداشت کرنے کی ہی تلقین کی جاتی رہی۔ پھر جب مسلمان مدینہ میں منتقل ہو گئے اور ایک چھوٹی سی اسلامی مملکت کی داغ بیل پڑ گئی، جو صرف مدینہ کے ایک چھوٹے سے قصبے تک محدود تھی۔ مسجد نبوی تعمیر ہو گئی جو مسلمانوں کے ہر طرح کے معاملات میں ہیڈ کوارٹر کا کام دیتی تھی۔ مہاجرین کے مسئلہ معاش کو مواخات کے ذریعہ کسی حد تک حل کر لیا گیا۔ یہودی قبائل اور مشرک قبائل سے امن و آشتی کے ساتھ آپس میں رہنے کے معاہدات طے پا گئے۔ اور مسلمان اس قابل ہو گئے کہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ تو ان کو کافروں سے جہاد کرنے کی اجازت مل گئی۔ اور یہی وہ پہلی آیت ہے جس میں مسلمانوں کو مدافعانہ جنگ کی اجازت دی گئی اور اس اجازت کی وجہ صاف الفاظ میں بتا دی گئی کہ یہ اجازت انہیں اس لئے دی جا رہی ہے کہ ان پر مسلسل ظلم ڈھائے جاتے رہے ہیں۔ یہ اجازت ۱ھ ہجری کے آخر میں ملی تھی۔ بعد میں بہت سی ایسی آیات نازل ہوئیں جن میں صرف مدافعانہ جنگ کی اجازت ہی نہیں بلکہ ہر اس قوت سے بھڑ جانے اور جہاد کرنے کا حکم دیا گیا جو اللہ کے دین کے راستہ میں مزاحم ہو رہی ہو۔

[۶۶] اس جملہ کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ اللہ اس بات پر بھی قادر ہیں کہ وہ جہاد و قتال کے بغیر بھی مسلمانوں کی مدد کر کے انہیں غالب کر دیں اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر بھی قادر ہیں کہ وہ مسلمانوں کو بے سر و سامان، تنگدست اور مٹھی بھر جماعت کو ان کفار مکہ پر غالب کر دیں جو اسلحہ، مال و دولت اور تعداد ہر لحاظ سے مسلمانوں سے بہت بڑھ کر ہیں۔ مزید برآں

رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿٤٠﴾ اَلَّذِيْنَ

سوائے اس کے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا [٦٧] پروردگار اللہ ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ ایک دوسرے کے ذریعہ [٦٨] لوگوں کی مدافعت نہ کرتا رہتا تو خانقاہیں، گرجے، عبادت گاہیں اور مساجد جن میں اللہ کو کثرت سے یاد کیا جاتا ہے، مسمار کر دی جاتیں اور اللہ ایسے لوگوں کی ضرور مدد کرتا ہے جو اس (کے دین) کی مدد کرتے ہیں۔ اللہ یقیناً بڑے طاقتور اور سب پر غالب ہے۔(٤٠) (اللہ کے دین کی مدد کرنے والے) وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں

تمام مشرک قبائل اور یہود بھی ان کے معاون و مددگار ہیں۔

[٦٧] مسلمانوں کو یہ سب مصائب اس لئے جھیلنا پڑے اور انہیں صرف اس جرم بے گناہی کی سزا دی جاتی رہی کہ وہ صرف ایک اللہ کے پرستار تھے۔ مکہ میں جس قدر مظالم ڈھائے گئے یہ داستان اتنی طویل اور خونچکاں ہے جس کا بیان یہاں ممکن نہیں اور اس کے لئے ایک الگ کتاب درکار ہے اس بات کا کچھ تھوڑا بہت اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مکی دور میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس پر کئی بار قاتلانہ حملے ہوئے اور سازشیں تیار کی گئیں ان کا مختصر ذکر سورہ مائدہ کی آیت نمبر ٦٧ کے حاشیہ میں گزر چکا ہے۔ (اس کی تفصیل مولانا مرحوم کی الگ تصنیف "محمد رسول اللہ ﷺ...... صبر و ثبات کے پیکر اعظم" میں ملاحظہ فرمایئے۔)

[٦٨] معرکہ حق و باطل میں اللہ اہل حق کی مدد کیوں کرتے ہیں؟ اس آیت میں الناس سے مراد مشرکین اور اللہ کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے والے لوگ ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جب بدی زور پکڑنے لگتی ہے تو اللہ تعالیٰ اہل حق کا ساتھ دے کر، خواہ وہ اہل حق کتنے ہی تھوڑے اور کمزور ہوں، بدی کا زور توڑ دیتے ہیں۔ وہ قوت جس کے اپنے سرنگوں ہونے کا تصور تک بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اللہ انہیں حق و باطل کے معرکہ میں لاکر اور اہل حق کی امداد کر کے انہیں صفحہ ہستی سے ملیا میٹ کر دیتے ہیں۔ اللہ کا یہ قانون اگر جاری و ساری نہ ہوتا تو مشرکین اور باطل قوتیں اہل حق کو کبھی جینے نہ دیتیں نہ ہی ان کے عبادت خانے برقرار رہنے دیتیں جن میں اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے اور ان کے بجائے بس بت خانے مزارات اور آستانے ہی دنیا میں نظر آتے۔

اس آیت میں صومعة کا لفظ راہب قسم کے لوگوں کے عبادت خانوں کے لئے بِیَع (واحد بیعة) عیسائیوں کی عبادت گاہ یا گرجا کے لئے صلوٰت یہودیوں کی عبادت گاہوں کے لئے اور مساجد مسلمانوں کی عبادت گاہوں کے لئے استعمال ہوا ہے اور اب مسلمانوں کو جو جہاد و قتال کی اجازت دی جارہی ہے۔ تو وہ اللہ کے اسی قانون کے مطابق ہے کہ اللہ اہل حق کی امداد کر کے باطل کا سر کچل دے۔ اس آیت میں دراصل مسلمانوں کو ایک بہت بڑی بشارت دی گئی ہے اسی قانون کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ہر زمانہ میں مشرکوں کے غلبہ کو روکا اور اہل حق کو ان سے بچایا ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مشرکوں کے شر سے محفوظ رکھا اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں نصاریٰ کو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ یقیناً مسلمانوں

إِن مَّكَّنَّٰهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَآتَوُا الزَّكَوٰةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ﴿٤١﴾ وَإِن يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٌ وَثَمُودُ ﴿٤٢﴾ وَقَوْمُ

زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں، زکوۃ ادا کریں، بھلے کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں [۶۹]۔ اور سب کاموں کا انجام [۷۰] تو اللہ کے ہاتھ میں ہے (۴۱) (اے نبی!) اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے نوح کی قوم اور قوم عاد اور ثمود بھی جھٹلا چکے ہیں۔ (۴۲) نیز ابراہیم اور

کو بھی مشرکین کے شر سے محفوظ رکھے گا اور انہیں غلبہ عطا کرے گا اور اللہ تعالیٰ ایسے حالات پیدا کر دینے اور اہل ایمان کے حق میں انہیں ساز گار بنانے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔

[۶۹] اسلامی حکومت کی ذمہ داریاں:۔ اس آیت میں اسلامی طرز حکومت کے خدوخال اور حکومت چلانے والوں کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ اسلام میں ریاست کا قیام اصل مقصود نہیں بلکہ یہ کسی دوسرے عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا ایک اسلامی ریاست کی ذمہ داریاں بھی غیر اسلامی ریاستوں سے بہت زیادہ ہیں۔ مثلاً ایک غیر اسلامی ریاست کی ذمہ داریاں محض یہ ہیں کہ پولیس کے ذریعہ امن بحال رکھا جائے۔ انتظامیہ کے ذریعہ حکومت کا کاروبار چلایا جائے اور فوج کے ذریعہ سرحدوں کی حفاظت کی جائے۔ جبکہ ایک اسلامی ریاست یہ ذمہ داریاں بھی پورا کرتی ہے اور یہ اس کا ثانوی فریضہ ہوتا ہے اس کے قیام کے اولین مقاصد یہ ہیں۔

۱۔ پوری ریاست میں نماز اور زکوۃ کا نظام قائم کیا جائے۔

۲۔ مکروہ کاموں کی روک تھام کی جائے اور اچھے کاموں کو فروغ دیا جائے اور ان اغراض کے لئے محکمے قائم کئے جائیں اور اس طرح۔

۳۔ ملک سے ظلم وجور کو ختم کر کے عدل وانصاف قائم کیا جائے اور اس راہ میں جو باطل قوتیں مزاحم ہوں۔ ان کو دور کیا جائے اور اسی کا نام جہاد ہے۔

علاوہ ازیں چونکہ ایک اسلامی ریاست کی بنیاد اخلاقی اقدار پر اٹھتی ہے، اسی لئے اسلام نے حکومت کے انتظام وانصرام کو وہ اہمیت نہیں دی جو اخلاقی اقدار کو دی ہے اور یہی چیز ایک اسلامی طرز حکومت کو دوسرے تمام اقسام حکومت سے ممتاز کرتی ہے۔

اس آیت میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عموماً اور مہاجرین کی خصوصاً اور بالخصوص خلفائے راشدین کی حقانیت اور فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ جن کے ذریعہ وہ تمام امور بطریقِ احسن سرانجام پائے جو اس آیت میں مذکور ہیں۔ اور جن کی داغ بیل خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈالی تھی۔

[۷۰] یعنی ایک ایسی طرزِ حکومت کے قیام کا تصور خواہ موجودہ حالات میں ناممکن نظر آرہا ہو لیکن ہر کام کا انجام تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جو ابابیل کے لشکر سے ہاتھیوں کے لشکر کو بھی پٹوا سکتے ہیں۔ وہ آخر ایک اہل حق کی کمزور سی جماعت کے مقابلہ میں کفار کے کروفر والے لشکر کو مغلوب کیوں نہیں کر سکتے۔

اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ﴿۴۳﴾ وَّاَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ
كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۴﴾ فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ
قَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿۴۵﴾ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَاۤ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ

لوط کی قوم بھی۔(۴۳)اور مدین والوں نے بھی جھٹلایا تھا۔اور موسیٰ کو بھی جھٹلایا گیا۔ان سب کافروں کو[۷۱] میں نے پہلے مہلت دی پھر انہیں پکڑ لیا سو دیکھ لو میری سزا کیسی[۷۲] رہی؟(۴۴) کتنی ہی بستیاں ہیں جو خطار کار تھیں، انہیں ہم نے ہلاک کر دیا تو اب وہ اپنے چھتوں پر گری پڑی ہیں، ان کے کنویں بے کار اور پلستر شدہ محلات ویران[۷۳] پڑے ہیں۔(۴۵) کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل ایسے ہو جاتے جو کچھ سمجھتے سوچتے اور کان ایسے

[۷۱] ❁ عذاب میں تاخیر پر کافروں کا استہزاء:۔ ان آیات میں ایک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہہ کر تسلی دی جا رہی ہے کہ کفار و مشرکین کے انکار، ضد، ہٹ دھرمی اور مخالفت کا واقعہ صرف آپ سے ہی پیش نہیں آیا بلکہ سب سابقہ انبیاء ایسے ہی حالات سے دوچار ہوتے رہے ہیں۔ انہوں نے ایسے مصائب پر صبر کیا تھا۔ لہٰذا آپ بھی صبر کیجئے۔ اور دوسرے یہاں ایک قانون بیان کیا جا رہا ہے جو یہ ہے کہ انبیاء اس وقت مبعوث کئے جاتے ہیں۔ جب معاشرہ میں خاصا بگاڑ پیدا ہو چکا ہو۔ لوگ اللہ وحدہ کو بھول چکے ہوں۔ شرک کی وبا عام ہو۔ غریبوں اور کمزوروں پر ظلم و تشدد ہو رہا ہو۔ حکومت اور قیادت بڑے بڑوں کے ہاتھ میں ہو۔ ان حالات میں جب نبی آکر اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے تو جن بڑے بڑے لوگوں پر اس دعوت کی زد پڑتی ہے وہ سب اس نبی اور اس کی مختصر اور کمزور سی پیروکار جماعت کے مخالف ہو جاتے ہیں۔ جس پر نبی انہیں اللہ کے عذاب اور اس کی گرفت سے ڈراتا ہے اور جب عذاب میں تاخیر ہوتی ہے تو یہ بڑے بڑے فوراً یہ کہنے لگتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو ہم پر عذاب لے کیوں نہیں آتے؟ گویا نبی کی تکذیب کے لئے انہیں ایک اور دلیل ہاتھ آجاتی ہے۔

[۷۲] ❁ نکیر کا لغوی مفہوم:۔ اللہ کے عذاب یا اس کی گرفت کے لئے بھی ایک قانون ہے۔ یہاں ایسی اندھیر نگری نہیں کہ ادھر کسی نے جرم کیا تو فوراً عذاب الٰہی سے وہ تباہ ہو گیا۔ ایسا ہوتا تو یہ دنیا کبھی آباد نہ رہ سکتی۔ اس کے بجائے اس کائنات میں اللہ کا قانون امہال و تدریج کام کرتا ہے اور عذاب کے سلسلہ میں یہی قانون ہے۔ اللہ مجرمین کو مہلت دیتے ہیں۔ تاکہ انہیں انتباہ کے بعد سنبھلنے کا اور توبہ کرنے کا موقع میسر ہو۔ اس دوران اگر وہ سنبھل جائیں تو عذاب الٰہی رک جاتا ہے اور اگر نہ رکیں تو بھی عذاب اپنے معینہ وقت پر ہی آتا ہے اور جب اس کا معینہ وقت آجاتا ہے تو پھر وہ آکے رہتا ہے۔

اس آیت میں عذاب کے لئے نکیر کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کے مادہ نکر میں ناگواری کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اور اجنبیت کا بھی لہٰذا اس کی ضد عرف بھی آتی ہے اور عجب بھی اور نکیر کا لفظ کسی ناگوار بات کے معنوں میں بھی آتا ہے اور کسی ناگوار بات پر گرفت کے معنوں میں بھی۔ پھر نکر کے معنی کسی چیز کی شکل و صورت کو اس طرح بدلنا ہے کہ اس کا حلیہ بگڑ جائے۔ لہٰذا نکیر کے معنی ایسی گرفت یا عذاب ہو گا جو اس عذاب میں ماخوذ لوگوں کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دے۔

[۷۳] یعنی رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کا انجام یہ ہوا کہ ان کی پر رونق اور پر بہار آبادیاں اور شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو گئے۔

بِهَا ۚ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ﴿٤٦﴾ وَيَسْتَعْجِلُونَكَ
بِالْعَذَابِ وَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ ۚ وَإِنَّ يَوْمًا عِندَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ﴿٤٧﴾ وَكَأَيِّن

جن سے وہ کچھ سن سکتے۔ بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، اندھے تو وہ دل [۷۴] ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔(۴۶) یہ لوگ عذاب کے جلد آنے کا مطالبہ کرتے ہیں حالانکہ اللہ کبھی اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا مگر تمہارے پروردگار کا ایک دن تمہارے شمار کے حساب سے ہزار سال [۷۵] کا ہوتا ہے۔(۴۷)

اس عذاب نے صرف آدمیوں کا ستیاناس نہیں کیا بلکہ ان کے تعمیر شدہ مکانات بھی زمین بوس ہوگئے۔ کنوئیں ویران ہوگئے۔ جن سے آسانی سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کبھی یہاں انسانوں کی کثیر تعداد آباد ہوگی۔

[۷۴] غور و فکر کا منبع دماغ ہے یا دل؟ یعنی ان تباہ شدہ بستیوں سے جو ان کے راستہ میں پڑتی ہیں یہ لوگ کبھی بھی عبرت حاصل نہیں کرتے۔۔ نہ یہ سوچتے ہیں کہ ان بستیوں کا ایسا انجام کیوں ہوا؟ مگر یہ باتیں سوچنے کے لئے تو دیدہ بینا چاہئے اور وہ ان میں ہے نہیں۔ عبرت حاصل کرنے کے لئے آنکھ کی بینائی کی ضرورت نہیں دل کی بینائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے کسی شاعر نے کہا ہے:

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ہر مقام پر عقل، فہم، فکر، سوچ کو دل سے متعلق کیا ہے۔ علاوہ ازیں تمام قسم کے جذبات مثلاً محبت، ہمدردی، رحم، اخوت اور اس کے برعکس جذبات مثلاً نفرت، کینہ، بغض حسد سب کا منبع دل کو قرار دیا ہے۔ جبکہ جدید طب کی رو سے کم از کم عقل، فہم، فکر اور سوچ وغیرہ دل سے نہیں بلکہ دماغ سے تعلق رکھتے ہیں۔ بایں ہمہ ہر زبان کے محاورہ میں دل ہی کو ان اشیاء کا مرجع قرار دیا جاتا ہے۔ جیسے مذکورہ بالا شعر میں بھی "دل بینا" استعمال ہوا ہے یا مثلاً:

یہی جی میں آئی کہ گھر سے نکل
ٹہلتا ٹہلتا ذرا باغ چل

اس شعر سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ارادہ سوچ کے بعد پیدا ہوتا ہے جسے دماغ کے بجائے دل سے منسوب کیا گیا ہے اور قرآن لوگوں کے اور بالخصوص قریش کے محاورہ کے مطابق نازل ہوا ہے۔

اور اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ موجودہ نظریہ قابل تغیر و تبدل ہے اور عین ممکن ہے کہ اس تحقیق کے بعد کسی نئی تحقیق کی رو سے ان تمام اشیاء کا اصل مرکز دماغ کے بجائے دل ہی کو قرار دیا جائے اور دماغ کی تمام تر فکر اور سوچ بھی دل کے خیالات اور جذبات کے تابع ہو۔ لہٰذا ہمیں ہر وقت یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ بات اسی ہستی کی سب سے زیادہ صحیح ہو سکتی ہے جو خود ان اشیاء کی خالق اور ہر طرح کے قلبی واردات سے پوری طرح واقف ہے۔

[۷۵] قوموں کی طبعی عمر؟ اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ ہر ابھرنے والی قوم یا تہذیب کی طبعی عمر ہزار سال ہوتی ہے یا ہونی چاہئے۔ بلکہ یہ الفاظ انسان کے عذاب کو جلد طلب کرنے اور اللہ کے قانونِ تدریج و امہال کے مطابق تاخیر میں تقابل

مِّنْ قَرْيَةٍ أَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ أَخَذْتُهَا ۚ وَإِلَيَّ الْمَصِيرُ ﴿٤٨﴾ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا

أَنَا لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٤٩﴾ فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿٥٠﴾

وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿٥١﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن

اور کتنی ہی بستیاں ہیں جو خطاکار تھیں، میں نے پہلے انہیں مہلت دی، پھر انہیں پکڑ لیا اور انہیں واپس تو میرے[۷۶] ہی پاس آنا ہے۔(۴۸)
آپ ان سے کہئے: لوگو! میں تو تمہارے لئے (برے انجام سے) صاف صاف[۷۷] ڈرانے والا ہوں۔(۴۹) سو جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک عمل کئے ان کے لئے تو بخشش بھی ہے اور عزت کی روزی[۷۸] بھی۔(۵۰) اور جو لوگ ہماری آیات[۷۹] کو نیچا دکھانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں تو یہی لوگ اہل جہنم ہیں۔(۵۱) ہم نے آپ سے پہلے جو بھی رسول[۸۰] یا نبی بھیجا تو جب بھی وہ کوئی

کے طور پر ذکر کئے گئے ہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ کسی قوم کے ظلم وجور میں اس قدر زیادتی واقع ہو جائے تو تین چار صدیاں گزرنے پر بھی اسے تباہ کر دیا جائے۔ اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ کوئی قوم یا تہذیب ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ زندہ رہے۔ یہ سب باتیں کسی قوم کے گناہوں کی رفتار پر منحصر ہوتی ہیں۔

[۷۶] یعنی اگر کسی ظالم قوم پر عذاب آنے میں تاخیر ہوئی یا سرے سے اس پر عذاب آیا ہی نہیں تو بھی وہ ہماری گرفت سے بچ کر کہیں جا نہیں سکتی اور اخروی زندگی میں انہیں ان کے اعمال کی پوری پوری سزا مل کے رہے گی۔

[۷۷] یعنی یہ بات میرے اختیار میں نہیں کہ اگر تم عذاب کے جلد آنے کا مطالبہ کرو تو میں فوراً وہ عذاب لے آؤں۔ میرا کام صرف تمہیں تمہارے انجام سے ڈرانا ہے اور یہ کام میں پوری ذمہ داری سے سرانجام دے رہا ہوں۔

[۷۸] رزق کریم یعنی عزت کی روزی کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اہل جنت کو جو کچھ بھی کھانے پینے کو ملے گا اعلیٰ قسم کا ہوگا خواہ پھل ہوں، مشروبات ہوں یا دوسری اشیاء جن پر لفظ رزق کا اطلاق ہوتا ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ انہیں کھانے پینے کو دیا جائے گا وہ اعلیٰ قسم کے برتنوں میں اور عزت سے تختوں پر بٹھا کر پیش کیا جائے گا۔

[۷۹] یعنی ہماری آیات کا انکار کر کے اور پھر اسلام کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر کے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اسی طرح اسلام اور اہل اسلام کو دبا لیں گے تو یہ ان کی بھول ہے البتہ ان کی ان کرتوتوں کے عوض انہیں جہنم کا عذاب ضرور ہوگا۔

[۸۰] رسول اور نبی کا فرق:۔ اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اور نبی دو الگ الگ شخصیتیں ہوتی ہیں۔ نبی عام ہے اور رسول خاص بالفاظ دیگر ہر رسول نبی تو ہوتا ہے جیسے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا﴾ (۱۹:۵۱) "یعنی موسیٰ علیہ السلام رسول بھی تھے اور نبی بھی" لیکن ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔ نبی اور رسول کا فرق پہلے سورہ مائدہ کی آیت ۶۷ کے تحت واضح کیا جا چکا ہے۔

رَسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِهٖ ۚ فَیَنْسَخُ اللّٰهُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ

آرزو[۸۱] کرتا تو شیطان اس کی آرزو میں وسوسہ کی آمیزش کر دیتا۔ پھر اللہ تعالیٰ شیطانی وسوسہ کی آمیزش کو تو دور

[۸۱] تمنیٰ کے معنی تمنا یا آرزو کرنا بھی لغوی لحاظ سے درست ہیں اور تلاوت کرنا بھی۔ ترجمہ میں پہلے معنی کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نبی یا رسول جب کوئی آرزو کرتا ہے (اور نبی یا رسول کی بڑی سے بڑی خواہش یہی ہوتی ہے کہ لوگ اس کی دعوت کو قبول کر لیں اور اس دعوت کو فروغ اور قبول عام حاصل ہو) تو شیطان اس کی خواہش کی تکمیل میں کئی طرح سے رکاوٹیں کھڑی کر دیتا ہے۔ اور ایسا وسوسہ بعض دفعہ تو شیطان نبی اور اس کے پیروکاروں کے دلوں میں ڈالتا ہے۔ جیسے کفار کے کسی حسی معجزہ کے مطالبہ پر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے دل میں یہ خیال آنے لگا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کوئی ایسا معجزہ دکھا دے تو اس سے کئی فائدے حاصل ہو سکتے ہیں یا مثلاً رؤسائے قریش نے آپ ﷺ سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اگر آپ ان ناتواں اور حقیر لوگوں (یعنی کمزور مسلمانوں) کو اپنی مجلس سے کسی وقت اٹھا دیں تو ہم آپ کے پاس بیٹھ کر آپ کی دعوت غور سے سننے کو تیار ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی عدم مخالفت اور اسلام کے غلبہ کی خاطر کافروں کے اس مطالبہ پر غور کرنے کے لئے تیار بھی ہو گئے تھے تو ایسے مواقع پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بروقت تنبیہ ہو جاتی تھی اور اللہ تعالیٰ ایسی آیات نازل فرما دیتا جو خود اسے منظور ہوتا تھا اور اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ شیطان نبی یا رسول کی خواہش کی تکمیل کی راہ میں دوسرے لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالنا شروع کر دیتا ہے۔ جو اللہ کی آیات کی تکذیب کرتے، اسلام کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتے اور اس کے خلاف سازشیں کرنے لگتے ہیں اور یہ لوگ دو ہی قسم کے ہو سکتے ہیں ایک منافقین اور دوسرے وہ لوگ جن کے دل قبولِ حق کے سلسلہ میں پتھر کی طرح سخت ہو چکے ہوں۔ لیکن اللہ تعالیٰ بالآخر ایسے لوگوں کی تمام تر سازشوں اور کوششوں کو ناکام بنا دیتا ہے۔ اور جس مقصد کی تکمیل کے لئے وہ کسی نبی یا رسول کو مبعوث فرماتا ہے اسے پختہ سے پختہ تر بنا دیتا ہے۔

❁ کسی نبی یا رسول کی آرزو میں شیطانی وسوسہ؟ اور اگر تمنیٰ کا معنی تلاوت کرنا سمجھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نبی یا رسول کوئی آیت تلاوت کرتا ہے۔ تو اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے سلسلہ میں شیطان لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈال کر انہیں شکوک و شبہات میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے جب یہ آیت نازل فرمائی کہ ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ﴾ تو بعض لوگوں نے یہ اعتراض جڑ دیا کہ یہ کیا بات ہوئی کہ اللہ کا مارا ہوا جانور تو حرام ہوا اور انسان کا مارا ہوا (ذبح کیا ہو) حلال؟ یہ خالصتاً شیطانی وسوسہ تھا۔ اسی طرح جب یہ آیت نازل ہوئی ﴿اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ (یعنی تم بھی اور اللہ کے سوا جنہیں تم پوجتے ہو سب جہنم کا ایندھن بنیں گے) اور آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھ کر سنائی تو کافروں نے فوراً یہ اعتراض جڑ دیا کہ پرستش تو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور سیدنا عزیر علیہ السلام اور فرشتوں کی بھی کی جاتی رہی ہے تو کیا یہ ہستیاں بھی جہنم کا ایندھن بنیں گی؟ یہ بھی خالصتاً شیطانی وسوسہ تھا۔ ایسے مواقع پر اللہ تعالیٰ دوسری صریح اور محکم آیات نازل فرما کر شکوک و شبہات اور شیطانی وساوس کو دور فرما کر اپنے حکم کی وضاحت فرما دیتے ہیں۔

❁ لات و منات کی سفارش کا من گھڑت قصہ: یہاں یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس آیت کے شانِ نزول

يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ۝ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ

کر دیتا اور اپنی آیات کو پختہ [۸۳] کر دیتا ہے اور اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکمت والا ہے۔(۵۲) تاکہ اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے وسوسہ کو ان لوگوں کے لئے آزمائش بنا دے جن کے دلوں میں (نفاق کا) مرض ہے یا جن کے دل (ایمان لانے کے بارے میں) سخت ہو چکے ہیں۔ بلاشبہ یہ ظالم (حق کی) مخالفت میں دور تک چلے گئے ہیں۔(۵۳)

کے متعلق بعض تفاسیر میں ایک واقعہ مندرج ہے جو یوں ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ سورہ النجم کی تلاوت فرما رہے تھے اور یہ تلاوت مشرکین مکہ بھی پاس بیٹھے سُن رہے تھے۔ جب آپ نے آیات تلاوت فرمائیں۔ ﴿اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى﴾ تو شیطان نے آپ کی آواز میں آواز ملا کر درج ذیل الفاظ یوں پڑھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ الفاظ آپ ہی کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔ (تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى) (یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں یعنی لات، عزیٰ اور منات۔ اور اللہ کے ہاں ان کی شفاعت کی یقیناً توقع کی جا سکتی ہے) چنانچہ جب مشرکینِ مکہ نے یہ الفاظ سنے تو ان کے کلیجے ٹھنڈے ہو گئے کہ ان کے بتوں کا بھلائی سے ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ بڑے غور سے آپ کی تلاوت سننے لگے اور سورہ والنجم کے اختتام پر آپ نے اور دیگر مسلمانوں نے سجدہ کیا تو ساتھ ہی مشرکوں نے بھی سجدہ کیا۔

پھر یہ قصہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کا اگلا حصہ یہ ہے کہ پھر یہ خبر مشہور ہو گئی کہ مسلمانوں اور کفار مکہ میں صلح و سمجھوتہ ہو گیا ہے یہ خبر اڑتی اڑتی جب مہاجرین حبشہ کو ملی تو ان میں سے بعض مہاجر مکہ واپس آ گئے۔ لیکن یہاں آ کر معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی۔

یہ واقعہ کئی لحاظ سے غلط ہے مثلاً:

۱۔ ان تمام روایات کی اسناد مرسل اور منقطع ہیں۔ لہٰذا یہ روایات ساقط الاعتبار ہیں۔ اسی وجہ سے صحاح ستہ میں اس قسم کی کوئی روایت مذکور نہیں۔

۲۔ ان آیات میں "اس شیطانی وسوسہ" سے پہلے ہی بتوں اور دیویوں کی مذمت مذکور ہے اور بعد میں بھی۔ لہٰذا درمیان میں بتوں کا یہ ذکرِ خیر کسی لحاظ سے بھی فٹ نہیں بیٹھتا۔

۳۔ تاریخی لحاظ سے یہ روایات اس لئے غلط ہیں کہ ہجرت کا واقعہ ۵ نبوی میں پیش آیا تھا اور جو مہاجر اس غلط افواہ کی بنا پر واپس مکہ آئے تھے وہ صرف تین ماہ بعد آئے تھے۔ جبکہ یہ سورت مدنی ہے اور ہجرت حبشہ سے واپسی اور اس سورہ کے نزول کے درمیان کم از کم آٹھ نو سال کا عرصہ ہے۔

[۸۲] شیطانی وساوس کا مختلف لوگوں پر مختلف اثر:۔ ان روایات میں دراصل کافروں کے ایک اعتراض کا جواب دیا گیا ہے جو یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ جو بعد میں محکم اور واضح آیات نازل کر کے شکوک و شبہات کو دور کرتے ہیں وہ پہلے ہی ایسے واضح احکام کیوں نہیں بھیج دیتے جن سے شکوک و شبہات پیدا ہی نہ ہوں" یہ اعتراض بھی دراصل کج رو اور کج فطرت کافروں کی عیاری

أُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۴﴾ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ
السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ﴿۵۵﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ۭ يَحْكُمُ

اور اس لئے بھی کہ جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے وہ جان لیں کہ یہ حق ہے آپ کے رب کی طرف سے اور وہ ایمان لائیں اور ان کے دل اس حق کے آگے جھک جائیں اور اللہ تعالیٰ یقیناً ایمان لانے والوں کو سیدھی راہ دکھا[۸۳] دیتا ہے۔(۵۴) اور کافر تو ہمیشہ اس (حق) سے شک میں پڑے ہی رہیں گے۔ تا آنکہ ان پر یا تو یکدم قیامت کی گھڑی آن پہنچے یا کسی منحوس دن کا عذاب[۸۴] ان پر نازل ہو۔(۵۵) اس دن حکومت اللہ ہی کی ہو گی۔

کا غماز ہے اور اس کا جواب سورہ آل عمران کے ابتدا میں آیات متشابہات اور آیات محکمات (آیت نمبر ۷) میں بیان ہو چکا ہے اور یہاں بھی انہیں دوسرے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ مختصراً یہ کہ :

۱۔ شکوک میں مبتلا صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو منافق ہوں یا ہٹ دھرم قسم کے کافر۔

۲۔ ایسی آیات سے بھی ایمانداروں کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے اور برحق ہے۔

۳۔ ایسی آیات دراصل سب لوگوں کے لئے ایک آزمائش اور جانچ ہوتی ہیں۔ جن سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کون کس مقام پر کھڑا ہے؟ آیا وہ منافقوں سے تعلق رکھتا ہے یا اللہ پر ایمان لانے والوں سے؟

[۸۳] ❁ مشرکین کیوں سجدہ ریز ہوئے تھے؟ یعنی ایمان والے فوراً یہ سمجھ جاتے ہیں کہ فلاں بات تو فی الواقع وحی الٰہی ہے یا ہو سکتی ہے اور فلاں بات شیطان کا وسوسہ یا دھوکا ہے۔ واضح رہے کہ مندرجہ بالا واقعہ میں سے اس کا صرف آخری حصہ ہی ایسا ہے۔ جو درست ہے اور صحیح احادیث میں مذکور ہے۔ یعنی کسی موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ النجم تلاوت فرمائی۔ اس کے اختتام پر آپ نے اور مسلمانوں نے سجدہ کیا تو پاس بیٹھے ہوئے مشرکوں نے بھی سجدہ کیا۔ ماسوائے ایک شخص (امیہ بن خلف) کے کہ اس نے کنکریوں کی ایک مٹھی اٹھائی اور اسے اپنی پیشانی سے لگا کر کہنے لگا کہ بس مجھے اتنا ہی کافی ہے (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ تفسیر سورہ والنجم) رہی یہ بات کہ قرآن شریف میں بتوں کی تعریف مذکور ہو یا یہ الفاظ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہوں، ایمان والے فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ یہ بات ناممکنات سے ہے۔ رہا مشرکوں کا مسلمانوں کے ساتھ سجدہ ریز ہو جانا تو اس کی وجہ قرآن کی اپنی تاثیر ہے جس کی بنا پر وہ قرآن کو جادو اور آپ کو جادوگر کہا کرتے تھے اور مسلمانوں پر قرآن بلند آواز سے پڑھنے پر پابندی لگا رکھی تھی کہ اس سے ان کی عورتیں اور بچے متاثر ہوتے ہیں۔ حالانکہ وہ خود بھی قرآن کی تاثیر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

[۸۴] یعنی ان ہٹ دھرم کافروں کا یہ حال ہے کہ یہ جوتے کھا کر ہی سیدھے رہ سکتے ہیں۔ اس سے پہلے یہ ماننے والے نہیں یا تو ان کا یہ شک قیامت کا دن دیکھ کر دور ہو گا۔ جب سب حقائق اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ یا عذاب الٰہی کا منحوس دن دیکھ کر،

بَيْنَهُمْ ۚ فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٥٦﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَ
كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿٥٧﴾ وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ
قُتِلُوا أَوْ مَاتُوا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللَّهُ رِزْقًا حَسَنًا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴿٥٨﴾
لَيُدْخِلَنَّهُم مُّدْخَلًا يَرْضَوْنَهُ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَعَلِيمٌ حَلِيمٌ ﴿٥٩﴾ ذَٰلِكَ ۖ وَمَنْ عَاقَبَ

وہ ان کے درمیان[٨٥] فیصلہ کردے گا۔ تو جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے وہ تو نعمتوں والے باغات میں ہوں گے۔(٥٦) اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا تو ایسے لوگوں کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہوگا۔(٥٧)

جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی پھر شہید ہوئے یا[٨٦] مر گئے اللہ انہیں اچھا رزق دے گا اور یقیناً اللہ ہی بہترین رازق ہے(٥٨) وہ انہیں ایسی جگہ داخل کرے گا جس سے وہ خوش ہو جائیں گے اور اللہ یقیناً سب کچھ جاننے والا، بردبار[٨٧] ہے۔(٥٩) یہ (تو ان لوگوں کا معاملہ ہے) اور جو شخص اتنا ہی بدلہ لے جتنی اس پر سختی

جس سے ان کے بچنے کی کوئی صورت نہ ہوگی اور نہ ہی اس دن کے بعد انہیں اگلا دن دیکھنا نصیب ہوگا۔

[٨٥] یعنی آج تو ہر شخص خواہ وہ ایماندار ہے یا کافر ہے یا منافق ہے یا مشرک ہے وہ یہی سمجھ رہا ہے کہ وہ حق پر ہے اور جو کچھ وہ کر رہا ہے اچھا کر رہا ہے۔ لیکن قیامت کے دن سب کو روزِ روشن کی طرح علم ہو جائے گا کہ آج صرف اکیلے اللہ ہی کی حکمرانی ہے۔ اور ان کے معبودوں یا دیوتاؤں کے کارساز نہ ہونے کا سارا فریب کھل جائے گا اور اللہ تعالیٰ شہادتیں قائم کرکے یہ فیصلہ کردیں گے کہ حق پر کون تھا اور جھوٹا کون؟ یا فلاں شخص کتنا حصہ حق پر تھا اور کتنا باطل پر؟ پھر اسی فیصلہ کے مطابق لوگوں کو بدلہ دیا جائے گا۔ اہل حق تو جنت کی نعمتوں سے محظوظ ہوں گے اور حق کو جھٹلانے والوں کو رسوا کن عذاب کا مزا چکھنا ہوگا۔

[٨٦] اہلِ ایمان کا ذکر کرنے کے بعد خصوصی طور پر مہاجرین کا ذکر فرمایا۔ جنہوں نے اللہ اور اس کے دین کی خاطر اپنے گھر بار، جائیداد اور وطن مالوف کو خیرباد کہا اس کے بعد خواہ جہاد کرکے شہید ہو جائیں یا طبعی موت سے وفات پا جائیں ان کی ہجرت کا عمل ہی اتنا گرانقدر ہے جس کے عوض اللہ انہیں ہزارہا گنا بہترین کھانے پینے کا سامان اور بہترین رہائش عطا فرمائیں گے۔ اتنا بہتر کہ جس سے وہ خوش ہو جائیں گے۔

[٨٧] یعنی اللہ خوب جانتا ہے کہ کس نے کس قدر خلوص نیت کے ساتھ ہجرت کی تھی۔ لہٰذا وہ اتنا ہی اسے زیادہ اجر دے گا اور یہاں حلیم کے لفظ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر کسی مہاجر سے کچھ خطا ہو بھی گئی تو اللہ تعالیٰ اس سے مؤاخذہ نہیں کریں گے اور دوسرا یہ کہ جن لوگوں نے مہاجرین کو ہجرت پر مجبور کیا تھا اللہ خوب جانتا ہے۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ حلیم ہے لہٰذا ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ فوراً عذاب نازل نہیں کرتے۔

بِمِثْلِ مَا عُوقِبَ بِهِ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنصُرَنَّهُ اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَعَفُوٌّ غَفُورٌ ﴿٦٠﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَأَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ﴿٦١﴾

ہوئی تھی۔ پھر (از سر نو) اس پر زیادتی کی جائے تو اللہ ضرور اس کی مدد[۸۸] کرے گا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا[۸۹] اور درگزر کرنے والا ہے۔(۶۰) یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں[۹۰] داخل کرتا ہے اور اللہ سب کچھ سنتا دیکھتا ہے۔(۶۱)

[۸۸] مظلوم کی آہ سے بچنے کا حکم خواہ وہ کسی بھی قوم سے تعلق رکھتا ہو:۔ پچھلی دو آیات میں ان مہاجر مسلمانوں کا ذکر تھا جو کفار کے ظلم و تشدد سے مجبور ہو کر گھر بار چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے اور وہ ظلم کا بدلہ لے ہی نہ سکتے تھے۔ اب ان لوگوں کا ذکر ہے جو بدلہ لینے کی طاقت رکھتے ہوں۔ انہیں یہ ہدایت کی جا رہی ہے کہ اگر وہ بدلہ لینا چاہیں تو اتنا ہی بدلہ لیں جس قدر ان پر زیادتی ہوئی ہے۔ اور اگر بدلہ لینے میں زیادتی کریں گے تو یہ خود ظالم ٹھہریں گے اس صورت میں اللہ ان کی مدد کریں گے جو مظلوم ہیں۔ کیونکہ اللہ ہمیشہ مظلوم کی مدد کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا معاذ بن جبل کو جب یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو جہاں اور بہت سی نصیحتیں ارشاد فرمائیں وہاں سب سے آخر میں اور بطور خاص جو نصیحت فرمائی یہ تھی۔ ”وَاتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُومِ فَإِنَّهُ لَيْسَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ اللّٰهِ حِجَابٌ“ (مسلم۔ کتاب الایمان۔ باب الدعاء الی الشهادتین و شرائع الاسلام) یعنی مظلوم کی بددعا سے بچے رہنا کیونکہ مظلوم کی پکار اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا۔ اسی مضمون کو شیخ سعدیؒ نے بڑے خوبصورت انداز میں یوں بیان کیا ہے۔

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از در حق بہر استقبال می آید

یعنی مظلوموں کی آہ سے ڈرتے رہنا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اس آہ کی قبولیت خود اسے لینے کو آگے آتی ہے۔

[۸۹] زیادتی کے برابر بدلہ لینے کا جواز یا رخصت:۔ اس آیت میں صرف زیادتی کے برابر بدلہ لینے کی اجازت دی گئی ہے اور اگر اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے تو اللہ اس بات کو قطعاً پسند نہیں کرتے اور اسے ظلم شمار کیا جائے گا۔ اس اجازت کے باوجود اگر بدلہ نہ لیا جائے تو یہی بات اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ کیونکہ وہ خود بھی معاف کرنے والے اور درگزر کرنے والے ہیں لہٰذا بندوں کو بھی چاہئے کہ وہ اپنے ذاتی اور معاشرتی معاملات میں عفو و درگزر کی عادت کو اپنائیں اور ہر وقت بدلہ لینے کے درپے نہ ہوا کریں۔

[۹۰] کائنات میں اللہ تعالیٰ کے تصرف اور قدرت کا یہ عالم ہے کہ دن اور رات کو الٹتا پلٹتا رہتا ہے کبھی دن بڑے اور راتیں چھوٹی ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور کبھی راتیں گھٹنا اور دن بڑے ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اب جو ہستی کائنات میں اس قدر تصرف کی قدرت رکھتی ہے کیا وہ ظالم سے بدلہ نہ لے سکے گی۔ لہٰذا جہاں تک ہو سکے ظلم اور زیادتی سے اجتناب کرو اور اس سے بہتر یہ روش ہے کہ اگر کوئی زیادتی کرے تو اسے معاف کر دیا کرو۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ
الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿٦٢﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً ۡ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ
مُخْضَرَّةً ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿٦٣﴾ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ
وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿٦٤﴾ ۧ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ ع

یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی حق ہے اور اللہ کے سوا جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں وہ سب کچھ باطل ہے اور اللہ ہی عالی شان [۹۱] اور کبریائی والا ہے۔(۶۲)
کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمان سے بارش برساتا ہے تو اس سے زمین سرسبز ہو جاتی ہے۔ وہ بڑا [۹۲] باریک بین اور ہر چیز سے باخبر ہے۔(۶۳) جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کا ہے بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر ایک سے بے نیاز [۹۳] اور حمد کے لائق ہے۔(۶۴) کیا تم دیکھتے نہیں کہ جو کچھ زمین میں ہے وہ اللہ نے تمہارے تابع فرمان بنا دیا ہے

[۹۱] پھر جو ہستی کائنات میں اتنا تصرف کرنے پر قدرت رکھتی ہے اور اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے کو تصرف میں ذرہ بھر بھی دخل نہیں۔ تمام ظاہری اور باطنی اسباب اور ان کے نتائج پر اللہ اکیلے کا کنٹرول ہے تو پھر حق بات یہی ہے کہ اپنی حاجات کے لیے اکیلے اللہ ہی کو پکارا جائے۔ کیونکہ وہی سب سے بڑی قوت ہے اور قوت والا ہے اور وہی سب سے بڑا ہے جس نے کائنات کی ایک ایک چیز کو اپنے قبضہ اختیار میں لے رکھا ہے اور جو لوگ ایسے قدرتوں والے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو پکارتے ہیں وہ غلط کار ہیں اور غلطی پر ہیں۔ کیونکہ دوسروں کے پاس کوئی قدرت و تصرف ہے ہی نہیں۔

[۹۲] ❁ لطیف کا لغوی مفہوم:۔ یہاں لطیف کا لفظ کا استعمال ہوا ہے اس کے مادہ ل ط ف میں بنیادی طور پر دو باتیں پائی جاتی ہیں (۱) دقت نظر اور (۲) نرمی (مقاییس اللغۃ) اور لطیف کے معنوں میں کبھی تو ایک ہی معنی پایا جاتا ہے۔ جیسے اس آیت میں دقیقہ رس (یا ایک ہی معاملہ کی چھوٹی چھوٹی جزئیات پر تک نظر رکھنے والا) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور کبھی یہ بیک وقت دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ تمام مخلوق کی چھوٹی سے چھوٹی ضروریات اور تکلیفات کا علم رکھنا پھر ان کا ازالہ بھی کرنا۔ اس صورت میں لطیف کا ترجمہ مہربان کر لیا جاتا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی قدرت و تصرف کی ایک اور دلیل پیش کی گئی ہے۔ یعنی پانی اور خشک مٹی کے اجزاء باہم ملتے ہیں تو زمین کے اجزا پھول جاتے ہیں اور ان میں روئیدگی کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اب جتنے بیج اس خشک زمین میں دبے پڑے تھے یا گھاس پھونس کی جڑیں خشک ہو کر زمین میں مل گئی تھیں ان میں جان پڑ جاتی ہے اور اس خشک اور مردہ بیج میں اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کی نرم و نازک کونپل زمین کی سخت سطح کو چیر پھاڑ کر زمین سے باہر نکل آتی ہے۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جب وہ سبزہ زار بن کر لہلہانے لگتی ہے اور اس سارے عمل کے دوران اللہ تعالیٰ کا لطف یا دقت نظر ہی وہ چیز ہوتی ہے جس کی بنا پر ایسے مثبت نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

[۹۳] چونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کے خالق و مالک ہیں۔ لہٰذا ہر چیز اپنی ہستی اور اس کی بقاء تک کے لئے اللہ تعالیٰ کی محتاج ہوئی۔ جبکہ وہ خود کسی کے محتاج نہیں۔ تمام کائنات کے وجود سے پہلے بھی اس کی ہستی قائم و دائم تھی اور وجود کے بعد بھی وہ اس

تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۭ وَيُمْسِكُ السَّمَاۗءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۵﴾ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ۡ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ

اور کشتی کو بھی جو اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے۔ اور وہ آسمان کو یوں تھامے ہوئے ہے کہ وہ اس کے اِذن کے بغیر زمین پر گر نہیں سکتا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بندوں پر [۹۴] ترس کھانے والا اور نہایت رحم والا ہے۔ (۶۵) وہی تو ہے جس نے تمہیں زندگی دی، پھر تمہیں [۹۵] مارتا ہے پھر تمہیں (دوبارہ) زندہ کرے گا اور حقیقت یہ

سے بے نیاز ہیں۔ لہٰذا کوئی اس کی حمد و ثنا بیان کرے یا نہ کرے اس سے انہیں کچھ فرق نہیں پڑتا (البتہ حمد و ثنا بیان کرنے والے کی اپنی ذات کو ضرور فائدہ پہنچ جاتا ہے) کیونکہ وہ اپنی ذات میں خود ہی محمود ہیں۔

[۹۴] انسان پر اللہ تعالیٰ کے چار بڑے احسانات:۔ اس آیت اور اس سے پہلی آیات میں دراصل ایسی باتوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے بغیر انسان کا اس دنیا میں زندہ رہنا اور باقی رہنا مشکل تھا۔ اللہ کا سب سے پہلا احسان تو یہ ہے کہ زمین سبزہ اگاتی ہے اور اسی سبزہ پر انسان کیا دوسرے جانوروں کی زندگی کا بھی انحصار ہے۔ اگر زمین میں پانی کی آمیزش سے روئیدگی کی قوت پیدا نہ ہوتی تو کسی بھی جاندار کا اس زمین پر زندہ رہنا مشکل تھا اللہ کا دوسرا احسان انسان پر یہ ہے کہ اس نے زمین کی ہر چیز کو اس کے لئے مسخر کر دیا ہے۔ ورنہ زمین پر بسنے والے درندے اسے چیر پھاڑ کر کھا جاتے اور اس کی ہستی کا خاتمہ کر سکتے تھے۔ پھر کئی ایسے عظیم الجثہ جانور بھی ہیں کہ انسان محض ان کا ایک نوالہ ہی بنتا ہے۔ لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے اتنی عقل دی کہ وہ زمین کی ہر بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز کو اپنے کام میں لا رہا ہے اور دوسری اشیاء کو اللہ تعالیٰ نے ایسے طبعی قوانین کا پابند بنا دیا ہے کہ انسان انہیں معلوم کر کے ہر چیز سے گوناگوں فائدے حاصل کر رہا ہے۔ انسان ان اشیاء میں جیسی بھی قطع و برید یا تصرف کرے، کوئی چیز اس کے آگے دم نہیں مار سکتی، اسی احسان کا ایک پہلو یہ ہے کہ انسان سمندری سفر کے قابل ہو گیا ہے۔ وہ سمندر جو زمین کے تین چوتھائی حصہ پر پھیلا ہوا ہے۔ جہاں کوئی نشان راہ بھی نہیں ہوتا نہ ہی سمت معلوم ہو سکتی ہے اور اس کی تلاطم خیز موجیں انسان جیسی کمزور مخلوق کو آن کی آن میں فنا کر کے میلوں گہرائی تک پہنچا سکتی ہیں۔ جہاں سے کبھی اس کا سراغ تک نہ مل سکے۔ اللہ تعالیٰ نے سمندر کو طبعی قوانین کا پابند بنا کر اسے بھی انسان کے تابع کر دیا ہے۔

اور تیسرا احسان اللہ کا یہ ہے کہ فضائے بسیط میں لاکھوں ہمہ وقت گردش میں مصروف سیارے اپنے اپنے مدار پر چلنے کے لئے طبعی قوانین کے اس قدر پابند اور ان میں جکڑے ہوئے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی زمین پر گر کر زمین کو پاش پاش اور انسان کو صفحہ ہستی سے مٹا نہیں سکتا۔ یہ سب اللہ کے اذن سے ہی جکڑے ہوئے ہیں۔ پھر یہ اللہ کا اذن ہی ہو گا کہ ایک وقت یہ اجرامِ فلکی آپس میں ٹکرا جائیں گے اور قیامت بپا ہو جائے گی۔ اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ ہر آفت سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔

[۹۵] انسان کو اللہ کا زندگی بخشن ایسا احسان ہے جسے ہر شخص احسان سمجھتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا انسان کو موت دینا اس لحاظ سے احسان ہے کہ اگر آدم سے لے کر موجودہ دور تک تمام مخلوق زندہ رہتی تو انسان کو زمین پر کھڑا ہونے کو بھی جگہ نہ ملتی۔

لَكَفُورٌ ﴿٦٦﴾ لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ
رَبِّكَ ۖ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ ﴿٦٧﴾ وَإِن جَادَلُوكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٦٨﴾
اللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٦٩﴾ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي
السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۗ إِنَّ ذَٰلِكَ فِي كِتَابٍ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴿٧٠﴾ وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ

ہے کہ انسان بڑا ہی منکر حق ہے۔(۶۶) ہم نے ہر ایک امت کے لئے عبادت کا ایک [۹۶] طریقہ مقرر کیا جس پر وہ چلتے ہیں۔ لہٰذا انہیں اس معاملہ میں آپ سے جھگڑنا نہیں چاہئے [۹۷]۔ آپ اپنے رب کی طرف دعوت دیں۔ بلاشبہ آپ راہ راست پر ہیں۔(۶۷) اور اگر وہ آپ سے جھگڑا کریں تو آپ ان سے کہئے کہ: "جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ اسے خوب جانتے ہیں۔(۶۸) اللہ ہی قیامت کے دن تمہارے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کریں گے جن میں تم اختلاف کر رہے ہو"(۶۹) کیا تم جانتے نہیں کہ اللہ وہ سب کچھ جانتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ بلاشبہ یہ سب [۹۸] کچھ ایک کتاب (لوح محفوظ) میں درج ہے۔ اللہ کیلئے یہ بات بالکل آسان ہے۔(۷۰) یہ لوگ اللہ کے علاوہ ان کی عبادت

وسائلِ معاش اور ضروریاتِ زندگی کا مہیا ہونا تو دور کی بات ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ساتھ ہی ساتھ پہلوں کو موت کی نیند سلا کر آنے والوں کے لئے جگہ اور ضروریات زندگی مہیا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح مرنے کے بعد زندہ کرنا پھر ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق جزا و سزا دینا بھی اللہ تعالیٰ کا انسان پر احسانِ عظیم ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کو اس اخروی زندگی اور اس کی تفصیلات سے بذریعہ وحی مطلع کر کے انجام سے خبردار نہ کرتے تو طاقتور اور درندہ صفت انسان کمزور انسانوں کو کچا چبا ڈالتے اور انہیں کبھی جینے کا حق نہ دیتے۔ جس کا بالآخر نتیجہ یہ ہوتا کہ دنیا میں مسلسل جنگ اور بدامنی کی وجہ سے انسان کا وجود ہی صفحہ ہستی سے ختم ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ کے اتنے احسانات کے باوجود انسان کی حالت یہ ہے کہ وہ نہ کسی ایسے حقائق پر غور کرتا ہے اور نہ ہی اللہ کے ان احسانات کے لئے اس کا شکر گزار ہوتا ہے۔

[۹۶] مَنسک کا معنی اور منسک اور منہاج کا فرق:۔ منسک کا لفظ اگرچہ حج کے شعائر و احکام اور ادائیگی سے مختص ہو گیا ہے اور مناسکِ حج سے مراد اعمال اور ارکانِ حج ادا کرنے کے مقامات، قاعدے اور طریقے ہے اور نسک اس قربانی کو کہتے ہیں جو حج کے دوران کی جاتی ہے۔ تاہم اس لفظ کے معانی میں یہ وسعت ہے کہ اس کا اطلاق تمام عبادات کے طریق کار پر ہوتا ہے اور یہ لفظ منہاج سے اخص ہے۔ منہاج کے معنی میں تمام شرعی احکام کی ادائیگی کا طریق کار شامل ہے اور یہ طریقِ کار بھی اللہ ہی کی طرف سے بتایا جاتا ہے اور مَنسک کا اطلاق صرف عبادات کے طریق کار پر ہوتا ہے۔

[۹۷] عبادات کا طریق کار ہر نبی اور اس کی امت کے لئے مختلف رہا ہے اور اس میں وقت کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا جاتا رہا ہے۔ اور چونکہ یہ طریق کار بھی اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے لہٰذا کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس بارے میں آپ سے بحث یا جھگڑا کرے۔ کیونکہ اس زمانہ میں یہی طریق کار درست اور برحق ہے۔ جو آپ ﷺ کو بتایا جا رہا ہے۔

[۹۸] یعنی مختلف انبیاء کی شریعت یا عبادات کے طریقوں میں تبدیلی اور اس کی وجوہ سب کچھ اللہ کے علم کے مطابق اور پہلے

مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿۷۱﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ

کرتے ہیں جن کے لئے نہ تو اللہ نے کوئی دلیل اتاری ہے اور نہ ہی خود[۹۹] انہیں کچھ علم ہے۔ ان ظالموں کا کوئی بھی مددگار[۱۰۰] نہ ہوگا۔(۷۱) اور جب ان پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو آپ ان کے چہروں پر ناگواری کے آثار دیکھتے ہیں۔ (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) ابھی وہ ان لوگوں پر جھپٹ پڑیں جو انہیں ہماری آیات سناتے ہیں۔ آپ ان سے کہئے: میں آپ کو بتاؤں اس سے بدتر چیز کیا ہے؟ آگ[۱۰۱] جس کا اللہ نے کافروں سے وعدہ

سے ہی طے شدہ ہیں اور اللہ کی کتاب میں پہلے ہی سے ثبت ہیں۔ پھر اللہ کو یہ بھی علم ہے کہ کون لوگ اس واضح سی بات پر بھی جھگڑے پیدا کرنے والے ہیں۔ اللہ کو ان سب باتوں کا پہلے سے علم ہونا، پھر ان جھگڑا کرنے والوں کے درمیان فیصلہ کر کے انہیں ان کی ہٹ دھرمی کی سزا دینا اللہ تعالیٰ کی وسعتِ علم اور عظیم قدرت کے مقابلہ میں بالکل ہیچ اور معمولی باتیں ہیں۔

[۹۹] ❁ اللہ کے دوسروں کو اختیارات تفویض کرنے پر کوئی علمی دلیل نہیں:۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کسی کتاب میں کہیں بھی یہ ذکر موجود نہیں کہ اس نے فلاں فلاں ہستی کو فلاں فلاں اختیارات تفویض کر رکھے ہیں۔ لہٰذا ان کاموں میں تم ان سے رجوع کر کے ان سے اپنی حاجات طلب کر سکتے ہو۔ نہ ہی انہیں کسی علمی تحقیق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ امور کائنات میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کو بھی تصرف کا حق حاصل ہے۔ اور اس بنا پر ان کی بھی عبادت کرنا درست ہے۔ لہٰذا جو معبودان لوگوں نے بنا رکھے ہیں اور ان سے کئی صفات اور اختیارات منسوب کر دیئے گئے ہیں ان کے آستانوں پر دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ نذریں، نیازیں چڑھائی جاتی ہیں بعض کے طواف اور اعتکاف تک بھی کئے جاتے ہیں ان کی حقیقت جاہلانہ توہمات کے سوا کچھ بھی نہیں۔

[۱۰۰] یعنی اللہ تو اس لئے ان کی مدد نہیں کریں گے کہ ان ظالموں نے اللہ کے شریک بنا کر ان کو ناراض کر لیا اور ان کے معبود اس لیے مدد نہیں کر سکیں گے کہ ان میں اتنی قدرت ہی نہیں۔ پھر ایسے لوگوں کے ظلم اور حماقت میں کیا شک ہو سکتا ہے؟

[۱۰۱] ❁ مشرکوں اور کافروں کی توحیدِ خالص سے چڑ اور بدکنا:۔ یعنی مشرکوں کے سامنے جب اللہ تعالیٰ کی ایسی آیات پڑھی جاتی ہیں جن میں خالص توحید کا ذکر ہوتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ تصرف امور کے جملہ اختیارات صرف اللہ کو ہیں اور کوئی دوسرا ان میں شریک نہیں تو ان مشرکوں کے تیور بگڑنے لگتے ہیں اور وہ یوں کبیدہ خاطر ہونے لگتے ہیں کہ ابھی ایسی آیات سنانے والے پر حملہ کر دیں گے یا چپت رسید کر دیں گے۔ آپ ﷺ انہیں کہئے کہ بیشک تمہیں یہ آیات ناگوار ہیں۔ لیکن اس ناگواری کا انجام اس سے بھی زیادہ ناگوار ہوگا اور وہ ہے آگ کا عذاب۔ اب تم خود ہی فیصلہ کر لو کہ ان دونوں ناگوار باتوں میں سے کون سی بات تمہیں قابل قبول ہے؟

ع ۹ كَفَرُوْا وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۲﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ
تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ
الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ

کر رکھا ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ (۷۲) لوگو! تم سے ایک مثال بیان کی جاتی ہے اسے ذرا غور سے سنو۔ جن لوگوں کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ اگر سارے بھی اکٹھے ہو جائیں تو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو اس سے چھڑا بھی نہیں سکتے۔ چاہنے والا[۱۰۲] بھی ناتواں اور جس سے مدد طلب کی جا رہی ہے وہ بھی (ایسا ہی) ناتواں ہے۔ (۷۳) ان لوگوں نے اللہ کی قدر پہچانی[۱۰۳] ہی نہیں جیسا

[۱۰۲] طالب اور مطلوب دونوں کی بے کسی اور بے بسی:۔ اللہ تعالیٰ نے اس مثال میں مکھی کا انتخاب اس لیے فرمایا کہ وہ بہت چھوٹی اور حقیر سی مخلوق ہے۔ جس سے سب لوگوں کو نفرت اور گھن آتی ہے۔ اب جو لوگ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے سے اپنی حاجات طلب کرتے ہیں انہوں نے خود اپنے آپ کو کمزور سمجھ کر ہی اپنے معبود سے حاجت طلب کی۔ لہٰذا اس کمزوری میں تو کوئی شبہ ہی نہ رہا۔ اور جس سے مراد طلب کی جا رہی ہے اس کا اپنا یہ حال ہے کہ وہ ایک مکھی جیسی حقیر مخلوق بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ بلکہ ان کے سامنے جو نذریں، نیازیں پیش کی جا رہی ہیں ان پر مکھی بیٹھ کر اس کا حقیر سا حصہ اڑا لے جائے تو وہ اس سے واپس بھی نہیں لے سکتا۔ پھر یہ کسی ایک معبود کا مسئلہ نہیں سارے معبود مل کر بھی نہ ایک مکھی تک پیدا کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی چھینی ہوئی چیز اس سے چھڑا سکتے ہیں۔ پھر اس سے بڑھ کر ان کی بے بسی اور کمزوری کیا ہو سکتی ہے؟ اب اگر یہ مشرک اس ایک بات پر ہی غور کر لیں تو انہیں اپنی حماقت کا پوری طرح علم ہو سکتا ہے کہ کمزوری اور بے بسی میں ان کے معبود ان سے بھی بڑھ کر ہیں۔ لہٰذا ان سے حاجات طلب کرنا نہایت احمقانہ بات ہے۔

[۱۰۳] کائنات کی وسعت اور اس پر کنٹرول سے اللہ کی ہستی اور قدرت پر دلیل:۔ یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت پر کبھی غور ہی نہیں کیا۔ جو اس پوری کائنات کو اور خود ان کو بھی عدم سے وجود میں لائے ہیں۔ اور انہیں زندگی بخشی ہے اگر وہ اللہ تعالیٰ کے کسی بھی کارنامے پر غور کرتے تو کبھی اس کے اختیار و تصرف میں کمزور اور بے بس قسم کی مخلوق کو شریک بنانے کی حماقت نہ کرتے۔ مثلاً: کائنات کی وسعت کا یہ حال ہے کہ موجودہ تحقیقات کی رو سے سورج کے گرد نو سیارے گردش کر رہے ہیں جن میں تیسرے نمبر پر ہماری زمین ہے اور اس کا سورج سے فاصلہ ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے۔ آخری نواں سیارہ پلوٹو ہے جس کا سورج سے ۳ ارب ۶۸ کروڑ میل فاصلہ ہے جسامت کے لحاظ سے بھی ہماری زمین دوسرے سیاروں کی نسبت بالکل حقیر ہے۔ ہمارے اس نظامِ شمسی میں سورج ایک ستارہ یا ثابت ہے۔ کائنات میں ایسے ہزاروں ستارے یا ثابت مشاہدہ کئے جا چکے ہیں اور یہ ستارے یا سورج جسامت کے لحاظ سے ہمارے سورج سے بہت بڑے ہیں۔ ہمارے نظام شمسی سے بہت دور تقریباً ۴۳ کھرب کلومیٹر کے فاصلے پر ایک سورج موجود ہے جو ہمیں محض روشنی کا ایک چھوٹا سا نقطہ معلوم ہوتا ہے اس کا نام الفا قنطورس (Alfa Centauris) ہے۔ ایسے ہی دوسرے سورج اس سے بھی دور ہیں اور خلا میں ہر طرف ایک دوسرے سے

قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۷۴﴾ اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ

کہ پہچاننا چاہئے تھی۔ اللہ تعالیٰ تو بڑا طاقتور اور ہر چیز پر غالب ہے۔(۷۴) اللہ (پیغام رسانی کے لیے) فرشتوں میں سے بھی رسول[۱۰۴] چن لیتا ہے اور لوگوں میں سے بھی۔ بیشک اللہ سب کچھ

الگ الگ بکھرے پڑے ہیں۔ رات کے وقت وہ آسمان پر روشنی کے ننھے منے نقطوں کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ یہ سب ستارے دراصل بہت بڑے اجسام ہیں اور ہمارے سورج کی طرح یہ بھی خود روشن ہیں۔

جسامت کے لحاظ سے سیاروں اور ستاروں کو چار قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی قسم کو سفید بونے کہا جاتا ہے ان کی اوسط جسامت مشتری کے برابر سمجھی گئی ہے اور مشتری کی جسامت نظام شمسی کے باقی آٹھ سیاروں (جن میں ہماری زمین بھی شامل ہے) کے برابر ہے۔ ہمارا سورج دوسری قسم میں آتا ہے اور اس کی جسامت ہماری زمین سے ۱۳ لاکھ ۳۷ ہزار گنا زیادہ ہے گویا ہمارا اتنا بڑا سورج بھی بڑے ستاروں میں شامل نہیں ہے۔ تیسری قسم کے ستاروں کو دیو (Gaints) اور چوتھی قسم کے ستاروں کو شاہ دیو (Super Gaints) کہا جاتا ہے۔ ایسے ستاروں کے مقابلہ میں ہمارا سورج ایسے ہی ہے جیسے سورج کے مقابلہ میں ہماری زمین ہے۔ ایسے ہی ایک ستارے کا نام قلب عقرب (Antares) ہے۔ اگر اسے اٹھا کر نظام شمسی میں رکھا جائے تو سورج سے لے کر مریخ تک تمام علاقہ اس میں پوری طرح سما جائے گا۔ جبکہ مریخ کا سورج سے فاصلہ ۱۴ کروڑ ۱۵ لاکھ میل ہے۔ گویا قلب عقرب کا قطر ۲۸ کروڑ ۳۰ لاکھ میل کے لگ بھگ ہے۔

مزید برآں کائنات میں لاتعداد مجمع النجوم اور کہکشائیں ہیئت دانوں کو ورطہ حیرت میں ڈال کر ان کے علم کو ہر آن چیلنج کر رہی ہیں پھر اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جوں جوں ہیئت دان مزید طاقتور اور جدید قسم کی دوربینیں استعمال کر رہے ہیں، توں توں اس بات کا بھی انکشاف ہو رہا ہے کہ کائنات میں مزید وسعت پیدا ہو رہی ہے۔ سیاروں کے درمیانی فاصلے بھی بڑھ رہے ہیں اور نئے نئے اجرام بھی مشاہدہ میں آ رہے ہیں۔

اب اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہماری زمین سورج کے گرد چھیاسٹھ ہزار چھ سو میل فی گھنٹہ کی برق رفتاری سے گردش کر رہی ہے۔ اسی طرح کائنات میں تمام سیارے کم وبیش اسی برق رفتاری سے محو گردش ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اسی طرح جکڑا ہوا ہے۔ کہ نہ وہ آپس میں ٹکراتے ہیں نہ ان کی چال میں فرق آتا ہے اور نہ ہی اپنے مدار سے ایک انچ بھی ادھر ادھر ہو سکتے ہیں۔ اور جوں جوں انسان اللہ تعالیٰ کی ان قدرتوں میں غور کرتا ہے تو اس کی عظمت و جلال کا سکہ اس کے دل پر نقش ہوتا جاتا ہے۔

اب ایک طرف تو اس قدر عظمت و جلال اور قوت و قدرت والی اللہ تعالیٰ کی ہستی ہے اور دوسری طرف اس کے ساتھ ایسے معبودوں اور حاجت رواؤں کو شریک کیا جا رہا ہے جو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ ایسے بے بس ہیں کہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو اسے مکھی سے چھڑانے کی قدرت بھی نہیں رکھتے۔ غور فرمائیے کیا ان دونوں کی قدرت میں کوئی نسبت قائم کی جاسکتی ہے؟ اور حقیقت یہ ہے کہ جو دوسروں کو اللہ کے شریک بناتے ہیں تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ انہوں نے کسی بھی معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی قدرتوں پر کبھی غور نہیں کیا۔ نہ ہی اللہ تعالیٰ کی قدرت کو پہچاننے کی کبھی کوشش کی ہے ورنہ وہ کبھی ایسی حماقت نہ کرتے۔

[۱۰۴] رسالت کے لئے اللہ تعالیٰ کا فرشتوں اور انسانوں سے انتخاب:۔ یعنی اللہ پیغام رسانی کے لئے فرشتوں میں سے اور

اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔(۷۵) وہ اسے بھی جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور اسے بھی جو ان سے اوجھل[۱۰۵] ہے اور تمام معاملات اسی کی طرف[۱۰۶] لوٹائے جاتے ہیں۔(۷۶)

آدمیوں سے بھی انتخاب خود اپنی حکمت اور صوابدید کے مطابق کرتے ہیں۔ فرشتوں میں سے سیدنا جبریل علیہ السلام یا وہ فرشتے جو سیدنا زکریا، سیدہ مریم، سیدنا ابراہیم اور سیدنا لوط کے پاس پیغام رساں بن کر آئے تھے اور لوگوں میں سے تمام انبیاء ورسل اللہ ہی کا پیغام لوگوں کو پہنچاتے رہے ہیں اور احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ جس طرح لوگوں میں سے پیغمبر سب سے افضل ہوتے ہیں اسی طرح پیغام رساں فرشتے بھی دوسرے فرشتوں سے افضل ہیں۔ اس آیت میں دراصل کافروں کے ایک اعتراض کا جواب دیا گیا ہے وہ کہتے تھے کہ اگر اللہ کو کوئی رسول بھیجنا ہی تھا تو وہ مکہ اور طائف کی بڑی بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی کا انتخاب کرتا۔ اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا کہ یہ بات بھی اللہ ہی خوب جانتے ہیں کہ لوگوں میں سے رسالت کا اہل کون ہے اور اس معاملہ میں کسی کو اعتراض کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

[۱۰۵] سفارش پر پابندیاں: ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ﴾ یہ جملہ قرآن کریم میں چار مقامات سورہ بقرہ آیت ۲۵۵ (آیۃ الکرسی) سورہ طٰہٰ، آیت نمبر ۱۱۰، سورہ انبیاء، آیت نمبر ۲۸، اور یہاں سورہ حج کی آیت نمبر ۷۶ میں استعمال ہوا ہے۔ اور ہر مقام پر اس جملہ سے پہلے یا آخر میں سفارش اور معبودانِ باطل کا ذکر ہے۔

اس جملہ میں سفارش پر پابندیوں کی وجہ بیان کی گئی ہے۔ سفارش پر پابندیاں یہ ہیں۔ (۱) کوئی شخص اللہ کے اذن کے بغیر سفارش نہ کر سکے گا (۲) سفارش اسی کے حق میں کی جاسکے گی جس کے حق میں اللہ چاہیں گے اور (۳) صرف اس جرم یا خطا کے لیے کی جاسکے گی جسے اللہ کو معاف کرنا منظور ہوگا۔ اب سب پابندیوں کو ملانے سے منطقی نتیجہ یہی حاصل ہوتا ہے کہ سفارش پر ہرگز تکیہ نہ کر بیٹھنا چاہئے۔ اور اس جملہ میں سفارش پر تکیہ نہ کرنے کی وجہ یہ بیان کی جارہی ہے کہ مثلاً ایک بااثر شخص کسی افسر سے مل کر کہتا ہے کہ حضور! آپ کا فلاں ملازم جس جرم میں ماخوذ ہے اسے معاف کر دیں۔ یہ میرا خاص آدمی ہے۔ اور افسر اسے یہ جواب دیتا ہے کہ تمہاری نظر تو صرف اس کے حالیہ جرم پر ہے۔ لیکن اس کا سابقہ ریکارڈ بھی بہت گندا ہے۔ لہٰذا اب مجھے اس کا موجودہ جرم بھی معاف کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ جس پر سفارش کرنے والا لاجواب اور بے بس ہو جاتا ہے۔ بالکل یہی صورت حال اللہ کے حضور سفارش کی ہے۔ اللہ تو ہر انسان کے پورے ریکارڈ سے واقف ہیں اور یہی اس جملہ کا مطلب ہے لیکن سفارش کرنے والے کو اس کی پوری ہسٹری شیٹ کا علم ہو ہی نہیں سکتا جس کی وہ سفارش کرنا چاہتا ہے اسی لئے سفارش پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے ہی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔

[۱۰۶] اگرچہ یہ جملہ عام ہے اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے سپرد ہے۔ مگر یہاں ربطِ مضمون کے لحاظ سے اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ جن معبودوں یا بزرگوں کی سفارش پر تکیہ کیا جاتا ہے یا لوگوں کو جھوٹے وعدے دیئے جاتے ہیں یا لوگ خود ہی خود فریبی میں مبتلا ہو چکے ہیں ان کے یہ محض توہمات ہیں جو لغو اور باطل ہیں۔ ہر شخص کا انجام وہی کچھ ہو گا جو اللہ کو منظور ہو گا۔

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱرْكَعُوا۟ وَٱسْجُدُوا۟ وَٱعْبُدُوا۟ رَبَّكُمْ وَٱفْعَلُوا۟ ٱلْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۩ ﴿۷۷﴾ وَجَـٰهِدُوا۟ فِى ٱللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِۦ ۚ هُوَ ٱجْتَبَىٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور نیک کام کرو تاکہ تم کامیاب[۱۰۷] ہو سکو(۷۷) اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق[۱۰۸] ہے۔ اس نے تمہیں (اپنے دین کے کام کیلئے) چن لیا ہے

[۱۰۷] اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ خطاب انفرادی طور پر ہو۔ اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اخروی نجات اور کامیابی کے لئے تین کاموں کا سرانجام دینا نہایت ضروری ہے۔ نماز کی درست طور پر ادائیگی۔ خالصتاً اللہ تعالیٰ کی عبادت جس میں شرک کی آمیزش نہ ہو۔ اور نیک اعمال کی بجاآوری اور اگر یہ خطاب مجموعی طور پر بحیثیت امت سمجھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس قوم میں یہ صفات موجود ہوں ان کی اخروی کامیابی تو یقینی ہے ہی، ان کی دنیا میں بھی کامیابی کی توقع کی جاسکتی ہے۔

❁ سورہ حج کی فضیلت:۔ سورہ حج کی فضیلت یہ ہے کہ اس میں دو سجدے آئے ہیں ﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ بھی مقام سجدہ تلاوت ہے۔ اس سورہ کا پہلا سجدہ تو متفق علیہ ہے۔ لیکن یہ دوسرا سجدہ اختلافی ہے سجدہ کے قائلین کی دلیل یہ ہے۔ یہاں ایمان لانے والوں کو سجدہ کا حکم دیا گیا ہے۔ اور دوسرے گروہ کی دلیل یہ ہے کہ یہاں رکوع اور سجدہ کا اکٹھا حکم آیا ہے۔ اور جہاں یہ دونوں الفاظ اکٹھے آئیں تو اس سے مراد پوری نماز لی جاتی ہے کیونکہ یہ دونوں نماز کے ہی جزء اشرف ہیں اور جزء اشرف بول کر اسے کل مراد لینا اہل عرب کا عام دستور ہے۔ بلکہ بعض دفعہ قرآن میں صرف رکوع یا صرف سجود کے لفظ سے بھی پوری نماز مراد لی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں قائلین کا موقف ہی راجح معلوم ہوتا ہے کیونکہ بعض روایات بھی ان کی تائید کرتی ہیں اگرچہ وہ روایات اتنی قوی نہیں ہیں۔

[۱۰۸] ❁ جہاد کی اقسام:۔ جہاد کرنے کا حق یہ ہے کہ دامے، درمے، سخنے ہر طرح سے جہاد کیا جائے۔ جہاد دراصل ہر اس بھرپور کوشش کا نام ہے جو اقامت دین کے لئے اور اس کی راہ میں رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے کی جائے۔ اس کا پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان اپنے نفس سے جہاد کرے اور اسے مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کے دین کے تابع بنا دے۔ اس کا دوسرا درجہ اپنے اہل و عیال اور گھر بار کو پوری کوشش کے ساتھ اس راہ پر ڈالنا ہے۔ پھر اس کے بعد رشتہ داروں کی باری آتی ہے پھر عام لوگوں کی۔

جہاد کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جہاں موقع اور ضرورت ہو انسان زبان سے لوگوں کو اس راہ کی طرف دعوت دے۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کرے۔ اور جہاں موقع اور ضرورت ہو تو صاحبِ قلم، قلم سے جہاد کریں۔ اسلام کی تعلیم کی اشاعت کر کے لوگوں میں پھیلائیں۔ اور اسلام کے مخالفوں کے اعتراضات کے مدلل جواب دیں۔ اور اس کا آخری درجہ یہ ہے کہ بوقت ضرورت جہاد بالسیف سے بھی دریغ نہ کریں۔ خواہ اس میں جان اور مال کی قربانی دینی پڑے۔ اور اس کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو سربلند کرنا ہو۔ اور یہ ساری اور ہر قسم کی کوششیں جہاد ہی کے ضمن میں آتی ہیں۔ اور ایک مومن کے ایمان کا تقاضا

فِی الدِّیۡنِ مِنۡ حَرَجٍ ؕ مِلَّۃَ اَبِیۡکُمۡ اِبۡرٰہِیۡمَ ؕ ہُوَ سَمّٰىکُمُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ۬ۙ مِنۡ قَبۡلُ

اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں [۱۰۹] رکھی۔ یہ تمہارے باپ [۱۱۰] ابراہیم کا دین ہے۔ اللہ نے اس سے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس (قرآن) میں [۱۱۱] بھی (مسلم ہی رکھا ہے) تاکہ رسول تم پر

ہیں جس قدر کسی کا ایمان مضبوط ہو گا اس قدر وہ جہاد میں سرگرمِ عمل رہے گا۔ اس کا ایمان خود اسے ایسی کوششوں کی ترغیب دیتا رہے گا۔

[۱۰۹] دین میں تنگی نہیں کمزور اور مجبور لوگوں کا لحاظ:۔ یعنی اسلام نے مسلمانوں پر جو فرائض عائد کیے ہیں ان میں ہر قسم کے لوگوں کی مجبوریوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور سختی نہیں کی۔ مثلاً بوڑھوں، بچوں، عورتوں، اندھوں اور معذوروں کو جہاد بالسیف سے سبکدوش کیا گیا ہے۔ مسافروں کی نماز میں تخفیف کردی گئی ہے۔ مریضوں کو نماز بیٹھ کر اور زیادہ بیماری میں لیٹ کر، حتیٰ کہ اشارہ سے پڑھنے کی رخصت دی گئی ہے۔ پانی نہ ملنے پر تیمم کی اجازت ہے۔ اور ایسی مثالیں بے شمار ہیں اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ سابقہ شریعتوں میں جو سخت احکام تھے انہیں دور کر کے آسان کر دیا گیا ہے اور اس کی مثالیں کسی دوسرے مقام پر گزر چکی ہیں۔ اور اس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ رسم و رواج کی پابندیوں اور بعض بزرگان دین کی خود ساختہ عائد کردہ پابندیوں کو ساقط الاعتبار قرار دیا گیا ہے اور اس کی کچھ تفصیل سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۵۷ کے تحت گزر چکی ہے اور اس سے متعلق احادیث سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۵۸ کے تحت درج کردی گئی ہیں۔

[۱۱۰] دین کے معاملہ میں سیدنا ابراہیم کا خصوصی ذکر کیوں؟ تمام انبیاء و رسل کا دین ایک ہی رہا ہے اور یہاں بالخصوص جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے دین کا نام لیا، دین موسوی یا عیسوی وغیرہ کا نام نہیں لیا، تو اس کی چند وجوہ ہیں۔ جو یہ ہیں:

۱۔ آپ کو یہودی، عیسائی، مسلمان حتیٰ کہ صابی بھی اپنا پیشوا تسلیم کرتے ہیں اور آپ سب کے ہاں یکساں محترم ہیں۔

۲۔ اہلِ عرب میں سے اکثر قبائل آپ کی ہی اولاد تھے اور آپ ان کے جداعلیٰ ہیں۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مسلمانوں کے روحانی باپ ہیں اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جدامجد تھے۔ لہٰذا سیدنا ابراہیم علیہ السلام تمام مسلمانوں کے باپ ہوئے۔

واضح رہے کہ دین کے بجائے ملت کا لفظ آیا ہے۔ اور یہ دونوں مترادف الفاظ ہیں۔ اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ دین صرف ان احکام و فرامین کا نام ہے جو کتاب و سنت یا کسی الہامی کتاب میں مذکور ہوتے ہیں۔ انہی احکام و فرامین کو جب عملی شکل دے کر رائج کر دیا جائے تو ایسے نظام کا نام ملت ہے۔ یعنی دین کی عملی شکل جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے پیش فرمائی تھی وہی اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے لہٰذا ہمیں انہی کی ملت کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔

[۱۱۱] مسلم کے لغوی معنی ہیں اللہ کے احکام کے سامنے سرتسلیم خم کر دینے والا۔ اس لحاظ سے ہر نبی پر ایمان لانے والی قوم مسلم ہی تھی۔ ابراہیمی یا نوحی، یا موسوی، یا عیسوی، وغیرہ ناموں سے وہ لوگ نہیں پکارے جاتے تھے۔ اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے ان کے یہ نام رکھے تھے۔ ان کے یہ نام ان کے خود ساختہ تھے یا دوسروں کے تجویز کردہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا نام بھی مسلمان ہی رکھا تھا اور تمہارا نام بھی مسلمان ہی ہے۔

وَفِي هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَأَقِيْمُوا
الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۭ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۷۸﴾ ع ۱۰ ۱۷

گواہ ہو[۱۱۲] اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔ لہٰذا نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ (کے دین) کو مضبوطی سے[۱۱۳] تھامے رکھو۔ وہی تمہارا کارساز ہے وہ کیسا اچھا کارساز ہے اور کیسا اچھا مددگار ہے۔(۷۸)

[۱۱۲] اس آیت کی تشریح کے لئے دیکھئے سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۴۳ کا حاشیہ

[۱۱۳] یعنی تمہیں ہر قسم کے احکام و قوانین خواہ یہ درونِ خانہ سے تعلق رکھتے ہوں یا تمہاری معیشت و معاش سے یا معاشرت و تمدن سے یا داخلی و خارجی پالیسی سے اللہ کے دین سے لینے چاہئیں اور انہی پر پوری طرح عمل پیرا ہونا چاہئے۔ لہٰذا تم اپنے نام کی لاج رکھو اور جس ہدایت عامہ کے لیے تمہیں پیدا کیا گیا ہے اس کی تکمیل کے لئے سب سے پہلے اپنے آپ کو نمونہ بناؤ۔ بدنی اور مالی عبادات میں بھی کوتاہی نہ ہونے پائے۔ ہر کام میں شریعت سے روشنی حاصل کرو اور جادۂ حق سے ادھر ادھر نہ جاؤ۔ اس کے فضل اور رحمت پر اعتماد رکھو اور تمام کمزور سہارے چھوڑ دو۔ صرف اللہ کو ہی اپنا مالک اور مولیٰ سمجھو۔ اس سے بہتر مالک اور مددگار تمہیں اور کون مل سکتا ہے؟

۱۱۸ آیاتہا سُوْرَۃُ الْمُؤْمِنُوْنَ مَکِّیَّۃٌ رکوعہا ٦

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ﴿۲﴾ وَالَّذِیْنَ

کلمات ۱۰۷۰ آیت ۱۱۸ (۲۳) سورۃ المؤمنون مکی ہے (۷۴) رکوع ٦ حروف ۴۵۳۸

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

ایماندار لوگ کامیاب[۱] ہوگئے۔(۱) جو اپنی نماز میں عاجزی[۲] کرتے ہیں(۲) اور جو بیہودہ[۳] باتوں

[۱] افلح کا مفہوم:۔ افلح (مادہ......ف ل ح) میں تین باتیں بنیادی طور پر پائی جاتی ہیں (۱) پھاڑنا (۲) کامیابی اور (۳) بقا (مقائیس اللغۃ) اور فلاح بمعنی کسان جو بیج بونے کے لئے زمین کو پھاڑتا، فصل پکنے پر کامیابی سے ہمکنار ہوتا اور اس سے فائدہ اٹھانے پر اپنی مراد پاتا ہے۔ گویا افلح کے معنی ایسا کامیاب ہونا ہے جو کسی کے اپنے عمل اور محنت کے نتیجہ میں ہو۔

کامیابی کے لئے مومنوں کی چھ صفات:۔ یہ سورت بالاتفاق مکی ہے اور اس دور میں نازل ہوئی جب مسلمانوں کے کامیاب ہونے کا تصور بھی محال تھا اور ان پر عرصہ حیات بھی تنگ کر دیا گیا تھا اور اگر اسلام لانے سے پہلے کسی مسلمان کا کوئی کاروبار یا شغل تھا بھی تو اسلام لانے کے بعد وہ ختم ہو چکا تھا۔ دوسری طرف قریش مکہ تھے جن کے ہاں مال و دولت کی ریل پیل تھی۔ تجارت ان کے ہاتھ میں تھی اور صاحب اختیار و اقتدار تھے۔ کعبہ کے متولی ہونے کی بنا پر تمام قبائل عرب ان کی عزت بھی کرتے تھے اور ان سے ڈرتے بھی تھے۔ ان حالات میں ایمانداروں کی کامیابی کا اعلان جہاں مسلمانوں کے لئے ایک بشارت تھی وہاں اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک دنیادار انسان کے نزدیک کامیابی کا جو تصور اور معیار ہے وہ تصور ہی سرے سے غلط ہے۔ دنیوی اور اخروی کامیابی کے لئے جن صفات کا ہونا لازمی ہے۔ وہ وہی چھ صفات ہیں جن کا آئندہ آیات میں ذکر ہو رہا ہے۔

[۲] نماز میں خشوع کا مقام اور اثرات:۔ خَشَعَ کے معنی ایسی عاجزی ہے جو دل میں ڈر اور ہیبت طاری ہونے کی وجہ سے ہو۔ پھر اس ڈر اور عاجزی کے اثرات اعضاء و جوارح پر بھی ظاہر ہونے لگیں۔ آنکھیں مرعوب ہو کر جھک جائیں اور آواز پست ہو جائے چنانچہ ایسے مقامات پر بھی قرآن نے یہی لفظ استعمال فرمایا ہے، پھر اسی خشوع کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ انسان نماز میں باادب کھڑا ہو۔ ادھر ادھر نہ دیکھے، نہ اپنے کپڑوں کو سنوارتا رہے نہ اپنی داڑھی وغیرہ سے کھیلتا رہے۔ اور نہ دل میں نماز پر توجہ کے علاوہ دوسرے خیالات آنے دے۔ اور خیالات آنے بھی لگیں تو فوراً ادھر سے توجہ ہٹا کر یہ سوچنے لگے کہ وہ نماز میں اپنے مالک کے سامنے دست بستہ کھڑا ہے اور اس بات پر توجہ دے کہ وہ زبان سے کیا کہہ رہا ہے۔ خشوع اگرچہ اجزائے صلوٰۃ کے لئے شرط نہیں تاہم حسنِ قبول کے لئے لازمی شرط ہے۔

[۳] لغو کا مفہوم:۔ لغو سے مراد فضول اور بیکار مشغلے اور کھیل بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ اگر تفریح طبع کے لئے یا جسمانی کسرت کے طور پر کوئی کھیل کھیلتے ہیں تو ایسے کھیل نہیں کھیلتے جن میں محض وقت کا ضیاع ہو بلکہ ایسے کھیل کھیلتے ہیں

هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ﴿۳﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ﴿۴﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴿۵﴾
اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴿۶﴾ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ

سے دور رہتے ہیں(۳) اور جو زکوٰۃ ادا کرتے [۴] رہتے ہیں(۴) اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت [۵] کرتے ہیں(۵) سوائے اپنی بیویوں اور کنیزوں کے جو ان کے قبضہ [۶] میں ہوں کیونکہ ان کے معاملہ میں ان پر کوئی ملامت نہیں۔(۶) البتہ ان کے سوا

جن سے کوئی دینی فائدہ بھی حاصل ہوتا ہو۔ جیسے جہاد کی غرض سے تیراکی، نیزہ بازی، تیر اندازی، اور نشانہ بازی وغیرہ۔ اور لغو سے مراد بیہودہ اور فضول باتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ جیسے فضول گپیں، غیبت، بکواس، تمسخر، فحش گفتگو اور فحش قسم کے گانے وغیرہ۔ ان باتوں سے وہ صرف خود ہی پرہیز نہیں کرتے بلکہ جہاں ایسی سوسائٹی ہو وہاں سے وہ اٹھ کر چلے جاتے ہیں اور ان کے ساتھ رہنا قطعاً گوارا نہیں کرتے۔

[۴] ❁ زکوٰۃ کا لغوی مفہوم:۔ زکوٰۃ (زکیٰ۔ زکو) کے معنی بالیدگی، نشوونما پانا، بڑھنا اور عمدہ ہونا ہے اور زکیٰ کے معنی کسی چیز کو عمدہ بنانا، اس کی اصلاح کرنا اور آگے بڑھانا ہے۔ اور تزکیہ نفس کے معنی نفس کو روحانی آلائشوں، بیماریوں یا اخلاق رذیلہ سے پاک صاف کر کے اوصافِ حمیدہ پیدا کرنا ہے جیسے ارشاد باری ہے۔ ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا﴾ (۹۱:۹) ”یعنی جس نے اپنے نفس کو پاکیزہ بنا لیا وہ کامیاب ہو گیا“ اور زکوٰۃ کے مفہوم میں یہ سب باتیں شامل ہیں اور زکوٰۃ سے جو دو فائدے زکوٰۃ ادا کرنے والے کو پہنچتے ہیں وہ ہیں تطہیر مال اور تزکیہ نفس (۹: ۱۰۳) اور زکوٰۃ سے جو فائدہ معاشرہ کو پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے غریبوں اور محتاجوں کی امداد ہوتی ہے۔ طبقاتی تقسیم کم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے دولت کا بہاؤ امیر سے غریب کی طرف ہو جاتا ہے۔

اور فَاعِلُوْنَ سے مراد یہ ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی ان کی مستقل اور پختہ عادت بن چکی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ جب جی چاہے ادا کر دیں اور جب نہ چاہے تو نہ کریں۔

❁ زکوٰۃ اور اس کے فوائد:۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ زکوٰۃ تو مدینہ میں فرض ہوئی تھی۔ پھر اس مکی سورہ میں فَاعِلُوْنَ کا کیا معنی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ زکوٰۃ کا نصاب محل زکوٰۃ اشیاء اور شرح زکوٰۃ کا تعین یہ سب کچھ فی الواقع مدینہ میں ہوا تھا مگر اس کی مشروعیت مکہ میں ہو چکی تھی۔ چنانچہ اکثر مکی سورتوں میں بھی زکوٰۃ و صدقات کا ذکر پایا جاتا ہے۔

[۵] اس آیت کے بھی دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنے مقامات ستر کو ڈھانپ کر رکھتے ہیں اور کسی کے سامنے کھولتے نہیں نہ عریاں لباس پہنتے ہیں کہ بدن کے اعضاء نظر آتے رہیں اور دوسرا یہ کہ وہ اپنی عفت و عصمت کی پوری پوری نگہداشت کرتے ہیں۔

[۶] ❁ ترکِ نکاح اور رہبانیت کا رد:۔ مسلمانوں کے لئے اپنے شہوانی جذبات اور خواہشات کی تکمیل کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنی خواہش اپنی بیویوں سے پوری کریں اور دوسری یہ کہ اپنی مملوک کنیزوں سے پوری کر سکتے ہیں۔ مملوک لونڈیوں کے لئے نکاح کی شرط نہیں اور اس سے تمتع کے جواز کی بنیاد نکاح نہیں بلکہ مِلک ہے۔

اس آیت سے مزید دو امور کا پتہ چلتا ہے۔ ایک یہ کہ راہب سنیاسی یا بعض صوفی قسم کے لوگ شہوانی خواہش کی تکمیل کو برا

هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝۷ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝۸ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۹

جو کوئی اور ذریعہ چاہے تو ایسے ہی لوگ حد [۷] سے بڑھنے والے ہیں۔(۷) اور جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان [۸] کا پاس رکھتے ہیں (۸) اور اپنی نمازوں [۹] پر محافظت کرتے ہیں۔(۹)

سمجھتے ہیں۔ حتیٰ کہ نکاح کو ان کی خود ساختہ ولایت کے معیار کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے کہ نکاح کے بعد انسان خانہ داری اور اولاد کے جھنجھٹوں میں پڑ جاتا ہے۔ اور یہ چیز رہبانیت کی ریاضت کے حصول میں آڑے آتی ہے۔ اس آیت میں ان لوگوں کے نظریہ کا پورا پورا رد موجود ہے۔

نیز دورِ نبوی میں صحابہ کرام میں بھی کچھ رہبانیت کا رجحان چل نکلا تھا۔ چنانچہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "تین آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے گھر آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے متعلق پوچھنے لگے۔ جب انہیں بتایا گیا تو اسے انہوں نے کم سمجھا اور کہنے لگے کہ کہاں ہم اور کہاں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جن کے پہلے اور پچھلے سب گناہ معاف کئے جاچکے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا: میں ہمیشہ ساری رات نماز میں گزارا کروں گا" دوسرے نے کہا: "میں ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا اور تیسرے نے کہا میں ہمیشہ عورتوں سے کنارہ کش رہوں گا اور کبھی نکاح نہ کروں گا" اتنے میں آپ تشریف لے آئے اور ان لوگوں سے پوچھا: "کیا تم ہی وہ لوگ ہو جنہوں نے ایسی اور ایسی باتیں کی ہیں؟ اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور پرہیز گار ہوں۔ اس کے باوجود میں روزہ رکھتا بھی ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں۔ رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ تو جو کوئی میری سنت کو ناپسند کرے اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں" (بخاری۔ کتاب النکاح۔ باب الترغیب فی النکاح)

❁ **عورت کا اپنے غلام سے تمتع کی ممانعت:** اور دوسری یہ بات کہ مرد کے لئے تو اس کی مملوکہ کنیز سے تمتع جائز ہے۔ لیکن عورت اپنے مملوک غلام سے تمتع نہیں کر سکتی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک عورت نے اپنے غلام سے تمتع کر لیا۔ پھر دلیل میں یہ آیت پیش کی۔ آپ نے صحابہ کی مجلس شوریٰ میں یہ معاملہ پیش کیا تو سب نے بالاتفاق کہا کہ تَاَوَّلَتْ كِتَابَ اللّٰهِ تَعَالٰى غَيْرَ تَاوِيْلِه (یعنی اس عورت نے اللہ کی کتاب کا غلط مفہوم اخذ کیا ہے) اور عورت کے لئے اس چیز کو حرام کرنے کی حکمت یہ ہے کہ غلام اپنی مالکہ کی خواہش شہوانی تو پوری کر سکتا ہے۔ لیکن اس کا قوام نہیں بن سکتا۔ لہٰذا ایسی عورت کے لئے بہتر یہی ہے کہ اگر وہ چاہے تو اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کر لے۔

[۷] ❁ **شہوانی خواہش کی تین ممکنہ صورتیں اور راہِ اعتدال:۔** شہوانی خواہشات کے سلسلہ میں تین ہی صورتیں ممکن تھیں۔ ایک یہ کہ انسان ایسی خواہشات کو کلیتاً ترک کر دے۔ دوسری یہ کہ ان خواہشات کی تکمیل میں انسان کلیتاً آزاد ہو اور تیسری یہ کہ کوئی معتدل روش اختیار کی جائے۔ اسلام نے ان میں سے معتدل روش کو اختیار کیا ہے۔

❁ **جائز نکاح اور مِلک یمین کے علاوہ باقی سب صورتیں حرام ہیں:۔** یعنی ان خواہشات کی تکمیل کا راستہ کھول تو دیا۔ لیکن صرف جائز نکاح یا مِلک یمین کی صورت میں۔ باقی دونوں انتہا پسندانہ صورتوں کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے۔ نہ رہبانیت کی ترک خواہش کو پسند فرمایا اور نہ اس سلسلہ میں شتر بے مہار قسم کی آزادی کو۔ اس آیت میں اسی بے لگام آزادی کو ممنوع قرار دیا

گیا ہے اور اس میں زنا، لواطت یا لونڈے بازی، عورتوں کی ہم جنسی، جلق یا مشت زنی غرضیکہ شہوت رانی کی جتنی بھی صورتیں مندرجہ بالا دو صورتوں کے علاوہ ممکن ہیں سب ناجائز قرار پاتی ہیں۔

واضح رہے کہ جائز نکاح سے مراد ایسا نکاح ہے جو عورت کو بسانے کے لئے کیا جائے۔ عورت کی رضا کو مقدم سمجھا جائے۔ عورت کا نکاح اس کا ولی کرے، نکاح کا اعلان ہو اور کم از کم دو گواہ موجود ہوں اور حق مہر مقرر کیا جائے۔ ان شرائط کو پورا نہ کرنے والا نکاح مثلاً نکاح متعہ، نکاح حلالہ یا نکاح شغار جائز نہیں۔ دور نبوی میں اور بھی کئی قسم کے نکاح رائج تھے۔ جو یہ شرائط پوری نہیں کرتے تھے۔ لہذا وہ از خود باطل قرار پاگئے۔ چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جاہلیت کے زمانہ میں لوگ چار طرح پر نکاح کیا کرتے تھے۔ ایک تو وہی معروف نکاح ہے۔ جیسے آج کل بھی لوگ کرتے ہیں یعنی کوئی شخص کسی دوسرے کو نکاح کے لئے کہتا اور وہ اپنی کسی رشتہ دار عورت (مثلاً بہن، بھتیجی، بھانجی وغیرہ) یا بیٹی کا مہر مقرر کر کے نکاح کر دیتا۔ (اسی قسم کے نکاح کو اسلام نے بحال رکھا ہے)

دوسری صورت یہ تھی کہ جب کسی کی بیوی حیض سے پاک ہو جاتی تو شوہر اپنی بیوی سے کہتا کہ تو فلاں شخص کو اپنے پاس بلا لے اور اس سے لپٹ جا۔ (یعنی اس سے ہمبستری کر) جب عورت اس مرد سے صحبت کر چکتی تو اس کا خاوند اس سے اس وقت تک علیحدہ رہتا جب تک کہ اس غیر مرد کا حمل نمایاں نہ ہو جاتا۔ اور جب حمل واضح ہو جاتا تو اس کے بعد اس کا خاوند اگر چاہتا تو اس سے صحبت کرتا۔ اور شوہر اپنی بیوی سے یہ کام اس لئے کراتا تھا کہ بچہ شریف اور عمدہ پیدا ہو (تاکہ وہ شوہر کی ناموری کا باعث ہو) ایسے نکاح کو نکاح استبضاع کہا کرتے تھے۔

نکاح کی تیسری صورت یہ تھی کہ ایک عورت کے شوہر کئی مرد ہوتے تھے لیکن یہ دس سے کم ہی ہوتے تھے۔ اور وہ سب اس عورت سے صحبت کیا کرتے۔ پھر جب اسے حمل قرار پا جاتا تو وہ وضع حمل کے چند دن بعد ان سب شوہروں کو بلا بھیجتی اور اس کی دعوت پر ان سب کو آنا پڑتا تھا۔ جب وہ اس کے ہاں اکٹھے ہو جاتے تو وہ ان سے کہتی۔ جو کچھ تم کرتے رہے وہ تمہیں معلوم ہے۔ اب میرے ہاں جو بچہ پیدا ہوا ہے یہ تم میں سے فلاں کا بچہ ہے۔ اس معاملہ میں اس عورت کو پورا اختیار ہوتا کہ جس کا وہ چاہتی نام لے لیتی اور وہ بچہ اسی کا ہو جاتا اور کسی کو اس کے فیصلہ سے انکار کی مجال نہ ہوتی۔ (کیونکہ قومی رسم ہی یہی تھی)

اور چوتھی صورت یہ تھی کہ کسی عورت کے پاس بہت سے آدمی آتے جاتے رہتے اور وہ ہر ایک سے صحبت کرا لیتی کسی سے بھی انکار نہ کرتی اور وہ کنجریاں تھیں جن کے دروازے پر پہچان کے لئے جھنڈا لگا دیتے۔ اب جس شخص کا جی چاہتا وہ اس سے صحبت کر سکتا تھا پھر جب اسے حمل ٹھہر جاتا اور بچہ جنتی تو اس کے ہاں جانے والے سب مرد اس عورت کے ہاں اکٹھے ہو جاتے اور کسی قیافہ شناس کو اپنے پاس بلاتے۔ قیافہ شناس علم قیافہ کی رو سے جس مرد کو اس بچہ کا باپ بتاتا وہ بچہ اسی کا بیٹا ہو جاتا وہ اس کا باپ کہلاتا۔ اور قیافہ شناس کے فیصلہ سے کسی کو انکار کی مجال نہ ہوتی۔

پھر جب اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر بنا کر بھیجا تو آپ نے جاہلیت کے سب نکاح ختم کر دیئے۔ بس ایک ہی قسم کا نکاح باقی رکھا جو آج کل لوگ کرتے ہیں" (بخاری۔ کتاب النکاح۔ باب من قال لانکاح الا بولی۔۔۔۔)

[۸] امانت کی قسمیں اور ان کی نگہداشت:۔ امانتوں سے مراد ہر وہ امانت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یا معاشرہ کی طرف سے

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝۱۰ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۱۱ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ

یہی لوگ ایسے وارث ہیں(۱۰) جو فردوس[۱۰] کے مالک ہوں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔(۱۱) اور ہم نے انسان کو

یا کسی فرد کی طرف سے کسی شخص کے سپرد کی گئی ہو۔ خواہ یہ امانت منصب سے تعلق رکھتی ہو یا اقوال سے یا اموال سے۔ ان سب کی پوری پوری نگہداشت ضروری ہے۔ یہی صورت مال، عہد اور معاہدات کی ہے۔ خواہ کوئی عہد اللہ تعالیٰ سے کیا گیا ہو اور اللہ تعالیٰ نے بندوں سے لیا ہو۔ خواہ یہ آپس کا قول و قرار ہو اور خواہ یہ معاہدہ بیع یا نکاح سے متعلق ہو۔ ان کو وفا کرنا ضروری ہے۔ امانت میں خیانت اور وعدہ خلافی دونوں ایسے جرم ہیں جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافق کی علامتیں قرار دیا ہے جیسا کہ درج ذیل احادیث سے واضح ہے:

۱۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "منافق کی تین نشانیاں ہیں۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے اور وعدہ کرے تو اس کا خلاف کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھیں تو خیانت کرے" (بخاری۔ کتاب الایمان۔ باب علامة المنافق)

۲۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس میں چار خصلتیں ہوں وہ پکا منافق ہے اور جس میں ان چاروں میں سے کوئی ایک خصلت ہو گی اس میں نفاق کی ایک خصلت ہو گی جب تک اسے چھوڑ نہ دے۔ جب اس کے پاس امانت رکھیں تو خیانت کرے اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے اور جب عہد کرے تو بے وفائی کرے۔ اور جب جھگڑا کرے تو بکواس کرے یا ناحق کی طرف چلے" (بخاری۔ کتاب الایمان۔ باب علامة المنافق)

اب دیکھئے پہلی حدیث میں صرف تین علامتیں مذکور ہیں جن میں دو یہی ہیں جو اس آیت میں مذکور ہیں اور دوسری میں جو چار علامتیں مذکور ہیں ان میں سے بھی دو یہی باتیں ہیں۔

[۹] ایمان لا کر کامیاب ہونے والوں کی صفات کی ابتدا بھی نماز سے کی گئی اور اختتام بھی نماز پر ہوا۔ اس سے نماز کی دوسرے خصائل پر اہمیت اور فضیلت معلوم ہوئی۔ پہلی آیت میں نماز میں خشوع کا ذکر تھا۔ اور اس آخری آیت میں سب نمازوں کی حفاظت کا ذکر ہے۔ حفاظت سے مراد نمازوں کو مقررہ اوقات پر بروقت ادا کرنا اور ہمیشہ ادا کرنا۔ تسلی سے نماز ادا کرنا اس کے پورے ارکان بجا لانا یعنی جسم کا، کپڑوں کا اور جگہ کا پاک ہونا پھر وضو اور طہارت پوری طرح کرنا وغیرہ وغیرہ سب کچھ شامل ہے۔

[۱۰] ❁ جنت کا سب سے اعلیٰ مقام جنت الفردوس:۔ فردوس بمعنی سرسبز وادی (منجد) اور بمعنی رودبار میں واقع باغ جس میں ہر قسم کے پھل اور پھول موجود ہوں (منتہی الارب) گویا جنت الفردوس سے مراد جنت کا وہ حصہ ہے جس میں گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں والے سرسبز درخت بکثرت ہوں۔ پھولوں کی خوشبو سے معطر ہو اور اس میں ہر قسم کے پھل بافراط ہوں۔ اور جنت الفردوس جنت کا سب سے بلند طبقہ اور عین وسط میں ہو گا۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

سیدنا انس بن مالک کہتے ہیں کہ ربیع بنت نضر کا بیٹا حارثہ بن سراقہ بدر کے دن ایک غیبی تیر سے شہید ہو گیا۔ وہ

مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا

مٹی کے سَت[۱۱] سے پیدا کیا۔(۱۲) پھر ہم نے اسے ایک محفوظ مقام[۱۲] (رحم مادر) میں نطفہ بنا کر رکھا۔(۱۳) پھر نطفہ کو لوتھڑا

آپ ﷺ کے پاس آکر کہنے لگیں ": مجھے حارثہ کا حال بتائیے اگر وہ خیر کو پہنچا تو میں ثواب کی امید رکھوں اور صبر کروں اور اگر نہیں پہنچا تو میں اس کے لئے دعا کرتی رہوں" آپ ﷺ نے فرمایا: "ام حارثہ! جنت میں بہت سے باغ ہیں اور تیرا بیٹا تو فردوسِ بریں میں داخل ہوا ہے جو جنت کے وسط میں بلند زمین اور سب سے بلند مقام ہے "(ترمذی۔ ابواب التفسیر)

اسی جنت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو یہ دعا سکھائی: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْجَنَّةَ الْفِرْدَوْسَ نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ سے سوال کرو تو جنت الفردوس کا سوال کیا کرو۔

(نیز جنت کی وراثت کے سلسلہ میں سورہ اعراف آیت نمبر ۴۳ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیے)

مندرجہ بالا آیات کے نزول کے وقت مسلمانوں کی جو حالت تھی اور ان آیات کے نزول پر آپ ﷺ نے مسلمانوں کے حق میں جو دعا فرمائی۔ مندرجہ ذیل حدیث سے اس حالت کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب آپ ﷺ پر وحی اترتی تو آپ ﷺ کے چہرے کے آس پاس شہد کی مکھی کی گنگناہٹ جیسی آواز آنے لگتی تھی۔ ایک دن آپ ﷺ پر وحی نازل ہوئی تو تھوڑی ہی دیر بعد آپ ﷺ نے قبلہ کی طرف منہ کرکے اور دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی: اے اللہ! ہمیں زیادہ کر، تھوڑے نہ رہنے دے، ہمیں عزت عطا فرما، ذلیل نہ رہنے دے ہمیں عطا کر اور محروم نہ رکھ، ہمیں دوسروں پر مقدم کر، دوسروں کو ہم پر مقدم نہ رکھ، ہمیں خوش کردے اور ہم سے خوش ہو جا! اس دعا کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ: مجھ پر دس آیات نازل ہوئی ہیں جو ان پر عمل کرے گا، جنت میں داخل ہوگا۔ پھر آپ ﷺ نے ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ.........﴾ سے لے کر دس آیات پڑھیں۔ (ترمذی۔ کتاب التفسیر)

[۱۱] ❁ انسان کی پیدائش اور مٹی کے جوہر کا مفہوم:۔ سَلَالَةٌ بمعنی خلاصہ، نچوڑ، ست، جوہر، کسی بھی چیز سے نکالا ہوا کارآمد حصہ (مفردات القرآن) اور انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کرنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ سیدنا آدم علیہ السلام کا پتلا مٹی سے بنایا گیا۔ پہلے یہ خشک مٹی تھی۔ پھر اس میں پانی ملایا گیا تو یہ گارا بن گیا۔ پھر اس کا خمیر اٹھایا گیا جس میں بدبو پیدا ہو گئی۔ پھر اسے گوندھ کر اس کا چکدار اور لیسدار حصہ لیا گیا اور اسے خشک کر لیا گیا۔ پھر اسے حرارت پہنچائی گئی حتی کہ وہ ٹن کی طرح بجنے لگا۔ جیسا کہ مٹی کے برتن اور ان کی مختلف شکلیں بنائی اور آگ میں پکائی جاتی ہیں۔ اور ان میں مٹی کا صرف چکدار اور کارآمد حصہ ہی استعمال ہوتا ہے۔ اسی مٹی سے آدم علیہ السلام کا پتلا تیار ہوا جس میں اللہ نے اپنی روح سے پھونکا تو جیتا جاگتا انسان وجود میں آگیا۔ پھر آئندہ آدم کی نسل توالد و تناسل اور نطفہ سے چلی۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے نطفہ بذات خود انسان کے جسم میں انہیں غذاؤں سے بنتا ہے جو زمین سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے نطفہ بھی بالآخر زمین ہی کا جوہر ہے۔

[۱۲] یعنی رحمِ مادر ایسا محفوظ مقام ہے جہاں نطفہ کو نشو و نما کے لئے مناسب حرارت تو ملتی رہتی ہے لیکن شدید گرمی یا سردی وغیرہ کے اثرات سے بالکل محفوظ ہوتا ہے اور وہ وہاں سے ہل بھی نہیں سکتا۔

الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ

بنایا پھر لوتھڑے کو بوٹی بنایا پھر بوٹی کو ہڈیاں بنایا پھر ہڈیوں پر گوشت [۱۳] چڑھایا، پھر ہم نے اسے ایک اور ہی [۱۴] مخلوق بنا کر پیدا کر دیا۔ پس بڑا بابرکت ہے، اللہ جو سب بنانے والوں سے [۱۵]

[۱۳] رحمِ مادر میں نطفہ کی نشوونما کے دوران جو مراحل پیش ہوتے ہیں۔ ان کی تشریح سورہ حج کی آیت نمبر ۵ کے تحت کی جا چکی ہے۔

[۱۴] ۞ انسان کی اندرونی کائنات:۔ یعنی نطفہ اور بے جان گوشت کے لوتھڑے سے ایک جیتا جاگتا عقل و شعور رکھنے والا انسان بنا کر پیدا کر دیا۔ جس کا ایک ایک عضو اور رگ و ریشہ کئی مقاصد کی تکمیل کر رہا ہے اور اس کا کوئی بھی حصہ بیکار پیدا نہیں کیا گیا۔ اب انسان کی اندرونی ساخت پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کئی قسم کی آٹومیٹک کلوں اور مشینوں کا مجموعہ ہے کہیں چکی لگی ہے، کہیں چھلنی ہے، کہیں پینے کی کل، کہیں کوٹنے کی، کہیں توڑنے کی کہیں جذب کرنے والی کہیں فضلات کو باہر پھینکنے والی، کہیں اچھالنے والی اور کہیں اتارنے والی اور یہ خودکار مشینیں اس قدر مضبوط، مربوط اور منظم طریقے سے کام کر رہی ہیں جن کا مطالعہ کر کے انسان اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور حکمتوں پر عش عش بھی کر اٹھتا ہے اور ورطۂ حیرت میں گم بھی ہو جاتا ہے۔ معدہ خالی ہو جائے تو از خود انسان کو بھوک اور پیاس لگتی ہے اور وہ کھانے پینے پر مجبور ہوتا ہے۔ اور جب غذا معدہ میں پہنچ جاتی ہے تو یہ سب خودکار مشینیں اپنا اپنا کام شروع کر دیتی ہیں۔ اگر ان میں سے کسی کل میں خرابی واقع ہو جائے تو انسان بیمار پڑ جاتا ہے اور اگر خرابی درست نہ ہو بلکہ بڑھ جائے تو انسان مر جاتا ہے۔

یہ تو تھا جسم کی اندرونی ساخت کا قصہ، اب اس کے قویٰ پر نظر دوڑائیے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس میں زندگی کی ابتدائی خصوصیات کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا نہ سماعت، نہ بصارت، نہ گویائی، نہ چلنے یا بیٹھنے کی طاقت، نہ عقل و خرد، نہ کوئی اور خوبی۔ مگر وہ رحمِ مادر سے باہر آکر کوئی اور ہی چیز بننا شروع ہو جاتا ہے۔ جس کو پیٹ والے جنین سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ تھوڑی ہی مدت میں وہ ایک سمیع و بصیر اور ناطق بچہ بن جاتا ہے۔

۞ انسان کا اور ہی چیز بن جانے کا مطلب:۔ اب وہ کچھ علم ماحول سے حاصل کرتا ہے اور کچھ اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ سے۔ ذرا اس میں عقل آتی ہے تو اس میں دوسروں سے مسابقت یا آگے نکل جانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی یہ بیداری اور خودی اسے ہر اس چیز پر اپنا تحکم جتانے اور اپنا زور منوانے کی کوشش کرتی ہے۔ جس پر اس کا بس چل سکتا ہو اور اس کی یہی بیداری اور خودی اس میں "کوئی اور ہی چیز" ہونے کی کیفیت کو نمایاں تر اور افزوں تر کرتی چلی جاتی ہے۔ پھر وہ جوان اور پختہ عمر کا ہوتا ہے تو اس کی تمام قوتیں، طاقت اور قابلیتیں بھی بڑھتی جاتی ہیں اور ایک وقت آتا ہے جب اس میں "ہمچو ما دیگرے نیست" کا تصور پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات بعض انسان ایسے محیر العقول کارنامے بھی سر انجام دیتے ہیں جو عام انسانوں کی بساط سے باہر ہوتے ہیں۔

[۱۵] اب اگر انسان ذرا سا بھی غور کرے کہ کس طرح ایک حقیر پانی کی بوند سے اس کی زندگی کا آغاز ہوا۔ اور مختلف مراحل طے کرانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسے کیا سے کیا بنا دیا۔ تو بے اختیار اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل آتے ہیں کہ ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ

أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ﴿١٤﴾ ثُمَّ إِنَّكُم بَعْدَ ذَٰلِكَ لَمَيِّتُونَ ﴿١٥﴾ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ ﴿١٦﴾ وَلَقَدْ

بہتر بنانے والا ہے۔(۱۴) پھر اس کے بعد تمہیں ضرور[۱۶] مرنا ہوگا۔(۱۵) پھر یقیناً تم قیامت کے دن[۱۷] دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔(۱۶) اور ہم نے تمہارے اوپر سات[۱۸] طبقے (آسمانوں کے)

﴿اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس کس قدر خیر و خوبی والی اور حکمتوں اور قدرتوں والی ہے جس نے انسانی تخلیق کا آغاز مٹی سے یا نطفہ سے کیا پھر مختلف مراحل طے کرا کر محیر العقول طریقوں سے اسے ایک باشعور اور صاحب ارادہ و اختیار انسان بنا دیا۔ واضح رہے کہ تبارک کا لفظ عموماً اللہ تعالیٰ سے مخصوص ہے اور ان خیر کے کاموں کے سلسلہ میں آتا ہے جو صرف اللہ تعالیٰ سے مختص ہیں۔

[۱۶] یعنی تمہارا اس دنیا میں آنا بھی تمہارے اپنے اختیار سے نہ تھا بلکہ اللہ کے حکم کے مطابق تھا اور اب اگر تم دنیا میں رہنا چاہو اور مرنے سے بچنے کی کوشش کرو تو یہ بات بھی ناممکن ہے۔ کیونکہ اللہ کا قانون یہی ہے کہ تمہیں موت آ کے رہے گی اور یہاں سے تمہاری اخروی زندگی کا آغاز ہو جائے گا۔ جیسا کہ نطفہ سے تمہاری دنیوی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ بالفاظ دیگر موت دنیوی زندگی اور اخروی زندگی کی سرحد پر واقع ہے۔

[۱۷] ❁ موت سے اخروی زندگی کا آغاز کیسے؟ یعنی جس طرح نطفہ سے انسان بننے میں تمہارا اپنا کچھ بھی اختیار نہ تھا۔ اور اللہ نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے مختلف مراحل طے کرا کر تمہیں پیدا بھی کیا اور ایک محیر العقول تخلیق بھی بنا دیا۔ اسی طرح موت کے بعد اسی جسم کے خلاصہ سے مختلف مراحل طے کرا کر تمہیں دوبارہ اسی طرح زندہ پیدا کر دے گا۔ جس طرح پہلی بار کیا تھا۔ چنانچہ سورہ انشقاق میں اللہ تعالیٰ نے کئی قسمیں کھانے کے بعد فرمایا: ﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ﴾ یعنی یہ مراحل تمہیں بہرحال طے کرنا ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلی تخلیق کے مراحل کا تو ذکر کئی مقامات پر فرمایا اس لئے وہ انسان کے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں اور دوسری زندگی کے مراحل کا ذکر اس لئے نہیں فرمایا کہ نہ تو وہ انسان کے مشاہدہ میں آ سکتے ہیں اور نہ ہی انسان کی عقل ان مراحل کو سمجھ سکتی ہے۔

[۱۸] سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے وہ دلیل بیان فرمائی جو انفس سے تعلق رکھتی ہے اور جس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ ﴿فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ﴾ اب آفاق سے چند دلائل پیش کئے جا رہے ہیں۔

❁ کائنات کی تخلیق اور اس کی نگہداشت:۔ سبع طرائق سے بعض علماء نے سات آسمان یا سات طبقات مراد لئے ہیں۔ جیسے ارشاد باری ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا......﴾ اور بعض نے ان سے مراد سات راستے ہی لئے ہیں۔ جو فرشتوں کی آسمانوں میں آمد و رفت کے راستے ہیں۔ اور آسمان چونکہ سات ہیں۔ اس لئے یہ راستے بھی سات ہیں۔ اور بعض علماء نے ان سے سات سیاروں کے راستے یا مدار مراد لئے ہیں۔ چونکہ نزول قرآن کے زمانہ میں بطلیموسی نظریہ ہیئت بھی درست سمجھا جاتا تھا اور اس نظریہ کے مطابق سات سیارے ہی محوِ گردش ہیں اور وہ چاند، زہرہ، عطارد، سورج، مشتری، مریخ اور زحل۔ لہٰذا قرآن نے لوگوں کے علم اور سمجھ کے مطابق سات ہی راستوں کا ذکر فرمایا۔ اگرچہ اس سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔

خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ﴿١٧﴾ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ

پیدا کئے ہیں اور ہم اپنی مخلوق [۱۹] سے غافل نہیں۔ (۱۷) نیز ہم نے آسمان سے ایک خاص مقدار [۲۰] میں پانی اتارا جسے ہم نے زمین میں ٹھہرا دیا

اور فَوْقَكُمْ یعنی تمہارے اوپر کے ایک معنی تو وہی ہیں جو عام فہم ہیں اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ آسمانوں کی یا سیاروں اور ان کے مداروں کی تخلیق تمہاری تخلیق سے بہت بلند تر اور بڑی چیز ہے۔ اور اس مطلب کی تائید بھی قرآن کریم کی اس آیت سے ہو جاتی ہے۔ ﴿لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ﴾ (۴۰:۵۷)

[۱۹] یعنی ہم اپنی مخلوق کو پیدا کرنے کے بعد اس کی مستقل نگہداشت بھی کرتے رہتے ہیں کیونکہ جس چیز سے بھی کام لیا جائے وہ کسی نہ کسی وقت بگڑ بھی جاتی ہے اس کی چال اور اس کے کام میں فرق آجاتا ہے اور اگر بروقت اس کی نگہداشت نہ کی جائے تو وہ خراب اور تباہ بھی ہو جاتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات کا نظام اتنا مربوط و منظم ہے کہ اس میں نہ ذرہ بھر فرق آتا ہے اور نہ کہیں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے جو اس بات کی قوی دلیل ہے کہ اس کائنات کا کوئی ایسا منتظم موجود ہے جو اپنی اس عظیم الجثہ مخلوق کی ہمہ وقت کڑی نگہداشت کر رہا ہے۔

[۲۰] **پانی کی کل مقدار جو اللہ نے آسمان سے اتاری:۔** سوال یہ ہے کہ یہ ایک خاص مقدار میں پانی اللہ تعالیٰ نے کب اتارا تھا؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے زمین پیدا کی تو اس وقت ہی ایک خاص اور کثیر مقدار میں پانی اتار دیا تھا۔ اتنا کثیر مقدار میں جو قیامت تک زمین پر پیدا ہونے والی مخلوق، خواہ وہ کسی نوع سے تعلق رکھتی ہو، کی ضروریات کے لئے کافی ہو۔ اس کثیر مقدار کے ایک کثیر حصہ نے زمین کی تین چوتھائی سطح کو سمندروں کی شکل میں تبدیل کر رکھا ہے۔ پھر اس کثیر مقدار کا کثیر حصہ زمین کی سطح کے نیچے چلا گیا جیسے زمین کے نیچے بھی پانی کے دریا بہہ رہے ہیں اور سطح زمین کا کثیر حصہ ایسا ہے کہ جہاں سے کھودیں نیچے سے پانی نکل آتا ہے۔ جسے انسان نکال کر اپنے استعمال میں لاتا ہے اور کبھی زمین سے از خود چشمے ابل پڑتے ہیں۔ پھر اپنی مخلوق کی ضروریات کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ سلسلہ قائم فرمایا کہ سورج کی گرمی سے سمندر سے آبی بخارات اوپر اٹھتے ہیں جو کسی سرد طبقہ میں پہنچ کر بادلوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور مزید سردی سے زمین پر برسنے لگتے ہیں۔ اس بارش کے پانی سے زمین کی تمام نباتات سیراب ہوتی ہے۔ جاندار بھی اپنی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ پھر اس بارش کا کچھ حصہ زمین میں جذب ہو جاتا ہے اور باقی حصہ ندی نالوں اور دریاؤں کی شکل میں پھر سمندروں میں جا گرتا ہے۔ اور جو پانی مخلوق استعمال کرتی ہے وہ بھی بالآخر یا تو پانی کی شکل میں زمین میں چلا جاتا ہے یا بخارات بن کر ہوا میں مل جاتا ہے۔ ان تصریحات سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پانی کی جتنی مقدار زمین پر نازل فرمائی تھی۔ اس مقدار میں نہ کچھ اضافہ ہوا ہے اور نہ ہی کمی واقع ہوئی ہے۔ البتہ اس طریقہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی ضروریات کی تکمیل کا ایک مستقل اور دائمی انتظام مہیا فرما دیا ہے۔

نیچریت اور دہریت کا رد:۔ اس سلسلہ میں حیران کن امر یہ ہے کہ پانی بذات خود ایک مرکب چیز ہے جو دو حصے ہائیڈروجن گیس اور ایک حصہ آکسیجن سے مل کر بنتا ہے (H_2O)۔ ہائیڈروجن گیس ایک آتش گیر اور فوراً بھڑک اٹھنے والی گیس ہے اور آکسیجن وہ گیس ہے جو جلانے میں مدد دیتی ہے۔ گویا ان آتشیں خاصیت والے مادوں سے اللہ تعالیٰ نے وہ چیز پیدا کی جو آگ کو بجھا دیتی ہے اور پھر اسی کو کیمیاوی عمل کے ذریعہ پھاڑ کر انہیں گیسوں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسری حیران کن بات یہ

فِي الْأَرْضِ ۖ وَإِنَّا عَلَىٰ ذَهَابٍ بِهِ لَقَادِرُونَ ﴿١٨﴾ فَأَنْشَأْنَا لَكُمْ بِهِ جَنَّاتٍ مِنْ نَخِيلٍ وَأَعْنَابٍ
لَكُمْ فِيهَا فَوَاكِهُ كَثِيرَةٌ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿١٩﴾ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُورِ سَيْنَاءَ تَنْبُتُ بِالدُّهْنِ وَ
صِبْغٍ لِلْآكِلِينَ ﴿٢٠﴾ وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۖ نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهَا وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ كَثِيرَةٌ

اور بلاشبہ ہم اس کو لے جانے[۲۱] پر بھی قادر ہیں۔(۱۸) پھر ہم نے اس پانی سے کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کیے ہیں جن سے تمہیں بہت سے پھل حاصل ہوتے ہیں اور انہیں[۲۲] تم کھاتے ہو۔(۱۹)

اور (اسی پانی سے) طورِ سینا سے ایک درخت اگتا[۲۳] ہے جو روغن لئے اگتا ہے اور کھانے والوں کو سالن کا کام دیتا ہے۔(۲۰) نیز تمہارے لئے چوپایوں میں بھی عبرت کا سامان ہے، جو کچھ ان کے بطنوں میں ہوتا ہے اس میں سے ایک چیز (دودھ) ہم تمہیں پلاتے[۲۴] ہیں اور ان سے تمہیں اور بھی بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں اور

ہے کہ ہائیڈروجن گیس اور آکسیجن گیس آج بھی وافر مقدار میں فضا میں موجود ہے اگر وہ از خود زمین کی پیدائش کے وقت مل کر پانی بن گئیں تھیں تو آج بھی مل کر پانی کی مقدار میں اضافہ کیوں نہیں کر دیتیں؟ نیچری اور دہریہ حضرات کے لئے یہ ایک بہت اہم لمحہ فکریہ ہے۔ ہمارے پاس تو اس کا واضح جواب موجود ہے کہ جتنا پانی بنانا اللہ کو منظور اور اس کے اندازہ کے موافق تھا اتنا بن گیا۔ ان گیسوں میں از خود یہ قدرت نہیں ہے کہ مل کر پانی بن جائیں۔

اور اس جملہ کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اپنی مخلوق کی ضروریات کے مطابق آسمان سے بوقت ضرورت پانی برساتے ہیں۔ نہ اتنا زیادہ کہ مخلوق ڈوب کر مر جائے اور نہ اتنا کم کہ مخلوق قحط میں مبتلا ہو کر مر جائے۔ اِلا یہ کہ وہ عذابِ الٰہی ہی کی شکل ہو۔

[۲۱] پانی کے زمین دوز ذخیروں کو اتنی گہرائی تک لے جائیں کہ اسے نکالنا انسانوں کی بساط سے باہر ہو جائے۔ یا ان ذخیروں کو کڑوا کسیلا بنا دیں جو قابل استعمال ہی نہ رہیں۔

[۲۲] صرف یہی نہیں کہ ان باغوں سے تمہیں بہت سے پھل وغیرہ کھانے کو ملتے ہیں۔ بلکہ یہ باغ تمہارے لئے ذریعہ آمدنی اور ذریعہ معاش بھی ہیں۔

[۲۳] ❁ زیتون کا درخت اور اس کے فوائد:۔ اس درخت سے مراد زیتون کا درخت ہے۔ شام و فلسطین اس درخت کا اصلی وطن ہے۔ اور طور سینا کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ یہ اس علاقہ کا مشہور مقام ہے۔ اس درخت کی عمر، اس کا قد و قامت اور پھیلاؤ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جیسے ہمارے ہاں برگد کا درخت ہوتا ہے۔ جس کے زیادہ پھیلاؤ کی وجہ سے اس کی کئی شاخیں واپس زمین تک آکر اس کا سہارا بنتی ہیں۔ زیتون کے درخت سے تیل وافر مقدار میں حاصل ہوتا ہے۔ یہیں سے یہ تیل دنیا کے اکثر مقامات پر جاتا ہے۔ طبی لحاظ سے یہ تیل بہت مفید چیز ہے۔ اور بہت سے لوگ اس کے پھل کا اچار ڈالتے ہیں۔ اس کے تیل کو سالن کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور سالن میں گھی کی جگہ بھی استعمال کرتے ہیں اس کی عام افادیت کے پیش نظر ہی اللہ تعالیٰ نے سورہ "التین" میں زیتون کی قسم بھی کھائی ہے۔

[۲۴] ❁ دودھ کیسے اور کب بنتا ہے؟ چوپایوں میں عبرت یا حیران کن بات یہ ہے کہ گھاس پھوس کھانے والے اور چرنے

وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿٢١﴾ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ ﴿٢٢﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٢٣﴾ فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ مَا هَٰذَا

ان میں سے بعض کو تم کھاتے بھی[۲۵] ہو۔(۲۱) نیز ان پر اور کشتیوں پر سوار بھی ہوا کرتے ہو۔(۲۲) ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تو اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو جس کے علاوہ تمہارا کوئی الٰہ نہیں۔ کیا تم[۲۶] ڈرتے نہیں؟" (۲۳) اس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا تھا، کہنے لگے: "یہ تو تمہارے ہی جیسا[۲۷]

والے مویشی (مادائوں) کے جسم میں جب غذا جاتی ہے تو اس سے خون اور فضلہ یا گوبر کے علاوہ ایک تیسری چیز بھی بنتی ہے جو اوصاف میں ان دونوں چیزوں سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ خون اور گوبر دونوں نجس اور حرام چیزیں ہیں۔ جبکہ دودھ نہایت پاکیزہ، حلال، طیب، انتہائی سفید رنگ، مزہ میں شیریں اور پینے میں خوشگوار ہوتا ہے اور مکمل غذا کا کام دیتا ہے۔ اس سے بھوک بھی دور ہو جاتی ہے اور پیاس بھی۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا محیر العقول کارنامہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مادائوں کے جسم میں ایسی مشینری فٹ کر دی ہے جو گھاس پھونس سی چیز کو ایک نہایت اعلیٰ اور قیمتی چیز میں تبدیل کر دیتی ہے اور اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ یہ مشینری صرف اس وقت حرکت میں آتی ہے جب حمل قرار پا جائے اور اس کا نتیجہ فوری طور پر نہیں نکلتا بلکہ بچہ کے وضع ہونے کے وقت تک یہ مشینری خون کو دودھ میں تبدیل کر دینے کے قابل بن جاتی ہے ادھر بچہ پیدا ہوتا ہے تو ادھر ماں کے پستان دودھ سے بھر جاتے ہیں اور بچہ پیدا ہوتے ہی جب ماں کے پستانوں کی طرف لپکتا ہے تو اسے فوراً یہ قدرتی غذا مہیا ہو جاتی ہے جبکہ وہ کوئی اور غذا کھانے کے قابل ہی نہیں ہوتا۔ اور اگر ماں کو حمل قرار نہ پائے تو اس بات کے باوجود کہ دودھ بنانے والی یہی گوشت پوست اور رگ ریشہ پر مشتمل یہ مشینری اس کے اندر موجود ہے۔ کبھی اپنا کام نہ کرے گی اور نہ دودھ بے گانہ پستانوں میں اترے گا۔

[۲۵] ❁ **مویشیوں کے فوائد:۔** مویشیوں کی ایک ایک چیز انسان کے کام کی چیز ہے۔ ان کی کھال، ان کے بال، ان کی ہڈیاں، غرضیکہ ہر چیز سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔ زندہ ہوں تو ان پر سواری بھی کرتا ہے اور یہ کھیتی باڑی اور باربرداری کے کام بھی آتے ہیں۔ پھر ان کا گوشت انسان بطور خوراک بھی استعمال کرتا ہے اور دودھ جو ان سے حاصل ہوتا ہے وہ ان سب فوائد سے بڑھ کر ہے۔

[۲۶] سیدنا نوح علیہ السلام کے واقعات پہلے سورہ اعراف حاشیہ نمبر ۶۱ تا ۶۴، سورہ یونس حاشیہ نمبر ۸۴، اور سورہ ہود حاشیہ نمبر ۳۴ تا ۵۳ میں گزر چکے ہیں۔ وہ بھی پیش نظر رکھے جائیں۔

[۲۷] ❁ **رسول کا بشر ہونا کیوں ضروری ہے:۔** تمام انبیاء اور رسل ہمیشہ بشر ہی ہوتے تھے۔ اور انسانوں کے لئے رسول بھی کوئی بشر ہی ہونا چاہئے جو انہی میں سے ہو تاکہ جب وہ انہیں اپنی زبان میں اللہ کا پیغام پہنچائیں تو وہ اسے سمجھ سکیں۔ نیز رسول کا کام صرف اللہ کا پیغام پہنچانا ہی نہیں ہوتا۔ ان احکام پر سب سے پہلے خود عمل پیرا ہو کر عملی نمونہ دکھانا بھی ہوتا ہے۔ اب اگر رسول انسان کے بجائے فرشتہ ہو یا نوری مخلوق ہو یا کسی اور اعلیٰ جنس سے ہو۔ تو اس پر ایمان لانے والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم لوگ انسان ہو کر ایک فرشتہ یا کسی بالاتر جنس والی ہستی کی اقتدا کیسے کر سکتے ہیں۔ یہی وہ مصلحتیں ہیں جن کی بنا پر رسول کا بشر ہونا

إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيدُ أَن يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَآءَ اللَّهُ لَأَنزَلَ مَلَٰٓئِكَةً ۚ مَّا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِىٓ ءَابَآئِنَا

انسان ہے جو چاہتا ہے کہ تم پر برتری[۲۸] حاصل کرے اور اگر اللہ چاہتا تو فرشتے نازل کرتا۔ یہ بات تو ہم نے اپنے آباء و اجداد

ضروری ہے اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کسی بشر ہی کو نبی اور رسول بنا کر مبعوث فرمایا اور قرآن کریم میں ان باتوں کی بہت سے مقامات پر وضاحت موجود ہے۔ اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کی زبان سے کئی بار اپنی بشریت کا اقرار کرایا ہے۔ حتیٰ کہ اس حقیقت کو اس کلمہ کا لازمی جز بنا دیا جس کے اقرار پر کوئی شخص اسلام میں داخل ہوتا ہے۔

۞ نور و بشر کی بحث:۔ لیکن گمراہ لوگوں کی گمراہیوں میں سے ایک یہ گمراہی بھی بطور قدر مشترک رہی ہے۔ بشریت اور رسالت دونوں صفات اکٹھی نہیں ہو سکتیں انبیاء کی تکذیب کرنے والوں نے سب سے پہلے بطور طعنہ انبیاء سے یہی بات کہی کہ تم تو ہم جیسے بشر ہو تم رسول بن کیسے سکتے ہو؟ یہ ایک طرح کی گمراہی تھی اور دوسری طرح کی گمراہی انبیاء کے عقیدت مندوں میں پیدا ہوتی ہے۔ جو غلو کی راہ اختیار کر کے دوسری انتہاء کو پہنچتے ہیں۔ ان کا نظریہ بھی یہی ہوتا ہے کہ نبوت یا رسالت اور بشریت ایک ہی شخص میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ فرق یہ پڑ جاتا ہے کہ وہ رسالت کا تو اقرار کرتے ہیں مگر بشریت سے انکار کر دیتے ہیں۔ دور کیوں جایئے ہم مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر کہنے والوں کو "گستاخِ رسول" کا طعنہ دیتا ہے۔ چنانچہ ان کا یہ زبان زد نعرہ "بشر عرش توں پار جا کوئی نہیں سکدا" ان کے اسی نظریہ کی ترجمانی کرتا ہے یہ لوگ آپ ﷺ کو بشر کے بجائے نور ثابت کرتے ہیں اور بشریت سے انکار کرتے ہیں اور یہ بحث پہلے سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۱۵ کے حاشیہ نمبر ۴۲ کے تحت گزر چکی ہے۔

[۲۸] دنیاداروں کا ہمیشہ سے یہ نظریہ رہا ہے کہ جو شخص بھی کسی اصلاحی دعوت کے کام کا آغاز کرتا ہے تو انہیں فوراً یہ خیال آتا ہے کہ یہ شخص اپنی چودھراہٹ قائم کرنے اور اپنا جھنڈا بلند کرنے کے لئے یہ کام کر رہا ہے۔ اور وہ اپنے اس نظریہ میں اس حد تک حق بجانب بھی ہوتے ہیں کہ وہ خود چونکہ اسی غرض کے لئے اپنی زندگیاں اور اپنی تمام تر کوششیں کھپا دیتے ہیں۔ لہٰذا وہ ہر شخص کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں قوم نوح نے نوح علیہ السلام کو یہ طعنہ دیا۔ فرعون نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو یہی بات کہی کہ "موسیٰ اس ملک پر قابض ہونا چاہتا ہے" اور آپ ﷺ کی قوم نے آپ ﷺ کے متعلق یہی نظریہ قائم کیا اور آپ ﷺ سے کہا کہ اگر تم مال و دولت چاہتے تو جتنا چاہو حاضر ہے۔ اقتدار چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا قائد تسلیم کر لیتے ہیں اور کسی حسین عورت سے شادی کرنا چاہتے ہو تو یہ کام بھی ہم کئے دیتے ہیں۔ بشرطیکہ ہماری مخالفت اور ہمارے معبودوں کی مذمت سے باز آ جاؤ اور ہم سے سمجھوتہ کر لو"

۞ انبیاء اور دوسرے لوگوں کے حصولِ اقتدار میں فرق:۔ پھر یہ بات بھی واضح ہے کہ انبیاء کو بھی بالآخر اللہ کی مدد سے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر ان دونوں کے اقتدار کے حصول میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ایک دنیادار کا مقصود ہی اقتدار کا حصول ہوتا ہے۔ جبکہ ایک نبی کا اصل مقصود احکامِ الٰہیہ کا نفاذ ہوتا ہے اور اس کے لئے وہ اقتدار کو محض ایک ذریعہ بناتا ہے۔ اس فرق کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک آدمی قتل ناحق کرتا ہے تو یہ سراسر فساد ہے اور ایک جج اس قاتل کو قصاص میں قتل کی سزا دیتا ہے تو یہ سراسر عدل اور رحمت اور فساد کی روک تھام ہے۔ جبکہ نفس قتل کے لحاظ دونوں واقعات ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔

الْأَوَّلِينَ ﴿٢٤﴾ إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ بِهِ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوا بِهِ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿٢٥﴾ قَالَ رَبِّ انصُرْنِي بِمَا كَذَّبُونِ ﴿٢٦﴾
فَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ أَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَإِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ فَاسْلُكْ
فِيهَا مِن كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۖ وَلَا
تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۖ إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ ﴿٢٧﴾ فَإِذَا اسْتَوَيْتَ أَنتَ وَمَن مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ

کے وقتوں میں [۲۹] کبھی سنی ہی نہیں۔(۲۴) وہ تو ایک ایسا آدمی ہے جسے [۳۰] جنون ہو گیا ہے لہٰذا کچھ مدت اور انتظار کرو (شاید وہ ٹھیک ہو جائے)(۲۵) نوح نے دعا کی: "اے میرے پروردگار! ان لوگوں نے جو مجھے جھٹلایا ہے تو اس پر تو میری [۳۱] مدد فرما" (۲۶) تب ہم نے اس (نوح) کی طرف وحی کی کہ ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایات کے مطابق ایک کشتی بناؤ۔ پھر جب (عذاب کے لئے) ہمارا حکم آجائے اور تنور ابلنے لگے تو ہر قسم کے جوڑے سے دو (نر اور مادہ) اس کشتی میں بٹھا لینا اور اپنے گھر والوں کو بھی سوائے ان کے جن کے خلاف پہلے فیصلہ صادر ہو چکا ہے۔ اور جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے بارے میں مجھ سے بات نہ کرنا کیونکہ وہ غرق ہو کے ہی رہیں گے۔(۲۷) پھر جب تم اور جو تمہارے ہمراہ ہوں کشتی میں [۳۲] جم کر بیٹھ جاؤ تو

[۲۹] یہ بات کہ "رسول بشر ہی ہوتا ہے" یا یہ کہ ایک اکیلے اللہ ہی ساری کائنات کی فرمانروائی اور حاجت روائی کے لئے بہت کافی ہیں اور دوسرے سب معبود لغو اور باطل ہیں"

[۳۰] قومِ نوح کی نظروں میں سیدنا نوح علیہ السلام کی دیوانگی یہ تھی کہ ساری قوم کے نظریہ کے خلاف خالص توحید کی طرف دعوت دے رہے تھے۔ اور وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ نوح علیہ السلام کا (نعوذ باللہ) ایک بیہودہ سا خیال ہے۔ بھلا ساری قوم کے مقابلہ میں اس اکیلے کی پکار کی کیا حقیقت ہے۔ لہٰذا اس کی طرف توجہ کی چنداں ضرورت نہیں۔ وہ خود ہی جب اپنی ناکامی دیکھے گا تو اپنی ایسی باتوں سے باز آجائے گا۔

[۳۱] سیدنا نوح علیہ السلام کا زمانہ تبلیغ غالباً تمام انبیاء سے زیادہ ہے جو قرآن کی صراحت کے مطابق ساڑھے نو سو سال ہے۔ اس طویل عرصہ میں آپ اپنی قوم سے ناروا باتیں اور طعنے وغیرہ سنتے اور برداشت کرتے رہے۔ اتنی طویل مدت میں بہت ہی کم لوگ ایمان لائے۔ دوسروں کا کیا ذکر آپ کی بیوی اور ایک بیٹا بھی آپ کے مقابلہ میں کافروں کا ساتھ دے رہے تھے۔ سیدنا نوح علیہ السلام کو یہ یقین ہو گیا کہ اب جو کافر موجود ہیں وہ اس قدر ضدی اور ہٹ دھرم واقع ہوئے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی دعوت حق کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہو گا۔ بس یہ لوگ صرف سیدنا نوح علیہ السلام کی اذیت اور ذہنی کوفت کا باعث بن رہے تھے۔ جب ان کافروں نے آپ کو اذیت دینے میں انتہا کر دی تو اس وقت آپ نے دعا کی کہ یا اللہ! یہ قوم مجھ پر غالب آگئی ہے اب تو ہی میری مدد فرما اور ان سے اس ظلم کا بدلہ لے جو انہوں نے اتنی طویل مدت مجھ پر ڈھایا ہے۔

[۳۲] یہ واقعات اور ان کی تفصیل سورہ ہود کے حواشی نمبر ۴۴ سے ۵۳ تک تفصیل سے گزر چکے ہیں۔ لہٰذا ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۸﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَیْرُ
الْمُنْزِلِیْنَ ﴿۲۹﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِیْنَ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ ﴿۳۱﴾
فَاَرْسَلْنَا فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۲﴾ ع وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ

کہنا: ”سب تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں ظالم لوگوں سے[۳۳] نجات دی۔(۲۸) اور (یہ بھی) کہنا کہ: ”میرے پروردگار! مجھے برکت والی جگہ اتارنا اور تو سب سے بہتر اتارنے والا[۳۴] ہے۔“(۲۹) اس واقعہ میں کئی نشانیاں ہیں اور آزمائش تو ہم کر کے ہی[۳۵] رہتے ہیں۔(۳۰) پھر ان کے بعد ہم نے ایک اور نسل کو پیدا کیا۔(۳۱) تو ان کی طرف انہیں میں سے[۳۶] ایک رسول بھیجا، (جس نے انہیں کہا کہ) اس اللہ کی عبادت کرو جس کے سوا تمہارا کوئی الہ نہیں۔ کیا تم ڈرتے نہیں؟[۳۷](۳۲) اور اس کی قوم کے جن سرداروں نے (اس دعوت کو

[۳۳] یہ قوم اتنی بدبخت تھی جس کی غرقابی پر سیدنا نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور بجائے افسوس کے خوشی کا اظہار کیا۔ یہ قوم فی الواقع ”خس کم جہاں پاک“ کا مصداق تھی۔ جبکہ سیدنا نوح علیہ السلام نے اپنی دعا میں واضح طور پر یہ الفاظ کہے تھے: یااللہ! اس قوم میں سے ایک گھرانہ بھی زندہ نہ رہنے دے کیونکہ ان کے ہاں جو بچے پیدا ہوں گے وہ بھی فاسق و فاجر ہی پیدا ہوں گے اور کبھی حق کو قبول نہ کریں گے“ (۷۱:۲۶،۲۷)

[۳۴] یہ بھی اس دعا کا حصہ ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے سیدنا نوح علیہ السلام کو کشتی میں سوار ہوتے وقت سکھائی تھی۔ اس دعاء میں ﴿اَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ﴾ کا ایک معنی تو ترجمہ سے واضح ہے اور اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ ”تو بہت اچھا مہمان نواز ہے یا بہت اچھا میزبان ہے“ جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے فرمایا تھا: ”کیا تم دیکھتے نہیں کہ میں ماپ میں بھی پورا دیتا ہوں اور مہمان نواز بھی بہت اچھا ہوں“ (۱۲:۵۹) مطلب یہ کہ مجھے بابرکت جگہ پر کشتی سے اتارنا اور اترنے کے بعد ہمیں وافر رزق بھی مہیا فرمانا“

[۳۵] سیدنا نوح علیہ السلام کے قصہ میں کئی ایسی باتیں ہیں جن سے ایک غور کرنے والا انسان سبق حاصل کر سکتا ہے۔ اور جب ہم کوئی نبی بھیجتے ہیں تو اس وقت قوم کا امتحان شروع ہو جاتا ہے۔ نبی اور اس کے پیروکاروں کا بھی کہ وہ کس حد تک صبر و ثبات سے کام لیتے ہیں اور جھٹلانے والوں کا بھی کہ وہ کس حد تک سرکشی اختیار کرتے ہیں۔ پھر جو اس امتحان میں کامیاب ہوں انہیں انعامات سے نوازتے بھی ہیں اور ان کی مدد بھی کرتے ہیں اور معاندین کو قرار واقعی سزا بھی دیتے ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بعد میں آنے والی قوم میں سے کون ان نشانیوں کو دیکھ کر عبرت و نصیحت حاصل کرتا ہے اور کون نہیں کرتا؟“

[۳۶] یہ اور نسل یا اور قوم عاد یا عاد اولیٰ تھی۔ جیسا کہ قرآن کریم کے بعض دوسرے مقامات میں سیدنا نوح علیہ السلام کے بعد اسی قوم کا ذکر ہوا ہے۔ اور ان کی طرف سیدنا ہود علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا۔

[۳۷] یعنی اللہ کے ساتھ دوسرے شریک بنانے کے برے انجام سے تمہیں خطرہ پیدا نہیں ہوتا کہ کہیں ہم پر قہر الٰہی نازل نہ ہو جائے۔

قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِلِقَاءِ الْآخِرَةِ وَأَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ
يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ ﴿٣٣﴾ وَلَئِنْ أَطَعْتُم بَشَرًا مِّثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذًا
لَّخَاسِرُونَ ﴿٣٤﴾ أَيَعِدُكُمْ أَنَّكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنتُمْ تُرَابًا وَعِظَامًا أَنَّكُم مُّخْرَجُونَ ﴿٣٥﴾ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ
لِمَا تُوعَدُونَ ﴿٣٦﴾ إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ﴿٣٧﴾ إِنْ هُوَ إِلَّا

ماننے سے) انکار کیا اور آخرت کی ملاقات کو [۳۸] جھٹلایا اور جنہیں ہم نے دنیا کی زندگی میں عیش و آرام دے رکھا تھا، وہ کہنے لگے: ”یہ تو تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہے، وہی کچھ کھاتا ہے [۳۹] جو تم کھاتے ہو اور پیتا بھی وہی کچھ ہے جو تم پیتے ہو۔(۳۳) اور اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک آدمی کی اطاعت کر لی تو پھر تو تم خسارے [۴۰] میں ہی رہے۔(۳۴) کیا تمہیں وہ یہ کہتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جاؤ گے تو تم (دوبارہ) اٹھائے جاؤ گے (۳۵) یہ بات تو بعید از عقل اور بعید از قیاس ہے جس کا تمہیں وعدہ دیا جارہا ہے۔(۳۶) زندگی تو بس یہی دنیا کی زندگی ہے، ہم مرتے ہیں اور جیتے (پیدا ہوتے) ہیں اور ہم ہرگز اٹھائے [۴۱] نہیں جائیں گے۔(۳۷)

[۳۸] انبیاء کی دعوت کی زد چونکہ چودھری قسم کے لوگوں پر ہی پڑتی ہے اور انہیں اپنی سرداریاں خطرہ میں پڑتی نظر آتی ہیں۔ اس لئے انبیاء کے اولین مخالف یہی لوگ ہوتے ہیں۔ اور عام لوگوں میں چونکہ انہیں کا اثر ورسوخ ہوتا ہے۔ لہٰذا انبیاء کی دعوت کے مقابلہ میں انہیں عوام سے سر کھپانا پڑتا ہے۔ تاکہ وہ انبیاء کی دعوت قبول کر کے ان کے دائرہ اثر سے باہر نہ ہو جائیں۔ مشرکین مکہ کی طرح قوم عاد بھی اخروی زندگی کی منکر تھی۔ اور مال و دولت کی فراوانی اور آسودگی کی زندگی نے ان سرداروں کو بالکل خدا فراموش بنا رکھا تھا۔ اور ان کا منتہائے مقصود صرف دنیا کا مال و دولت اور اس کا حصول تھا۔

[۳۹] نبی کی دعوت کے مقابلہ میں جس بات کی دعوت وہ عوام الناس کو دے سکتے تھے وہ یہی تھی کہ آخر اس نبی میں کیا خوبی ہے کہ تم اس کی اطاعت کرو وہ بھی تمہارے ہی جیسا انسان اور کھانے پینے کا محتاج ہے۔

[۴۰] ۞ دوسرے کی آنکھ کا تنکا بھی نظر آجاتا ہے اور اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا:۔ حالانکہ وہ خود بھی ایک عام انسان ہی تھے۔ اور عام لوگوں کی طرح کھاتے پیتے تھے۔ اس کے باوجود وہ عوام کے مطاع بنے ہوئے تھے اور چاہتے تھے کہ عوام ان کی اطاعت کریں۔ ان کا یہ پروپیگنڈا اس لئے نہ تھا کہ انسان مطاع نہیں بن سکتا۔ بلکہ صرف اس لئے تھا کہ کہیں لوگ نبی کی دعوت قبول کر کے ہماری اطاعت کو ترک کر کے اس کی اطاعت نہ کرنے لگ جائیں۔ گویا اصل خطرہ انہیں اپنی سرداریوں کا تھا اور ان کے لئے تو یہ واقعی خسارہ کی بات تھی۔ لیکن لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ نبی کی اطاعت کر کے تم خسارہ میں رہو گے۔ گویا بشر ہونے کے باوجود ان کی اپنی اطاعت میں خسارے کی بات ان کے نزدیک خارج از بحث تھی۔

[۴۱] ۞ آخرت کا انکار جہالت اور ہٹ دھرمی پر مبنی ہے:۔ آخرت سے انکار کرنے والوں کے پاس سب سے بڑی دلیل یہ ہوتی ہے کہ چونکہ کوئی بھی مرا ہوا انسان آج تک دوبارہ زندہ ہو کر واپس نہیں آیا۔ لہٰذا ہم کیسے مان لیں کہ مرنے اور مر کر مٹی میں مل جانے کے بعد دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ گویا ان کے انکار کی اصل بنیاد ان کا اپنا تجربہ یا مشاہدہ ہوتا ہے۔ قوم عاد مشرکین

رَجُلُ ٱفْتَرَىٰ عَلَى ٱللَّهِ كَذِبًا وَمَا نَحْنُ لَهُۥ بِمُؤْمِنِينَ ﴿٣٨﴾ قَالَ رَبِّ ٱنصُرْنِى بِمَا كَذَّبُونِ ﴿٣٩﴾ قَالَ عَمَّا قَلِيلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نَٰدِمِينَ ﴿٤٠﴾ فَأَخَذَتْهُمُ ٱلصَّيْحَةُ بِٱلْحَقِّ فَجَعَلْنَٰهُمْ غُثَآءً فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿٤١﴾

یہ ایک ایسا آدمی ہے جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے [۴۲] اور ہم کبھی اس کی بات نہیں مانیں گے (۳۸) اس رسول نے دعا کی کہ: "پروردگار! ان لوگوں نے جو مجھے جھٹلایا ہے تو اس پر میری مدد فرما" (۳۹) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تھوڑے ہی عرصہ بعد یہ (اپنے کیے پر) پچھتانے لگیں [۴۳] گے۔ (۴۰) چنانچہ ٹھیک حق کے [۴۴] مطابق ایک ہیبت ناک چیخ نے انہیں آلیا تو ہم نے انہیں خس وخاشاک [۴۵] بنا کے رکھ دیا۔ سو ظالم لوگوں کے لئے پھٹکار ہی پھٹکار ہے۔ (۴۱)

مکہ کی طرح اللہ کی ہستی کے قائل تھے حالانکہ اللہ کی ہستی بھی کسی تجربہ اور مشاہدہ میں نہیں آتی۔ اور اللہ کی ہستی کے قائل ہونے کی وجہ بھی یہ نہیں ہوتی کہ وہ کسی پیغمبر کی تعلیم سے متاثر ہو کر اللہ پر ایمان بالغیب لاتے ہیں۔ بلکہ اس لئے فلاسفروں اور حکماء نے اللہ کی ہستی کو علت العلل (First Cause) کے طور پر تسلیم کیا ہے یعنی جس طرح ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہر چیز کے لئے صانع یا اس کے بنانے والے کا ہونا ضروری ہے اسی طرح اس کارخانہ کائنات کا بنانے والا ہونا بھی ضروری ہے۔ بالفاظ دیگر اللہ کی ہستی کو عقلی دلیل کی بنا پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ عقلی دلیل کی بنا پر بھی ایسی اشیاء کو تسلیم کرنا ضروری ہے جو مشاہدہ اور تجربہ میں نہ آئی ہوں یا نہ آسکتی ہوں۔ اور دوبارہ زندگی کے قیام پر چونکہ بہت سے عقلی دلائل موجود ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں بھی بے شمار مقامات پر ہوا ہے۔ لہٰذا جو لوگ آخرت اور دوبارہ زندگی کا انکار محض اس بنا پر کرتے ہیں کہ کوئی آدمی مر کر واپس نہیں آیا یا انسان کا جسم مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے تو پھر کیسے زندہ ہو سکتا ہے، تو یہ عقلی دلائل کا انکار اور محض جہالت ہے۔

[۴۲] اسی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم عاد اللہ تعالیٰ کی ہستی کی قائل تھی۔ اور ان کے نزدیک سیدنا ہود علیہ السلام کا اللہ پر جھوٹ باندھنا یہ تھا کہ میں اللہ کی طرف سے تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں" یا یہ کہ "مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ ضرور تمہیں دوبارہ پیدا کرے گا اور تم سے تمہارے اعمال کا مواخذہ کرے گا" اور یہ دونوں باتیں ہم ہرگز تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔

[۴۳] یعنی ان کے گناہوں کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اور تھوڑی دیر بعد ہی ان پر عذاب آنے والا ہے۔ جب یہ اس کے آثار دیکھ لیں گے تو اس وقت اپنی اس ہٹ دھرمی پر پچھتائیں گے لیکن اس وقت نہ انہیں پچھتانا کچھ کام دے گا اور نہ ایمان لانا۔

[۴۴] یعنی بالکل ٹھیک اسی وقت ان پر عذاب آیا جو وقت ان کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ یہاں ہیبت ناک چیخ کے عذاب سے بعض علماء نے یہ قیاس کیا ہے کہ یہ قصہ قوم عاد اولیٰ کا نہیں کیونکہ ان پر تند و تیز اور شدید سرد آندھی کا عذاب آیا تھا۔ بلکہ یہ قصہ عاد ثانی۔ یعنی ثمود کی قوم کا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

اس آیت میں بالحق کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نے جو انہیں سزا دی تو وہ ٹھیک ان کے گناہوں کی پاداش کے مطابق تھی۔ عدل و انصاف کا یہی تقاضا تھا اور اس سلسلہ میں ان پر ذرہ بھر ظلم نہیں ہوا۔

[۴۵] غثاء بمعنی کوڑا کرکٹ، کچرا، خس وخاشاک۔ یعنی وہ ہمارے عذاب کی رو میں یوں بہہ گئے جیسے سیلاب خس وخاشاک کو بہا لے جاتا ہے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۴۲﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿۴۳﴾

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ؕ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ

اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۴﴾ ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ

پھر ان کے بعد ہم نے کئی اور قومیں پیدا کیں۔ (۴۲) کوئی بھی قوم نہ اپنے وقت سے پہلے ختم ہوئی اور نہ اس وقت کے بعد ٹھہر سکی۔ (۴۳) پھر اس کے بعد ہم نے پے در پے اپنے رسول بھیجے جب بھی کسی قوم کے پاس اس کا رسول آتا تو وہ اسے جھٹلا دیتے تو ہم ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو ہلاک کرتے رہے تا آنکہ انہیں افسانے[۴۶] بنا دیا۔ سو ان لوگوں پر پھٹکار ہو جو ایمان نہیں لاتے۔ (۴۴)

پھر ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون کو معجزے اور روشن دلیل[۴۷] دے کر بھیجا (۴۵)

[۴۶] قوم عاد اولیٰ اور عاد ثانی کے بعد، موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک درج ذیل انبیاء مبعوث ہوئے۔ سیدنا ابراہیم، سیدنا اسماعیل، سیدنا اسحاق، سیدنا یعقوب، سیدنا یوسف، سیدنا ایوب، اور سیدنا شعیب علیہم السلام یہ تو وہ انبیاء ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں ملتا ہے اور جن کا ذکر قرآن میں نہیں آیا وہ ان سے بہت زیادہ ہیں۔ بعض روایات کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دنیا میں مبعوث ہونے والے رسولوں کی تعداد پوچھی گئی تو آپ نے ۳۱۳ تا ۳۱۵ بتائی اور انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی جبکہ قرآن میں صرف ۲۷ انبیاء و رسل کا ذکر ہے۔

۞ قوم عاد کے بعد کے انبیاء:۔ اب اگر تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو جہاں تک انسانی علم کی رسائی ہو سکی ہے اس کے مطابق عاد اولیٰ اور موسیٰ علیہ السلام کی درمیانی مدت تقریباً چار ہزار سال پر محیط ہے۔ اس طویل عرصہ میں لاتعداد انبیاء و رسل مبعوث ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ ان انبیاء کا ایسا تانتا بندھا ہوا تھا کہ کوئی وقت ایسا نہ تھا جب روئے زمین پر کوئی نبی موجود نہ ہو۔ بلکہ بیک وقت ایک ہی زمانے میں کئی کئی انبیاء مبعوث ہوتے رہے۔ ان سب سے یہی سلوک ہوتا رہا کہ انہیں جھٹلایا گیا۔ کیونکہ چودھری قسم کے لوگ قطعاً اس بات پر آمادہ نہیں ہوتے کہ وہ اپنی سرداریوں سے دستبردار ہو کر نبیوں کے مطیع فرمان بن جائیں۔ وہ دوسرے لوگوں کو بھی انبیاء کے خلاف بھڑکاتے رہے۔ ان کے اس جرم کی پاداش میں ان پر عذاب آتے رہے۔ ایک قوم مٹی تو دوسری اس کی جگہ لیتی رہی۔ پھر اس کے مقررہ وقت کے مطابق اسے بھی صفحہ ہستی سے نیست و نابود کیا جاتا رہا۔ حتیٰ کہ ان کے آثار بھی باقی نہ رہے، ماسوائے ان داستانوں اور افسانوں کے جو بعد کے آنے والے لوگوں میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہے۔

[۴۷] ۞ سلطان کا لغوی مفہوم:۔ سلطان بمعنی غلبہ، قوت، اختیار (منجد، مقاییس اللغۃ) اور بمعنی فرمان شاہی (منجد) یعنی اتھارٹی یا اتھارٹی لیٹر (Athority Letter) وہ اختیار یا اختیار نامہ جو کسی حاکم اعلیٰ سے اس کے نائب کو ملا ہو۔ (اور سلطان بمعنی بادشاہ اس کا کنائی اور مجازی معنی ہے لغوی نہیں۔ نہ ہی قرآن نے اس لفظ کو کسی بھی جگہ ان معنوں میں استعمال کیا ہے) اور اس مقام پر سلطان مبین سے مراد یا ان دونوں نبیوں کی نبوت ہے یا وحی الٰہی۔ اور آیات سے مراد وہ معجزات ہیں جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے صرف عصا اور ید بیضا ہی نہیں بلکہ دوسرے معجزات بھی کیونکہ یہاں جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے تثنیہ کا

مُّبِيۡنٍ ﴿۴۵﴾ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسۡتَكۡبَرُوۡا وَكَانُوۡا قَوۡمًا عَالِيۡنَ ﴿۴۶﴾ فَقَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَيۡنِ
مِثۡلِنَا وَقَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ ﴿۴۷﴾ فَكَذَّبُوۡهُمَا فَكَانُوۡا مِنَ الۡمُهۡلَكِيۡنَ ﴿۴۸﴾ وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى
الۡكِتٰبَ لَعَلَّهُمۡ يَهۡتَدُوۡنَ ﴿۴۹﴾ وَجَعَلۡنَا ابۡنَ مَرۡيَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰيَةً وَّاٰوَيۡنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبۡوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ

فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف تو وہ اکڑ گئے اور وہ تھے ہی سرکش[۴۸] لوگ (۴۶) کہنے لگے: "کیا ہم اپنے ہی ہے دو آدمیوں پر ایمان لائیں جبکہ ان کی قوم ہماری غلام[۴۹] ہے۔(۴۷) چنانچہ انہوں نے ان دونوں کو جھٹلا دیا تو وہ بھی ہلاک ہونے والوں میں شامل ہو گئے۔(۴۸) اور ہم نے موسیٰ کو کتاب (اس لئے) دی تھی کہ وہ لوگ اس سے رہنمائی[۵۰] حاصل کریں۔(۴۹) اور ہم نے (عیسیٰ) ابن مریم اور اس کی والدہ کو ایک نشانی[۵۱] بنایا اور ایک ایسے ٹیلے[۵۲] پر جگہ دی جو اطمینان بخش تھی اور وہاں جاری پانی (چشمہ) بھی موجود تھا۔(۵۰)

نہیں۔ نیز آیات سے مراد احکامِ الٰہی بھی ہو سکتے ہیں۔ جو فرعون کے پاس جاتے وقت انہیں دیئے گئے تھے۔ اور جن سے یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ ان کی پشت پر کوئی مافوق الفطرت قوت موجود ہے۔

[۴۸] یعنی وہ متکبر قسم کے لوگ تھے جو اپنے آپ کو عام انسانوں سے کوئی بالاتر مخلوق سمجھتے تھے۔

[۴۹] یعنی دوسرے انبیاء کی تکذیب کرنے والے چودھری حضرات تو اپنے انکار کی صرف ایک وجہ بتاتے تھے کہ "یہ نبی بھی ہم جیسا ہی انسان ہے اور اس میں ایسی کون سی خوبی ہے کہ ہم اس پر ایمان لائیں" فرعون اور اس کے سرداروں نے اس وجہ کے ساتھ ایک اور وجہ بھی بیان کر دی کہ ان نبیوں کی برادری تو ہماری غلام ہے۔ لہٰذا ہم ان پر ایمان لا کر دوہری رسوائی کیسے قبول کریں۔

۞ عبادت کا مفہوم:۔ یہاں عٰبِدُوۡنَ کے لفظ سے عبادت کا مفہوم کھل کر سامنے آجاتا ہے کہ عبادت محض پوجا پاٹ کا نام نہیں۔ کیونکہ بنی اسرائیل فرعونیوں کی پوجا پاٹ نہیں کرتے تھے۔ بلکہ عبادت کا لفظ اپنے وسیع معنوں میں ہمہ وقت کی غلامی اور فرمانبرداری کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

[۵۰] ۞ منکرینِ سنت کا رد:۔ اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کو کتاب تورات فرعون اور اس کے سرداروں کی غرقابی کے بعد دی گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ جو احکام موسیٰ علیہ السلام کو تورات کے نازل ہونے سے پہلے دیئے گئے تھے وہ بھی موسیٰ علیہ السلام اور آپ پر ایمان لانے والوں کے لئے اسی طرح قابل اتباع تھے جس طرح تورات کے احکام۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نبی پر کتاب اللہ کے علاوہ اللہ کی طرف سے اور بھی بہت کچھ نازل ہوتا ہے۔ اور اس کی اتباع بھی اسی طرح واجب ہوتی ہے جیسے کتاب اللہ کی اور اس میں ان لوگوں کا پورا رد موجود ہے جو کہتے ہیں کہ ہمیں ہدایت کے لئے صرف قرآن ہی کافی ہے۔

[۵۱] ۞ عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ پیدائش کے منکرین کا رد:۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ابن مریم بھی ایک نشانی تھے اور ان کی والدہ بھی ایک نشانی تھی۔ بلکہ یوں فرمایا ان دونوں کو ملا کر ایک نشانی بنایا۔ اور اس کی صورت صرف یہی رہ جاتی ہے کہ سیدنا عیسیٰ کی ولادت کو بن باپ تسلیم کیا جائے نیز یہ بھی کہ سیدہ مریم کسی مرد کے چھوئے بغیر ہی نفخۂ الٰہی سے حاملہ ہوئی تھیں۔

[۵۲] ربوۃ کا لغوی مفہوم اور اس سے مراد:۔ ربوۃ سے مراد ایسی زمین ہے جو عام سطح زمین سے قدرے بلند ہو اور اس

کی مٹی بھربھری اور ریتلی قسم کی ہو۔ ایسی زمین پانی کو اپنے اندر جذب کر کے خوب پھول جاتی ہے۔ پنجابی میں ایسی زمین کو ''میرا زمین'' کہتے ہیں۔ اس زمین کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ عام زمین کی نسبت سرسبز و شاداب بھی زیادہ ہوتی ہے اور بلند بھی ہوتی ہے۔

اب اس ربوۃ کی تعین میں مفسرین کا اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہی بلند مقام ہے جہاں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے وہاں ایک چشمہ بھی جاری کر دیا تھا اور کھجور کے ٹنڈ درخت سے اللہ کے حکم سے تازہ کھجوریں گرنے لگی تھیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس وقت کا ظالم یہودی بادشاہ ہیروڈس سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا دشمن بن گیا تھا۔ سیدہ مریم ان کی حفاظت کی خاطر اللہ کے حکم سے مصر کی طرف ہجرت کر گئیں۔ اور ایک بلند چشمہ دار جگہ پر قصبہ میں مقیم ہوئیں جسے رملہ کہتے ہیں۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام وہیں جوان ہوئے پھر جب ہیروڈس مر گیا تو سیدہ مریم انہیں لے کر اپنے وطن واپس آ گئیں۔ اسرائیلی روایات اسی توجیہ کی تائید کرتی ہیں۔

اور ربوۃ کے ساتھ ذات قرار سے مراد ایسی جگہ ہے جہاں ضروریات زندگی مہیا ہو سکتی ہوں اور انسان کو وہاں قیام کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ اور معین کا لفظ تائید مزید کے لئے ہے۔ جس کا معنی جاری پانی، تھرا پانی، بہتا ہوا چشمہ، ٹھنڈا اور میٹھا پانی سب کچھ آتا ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہندوستان کے ضلع گورداسپور میں واقع ایک قصبہ قادیان میں ایک شخص مرزا غلام احمد نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ وہ خود تو وہیں قادیان میں دفن ہوا اور اس کا مدفن بھی وہیں بنا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا تو مرزا صاحب کی امت وہاں سے پاکستان کے ضلع جھنگ میں منتقل ہوئی اسی طرح ایک بلند زمین اپنے ہیڈ کوارٹر کے لئے منتخب کی اور اس کا نام ربوہ رکھ لیا۔ مرزا صاحب کے خلیفے اور اولاد وہیں اقامت پذیر ہیں۔

۞ <u>مرزا قادیانی کا مسیح موعود ہونے کا دعویٰ اور عیسیٰ علیہ السلام کی قبر کی نشاندہی:۔</u> مرزا صاحب نے صرف نبوت کا ہی دعویٰ نہیں کیا بلکہ مسیح موعود ہونے کا دعویٰ بھی کیا تھا۔ مرزا صاحب عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ پیدائش کے تو قائل تھے لیکن رفع عیسیٰ کے قائل نہیں تھے۔ کیونکہ اگر وہ اس کے قائل ہوتے تو آپ کو مسیح موعود بننے میں مشکل پیش آتی تھی۔ ان کی امت نے تو جھنگ میں ایک ربوہ بنا لیا لیکن خود انہوں نے کشمیر کو ربوہ قرار دیا۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی طبعی موت قرار دینے کے بعد فرمایا کہ ان کی قبر کشمیر میں ہے۔ کشمیر کے صدر مقام سری نگر کے محلہ خان یار میں ایک قبر ''یوسف آز'' کے نام سے مشہور ہے۔ عوام میں یہ بات مشہور ہے کہ یہ کسی نبی کی قبر ہے جو کوئی شہزادہ تھا اور کسی دوسرے ملک سے یہاں آیا تھا۔ مرزا صاحب کے مقصد کے لئے یہ بے سروپا افواہیں ہی کافی تھیں۔ چنانچہ ان کو الہام ہو گیا کہ یہ قبر تو عیسیٰ علیہ السلام ہی کی ہے۔ اب اگر ان کی امت کے بقول ان کے الہام کو درست سمجھ بھی لیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں صرف سیدنا عیسیٰ کا ذکر نہیں بلکہ ان کی والدہ کا بھی ذکر ہے لہٰذا ان کو الہام تو دو قبروں کا ہونا چاہئے تھا۔ مگر افسوس ہے کہ وہاں قبر صرف ایک ہی ہے۔ اس سے ان کی نبوت اور الہامات کی بھی قلعی کھل جاتی ہے۔

وَّمَعِيْنٍ ﴿٥٠﴾ يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿٥١﴾ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴿٥٢﴾ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا

اے پیغمبروں کی جماعت[۵۳]! پاکیزہ چیزیں[۵۴] کھاؤ اور نیک اعمال کرو جو کچھ تم کرتے رہے ہو[۵۵] میں اسے خوب جانتا ہوں (۵۱) اور یہ تمہاری امت ایک ہی[۵۶] امت ہے اور میں تمہارا پروردگار ہوں۔ لہٰذا مجھی سے ڈرو۔ (۵۲) پھر لوگوں نے اپنے (دین کے) کام کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر

[۵۳] خطاب کا یہ انداز اس لحاظ سے نہیں کہ سارے رسول کسی ایک جگہ اکٹھے کئے گئے تھے تو انہیں اس طرح مخاطب کیا گیا ہے۔ بلکہ اس لحاظ سے ہے کہ چونکہ سارے رسولوں کی اصولی تعلیم ایک ہی جیسی رہی ہے۔ لہٰذا بطور اختصار یہاں خطاب کا مشترکہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ نیز اس آیت میں اگرچہ خطاب رسولوں کو ہے تاہم اس کا حکم عام ہے۔ اور قرآن کریم نے بعض مقامات پر تو یٰاَیُّھَا النَّاسُ کہہ کر حلال اور پاکیزہ چیزیں کھانے کا حکم دیا ہے اور بعض مقامات پر اس حکم کے مخاطب ایمان لانے والے ہیں۔

[۵۴] ❁ رسولوں کو پاکیزہ اشیاء کھانے کا حکم:۔ پاکیزہ چیزوں سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کا کھانا شریعت نے حلال قرار دیا ہو اور انہیں حلال ذرائع سے ہی حاصل کیا گیا ہو۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ مرغی بذات خود حلال چیز ہے مگر جب یہ چوری کی ہو تو حرام ہو جائے گی۔ اسی طرح سود یا دوسرے ناجائز ذرائع سے حاصل شدہ مال حرام مال تصور ہوگا۔

❁ کسب حلال کی اہمیت:۔ کسب حلال اور حرام سے اجتناب اس قدر اہم حکم ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے نیک اعمال سے پہلے ذکر فرمایا۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کسی کی کمائی حرام کی ہو تو اس کے نیک اعمال بھی قبول نہیں ہوتے۔ اس سلسلہ میں ہم سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۶۸ کے تحت آٹھ حدیثیں درج کر چکے ہیں جن کو دوبارہ دیکھ لینا مفید ہوگا۔ تاکہ اس اہم شرعی حکم کی اہمیت پوری طرح معلوم ہو جائے۔

[۵۵] یعنی اگر کسی نے کسب حلال میں حرام کی آمیزش کی ہو تو اُسے میں خوب جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارے اعمال میں اللہ کی رضامندی اور خلوص کا حصہ کتنا تھا۔ یہ مطلب اس لحاظ سے ہوگا جب اس خطاب کا روئے سخن عام لوگوں یا ایمانداروں کی طرف سے سمجھا جائے کیونکہ انبیاء سے کسی قسم کی نافرمانی کا امکان نہیں اور اگر اس کا روئے سخن انبیاء کی طرف سمجھا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ میں خوب جانتا ہوں کہ تم نے حق تبلیغ کس حد تک ادا کیا ہے۔

[۵۶] ❁ امۃ واحدۃ کا مفہوم:۔ امت سے مراد ایسا گروہ ہے جو ہم عقیدہ و ہم خیال ہو۔ اور یہاں تمہاری امت سے مراد انبیاء و رسل کی جماعت بھی ہو سکتی ہے اور ان کے ساتھ ان پر ایمان لانے والے بھی۔ اور یہ پوری کی پوری جماعت متحد العقیدہ تھی۔ یعنی ان سب کی اصولی تعلیم اور اصول و عقائد ایک ہی جیسے رہے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ (۱) اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا خالق و مالک ہے لہٰذا وہی اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اس کی ذات و صفات اور عبادات میں کسی دوسرے کو شریک نہ کیا جائے۔ (۲) یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ مرنے کے بعد ہر انسان کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور اسے اللہ کے حضور پیش ہونا پڑے

لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۵۴﴾ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ

لیا[۵۷]۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اس میں مگن ہے۔(۵۳) لہٰذا ان کا قصہ چھوڑو کہ وہ ایک خاص وقت تک اپنی اس مدہوشی میں [۵۸] پڑے رہیں۔(۵۴) کیا وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم جو انہیں مال اور اولاد دیئے

گا۔ دنیا میں جو اعمال وہ کرتا رہا اس کے متعلق اس سے باز پرس ہوگی۔ پھر ہر ایک کو اس کے اچھے یا برے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ لہٰذا تمہیں صرف مجھ سے ڈرنا چاہئے۔ (۳) کسبِ حرام سے مکمل طور پر اجتناب یعنی کسی صورت میں بھی دوسرے کے حقوق یا اموال پر ڈاکہ نہ ڈالا جائے اور (۴) اور نیک اعمال بجالائے جائیں یہ چار باتیں ایسی ہیں جو اصولی نوعیت کی ہیں اور ان کا حکم ہر نبی کو دیا جاتا رہا ہے اور انہی باتوں کا نام دین ہے۔ رہے جزئی احکام جن کا تعلق بالخصوص شق نمبر ۳ سے ہے تو اس میں انبیاء کی شریعتوں میں اختلاف بھی رہا ہے۔

[۵۷] ❁ دین کے اصول چار اور فرقے سینکڑوں:۔ یعنی اصل دین میں چند موٹی موٹی باتیں شامل تھیں۔ اور ہر نبی یہی اصول دین پیش کرتا رہا۔ مگر لوگوں نے انہیں اصول دین میں اختلاف کر کے سینکڑوں فرقے بنا ڈالے۔

مثلاً پہلی شق توحید ہی کو لیجئے۔ شیطان نے شرک کی بیسیوں نئی سے نئی قسمیں ایجاد کر کے لوگوں کو اس راہ پر ڈال دیا بعض لوگوں نے کسی شخص، نبی یا فرشتوں کو اللہ کی اولاد قرار دیا۔ حلول اور اوتار کا عقیدہ وضع کیا اور اللہ تعالیٰ کو بعض لوگوں کے اجسام میں اتار دیا۔ کسی نے کہا کہ فلاں ہستی اللہ کے نور میں سے (جدا شدہ) نور ہے۔ کئی ہستیوں کو اللہ کے علاوہ عالم الغیب اور حاضر وناظر تسلیم کیا گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت انسان نے جسے تمام مخلوق سے افضل واشرف پیدا کیا گیا تھا، اپنے نفع و نقصان کو پتھروں، درختوں، مویشیوں، ستاروں، جن بھوتوں اور آستانوں سے وابستہ کر دیا۔ اور ان کے آگے سر تسلیم خم کرنے لگا۔ انہیں سے مرادیں مانگنے لگا۔

❁ فرقے کیسے بنتے ہیں اور ہر فرقہ کی خود پسندی:۔ دوسری شق آخرت پر ایمان ہے۔ بعض لوگوں نے تو روز آخرت اور دوبارہ جی اٹھنے کا انکار ہی کر دیا۔ اور جنہوں نے اسے تسلیم کیا انہوں نے بھی اس کے تقاضوں کو نہ سمجھا۔ بعض نے کہا کہ ہم چونکہ انبیاء کی اولاد یا سادات ہیں۔ لہٰذا ہمیں کیسے عذاب ہو سکتا ہے۔ بعض لوگوں نے سفارش کے عقیدے وضع کر لئے اور اگر فلاں حضرت کی بیعت کر لی جائے تو وہ شفاعت کر کے ہمیں چھڑا لیں گے۔ بعض نے یہی عقیدہ اپنے دیوتاؤں سے یا بتوں سے وابستہ کر دیا۔ نصاریٰ نے کفارۂ مسیح کا عقیدہ گھڑ لیا اور بعض پادری حضرات اس دنیا میں ہی لوگوں سے رقوم بٹور کر کے ان کے لئے معافی نامے جاری کرنے لگے۔ اور بعض لوگوں نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ اگر فلاں حضرت کے بہشتی دروازہ سے اس کے عرس کے دن نیچے سے گزرا جائے تو یقیناً نجات ہو جائے گی ایسے سستی نجات کے سب عقیدے لغو اور باطل ہیں۔ اور قرآن نے ایسے عقائد رکھنے والوں کو آخرت کے منکر یعنی کافر قرار دیا ہے۔

تیسری شق حلال اور پاکیزہ اشیاء کھانے سے متعلق تھی تو اس میں بھی لوگوں نے افراط و تفریط کی راہیں پیدا کر لیں۔ رہبان و مشائخ اور بعض صوفیاء نے اپنے اوپر حلال اشیاء کو حرام قرار دے لیا۔ اور بعض دوسروں نے حرام وحلال کی تمیز ہی ختم کر دی اور سود جیسی حرام چیز کو جسے ساری شریعتوں میں حرام قرار دیا جاتا رہا ہے اسے حلال ثابت کرنے کی کوشش کی۔ بہت سے علماء و مشائخ، بتوں کے مہنتوں، مقبروں اور مزاروں کے مجاوروں نے حلت و حرمت کے اختیار خود سنبھال لئے اور ایسے لوگوں کا

بَنِیْنَ ﴿۵۵﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِی الْخَیْرٰتِ ۭ بَلْ لَّا یَشْعُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ خَشْیَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۵۷﴾
وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ یُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا یُشْرِکُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَآ
اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰی رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴿۶۰﴾ اُولٰٓئِکَ یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَهُمْ لَهَا

جارہے ہیں(۵۵) تو ہم انہیں بھلائیاں دینے میں جلدی[۵۹] کر رہے ہیں؟ معاملہ یوں نہیں بلکہ اصل بات کا انہیں شعور ہی نہیں(۵۶) (بھلائیاں پانے والے در اصل وہ لوگ ہیں) جو اپنے پروردگار کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں(۵۷) اور جو اپنے پروردگار کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں(۵۸) اور وہ اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے(۵۹) اور وہ (اللہ کی راہ میں) دیتے ہیں جو بھی دیں اور ان کے دلوں کو دھڑکا لگا رہتا ہے کہ وہ اپنے پروردگار کے پاس لوٹ کر جانے والے ہیں۔(۶۰) یہی لوگ ہیں جو نیک کاموں میں جلدی کرنے اور ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی[۶۰] کوشش کرتے ہیں۔(۶۱)

تذکرہ قرآن میں متعدد بار آیا ہے۔

چوتھی شق عمل صالح کی تھی۔ تو غالباً اس شق میں شرک سے بھی زیادہ فرقہ بازی ہوئی۔ دین کے بعض اصولی احکام کو مسخ کر کے بدعی عقائد و اعمال شامل کر دیئے گئے اور ان باتوں کی اصل بنیاد حبِ جاہ و مال تھی اور بے شمار سیاسی اور بدعی قسم کے فرقے وجود میں آگئے۔ انہی میں سے ایک تقلید شخصی کا عقیدہ ہے جس کے ذریعہ اماموں کو نبیوں کا درجہ دے دیا گیا یا ان سے بھی بڑھ کر سمجھا گیا۔

گویا اس سادہ اور مختصر سی اصولی تعلیم سے اختلاف کر کے لوگ جو فی الحقیقت ایک ہی امت تھے سینکڑوں اور ہزاروں فرقوں میں بٹتے چلے گئے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان میں ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے اور اپنے علاوہ دوسرے فرقوں کو دوزخ کا ایندھن سمجھتا ہے۔ حالانکہ یہ اصولی تعلیم آج بھی موجود ہے اور اگر کوئی شخص یا کوئی فرقہ تعصب سے بالاتر ہو کر راہ حق کو تلاش کرنا چاہے تو راہ حق آج بھی ایسی چھپی ہوئی چیز نہیں ہے جس کا سراغ نہ لگایا جا سکتا ہو۔

[۵۸] یعنی ایسے متعصب اور ہٹ دھرم لوگ جو راہِ راست کی طرف آنا بھی پسند نہیں کرتے اور اپنے حال میں مست اور مگن ہیں۔ انہیں ان کے حال پر ہی رہنے دیجئے ایک وقت آنے والا ہے جب انہیں سب حقیقت پوری طرح معلوم ہو جائے گی۔

[۵۹] ۞ کیا آسودہ حالی اللہ کی رضامندی کی علامت ہے؟ دنیا دار اور جاہل لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ آسودہ حالی اللہ کی رضامندی کی علامت ہوتی ہے۔ اور تنگدستی یا پریشان حالی اللہ تعالیٰ کی ناراضی کی۔ حالانکہ بسا اوقات معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ چودھری لوگوں کی سرکشی کا بڑا سبب یہی نظریہ ہوتا ہے وہ دیکھتے ہیں کہ پیغمبروں کی تکذیب کرنے اور ایمانداروں پر ظلم و زیادتی روا رکھنے کے باوجود بھی ان کا کچھ نہیں بگڑا تو وہ اس نظریہ پر مزید پختہ ہو جاتے ہیں۔ اب اللہ کی طرف سے ان پر ابتلاء کا دور یوں آتا ہے کہ ان پر مزید انعامات الٰہی کی بارش ہونے لگتی ہے۔ حالانکہ ان انعامات کی حیثیت ایسے ہی ہوتی ہے جیسے بجھنے والا چراغ بجھنے سے پیشتر ایک دفعہ خوب روشن ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ مال و دولت اور نعمتوں کی فراوانی اللہ کی خوشنودی کے طور پر نہیں بلکہ امہال و استدراج کی بنا پر ہے۔ اور جتنی انہیں ڈھیل دی جا رہی ہے اسی قدر ان کی شقاوت کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے۔

[۶۰] ان لوگوں کے مقابلہ میں اب اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلص بندوں کی چند صفات بیان فرمائیں سب سے پہلی بات یہ کہ ان

سٰبِقُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾ بَلْ

ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف [۶۱] نہیں دیتے اور ہمارے پاس ایسی کتاب (نامہ اعمال) ہے جو ٹھیک ٹھیک [۶۲] بیان کردے گی اور ان کی حق تلفی [۶۳] نہ ہوگی۔ (۶۲)

میں نیک کام کرتے رہنے کے باوجود نیکی کا غرور اور گھمنڈ پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اس بات سے اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں کہ ان کے یہ اعمال شاید اللہ کی بارگاہ میں قبول ہونے کے لائق تھے یا نہیں یا ان میں کچھ تقصیر تو نہیں ہوگئی۔ دوسری صفت یہ ہے کہ وہ منزل من اللہ آیات پر بھی ایمان لاتے ہیں اور کائنات میں ہر طرف اللہ کی بکھری ہوئی آیات میں غور کرکے ان سے معرفت بھی حاصل کرتے ہیں جن سے ان کے دلوں میں اللہ کی عظمت اور جلال کا سکہ بیٹھتا ہے تیسری صفت یہ ہے کہ وہ شرک کی ہر چھوٹی بڑی قسم سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور چوتھی صفت یہ کہ اپنے اموال اور دوسری اللہ کی عطا کردہ نعمتوں میں سے صدقہ و خیرات وغیرہ ادا کرنے کے باوجود اللہ کے حضور اعمال کی باز پرس سے ڈرتے بھی رہتے ہیں۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہوتا ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے اس آیت کے متعلق نبی اکرم ﷺ سے پوچھا کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں دیتے ہیں، انہیں کس بات کا ڈر لگا رہتا ہے؟ کیا وہ شراب پیتے ہیں یا چوری کرتے ہیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا: صدیق کی بیٹی! یہ بات نہیں بلکہ وہ لوگ روزہ رکھتے، نماز پڑھتے اور صدقہ دیتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ ڈرتے ہیں کہ شاید ان کا عمل قبول نہ ہو۔ یہی لوگ ہیں جو نیکیوں کی طرف لپکتے اور آگے نکل جانے والے ہیں" (ترمذی۔ ابواب التفسیر)

[۶۱] ۞ تکلیف کا مفہوم' شرعی احکام کی حکمت اور ہر شخص کی استعداد کا لحاظ: یعنی ہم نے احکام شریعت ایسے نازل نہیں کئے جو انسان کی بساط سے باہر ہوں۔ شرعی احکام میں مصلحت کے جس پہلو کو ملحوظ رکھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ شرعی احکام بالعموم مسلمانوں کی اکثریت کے لئے اور نارمل حالات میں قابل عمل ہوتے ہیں۔ جب حالات بدل جائیں تو احکام میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی کردی جاتی ہے پھر چونکہ یہ احکام ایک عام انسان کی استعداد یا قوتِ کار کو ملحوظ رکھ کر دیئے جاتے ہیں۔ لہٰذا عام استعداد سے کم استعداد رکھنے والوں مثلاً بیماروں یا معذوروں کے لئے رخصت یا رعایت دی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ نابالغ، مجنون وغیرہ سے شرعی احکام ویسے ہی ساقط کردیئے گئے ہیں۔ پھر معاشرہ میں کچھ ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو ایک عام انسان کی استعداد سے زیادہ استعداد رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے وسیع میدان عمل کو سامنے لاکر اس حکم کی زیادہ سے زیادہ بجا آوری کی ترغیب دی جاتی ہے۔ مثلاً ہر عاقل و بالغ مسلمان کو پانچ وقت نماز باجماعت ادا کرنے کا حکم ہے اور نماز سے پہلے وضو یا طہارت بھی ضروری ہے تو حالات کے مطابق مراعات تو یہ ہیں کہ جسے وقت پر وضو کے لئے پانی دستیاب نہ ہو وہ تیمم کرسکتا ہے۔ بیمار کو اگر وضو کرنے سے بیماری بڑھنے یا کسی اور تکلیف کا خطرہ ہو تو وہ بھی تیمم کرسکتا ہے۔ سفر یا خوف کی حالت میں نماز قصر بھی کرسکتا ہے اور دو نمازیں اکٹھی بھی پڑھ سکتا ہے، نیز سفر کی حالت میں سواری پر بھی نماز ادا کرسکتا ہے۔ نیز اگر قبلہ یا صحیح وقت کی تعیین میں دقت ہو تو اندازہ سے کام لے سکتا ہے۔ بارش یا کسی اور معقول عذر کی وجہ سے مسجد نہیں جاسکتا تو گھر پر نماز ادا کرسکتا ہے۔ اور کم استعداد والوں کی مثال یوں سمجھئے کہ بیمار بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہے اگر زیادہ بیمار ہے تو لیٹے لیٹے ہی پڑھ سکتا ہے۔ اتنی بھی ہمت نہ رہی ہو تو اشارہ سے بھی ادا کرسکتا ہے۔ ایسا بیمار یا انتہائی بوڑھا جو مسجد تک جانے کی ہمت نہیں رکھتا۔

قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴿۶۳﴾ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا

بلکہ اس بات سے تو ان کے دل سخت غافل ہیں اور اس غفلت کے علاوہ ان کے اور بھی کئی (برے) اعمال ہیں[۶۴] جو وہ کر رہے ہیں (۶۳) یہاں تک کہ جب ہم ان کے عیاش لوگوں کو

مستقل طور پر اپنے گھر میں نماز ادا کر سکتا ہے۔ یہی اس جملہ کا مطلب ہے کہ ”ہم کسی شخص کو اس کے مقدور سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے“ اتنی مراعات کے باوجود پھر بھی کوئی شخص عمداً نماز ادا نہیں کرتا تو وہ کافر ہو جائے گا اور اگر نماز کی بجا آوری میں کوتاہی کرتا ہے تو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا۔

اور جو لوگ زیادہ استعداد رکھتے ہیں ان کے لئے فرضی نماز کے علاوہ نوافل تجویز کئے گئے ہیں۔ مثلاً ظہر کی نماز کی فرض رکعات صرف چار ہیں۔ ان چار رکعات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تطوعاً جو اضافہ کیا وہ ہمارے لئے سنت ہیں اور وہ چار رکعات فرض نماز سے پہلے ہیں اور دو بعد میں۔ پھر ان فرض اور سنت رکعات پر تطوعاً آخر میں مزید رکعات کا اضافہ ہوا جسے نفل کہتے ہیں اور ان پر مزید نوافل کا اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ پھر کچھ نمازیں ایسی ہیں جو فرض کفایہ ہیں جیسے نماز جمعہ اور نماز جنازہ وغیرہ اور کچھ سنت ہیں جیسے تہجد کی نماز جو آپ ﷺ پر تو فرض تھی مگر امت کے لئے سنت موکدہ ہے یا نماز تراویح اور کچھ نمازیں ہی نفلی ہیں مثلاً نماز چاشت، اوابین اور شکرانہ کے نوافل اور کچھ نفل نمازیں حالات سے متعلق ہیں۔ جیسے نماز استسقاء، نماز کسوف اور خسوف وغیرہ یہ ہے وہ وسیع میدان جو ترقی درجات کا سبب بنتا ہے۔ پھر ایک نماز ہی کی یہ صورت نہیں۔ صدقات و خیرات بلکہ ہر رکن اسلام اور عمل صالح کی یہی صورت ہے کہ اس میں تطوعات کا وسیع میدان موجود ہے یہی وہ میدان ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿یُسَارِعُوْنَ فِي الْخَیْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ﴾ اور اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بھلے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرنا کوئی ایسی بات نہیں جو انسان کی بساط سے باہر ہو۔ کم از کم ہر انسان کو ایسا کرنے کی کوشش ضرور کرنا چاہئے۔

[۶۲] **اعمال کے اندراج کا طریق کار:۔** یعنی ہر انسان کے اعمال، افعال، اقوال حتیٰ کہ دل کے خیالات اور دل میں پیدا ہونے والے وساوس اور ارادے بھی ساتھ کے ساتھ ریکارڈ ہو رہے ہیں۔ قرآن کی تصریح کے مطابق یہ قلم بند کرنے والے دو معزز فرشتے ہوتے ہیں ایک انسان کے دائیں طرف، دوسرا بائیں طرف، پھر ان کی ڈیوٹیاں بھی فجر اور عصر کے وقت بدلتی رہتی ہیں موجودہ دور کی سائنسی ایجادات نے اس حقیقت کو بہت حد تک قریب الفہم بنا دیا ہے کہ یہ باتیں از خود کس طرح ریکارڈ میں آ جاتی ہیں۔ گویا ہر شخص کی زندگی کی مکمل ہسٹری شیٹ اللہ کے ہاں موجود رہتی ہیں اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نہ تو کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات قلم بند ہونے سے رہ جاتی ہے اور نہ ہی اس میں کوئی غلط اندراج ہو سکتا ہے (نیز دیکھئے سورہ کہف کی آیت نمبر ۴۹)

[۶۳] یعنی یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ کسی کو اس کے کام سے کم اجر ملے، نہ یہ کہ اس کے گناہ سے زیادہ سزا ملے۔ یا کسی کا جرم کسی دوسرے کے کھاتے میں چلا جائے۔ غرضیکہ کسی طرح کی زیادتی اور حق تلفی ممکن نہ ہوگی۔

[۶۴] یعنی یہ بات ان کے ذہن میں آتی ہی نہیں کہ ان کی پوری ہسٹری شیٹ ساتھ ہی ساتھ تیار ہو رہی ہے۔ لہٰذا وہ اپنے دنیا کے دوسرے کاموں میں ہی ایسے منہمک اور مگن ہیں کہ انہیں اس نامہ اعمال اور اس کی بنا پر آخرت کی بازپرس کا خیال تک نہیں آتا۔

مُتْرَفِيهِم بِالْعَذَابِ إِذَا هُمْ يَجْـَٔرُونَ ﴿٦٤﴾ لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ إِنَّكُم مِّنَّا لَا تُنصَرُونَ ﴿٦٥﴾ قَدْ كَانَتْ آيَاتِي تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَكُنتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ تَنكِصُونَ ﴿٦٦﴾ مُسْتَكْبِرِينَ بِهِ سَامِرًا تَهْجُرُونَ ﴿٦٧﴾ أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ جَاءَهُم مَّا لَمْ يَأْتِ آبَاءَهُمُ الْأَوَّلِينَ ﴿٦٨﴾ أَمْ لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ فَهُمْ لَهُ مُنكِرُونَ ﴿٦٩﴾ أَمْ يَقُولُونَ

عذاب میں پکڑلیں گے تو اس وقت وہ چیخنا چلانا[۶۵] شروع کر دیں گے (۶۴) (ہم کہیں گے) آج چلاؤ نہیں۔ ہماری طرف سے تمہیں کوئی مدد نہیں ملے گی۔ (۶۵) جب میری آیات تم پر پڑھی جاتی تھیں تو تم اُلٹے پاؤں[۶۶] پھر جاتے تھے۔ (۶۶) اپنے گھمنڈ میں میری آیتوں کو افسانے[۶۷] سمجھتے اور بکواس کیا کرتے تھے۔ (۶۷) کیا ان لوگوں نے اس کلام پر کبھی غور نہیں کیا یا ان کے پاس کوئی ایسی بات آئی ہے جو ان کے آباء واجداد[۶۸] کے پاس نہیں آئی تھی؟ (۶۸) یا انہوں نے اپنے[۶۹] رسول کو پہچانا ہی نہیں لہذا وہ اس کا انکار کر رہے ہیں؟ (۶۹) یا وہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ اسے

[۶۵] یعنی جب عذاب الٰہی آتا ہے تو واویلا اور چیخ پکار کرنے والے بھی وہی لوگ ہوتے ہیں جو آسودہ حال اور چودھری ٹائپ ہوتے ہیں۔ یہی لوگ نبیوں کی تکذیب، انہیں ایذائیں پہنچانے اور عوام کو اللہ کی راہ سے روکنے میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ اور عذاب نازل ہونے پر چیخنے چلانے والے بھی یہی ہوتے ہیں۔ حالانکہ جب عذاب آجاتا ہے تو پھر چیخنے چلانے یا فریادیں کرنے کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔ نہ ہی کوئی طاقت انہیں اللہ کے عذاب سے بچا سکتی ہے۔

[۶۶] یہ عذاب دراصل ان کے اپنے ہی اعمال کی شامت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ انہیں جب اللہ کی آیات سے نصیحت کی جاتی تھی اور برے انجام سے ڈرایا جاتا تھا تب تو وہ ایسی باتوں کو سننا بھی گوارا نہ کرتے تھے اور اب جب سر سے پانی چڑھ گیا تو پھر چیخنے چلانے کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟

[۶۷] ۞ سمر کا لغوی مفہوم:۔ سمر کے معنی رات کے وقت سونے سے پیشتر ایک دوسرے سے قصے کہانیاں بیان کرنا۔ تاکہ ان قصے کہانیوں میں محو ہو کر نیند آجائے۔ یہ قصے یا افسانے یا کہانیاں محض دفع الوقتی یا خوش وقتی کے لئے سنے سنائے جاتے ہیں۔ ان کا اور کچھ مقصد نہیں ہوتا۔ دیہاتوں میں آج بھی یہ دستور ہے کہ بڑے لوگ چھوٹوں کو کوئی بھوت پریت یا ایسی ہی دوسری کہانیاں سناتے ہیں اور مکہ میں بھی یہی دستور تھا۔ اور ھجر کے معنی بیماری، نیم بے ہوشی یا نیم خفتگی کی حالت میں مہمل سی باتیں کرنا یا بڑبڑانا۔

گویا مترفین یا ان عیاش لوگوں کا جرم یہ تھا کہ اللہ کی آیات کو سننا بھی گوارا نہ کرتے تھے اور از راہ تکبر منہ موڑتے ہوئے واپس چلے جاتے تھے۔ مزید بر آں ایک دوسرے سے اگر آیاتِ الٰہی کا ذکر کرتے بھی تو انتہائی بے نیازی اور لاپروائی سے جیسے کوئی مہمل سی باتیں یا قصے کہانیاں سنا رہا ہو۔ ان کے ان جرائم کی سزا یہی ہے کہ اب ان کے چھٹکارا کی سب راہیں بند کر دی جائیں اور ان کی آہ وفغاں پر کچھ توجہ نہ دی جائے۔

[۶۸] یعنی اگر لوگ قرآن اور اس کی آیات میں غور کرتے تو انہیں بآسانی معلوم ہو سکتا تھا کہ اس میں وہی باتیں مذکور ہیں جو سابقہ تمام انبیاء کی تعلیم رہی ہے اور جنہیں ان کے آباء واجداد بھی سنتے رہے ہیں۔ یہ کوئی نئی تعلیم تو ہے نہیں۔ پھر آخر ان

بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلْ جَاۗءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ۝ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاۗءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ

جنون ہے[۶۹]۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان کے پاس سچی بات لایا ہے لیکن ان میں[۷۱] سے اکثر لوگ حق کو پسند ہی نہیں کرتے (۷۰) اور اگر حق ان کی خواہشات کی پیروی کرتا تو یہ زمین و آسمان اور ان میں جو کچھ ہے ان سب کا نظام درہم برہم[۷۲]

کے اس طرح بدکنے کی کیا وجہ ہے؟ بلکہ اگر وہ سنجیدگی سے اس میں غور کرتے تو انہیں خوب معلوم ہو جاتا کہ یہ کلام طعن و تشنیع کے نہیں تعریف کے قابل ہے۔ جس میں سراسر حکمت بھری ہوئی ہے اور کلام بھی نہایت فصیح و بلیغ ہے۔

[۶۹] اللہ کی آیات سے بدکنے کی دوسری وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے اس رسول سے پوری طرح متعارف نہ ہوتے۔ اور جب وہ یہ باتیں اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کی زندگی ابتدا ہی سے بے داغ رہی ہے۔ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ کسی انسان سے فریب نہیں کیا۔ کبھی کسی کی امانت میں خیانت نہیں کی۔ نہ کبھی وعدہ خلافی کی ہے نہ کبھی کسی سے الجھا ہے تو کیا وہ شخص جو کسی انسان سے کبھی جھوٹ نہیں بولتا وہ اللہ پر جھوٹ بول سکتا ہے کہ اس نے مجھے رسول بنایا ہے اور اللہ کے نام پر تمہیں فریب دے سکتا ہے؟

[۷۰] انکار کی ایک تیسری وجہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ لوگ اپنے رسول کو دیوانہ سمجھ کر اس کی باتوں کو درخور اعتناء نہ سمجھیں۔ اگر وہ اسے دیوانہ کہہ بھی دیں تو ان کے دل ہرگز اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ جب دعوت توحید کا چرچا عام ہونے لگا تو قریشی سرداروں کو بہت فکر لاحق ہوگئی۔ وہ اس دعوت کو روکنے کے لئے مشورہ کی خاطر ولید بن مغیرہ کے پاس جمع ہوئے۔ ولید بن مغیرہ ابوجہل کا چچا تھا اور حرب بن امیہ کی وفات کے بعد قریش کی سیادت اسی کے ہاتھ آئی تھی) ولید بن مغیرہ ایک سمجھدار آدمی تھا۔ کہنے لگا اس سلسلہ میں اپنی اپنی تجاویز پیش کرو انہیں پیش کردہ تجاویز میں سے ایک سردار نے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ ہم لوگوں سے کہیں گے کہ "وہ تو ایک مجنون آدمی ہے" یہ سن کر ولید بن مغیرہ کہنے لگا: "اللہ کی قسم! وہ دیوانہ نہیں ہے۔ ہم نے دیوانوں کو بارہا دیکھا ہے۔ اس کے اندر نہ دیوانوں جیسی دم گھٹنے کی کیفیت ہے، نہ الٹی سیدھی حرکتیں ہیں اور نہ ہی ان جیسی بہکی بہکی باتیں ہیں" (الرحیق المختوم ص ۱۲۱) (نیز رسول اور مجنون میں فرق کے لئے دیکھئے سورہ اعراف آیت نمبر ۱۸۴)

[۷۱] پھر جب یہ سب باتیں ناممکن ہیں تو اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ جو دعوت یہ رسول پیش کر رہا ہے وہ حق اور درست ہو، اور ان کے انکار اور بدکنے کی وجہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ انہیں سچی بات سے چڑ ہو گئی ہے اور وہ اپنی ضد، تعصب اور ہٹ دھرمی کی بنا پر یہ سچی بات قبول کرنے کو تیار نہیں۔

[۷۲] ❁ حق لوگوں کی خواہشات کا تابع نہیں:۔ اگر اللہ تعالیٰ یا اللہ تعالیٰ کے احکام عام لوگوں کی خواہشات کے مطابق نازل ہوں اور اللہ تعالیٰ لوگوں کی خواہشات کے مطابق احکام نازل کرے تو اللہ تعالیٰ مالک و مختار رہ کہاں گیا؟ اس صورت میں تو اللہ تعالیٰ (معاذ اللہ) بندوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن گیا۔ پھر خواہشات بھی ہر شخص کی الگ الگ ہیں۔ اور ایک دوسرے کی خواہشات سے ٹکراتی ہیں اس بات کو ایک سادہ سی کہانی سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں ایک آدمی کی دو بیٹیاں تھیں۔ اس نے اپنی ایک بیٹی کا نکاح ایک زمیندار لڑکے سے کر دیا اور دوسری کا ایک کمہار سے۔ ایک دفعہ وہ اپنی بیٹیوں سے ملنے گیا۔ پہلے

وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۱﴾ اَمْ تَسْــَٔــلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ

ہو جاتا بلکہ ہم نے انہیں انہی کے لئے ذکر (قرآن) دیا ہے مگر وہ اپنے اس ذکر سے ہی منہ موڑ[۷۳] رہے ہیں۔(۷۱) یا آپ ان سے کچھ مال مانگتے ہیں؟ تو آپ کے لئے آپ کے

بڑی بیٹی کے ہاں گیا تو وہ کہنے لگی۔ ابا جان! کافی عرصہ سے بارش نہیں ہو رہی فصل کو پانی کی شدید ضرورت ہے۔ آپ اللہ سے دعا کریں کہ وہ رحمت کی بارش برسادے۔ ورنہ اگر فصل نہ ہوئی تو ہم تو بھوکوں مر جائیں گے۔ اس نے بیٹی سے دعا کا وعدہ کیا۔ پھر دوسری بیٹی کے ہاں گیا۔ تو وہ کہنے لگی: ابا جان! ابھی ابھی ہم نے برتنوں والا آوا چڑھایا ہے۔ آپ اللہ سے دعا کریں کہ ابھی کچھ مدت بارش نہ ہو۔ اگر بارش ہو گئی تو ہمارا بہت نقصان ہو جائے گا" وہ اس کی بات سن کر کہنے لگا: "یااللہ! جیسے تیری مرضی ہے ویسے ہی کر۔ اپنے کاموں کو تو ہی بہتر جانتا ہے"

اب اگر مشرکوں کی خواہش کا اتباع کیا جائے تو ان کی تو یہ خواہش ہے کہ ان کے معبودوں کو تصرف امور میں شریک سمجھا ہی نہ جائے بلکہ بنا بھی دیا جائے۔ اب بتایئے کہ اس صورت میں یہ نظامِ کائنات ایک ساعت بھی قائم رہ سکتا ہے؟ ایک گھر میں دو منتظم یا ایک مملکت میں دو بادشاہ بھی سما نہیں سکتے تو کیا اس کائنات میں مشرکوں کے سینکڑوں خداؤں کی خدائی سے کائنات کا نظام ایک منٹ بھی چل سکتا ہے۔ حق صرف اس لئے حق ہے کہ لوگ اس کی اتباع کریں نہ یہ کہ حق لوگوں کی خواہشات کی اتباع کرنے لگے۔ اور اگر بفرضِ محال ایسی صورت ہو تو کوئی بات بھی حق نہ رہے گی۔

[۷۳] ۞ قرآن کی تاثیر: عتبہ بن ربیعہ پر قرآن کی آیات کا اثر:۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ ہم نے ان کی طرف قرآن اس لئے نازل کیا تھا کہ وہ ہدایت حاصل کرتے۔ جیسا کہ کفارِ مکہ کہا کرتے تھے کہ اگر ذکر ہماری طرف نازل کیا جائے تو ہم یقیناً دوسری سب قوموں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہو جائیں گے۔ (۶:۱۵۷) پھر جب ذکر ان کے پاس آ گیا تو بجائے اس کے کہ اسے قبول کر لیتے اس سے اِعراض کرنے لگے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہاں ذکر سے مراد عزو شرف ہے اور یہ معنی بھی اکثر مفسرین نے اختیار کیا ہے یعنی ہم نے یہ ذکر تمہاری ہی زبان میں نازل کیا تاکہ تم اسے خوب سمجھ سکو پھر رسول نے تمہیں واضح طور پر بتادیا کہ اگر تم اس کی تعلیم پر عمل کرو گے تو تم عرب و عجم کے حکمران بن جاؤ گے اور اس کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ ایک دفعہ عتبہ بن ربیعہ، جو ایک معزز قریشی سردار، نہایت بہادر اور فطرتاً نیک دل انسان تھا۔ حرم میں بیٹھ کر اپنے دوسرے ساتھیوں سے کہنے لگا کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کچھ باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ امید ہے وہ ان میں سے ایک نہ ایک ضرور قبول کر لے گا اور اگر اس نے قبول کر لی تو ہم اس مصیبت سے نجات حاصل کر سکیں گے۔

مشرکوں نے کہا: ابوالولید! ضرور یہ کام کرو۔ چنانچہ آپ ﷺ کے پاس آ کر اس نے چند باتیں پیش کیں۔ جن کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ ان سب باتوں کے جواب میں آپ نے سورہ حم السجدہ کی چند آیات پڑھیں جنہیں عتبہ چپ چاپ سنتا رہا۔ جب آپ اس آیت پر پہنچے ﴿فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ﴾ (۴۱:۱۳) "یعنی اگر یہ لوگ اعراض کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہیں عاد و ثمود کی کڑک جیسی ایک کڑک کے خطرہ سے آگاہ کر رہا ہوں" تو عتبہ

رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۷۲﴾ وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۳﴾ وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا
يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ﴿۷۴﴾ وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ

پروردگار کا دیا[۷۴] ہی بہتر ہے اور وہی بہترین رازق ہے۔(۷۲) اور بلاشبہ آپ انہیں[۷۵] سیدھی راہ کی طرف بلاتے ہیں۔(۷۳) اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ اس سیدھی راہ سے ہٹ کر چلنا چاہتے ہیں(۷۴) اور اگر ہم ان پر مہربانی کریں اور ان کی تکلیف کو دور کر دیں تو یہ اپنی سرکشی میں اور

کے آنسو بہنے لگے اور آپ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ قرآن کی یہ آیات اس کے دل کو خوب متاثر کر رہی تھیں اور اسے یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں ایسا عذاب اسی وقت نہ آن پڑے۔ وہ چپ چاپ وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر اب وہ پہلا عتبہ نہ رہا تھا۔ جاکر قریشیوں سے کہنے لگا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کلام پیش کرتا ہے وہ شاعری نہیں کچھ اور ہی چیز ہے تم اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اگر وہ عرب پر غالب آ گیا تو اس میں تمہاری ہی عزت ہے اور اگر وہ خود ہی ختم ہو گیا تو یہی کچھ تم چاہتے ہو" وہ کہنے لگے: "ابوالولید! معلوم ہوتا ہے تم پر بھی اس کا جادو چل گیا۔ (تفسیر ابن کثیر، ج ۶، ۱۵۹ تا ۱۶۱)

مگر جب یہ عزو شرف بخشنے والا ذکر آ گیا تو انہوں نے اس سے اعراض اور نفرت کا اظہار شروع کر دیا۔

[۷۴] آپ کی دعوت سے ان لوگوں کے انکار کی ایک چوتھی وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ آپ ان سے اپنی اس محنتِ تبلیغ کا معاوضہ مانگتے ہوں اور وہ اسے تاوان سمجھ کر اس سے انکار کر دیں۔ یہ بات بھی نہ تھی۔ نہ صرف یہ کہ آپ بے لوث ہو کر دعوت دین کا کام سر انجام دے رہے تھے بلکہ اس سے کئی مسائل پیدا ہو گئے۔ نبوت سے پہلے آپ تجارت کرتے تھے۔ نبوت کے بعد یہ شغل چھوٹ گیا۔ پہلے آپ مالدار تھے، بعد میں افلاس میں مبتلا ہو گئے۔ پہلے آپ اپنی قوم کی آنکھوں کا تارا تھے۔ بعد میں وہی قوم آپ کی دشمن بن گئی۔ قوم نے آپ سے سمجھوتہ کی خاطر بے شمار مال و دولت قدموں میں ڈھیر کرنے کا لالچ دیا مگر آپ نے اسے ٹھکرا دیا۔ اس سے ان لوگوں کو اتنا بھی پتہ نہیں چل سکتا کہ جو شخص کئی طرح مصیبتیں سہہ کر اور بغیر معاوضہ کے ایسی خدمت سر انجام دے رہا ہے اس کی کوئی غرض دنیا سے وابستہ نہیں ہو سکتی۔ اور جس ہستی کے لئے وہ اتنی مشقتیں برداشت کر رہا ہے اس کا معاوضہ بھی اسی کے ذمہ ہے اور وہ ایسے ذرائع سے رزق مہیا کرتا ہے جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتے۔

[۷۵] سیدھی راہ سے مراد:۔ یعنی وہ ایسی موٹی موٹی باتیں ہیں جو ہر پیغمبر پر وحی کی جاتی رہی ہیں۔ ان میں کوئی ایچ پیچ نہیں۔ کوئی پیچیدگی اور ابہام نہیں۔ ان کے دلائل نہایت سادہ اور عام فہم ہیں۔ جو ایک دیہاتی اور بدو کو بھی متاثر کر دیتے ہیں۔ ان کے سمجھنے کے لئے کسی لمبی چوڑی تعلیم کی بھی ضرورت نہیں۔ مثلاً ایک بدو سے کسی نے پوچھا کہ کیا اللہ تعالیٰ کی ہستی موجود ہے؟" کہنے لگا: "ہاں ہے! پوچھنے والے نے دوبارہ سوال کیا" بھلا کیسے؟" بدو کہنے لگا: اگر ہم راہ میں کوئی اونٹ کی مینگنی پڑی دیکھیں تو ہم اندازہ لگا لیتے ہیں کہ یہاں سے یقیناً کوئی اونٹ گزرا ہے۔ اسی طرح جب ہم یہ کائنات کا اتنا وسیع کارخانہ دیکھتے ہیں تو لازماً اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس کا کوئی بنانے والا ضرور ہونا چاہئے"

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک گھر میں دو حاکم ہوں تو اس کا نظام کبھی درست نہیں رہتا پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کائنات

طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُونَ ﴿۷۵﴾ وَلَقَدۡ اَخَذۡنٰهُمۡ بِالۡعَذَابِ فَمَا اسۡتَكَانُوۡا لِرَبِّهِمۡ وَمَا يَتَضَرَّعُوۡنَ ﴿۷۶﴾

حَتّٰۤى اِذَا فَتَحۡنَا عَلَيۡهِمۡ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيۡدٍ اِذَا هُمۡ فِيۡهِ مُبۡلِسُوۡنَ ﴿۷۷﴾ وَهُوَ الَّذِىۡۤ اَنۡشَاَ لَكُمُ السَّمۡعَ

زیادہ بھٹکتے جائیں گے۔(۷۵) اور ہم نے انہیں عذاب میں مبتلا کیا تو بھی یہ[۷۶] نہ اپنے پروردگار کے سامنے جھکے اور نہ آہ و زاری کی(۷۶) یہاں تک کہ ہم نے ان پر سخت عذاب کا در کھول دیا[۷۷] تو اس حال میں وہ (ہر بھلائی سے) مایوس[۷۸] ہونے لگے۔(۷۷) وہی تو ہے جس نے تمہیں کان،

میں اللہ کے سوا کچھ اور بھی مالک و مختار ہوں؟ اگر ایسی صورت ہو تو کائنات کا نظام تو ایک دن بھی نہ چل سکے۔

اسی طرح ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت اور ہر زمانہ میں مردہ سے زندہ اور زندہ سے مردہ پیدا کر تا رہتا ہے۔ انسان جو غذائیں کھاتا ہے سب بے جان ہیں۔ کئی مراحل کے بعد انہیں غذاؤں سے نطفہ بنتا ہے۔ پھر اسی نطفہ سے ایک جیتا جاگتا انسان پیدا ہو جاتا ہے۔ جس میں اس کے ماں باپ کے خصائل و عادات اور نقش و غیرہ تک کی جھلک موجود ہوتی ہے۔ اسی سے بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جو کام اس دنیا میں ہر آن ہمارے سامنے ہو رہے ہیں وہ آخر انسان کی موت کے بعد کیوں ناممکن ہیں۔ غرض دین کی اصولی تعلیمات پر غور فرمایئے تو سب باتیں سیدھی، سادہ اور عام فہم نظر آئیں گی اور یہی اصولی باتیں ہی اللہ کی سیدھی راہ ہے۔

[۷۶] ❁ کفارِ مکہ پر قحط:۔ جب ابتدائے اسلام میں ہی کفار مکہ نے مسلمانوں اور پیغمبر اسلام پر مصائب ڈھانا شروع کئے اور یہاں تک مخالفت کی کہ ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حضور ان کے حق میں بددعا کی اور فرمایا: یااللہ! ان پر سیدنا یوسف علیہ السلام والے قحط کے سات سال مسلط کر" چنانچہ آپ کی دعا قبول ہوگئی تو ان پر قحط کا عذاب آگیا۔ بارشیں رک گئیں۔ باہر سے غلہ آنا بھی رک گیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ یہ لوگ مردار، ہڈیاں اور خون تک کھانے پر مجبور ہوگئے مگر بھوک پھر بھی نہ مٹتی تھی۔ لوگ بھوکوں مرنے لگے اور بھوک کی وجہ سے اتنے کمزور ہوگئے کہ آسمان کی طرف نظر اٹھاتے تو انہیں دھواں نظر آتا تھا۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن میں متعدد مقامات پر آیا ہے اور سورہ دخان میں صراحت سے مذکور ہے۔ بالآخر ابوسفیان آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا تم تو رشتہ جوڑنے کی تاکید کرتے رہتے ہو اور ہم تمہاری ہی برادری ہو کر بھوکوں مر رہے ہیں ہمارے لئے اللہ سے رحم کی دعا کرو" چنانچہ آپ ﷺ نے دعا فرمائی اور اللہ نے رحم کر دیا۔ بارشیں بھی شروع ہوگئیں اور باہر سے غلہ آنا بھی اور بھلے دن آگئے پھر کفار مکہ سب باتیں بھول گئے اور پھر پہلے کی طرح مسلمانوں کو دکھ دینا شروع کر دیا۔

[۷۷] سخت عذاب سے مراد وہ مار ہے جو کافروں کو مسلمانوں کے ہاتھوں پڑتی رہی اور جس کا آغاز غزوہ بدر سے ہوا تھا۔

[۷۸] ❁ بلس کے معنی مایوسی کی وجہ سے انتقام پر اتر آنا:۔ لفظ مُبۡلِسُوۡنَ آیا ہے اور بلس کے معنی غم کی وجہ سے سخت مایوس ہو جانا یا سخت مایوسی کی وجہ سے غمگین ہونا پھر اسی مایوسی کی بنا پر برافروختہ ہو جانا یا بھڑک اٹھنا۔ سعدی کا ایک شعر ہے۔

نہ بینی کہ چوں گربہ عاجز شود ...... برآرد بچنگال چشم پلنگ

ترجمہ: تم دیکھتے نہیں کہ چیتے کے مقابلہ میں جب بلی عاجز ہو جاتی ہے اور اسے اپنی موت کا یقین ہو جاتا ہے تو چیتے پر حملہ کر کے

وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾ وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۸۰﴾

آنکھیں اور دل [۷۹] عطا کئے (تاکہ تم سنو، دیکھو اور غور کرو) مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔(۷۸) اور وہی ذات ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلا دیا اور اسی کی طرف تم اکٹھے کئے [۸۰] جاؤ گے۔(۷۹) اور وہی ہے جو زندہ کرتا اور مارتا [۸۱] ہے اور رات اور دن کا باری باری آتے رہنا اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ کیا تم کچھ بھی نہیں سمجھتے؟(۸۰)

اپنے پنجہ سے اس کی آنکھ نکال دیتی ہے) یعنی ان کافروں کی یہ حالت ہے کہ جوں جوں انہیں مار پڑتی ہے اور انہیں اپنی کامیابی کے امکان ختم ہوتے نظر آتے ہیں تو بجائے اس کے کہ وہ سیدھی راہ اختیار کریں مزید برافروختہ ہو جاتے ہیں۔ اور دوسری اقوام اور دوسرے مشرک قبائل کو اپنے ساتھ ملا کر اجتماعی طور پر مسلمانوں پر حملہ آور ہو کر انہیں صفحہ ہستی سے مٹا ڈالنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔

[۷۹] یعنی اللہ نے تمہیں آنکھیں، کان اور دل اس لیے نہیں دیئے تھے کہ تم ان سے اتنا ہی کام لو جتنا جانور لیتے ہیں۔ دیکھو تو صرف وہ چیز دیکھو جس سے تمہیں دنیوی فائدہ نظر آتا ہو۔ اور سنو تو بھی ایسی ہی بات سنو اور سوچو تو صرف اپنے کاروبار اور روزگار کی بات سوچو یا یہ فکر کرو کہ کون کون سے وسائل سے تمہاری آمدنی کے ذرائع میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ آخر اللہ نے تمہیں جانوروں سے کچھ زائد قوتیں بھی عطا فرمائی ہیں ان سے تم نے کیا کام لیا؟ اللہ نے تمہیں آنکھیں اس لئے دی تھیں کہ اپنی دنیوی ضرورتیں ہی پوری کرو مگر کائنات میں ہر سو بکھری ہوئی اللہ کی نشانیوں کو بھی دیکھو۔ منزل من اللہ آیات کو اپنے کانوں سے غور سے سنو۔ پھر ان تمام نشانیوں میں غور و فکر کر کے معرفت الٰہی حاصل کرو اور اس کا شکر بجالاؤ۔ جانوروں کی طرح ان قوتوں کو محض دنیوی مفادات میں کھپا دینا جہاں ایک طرف اللہ کی ناشکری پر دلالت کرتا ہے وہاں اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ تم اپنے آپ کو جانوروں سے بھی بدتر مخلوق ثابت کر رہے ہو۔

[۸۰] یعنی تمہیں ایک نفس سے پیدا کر کے تمام روئے زمین پر پھیلا دیا اور یہ پھیلاؤ کا عمل تا قیامت جاری رہے گا۔ اب جو ذات تمہیں پھیلا سکتی ہے، وہ تمہیں سمیٹ کر اپنے ہاں اکٹھا بھی کر سکتی ہے اور جو کچھ تم اس دنیا میں کرتے رہے اس پر مواخذہ بھی کر سکتی ہے۔

[۸۱] ۞ گردش لیل و نہار:۔ یعنی وہ اس دنیا میں ہر آن مردہ سے زندہ اور زندہ سے مردہ پیدا کرتا رہتا ہے۔ اگر تم سوچو تو اپنی ذات اور اپنے گردوپیش میں بیسیوں ایسی مثالیں مل سکتی ہیں۔ نیز وہ اندھیرے میں سے اجالا نکالتا ہے اور اجالے کو پھر اندھیرے میں گم کر دیتا ہے۔ دن رات کا باری باری آنا، دنوں کی مقدار میں کمی شروع ہونا اور راتوں کا بڑھنے لگنا اور اس کے برعکس راتوں کا گھٹنے لگنا اور دنوں کا بڑھنے لگنا پھر موسموں کا تغیر و تبدل یہ سب چیزیں اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ پھر تمہیں یہ سمجھ نہیں آسکتی کہ جو ہستی اس قدر قدرتوں کی مالک ہے تمہیں اپنے پاس اکٹھا کر کے حاضر کر لینے کی بھی قدرت رکھتی ہے۔

بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿۸۱﴾ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا
لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۸۲﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَاۗؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸۳﴾
قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۴﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۵﴾
قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۸۶﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۸۷﴾

بلکہ انہوں نے بھی وہی کچھ کہہ دیا جو ان کے پیشرو کہہ چکے ہیں (۸۱) کہ: "جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو ہمیں [۸۲] پھر زندہ کر کے اٹھایا جائے گا؟ (۸۲) یہ بات تو ہمیں اور اس سے پیشتر ہمارے آباء واجداد کو بھی کہی گئی تھی۔ یہ تو محض پرانے افسانے ہیں۔" (۸۳) آپ ان سے پوچھئے کہ: اگر تمہیں کچھ علم ہے تو بتاؤ کہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے وہ کس کا ہے؟ (۸۴) وہ فوراً کہہ دیں گے کہ "اللہ کا" آپ کہئے پھر تم نصیحت قبول کیوں [۸۳] نہیں کرتے؟ (۸۵) پھر ان سے پوچھئے کہ: سات آسمانوں اور عرشِ عظیم کا مالک کون ہے؟ (۸۶) وہ فوراً کہہ دیں گے کہ یہ (سب کچھ) اللہ ہی کا ہے۔ آپ کہئے پھر تم اللہ سے ڈرتے کیوں نہیں؟ [۸۴] (۸۷)

موجودہ نظریہ کے مطابق ہماری زمین کی دو قسم کی گردشیں ہیں ایک روزانہ یعنی ۲۴ گھنٹے میں اپنے محور کے گرد اور دوسری سالانہ سورج کے گرد ساڑھے چھیاسٹھ ڈگری کا زاویہ بناتے ہوئے۔ اسی سے دن رات وجود میں آتے ہیں اور موسموں میں تغیر و تبدل ہوتا ہے۔ یہ تو محض نظریہ کا فرق ہے جہاں تک اللہ کی قدرت کا تعلق ہے اس کا بہر حال ہر ایک کو اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ بلکہ موجودہ نظریہ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے جس نے ہماری زمین اور اس سے بھی بہت بڑے اجرام فلکی کو اس طرح مصروف گردش بنا رکھا ہے جس سے وہ سرِ مو نہ تجاوز کرتے ہیں نہ کر سکتے ہیں۔

[۸۲] کفار مکہ سے جب بدوی لوگ پوچھتے کہ تم میں جو نبی پیدا ہوا ہے اس کی تعلیم کیا ہے؟ تو وہ کہہ دیتے کہ اس میں کوئی نئی بات تو ہے نہیں وہی پرانے لوگوں کی داستانیں اور قصے کہانیاں ہیں جو ہم پہلے بھی سنتے آئے ہیں۔ اور یہ بات وہ اس لئے کہتے تھے کہ انبیاء کی بنیادی اور اصولی تعلیم ایک ہی جیسی رہی ہے۔ ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ خود بھی تو اپنے پیغمبر کو وہی بات کہہ رہے ہیں جو ان کے آباء واجداد انبیاء کی مخالفت میں کہتے چلے آئے ہیں کہ "جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا پھر ہمیں زندہ کر کے اٹھایا جائے گا؟" یہ خود بھی تو وہی پرانی گھسی پٹی بات دہرا رہے ہیں۔ دلیل کے ساتھ انہیں کوئی نیا جواب میسر نہیں آرہا۔ پھر کیا ان کا یہ قول بھی پرانے افسانے ہی نہیں؟ جو محض تقلید آباء کے طور پر کہا جاتا ہے۔

[۸۳] انہیں خود اس بات کا اعتراف ہے کہ زمین اور اس میں جو کچھ موجود ہے وہ اللہ ہی کی ملکیت ہے وہ خود بھی جو زندہ ہیں اور اس زمین پر چل پھر رہے ہیں اور وہ بھی جو مر کر زمین کے اندر چلے گئے ہیں خواہ وہ مٹی میں مل کر مٹی ہی بن چکے ہوں سب کچھ اللہ کے قبضۂ قدرت اور اس کی ملکیت میں ہیں۔ پھر وہ یہ بات کیوں تسلیم نہیں کرتے کہ اللہ اس مٹی سے جس میں ان کا وجود مل چکا ہے انہیں دوبارہ پیدا کر دے۔

[۸۴] پہلی آیت میں صرف زمین اور اس میں موجودات کی ملکیت کے متعلق سوال تھا۔ اس آیت میں پوری کائنات کی ملکیت کا سوال ہے۔ کفار مکہ کو یہ بھی اعتراف تھا کہ اس پوری کائنات کا مالک و مختار صرف اللہ تعالیٰ ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے معبودوں کے اس کائنات میں تصرف کے اختیار کہاں سے آگئے؟ انہیں اس بات سے ڈر نہیں لگتا کہ اللہ کے

قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۸﴾
سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۹۰﴾ مَا اتَّخَذَ

پھر ان سے پوچھئے کہ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ' ہر چیز پر حکومت کس کی ہے؟[۸۵] اور وہ کون ہے جو پناہ دیتا ہے مگر اس کے مقابلہ میں کسی کو پناہ نہیں مل سکتی؟(۸۸) وہ فوراً کہیں گے اللہ ہی ہے۔ آپ کہئے پھر تم پر کہاں سے جادو چل جاتا ہے؟[۸۶](۸۹) بلکہ ہم تو ان کے پاس حق لے کر آئے ہیں اور یقیناً یہی جھوٹے[۸۷] ہیں۔(۹۰)

تصرف و اختیار میں ایسی چیزوں کو شریک بنا رہے ہیں۔ جو دوسروں کے تو کیا، اپنے بھی نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں۔ ایسے صریح ظلم اور اس کے انجام سے انہیں ڈر نہیں لگتا؟

[۸۵] ملکوت کا لغوی معنی:۔ اس آیت میں ملکوت کا لفظ استعمال ہوا ہے جس میں مُلک، مِلک اور مَلک تینوں معنی پائے جاتے ہیں۔ نیز یہ جو مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا مطلب ہے ہر چیز پر مکمل حاکمیت یا بادشاہی۔ ہر چیز کی پوری کی پوری ملکیت اور ہر چیز پر پورے کا پورا اختیار و تصرف۔ لہٰذا وہ جونسی بھی چیز کو چاہے اسے اپنی پناہ میں لے سکتا ہے اور کوئی دوسرا اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ مگر جس چیز کو وہ پکڑے تو اسے نہ کوئی اس سے چھڑا سکتا ہے اور نہ ہی پکڑنے سے پیشتر پناہ دے سکتا ہے۔

اس آیت میں مشرکین مکہ کے اعتراف سے معلوم ہوا کہ ان کا عقیدہ تھا کہ جس کو اللہ پکڑ لے اس کو نہ کوئی پناہ دے سکتا ہے اور نہ چھڑا سکتا ہے۔ مگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج کے مشرکین، مکہ کے مشرکوں سے بھی آگے نکل گئے ہیں جو یہ کہتے ہیں:

خدا جے پکڑے چھڑائے محمد ؎ محمد جے پکڑے چھڑا کوئی نہیں سکدا

یعنی اگر اللہ کسی کو پکڑ لے تو اسے محمد (ﷺ) چھڑا لیں گے اور اگر محمد (ﷺ) پکڑ لیں تو اسے کوئی چھڑا نہیں سکتا۔

اس شعر سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی پکڑنے اور لوگوں سے مواخذہ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ دوسری یہ کہ ان کے یہ اختیارات اتنے وسیع ہیں کہ ان کے پکڑے ہوئے کو کوئی (یعنی اللہ تعالیٰ جیسا کہ شعر میں محمد کے مقابلہ پر خدا کا لفظ استعمال ہوا ہے) بھی چھڑا نہیں سکتا۔ پھر جب اس شعر پر اعتراض کیا جاتا ہے تو اس کی ایسی توجیہ بیان کر کے اسے درست ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو "عذر گناہ، بدتر از گناہ" کا مصداق ہوتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا رد پیش کیا جا رہا ہے۔

[۸۶] زیادہ خداؤں کا نتیجہ نظامِ کائنات کا درہم برہم ہونا ہے:۔ کفارِ مکہ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ ہر چیز کی ملکیت اور اس پر پورے کا پورا اختیار و اقتدار اللہ ہی کو ہے۔ پھر یہ لوگ دوسروں کو اللہ کے اختیار و تصرف میں شریک کر کے اپنی مسلمہ بات کی خود ہی تردید بھی کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان مشرکوں کو مخاطب کر کے پوچھ رہے ہیں کہ تم جو اپنے پیغمبر کو کبھی ساحر اور کبھی مسحور کہتے ہو، حقیقت یہ ہے کہ مسحور پیغمبر نہیں بلکہ مسحور تم خود ہو۔ جو ایسی حقیقت کا انکار کر رہے ہو جس کا تمہیں خود بھی اعتراف ہے۔ اور جسے تم حقیقت سمجھ رہے ہو وہ تو محض تمہارے باطل نظریات ہیں۔ حقیقت کا اعتراف کرنے کے باوجود حقیقت تم سے اوجھل ہے۔ ایسا جادو آخر کہاں سے تم پر چل گیا ہے؟

[۸۷] سابقہ آیات میں تین باتوں کا اعتراف کرنے سے مشرکین پر حجت قائم ہو جاتی ہے ایک طرف تو وہ یہ اعتراف کرتے

اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى
بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۹۱﴾ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۹۲﴾ قُلْ

اللہ تعالیٰ نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا[۸۸] اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی اور الٰہ ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو ہر الٰہ اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہو جاتا[۸۹] اور ان میں سے ہر ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کرتا۔ اللہ تو ان باتوں سے پاک ہے۔ جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں (۹۱) وہ سب پوشیدہ اور ظاہر باتوں کا جاننے والا[۹۰] ہے اور جن چیزوں کو یہ لوگ شریک ٹھہراتے ہیں ان سے وہ بالاتر ہے۔ (۹۲)

ہیں کہ ہر چیز کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور ہر طرح کا تصرف و اختیار اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے معبودوں کا بھی مالک اللہ تعالیٰ ہے اور وہ بھی ایسے ہی مملوک ہیں جیسے کائنات کی دوسری اشیاء اور مخلوقات اور مملوک کبھی مالک کے اختیارات میں شریک نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ حق بات ہے جو ہم نے انہیں بتائی ہے اور جس کا اعتراف وہ خود کر رہے ہیں۔ رہے ان کے زبانی دعوے کہ ان کے معبود بھی کچھ اختیارات رکھتے ہیں تو وہ اپنے اقرار و اعتراف کی بنا پر بھی جھوٹے قرار پاتے ہیں۔

[۸۸] جبکہ مشرکین اپنی دیویوں لات، منات اور عزیٰ کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور باقی ممالک کے مشرکین نے تو ایسی دیو مالا تیار کی کہ اللہ کی نسل ہی چلا دی۔ عیسائیوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا اور یہود نے سیدنا عزیر علیہ السلام کو۔ اب ظاہر ہے کہ بیٹا مملوک نہیں ہوتا بلکہ شریک ہوتا ہے۔ اب ایک طرف تو مشرکین مکہ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ہر چیز کا مالک اللہ ہے اور ہر چیز اس کی مملوک ہے۔ لہٰذا اگر ہر چیز کو مملوک مان لیا جائے تو کوئی بھی چیز اس کی اولاد نہیں ہو سکتی۔ یا پھر اس کلیہ سے دستبردار ہونا پڑے گا کہ ہر چیز کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔

[۸۹] اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو الٰہ ماننے سے مشکل یہ پیش آتی ہے کہ الٰہ صرف وہی ہو سکتا ہے جس کے پاس کچھ اختیارات بھی ہوں۔ اس طرح اللہ کے علاوہ بہت سے اصحاب اختیار و اقتدار سامنے آجاتے ہیں اور ہر ایک کی یہ کوشش ہوگی کہ دوسرے کو مات کر کے خود غالب آجائے پھر جس مخلوق پر کسی الٰہ کا اختیار چلتا ہوگا یقیناً وہ اسے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرے گا۔ اور اقتدار کی اس جنگ میں لامحالہ کائنات کا نظام بھی تباہ ہو کے رہے گا۔ لیکن چونکہ کائنات کے نظام میں ہم آہنگی اور استقلال پایا جاتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ دوسرے معبودوں اور ان کے اختیارات کا عقیدہ باطل اور لغو ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات ان بیہودگیوں سے پاک ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔

[۹۰] یعنی اللہ کے علاوہ اگر کسی اور ہستی کے پاس رتی بھر بھی اختیارات ہوتے تو اس کا سب سے پہلے علم اللہ کو ہی ہو سکتا تھا کیونکہ وہ تو موجود اشیاء اور موجودہ علم کے علاوہ غیر موجود اشیاء اور نامعلوم علم کا بھی جاننے والا ہے اور اس سے کوئی چیز بھی مخفی رہنا ناممکنات سے ہے۔ اور اپنی اس وسعت علم کی بنا پر ہی یہ فرما رہا ہے کہ اللہ کے علاوہ نہ کوئی الٰہ ہو سکتا ہے نہ کسی کے پاس کسی قسم کا کوئی اختیار ہے لہٰذا مشرکوں کے ان بیہودہ عقائد سے اللہ کی شان بہت بلند و بالا ہے۔

رَّبِّ إِمَّا تُرِيَنِّي مَا يُوعَدُونَ ﴿٩٣﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِي فِي الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٩٤﴾ وَإِنَّا عَلَىٰ
أَن نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقَادِرُونَ ﴿٩٥﴾ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۚ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا
يَصِفُونَ ﴿٩٦﴾ وَقُل رَّبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ ﴿٩٧﴾ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَن يَحْضُرُونِ ﴿٩٨﴾

(اے پیغمبر!) آپ یہ دعا کیجئے کہ: "پروردگار! جس عذاب کی انہیں دھمکی دی جا رہی ہے اگر وہ میری موجودگی پر آجائے(۹۳) تو اے پروردگار! مجھے[۹۱] ان ظالموں میں شامل نہ کرنا"(۹۴) اور جس عذاب کی انہیں دھمکی دی جارہی ہے وہ عذاب آپ کو دکھانے پر[۹۲] ہم پوری قدرت رکھتے ہیں۔(۹۵) آپ بُری بات کے جواب میں بھی ایسی بات کہئے جو بہت اچھی ہو[۹۳] جو کچھ یہ لوگ بیان کرتے ہیں ہم اسے خوب جانتے ہیں۔(۹۶)

نیز یہ دعا کرتے رہئے کہ: پروردگار! میں شیطان کی اکساہٹوں سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں(۹۷) اور اس بات سے بھی آپ کی پناہ مانگتا ہوں کہ وہ[۹۴] میرے پاس آئیں(۹۸)

[۹۱] اس آیت میں بھی اگرچہ خطاب بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن یہ ہدایت عام مومنوں کے لئے ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں اکثر یہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مشرکین جس طرح اللہ کے حق میں یہ گستاخیاں کر رہے ہیں، عین ممکن ہے کہ ان پر کوئی آفت آ کر رہے۔ لہٰذا مومنوں کو یہ ہدایت کی گئی کہ ایسے حالات میں وہ اللہ سے دعا کرتے رہیں کہ اگر ظالموں پر عذاب آئے تو اللہ انہیں اس عذاب سے بچانے کی کوئی صورت پیدا فرما دے۔

[۹۲] کفارِ مکہ پر اس قسم کے عذاب کا آغاز غزوۂ بدر سے ہی ہو گیا تھا۔ اور اختتام حجۃ الوداع کے دن اعلان براءت پر ہوا۔ جس کی رو سے مشرکین مکہ ہی نہیں بلکہ عرب بھر کے مشرکوں کو چار ماہ کی مہلت دی گئی کہ اس عرصہ کے اندر خواہ وہ اسلام قبول کر لیں یا جزیرۃ العرب کو خالی کر دیں اور یہاں سے نکل جائیں۔ یا پھر ان سے جہاد کر کے ان کا کلی استیصال کر دیا جائے گا۔ یہ تو وہ عذاب تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی ان پر نازل ہوا اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں تو آس پاس کے ممالک سے شرک اور مشرکین کا کلی طور پر خاتمہ ہو گیا اور اسلام کا بول بالا ہوا۔

[۹۳] یعنی اگرچہ ہم اس بات پر قادر ہیں کہ آپ کے جیتے جی انہیں وہ عذاب چکھا دیں جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ مگر ہنوز وہ وقت نہیں آیا۔ ابھی آپ کے لئے بہتر حکمتِ عملی یہی ہے کہ آپ ان مشرکوں کے برے سلوک اور ناگوار اور تلخ باتوں کا جواب بھلائی سے دیں۔ ابھی ان میں کئی لوگ ایسے موجود ہیں جن کے لئے ہدایت مقدور ہو چکی ہے۔

ربطِ مضمون کے لحاظ سے اس کا مطلب وہی ہے جو اوپر بیان ہوا۔ تاہم داعیِ حق کے لئے یہ ایک نہایت قیمتی اصول ہے اور اس کا نتیجہ ہمیشہ خوشگوار نکلتا ہے اسی اصول کو قرآن نے ایک دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا ہے۔ "آپ برائی کا جواب بھلائی سے دیا کیجئے اس طرح تمہارا دشمن بھی تمہارا دلی دوست بن جائے گا" (۴۱: ۳۴) نیز یہ جملہ ایک ایسی آفاقی حقیقت (Universal Truth) ہے۔ جس کا ہر شخص، ہر حال میں اور ہر زمانہ میں تجربہ کر کے اس کے خوشگوار اثرات سے مستفید ہوتا رہا ہے اور ہو سکتا ہے۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یہ اصول جتنا مفید ہے اتنا ہی اس پر عمل پیرا ہونا مشکل ہے۔ یہ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ صاحبِ عزم انسان ہی اس پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔

[۹۴] سابقہ آیات میں ان دشمنوں کا ذکر تھا جو انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ خود بھی اور ان کے معاندانہ اعمال و افعال بھی

حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ

(یہ لوگ اپنی کارستانیوں میں لگے رہیں گے) یہاں تک کہ ان میں سے کسی کو جب موت آئے گی تو کہے گا: پروردگار! مجھے دنیا میں[۹۵] واپس بھیج دے(۹۹) جسے میں چھوڑ آیا ہوں امید ہے کہ اب میں نیک عمل کروں گا (اللہ تعالیٰ فرمائیں گے) "ایسا ہرگز نہیں[۹۶] ہو سکتا" یہ بس ایک بات ہو گی جسے اس نے کہہ دیا۔ اور ان (مرنے والوں) کے درمیان دوبارہ جی اٹھنے کے دن تک ایک آڑ[۹۷] حائل ہو گی۔(۱۰۰) پھر جب صور پھونکا جائے گا تو ان کے درمیان

سب کچھ کم از کم نظر تو آتے ہیں اور انسان ان کا مداوا بھی سوچ سکتا ہے ان دو آیات میں ان دشمنوں کا ذکر ہے جو جنوں یا شیطانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور جو انسانوں کے جسم میں داخل ہو کر برے خیالات اور برے ارادوں کے ذریعہ یوں حملہ آور ہوتے ہیں کہ انسان نہ انہیں دیکھ سکتا ہے اور نہ ان کی کارکردگی کو۔ اور بعض دفعہ انسان ایسے دشمن کی اکساہٹ پر کوئی ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے جو اس کے برسوں کے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ ایسے دشمن کے حملہ سے بچاؤ کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اللہ کی پناہ میں آجائے۔ اور یہ دعا کرتا رہے جو ان دو آیات میں سکھائی گئی ہے۔

[۹۵] رَبِّ ارْجِعُوْنِ میں اپنے پروردگار سے ندا کے بعد جمع مذکر کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ رَبِّ ارْجِعْنِیْ نہیں استعمال کیا گیا۔ جس کا غالباً ترجمہ و مطلب یوں بنتا ہے کہ اے میرے پروردگار! میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ یہ فرشتے جو میری جان نکالنے آئے ہیں یہ مجھے دنیا میں واپس لوٹا دیں" اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بے شمار مقامات پر فرشتوں کے عمل کو اپنا ہی عمل قرار دیتے ہوئے اس کی نسبت اپنی طرف بھی کی ہے اس لحاظ سے یہ ترجمہ بھی درست ہے کہ اے میرے پروردگار! مجھے دنیا میں واپس بھیج دے۔

[۹۶] کلا یہاں دو معنی دے رہا ہے ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ چونکہ مرنے کے بعد دوبارہ کسی انسان کو اس دنیا میں واپس بھیجنا میرے قانون اور میری مشیت کے خلاف ہے۔ لہذا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اور دوسرا یہ کہ یہ جو مرنے والا کہہ رہا ہے کہ میں اب دنیا میں جا کر برے اعمال کے بجائے نیک اعمال بجا لاؤں گا تو یہ ایک بے کاری بات ہے۔ کیونکہ موت کے وقت کے حالات کا مشاہدہ کر لینے اور فرشتوں کو دیکھ لینے کے بعد تو ایمان بالغیب رہتا ہی نہیں۔ اور مطلوب ایمان بالغیب ہے نہ کہ ایمان بالشہادۃ۔ موجود اور دیکھی ہوئی چیز کا اقرار تو ہر شخص کر لیتا ہے اور اسے ایمان یا ایمان بالغیب نہیں کہہ سکتے نہ ہی اس صورت میں یہ دنیا دار الامتحان رہتی ہے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ انسان کی عادت ہے کہ مصیبت کے وقت اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے پھر جب وہ مصیبت دور ہو جائے اور خوشحالی میسر ہو تو وہ مصیبت کے اوقات اور اس مصیبت میں اللہ سے کئے ہوئے وعدے وغیرہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اور اس صورت کی عام مشاہدہ سے بھی تائید ہو جاتی ہے۔ اور قرآن کریم کی کئی آیات سے بھی۔ اس لحاظ سے بھی کسی مرنے والے انسان کو دوبارہ دنیا میں بھیجنا بے کار ہے۔ لہذا موت کے وقت جو کچھ وہ مرنے والا کہہ رہا ہے محض ایک بکواس ہی ہو گی جس کا کچھ فائدہ نہ ہو گا۔

[۹۷] ❁ برزخ زمانی از موت تا قیام قیامت:۔ یہاں برزخ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا معنی پردہ، آڑ، روک وغیرہ ہے اور

بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿١٠١﴾ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٠٢﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿١٠٣﴾ تَلْفَحُ

کوئی رشتہ نہ رہے گا اور نہ ہی اس دن کوئی ایک دوسرے[98] کا حال پوچھے گا۔(١٠١) اس دن جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہ تو کامیاب ہوں گے۔(١٠٢) اور جن کے ہلکے ہوں گے تو یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو[99] خسارے میں رکھا وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔(١٠٣) جہنم کی آگ ان کے چہروں کو جھلس

بعض کے نزدیک یہ فارسی لفظ پردہ ہی کا معرب ہے۔ لیکن، روک یا پردہ ایسا نہیں جیسے دو چیزوں کے درمیان کوئی کپڑا لٹکا کر یا دیوار بنا کر ہر چیز کو دوسری سے اوجھل کر دیا جاتا ہے۔ جبکہ اس روک میں ایک طویل مدت زمانی بھی شامل ہے۔ اور یہ برزخ کسی انسان کی موت کے وقت سے لے کر اس کے دوبارہ جی اٹھنے تک کے زمانہ کو محیط ہے۔ اہل برزخ سے عالم دنیا بھی اوجھل ہوتا ہے اور عالم عقبیٰ بھی۔ اس عالم برزخ کو اللہ تعالیٰ نے موت کے زمانہ سے تعبیر کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس عرصہ کے دوران موت کے اثرات غالب ہوتے ہیں۔ تاہم روح چونکہ زندہ ہی رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہوتی ہے لہٰذا اس عرصہ میں بھی زندگی کے تھوڑے بہت آثار پائے جاتے ہیں۔ اس عرصہ میں بہت کو عذاب وثواب بھی ہوتا ہے لیکن یہ عذاب وثواب قیامت کے عذاب وثواب کی نسبت بہت ہلکا ہوتا ہے اسی عرصہ کے عذاب کو عذابِ قبر کہتے ہیں خواہ میت کا جسم قبر میں موجود ہو یا گل سڑ گیا ہو یا درندوں نے کھا لیا ہو یا پانی کی تہہ میں چلا گیا ہو۔

[98] ۞ قیامت کے دن سب رشتہ داریاں بھول جائیں گی:۔ جب دوسری بار صور پھونکا جائے گا تو یہی دن مردوں کا اپنی قبروں سے جی کر اٹھنے اور اللہ کے حضور حاضر کئے جانے کا دن ہوگا اسی دن کو قیامت کا دن کہا جاتا ہے یہ دن چونکہ ہمارے موجودہ حساب کے مطابق پچاس ہزار برس کا ہوگا۔ لہٰذا اس مدت میں انسان کو بہت سی قسم کے حالات اور واقعات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس آیت میں جو کیفیت بیان کی گئی ہے وہ زندہ ہونے کے بعد ابتدائی کیفیت ہے۔ اس وقت دہشت اور ہولناکی اس قدر زیادہ ہوگی کہ ہر ایک کو اپنی اپنی ہی پڑی ہوگی۔ سب رشتہ داریاں بھول جائیں گی۔ بلکہ ہر آدمی اپنے حقیقی رشتہ داروں سے بھی الگ رہنے اور دور بھاگنے کی کوشش کرے گا ایک دوسرے کا حال پوچھنا تو دور کی بات ہے۔

[99] ۞ میزان الاعمال کے نتائج:۔ ان دو آیات میں قیامت کے دن کا ایک دوسرا منظر سامنے لایا گیا ہے۔ جبکہ ہر شخص کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک وزن کیا جائے گا اور پلڑا بھاری ہونے سے یہاں مراد نیکیوں والا پلڑا ہے۔ اور اصل چیز جو اس پلڑے کو بھاری اور وزن دار بنا سکتی ہے وہ کلمہ توحید اور اس پر استقامت ہے۔ پھر اسی کے مطابق اعمال صالح اس کی تائید مزید کریں گے۔ نیکیوں کا پلڑا جھکنے پر فوراً اصحاب عمل کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ دنیا کے امتحان میں پاس ہو گیا ہے اور اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔ اور جس کا نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہونے کی وجہ سے اوپر اٹھ گیا اور برائیوں کا پلڑا بھاری ہوا تو ایسے لوگ اس امتحان میں فیل اور ناکام ہو جائیں گے پھر ایک تو اس ناکامی پر انہیں افسوس اور حسرت ہوگی، دوسرے اس کے نتیجہ میں جہنم کا عذاب ان کے لئے پہلے ہی تیار ہوگا اور ان کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوگی کہ وہ اللہ کی توحید کے اقرار کے ساتھ شرک بھی کرتے رہے ہوں گے اور خسارہ کی صورت یہ ہوگی کہ وہ اچھے عمل بھی کرتے رہے، محنت بھی کی مگر شرک کی آمیزش کی وجہ سے وہ

وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ﴿١٠٤﴾ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿١٠٥﴾
قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿١٠٦﴾ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا
فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿١٠٧﴾ قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿١٠٨﴾ اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ
رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿١٠٩﴾ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰى

دے گی۔ اور ان کے جبڑے باہر [۱۰۰] نکلے ہوں گے (۱۰۴) (انہیں کہا جائے گا) کیا تم پر میری آیات نہیں پڑھی جاتی
تھیں تو تم انہیں جھٹلا دیا کرتے تھے ؟ (۱۰۵) وہ کہیں گے : ”ہمارے پروردگار! ہم پر ہماری بدبختی غالب آ گئی تھی اور
ہم واقعی گمراہ لوگ تھے۔ (۱۰۶) پروردگار! ہمیں اس آگ سے نکال۔ اگر ہم دوبارہ ایسا [۱۰۱] قصور کریں تو واقعی ہم ظالم
ٹھہرے“ (۱۰۷) اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ”مجھ سے دفع ہی رہو [۱۰۲] اور اسی آگ میں پڑے رہو اور مجھ سے بات بھی نہ
کرو۔ (۱۰۸) (بات یہ ہے) جب میرے کچھ بندے یہ کہتے تھے کہ: اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے، ہمیں
بخش دے اور ہم پر رحم فرما کیونکہ تو ہی سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے (۱۰۹) تو تم لوگ ان کا مذاق اڑاتے تھے [۱۰۳] حتیٰ کہ

اعمال ان کے کام بھی نہ آئے۔ الٹا جہنم کے عذاب سے دوچار ہونا پڑ گیا۔

[۱۰۰] ۞ کَلَحَ کا لغوی مفہوم :۔ کلح کا لغوی معنی بدشکل ہونا یا حلیہ کا اس طرح بگڑ جانا ہے جس سے انسان بدصورت اور ڈراؤنا معلوم ہو۔ وہ یوں کہ اوپر کا ہونٹ اوپر کو اٹھ جائے اور نیچے کا نیچے کو اور بڑے بڑے دانت سامنے نظر آئیں جیسے ابھی کسی کو پھاڑ کھائے گا۔ یعنی جہنم کی آگ ان کے چہروں کا اس طرح حلیہ بگاڑ کے رکھ دے گی۔

[۱۰۱] ظالم لوگ موت کے وقت بھی دوبارہ دنیا میں واپس جانے کی التجا کریں گے جیسا کہ اس سورہ کی آیت نمبر ۱۰۰ میں گزر چکا ہے اور دوزخ میں داخل ہونے کے وقت بھی۔ لیکن ان کی یہ التجا کن وجوہ کی بنا پر ناقابل قبول ہو گی، اس کی تشریح مذکورہ بالا آیت کے حاشیہ میں ملاحظہ فرمالیجئے۔

[۱۰۲] ۞ خسأ کا لغوی مفہوم :۔ خسأ کا لفظ کتے اور سور کو دھتکارنے کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے ہم پنجابی زبان میں کتے کو دھتکارنے یا دفع کرنے کے لئے ”دُر دُر“ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ پھر اس کا استعمال ہر اس شخص کے لئے بھی ہونے لگا جسے حقیر اور ذلیل سمجھ کر دفع ہونے یا نکل جانے کو کہا جائے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کی التجا کے جواب میں فرمائیں گے کہ تم اس قدر ذلیل مخلوق ہو کہ تمہارا اسی جہنم میں پڑے رہنا ہی مناسب ہے اور دیکھو! آئندہ مجھ سے کوئی ایسی التجا نہ کرنا۔

[۱۰۳] کیونکہ دنیا میں تمہاری حالت یہ تھی کہ جب میرے مخلص بندے میرے آگے دعا و استغفار کرتے تھے یا میری عبادت کرتے تھے تو تم ان پر ہنسا کرتے تھے۔ اس قدر ٹھٹھا کرتے اور ان کی نیک خصلتوں کا اتنا مذاق اڑاتے تھے کہ ان کے پیچھے پڑے رہنے کی وجہ سے تم نے میری یاد بھی بھلا دی۔ اور تمہیں اس بات کا احساس ہی نہ رہا تھا کہ تمہارے سر پر کوئی ایسی ہستی موجود ہے جو ہر وقت تمہارے ان کرتوتوں کو دیکھ رہی ہے۔ اور وہ تمہیں شرارتوں کی سزا دینے پر قادر بھی ہے۔

أَنْسَوْكُمْ ذِكْرِي وَكُنْتُمْ مِنْهُمْ تَضْحَكُونَ ﴿١١٠﴾ إِنِّي جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوا أَنَّهُمْ هُمُ
الْفَائِزُونَ ﴿١١١﴾ قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ ﴿١١٢﴾ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ
فَسْئَلِ الْعَادِّينَ ﴿١١٣﴾ قٰلَ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا لَوْ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١١٤﴾ أَفَحَسِبْتُمْ
أَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ﴿١١٥﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ

ان کے ساتھ اس مشغلہ نے تمہیں میری یاد بھی بھلا دی اور تم ان پر ہنسا کرتے تھے۔(۱۱۰) آج میں نے انہیں ان کے صبر کا بدلہ [۱۰۴] دے دیا ہے۔ بلاشبہ وہی کامیاب رہے ہیں" (۱۱۱) پھر اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا: "بتاؤ تم کتنے سال زمین میں رہے؟" (۱۱۲) وہ کہیں گے: "یہی کوئی ایک دن یا اس کا کچھ حصہ۔ اور یہ بات تو شمار کرنے والوں [۱۰۵] سے پوچھئے" (۱۱۳) اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "واقعی تم تھوڑا ہی عرصہ [۱۰۶] وہاں ٹھہرے تھے۔ کاش تم یہ بات (اس وقت بھی) جانتے ہوتے۔(۱۱۴) کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں بے کار ہی پیدا کر دیا اور تم ہمارے ہاں [۱۰۷] لوٹ کر نہ آؤ گے؟" (۱۱۵) پس اللہ تعالیٰ بہت بلند شان والا ہے۔ وہی حقیقی بادشاہ ہے، اس کے

[۱۰۴] لیکن تمہارے اس تمسخر اور مذاق کے مقابلہ میں میرے مخلص بندے دنیا میں صبر ہی کرتے رہے۔ آج میں تمہیں تمہارے کرتوتوں کی پوری سزا دوں گا اور انہیں ان کے صبر کی پوری پوری جزا دے رہا ہوں۔ میں انہیں ایسا مقام عطا کر رہا ہوں جہاں وہ ہر طرح کی لذتوں اور مسرتوں سے ہمکنار ہوں گے اور یہی صبر کرنے والے لوگ ہیں جو ہر طرح سے کامیاب رہے۔

[۱۰۵] ان مذاق اڑانے والوں اور دوزخ میں داخل ہونے والوں سے اللہ تعالیٰ یا اس کے فرشتے سوال کریں گے: "بھلا بتاؤ تو کہ تم زمین میں کتنے سال مقیم رہے؟" اس سوال میں زمین سے مراد صرف دنیا کی زندگی بھی ہو سکتی ہے اور قبر کی زندگی سمیت مجموعی زندگی بھی۔ جس کے جواب میں وہ کہیں گے کہ ہمیں تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم زمین میں بھی کوئی ایک آدھ دن مقیم رہے ہیں اور ٹھیک ٹھیک مدت تو شمار کرنے والے ہی بتا سکتے ہیں۔ ان سے پوچھ لیجئے۔ اس جملہ میں عادین یا شمار کرنے والوں سے مراد اعمال نامہ مرتب کرنے والے فرشتے بھی ہو سکتے ہیں جو ایک ایک دن بلکہ ایک ایک گھڑی کے اعمال ساتھ ہی ساتھ ریکارڈ کرتے جا رہے ہیں۔

[۱۰۶] یعنی یہی بات تو اللہ تعالیٰ نے فرمائی تھی کہ تمہاری یہ زندگی چند روزہ اور ناپائیدار ہے۔ لہٰذا دنیا اور اس کے ساز و سامان پر مست نہ ہو جاؤ بلکہ آخرت کی فکر کرو۔ لیکن اس وقت تو تم ہماری اس بات کا بھی مذاق اڑایا کرتے تھے اور یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ بس یہ دنیا ہی دنیا اصل حقیقت ہے۔ لہٰذا ہم جتنے مزے اڑا سکتے ہیں اڑا لیں۔ پھر کب ایسا موقع ملے گا؟ اور آج تم خود اس بات کا اقرار کر رہے ہو۔ کاش یہی بات تمہیں دنیا کی زندگی میں معلوم ہو جاتی۔

[۱۰۷] ❁ **اعمال کے نتائج بھگتنے کے لئے ایک طویل مدت (آخرت) کی ضرورت:۔** تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم اس دنیا میں عیش و آرام کرنے اور مزے لوٹنے کے لئے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ اسی دنیا میں نہ ظالم کو اس کے ظلم کا بدلہ ملتا ہے نہ اپنے خیال کے مطابق نیک اعمال کرنے والوں کو ان کی نیکی کا بدلہ ملتا ہے اور نہ ہی کوئی انسان دوبارہ زندہ ہو کر واپس آیا ہے۔ جو یہ خبر دے

رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿١١٦﴾ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ
عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿١١٧﴾ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿١١٨﴾ ع

علاوہ کوئی الٰہ نہیں،[۱۰۸] وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔(۱۱۶)

اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی اور الٰہ کو پکارتا ہے جس کی اس کے پاس کوئی دلیل[۱۰۹] نہیں، تو اس کا حساب اس کے پروردگار کے سپرد ہے۔ ایسے کافر کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔(۱۱۷) اور آپ اللہ سے دعا کیجئے کہ: "اے میرے پروردگار! مجھے بخش دے[۱۱۰] اور مجھ پر رحم فرما اور تو ہی سب رحم کرنے والوں سے اچھا رحم کرنے والا ہے۔"(۱۱۸)

کہ ظالموں کو اس کے ظلم کی سزا ملی ہے۔ لہٰذا تم نے یقین کر لیا کہ یہی دنیا ہی دنیا ہے جیسے بھی بن پڑے یہاں عیش و عشرت کا سامان اکٹھا کر لو حالانکہ اگر تم اس کائنات کے نظام عدل میں ذرا بھی غور کرتے تو تمہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ کائنات اور اس میں انسان کو محض ایک کھیل تماشہ کے طور پر نہیں بنایا گیا لیکن ہر سبب ایک نتیجہ پیدا کر رہا ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ تمہارے اچھے اور برے اعمال کا کوئی نتیجہ مرتب نہ ہو۔ اور چونکہ دنیا کی زندگی اعمال کے نتیجہ بھگتنے کے لحاظ سے بہت قلیل ہے۔ لہٰذا مرنے کے بعد اب طویل زندگی کا قیام ضروری ہوا تاکہ عدل و انصاف کے تقاضے پورے کئے جا سکیں۔

[۱۰۸] ❁ اللہ تعالیٰ نے کبھی کوئی چیز بے کار پیدا نہیں کی:۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہی حقیقی خالق و مالک اور بادشاہ ہے۔ اس کی شان اس بات سے بہت بلند ہے کہ وہ کوئی چیز بے کار و بے فائدہ پیدا کرے۔ اس نے جس چیز کو بھی پیدا کیا ہے۔ متعدد اغراض و مصالح کے تحت پیدا کیا ہے۔ اور جو نتائج اس سے مطلوب ہیں وہ حاصل ہو رہے ہیں اور ہو کے رہیں گے اس کی ذات اس چیز سے بھی بلند ہے کہ ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا نہ دے۔ یا مخلص بندوں کو ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ نہ دے۔ اس کے علاوہ کوئی ایسا حاکم نہیں جو اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے یا سفارش کر کے اس کے فیصلوں میں رد و بدل کروا سکے۔ وجہ یہ ہے کہ کائنات کی سب سے بڑی چیز یعنی عرش عظیم کا بھی وہی مالک ہے پھر کوئی دوسری چیز کس شمار میں ہو سکتی ہے؟

[۱۰۹] ❁ غیر اللہ کو پکارنے پر کوئی عقلی یا نقلی دلیل موجود نہیں:۔ جو لوگ اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی پکار کر شرک کے مرتکب ہو رہے ہیں اور انہوں نے انہیں اپنا حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ رکھا ہے تو ان کے پاس اس کے جواز میں نہ کوئی عقلی دلیل موجود ہے اور نہ نقلی۔ ایسے من گھڑت قصوں کی بنیاد محض وہم و گمان پر ہوتی ہے پھر تقلید آباء کی وجہ سے یہ نظریے لوگوں میں رواج پا جاتے ہیں۔ ایسے مشرکوں سے اللہ تعالیٰ پورا پورا حساب لے گا اور ہر ایک کو اس کے مقدار جرم کے مطابق سزا دی جائے گی۔ اور ایسے ہٹ دھرم اور منکر لوگ جو سمجھانے پر باز نہیں آتے۔ آخرت میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

[۱۱۰] اوپر اسی سورہ کی آیت نمبر ۱۰۹ میں ذکر ہوا ہے کہ جب میرے بندے مجھ سے مغفرت اور رحم کی دعا کرتے تو کافر ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ ان کا انجام بتانے کے بعد پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کو یہ ہدایت دی جا رہی ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ سے رحم اور مغفرت کی دعا مانگتے رہا کریں۔ اور اللہ چونکہ سب سے بڑھ کر اور سب پر رحم کرنے والا ہے لہٰذا تمہیں یقین رکھنا چاہئے کہ وہ تم پر رحم کرتے ہوئے تمہاری تقصیرات اور خطاؤں کو معاف فرما دے گا۔

سُوْرَةُ النُّوْرِ مَدَنِيَّةٌ

۶۴ آیاتها رکوعها ۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ① اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ

آیت ۶۴ (۲۴) سورہ النور[۱] مدنی ہے (۱۰۲) رکوع ۹

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

یہ ایک سورت ہے جسے ہم نے نازل کیا[۲] اور (اس کے احکام کو) لوگوں پر فرض کر دیا اور اس میں واضح آیات نازل فرمائیں تاکہ سبق حاصل کرو۔(۱) زانی عورت ہو یا مرد، ان میں

[۱] سورۂ نور کے نزول کا پس منظر:۔ سورہ نور غزوۂ بنی مصطلق کے بعد ۶ ہجری میں نازل ہوئی۔ اور غزوۂ بنی مصطلق، غزوہ احزاب یا غزوہ خندق کے بعد واقع ہوا تھا۔ غزوۂ خندق کے موقعہ پر اتحادی کافروں کا لشکر دس ہزار کے لگ بھگ تھا اور یہ لشکر ایک ماہ کے بعد ناکام واپس لوٹا تھا۔ اس موقعہ پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ”آج کے بعد قریش ہم پر حملہ آور نہیں ہوں گے۔ بلکہ اب ہم ان پر حملہ آور ہوا کریں گے“ جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ اسلام اور اسلامی ریاست اتنی مضبوط اور اپنے پاؤں پر قائم ہو چکی تھی۔ اور کفر کی تمام قوتوں، جس میں مشرکین مکہ، دوسرے مشرک عرب قبائل، مدینہ کے یہود اور منافقین سب شامل تھے، میں اب اتنی سکت باقی نہ رہ گئی تھی کہ سب مل کر بھی مدینہ پر حملہ آور ہو سکیں۔ میدان جنگ میں مات کھانے کے بعد ان لوگوں نے یہ حربہ اختیار کیا کہ جس طرح بن پڑے اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کر کے اور ان میں پھوٹ ڈال کر اس طاقت کو کمزور بنا دیا جائے۔ منافق چونکہ مسلمانوں کے اندر گھسے ہوئے تھے اس لئے وہ اس سلسلہ میں سب سے اہم کردار ادا کر سکتے تھے۔ غزوہ بنی مصطلق سے واپسی پر سفر کے دوران عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین نے اسی سازش کے تحت دو کارنامے سر انجام دیئے۔ اتفاق سے انصار اور مہاجرین میں کچھ جھگڑا ہو گیا۔ تو عبداللہ بن ابی نے اس واقعہ کو اتنی ہوا دی اور جاہلی حمیت سے کام لے کر انصار اور بالخصوص منافقوں کو اتنا برافروختہ کر دیا قریب تھا کہ ان میں لڑائی چھڑ جائے۔ رسول اللہ ﷺ کو اس بات کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فوراً موقع پر پہنچ کر حالات پر کنٹرول کر لیا۔ اس دوران عبداللہ بن ابی نے بہت بکواس کی جس کا تفصیلی ذکر سورہ منافقون میں آئے گا۔ دوسرا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگا دی اور یہ واقعہ ”افک“ کے نام سے مشہور ہے۔ اس واقعہ کا ان منافقوں نے اس قدر پروپیگنڈا کیا کہ بعض مخلص مسلمان بھی اس پروپیگنڈا سے متاثر ہو گئے۔ واقعہ افک کا تفصیلی ذکر تو آگے آ رہا ہے سرِدست یہ بتانا مطلوب ہے کہ پورا مہینہ یہ افواہیں پھیلتی رہیں۔ منافق اس تہمت کو پھیلانے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے۔ اور اتفاق کی بات کہ وحی بھی نازل نہیں ہو رہی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مسئلہ میں پورا ایک مہینہ پریشان رہے۔ ایک ماہ بعد اللہ تعالیٰ نے یہ سورہ نور نازل فرمائی جس میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی واشگاف الفاظ میں بریت فرمائی۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کے لئے نہایت مفید احکام اور پند و نصائح نازل فرمائے۔

[۲] اس سورہ کی پہلی آیت بطور تمہید ہے۔ جس میں صیغہ جمع متکلم کا تین بار تکرار کر کے اس سورہ میں نازل کردہ احکام کی

فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ

سے ہر ایک کو سو درے[۳] لگاؤ، اور اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو تو اللہ کے دین کے

اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ نیز فرمایا کہ ان احکام کی حیثیت محض سفارشات کی نہیں بلکہ ان پر عمل کرنا فرض قرار دیا گیا ہے۔ نیز یہ احکام ہیں بھی ایسے جن میں کسی قسم کا الجھاؤ یا ابہام نہیں کہ کوئی حکم تم پر مشتبہ ہو جائے۔ اور ان احکام کو تمہیں ہر وقت یاد رکھنا چاہئے بھولنا نہیں چاہئے۔

[۳] زنا کی سزا سے متعلق پہلا حکم سورہ نساء کی آیت نمبر ۱۵ اور ۱۶ میں نازل ہوا تھا۔ جن کا ترجمہ یہ ہے "تم میں سے جو عورتیں بدکاری کی مرتکب ہوں، ان پر چار مردوں کی گواہی لاؤ، پھر اگر وہ چاروں گواہی دے دیں تو تم ایسی عورتوں کو گھروں میں بند رکھو تا آنکہ وہ مر جائیں یا پھر اللہ تعالیٰ ان کے لئے دوسری راہ مقرر کر دے۔ اور پھر جو دو مرد تم میں سے اسی جرم کا ارتکاب کریں تو ان دونوں کو ایذا دو" (۴:۱۵،۱۶)

ان آیات سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ مرد اور عورت دونوں کے لئے ابتدائی سزا ان کو ایذا پہنچانا تھا جس میں لعنت ملامت اور مار پیٹ سب کچھ شامل ہے۔ البتہ عورتوں کے لئے یہ اضافی سزا تھی کہ تازیست انہیں گھر میں نظر بند رکھا جائے۔

۲۔ ایسی سزا کا حکم عارضی اور تا حکم ثانی ہے۔

۳۔ یہ سزا حکومت سے نہیں بلکہ معاشرہ سے تعلق رکھتی تھی۔

۶ ہجری میں واقعہ افک پیش آیا جس کے نتیجہ میں ۶ ہجری کے آخر میں سورہ نور میں یہ سزا مقرر کی گئی جو اس آیت میں مذکور ہے۔ اس آیت میں زنا کی جو سزا مقرر کی گئی ہے صرف کنوارے زانی کے لئے ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور اس کی دلیل اس سے اگلی آیت ہے جو یوں ہے: "زانی نکاح نہ کرے مگر زانیہ یا مشرکہ عورت کے ساتھ اور زانیہ نکاح نہ کرے مگر زانی یا مشرک مرد کے ساتھ اور مومنوں پر یہ چیز حرام کر دی گئی ہے" (۲۴:۳)

اب دیکھئے کہ اس آیت میں (۱) جن زانیوں کی سزا کا ذکر ہے ان کے ساتھ نکاح کی بھی ممانعت ہے اور یہ ایسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ مرد اور عورت غیر شادی شدہ ہوں۔

(۲) ۞ <u>کوڑوں کی سزا صرف کنوارے مرد اور عورت کیلئے کیوں ہے؟</u> زانی مرد سے نکاح کا حق صرف زانیہ عورت کو دیا گیا ہے۔ اب وہ عورت پہلے ہی شادی شدہ ہو تو زنا کے بعد اس کا مستحق کوئی زانی ہی ہو سکتا ہے، نہ کہ اس کا پہلا خاوند جس کا کوئی قصور بھی نہیں۔ اس طرح یہ سزا لاقید زانی کے حق میں تو مفید رہے گی۔ مگر پرہیزگار خاوند کے حق میں خانہ بربادی کا باعث بنے گی اور یہ چیز منشائے الٰہی کے خلاف ہے۔

(۳) ہمارے اس دعویٰ کی تائید سورہ نساء کی آیت نمبر ۲۵ سے بھی ہوتی ہے جو یوں ہے "اور تم سے جو لوگ مومن آزاد عورتوں سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں۔ تو وہ تمہاری مومن لونڈیوں سے نکاح کر لیں۔ پھر اگر وہ لونڈیاں نکاح کے بعد بھی بدچلنی کی مرتکب ہوں تو ان پر اس سزا سے آدھی سزا ہے جو آزاد عورتوں کو دی جائے"

اس آیت میں پہلی بار جو لفظ محصنت آیا ہے۔ اس کا معنی تو "آزاد غیر شادی شدہ عورت" کے سوا کوئی دوسرا ہو ہی نہیں

سکتا۔ جس سے نکاح کی ہدایت کی جارہی ہے اور دوسری بار جو اس آیت میں محصنٰت کا لفظ آیا ہے تو اس کا معنی بھی لامحالہ ”آزاد غیر شدہ شادی عورت“ ہی لینا پڑے گا اور آزاد غیر شادی شدہ زانیہ کی سزا سو کوڑے ہے۔ لہٰذا منکوحہ زانیہ لونڈی کی سزا آزاد غیر شادی شدہ عورت کی سزا سے نصف یعنی پچاس کوڑے ہے۔

۞ منکرین رجم کا اعتراض اور اس کا جواب:۔ اس آیت میں جہاں اس بات کی دلیل ہے کہ سورہ نور میں مذکور سزا صرف کنوارے مرد و عورت کی ہی ہو سکتی ہے وہاں منکرین حدیث کے ایک اعتراض کا جواب بھی مہیا کر دیتی ہے۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ شادی شدہ آزاد عورت کی سزائے زنا حدیث کے مطابق رجم ہے اور شادی شدہ لونڈی کی سزائے زنا قرآن کے مطابق شادی شدہ آزاد عورت کی سزا کا نصف ہے۔ اور نصف رجم بنتی ہے اور نصف رجم چونکہ ممکن نہیں اس لیے حدیث میں وارد شدہ سزائے رجم درست نہیں ہو سکتی۔ درست بات یہ ہے کہ عورت اور مرد چاہے کنوارے ہوں یا شادی شدہ بلا امتیاز سب کی سزا سو کوڑے ہے۔

اس اعتراض کے جواب سے پہلے یہ بات سمجھ لینا ضروری ہے کہ لونڈی کا آزاد ہونا بھی احصان (یا زنا سے بچاؤ) کا ذریعہ ہے اور نکاح دوسرا ذریعہ ہے۔ آزاد عورت ایک لحاظ سے تو پہلے ہی محصن ہوتی ہے۔ شادی کے بعد احصان کا دوسرا درجہ بھی حاصل کر لیتی ہے۔ لہٰذا لغوی لحاظ سے ہم محض آزاد کنواری عورت کو محصنہ کہہ سکتے ہیں اور بیاہی عورت کو بھی خواہ وہ لونڈی ہو یا آزاد ہو۔ اب منکرین حدیث اس اعتراض میں لوگوں کو فریب یہ دیتے ہیں کہ محصنٰت کا ترجمہ تو بیاہی آزاد کر لیتے ہیں۔ حالانکہ جس آیت (۴:۲۵) میں لونڈی کی سزا مذکور ہے اس میں محصنٰت کا ترجمہ آزاد بیاہی عورت ہو ہی نہیں سکتا۔ جب کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ اور منکرین حدیث کا تو شیوہ ہی یہ ہے کہ پہلے کسی حدیث میں شکوک و شبہات پیدا کر دیتے ہیں۔ پھر سارے ذخیرہ حدیث پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ تو واضح بات ہے کہ شادی شدہ مرد و عورت کا زنا کرنا کنوارے جوڑے کے زنا کرنے سے شدید تر جرم ہے۔

۞ زنا کی اقسام اور ان میں فرق:۔ زنا کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ کنوارا لڑکا اور لڑکی زنا کریں۔ اس قسم کے زنا کو سابقہ تہذیبوں میں معیوب ضرور سمجھا جاتا رہا ہے لیکن قابل دست اندازی سرکار جرم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ سابقہ شریعتوں میں بھی ایسے زنا کی سزا نسبتاً کم تجویز کی گئی تھی۔ دوسری قسم یہ ہے کہ کوئی کنوارا کسی شادی عورت سے یا شادی شدہ مرد کسی کنواری عورت سے زنا کرے اسے (Audultary) کہتے ہیں۔ تیسری قسم یہ ہے کہ فریقین شادی شدہ ہوں۔ یہ اقسام سابقہ تہذیبوں اور علیٰ ھٰذا القیاس شریعتوں میں بھی ایسے جرائم سمجھے جاتے رہے ہیں جن میں حکومت بھی مداخلت کر سکتی ہے اور فریقین میں سے ہر کسی کو یہ حق بھی حاصل تھا کہ وہ ایسا دعویٰ عدالت میں لے جائے اور اس طرح کے دعوؤں کی اصل بنیاد کسی بھی فریق کے حقوق کی پامالی ہوتی تھی نہ کہ فعل زنا۔ مثلاً کوئی شخص کسی بیاہی عورت سے زنا کر کے پیدا ہونے والے بچے کی تربیت کا سارا بوجھ بھی بیاہی عورت کے خاوند پر ڈال دیتا ہے اور اس کی وراثت میں بھی اسے حصہ دار بنا دیتا ہے۔ اسی طرح اگر شادی شدہ مرد زنا کرتا ہے اور اس کی بیوی اس کا یہ فعل برداشت نہیں کرتی تو وہ عدالت میں نالش کر سکتی ہے۔ اور اگر فریقین شادی شدہ ہوں تو اور بھی زیادہ تمدنی اور خاندانی جھگڑے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اسلامی شریعت کا امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے محض زنا کو ہی اصل جرم قرار دے کر اس کی سزا مقرر کر دی جو قرآن میں مذکور ہے اور یہ کم سے کم سزا ہے۔ اور یہ تو واضح ہے کہ محض زنا صرف کنوارے جوڑے کی صورت میں ہی ہو سکتا ہے۔ ایسا زنا خواہ فریقین کی رضامندی سے ہو تب بھی انہیں سو سو کوڑے کی سزا ضرور ملے گی۔

زنا کے سدباب کے ذرائع:۔ اسلام نے سب سے پہلے فحاشی کے ذرائع کا سدباب کیا۔ سورہ احزاب جو اس سورہ سے قریباً ایک سال پہلے نازل ہوئی تھی، میں مسلمان عورتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ محرم رشتہ داروں کے علاوہ کسی کے سامنے اپنی زیب و زینت ظاہر نہیں کر سکتیں ان کا اصل مقام گھر ہے۔ لہٰذا وہ دور جاہلیت کی طرح گھر سے باہر اپنی زیب و زینت کا اظہار بھی نہیں کر سکتیں اور اگر ضرورتاً جانا پڑے تو بڑی چادر اوڑھ کر ہی جاسکتی ہیں۔ پھر اس سورہ نور میں مزید ایسے بہت سے احکامات دیئے گئے جو فحاشی کے سدباب کا ذریعہ تھے۔ نیز یہ حکم دیا گیا کہ معاشرہ میں جو لوگ مجرد ہیں خواہ وہ عورتیں ہوں یا مرد، غلام ہوں یا لونڈیاں، اور وہ بیوہ یا مطلقہ عورتیں ہوں یا ایسے مرد ہوں جن کی بیویاں فوت ہو چکی ہوں سب کے نکاح کر دیئے جائیں (۲۴:۳۱،۳۲) نیز نکاح کے سلسلہ میں انہیں تمام ممکنہ سہولتیں دی گئیں۔ اس کے باوجود بھی جو لوگ مہر کی رقم یا بیوی کے نان نفقہ کی بھی طاقت نہیں رکھتے تھے انہیں پاکدامن رہنے اور روزہ رکھنے کی ہدایات دی گئیں۔

شادی شدہ مرد و عورت کا زنا شدید ترین جرم ہے:۔ اب یہ تو واضح ہے کہ ان احکامات اور حدود و قیود کے بعد زنا کا زیادہ خطرہ نوجوان اور بے زوج قسم کے لوگوں یعنی کنوارے مردوں اور کنواری عورتوں سے ہی ہو سکتا تھا کیونکہ ان کے پاس شہوت کی تکمیل کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا قرآن نے ایسے لوگوں کے زنا کے جرم کو اصل بنیاد قرار دیا ہے۔ رہا شادی شدہ مرد اور عورت کا زنا تو یہ دو لحاظ سے اصل جرم سے شدید تر ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ ایسے اشخاص معاہدہ نکاح کی عہد شکنی کرتے ہیں۔ دوسرے ایک جائز ذریعہ تکمیل خواہش موجود ہونے کے باوجود اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ لہٰذا ایسے لوگوں کی سزا بھی شدید تر ہونی چاہئے۔

رجم ہماری شریعت کا حصہ کیوں ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی سزا وہی رہنے دی جو شریعت موسوی میں موجود تھی۔ اور یہ بات ہم پہلے بھی سورہ انعام کی آیت نمبر ۹۰ کے الفاظ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ کے ضمن میں بتا چکے ہیں کہ سابقہ شریعتوں کے ایسے احکام جن کے متعلق کتاب و سنت میں کسی قسم کی نکیر نہ وارد ہو وہ بھی شریعت کا حصہ ہوتے ہیں۔ اس کی ایک مثال تو یہی رجم ہے اور دوسری مثال اعضاء و جوارح کا قصاص ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۴۵ میں حکایتاً یوں بیان فرمایا۔ کہ ”ہم نے اس (تورات) میں یہ لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور زخموں کا قصاص ہوگا“ یہ حکم بنی اسرائیل کو دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کو اعضاء و جوارح کے قصاص کے متعلق الگ کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ اس کے باوجود یہ احکام ہماری شریعت کا حصہ ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کے مطابق فیصلے صادر فرمائے۔

شادی شدہ یہودی جوڑے کا رجم:۔ اسی طرح ایک یہودی اور یہودن کے زنا کا مقدمہ آپ کے پاس آیا یہ دونوں شادی شدہ تھے۔ یہود یہ مقدمہ آپ کے پاس اس غرض سے لائے تھے کہ موسوی شریعت میں اس کی سزا رجم ہے شاید شریعت اسلامیہ میں اس کی سزا کچھ نرم ہو۔ چنانچہ انہوں نے مقدمہ پیش کرنے والے سے کہہ دیا تھا کہ اگر اس کا فیصلہ رجم کی صورت میں دیا جائے تو قبول نہ کرنا اور اگر اس کے علاوہ اور فیصلہ دیا جائے تو قبول کر لینا۔ جیسا کہ سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۴۱ میں مذکور ہے۔ آپ نے یہود سے تورات منگوائی تو اس میں رجم کا حکم موجود تھا پھر ان کے ایک بہت بڑے عالم ابن صوریا کو بلا کر شہادت لی تو اس نے بھی اعتراف کیا کہ شادی شدہ مرد و عورت کے زنا کی سزا رجم ہے۔ چنانچہ آپ نے ان دونوں کے رجم کا فیصلہ دے دیا اور فرمایا: ”یا اللہ! میں نے تیرے ایک ایسے حکم کو زندہ کیا ہے۔ جسے ان لوگوں نے مردہ یعنی متروک العمل بنا چھوڑا تھا۔“

(مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے: بخاری، کتاب المحاربین۔ باب الرجم فی البلاط، مسلم۔ کتاب الحدود۔ باب حد

الزنا۔ ابوداؤد۔ کتاب الحدود۔ باب رجم الیهودیین)

امام بخاری کا اجتہاد:۔ امام بخاری اس واقعہ کو کتاب الحدود کے بجائے کتاب المحاربین میں اس لئے لائے ہیں کہ ان کے نزدیک شادی شدہ جوڑے کا زنا محض زنا نہیں بلکہ اس سے شدید تر جرم، اللہ اور اس کے رسول علیہ السلام سے محاربہ ہے اور محاربہ کی قرآن میں مذکور سزاؤں میں سے ایک سزا یُقَتَّلُوا یعنی کسی کو ایذائیں دے دے کر بری طرح سے مار ڈالنا اور وہ رجم کو بھی اسی قسم کی سزا سمجھتے ہیں۔

حد رجم سے انکار کی وجوہ:۔ حد رجم سے انکار سب سے پہلے اولین منکرین حدیث یعنی معتزلہ نے پھر بعض خوارج نے کیا تھا۔ ان کے انکار کی وجہ محض انکار حدیث کے سلسلہ میں ان کی عصبیت تھی مگر آج کے دور میں ایک اور وجہ بھی اس میں شامل ہو گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ اہل مغرب اسلام کی ایسی سزاؤں کو وحشیانہ سزائیں سمجھتے ہیں۔ لہٰذا مغربیت سے مرعوب ذہن ایسی سزاؤں سے فرار اور انکار کی راہیں تلاش کر رہے ہیں۔ اور یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ انکار حدیث یا قرآنی آیات کی تاویل کی وجوہ صرف دو ہی ہو سکتی ہیں ایک اتباع ہوائے نفس اور دوسری موجودہ دور کے نظریات سے مرعوبیت پہلے ادوار میں بھی یہی دو وجوہ انکار حدیث اور تاویل قرآن کا باعث بنتی رہی ہیں اور آج بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔

آیت رجم اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا خطبہ:۔ احادیث میں رجم سے متعلق ایک آیت کا بھی ذکر آتا ہے جو بعد میں منسوخ ہو گئی تھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے آخری ایام میں مسجد نبوی میں جمعہ کے دن مسلمانوں کے ایک کثیر مجمع کے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ جسے تقریباً سب محدثین نے اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ اس خطبہ کے درج ذیل الفاظ قابل غور ہیں۔ آپ نے خطبہ کے دوران فرمایا:

"اس کتاب اللہ میں رجم کی بھی آیت موجود تھی جسے ہم نے پڑھا، یاد کیا اور اس پر عمل بھی کیا۔ رسول اکرم علیہ السلام کے زمانہ میں بھی رجم ہوا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ مجھے ڈر ہے کہ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد کوئی یہ کہنے لگے کہ ہم رجم کے حکم کو کتاب اللہ میں نہیں پاتے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اللہ کے اس فریضہ کو جسے اللہ نے اپنی کتاب میں اتارا چھوڑ کر مر جائیں۔ کتاب اللہ (سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی کتاب اللہ سے مراد تمام منزل من اللہ احکام ہوتے تھے) میں رجم کا حکم برحق ہے۔ اس پر جو زنا کرے اور شادی شدہ خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ جبکہ اس کے زنا پر کوئی شرعی ثبوت یا حمل موجود ہو" (بخاری۔ کتاب المحاربین۔ باب رجم الحبلیٰ من الزنا اذا احصنت)

منسوخ التلاوت آیت کا حکم باقی رہنے کی تین وجوہ:۔ اس حدیث پر اعتراض یہ ہے کہ اگر یہ آیت قرآن میں موجود تھی تو گئی کہاں؟ اور اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ وہ منسوخ ہو گئی۔ یہ ناسخ و منسوخ کی بحث چونکہ الگ تفصیل کی محتاج ہے۔ لہٰذا اسے ہم نے اس کے مناسب مقام سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۰۶ کے تحت درج کر دیا ہے۔ مختصراً یہ کہ جب اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں۔ ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ﴾ (۸۷: ۶، ۷) "یعنی ہم آپ کو پڑھائیں گے جو آپ کو فراموش نہ ہو گا مگر جو کچھ اللہ چاہے" تو پھر آخر ان لوگوں کو کیوں اعتراض ہے؟

دوسرا یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر یہ آیت منسوخ التلاوت ہے تو اس کا حکم کیسے باقی رہ گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس حکم کو باقی رکھنے کا ذریعہ یہ منسوخ التلاوت آیت نہیں بلکہ اس حکم کے بقا کی دوسری تین وجوہ ہیں ایک یہ کہ تورات کا یہ حکم شریعت محمدیہ میں بھی بدستور باقی رکھا گیا ہے۔ جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے اور دوسری وجہ وہ متواتر احادیث ہیں جن میں یہ مذکور ہے کہ تین صورتوں کے علاوہ کسی کو جان سے مار ڈالنا حرام ہے۔ شادی شدہ زانی یا زانیہ کو سنگسار کر کے مار ڈالنا، بطور

قصاص اور قتل مرتد اور ان تمام صورتوں میں قتل کرنا حکومت کا کام ہے، عوام کا نہیں۔ علاوہ ازیں اس حکم رجم کو باقی رکھنے کا ذریعہ وہ واقعات ہیں جن پر آپ نے رجم کی سزا دی۔

اس مقام پر اس بات کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ کوئی حدیث یا سنت نبوی جب صحیح ثابت ہو جائے تو وہ بالکل اسی طرح واجب الاتباع ہوتی ہے جس طرح قرآنی احکام واجب الاتباع ہیں۔ اور اگر اس کلیہ سے انحراف کیا جائے گا تو قرآن کے احکام پر عمل ہو ہی نہیں سکتا۔

پھر کچھ حضرات ایسے بھی ہیں جو خود تو سنت کو حجت تسلیم کرتے ہیں مگر منکرینِ حدیث کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر یہ سوچنے لگتے ہیں کہ شائد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کی سزائیں سورہ نور کے نازل ہونے سے پہلے دی ہوں۔ لیکن ان کا یہ خیال بھی غلط ہے سورہ نور ۶ ہجری میں نازل ہوئی تھی اور ہمیں چند ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جن میں یہ داخلی شہادت موجود ہے کہ رجم کے یہ واقعات بعد کے ہیں۔ مثلاً

۱۔ رجم کے واقعات سورہ نور کے نزول کے بعد کے ہیں:۔ غامدیہ عورت کا رجم ہوا۔ سیدنا خالد بن ولید نے اسے پتھر مارا۔ جس سے خون کے چند چھینٹے سیدنا خالد پر پڑ گئے۔ تو آپ نے اس عورت کو گالی دی اس پر آپ ﷺ نے سیدنا خالد کو سخت تنبیہ کی اور سیدنا خالد صلح حدیبیہ اور فتح مکہ (۸ ھ) کے درمیانی عرصہ میں اسلام لائے تھے۔ صلح حدیبیہ سے واپسی پر سورہ فتح نازل ہوئی جس کا ترتیب نزول کے لحاظ سے نمبر ۱۱۱ ہے جبکہ سورہ نور کا نمبر ۱۰۲ ہے۔ لہٰذا غامدیہ عورت والا واقعہ سورہ نور کے نزول سے بہت بعد کا ہے۔

۲۔ عسیف یا مزدور لڑکے کے مقدمہ کی پیشی کے وقت ابوہریرہ خود وہاں موجود تھے اور وہ خود ہی اس روایت کے راوی بھی ہیں اور فرماتے ہیں کہ كنا عند النبى صلى الله عليه وسلم (بخاری۔ کتاب المحاربین۔ باب اعتراف الزنا) اور اس واقعہ میں اس مزدور کی مالکہ کو رجم کیا گیا۔ اور سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جنگ خیبر (۷ ہجری) کے موقع پر آپ کے پاس حاضر ہو کر ایمان لائے جبکہ سورہ نور اس سے بہت پہلے نازل ہو چکی تھی۔

۳۔ یہودی اور یہودن کے رجم کے وقت سیدنا عبداللہ بن ابی الحارث وہاں موجود تھے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ آپ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے ان دونوں کو رجم کیا جبکہ آپ اپنے دادا کے ساتھ فتح مکہ کے بعد اسلام لائے۔ (فتح الباری۔ باب احکام اھل الذمة ج ۱۲ ص ۱۴۴)

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کی ایک کثیر تعداد کے سامنے مسجد نبوی میں خطبہ ارشاد فرمایا تو مجمع میں سے کسی نے بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بیان پر اعتراض نہیں کیا پھر اس وقت سے لے کر آج تک یہ مسئلہ متفق علیہ چلا آ رہا ہے۔ جس کا ماسوائے منکرین حدیث کے کسی نے انکار نہیں کیا۔ آج وحشیانہ سزا کے مغربی تخیل سے مرعوب ہو کر منکرین حدیث کا ماہوار رسالہ ”طلوع اسلام“ ایک طرف تو اس مسئلہ کو پھیپھڑوں تک کا زور لگا کر اچھال رہا ہے اور دوسری طرف قرآن میں مذکور شرعی حدود کو زیادہ سے زیادہ شرعی سزائیں قرار دے رہا ہے اور ان میں رعایت کی کوئی بات خواہ وہ قرآن کے بجائے کسی کمزور سے کمزور روایت یا تاریخ سے مل جائے اسے تسلیم کرنے پر فوراً آمادہ ہو جاتا ہے۔

رجم سے متعلق ان تصریحات کے بعد اب ہم کچھ احادیث کا مکمل ترجمہ اور مکمل حوالہ درج کر رہے ہیں۔ جو حد اور اقامتِ حد سے متعلقہ احکام و ہدایات اور شرائط پر روشنی ڈالتی ہیں:

۱۔ماعز بن مالک اسلمی کے رجم کا واقعہ بخاری میں کئی ابواب کے تحت مذکور ہے۔ ہم ان حدیثوں کا ملخص بیان پیش کرتے ہیں: سیدنا ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص (ماعز بن مالک اسلمی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس وقت آپ ﷺ مسجد میں تھے۔ اس نے آپ کو آواز دی اور کہنے لگا۔ یارسول اللہ ﷺ میں نے زنا کی ہے۔ آپ ﷺ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ یہاں تک کہ اس نے چار مرتبہ یہی الفاظ کہے۔ جب اس نے چار مرتبہ اپنے خلاف گواہی دی۔ تو آپ ﷺ نے اسے اپنے پاس بلا کر پوچھا: کیا تو مجنون تو نہیں؟" وہ کہنے لگا۔ "نہیں" پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "تیرا نکاح ہو چکا ہے؟" اس نے کہا، "جی ہاں" پھر آپ ﷺ نے کہا: "نکاح کے بعد صحبت کر چکا ہے۔ اس نے کہا، "جی ہاں" پھر آپ ﷺ نے کہا: "شاید تو نے بوسہ لیا ہو گا یا مساس کیا ہو گا یا آنکھ سے دیکھا ہو گا؟ اس نے کہا، "نہیں یارسول اللہ ﷺ!" پھر آپ ﷺ نے صاف صاف ننگے لفظوں میں پوچھا: کیا تو نے دخول کیا تھا؟" اس نے کہا "جی ہاں" تب آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا اس کو لے جاؤ اور رجم کرو۔" پھر ہم لوگوں نے اس کو عید گاہ میں لے جا کر رجم کیا۔ جب اسے پتھر پڑے تو بھاگ کھڑا ہوا۔ ہم نے اسے مدینہ کے پتھریلے میدان میں جا پکڑا اور اسے رجم کر ڈالا۔ بعد میں اس واقعہ کی اطلاع آپ کو دی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: جب وہ بھاگ کھڑا ہوا تھا تو تم نے اسے چھوڑ دیا ہوتا" (بخاری۔ کتاب المحاربین۔ باب رجم المحصن)

۲۔حد اور اقامت سے متعلق شرائط، ہدایات اور احکام سے متعلقہ احادیث:۔ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کے پاس ایک یہودی اور یہودن لائے گئے۔ جنہوں نے بدکاری کی تھی۔ آپ ﷺ نے یہودیوں سے پوچھا: تم اپنی کتاب میں اس جرم کی کیا سزا پاتے ہو؟ وہ کہنے لگے: ہمارے عالموں نے منہ کالا کرنا اور دم کی طرف منہ کر کے سوار کرانا اس کی سزا بتائی ہے۔ یہ سن کر عبداللہ بن سلام کہنے لگے۔ یارسول اللہ ﷺ ان سے تورات منگوایئے۔ تورات لائی گئی تو ایک یہودی رجم کی آیت پر ہاتھ رکھ اس سے پہلے اور بعد کی آیتیں پڑھنے لگا۔ عبداللہ بن سلام نے اس سے کہا ذرا اپنا ہاتھ تو اٹھا جب اس نے ہاتھ اٹھایا تو نیچے رجم کی آیت تھی۔ پھر آپ ﷺ نے حکم دیا تو وہ دونوں رجم کئے گئے۔ عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں یہ دونوں بلاط کے پاس رجم کئے گئے اور میں نے دیکھا کہ یہودی یہودن پر جھک گیا تھا۔ (بخاری۔ کتاب المحاربین۔ باب الرجم فی البلاط)

۳۔ سیدنا ابوہریرہؓ اور زید بن خالد دونوں کہتے ہیں کہ ہم ایک دفعہ آپ ﷺ کے پاس بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک شخص کھڑا ہو کر کہنے لگا: یارسول اللہ ﷺ! میں آپ ﷺ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ آپ کتاب اللہ کے مطابق ہمارا فیصلہ فرما دیجئے۔ یہ سن کر دوسرا فریق جو کچھ زیادہ سمجھ دار تھا کھڑا ہو کر کہنے لگا: ہاں یارسول اللہ ﷺ! ہمارا فیصلہ کتاب اللہ کے موافق فرمایئے۔ اور بات کرنے کی مجھے اجازت دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا بتاؤ۔ وہ کہنے لگا: میرا بیٹا اس شخص کے پاس نوکر تھا۔ اس نے اس کی بیوی سے بدفعلی کی۔ میں نے سو بکریاں اور ایک غلام بطور فدیہ اسے دیا ہے۔ اس کے بعد میں نے کئی عالموں سے یہ مسئلہ پوچھا: وہ کہتے ہیں کہ تیرے بیٹے کو سو کوڑے پڑیں گے اور ایک سال کی جلاوطنی ہو گی۔ اور اس کی بیوی کو رجم کیا جائے گا۔ آپ نے یہ سن کر فرمایا: اس پروردگار کی قسم! جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ میں کتاب اللہ کے مطابق تم دونوں کا فیصلہ کروں گا۔ سو بکریاں اور غلام جو تو نے دیا ہے تجھے واپس ہو گا۔ اور تیرے بیٹے کو سو کوڑے اور ایک سال جلاوطنی کی سزا ہے۔ اور اے انیس (بن ضحاک) تو کل صبح اس (دوسرے فریق) کی بیوی کے پاس جا کر پوچھ اگر وہ اقرار کرے تو اسے رجم کر دینا۔ چنانچہ دوسرے دن انیس اس عورت کے پاس گئے، اس نے اقرار کر لیا تو انیس نے اسے رجم کیا۔ (بخاری۔ کتاب المحاربین۔ باب اعتراف الزنا)

۴۔ سیدنا بریدہؓ فرماتے ہیں کہ قبیلہ غامدیہ کی ایک عورت آپ ﷺ کے پاس آکر کہنے لگی: یارسول اللہ ﷺ! میں نے زنا کی ہے۔ مجھے پاک کیجئے۔ آپ نے اس کو پھیر دیا۔ جب دوسرا دن ہوا تو آپ ﷺ کے پاس حاضر ہو کر کہنے لگی۔ شاید آپ مجھے ماعز کی طرح لوٹانا چاہتے ہیں۔ اللہ کی قسم! میں حاملہ ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ابھی نہیں تا آنکہ تو بچہ جنم دے لے۔ پھر جب اس نے بچہ جنا تو بچے کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر لے آئی اور کہا: اب تو میں بچہ جن چکی" آپ ﷺ نے فرمایا: جا اسے دودھ پلا حتی کہ تو اس کا دودھ چھڑائے۔ پھر جب اس نے دودھ چھڑایا تو بچے کو لے کر آئی جس کے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا تھا اور کہنے لگی یہ پتہ ہے میں نے اس کا دودھ چھڑا دیا ہے اور اب یہ کھانا کھاتا ہے" آپ ﷺ نے یہ بچہ ایک مسلمان کے حوالے کیا۔ پھر اس کے متعلق حکم دیا کہ اس کے سینے تک گڑھا کھودا جائے اور لوگوں کو اسے رجم کرنے کا حکم دیا۔ سیدنا خالد بن ولید ایک پتھر لے کر آگے بڑھے اور اس کے سر پر مارا۔ خون کے چھینٹے سیدنا خالد کے منہ پر پڑے تو آپ نے اس عورت کو گالی دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا خالد کو گالی دیتے سن لیا تو سیدنا خالد سے فرمایا: خالد! یہ کیا بات ہے؟ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ اس عورت نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ٹیکس لینے والا بھی ایسی توبہ کرے تو بخش دیا جائے۔ پھر آپ ﷺ نے نماز جنازہ کا حکم دیا۔ نماز پڑھی گئی پھر دفن کی گئی۔ (مسلم۔ کتاب الحدود۔ باب حدالزنا)

۵۔ سیدنا عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھ سے (شرع کی باتیں) سیکھ لو۔ اللہ نے (زانی) عورتوں کے لئے ایک راہ نکالی۔ جب کنوارا، کنواری سے زنا کرے۔ تو سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے اور اگر شوہر دیدہ عورت، زن دیدہ مرد سے زنا کرے تو سو کوڑے اور رجم ہے (مسلم۔ کتاب الحدود۔ باب حدالزنا)

۶۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مخزومی عورت (فاطمہ بنت اسود) نے چوری کی تو قریشیوں کو فکر لاحق ہوئی (کہ اب اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا) انہوں نے کہا: اس مقدمے میں آپ ﷺ سے سفارش کی جرأت اسامہ بن زیدؓ کے سوا اور کون کر سکتا ہے۔ جو آپ کا محبوب ہے۔ خیر اسامہؓ نے اس سلسلہ میں آپ ﷺ سے بات کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم اللہ کی مقرر کردہ سزاؤں میں سفارش کرتے ہو؟" پھر آپ نے خطبہ دیا اور فرمایا: "تم سے پہلے لوگ صرف اس وجہ سے تباہ ہوئے کہ جب ان میں کوئی شریف و معزز چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے۔ اللہ کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمد ﷺ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا" (بخاری۔ کتاب الانبیاء۔ باب ماذکر عن بنی اسرائیل)

۷۔ سیدنا ابن عباس فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے عویمر عجلانی اور اس کی بیوی میں لعان کا فیصلہ فرمایا اور میں نے یہ حدیث بیان کی تو ایک شخص مجھ سے پوچھنے لگا: کیا یہ وہی عورت تھی جس کے حق میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر میں کسی کو شہادتوں کے بغیر رجم کر سکتا تو اس عورت کو ضرور کرتا؟" ابن عباس نے کہا: نہیں، یہ ایک اور عورت تھی۔ اس کی بدکاری اسلام کے زمانہ میں کھل گئی تھی۔ (بخاری کتاب الطلاق۔ باب قول النبی ﷺ لو کنت راجما بغیر بینة)

۸۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "تین شخص مرفوع القلم ہیں یعنی ان پر تکلیف شرعی نہیں۔ سویا ہوا یہاں تک کہ بیدار ہو دوسرے بچہ یہاں تک کہ بالغ ہو اور تیسرے مجنوں، یہاں تک کہ اسے عقل آئے" (ترمذی۔ ابواب الحدود۔ باب ما جاء فیمن لایجب علیه الحد)

۹۔ ❁ اثباتِ جرم میں شک کا فائدہ ملزم کو پہنچتا ہے:۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جہاں تک ہو سکے مسلمانوں سے حدود کو ٹالنے کی کوشش کرو۔ اور مجرم کی رہائی کی کوئی بھی شکل نظر آ رہی ہو تو اسے چھوڑ دو۔ اس لئے کہ حاکم اگر مجرم کو معاف کر دینے میں غلطی کرے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ سزا دینے میں غلطی کرے" (ترمذی۔ ابواب الحدود۔ باب ما جاء فی درء الحدود)

۱۰۔ سیدنا ابو ہریرہ ؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جس نے کسی مسلمان کی کوئی مصیبت دور کر دی۔ اللہ آخرت کی مصیبتوں میں سے ایک مصیبت اس سے دور کر دے گا۔ اور جس نے کسی مسلمان کا عیب چھپایا اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کا عیب چھپائے گا۔ اور جب تک کوئی شخص اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہے اللہ اس کی مدد میں ہوتا ہے" (ترمذی۔ ابواب الحدود۔ باب ما جاء فی الستر علی المسلم)

۱۱۔ سیدنا ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوڑے بھی لگائے اور جلاوطن بھی کیا۔ (اسی طرح) سیدنا ابو بکر ؓ اور سیدنا عمر ؓ نے کوڑے بھی لگائے اور جلاوطن بھی کیا" (ترمذی۔ ابواب الحدود۔ باب ما جاء فی النفی)

۱۲۔ ❁ زنا بالجبر میں عورت پر حد نہیں:۔ سیدنا علقمہ بن وائل کندی اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ دور نبوی میں ایک عورت (فجر کی) نماز کے ارادہ سے نکلی اسے ایک مرد ملا جس نے اسے چھپا لیا پھر اس سے اپنی حاجت پوری کی وہ چیخنے لگی تو مرد بھاگ گیا۔ اتفاق سے ایک اور آدمی اس کے پاس سے گزرا تو اس عورت نے کہا کہ اس شخص نے میرے ساتھ ایسا اور ایسا کیا ہے۔ پھر کچھ مہاجر وہاں سے گزرے تو عورت نے وہی بات دہرائی۔ لوگوں نے اس مرد کو پکڑ لیا جس کے متعلق عورت کا گمان تھا کہ اس نے بد فعلی کی ہے۔ مگر حقیقتاً وہ زانی نہ تھا۔ اور اسے آپ ﷺ کے پاس لے گئے۔ آپ ﷺ نے اس کے رجم کا حکم دے دیا۔ اب وہ شخص کھڑا ہوا جس نے زنا کیا تھا کہنے لگا: یا رسول اللہ! اصل مجرم میں ہوں۔ آپ نے عورت سے فرمایا: تم چلی جاؤ۔ اللہ نے تجھے (جبر کی وجہ سے) بخش دیا۔ اور ملزم سے بھی آپ ﷺ نے اچھی بات کہی۔ پھر مجرم کے متعلق فرمایا کہ اسے رجم کر دو۔ نیز فرمایا کہ اس شخص نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر تمام شہر والے ایسی توبہ کریں تو ان کی توبہ قبول ہو جائے" (ترمذی۔ ابواب الحدود۔ باب ما جاء فی المرأۃ اذا استکرھت علی الزنا)

۱۳۔ سیدنا ابو بردہ بن نیار کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ کی حدود میں سے کسی حد کے علاوہ دس کوڑے سے زیادہ نہ مارے جائیں" (بخاری۔ کتاب المحاربین۔ باب کم التعزیر والادب)

۱۴۔ ❁ قید کرنے کی مشروعیت:۔ سیدنا بہز بن حکیم اپنے باپ سے، وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کو ایک الزام میں قید رکھا" (نسائی۔ کتاب قطع السارق۔ باب امتحان السارق بالضرب والحبس)

۱۵۔ سیدنا نعمان بن بشیر کے پاس قبیلہ کلاعی کے لوگ آئے اور کہا کہ جولاہوں نے ہمارا سامان چرا لیا ہے۔ نعمان نے ان جولاہوں کو کچھ دن قید رکھا پھر چھوڑ دیا۔ کلاعی لوگ پھر نعمان کے پاس آ کر کہنے لگے: آپ نے جولاہوں کو چھوڑ دیا، نہ ان کا امتحان لیا نہ مارا۔ نعمان نے کہا: کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں انہیں ماروں؟ مگر دیکھو! اگر تمہارا سامان ان کے پاس نکل آیا تو خیر ورنہ میں اسی قدر تمہاری پیٹھ پر ماروں گا" وہ کہنے لگے: کیا یہ تمہارا حکم ہے۔ نعمان نے کہا: یہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے۔" (نسائی۔ کتاب قطع السارق۔ باب امتحان السارق بالضرب و الحبس)

۱۶۔ ❁ سامان کی برآمدگی چوری کا ثبوت نہیں:۔ سیدنا ابو امیہ مخزومی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے پاس ایک چور آیا جو چوری کا

اقرار کرتا تھا لیکن اس کے پاس مال نہ ملا۔ آپ ﷺ نے اسے فرمایا: میں تو نہیں سمجھتا کہ تو نے چوری کی ہو گی" وہ کہنے لگا: نہیں! میں نے چوری کی ہے" آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو لے جاؤ اس کا ہاتھ کاٹو پھر لاؤ" لوگ اسے لے گئے۔ اس کا ہاتھ کاٹا پھر لے کر آئے۔ آپ ﷺ نے اسے فرمایا: کہو اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ چنانچہ اس نے یہ دعا کی پھر آپ ﷺ نے فرمایا: یا اللہ اس کی توبہ قبول کر" (نسائی۔ کتاب قطع السارق۔ باب تلقین السارق)

۱۷۔ ۞ مقدمہ عدالت میں جانے سے پہلے حقدار چور کو معاف کر سکتا ہے:۔ سیدنا صفوان بن امیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے خانہ کعبہ کا طواف کیا پھر نماز پڑھی پھر اپنی چادر تہ کر کے سر کے نیچے رکھی اور سو گئے۔ چور آیا اور چادر ان کے سر کے نیچے سے کھینچی (ان کی آنکھ کھلی) تو دوڑ کر چور کو پکڑ لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے اور بتایا کہ اس نے میری چادر چرالی ہے۔ آپ ﷺ نے چور سے پوچھا: کیا تو نے چادر چرائی تھی؟ وہ کہنے لگا "ہاں" آپ ﷺ نے دو آدمیوں سے کہا کہ اسے لے جاؤ اور اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ تب صفوان کہنے لگے: یا رسول اللہ! میری نیت یہ نہ تھی کہ ایک چادر کے بدلے اس کا ہاتھ کاٹا جائے" آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کام پہلے کرنے کا تھا" (نسائی۔ کتاب قطع السارق۔ باب مایکون حرزاً ومالا یکون)

۱۸۔ ۞ حد قائم کرنے کی برکت:۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی ملک میں اسلامی قانون کا جاری ہونا وہاں کے لوگوں کے لئے تیس دن (اور ایک دوسری روایت کے مطابق چالیس دن) بارش برسنے سے بہتر ہے۔ (نسائی۔ کتاب قطع السارق۔ باب الترغیب فی اقامۃ الحد)

۱۹۔ سیدنا انس بن مالک کہتے ہیں کہ میں آپ ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک شخص (ابوالبسر کعب بن عمرو) آپ کے پاس آکر کہنے لگا: یا رسول اللہ ﷺ! میں نے ایک مستوجب حد گناہ کیا ہے۔ مجھے حد لگائیے۔ آپ ﷺ نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ اتنے میں نماز کا وقت آگیا۔ اس نے بھی آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی۔ جب آپ ﷺ نماز پڑھ چکے تو پھر وہ شخص کھڑا ہو کر کہنے لگا: یا رسول اللہ ﷺ! میں نے ایک مستوجب حد گناہ کیا ہے کتاب اللہ کے مطابق مجھے سزا دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تو نے ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی؟ وہ کہنے لگا: پڑھی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو بس اللہ نے تیرا گناہ یا تیری سزا کو معاف کر دیا ہے" (بخاری۔ کتاب المحاربین۔ باب اذا اقر بالحد ولم یبین هل للامام ان یستر علیه)

۞ حد اور اقامت کے متعلق احادیث کا ماحصل:۔ اب ہم مندرجہ بالا احادیث کا ماحصل درج ذیل دفعات کی شکل میں پیش کرتے ہیں:

۱۔ کنوارے مرد اور کنواری عورت کی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے۔ (حدیث نمبر ۳ اور نمبر ۵) جلاوطنی سے مراد ملک بدر کرنا نہیں بلکہ اتنے فاصلہ پر بھیجنا ہے جس کو شرعی اصطلاح میں سفر کہہ سکتے ہوں۔ اور اس جلاوطنی کا مقصد یہ ہے کہ آئندہ کم از کم زانی جوڑے کے ملاپ کی راہ کو ہی بند کر دیا جائے اور اس کی امکانی صورتوں کو ختم کر دیا جائے (حدیث نمبر ۳) اور یہ مقصد بعض علماء کے نزدیک قید میں ڈالنے سے بھی پورا ہو سکتا ہے اور اگر ایسا کوئی خطرہ موجود نہ ہو تو قاضی جلاوطنی کی سزا کو موقوف بھی کر سکتا ہے۔ لیکن سو کوڑے کی سزا بہر حال قائم رہے گی۔ گویا سو کوڑے تو اللہ کی مقرر کردہ حد ہے اور ایک سال کی جلاوطنی بطور تعزیر ہے۔

۲۔ کوڑا ایسا ہونا چاہئے جو نہ زیادہ سخت ہو کہ سو کوڑے پڑنے پر چمڑی ہی ادھیڑ ڈالے اور گوشت ننگا ہو جائے اور یہ مفہوم جلدة کے لغوی معنی میں شامل ہے اور نہ زیادہ نرم جس کو مجرم سزا بھی نہ سمجھے۔ بلکہ ایسا ہونا چاہئے جو نہ بالکل نیا اور سخت ہو اور نہ

زیادہ پرانا اور نرم ہو۔

۳۔ اسی طرح کوڑے مارنے والے (جلاد) کو بھی کوڑے اتنے زور سے نہ مارنے چاہئیں کہ ایسا معلوم ہو جیسے وہ کوئی اپنا ذاتی انتقام لے رہا ہے۔ نہ وہ پیچھے سے دوڑ کر پورے زور سے کوڑے برسائے اور نہ بالکل آہستہ مارے جس کی مجرم کو تکلیف ہی نہ ہو۔۔ بلکہ درمیانی روش اختیار کرنا چاہئے۔ اور وہ درمیانی روش یہ ہے کہ سو کوڑے کھانے کے بعد نہ اس کا گوشت ننگا ہونا چاہئے۔ نہ ایسا ہونا چاہئے کہ وہ سو کوڑے کھانے کے بعد مر جائے یا بے ہوش ہو کر گر پڑے یا اس کے بدن کا قیمہ اڑنے لگے۔

۴۔ کوڑے برساتے وقت چہرے اور شرم گاہ کو ضرور بچانا چاہئے۔ باقی کوڑے بھی کسی ایک ہی جگہ مثلاً سرین پر نہ مارے جائیں بلکہ بدن کے مختلف حصوں پر بانٹ کر مارے جائیں۔ مرد کو یہ سزا کھڑا کر کے اور عورت کو بٹھا کر دی جائے۔ مرد کا جسم ننگا ہو تو بھی ٹھیک ہے۔ مگر عورت کا جسم مستور ہونا چاہئے۔ البتہ بدن پر کوئی اتنا موٹا کپڑا بھی نہ ہو جو سزا کے اثر کو ہی کم یا زائل کر دے۔

۵۔ ۞ سزا میں بامرِ مجبوری شرعی حیلہ: اگر مجرم کمزور ہو تو سو کوڑوں کی تعداد بالاقساط بھی پوری کی جاسکتی ہے۔ یعنی روزانہ پچیس تیس کوڑے لگادیئے جائیں۔ اور بہت زیادہ کمزور ہو تو جھاڑو وغیرہ سے جس میں سو تنکے ہوں اسے سزا دے کر حد پوری کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح اگر عورت حاملہ ہو، یا نفاس میں ہو یا بچہ کو دودھ پلاتی ہو تو سزا کو اس وقت تک مؤخر کیا جائے گا۔ کہ وہ عورت اس حالت سے فارغ ہو جائے۔ (حدیث نمبر ۴)

۶۔ سو کوڑے کی سزا کی شرائط یہ ہیں کہ مجرم آزاد ہو۔ عاقل ہو، بالغ، مجنوں اور دیوانہ نہ ہو۔ (حدیث نمبر ۸)

۷۔ رجم کی سزا کے لئے چند شرائط اور بھی ضروری ہیں۔ یعنی شادی شدہ ہو اور اپنی بیوی سے ہمبستری بھی کر چکا ہو۔ (حدیث نمبر ۱) اور بعض علماء کے نزدیک مسلمان ہونا بھی شرط ہے اور ذمیوں پر اس کا اطلاق نہ ہو گا اور جو رسول اللہ نے یہودی جوڑے کو رجم کرایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی کتاب میں یہی سزا واجب تھی اور ان سے اعتراف بھی کروایا گیا تھا (حدیث نمبر ۲)

۸۔ اگرچہ حدیث نمبر ۵ میں شادی شدہ زانی یا زانیہ کی سزا سو کوڑے اور رجم دونوں ہیں۔ تاہم دور نبوی اور خلفائے راشدین میں صرف رجم پر ہی اکتفا کیا جاتا رہا ہے۔ جیسا کہ احادیث نمبر ۱ تا نمبر ۴ سے ظاہر ہے۔ البتہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ایک محصنہ زانیہ کو یہ دونوں سزائیں دیں۔ جمعرات کے دن اس کو سو کوڑے لگائے اور یہ فرمایا یہ سزا کتاب اللہ کے مطابق ہے اور جمعہ کے دن اسے رجم کیا اور فرمایا یہ سزا سنت رسول ﷺ کے مطابق ہے۔ یہ واقعہ مسند احمد میں تفصیلاً مذکور ہے اور بخاری میں مجملاً (بخاری۔ کتاب المحاربین۔ باب رجم المحصن)

۹۔ مرد کو کھڑے کھڑے رجم کیا جائے گا مگر عورت کے لئے سینہ تک گڑھا کھود کر اس میں اسے داخل ہونے کو کہا جائے گا۔ (حدیث نمبر ۴)

۱۰۔ اگر انسان سے کوئی بے حیائی کا ایسا جرم سرزد ہو جائے جس پر حد لاگو ہوتی ہو تو اسے چاہئے کہ عدالت میں جاکر اعتراف کرنے کی بجائے اللہ کے حضور توبہ استغفار پر اکتفا کرے (حدیث نمبر ۱، نمبر ۴)

۱۱۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو کسی گناہ میں مبتلا دیکھ لے تو اسے اپنے مسلمان بھائی کی پردہ پوشی کرنا چاہئے۔ ایسا نہ کرے کہ عدالت میں یا حاکم کے پاس اس کی رپورٹ کر دے۔ یا دوسروں کو بتاتا پھرے۔ (حدیث نمبر ۱) بشرطیکہ اس جرم کا تعلق حقوق اللہ سے ہو۔ حقوق العباد سے نہ ہو۔

۱۲۔ اگر کوئی مجرم عدالت میں جاکر اپنے جرم کا اقرار کرے تو قاضی اسے یہ تلقین کر سکتا ہے کہ واپس چلے جاؤ اور اللہ سے توبہ استغفار کرو اور اسے سزا دینے کا اقدام نہ کرے۔ (حدیث نمبر۱، نمبر۴)

اسی طرح اگر کوئی مجرم عدالت میں مبہم بیان دے تو بھی قاضی اسے ایسی تلقین کر سکتا ہے (حدیث نمبر۱۹)

۱۳۔ دورِ فاروقی میں حد قذف:۔ زنا کے ثبوت کے لئے چار معتبر عاقل، بالغ مسلمانوں کی شہادت ضروری ہے اور یہ گواہی صرف مردوں کی ہو گی جس میں ایک مرد کے بجائے دو عورتوں کی گواہی قابل قبول نہیں۔ عورتوں کی گواہی کا تعلق صرف مالی امور میں معتبر ہے۔ اور یہ شہادت صاف صاف اور واشگاف الفاظ میں ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر کسی ایک گواہ کے بیان سے بھی معاملہ مشکوک ہو گیا تو مجرم سزا سے بچ سکتا ہے کیونکہ شبہ کا فائدہ مجرم کو پہنچتا ہے۔ (حدیث نمبر۹) اس صورت میں گواہوں کی شامت آسکتی ہے۔ بعض علماء کے نزدیک تو ان گواہوں پر قذف کی حد لگائی جائے گی۔ چنانچہ دور فاروقی میں ایک ایسا واقعہ ہوا بھی تھا۔ سیدنا ابو بکرہؓ نے مغیرہ بن شعبہؓ گورنر بصرہ پر زنا کی تہمت لگائی اور تین گواہ بھی پیش کر دیئے۔ ان میں سے ایک گواہ کا بیان مبہم ہونے کی بنا پر سیدنا مغیرہؓ تو سزا سے بچ گئے اور سیدنا ابو بکرہؓ اور ان کے دو ساتھیوں کو سیدنا عمرؓ نے قذف کی حد لگائی تھی۔ اور تیسرا گواہ مبہم بیان کی وجہ سے بچ گیا تھا۔

دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ ان پر قذف کی حد نہیں لگے گی اور ان کی وجوہ یہ ہیں (۱) یہ گواہ قذف کے مدعی بن کر نہیں آتے بلکہ زنا کے گواہ ہوتے ہیں۔ (۲) سیدنا عمرؓ نے گواہوں کو جو سزا دی تو یہ خصوصی حالات میں تھی۔ سیدنا مغیرہ بن شعبہ اور ابو بکرہؓ میں پہلے سے چپقلش موجود تھی اور گواہ سیدنا ابو بکرہؓ کے دوست تھے۔ (۳) اگر اس طرح زنا کے گواہوں کے ادنیٰ سے شبہ کی بنا پر مار پڑنے لگے تو کبھی کوئی شخص گواہی پر تیار نہ ہو گا۔ ہماری رائے میں دوسرے گروہ کا موقف راجح معلوم ہوتا ہے۔ تاہم ایسے بے حیائی کے مقدمات میں شہادت اور افواہوں میں دلچسپی لینے سے حتیٰ الامکان گریز ہی کرنا چاہئے۔ اور جہاں کہیں ایسی گندگی نظر آئے بھی تو اسے نشر کرنے کی بجائے پردہ پوشی سے کام لینا ہی بہتر ہوتا ہے۔

۱۴۔ شہادات کے بعد ثبوت جرم کا دوسرا معتبر ذریعہ ملزم کا اپنا اقرار ہے۔ مجرم اگر چار گواہیوں کے عوض چار بار اقرار کرے تو یہ بہتر ہے۔ جیسا کہ حدیث نمبر۱ اور نمبر۴ سے معلوم ہوتا ہے۔ تاہم ایک بار کا اقرار بھی ثبوتِ جرم کیلئے کافی ہے۔ (حدیث نمبر۳)

۱۵۔ ثبوت جرم کا تیسرا معتبر ذریعہ حمل ہے۔ اگر عورت کنواری یا بے شوہر ہے اور اسے حمل ہو جائے تو یہ قرینہ کی معتبر شہادت ہے اور اس بنا پر سزا دی جا سکتی ہے۔ (حدیث نمبر۴) نیز سیدنا عمر کا وہ خطبہ جس کا ذکر رجم کے بیان میں گزر چکا ہے۔ (بخاری۔ کتاب المحاربین۔ باب رجم الحبلیٰ)

۱۶۔ ملزم کو شبہ کا فائدہ:۔ قاضی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مجرم کے اقرار کے بعد بھی صورت حال کی پوری تحقیق کرے۔ اگر اسے کسی قسم کا شبہ پڑ جائے تو وہ مجرم کو چھوڑ سکتا ہے کیونکہ مجرم کو سزا دینے میں غلطی کرنے سے اسے معاف کر دینے میں غلطی کرنا بہتر ہے۔ (حدیث نمبر۹)

۱۷۔ زنا کا جرم قابلِ راضی نامہ نہیں:۔ زنا کا جرم کسی قیمت پر قابلِ راضی نامہ نہیں۔ نہ ہی مال و دولت یا تاوان سے کسی کی عصمت و آبرو کی سودا بازی ہو سکتی ہے۔ (حدیث نمبر۳)

۱۸۔ البتہ ایسے حدی جرائم جن کا مالی معاملات سے تعلق ہو۔ مقدمہ عدالت میں آنے سے بیشتر قابل راضی نامہ ہوتے ہیں۔

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ الزَّانِيْ لَا

معاملہ [۴] تمہیں ان دونوں (میں سے کسی) پر بھی ترس نہ آنا چاہئے۔ اور مسلمانوں میں سے ایک گروہ ان کی سزا [۵] کے وقت موجود ہونا چاہئے۔(۲)

مثلاً چور کو معاف بھی کیا جاسکتا ہے اور اس سے مسروقہ مال لے کر بھی معافی دی جاسکتی ہے۔ علاوہ ازیں کوئی بھی شرائط جو صاحبِ حق تسلیم کرلے اس پر راضی نامہ ہوسکتا ہے۔ (حدیث نمبر ۱۷)

۱۹۔ ❁ اقبالِ جرم کیلئے سزا کی ممانعت:۔ مالی مقدمات میں اقبال جرم کرانے کے لئے ملزم کو قید تو کیا جاسکتا ہے مگر اسے بدنی سزا نہیں دی جاسکتی۔ (حدیث نمبر ۱۴، ۱۵)

۲۰۔ مقدمہ عدالت میں آجانے کے بعد مجرم کے حق میں سفارش کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ (حدیث نمبر ۶)

۲۱۔ جرم ثابت ہوجانے کے بعد قاضی حد کی سزا میں کوئی کمی و بیشی کرنے کا مجاز نہیں۔ (سورہ نور۔ آیت نمبر ۲)

۲۲۔ ❁ قاضی اپنے علم کی بنا پر فیصلہ نہیں دے سکتا:۔ فوجداری مقدمات میں قاضی اپنے علم کی بنا پر فیصلہ نہیں دے سکتا۔ ایسے فیصلے اسے شہادتوں کی بنیاد پر ہی کرنا ہوں گے۔ (حدیث نمبر ۷)

۲۳۔ حد جاری ہونے کے بعد مجرم اس گناہ سے بالکل پاک صاف ہوجاتا ہے۔ لہٰذا اسے برے لفظوں سے قطعاً یاد نہ کیا جائے۔ اس پر جنازہ بھی پڑھا جائے گا۔ اور اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔ (حدیث نمبر ۴ اور نمبر ۱۲)

۲۴۔ ❁ زنا کے دوسرے فریق کی تفتیش نہ کی جائے:۔ زنا کا ایک فریق اگر اپنے گناہ کا اقرار کرلے تو قاضی اسے یہ نہیں پوچھے گا کہ دوسرا فریق کون ہے؟ اگر اس پر پردہ پڑا ہے تو یہی بات اسلام کے مطابق ہے۔ نیز اسلامی قانون لوگوں کو سزا دینے کے لئے بے چین نہیں ہے۔ (حدیث نمبر ۴، نمبر ۱)

۲۵۔ اقرار کرنے والا فریق دوسرے فریق کا پتہ بتاتا ہے تو دوسرے فریق سے معلوم کیا جائے گا اگر وہ بھی اقرار کرلے تو اس پر حد جاری ہوگی۔ (حدیث نمبر ۳) اور اگر انکار کردے تو وہ بچ جائے گا۔ البتہ بعض علماء کے نزدیک پتہ بتانے والے پر قذف کی حد بھی جاری ہوگی۔ لیکن یہ بات قاضی کی تحقیق اور صوابدید پر منحصر ہے۔

۲۶۔ حدود جاری کرنے والے معاشرہ پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار خیر و برکات کا نزول ہوتا ہے۔ (حدیث نمبر ۱۸)

۲۷۔ اگر رجم کا مجرم اقرار کے بعد اپنے اقرار سے پھر جائے یا بھاگ کھڑا ہو تو اسے مزید سزا نہیں دی جائے گی۔ (حدیث نمبر ۱)

۲۸۔ عورت سے اگر بالجبر زنا کیا گیا ہو تو اس پر حد جاری نہیں کی جائے گی۔ (حدیث نمبر ۱۲)

۲۹۔ حدود کے علاوہ کسی جرم کی تعزیر میں قاضی بدنی سزا دس کوڑوں سے زیادہ دینے کا مجاز نہیں۔ (حدیث نمبر ۱۳)

[۴] ❁ تحقیقِ جرم میں انتہائی نرمی:۔ مندرجہ بالا احکام و ہدایات سے واضح طور پر یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ اسلامی قانون اس تلاش میں نہیں رہتا کہ کوئی مجرم ملے تو اسے سزا دے ڈالی جائے۔ بلکہ اس کی ہر ممکن کوشش یہ ہوتی ہے کہ مجرم سزا سے بچ جائے۔ پہلے تو وہ مجرم کو خود ہدایت دیتا ہے کہ اپنا جرم کسی کو نہ بتائے بلکہ اللہ سے توبہ و استغفار کرے۔ پھر معاشرہ کے افراد کو ہدایت دیتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو جرم میں مبتلا دیکھ لے تو اس پر پردہ ڈالے اور کسی کے آگے بیان نہ کرے۔ پھر قاضی کو ہدایت دیتا ہے کہ مجرم کو سمجھائے اور توبہ استغفار کی تلقین کرکے اسے واپس بھیج دے۔ پھر اس کا قانونِ شہادت اتنا سخت ہے کہ شائد ہی کوئی جرم شہادتوں کی بنا پر پایہ ثبوت کو پہنچتا ہو۔ قاضی کو یہ ہدایت دیتا ہے کہ شہادت یا مجرم کے اقرار میں کسی طرح کا شبہ پڑ جائے یا مجرم

يَنْكِحُ إِلَّا زَانِيَةً أَوْ مُشْرِكَةً ۖ وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا إِلَّا زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذَٰلِكَ عَلَى

زانی نکاح نہ کرے مگر زانیہ یا مشرکہ عورت کے ساتھ، اور زانیہ کے ساتھ وہی نکاح کرے جو خود زانی یا مشرک ہو۔ اور اہل ایمان پر یہ کام[۶] حرام کر دیا گیا ہے۔(۳)

اپنے اقرار سے منحرف ہو جائے تو اسے چھوڑ دیا جائے پھر وہ مجرم کی حالت دیکھتا ہے کہ آیا وہ سزا کے قابل بھی ہے یا نہیں۔

❁ اثباتِ جرم کے بعد بر سر عام بدنی سزا کی وجہ:۔ ان سب مراحل سے گزرنے اور جرم کے پایہ ثبوت کو پہنچ جانے کے بعد پھر جو سزا دیتا ہے۔ وہ یقیناً سخت بھی ہے اور اس کا تعلق بھی بدنی سزا سے ہوتا ہے اس وقت حد لگانے کی حد تک تو نرمی کا برتاؤ ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ مگر مجرم پر ترس کھانے کا مطلق روادار نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ایسے مجرم پر ترس کھانا فی الحقیقت پورے معاشرے پر ظلم کے مترادف ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر فرمایا "اے صاحبان عقل و خرد! تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے" (۲:۱۷۹) بالفاظ دیگر ایک شخص کو قصاص میں مار ڈالنے سے سارے معاشرہ کو جینے کا حق ملتا ہے۔ اور وہ امن و چین سے رہ سکتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اسلامی قانون حدود و قصاص اور تعزیرات کو بھی "اللہ کا دین" فرمایا ہے۔ کیونکہ یہ بھی اقامت دین کا ایک لازمی عنصر ہے۔ دین کا اطلاق صرف عبادات تک ہی محدود نہیں بلکہ اس لفظ کے معنی کی وسعت میں شریعت کے تمام تر احکام آجاتے ہیں۔

[۵] یعنی مجرموں کو یہ بدنی سزائیں برسرِ عام دی جائیں تاکہ انہیں اپنے کئے پر زیادہ سے زیادہ شرمندگی ہو۔ اور دوسروں کے لئے باعث عبرت ہو۔

❁ وحشیانہ سزا کا طعنہ دینے والوں کا اپنا کردار:۔ اب ایسے اسلامی معاشرہ کے مقابلہ میں ان لوگوں پر نظر ڈالنا بھی ضروری ہے جو اسلامی سزاؤں کو وحشیانہ سزائیں قرار دیتے میں اور اس کا پروپیگنڈہ کرنے میں اپنے پھیپھڑوں تک کا زور لگا رہے ہیں۔ انہیں صرف ایسے مجرموں پر ترس آتا ہے جو حکومت کے حامی یا اس کے رکن ہوتے ہیں۔ اور ترس اس لئے آتا ہے کہ ان کے تعاون کے بغیر ان کی حکومت چل ہی نہیں سکتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے مجرموں نے لوٹ کھسوٹ، مار دھاڑ اور فساد کے ذریعہ لوگوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ اور جو مجرم حکومت کے مخالف ہوں ان کے لئے علیحدہ عقوبت خانے (Cell) (Tarcher) بنائے جاتے ہیں اور ان مجرموں کے ایسے ایسے جاں گداز روح فرسا عذاب دیئے جاتے ہیں کہ سن کر روح کانپ اٹھتی ہے۔ اور یہ سب ظلم تنگ و تار کوٹھڑیوں میں ڈھائے جاتے ہیں کہ کسی کا دیکھنا تو درکنار اکسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح بسا اوقات پولیس حوالات کے دوران ملزموں کو مار مار کر ہلکان کر دیتی ہے۔ اور اس کی مثال بالکل وہی ہے جیسے موجودہ دور حکومت کے مہذب لوگ دوسرا نکاح کرنا تو جرم سمجھتے ہیں مگر حرام طریقے پر بیسیوں داشتائیں اور شناسائیں رکھی ہوتی ہیں اور اسلام جو حلال طریقے سے چار بیویوں کی اجازت دیتا ہے اس کا تمسخر اڑاتے ہیں۔

[۶] اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ سو کوڑے کی سزا صرف کنوارے مرد اور عورت کے لئے ہے۔ جیسا کہ پہلے اس سورہ کے حاشیہ نمبر ۳ کے ابتدا میں اس کی وضاحت کی جا چکی ہے اسی آیت کی تشریح میں درج ذیل حدیث بھی ملاحظہ فرمائیے۔

الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳﴾ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ

اور جو لوگ پاکدامن عورتوں[۷] پر تہمت لگائیں پھر چار گواہ پیش نہ کر سکیں انہیں اسی (۸۰) کوڑے لگاؤ اور آئندہ

فاشی میں مشہور مرد یا عورت سے نکاح کرنا حرام ہے:۔ عمرو بن شعیب کے دادا نے کہا کہ "مرثد بن ابی مرثد (غنوی) نامی ایک شخص قیدیوں کو مکہ سے مدینہ لے جایا کرتا تھا۔ مکہ میں ایک فاحشہ عورت تھی جس کا نام عناق تھا اور وہ مرثد کی (اسلام لانے سے پہلے) دوست تھی۔ مرثد نے مکہ کے قیدیوں میں سے ایک شخص سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ اسے (مدینہ) لے جائے گا۔ مرثد کہتے ہیں کہ میں ایک چاندنی رات دیواروں کے سایہ میں چھپتے چھپاتے مکہ آیا۔ عناق آئی اور اس نے میرے سایہ کو دیوار کے سایہ کی طرف سرکتے دیکھا۔ جب میرے قریب آگئی تو اس نے مجھے پہچان لیا اور پوچھا "مرثد ہے؟" میں نے کہا: "ہاں! مرثد ہوں" وہ کہنے لگی: خوش آمدید! آؤ اور ہمارے ہاں یہ رات گزارو" میں نے کہا: عناق! اللہ نے زنا حرام قرار دیا ہے" وہ بول اٹھی: اے خیمہ والو! یہ شخص ہے جو تمہارے قیدی اٹھا لے جاتا ہے" چنانچہ آٹھ آدمی میرے پیچھے لگ گئے میں خندمہ کی راہ پر چلنے لگا اور ایک غار میں جا گھسا۔ وہ آئے اور میرے سر پر کھڑے تھے۔ انہوں نے پیشاب کیا جو میرے سر پر پڑا۔ تاہم اللہ نے انہیں مجھے دیکھنے سے اندھا کر دیا۔ پھر وہ چلے گئے اور میں پھر (مکہ میں) اپنے رفیق کے پاس آیا اور اسے اٹھا لیا وہ ایک بھاری بھرکم آدمی تھا۔ میں اسے اٹھا کر اذخر (کے مقام) تک پہنچا۔ پھر میں نے اس کی مشکیں کھول دیں اور پھر اسے اپنی پشت پر لاد لیا وہ مجھے تھکا تھکا دیتا تھا حتیٰ کہ میں مدینہ پہنچ گیا اور آپ ﷺ کے پاس حاضر ہو کر کہا: "یارسول اللہ ﷺ! کیا میں عناق سے نکاح کر لوں؟" آپ ﷺ چپ رہے اور مجھے کوئی جواب نہ دیا۔ حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ تب آپ ﷺ نے مجھے فرمایا کہ "اس عورت سے نکاح نہ کر" (ترمذی۔ کتاب التفسیر)

ہاں اگر کوئی زانیہ عورت یا زانی مرد اللہ کے حضور توبہ کر کے آئندہ کلیتاً اپنا طرز حیات بدل لے تو پھر ایسے لوگوں سے نکاح کی اجازت ہے۔ اس آیت میں عام مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جو لوگ فاشی میں مشہور ہوں ان سے رشتہ داری قائم نہ کی جائے۔ نہ انہیں لڑکی کا رشتہ دیا جائے نہ ان سے لیا جائے۔

﴿حُرِّمَ ذٰلِكَ﴾ کے بھی دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ فعل زنا مومنوں پر حرام کر دیا گیا ہے اور اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ زنا کرنے والا جب زنا کرتا ہے تو اس وقت وہ مومن نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ الحدیث (بخاری۔ کتاب المحاربین۔ باب اثم الزناۃ) اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ پاکباز اور عفیف مسلمانوں کے لئے بدکاروں سے رشتہ نکاح کرنا حرام قرار دیا گیا ہے۔

[۷] کسی پر تہمت لگانا بہت بڑا گناہ ہے:۔ یہاں محصن کا لفظ صرف پاکباز یا بے قصور کے معنوں میں آیا ہے۔ خواہ وہ عورت کنواری ہو یا شادی شدہ ہو۔ حتیٰ کہ بعض علماء کے نزدیک پاکباز لونڈی پر تہمت زنا لگانا بھی اس میں شامل ہے۔ اور یہ حکم صرف مردوں کے لئے نہیں بلکہ عورتوں کے لئے بھی ہے کہ وہ پاکباز مردوں پر ایسی تہمت نہ لگائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گناہ کو ان سات بڑے بڑے گناہوں میں شمار کیا ہے جو انسان کو ہلاک کر دینے والے ہیں۔ (بخاری۔ کتاب الوصایا۔ باب قول اللہ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ...... الآیۃ)

ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا
مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵﴾ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ

کبھی ان کی شہادت قبول نہ کرو۔ اور یہی لوگ بدکردار [۸] ہیں۔(۴)

البتہ جو لوگ اس کے بعد توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں تو یقیناً اللہ بڑا بخشنے والا [۹] اور رحم کرنے والا ہے۔(۵) اور جو لوگ اپنی بیویوں پر تہمت لگائیں اور ان کے اپنے سوا ان کے پاس گواہ بھی

❁ **تہمت کے اثبات کے لئے چار شہادتیں کیوں؟** زنا کی شہادت سے مراد تو ایسی شہادت ہے جس میں وضاحت کے ساتھ فعل زنا کی شہادت ہو اور تہمت زنا کی شہادت سے مراد ایسے قرائن کی شہادت ہے جیسے کوئی یہ گواہی دے کہ میں نے فلاں اجنبی مرد اور عورت کو خلوت میں دیکھا ہے۔ یا بوس و کنار کرتے دیکھا ہے یا کوئی کسی کو ولد الزنا یا ولد الحرام کہے۔ ایسے مدعی کے لئے چار شہادتوں کا پیش کرنا ضروری ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی چار شہادتیں میسر آنا نہایت مشکل ہے۔ لہٰذا شہادتوں کے اس سخت نصاب اور پھر سخت سزا سے اصل مقصود یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی برائی دیکھ بھی لے تو اس کے لئے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو وہ پردہ پوشی کرے اور مطلقاً اس کی تشہیر نہ کرے۔ یا پھر چار شہادتیں مہیا کرکے صرف حکومت کو مطلع کرے تاکہ حکومت ملزموں کا جرم ثابت ہو جانے پر انہیں سزا دے کر اس گندگی کا سدباب کرے۔ تیسری راہ اختیار کرنا یعنی عام لوگوں میں ایسی باتیں پھیلانا معاشرہ کے حق میں اور خود اس کے حق میں انتہائی خطرناک ہے۔

دوسری بات محصلت کے لفظ سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو مرد یا عورت پہلے ہی بدنام مشہور ہو چکے ہوں یا پہلے ہی سزا یافتہ ہوں ان پر الزام لگانے سے نہ حد پڑے گی اور نہ ہی وہ غیر مقبول الشہادت قرار پائیں گے تاہم انہیں ایسے کام سے پرہیز کرنا چاہئے۔

[۸] ❁ **پردہ پوشی کس لحاظ سے بہتر ہے؟** خواہ ایسے لوگ اپنی بات یا دعویٰ میں حقیقتاً سچے ہوں مگر مکمل ثبوت فراہم نہ ہونے کے باعث جھوٹے قرار پا گئے ہوں تب بھی ایسے لوگ بدکردار ہیں۔ اللہ کے ہاں بھی اور لوگوں کے ہاں بھی۔ اور ان کی بدکرداری یہ ہے کہ ایسی فحاشی کی بات کو معاشرے میں پھیلانا شروع کر دیا۔ جسے وہ ثابت نہیں کر سکے۔ لہٰذا مسلمانوں کے لئے راہ نجات پردہ پوشی میں ہی ہے۔

[۹] سابقہ آیت میں تہمت لگانے والوں کے لئے تین باتوں کا ذکر ہوا۔ جن میں سے دو تو حکم ہیں۔ یعنی انہیں اسی کوڑے لگاؤ اور آئندہ ان کی کبھی شہادت قبول نہ کرو اور تیسری خبر ہے کہ ایسے لوگ بدکردار ہیں۔ اس آیت میں یہ ذکر ہے کہ جو لوگ اللہ کے حضور توبہ کرلیں انہیں پوری طرح اپنے گناہ کا احساس اور ندامت ہو اور آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کریں تو اب وہ عند اللہ اور عند الناس فاسق نہیں رہیں گے۔ البتہ پہلی دونوں دنیوی سزائیں انہیں بھگتنا ہی ہوں گی۔ تاہم بعض علماء کے نزدیک اپنی اصلاح اور توبہ کے بعد اسے مقبول الشہادت بھی قرار دیا جاسکتا ہے اور اس کی دلیل یہی ہے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جھوٹی تہمت لگانے والا کم از کم دو افراد پر تو ضرور تہمت لگاتا ہے یعنی ایک مرد اور ایک عورت پر اور اس تہمت کی لپیٹ میں زیادہ افراد بھی آسکتے ہیں۔ اب جو اسے حد لگے گی وہ ہر ایک کے لئے اسی (۸۰) کوڑے نہیں لگے گی بلکہ ایک ہی حد لگے گی۔

شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٦﴾
وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٧﴾ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ
تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٨﴾ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَا اِنْ كَانَ

کوئی نہ ہو تو ان میں سے ایسے شخص کی شہادت یوں ہو گی کہ وہ چار دفعہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دے کہ وہ سچا ہے۔(۶) اور پانچویں دفعہ یوں کہے گا کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت ہو(۷) اور اس عورت (جس پر الزام لگایا گیا ہے) سے سزا (حد) یوں ٹل سکتی ہے کہ وہ چار دفعہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دے کہ "وہ (خاوند) جھوٹا ہے "(۸) اور پانچویں دفعہ یوں کہے کہ "اگر مرد (اس کا خاوند) سچا ہو تو اس (مجھ) پر اللہ کا غضب نازل[۱۰] ہو"(۹)

[۱۰] آیت نمبر ۶ سے آیت نمبر ۹ تک کی وضاحت کے لئے درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیے:

ا۔ لعان کے متعلق احادیث:۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہلال بن امیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی (خولہ بنت عاصم) کو شریک بن سحماء سے متہم کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہلال سے فرمایا: ("چار) گواہ لاؤ ورنہ تمہاری پشت پر حد قذف پڑے گی" ہلال رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ہم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کو کسی سے بدکاری کرتے دیکھے تو کیا وہ گواہ ڈھونڈتا پھرے؟" (یہ تو بہت مشکل ہے) لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہی فرماتے رہے کہ گواہ لاؤ ورنہ حد پڑے گی" ہلال رضی اللہ عنہ کہنے لگے: "اس پروردگار کی قسم جس نے آپ کو سچائی کے ساتھ بھیجا ہے، میں سچا ہوں اور اللہ تعالیٰ ضرور میرے متعلق کوئی ایسا حکم نازل کریں گے جس سے میری پشت کو سزا سے بچا لیں گے" اس کے بعد جبریلؑ اترے اور ﴿ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ...... ﴾ سے لے کر ﴿مِنَ الصَّادِقِيْنَ﴾ تک آیت نازل ہوئیں۔ بعد ازاں آپ نے ہلال کی بیوی کو بلا بھیجا۔ (پہلے) ہلال نے لعان کی گواہیاں دیں۔ جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساتھ ساتھ فرما رہے تھے: "دیکھو تم میں سے ایک ضرور جھوٹا ہے اور جو جھوٹا ہے وہ توبہ کرتا ہے یا نہیں؟" ہلال کے بعد اس کی بیوی کھڑی ہوئی اس نے چار گواہیاں دے دیں جب پانچویں کا وقت آیا تو لوگوں نے اسے ٹھہرایا (اور سمجھایا) کہ "یہ پانچویں گواہی تمہیں عذاب میں مبتلا کر دے گی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ "یہ بات سن کر وہ عورت ذرا جھجکی اور رکی اور ہم سمجھے کہ وہ اقرار کر لے گی مگر وہ کہنے لگی کہ میں اپنی قوم کو تمام عمر کے لئے رسوا نہیں کر سکتی، پھر پانچویں گواہی بھی دے دی" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دیکھتے رہو، اگر اس عورت کا بچہ کالی آنکھوں، موٹے سرین اور موٹی پنڈلیوں والا پیدا ہوا تو وہ شریک بن سحماء کا نطفہ ہو گا۔ چنانچہ اس عورت کے ہاں اسی صورت کا بچہ پیدا ہوا اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر اللہ کا حکم (لعان) نازل نہ ہوا ہوتا تو میں اس عورت کو ٹھیک سزا دیتا (بخاری۔ کتاب التفسیر)

سہل بن سعد راوی ہیں کہ عویمر (بن حارث بن زید بن جد بن عجلان) عاصم بن عدی کے پاس آئے جو عویمر کے قبیلہ بنی عجلان کے سردار تھے۔ اور ان سے پوچھا کہ: اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کے ساتھ دیکھے تو تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟ اگر وہ اسے مار ڈالے تو تم لوگ بھی اس کو (قصاص میں) مار ڈالو گے۔ پھر وہ کیا کرے؟ عاصم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور یہ مسئلہ پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے سوالات کو برا سمجھا (اور خاموش رہے) پھر جب عویمر نے عاصم سے اپنے

مسئلہ کا جواب پوچھا تو کہنے لگے : میں تو ایسا مسئلہ رسول اللہ ﷺ سے کبھی نہ پوچھوں گا۔ آخر عویمر خود رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہا: "اللہ کے رسول! اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو غیر مرد کے ساتھ دیکھے تو کیا کرے اس کو مار ڈالے تو آپ اس کو (قصاص میں) مار ڈالیں گے۔ پھر آخر کیا کرے؟" آپ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے تیرے اور تیری بیوی کے باب میں قرآن (میں حکم) نازل کیا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے دونوں میاں بیوی کو لعان کرنے کا حکم دیا جیسا کہ قرآن میں حکم نازل ہوا تھا۔ عویمر نے اپنی بیوی سے لعان کرنے کے بعد کہا۔ "یا رسول اللہ! اگر اب میں اس عورت کو رکھوں تو میں ظالم ہوں" چنانچہ عویمر نے بیوی کو طلاق دے دی اور بعد میں ایسے لعان کرنے والوں میں یہی طریقہ جاری ہو گیا۔ لعان کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: دیکھتے رہو اس عورت کا جو بچہ پیدا ہو اگر وہ سانولا، کالی آنکھوں، اور بڑے سرین اور موٹی پنڈلیوں والا ہو تو میں سمجھوں گا کہ عویمر نے اپنی بیوی کے متعلق سچ کہا تھا۔ اور اگر بچہ گرگٹ کی طرح سرخ رنگ کا پیدا ہو تو میں سمجھوں گا کہ عویمر نے اپنی بیوی پر تہمت لگائی۔ پھر جب بچہ پیدا ہوا تو آپ ﷺ کی بتائی ہوئی علامات کے مطابق عویمر سچا نکلا۔ چنانچہ اس بچہ کا نسب اس کی ماں سے ملایا گیا۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر) یہ لعان مسجد میں ہوا اور میں وہاں موجود تھا (کتاب الصلوٰۃ۔ باب القضاء واللعان فی المسجد)

۳۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب عویمر اور اس کی بیوی میں لعان ہو چکا تو عویمر نے کہا کہ میں نے جو مہر کا روپیہ دیا تھا وہ کدھر جائے گا تو اسے یہ جواب دیا گیا کہ تمہارے لئے کوئی مال نہیں۔ اگر تم اپنے بیان میں سچے ہو تو بھی تم اپنی بیوی سے صحبت کرتے رہے اور اگر جھوٹے ہو تو پھر تو کسی صورت تم اس کے حقدار نہیں۔ (بخاری۔ کتاب الطلاق۔ باب صداق الملاعنة)

۞ احادیث سے ماخوذ لعان سے متعلق احکام:۔ ان احادیث سے اور بعض دوسری احادیث سے مندرجہ ذیل امور معلوم ہوتے ہیں۔

۱۔ اگر کوئی شخص کسی غیر عورت پر تہمت لگائے تو اس کا فیصلہ شہادتوں کی بنا پر ہوگا۔ اور اگر اپنی ہی بیوی پر الزام لگائے تو اس کا فیصلہ لعان کی صورت میں ہوگا جیسے ان آیات میں مذکور ہے۔

۲۔ قسم کھانے کے دوران قاضی فریقین کو اللہ سے ڈر کر صحیح بات کہنے کی تلقین کرتا رہے۔ اور اگر فریق اپنے دعویٰ سے رک جائے تو اس پر حد قذف لگے گی اور مرد کے قسمیں کھانے کے بعد عورت رک جائے تو ظاہر ہے کہ اس نے اپنے زنا کے جرم کا اعتراف کر لیا (حدیث نمبر ۱) اس صورت میں اسے رجم کیا جائے گا۔ اور آیت نمبر ۸ میں لفظ عذاب سے یہی سزا مراد ہے۔

۳۔ لعان تفریق زوجین کی سب سے سخت قسم ہے۔ جس کے بعد فریقین میں کبھی دوبارہ نکاح نہیں ہو سکتا۔

۴۔ لعان کے بعد مرد طلاق دے یا نہ دے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمیشہ کے لئے جدائی از خود واقع ہو جاتی ہے۔

۵۔ لعان کے بعد مرد عورت سے حق مہر یا دیگر اخراجات کی واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ (حدیث نمبر ۳)

۶۔ لعان کے بعد عدت کے دوران عورت کا نان و نفقہ یا سکنیٰ مرد کے ذمہ نہ ہوگا۔

۷۔ پیدا ہونے والا بچہ ماں کی طرف منسوب ہوگا۔ اسے متہم زانی کی طرف منسوب نہیں کیا جائے گا۔

۸۔ بچہ ماں کا وارث ہوگا۔ اور ماں بچہ کی۔ اور وضع حمل کے بعد اگر عورت مجرم ثابت ہو جائے تو بھی اسے سنگسار نہیں کیا جائے گا۔

مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٩﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ﴿١٠﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ
بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ۭ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ۭ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ

اور اگر تم پر (اے مسلمانو!) اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی (تو ایسا معاملہ تم پر سخت پیچیدہ بن جاتا) اور اللہ تعالیٰ بڑا التفات فرمانے والا[۱۱] اور حکیم ہے (جس نے معافی کا یہ قاعدہ مقرر کر دیا) (۱۰) جن لوگوں نے تہمت[۱۲] کی باتیں کیں وہ تم میں سے ایک ٹولہ ہے۔ اسے تم اپنے لئے برا نہ سمجھو بلکہ وہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ جس نے اس میں جتنا حصہ لیا[۱۳] اتنا ہی گناہ کمایا اور

[۱۱] لعان بہت سے پیچیدہ مسائل کا حل ہے:۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ لعان کا حکم نازل نہ فرماتے تو تم پر کئی قسم کی مشکلات پڑ سکتی تھیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص خود اپنی بیوی کو بدکاری میں مبتلا دیکھ لے تو کیا کرے؟ گواہ ڈھونڈنے جائے تو گواہوں کے آنے تک معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور اگر گواہوں کے بغیر بات کرے تو اس پر حد قذف پڑتی ہے۔ اگر خاموش ہو رہے تو خاموشی دوسروں کے حق میں تو اختیار کی جا سکتی ہے مگر اپنی بیوی کے حق میں یہ کڑوا گھونٹ کیسے پی سکتا ہے؟ اگر بیوی کو غصہ میں آ کر قتل کر دے تو خود قصاص میں مارا جاتا ہے۔ اور اگر طلاق دے دے تو اس میں اس کا اپنا نقصان بھی ہے اور بیوی کو یا اس کے آشنا کو کوئی بدنی یا اخلاقی سزا بھی نہیں ملتی۔ بلکہ یہ طلاق شائد ان دونوں زانی اور زانیہ کے حق میں خوشی کا باعث ثابت ہو۔ اور اگر بالفرض محال کڑوا گھونٹ پی کر صبر کر ہی جاتا ہے تو ایک ناجائز بچے کی پرورش کا بار اس کے گلے میں آ پڑتا ہے جو بعد میں اس کا وارث بھی ہو گا۔ یہ اور ایسی ہی اور کئی مشکلات تھیں جن کا تمہارے پاس کوئی حل نہ تھا۔ اللہ نے لعان کا حکم نازل فرما کر ان تمام پیچیدگیوں کو حل کر دیا۔ پھر لعان کے اس قانون میں فریقین کو یکساں سطح پر رکھا گیا ہے۔ اس لئے یہ حقیقت ہے کہ قسمیں کھانے کے باوجود ان دونوں میں سے ایک نہ ایک ضرور سچا اور دوسرا جھوٹا ہوتا ہے۔ اور یہی باتیں اللہ تعالیٰ کے حکیم ہونے کی زبردست دلیل ہیں۔

[۱۲] یہاں آیت نمبر ۱۱ سے لے کر آیت نمبر ۲۰ تک افک کے واقعہ سے متعلق دس آیات مذکور ہیں۔ جو اس سورت کا شان نزول بنیں۔ ابتدا میں تہمت، قذف زنا کے احکام اور سزا بتانے کے بعد اس واقعہ کا آغاز اور اس پر تبصرہ ہے۔ اس کی ابتدا ہی ان الفاظ سے کی گئی ﴿وَالَّذِيْنَ جَاءُوْا بِالْاِفْكِ﴾ یعنی یہ جو کچھ افواہیں پھیلیں اور قصے گھڑے گئے۔ سراسر جھوٹ اور بہتان ہے جس میں حقیقت کا شائبہ تک نہیں۔

[۱۳] واقعہ افک میں ملوث ہونے والے مسلمان اور ان پر حد قذف:۔ یہ کون لوگ تھے۔ یہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کی زبانی سنئے:

۱۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس آیت میں ﴿وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ﴾ سے مراد عبداللہ بن ابی ابن سلول (رئیس المنافقین) ہے۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

۲۔ سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس طوفان کا چرچا (مسلمانوں میں سے) دو مرد کرنے والے تھے۔ مسطح بن اثاثہ، اور حسان بن ثابت اور تیسرا عبداللہ بن ابی بن سلول منافق تھا جو کرید کرید کر پوچھتا' پھر اس پر حاشیے چڑھاتا۔ وہی اس طوفان کا بانی مبانی تھا اور ﴿وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ﴾ سے وہ اور حمنہ بنت جحش مراد ہیں" (عبداللہ بن ابی منافق کے علاوہ تینوں پر حد قذف لگی تھی) (بخاری۔ کتاب التفسیر)

۳۔ مسروق سے روایت ہے کہ حسان بن ثابت (مشہور شاعر) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں گئے اور یہ شعر سنایا:

حصان رزان ماتزن بريبة ...... و تصبح غرثیٰ من لحوم الغوافل

اِلَّا ثْمِ ۚ وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۱﴾ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ

ان میں سے جو شخص اس تہمت کے بڑے حصہ کا[۱۴] ذمہ دار بنا اس کے لئے عذاب عظیم ہے۔(۱۱) جب تم نے یہ قصہ سنا[۱۵] تھا تو مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے دل میں

(سیدہ عائشہ) پاکدامن، عقلمند اور ہر شک و شبہ سے بالا ہیں۔ وہ بھولی بھالی معصوم عورتوں کا گوشت کھانے (ان پر تہمت لگانے یا ان کا گلہ کرنے) سے بھوکی ہی رہتی ہیں۔ یہ شعر سن کر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: مگر (حسان) تم تو ایسے نہیں۔ میں (مسروق) نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا۔ "آپ ایسے شخص کو کیوں آنے دیتی ہیں جس کے حق میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری ﴿وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَهٗ﴾...... الآیہ" سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اسے اندھے پن سے زیادہ اور کیا عذاب ہوگا (سیدنا حسان آخری عمر میں اندھے ہو گئے تھے) پھر یہ بھی کہا: کہ حسان رسول اللہ ﷺ کی طرف سے (کافروں کو ان کی ہجو کا) جواب دیتے تھے۔" (بخاری۔ کتاب التفسیر)

نیز عبدالرحمٰن بن عوف فرماتے ہیں کہ سیدنا حسان بن ثابت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے گواہی چاہتے تھے۔ کہتے تھے: "ابو ہریرہ! تمہیں اللہ کی قسم! کیا تم نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے نہیں سنا: "حسان! تو اللہ کے رسول کی طرف سے کافروں کو جواب دے۔ یا اللہ! روح القدس سے حسان کی مدد کر" ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: "ہاں" (بخاری۔ کتاب الصلوٰۃ باب الشعر فی المسجد)

[۱۴] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول مندرجہ بالا احادیث سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اس فتنہ کا بانی مبانی عبداللہ بن ابی منافق تھا۔ اتفاق کی بات کہ اس غزوہ بنی مصطلق میں جتنے زیادہ منافق شامل ہوئے تھے دوسرے کسی غزوہ میں شامل نہ ہوئے تھے۔ انہی لوگوں نے ہی اس بہتان کا بھرپور پروپیگنڈہ کیا تھا۔ جس سے کئی سادہ لوح مخلص مسلمان بھی متاثر ہو گئے تھے۔ متاثر ہونے والے مسلمانوں کے نام جو کتب احادیث و سیر میں ملتے ہیں اور وہ تھے سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ، مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ اور ام المومنین زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی بہن حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا یعنی روایت کے مطابق ان تینوں کو قذف کی حد بھی لگی تھی۔ لیکن منافقوں میں سے عبداللہ بن ابی کے سوا کسی کا نام کتب تاریخ و سیر میں نہیں ملتا۔ نہ ہی منافقوں میں سے کسی کو حد لگی تھی۔ ان کا معاملہ بس اللہ کے سپرد تھا۔

واقعہ افک میں عبداللہ بن ابی کا کردار: جب یہ فتنہ گھڑا گیا تو منافق خوش ہو کر اور خوب مزے لے کر ان واہیات باتوں کا تذکرہ کرتے تھے بعض اظہار افسوس کے طور پر، بعض بات چھیڑ دیتے اور خود چپکے سے سنا کرتے، اور مسلمان یہ باتیں سن کر بعض تردد میں پڑ جاتے، بعض خاموش رہتے اور بہت سے یہ باتیں سن کر جھٹلا دیتے۔ اور اس قصہ کا بڑا بوجھ اٹھانے والے اور بانی عبداللہ کا یہ حال تھا کہ لوگوں کو جمع کرتا اور ابھارتا اور نہایت چالاکی سے اپنا دامن بچا کر دوسروں سے اس کی اشاعت کرایا کرتا تھا۔ اس آیت میں بتایا یہ جا رہا ہے کہ اس قصہ میں کسی نے جتنا حصہ لیا اسی کے مطابق اسے عذاب عظیم ہوگا۔

ان حالات میں عام انسانی سوچ کے مطابق چاہئے تو تھا کہ اللہ تعالیٰ منافقوں کی اس اخلاقی گراوٹ پر غضب ناک گرفت فرماتے یا مسلمانوں کو جوابی حملے سے اکساتے مگر اللہ تعالیٰ جو سب سے بڑھ کر علیم اور حکیم ہیں نے یہ انداز اختیار فرمایا کہ تمام تر توجہ مسلمانوں کو یہ تعلیم دینے پر صرف فرمائی کہ تمہارے اخلاقی محاذ میں جہاں رخنے موجود ہیں ان کو بھر کر اس اخلاقی محاذ کو اور بھی زیادہ مضبوط بنانا چاہئے۔ اسی لئے اس سورہ میں بہت سے ستر و حجاب کے احکام نازل ہوئے جو آگے آرہے ہیں۔

[۱۵] اس واقعہ افک کی پوری روئیداد خود سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی زبانی سنئے۔

۞ واقعہ افک سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی زبانی:۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے (خود اپنا واقعہ افک یوں) بیان کیا کہ آپ ﷺ کی عادت تھی کہ جب آپ سفر پر جاتے تو اپنی بیویوں کے نام قرعہ ڈالتے۔ قرعہ میں جس بی بی کے نام قرعہ نکلتا اسے آپ ساتھ لے جاتے۔ چنانچہ آپ نے ایک غزوہ (بنی مصطلق) میں قرعہ ڈالا جو میرے نام نکلا۔ پس میں آپ کے ساتھ روانہ ہو گئی اور یہ واقعہ حجاب کا حکم نازل ہونے کے بعد کا ہے۔ میں ایک ہودے میں سوار رہتی اور جب اترتی تو ہودہ سمیت اتاری جاتی۔ ہم اس طرح سفر کرتے رہے جب آپ ﷺ اس غزوہ سے فارغ ہوئے اور سفر سے لوٹے تو ہم لوگ مدینہ کے نزدیک آن پہنچے۔ ایک رات کوچ کا حکم ہوا یہ حکم سن کر اٹھی اور پیدل چل کر لشکر سے پار نکل گئی۔ جب حاجت سے فارغ ہوئی تو لشکر کی طرف آنے لگی تو مجھے معلوم ہوا کہ ظفار کے نگینوں کا ہار (جو میرے گلے میں تھا) ٹوٹ کر گر گیا۔ میں اسے ڈھونڈنے لگی اور اسے ڈھونڈنے میں دیر لگ گئی۔ اتنے میں وہ لوگ جو میرا ہودہ اٹھا کر اونٹ پر لادا کرتے تھے انہوں نے ہودہ اٹھایا اور میرے اونٹ پر لاد دیا۔ وہ یہ سمجھے رہے کہ میں ہودہ میں موجود ہوں۔ کیونکہ اس زمانہ میں عورتیں ہلکی پھلکی ہوتی تھیں۔ پُر گوشت اور بھاری بھر کم نہ ہوتی تھیں۔ اور تھوڑا سا کھانا کھایا کرتی تھیں۔ لہٰذا ان لوگوں نے جب ہودہ اٹھایا تو اس کے ہلکے پن کا کوئی خیال نہ آیا۔ علاوہ ازیں میں ان دنوں ایک کمسن لڑکی تھی۔ خیر وہ ہودہ اونٹ پر لاد کر چل دیئے۔

لشکر کے روانہ ہونے کے بعد میرا ہار (جو اونٹ کے نیچے آ گیا تھا) مجھے مل گیا میں اسی ٹھکانے کی طرف چلی گئی۔ جہاں رات کو اترے تھے۔ دیکھا تو وہاں نہ کوئی پکارنے والا ہے اور نہ جواب دینے والا (سب جا چکے ہیں) میں نے ارادہ کیا کہ اپنے ٹھکانے پر چلی جاؤں۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ جب وہ لوگ مجھے نہ پائیں گے تو اسی جگہ تلاش کرنے آئیں گے۔ میں وہاں بیٹھی رہی۔ نیند نے غلبہ کیا اور میں سو گئی۔ لشکر کے پیچھے پیچھے (گرے پڑے کی خبر رکھنے کے لئے) صفوان بن معطل سُلَمی مقرر تھے۔ وہ پچھلی رات چلے اور صبح میرے ٹھکانے کے قریب پہنچے اور دور سے کسی انسان کو سوتے ہوئے دیکھا پھر میرے قریب آئے تو مجھے پہچان لیا۔ کیونکہ حجاب کا حکم نازل ہونے سے پہلے انہوں نے مجھے دیکھا تھا۔ جب انہوں نے مجھے پہچان کر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا تو میں بیدار ہو گئی اور اپنی چادر سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ اللہ کی قسم انہوں نے نہ مجھ سے کوئی بات کی اور نہ ہی میں نے انا للہ وانا الیہ راجعون کے سوا کوئی بات سنی۔ انہوں نے اپنی سواری بٹھائی اور اس کا پاؤں اپنے ہاتھ سے دبائے رکھا تو میں اس پر سوار ہو گئی۔ وہ پیدل چلتے رہے اور اونٹنی کو چلاتے رہے تا آنکہ ہم لشکر سے اس وقت جا ملے جب وہ عین دوپہر کو گرمی کی شدت کی وجہ سے اترے ہوئے تھے۔ اور جن لوگوں کی قسمت میں تباہی لکھی تھی وہ تباہ ہوئے اس تہمت کو سب زیادہ پھیلانے والا عبداللہ بن ابی بن سلول (رئیس المنافقین) تھا۔ خیر ہم لوگ مدینہ پہنچے وہاں پہنچ کر میں بیمار ہو گئی اور ایک مہینہ بھر بیمار رہی۔ لوگ تہمت لگانے والوں کی باتوں کا چرچا کرتے رہے اور مجھے خبر تک نہ ہوئی۔ البتہ ایک بات سے مجھے وہم سا پیدا ہوا۔ وہ یہ تھی کہ آپ کی وہ مہربانی جو بیماری کی حالت میں مجھ پر ہوا کرتی تھی وہ اس بیماری میں نہیں پائی تھی۔ آپ تشریف لاتے، سلام علیک کہتے پھر یہ پوچھ کر کہ (اب طبیعت) کیسی ہے چل دیتے۔ اس بات سے مجھے کچھ شک تو پڑتا مگر کسی بات کی خبر نہ تھی۔

۞ گھروں سے باہر قضائے حاجت کی جگہیں:۔ بیماری سے کچھ افاقہ ہوا اور ابھی کمزور ہی تھی کہ مناصع کی طرف گئی۔ مسطح کی ماں (سلمٰی) میرے ساتھ تھی۔ ہم لوگ ہر رات کو وہاں رفع حاجت کے لئے جایا کرتے تھے۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب اپنے گھروں کے نزدیک ہم بیت الخلاء نہیں بناتے تھے بلکہ اگلے زمانہ کے عربوں کی طرح رفع حاجت کے لئے جنگل جایا

کرتے۔ کیونکہ گھروں کے قریب بیت الخلاء بنانے سے ان کی بدبو ہمیں تکلیف دیتی۔ خیر میں اور مسطح کی ماں جو ابورہم بن عبد مناف کی بیٹی اور اس کی ماں صخر بن عامر کی بیٹی، ابوبکر صدیق کی خالہ تھی۔ اسی کا بیٹا مسطح تھا۔ رفع حاجت سے فراغت کے بعد ہم دونوں گھر کو آرہی تھیں کہ مسطح کی ماں کا پاؤں چادر میں الجھ کر پھسلا تو کہنے لگی: "مسطح ہلاک ہو، میں نے اسے کہا": کیا بکتی ہو، کیا تم ایسے شخص کو کوستی ہو جو بدر میں شریک تھا؟" وہ کہنے لگی: "اے بھولی لڑکی، کیا تم نے وہ کچھ بھی سنا جو وہ کہتا ہے؟" پوچھا "کیا کہتا ہے؟ تب اس نے تہمت لگانے والوں کی باتیں مجھ سے بیان کیں تو میری بیماری میں مزید اضافہ ہوگیا۔ جب میں گھر پہنچی۔ تو رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور سلام کر کے پوچھا، اب کیسی ہے؟ میں نے کہا: آپ مجھے اجازت دیجئے میں اپنے والدین کے ہاں جانا چاہتی ہوں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ ان سے اس خبر کی تحقیق کروں۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اجازت دے دی تو میں اپنے والدین کے ہاں آگئی۔ میں نے اپنی ماں سے کہا۔ امی! یہ لوگ (میری نسبت) کیا بک رہے ہیں؟" اس نے کہا: "بیٹی اتنا رنج نہ کرو۔ اللہ کی قسم! اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی مرد کے پاس کوئی خوبصورت عورت ہوتی ہے اور وہ اس سے محبت کرتا ہے اور اس کی سوکنیں بھی ہوں تو سوکنیں بہت کچھ کرتی رہتی ہیں" میں نے کہا": سبحان اللہ! لوگوں نے اس کا چرچا بھی کر دیا۔ چنانچہ میں یہ ساری رات روتی رہی۔ صبح ہوگئی۔ مگر نہ میرے آنسو تھمتے تھے اور نہ مجھے نیند آتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو بلایا کیونکہ وحی اترنے میں دیر ہو رہی تھی اور آپ ﷺ اس سلسلہ میں ان سے مشورہ چاہتے تھے۔ چنانچہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو وہی مشورہ دیا جو وہ جانتے تھے کہ عائشہ ایسی ناپاک باتوں سے پاک ہے اور اسامہ رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ کی بیویوں سے محبت تھی انہوں نے صاف کہہ دیا کہ عائشہ پاکدامن اور بے قصور ہیں۔ اور سیدنا علی بن ابی طالب نے کہا: "یارسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ آپ ﷺ پر تنگی نہیں کرے گا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ اور بھی بہت عورتیں ہیں اور اگر آپ بریرہ رضی اللہ عنہا سے پوچھیں تو وہ آپ ٹھیک بتادے گی" چنانچہ آپ نے بریرہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور اس سے پوچھا: کیا تم نے کوئی ایسی بات بھی دیکھی ہے کہ عائشہ کے متعلق تمہیں کچھ شک ہو؟" بریرہ رضی اللہ عنہا کہنے لگیں: "اللہ کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا میں نے ایسی کوئی بات نہیں دیکھی۔ ہاں میں اس میں ایک بات دیکھتی ہوں اور اس سے چشم پوشی کر جاتی ہوں اور وہ یہ کہ وہ ابھی کم سن بچی ہے۔ آٹا گندھا پڑا چھوڑ کر سو جاتی ہے اور بکری آکر آٹا کھا جاتی ہے"

(ان شہادتوں کے بعد) نبی صلی اللہ علیہ وسلم (خطبہ کے لئے) کھڑے ہوئے۔ عبداللہ بن ابی بن سلول کے خلاف آپ نے مدد چاہی۔ فرمایا۔ مسلمانو! اس شخص کے مقابل کوئی میری حمایت کرتا ہے۔ جس نے میرے اہل خانہ کے بارے میں مجھے دکھ پہنچایا؟ میں نے تو اپنے اہل خانہ میں بھلائی ہی دیکھی ہے اور جس شخص سے یہ لوگ متہم کرتے ہیں اس میں بھی میں نے بھلائی ہی دیکھی ہے۔ وہ میرے گھر کبھی اکیلا نہیں آتا بلکہ میرے ساتھ ہی آتا ہے۔ یہ سن کر سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ (اوس قبیلہ کے سردار) کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: "میں اس کے مقابل آپ کی مدد کرتا ہوں۔ اگر یہ اوس قبیلے کا ہے تو بھی اس کی گردن اڑا دیتا ہوں۔ اور اگر ہمارے بھائیوں خزرج قبیلے کا ہے تو آپ جو حکم دیں گے بجالائیں گے" یہ بات سن کر سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ جو خزرج قبیلے کے سردار تھے کھڑے ہوئے۔ وہ ایک نیک بخت آدمی تھے مگر قومی حمیت نے آدبوچا تو کہنے لگے: سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ! اللہ کی قسم تو جھوٹ کہتا ہے تو نہ اسے مارے گا نہ مار سکے گا۔ اتنے میں اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ جو سعد بن

معاذ رضی اللہ عنہ کے چچازاد بھائی تھے۔ کھڑے ہو کر سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے: "اللہ کی قسم! تو جھوٹا ہے ہم ضرور اسے قتل کریں گے۔ کیا تو بھی منافق ہو گیا ہے جو منافقوں کی طرفداری کرتا ہے؟ اس پر دونوں قبیلوں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور قریب تھا کہ آپس میں لڑ پڑیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابھی منبر پر ہی تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں سمجھاتے اور تھماتے رہے جب وہ خاموش ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی خاموش ہو گئے۔

میرا وہ دن بھی رونے دھونے میں گزرا اور میں مسلسل دو دن سے رو رہی تھی۔ نہ میرے آنسو تھمتے تھے اور نہ نیند آتی۔ میرے والدین سمجھے کہ رو رو کر میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ پھر ایسا ہوا کہ میرے والدین پاس بیٹھے تھے اور میں رو رہی تھی کہ ایک انصاری عورت نے اندر آنے کی اجازت مانگی میں نے اجازت دی تو وہ بھی میرے ساتھ بیٹھ کر رونے لگی۔ اسی حالات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے سلام کیا۔ پھر بیٹھ گئے۔ اس سے پہلے جب سے مجھ پر تہمت لگی تھی آپ میرے پاس نہیں بیٹھے تھے۔ ایک مہینہ بھر آپ انتظار کرتے رہے مگر وحی نہ آئی۔ آپ نے بیٹھ کر تشہد پڑھا۔ پھر فرمایا: "عائشہ! مجھ کو تیری نسبت ایسی ایسی خبر آئی ہے۔ اگر تو پاک ہے تو اللہ تیری بریت فرمائے گا اور اگر واقعی تجھ سے کوئی قصور ہو گیا ہے تو اللہ سے اپنے قصور کی معافی مانگ اور توبہ کر۔ جب بندہ گناہ کا اقرار کرتا ہے پھر اللہ کے حضور توبہ کرتا ہے تو اللہ ان کے گناہ بخش دیتا ہے" جب آپ یہ گفتگو ختم کر چکے تو یکبارگی میرے آنسو تھم گئے یہاں تک کہ ایک قطرہ بھی میری آنکھوں میں نہ رہا۔ میں نے اپنے والد سے کہا کہ وہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب دیں" وہ کہنے لگے! "اللہ کی قسم! میں نہیں جانتا کہ کیا جواب دوں" پھر میں نے اپنی والدہ (ام رومان) سے کہا کہ تم جواب دو اس نے کہہ دیا کہ "میں نہیں جانتی کہ کیا جواب دوں" آخر میں خود ہی جواب دینے لگے۔ میں ایک کمزور لڑکی تھی۔ قرآن مجھ کو زیادہ یاد نہ تھا۔ میں نے کہا: "اللہ کی قسم! میں جانتی ہوں کہ یہ بات جو آپ لوگوں نے سنی ہے آپ کے دل میں جم گئی ہے اور آپ اسے سچ سمجھنے لگے ہیں۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ میں پاک ہوں اور اللہ خوب جانتا ہے کہ میں پاک ہوں تو بھی آپ لوگ مجھے سچا نہیں سمجھیں گے۔ اور اگر میں گناہ کا اقرار کر لوں اور اللہ جانتا ہے کہ میں اس سے پاک ہوں تو آپ لوگ مجھے سچا سمجھیں گے۔ اللہ کی قسم! میں اپنی اور تمہاری مثال ایسی ہی سمجھتی ہوں جیسے سیدنا یوسف علیہ السلام کے والد کی تھی۔ انہوں نے جو کچھ کہا تھا میں بھی وہی کچھ کہتی ہوں کہ "اب صبر کرنا ہی بہتر ہے اور تمہاری باتوں پر اللہ میری مدد کرنے والا ہے"

یہ کہہ کر میں نے کروٹ بدلی۔ مجھے یہ یقین تھا کہ چونکہ میں پاک ہوں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ضرور میری بریت کر دے گا۔ مگر اللہ کی قسم مجھے یہ خیال تک نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ میرے بارے میں ایسی آیات نازل کرے گا جو ہمیشہ پڑھی جائیں گی میں اپنی شان اس سے بہت کمتر سمجھتی تھی۔ ہاں مجھے یہ امید ضرور تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی خواب دیکھیں گے جس سے آپ پر میری بریت واضح ہو جائے گی۔ پھر اللہ کی قسم! ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے ہلے بھی نہ تھے اور نہ ہی کوئی دوسرا آدمی وہاں سے باہر گیا کہ آپ پر وحی نازل ہونا شروع ہو گئی۔ معمول کے موافق آپ پر سختی ہونے لگی اور پسینہ موتیوں کی طرح آپ کے بدن سے ٹپکنے لگا حالانکہ وہ دن سردی کا دن تھا۔ مگر وحی اترنے میں ایسی ہی سختی ہوتی تھی۔ جب وحی ختم ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم خوش تھے اور ہنس رہے تھے۔ پھر پہلی بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی کی: "عائشہ! اللہ تعالیٰ نے تمہاری بریت فرما دی" میری والدہ مجھے کہنے لگی: اٹھو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شکریہ ادا کرو۔ میں نے کہا۔ "اللہ کی قسم میں نہیں اٹھوں گی۔ میں تو صرف اللہ

عزوجل کا شکریہ ادا کروں گی" اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں اتاریں۔ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ جَاءُ وْ بِالْاِفْكِ............﴾ پوری دس آیات۔ جب یہ آیات اتریں تو ابو بکرؓ نے، جو محتاجی اور رشتہ کی وجہ سے مسطح کی مدد کیا کرتے تھے، کہا: اللہ کی قسم! "آئندہ میں مسطح کو کچھ نہیں دیا کروں گا جبکہ اس نے عائشہ کے متعلق ایسی باتیں کیں" تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ﴿وَلَا یَاْتَلِ اُوْلُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ ...... غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ یہ آیت سن کر ابو بکرؓ کہنے لگے: اللہ کی قسم! مجھے یہ پسند ہے کہ اللہ مجھے بخش دے۔ پھر وہ مسطح سے پہلا سا سلوک کرنے لگے اور کہا: "اللہ کی قسم! جب تک مسطح زندہ رہا میں یہ معمول بند نہ کروں گا"

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ: (اس تہمت کے زمانہ میں) آپ ﷺ زینب بن جحش (ام المومنین) سے میرا حال پوچھتے کہ "تم عائشہ کو کیسی سمجھتی ہو اور تم نے کیا دیکھا ہے؟" تو انہوں نے کہا: "یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنے کان اور آنکھ کی خوب احتیاط رکھتی ہوں، میں تو عائشہ رضی اللہ عنہا کو اچھا ہی سمجھتی ہوں" آپ ﷺ کی بیویوں میں سے زینب ہی میرے برابر کی تھیں۔ بڑھ چڑھ کر رہنا چاہتی تھیں۔ اللہ نے ان کی پرہیزگاری کی وجہ سے انہیں بچا لیا اور ان کی بہن حمنہ بنت جحش اپنی بہن سے اس بارے میں جھگڑنے لگی تو جیسے دوسرے تہمت لگانے والے تباہ ہوئے وہ بھی تباہ ہوئی۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

اس مفصل حدیث کی رو سے مسلمانوں کی مضبوط اخلاقی حالت کا درج ذیل امور سے پتہ چلتا ہے:

۱۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس واقعہ کو ایک بہتان ہی سمجھتے تھے۔ وہ صرف اپنی زوجہ محترمہ کو ہی نہیں، صفوان بن معطل کو بھی ایک پاکباز انسان سمجھتے تھے۔

۲۔ اس قصہ کا براہ راست صدمہ آپ ﷺ کی ذات کو پہنچتا تھا۔ اور آپ ﷺ کے ایک ادنیٰ سے اشارے سے بہتان تراشوں کا صفایا بھی کیا جا سکتا تھا۔ مگر جب قومی اور قبائلی عصبیت کی بنا پر اس میں جھگڑا شروع ہوا تو آپ ﷺ نے یہ صدمہ جانکاہ خود اپنی ذات پر برداشت کر لیا۔ مگر مسلمانوں میں جھگڑا نہ ہونے دیا۔

۳۔ آپ اس سلسلہ میں پورا مہینہ بے تاب و بے قرار رہے اس لئے کہ یقینی علم یا علم غیب آپ ﷺ کو حاصل نہ تھا۔ ورنہ آپ دوسروں سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کوئی استفسار نہ فرماتے۔ اور شاید اس تاخیر میں یہ مصلحت بھی پوشیدہ ہو کہ بعد میں آنے والے لوگوں میں کچھ لوگ آپ کو عالم الغیب نہ سمجھنے لگیں یا ثابت نہ کرنے لگیں۔

۴۔ اپنے یقین کامل کے باوجود آپ نے اس واقعہ کی حتمی تردید اس لئے نہ فرمائی کہ ایک شوہر کی اپنی بیوی کے لئے تردید مخالفین کی نظروں میں کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

۵۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے والدین بھی ذاتی طور پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو پاکباز سمجھتے تھے۔ جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی والدہ ام رومان کے جواب سے واضح ہوتا ہے۔ تاہم وہ بھی حتمی تردید اس لئے نہ کر سکتے تھے یا پاکبازی کا بیان اس لئے نہ دے سکتے تھے کہ والدین کا اپنی بیٹی کے حق میں پاکیزگی کا بیان مخالفین کا منہ بند نہیں کر سکتا۔

۶۔ آپ ﷺ نے اس سلسلہ میں سیدنا اسامہ بن زید، سیدہ بریرہ اور ام المومنین سیدہ زینب بنت جحش سے استفسار فرمایا اور یہ سب آپ کے گھر کے افراد تھے۔ سب نے پرزور الفاظ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی پاکبازی کا بیان دیا۔ سیدہ زینب جو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی سوکن اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بیان کے مطابق ان کے مقابلہ کی چوٹ تھیں۔ انہوں نے بھی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا ذکر خیر ہی فرمایا۔ چوتھے گھر کے فرد سیدنا علیؓ تھے جن سے آپ نے استفسار فرمایا۔ انہوں نے

بِاَنۡفُسِهِمۡ خَيۡرًا ۙ وَّقَالُوۡا هٰذَاۤ اِفۡكٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۲﴾ لَوۡلَا جَآءُوۡ عَلَيۡهِ بِاَرۡبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذۡ لَمۡ يَاۡتُوۡا بِالشُّهَدَآءِ

اچھی بات کیوں نہ سوچی اور یوں[۱۶] کیوں نہ کہہ دیا کہ "یہ تو صریح بہتان ہے" (۱۲)

پھر یہ تہمت لگانے والے اس پر چار گواہ کیوں نہ لا سکے؟ پھر جب یہ گواہ نہیں[۱۷] لا سکے تو اللہ

اس الزام کی تردید یا سیدہ عائشہ کی پاکبازی بیان کرنے کے بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کبیدگی اور خوشنودی کا لحاظ رکھ کر جواب دیا۔ تاہم ان کی زبان سے بھی ایسا کوئی لفظ نہیں نکلا جس سے اس الزام کی تائید ہوتی ہو یا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ذات یا پاکبازی پر کوئی حرف آتا ہو۔

۷۔ ۞ واقعہ کے دوران عامۃ المسلمین کا بلند پایہ اخلاق:۔ عامۃ المسلمین کی بھی اخلاقی حالت اتنی مضبوط تھی کہ منافقوں کے پرزور پروپیگنڈہ کے باوجود تین افراد کے سوائے کوئی ان سے متاثر نہ ہو سکا ان میں سے بھی حمنہ بنت جحش اپنی بہن کی خاطر اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو نیچے دکھانے کی وجہ سے اس بہتان میں شامل ہو گئی تھیں۔

اور اس واقعہ میں مسلمانوں کے لئے خیر کے پہلو یہ تھے:

۱۔ اس واقعہ سے مسلمانوں کے ایمان کا امتحان ہو گیا اور منافقین چھٹ کر سامنے آ گئے۔ جو یہ چاہتے تھے کہ اس طرح مسلمانوں میں پھوٹ ڈال کر انہیں کمزور کر دیا جائے۔ لیکن نتیجہ اس کے برعکس نکلا اور مسلمانوں کا اخلاقی تفوق پہلے سے بھی زیادہ نمایاں ہو گیا۔

۲۔ جو افراد اس صدمہ سے جس قدر متاثر تھے اسی قدر وحی الٰہی ان کے لئے تسلی اور خوشی کا باعث ہوئی۔ جب وحی ختم ہوئی تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوشی کی وجہ سے ہنس رہے تھے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے والدین کی خوشی کا بھی یہ اثر تھا کہ انہوں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو آپ ﷺ کا شکریہ ادا کرنے کو کہا۔ اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی خوشی کی تو کچھ انتہا ہی نہ تھی جن کو یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ان کی بریت میں دس آیات نازل ہوں گی جو تا قیامت پڑھی جاتی رہیں گی اور آئندہ کے لئے ان کا لقب ہی صدیقہ پڑ گیا۔

۳۔ مسلمانوں کو ایسی ہدایات و احکام دیئے گئے جن پر عمل پیرا ہونے سے وہ ایسے فتنہ خیز اور فتنہ پرور طوفانوں کا بخیر و بخوبی مقابلہ کر سکیں۔

[۱۶] جب اس بہتان کا عام چرچا ہونے لگا تو ایک دن سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی بیوی نے اپنے شوہر سے کہا: لوگ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں۔ سیدنا ایوب رضی اللہ عنہ کہنے لگے: "لوگ بکواس کرتے ہیں۔ تم خود ہی بتاؤ کہ تم ایسا کام کر سکتی ہو؟ وہ کہنے لگی: "ہرگز نہیں" وہ کہنے لگے: پھر (صدیق کی بیٹی اور نبی کی بیوی) عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا تجھ سے بڑھ کر پاک صاف اور طاہر و مطہر ہیں۔ ان کی نسبت ایسا بے وجہ گمان کیوں کیا جائے۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر صفوان کی جگہ میں خود ہوتا تو ایسا خیال تک نہ کر سکتا تھا اور صفوان تو مجھ سے بہتر مسلمان ہے" اور مسلمانوں کی اکثریت کی فکر کا انداز یہی تھا۔

[۱۷] ۞ واقعہ افک کا قانونی پہلو:۔ یہ اس واقعہ کا قانونی پہلو ہے کہ ایسی شہادتیں جو بدکاری پر دلالت کرتی ہوں وہ کبھی میسر آ بھی نہ سکتیں تھی۔ کیونکہ قرائن سب کے سب خلاف تھے۔ واقعہ یہ تھا کہ پیچھے رہ جانے والی کوئی عام عورت نہ تھی بلکہ تمام مسلمانوں کی ماں ہے اور پیچھے سے آنے والا بھی پکا مسلمان ہے جو انہیں فی الواقع اپنی ماں ہی سمجھتا ہے۔ ماں اس سے پردہ بھی کر لیتی ہے اور وہ آپس میں نہ اس وقت ہمکلام ہوتے ہیں اور نہ پورے دوران سفر۔ اور یہ سفر صبح سے لے کر دوپہر تک دن دیہاڑے ہو رہا ہے۔ عورت اونٹ پر سوار ہے اور مرد خاموش آگے آگے چل رہا ہے۔ تا آنکہ وہ مسلمانوں کے لشکر سے جا ملتا

فَأُولَٰٓئِكَ عِندَ ٱللَّهِ هُمُ ٱلْكَٰذِبُونَ ﴿١٣﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُۥ فِى ٱلدُّنْيَا وَٱلْءَاخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِى
مَآ أَفَضْتُمْ فِيهِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٤﴾ إِذْ تَلَقَّوْنَهُۥ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُم مَّا لَيْسَ لَكُم بِهِۦ
عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهُۥ هَيِّنًا وَهُوَ عِندَ ٱللَّهِ عَظِيمٌ ﴿١٥﴾ وَلَوْلَآ إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُم مَّا يَكُونُ لَنَآ أَن نَّتَكَلَّمَ
بِهَٰذَا سُبْحَٰنَكَ هَٰذَا بُهْتَٰنٌ عَظِيمٌ ﴿١٦﴾ يَعِظُكُمُ ٱللَّهُ أَن تَعُودُوا۟ لِمِثْلِهِۦٓ أَبَدًا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٧﴾

کے ہاں یہی جھوٹے ہیں۔(۱۳) اور اگر تم پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور اس کی رحمت [۱۸] نہ ہوتی تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے اس کی پاداش میں تمہیں بہت بڑا عذاب آلیتا۔(۱۴) جب تم اپنی زبانوں سے اس کا ایک دوسرے سے ذکر کرتے تھے اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہہ رہے تھے جس کے متعلق تمہیں کچھ علم نہ تھا اور تم اسے معمولی بات سمجھ رہے تھے، حالانکہ وہ اللہ کے ہاں [۱۹] بہت بڑی بات تھی۔(۱۵) جب تم نے یہ قصہ سنا تھا تو تم نے یوں کیوں نہ [۲۰] کہہ دیا کہ: ''ہمیں یہ مناسب نہیں کہ ایسی بات کریں، سبحان اللہ! یہ تو بہت بڑا بہتان ہے'' (۱۶) اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو آئندہ کبھی ایسی [۲۱] حرکت نہ کرنا۔(۱۷)

ہے۔ ایسے حالات میں بدگمانی کی محرک صرف دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ گمان کرنے والا خود بدباطن اور خبیث ہو۔ جو ایسے حالات میں خود یہی کچھ سوچتا یا کرتا ہو اور اس طرح دوسرے سب لوگوں کو بھی اپنی ہی طرح سمجھتا ہو۔ اور دوسری یہ کہ وہ ایسے موقع کو غنیمت جان کر ازراہ دشمنی ایسی بکواس کرنے لگے اور منافقوں میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی تھیں۔

[۱۸] اللہ کا فضل اور رحمت یہ تھی کہ اس نے مسلمانوں کو بالعموم اور اپنے پیغمبر ﷺ کو بالخصوص ان حالات میں صبر و استقامت کی توفیق بخشی۔ ورنہ منافقوں نے جس طرح مسلمانوں پر یہ زبردست وار کیا تھا۔ اگر مسلمان بھی جوابی کارروائی پر اٹھ کھڑے ہوتے تو حالات کوئی سنگین صورت اختیار کر سکتے تھے۔

[۱۹] ۞ انسان کے جھوٹا ہونے کیلئے یہی کافی ہے کہ وہ سنی سنائی بات آگے بیان کردے:۔ محض سنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے آگے بیان کر دینا کبیرہ گناہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ کسی انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اسے آگے منتقل کر دے'' (مقدمہ صحیح مسلم)

[۲۰] ۞ بدظنی سے اجتناب اور حسنِ ظن کی تاکید:۔ اس آیت میں ایک بڑا قیمتی اخلاقی ضابطہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر ایک شخص کو دوسرے کے متعلق حسن ظن ہی رکھنا چاہئے۔ تاکہ اس کے خلاف بدظنی کی کوئی یقینی وجہ اس کے علم میں نہ آجائے۔ یہ اصول قطعاً غلط ہے کہ ہر ایک کو شکوک و شبہات کی نظر سے دیکھا جائے تا آنکہ اس کی امانت و دیانت کا کوئی یقینی ثبوت ہاتھ نہ آجائے۔ اور یہاں تو معاملہ اور بھی زیادہ سخت تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ پر محض بدظنی کی بنا پر بہتان لگانا پھر اسے ہوا دینا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ بلکہ اتنا سنگین جرم تھا کہ اس کی بنا پر تم پر عذاب نازل ہو سکتا تھا۔ یہ اللہ کی رحمت اور مہربانی ہی تھی کہ اس نے تمہیں ایسے عذاب سے محفوظ رکھا۔

[۲۱] یعنی آئندہ منافقوں کی ایسی معاندانہ چالوں سے ہوشیار اور چوکس رہنا چاہئے۔ نیز پیغمبر اسلام اور آپ ﷺ کے گھر

وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ⑱ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ

اللہ تمہیں واضح ہدایات دیتا ہے اور وہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔(۱۸) جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں میں بے حیائی [۲۲] کی اشاعت ہو ان کے لئے دنیا

والوں کی عظمت شان کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔

[۲۲] فحاشی کی مختلف صورتیں اور ان کی اشاعت :۔ فاحشة سے مراد ہر وہ کام جو انسان کی شہوانی خواہش میں تحریک پیدا کرنے کا سبب بن سکتا ہو۔ فحاشی کی اشاعت کی بہت سی صورتیں ہیں۔ پہلی اور سب سے اہم صورت وہی ہے جس کا اس صورت میں ذکر ہے۔ یعنی یہ کہ اگر کوئی شخص کسی پاک دامن عورت پر الزام لگا دے تو دوسرے لوگ بلا تحقیق اس بات کو آگے دوسروں سے بیان کرنا شروع کر دیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ زنا (جسے قرآن نے فاحشة مبينة کہا ہے) کے علاوہ شہوت رانی کی دوسری صورتیں اختیار کی جائیں۔ مثلاً مردوں کی مردوں سے خواہش پوری کرنا یعنی لواطت جس کی وجہ سے قوم لوط پر پتھروں کا عذاب نازل ہوا تھا اور ہماری شریعت میں لواطت کی سزا قتل ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ مرد حیوانات سے یہ غرض پوری کریں۔ اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ”اگر تم دیکھو کہ کوئی شخص حیوان پر جا پڑا ہے تو اس کو بھی اور اس حیوان کو بھی مار ڈالو“ (ترمذی۔ ابواب الحدود۔ باب ما جاء فيمن يقع على البهيمة)

چوتھی صورت یہ ہے کہ عورتیں عورتوں سے ہمبستری کریں۔ شریعت نے عورتوں کے لئے بھی ستر کے حدود مقرر کر دیئے ہیں۔ یعنی کوئی عورت کسی عورت کے سامنے بھی ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ کسی صورت میں نہیں کھول سکتی اور ہمارے ہاں جو یہ رواج ہے کہ عورتیں ایک دوسرے کے سامنے ننگے بدن ایک ساتھ نہا لیتی ہیں یہ بالکل خلاف شرع ہے اور عورتوں کا ننگے بدن ایک دوسرے سے چمٹنا اور بھی بری بات ہے۔ اس بات سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے منع کیا اور فرمایا ”کوئی عورت کسی دوسری عورت کے ساتھ نہ چمٹے“ (بخاری۔ کتاب النکاح۔ باب لاتبا شر المرأة المرأة فتنعتها لزوجها)

اس حدیث کے الفاظ سے چپٹی لگانا بھی مراد لیا جا سکتا ہے (یعنی عورت کا عورت کے ساتھ لگ کر جنسی خواہش پوری کرنا) کیونکہ عربی زبان میں مجامعت کے لئے مباشرت کا لفظ بھی عام استعمال ہوتا ہے۔

پانچویں صورت یہ ہے کہ عورتیں بعض حیوانات سے اپنی جنسی خواہش پوری کریں جیسا کہ بنگلوں میں رہنے والی بعض مہذب خواتین اپنے پالتو کتوں سے بدفعلی کرواتی ہیں اس کا حکم بھی تیسری صورت پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

چھٹی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے دوستوں سے اپنی بیوی سے ہمبستری کی باتیں دلچسپی لے لے کر بیان کرے یا کوئی عورت اپنی سہیلیوں سے ایسے ہی تذکرے کرے۔ یا کوئی عورت ننگے بدن دوسری ننگی عورت سے چمٹے پھر اس بات کا تذکرہ اپنے خاوند سے کرے اور اس عورت کے مقامات ستر سے اسے آگاہ کرے تاکہ اس کے شہوانی جذبات بیدار ہوں اور اس کا خاوند اس کی طرف مائل ہو۔ ایسی تمام باتوں سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ (بخاری۔ کتاب النکاح۔ باب لاتباشر المرأة المرأة فتنعتها لزوجها)

اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۱۹ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ
عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۰ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ وَمَنْ ع ۲ ۸ النصف
يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ

میں بھی دردناک عذاب ہے اور آخرت میں بھی۔ اور (اس کے نتائج کو) اللہ ہی بہتر جانتا ہے تم نہیں جانتے۔[۲۳] (۱۹) اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت شامل حال نہ ہوتی (تو اس کے برے نتائج تمہارے سامنے آجاتے) اور اللہ تعالیٰ یقیناً بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ (۲۰)

اے ایمان والو! شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ اور جو شخص شیطان کے قدموں پر چلے گا تو وہ تو بے حیائی[۲۴] اور برے کاموں کا ہی حکم دے گا۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی تو تم میں

پھر آج کل فحاشی کی اشاعت کی اور بھی بہت سی صورتیں ایجاد ہو چکی ہیں۔ مثلاً تھیٹر، سینما گھر، کلب ہاؤس، اور ہوٹلوں کے پرائیویٹ کمرے۔ ریڈیو اور ٹی وی پر شہوت انگیز پروگرام اور زہد شکن گانے۔ فحاشی پھیلانے والا لٹریچر، ناول افسانے اور ڈرامے وغیرہ اور جنسی ادب۔ اخبارات اور اشتہارات وغیرہ میں عورتوں کی عریاں تصاویر۔ ناچ گانے کی محفلیں۔ غرض فحاشی کی اشاعت کا دائرہ آج کل بہت وسیع ہو چکا ہے اور اس موجودہ دور میں فحاشی کے اس سیلاب کی ذمہ دار یا تو خود حکومت ہے یا پھر سرمایہ دار لوگ جو سینما، تھیٹر اور کلب گھر وغیرہ بناتے ہیں یا اپنا میک اپ کا سامان بیچنے کی خاطر انہوں نے عورتوں کی عریاں تصاویر شائع کرنے کا محبوب مشغلہ اپنا رکھا ہے یا بعض اداروں اور مکانوں میں عورتوں کو سیل مین کے طور پر ملازم رکھا جاتا ہے تاکہ مردوں کے لئے وہ باعثِ کشش ہوں اور ان کے کاروبار کو فروغ حاصل ہو۔ ان سب باتوں کے لئے وہی وعید ہے جو اس آیت میں مذکور ہے۔ اور اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ فحاشی کی ان تمام اقسام کو قابلِ دست اندازی پولیس جرم قرار دے۔ تاکہ کم از کم دنیا کے عذاب سے تو لوگ بچ سکیں۔ ورنہ انہیں دنیا میں عذاب چکھنا ہوگا اور آخرت کا عذاب تو بہر حال یقینی ہے۔

[۲۳] یعنی یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ ان فحاشی کے کاموں کا دائرہ اثر کتنا وسیع اور ان کی زد کہاں کہاں تک پہنچتی ہے۔ کس طرح چند لوگوں کی فحاشی سے یا فحاشی کی افواہیں پھیلانے سے پوری قوم کا اخلاق تباہ و برباد ہوتا ہے بدکار لوگوں کو بدکاری کے نئے نئے مراکز کیسے مہیا ہوتے ہیں۔ نیز نئی نسل کے ذہنوں میں جب ابتداءً فحاشی بھر دی جائے تو پوری قوم کس طرح اللہ اور روز آخرت سے غافل ہو کر اللہ کی نافرمان بن جاتی ہے۔ یہ باتیں تم نہیں جان سکتے۔

[۲۴] ۞ شرک کے بعد شیطان کا دوسرا وار فحاشی پھیلانا ہے:۔ یعنی شیطان کا تو کام ہی یہ ہے کہ تمہیں برائیوں اور بے حیائیوں کے کاموں میں مبتلا کر کے تمہارا ایمان تباہ اور تمہیں گمراہ کر دے۔ شیطان کا انسان پر سب سے پہلا وار تو یہ ہوتا ہے کہ وہ اسے شرک کی نئی راہیں سجھاتا اور انہیں بڑے خوبصورت انداز میں پیش کرتا ہے۔ جس سے کم ہی لوگ بچتے ہیں۔ اس طرح توحید سے گمراہ کر کے شرک میں مبتلا کر دیتا ہے اور اس کا دوسرا وار یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو بے حیائی کے کاموں میں مبتلا کرے اور یہ کام بھی انہیں نہایت خوبصورت انداز میں پیش کرے۔ جنت میں شیطان نے یہی کارنامہ سر انجام دیا تھا۔ پہلے

مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾ وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَ
السَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ

سے کوئی بھی پاک صاف[۲۵] نہ رہ سکتا تھا۔ مگر اللہ جسے چاہے پاک سیرت[۲۶] بنا دیتا ہے اور اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔(۲۱) اور تم میں سے آسودہ حال لوگوں کو یہ قسم نہ کھانا چاہئے کہ وہ قرابت داروں،[۲۷] مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو کچھ (صدقہ وغیرہ) نہ دیں گے۔ انہیں چاہئے کہ وہ ان کو

سیدنا آدم علیہ السلام و حوا کو خوبصورت وعدے اور سبز باغ دکھا کر اللہ کی نافرمانی پر آمادہ کیا۔ جس کے نتیجہ میں ان دونوں کا لباس اترواد یا تھا۔ آج بھی شیطان اور اس کے چیلے اسی کام میں لگے ہوئے ہیں جو کہتے ہیں کہ گھر کی چار دیواری عورت کے لئے قید خانہ اور اس کی آزادی پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف ہے یا پردہ ایک دقیانوسی چیز ہے۔ کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک عورت گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر اور بے حجاب ہو کر مرد کے شانہ بشانہ کام نہ کرے یا عورت کے گھر میں بند رہنے سے ملکی معیشت پر ناگوار اثر پڑتا ہے۔ ایسی سب باتیں بے حیائی کی باتیں ہیں جو خوبصورت کر کے پیش کی جاتی ہیں۔ ان کا اصل مقصد عورت و مرد کا بے حجابانہ اور آزادانہ اختلاط ہے اور بدکاری کی راہیں بڑی آسانی سے کھلنے لگتی ہیں۔ نیز جن فحاشی کے کاموں کا اوپر ذکر ہوا ہے ان میں سے اکثر کام ایسے ہیں جو تہذیب حاضر کا جزو لاینفک سمجھے جاتے ہیں۔ ایسے کاموں میں ہی الجھا کر شیطان انسانوں کو مزید بڑے بڑے فتنوں میں مبتلا کر دیتا ہے اور یہی اس کا اصل مقصد ہوتا ہے۔

[۲۵] یعنی یہ اللہ کی خاص رحمت تھی کہ اس نے تمہیں اس فتنہ کی رو میں بہہ جانے سے بچا لیا۔ ورنہ شیطان کا یہ حملہ اتنا زوردار تھا کہ اگر اللہ کا فضل تمہارے شامل حال نہ ہوتا تو شاید تم میں سے کوئی بھی اس رو میں بہہ جانے سے بچ نہ سکتا۔

[۲۶] یعنی پاک سیرت بنانے کے لئے یا بنائے رکھنے کے لئے بھی اللہ کا ایک ضابطہ ہے۔ جو یہ ہے کہ جو شخص خود پاک سیرت رہنے کی کوشش کرتا ہے اسے ہی اللہ پاکیزہ رہنے کی توفیق بھی دیتا ہے۔ اور وہ خوب جانتا ہے کہ کون شخص اس پاکیزگی کا اہل ہے اور کون نہیں؟

[۲۷] ۞ سیدنا ابو بکر کا وظیفہ بند کرنے پر قسم کھانا:۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے مفصل بیان والی حدیث میں یہ مذکور ہے کہ مسطح بن اثاثہ ان سادہ لوح مسلمانوں میں سے تھے جو اس فتنہ کی رو میں بہہ گئے تھے۔ یہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے قریبی رشتہ دار تھے اور محتاج تھے۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ انہیں گزر اوقات کے لئے کچھ ماہوار وظیفہ بھی دیا کرتے تھے۔ جب یہ بھی تہمت لگانے والوں میں شامل ہو گئے تو سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ان سے رنج پہنچ جانا ایک فطری امر تھا۔ جس نے بھلائی کا بدلہ برائی سے دیا تھا۔ چنانچہ آپ نے قسم کھالی کہ آئندہ ایسے احسان فراموش کی کبھی مدد نہ کریں گے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ جس سے ایسے لوگوں سے بھی عفو و درگزر کی تلقین کی گئی۔ چنانچہ آپ نے فوراً اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور فرمایا: "پروردگار! ہم ضرور چاہتے ہیں کہ تو ہمیں معاف کر دے" چنانچہ آپ نے دوبارہ مدد کا سلسلہ جاری رکھنے کا عہد کیا بلکہ پہلے سے زیادہ مدد کرنے لگے۔

اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۪ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۳﴾ يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ

معاف کر دیں اور ان سے در گزر کریں۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہیں معاف [۲۷-الف] کر دے۔ اور اللہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ (۲۲) جو لوگ پاکدامن اور بھولی بھالی [۲۸] مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا میں بھی لعنت اور آخرت میں بھی اور انہیں بہت بڑا عذاب ہوگا۔ (۲۳) جس دن ایسے مجرموں کی اپنی زبانیں، ہاتھ اور پاؤں ان کے کرتوتوں سے متعلق ان کے خلاف گواہی [۲۹]

[۲۷-الف] معاف اس لئے کرنا چاہئے کہ اللہ ہمیں معاف کرے:۔ گویا اس آیت میں مسلمانوں کو ایک بڑا بلند اصول مد نظر رکھنے کی تعلیم دی گئی ہے یعنی کسی کو معاف کرتے وقت انہیں یہ نہ سوچنا چاہئے کہ اس کا میرے ساتھ برتاؤ کیسا رہا ہے۔ بلکہ اس لئے معاف کرنا چاہئے کہ اللہ انہیں معاف فرمائے گا۔ اور یہ ایسی ضرورت ہے جس کی ہر شخص کو ہر حال میں ضرورت ہوتی ہے۔

دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ سیدنا ابو بکرؓ نے امداد تو جاری کر دی۔ مگر کیا قسم کا کفارہ بھی ادا کیا تھا؟ اس بات کا یہاں ذکر تک نہیں آیا۔ لہٰذا بعض علماء کا خیال ہے کہ اچھے کام کو اختیار کر لینا ہی قسم کا کفارہ ہے۔ جبکہ دوسرے گروہ کا خیال ہے اور سورہ مائدہ میں قسموں کے کفارہ کا حکم نازل ہونے کے بعد قسم کا کفارہ ادا کرنا بھی ضروری ہے اور دلیل مزید کے طور پر درج ذیل حدیث پیش کرتے ہیں:

''سیدنا ابو موسیٰ اشعری فرماتے ہیں کہ: آپ نے فرمایا: ''میں تو اللہ کی قسم! جو اللہ چاہے جب کسی بات پر قسم کھالیتا ہوں۔ پھر اس کے خلاف کرنا بہتر سمجھتا ہوں تو اپنی قسم کا کفارہ دے دیتا ہوں اور جو کام بہتر معلوم ہوتا ہے وہ کر لیتا ہوں'' (بخاری۔ کتاب الایمان والنذور۔ باب الاستثناء فی الایمان) لہٰذا بہتر صورت یہی ہے کہ ایسی قسم کا کفارہ بھی ادا کر دیا جائے۔

[۲۸] یعنی جنہیں ایسی گندی باتوں کا خیال بھی نہ ہو۔ ان کا ذہن ہی ایسی باتوں کی طرف منتقل نہ ہوتا ہو کہ بد چلنی کیا چیز ہے اور یہ کیسے کی جاتی ہے یعنی وہ سیدھی سادی اور پاک فطرت عورت جو بد چلن عورتوں کے چلتروں اور ان کی باتوں تک سے ناواقف ہوتی ہے اور صحیحین کے مطابق ایسی بھولی بھالی مومن عورتوں پر تہمت لگانا ان سات تباہ کن گناہوں میں سے ہے جو سابقہ کئے کرائے پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ اور یہاں تو معاملہ اور بھی سخت ہے کیونکہ جس پر بہتان باندھا گیا ہے وہ کوئی عام مومنہ نہیں۔ بلکہ اللہ کے رسول ﷺ کی بیوی اور مومنوں کی ماں ہے۔ لہٰذا ایسے تہمت لگانے والے منافقین پر دنیا میں بھی لعنت برستی رہے گی اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں ان منافقوں پر جو لعنت برستی رہی اور ہر دم ذلیل و خوار ہوتے رہے وہ سب نے دیکھ لیا اور آخرت میں یہ لوگ جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے۔

[۲۹] اعضاء و جوارح کی شہادت:۔ اس دنیا میں انسان جو کچھ زبان سے بولتا یا کلام کرتا ہے۔ وہ دل کے ارادہ کے مطابق بولتا ہے۔ دل میں جھوٹ بولنے یا ہیرا پھیری کرنے کی نیت ہو تو انسان کی زبان وہی الفاظ ادا کرے گی جو انسان کے دل میں ہوتا ہے۔ گویا زبان دل کے ارادہ کے تابع ہوتی ہے اور دوسرے اعضاء و جوارح بھی وہی کام کرتے ہیں۔ جسے انسان کا دل چاہتا ہو۔

بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۴﴾ يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ﴿۲۵﴾

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ اُولٰٓئِكَ

دیں گے۔ (۲۴) اس دن اللہ تعالیٰ انہیں وہ بدلہ دے گا جس کے [۳۰] وہ مستحق ہیں اور وہ جان لیں گے کہ اللہ ہی حق ہے، سچ کو سچ کر دکھانے والا ہے۔ (۲۵) خبیث عورتیں، خبیث مردوں کے لیے، اور خبیث مرد، خبیث عورتوں کے لیے ہیں۔ اور پاکیزہ [۳۱] عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کیلئے ہیں۔

مگر آخرت میں یہ اعضاء انسان کے ارادہ کے تابع نہیں ہوں گے بلکہ اس حقیقت کے تابع ہوں گے کہ انسان اس دنیا میں اپنے اعضاء و جوارح سے جو کام لے رہا ہے۔ تو ساتھ کے ساتھ ان اعمال و افعال و اقوال کے اثرات ان اعضاء و جوارح پر بھی مترتب ہوتے جا رہے ہیں۔ آج انسان اس حقیقت کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتا۔ تاہم بعض موجودہ سائنسی ایجادات نے اس مسئلہ کو قریب الفہم ضرور بنا دیا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان اعضاء و جوارح کو زبان دے دیں گے۔ اور وہ وہی بات کہیں گے جو اثرات ان پر مترتب ہوئے تھے اور جو کچھ ان سے کام لیا گیا تھا۔ لہٰذا اگر کوئی شخص قیامت کے دن اپنے کسی جرم کا اعتراف کرنے کی بجائے غلط سلط باتیں بنانے کی کوشش کرے گا تو اللہ تعالیٰ فوراً اس کی زبان اس کے ہاتھوں اور پاؤں کو قوت گویائی دے کر صحیح باتیں بتانے کا حکم دے گا۔ تو سب اعضاء و جوارح کی گواہی ایسے مجرموں کے خلاف قائم ہو جائے گی اور انہیں جو سزا ملے گی وہ علیٰ رؤس الشہادات ملے گی۔

[۳۰] ❁ دین کے لغوی معانی:۔ دین کا لفظ چار معنوں میں استعمال ہوتا ہے (۱) اللہ کی خالصتاً اور مکمل حاکمیت (۲) بندے کی خالصتاً اور مکمل عبودیت (۳) قانون سزا و جزا اور (۴) قانون جزا و سزا کا عملاً نفاذ۔ اس آیت میں دین تیسرے اور چوتھے معنوں میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ اہل عرب کہتے ہیں کما تدین تدان (یعنی جیسا کرو گے ویسا بھرو گے) یعنی اس دن اللہ تعالیٰ جو ان مجرموں کو بدلہ دے گا وہ ٹھیک ٹھیک جزا و سزا کے اس قانون کے مطابق ہوگا جس کا ذکر قرآن میں بے شمار مقامات پر مذکور ہے۔ اور ہر شخص کو واضح طور پر یہ معلوم ہو جائے گا کہ اسے جو سزا دی جا رہی ہے فی الواقع وہ اللہ کے قانون عدل کے مطابق اسی سزا کا مستحق تھا۔

[۳۱] اس آیت کا ایک مطلب تو یہ ہے جو ترجمہ سے واضح ہے اور ربط مضمون کے لحاظ سے مناسب بھی یہی ہے۔ یعنی پاکباز مردوں اور عورتوں کی تہذیب، ماحول اور عادات ان لوگوں سے بالکل الگ ہوتی ہیں۔ جو گندے اور فحاشی کے کاموں میں مبتلا ہوں۔ ان دونوں کا آپس میں مل بیٹھنا فطرتاً بھی محال ہوتا ہے۔ نہ ان کی تہذیب آپس میں مشترک ہو سکتی ہے، نہ بول چال اور نہ عادات۔ ایک پاکباز انسان کسی گندے ماحول میں چلا جائے تو اسے وہاں ایک دن گزارنا بھی مشکل ہو جاتا ہے اسی طرح ایک فاحش مرد اور ایک فاحشہ عورت کے لئے کسی پاکیزہ ماحول میں ایک دن گزارنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ایسے دونوں طبقات کو آپس میں ملانے یا آپس میں رشتے استوار کرنے کی ہرگز کوشش نہ کرنا چاہئے۔ اور اگر کوئی ایسی کوشش کرے گا تو ناکامی اور خرابی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ طیبات کو اپنے وسیع مفہوم میں لیا جائے۔ اس لحاظ سے اس کے معنی میں پاکیزہ عورتیں ہی نہیں پاکیزہ باتیں بھی شامل ہیں۔ یعنی پاکباز لوگوں کی زبانوں سے پاکیزہ باتیں ہی نکلتی ہیں اور گندے خیال رکھنے والے لوگوں کو

مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿٢٦﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ

ع ۹

ان کا دامن ان باتوں سے پاک ہے جو وہ (تہمت لگانیوالے) بکتے ہیں، ان کے لئے بخشش بھی ہے اور عزت کی روزی بھی۔(۲۶) اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا[۳۲] دوسروں کے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ ان کی رضا[۳۳]

گندی باتیں سوجھتی ہیں۔ جس طرح یہ ناممکن ہے کہ پاکیزہ خیال لوگوں کو گندی باتیں سوجھیں اسی طرح گندی ذہنیت رکھنے والوں کو پاکیزہ باتیں کم ہی سوجھتی ہیں۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ فحاشی پھیلائی اور پروپیگنڈہ کیا۔ حقیقتاً گندی ذہنیت کے لوگ تھے۔ پاکباز لوگوں کا یہ شیوہ نہیں کہ وہ ایسی باتوں میں حصہ لیں۔ وہ ایسی باتوں سے بچنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔

[۳۲] اجازت کے بغیر گھروں میں داخلہ پر پابندی:۔ اس سے پہلے سورہ احزاب میں بھی گھروں میں اذن لے کر داخل ہونے کا حکم آچکا تھا۔ لیکن اس حکم کا دائرہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک محدود تھا۔ مگر اس حکم کے ذریعہ اسے تمام گھروں تک پھیلا دیا گیا۔ اس سے پہلے اس سورہ میں ایسے احکام بیان ہوئے ہیں۔ جن کا تعلق ایسے حالات سے تھا جب فحاشی کی بنا پر کوئی فتنہ رونما ہو چکا ہو۔ اب ایسے احکام دیئے جارہے ہیں جن پر عمل کرنے سے کسی فتنہ کے سر اٹھانے کے امکانات کم سے کم رہ جاتے ہیں۔ گویا یہ احکام فحاشی کے پھیلاؤ کے سلسلہ میں سد ذرائع کا حکم رکھتے ہیں۔ عرب معاشرہ میں یہ عام دستور تھا کہ لوگ ایک دوسرے کے گھروں میں بلا جھجک داخل ہو جاتے تھے۔ اس آیت کے ذریعہ ایسی آزادانہ آمد ورفت پر پابندی لگادی گئی۔

[۳۳] استأنس کا لغوی مفہوم۔ احکام استیذان:۔ اس آیت میں تستأنسوا کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا مادہ انس ہے جس کا عربی میں بھی وہی مفہوم ہے جو ہمارے ہاں سمجھا جاتا ہے یعنی کسی سے مانوس ہونا یا اسے مانوس کرنا۔ اور اس کا مطلب کوئی بھی ایسا کام کرنا ہے جس سے صاحب خانہ کو علم ہو جائے کہ دروازے پر فلاں شخص کھڑا اندر آنے کی اجازت چاہ رہا ہے۔ بعض دفعہ گھنگارنے سے ہی یہ مطلب حاصل ہو جاتا ہے۔ اور بعض دفعہ بولنے یا السلام علیکم کہنے سے۔ اس طرح صاحب خانہ کو اس کی کھانسی یا آواز سے ہی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ آواز فلاں شخص کی ہے۔ بعض دفعہ کوئی شخص برقی گھنٹی ہی اس انداز سے دباتا ہے جو اس میں اور صاحب خانہ میں متعارف ہوتی ہے۔ اور گھنٹی بجانے سے ہی صاحب خانہ کو علم ہو جاتا ہے۔ کہ فلاں شخص آکر آواز دے رہا ہے۔ ایسی تمام صورتیں تستانسوا کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اسی لئے اس کے قریبی مفہوم "رضا حاصل کرنا" سے اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ اب اگر یہ استیناس السلام علیکم کہنے سے ہی کیا گیا ہے تو ٹھیک ہے۔ اور اگر کسی اور طریقہ سے کیا گیا ہے تو گھر میں داخل ہوتے وقت السلام علیکم کہنا بھی ضروری ہے۔

یہاں ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "اپنے گھروں" سے کیا مراد ہے؟ اور اس کے مفہوم میں کون کون سے گھر شامل ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اپنے گھر سے صرف وہ گھر مراد ہے جہاں اس کی بیوی رہتی ہو۔ یہی وہ گھر ہے جس میں شوہر ہر وقت بلا جھجک اور بلا اجازت داخل ہو سکتا ہے۔ اپنی ماں اور بیٹیوں تک کے گھروں میں داخل ہونے سے پہلے استیناس ضروری ہے جیسا کہ درج ذیل حدیث سے معلوم ہوتا ہے:

علاء بن سیار کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔ کیا میں گھر جاتے وقت اپنی ماں سے بھی اذن مانگوں؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں" وہ بولا: "میں تو اس کے ساتھ گھر میں رہتا ہوں" آپ ﷺ نے فرمایا: "پھر بھی

حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸﴾ لَيْسَ

حاصل نہ کرو اور گھر والوں پر سلام نہ کر لو۔ یہ بات تمہارے[۳۴] حق میں بہتر ہے توقع ہے کہ تم اسے یاد رکھو (اور اس پر عمل کرو) گے۔ (۲۷) پھر اگر ان میں کسی کو نہ پاؤ تو جب تک تمہیں اجازت[۳۵] نہ ملے اس میں داخل نہ ہونا۔ اور اگر تمہیں کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو لوٹ آؤ[۳۶]۔ یہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے اور جو کام تم کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ (۲۸)

اجازت لے کر داخل ہو" وہ کہنے لگا: "میں ہی تو اس کی خدمت کرتا ہوں" آپ ﷺ نے فرمایا: "پھر بھی اجازت لے کر داخل ہو۔ کیا تو اس بات کو پسند کرتا ہے کہ تو اپنی ماں کو ننگا دیکھے؟" وہ کہنے لگا: "نہیں" آپ نے فرمایا: "تو پھر اذن لے کر جاؤ (موطا امام مالک۔ کتاب الجامع۔ باب الاستیذان)

اور "اپنے گھر" میں بلا اجازت داخل ہونے کی اجازت ضرور ہے۔ مگر بہتر یہی ہے کہ اپنے گھر میں یکایک اور اچانک داخل نہ ہو۔

[۳۴] ۞ اذن کیوں ضروری ہے؟ یعنی یہ بات صاحب خانہ اور ملاقاتی دونوں کے حق میں بہتر ہے کہ ملاقاتی صاحب خانہ سے پہلے اِذن حاصل کرے۔ پھر گھر میں داخل ہو۔ اس لئے کہ اگر ملاقاتی گھر میں بلا اذن داخل ہو تو ممکن ہے اس وقت اہل خانہ اپنی کسی پرائیویٹ گفتگو میں مصروف ہوں، یا عورت بے حجاب پھر رہی ہو۔ یا صاحب خانہ کسی اور مجبوری یا معذوری کی وجہ سے اس وقت ملاقات کرنا ہی نہ چاہتا ہو اور اس طرح ملاقاتی کو خواہ مخواہ خفت یا ندامت حاصل ہو۔ لہٰذا مہذبانہ طریقہ یہی ہے کہ کسی کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اجازت حاصل کی جائے۔

[۳۵] یعنی جب گھر والوں میں سے کوئی شخص بھی گھر میں موجود نہ ہو اس وقت ہرگز کسی دوسرے کے گھر میں داخل نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس طرح ایک دوسرے کے متعلق کئی طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہو سکتے ہیں اور الزام تراشی سے بڑھ کر معاملہ تنازعہ کی شکل اختیار کر سکتا ہے اس سے استثناء کی صورت صرف یہ ہے کہ صاحب خانہ خود ہی کسی ملاقاتی کو اپنے کمرہ وغیرہ میں یہ کہہ کر بٹھا جائے کہ تھوڑی دیر انتظار کرو۔ میں ابھی واپس آتا ہوں۔ اور اس طرح کی اجازت کی بھی کئی صورتیں ممکن ہیں۔

[۳۶] ایسی اجازت لینے کی حد تین بار ہے۔ ممکن ہے پہلی بار اور دوسری بار اجازت کی بات کو صاحب خانہ سن ہی نہ پائے۔ یا وہ اپنے کسی کام میں سخت مشغول ہو اور اتنی جلدی دروازہ تک آ ہی نہ سکتا ہو۔ لہٰذا تین بار اجازت کا حکم دیا گیا ہے۔ اور یہ اجازت تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد طلب کرنا چاہئے اور اگر تین بار اجازت طلب کرنے پر بھی اندر سے کوئی جواب نہ ملے تو ملاقات یا داخلہ کے لئے مزید اصرار نہ کرنا چاہئے۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

۞ اگر تیسری بار بھی اِذن نہ ملے تو واپس چلے جانا چاہئے:۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں انصار کی ایک مجلس میں بیٹھا تھا کہ ابو موسیٰ اشعری آئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ڈرے ہوئے اور گھبرائے ہوئے ہیں۔ وہ کہنے لگے: "میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ہاں گیا تھا میں نے تین بار اِذن مانگا مگر مجھے اذن نہیں ملا آخر میں لوٹ گیا۔ پھر مجھے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: "تم کھڑے کیوں نہ رہے؟" (انتظار کیوں نہ کیا؟) ابو موسیٰ اشعری کہنے لگے: "میں نے تین بار اذن مانگا اور مجھے اذن نہ ملا تو میں لوٹ آیا۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا

عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ مَسْكُونَةٍ فِيهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ ﴿٢٩﴾ قُلْ

البتہ بے آباد گھروں میں [۳۷] داخل ہونے سے تم پر کوئی گناہ نہیں جہاں تمہارے فائدے کی کوئی چیز ہو۔ اور اللہ خوب [۳۸] جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔(۲۹)

ہے کہ تم میں سے کوئی شخص تین بار اذن مانگے پھر اسے اذن نہ دیا جائے۔ تو لوٹ آئے"۔ سیدنا عمرؓ نے کہا کہ: "اللہ کی قسم! تجھے اس حدیث پر کوئی گواہ لانا ہوگا" اب بتاؤ کیا تم میں سے کسی نے نبی ﷺ سے یہ حدیث سنی ہے؟" سیدنا ابی بن کعب کہنے لگے: "اللہ کی قسم! تمہارے ساتھ وہ آدمی شہادت دے گا جو ہم سب میں چھوٹا ہو" اور ان سب میں چھوٹا میں ہی تھا۔ چنانچہ میں ابوموسیٰ اشعری کے ساتھ گیا اور سیدنا عمرؓ کو بتایا کہ نبی ﷺ نے واقعی ایسا فرمایا ہے۔ امام بخاری کہتے ہیں کہ اس سے سیدنا عمر کا ارادہ محض حدیث کی توثیق تھا۔ یہ نہیں کہ وہ خبر واحد کو درست نہ سمجھتے تھے۔ (بخاری۔ کتاب الاستیذان۔ باب التسلیم والاستیذان ثلثا)

اور اگر صاحب خانہ دروازہ وغیرہ کھٹکھٹانے پر پوچھے کہ کون ہے؟ تو ایسے واضح الفاظ میں اپنا تعارف کرانا یا نام بتانا چاہئے جس سے صاحب خانہ کو علم ہو جائے کہ فلاں شخص داخلہ کی اجازت چاہتا ہے جیسا کہ درج ذیل حدیث میں واضح ہے۔

۱۔ ❁ اذن لینے کا طریقہ:۔ سیدنا جابرؓ کہتے ہیں کہ میں آپ ﷺ کے پاس اس قرضہ کے سلسلے میں بات کرنے کے لئے حاضر ہوا جو میرے والد پر تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ آپ ﷺ نے (اندر سے) پوچھا کون ہے؟" میں نے کہا: "میں ہوں" آپ نے فرمایا: "میں تو میں بھی ہوں" گویا آپ نے (نام بتانے کے بجائے) میں ہوں کہنے کو برا سمجھا۔ (بخاری۔ حوالہ ایضاً)

۲۔ اور اجازت حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ بیرونی دروازہ کے بالکل سامنے نہ کھڑا ہو۔ جبکہ دائیں یا بائیں جانب کھڑا ہو تاکہ جب صاحب خانہ یا اس کا ملازم یا کوئی اور گھر کا فرد دروازہ کھولے تو اجازت ملنے سے پہلے ہی ملاقاتی کی نظر اندر تک نہ چلی جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آپ نے فرمایا کہ: "جب نگاہ اندر چلی گئی تو پھر اذن کا مقصد ہی فوت ہو گیا۔" (ابوداؤد۔ کتاب الادب۔ باب فی الاستیذان)

۳۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ: "نظر بازی کی وجہ سے ہی تو اذن کا حکم دیا گیا ہے۔" (مسلم۔ کتاب الآداب۔ باب تحریم النظر فی بیت غیرہ)

۴۔ اور نظر بازی یا کسی کے گھر میں جھانکنا بہت بڑا گناہ ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر کوئی شخص تمہارے مکان میں جھانکے اور تم کنکر مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دو تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔" (بخاری۔ کتاب الدیات باب من اطلع فی بیت قوم ففقؤا عینہ)

یعنی اگر کوئی شخص ایسے بد نظر شخص کی آنکھ پھوڑ بھی دے تو اس کا قصاص وغیرہ کچھ نہ ہوگا۔

[۳۷] یعنی ایسے گھر جس میں کوئی خاص آدمی نہ رہتے ہوں۔ جبکہ وہ ہر خاص و عام کے لئے کھلے ہوں۔ جیسے نمازوں کی ادائیگی کے لئے مساجد، کھانے پینے اور رہائش کے لئے ہوٹل اور سرائیں وغیرہ۔ ایسے مقامات میں داخل ہونے کے لئے کسی اذن لینے کی ضرورت نہیں۔ اور اس کا دوسرا مطلب ایسے گھر بھی ہو سکتے ہیں جو بے آباد، ویران اور گرے پڑے ہوں۔ ان کے مالک انہیں چھوڑ کر چلے گئے ہوں یا نہ معلوم ہوں۔ اور وہاں مثلاً گھاس وغیرہ اگ آئی ہو۔ اور کوئی شخص وہاں سے گھاس کاٹ لے۔ یا ایسا ہی دوسرا فائدہ وہاں سے ہر شخص اٹھا سکتا ہے۔

[۳۸] یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے لامحدود علم کی بنا پر اور تمام امور کی رعایت محفوظ رکھ کر یہ احکام دیئے ہیں جو تمہارے تمام

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا

(اے نبی!) مومن مردوں سے کہئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی[۳۹] رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں[۴۰]۔ یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔ اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر ہے۔(۳۰) اور مومن عورتوں سے بھی کہئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر جو از خود

ظاہری اور باطنی اعمال و افعال سے خوب واقف ہے۔ اور ان سے مقصود فحاشی اور فتنہ و فساد کے راستوں کو بند کرنا ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو چاہئے کہ اسی غرض کو مدنظر رکھ کر ان پر عمل پیرا ہو۔

[۳۹] نگاہیں پست رکھنے کا حکم جیسے مومن مردوں کو ہے ویسے ہی مومن عورتوں کو بھی ہے۔ جیسا کہ اس سے اگلی آیت میں مذکور ہے نگاہیں نیچی رکھنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ چلتے وقت راستہ بھی پوری طرح نظر نہ آئے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مرد کی کسی غیر عورت پر اور عورت کی کسی غیر مرد پر نگاہ نہ پڑنی چاہئے اور اگر اتفاق سے نظر پڑ جائے تو فوراً نظر ہٹا لینی چاہئے۔ جیسا کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ: پہلی بار کی نظر تجھے معاف ہے (یعنی اتفاقاً پڑ جائے) لیکن بعد کی معاف نہیں" (ترمذی۔ ابواب الادب۔ باب نظر الفجاءة) یعنی اتفاقاً نظر پڑ جانے کے بعد پھر دیکھتے نہیں رہنا چاہئے بلکہ فوراً نظر ہٹا لینی چاہئے اور ایک بار آپ ﷺ نے یوں فرمایا کہ "نظر بازی آنکھوں کا زنا ہے یا آنکھوں کا زنا نظر بازی ہے" (بخاری۔ کتاب الاستیذان۔ باب زنا الجوارح دون الفرج)

[۴۰] ❁ نظر بازی زنا کا سب سے بڑا دروازہ ہے:۔ نظر بازی سے اجتناب کے ساتھ ہی متصلاً اللہ تعالیٰ نے فروج کی حفاظت کا ذکر فرمایا جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ فروج (یعنی شرمگاہوں) کی حفاظت کے لئے نظر بازی سے اجتناب انتہائی ضروری ہے۔ بالفاظ دیگر زنا کے عوامل میں سے نظر بازی ایک بہت بڑا عامل یا اس کا مین گیٹ ہے۔ اسی نظر بازی کے نتیجہ میں بعد میں انسان کے دوسرے اعضاء بھی اس فتنہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مندرجہ بالا پوری حدیث اس طرح ہے "آنکھ کا زنا نظر بازی ہے۔ زبان کا زنا فحش کلامی ہے اور آدمی کا نفس زنا کی خواہش کرتا ہے۔ پھر شرمگاہ تو ان سب قسموں کے زنا کی تصدیق کر دیتی ہے یا تکذیب۔ (بخاری۔ کتاب الاستیذان۔ باب زنا الجوارح دون الفرج)

۲۔ سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے دروازہ کے سوراخ میں سے آپ ﷺ کے حجرے میں جھانکا اس وقت آپ ﷺ کے ہاتھ میں خارپشت یعنی ایک لوہے کی سلائی یا تیر کی انی تھی جس سے آپ ﷺ اپنا سر کھجلا رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ تو جھانک رہا ہے تو میں تیری آنکھ پر مار کر اسے پھوڑ دیتا۔ استیذان کا حکم تو نظر بازی کے فتنہ کی وجہ سے ہی ہوا ہے" (بخاری۔ کتاب الاستیذان)

۳۔ طبرانی میں ایک روایت یوں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: نظر بازی، ابلیس کے زہریلے تیروں میں سے ایک تیر ہے (بحوالہ تفہیم القرآن ج ۳ ص ۳۸۰)

❁ منگیتر کو دیکھنے کی اجازت:۔ البتہ اس میں استثناء کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی کو اپنی ہونے والی بیوی یعنی

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ

ظاہر ہو[۴۱] جائے۔ اور اپنی اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈال لیا کریں اور اپنے بناؤ سنگھار کو ظاہر[۴۲] نہ کریں مگر ان لوگوں کے سامنے: خاوند، باپ، خاوند کے باپ (سسر) بیٹے، اپنے

مخطوبہ کو دیکھنے کی اجازت ہے۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک عورت سے منگنی کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس عورت کی طرف دیکھ لو، کیونکہ تم دونوں میں موانست کا یہ بہتر طریقہ ہے" (ترمذی۔ ابواب النکاح۔ باب النظر الی المخطوبة) اسی طرح آپ ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا جو کسی انصاری عورت سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ آپ ﷺ نے اسے فرمایا: "کیا تو نے اس مخطوبہ کی طرف دیکھ لیا؟" اس نے کہا "نہیں" آپ ﷺ نے فرمایا: جا اور اس کے طرف دیکھ لے کیونکہ انصار کی عورتوں کی آنکھوں میں کچھ عیب ہوتا ہے" (مسلم۔ کتاب النکاح۔ باب ندب من اراد نکاح امرأة الی ان ینظر الی وجهها)

[۴۱] بعض علماء نے قرآن کریم کے الفاظ اِلَّا مَاظَهَرَ مِنْهَا سے یہ مراد لی ہے کہ حجاب سے چہرہ اور ہاتھ مستثنیٰ ہیں۔ یعنی عورتوں کو غیر مردوں سے بھی چہرہ اور ہاتھ چھپانے کی ضرورت نہیں۔ یہ توجیہ درج ذیل وجوہ کی بنا پر غلط ہے:

۱۔ ہاتھوں اور چہرہ کو ڈھانپنا:۔ اس آیت میں احکام حجاب کی رخصتوں کا ذکر ہے نہ کہ احکام حجاب کی پابندیوں کا۔ یعنی ذکر تو یہ چل رہا ہے کہ فلاں فلاں ابدی محرم رشتہ داروں سے بھی حجاب کی ضرورت نہیں، اپنی عورتوں سے بھی لونڈیوں سے بھی، خدام اور نابالغ بچوں سے بھی اظہار زینت اور حجاب پر کوئی پابندی نہیں۔ اب دیکھئے اس آیت میں کہیں عام لوگوں یا غیر مردوں کا ذکر آیا ہے کہ ان سے بھی اظہار زینت پر کوئی پابندی نہیں؟ لہٰذا اگر ان حضرات کے مصداق ماظہر منھا سے مراد چہرہ اور ہاتھ ہی لے لئے جائیں تو بھی چنداں فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس آیت میں مذکور اشخاص کے سامنے ہاتھ اور چہرہ کھلا رکھنے کی اجازت ہی کا تو ذکر ہے۔

۲۔ اس بات کے باوجود بھی یہ توجیہ غلط ہے کیونکہ مَاظَهَرَ مِنْهَا میں ھا کی ضمیر زِيْنَتَهُنَّ کی طرف راجع ہے جو کہ قریب ہی مذکور ہے، نہ کہ اعضائے بدن کی طرف جن کا یہاں ذکر ہی موجود نہیں۔ اور اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ "عورتیں اپنی زینت ظاہر نہ کریں مگر جو اس زینت سے از خود ظاہر ہو جائے۔ گویا اللہ تعالیٰ عورتوں کو تکلیف مالا یطاق نہیں دینا چاہتے۔ یعنی اگر جلباب یا بڑی چادر یا برقع کسی وقت ہوا سے اٹھ جائے یا غفلت یا کسی دوسرے اتفاق کی بنا پر عورت کا زیور یا زینت یا اس کا کچھ حصہ ظاہر ہو جائے تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ اکثر صحابہ اور تابعین نے مَاظَهَرَ مِنْهَا سے یہی مفہوم مراد لیا ہے۔

۳۔ پیچھے واقعہ افک میں ایک طویل حدیث، جو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، گزر چکی ہے۔ اس میں وہ خود فرماتی ہیں کہ میں نے صفوان بن معطل سلمی کو جب بیدار ہو کر اپنے پاس کھڑا دیکھا تو میں نے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ کیونکہ اس سے پہلے (سورہ احزاب میں) پردہ کا حکم نازل ہو چکا تھا۔ پھر بعد میں کیا یہ حکم منسوخ ہو گیا تھا؟ کیا کچھ شواہد و آثار ایسے ملتے ہیں جن سے یہ ثابت ہو سکے کہ یہ حکم منسوخ ہو گیا تھا؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہو اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر اس جملہ کا یہ مطلب کیسے

لیا جاسکتا ہے کہ چہرہ اور ہاتھ پردہ کے حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

۴۔ تمام بدن میں چہرہ ہی ایسا عضو ہے جس میں غیروں کے لئے دلکشی کا سب سے زیادہ سامان ہوتا ہے۔ پھر اگر اسے ہی پردہ سے مستثنیٰ قرار دے دیا جائے تو باقی احکام حجاب کی کیا اہمیت باقی رہ جاتی ہے؟

اب اس مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ تمام تر صحابہ کرام میں سے سیدنا ابن عباسؓ نے، پھر ان کے شاگردوں نے، پھر بعض فقہائے حنفیہ نے ﴿ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا ﴾ سے یہ مراد لیا ہے کہ ہاتھ اور چہرہ حکم حجاب سے خارج ہیں اور یہی وہ اصل بنیاد ہے جس پر منکرین حجاب اپنی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ حالانکہ ان اصحاب کا یہ موقف بھی منکرین حجاب کے کام کی چیز نہیں وجہ یہ ہے کہ ابن عباسؓ ﴿يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ﴾ کا مفہوم یوں بیان فرماتے ہیں۔

''ابن عباس اور ابو عبیدہ نے فرمایا ''مومنوں کی عورتوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ چادروں سے اپنے سر اور چہروں کو ڈھانپ کر رکھیں مگر ایک آنکھ کھلی رکھ سکتی ہیں تاکہ معلوم ہوسکے کہ وہ آزاد عورتیں ہیں'' (معالم التنزیل بحوالہ تفہیم القرآن ج ۳ ص ۱۲۹)

اسی طرح کی ایک دوسری روایت یہ ہے کہ علی بن ابی طلحہ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ: ''اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی عورتوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ اپنے گھروں سے کسی ضرورت کے تحت نکلیں تو چادروں سے اپنے سروں کے اوپر سے چہروں کو ڈھانپ لیں اور (صرف) ایک آنکھ ظاہر کریں'' (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۳۱۸، جامع البیان للطبری ص ۳۳ مطبوعہ مصر)

اور یہ تو ظاہر ہے کہ جلباب کا تعلق گھر کے باہر کی دنیا سے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سیدنا ابن عباس گھر سے باہر مکمل پردہ (یعنی چہرہ سمیت کے قائل تھے، ان کے موقف میں اگر کچھ لچک ہے تو وہ گھر کے اندر کی دنیا سے ہے یعنی اگر گھر کے اندر ایسے رشتہ دار آجائیں جو محرم نہیں تو ان سے ہاتھ اور چہرہ چھپانے کی ضرورت نہیں لہٰذا آج کے مہذب اور پردہ کے مخالف طبقہ کے لئے ابن عباسؓ کا یہ موقف بھی کچھ زیادہ سودمند نہیں۔

[۴۲] دوپٹہ اوڑھنے کا مقصد:۔ بدن کی قدرتی زیبائش میں سب سے زیادہ نمایاں چیز عورت کے سینہ کا ابھار یا اس کے پستان ہیں۔ جو مرد کے لئے خاصی کشش رکھتے ہیں۔ لہٰذا سینہ کو ڈھانپنے کی بطور خاص تاکید فرمائی۔ اور جاہلیت کی رسم کو ختم کرنے کی صورت بھی بتادی۔ جاہلیت میں عورتیں اپنے خمار (دوپٹے) سر پر ڈال کر اس کے دونوں پلے پشت پر لٹکا لیتی تھیں۔ اس طرح سینہ پر کوئی چیز نہ ہوتی تھی اور یہ بھی گویا حسن کا مظاہرہ یا نمائش تھی۔ اور آج کی مہذب سوسائٹی میں اول تو ہماری یہ مہذب عورتیں دوپٹہ لینا گوارا ہی نہیں کرتیں اور اگر لیں تو دوپٹہ کو گلے میں ڈال کر اس کے پہلو پیچھے پشت پر ڈال دیتی ہیں۔ اس طرح سر اور سینہ دونوں ننگے رہتے ہیں۔ البتہ دوپٹہ کا نام ضرور بدنام کیا جاتا ہے۔ اور مقصود اس سے بھی سینہ کے ابھار کی نمائش اور مردوں کے لئے پرکشش بنے رہنا ہوتا ہے۔ گویا آج اس نئی روشنی اور ترقی میں پرانے دور جاہلیت سے بھی زیادہ جاہلیت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے یہ طریقہ بتایا کہ دوپٹہ کو سر پر سے لاکر گریبان پر ڈالنا چاہئے اس طرح سر، کان، گردن، سینہ سب اعضاء چھپے رہتے ہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو مدینہ کی عورتوں نے اپنے تہبند (یعنی موٹا کپڑا) پھاڑ کر اس کی اوڑھنیاں بنالیں'' (بخاری۔ کتاب التفسیر) گویا اس حکم پر انہوں نے فوراً سر تسلیم خم کر دیا۔

اَوْ اَبْنَآىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآىِٕهِنَّ اَوْ

شوہروں کے بیٹے (سوتیلے بیٹے) بھائی، بھتیجے، بھانجے[۴۳]، اپنے میل جول[۴۴] والی عورتیں، کنیزیں جن کی وہ

[۴۳] ابدی محرم رشتہ دار:۔ قرآن کریم میں اس مقام اور بعض دوسرے مقامات پر بارہ قسم کے لوگوں یا رشتہ داروں کا ذکر آیا ہے۔ جن سے حجاب کی ضرورت نہیں۔ البتہ ستر کے احکام بدستور برقرار رہیں گے۔ بالفاظ دیگر ان مذکورہ بارہ قسم کے لوگوں یا رشتہ داروں کے سامنے عورتیں اپنی زیب و زینت کا اظہار کر سکتی ہیں۔ ان میں آٹھ یہاں مذکور ہیں۔ اور یہ رشتہ دار ایسے ہیں جو ابدی طور پر محرم ہیں یعنی خاوند، باپ، سسر، حقیقی بیٹے، سوتیلے بیٹے، بھائی، بھتیجے اور بھانجے۔ پھر ان میں وہ رشتہ دار بھی شامل ہو جاتے ہیں جو رضاعت کی بنا پر حرام ہوں مثلاً رضاعی باپ، رضاعی بھائی یا رضاعی بیٹے اور چچے وغیرہ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ نساء کی آیت نمبر ۲۳ سے استشہاد کر کے نسب اور رضاعت کو ایک ہی سطح پر رکھ کر فرمایا کہ "جو رشتے نسب کے لحاظ سے حرام ہیں وہی رضاعت کے لحاظ سے بھی حرام ہیں" (بخاری۔ کتاب الشہادات۔ باب الشهادة على الانساب والرضاع)

[۴۴] غیر عورتوں اور ہیجڑوں سے بھی حجاب کا حکم:۔ قرآن کریم کے الفاظ ہیں اَوْ نِسَآىِٕهِنَّ (یا اپنی عورتوں سے بھی اظہار زیب و زینت میں کوئی حرج نہیں) یہ نویں قسم ہوئی اور اپنی عورتوں سے مراد آپس میں میل ملاقات رکھنے والی مسلمان عورتیں ہیں جو ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتی پہچانتی اور ایک دوسرے پر اعتبار رکھتی ہوں۔ رہی دوسری غیر مسلم، مشتبہ اور ان جانی عورتیں تو ایسی عورتوں سے اپنی زیب و زینت چھپانے اور حجاب کا ایسا ہی حکم ہے۔ جیسے غیر مردوں سے ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عورتیں ہی ہوتی ہیں جو قحبہ گری کی دلالی بھی کرتی ہیں۔ نوخیز اور نوجوان لڑکیوں کو اپنے دام تزویر میں پھنسا کر غلط راہوں پر ڈال کر شیطان کی پوری نمائندگی کرتی ہیں۔ اور ایک گھر کے بھید کی باتیں دوسرے گھر میں بیان کر کے فحاشی پھیلاتی اور اس کی راہیں ہموار کرتی ہیں۔ ایسی بدمعاش قسم کی عورتوں سے پرہیز کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا تمام ان جانی اور غیر مسلم عورتوں یا غیر عورتوں سے بھی حجاب کا حکم دیا گیا۔ بلکہ ایسی عورتوں کو گھروں میں داخلہ پر بھی ایسے ہی پابندی لگانا ضروری ہے جیسے غیر مردوں کے لئے ضروری ہے۔

علاوہ ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہیجڑوں، مخنث، یا زنانہ وضع قطع رکھنے والے مردوں سے بھی حجاب کا حکم دیا ہے۔ دور نبوی کا ایک واقعہ ہے کہ آپ ﷺ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف فرما تھے۔ گھر میں ایک ہیجڑا تھا۔ وہ سیدہ ام سلمہ کے بھائی عبداللہ بن ابی ربیعہ سے کہنے لگا: اگر اللہ نے کل طائف فتح کرا دیا تو میں تمہیں غیلان کی بیٹی کی نشاندہی کروں گا وہ اگر سامنے آتی ہے تو چار سلوٹ لے کر اور پیٹھ موڑتی ہے تو آٹھ سلوٹ لے کر (یعنی اس کا بدن خوب گتھا ہوا ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سن لی تو فرمایا: یہ ہیجڑا آئندہ کبھی تمہارے ہاں نہ آیا کرے" (بخاری۔ کتاب النکاح۔ باب ماینهى من دخول المشتبهين بالنساء على المرأة)

یہ مخنث (خسرا، ہیجڑا یا زنانہ) چونکہ عورتوں کے امور سے دلچسپی رکھتا تھا۔ لہٰذا آپ ﷺ نے اس سے حجاب کا حکم دیا اور داخلہ پر پابندی لگا دی۔

مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۖ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۚ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ۚ اِنْ

مالک ہوں[۴۵]۔ اپنے خادم مرد[۴۶] جو عورتوں کی حاجت نہ رکھتے ہوں اور ایسے لڑکے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے[۴۷] ابھی واقف نہ ہوئے ہوں۔ اور اپنے پاؤں زمین پر مارتے ہوئے[۴۸] نہ چلیں کہ جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہے اس کا لوگوں کو علم ہو جائے اور اے ایمان والو! تم سب مل کر اللہ کے حضور[۴۹] توبہ کرو توقع ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ گے۔(۳۱) اور تم میں سے جو لوگ مجرد[۵۰] ہیں ان کے نکاح کر دو۔ اور اپنے لونڈی، غلاموں کے بھی

[۴۵] دسویں قسم جن میں اپنی زیب وزینت چھپانے میں کوئی حرج نہیں وہ عورتوں کی اپنی کنیزیں ہیں۔ جن کی وہ خود یا ان کے خاوند مالک ہوں۔

[۴۶] ❁ اپنے خادموں سے بے حجاب ہونے کی مشروط اجازت:۔ تابعین سے مراد مطیع ومنقاد۔ نوکر چاکر اور شاگرد قسم کے لوگ ہیں۔ یہ گیارہویں قسم ہوئی۔ مگر ایسے لوگوں سے زیب وزینت کے اظہار کی رخصت صرف اس صورت میں ہے کہ انہیں ہمبستری کی خواہش ہی نہ ہو۔ اور خواہش کا نہ ہونا یا شہوانی جذبات کا بیدار نہ ہونا بچپن کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ زیادہ بڑھاپے کی وجہ سے بھی۔ بیماری یا نامردی کی وجہ سے بھی اور مالک کی عزت اور وقار کی وجہ سے بھی یعنی یہ خدام اپنی مالکہ سے ایسی بات کا تصور تک بھی نہ کر سکتے ہوں اور اپنے کام سے ہی غرض رکھیں اور اگر یہ خطرہ ہو کہ ایسے لوگوں کے شہوانی جذبات کسی وقت بھی بیدار ہو سکتے ہیں تو پھر ان سے یہ رخصت ختم ہو جاتی ہے۔ ان پر حجاب کے احکام لاگو ہو جاتے ہیں اور ان کے سامنے اظہار زیب وزینت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا ایسے جوان ڈرائیور، خانسامے، اور بیرے وغیرہ سے حجاب کی رخصت کی کوئی گنجائش نہیں، بالخصوص اس صورت میں کہ ان کی شادی بھی ابھی نہ ہوئی ہو۔

[۴۷] بچوں اور لڑکوں سے یہ رخصت اس وقت تک ہے جب تک وہ بالغ نہ ہوئے ہوں یعنی دس گیارہ سال تک کے بچوں کے سامنے تو عورت بے حجاب رہ سکتی ہے بعد میں نہیں۔ پس یہ بارھویں قسم ہوئی۔

[۴۸] ❁ چال پر پابندی:۔ یعنی عورتیں اس انداز سے اپنے پاؤں زمین پر نہ ماریں یا رکھ کر نہ چلیں کہ ان کے زیوروں کی جھنکار سنائی دینے لگے اور یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے کیا کچھ زیور پہن رکھے ہیں۔ اگر وہ ایسے ہی چھن چھن کرتے ہوئے چلے گی تو کیا معلوم اس کا پاؤں زمین پر پڑنے کے ساتھ ساتھ کسی عاشق مزاج کے دل پر بھی جا پڑے۔ اس قسم کی آواز بسا اوقات صورت دیکھنے سے بھی زیادہ شہوانی جذبات کو بھڑکانے کا سبب بن جاتی ہے۔

[۴۹] دور جاہلیت میں اور بالخصوص انکے مشہور میلوں کے موقع پر جس قدر فحش حرکات تم سے سرزد ہو چکی ہیں۔ ان سے اللہ کے حضور توبہ کرو۔ مرد ہوں یا عورتیں سب کے سب لوگوں کو سابقہ اطوار چھوڑ کر آئندہ ان باتوں اور ایسی حرکتوں سے کلی اجتناب کرنا چاہئے اسی طرح تمہارا معاشرہ فواحش سے پاک ہو سکتا ہے اور تمہاری دین ودنیا میں کامیابی کا انحصار ان باتوں پر پوری طرح عمل پیرا ہو جانے پر ہے۔

[۵۰] ❁ ایامیٰ کا لغوی مفہوم:۔ معاشرہ کے فواحش سے طہارت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ تم میں سے کوئی فرد خواہ وہ مرد

ہو یا عورت بے زوج نہ رہے۔ ایسے سب افراد کے نکاح کر دو۔ ایامی ایم کی جمع ہے اور یہ بڑے وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس سے مراد وہ مرد بھی ہیں جن کی بیوی یا بیویاں فوت ہو چکی ہوں یا طلاق دے چکے ہوں اور مجرد رہتے ہوں اور وہ عورتیں بھی جو بیوہ ہوں یا مطلقہ ہوں اور مجرد رہتی ہوں۔ نیز ان میں وہ کنوارے مرد اور کنواری عورتیں بھی شامل ہیں جن کی بلوغت کے بعد تادیر شادی نہ ہوئی ہو۔ لہٰذا اس لفظ کا معنی مجرد رہنا ہی قریب الفہم ہے۔ ایسے ہی مجرد افراد کے اولیاء کو یہ حکم دیا جارہا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: علی! تین کاموں میں دیر نہ کرنا، فرض نماز، جب اس کا وقت ہو جائے۔ جنازہ جب موجود ہو تو اسے دفن کرنے میں اور بیوہ عورت کے نکاح میں جب کہ اس کا کفو (بر، ہمسر) مل جائے" (ترمذی۔ ابواب الصلوۃ۔ باب ماجاء فی الوقت الاول من الفضل)

۞ مجرد افراد کے نکاح کا حکم:۔ ہمارے معاشرے میں عام طور مجرد مردوں یا مجرد عورتوں کے نکاح کو معیوب سمجھا جانے لگا ہے۔ اور کوئی فرد ہمت کر کے نکاح کر بھی کر لے تو اسے طعن و تشنیع کی جاتی ہے یا کم از کم اس کے اس کام پر ناک بھوں ضرور چڑھاتے ہیں کہ جب اس کے ہاں اولاد موجود ہے تو اسے نکاح کی کیا ضرورت تھی؟ انہیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ان کا یہ رویہ آیات اللہ کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ اس رواج کی کئی وجوہ ہیں۔ سب سے بڑی وجہ تو مغربی تہذیب سے مرعوبیت ہے۔ جہاں یک زوجگی کا قانون رائج ہے۔ فحاشی اور حرام کی سب راہیں کھلی ہیں اور یہ لوگ یہاں بھی یہی کچھ چاہتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بعض دفعہ اولاد اپنے مجرد باپ یا بیوہ ماں کے نکاح میں آڑے آتی ہے۔ اور اس کا بڑا سبب عموماً یہ ہوتا ہے کہ اگر اولاد پیدا ہوئی تو وہ وراثت میں شریک بن جائے گی۔ یا پھر جھوٹی قسم کی غیرت ہوتی ہے اس کی تیسری وجہ خاندانی منصوبہ بندی والوں کا پروپیگنڈہ ہے۔ اور اسی وجہ سے بلوغت کے بعد تادیر مجرد رہنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ یہ سب وجوہ مل کر ایک ایسا ماحول بن گیا ہے۔ جس میں حرام کاموں کے لئے تو سب سہولتیں میسر ہیں۔ مگر حلال کاموں پر عمل پیرا ہونا بہت مشکل بنادیا گیا ہے۔

ضمناً اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورت خواہ کسی عمر کی ہو اس کا ولی کے بغیر نکاح درست نہیں ہوتا۔ اور یہ بات احادیث میں پوری وضاحت سے مذکور ہے۔ چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ کوئی بھی عورت جو ولی کے بغیر نکاح کرے تو اس کا نکاح باطل ہے۔ تو اس کا نکاح باطل ہے تو اس کا نکاح باطل ہے۔ (ترمذی۔ ابواب النکاح۔ باب لانکاح الا بولی) لہٰذا اولیاء کو یہی حکم دیا جارہا ہے کہ وہ مجرد لوگوں کے نکاح کریں۔

اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں امر کا صیغہ وجوب کے لئے نہیں ہے یعنی معاشرہ یا اسلامی حکومت یا اولیاء پر یہ واجب نہیں کہ معاشرہ کا جو فرد بھی مجرد ہو اس کو پکڑ کر اس کا نکاح کرادے۔ بلکہ یہ امر استحباب کے لئے ہے۔ کیونکہ نکاح میں کچھ رکاوٹیں بھی ہو سکتی ہیں مثلاً جوڑ کا رشتہ نہ ملنا یا تنگدستی وغیرہ۔ البتہ معاشرہ کے افراد کے لئے بہتر بات یہی ہے کہ وہ مجرد لوگوں کے نکاح کے سلسلہ میں حتی الامکان تعاون کریں۔ اور جن لوگوں کے حالات نکاح کے لئے سازگار نہ ہوں انہیں آپ ﷺ نے روزے رکھنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ہم کچھ جوان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتے تھے اور (نکاح کے لئے) ہمارے پاس کچھ نہ تھا۔ تو آپ نے ہمیں ارشاد فرمایا کہ اے نوجوانو! تم میں سے جو کچھ خانہ آبادی کی استطاعت رکھتا ہے اسے چاہئے کہ نکاح کرلے کیونکہ نکاح نگاہ نیچی رکھنے اور شرمگاہ کی حفاظت کے لئے خوب چیز ہے اور جو اس کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ روزے رکھا کرے۔ روزے اس کی شہوت کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ڈھال کا

يَكُونُوا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ
نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ

جو نکاح کے قابل[۵۱] ہوں۔ اگر وہ محتاج ہیں تو اللہ اپنی مہربانی[۵۲] سے انہیں غنی کر دے گا۔ اور اللہ بڑی وسعت والا اور جاننے والا ہے۔(۳۲) اور جو لوگ نکاح (کا سامان) نہیں پاتے انہیں (زنا وغیرہ) سے بچے رہنا چاہیئے تا آنکہ اللہ انہیں اپنے فضل سے[۵۳] غنی کر دیں اور تمہارے غلاموں میں سے جو لوگ

کام دیں گے۔ (بخاری۔ کتاب النکاح۔ باب من لم یستطع الباءۃ فلیصم)

نیز سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو تبتل (مجرد یا عورت سے الگ تھلگ رہنے) کی اجازت نہ دی۔ اگر آپ اسے اجازت دے دیتے تو ہم خصی ہو جاتے۔ (بخاری۔ کتاب النکاح۔ باب مایکرہ من التبتل والخصاء)

[۵۱] لونڈی اور غلاموں کے ذکر میں صالحین کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جو یہاں دو مطلب ادا کر رہا ہے۔ ایک یہ کہ ان میں ازدواجی زندگی کو نباہنے کی صلاحیت موجود ہو۔ ایسا نہ ہو کہ نکاح کے بعد وہ ڈھیلے پڑ جائیں اور ان کا سارا بوجھ مالک پر پڑ جائے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ نیک ہوں اور پاک سیرت رہنا چاہتے ہوں اور فحاشی اور بدکاری سے بچنا چاہتے ہوں۔ جو بھی صورت ہو ان کے مالکوں کو چاہیئے کہ ان کے نکاح کے لئے ممکن حد تک کوشش کریں۔

[۵۲] رزق کی تنگی ترشی کا انحصار نکاح پر نہیں:۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو بھی محتاج شادی کرے گا شادی کے بعد وہ مالدار اور غنی ہو جائے گا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی نظر ظاہری اسباب تک محدود رہتی ہے۔ اور وہ انہیں ظاہری اسباب کو سامنے رکھ کر حساب لگاتا ہے۔ جبکہ اس کائنات میں ظاہری اسباب کے علاوہ بے شمار باطنی اسباب بھی موجود ہیں۔ جن پر انسان مطلع نہیں ہو سکتا اور وہ اسباب خالصتاً اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ لہٰذا جو لوگ اس وجہ سے نکاح میں پس و پیش کرتے ہیں کہ نکاح کے بعد بیوی بچوں کا بوجھ کیسے برداشت کریں گے۔ انہیں سمجھا دیا گیا کہ ایسے موہوم خطرات کی بنا پر نکاح سے مت رکو۔ تمہارا اور تمہارے بال بچوں کا رزق اللہ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ تم مجرد رہ کر غنی بن جاؤ گے یا نکاح کے بعد مفلس و قلاش ہو جاؤ گے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان نکاح کے بعد احساس ذمہ داری کی وجہ سے پوری طرح محنت کرنے لگتا ہے جو پہلے نہیں کرتا تھا۔ کبھی بیوی اس کے کسبِ معاش کے سلسلہ میں اس کی ممد و معاون بن جاتی ہے۔ کبھی بیوی کے کنبہ والے اس سلسلہ میں اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ کبھی مرد کے لئے کمائی اور آمدنی کی ایسی راہیں کھل جاتی ہیں جس کا اسے پہلے وہم و گمان بھی نہیں ہوتا گویا پیدا ہونے والے بچے اپنا رزق اپنے ساتھ لاتے ہیں جس کا ذریعہ ان کا والد بنتا ہے۔ لہٰذا یہ یقین رکھو کہ رزق کی تنگی اور فراخی کا انحصار نہ نکاح کرنے پر ہے اور نہ مجرد رہنے پر۔ لہٰذا اس بنا پر نکاح سے گریز نہ کرنا چاہیئے۔

[۵۳] اس آیت سے پہلی آیت کے حاشیہ میں ذکر ہو چکا ہے کہ جو جوان مرد نکاح اور خانہ آبادی کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے رکھنے کی تلقین فرمائی اور واضح فرما دیا کہ روزے رکھنا تمہارے عفیف اور پاکیزہ

عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا ۖ وَآتُوهُمْ مِنْ مَالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ ۚ وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ

مکاتبت[۵۴] کرنا چاہیں تو اگر تم ان میں بھلائی دیکھو تو ان سے مکاتبت کر لو۔ اور اس مال میں سے جو اللہ نے تمہیں دیا[۵۵] ہے انہیں بھی دے دو۔

اور تمہاری لونڈیاں اگر پاکدامن رہنا چاہیں تو انہیں[۵۶] اپنے دنیوی فائدوں کی خاطر بدکاری پر مجبور نہ کرو۔

رہنے میں بہت مددگار ثابت ہوگا۔ کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اسی ضبطِ نفس اور عفت کی برکت سے انہیں نکاح کا بہترین موقع مہیا فرما دے اور انہیں غنی بھی کر دے۔ کہ معاشرہ میں بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو خود تو غنی ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی بیٹیوں کے رشتہ کے سلسلہ میں ایسا جوڑ چاہتے ہیں جو شریف، نیک اور پاکیزہ سیرت انسان ہو۔ اور وہ اپنی بیٹی کی غربت کا خیال اس لئے نہیں کرتے کہ اس جوڑے کی غربت کا علاج ان کے پاس موجود ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اللہ کے فضل کی بے شمار راہیں ہیں۔ انسان کو بس اس کا فرمانبردار بن کر رہنا چاہئے۔

[۵۴] واضح رہے کہ عہدِ نبوی میں معاشرہ کا ایک کثیر حصہ غلاموں اور لونڈیوں پر مشتمل تھا۔ اور یہ معاشرہ کا جزو لاینفک بن چکا تھا۔ کسی شخص کی دولت کا معیار ہی یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کے پاس کتنے غلام ہیں۔ گویا یہ غلام ان آزاد لوگوں کی آمدنی کا ذریعہ بنتے تھے۔ منڈیوں میں غلاموں کی آزادانہ خرید و فروخت ہوتی تھی۔ جیسے ہمارے ہاں بھیڑوں اور گائے بھینسوں کی ہوتی ہے۔ اسلام نے اس غلامی کے رواج کو سخت ناپسندیدہ سمجھا۔ غلاموں کی آزادی کے لئے ہر ممکن صورت اختیار کی لیکن شراب اور سود کی طرح اس کا کلی طور پر خاتمہ نہیں کیا۔ وجہ یہ ہے کہ تاقیامت جنگیں ہوتی رہیں گی اور قیدی بنتے رہیں گے۔ ایسے مواقع پر ایک غیر مسلم حکومت کے فوجی مفتوح قوم کی عورتوں پر جس طرح کی دست درازیاں کرتے اور ظلم و ستم ڈھاتے ہیں وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اسلام ایسی فحاشی اور ایسے مظالم کو حرام قرار دیتا ہے اور اس کے بجائے ملک یمین کی حلال راہیں کھولتا ہے۔ اسی اعلیٰ اخلاقی قدر کی بنا پر اسلام نے جنگی قیدیوں اور ملک یمین کا مکمل طور پر خاتمہ نہیں کیا۔ اسلام نے غلامی کے رواج کی حوصلہ شکنی کے لئے بہت سے گناہوں کا کفارہ غلام کی آزادی قرار دیا۔ زکوٰۃ کے مصارف میں سے ایک مصرف یہ بھی فرمایا۔ مسلمانوں کو بہت بڑے اجر کا وعدہ فرما کر غلاموں کو آزاد کرنے اور کرانے کی ترغیب دی۔ غرض یہ باب بھی بڑا طویل ہے۔ ایسے ہی ذرائع میں سے مکاتبت بھی غلاموں کی آزادی کا ایک ذریعہ ہے۔ مکاتبت کا لغوی معنی تو باہمی تحریر یا لکھا پڑھی ہے۔ اور اصطلاحاً اس سے مراد وہ (تحریری یا زبانی) معاہدہ ہے جو غلاموں کی آزادی کے سلسلہ میں مالک اور غلاموں کے درمیان باہمی رضامندی سے طے ہو جائے۔ مثلاً یہ کہ غلام یہ وعدہ کرے کہ میں اتنی رقم اتنی مدت کے بعد یا مدت کے اندر یکمشت یا بالاقساط ادا کروں گا اگر کوئی غلام اپنے مالک سے ایسی درخواست کرے تو مالک کو ایسی درخواست قبول کر لینا چاہئے۔ اس معاہدہ پر مزید کسی شرط کے اضافہ کی مالک کے لئے گنجائش نہیں ہوتی جیسا کہ درج ذیل حدیث سے ظاہر ہے:

عمرہ بنت عبدالرحمٰن کہتی ہیں کہ: بریرہ لونڈی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی وہ اپنی کتابت کے سلسلہ میں سیدہ عائشہؓ سے مدد چاہتی تھی۔ انہوں نے کہا: ''اگر تو چاہے تو میں تیرے مالکوں کو رقم ادا کر دیتی ہوں مگر ولاء (تیرا ترکہ) میرا ہوگا'' اور اس کے مالکوں نے اسے کہا: اگر تو چاہے کتابت کی بقایا رقم دے دے پھر خواہ وہ تجھے آزاد کر دیں۔ مگر اس کا ترکہ

ہم ہی لیں گے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب آپ ﷺ تشریف لائے تو میں نے آپ سے اس بات کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم بریرہ کو خرید کر آزاد کر دو۔ اور ترکہ تو اسی کا ہوتا ہے جو آزاد کرے'' پھر آپ ﷺ منبر پر چڑھے اور فرمایا: ''لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو ایسی شرطیں لگاتے ہیں جو اللہ کی کتاب میں نہیں ہیں۔ اور ایسی شرطیں جو اللہ کی کتاب میں نہ ہوں۔ خواہ کوئی سو شرطیں لگائے اسے کچھ بھی نہ ملے گا'' (بخاری۔ کتاب الصلوۃ۔ باب ذکر البیع والشراء علیٰ منبر المسجد)

۞ اگر غلام مالک سے مکاتبت کرنا چاہے تو اسے مان لینا چاہئے:۔ مالک کے لئے یہ امر وجوب کے لئے ہے۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ مالک اگر چاہے تو غلام کی مکاتبت کی درخواست کو قبول کرے اور چاہے تو نہ کرے اور مالک مکاتبت پر رضامند نہ ہو تو اسے اسلامی حکومت کی طرف سے ایسے معاہدہ کے لئے مجبور کیا جائے۔ البتہ ایسی مکاتبت کے لئے ایک شرط اللہ تعالیٰ نے خود ہی بتا دی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر مالک اپنی دیانتداری کے ساتھ اپنے لالچ کے بغیر یہ سمجھے کہ یہ آزادی فی الواقع غلام یا لونڈی کے حق میں بہتر نہ ہو گی۔ قید غلامی سے رہا ہو کر وہ چوری، بدکاری یا اور طرح طرح کی بدمعاشیاں نہ کرتا پھرے گا۔ اگر یہ اطمینان ہو تو اسے ضرور آزاد کر دینا چاہئے۔ کہ وہ آزاد ہو کر معاشرہ میں اپنا مقام پیدا کر سکے اور اگر نکاح کرنا چاہے تو اپنے اختیار سے کر سکے۔ نیز کسی بھی میدان میں غلامی کی وجہ سے اس کے لئے میدان تنگ نہ ہو۔ یا پھر خیر کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ آیا وہ اپنے اس عہد کو نباہ بھی سکتا ہے یا نہیں یعنی اپنے معاوضہ کی رقم ادا کرنے کے قابل ہے یا نہیں۔

[۵۵] ۞ مکاتب کی مالی امداد:۔ اس جملہ کے مخاطب عام افراد معاشرہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ مکاتبت کرنے والے غلام کی رقم کی ادائیگی کے سلسلہ میں اس کی مالی امداد کریں۔ غلاموں کے مالک بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ طے شدہ رقم کا کچھ حصہ چھوڑ دیں اور اسلامی حکومت بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ایسے شخص سے زکوٰۃ فنڈ میں سے مالی تعاون کریں۔

[۵۶] غلام اور لونڈیوں کو اہل عرب اپنی آمدنی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ جتنے کسی کے پاس زیادہ غلام ہوتے اتنا ہی وہ زیادہ مالدار ہوتا جاتا تھا۔ اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے آج کل ایک کارخانہ میں دس مزدور کام کرتے ہیں اور دوسرے میں پچاس۔ تو پچاس مزدوروں والے کارخانہ کا مالک یقیناً پہلے سے بہت زیادہ مالدار ہو جائے گا۔ اس سلسلہ میں بعض بدباطن اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے اپنی لونڈیوں سے پیشہ بھی کرواتے تھے۔ اور عبداللہ بن ابی منافق رئیس المنافقین اس سلسلہ میں بہت مشہور تھا۔ اس کی بعض لونڈیاں مسلمان ہو گئیں تو انہوں نے پیشہ کرنے سے انکار کر دیا جس پر وہ ملعون انہیں زدوکوب کرتا تھا۔ یہ آیت اسی بارے میں نازل ہوئی۔ (مسلم۔ کتاب التفسیر عن جابر)

زنا بذاتِ خود ایک حرام اور مذموم فعل ہے۔ ان دو جملوں نے زنا کی قباحت میں مزید اضافہ کر کے ایسی حرکت کو شدید ترین جرم بنا دیا ہے۔ یعنی اگر لونڈیاں پاک دامن نہ رہنا چاہیں تو بھی زنا حرام اور مذموم ہے اور اگر وہ پاک دامن بھی رہنا چاہتی ہوں پھر جبراً ان سے یہ کام کروایا جائے تو یہ شدید جرم بن جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی فرد کسی لالچ کے بغیر زنا کرتا ہے یا کرواتا ہے تو بھی اس کی حرمت اور مذمت بدستور قائم ہے۔ پھر یہ کام جب محض دنیا کے حقیر فائدے کے خاطر کرایا جائے تو اس جرم کی شدت اور شناعت مزید بڑھ جاتی ہے۔

تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۳﴾
وَلَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۴﴾ ع
اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ

اور جو کوئی انہیں مجبور کرے [۵۷] تو ان پر جبر کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں بخش دینے والا اور رحم کرنے والا ہے۔(۳۳) ہم نے تمہاری طرف واضح احکام بتانے والی آیات بھی نازل کی ہیں اور ان لوگوں کی مثالیں [۵۸] بھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور پرہیزگاروں کے لئے نصیحتیں بھی نازل کر دی ہیں۔(۳۴)

اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا نور [۵۹] ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق ہو جس میں ایک چراغ ہو،

[۵۷] یعنی جس کو بدکاری پر مجبور کر دیا گیا ہو۔ اللہ اسے اس کا یہ گناہ معاف فرمائے گا۔ بلکہ اس کا یہ گناہ جبر کرانے والے کے گناہ میں شامل کر دیا جائے گا۔ اور ترمذی کے حوالہ سے یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ جس عورت سے بالجبر زنا کیا گیا تھا اس سے حد زنا ساقط کر دی گئی تھی۔

[۵۸] واضح احکام سے مراد وہ تمام احکام ہیں جو ابتدائے سورہ نور سے بیان ہو رہے ہیں یعنی زنا اور قذف کی حد۔ لعان کا طریقہ۔ معاشرہ کو فحاشی سے پاک رکھنے کے لئے احکام وہدایات وغیرہ۔ اور پہلے لوگوں کی مثالیں بیان کرنے سے مراد یہ ہے کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ تم سے پہلے جن جن لوگوں نے اللہ کے احکامات سے سرتابی کی تو ایسی قوموں کا کیا حشر ہوا۔ اور ان کا یہ حشر بھی پہلے متعدد مقامات پر مذکور ہو چکا ہے۔ لہٰذا اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے ان سابقہ نظائر میں بہت سے نصیحت آموز اسباب موجود ہیں۔

[۵۹] قرآن میں عموماً جہاں کہیں بھی آسمانوں اور زمین کا اکٹھا ذکر آیا ہے وہاں اس سے مراد پوری کائنات ہوتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا نور ہے یا پوری کائنات کو روشن کرنے والا ہے۔

نور کی اقسام:۔ نور تین قسم کا ہوتا ہے (۱) روشن چیزوں کا نور مثلاً سورج، چاند، ستاروں اور چراغ یا برقی قمقموں کا نور۔ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے۔ ایسے نور کے بغیر انسان ظاہری چیزوں کو دیکھ نہیں سکتا۔ (۲) آنکھ کا نور جس کی عدم موجودگی میں روشن چیزوں کا نور بے کار ہوتا ہے۔ سورج نکلا ہوا ہو تب بھی آنکھ کے اندھے کو کوئی چیز نہیں نظر آتی۔ (۳) وحی یا علم دین کا نور جس کی عدم موجودگی میں انسان ہدایت کے نور سے استفادہ نہیں کر سکتا جس طرح ایک اندھا سورج کی روشنی میں بھی ظاہری اشیاء کو نہیں دیکھ سکتا اسی طرح دل کے اندھے کے لئے تعلیمات الٰہیہ بے کار ثابت ہوتی ہیں۔ اب دیکھئے آنکھ کا نور بھی خالصتاً اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ اس کی ماہیت کیا ہے؟ یہ بات سمجھنا غالباً انسان کی بساط سے باہر ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کا نور بصارت چھین لے تو کوئی طاقت اسے واپس نہیں لا سکتی۔ اور اسی آنکھ کے نور سے ہم کائنات کی اشیاء کو دیکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا اصل منبع نور خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہوئی اور اسی کے نور سے کائنات کی ایک ایک چیز کی نمود ہے۔

اور دوسری طرف دل کا نور بھی خالصتاً اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے اور اسی نور سے انسان آیات انفس و آفاق میں فکر و تدبیر کرتا ہے اور وحی الٰہی سے فیض یاب ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جس شخص کو نور و ہدایت حاصل ہوا یا جس مقدار میں حاصل ہوا سب کچھ اسی منبع نور سے حاصل ہوا ہے۔ بعض علماء نے یہاں نور کے معنی منور کیا ہے۔ اس لحاظ سے پہلی توجیہ فٹ بیٹھتی ہے لیکن نور کا لفظ منور سے زیادہ ابلغ ہے۔ پھر نور کا لفظ ہر دو توجیہات کے مطابق ہے۔ لہٰذا ہمارے خیال میں نور کا معنی نور یا

اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ۭ نُوْرٌ عَلٰي نُوْرٍ ۭ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ

یہ چراغ فانوس میں رکھا ہوا ہو، وہ فانوس ایسا صاف شفاف ہو جیسے ایک چمکتا ہوا ستارہ۔ اور وہ چراغ زیتون کے مبارک درخت (کے تیل) سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ مشرق میں ہوتا ہے اور نہ مغرب میں۔ اس کے تیل کو اگر آگ نہ بھی چھوئے تو بھی وہ ازخود بھڑک اٹھنے کے قریب ہوتا ہے (اس طرح) روشنی پر روشنی[۶۰] (بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں) اللہ اپنے ایسے ہی نور کی طرف جسے چاہتا ہے، رہنمائی[۶۱] کر دیتا ہے۔ اور اللہ مثالیں بیان کر کے لوگوں

روشنی ہی سمجھا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

[۶۰] ۞ اللہ ہی کائنات کا نور ہے:۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے نور کی جو مثال بیان فرمائی ہے۔ اس کی مندرجہ بالا دو توجیہات کے مطابق دو صورتیں ہیں۔ پہلی توجیہ کے مطابق یہ پوری کائنات ایک طاق کی مانند ہے۔ اور اس میں جس چراغ کی روشنی کی مثال پیش کی گئی ہے وہ اللہ کا نور ہے۔ باقی جو باتیں مذکور ہیں وہ اس لحاظ سے ہیں کہ ایک انسان زیادہ سے زیادہ اور صاف شفاف روشنی کا جو تصور اس دور میں کر سکتا تھا وہ پیش کیا گیا ہے مثلاً ایک یہ ہے کہ وہ چراغ ایک طاق میں ہے جس کا مطلب یہ ہے روشنی کے پھیلاؤ کا دائرہ وسیع نہیں بلکہ بہت محدود حصہ میں ہے تاکہ طاق میں پڑی ہوئی ہر چیز بڑی واضح اور نمایاں نظر آسکے۔ دوسرے یہ کہ اس چراغ میں جلنے والا تیل زیتون کا تیل ہے۔ جو دوسرے تمام قسم کے تیلوں سے زیادہ اور صاف روشنی دیتا ہے۔ مزید یہ کہ وہ زیتون کا درخت ہر وقت دھوپ میں رہتا ہے۔ مشرقی اور مغربی رخ کے سائے اس درخت پر نہیں پڑتے اور ایسے ہمیشہ دھوپ میں رہنے والے درخت کا تیل عام درختوں کے تیل سے زیادہ لطیف ہوتا ہے نیز اس میں یہ خاصیت ہے کہ آگ لگانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ آگ نزدیک ہونے سے ہی بھڑک اٹھتا ہے۔ جیسا کہ آج کل پٹرول میں یہ خاصیت پائی جاتی ہے۔ اور تیسرے یہ کہ اس چراغ کے گرداگرد نہایت صاف شفاف شیشہ یا فانوس ہے۔ اور ایسے فانوس سے جس قدر روشنی میں اضافہ ہوتا ہے اس کا اندازہ آپ کسی لالٹین سے اس کی شیشہ کی چمنی اتار کر سکتے ہیں۔ گویا چراغ کی روشنی کو سہ بالا یا نور علی نور کرنے والی تین چیزیں ہوئیں۔ ایک تیل کی اعلیٰ کوالٹی، دوسرے صاف شفاف فانوس اور تیسرے روشنی کا دائرہ بہت محدود ہونا اور مثال کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ایسی روشنی سے کائنات کی ایک ایک چیز کو منور کر رہا ہے۔

۞ نورِ ایمانی کی وحی الٰہی کیلئے بے تابی:۔ اور دوسری صورت میں چراغ اور اس کے تیل سے مراد نور بصیرت یا نور ایمان ہے۔ فانوس سے مراد انسان کا دل ہے۔ جس میں یہ نور بصیرت واقع ہوتا ہے اور طاق سے مراد اس کا جسم ہے۔ پھر جب ہدایت یا آیات الٰہی پہنچتی ہیں تو ایسے شخص کی بصیرت اس کو قبول کرنے کیلئے پہلے ہی بے تاب ہوتی ہے۔ اب اگر کسی کے دل میں نور بصیرت ہوگا۔ جس کا منبع خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ تو ایسے ہی شخص کو یہ آیات فوراً اپیل کرتی اور نظر آنے لگتی ہیں۔ بے بصیرت کو نظر نہیں آتیں۔ یہ دوسری توجیہ کتاب و سنت سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اکثر آسمانی کتب کیلئے بھی نور کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور علم وحی اور ہدایت کیلئے بھی۔ اور اس مثال کا مطلب یہ ہے کہ جس کسی کے دل میں نور بصیرت کا عطیہ موجود ہوتا ہے وہ احکام الٰہی اور وحی الٰہی کو قبول کرنے کیلئے اس قدر بے تاب ہوتا ہے جیسے پٹرول آگ پکڑنے کیلئے بے تاب ہوتا ہے۔

[۶۱] جس طرح آنکھ کا نور اللہ تعالیٰ ہر شخص کو فطری طور پر عطا کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر شخص کو نور بصیرت بھی عطا کرتا

الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۳۵﴾ فِي بُيُوتٍ أَذِنَ اللَّهُ أَن تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ يُسَبِّحُ لَهُ فِيهَا بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ ﴿۳۶﴾ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ ۙ

کو سمجھاتا ہے اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔(۳۵) (یہ) ان گھروں (مساجد وغیرہ) میں ہوتے ہیں جن کے متعلق اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان میں اللہ کا نام بلند کیا جائے اور ان کا ذکر کیا جائے[۶۲] ان (مساجد) میں صبح و شام ایسے لوگ اللہ کی تسبیح کرتے رہتے ہیں۔(۳۶) انہیں اللہ کے ذکر، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے نہ تجارت غافل کرتی ہے اور نہ خرید و فروخت،

ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کا ایک دوسرا قانون یہ ہے کہ جس عضو یا قوت سے انسان کام لینا چھوڑ دے وہ قوت اس سے چھین لی جاتی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی ہدایت نصیب انہی لوگوں کو ہوتی ہے جو خود بھی اس سے کام لینے کی کوشش کرتے ہیں اور جو شخص نور ہدایت کا طالب ہی نہ ہو تو اللہ زبردستی سے کسی کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

[۶۲] بعض علماء نے یہاں بیوت سے مراد مساجد لی ہیں اور ترفع سے مراد انہیں تعمیر کرنا لیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے نورِ بصیرت عطا کیا ہوتا ہے اور وہ ہر وقت حق کے متلاشی رہتے ہیں اور جب انہیں اللہ کی آیات سنائی جائیں تو وہ انہیں تسلیم کرنے کیلئے پہلے سے ہی تیار بیٹھے ہوتے ہیں ایسے لوگ مساجد میں پائے جاتے ہیں۔ انہیں دیکھنا ہو تو اللہ کی مساجد میں دیکھو جہاں ہر وقت اللہ کا ذکر بلند ہوتا رہتا ہے۔ اور صبح و شام وہاں ایسے لوگ نمازوں اور تسبیح و تہلیل میں مصروف رہتے ہیں۔

اگرچہ یہ توجیہ بھی درست ہے مگر یہاں ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں جس کی بنا پر بیوت کے لفظ کو صرف مساجد تک محدود کر دیا جائے لہٰذا اکثر علماء کے نزدیک بیوت سے مراد سب مومنوں کے گھرانے ہیں۔ اور ہر گھر میں اللہ کا ذکر بھی ہوتے رہنا چاہئے اور تسبیح و تہلیل بھی۔ حتیٰ کہ فرض نمازوں (یعنی جو نماز باجماعت ادا کرنا ضروری ہے جنہیں ہم اپنی زبان میں ہر نماز کی فرض رکعات کہتے ہیں) کے علاوہ نماز کا باقی حصہ سنت یا نفلی نمازیں بھی اپنے اپنے گھروں میں ادا کرنا بہتر ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص مساجد میں جانے سے معذور ہو تو وہ فرض نمازیں بھی گھر پر (اکیلے یا باجماعت) ادا کر سکتا ہے۔ جیسا کہ درج ذیل احادیث سے واضح ہوتا ہے:

۱۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جب سے مجھے ہوش آیا میں نے اپنے والدین کو مسلمان ہی پایا۔ اور ہم پر کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا جس دن آپ ﷺ ہمارے ہاں نہ آئے ہوں۔ صبح و شام آپ دو وقت تشریف لاتے پھر ابو بکرؓ کے جی میں آیا تو انہوں نے اپنے صحن میں ایک مسجد بنائی وہ وہاں نماز ادا کرتے اور قرآن پڑھتے۔ مشرکوں کی عورتیں کھڑی ہو کر سنا کرتیں ان کے بچے بھی سنتے اور تعجب کرتے اور سیدنا ابو بکرؓ کو دیکھتے رہتے ابو بکرؓ ایک رونے والے آدمی تھے تو اپنی آنکھوں سے آنسو روک نہ سکتے۔ یہ صورت حال دیکھ کر مشرکین قریش سٹ پٹا گئے۔ (بخاری۔ کتاب الصلوٰۃ۔ باب الاستلقاء فی المسجد ومد الرجل)

۲۔ گھروں میں نوافل کی ادائیگی:۔ محمود بن ربیع الانصاری کہتے ہیں کہ عتبان بن مالک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے تھے اور بدر کی جنگ میں شریک تھے۔ وہ آپ ﷺ کے پاس آئے اور عرض کیا: "یا رسول اللہ ﷺ! میری بینائی

يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ ﴿٣٧﴾ لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَيَزِيدَهُم مِّن

وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں۔ جس میں دل اور آنکھیں [۶۳] الٹ جائیں گی (۳۷) (اور وہ لوگ یہ سب کچھ اس لئے کرتے ہیں کہ) جو عمل وہ کرتے رہے ہیں اللہ انہیں ان کا بہتر بدلہ دے اور اپنے فضل سے [۶۴]

بگڑ گئی ہے اور میں اپنی قوم کے لوگوں کو نماز پڑھایا کرتا ہوں۔ جب مینہ برسے تو نالہ بہنے لگتا ہے جو میرے اور ان کے درمیان ہے۔ لہٰذا میں ان کی مسجد میں جا نہیں سکتا کہ ان کو نماز پڑھا سکوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ﷺ میرے ہاں تشریف لائیں اور میرے گھر میں نماز پڑھیں تو میں اس جگہ کو مسجد بنا لوں" آپ ﷺ نے فرمایا: "اچھا میں انشاء اللہ یہ کام کروں گا" چنانچہ (دوسرے دن) صبح آپ ﷺ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ دونوں دن چڑھے میرے ہاں آئے۔ آپ نے اندر آنے کی اجازت مانگی میں نے اجازت دی۔ آپ ﷺ تشریف لائے اور بیٹھنے سے پہلے ہی پوچھا: "اپنے گھر میں کون سی جگہ پسند کرتے ہو جہاں میں نماز پڑھوں؟" عتبان نے آپ کو گھر کا ایک کونہ بتایا۔ آپ ﷺ وہاں کھڑے ہوئے اور اللہ اکبر کہا ہم بھی کھڑے ہوئے اور صف باندھی آپ نے دو رکعت (نفل) پڑھ کر سلام پھیرا۔ پھر ہم نے حلیم تیار کر کے آپ ﷺ کو روک لیا۔ محلّہ کے اور آدمی بھی گھر میں جمع ہو گئے۔ ان میں ایک آدمی کہنے لگے: مالک بن دخیشن یا دخشن کہاں ہے؟ کسی نے (عتبان سے) کہا: وہ تو منافق ہے۔ اللہ اور اس کے رسول سے محبت نہیں رکھتا" آپ ﷺ نے فرمایا: "ایسا مت کہو۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ وہ خالصتاً اللہ کی رضا کے لئے لا الہ الا اللہ کہتا ہے" عتبان کہنے لگے: اللہ اور اس کا رسول خوب جانتے ہیں۔ بظاہر تو ہم اس کی توجہ اور ہمدردی منافقوں کی طرف ہی دیکھتے ہیں" آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ عزوجل نے آگ کو اس شخص پر حرام کر دیا ہے جو خالصتاً اللہ کی رضامندی کے لئے لا الہ الا اللہ کہتا ہے" (بخاری۔ کتاب الصلوۃ۔ باب المساجد فی البیوت)

[۶۳] ان ہدایت یافتہ لوگوں کی صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ گھروں کے اندر بھی اللہ کی یاد میں مشغول رہتے ہیں اور گھروں سے باہر بھی اللہ کی یاد سے غافل نہیں رہتے۔ اپنے کام کاج یا کاروبار کرتے وقت بھی اللہ کی یاد ان کے دلوں میں موجود رہتی ہے جو انہیں اللہ کی نافرمانی والے ہر کام سے باز رکھتی ہے۔ وہ صرف اس چند روزہ زندگی کے فائدوں کے ہی طلب گار نہیں ہوتے بلکہ ان کی نگاہ آخرت کی ابدی زندگی پر جمی رہتی ہے اور اللہ کے حضور وہ اپنے اعمال کی جواب دہی سے ڈرتے بھی رہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ دن ہی اتنا سخت اور ہولناک ہوگا جس میں ہر شخص کا دل بھی بے قرار ہوگا اور آنکھیں بھی بے قرار ہوں گی۔ اور ان ہدایت یافتہ لوگوں کا بھی یہ حال ہوگا۔ کہ کبھی وہ اللہ کی رحمت کی امید لگائے ہوں گے اور اللہ کے عذاب سے اور اس کی گرفت سے ڈرنے لگیں گے۔ یہی حال آنکھوں کا ہوگا کبھی وہ دائیں طرف دیکھیں گی اور کبھی بائیں طرف تاکہ یہ دیکھیں کس جانب سے ان کا نامہ اعمال ان کے حوالہ کیا جاتا ہے۔

[۶۴] وہ لوگ اس توقع پر یہ سارے کام کرتے ہیں کہ اللہ کے ہاں اپنے ان عملوں کا بہتر بدلہ ملے۔ جو یقیناً انہیں مل جائے گا۔ اللہ صرف ان کے اعمال کا بہتر بدلہ ہی نہ دیں گے بلکہ اس کے علاوہ انہیں ایسی ایسی نعمتوں سے نوازیں گے جو اس وقت ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آ سکتیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جس شخص پر راضی اور خوش ہو جائیں تو اللہ کے ہاں کس چیز کی کمی ہے جو اسے نہ دے گا۔

فَضْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۳۸ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ
الظَّمْاٰنُ مَاۗءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـــًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ
الْحِسَابِ ۝۳۹ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ

زیادہ بھی دے اور اللہ جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق عطا کرتا ہے۔(۳۸) اور جو کافر ہیں ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹیل میدان میں کوئی سراب[۶۵] ہو جسے پیاسا پانی سمجھ رہا ہو حتیٰ کہ جب وہ اس سراب کے قریب آتا ہے تو وہاں کچھ بھی نہیں پاتا۔ بلکہ اس نے اللہ کو وہاں موجود پایا جس نے اس کا حساب چکا دیا اور اللہ کو حساب چکانے میں دیر نہیں لگتی۔(۳۹) یا (پھر کافروں کے اعمال کی مثال ایسی ہے) جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرے ہوں جسے موج نے ڈھانپ لیا ہو، پھر اس کے اوپر ایک اور موج ہو اور اس کے اوپر بادل ہو ایک تاریکی[۶۶] پر ایک اور تاریکی

[۶۵] سراب اور شراب کا لغوی فرق:۔ عربی زبان میں ہر مشروب یعنی پینے کی چیز کو شراب کہتے ہیں اور جو چیز بظاہر تو شراب نظر آئے مگر حقیقت اس کے برعکس ہو اسے سراب کہتے ہیں۔ پھر اس لفظ کا استعمال اس تودہ ریت پر ہونے لگا جو دور سے ایک خاص زاویہ سے سورج کی روشنی میں ٹھاٹھیں مارتا پانی نظر آتا ہے مگر حقیقتاً وہاں پانی وانی کچھ نہیں ہوتا۔

عام کافروں اور منافقوں کی مثال:۔ یہ مثال ایسے کافروں اور منافقوں سے تعلق رکھتی ہے جو فی الجملہ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور کچھ نیک اعمال بھی بجا لاتے ہیں۔ خواہ وہ نمود و نمائش کے لئے ہوں پھر انہیں یہ توقع بھی ہوتی ہے کہ آخرت میں انہیں ان کا اجر ملے گا۔ اور چونکہ ان کے اکثر اعمال اللہ کی مرضی نہیں بلکہ ان کی اپنی مرضی کے مطابق ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی لوگوں کی مثال بیان کرتے ہوئے فرمایا: کہ جس طرح کسی ریگستان میں ایک پیاسا دور سے چمکتی ہوئی ریت کو پانی سمجھ کر اس کی طرف جاتا ہے تاکہ اس سے اپنی پیاس بجھائے۔ وہ پیاس کا مارا جب گرم ریت کا میدان طے کر کے دوڑتا ہوا وہاں پہنچتا ہے تو اسے وہاں کچھ نہیں ملتا۔ اور سخت مایوس اور درماندہ ہو جاتا ہے۔ یہی حال ایسے کافروں کا ہے۔ موت کا وقت ان کے لئے سراب ہے۔ اور وہ توقع لگائے بیٹھے ہیں کہ انہیں ان کے نیک اعمال کا بدلہ ملے گا۔ مگر کفر و نفاق اور شامتِ اعمال کی بنا پر انہیں وہاں کچھ بھی ان کے اعمال کا بدلہ نہ ملے گا۔ اور جس طرح پیاسے کو سراب تک پہنچنے میں تھکاوٹ اور گرمی کی شدت بھی جھیلنا پڑی تھی اس طرح ان لوگوں کو ان کے برے اعمال کا بدلہ جہنم کے عذاب کی صورت میں دیا جائے گا۔

[۶۶] یہ ان کافروں کی مثال ہے جو اپنے کفر میں پکے اور ہٹ دھرم ہیں۔ وہ صرف اللہ کی نافرمانی اور رسولوں کی تکذیب پر ہی اکتفا نہیں کرتے۔ بلکہ رسول اور مومنوں کو ایذائیں اور دکھ بھی پہنچاتے ہیں اور اللہ کی راہ روکنے کے لئے ہر وقت سرگرم عمل رہتے ہیں۔ اس طرح ان کے کفر کا جرم شدید تر ہوتا جاتا ہے اور اس پر ان کے کفر کی کئی تہیں چڑھتی جاتی ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص گہرے سمندر میں رات کے وقت سفر کر رہا ہو۔ موجوں پر موجیں اٹھ رہی ہوں اور اوپر گہرے بادل بھی چھائے ہوں۔ اس طرح تین چار طرح کی تاریکیاں مل کر ایک ایسا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہو جاتا ہے کہ اگر وہ شخص اپنا ہاتھ اپنی آنکھ کے سامنے لائے تو اپنے ہاتھ کو دیکھ بھی نہ سکے۔ کیا ایسے شخص سے توقع ہو سکتی ہے کہ سیدھی راہ پر اپنا سفر جاری رکھ سکے

بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ إِذَآ أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهُ نُوْرًا فَمَا لَهُ مِنْ نُّوْرٍ ﴿۴۰﴾ ع ۵

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيْحَهُ ؕ

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَإِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۴۲﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ

چڑھی ہو اگر کوئی شخص اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھ سکے اور جسے اللہ روشنی نہ عطا کرے[۶۷]، اس کے لئے (کہیں سے بھی) روشنی نہیں (مل سکتی)۔(۴۰) کیا تم دیکھتے نہیں کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے (اور فضا میں) پر پھیلائے ہوئے[۶۸] پرندے بھی، یہ سب اللہ ہی کی تسبیح کر رہے ہیں۔ ہر مخلوق کو اپنی[۶۹] نماز اور تسبیح کا طریقہ معلوم ہے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ سب کچھ جانتا ہے۔(۴۱) نیز آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے اور اسی کی طرف سب کی بازگشت ہے۔(۴۲) کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ بادل کو

گا۔ اللہ تعالیٰ نے کفر کو ہمیشہ اندھیرے یا اندھیروں سے اور ہدایت کو روشنی سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس معاند اور ہٹ دھرم کا تو یہ حال ہے کہ اس پر ایسے اندھیروں کے کئی ردے چڑھے ہوئے ہیں پھر اسے بھلا راہ ہدایت نصیب ہو سکتی ہے۔

[۶۷] یہ مضمون ﴿اللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ سے شروع ہوا تھا اور یہ اس مضمون کا اختتام ہے۔ منبع ہدایت اور نور تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ پھر جو شخص اللہ کی طرف رجوع ہی نہ کرے۔ بلکہ اللہ سے باغیانہ اور معاندانہ روش اختیار کرے۔ اسے ہدایت کی روشنی کیسے نصیب ہو سکتی ہے؟

[۶۸] کافروں کی دو مثالیں بیان کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ نے کائنات سے کچھ اپنی ایسی نشانیاں بیان فرمائی ہیں۔ جن میں غور کرنے سے انسان اللہ تعالیٰ کی معرفت یا نور ہدایت حاصل کر سکتا ہے۔ ان نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پرندوں کو فطری طور پر ایسا طریقہ سکھا دیا کہ وہ زمین اور آسمان کے درمیان فضا میں اپنے پر کھولے ہوئے اور قافلہ کی صورت میں قطار در قطار اڑتے پھرتے ہیں۔ اور وہ زمین پر گر نہیں پڑتے۔ پھر بعض دفعہ وہ اڑتے اڑتے اپنے پروں کو سمیٹ بھی لیتے ہیں۔ مگر گرتے پھر بھی نہیں۔ آخر ان پرندوں کو یہ طریقہ کس نے سکھایا؟ زمین کی کشش ثقل جو کاغذ کے ایک ہلکے سے پرزے کو اپنی طرح کھینچ لیتی ہے انہیں کیوں نہیں کھینچتی؟

[۶۹] ❁ کائنات کی ہر چیز کی نماز اور تسبیح:۔ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے قانون کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے۔ جس کام پر اسے اللہ نے لگا دیا ہے بلا چون وچرا اس کو سر انجام دے رہی ہے۔ اور فطری قانون ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے بنائے ہیں۔ ان سے سر مو تجاوز نہیں کرتی۔ ایسی اطاعت کو بھی ان کی نماز اور تسبیح کہا جا سکتا ہے۔ تاہم ان اشیاء کی نماز اور تسبیح اس کے علاوہ کچھ اور ہی چیز ہے جسے ہم انسان یا جن جو مکلف مخلوق ہیں، جان نہیں سکتے۔ اور تسبیح کرنے والی اشیاء اپنی نماز اور تسبیح اور اس کے طریق کار کو خوب جانتی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۴۴ میں بتا دیا کہ تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے۔

سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهُ ثُمَّ يَجْعَلُهُ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ

آہستہ آہستہ [۷۰] چلاتا ہے پھر بادل (کے اجزاء) کو آپس میں ملا دیتا ہے پھر اسے تہ بہ تہ بنا دیتا ہے پھر تو دیکھتا ہے کہ اس کے درمیان سے بارش کے قطرے ٹپکتے ہیں اور وہ آسمان سے ان پہاڑوں کی بدولت جو اس

[۷۰] مشکل یہ پیش آتی ہے کہ ہمارے علمائے ہیئت نے اللہ کی ہر نشانی میں کچھ ایسے طبعی قوانین دریافت فرما رکھے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا دستِ قدرت کہیں کام کرتا نظر نہ آئے اور یہی قوانین سکولوں اور کالجوں میں بچوں کو پڑھائے جاتے ہیں۔ مثلاً بارش کے لئے دریافت کردہ طبعی قوانین یہ ہیں کہ سمندر پر سورج کی گرمی سے بخارات بن کر اوپر اٹھتے ہیں۔ پھر ہواؤں کا رخ ان بخارات کو کسی مخصوص سمت کی طرف اڑائے لے جاتا ہے۔ تا آنکہ یہ بخارات کسی سرد منطقہ فضائی میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر یہ بخارات پھر پانی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اور بارش ہونے لگتی ہے اور اگر شدید سرد منطقہ میں پہنچ جائیں تو پھر اولے برسنے لگتے ہیں انہی اصولوں کے مطابق ہمارے ہاں پاکستان میں بارش یوں ہوتی ہے کہ جون جولائی کے گرم مہینوں میں بحیرہ عرب سے بخارات اٹھتے ہیں جو کوہ ہمالیہ سے آکر ٹکراتے ہیں یہاں ہوائیں پھر ان کا رخ پاکستان کی طرف موڑ دیتی ہیں اور وہ اس پہاڑ کے سرد حصوں میں پہنچ کر پانی بن جاتے ہیں اور اس طرح موسم برسات یا جولائی یا اگست میں ہمارے ہاں بارشیں ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے کسی خاص مقام پر بارش ہونے کے عوامل یہ ہیں۔ سمندر سے اس مقام کا فاصلہ سطح سمندر سے بلندی، ہواؤں کا رخ، پہاڑوں کا رخ اور بلندی، ان اصولوں کے تحت ضروری ہے کہ ایک خاص مقام پر اور ایک خاص موسم میں ہر سال یکساں بارش ہو۔ کیونکہ نہ سمندر کے پھیلاؤ میں فرق آتا ہے نہ سورج کی گرمی میں، نہ پہاڑوں کی بلندی اور رخ میں سرد ہوائیں بھی طبعی قانون کے تحت ایک خاص رخ ہی اختیار کرتی ہیں۔ مگر ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ ہر سال یکساں بارش نہیں ہوتی۔ ایک سال تو بارشوں کی کثرت سے اس خاص مقام پر سیلاب آجاتا ہے اور کوئی سال بالکل خشک گزر جاتا ہے سرے سے بارش ہوتی ہی نہیں پھر ان طبعی قوانین کے نتائج میں یہ کمی بیشی اور تبدیلی کیوں واقع ہوتی ہے؟ آخر ان باتوں سے یہ نتیجہ کیوں نہیں نکالا جا سکتا کہ کوئی ایسی زبردست اور بالاتر ہستی بھی موجود ہے جو ان بے جان قوانین کے نتائج میں تبدیلی کا پورا پورا اختیار رکھتی ہے۔

کیا بارش محض طبعی قوانین کا نتیجہ ہے؟ دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ بادل جو کروڑوں ٹن پانی کے بخارات سے لدے ہوتے ہیں وہ کسی سرد منطقہ میں پہنچ کر پانی بن جاتے ہیں۔ تو یہ پانی برستے وقت آخر قطروں کی شکل کیوں اختیار کرتا ہے۔ پانی کے بخارات کی مقدار قلیل ہو تو اس کے متعلق تو کہہ سکتے ہیں۔ لیکن کروڑوں ٹن پانی آخر کسی مقام پر یک دم کیوں نہیں گر پڑتا۔ اس پانی کی کثیر مقدار کو اس انداز میں نازل کرنا وہ خلقِ خدا، درختوں اور نباتاتِ ارضی کے لئے نقصان دہ ہونے کے بجائے فائدہ مند ثابت ہو یہ آخر کون سے بے جان طبعی قانون کا نتیجہ ہے؟

پھر یہی بخارات جب شدید سرد منطقہ میں پہنچتے ہیں تو پانی جم جاتا ہے اسی کیفیت کے متعلق قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ بلندی میں اولوں کے پہاڑ ہوتے ہیں جن کا فائدہ بہت کم اور نقصان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یعنی وہی چیز جو اللہ کی رحمت تھی۔ اللہ کا عذاب بن کر گرنے لگتی ہے۔ اور فصلوں کو فائدہ پہنچانے کی بجائے انہیں تباہ کر دیتی ہے۔ اور یہ اولے بھی

فِيهَا مِنْ بَرَدٍ فَيُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَصْرِفُهُ عَنْ مَنْ يَشَاءُ ۖ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهِ يَذْهَبُ
بِالْأَبْصَارِ ﴿٤٣﴾ يُقَلِّبُ اللَّهُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِأُولِي الْأَبْصَارِ ﴿٤٤﴾ وَاللَّهُ خَلَقَ كُلَّ دَابَّةٍ

میں بلند ہیں، اولے برساتا ہے پھر جسے چاہتا ہے ان سے نقصان پہنچاتا ہے اور جسے چاہتا ہے ان سے بچالیتا ہے۔ اس کی بجلی کی چمک آنکھوں کو خیرہ [۷۱] کر دیتی ہے (۴۳) اللہ ہی رات اور دن کا ادل بدل کرتا رہتا ہے۔ بلاشبہ اہل نظر کے لئے ان نشانیوں میں [۷۲] عبرت کا سامان ہے۔ (۴۴) اللہ نے ہر چلنے والے جاندار کو پانی سے [۷۳] پیدا کیا۔

گرتے اسی مقام پر ہیں جہاں اللہ کو منظور ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مرضی کے مطابق ہواؤں کے رخ کو فوراً پھیر دیتا ہے اور جن لوگوں کو چاہتا ہے اولوں کے اس عذاب سے بچا بھی لیتا ہے اور جس قوم پر چاہتا ہے یہ عذاب اسی پر نازل ہوتا ہے۔

[۷۱] بادلوں اور بارش کے مضر پہلو:۔ یعنی آبی بخارات یا منجمد بادلوں کے ٹکراؤ سے بجلی بھی پیدا ہوتی ہے جو گر کر ہر چیز کو جلا دیتی ہے اور اسے تباہ کر کے رکھ دیتی ہے اور اس کی روشنی اس قدر تیز اور نگاہوں کو خیرہ کرنے والی ہوتی ہے کہ اگر انسان کچھ دیر اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کی بینائی کے نور کو بھی تباہ کر کے رکھ دے۔ یعنی بارش جو تمام اہل زمین کے لئے خیر کا پہلو رکھتی ہے اس میں اہل زمین کے لئے شر کے کئی پہلو موجود ہیں۔ یعنی اس بارش کے پانی میں بجلی اور آگ بھی موجود ہے۔ اس میں اتنی تیز روشنی بھی ہے جو آنکھوں کو بے نور کر سکتی ہے پھر یہی پانی اولے بن کر نقصان دہ چیز بھی بن جاتا ہے۔ لہٰذا انسان کو خوشی کے عالم میں کبھی اترانا نہ چاہئے بلکہ اللہ کی گرفت سے ڈرتے رہنا چاہئے۔

[۷۲] گردش لیل و نہار اور موسموں کی تبدیلی:۔ رات اور دن کا باری باری آنا بھی اللہ کی معرفت کی نشانیوں میں سے ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ جسے اللہ نے قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سیاروں کی گردش کا ایسا مربوط نظام بنا دیا ہے جس سے دن اور رات باری باری آتے رہتے ہیں۔ کسی مقام پر ایک ہی وقت راتیں بڑھ رہی ہیں تو دوسرے مقام پر اسی وقت چھوٹی ہو رہی ہیں۔ پھر اسی نظام سے ہر مقام پر موسموں میں تبدیلی آتی رہتی ہے جو مختلف قسم کی اجناس اور نباتات کے پکنے میں ممد ثابت ہوتی ہے۔ فصلوں کے پکنے اور موسم میں ایک گہرا تعلق ہے غرضیکہ اللہ تعالیٰ کا یہ نظام اس قدر محیر العقول اور کثیر الفوائد ہے کہ جتنا بھی اس میں غور کیا جائے اتنا ہی اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال کا سکہ انسان کے دل میں بیٹھتا جاتا ہے۔

موجودہ نظریہ کے مطابق یہ سب نتائج زمین کی محوری گردش اور سورج کے گرد سالانہ گردش سے حاصل ہوتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ آخر زمین جیسے عظیم الجثہ کرّے کو آخر کس ہستی نے مجبور کیا ہے کہ وہ سورج کے گرد اپنے محور پر ساڑھے چھ ڈگری کا زاویہ بناتے ہوئے چھیاسٹھ ہزار چھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتی رہے اور ہمیشہ گھومتی رہے اور اس گردش میں سر مو بھی فرق نہ آنے دے؟ پھر ہر وقت اس کی کڑی نگرانی بھی رکھے ہوئے ہے ﴿ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ ﴾

[۷۳] زمین پر سب جانداروں کی تخلیق پانی سے ہوئی ہے:۔ سورۂ ہود کی آیت نمبر ۷ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ ایام میں پیدا کیا اور (اس وقت) اس کا عرش پانی پر تھا" (۱۱: ۷) اسی آیت کے مطابق درج ذیل حدیث کا مضمون ہے: عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یمن کے کچھ لوگ آپ کے پاس عالم کی پیدائش کا حال پوچھنے آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (پہلے صرف) اللہ کی ذات تھی اور اس کے سوا کوئی چیز نہ تھی۔ اس کا عرش پانی پر تھا۔ اس نے ہر چیز کو لوح

مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ۭ يَخْلُقُ
اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۵﴾ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى
صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۶﴾ وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ

ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں، کچھ دو پاؤں پر اور کچھ چار پاؤں پر، جو کچھ وہ چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے اور یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔(۴۵) ہم نے صاف صاف حقیقت بتانے والی آیات اتاری ہیں اور سیدھی [۷۴] راہ کی طرف رہنمائی تو اللہ ہی جسے چاہے کرتا ہے۔(۴۶) یہ (منافق) کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے اطاعت قبول کی۔ پھر اس کے بعد ان میں سے ایک فریق (اطاعت سے) منہ پھیر [۷۵]

محفوظ میں لکھ لیا اور آسمان اور زمین پیدا کیے" (بخاری۔ کتاب بدء الخلق۔ باب ما جاء فی قول الله هو الذی يبدأ الخلق)

اس آیت اور اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مخلوقات میں سے سب سے پہلے اللہ نے پانی کو پیدا کیا تھا۔ اور عرش کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں نہ ہم یہ جاننے کے مکلف ہیں۔ پھر سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۳۰ میں فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ (۲۱:۳۰) یعنی جس چیز میں بھی زندگی کی رمق ہے اسے ہم نے پانی سے بنایا ہے۔ جس کا دوسرا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ کوئی جاندار چیز پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اور اس آیت میں جانداروں کا ذکر فرمایا کہ وہ پانی سے پیدا ہوئے ہیں۔ خواہ وہ کس نوعیت کے ہوں۔ کیڑے مکوڑے ہوں، پیٹ کے بل چلنے یا رینگنے والے ہوں، جیسے سانپ، گرگٹ اور مچھلی وغیرہ یا دو پاؤں پر چلنے والے ہوں۔ جیسے انسان اور پرندے یا چار پاؤں پر جیسے تمام مویشی اور درندے وغیرہ۔ پھر کچھ ایسی بھی مخلوق ہے جس کے پاؤں چار سے بہت زیادہ ہوتے ہیں جیسے کنکھجورا وغیرہ۔ تو ایسی سب مخلوق کی ابتدا پانی ہی سے ہوئی تھی اور پانی کے سہارے ہی یہ مخلوق زندہ رہ سکتی ہے۔ پانی سے روئے زمین کی تمام اشیاء کو اور بالخصوص جاندار اشیاء کو وجود میں لانا بھی اللہ تعالیٰ کا ایسا کارنامہ ہے جس سے اس کی ہر چیز پر قدرت ہونے کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ ڈارون کے نظریہ کے مطابق زندگی کا آغاز سمندر کے کنارے کائی سے ہوا تھا۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ کائی بھی پانی ہی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی اور حقیقتاً ہر شے کی زندگی کا آغاز کائی سے نہیں بلکہ پانی سے ہوا تھا۔ علاوہ ازیں اسلامی نظریہ حیات ڈارون کے پیش کردہ نظریہ حیات سے کئی باتوں میں متصادم ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے میری تصنیف آئینہ پرویزیت حصہ دوم میں نظریہ ارتقاء)

[۷۴] یعنی یہ جتنی نشانیاں اوپر مذکور ہوئیں، غور و فکر کرنے والوں کو ان سے اللہ تعالیٰ کی بخوبی معرفت حاصل ہو سکتی ہے اور جو ان باتوں کی طرف توجہ ہی نہ کرے اسے ہدایت کیسے نصیب ہو سکتی ہے؟

[۷۵] یعنی اپنے عمل سے اپنے قول کی خود ہی تردید کر دیتے ہیں۔ ان کے دعویٰ کے دو جز تھے ایک اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا، دوسرے اطاعت کرنا۔ اب چونکہ انہوں نے منہ پھیر کر اطاعت سے انکار کر دیا ہے لہٰذا تو یہ اپنے دعویٰ کے پہلے جز یعنی ایمان لانے کے سلسلہ میں جھوٹے ہوئے۔ اگر سچے دل سے ایمان لائے ہوتے تو کبھی اطاعت سے منہ نہ پھیرتے۔ اس

ذٰلِكَ ۚ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٤٧﴾ وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٤٨﴾ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ﴿٤٩﴾ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ

لیتا ہے حقیقتاً یہ لوگ ایماندار نہیں۔(٤٧) اور جب انہیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ رسول ان کے درمیان [٧٦] فیصلہ کرے تو کچھ لوگ اعراض کرنے لگتے ہیں (٤٨) اور حق ان کی موافقت میں ہو تو بڑے [٧٧] مطیع و منقاد ہو کر چلے آتے ہیں۔(٤٩) کیا ان کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے یا وہ شک میں

سے معلوم ہوا کہ جس شخص کا بھی عمل اس کے قول یا زبانی دعویٰ کے خلاف ہو۔ حقیقتاً وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہوتا ہے۔

[٧٦] اس آیت سے کئی باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ اللہ کے رسول کی طرف بلانا دراصل اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلانا ہے۔ رسول کی دعوت اور رسول کی طرف دعوت دراصل اللہ کی دعوت اور اللہ کی طرف دعوت ہے۔ دوسرے یہ کہ رسول کا فیصلہ حقیقتاً اللہ ہی کا فیصلہ ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ جو شخص رسول کی طرف جانے یا اس سے فیصلہ کروانے یا اس کا فیصلہ تسلیم کرنے سے اعراض کرے وہ مومن نہیں بلکہ منافق ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ اس آیت کا حکم آپ ﷺ کی زندگی تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ آپ کے بعد کوئی بھی اسلامی حکومت جس میں عدالتیں کتاب اللہ اور سنت رسول کے مطابق فیصلے کرتی ہوں اور ایسی عدالت کی طرف سے اگر کسی شخص کو بلاوا یا سمن آئے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ہی بلاوا سمجھا جائے گا۔ اور اس سے اعراض کرنے والا مومن نہیں بلکہ منافق ہوگا۔ علاوہ ازیں ہمارے اختلافی مسائل میں بھی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت حَکَم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور کتاب و سنت میں ہمارے اکثر اختلافی مسائل کا حل بھی موجود ہے۔ اگر کوئی شخص کتاب و سنت کی طرف جانے یا اس کا فیصلہ ماننے سے اعراض کرے تو وہ بھی حقیقتاً مومن نہیں بلکہ منافق ہیں۔ مقلد حضرات کے لئے بھی یہ آیت لمحہ فکریہ ہے جن میں سے بعض کا تو یہ حال ہے کہ جب ان سے کتاب و سنت کے مطابق فیصلہ کرنے کو کہا جائے تو چیں بہ جبیں ہو جاتے ہیں اور چل دیتے ہیں اور بعض یوں کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے امام صاحب کو بھی یہ آیت اور یہ حدیث معلوم تھی۔ آخر انہوں نے بھی کسی دلیل سے یوں کہا ہوگا اور وہ دلیل ہمیں جاننے یا سمجھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم مقلد ہیں۔

[٧٧] ❁ اللہ اور رسول کی بات سے اعراض منافقت ہے:۔ ذَعَنَ کے معنی نہایت فرمانبردار بن کر ساتھ ہو لینا یا اشاروں پر چلنا ہے۔ اور اس آیت کا معنی یہ ہے کہ منافق لوگ اللہ اور اس کے بلانے یا اس کے ہاں جانے سے اعراض صرف اس وقت کرتے ہیں جب انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے کا حق دبا رہے ہیں اور اگر رسول کے پاس گئے تو وہ یقیناً حق کے مطابق فیصلہ کرے گا۔ لہٰذا ہمیں اس کے پاس جانے سے نقصان پہنچ جائے گا لیکن جب انہیں معلوم ہو کہ ہم حق پر ہیں یا دوسرے کی طرف سے ان کا حق نکلتا ہو تو بلا چون و چرا نہایت فرمانبردار بن کر ساتھ ہو لیتے ہیں اس کی وجہ بھی وہی ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ رسول حق کے مطابق ہی فیصلہ کرے گا۔ ایسے لوگ دراصل رسول کی نہیں اپنے فائدے کی اتباع کرتے ہیں۔

پہلے سورہ مائدہ کی آیت نمبر ٤٣ کے حاشیہ میں گزر چکا ہے کہ ایک منافق اور ایک یہودی کے درمیان کچھ جھگڑا ہو گیا

يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ۭ بَلْ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ۧ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا
دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَنْ

پڑے ہوئے ہیں یا وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اللہ اور اس کا رسول ان کی حق تلفی [۷۸] کر جائیں گے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود ہی ظالم ہیں۔(۵۰)

مومنوں کی تو بات ہی یہ ہوتی ہے کہ جب انہیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ کہتے ہیں کہ "ہم نے سن لیا اور اطاعت [۷۹] کی" ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔(۵۱) اور جو

تھا۔ جس میں یہودی حق پر تھا۔ اور یہ چاہتا تھا کہ اپنا مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے چلیں۔ جبکہ منافق یہ چاہتا تھا کہ یہ مقدمہ یہود کے سردار کعب بن اشرف کے پاس لے جائیں۔ اس مقدمہ کی تفصیل مذکورہ حاشیہ میں دیکھ لی جائے۔ کہتے ہیں کہ یہ آیت بھی اسی سلسلہ میں نازل ہوئی تھی۔

❁ شریعت کی حسب پسند باتوں پر عمل کرنے والا بھی منافق ہے:۔ اس آیت سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص شریعت کی مفید مطلب باتیں تو بہ خوشی قبول کرے مگر جو باتیں اس کی اغراض و خواہشات یا مفاد کے خلاف پڑتی ہوں ان سے اعراض کرے وہ مومن نہیں۔ بلکہ منافق ہوتا ہے اور اپنے ایمان کے دعوے میں جھوٹا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ دراصل اپنی خواہشات کا پیروکار ہوتا ہے۔ شریعت کا نہیں ہوتا۔

[۷۸] ❁ اللہ کے رسول کے فیصلہ سے اعراض کی وجوہ:۔ یعنی ان منافقوں کے رسول کے فیصلہ سے اعراض کی تین ہی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ سچے دل سے ایمان نہ لایا ہو بلکہ اپنے ذاتی مفادات کے حصول کی خاطر مسلمان ہو گیا ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ ایمان کا دعوٰے کرنے کے باوجود اس شک و شبہ میں مبتلا ہو کہ یہ شخص واقعی اللہ کا رسول ہے بھی یا نہیں؟ یا یہ قرآن اللہ کا کلام ہے بھی یا نہیں؟ یا آخرت کے دن کے قیام اور اس دن جزو سزا کا عقیدہ کچھ حقیقت بھی رکھتا ہے یا نہیں یا یہ سب باتیں محض افسانے اور من گھڑت باتیں ہیں۔ تیسرے یہ کہ وہ اللہ اور رسول کو مان لینے کے بعد یہ اندیشہ رکھتا ہو کہ قرآن کے فلاں حکم نے تو ہمیں ذلیل کر کے رکھ دیا ہے اور مصیبت میں ڈال دیا ہے یا رسول کا فلاں طریقہ یا حکم ہمارے لئے سخت نقصان دہ ہے ان تینوں صورتوں میں سے جو بھی صورت ہو ان کے ظالم ہونے میں کوئی شک نہیں۔ ایسا شخص خود بھی فریب میں مبتلا ہے اور فی الحقیقت بڑا دغاباز اور خائن ہے۔ جو ذاتی مفادات کی خاطر مسلمان بنا ہوا ہے۔ اور مسلمانوں کو بھی فریب دے رہا ہے۔ وہ اپنے آپ پر بھی ظلم کر رہا ہے اور دوسرے مسلمانوں پر بھی۔ جو اس کے زبانی دعوے پر اعتماد کر کے اسے اپنی ملت میں شامل کر لیتے ہیں۔

ان کے ظالم ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ اپنا حق تو پورا پورا وصول کریں۔ خواہ اس میں دوسروں کی کتنی زیادہ حق تلفی ہو رہی ہو۔ اور اسی غرض کے تحت وہ اپنا فیصلہ وہاں لے جانا چاہتے ہیں جہاں انہیں اپنی خواہش کے مطابق فیصلہ کی توقع ہو۔ اور یہ دونوں باتیں ان کے ظالم ہونے پر صریح دلیل ہیں۔

[۷۹] یعنی مومنوں کی نظر منافقوں کی طرح اپنے ذاتی مفادات پر نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اپنا تمام تر مفاد اس بات میں سمجھتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کی دل و جان سے اطاعت کی جائے وہ اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ اللہ کا رسول انہیں کوئی حکم دے

يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ
اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ؕ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۳﴾ قُلْ
اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَاِنْ
تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۵۴﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا

شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے، اللہ سے ڈرے، اور اس کی نافرمانی سے بچتا رہے تو ایسے ہی لوگ بامراد ہیں۔(۵۲) (منافقین) اللہ کی پختہ قسمیں کھا کر (رسول سے) کہتے ہیں کہ "اگر آپ انہیں حکم دیں تو وہ ضرور (جہاد پر) نکلیں گے" آپ ان سے کہئے کہ قسمیں نہ کھاؤ۔ مطلوب (قسمیں نہیں بلکہ) دستور کے مطابق[۸۰] اطاعت ہے" اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر[۸۱] ہے۔(۵۳) آپ ان سے کہئے کہ "اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو" پھر اگر تم اطاعت نہیں کرو گے تو رسول کے ذمہ تو وہی کچھ ہے جس کا وہ مکلّف ہے (یعنی تبلیغ کا) اور تمہارے ذمہ وہ کچھ ہے جس کے تم مکلف ہو (یعنی اطاعت کے) اور اگر تم رسول کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پا جاؤ گے اور رسول کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ صاف صاف[۸۲] پیغام پہنچا دے۔(۵۴) تم میں سے جو مومن ہیں اور نیک کام کرتے ہیں ان سے اللہ نے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ

جسے وہ بجا لائیں۔ ان کی خوشی بھی اسی بات میں ہوتی ہے اور اطمینان بھی اسی بات میں۔ اور جن لوگوں نے اپنی تمام تر اغراض، خواہشات اور مفادات کو اللہ اور اس کے رسول کی رضامندی کے تابع بنا دیا۔ تو اللہ بھی ایسے لوگوں کی حمایت و نصرت فرماتے ہیں وہ دنیا میں بھی انہیں کامیاب بنائیں گے اور آخرت میں بھی ایسے ہی لوگ کامیاب ہوں گے۔

[۸۰] طاعة معروفة کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا سچے دل سے عہد کیا ہو۔ وہ اطاعت کر کے دکھا دیتے ہیں اور انہیں قسمیں کھانے کی کبھی ضرورت پیش ہی نہیں آتی۔ قسمیں کھانے اور قسمیں کھا کر یقین دلانے اور اپنا اعتماد بحال کرنے کی تو ضرورت ہی تب پیش آتی ہے جب کسی کا اعتماد مجروح ہو چکا ہو۔ اور آئندہ بھی اس کی صحیح صورت یہ نہیں کہ بس پکی قسمیں کھا کر اعتماد بحال کرنے کی کوشش کریں۔ بلکہ یہ ہے کہ وہ عملی طور پر اطاعت کر کے دکھا دیں۔ اس طرح قسمیں کھانے کے بغیر ہی ان کا اعتماد بحال ہو جائے گا۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ جتنی اور جیسی وہ اطاعت کر رہے ہیں تو وہ پہلے ہی سب کو معلوم ہے۔ پہلے بھی لوگ ایسے بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے تھے اور یقین دہانیاں کراتے تھے۔ قسمیں کھانے کے بعد ایسی اطاعت کی ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے؟

[۸۱] یعنی تم لوگ اگر قسمیں کھا کر لوگوں کو اپنی بات کا یقین دلا بھی دو تو اللہ کے سامنے تو تمہاری ایسی چالاکیاں اور فریب کاریاں کسی کام نہیں آسکتیں جو تمہاری تمام ظاہری اور باطنی خباثتوں سے پوری طرح باخبر ہے اور وہ کسی وقت بھی تمہاری عیاری اور نفاق کا پردہ چاک کر سکتا ہے۔

[۸۲] یعنی رسول اپنی ذمہ داری پوری کرنے کا پابند ہے اور تم اپنی ذمہ داری کے۔ رسول کی ذمہ داری اتنی ہی ہے کہ وہ تمہیں

الصّٰلِحٰتِ لَيَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِي الۡاَرۡضِ كَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ۖ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمۡ دِيۡنَهُمُ الَّذِي

انہیں زمین میں ایسے ہی خلافت عطا کرے[۸۳] گا جیسے تم سے پہلے لوگوں کو عطا کی تھی اور ان کے اس دین کو

اللہ کا پیغام پہنچا دے اور وہ اس نے پوری کر دی۔ اور تمہارے ذمہ یہ بات ہے کہ تم اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو جس میں تم پس و پیش کر رہے ہو۔ اور زری قسمیں کھا کھا کر ہی آئندہ کے لئے اطاعت کا یقین دلانا چاہ رہے ہو لیکن یاد رکھو کہ اگر اس کے احکام کی تعمیل کرو گے تو اسی میں تمہارا بھلا ہے۔ دنیا میں بھی عزت و آرام سے رہو گے اور آخرت میں کامیاب رہو گے۔ اور اگر ایسا نہ کرو گے تو اس میں رسول کا کچھ نقصان نہیں۔ تمہاری خباثتوں کا خمیازہ تمہیں ہی بھگتنا پڑے گا۔

[۸۳] ۞ نظامِ خلافت کی استعداد ہر انسان میں بالقوۃ موجود ہے:۔ اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدمؑ کو دنیا میں خلیفہ بنا کر بھیجا تھا تاکہ آدم اور اس کی اولاد دنیا میں وہ نظام حیات قائم کرے جو اللہ کی مرضی کے مطابق ہو اور جسے اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدمؑ کو بھی اور بعد میں وقتاً فوقتاً ان کی اولاد کو بذریعہ وحی بتا بھی دیا تھا۔ اور نظام خلافت کے قائم کرنے کے لئے جو اوصاف درکار تھے وہ سب آدم اور اس کی اولاد کی فطرت میں ودیعت کر دیئے گئے تھے۔ ساتھ ہی انسان کو قوتِ ارادہ و اختیار بھی دیا گیا۔ اور اسی میں حضرت انسان کی آزمائش رکھ دی گئی کہ آیا وہ اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ اس مقصد خلافت کو پورا کرتا ہے یا نہیں؟ اور چونکہ ایسے اوصاف ہر انسان کی فطرت میں رکھ دیئے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے آدم کی تمام تر اولاد خلافت کی مستحق قرار پاتی ہے۔ البتہ ان سے وہ لوگ از خود خارج ہو جاتے ہیں جو اپنی مرضی اور اپنی خواہشات کو اللہ کی مرضی کے تحت نہ بنائیں۔ اس آیت کی رو سے منافقین کو اس خلافتِ ارضی کے استحقاق سے خارج کر دیا گیا اور ان لوگوں کو بھی جو سرے سے ایمان ہی نہ لائیں یا ان کے اعمال صالح نہ ہوں۔ گویا یہ استحقاق صرف ان لوگوں کے لئے باقی رہ گیا جو ایمان بھی لائیں اور اعمال بھی صالح بجا لائیں۔ ایسے ہی لوگوں سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اگر انہیں زمین میں اقتدار حاصل ہو تو وہ ایسا نظام حیات قائم کریں گے جو اللہ کے ہاں پسندیدہ اور اس کی منشا کے مطابق ہو اور یہی لوگ اپنے میں سے کسی بہترین آدمی کو اپنا امیر یا امام یا خلیفہ بنا لیں گے اور جب وہ ایسا دین یا نظام حیات قائم کر لیں گے تو اللہ ان کے دین کو اور زیادہ مضبوط بنا دیں گے اور ان کی نمایاں خصوصیت یہ ہوگی کہ شرک کو کسی قیمت پر بھی گوارا نہ کریں گے۔

۞ صحابہ کرام سے خلافتِ ارضی اور دین کے استحکام کا وعدہ الٰہی:۔ اس آیت میں منکم سے اور اس سے پہلی آیات میں منافقین مدینے کے ذکر سے صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ یہ وعدہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت سے کیا جا رہا ہے اور جب یہ سورت نازل ہوئی اس وقت تک مسلمان تنگدستی کی زندگی بسر کر رہے تھے فتح خیبر کے بعد مسلمانوں کی معیشت میں صرف اس حد تک آسودگی آئی تھی کہ مہاجرین نے جو باغ اور کھجوروں کے درخت معاہدہ مواخات کے تحت انصار سے مزارعت پر لئے تھے وہ انہوں نے واپس کر دیئے تھے۔ اور جنگ احزاب سے پہلے تک مسلمانوں کی نوخیز ریاست مدینہ کی یہ حالت تھی کہ وہاں ہر وقت کفار کے حملہ سے خوف و ہراس کی فضا چھائی رہتی تھی۔ جنگ احزاب کے خاتمہ پر البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ضرور فرمایا تھا کہ آج کے بعد کفار ہم پر چڑھائی کرنے کے لئے نہیں آئیں گے بلکہ اب ہم ان پر چڑھائیں کریں گے۔ مگر مدینہ سے باہر عرب میں لوٹ مار کا بازار گرم رہتا تھا اور کوئی شخص یا کوئی قافلہ خیر خیریت سے سفر نہ کر سکتا تھا۔ اس آیت میں تو اللہ تعالیٰ نے صرف ایسے خوف و ہراس کے خاتمہ کی خوشخبری دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے خوف کے علاوہ تنگ دستی کے خاتمہ کی بھی خوشخبری دی۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے۔

۞ تنگدستی اور بدامنی کے خاتمہ کی شہادت:۔ عدی بن حاتم کہتے ہیں کہ ایک دن میں آپ ﷺ کے پاس بیٹھا تھا کہ دو آدمی آئے۔ ایک تنگی معیشت کی شکایت کرتا تھا اور دوسرا رہزنی کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "عنقریب ایسا امن ہو گا کہ یہاں سے جانے والا قافلہ بغیر کسی محافظ کے جائے گا اور اے عدی بن حاتم! کیا تم نے حیرہ دیکھا ہے؟" میں نے کہا نہیں البتہ اس کی خبر ملی ہے" فرمایا: اگر تمہاری عمر زیادہ ہوئی تو تم دیکھو گے کہ ایک عورت حیرہ سے چل کر کعبہ کا طواف کرے گی لیکن اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہو گا" میں نے دل میں سوچا: قبیلہ بنو طے کے لٹیرے جنہوں نے تہلکہ مچا رکھا ہے اس وقت کہاں جائیں گے؟" اور قیامت نہیں آئے گی کہ ایک شخص اپنا صدقہ لے کر چکر لگائے کہ اسے کوئی لینے والا مل جائے لیکن اسے کوئی صدقہ لینے والا نہیں ملے گا۔ اور تم لوگ کسریٰ کے خزانے فتح کرو گے۔" میں نے کہا: کسریٰ بن ہرمز؟" آپ ﷺ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا اور اے عدی! اگر تمہاری عمر لمبی ہوئی تو ضرور تم ایسے شخص کو دیکھو گے جو مٹھی بھر سونا یا چاندی لے کر ایسے آدمی کی تلاش میں نکلے گا جو اسے قبول کرے لیکن اسے ایسا کوئی آدمی نہ ملے گا۔" (بخاری۔ کتاب الزکوۃ باب الصدقۃ قبل الرد کتاب المناقب۔ باب علامات النبوۃ فی الاسلام) سیدنا عدی کہتے ہیں پھر میں نے حیرہ سے چل کر کعبہ کا طواف کرنے والی عورت کو دیکھا جو اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتی تھی اور میں خود ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے کسریٰ بن ہرمز کے خزانے فتح کئے۔ (بخاری۔ کتاب المناقب۔ باب علامات النبوۃ)

ان حالات میں ایسی پیشین گوئی مسلمانوں کے لئے ایک عظیم خوشخبری تھی چنانچہ اس خوشخبری کا کچھ حصہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی پورا ہو گیا۔ فتح مکہ اور بالخصوص اعلان براءت کے بعد عرب بھر سے لوٹ مار کی وارداتیں ختم ہو گئیں۔ اور صحابہ کرام ؓ کو آسودگی بھی میسر آ گئی مگر عرب سے باہر ابھی تک خوف و ہراس، لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کی فضا قائم تھی۔ جو خلفائے راشدین کے زمانہ میں پوری ہوئی۔ اور سیدنا عثمان ؓ کے زمانہ میں فی الواقع اتنی آسودگی ہو گئی کہ ایک شخص اپنی زکوۃ ادا کرنے کے لئے نکلتا تو اسے کوئی مستحق زکوۃ شخص نہیں ملتا تھا۔

ضمناً اس آیت سے درج ذیل نتائج بھی سامنے آتے ہیں:

۱۔ ۞ اعمالِ صالحہ کی نئی تاویل:۔ صحابہ کرام ؓ نے جو نظام خلافت قائم کیا۔ وہی اللہ کے ہاں پسندیدہ دین ہے۔ اور اللہ نے اسی دین کو ان کے لئے پسند فرمایا تھا اور اس نظام خلافت کی خصوصیات سورہ حج کی آیت نمبر ۴۱ میں یہ بیان فرمائیں کہ ایسے مومنوں کو جب ہم اقتدار بخشتے ہیں تو وہ نماز اور زکوۃ کا نظام قائم کرتے ہیں۔ بھلے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں اس وضاحت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اعمال صالحہ کس قسم کے اعمال ہوتے ہیں اور اس اصطلاح سے شرعاً کون سے اعمال مراد لئے جا سکتے ہیں۔

یہ وضاحت ہمیں اس لئے کرنا پڑی ہے کہ بعض کج فہم حضرات اعمال صالحہ سے مراد صلاحیت رکھنے والے کام لیتے ہیں جیسے وہ اعمال جن سے اقتدار حاصل کیا جا سکتا ہو۔ اس لحاظ سے ان کے نزدیک ہر وہ قوم جو اس وقت اقتدار حاصل کئے ہوئے ہے وہی ایماندار ہے اور اسی کے اعمال صالح ہیں۔ خواہ وہ قوم کافر، مشرک یا دہریہ ہی کیوں نہ ہو۔ ظاہر ہے یہ کج فکری کتاب و سنت کی تمام تر تعلیمات پر پانی پھیر دیتی ہے۔

۲۔ ۞ صحابہ کرام کی فضیلت:۔ یہ نظامِ خلافت اس قدر مضبوط ہو گیا تھا جس کی تمام روئے زمین پر دھاک بیٹھ گئی تھی۔ اور یہ

ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿55﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿56﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَلَبِئْسَ

مضبوط کرے گا جسے اس نے ان کیلئے پسند کیا ہے اور ان کی حالت خوف کو امن میں تبدیل کر دے گا۔ پس وہ میری ہی عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کرے[۸۴] تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔(۵۵) نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور رسول کی اطاعت کرو (اس طرح) توقع ہے کہ تم پر رحم کیا جائے[۸۵]۔(۵۶) آپ کافروں کے متعلق یہ خیال نہ کیجئے کہ وہ زمین میں[۸۶] (اللہ کو) عاجز کر دینے والے ہیں (کہ وہ انہیں عذاب نہ کرے) ان کا

دور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک مسلسل ترقی پذیر رہا۔ اگرچہ بعد میں مسلمانوں کے باہمی تنازعات کی بنا پر ان میں انحطاط آنا شروع ہو گیا۔ تاہم یہ نظام بعد میں مدتوں چلتا رہا۔

۳۔ اس نظام میں شرک کا شائبہ تک نہ تھا، لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی ہر قسم کے شرک سے پاک و صاف تھی۔ ان تمام باتوں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کمال فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

❁ **کونسے اعمال صالح ہیں؟** اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آیا اللہ کا یہ وعدہ صرف صحابہ کرام کے لئے ہی مخصوص تھا یا بعد کے مومنوں کے لئے بھی ہے؟ تو اس کا جواب اسی آیت میں مذکور ہے یعنی یہ وعدہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پہلے کے مومنوں کے لئے بھی تھا تو بعد میں آنے والے مومنوں کے لئے کیوں نہ ہو گا؟ بشرطیکہ ان میں مندرجہ اوصاف پائے جائیں یعنی وہ سچے مومن ہوں، اعمال صالح بجالائیں۔ نظام نماز اور زکوٰۃ قائم کریں۔ اچھے کاموں کا حکم دیں۔ برے کاموں سے روکیں ان کا مقصد محض اللہ کے دین یا نظام خلافت کا قیام ہو۔ اور اس کے لئے ہر ممکن کوشش کریں۔ ان کی زندگیاں شرک سے کلیتاً پاک صاف ہوں۔ صرف اللہ سے ڈرنے والے اور اسی پر توکل کرنے والے ہوں اور باہم متحد ہو کر اور باہمی مشورہ سے کام کریں۔ اور تفرقہ بازی سے بچے رہیں۔ کیونکہ قرآن کریم نے تفرقہ بازی کو بھی اقسام شرک میں شمار کیا ہے۔ اگر مومن ان اوصاف کو اپنا لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ ان سے کیا ہوا وعدہ پورا نہ کرے۔

[۸۴] یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کے مومنوں یا صحابہ کرام سے ایسے وعدہ اور پکی خوشخبری کے بعد بھی ان کا ساتھ نہ دے اور کفر و نفاق کی راہ اختیار کرے تو ایسے لوگ یقیناً بدکردار ہیں اور بعض علماء نے اس فقرہ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ خلفائے راشدین کی خلافت قائم ہونے اور دین کے مضبوط ہونے کے بعد بھی جو شخص اس بات کا انکار کرے کہ خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کا اختیار کردہ دین اللہ کا پسندیدہ دین نہیں تھا تو ایسے لوگ فاسق ہیں۔

[۸۵] یہ خطاب صرف منافقوں کو ہی نہیں بلکہ سب کے لئے عام ہے۔ یعنی اگر تم لوگ چاہتے ہو کہ اللہ تم پر رحم فرمائے اور اس کی رحمتیں تم پر نازل ہوں تو اس کی صورت صرف یہی ہے کہ سچے دل سے اللہ کے رسول کی اطاعت کرو اور نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا پورا اہتمام کرو۔

[۸۶] کافر سے مراد یہاں سب غیر مسلم ہیں۔ یعنی کفار مکہ، عرب کے مشرک قبائل، مدینہ کے یہود و منافقین، یہ سب لوگ

الْمَصِيْرُ ﴿۵۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ ع ۱۴
مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ۭ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ
بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَاۗءِ ڜ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ۭ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ۭ طَوّٰفُوْنَ
عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۸﴾ وَاِذَا بَلَغَ

ٹھکانا آگ ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے (۵۷) اے ایمان والو! تمہارے غلاموں اور ان لڑکوں پر جو ابھی حد بلوغ کو نہ پہنچے ہوں، لازم ہے کہ وہ (دن میں) تین بار اجازت لے کر گھروں میں داخل ہوا کریں۔ نماز فجر سے پہلے اور ظہر کے وقت جب تم کپڑے اتارتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد یہ تین اوقات تمہارے لئے پردہ [۸۷] کے ہیں۔ ان اوقات کے علاوہ (دوسرے وقتوں میں) ان کے بلااجازت آنے جانے سے نہ ان پر کچھ گناہ ہے [۸۸] اور نہ تم پر، تمہیں ایک دوسرے کے پاس بار بار آنا ہی پڑتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنے ارشادات کی وضاحت کرتا ہے اور وہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔ (۵۸)

مل کر اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگا لیں تب بھی یہ لوگ اسلام کی راہ روک نہیں سکتے۔ اللہ کا دین تو یقیناً بلند ہو کے رہے گا۔ رہے یہ معاندین تو اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی انہیں رسوا کرے گا اور آخرت میں بھی انہیں جہنم کا عذاب بھگتنا ہوگا۔

[۸۷] ❁ عورت کا لغوی معنی:۔ اس آیت سے پھر وہی معاشرتی احکام شروع ہو رہے ہیں جو اس سورت کا اصل موضوع ہے۔ اس آیت میں عورات کا لفظ عورۃ کی جمع ہے۔ یہ لفظ ان الفاظ سے ہے جو کسی دوسری زبان میں منتقل ہو کر بالکل جداگانہ مفہوم اختیار کر لیتے ہیں۔ ہماری زبان میں تو عورت مرد کی تانیث یا مادہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جبکہ عربی زبان میں (جس زبان کا یہ لفظ ہے) عورت ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کو کھلا رکھنا یا اس کا کھلا رہنا انسان کے لئے باعث ننگ و عار ہو۔ اور انسان اسے چھپانا ضروری سمجھتا ہو (مفردات امام راغب) اور مردوں کی مادہ کے لئے نساء کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اسی سورہ کی آیت نمبر ۳۱ میں یہ دونوں الفاظ اکٹھے استعمال ہوئے ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔ ﴿اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰي عَوْرٰتِ النِّسَاۗءِ﴾ (۳۱:۲۴) ترجمہ: یا پھر وہ (نابالغ) بچے جو ابھی عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے واقف نہ ہوئے ہوں۔ علاوہ ازیں قرآن میں یہ لفظ ایسے غیر محفوظ مکان کیلئے بھی استعمال ہوا ہے۔ جس کو محفوظ رکھنا ضروری ہو (۱۳:۳۳) اور اس مقام پر پوشیدہ اوقات یا پردہ کے اوقات کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

❁ خلوتِ خانہ کی اہمیت اور احکام:۔ اس آیت میں بالخصوص گھر کی خلوت (Privacy) کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے اور حکم یہ دیا جا رہا ہے کہ دن اور رات یعنی ۲۴ گھنٹوں میں تین اوقات ایسے ہیں جن میں تمہارے غلاموں، تمہاری کنیزوں اور تمہارے نابالغ بچوں خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں، سب کا داخلہ بلااجازت ممنوع ہے۔ اور وہ اوقات ہیں۔ طلوعِ فجر سے پہلے یعنی سحری کا وقت، دوسرے ظہر کے وقت نماز ظہر سے پہلے یا بعد، جب تم آرام کرنے کے لئے اپنے کپڑے اتارتے ہو۔ اور تیسرے جب عشاء کی نماز کے بعد تمہارے سونے کا وقت ہوتا ہے اور یہ تینوں اوقات ایسے ہیں کہ جن میں اکثر میاں بیوی کی ہم بستری کا امکان ہوتا ہے۔ لہٰذا تمہارے کسی نابالغ بچے یا تمہارے غلام کو بلااجازت گھر میں داخل نہ ہونا چاہئے۔

[۸۸] ان تین اوقات کے علاوہ کسی بھی وقت تمہارے نوکر چاکر اور تمہارے نابالغ بچے تمہاری عورتوں کے ہاں یا تمہارے

الْأَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَأْذِنُوا كَمَا اسْتَأْذَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٥٩﴾ وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ اللَّاتِي لَا يَرْجُونَ

اور جب لڑکے سن بلوغ[۸۹] کو پہنچ جائیں تو وہ بھی اس طرح اذن لیا کریں جیسا کہ ان سے پہلے (ان کے بڑے) اجازت لیتے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح تمہارے لیے اپنے احکام کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔(۵۹) اور جو عورتیں جوانی سے گزری[۹۰] بیٹھی ہوں اور نکاح کی توقع نہ رکھتی ہوں

پرائیویٹ کمروں میں بلااجازت آجاسکتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ گھر کے کام کاج کے سلسلہ میں انہیں ہر وقت گھر سے باہر اور باہر سے گھر میں داخلہ کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ اور ان پر ہر وقت اجازت کے ساتھ داخلہ کی پابندی ان کے لئے بھی اور تمہارے لئے بھی ایک مصیبت بن جائے گی۔ ہاں اگر یہ لوگ ان خلوت کے اوقات میں بلااجازت اندر آئیں تو یہ ان کی غلطی ہے اور اگر ان اوقات کے علاوہ کسی دوسرے وقت تم کسی نامناسب حالت میں ہو اور وہ بلااجازت اندر آجائیں تو تمہیں ان کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں غلطی تمہاری اپنی ہوگی کہ کام کاج کے اوقات میں تم نے اپنے آپ کو ایسی نامناسب حالت میں رکھا۔

[۸۹] ۞ بلوغت اور اس کے عوامل:۔ ان میں جنسی شعور، صنفی میلانات بیدار ہونے لگیں اور شرعاً اس کی حد یہ ہے کہ بچے کو احتلام آنے لگے۔ بلوغت کی عمر کی سالوں سے تعیین کرنا مشکل ہے یہ بھی ممکن ہے کہ ایک لڑکا گیارہ سال کا ہی بالغ ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اٹھارہ سال تک بالغ نہ ہو۔ اور اس سن بلوغت کے بھی کئی عوامل ہیں مثلاً جن ممالک کی آب و ہوا گرم مرطوب ہو وہاں بچے جلد بالغ ہو جاتے ہیں اور جہاں آب و ہوا سرد ہو وہاں دیر سے بالغ ہوتے ہیں۔ اسی طرح خوشحال گھرانوں کے بچے جلد بالغ ہو جاتے ہیں اور تنگدست گھرانوں کے بچے دیر سے بالغ ہوتے ہیں۔ اسی طرح مرد و عورت کے آزادانہ اور فحاشی کے ماحول میں بچے جلد بالغ ہو جاتے ہیں اور پاکیزہ ماحول والے بچے دیر سے بالغ ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں بچے کی بلوغت کا مدار کسی حد تک اس کی قد و قامت اور صحت پر بھی ہوتا ہے کمزور خلقت والے بچے نسبتاً دیر سے بالغ ہوتے ہیں۔ لہٰذا بلوغت کا اندازہ کسی بچے کی عمر سے نہیں بلکہ اس کی دوسری کیفیات سے لگانا چاہئے۔ اور جب ان کی بلوغت کا علم ہو جائے تو ان پر گھروں میں داخلہ پر وہی پابندیاں عائد ہو جائیں گی جو بڑوں پر ہیں یعنی کسی وقت بھی ان کا گھروں میں بلااجازت داخلہ ممنوع ہوگا۔

[۹۰] ۞ قواعد کا لغوی مفہوم:۔ قواعد کا لفظ قاعدہ اور قعیدہ دونوں کی جمع ہے۔۔ قاعدہ بمعنی بنیاد اور قواعد بمعنی بنیادیں بھی قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے۔ (۲: ۱۲۷) اور قعد کے معنی بیٹھنا بھی، بیٹھ رہنا اور کوئی کام نہ کرنا بھی اور کسی کام کے لئے تیار ہو بیٹھنا بھی ہے۔ اور قعیدۃ کا دوسرے معنی سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی ایسی عورتیں جو ازدواجی زندگی کے کام کاج سے فارغ ہو چکی ہوں۔ یعنی سن یاس کو پہنچ چکی ہوں اور اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ رہی ہوں اور جن کی جنسی خواہشات مر چکی ہوں اور اگر کوئی مرد انہیں دیکھے تو اس کے صنفی جذبات میں تحریک پیدا نہ ہو یعنی بوڑھی کھوسٹ عورتیں۔

نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۢ بِزِيْنَةٍ ۭ وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۶۰﴾ لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى

وہ اگر اپنی چادریں[۹۱] اتار (کر ننگا سر کر) لیا کریں تو ان پر کچھ گناہ نہیں بشرطیکہ زیب و زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں۔ تاہم اگر وہ (چادر اتارنے سے) پرہیز[۹۲] ہی کریں تو یہی بات ان کے حق میں بہتر ہے اور اللہ سب کچھ سنتا، جانتا ہے۔(۶۰) اس بات میں نہ اندھے پر، نہ لنگڑے پر،

[۹۱] ستر و حجاب میں فرق۔ مرد اور عورت کے مقامات ستر:۔ یہاں ثِيَابَهُنَّ کا لفظ استعمال ہوا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپنے بدن کے سب کپڑے اتار سکتی ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب ہے کہ ان سے حجاب کی پابندیاں اٹھ جاتی ہیں۔ لیکن ستر کی پابندیاں بدستور بحال رہتی ہیں۔ ستر اور حجاب میں فرق یہ ہے کہ ستر ان اعضاء کو ڈھانپ رکھنے کا نام ہے جن کا ڈھانپنا ہر حال میں ضروری ہے کوئی دیکھ رہا ہو یا نہ دیکھ رہا ہو۔ مرد کا مقام ستر ناف سے لے کر گھٹنے تک ہے۔ اور عورت کا مقام ستر اس کا سارا جسم ہے ماسوائے ہاتھوں اور چہرہ کے۔ مرد اپنے مقامات ستر اپنی بیوی کے سوا کسی کے سامنے کھول نہیں سکتا اور نہ ہی عورت اپنے ستر کے مقامات اپنے خاوند کے سوا کسی دوسرے کے سامنے کھول سکتی ہے۔ ان احکام میں اگر گنجائش ہے تو صرف یہ ہے کہ عورت اپنے محرم رشتہ داروں کے سامنے کسی ضرورت کے تحت جسم کا اتنا حصہ کھول سکتی ہے جسے گھر کا کام کاج کرتے ہوئے کھولنے کی ضرورت پیش آتی ہے جیسے فرش دھوتے وقت پائنچے اوپر چڑھا لینا یا آٹا گوندتے وقت کف اوپر چڑھا لینا وغیرہ اور مقام ناف سے لے کر گھٹنے تک کے مقامات ستر تو ایسے ہیں جنہیں کوئی عورت کسی عورت کے بھی سامنے کھول نہیں سکتی۔ مزید تفصیل کے لئے میری تصنیف "احکام ستر و حجاب" ملاحظہ ہو

بوڑھی عورتوں کو حجاب کے احکام سے رخصت کی مشروط اجازت:۔ یہاں جو بڑھی بوڑھیوں کو کپڑے اتارنے کی اجازت ہے تو اس سے مراد وہ کپڑے ہیں جو ستر سے متعلق نہیں بلکہ حجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور وہ دو ہیں ایک دوپٹہ جس سے عورتوں کے سر پر رکھنے اور اس سے اپنے گریبان ڈھانپے رکھنے کا حکم ہے اور اس کا تعلق گھر کے اندر کی دنیا سے ہے اور دوسرے بڑی چادریں جن سے انہیں اپنا سارا بدن اور زیب و زینت ڈھانپ کر گھر سے باہر نکلنے کا حکم ہے۔ اب بڑی بوڑھیوں کو رخصت صرف یہ ہے کہ ان کے لئے یہ ضروری نہیں کہ گھر میں ہر وقت دوپٹہ یا اوڑھنی اوڑھے رکھیں یا جب کسی ضرورت سے گھر سے باہر نکلیں تو بڑی چادروں میں اپنے پورے جسم کو ڈھانپ کو نکلا کریں۔ اور یہ رخصت بھی صرف اس صورت میں ہے جب انہوں نے سنگھار اور میک اپ وغیرہ نہ کیا ہو۔ اور اگر ایسی صورت ہو اور انہیں بھی اپنی زیب و زینت کا اظہار مقصود ہو یا ان کا بھی بناؤ سنگھار کرنے یا اس کی نمود و نمائش کرنے کو جی چاہتا ہو تو انہیں یہ رخصت نہیں ملے گی۔

[۹۲] یعنی اگر بڑی بوڑھی عورتیں بھی اس رخصت سے فائدہ نہ اٹھائیں تو یہی بات ان کے حق میں بہتر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اسے دیکھنے والے سارے بوڑھے یا متقی لوگ تو نہیں ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی شہوت کا مارا اوباش اس سے بھی چھیڑ چھاڑ شروع کر دے اور اس پر بھی ہاتھ صاف کرنے سے نہ چوکے۔ لہٰذا بوڑھی عورتیں بھی اس رخصت کا استعمال موقع و محل کا لحاظ رکھ کر کریں۔ بصورت دیگر اس رخصت پر عمل نہ کریں۔ یہی چیز ان کے حق میں بھی بہتر ہے اور معاشرہ کے حق میں بھی۔

الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ وَلَا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَن تَأْكُلُوا مِن بُيُوتِكُمْ

أَوْ بُيُوتِ آبَائِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أُمَّهَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ إِخْوَانِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخَوَاتِكُمْ أَوْ

بُيُوتِ أَعْمَامِكُمْ أَوْ بُيُوتِ عَمَّاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخْوَالِكُمْ أَوْ بُيُوتِ خَالَاتِكُمْ أَوْ مَا مَلَكْتُم

نہ مریض[۹۳] اور نہ خود تمہارے لیے کوئی حرج ہے کہ تم اپنے گھروں سے[۹۴] کھانا کھاؤ، اپنے باپ دادا کے گھروں سے یا اپنی ماں (اور نانی) کے گھروں سے یا اپنے بھائیوں، بہنوں، چچاؤں، پھوپھیوں، ماموؤں یا خالاؤں کے گھروں سے کھاؤ یا ان کے گھروں سے جن کے تم سرپرست[۹۵] ہو

[۹۳] کھانا کھانے کھلانے کے آداب:۔ اس آیت میں معاشرہ کے مختلف قسم کے لوگوں کے ایک دوسرے کے ہاں کھانا کھانے کے آداب اور احکام بیان ہوئے ہیں۔ آیات کا ابتدائی حصہ معذور لوگوں سے تعلق رکھتا ہے یعنی لنگڑے اور مریض قسم کے لوگ۔ ان کے متعلق ارشاد ہوا کہ وہ چونکہ خود کما نہیں سکتے اس لئے وہ ہر گھر سے کھانا کھا سکتے ہیں۔ انہیں اس میں عار محسوس نہ کرنا چاہئے اور معاشرہ کے لوگوں پر چونکہ ان کا حق ہے۔ لہٰذا انہیں بھی چاہئے کہ انہیں کھانا کھلانے کے سلسلہ میں فراخدلی سے کام لیں۔

اس کی دوسری توجیہ یہ ہے کہ دور جاہلیت میں اس قسم کے معذور لوگ خود آسودہ حال اور تندرست لوگوں کے ساتھ مل کر کھانا کھانے میں جھجک محسوس کرتے تھے انہیں یہ خیال آتا تھا کہ شاید دوسروں کو ہمارے ساتھ کھانا کھانے سے نفرت ہو اور وہ اسے ناگوار محسوس کریں۔ اور فی الواقع بعض لوگوں کو ایسی نفرت و وحشت ہوتی بھی تھی۔ لہٰذا عام لوگوں کو ہدایت دی گئی کہ ایسے لوگ تو تمہاری ہمدردی کے محتاج ہیں چہ جائے کہ ان سے نفرت کی جائے۔

تیسری توجیہ یہ ہے کہ بعض متقی قسم کے لوگوں کو یہ خیال آتا تھا کہ شاید ایسے لوگوں کے ساتھ مل کر کھانے سے کہیں ان معذور لوگوں کی حق تلفی نہ ہوتی ہو۔ مثلاً اندھے کو سب کھانے نظر نہیں آتے۔ لنگڑے ممکن ہے دیر سے پہنچیں اور مریض تو کھانا کھاتے وقت اپنی تکلیف اور پرہیز ہی کو ملحوظ رکھتے ہیں لہٰذا یہ لوگ علیحدہ ہی کھانا کھائیں تو بہتر ہے۔ اس جملہ سے ان سب لوگوں کے نظریات کا ازالہ کر دیا گیا۔

[۹۴] جب یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَلَا تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ (۴:۲۹) تو بعض مسلمان اس سلسلہ میں ضرورت سے زیادہ محتاط ہو گئے تھے اور وہ صاحب خانہ کی دعوت یا اس کی اجازت کے بغیر اپنے کسی قریبی رشتہ دار کے ہاں سے بھی کھانا کھانا تقویٰ کے خلاف سمجھنے لگے تھے۔ اس فقرہ کی رو سے ان کی ضرورت سے زیادہ احتیاط کے نظریہ کا ازالہ کیا گیا اور سب سے پہلے اپنے ہی گھروں سے کھانا کھانے سے ابتدا کی گئی۔ حالانکہ اپنے گھر سے کھانا کھانے کے لئے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس آغاز سے ذہن نشین یہ کرایا گیا ہے کہ جس طرح تمہیں اپنے گھر سے کھانا کھانے کے لئے کسی اجازت اور تکلف کی ضرورت نہیں ہوتی اسی طرح تم اپنے باپ، اپنی ماں، اپنے بھائیوں، اپنی بہنوں، اپنے چچاؤں، اپنی پھوپھیوں، اپنے ماموؤں اور اپنی خالاؤں کے ہاں سے کھا سکتے ہو۔ اس مقام پر آٹھ بڑے قریبی رشتہ داروں کا ذکر کیا گیا ہے کہ ان گھروں سے تم بلا اجازت اور بے تکلف کھانا کھا سکتے ہو۔ خواہ صاحب خانہ موجود ہو یا نہ ہو۔ اس آیت میں اپنے بیٹوں، بیٹیوں کے گھروں کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا۔ یہ گھر بھی دراصل ہر شخص کے اپنے ہی گھر ہوتے ہیں۔

[۹۵] ﴿أَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَفَاتِحَهُ﴾ کے بھی دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ تمہارے کارندے اس چیز سے کھا سکتے ہیں جس پر تم نے

مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ۭ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ۭ

یا اپنے دوست[۹۶] کے ہاں سے کھالو۔

نہ ہی اس بات میں کوئی گناہ ہے کہ تم سب مل کر کھاؤ یا علیحدہ علیحدہ[۹۷]۔ البتہ جب تم گھروں میں[۹۸] داخل ہوا

انہیں نگران یا کارندہ بنایا ہے۔ اس لحاظ سے تمہارے باغ کا مالی باغ کے پھل تمہاری اجازت کے بغیر کھا سکتا ہے۔ تمہارا گڈریا تمہاری اجازت کے بغیر بکریوں کا دودھ پی سکتا ہے۔ تمہارا نان بائی تمہارے ہوٹل سے تمہاری اجازت کے بغیر کھانا کھا سکتا ہے اور اس کی بے شمار مثالیں ہو سکتی ہیں اور دوسرا یہ کہ اگر تم ایسے لوگوں کے ہاں سے کچھ کھالو تو اس میں بھی کچھ حرج نہیں۔ کیونکہ ان کے کفیل تو تم خود ہو۔

[۹۶] یہاں دوست سے مراد ایسا دلی اور ہمدرد دوست مراد ہے جو اگر تمہارے پاس آئے تو تمہیں حقیقی مسرت حاصل ہو اور اگر وہ تمہاری غیر حاضری میں تمہارے گھر سے کچھ کھالے تو تمہیں یہ بات ناگوار گذرنے کے بجائے خوشی ہو۔

[۹۷] ۞ <u>اکیلے اکیلے کھانا بہتر ہے یا اکٹھے مل کر:</u>۔ اہل عرب کے بعض قبیلوں کی یہ تہذیب تھی کہ وہ اکیلا اکیلا کھانا کھانے کو بہتر سمجھتے تھے اور اکٹھے مل کر کھانے کو معیوب سمجھتے تھے۔ ہندوؤں میں آج کل بھی یہی تہذیب ہے۔ اور مسلمانوں میں سے بھی کچھ لوگ اسی بات کو بہتر سمجھتے ہیں بالخصوص وہ لوگ جو جراثیم کے نظریہ کے ضرورت سے زیادہ قائل ہوتے ہیں۔ دوسری طرف کچھ ایسے لوگ تھے جو اکیلے یا اکیلے اکیلے کھانے کو معیوب سمجھتے تھے۔ بعض تو اس حد تک متشدد تھے کہ اس وقت تک کھانا نہ کھاتے تھے بلکہ فاقہ سے رہتے تھے جب تک کوئی دوسرا آدمی یا مہمان ان کے ساتھ کھانے میں شامل نہ ہو اور بعض کی تہذیب ہی یہ تھی کہ اکیلے اکیلے کھانا بری بات ہے اور مل کر کھانا ہی بہتر ہے۔ یہ آیت اس طرح کی پابندیوں کو ختم کرنے کے لئے نازل کی گئی اس آیت کی رو سے اگرچہ عام اجازت دی گئی کہ جس طرح کوئی چاہے کھا سکتا ہے۔ تاہم اسلام نے اکٹھے مل کر کھانے کو ہی ترجیح دی ہے اور اس کی دلیل درج ذیل احادیث ہیں:

۱۔ عمرو بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ، جو ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے (ابو سلمہ سے) بیٹے تھے، کہتے ہیں کہ ایک دن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھایا۔ میں رکابی کے سب اطراف میں ہاتھ بڑھانے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: "اپنے سامنے سے کھاؤ" (بخاری۔ کتاب الاطعمہ۔ باب الأكل ممايليه)

۲۔ سیدنا ابو موسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اشعری لوگ جب لڑائی میں محتاج ہو جاتے ہیں یا مدینہ میں ان کے بال بچوں کا کھانا کم ہو جاتا ہے تو جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے اس کو ایک کپڑے میں اکٹھا کرتے ہیں۔ پھر آپس میں برابر برابر بانٹ لیتے ہیں۔ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں" (مسلم۔ کتاب الفضائل۔ باب من فضائل الاشعريين)

[۹۸] اس جملہ کا تعلق صرف کھانے کی دعوت سے نہیں بلکہ عام ہے۔ یعنی جب بھی تم اپنے یا کسی دوسرے کے گھر میں یا مسجد وغیرہ میں داخل ہوا کرو تو وہاں موجود لوگوں پر سلام (سلامتی کی دعا السلام علیکم) ضرور کہا کرو۔ بلکہ اگر گھر میں کوئی شخص بھی نظر نہ آئے، تب بھی السلام علیکم ضرور کہنا چاہئے اور فرشتوں کی موجودگی کا خیال کر لینا چاہئے۔ اور یہ کلمہ پاکیزہ اور مبارک اس

فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ۭ
ع كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٦١﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ
رَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓي اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ
يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ

کرو تو اپنے لوگوں (گھر والوں) کو سلام کہا کرو۔ یہ اللہ کی طرف سے مبارک اور پاکیزہ تحفہ ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیات تمہارے لئے کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم سمجھ سے کام لو۔(۶۱)

مومن تو وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں اور جب وہ کسی اجتماعی کام میں رسول کے ساتھ ہوتے ہیں تو اس سے [۹۹] اجازت لئے بغیر جاتے نہیں (اے رسول!) جو لوگ آپ سے اجازت مانگتے ہیں وہی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والے ہیں، تو جب وہ اپنے کسی کام کے لئے آپ سے اِذن مانگیں

لحاظ سے ہے کہ جواب میں تمہیں بھی سلامتی کی دعا حاصل ہوگی۔ اس طرح پورے معاشرہ میں ایک دوسرے کے لئے ہمدردی اور سلامتی چاہنے کی فضا بن جائے گی۔

[۹۹] مجلس سے صدر کی اجازت کے بغیر اٹھ کر چلے آنا ممنوع ہے:۔ یعنی ایسے امور جن کا تعلق سب مسلمانوں سے مشترک ہو۔ جیسے جہاد یا مجلس مشاورت، یا کوئی مشترکہ مفادات کے لئے اجتماع ہو۔ خواہ ایسی میٹنگ جنگ یا حالات جنگ سے تعلق رکھتی ہو یا حالت امن سے، مومنوں کا یہ کام نہیں کہ آپ سے اجازت لئے بغیر وہاں سے چل دیں۔ ہاں اگر انہیں کسی ضروری کام کی بناء پر اس مجلس و اجتماع کے اختتام سے پہلے واپس آنا ضروری ہو تو وہ اس سے رخصت ہونے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ اجازت لئے بغیر وہاں سے چلے نہیں آتے۔ اگر وہ اپنی کوئی ضرورت آپ سے بیان کریں۔ تو انہیں اجازت دینا آپ کی صوابدید پر منحصر ہے اور اگر آپ یہ سمجھیں کہ اس کا ذاتی کام اس اجتماعی مفاد کے مقابلہ میں کچھ اہمیت نہیں رکھتا تو بے شک آپ انہیں اجازت نہ دیں۔ اور اگر آپ انہیں اجازت دے دیں تو ان کے لئے دعائے مغفرت بھی کیجئے۔ کیونکہ اپنی کسی ذاتی غرض کی خاطر اجتماعی معاملات اور آپ کی صحبت سے محروم رہنا حقیقتاً دنیا کو دین پر ترجیح دینے کے مترادف ہے۔ لہٰذا اگر کسی مخلص مومن کو اس کی التجا کی بناء پر آپ اجازت دے بھی دیں تو اس کے حق میں آپ کے استغفار کی برکت سے اس تقصیر کا تدارک ہو سکے گا۔ ضمناً اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی واقعی ضرورت کے بغیر ایسے اجتماعی مفاد کی مجلس سے اجازت طلب کرنا قطعاً ناجائز ہے۔ علاوہ ازیں یہ حکم آپ ﷺ کی ذات یا آپ کی زندگی تک ہی محدود نہیں بلکہ آپ کے بعد آپ کے خلفائے راشدین یا کسی بھی اسلامی حکومت کے ایسے مشترکہ مفاد کی مجلس سے بلا اجازت چلے آنا آداب مجلس کے بھی خلاف ہے اور شرعاً ناجائز بھی ہے مجلس کو چھوڑ کر جانے کا جواز صرف اس صورت میں ہے کہ فی الحقیقت کوئی ضرورت لاحق ہو جس کی بناء پر میر مجلس سے رخصت ہونے کی اجازت حاصل کی جائے۔ اور اگر میر مجلس اس کو اجازت دینے یا اس کے ذاتی کام کے مقابلہ میں اس کے شریک مجلس رہنے کو زیادہ اہم سمجھتا ہو اور وہ اجازت نہ دے تو کسی مومن کو اس سے کچھ شکایت نہیں ہونا چاہئے۔

لِمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٦٢﴾ لَا تَجْعَلُوْا دُعَاۗءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاۗءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ۭ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ

تو ان میں سے جسے آپ چاہیں اجازت دیں (اور جسے چاہیں نہ دیں) اور ان کیلئے اللہ سے بخشش طلب کیجئے۔ اللہ تعالیٰ یقیناً بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔(۶۲) (مسلمانو!) رسول کے بلانے کو ایسا نہ سمجھ لو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے [۱۰۰] کو بلاتے ہو۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جانتا ہے جو تم میں سے چپکے سے [۱۰۱] کھسک جاتے ہیں لہٰذا جو

[۱۰۰] رسول اللہ ﷺ کا ادب واحترام:۔ اس جملہ کے تین مطلب ہو سکتے ہیں اور تینوں ہی درست ہیں۔ ایک یہ کہ رسول کو ایسے نہ بلایا کرو جیسے تم ایک دوسرے کو بے تکلفی سے بلاتے رہتے ہو۔ بلکہ انہیں بلانا ہو تو ان کا پورا ادب واحترام ملحوظ رکھا کرو۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر رسول تمہیں بلائیں تو ایسا نہ سمجھو جیسے کوئی عام آدمی بلا رہا ہے کہ جی چاہے تو جواب دے دو یا نہ دو یا اگر جی چاہے تو ان کے پاس حاضر ہو جاؤ اور چاہے تو نہ آؤ۔ بلکہ ان کے بلانے پر تم پر واجب ہو جاتا ہے کہ تم ان کے پاس حاضر ہو جاؤ اور ان کی بات سنو پھر اسے بجا لاؤ۔ اور یہ مطلب قرآن کریم کی ایک دوسری آیت ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ﴾ (۸: ۲۴) سے ماخوذ ہے۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

سیدنا سعید بن معلیٰ ؓ کہتے ہیں کہ: میں نماز پڑھ رہا تھا آپ ﷺ میرے سامنے گزرے اور مجھے بلایا۔ میں نماز پڑھ کر حاضر ہوا تو مجھے فرمایا: تم میرے بلانے پر کیوں نہ آئے؟ کیا تم نے اللہ کا یہ فرمان نہیں سنا ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ﴾ (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ زیر آیت مذکورہ)

اس حدیث سے علماء نے یہ مسئلہ استنباط کیا ہے کہ اگر کوئی شخص فریضہ نماز بھی ادا کر رہا ہو تو رسول کے بلانے پر اسے نماز تک چھوڑ کر فوراً حاضر ہو جانا چاہئے۔ اور تیسرا مطلب یہ ہے کہ رسول ﷺ کی دعا کو یوں نہ سمجھو جیسے کسی عام آدمی کی دعا ہے۔ بلکہ تمہارے حق میں رسول ﷺ کی دعا تمہاری دنیا اور تمہاری آخرت سنوارنے کا موجب بن سکتی ہے اسی طرح ان کی بددعا تمہیں تباہ و برباد بھی کر سکتی ہے۔ لہٰذا ان کی اطاعت کر کے انہیں خوش رکھنے اور ان کی دعا لینے کی کوشش کیا کرو۔

[۱۰۱] دن کے پچھلے حصہ (اصیل) میں تو تین نمازیں آ جاتی ہیں۔ مگر پہلے حصے میں ایک بھی فرض نماز نہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ دن کے پہلے حصہ میں کوئی ایسی وحی آ جاتی جس سے مسلمانوں کو فوری طور پر آگاہ کرنا ضروری ہوتا تھا۔ اس غرض سے مسجد نبوی میں اذان کہہ کر مسلمانوں کو بلا لیا جاتا۔ آپ وحی سناتے۔ خطبہ ارشاد فرماتے اور حالاتِ حاضرہ سے متعلق بعض دفعہ مشورے بھی مقصود ہوتے تھے اور بعض دفعہ اللہ کے احکام کی فوری نشر واشاعت...... اسی سلسلہ میں منافق بھی ایک دفعہ آپ ﷺ کے پاس حاضر ضرور ہو جاتے اور یہ بات نفاق کا شبہ دور کرنے کی خاطر ان کے لئے ضروری بھی ہوتی تھی۔ حاضری لگوا لینے کے بعد وہ اس انتظار میں رہتے تھے کہ موقع ملے تو چپکے سے کھسک جائیں اور بمصداق جو ئندہ یابندہ وہ کھسک بھی جایا کرتے تھے۔ اس آیت میں ایسے ہی لوگوں کو خطاب کیا جا رہا ہے۔

عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ

قَدْ يَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ۭ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۴﴾ ع ۹ ۱۵

لوگ رسول کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں[۱۰۲] انہیں اس بات سے ڈرنا چاہئے کہ وہ کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائیں یا انہیں کوئی دردناک عذاب پہنچ جائے۔(۶۳) یاد رکھو! جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے۔ تم جس روش پر بھی ہو اللہ اسے جانتا ہے۔ اور جس دن لوگ اس کی طرف لوٹائے جائیں گے تو وہ[۱۰۳] انہیں بتادے گا کہ وہ کیا کرتے رہے۔ اور اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔(۶۴)

[۱۰۲] رسول اللہ ﷺ کی مخالفت پر عذاب کی وعید:۔ ربط مضمون کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بلانے پر منافقوں کا آپ کی دعوت کو ناگوار محسوس کرنا، کھسک جانے کی کوشش کرنا۔ آپ کے نصائح پر توجہ نہ دینا یا آپ کی دعوت کو کچھ اہمیت نہ دینا۔ یہ سب رسول کی مخالفت میں آتی ہیں۔ تاہم رسول کی مخالفت کا دائرہ اس سے وسیع تر ہے اور منافقوں کے لئے یہ فتنہ کیا کم ہے کہ ان کے دلوں میں کفر و نفاق جڑ پکڑ جائے اور انہیں اپنی ایسی کرتوتیں بھی اچھی نظر آنے لگیں۔ تاہم آیت کے اس حصہ کا حکم عام ہے جو منافقوں اور مسلمانوں سب کو شامل ہے اور ہمیشہ کے لئے ہے۔ رہا فتنہ کا مفہوم تو اس کی بے شمار صورتیں ہو سکتی ہیں۔ سب سے واضح صورت مسلمانوں کا داخلی انتشار اور ان کی اجتماعی قوت کا کمزور ہونا اور ان پر ظالم اور جابر حکمران کا مسلط ہو جانا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس وقت ہوتا ہے جب احکامِ شرعیہ کو پس پشت ڈال دیا جائے۔

[۱۰۳] یعنی جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے کھسک جاتے ہیں یا اسلام اور مسلمانوں کا تمسخر اڑاتے ہیں اور اس کی راہ روکنے کے لئے سازشیں تیار کرتے ہیں۔ ایسے لوگ رسول یا دوسرے مسلمانوں کی نظروں سے تو اوجھل رہ سکتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ تو ان کے اعمال و افعال تو درکنار ان کے دلوں کے خیالات تک سے واقف ہے اور انہیں سزا دینے پر قادر بھی ہے۔ لہٰذا قیامت کے دن وہ سب کو اپنے حضور اکٹھا کر کے انہیں ان کی کرتوتیں بتا بھی دے گا اور ان کی سزا بھی دے گا۔

سُوْرَةُ الْفُرْقَانِ مَكِّيَّةٌ
۷۷ آیاتها رکوعها ٦

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۝ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

کلمات ۹۰۶ آیت ۷۷ (۲۵) سورہ الفرقان مکی ہے (۴۲) رکوع ٦ حروف ۳۹۱۹

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

متبرک[۱] ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے[۲] پر فرقان[۳] (قرآن) نازل کیا تاکہ وہ کل اہل عالم کیلئے (برے انجام سے) ڈرانے والا[۴] بن جائے۔(۱) وہی ذات جو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کی مالک[۵] ہے جس

[۱] ۞ تبارک کا لغوی مفہوم:۔ تبارک کا مادہ ب رک ہے۔ اسی سے لفظ برکت ہے اور کسی چیز سے زیادہ سے زیادہ متوقع یا غیر متوقع فوائد حاصل ہو جانے کا نام برکت ہے۔ اور بابرکت وہ ذات ہے جو دوسروں کو زیادہ سے زیادہ متوقع اور غیر متوقع فوائد پہنچانے والی ہو۔ علاوہ ازیں تبارک کے لفظ میں بلندی اور تقدس کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اور یہ لفظ اللہ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔

[۲] ۞ مسلمانوں کا اپنے نبی کی شان میں غلو:۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر اپنے پیارے رسول کے لئے عبد کا لفظ استعمال فرمایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی امتوں نے بھی اپنے رسول کی شان میں عقیدت مندی کی بنا پر غلو کیا تھا اور انہیں ان کے حقیقی مقام سے اٹھا کر اللہ کے ساتھ جا ملایا تھا۔ یہود نے کہا کہ عزیرؑ کے جسم میں اللہ تعالیٰ نے حلول کیا ہے اور وہ اللہ کے اوتار تھے، ہندوؤں میں بھی اوتار یا حلول کا عقیدہ بکثرت پایا جاتا ہے اور نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بھی کہا بلکہ اس سے بڑھ کر اللہ ہی بنا دیا۔ اسی لئے آپ ﷺ نے واضح الفاظ میں اپنی امت کو تنبیہ فرمائی کہ "مجھے میری حد سے ایسے نہ بڑھانا چڑھانا جیسے نصاریٰ نے عیسیٰ ابن مریم کو چڑھا دیا میں تو اللہ کا بندہ ہوں لہذا تم یوں کہو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول" (بخاری، کتاب بدء الخلق۔ باب واذکر فی الکتاب مریم)

لیکن افسوس ہے کہ آپ کی اس تنبیہ کے باوجود مسلمانوں نے بھی وہی کچھ کیا جو پہلی امتیں کرتی رہیں۔ مسلمانوں کے طبقہ نے آپ کو نور من نور اللہ قرار دیا۔ اور کچھ لوگوں نے یوں کہا:

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر
اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفےٰ ہو کر

یہود و نصاریٰ نے تو اس حلول کے عقیدہ کو انبیاء تک محدود رکھا تھا مگر مسلمانوں نے یہ کمال دکھایا کہ انبیاء کے علاوہ دوسرے بزرگوں میں بھی اللہ کے حلول کا عقیدہ اپنا لیا۔ اسی طرح کا ایک دوسرا شعر:

اپنا اللہ میاں نے ہند میں نام
رکھ لیا خواجہ غریب نواز

بھی اسی عقیدہ حلول کی وضاحت کر رہا ہے۔

عبداللہ بن سبا یہودی کا کردار:۔ اسلام میں اس عقیدہ کو داخل کرنے والا ایک یہودی عبداللہ بن سبا تھا۔ یہ یمن کے شہر صنعاء کا رہنے والا اور نہایت ذہین و فطین آدمی تھا۔ جب اس نے یہ معلوم کر لیا کہ عملی میدان میں مسلمانوں سے انتقام لینے کی یہودیوں میں سکت باقی نہیں رہ گئی تو اس نے فریب کاری کے طور پر اسلام قبول کیا اور درویشی کا لبادہ اوڑھ کر زہد و تقویٰ کے روپ میں سامنے آتا۔ یہ سیدنا عمرؓ کے زمانہ میں مسلمان ہوا اور حالات کے دھارے کا انتظار کرتا رہا۔ اس کی یہ سازشی تحریک انتہائی خفیہ طور پر مکہ اور مدینہ سے اور دوسرے علاقوں مثلاً کوفہ، بصرہ اور مصر میں اپنا کام کر رہی تھی۔ بالآخر اسی یہودی کے حامیوں نے سیدنا عثمان ؓ پر مختلف الزامات عائد کئے اور موقعہ پا کر غنڈہ گردی کر کے ۳۵ھ میں انہیں شہید کر دیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اسلام کے جسم پر اس نے دو طرح کے وار کئے اور اپنی سازش کی کامیابی کے لئے سیدنا علی کو بطور ہیرو منتخب کیا۔ اس کا پہلا وار یہ تھا کہ نو مسلم عجمی لوگوں کو یہ تاثر دیا کہ رسول اکرم ﷺ سے قرابتداری کی بنا پر خلافت کے اصل حقدار سیدنا علیؓ تھے اور پہلے تین خلیفوں نے ان کا حق غصب کیا ہے۔ نئے مسلمان ابھی اسلامی تعلیمات سے پوری طرح آگاہ نہیں تھے، دنیا کے عام دستور وراثت و نیابت کے مطابق اس کی چال میں آ گئے۔ اور دوسرا وار دین طریقت کو اسلام میں داخل کرنا تھا۔ وہ خود درویشی کے روپ میں سامنے آیا تھا۔ لہذا ظاہر اور باطن کی تفریق کر کے اور شریعت و طریقت کے رموز بتا کر ان نو مسلموں میں دین طریقت کے ملحدانہ اور کافرانہ نظریات داخل کر دیئے اور بتایا کہ سیدنا علیؓ اللہ کی ذات کا مظہر ہیں اور اللہ ان کے بدن میں حلول کر گیا ہے۔ گویا اسلام میں سیدنا علی وہ پہلے شخص ہیں جن کے متعلق حلول کا عقیدہ اپنایا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حلول کا عقیدہ تو بہت زمانہ بعد کی پیداوار ہے۔

سیدنا علیؓ کا آپ کو اللہ کہنے والوں کو سزا دینا:۔ عبداللہ بن سبا نے خود ایک دفعہ کوفہ میں سیدنا علیؓ کو مخاطب کر کے رمز و کنایہ کی زبان میں کہا انت ھو یعنی "تو وہی ہے" تو علی رضی اللہ عنہ اس کے نظریہ کو بھانپ گئے اور اسے سخت سرزنش کی اور بعد میں اسے سزا دینے کے لئے بلا بھیجا تو معلوم ہوا کہ وہ کوفہ سے راہ فرار اختیار کر چکا ہے۔ بہر حال اس نے اپنے معتقدین کی ایک جماعت تیار کر لی تھی۔ ایک دفعہ یہ لوگ علی الاعلان بازار میں کھڑے ہو کر اپنے اسی عقیدہ کا پرچار کر رہے تھے کہ سیدنا علیؓ کے غلام قنبر نے یہ باتیں سنیں تو سیدنا علیؓ کو جا کر اطلاع دی کہ کچھ لوگ آپ کو اللہ کہہ رہے ہیں۔ اور آپ میں خدائی صفات مانتے ہیں۔ آپ نے ان کو بلایا اور قوم زط کے ستر اشخاص تھے آپ نے ان سے پوچھا "تم کیا کہتے ہو؟" انہوں نے کہا کہ آپ ہمارے رب ہیں اور خالق اور رازق ہیں" آپ نے فرمایا: "تم پر افسوس! میں تو تم ہی جیسا ایک بندہ ہوں اور تمہاری طرح کھانے پینے کا محتاج ہوں۔ اگر اللہ کی اطاعت کروں گا تو مجھے اجر دے گا اور نافرمانی کروں گا تو سزا دے گا۔ لہذا تم اللہ سے ڈر جاؤ اور اس عقیدہ کو چھوڑ دو"۔

دوسرے دن قنبر نے پھر سیدنا علیؓ کو بتایا کہ وہ لوگ پھر وہی کچھ کہہ رہے ہیں۔ آپ نے دوبارہ انہیں بلایا اور تنبیہ کی۔ لیکن پھر بھی یہ لوگ باز نہ آئے۔ تیسرے دن آپ نے انہیں بلا کر یہ دھمکی بھی دی کہ اگر تم نے پھر یہی بات کہی تو میں تم کو نہایت بُری سزا دوں گا۔ مگر اس جماعت کا سرغنہ عبداللہ بن سبا تو ایک خاص مشن کے تحت یہ تحریک چلا رہا تھا۔ لہذا یہ لوگ

اپنی بات پر اڑے رہے۔ آپ نے ایک گڑھا کھدوایا جس میں آگ جلائی گئی اور ان سے کہا۔ "دیکھو اب بھی باز آجاؤ ورنہ اس گڑھے میں پھینک دوں گا مگر وہ اپنے عقیدہ پر قائم رہے تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے آگ میں پھینک دیئے گئے" (فتح الباری۔ ج ۱۲، ص ۲۳۸)

امام بخاری نے یہ حدیث مختصراً کتاب استتابۃ المرتدین میں درج فرمائی ہے اور ان حلولیوں کے لئے "زنادقہ" کا لفظ استعمال کیا ہے اور یہ بھی صراحت کی ہے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ اگر میں حاکم ہوتا تو ان کو جلانے کے بجائے ان کے قتل پر اکتفا کرتا۔

حلول کا عقیدہ رکھنے والے وہ لوگ جو بچ رہے تھے اپنے عقیدہ میں اور بھی سخت ہوگئے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ آگ اور پانی سے عذاب دینا صرف اللہ کو سزاوار ہے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بھی چونکہ آگ سے جلایا ہے لہذا وہ عین اللہ ہیں۔ وہ زبان سے یہ کہتے تھے کہ لایعذب بالنار الا رب النار "یعنی آگ کا رب ہی آگ سے سزا دیتا ہے"

عبداللہ بن سبا کا یہ عقیدہ اس کے پیروکار نصیریہ، کیسانیہ، قرامطیہ اور باطنیہ سے ہوتا ہوا صوفیاء کے اندر داخل ہوگیا حسین بن منصور حلاج (م ۳۰۹ھ) اس عقیدہ کا علمبردار اعلیٰ تسلیم کیا جاتا ہے اور اسلام میں یہی وہ پہلا شخص ہے جس نے خود اپنی ذات کے متعلق کھل کر یہ دعویٰ کیا کہ اللہ اس کے اندر حلول کر گیا ہے۔ گویا اس سے پہلے بھی کچھ صوفیاء اس عقیدہ کے حامی اور اسے اپنے سینوں میں چھپائے رکھتے تھے، مگر عقیدہ کو شہرت دوام حلاج ہی کی ذات سے ہوئی۔ وہ خود انا الحق کا دعویٰ کرتا تھا سمجھانے کے باوجود جب وہ اپنے عقیدہ پر مصر رہا تو خلیفہ بغداد المقتدر باللہ نے علماء سے فتویٰ لینے کے بعد ۲۴ ذی قعدہ ۳۰۹ھ (۹۱۴ء) کو بغداد میں قتل کر دیا اور اس "خدا" کی لاش کو جلا کر دریا میں پھینک دیا گیا اور اس کی خدائی اپنے آپ کو بھی موت اور لاش کو جلنے کے عذاب سے بچا نہ سکی۔ مگر حیرت تو اس بات پر ہے کہ حسین بن منصور کے اتنے شدید جرم کے صوفیاء کی اکثرت نے اس کے حق پر ہونے کی حمایت کی لہذا حلول کا عقیدہ آج تک مسلمانوں میں متوارث چلا آرہا ہے۔ چنانچہ امام اہل سنت رضا خان بریلوی فرماتے ہیں:

سوال: منصور، تبریز اور سرمد نے ایسے الفاظ کہے جن سے خدائی ثابت ہے (یعنی یہ تینوں حضرات خدائی کے دعویدار تھے) لیکن وہ ولی اللہ گنے جاتے ہیں۔ جبکہ فرعون، شداد، ہامان، اور نمرود نے یہی دعویٰ کیا تھا تو وہ دائمی جہنمی ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: ان کافروں نے خود کہا اور ملعون ہوئے اور انہوں نے (یعنی منصور، تبریز اور سرمد نے) خود نہ کہا۔ اس نے کہا جسے کہنا شایاں ہے۔ اور آواز بھی انہی سے مسموع ہوئی۔ جیسے سیدنا موسیٰ نے درخت سے سنا۔ اِنی انا اللہ میں ہوں اللہ رب سارے جہان کا، کیا درخت نے کہا تھا؟۔۔۔۔۔ نہیں، بلکہ اللہ نے۔ یونہی یہ حضرات اس وقت شجر موسیٰ ہوتے ہیں" (احکام شریعت ص ۹۳)

❁ اہل سنت اور عقیدہ حلول:۔ اس جواب میں نشان زدہ الفاظ پر اور اس کی دلیل پر غور فرمایئے اور دیکھئے کہ امام اہل سنت عقیدہ حلول کی کس قسم کے اسرار و رموز سے وکالت فرما رہے ہیں۔ فرعون، شداد، نمرود اور ہامان وغیرہ کو اللہ نے جہنمی قرار دیا اور اس کی اطلاع قرآن میں دی ہے۔ حلاج و سرمد وغیرہ کو ولی تو آپ لوگ کہتے ہیں۔ عامۃ المسلمین اور علماء نے تو منصور کو

زندیق اور کافر قرار دے کر اس کے قتل کا فتویٰ صادر کیا تھا اور باقی دو کا انجام اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر یہی امام اہل سنت فرماتے ہیں کہ حضور پر نور سیدنا غوث اعظم حضور اقدس وانور سید عالم کے وارث کامل ونائب تام آئینہ ذات ہیں کہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم مع اپنی جمیع صفات جمال وجلال وکمال وافضال کے ان میں متجلی ہیں۔ جس طرح ذات عزت احدیت مع جملہ صفات ونعوت وجلالت آئینہ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں تجلی فرما ہے" (فتاویٰ افریقہ ص ۱۰۱)

گویا امام صاحب کے اس ارشاد نے واضح طور پر بتادیا کہ اللہ کی ذات رسول اللہ کی ذات میں جلوہ گر ہے۔ اسی طرح غوث اعظم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات جلوہ گر ہے یہ ہے حلول کا وہ نظریہ جسے صوفیاء کے ہی ایک طبقہ نے گمراہ کن نظریہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ یہ شرک فی الصفات کے علاوہ شرک فی الذات کی بھی واضح دلیل ہے۔ اسی باطل نظریہ کے ردّ میں اللہ نے سورہ نساء میں فرمایا:

﴿یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ﴾ (۴:۱۷۱) "اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو اور وہی بات کہو جو حق ہو"

اور سورہ مائدہ میں فرمایا:

﴿یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ غَیْرَ الْحَقِّ﴾ (۵:۷۷) "اے اہل کتاب اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو"

[۳] ۞ فرقان کا مفہوم:۔ فرقان مبالغہ کا صیغہ ہے۔ یعنی حق وباطل کو یا کفر اور ایمان کو بالکل الگ الگ کر کے دکھانے والا اور اس سے مراد قرآن ہے۔ جس نے ایمان اور اس کے مقابلہ میں کفر وشرک اور نفاق کی ایک ایک خصلت کو یوں واضح کر کے بتادیا ہے کہ کچھ ابہام باقی نہیں رہتا۔ اور بعض علماء نے فرقان سے مراد حلت وحرمت کے احکام کو جدا جدا کر کے واضح طور پر بتانے والا لیا ہے۔ اور یوم الفرقان سے مراد غزوہ بدر کا دن ہے جو حق وباطل کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ ثابت ہوئی۔

[۴] ۞ آپ کی رسالت اور قرآن کی ہدایت قیامت تک سب لوگوں کے لئے ہے:۔ لیکون کی ضمیر عبدہ کی طرف بھی راجع قرار دی جاسکتی ہے اور فرقان یعنی قرآن کی طرف بھی اور صاحب قرآن کی طرف بھی۔ کیونکہ قرآن اور صاحب قرآن دونوں کی دعوت ایک ہی ہے۔ قرآن مراد لینے کی صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ قرآن سب لوگوں کے لئے تاقیامت کتاب ہدایت ہے اور صاحب قرآن مراد لینے کی صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ آپ تاقیامت تمام تر لوگوں کے لئے اللہ کے رسول ﷺ ہیں۔ اور قرآن ہو یا صاحب قرآن دونوں کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو ان کے برے اعمال کے برے انجام سے خبردار کیا جائے۔

[۵] ۞ اللہ کی اولاد نہ ہونے پر استدلال:۔ یعنی پوری کائنات کا مکمل اقتدار و اختیار آج کی زبان میں اقتدارِ اعلیٰ (Sovereignty) اسی کے ہاتھ میں ہے اور جب یہ بات تسلیم کرلی جائے تو سب قسم کے شریکوں کی از خود نفی ہو جاتی ہے کیونکہ سب چیزیں اللہ کی مملوک اور وہ ان کا مالک ہے۔ اور بیٹا چونکہ مملوک نہیں ہوتا اور ہم یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ ہر چیز اللہ کی مملوک ہے تو اس کا کسی سے نسبی تعلق ہونے کی بھی از خود نفی ہوگئی۔

وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ﴿۲﴾ وَاتَّخَذُوْا

مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا

يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ﴿۳﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ

نے نہ کسی کو بیٹا بنایا اور نہ ہی اس کی حکومت میں کوئی شریک ہے۔ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا تو اس کا ٹھیک اندازہ[۶] کیا(۲) اور (لوگوں نے) اللہ کے سوا کئی اور الٰہ بنا ڈالے جو کوئی چیز پیدا تو کیا خاک کریں گے وہ تو خود پیدا کیے گئے ہیں، انہیں خود اپنے نفع و نقصان کا بھی کچھ اختیار نہیں اور نہ ہی انہیں کسی کو مارنے،[۷] زندہ کرنے اور مردہ کو اٹھا سکنے کا کچھ اختیار ہے۔(۳)

کافر لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) تو محض جھوٹ ہے جسے اس نے خود بنا ڈالا ہے اور کچھ

[۶] ہر چیز کے متعلق اللہ کا اندازہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو، خواہ وہ جاندار ہے یا بے جان، پیدا بھی کیا پھر اس نے ہر ایک چیز کا وظیفہ اور اس کے لئے قوانین بھی بنا دیئے۔ جن سے وہ تجاوز نہیں کر سکتی۔ مثلاً کوئی جاندار ایسا نہیں جسے موت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ ہر چیز جو بنتی ہے وہ ضرور کسی نہ کسی وقت فنا بھی ہو جائے گی۔ پانی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی وقت بلندی کی طرف بھی بہنا شروع کر دے یا پستی کی طرف بہنا رک جائے۔ نہ آگ کے لئے ممکن ہے کہ وہ ٹھنڈک پہنچانا شروع کر دے۔ آپ کسی کتے کو عمدہ اور بکثرت غذائیں کھلا پلا کر گھوڑے کے قد کے برابر نہیں کر سکتے غرض ہر ایک چیز کیلئے کچھ حدود اور کچھ وظائف اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیئے ہیں۔ اور یہی ہر چیز کے لئے اللہ تعالیٰ کا اندازہ ہے۔

[۷] اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے الوہیت کے کئی معیار بیان فرمائے ہیں اور مشرکوں کو عام دعوت دی گئی ہے کہ وہ اپنے معبودوں کو ان معیاروں پر جانچ کر دیکھیں اور پھر بتائیں کہ آیا ان کے معبودوں میں الوہیت کا کوئی شائبہ تک بھی پایا جاتا ہے مثلاً

(۱) جو ہستی کوئی چیز پیدا نہ کر سکے یا کسی بھی چیز کی خالق نہ ہو وہ معبود نہیں ہو سکتی۔

(۲) جو چیز خود پیدا شدہ ہو یا مخلوق ہو وہ الٰہ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جو چیز پیدا ہوئی ہے وہ فنا بھی ضرور ہو گی۔ اور فنا ہونے والی چیز الٰہ نہیں ہو سکتی۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ مشرکوں کے معبود خواہ وہ بت ہوں جنہیں انہوں نے خود ہی گھڑ رکھا ہے یا فرشتے ہوں یا کوئی اور چیز مثلاً: سورج، چاند، تارے، شجر، حجر ہوں۔ یہ سب چیزیں اللہ کی مخلوق ہیں۔ لہٰذا ان میں کوئی چیز بھی الوہیت کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔

(۳) جو ہستی کسی دوسرے کو فائدہ یا نقصان نہ پہنچا سکتی ہو بالفاظ دیگر وہ حاجت روا یا مشکل کشا نہ ہو وہ الٰہ نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ صفات ہیں جنہیں مشرکین اللہ کے سوا بعض دوسری ہستیوں میں (خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان، زندہ ہوں یا مر چکی ہوں) تسلیم کرتے ہیں اور شرک کی یہی قسم سب سے زیادہ عام ہے۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا کہ:

(۴) الوہیت کے سلبی معیار:۔ جو چیز اپنے ہی نفع و نقصان کی بھی مالک نہ ہو، وہ دوسرے کسی کی حاجت روا یا مشکل کشا

وَ اَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚۛ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّ زُوْرًا ۚ﴿۴﴾ وَ قَالُوْۤا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ

دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے۔ کتنا بڑا جھوٹ اور ظلم ہے جس پر [۸] یہ لوگ اتر آئے ہیں۔ (۴) نیز وہ کہتے ہیں کہ یہ تو پہلے لوگوں کی داستانیں ہیں جنہیں اس نے نقل کرالیا ہے سو وہی

نہیں ہو سکتی۔ اور یہ معیار بھی ایسا معیار ہے جس کے مطابق اللہ کے سوا تمام تر معبود باطل قرار پاتے ہیں۔ پتھر کے معبودوں کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے توڑ پھوڑ ڈالا تو وہ ان کا بال بیکانہ کر سکے۔ رہے بزرگانِ دین (خواہ وہ پیغمبر ہو یا ولی، زندہ ہو یا فوت ہو چکے ہوں) سب کو ان کی زندگی میں بے شمار تکلیفیں پہنچتی رہیں لیکن وہ اپنی بھی تکلیفیں اور بیماریاں خود رفع نہ کر سکے تو دوسروں کی کیا کرتے یا کیا کریں گے۔ اس لئے بس وہ اللہ سے دعا ہی کرتے رہے۔ رہے شمس و قمر، تارے اور فرشتے تو یہ سب ایسی مخلوق ہیں جنہیں اپنا اختیار کچھ بھی نہیں ہے۔ اللہ نے انہیں جس کام پر لگا دیا ہے اس کے سوا وہ کوئی دوسرا کام کر ہی نہیں سکتے۔ لہذا وہ بھی الوہیت کے معیار پر پورے نہیں اتر سکتے۔

(۵) الوہیت کا پانچواں معیار یہ ہے کہ وہ ہستی کسی زندہ چیز کو مار بھی سکتی ہو اور مردہ چیز کو زندہ بھی کر سکتی ہو۔ اللہ کی یہ شان ہے کہ وہ ہر وقت زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ چیزیں پیدا کر رہا ہے۔ اور دوسرے معبودوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے چیلنج کے طور پر فرمایا کہ وہ ایک حقیر سی مخلوق مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے جبکہ ان کی عاجزی کا یہ عالم ہے کہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ سب مل کر اس سے اپنی سلب شدہ چیز چھڑا بھی نہیں سکتے اور مردوں کو زندہ کر کے اٹھا کھڑا کرنا تو اور بھی بڑی بات ہے۔

اس مقام پر الوہیت کے یہی معیار بیان کئے گئے ہیں جبکہ بعض دوسرے مقامات پر اور بھی کئی معیار مذکور ہیں: مثلاً جو خود محتاج ہو وہ الٰہ نہیں ہو سکتا۔ جو بے جان ہوں الٰہ نہیں ہو سکتا، جو کھانا کھاتا ہو وہ الٰہ نہیں ہو سکتا، جو نہ سن سکتا ہو نہ دیکھ سکتا ہو یا جواب نہ دے سکتا ہو وہ الٰہ نہیں ہو سکتا۔ وغیرہ وغیرہ

[۸] مستشرقین کا یہ الزام کہ آپ نے علماء یہود و نصاریٰ سے کسبِ فیض کیا تھا اور اس کے جوابات:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر قرآن کو تصنیف کرنے کا الزام اس دور کے مشرکین مکہ کو ہی نہ تھا، آج کے مستشرقین بھی اپنی تحقیق و تنقید کی آڑ میں کچھ ایسا ہی الزام لگا رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ آج کے ان محققین کا یہ کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پیشتر کئی تجارتی سفر کئے یہود و نصاریٰ کے کئی علماء سے آپ کی ملاقات ہوئیں اور اس سلسلہ میں بالخصوص بحیرا راہب کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ تو انہیں ملاقاتوں کے دوران آپ ﷺ نے ان علماء سے کسبِ فیض کیا۔ پھر اسے اپنے انداز میں اور اپنی زبان میں عربوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ یہی وہ قصص انبیاء یا سابقہ اقوام کی تاریخ تھی جسے آپ نے نبوت کے نام سے پیش کیا۔

مستشرقین کے اس اعتراض کے باطل ہونے کی بے شمار وجوہ ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ آپ ﷺ نے جب بھی کوئی تجارتی سفر کیا تو اکیلے نہیں کیا تھا بلکہ اپنی قوم کے لوگوں کے ہمراہ کیا تھا۔ اگر آپ ﷺ نے علمائے یہود و نصاریٰ سے کچھ ملاقاتیں کی تھیں یا ان سے کسبِ علم کیا تھا تو اس بات کا سب سے زیادہ علم آپ کے ہمراہیوں کو

ہونا چاہئے تھا۔ حالانکہ نبوت سے پیشتر ان لوگوں نے آپ پر کوئی ایسا اعتراض نہیں کیا تھا۔ پھر جس بات کا علم آپ کے ہمراہیوں کو نہ ہو سکا تھا ان لوگوں کو کیسے ہو گیا؟

۲۔ نبوت سے پہلے اگر آپ نے علمائے یہود و نصاریٰ سے کچھ کسب علم کیا تھا تو ضروری تھا کہ اس کا اظہار دانستہ طور پر یا نادانستہ طور پر نبوت سے پہلے بھی ہو جاتا۔ خواہ آپ اسے چھپانے کی کتنی ہی کوشش کرتے۔ نبوت سے پیشتر کوئی ایسی بات آپ کی زبان سے نہ نکلنا ہی اس بات کی زبردست دلیل ہے کہ یہ اعتراض سراسر باطل اور لغو ہے۔

۳۔ قرآن میں کئی ایسی پیشین گوئیاں مذکور ہیں جو آپ کی زندگی میں حرف بحرف پوری ہو گئیں اور ان کا علمائے یہود و نصاریٰ کو کسی طرح بھی علم نہ ہو سکتا تھا۔ جیسے روم کا شکست کھانے کے بعد ایران پر دوبارہ غلبہ یا کافروں کی مخالفانہ بھرپور کوششوں کے باوجود اسلام کا غلبہ اور کفار و مشرکین کی ذلت آمیز شکست وغیرہ وغیرہ۔

۴۔ قرآن میں بے شمار ایسی آیات نازل ہوئیں جن کا ان کے پس منظر سے گہرا تعلق ہے۔ مثلاً جنگ بدر کے بعد اموال غنیمت میں تنازعہ کے موقع پر سورہ انفال کا نزول لعان اور ظہار کے احکام کا نزول، واقعہ افک کے بعد قذف اور زنا کی حدود کے احکام کا نزول۔ ایسی آیات کا بھلا علمائے یہود و نصاریٰ کا پہلے سے کیونکر علم ہو سکتا تھا اور وہ ایسے حکیمانہ احکام کیسے بتا سکتے تھے۔

۵۔ قرآن میں بے شمار مقامات پر یہود و نصاریٰ کے عقائد اور ان کے اخلاق و کردار پر تنقید کی گئی ہے کیا یہ باتیں بھی علمائے یہود و نصاریٰ آپ کو بتا سکتے تھے؟ غرضیکہ اس اعتراض پر جتنا بھی غور کیا جائے اس کو باطل قرار دینے کی اور بھی کئی وجوہ سامنے آتی جائیں گی۔

۞ مشرکین کا یہ الزام کہ آپ کو کوئی سکھا جاتا ہے کے جوابات:۔ اور مشرکین مکہ کا آپ پر جو اعتراض تھا وہ نبوت کے بعد کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ چند یہودی پڑھے لکھے غلام مسلمان ہو گئے تھے۔ مشرکوں کو اعتراض یہ تھا کہ آپ ﷺ نے یہ باتیں ان سے سیکھی ہیں۔ ابتداءً صرف دو نمازیں فرض تھیں ایک صبح کی اور ایک شام کی۔ ان نمازوں کے اوقات میں مسلمان دار ارقم میں اکٹھے ہوتے۔ تو اگر کچھ وحی اس دوران نازل ہوتی تو آپ نماز کے لئے آنے والے مسلمانوں کو سنا دیتے۔ اس بات سے بتنگڑ یہ بنایا گیا کہ صبح و شام جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مسلمان اکٹھے ہوتے ہیں تو یہی یہودی پڑھے لکھے غلام مسلمان اقوام سابقہ اور انبیائے سابقہ کے حالات بیان کرتے ہیں جو ساتھ ساتھ لکھ بھی لئے جاتے ہیں اور پڑھے اور سنے سنائے بھی جاتے ہیں۔ پھر انہی باتوں کو اللہ کی طرف سے منسوب کر کے قرآن کے نام سے دوسروں کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے۔ یہ اعتراض درج ذیل وجوہ کی بنا پر باطل ہے:

ا۔ اگر یہ یہودی غلام جو مسلمان ہو گئے تھے آپ کے استاد یا معلم ہوتے تو وہ آپ کے فرمانبردار بن کر نہیں رہ سکتے تھے۔ پھر فرمانبرداری بھی ایسی جو جانثاری کی حد تک پہنچ چکی ہو۔

۲۔ اگر بفرض محال یہ تسلیم کر لیا جائے کہ دنیوی مفادات کی خاطر ایسا سمجھوتہ کر لیا گیا تھا تو آپ کے نزدیک آپ کے مقرب وہ یہودی غلام ہونے چاہئیں تھے نہ کہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، یا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ یا سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، سیدنا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ وغیرھم

۳۔ علاوہ ازیں ان پر بھی وہ سب اعتراض وارد ہوتے ہیں جو اوپر مذکور ہیں۔ مثلاً قرآن کی پیشین گوئیاں، موقع اور ضرورت

اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝٥ قُلْ أَنزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمَاوَاتِ
وَالْأَرْضِ ۚ إِنَّهُ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝٦ وَقَالُوا مَالِ هَٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي
فِي الْأَسْوَاقِ ۙ لَوْلَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيرًا ۝٧ أَوْ يُلْقَىٰ إِلَيْهِ كَنزٌ أَوْ تَكُونُ
لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا ۚ وَقَالَ الظَّالِمُونَ إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا ۝٨ انظُرْ كَيْفَ

داستانیں صبح و شام اس کے پاس پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔(۵) آپ ان سے کہیے کہ قرآن کو اس ذات نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھید[9] جانتا ہے اور وہ یقیناً بہت بخشنے والا، رحم والا ہے۔(۶) نیز کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں[10] میں چلتا پھرتا ہے۔ اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہ اتارا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور لوگوں کو ڈرایا[11] کرتا(۷) یا اس پر کوئی خزانہ ہی اتار دیا جاتا یا اس کا کوئی باغ ہی ہوتا،[12] جس سے یہ (اطمینان کی) روزی کھا سکتا۔ اور ظالم کہتے ہیں کہ تم تو ایک جادو شدہ آدمی[13] کے پیچھے لگ گئے ہو"(۸) اے نبی! غور کیجئے

کے مطابق احکامِ الٰہی کا نزول اور یہود کے اخلاق و عقائد پر کڑی تنقید وغیرہ۔

لہٰذا یہ اعتراض قرآن کریم کی داخلی، خارجی شہادت اور عقلی دلائل کے لحاظ سے محض ایک افتراء اور جھوٹ کا پلندہ ہے۔

[9] ۞ قرآن کو نازل کرنے والا صرف ایک اللہ ہی ہو سکتا ہے:۔ اس کے بعد اب ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ یہ قرآن کسی ایسی باخبر اور حکیم ہستی کی طرف نازل شدہ ہو جو ماضی کے حالات سے خوب واقف اور ان یہود و نصاریٰ کی کارستانیوں سے بھی باخبر ہو۔ زمانہ حال کے حالات سے بھی پوری طرح باخبر ہو اور موقع و محل اور احوال و ظروف کے مطابق ایسے احکام نازل کرتا ہو جو سراسر عدل اور حکمت پر مبنی ہوں اور مستقبل میں پیش آنے والے واقعات بھی اس کے سامنے ہوں۔ پھر اس کا انداز خطاب بڑا دل نشین اور اثر کے لحاظ سے دل کی گہرائیوں تک اتر جانے والا ہو۔ اور اس کے مقابلہ میں کلام پیش کرنا ناممکنات سے ہو اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہو سکتی ہے۔

[10] کفار کا یہ جاہلانہ اعتراض بھی قرآن میں متعدد مقامات پر دہرایا گیا ہے اور وہ اعتراض یہ ہے کہ رسول کم از کم کوئی مافوق البشر ہستی ہونا چاہئے۔ جو حوائجِ بشریہ سے بے نیاز ہو۔ یا کم از کم دنیوی دھندوں سے آزاد اور تارک دنیا قسم کے لوگوں سے ہو۔ اس اعتراض کا جواب بھی پہلے کئی مقامات پر دیا جا چکا ہے۔

[11] یعنی وہ کافر جو اس پیغمبر کی بات کو درست تسلیم نہ کرتا، فرشتہ اسے ڈراتا، دھمکاتا یا مار مار کر کچومر نکال دیتا۔ تاکہ لوگ نبی کی دعوت کا انکار کرنے کی جرأت ہی نہ کر سکتے اور اس طرح اس کی اپنی ہی ایک جمعیت بن جاتی۔

[12] اس پیغمبر کو کم از کم فکرِ معاش سے تو آزاد ہونا چاہئے تھا۔ اگر کوئی رئیس اور خزانوں کا مالک ہوتا تو لوگ خود اس سے ملاقات کی آرزو کرتے پھر یہ جسے چاہتا اجازت دیتا اور نہ دیتا اور ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ رہتا اور خزانوں کا مالک نہیں تو کم از کم کسی باغ کا ہی مالک ہوتا جس سے اس کی گزر بسر ہوتی رہتی۔

[13] ۞ اہلِ عرب کے نزدیک مسحور کی تین صورتیں:۔ جادو شدہ آدمی سے مراد دیوانہ آدمی ہے۔ عرب میں دیوانگی کی تین

ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ⑨ تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ ع ۱ ۵ ۱۶
لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ⑩
بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ۣ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ⑪ اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۣ

یہ لوگ آپ کے لئے کس طرح کی مثالیں [۱۴] بیان کرتے ہیں۔ یہ ایسے گمراہ ہوئے ہیں کہ راہ راست پر آ ہی نہیں سکتے۔(۹) وہ بڑی برکت والی ذات ہے۔ وہ چاہے تو آپ کو ان چیزوں سے بھی بہتر چیزیں دے سکتا ہے (ایک نہیں) کئی باغ جن میں نہریں جاری ہوں اور کئی محل دے سکتا ہے۔(۱۰) لیکن بات یہ نہیں بلکہ یہ لوگ [۱۵] دراصل قیامت کو جھٹلا رہے ہیں اور جو قیامت کو جھٹلائے ہم نے اس کے لئے جہنم تیار کر رکھی ہے۔(۱۱) جب وہ دور سے انہیں (اپنے شکار کو) دیکھے گی تو یہ اس کے [۱۶]

وجوہ سمجھی جاتی تھیں۔ ایک یہ کہ کسی شخص پر کسی جن بھوت کا سایہ پڑ گیا ہو۔ دوسرے یہ کہ کسی معبود، کسی بت، کسی دیوی دیوتا یا ان کے کسی بزرگ کی شان میں گستاخی کی گئی ہو اور اس کی مار پڑ گئی ہو اور تیسرے یہ کہ کسی جادوگر نے اس پر جادو کر دیا ہو۔ کفار مکہ آپ پر وقتاً فوقتاً ایسے تینوں طرح کے الزام دیتے تھے، اس مقام پر تیسری قسم کا ذکر ہوا ہے۔

[۱۴] ۞ کفار کو یہ سمجھ ہی نہیں آتی تھی کہ آپ پر کیا الزام لگائیں؟ یعنی کبھی کہتے ہیں کہ اس شخص نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے جو کہتا ہے کہ مجھ پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے کبھی کہتے ہیں کہ یہ قرآن اس نے خود ہی تصنیف کر ڈالا ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں دوسروں سے بھی مدد لیتا ہے۔ کبھی آپ کو کاہن کہتے ہیں، کبھی شاعر، کبھی ساحر، جادوگر اور کبھی مسحور۔ پھر کبھی یہ کہتے ہیں کہ اسے فرشتہ ہونا چاہئے تھا۔ کبھی کہتے ہیں کہ اگر بشر ہی تھا تو کم از کم اس کے ساتھ کوئی فرشتہ ہی رہا کرتا۔ کبھی یہ کہ اس نبی کے پاس مال و دولت کی کثرت ہونا چاہئے تھی۔ یہ سب باتیں دراصل ان کے دعوتِ حق کو قبول نہ کرنے کے بہانے ہیں۔ ہٹ دھرمی اور تعصب نے ان کو اندھا کر رکھا ہے اور ایسی بے تکی باتیں بنانے پر مجبور کر رکھا ہے۔ ان کی ان باتوں کی حیثیت "خوئے بدرا بہانہ بسیار" سے زیادہ کچھ نہیں۔ البتہ ان کی ایسی ہٹ دھرمی کی باتوں سے یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ دعوتِ حق کو کسی قیمت پر قبول نہیں کریں گے۔ اور ان کے یہ مطالبات اور اعتراضات محض شرارت اور تنگ کرنے کی بنا پر ہیں۔

[۱۵] یعنی اللہ اگر چاہے تو آپ کو ایک باغ کیا، ایسے بیسیوں باغ عطا کر سکتا ہے۔ اسی طرح رہائش کے لئے ایک محل کیا بیسیوں محل بھی عطا کر سکتا ہے۔ اور دوسری جن چیزوں کا یہ نام لیتے ہیں وہ بھی دینے پر قادر ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا پھر یہ لوگ ایمان لے آئیں گے؟ اور اس سوال کا یقینی جواب یہ ہے کہ یہ لوگ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ بلکہ پھر اور قسم کی باتیں بنانا شروع کر دیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ سرے سے قیامت کے دن پر، دوبارہ جی اٹھنے پر اور اللہ کے سامنے حاضر ہونے پر اور اپنے برے اعمال کی سزا بھگتنے پر یقین ہی نہیں رکھتے۔ پھر یہ لوگ ایسی کٹ حجتیاں نہ کریں تو اور کریں بھی کیا؟

[۱۶] ایسے معاند اور ہٹ دھرم لوگوں کے استیصال کے لئے ہم نے جہنم کی بھڑکتی آگ کو پہلے سے ہی تیار کر رکھا ہے جب وہ

بَعِيدٍ سَمِعُوا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيرًا ⑫ وَإِذَآ أُلْقُوا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِينَ دَعَوْا
هُنَالِكَ ثُبُورًا ⑬ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُورًا وَّاحِدًا وَّادْعُوا ثُبُورًا كَثِيرًا ⑭ قُلْ أَذٰلِكَ
خَيْرٌ أَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ۚ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّمَصِيرًا ⑮ لَهُمْ فِيهَا مَا

جوش و خروش کی آوازیں خود ہی سن لیں گے (۱۲) اور جب اس میں دست و پابستہ ایک تنگ جگہ سے پھینکے جائیں گے تو اس [۱۷] وقت موت کو پکاریں گے۔ (۱۳) (اس وقت انہیں کہا جائے گا) آج ایک نہیں بہت سی [۱۸] موتوں کو پکارو۔ (۱۴) آپ ان سے پوچھئے: کیا یہ انجام اچھا ہے یا ہمیشہ کی جنت جس کا پرہیز گاروں سے وعدہ کیا گیا ہے جو ان کے عملوں کا بدلہ [۱۹] اور ان کی آخری منزل ہو گی۔ (۱۵)

اپنا شکار دیکھے گی تو فوراً جوش میں آجائے گی اور آگ کی لپٹوں کی تیزی و تندی کی وجہ سے اس میں سے کئی طرح کی غضبناک آوازیں اور پھنکاریں پیدا ہونے لگیں گی اور اس کی یہ آواز سن کر ایسے معاند اور ہٹ دھرم لوگوں کے جہنم میں داخل ہونے سے پہلے ہی پتے پانی ہو جائیں گے۔

اس آیت میں جہنم کے لئے دیکھنے کا فعل یا تو مجازاً استعمال ہوا ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ ہمارا گھر تو ایک عرصہ سے آپ کی راہ تک رہا ہے یا حقیقی معنوں میں بھی ہو سکتا ہے جسکا مطلب یہ ہو تا کہ جہنم کی آگ میں شعور بھی ہو گا اور جو کوئی جتنا زیادہ مجرم ہو گا، اسی قدر وہ اس پر بھرے گی اور اسی قدر تندی سے اسے جلائے گی۔

[۱۷] جہنم میں ہر مجرم معاند کے لئے اتنی تنگ جگہ ہو گی جہاں سے وہ ہل بھی نہ سکے گا۔ علاوہ ازیں ایک ہی نوعیت کے کئی کئی مجرم ایک ساتھ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں گے۔ جہنم کے غیظ و غضب کی لپٹیں انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوں گی۔ اس وقت وہ اس مصیبت سے گھبرا کر موت کو پکاریں گے کہ کاش موت آکر ہماری ان دردناک مصیبتوں کا خاتمہ کر دے۔

[۱۸] آج ایک موت کے لئے کیا چیخ و پکار کرتے ہو۔ سینکڑوں موتیں مانگو، تب بھی تمہارا یہ پکارنا لاحاصل ہے۔ وہ آرزو تو کریں گے کہ ایک بار مریں تو چھٹکارا حاصل ہو جائے۔ دن میں ہزار بار مرنے سے جو بری حالت ہو رہی ہے ہے اس سے نجات پا جائیں گے مگر یہ پکار بالکل بے سود ہو گی۔

[۱۹] ۞ آخرت کے قائل اور کافر کے انجام کا تقابل:۔ اس آیت میں ایک ایماندار اور ایک کافر کے انجام کا جو تقابل پیش کیا گیا ہے وہ بڑا معنی خیز ہے۔ یعنی روز آخرت اور اعمال کی جزا و سزا کے متعلق ایک یہ امکان ہے کہ فی الواقع ایک حقیقت ہے اور وہ واقع ہو کے رہے گی اور دوسرا امکان یہ ہے کہ شاید یہ سب کچھ افسانہ ہی ہو۔ اور یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جو مشاہدہ اور تجربہ میں نہیں آسکتیں۔ اب وہ شخص جو آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور اس دنیا میں نہایت محتاط اور اللہ سے ڈر کر زندگی گزار رہا ہے۔ اگر بالفرض روز آخرت نہ ہو تو اس کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ اور اگر قیامت قائم ہوئی تو اس کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ سب احوال قیامت اس کی توقع کے مطابق اس کے لئے خوشی کا باعث ہوں گے کیونکہ اس نے روزِ آخرت کے احوال کو ملحوظ رکھ کر ہی زندگی گزاری تھی۔ اب اس کے مقابل کافر کا انجام یہ ہے کہ اس کی توقع کے خلاف قیامت قائم ہو گئی۔ تو اسے ایسے

يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ۭ كَانَ عَلٰي رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔــوْلًا ﴿١٦﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَاۗءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴿١٧﴾ۭ قَالُوْا
سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَ

وہاں انہیں جو کچھ چاہیں گے ملے گا وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ یہ تمہارے پروردگار کے ذمہ ایسا وعدہ ہے جو طلب کیا[۲۰] جا سکتا ہے (۱۶) اور جس دن اللہ تعالیٰ انہیں اور جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں اکٹھا کرے گا تو ان معبودوں سے سوال کریں گے کہ کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا یا یہ خود ہی راہ سے بہک گئے تھے؟" (۱۷) وہ کہیں گے: "تیری ذات پاک ہے ہماری مجال نہ تھی کہ تیرے سوا کسی کو کارساز[۲۱] بناتے مگر تو نے انہیں اور ان

مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا جو اس کے کبھی وہم و خیال میں نہ آیا ہوگا۔ دنیا تو ان دونوں کی ایک جیسی گزری۔ دونوں کو اس دنیا میں راحت بھی نصیب ہوئی اور غم بھی۔ برے دن بھی آئے اور بھلے بھی۔ دنیا میں نہ اس بات کی ضمانت ہے کہ آخرت پر ایمان نہ رکھنے والا بہر حال آسودہ اور خوشحال رہے گا اور نہ ہی ضروری ہے کہ ایماندار ساری زندگی مشکلات میں ہی گزارے۔ لیکن انجام بہر حال آخرت پر ایمان رکھنے والے کا بہتر ہوگا۔ روزِ آخرت پر ایمان رکھنے کی افادیت پر یہ ایک ایسی عقلی دلیل ہے جس کا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔

[۲۰] ایمانداروں اور پرہیزگاروں سے اللہ کا یہ حتمی وعدہ ہے کہ وہ انہیں جنت عطا فرمائے گا۔ اس جنت میں وہ جو کچھ بھی خواہش کریں گے انہیں مہیا کی جائے گی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اس جنت میں قیام پذیر رہیں گے۔ یہ ایک ہی وعدہ کے تین اجزاء ہوئے اور اس وعدہ کے سلسلہ میں مسلمانوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ وہ اس کے لئے اللہ سے دعا مانگتے رہا کریں اور جنت کا مطالبہ کرتے رہا کریں۔ جیسا کہ مسلمانوں کو یہ دعا سکھائی گئی۔ ﴿رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰي رُسُلِكَ﴾

[۲۱] ۞ من دون اللہ سے مراد صرف بت نہ ہونے کی وجہ:۔ یعنی معبودوں کو بھی اور ان کی عبادت کرنے والوں کو بھی سب کو آمنے سامنے لا اکٹھا کرے گا۔ اور اللہ تعالیٰ پہلے معبودوں کو ہی مخاطب کر کے پوچھیں گے کہ "کیا تم نے میرے ان بندوں کو کہا تھا کہ ہم تمہارے مشکل کشا اور حاجت روا ہیں۔ لہذا ہمارے ہاں نذرانے پیش کیا کرو۔ ہم قیامت کے دن تمہیں اللہ سے بخشوا لیں گے" یا ان عبادت گزاروں اور تمہارے عقیدت مندوں نے خود ہی ایسے عقیدے گھڑ لئے تھے؟ اس سوال کے جواب میں معبود حضرات کہیں گے کہ یا اللہ! ہم تو خود تجھے ہی اپنا حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتے رہے تیرے ہی سامنے اپنی حاجتیں پیش کرتے رہے۔ تیرے حضور ہی جھکتے اور نذریں نیازیں گزارتے رہے۔ تجھے ہی اپنا کارساز سمجھتے رہے۔ پھر بھلا ہم انہیں یہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ اللہ کو چھوڑ کر تم ہمیں یا کسی دوسرے کو اپنا کارساز بنا لو"

اس سوال و جواب سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں معبودوں سے مراد بت نہیں۔ کیونکہ بے جان کا اللہ کو کارساز بنانے کا کچھ مطلب ہی نہیں۔ ایسے سوال و جواب اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام سے بھی کریں گے۔ جنہیں نصاریٰ نے اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ (سورہ مائدہ آیت نمبر ۱۱۶ تا ۱۱۸) اسی طرح آگے سورہ سبا کی آیات نمبر ۴۱، ۴۲ میں مذکور ہے کہ ایسا ہی

اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًا بُوْرًا ﴿۱۸﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ فَمَا
تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ۚ وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ﴿۱۹﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا

کے آباء واجداد کو خوب سامان زیست[۲۲] دیا۔ یہاں تک کہ وہ تیری یاد کو بھول گئے اور یہ لوگ تھے ہی ہلاک ہونے کے قابل۔(۱۸)

گویا (اے کافرو!) جو تم آج[۲۳] کہتے ہو، اس دن تمہارے معبود تمہیں جھٹلا دیں گے۔ پھر نہ تم (عذاب کو) ٹال سکو گے اور نہ تمہیں کہیں سے مدد مل سکے گی۔ اور جو بھی تم سے ظلم[۲۴] کر رہا ہے اسے ہم سخت عذاب کا مزا چکھائیں گے۔(۱۹)

سوال وجواب فرشتوں سے بھی ہوگا جن کی پوجا کی جاتی رہی ہے۔

رہی یہ بات کہ عموماً "ما" کا لفظ غیر ذوی العقول کے لئے آتا ہے اور ذوی العقول کے لئے "من" کا لفظ آتا ہے تو یہ کوئی ایسا کلیہ نہیں جس میں استثناء نہ ہو یہ ذوی العقول کے لئے آسکتا ہے جیسے ﴿اِلَّا عَلٰۤی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ﴾ (۲۳:۶) اور استفہامیہ ہونے کی صورت میں بھی آسکتا ہے جیسے ماَزید بمعنی زید کیا ہے؟ (منجد)

[۲۲] ❁ قیامت کے دن مطیع ومطاع کا مکالمہ اور ایک دوسرے پر الزام:۔ معبود اپنی بریت کا اظہار کرنے کے بعد کہیں گے کہ ان کے گمراہ ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ بدبخت خود ہی گمراہ اور تباہ ہونا چاہتے تھے جس کا ظاہری سبب یہ بن گیا کہ تو نے انہیں اور ان کے آباء واجداد کو عیش و آرام دیا تھا۔ یہ لوگ بس اسی عیش و آرام میں پڑ کر اور غفلت کے نشہ میں چور ہو کر تیری یاد سے بے نیاز ہوگئے۔ کسی نصیحت پر کان نہ دھرا۔ پیغمبروں کی ہدایت سے آنکھیں بند کرلیں۔ تو نے ان پر جس قدر زیادہ مہربانیاں کیں اتنے ہی یہ نمک حرام ثابت ہوئے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ وہ ان نعمتوں پر تیرا شکر ادا کرتے مگر یہ الٹے متکبر بن کر کفر وعصیاں پر تل گئے۔

[۲۳] یعنی آج تم یہ کہتے ہو کہ اگر قیامت ہوئی بھی تو تمہارے یہ معبود وہاں بھی تمہارے کام آئیں گے اور اگر عذاب کی کوئی بات ہوئی تو یہ چھڑا لیں گے۔ مگر اس دن تمہارے یہی معبود جن کی اعانت پر تمہیں بھروسا تھا تم سے علانیہ بیزاری کا اظہار کریں گے اور یہ کہہ کر تمہیں جھٹلا دیں گے کہ ہم نے کب ان سے کہا تھا کہ تم ہماری عبادت کیا کرنا۔ اس طرح معبود تو بری الذمہ ہو جائیں گے اور سارا بوجھ ان کے عبادت کرنے والوں پر پڑ جائے گا جن کی عذاب سے رہائی کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

[۲۴] ❁ ظلم کا لغوی مفہوم:۔ ظلم کا لفظ عدل کی ضد ہے۔ اور اس کا اطلاق تو ہر بے انصافی کی بات اور غیر معقول بات پر ہو سکتا ہے۔ نبی کی دعوت کو جھٹلانا، اسلام کی راہ سے روکنا، ایمان لانے والوں کو ایذائیں پہنچانا، انہیں پریشان کرنا یا ان کا تمسخر اڑانا، بتوں یا دوسرے معبودوں کی عبادت کرنا یا انہیں حاجت کے لئے پکارنا، آخرت کے عذاب و ثواب سے انکار کرنا سب ظلم کی ہی قسمیں ہیں اور ان کاموں کا ارتکاب کرنے والے سب ظالم ہیں۔

قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَيَمْشُونَ فِي الْأَسْوَاقِ ۗ وَجَعَلْنَا
بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً أَتَصْبِرُونَ ۗ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيرًا ﴿۲۰﴾

ع ۲ ۱۷

اور (اے نبی!) ہم نے آپ سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے وہ سب[۲۵] کھانا کھاتے اور بازروں میں چلتے پھرتے تھے۔ اور ہم نے تم لوگوں کو ایک دوسرے کے لئے آزمائش[۲۶] کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ تو کیا تم (اے مسلمانو!) کفار کے (طعن و تشنیع پر) صبر[۲۷] کرو گے؟ اور آپ کا پروردگار سب کچھ دیکھ رہا ہے[۲۸]۔(۲۰)

[۲۵] یہ کافروں کے اس اعتراض کا جواب ہے۔ جس کا ذکر اسی سورہ کی آیت نمبر ۷ میں ہوا ہے۔ کفار مکہ کا یہ اعتراض محض کٹ حجتی کے طور پر تھا۔ ورنہ وہ خوب جانتے تھے کہ سیدنا نوح، سیدنا ابراہیم، سیدنا موسیٰ اور سیدنا عیسیٰ علیہم السلام سب کے سب انسان ہی تھے۔ حوائج بشریہ ان کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ اور وہ اپنی زندگی کی بقاء کے لئے کھاتے پیتے بھی تھے۔ اور کسب معاش یا خرید و فروخت کی خاطر وہ بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود لوگ انہیں رسول تسلیم کرتے تھے۔ کھانا کھانا یا بازاروں میں چلنا پھرنا بزرگی یا نبوت کے منافی نہیں، ہے پھر آخر اس رسول پر ان کا یہ اعتراض کس لحاظ سے درست ہے۔

[۲۶] نبی کے ذریعہ سب افراد قوم کی آزمائش کیسے ہوتی ہے؟ اللہ تعالیٰ اپنا رسول بھیج کر سب لوگوں کو آزمائش میں ڈال کر ہر ایک کو خوب جانچتا ہے۔ ایمان لانے والوں کو بھی اور کافروں کو بھی۔ ایمان والوں میں سے سب سے زیادہ سخت آزمائش تو خود رسولوں کی ہوتی ہے جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے اشد البلاء علی الانبیاء ثم الامثل فالامثل یعنی سب سے سخت آزمائش نبیوں کی ہوئی ہے پھر اس کے قریبی مومنوں کی پھر اگلے درجہ کے مومنوں کی۔ نبی کی دعوت پر مخالفت کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور ابتداءً نبی کی دعوت پر ایمان لانے والے عموماً معاشرہ کے ظلم و ستم سے عاجز آئے ہوئے اور ستائے ہوئے کمزور قسم کے لوگ ہی ہوتے ہیں۔ ان کی اس معرکہ حق و باطل میں خوب آزمائش ہوتی ہے تا آنکہ ہر ایک کو معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں ایماندار اپنے دعویٰ میں کس قدر پختہ ہے۔ اور منافقوں کی بھی چھانٹی ہوتی رہتی ہے اور کافروں کا امتحان اس طرح ہوتا ہے کہ انہی میں سے دنیوی مال و دولت اور جاہ و حشم کے لحاظ سے ایک کمتر درجہ کا شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اپنی دعوت پر عقلی اور نقلی دلائل پیش کرتا ہے تو کیا وہ اپنی نخوت اور اپنی انا کو چھوڑ کر حق کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر کوئی رسول کی دعوت کا انکار کرتا ہے تو کس قدر سرکشی اور بغاوت کی راہ اختیار کرتا ہے۔ گویا ایک نبی کی دعوت پر حق و باطل کا معرکہ ایک ایسی بھٹی ہے جو اللہ تعالیٰ کی عین مشیت کے مطابق ہے اور اس میں کئی حکمتیں مضمر ہیں اور اس بھٹی سے قوم کے ایک ایک فرد کی آزمائش ہو جاتی ہے۔

[۲۷] یہ خطاب صرف مسلمانوں کو ہے یعنی تمہاری آزمائش یہ ہے کہ آیا تم لوگ ان کافروں کے ناجائز اعتراضات' ان کے استہزاء اور ان کی طرف سے پہنچنے والی ایذاؤں پر صبر کرتے ہو جبکہ اس میں تمہارے لیے کئی قسم کی مصلحتیں اور حکمتیں موجود ہیں؟

[۲۸] اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تمہارے پروردگار نے سب کو جو آزمائش میں ڈالا ہے تو اس کی مصلحتوں کو دیکھ کر ہی ڈالا ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ معرکہ حق و باطل میں جو لوگ حق کا ساتھ دے رہے ہیں انہیں بھی دیکھ رہا ہے اور جو اس کی راہ

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً

اور جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں، ہم پر فرشتے کیوں نہیں اترے یا ہم ہی اپنے پروردگار کو (آنکھوں سے) [۲۹] دیکھ لیں؟ یہ اپنے دل میں بہت بڑے بن بیٹھے ہیں اور بہت بڑی سرکشی میں مبتلا [۳۰] ہو چکے ہیں۔ (۲۱) جس دن یہ فرشتوں کو دیکھیں گے وہ دن [۳۱] ایسے مجرموں کے لئے کوئی خوشی کا دن نہ ہوگا اور وہ پکار اٹھیں گے کہ ہم تو تم سے [۳۲] پناہ مانگتے ہیں (۲۲) اور جو کچھ انہوں نے کیا دھرا ہوگا ہم ادھر توجہ کریں گے میں روک بن کر کھڑے ہو گئے ہیں انہیں بھی اور ان کی کارستانیوں کو بھی اچھی طرح دیکھ رہا ہے۔

[۲۹] کفار کا مطالبہ کہ فرشتے ہم پر نازل ہوں:۔ کفار مکہ کے لغو قسم کے مطالبات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ جیسے تم پر فرشتہ نازل ہوتا ہے ایسے ہی ہم میں سے ہر ایک پر فرشتہ اترنا چاہئے تاکہ ہمیں پورا یقین ہو جائے کہ جو کچھ تمہاری دعوت ہے وہ درست ہے اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو ہم کم از کم اپنے رب کو ہی دیکھ لیں۔ جو ہمیں ایک دفعہ یہ کہدے کہ میں فلاں شخص کو رسول بنا کر بھیج رہا ہوں اور تمہیں اس پر ایمان لے آنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کے یہ مطالبات اس لئے نہیں ہیں کہ اگر ان کی یہ بات پوری ہو جائے تو یہ ایمان لانے کو بالکل تیار بیٹھے ہیں بلکہ یہ لوگ ایسی بکواس اس لئے کر رہے ہیں کہ انہیں یہ یقین نہیں ہے کہ مرنے کے بعد انہیں ہمارے حضور پیش ہونا ہے۔ اگر انہیں اس بات کا یقین ہوتا تو کبھی ایسی باتیں نہ بناتے۔

[۳۰] یعنی ہم نے جوان کو مال و دولت کی فراوانی اور آسودگی عطا کی ہے تو یہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھنے لگے ہیں۔ وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اگر فرشتہ اس شخص پر جو ان کے خیال کے مطابق ان سے کم درجہ کا آدمی ہے، نازل ہو سکتا ہے تو آخر ہم لوگوں پر کیوں نازل نہیں ہو سکتا، یا پھر ہمیں خود اللہ تعالیٰ ان باتوں کی یقین دہانی کرائے۔ اس شخص کی باتوں پر آخر ہم لوگ کیسے یقین کر لیں؟

[۳۱] ان کے فرشتوں کے دیکھنے کی تین ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ دو دنیا میں اور ایک آخرت میں۔ دنیا میں ایسے لوگ اس وقت فرشتوں کو بچشم خود دیکھ لیتے ہیں جب وہ ان پر قہرِ الٰہی اور عذابِ الٰہی لے کر نازل ہوتے ہیں۔ دوسرے اس وقت جب وہ ان کی جانیں نکالنے کے لئے ان کے پاس آئیں گے اور قیامت میں تو یہ ہر وقت ہی فرشتوں کو دیکھا کریں گے۔ جو بھی وقت اور جو بھی صورت ہو، ان کے لئے کوئی خوشی کی بات نہ ہوگی بلکہ جب بھی وہ ان کے پاس آئیں گے قہرِ الٰہی بن کر ہی آئیں گے۔

[۳۲] فرشتوں کو دیکھنے کی تین صورتیں:۔ یہ محاورہ ہے۔ حجارۃ بمعنی پتھر اور حجر ہر اس چیز کو کہتے ہیں کہ جو پتھر کی طرح سخت بھی ہو اور روک یا آڑ کا کام بھی دے۔ اہل عرب کی عادت تھی کہ جب اپنے کسی دشمن کو، جس سے انہیں تکلیف پہنچنے کا خطرہ ہوتا، دیکھ کر، یا کسی دوسری آفت کو دیکھ کر حِجرا محجورا کہنے لگتے۔ جیسے ہم کہتے ہیں "اس سے اللہ کی پناہ" یا "اللہ اس

مَنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿۲۴﴾ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَ

تو اسے اڑتا ہوا غبار [۳۳] بنا دیں گے۔ (۲۳) اس دن اہل جنت کا ہی ٹھکانا اور دوپہر کو آرام [۳۴] کرنے کا مقام بہتر ہو گا۔ (۲۴) اس دن آسمان کو چیرتے ہوئے ایک بادل نمودار ہو گا [۳۵] اور فرشتوں کے پرے

سے ہمیں بچائے" تو سننے والا عموماً یہ قول سن کر تکلیف نہیں پہنچاتا تھا۔ ایسے مجرمین بھی جس دن فرشتوں کو دیکھیں گے تو یہی الفاظ بول کر ان سے پناہ مانگیں گے لیکن اس دن انہیں کوئی پناہ نہ مل سکے گی۔

[۳۳] کافروں کو ان کے اچھے اعمال کا بدلہ کیوں نہیں ملے گا؟ کفار مکہ مسلمانوں سے کہا کرتے تھے کہ گر تم کچھ اچھے کام کرتے ہو تو ہم بھی بہت سے اچھے کام کرتے ہیں۔ ہم حاجیوں کی خبر گیری کرتے ہیں۔ انہیں پانی پلانے کا انتظام کرتے ہیں۔ ان کی امداد کرتے ہیں۔ غریبوں مسکینوں اور بیواؤں کے لئے فنڈ اکٹھا کرتے ہیں اور انہیں وظیفے دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

یہاں کافروں کے ایسے ہی اچھے اعمال کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ ہم ان کے ایسے اعمال کی طرف بڑھیں گے تو انہیں اڑتا غبار بنا دیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ انہوں نے یہ اعمال اس غرض سے تو کئے ہی نہیں تھے کہ ان کو آخرت میں ان کا بدلہ ملے۔ کیونکہ وہ آخرت پر تو یقین ہی نہیں رکھتے تھے۔ ان کے اعمال کی کچھ بنیاد ہی نہ تھی۔ جس پر وہ قائم رہ سکتے۔ دنیا میں اگر انہوں نے کچھ اچھے اعمال کئے تھے تو صرف اس غرض سے کہ لوگ انہیں اچھا سمجھیں اور اچھا کہیں اور یہ کام دنیا میں ہو چکا۔ ان کے اچھے اعمال کا بدلہ انہیں دنیا میں مل چکا۔ آخرت میں ان کو اب کیا ملے گا؟ اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے سورہ کہف میں یوں بیان فرمایا ﴿فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا﴾ (۱۸:۱۰۵) یعنی ہم ایسے لوگوں کے لئے میزان الاعمال رکھیں گے ہی نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے اچھے عمل تو اڑتا ہوا غبار بن گئے۔ اب نیکیوں کے پلڑے میں رکھنے کے لئے کیا چیز باقی رہ گئی کہ ان کے لئے میزان رکھی جائے۔

[۳۴] قیامت کا دن ہمارے موجودہ حساب سے پچاس ہزار سال کا دن ہے۔ اس دن کی بھی، دوپہر اور شام ہو گی۔ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دوپہر سے پہلے پہلے لوگوں کے حساب کتاب سے فارغ ہو جائیں گے۔ اہل جنت، جنت میں اور اہل دوزخ، دوزخ میں چلے جائیں گے اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جنت دوپہر کے بعد جنت میں ہی جا کر سوئیں گے۔ کیونکہ قیلولہ دوپہر کے بعد سونے کو اور مقیلا دوپہر کے بعد سونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ نیز حدیث میں آیا ہے کہ مومنوں یا اہل جنت کو یہ پچاس ہزار سال کا دن ایسا ہلکا محسوس ہو گا جیسے کسی فرض نماز کا وقت ہوتا ہے۔ (بیہقی بحوالہ مشکوۃ۔ کتاب الفتن۔ باب الحساب والقصاص والمیزان۔ فصل ثالث)

[۳۵] آسمان وزمین جیسے پہلے دھواں اور گڈمڈ تھے قیامت کو ویسے ہی ہو جائیں گے:۔ اس آیت کا ایک مطلب تو وہی ہے جو ترجمہ سے ظاہر ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جس مادہ سے آسمانوں کی تخلیق ہوئی تھی وہ پھر اسی مادہ میں واپس لوٹا دیئے جائیں گے۔ سورہ فصلت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ﴾ (۴۱:۱۱) "پھر اللہ تعالیٰ سماء (بلندی) کی طرف متوجہ ہوا اور اس وقت وہ صرف دھواں تھا۔ اور دوسرے مقام پر فرمایا: آسمان اور زمین سب کچھ گڈمڈ تھے اور جڑے ہوئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں کھول کر الگ الگ کر دیا۔ (۲۱:۳۰) پہلے ابتداءً صرف دھواں ہی دھواں یا گیسوں کا مجموعہ تھا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان بنائے۔ اور قیامت کو یہ آسمان اسی طرح دھوئیں میں تبدیل کر دیئے جائیں گے جو بادلوں

نُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿٢٥﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ۨالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ۭ وَكَانَ يَوْمًا عَلَي الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿٢٦﴾
وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰي يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿٢٧﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ
لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿٢٨﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَاۗءَنِيْ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ

کے پرے اتار دیئے جائیں گے (٢٥) اس دن حقیقی بادشاہی [٣٦] رحمٰن کی ہوگی اور یہ دن کافروں کے لئے [٣٧] بڑا سخت دن ہوگا۔ (٢٦) اس دن ظالم اپنے ہاتھوں کو کاٹے گا اور کہے گا: کاش! میں نے رسول کے ساتھ ہی اپنی روش اختیار کی ہوتی۔ (٢٧) کاش! میں نے فلاں شخص کو دوست [٣٨] نہ بنایا ہوتا۔ (٢٨) اس نے تو میرے پاس نصیحت آجانے کے بعد مجھے بہکا دیا اور شیطان تو انسان کو مصیبت پڑنے پر چھوڑ جانے [٣٩] والا ہے۔ (٢٩)

کی شکل اختیار کر لے گا۔ اسی بادل میں سے فرشتے میدان محشر کی طرف جوق در جوق اتارے جائیں گے۔

[٣٦] ۞ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو حشر میں سب سے پہلے لباس پہنایا جائے گا: قیامت کے دن اللہ اکیلے کی فرمانبرداری اور بادشاہی ہوگی اور سب انسان بالکل برہنہ قبروں سے اٹھا کھڑے کئے جائیں گے چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: لوگ (قیامت کے دن) ننگے پاؤں، ننگے بدن حشر کئے جائیں گے'' میں نے کہا: ''یارسول اللہ! اس طرح تو مرد اور عورت سب ایک دوسرے کے ستر کو دیکھیں گے! آپ ﷺ نے فرمایا: عائشہ! قیامت کا معاملہ ایسے خیالوں سے شدید تر ہوگا۔ (بخاری۔ کتاب الرقاق۔ باب کیف الحشر) اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں کو خطبہ سنانے کھڑے ہوئے اور فرمایا: تم لوگ ننگے پاؤں، ننگے بدن حشر کئے جاؤ گے۔ جیسے (اللہ تعالیٰ نے قرآن میں) فرمایا جس طرح تمہیں شروع میں پیدا کیا اسی طرح دوبارہ بھی پیدا کرے گا۔ اور تمام مخلوق میں جسے سب سے پہلے لباس پہنایا جائے گا وہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہوں گے'' (بخاری۔ کتاب الرقاق۔ باب کیف الحشر)

اب دیکھئے جہاں یہ صورت حال ہو ہر کسی کو اپنی اپنی پڑی ہو تو کسی کو بادشاہی کا خیال آسکتا ہے اور دنیا کے بادشاہ تو اور بھی سخت حالت میں ہوں گے۔

[٣٧] جس طرح مومن کے لئے قیامت کے دن کی مدت انتہائی مختصر اور آسان بنا دی جائے گی اتنی ہی کافر کے لئے یہ مدت طویل اور سخت تر ہوگی۔ کیونکہ دنیا میں بھی یہ چیز تجربہ شدہ ہے کہ مصیبت کے چند لمحات اتنے طویل تر اور شدید تر معلوم ہوتے ہیں جیسے کئی سالوں سے وہ یہ دکھ سہہ رہے ہیں۔

[٣٨] جب کافر مومنوں سے اللہ تعالیٰ کا حسن سلوک دیکھے گا وہی مومن جنہیں وہ حقیر مخلوق سمجھ کر ایذائیں پہنچایا کرتا تھا تو حسرت و ندامت سے اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل جائیں کہ کاش میں نے بھی اللہ کے رسول ﷺ کا ساتھ دیا ہوتا تو یہ سخت وقت نہ دیکھنا پڑتا۔ کاش میں نے کچھ اپنی بصیرت سے کام لیا ہوتا اور محض دوسروں کا آلہ کار بن کر رسول ﷺ کی مخالفت نہ کی ہوتی۔

[٣٩] ۞ خذول کا لغوی مفہوم:۔ خذول بمعنی کسی کی مدد نہ کرنا بلکہ مدد کے وقت ساتھ چھوڑ جانا اور خذول ایسے دوست کو کہتے ہیں جو زبانی تو دوستی کے بہت دعوے کرتا اور دم بھرتا ہو لیکن مصیبت کے وقت ساتھ چھوڑ کر چلا جائے۔ دغا دینے والا دوست۔ اور شیطان کے لئے یہ لفظ بالکل راس آتا ہے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ انسان کو سبز باغ دکھا کر اور خوشنما وعدے دے کر اسے

خَذُوْلًا ﴿۲۹﴾ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ

اور رسول (ﷺ) کہیں گے: ''پروردگار! میری قوم کے یہی لوگ ہیں جنہوں نے اس قرآن کو نشانہ تضحیک[۴۰] بنا رکھا تھا۔(۳۰) اسی طرح (اے نبی!) ہم نے مجرموں کو[۴۱] ہر نبی کا دشمن کا بنایا ہے

گمراہ کرتا ہے۔ پھر مشکل وقت پڑنے پر دنیا میں بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے اور آخرت میں بھی وہ یہی کام کرے گا اور یہی خصلت شیطان کے دوستوں یا شیطان سیرت انسان کی بھی ہوتی ہے۔

[۴۰] مسلمانوں کے قرآن کو پس پشت ڈالنے کے مختلف پہلو:۔ مھجورا کا مادہ ھ ج ر ہے اب اگر اس لفظ کو ھجر (ھجرا) سے مفعول تسلیم کیا جائے تو مھجورا کا معنی ایسی مہمل گفتگو ہے جو کوئی شخص بیماری یا خواب یا نیم خوابی یا بے ہوشی کی حالت میں کرتا ہے یعنی بڑبڑاہٹ یا ہذیان۔ پھر چونکہ ایسی باتیں ہنسی مذاق کا باعث ہوتی ہیں لہذا اس کا مطلب قرآن کی آیات کا ہنسی استہزاء اور مذاق اڑانا ہوگا اور قرآن کو نشانہ تضحیک بنانا جیسا کہ کفار مکہ کا معمول تھا۔ اور اگر اس لفظ کو ھجر (ھجرا) سے مفعول تسلیم کیا جائے تو اس کا معنی قرآن کو متروک العمل سمجھنا اور اسے پس پشت ڈال دینا ہوگا۔ جیسا کہ آج کل کے مسلمان کیا عوام اور کیا علماء سب کے سب اس جرم کے مجرم ہیں۔ علماء کی قرآن سے غفلت کا یہ حال ہے کہ ہمارے دینی مدارس میں جو درس نظامی رائج ہے اس میں قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کی باری آخری سال ہی آتی ہے اور کبھی وہ بھی نہیں آتی۔ کسی مدرسہ میں چھ سالہ کورس ہے، کسی میں سات کسی میں آٹھ اور کسی میں نو سال تک نصاب ہے۔ اور اس طویل مدت کا بیشتر حصہ قرآن کو سمجھنے کے لئے امدادی علوم کی تعلیم و تدریس پر صرف کر دیا جاتا ہے۔ ابتدائی تین چار سال صرف و نحو، منطق یا اخلاقیات وغیرہ۔ بعد میں فقہ اور حدیث اور آخری سال میں قرآن، گویا ساری توجہ اور محنت بنیادی باتوں میں صرف کر دی جاتی ہے اور طالب علموں کو قرآن پڑھنے کا اگر وقت مل جائے تو ان کی خوش قسمتی ہے ورنہ اکثر حالات میں نہیں ملتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ علماء نے عوام کو یہ بات ذہن نشین کرا رکھی ہے کہ قرآن کریم ایک انتہائی مشکل کتاب ہے۔ اسی لئے اس کی تدریس سب سے آخری سال رکھی جاتی ہے۔ حالانکہ قرآن کا دعویٰ اس نظریہ کے بالکل برعکس ہے اور تجربہ و مشاہدہ ہے کہ ایک معمولی لکھا پڑھا آدمی کسی ترجمہ والے قرآن کے مطالعہ سے جو سادہ اور سیدھی سادی سمجھ حاصل کرتا ہے۔ وہ اس سمجھ سے بدرجہا بہتر ہوتی ہے۔ جو فرقہ پرست اور مقلد حضرات کسی طالب علم کو پہلے اپنے مسلک کی فقہ پڑھا کر ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں۔ یہ تو علماء کا قرآن پر ظلم ہوا اور عوام کا ظلم یہ ہے کہ انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ قرآن بس ایک عملیات کی کتاب ہے اور اس میں ہماری دینی اور دنیوی سب طرح کی تکلیفوں کا حل موجود ہے مگر ضرورت انہیں صرف دنیوی تکلیفوں کے دور کرنے کی ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے کچھ تجربے بھی کر رکھے ہیں مثلاً اس کی فلاں آیت کی تسبیحات نکالنے سے فلاں تکلیف دور ہوتی ہے اور فلاں سورت کی زکات نکالنے سے فلاں فلاں مقاصد حاصل ہوتے ہیں۔ پھر قرآن کو بطور تعظیم ریشمی غلافوں میں لپیٹ کر مکان کے کسی اوپر والے طاقچے میں رکھ دیا جاتا ہے۔ یا پھر مرنے والے انسان پر یٰس پڑھائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں کبھی کبھی قسم اٹھانے کے کام آتا ہے۔ نزول قرآن کی اصل غرض وغایت تو یہ تھی کہ انسان اس سے ہدایت حاصل کرے تو اس بنیادی مقصد کے لحاظ سے فی الحقیقت قرآن آج متروک العمل ہو چکا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حضور یہی شکایت کریں گے۔

[۴۱] یعنی نبی کی بعثت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ رسول کی اطاعت کریں۔ اب جو لوگ پہلے سے مطاع بنے بیٹھے

نَبِیٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِیْنَ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ هَادِیًا وَّ نَصِیْرًا ﴿۳۱﴾ وَ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ
عَلَیْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚۛ كَذٰلِكَ ۚۛ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ رَتَّلْنٰهُ تَرْتِیْلًا ﴿۳۲﴾ وَ لَا

اور آپ کا پروردگار رہنمائی کرنے اور مدد دینے کو کافی[۴۲] ہے۔(۳۱) کافر (یہ بھی) کہتے ہیں کہ: "یہ سارا قرآن یکبارگی ہی رسول پر کیوں نہ[۴۳] اتار دیا گیا؟" بات ایسی ہی ہے اور یہ اس لئے کہ ہم آپ کی ڈھارس بندھاتے جائیں اور اس لیے بھی کہ ہم آپ کو (ایک خاص ترتیب اور وقفوں سے) پڑھ کر سناتے جائیں(۳۲)

ہوتے ہیں۔ وہ بھلا یہ کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ جو لوگ پہلے ان کے فرمانبردار و اطاعت گزار تھے وہ انہیں چھوڑ کر یا ان کے ساتھ کسی دوسرے کی بھی اطاعت کرنے لگیں۔ بالفاظ دیگر معاشرہ کے آسودہ حال لوگ یا ایسے لوگ جن کا عوام پر کسی نہ کسی طرح کا اثر اور بالادستی ہوتی ہے اس نبی کو اپنا رقیب سمجھ کر اس کی مخالفت پر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسے ہی مجرموں کا ذکر قرآن نے بعض مقامات پر مترفین کے لفظ سے کیا ہے اور بعض مقامات پر ملأ کے لفظ سے اور چونکہ ایسے لوگوں کی تعداد کافی ہوتی ہے۔ لہذا نبی کی دعوت دراصل بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے کے مترادف ہوتی ہے۔ دعوت کے آغاز میں ہی معرکہ حق و باطل شروع ہو جاتا ہے اور دنیا کے یہ خونخوار کتے سینہ تان کر نبی کے مقابلہ میں آن کھڑے ہوتے ہیں۔

[۴۲] اس معرکہ حق و باطل میں حالات جو نسا رخ اختیار کرتے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ہی اپنے نبی اور اس کے پیروکاروں کو ہدایات بھی دیتا جاتا ہے کہ اب انہیں یوں کرنا چاہئے اور اس سے اگلا قدم اس طرح اٹھنا چاہئے پھر وہ صرف ہدایات اور احکام پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ ان کافروں کی طاقتور جماعت کے مقابلہ میں ایمانداروں کی مدد بھی فرماتا ہے اور ایسے طریقوں سے مدد فرماتا ہے جس کا پہلے سے مسلمانوں کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ تمام ظاہری اور باطنی اسباب اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہوتے ہیں۔ وہ حالات ہی ایسے پیدا کر دیتا ہے جو مسلمانوں کے حق میں مفید ہوتے ہیں اور کافروں کا کچومر نکال دیتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے جہاں یہ اطلاع دی کہ نبی کے دشمن پیدا ہوتے رہے ہیں ساتھ ہی یہ خبر بھی دے دی کہ اللہ اپنے نبی اور اس پر ایمان لانے والے مسلمانوں کو دشمنوں کے حوالے نہیں کر دیتا بلکہ انہیں بروقت ہدایات بھی دیتا اور پھر ان کی مدد بھی کرتا ہے۔

[۴۳] ۞ کفار کا اعتراض کہ قرآن یکبارگی کیوں نازل نہیں ہوا؟ کفار کے اعتراض کے الفاظ تو یہی ہوتے تھے لیکن وہ ان الفاظ سے مطلب کچھ اور ہی لیتے تھے جو یہ تھا کہ یہ نبی جیسے جیسے حالات رخ اختیار کرتے ہیں ساتھ کے ساتھ یہ قرآن کو تصنیف کرتا جاتا ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کو تو آنے والے حالات کا پہلے سے ہی علم ہے۔ اگر قرآن اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہوتا۔ تو اس میں ہر قسم کے حالات کے مطابق احکام یکبارگی بھی نازل ہو سکتے تھے۔ یہ اعتراض کر کے وہ گویا اللہ، اس کے رسول اور اس کے قرآن سب کی تکذیب اور ان پر افترا کرتے تھے۔

يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ﴿٣٣﴾ الَّذِينَ يُحْشَرُونَ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ إِلَىٰ جَهَنَّمَ
أُولَٰئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضَلُّ سَبِيلًا ﴿٣٤﴾ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَا مَعَهُ أَخَاهُ هَارُونَ وَزِيرًا ﴿٣٥﴾

۳
ع۴
۱

اور اس لیے بھی کہ جب بھی یہ کافر آپ کے پاس کوئی مثال (اعتراض) لائیں تو اس کا ٹھیک [۴۴] اور برجستہ جواب اور بہترین توجیہ ہم آپ کو بتا دیں۔(۳۳) ایسے لوگ اوندھے منہ جہنم کی طرف [۴۵] لائے جائیں گے، ان کا ٹھکانا بہت برا ہے اور یہی سب سے زیادہ گمراہ ہیں۔(۳۴)

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب [۴۶] دی تھی اور اس کے ساتھ اس کے بھائی ہارون کو مددگار بنا دیا(۳۵) اور

[۴۴] ۞ قرآن کے بتدریج نازل ہونے کے فوائد:۔ کفار نے یہ اعتراض متعدد بار کیا اور مختلف مقامات پر قرآن نے اس اعتراض کا جواب دیا ہے۔ اس مقام پر قرآن کو بتدریج نازل کرنے کے تین فوائد بتائے گئے ہیں۔

۱۔ نبی کی دعوت پر جو معرکہ حق و باطل بپا ہوتا ہے اور جس طرح باطل ہجوم کر کے حق پر ایک دم ٹوٹ پڑتا ہے تو یہ معرکہ کوئی ایک دو دن کا قصہ نہیں ہوتا بلکہ نبی کی پوری زندگی کو محیط ہوتا ہے۔ اور جب بھی حالات مسلمانوں کے لئے حوصلہ شکن ہوتے ہیں تو انہیں تسلی دینے اور ان کی ڈھارس بندھانے کی ضرورت پیش آتی ہے اور ایک ہی دفعہ حوصلہ افزائی خواہ کتنی ہی کی جائے۔ وہ فائدہ نہیں دے سکتی۔ جو فائدہ ساتھ کے ساتھ اور بارہا حوصلہ افزائی کا ہوتا ہے۔

۲۔ قرآن کو حفظ کرنا، اسے سمجھنا اور اس پر عمل پیرا ہو کر اپنی پوری طرز زندگی میں تبدیلی پیدا کرنا اسی صورت میں ممکن تھا کہ قرآن کریم بتدریج نازل ہوتا۔ قرآن کو بتدریج نازل کرنے سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ ہر ایمان لانے والے کو یہ معلوم ہے کہ فلاں آیت یا فلاں سورت کا شان نزول کیا تھا اور کس طرح کے پس منظر میں یہ نازل ہوئی تھی۔ نیز اگر کوئی شخص قرآن کی کسی آیت یا اس کے کسی مفہوم کو غلط معنی پہناتا تو قرآن ساتھ کے ساتھ نازل ہو کر اس مفہوم کی تردید کر کے صحیح تعبیر پیش کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں معاشرہ سے برائیوں مثلاً شراب نوشی، لوٹ مار، قتل و غارت، بے حیائی، زنا اور سود کے استیصال کے لئے سب احکام ایک دفعہ نازل کئے جاتے تو ان پر عمل پیرا ہونا بہت مشکل ہو جاتا اور لوگ سرے سے نبی پر ایمان لانے اور اس کی اطاعت کرنے سے دستبردار ہو جاتے۔

۳۔ تیسرا فائدہ جو اگلی آیت میں مذکور ہے یہ ہے کہ کافر جس قسم کے آپ پر اعتراضات کرتے ہیں یا آپ ﷺ سے مطالبات کرتے رہتے ہیں۔ ہم ساتھ کے ساتھ ان اعتراضات کے واضح اور مدلل جوابات دیتے جاتے ہیں۔ اب یہ کیا تک ہے کہ اعتراضات تو بعد میں ہوں اور ان کے جوابات پہلے ہی یکبارگی نازل کر دیئے جائیں۔ اور اگر ہم ایسا کرتے ہیں بھی یہ لوگ ان جوابات پر کئی طرح کے اعتراضات کرنا شروع کر دیتے۔

[۴۵] یعنی کافروں کے اس قسم کے اعتراضات کرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کی عقلیں اوندھی ہو چکی ہیں۔ جو سیدھی سادی باتوں پر غور کرنے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتیں لہذا ہم قیامت کے دن اوندھے منہ جہنم کی طرف چلا کر لے جائیں گے جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہوتا ہے۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ بن مالک فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا: "یا نبی اللہ ﷺ قیامت کے دن کافر اپنے منہ کے بل حشر کئے جائیں گے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "جس پروردگار نے انسان کو دو پاؤں پر چلایا ہے کیا وہ اسے قیامت کے دن منہ کے بل نہیں چلا سکتا" (بخاری۔ کتاب التفسیر)

[۴۶] یہاں کتاب سے مراد تورات نہیں کیونکہ تورات تو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر بلا کر اس وقت دی گئی تھی۔

فَقُلْنَا اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ؕ﴿۳۶﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ
اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۷﴾ۚۖ وَّعَادًا وَّثَمُوْدَاۡ وَاَصْحٰبَ

ان سے کہا: اس قوم کی طرف جاؤ، جنہوں نے ہماری آیات[۴۷] کو جھٹلا دیا ہے بالآخر ہم نے انہیں تہس نہس کر دیا۔(۳۶) اور نوح کی قوم نے جب رسولوں[۴۸] کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں غرق کر دیا اور انہیں تمام لوگوں کے لئے ایک نشانی[۴۹] بنا دیا۔ علاوہ ازیں ہم نے ایسے ظالموں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔(۳۷) اور (اسی طرح) قوم عاد، قوم ثمود، کنوئیں والے[۵۰] اور

جب بنی اسرائیل میدان تیہ میں قیام پذیر تھے۔ بلکہ اس سے مراد وہ منزل من اللہ ہدایات واحکام ہیں۔ جو آپ کو مصر سے خروج سے پہلے دی جاتی رہیں۔ ایسی ہی منزل من اللہ وحی کو اصطلاحی زبان میں وحی خفی یا سنت بھی کہتے ہیں اور ایسے احکام پر کتاب اللہ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ ایسی وحی یا سنت پر عمل کرنا ایسے ہی واجب ہے جیسے وحی جلی یا وحی متلو یا اللہ کی کتاب پر۔

[۴۷] یہاں آیات سے مراد غالباً وہ وحی تھی جو سیدنا ابراہیم، سیدنا اسحاق، سیدنا یعقوب اور سیدنا یوسف علیہم السلام پر نازل ہوئی تھی کیونکہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے تو ان فرعونیوں کو ابھی اپنی طرف نازل شدہ کوئی وحی سنائی ہی نہ تھی۔ یا پھر آیت اللہ سے مراد کائنات میں ہر سو اللہ کی بکھری ہوئی نشانیاں ہیں جن سے غور و فکر کرنے والے اللہ کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔ اور فرعون ایسی نشانیوں سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے خود ہی خدائی کا دعویدار بن بیٹھا تھا۔

[۴۸] اس سے معلوم ہوا ہے کہ قوم نوح کی طرف سیدنا نوح علیہ السلام سے پہلے بھی کچھ رسول آچکے تھے۔ جن کے قرآن میں نام مذکور نہیں ہیں یا اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ اصولِ دین میں تمام انبیاء کی تعلیم ایک ہی رہی ہے تو اس لحاظ سے ایک رسول کو جھٹلانے سے از خود باقی سب رسولوں کی تکذیب ہو جاتی ہے۔

[۴۹] نشانی اس لحاظ سے کہ ان ظالموں کی روئے زمین پر نسل ہی ختم ہو گئی۔ طوفان نوح کے بعد سیدنا آدم علیہ السلام کی نسل صرف ان لوگوں سے چلی جو سیدنا نوح علیہ السلام کے ہمراہ کشتی میں سوار تھے اور بعض کے نزدیک آئندہ نسل سیدنا نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں حام، سام اور یافث سے چلی۔

[۵۰] ۞ اصحاب الرس کون ہیں؟ قوم عاد و ثمود کا ذکر تو قرآن میں بہت سے مقامات پر مذکور ہے مگر اصحاب الرس یا کنویں والوں کا ذکر صرف دو مقامات پر آیا ہے۔ ایک اسی جگہ اور دوسری سورہ ق کی آیت نمبر ۱۲ میں۔ ان مقامات پر ان کا ذکر اس قدر مختصر ہے جس سے ان کے حالات پر کچھ روشنی نہیں پڑتی۔ نہ ہی یہ معلوم ہو سکا ہے کہ ان کی طرف کون سا نبی مبعوث ہوا تھا۔ لغوی لحاظ سے رس بڑے کنوئیں کو کہتے ہیں جس میں پانی وافر مقدار میں موجود ہو اسی وجہ سے اصحاب الرس کے بارے میں مفسرین میں کئی قسم کے اختلافات ہیں۔ زیادہ مشہور یہی بات ہے اس سے مراد اہلِ انطاکیہ ہیں۔ ان کی طرف حبیب نجار نبی مبعوث ہوئے تو انہوں نے انہیں جھٹلایا لیکن آپ بدستور انہیں اللہ کا پیغام پہنچاتے رہے۔ بالآخر ان لوگوں نے آپ کو مار کر کنوئیں میں ڈال دیا۔ اسی وجہ سے یہ اصحاب الرس کے لقب سے مشہور ہوئے پھر اللہ نے اس کنوئیں سمیت اس بستی کو زمین

الرَّسِّ وَقُرُونًا بَيْنَ ذَٰلِكَ كَثِيرًا ﴿٣٨﴾ وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْأَمْثَالَ ۖ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيرًا ﴿٣٩﴾ وَلَقَدْ أَتَوْا
عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِي أُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ۚ أَفَلَمْ يَكُونُوا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ نُشُورًا ﴿٤٠﴾
وَإِذَا رَأَوْكَ إِن يَتَّخِذُونَكَ إِلَّا هُزُوًا أَهَٰذَا الَّذِي بَعَثَ اللَّهُ رَسُولًا ﴿٤١﴾ إِن كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ
آلِهَتِنَا لَوْلَا أَن صَبَرْنَا عَلَيْهَا ۚ وَسَوْفَ يَعْلَمُونَ حِينَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ أَضَلُّ سَبِيلًا ﴿٤٢﴾

درمیانی پشتوں میں سے بہت سے لوگ (تباہ کر دیئے گئے)۔(۳۸) ان میں ہر ایک کے لئے ہم نے (پہلے تباہ شدہ قوموں کی) مثالیں[۵۱] بیان کر کے سمجھایا آخر ان سب کا نام و نشان تک مٹا دیا(۳۹) اور اس بستی پر تو ان کا گزر ہو چکا ہے جس پر بدترین بارش برسائی[۵۲] گئی تھی۔ کیا انہوں نے اس بستی کا حال نہ دیکھا ہو گا؟ لیکن (اصل معاملہ یہ ہے کہ) یہ لوگ موت کے بعد دوسری زندگی کی توقع ہی نہیں رکھتے۔(۴۰) اور جب یہ لوگ آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ سے مذاق کے سوا انہیں کچھ سوجھتا ہی نہیں (کہتے ہیں) کیا یہی وہ شخص ہے[۵۳] جسے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟(۴۱) اگر ہم اپنے معبودوں کی عقیدت پر ڈٹے نہ رہتے تو یہ تو ہمیں ان سے[۵۴] برگشتہ کر کے چھوڑتا، جلد ہی انہیں معلوم ہو جائے گا جب یہ عذاب دیکھیں گے کہ کون راہ سے بھٹکا ہوا تھا۔(۴۲)

میں دھنسا دیا۔ واللہ اعلم بالصواب

[۵۱] ہر قوم کے متعلق ہمارا طریقہ یہی رہا کہ ان کی طرف نبی بھیجا گیا جس نے اس قوم کو سابقہ اقوام کے انجام سے متنبہ کیا۔ پھر انہیں مختلف انداز سے مثالیں دے دے کر سمجھایا گیا۔ پھر انہیں غور و فکر کے لئے مہلت بھی دی گئی۔ ان سب باتوں کے بعد بھی جب وہ اپنی ہٹ دھرمی پر اڑے رہے اور ان پر حجت قائم ہو گئی تو پھر ہم نے انہیں اس طرح تباہ کیا کہ ان کا نام و نشان نہ رہنے دیا۔

[۵۲] ۞ آخرت کے قائل اور منکر کا فرق:۔ اس سے مراد لوط علیہ السلام کی بستی یا سدوم کا علاقہ ہے۔ ان کفار مکہ کے جو تجارتی قافلے شام کی طرف جاتے اور واپس آتے ہیں تو یہ علاقہ ان کے راستہ میں پڑتا ہے اس علاقہ کی ویرانی اور خستہ حالی یہ کئی بار بچشم خود دیکھ چکے ہیں مگر یہ لوگ اس علاقہ کو محض ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھ کر آگے چلے جاتے ہیں۔ اس سے کچھ بھی عبرت حاصل نہیں کرتے اور ان کی یہ کیفیت محض اس لئے کہ یہ لوگ اللہ کے حضور پیش ہونے اور اپنے اعمال کی سزا پانے کا یقین ہی نہیں رکھتے۔ اور یہی وہ فرق ہے جو ایک آخرت کے منکر اور آخرت پر یقین رکھنے والے میں ہوتا ہے۔ آخرت کا منکر ایسے مقامات کو محض ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھتا ہے جبکہ آخرت پر یقین رکھنے والا ایسے مقامات سے عبرت اور کئی سبق حاصل کرتا ہے۔

[۵۳] یہ کفار مکہ کیسے ہدایت حاصل کر سکتے ہیں جبکہ ان کا محبوب مشغلہ ہی یہ ہے کہ وہ آپ کو دیکھتے ہیں تو ایک دوسرے کو کہتے ہیں۔ اجی یہ ہیں وہ صاحب جو اپنے آپ کو اللہ کا رسول ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ کیا یہی شخص اللہ تعالیٰ کو اپنی ساری مخلوق میں سے رسالت کے لئے پسند آیا تھا؟ اس کی حیثیت کو دیکھو اور اس کے بلند بانگ دعویٰ کو دیکھو۔ کیا ہم اتنے ہی عقل کے اندھے ہیں کہ اس کے اس دعویٰ کو درست تسلیم کر لیں؟

[۵۴] ۞ کفار کی بوکھلاہٹ اور خود اپنی تردید:۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ جو کلام یہ پیش کرتا ہے اس میں جادو کا اثر ہوتا ہے۔ جو

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ۭ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿٤٣﴾ۙ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ

بھلا آپ نے اس شخص کے حال پر غور کیا جس نے اپنی خواہش کو ہی الٰہ [۵۵] بنا رکھا ہے؟ ایسے شخص (کو راہِ راست پر لانے) کے آپ ذمہ دار بن سکتے ہیں؟(۴۳) یا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ ان میں اکثر

بڑے بڑوں کے قدم پھسلا سکتا ہے اور سننے والوں کو اپنا گرویدہ بنا سکتا ہے۔ اور اگر ہم لوگ پوری مستقل مزاجی اور ثابت قدمی سے اپنے باپ دادا کے دین پر جمے نہ رہتے تو اس نے تو کب سے ہمیں اپنے معبودوں سے برگشتہ کر دیا ہوتا۔

اب دیکھئے اس نبی کی دعوت سے کچھ اس طرح بوکھلائے ہوئے تھے کہ خود ہی اپنی باتوں کی تردید بھی کرتے جاتے تھے۔ ایک طرف تو وہ یہ استہزاء کرتے تھے کہ آخر اس نبی میں کیا خوبی ہے کہ اللہ نے اسے ہی اپنی رسالت اور نبوت کے لئے منتخب کیا ہے؟ پھر ساتھ ہی یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ البتہ اس نبی میں یہ خوبی ضرور ہے کہ اس کا پیش کردہ کلام اس قدر پر تاثیر اور زوردار ہے جس کا اثر ہر ایک کے دل کی گہرائیوں تک جا پہنچتا ہے وہ تو ہم ہی تھے جو اپنے دین پر ایسے پکے اور ثابت قدمی سے جمے رہے اور اس کے کلام کا اثر قبول نہیں کیا۔ ورنہ یہ سب کو اپنے دام تزویر میں پھنسا چکا ہوتا۔

قریش کی ان دو متضاد باتوں سے ضمناً چند باتیں معلوم ہوتی ہیں: ایک یہ کہ رسالت کے لئے جو خوبیاں درکار ہوتی ہیں وہ سب آپ ﷺ کی ذات میں موجود تھیں۔ آپ اللہ کا کلام جس انداز میں پیش کرتے تھے اور اس کا نمونہ اپنی ذات سے پیش کرتے تھے وہ عام لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لئے بہت کافی تھا۔ دوسرے یہ کہ کفار دلائل کے میدان میں مات کھا چکے تھے۔ اب ان کا انکار محض ضد، ہٹ دھرمی اور تقلید آباء کی بنا پر تھا۔

[۵۵] خواہشات کی اتباع شرک کی ہی ایک قسم ہے:۔ جو شخص اللہ کے بجائے اپنی خواہش نفس کا بندہ یا غلام بن جائے اور اللہ کے احکام کے بجائے اپنی خواہش نفس کی بات ماننے کو ترجیح دے تو ایسے شخص کے راہ راست پر آنے کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں، نہ ہی آپ ایسے ہوا پرستوں کو راہ راست پر لانے کی ذمہ داری اٹھا سکتے ہیں۔ قرآن کے انداز بیان سے جو بات فوراً ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے خواہش نفس کی اتباع بھی شرک کی اقسام میں سے ایک قسم ہے۔ اور خواہش نفس کی اتباع ایک ایسا عام مرض ہے جس میں کافر و مشرک تو درکنار، مومن و مسلم اور عوام و خواص سب ہی تقریباً مبتلا ہوتے ہیں۔ مثلاً عام لوگوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ شریعت کے احکام میں سے جو آسان اور ان کے من پسند ہوں ان پر تو عمل کر لیتے ہیں اور جو مشکل ہوں اور طبیعت کو گراں معلوم ہوتے ہوں انہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے لوگ حقیقتاً شریعت کے متبع نہیں ہوتے بلکہ اپنی خواہشات کے متبع ہوتے ہیں اور خواص یا علماء کی اتباع ہوائے نفس یہ ہے کہ وہ اللہ کی آیات کی تاویل کر لیتے جو ان کی افتاد طبع ہو اور انہیں پسند ہو، بعض غلط استنباط کر کے اور غلط فتوے دے کر دنیا کا مال بٹورتے ہیں۔ پھر جو اور زیادہ ذہین طبع ہوتے ہیں وہ عوام میں کوئی بدعی عقیدہ رائج کر کے عوام کی توجہ کا مرکز بننا چاہتے ہیں اور نئے فرقہ کی بنیاد رکھ دیتے ہیں جس کی تہہ میں حب مال و جاہ میں سے کوئی نہ کوئی جذبہ کار فرما ہوتا ہے اور کافر جو انبیاء کی مخالفت پر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ تو ان کا بھی مقصود یہ ہوتا ہے کہ انہیں جو مقام معاشرہ میں حاصل ہے وہ ان سے چھن نہ جائے۔ اور مشرکوں کی اتباع خواہش کا تو پوچھنا ہی کیا۔ آج ایک پتھر اچھا معلوم ہوا تو اسے پوجنے لگے کل دوسرا اس سے خوبصورت پتھر مل گیا تو پہلے کو چھوڑ کر اس کے آگے سر جھکا دیا۔ یا کسی

يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ ۚ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ ۖ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا ﴿٤٤﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَىٰ رَبِّكَ كَيْفَ
مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهُ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيلًا ﴿٤٥﴾ ثُمَّ قَبَضْنَاهُ إِلَيْنَا قَبْضًا

سنتے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو مویشیوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے[۵۶] ہیں۔(۴۴) آپ دیکھتے نہیں کہ تمہارا پروردگار کس طرح سایہ پھیلا دیتا ہے اگر وہ چاہتا تو اسے وہیں ساکن ہی رہنے دیتا پھر ہم نے سورج[۵۷] کو اس پر رہنمائی کرنے والا بنا دیا۔(۴۵) پھر (جیسے جیسے سورج بلند ہوتا جاتا ہے) ہم اس سائے کو

ع ۴

شخص نے کسی ولی کے مزار سے متعلق کوئی کرامت یا حاجت روائی کا قصہ بیان کر دیا تو اس کے مزار پر نذریں نیازیں دینا شروع کر دیں۔ پھر کسی اس سے بڑے بزرگ کے مزار کے حالات سے متاثر ہوئے تو اپنی ساری نیاز مندیاں ادھر منتقل کر دیں۔ غرضیکہ جس طرح انسانوں کی بے شمار اقسام ہیں اسی طرح ان کی خواہش نفس اور اتباع کی بھی بے شمار اقسام ہیں اور رسول بھلا ان ہر طرح کے لوگوں کو راہ راست پر لانے کی ذمہ داری کیسے اٹھا سکتے ہیں؟

[۵۶] ❁ کافر مویشیوں سے بدتر کیوں ہیں؟ ایسے انسانوں کی مویشیوں سے بدتر ہونے کی دو وجوہ ہیں ایک یہ کہ ہر مویشی اپنے پالنے والے کو خوب پہچانتا ہے اور اس کا وفادار اور فرمانبردار ہوتا ہے۔ اور اپنے مالک کے سامنے گردن جھکا دیتا ہے۔ اور اگر انہیں کھلا چھوڑ دیا جائے تو اپنے مالک کے گھر واپس آ جاتے ہیں۔ لیکن حضرت انسان کا یہ حال ہے کہ وہ بات تسلیم کرنے کے باوجود کہ اس کا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے اپنی نیاز مندیوں اور نذروں نیازوں میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک بنا لیتا ہے۔ اور اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان کو اپنی آنکھوں اور کانوں سے اتنا ہی کام نہ لینا چاہئے جتنا جانور لیتے ہیں۔ مثلاً بھیڑ بکریوں کا ریوڑ اپنے ہانکنے والے کو دیکھتا ہے اور اس کی آواز سنتا ہے۔ بھیڑ بکریاں بس اس کے اشارے پر چلتی ہیں انہیں یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ ہانکنے والا انہیں چرانے کے لئے لے جا رہا ہے یا ذبح کرنے کے لئے۔ کیونکہ اللہ نے انہیں اتنی عقل نہیں دی کہ وہ قرائن سے آنے والے حال کا کچھ اندازہ کر سکیں لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایسی عقل و تمیز عطا کی ہے کہ وہ چرواہے اور قصائی میں امتیاز کر سکے لیکن اس کے باوجود جو شخص اپنے بھلے اور برے میں تمیز نہ کر سکے یا اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکے کون اسے سیدھی راہ کی طرف بلا رہا ہے اور کون گمراہی کی تاریکیوں میں دھکیل رہا ہے؟ اس کا دوست کون ہو سکتا ہے اور دشمن کون؟ تو ایسے انسان واقعی جانوروں سے بدتر ہوتے ہیں۔

[۵۷] ❁ سایوں کے بتدریج گھٹنے بڑھنے کے خوشگوار اثرات:۔ سایوں کا سورج سے گہرا تعلق ہے۔ طبعی اصول یہ ہے کہ روشنی کی شعاعیں یا کرنیں ہمیشہ صراط مستقیم میں سفر کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے جہاں بھی روشنی ہو گی چیزوں کا سایہ ہو گا۔ اب اگر کسی چیز کا سایہ روشن چیز سے کم درجہ پر واقع ہو گا تو سایہ لمبا ہو گا اور زاویہ بڑھتا جائے گا تو سایہ چھوٹا ہوتا جائے گا۔ حتیٰ کہ اگر یہ سایہ ۹۰ درجہ پر پہنچ جائے تو ہر چیز کا سایہ اس کے قدموں پر پڑے گا اور بہت چھوٹا رہ جائے گا۔ حتیٰ کہ یہ غائب بھی ہو سکتا ہے۔ اب چونکہ روشنی کا مستقل ...... باعتماد اور منظم منبع یہی سورج ہی ہے۔ لہٰذا سایوں کے مستقبل منبع کا ذکر کیا اور یہ ذکر اس لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ ہر قسم کی نباتات اور تمام جاندار اشیاء کی

یَسِیْرًا ﴿۴۶﴾ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾ وَهُوَ

آہستہ آہستہ [۵۸] اپنی طرف سمیٹتے جاتے ہیں۔(۴۶) اور وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے رات کو لباس، نیند کو (باعث) آرام اور دن [۵۹] کو جی اٹھنے کا وقت بنایا ہے۔(۴۷) اور وہی تو ہے جو

تربیت اور نشوونما پر اثر انداز ہونے کی چیز سورج کی روشنی یا دھوپ اور سایہ ہی ہوتا ہے اب اگر کسی چیز پر ہمیشہ دھوپ پڑتی رہے یا کوئی چیز ہمیشہ سایہ میں رہے تو اس کی تربیت اور نشوونما کبھی درست طور پر نہ ہو سکے گی۔ دھوپ اور سایہ دونوں ہی اللہ کی نعمتیں ہیں اور دونوں سے ہر چیز کی زندگی کا گہرا تعلق ہے۔ اگر ہمیشہ سایہ ہی رہتا تو زندگی کی یہ بہاریں کبھی قائم نہ رہ سکیں۔

[۵۸] اللہ تعالیٰ سایوں کو پھیلاؤ سے سمیٹتا ہے تو بھی آہستہ آہستہ بتدریج سمیٹتا ہے اور سایوں کا پورا سمٹ جانا عین نصف النہار کے وقت ہوتا ہے یا سر پر ہوتا ہے جبکہ زاویہ قائمہ بن جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد سائے آہستہ آہستہ اور بتدریج بڑھنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس تدریج میں بہت سے فوائد مضمر ہیں اور دنیا میں جو بھی تغیر واقع ہوتا ہے اس میں تدریج کا قانون کام کرتا ہے۔ اگر یہ تدریج کا قانون نہ ہوتا تو ہر جاندار کے لئے زندگی دوبھر ہو جاتی مثلاً سورج طلوع ہوتے ہی اتنی شدید گرمی ہوتی جیسے دوپہر کو ہوتی ہے اور یہ گرمی سورج غروب ہونے تک بدستور اتنی ہی تیزی سے رہتی پھر غروب ہونے پر یک لخت سردی ہو جاتی تو یہ چیز بھی ہر جاندار کے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔

[۵۹] ❁ نیند میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں:۔ اللہ تعالیٰ کا ایک انعام یہ ہے کہ اس نے رات کو تاریک اور ہر چیز کو ڈھانپنے والا بنا دیا۔ تاکہ دن بھر کے تھکے ماندے لوگ رات کو آرام کر سکیں۔ اور آرام کے لئے رات کی تاریکی اور خاموش ماحول بہت سازگار ہوتا ہے رات کی نیند بھی اللہ کی ایک خاص نعمت ہے اور اس نعمت کی قدر اس شخص سے پوچھئے جسے رات کو نیند نہ آتی ہو۔ پھر اس نیند میں بھی اللہ تعالیٰ کی کئی نشانیاں ہیں۔ دن بھر کام کرنے سے اور محنت سے جسم کے کچھ خلیے حرارت سے جل جاتے ہیں۔ جب انسان سوتا ہے تو ان جلے ہوئے خلیوں کی جگہ نئے خلیے پیدا ہو جاتے ہیں اور جب یہ عمل پورا ہو چکتا ہے تو انسان کو جاگ آجاتی ہے اور وہ تازہ دم ہو کر دوسرے دن کام کرنے کے قابل ہو جاتا ہے انسان جس قدر زیادہ تھکا ہوا ہوگا۔ اتنی ہی اسے گہری نیند آئے گی اور تادیر آئے گی۔ تاکہ اس کے جلے ہوئے خلیوں کی تلافی مافات ہو سکے۔ بعض دفعہ انسان گہری نیند کی علامت کے طور پر خراٹے بھی لیتا ہے یہ اللہ کی ایک اور نشانی ہے اور بعض دفعہ خواب بھی دیکھتا ہے۔ اب اگر خواب کی حقیقت پر غور کرنا شروع کیا جائے تو انسان اللہ تعالیٰ کے اس محیر العقول کرشمے کی پہنائیوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے وجود میں کیا کچھ عجائبات سمو دیئے ہیں۔ اس آیت سے سرسری طور پر جو بات ذہن میں آتی ہے کہ وہ یہ ہے کہ اللہ نے کام کاج کے لئے دن اور آرام کے لئے رات بنائی ہے۔ اب اگر انسان اس کا الٹ کرے گا یعنی رات کو کام اور دن کو آرام کرے گا تو اس کے نتائج انسان کے حق میں بہتر نہیں ہو سکتے اور اس کی صحت تادیر قائم نہ رہ سکے گی۔

الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿٤٨﴾ لِّنُحْیِۦَ بِهٖ

اپنی رحمت (بارش) سے پیشتر ہواؤں [٦٠] کو بشارت بنا کر بھیجتا ہے اور ہم نے ہی آسمان سے صاف ستھرا [٦١] پانی اتارا ہے۔ (۴۸)

[٦٠] ہواؤں کی مختلف اقسام:۔ ریاح کا لفظ ریح کی جمع ہے۔ جس کا معنی محض ہوا ہے خواہ وہ چل رہی ہو یا ساکن ہو اور اگر وہ حرکت میں ہو یعنی چل رہی ہو تو عربی زبان میں ہر سمت سے چلنے والی ہوا کے لئے الگ الگ لغت ہے۔ جو ہوا شمال سے جنوب کی طرف چل رہی ہو اس ہوا کو بھی شمال ہی کہتے ہیں اور یہ عموماً بارش لاتی ہے اور جو جنوب سے شمال کو چلے اسے جنوب کہتے ہیں اور یہ عموماً بادلوں کو اڑا لے جانے والی ہوتی ہے جو مشرق سے مغرب کو عموماً صبح کے وقت چلتی ہے اسے صبا کہتے ہیں اور یہ دل کو فرحت بخشنے والی ہوتی ہے اور جو مغرب سے مشرق کو چلے اسے دبور کہتے ہیں۔ اسے منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ عاد کی قوم اسی ہوا سے ہلاک ہوئی تھی۔

اگرچہ ریاح ریح کی جمع ہے لیکن قرآن نے ریح اور ریاح کو الگ الگ مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ ریح کا لفظ عموماً عذاب دینے والی ہوا کے لئے استعمال ہوا ہے (مثالوں کے لئے دیکھئے ۳:۱۱۷، ۱۴:۱۸، ۳۳:۹، ۵۴:۱۹ وغیرہ) اور ارسال الریح کا لفظ عموماً رحمت کی ہواؤں کے لئے آتا ہے۔ جیسے اس مقام پر بھی ہوا ہے (نیز دیکھئے ۷:۵۷، ۱۵:۲۲، ۳۰:۴۶، ۳۰:۴۸ وغیرہ) اور باران رحمت لانے والی ہواؤں کے لئے جمع کا صیغہ غالباً اس لئے استعمال ہوا ہے کہ اس میں آبی بخارات بھی شامل ہوتے ہیں۔ سورج کی یا آگ کی حرارت سے پانی کی سطح پر سے جو آبی بخارات اٹھتے ہیں ان کا خاصہ صرف یہ ہے کہ وہ سیدھا اوپر کو اٹھتے ہیں اور اوپر اٹھ کر کوئی خاص سمت اختیار کرنا آبی بخارات کا خاصہ نہیں ہے۔ اب ان کو ہوائیں ہی کسی خاص سمت میں جس طرف اللہ کو منظور ہوتا ہے، اڑا لاتی ہیں۔ اور جس مقام پر اللہ تعالیٰ کو بارش برسانا منظور ہوتا ہے وہاں پہلے ہی ایسی پانی سے لدی ہواؤں کے ٹھنڈے جھونکے آنا شروع ہو جاتے ہیں جو ایک طرف تو بارش کی آمد کی خوشخبری بتاتے ہیں دوسری طرف دلوں کو عجیب طرح کا سرور بخشتے ہیں۔

[٦١] بارش کے پانی کا خوشذائقہ ہونا اللہ کی ایک نشانی ہے:۔ آبی بخارات عموماً سمندر کی سطح پر سورج کی گرمی سے اوپر اٹھتے ہیں سابقہ آیات میں سایوں کا، پھر رات کے پرسکون ہونے اور دن کے وقت کام کاج کرنے کا ذکر تھا اور یہ سب باتیں سورج سے متعلق ہیں اور بارش کا سلسلہ بھی سورج ہی سے متعلق ہے۔ اسی نسبت سے ساتھ ہی اس کا بھی ذکر آگیا۔ اب یہ تو واضح بات ہے کہ سمندر کا پانی کڑوا اور سخت نمکین ہوتا ہے پھر اس میں کئی قسم کے کیمیائی اجزاء بھی ملے ہوتے ہیں۔ سمندر کا پانی جسم کے کسی حصے پر لگ جائے تو اسے چبھنے لگ جاتا ہے۔ اور جب تک سادہ اور صاف پانی سے وہ جگہ دھوئی نہ جائے چین نہیں آتا۔ لیکن حیران کن بات ہے کہ اس کے بخارات سے جو بارش برستی ہے اس میں نہ نمک کی آمیزش ہوتی ہے نہ کسی دوسرے کیمیکل کی۔ حالانکہ ہم خود آبی بخارات کے ذریعہ عرق کشید کرتے ہیں۔ مثلاً سونف کا عرق یا گلاب کا عرق تو اس عرق میں سونف یا گلاب کا ذائقہ، تاثیر حتیٰ کہ خوشبو تک سب کچھ منتقل ہو جاتا ہے۔ مگر سمندر کے آبی بخارات سے برسنے والی بارش ہر قسم کے اثرات سے پاک صاف اور محفوظ ہوتی ہے۔ اور یہ پانی خود ہی پاک صاف نہیں ہوتا بلکہ دوسری اشیاء کو بھی گندگی، غلاظت اور

بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ﴿۴۹﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ
فَاَبٰىٓ اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۵۰﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ﴿۵۱﴾ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ

تاکہ ہم اس پانی سے مردہ علاقے کو زندہ کر دیں اور اپنی مخلوق میں سے بہت سے جانوروں اور انسانوں کو سیراب[۶۲] کریں۔(۴۹) ہم نے یہ بات مختلف طریقوں سے ان کے سامنے بیان کی ہے تاکہ وہ کچھ سبق حاصل کریں[۶۳]۔ لیکن اکثر لوگ کفر کے سوا کوئی اور بات تسلیم ہی نہیں کرتے(۵۰) اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک ڈرانے والا (پیغمبر) بھیج دیتے۔(۵۱) لہٰذا آپ کافروں کی بات نہ مانئے اور اس

نجاست سے پاک صاف بنا دیتا ہے۔

[۶۲] ❁ بارش کو ستاروں کی گردش سے منسوب کرنے والا کافر ہے:۔ اگر سمندر کا پانی اپنی اصلی حالت میں کھیتی کو پلایا جائے تو کھیتی مرجھا کر تباہ ہو جائے۔ اور اگر کوئی جاندار پی لے تو اس کی آنتوں کو کاٹ کے رکھ دے یا کم از کم زخمی کر کے رکھ دے۔ لیکن اسی سمندر کے پانی کے بخارات جب بارش میں منتقل ہوتے ہیں تو کیا نباتات، کیا حیوان اور کیا انسان سب کے لئے یہ پانی حیات بخش ثابت ہوتا ہے۔ کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں اور جاندار مخلوق بارش ہونے سے پہلے ہواؤں کی آمد پر ہی مسرور ہو کر جھومنے لگتی ہے۔ نباتات سے ہی جاندار مخلوق کو غذا حاصل ہوتی ہے اور اس کے پینے کے لئے اللہ تعالیٰ صاف ستھرا پانی دیتا ہے۔ جمادات کے علاوہ اس کائنات ارضی پر کوئی مخلوق ایسی نہیں جس کی زندگی کی بقا پانی کے بغیر ممکن ہو۔

[۶۳] جتنی بھی اللہ کی نشانیاں اوپر مذکور ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور ان سے سبق حاصل کرنے کے لئے تھوڑی نہیں بلکہ بہت کافی ہیں۔ مگر انسانوں کی اکثریت ایسی ہے جو نہ ان باتوں پر دھیان دیتی ہے اور نہ اللہ کی ان نعمتوں کا شکر بجا لاتی ہے۔ اور بعض انسان تو ایسے غلط عقائد میں مبتلا ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ بارش فلاں ستارہ کے فلاں نچھتر میں داخل ہونے سے ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کے زمانہ میں بھی ایسے عقائد عام تھے اور ہر اچھی اور بری بات کو سیاروں کی گردش سے منسوب کر دیا جاتا تھا۔ حدیبیہ کے مقام پر جہاں آپ ﷺ چودہ سو صحابہ سمیت عمرہ کی غرض سے تشریف لائے ایک رات بارش ہوئی جو عرب جیسے بے آب و گیاہ ملک میں ایک عظیم نعمت متصور ہوتی تھی تو صبح آپ ﷺ نے اعلان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "میرے بندوں میں سے کچھ لوگ مجھ پر ایمان لائے اور ستاروں کے منکر ہوئے۔ یعنی جس شخص نے یہ کہا کہ یہ بارش اللہ کے فضل اور رحمت سے ہوئی تو وہ مجھ پر ایمان لایا اور ستاروں کا منکر ہوا اور جس نے کہا کہ یہ بارش فلاں ستارے کے فلاں نچھتر میں داخل ہونے سے ہوئی تو وہ میرا منکر ہوا اور ستاروں پر ایمان لایا" (بخاری۔ کتاب الصلوۃ۔ باب یستقبل الامام الناس اذا سلم)

گویا ستاروں کے اثرات کو تسلیم کرنا اور اللہ پر ایمان لانا دو متضاد باتیں ہیں ان میں سے صرف ایک ہی چیز قبول کی جا سکتی ہے جو ستاروں کے اثرات کو تسلیم کرتا ہے وہ مسلمان نہیں اور جو مسلمان ہے وہ ان اثرات کو تسلیم نہیں کر سکتا۔

جَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا ﴿٥٢﴾ وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ

قرآن کی ہدایات کے مطابق ان سے زبردست جہاد[۶۴] کیجئے۔(۵۲) اور وہی تو ہے جس نے دو سمندروں کو ملا[۶۵] رکھا ہے جن میں سے ایک کا پانی لذیذ و شیریں ہے اور دوسرے کا کھاری کڑوا۔

[۶۴] کافروں سے جہاد کبیر کیوں اور کیسے؟ یعنی ہم چاہتے تو ہر بستی میں الگ الگ نبی بھیج دیتے اور ہر جگہ ہی حق و باطل کے معرکے بپا ہوتے۔ لیکن ہماری مشیت یہی ہے کہ اب ایک ہی آفتابِ نبوت بھیج دیا جائے جس کی رسالت سب لوگوں کے لیے یکساں ہو اور تا قیامت ہو۔ جیسا کہ ایک ہی آفتاب ساری دنیا کو منور کر رہا ہے اور تا قیامت کرتا رہے گا۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ نبی جتنا عظیم الشان ہوگا معرکہ حق و باطل بھی اتنا ہی بڑا ہوگا۔ اسی لئے یہ تاکید فرمائی کہ کافروں سے کسی قسم کے سمجھوتہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ اپنی پوری قوت کے ساتھ ان کافروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیجئے۔ یہ خطاب اگرچہ بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن اس میں آپ کی پوری امت بھی شامل ہے۔ جہاد کا لغوی معنی کسی مقصد کے حصول کے لئے بھرپور کوشش ہے اور جہاد کبیر میں تاکید مزید بھی پائی جاتی ہے اور وسعت اور پھیلاؤ بھی۔ یعنی ایک تو اس امت کا ہر فرد اپنی اس کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے اور اپنے تمام تر ذرائع استعمال کرے۔ اور دوسرے یہ کہ دشمن کا ہر اس محاذ پر مقابلہ کیا جائے۔ جس پر اسلام دشمن طاقتیں کام کر رہی ہوں۔ اور اس میں زبان و قلم کا جہاد بھی شامل ہے، مال کا بھی اور توپ و تفنگ کا بھی۔ غرضیکہ جس محاذ پر بھی دشمن حملہ آور ہو اسی محاذ پر اس کا پوری قوت سے مقابلہ کیا جائے۔

[۶۵] مرج کا لغوی مفہوم:۔ مرج کا لغوی معنی دو چیزوں کو اس طرح ملانا یا ان کا آپس میں اس طرح ملنا ہے کہ ان دونوں کی انفرادی حیثیت اور خواص برقرار رہیں۔ جیسے غصن مریج باہم گتھی ہوئی ٹہنی (مفردات امام راغب) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی ایک نہایت محیر العقول نشانی بتائی ہے اور وہ نشانی اتنی عام ہے جو بے شمار لوگوں کے مشاہدہ میں آچکی ہے۔ اور جغرافیہ دان حضرات اور جغرافیہ پڑھنے والے طالب علم اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ سمندروں کے اندر بھی ایسے دریا چل رہے ہیں جیسے سطح زمین پر بہہ رہے ہیں۔

گرم پانی میں ٹھنڈے اور ٹھنڈے پانی میں گرم روئیں چلانا بھی اللہ کی ایک بہت بڑی نشانی ہے:۔ کہیں گرم پانی کی روئیں چل رہی ہیں کہیں ٹھنڈے پانی کی، کہیں کھاری پانی کی، کہیں میٹھے پانی کی، اور یہ روئیں اتنی لمبی ہوتی ہیں جو سمندر کے اندر ہی اندر ایک ملک سے دوسرے ملک تک چلی جاتی ہیں۔ پھر کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ اوپر کھاری پانی ہے، نیچے ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا دریا بہہ رہا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک طرف کھاری پانی کا دریا بہہ رہا ہے تو اس کے ساتھ متصل میٹھے پانی کا دریا چل رہا ہے اور یہ پانی اپنی اپنی حدود کے اندر رہتے ہیں۔ باہم ملتے نہیں۔ اور ملاح حضرات اپنی واقفیت کی بنا پر سمندر میں سے ٹھنڈا اور میٹھا پانی بھی حاصل کر لیتے ہیں اور میں نے خود دو مقامات چترال اور کراچی میں دیکھا ہے کہ ایک طرف گرم پانی کا چشمہ ابل رہا اور ساتھ ہی متصل دوسری طرف ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا چشمہ ابل رہا ہے حالانکہ زمین کے نیچے پانی کی سطح ایک ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانی کی یہ مثال اسی لئے دی ہے کہ یہ بات عام لوگوں کے مشاہدہ میں آچکی ہے اب سوال یہ ہے کہ پانی یا ہر سیال چیز کی جہاں یہ خاصیت ہے کہ وہ بہتی ہے وہاں یہ بھی ہے کہ اگر ایک ہی نوع کی ہو تو آپس میں مل بھی جاتی ہے مگر ایسے مقامات پر اللہ تعالیٰ نے پانی کی اس خاصیت

وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا ﴿٥٣﴾ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا ۗ

وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا ﴿٥٤﴾ وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ۗ وَكَانَ

پھر ان کے درمیان ایک پردہ اور سخت روک کھڑی کر دی ہے۔[۶۶] (جو ان دونوں کو ملنے نہیں دیتی)(۵۳)

اور وہی ہے جس نے پانی (نطفہ) سے انسان کو پیدا کیا پھر (میاں بیوی) سے نسب اور سسرال[۶۷] کا سلسلہ چلایا

اور آپ کا پروردگار بڑی ہی قدرت والا ہے۔(۵۴)

یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کو پوجتے ہیں جو نہ انہیں کچھ فائدہ پہنچا سکتی ہیں اور نہ نقصان۔ اور

کو سلب کر لیا۔ تاکہ سمندر کے اندر یا سمندر کے کناروں پر بسنے والی مخلوق کو پینے کیلئے ٹھنڈا اور میٹھا پانی مہیا ہو سکے تاکہ وہ اپنی زندگی کو برقرار رکھ سکے۔ کیا اب بھی غافل انسان اپنی چشم بصیرت سے اللہ کی اس نشانی اور عظیم الشان نعمت اور قدرت کو نہ دیکھے گا؟

[۶۶] یہاں حجرا مھجورا کا لفظ محاورتاً نہیں بلکہ اپنے اصل اور لغوی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

[۶۷] نطفہ سے مرد اور عورت کی تخلیق۔ نیز ان کی جسمانی ساخت اور کارکردگی میں اللہ کی محیر العقول تقدیر:۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا یہ کرشمہ کیا کم ہے کہ اس نے پانی کی ایک بوند سے انسان جیسی محیر العقول مشینری رکھنے والی مخلوق پیدا کر دی۔ مزید یہ کہ اس پیدا ہونے والے بچہ کو جو مختلف نوعوں میں تقسیم کر دیا۔ کبھی لڑکا پیدا ہوتا ہے اور کبھی لڑکی۔ اور یہ دونوں انسان ہونے کے اعتبار سے تو یکساں ہیں۔ مگر اپنی جسمانی ساخت اور خصوصیات میں بہت سے امور میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ تاہم اس اختلاف کے باوجود وہ دونوں مل کر ایک ہی مقصد پورا کرتے ہیں اور وہ ہے بقائے نسل انسانی۔ ان دونوں نوع کے ملاپ سے دنیا میں ہزاروں مرد اور عورتیں پیدا ہو رہے ہیں۔ پھر اس اختلاف کی بنا پر رشتہ داریاں بھی دو طرح کی بن جاتی ہیں۔ ایک وہ جن کے ہاں عورتیں بہو بن کر آتی ہیں اور یہ نسبی رشتہ داری ہے۔ جیسے بیٹا، پوتا، پڑپوتا وغیرہ اور دوسرے وہ جن کے ہاں ہماری بیٹیاں، پوتیاں وغیرہ بہو بن کر جاتی ہیں یہ سسرالی رشتہ داریاں ہیں۔ پھر ان دونوں قسم کی رشتہ داریوں کے باہمی تعلقات سے پورا معاشرہ جڑ جاتا ہے اور ایک ہی جیسا تمدن وجود میں آ جاتا ہے۔

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو لڑکے اور لڑکی کی جسمانی ساخت میں صرف شرمگاہوں کا فرق ہوتا ہے جس سے ہم یہ تمیز کرتے ہیں کہ پیدا ہونے والا بچہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ پھر کچھ اختلاف بلوغت پر نمایاں ہوتے ہیں۔ جیسے لڑکے کو احتلام ہونا اور داڑھی اور مونچھوں کے بالوں کا اگنا اور لڑکیوں کو حیض آنا اور اس کے پستانوں میں ابھار کا پیدا ہونا۔ پھر کچھ امور ایسے ہیں جن کا تعلق استقرار حمل سے ہوتا ہے جیسے عورت کے پستانوں میں دودھ کا اتر آنا۔ کیونکہ جب تک حمل قرار نہ پائے دودھ بنتا ہی نہیں۔ پھر جوانی ڈھلنے پر عورت کا حیض آنا از خود بند ہو جاتا ہے اور مرد میں مادہ منویہ کی پیدائش از خود رک جاتی ہے۔ اور دونوں کے شہوانی جذبات افسردہ پڑنے لگ جاتے ہیں اور یہ ایسے لگے بندھے قوانین فطرت ہیں جن میں کبھی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ ان امور پر غور کرنے سے بے اختیار یہ بات زبان پر آ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز سے جس قسم کا کام لینا ہوتا ہے اس پر وہ پوری قدرت رکھتا ہے۔

الْكٰفِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ﴿۵۵﴾ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۵۶﴾ قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۵۷﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ

کافر اپنے پروردگار کے مقابلہ پر (باغی کا) مددگار[۶۸] بنا ہوا ہے۔(۵۵) اور (اے نبی!) ہم نے تو آپ کو بس خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا[۶۹] بنا کر بھیجا ہے۔(۵۶)

آپ ان سے کہئے: کہ میں اس (تبلیغ) پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا۔ میری اجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے اپنے پروردگار کا راستہ اختیار کرے۔[۷۰](۵۷) اور اس ذات پر توکل کیجئے۔ جو (ہمیشہ سے) زندہ ہے اور اسے کبھی

[۶۸] کافر کا کام یہ ہوتا ہے کہ جہاں کہیں بھی اعلائے کلمۃ اللہ کا کام شروع ہو تو وہ اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتا ہے۔ اس کی اخلاقی زبانی، مالی اور جانی ہمدردیاں ہمیشہ ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہیں جو اقامتِ دین الٰہی کے راستہ میں مزاحم ہو رہے ہوں۔ انہیں کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ ان کی زندگی اور اس کی بقاء کے اسباب تو اللہ تعالیٰ حیرت انگیز طریقوں سے مہیا کر رہا ہے۔ لہٰذا انہیں اسی اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار بن کر رہنا چاہئے۔ الٹا وہ ہر اس عمل اور اس سازش میں شریک ہو جاتا ہے جو اللہ کی نافرمانی پر مشتمل ہو اور ایسی چیزوں کی عبادت گزاری اور فرمانبرداری کرنے لگتا ہے جن کے اختیار میں ان کا اپنا بھی نفع و نقصان نہیں ہوتا۔

[۶۹] کافروں اور مسلمانوں کے لئے آپ کی ذمہ داری کی نوعیت:۔ یعنی آپ ﷺ کا یہ کام نہیں کہ آپ لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لئے مجبور کریں۔ نہ ہی یہ کام ہے کہ ایمان نہ لانے والوں کو کچھ سزا دیں اور ایمان لانے والوں کو مالی امداد بہم پہنچائیں۔ بلکہ آپ کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ سب لوگوں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کر دیں۔ منکرین حق کو ان کے برے انجام سے ڈرائیں اور ایمان لانے والوں کو ان کے اعمالِ صالحہ کے اجر کی خوشخبری دیں۔ بس آپ کا کام اتنا ہی ہے۔

واضح رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف ایسا خطاب دراصل کافروں کو دعوت دینے کی حد تک ہے۔ ورنہ جو لوگ ایمان لے آئیں تو ان کے لئے نبی کا کام اتنا ہی نہیں کہ آپ انہیں بھی بس ان کے اعمالِ صالحہ کی خوشخبری دے دیں۔ بلکہ ان کی تعلیم، ان کی تربیت، اور تزکیہ نفس سب کچھ آپ کی ذمہ داریوں میں شامل ہے اور قرآن کریم نے اس مضمون کو چار مختلف مقامات پر ذکر کیا ہے اور آپ کی مسلمانوں کے لئے چار ذمہ داریاں ہیں۔ مثلاً یہ کہ آپ ان کو قرآنی آیات پڑھ کر سنائیں، ان کا تزکیہ نفس کریں۔ انہیں کتاب کی بھی تعلیم دیں اور حکمت بھی۔ (مزید تشریح کے لئے دیکھئے ۲: ۱۲۹، ۲: ۱۵۱، ۳: ۱۶۴)

[۷۰] انبیاء کی محنت کا صلہ؟ انبیاء کی دعوت اور کفار کے انکار کے سلسلہ میں انبیاء کی طرف سے جواب کے طور پر یہ جملہ قرآن میں متعدد مقامات پر مذکور ہے۔ اور اس جواب کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ اگر تمہیں میرا یہ دعوت الی اللہ کا کام پسند نہیں آتا تو میں تم سے کوئی معاوضہ یا تنخواہ تھوڑے لے رہا ہوں جو تم اسے بند کر دو گے اور میں اپنا کام چھوڑ دوں گا اور نہ ہی تم سے میرا اس قسم کا مطالبہ ہے۔ لہٰذا تمہیں یہ کام پسند ہو یا نہ ہو یا میں اپنا کام کئے ہی جاؤں گا اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ میں بالکل بے لوث اور بے غرض ہو کر تمہاری بھلائی کی خاطر تمہیں سیدھے راستے کی طرف دعوت دے رہا ہوں اور میں تم سے لیتا بھی

بِحَمْدِهٖ ؕ وَ كَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِیْرَا ۚ۝ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚۛ اَلرَّحْمٰنُ فَسْــٴَـلْ بِهٖ خَبِیْرًا ۝ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ

موت[۷۱] نہیں آئے گی۔ اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کیجئے۔ وہ اپنے بندوں کے گناہوں سے خبر رکھنے کو کافی ہے۔(۵۸) جس نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کچھ چھ دنوں میں پیدا کیا پھر عرش پر[۷۲] قرار پکڑا وہی رحمٰن[۷۳] ہے، اس کا حال کسی باخبر سے[۷۴] پوچھ لیجئے۔(۵۹)

اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ "رحمٰن" کیا ہوتا ہے؟[۷۵] کیا ہم اس کو

کچھ نہیں بلکہ الٹا تم سے مذاق اور استہزاء سنتا اور تکلیفیں اٹھا رہا ہوں پھر بھی تمہیں اتنا خیال تک نہیں آتا کہ کم از کم اس کی بات پر بھی کچھ غور و فکر تو کر لیں۔ اس آیت کا اگلا حصہ اسی پہلو یا اسی مطلب کی تائید کر رہا ہے۔ یعنی اگر اللہ نے چاہا اور تم میں سے کوئی ایک شخص بھی ہدایت کی راہ پر آ گیا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت کا صلہ یا معاوضہ مجھے مل گیا۔

[۷۱] یعنی میں اس ہستی پر توکل کرتا ہوں جو ہمیشہ سے زندہ اور قائم و دائم ہے اور قائم دائم اور زندہ ہی رہے گی۔ تمہارے معبودوں کی طرح مخلوق نہیں، نہ وہ اس قدر محتاج ہے کہ اسے اپنی ذات کو قائم رکھنے کے لئے بھی اپنے عقیدت مندوں کی احتیاج ہو اور جو اپنے بھی نفع و نقصان کی مالک نہیں وہ تمہارا کیا بگاڑ یا سنوار سکتی ہے۔ مجھے ایسی ہستی کی عبادت کا حکم ہے اور وہ تمہارے جیسے منکروں کی کرتوتوں سے پوری طرح واقف ہے اور ان کرتوتوں پر تمہیں سزا دینے پر قادر بھی ہے۔

[۷۲] استوٰی علی العرش کی تفسیر کے لئے سورہ طٰہٰ کی آیت نمبر ۵ کا حاشیہ نمبر ۳، سورہ اعراف کی آیت نمبر ۵۴ کا حاشیہ نمبر ۵۴۔

[۷۳] استوٰی علی العرش کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اور بعض مقامات پر رحمٰن کی طرف جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رحمٰن بھی اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام ہے اور اللہ کی باقی صفات بھی، جن کا سابقہ آیات میں ذکر ہوا ہے۔ رحمٰن کی طرف منسوب کی جاسکتی ہیں۔

[۷۴] یہاں خبیر سے مراد ایسا عالم ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی کائنات میں بکھری ہوئی آیات میں غور و فکر کر کے اللہ تعالیٰ کی معرفت کا علم حاصل کیا ہو۔ ایسے ہی خبیر کو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر لفظ عالم سے تعبیر فرمایا ہے جہاں ایسی بہت سی آیات کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ﴿ اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ﴾ (۳۵:۲۸) یعنی اللہ کے بندوں میں سے اللہ سے صرف عالم لوگ ہی ڈرتے ہیں۔ تاہم اس سے نقلی علوم وحی کو جاننے والے حضرات بھی مراد لئے جاسکتے ہیں اور بعض انبیاء کو بھی تو اللہ تعالیٰ نے ملکوت السموات والارض کا مشاہدہ بھی کرایا تھا۔ اس لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے عالم اور خبیر ہوئے اس کے بعد دوسرے انبیاء۔ پھر ان کے بعد اس صف میں وہ عالم دین بھی شامل ہو جاتے ہیں جو اپنے علم میں راسخ ہوں۔ خواہ وہ تورات کے عالم ہوں یا کسی اور الہامی کتاب کے۔

[۷۵] ۞ رحمٰن کے لفظ سے قریش کی چڑ:۔ قریش مکہ کے سامنے جب رحمٰن کا ذکر کیا جاتا تو از راہ تحقیر کہا کرتے کہ "رحمٰن کیا ہوتا ہے؟" یہاں ذوی العقول کے لیے ما کا لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ قریش رحمٰن سے ناواقف

قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ق اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴿۶۰﴾ تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ
بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ﴿۶۱﴾ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ

سجدہ کریں جس کا تو ہمیں حکم دیتا ہے؟" اور (یہ دعوت) ان کی نفرت میں مزید اضافہ [۷۶] کر دیتی ہے۔(۶۰)
بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمان میں برج [۷۷] بنائے اور اس (آسمان) میں چراغ (سورج) اور چمکتا ہوا چاند [۷۸]
پیدا کیا۔(۶۱) اور وہی ہے جس نے رات و دن کو بار بار ایک دوسرے کے بعد آنے والا [۷۹] بنایا۔ اب جو چاہے اس سے

محض تھے بلکہ یہ تھی کہ رحمٰن کا لفظ ان کے ہاں مروج نہ تھا۔ اور انہیں اس لفظ سے چڑ سی ہو گئی تھی جیسا کہ پہلے سورہ رعد کی آیت نمبر ۳۰ کے حاشیہ ۳۹ میں گزر چکا ہے اور جب انہیں رحمٰن کو سجدہ کرنے کو کہا جاتا تو یکدم بھڑک اٹھتے تھے اور ان کی حرکت محض ضد اور تعصب کی وجہ سے ہوتی تھی۔ ورنہ اگر انہیں فی الواقع رحمٰن کا علم نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان پر گرفت کرنے کے بجائے انہیں نرمی سے سمجھا اور بتا سکتے تھے۔

[۷۶] اس آیت کی اختتام پر سجدہ تلاوت مشروع ہے۔ قاری کے لئے بھی اور سامع کے لئے بھی تاکہ اللہ کی اطاعت گزاروں اور قریش مکہ جیسے اسلام دشمنوں کے درمیان فرق معلوم ہو سکے۔

[۷۷] آسمان میں بارہ برجوں کی وضاحت کے لئے سورہ حجر کی آیت نمبر ۱۶ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیے۔

[۷۸] ۞ چاند اور سورج کی روشنی میں فرق اور دوسرے فوائد:۔ دن کے وقت سورج روشنی کا سب سے بڑا قدرتی منبع ہے اور رات کے وقت چاند۔ پھر ان دونوں کی روشنی میں بڑا فرق ہے۔ سورج کی روشنی میں تپش اور حرارت ہے اور وہ سرخی مائل ہوتی ہے اور اس کی شعاعیں انسان کی آنکھ کے سامنے والے پردہ پر پڑیں تو سخت کوفت ہوتی ہے۔ جبکہ چاند کی روشنی میں ایک سرور بخش ٹھنڈک ہوتی ہے اور انسان کا جی چاہتا ہے کہ اس کی طرف دیکھتا رہے۔ حتیٰ کہ چاند کی چاندنی کا تصور ہی ہر شخص کی خوشی کا باعث ہے پھر ان دونوں سیاروں سے ہمیں صرف روشنی ہی حاصل نہیں ہوتی بلکہ اور بھی بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ فصلوں کے پکنے کا انحصار سورج ہی سے متعلق ہے۔ دھوپ سے کئی قسم کے نقصان دہ جراثیم اور کیڑے مکوڑے مر جاتے ہیں۔ ہر جاندار کی زندگی اور صحت کے لئے بھی دھوپ کی ایک معین مقدار نہایت ضروری ہے چاند جب زائد النور ہوتا ہے تو اس دوران پھلوں میں تیزی سے رس پیدا ہوتا ہے۔ غرضیکہ ان سیاروں سے انسان کو گوناگوں فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

[۷۹] ۞ خِلْفَةً کا لغوی مفہوم:۔ خِلْفَةً کے معنی ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے۔ رات کے پیچھے دن آتا ہے اور دن کے پیچھے رات۔ اور یہ بار بار ایک دوسرے کے پیچھے آتے رہتے ہیں۔

موجودہ نظریہ ہیئت کے مطابق دن رات سورج کے سامنے زمین کی محوری یک روزہ گردش کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں۔ زمین کا محیط پچیس ہزار میل ہے اور زمین اپنی محوری گردش پورے چوبیس گھنٹہ میں پوری کرتی ہے۔ بالفاظ دیگر ہم نے زمین کی محوری گردش کی مدت کو چوبیس گھنٹہ میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اور دن اور رات کے اوقات میں کمی بیشی زمین کی سورج کے گرد سالانہ گردش کی وجہ سے ہوتی ہے اس نظریہ کی رو سے اللہ کی قدرت کے یہ کرشمے اور بھی محیر العقول بن جاتے ہیں جس نے اتنے بڑے بڑے عظیم الجثہ کروں کو بجلی کی تیز رفتاری سے اس طرح محو گردش بنا رکھا ہے کہ ان کے نتائج میں کبھی ایک سیکنڈ کی بھی تقدیم و

يَذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ﴿۶۴﴾ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا

سبق حاصل کرے اور جو چاہے شکر گزار بنے(۶۲) اور رحمٰن کے (حقیقی) بندے وہ ہیں جو زمین پر انکساری[۸۰] سے چلتے ہیں اور اگر جاہل ان سے مخاطب ہوں تو بس سلام[۸۱] کہہ کر (کنارہ کش رہتے ہیں)(۶۳) اور جو اپنے پروردگار کے حضور سجدہ اور قیام میں راتیں[۸۲] گزارتے ہیں(۶۴) اور دعا کرتے ہیں: اے ہمارے پروردگار!

تاخیر نہیں ہو سکتی۔ نہ ہی ان کروں کا آپس میں کہیں تصادم ہوتا ہے۔

[۸۰] ۞ اللہ کے بندوں کی صفات:۔ سابقہ آیات میں رحمٰن اور رحمٰن کی نشاند ہی کا ذکر چل رہا تھا تو یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی نسبت اپنی طرف کرنے کے بجائے رحمٰن کی طرف منسوب کر کے واضح کر دیا کہ رحمٰن بھی اللہ تعالیٰ ہی کا ذاتی نام ہے۔ ویسے تو جتنی بھی اللہ کی مخلوق ہے سب ہی رحمٰن کے بندے ہیں۔ لیکن یہاں اس سے مراد اللہ کے وہ بندے ہیں جو اللہ کو محبوب ہیں۔ اگلی آیات میں ایسے ہی اللہ کے بندوں کی کچھ صفات مذکور ہیں۔ ان آیات میں دراصل رحمٰن کے بندوں اور شیطان کے بندوں کا طرزِ زندگی اور ان کے اعمال وافعال کا تقابل پیش کیا جارہا ہے۔ پہلے شیطان کے بندوں کا ذکر چل رہا تھا۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی صفات بیان کر کے بہت سی باتوں کو انسان کے فہم پر چھوڑ دیا ہے۔

۞ تکبرانہ چال کی ممانعت' چال انسان کے خیالات کی عکاس ہوتی ہے:۔ اللہ کے بندوں کی پہلی صفت یہ بیان فرمائی کہ ان کی چال میں انکساری ہوتی ہے تکبر کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ انسان کی چال ایسی چیز ہے جو اس کے ذہن کی پوری پوری عکاسی کر دیتی ہے۔ ایک شریف النفس اور سلیم الطبع انسان کی چال اور قسم کی ہوتی ہے۔ کسی ظالم و جابر کی اور قسم کی، اوباش اور غنڈوں کی اور قسم، اور متکبر اور شیخی باز لوگوں کی اور قسم کی۔ گویا ہر انسان کے چال ڈھال سے پہلی نظر میں ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ انسان کون سے طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں چال کی صفت میں هَوْنًا کا لفظ استعمال فرمایا هُوْنًا نہیں فرمایا۔ هَوْنًا کا مطلب ایسی چال ہے جس میں تواضع، سبکساری اور وقار پایا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چال ایسی ہی ہوتی تھی۔ قدم چھوٹے مگر تیز گام اور چال میں وقار ہوتا تھا اور هُوْنًا کا مطلب ایسی چال ہے جس میں کمزوری، کم ہمتی اور ذلت کا پہلو محسوس ہوتا ہے جیسے کسی بیمار اور بڑے بوڑھے کی چال یا کسی ایسے ریاکار کی چال جو لوگوں میں اپنی انکساری کا سکہ بٹھانا چاہتا ہو۔ جیسے متکبرانہ چال ممنوع ہے ویسے ہی اس طرح کی چال بھی ممنوع ہے۔ (نیز دیکھئے سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۳۷ کا حاشیہ)

[۸۱] ۞ بیہودہ مجالس سے اجتناب:۔ جاہل سے مراد بے علم یا کم علم یا نادان نہیں بلکہ کج بحث قسم کے لوگ ہیں جن کا بحث میں مقصود کچھ سبق حاصل کرنا نہیں ہوتا بلکہ مخاطب کو نیچا دکھانا یا اس کا مذاق اڑانا ہوتا ہے۔ اللہ کے بندوں کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسی فضول اور بیہودہ باتوں میں پڑ کر اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔ نہ ہی وہ ایسے لوگوں کی بد تمیزی یا بیہودگی کو برداشت کرتے ہیں۔ بلکہ اگر کسی ایسے شخص سے سابقہ پڑ بھی جائے تو سلام کہہ کر اس سے کنی کترا جاتے ہیں۔ وہ گالی کا جواب گالی سے یا اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والوں سے کنارہ کش رہتے ہیں اور ایسے لوگوں کے نزدیک بھی نہیں پھٹکتے!

[۸۲] ۞ رات کی تنہائی میں اللہ کی یاد اور نماز تہجد:۔ اللہ کے بندوں کی تیسری صفت یہ بیان فرمائی کہ راتوں کو بھی اللہ کی یاد سے غافل نہیں رہتے۔ بلکہ انہیں رات کو عبادت میں زیادہ مزا آتا ہے۔ اس لئے کہ ایک تو رات کی عبادت میں ریا کا شائبہ

اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿٦٥﴾ إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا ﴿٦٦﴾
وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا ﴿٦٧﴾ وَالَّذِينَ لَا

جہنم کے عذاب سے ہمیں بچائے رکھنا، کیونکہ اس کا عذاب ٹلنے والا نہیں۔(۶۵) بلاشبہ وہ جائے قرار بھی بری ہے[۸۳] اور مقام بھی برا ہے۔(۶۶) اور جو خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل بلکہ ان کا خرچ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان[۸۴] اعتدال پر ہوتا ہے۔(۶۷) اور اللہ کے ساتھ کسی

نہیں ہوتا۔ دوسرے رات کی تنہائیوں میں بندہ جس طرح اللہ کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے اور مناجات کر سکتا ہے دن کو نہیں کر سکتا۔ اسی لئے احادیث میں رات کی عبادت اور بالخصوص نماز تہجد کی بہت فضیلت مذکور ہے۔ نیز سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سات قسم کے آدمیوں کو اپنے سایہ میں رکھے گا جس دن اس کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔ ان سات آدمیوں میں سے ایک وہ شخص ہوگا جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور اس کی آنکھیں بہہ نکلیں" (بخاری۔ کتاب الزکوٰۃ۔ باب الصدقۃ بالیمین)

[۸۳] ایمان کا تقاضا اللہ سے امید بھی اور ڈر بھی:۔ یعنی راتوں کی عبادت یا ان کے دوسرے نیک اعمال انہیں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں کر دیتے کہ اب وہ یقینی طور پر جنت کے مستحق ہو گئے ہیں۔ نہ ہی ان میں ان اعمال کی بجا آوری پر پندار نفس یا غرور پیدا ہوتا ہے۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

غرور زہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو　　کہ بندگانِ خدا پر زبان دراز کرے

بلکہ وہ اللہ سے یہ دعا بھی کرتے رہتے ہیں کہ اگر ان اعمال کی بجا آوری میں کچھ تقصیر ہو گئی ہے تو معاف فرما دے۔ ان اعمال کو جیسے بھی وہ ہیں قبول فرما لے اور ہمیں جہنم کے عذاب سے بچائے رکھنا گویا اللہ کے بندوں کی چوتھی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ اپنے اعمال پر بھروسہ نہیں کر بیٹھتے بلکہ ان کا اصل اعتماد اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔

[۸۴] اسراف و تبذیر میں فرق:۔ اسراف کا اطلاق ضرورت کے کاموں سے زیادہ خرچ کرنے پر ہوتا ہے۔ مثلاً اپنے سامان خورد و نوش یا کپڑوں پر یا مکان پر یا شادی بیاہ پر بھی بے دریغ خرچ کر دینا یا اپنی ہمت اور مقدور سے زیادہ خرچ کر دینا۔ ایسی فضول خرچیوں سے اسلام نے سختی سے روک دیا ہے۔ پھر اسراف کی ایک قسم ایسی ہے جسے تبذیر کہتے ہیں۔ جس کا معنی یہ ہے کہ ناجائز کاموں یا ناجائز ضرورتوں پر خرچ کرنا۔ جیسے شراب نوشی، قمار بازی، بیاہ شادی کے موقعہ پر آتش بازی اور راگ رنگ وغیرہ ایسے کاموں میں ایک پیسہ بھی خرچ کرنا حرام ہے۔ چہ جائیکہ ایسے کاموں پر بھی بے دریغ اور بے تحاشا خرچ کر دیا جائے۔

اِسراف کی ضد بخل ہے۔ جس کا معنی یہ ہے کہ مقدور ہوتے ہوئے بھی ضرورت کے کاموں میں پیسہ ضرورت سے کم خرچ کرنا اور پیسہ کو جوڑ کر رکھنا۔ جیسے اپنی ذات پر اور اپنے بال بچوں کی گزران کے سلسلہ میں بھی بخل کر جانا۔ خوراک میں پوشاک میں، طرزِ بود و باش میں، اعزہ و اقرباء کو تحفے تحائف دینے لینے میں ہر جگہ بخل سے کام لینا اور بالخصوص جب اللہ کی راہ میں

يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿٦٨﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿٦٩﴾ اِلَّا

اور اللہ کو نہیں پکارتے نہ ہی اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق قتل کرتے ہیں اور نہ زنا کرتے ہیں[۸۵] اور جو شخص ایسے کام کرے گا ان کی سزا پا کے رہے گا۔(۶۸)

قیامت کے دن اس کا عذاب دگنا[۸۶] کر دیا جائے گا اور ذلیل ہو کر اس میں ہمیشہ کے لئے پڑا رہے گا۔(۶۹) ہاں

کچھ خرچ کرنا پڑے تو اسے یوں محسوس ہو کہ پیسہ کے ساتھ اس کی اپنی جان بھی نکلی جا رہی ہے۔

۞ اقتصاد کیا ہے؟ اسراف اور بخل کے درمیان کی صفت کا نام اقتصاد یا قصد ہے اور اسی صفت کو اسلام نے پسند کیا ہے۔ اقتصاد یہ ہے کہ انسان اپنی جائز ضرورتوں پر اتنا ہی خرچ کرے جتنا ضروری ہو نہ کم نہ زیادہ۔ حتیٰ کہ اگر اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہو تو بھی یہی بات مد نظر رکھنی چاہئے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ وہی بہتر ہے جس کے بعد انسان خود محتاج نہ ہو جائے۔(بخاری۔ کتاب النفقات۔ باب وجوب النفقة علی الاھل و العیال)

اور اعتدال کی روش اختیار کرنے کے بعد اگر کسی کے پاس مال بچ رہتا ہے تو اسے اپنے اقرباء اور دوسرے حاجت مندوں کی ضرورتوں پر خرچ کرنا چاہئے۔

[۸۵] ۞ عرب معاشرہ میں شرک، قتل ناحق اور زنا کی کثرت اور ان کاموں سے اجتناب:۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان تین بڑے بڑے گناہوں کا ذکر فرمایا۔ جن میں اس دور کا عرب معاشرہ بری طرح مبتلا تھا۔ ہر قبیلے کا الگ الگ بت ہوتا تھا۔ پھر ایک بڑا بت کئی قبائل کا مشترکہ بھی ہوتا تھا۔ بیت اللہ شریف کے متولیوں نے اللہ کے اس گھر کو جس کی بنیاد ہی توحید پر رکھی گئی تھی تین سو ساٹھ بتوں سے بھر دیا تھا۔ پورے عرب میں لوٹ مار اور قتل و غارت ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ پھر اگر کسی قبیلہ کا کوئی دشمن قتل ہو جاتا تو سمجھ لو کہ سالہا سال تک کے لئے ان دونوں قبائل میں جنگ ٹھن گئی۔ ایسی لڑائیوں نے گھرانوں کے گھرانے اجاڑ دیئے تھے۔ شراب نوشی اور زنا ان لوگوں کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ زنا کو وہ کوئی معیوب فعل نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کے ادباء و شعراء میلوں میں اپنے زنا کے واقعات اور اپنی محبوبہ کا ذکر بڑے فخر سے کرتے تھے۔ حد یہ ہے کہ صفا اور مروہ پہاڑیوں پر دو بت رکھے گئے تھے جن کا نام اساف اور نائلہ تھا یہ دونوں دراصل ایک زانی مرد اور زانی عورت تھے جنہوں نے حرم کعبہ میں زنا کیا تھا۔ ان کے متعلق مشہور یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس جرم میں پتھر بنا دیا تھا۔ بعد کے لوگوں نے انہی پتھروں کو صفا اور مروہ پر رکھ کر ان کی پوجا شروع کر دی۔ اسی بات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ زنا ان کے ہاں گناہوں میں شمار بھی ہوتا تھا یا نہیں۔ پھر قتل ناحق کی ایک صورت ان کے ہاں رائج تھی اور وہ تھی لڑکیوں کو زندہ در گور کرنا۔(جس پر پہلے تفصیل سے لکھا جا چکا ہے) اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ ان شدید جرائم سے بچے رہتے ہیں جن میں عرب کا معاشرہ بری طرح پھنسا ہوا ہے۔

[۸۶] یعنی جو لوگ ایسے جرائم میں مبتلا ہیں۔ ایک تو انہیں ان کی سزا مل کے رہے گی۔ دوسرے ان کے عذاب میں کبھی وقفہ نہیں آئے گا۔ اور تیسرے یہ کہ ان کے عذاب میں دم بدم اضافہ ہی کیا جاتا رہے گا۔ پھر اس جہنم سے نکلنے کی بھی کوئی صورت اس کے لئے ممکن نہ ہو گی۔

مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا
رَّحِيْمًا ﴿۷۰﴾ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَ

جو شخص توبہ کر لے اور ایمان [۸۷] لے آئے اور نیک عمل کرے تو ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں سے بدل دے گا اور اللہ بہت بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔(۷۰) اور جو شخص توبہ کرے اور نیک عمل کرے تو وہ گویا اللہ کی طرف یوں رجوع کرتا ہے جیسا کہ رجوع کرنے [۸۸] کا حق ہے۔(۷۱) اور جو

[۸۷] اسلام لانے کے فائدے:۔ یعنی ایسے شدید جرم کرنے والے کافروں میں سے بھی جو شخص ایمان لائے گا اللہ اس کے سابقہ گناہوں کو کلیتاً معاف فرما دے گا۔ جیسا کہ درج ذیل احادیث سے واضح ہے۔

۱۔ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: یا رسول اللہ ﷺ! ہم نے جو گناہ جاہلیت کے زمانہ میں کئے ہیں کیا ہم سے ان کا مؤاخذہ ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص اسلام لایا پھر نیک عمل کرتا رہا اس سے جاہلیت کے گناہوں کا مواخذہ نہیں ہوگا“ (بخاری۔ کتاب استتابة المرتدين)

۲۔ سیدنا براء بن عازب فرماتے ہیں کہ ایک شخص (دوران جہاد) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ وہ اپنا چہرہ لوہے کے ہتھیاروں سے چھپائے ہوئے تھا۔ کہنے لگا: ”اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا میں پہلے کافروں سے لڑائی کروں یا اسلام لاؤں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”پہلے اسلام لاؤ، پھر لڑائی کرو“ تو وہ مسلمان ہو گیا پھر لڑنے لگا حتیٰ کہ شہید ہو گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”دیکھو اس نے عمل تو تھوڑا کیا مگر ثواب بہت زیادہ پایا“ (بخاری۔ کتاب الجهاد۔ باب عمل صالح قبل القتال)

۳۔ سیدنا حکیم بن حزام کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! ”میں نے جاہلیت کے زمانہ میں جو اچھے کام کئے تھے مثلاً قرابت داروں سے حسن سلوک، غلام کو آزاد کرنا یا صدقہ و خیرات دینا۔ کیا مجھے ان کا اجر ملے گا؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیوں نہیں۔ تم جو اسلام لائے ہو تو سابقہ نیکیوں کو برقرار رکھتے ہوئے اسلام لائے ہو“ (بخاری۔ کتاب البیوع۔ باب شراء المملوك من الحربي)

برائیاں نیکیوں میں کیسے بدلتی ہیں؟:۔ ان احادیث سے نتیجہ نکلا کہ اسلام لانے کے دو بڑے فائدے ہیں۔ ایک یہ کہ سابقہ سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور اسلام لانے والا گناہوں سے اس طرح پاک صاف ہو جاتا ہے جیسے آج ہی پیدا ہوا اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس کے سابقہ نیک اعمال کا اسے اجر بھی ملے گا جبکہ بحالت کفر مرنے پر اسے نیک اعمال کا اسے اجر نہیں مل سکتا تھا۔

ایک تو یہ صورت ہوئی دوسری صورت یہ ہے کہ اسلام لانے والے کے اعمال نامہ میں فی الواقع اس کی برائیوں کی جگہ نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ جو شخص اعمال صالحہ کا خوگر ہو جائے اس سے برائیوں کی عادت چھوٹ جاتی ہے اور سابقہ برائیاں معاف کر دی جاتی ہے۔ اسی طرح جس معاشرہ میں نیکیاں رواج پا جائیں۔ برائیاں از خود مٹتی چلی جاتی ہیں۔

[۸۸] توبہ کا فائدہ اور شرائط:۔ سابقہ آیت میں ان لوگوں کا ذکر تھا جو کفر سے توبہ کرتے اور دائرہ اسلام میں داخل ہوتے ہیں۔ اس آیت میں ان مسلمانوں کا ذکر ہے جن سے گناہ سرزد ہو جائیں اور وہ توبہ کرتے ہیں۔ توبہ کی قبولیت کی شرائط یہ ہیں کہ وہ فی الواقع اپنے کئے پر نادم ہو۔ پھر اللہ سے استغفار کرے۔ توبہ استغفار کے بعد اپنی اصلاح کرے اور کم از کم اس سے وہ گناہ سرزد نہ ہو جس سے اس نے

اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿٧٢﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴿٧٣﴾

جھوٹی گواہی[۸۹] نہیں دیتے اور جب کسی لغو کام پر ان کا گزر ہو تو (شریف آدمیوں کی طرح) وقار سے گزر جاتے ہیں۔(۷۲) اور جب انہیں اپنے رب کی آیات سے نصیحت کی جاتی ہے تو ان پر اندھے اور بہرے[۹۰] ہو کر نہیں گرتے (بلکہ ان کا گہرا اثر قبول کرتے ہیں)(۷۳)

توبہ کی تھی۔ اب وہ توبہ استغفار کے بعد جس قدر اپنی اصلاح کرتا اور اعمال صالحہ بجالاتا رہے گا اسی قدر وہ اللہ کے حضور مقرب بنتا جائے گا۔

[۸۹] ۞ شهادة الزُّور کا مطلب:۔ اس کا ایک ترجمہ تو وہی ہے جو ترجمہ سے واضح ہے البتہ یہ وضاحت باقی رہ جاتی ہے کہ زور کا معنی محض جھوٹ نہیں بلکہ ہر باطل اور لغو کام بھی زور میں شامل ہے۔ اسی طرح شهادة الزور سے مراد محض جھوٹی شہادت نہیں۔ جبکہ گول مول سی شہادت دینا، شہادت کا کچھ حصہ چھپا جانا اور بیان نہ کرنا یا ایسی ہیرا پھیری کرنا کہ غیر اہم بات نہایت اہم اور اہم بات نہایت معمولی معلوم ہونے لگے' یہ ایسی سب باتیں شهادة الزور میں داخل ہیں۔ اور ایسی شہادت کا مقصد کسی نہ کسی فریق کی ناجائز حمایت اور طرفداری ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں فریق ثانی کی از خود حق تلفی ہو جاتی ہے۔ ایسی شہادت کو رسول اللہ ﷺ نے بڑے بڑے گناہوں میں شمار کیا ہے۔ (بخاری۔ کتاب الشہادات۔ باب ماقیل فی شهادة الزور)

اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ جہاں کوئی لغو اور بے ہودہ قسم کا کام ہو رہا ہو۔ اللہ کے بندے وہاں حاضر ہو کر تماشائی نہیں بنتے اور ان کی طبیعت قطعاً یہ گوارا نہیں کرتی کہ وہ ایسی مجالس میں شریک ہوں جیسا کہ اس آیت کے اگلے حصہ سے یہی مفہوم متبادر ہوتا ہے۔ جہاں ایسے بے ہودہ قسم کے کھیل تماشے یا مجالس منعقد ہوں گے وہاں وہ نہ رکنا گوارا کرتے ہیں نہ انہیں دیکھنا پسند کرتے ہیں بلکہ شریفانہ طور پر وہاں سے آگے گزر جاتے ہیں۔

[۹۰] ۞ وحی کو عقل کے تابع رکھنے والے حضرات کا قرآن کی اس آیت سے استدلال:۔ یعنی جب اللہ کے بندوں کو آیات الٰہی سے نصیحت اور یاد دہانی کرائی جاتی ہے تو اس نصیحت سے ان کے دل پوری طرح اثر قبول کرتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں وہ اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ بعض عقل پرست حضرات اس آیت کا مفہوم یہ لیتے ہیں کہ اللہ کے بندوں کو جب آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ بلا سوچے سمجھے ان پر نہیں گرے پڑتے بلکہ اگر وہ آیات عقل کے مطابق ہوں تو تب انہیں قبول کرتے ہیں اور اس سے مزید نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ قرآن کا کوئی حکم ایسا نہیں جو عقل انسانی کے مطابق نہ ہو۔ اس طرح وہ وحی الٰہی کو عقل کے تابع بنا دیتے ہیں۔ یہ سلوک تو ان کا قرآن سے ہے اور جو سلوک ان کا احادیث نبویہ سے ہو سکتا ہے اس کا آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ حالانکہ دین میں جتنے بھی تعبدی امور ہیں وہ سب ایسے ہیں جن تک عقل کی رسائی ممکن نہیں۔ مثلاً یہ کہ حدث یا ہوا نکلنے سے وضو کیوں ٹوٹ جاتا ہے اور صاف ستھرے اجزائے بدن کو از سر نو کیوں دھونا پڑتا ہے۔ یا مثلاً یہ کہ اگر ذبح کرتے وقت جانور پر اللہ کا نام نہ لیا جائے تو وہ حرام کیوں ہو جاتا ہے اور اس کے گوشت میں کیا تبدیلی واقع ہوتی ہے کہ اس کا کھانا حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور ایسی مثالیں بے شمار ہیں۔

گویا اصل مفہوم کے لحاظ سے اس آیت کا مقصد اللہ کی آیات میں غور و فکر اور اثر پذیری ہے لیکن عقل پرستوں کے نزدیک اس آیت کا مقصد اللہ کے احکام کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا ہے۔ اگر وہ پوری اترے تو اسے قبول کر لیا جائے ورنہ اس کی تاویل کر ڈالی جائے۔

[۹۱] ۞ اہل خانہ کو دیندار بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ دعا بھی ضروری ہے:۔ مکی دور میں مسلمانوں کی زندگی کچھ اس

وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا ﴿٧٤﴾

أُولَٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا ﴿٧٥﴾ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا

اور جو دعا کرتے ہیں کہ: پروردگار! ہمیں اپنی بیویوں اور اولاد[91] کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیز گاروں کا پیشوا[92] بنا۔(۷۴) یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے صبر کا بدلہ (بہشت کے) بالا خانوں[93] کی صورت میں پائیں گے، وہاں دعائے حیات اور سلام کے ساتھ ان کا استقبال ہوگا۔(۷۵) جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے کیا ہی اچھی

طرح گزر رہی تھی کہ اگر باپ مسلمان ہے تو اولاد کافر ہے اور اولاد مسلمان ہے تو والدین کافر ہیں۔ شوہر مسلمان ہے تو بیوی کافر ہے اور بیوی مسلمان ہے تو شوہر کافر ہے۔ یہ صورت حال بھی مسلمانوں کی پریشانیوں میں مزید اضافہ کا باعث بنی ہوئی تھی۔ لہذا اللہ کے بندوں کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی کہ وہ یہ بھی دعا کرتے رہتے ہیں کہ ہمارے ازواج اور ہماری اولاد کو بھی ایمان کی دولت نصیب فرما تا کہ ہمارے اس قلق والم کا تدارک ہو سکے۔

واضح رہے کہ جس طرح ہر عورت کے لئے اس کا خاوند زوج ہے اسی طرح ہر مرد کے لئے اس کی بیوی اس کا زوج ہے اور اولاد دونوں کی ہوتی ہے اس لحاظ سے یہ دعا ہر مسلمان مرد اور عورت سب کے لئے یکساں ہے۔

پھر یہ دعا صرف اس دور کے مسلمانوں سے ہی مخصوص نہیں ہر دور میں اس کی ضرورت برقرار ہے۔ بیوی اور اولاد ایسی چیزیں ہیں جن سے انسان کو فطرتاً محبت ہوتی ہے اور اس کے لئے آزمائش کا سبب بن جاتی ہے لہذا ہر مسلمان کو جس طرح اپنے حق میں دعائے خیر کرنا ضروری ہے ویسے ہی ان کے حق میں بھی ضروری ہے کہ وہ اللہ کے نافرمان اور دین سے بیگانہ رہ کر اس کے لئے پریشانیوں کا سبب نہ بن جائیں۔ بلکہ اللہ کے فرمانبردار اور دین کے خادم بن کر اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک ثابت ہوں۔

[۹۲] ❁ امارت کی مشروط آرزو اور سیاسی لیڈروں کی تاویل:۔ یہ بھی دعا کا اگلا حصہ ہے۔ یعنی ہماری بیویوں اور اولاد کو نیک اور پرہیز گار بنا اور پھر ہمیں ان سے بڑھ کر پرہیز گار بنا کہ ہم خود ان کے امام اور پیش رو ثابت ہوں۔ پھر یہ دعا صرف ازواج و اولاد تک ہی محدود نہیں بلکہ ہمیں اتنا نیک اور پرہیز گار بنا دے کہ ہم دوسرے متقین کے لئے رہبر اور نمونہ بن جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے بندوں کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ نیکی اور پرہیز گاری کے میدان میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی آرزو اور اس کے لیے دعا کرتے ہیں حتیٰ کہ اس مقصد کے لئے اور اس میدان میں امامت یا حکومت تک کے لئے آرزو کرنا یا دعا کرنا صرف جائز ہی نہیں تھا بلکہ ضروری ہے۔ جبکہ حبِ مال یا حبِ جاہ کی غرض سے طلب امارت بے شمار صحیح احادیث کی رو سے ممنوع ہے لیکن موجودہ جمہوری دور کے بعض سیاسی لیڈر اسی آیت سے طلبِ امارت کے جواز پر استدلال کرتے ہیں۔ وہ چاہتے یہ ہیں کہ متقی حضرات تو ان کی رعیت بنیں اور یہ سیاسی لیڈر، جیسے بھی کردار کے وہ مالک ہوں، ان کے حاکم بن جائیں۔ ایسی کج فکری خالصتاً کسی پکے دنیادار کے ذہن کا نتیجہ ہی ہو سکتی ہے۔

[۹۳] بالا خانہ سے مراد یہ نہیں کہ وہ کسی دو منزلہ عمارت کی اوپر کی منزل میں واقع ہوگا۔ بلکہ اس سے مراد بلند درجوں میں

وَّمُقَامًا ﴿٧٦﴾ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴿٧٧﴾

جائے قرار[٩٤] اور قیام گاہ ہے۔(٧٦)

(اے نبی! آپ لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ اگر تم اسے نہیں پکارتے تو میرے پروردگار کو تمہاری کوئی پروا[٩٥] نہیں۔ تم تو (حق کو) جھٹلا چکے اب[٩٦] جلد ہی اس کی ایسی سزا پاؤ گے جس سے جان چھڑانا محال ہو گی۔(٧٧)

واقع رہائش گاہ ہے اور جنت کے اوپر نیچے سو درجے ہیں۔ یعنی اللہ کے بندوں میں مذکورہ بالا صفات جس حد تک پائی جائیں گی اسی کے مطابق ان کو بلندی درجات اور ان میں سکونت نصیب ہو گی۔ پھر ایسے اللہ کے بندوں کے استقبال کے لئے فرشتے موجود ہوں گے جو انہیں سلام بھی کہیں گے اور سلامتی کی دعائیں بھی دیں گے۔ جنت میں رہائش پذیر ہو جانے کے بعد ان کی باہمی ملاقاتوں میں یہ ہی کلمات سلام ودعا ان کی تکریم اور عزت افزائی کے لئے استعمال ہوں گے۔

[٩٤] جنت کے بہترین رہائش گاہ ہونے کا اندازہ سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے ہوتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جنت میں ایک کوڑا رکھنے کے برابر جگہ ساری دنیا اور مافیہا سے بہتر ہے" (بخاری۔ کتاب بدء الخلق۔ باب فی صفة الجنة)

[٩٥] ۞ اللہ کی بے نیازی:۔ یعنی اگر تم اللہ کو پکارو گے اس کی عبادت کرو گے اس کے حضور توبہ استغفار کرو گے اس سے اپنی حاجتیں طلب کرو گے تو اس میں تمہارا اپنا ہی بھلا ہے۔ اور اگر تم ان باتوں میں بے نیازی کا مظاہرہ کرو گے تو اللہ کی کوئی ضرورت تمہاری پکار اور دعا یا عبادت نہ کرنے کی وجہ سے اٹکی ہوئی نہیں ہے۔ اس آیت کی تفسیر کے لئے درج ذیل حدیث قدسی ملاحظہ فرمایئے۔

"سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اے میرے بندو! تم نہ میرا کچھ نقصان کر سکتے ہو اور نہ مجھے کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہو۔ اگر تمہارے اگلے اور پچھلے اور آدمی اور جن سب ایسے ہو جائیں جیسے تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار شخص ہے تو اس سے میری سلطنت میں کچھ افزائش نہ ہو گی۔ اور اگر تمہارے اگلے پچھلے اور آدمی اور جن سب ایسے ہو جائیں جیسے تم میں کوئی سب سے زیادہ بدکردار ہے تو بھی میری سلطنت میں کچھ کمی واقع نہ ہو گی۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے اور آدمی اور جن سب ایک میدان میں جمع ہو کر مجھ سے مانگنا شروع کر دیں اور میں ہر ایک کو وہی کچھ دیتا جاؤں جو کچھ اس نے مانگا ہے تو جو کچھ میرے پاس ہے اس میں سے کچھ بھی کم نہ ہو گا۔ مگر اتنا جیسے سمندر میں سوئی کو ڈبو کر نکال لیا جاتا ہے۔ اے میرے بندو! یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جنہیں میں تمہارے لئے شمار کرتا رہتا ہوں۔ پھر تمہیں ان کا پورا پورا بدلہ دوں گا۔ سو جس کو اچھا بدلہ ملا اسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے اور اس کی حمد وثنا بیان کرنا چاہئے اور جسے برا بدلہ ملے تو اسے اپنے آپ ہی کو ملامت کرنا چاہئے" (مسلم۔ کتاب البر والصلة۔ باب تحریم الظلم)

[٩٦] ۞ کیا اچھے اور برے اعمال کے نتائج لابدی ہیں:۔ اس آیت کے مخاطب قریش مکہ ہیں۔ جنہوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی جھٹلایا اور اس کی آیات کو بھی۔ اس تکذیب کا انجام ان کے گلے کا ہار بن گیا۔ ان پر اللہ کی گرفت کا آغاز غزوہ بدر سے ہوا اور اس گرفت میں دم بدم اضافہ ہی ہوتا گیا حتیٰ کہ جب مکہ فتح ہوا تو انہیں اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ اور جزیرہ

عرب سے کفروشرک یا کافروں اور مشرکوں کا نام و نشان تک مٹ گیا اور ان میں سے وہی زندہ رہے جنہوں نے اسلام کی آغوش میں پناہ لے لی۔

اس آیت سے ایک گمراہ فرقہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نیکی اور بدی کے لئے جزاوسزا کے جو قانون مقرر کر رکھے ہیں۔ وہ لابدی ہیں اور ان میں کسی طرح کا تخلف نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلہ میں ان کی گمراہی یہ نہیں کہ انہوں نے اس آیت سے غلط نتیجہ نکالا ہے بلکہ گمراہی یہ ہے کہ انہوں نے صرف اس آیت یا اس جیسی ہی دوسری آیات کو مدنظر رکھا ہے اور وہ آیات جن میں اللہ کی مغفرت اور رحمت کا ذکر ہے ان کو پس انداز کر دیا ہے۔ اللہ کے عدل کا تقاضا صرف یہ ہے کہ کسی ظالم کو اس کے جرم سے زیادہ سزا نہ دے اور کسی محسن کو اس کی نیکی کے برابر جزا ضرور دے۔ اس سے کم نہ دے۔ اور اللہ کا غفور اور رحیم ہونا عدل کے منافی نہیں بلکہ اس سے بلند تر صفت ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ محسن کو اس کی نیکی کے تناسب سے بہت زیادہ بدلہ دے دے یا کسی ظالم کو کسی مصلحت کی بنا پر معاف کر دے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مرضی پر منحصر ہے۔

۲۲۷ آیاتھا سُورَۃُ الشُّعَرَاءِ مَکِّیَّۃٌ رکوعھا ۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰسٓمٓ ① تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ② لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ③
اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ④ وَمَا يَاْتِيْهِمْ

آیت ۲۲۷ (۲۶) سورہ الشعراء مکی ہے (۴۷) رکوع ۱۱

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

ط۔ س۔ م (۱) یہ وضاحت کرنے والی کتاب [۱] کی آیات ہیں (۲) (اے نبی!) اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو اس غم میں شاید آپ اپنے آپ کو ہلاک ہی کر [۲] ڈالیں گے (۳) اگر ہم چاہتے تو ان پر آسمان سے کوئی معجزہ اتار دیتے جس کے آگے ان کی گردنیں جھک جاتیں [۳]۔ (۴) ان کے پاس رحمٰن کی طرف سے جو بھی

[۱] کتاب سے مراد یہی خاص سورہ شعراء بھی ہو سکتی ہے اور پورا قرآن بھی۔ کیونکہ قرآن کی ہر سورہ اپنی ذات میں جامع ہے، مکمل ہے اور مستقل کتاب ہے۔ جیسا کہ پہلے اس کی وضاحت کی جا چکی ہے اور مبین سے مراد یہ ہے کہ یہ کتاب اپنا مدعا صاف صاف بیان کر رہی ہے اس میں کچھ ابہام نہیں جس کی کسی کو سمجھ نہ آ سکے۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ان آیات سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ کتاب کی آیات ہیں۔ کسی انسان سے یہ ممکن نہیں کہ وہ ایسی آیات پیش کر سکے۔

[۲] ❁ کفار کے ایمان نہ لانے پر آپ کی پریشانی کی وجوہ:۔ آپ کی یہ انتہائی آرزو تھی کہ کفار مکہ ایمان لے آئیں اور جب وہ ایمان لانے کے بجائے معاندانہ روش اختیار کرتے تو آپ کو اتنا ہی شدید صدمہ ہوتا تھا۔ اس کی وجوہ کئی تھیں۔ ایک یہ کہ آپ خلقِ خدا کے لئے نہایت ہمدردانہ اور مشفقانہ جذبات رکھتے تھے۔ آپ جانتے تھے کہ یہ لوگ میری مخالفت کرکے جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں۔ لہذا آپ کو ان کی اس مخالفت سے شدید دکھ ہوتا تھا۔ دوسری وجہ فطری تھی۔ انسان جس کام میں اپنی تمام تر کوششیں صرف کر رہا ہو اگر اس کا کوئی مثبت نتیجہ نظر نہ آ رہا ہو تو وہ مایوس ہو جاتا ہے اور اسے سخت صدمہ پہنچتا ہے۔ تیسری وجہ یہ تھی جس میں دوسرے مسلمان بھی شامل تھے کہ اگر یہ لوگ اسلام قبول کر لیتے تو اسلام کو خاصی تقویت پہنچ سکتی تھی۔ بصورت دیگر مسلمانوں کی ایذاؤں اور مشکلات میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر آپ کفار کے انکار پر شدید افسردہ اور غمگین رہتے تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ آپ ان لوگوں کے ایمان نہ لانے پر اپنے آپ کو ہلکان نہ کریں۔ انہیں راہِ راست پر لانا آپ کے ذمہ نہیں اور جو کام آپ کے ذمہ ہے وہ آپ کر ہی رہے ہیں۔ آپ انہیں ان کے حال پر چھوڑیئے ان سے نمٹنا میرا کام ہے۔ آپ بس اپنا کام کرتے جایئے۔

[۳] ❁ جبری ایمان اللہ کو مطلوب نہیں:۔ اگر ان کا ایمان لانا ہی مطلوب و مقصود ہوتا تو یہ کام یوں بھی ہو سکتا تھا کہ ہم کوئی ایسا معجزہ نازل کر دیتے جس کی بنا پر یہ ایمان لانے پر مجبور ہو جاتے۔ مگر یہ بات ہماری مشیئت کے خلاف ہے۔ ایسا جبری ایمان

مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ⑤ فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰۗؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ⑥ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ⑦ اِنَّ فِيْ

کوئی نئی نصیحت آتی ہے تو اس سے یہ منہ موڑ[۴] لیتے ہیں (۵) یہ لوگ تکذیب تو کر ہی چکے ہیں تو اب جلد ہی انہیں ان باتوں کی حقیقی خبریں[۵] مل جائیں گے جن کا یہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ (۶) کیا انہوں نے زمین کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس میں کتنی کثیر مقدار میں ہر طرح کی عمدہ نباتات پیدا کی ہے۔ (۷) یقیناً اس میں ایک نشانی[۶]

لانے کا نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ ہمیں مطلوب ہے۔ مطلوب تو یہ ہے کہ انہیں راہ ہدایت سمجھا دینے کے بعد کون شخص اپنی عقل و تمیز کو کام میں لا کر اور اپنے ارادہ واختیار سے ایمان لاتا ہے۔ اور یہی چیز انسان کی پیدائش کا مقصود اصلی ہے ورنہ اللہ انسان کو بھی دوسری مخلوق کی طرح پیدا کر سکتا تھا جو اللہ کے سامنے ہر حال میں سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہے۔

[۴] ان لوگوں کو راہِ راست سمجھانے کا طریقہ یہی ہے کہ ان کی توجہ اللہ تعالیٰ کی آیات تکوینیہ (وہ نشانیاں جو کائنات میں ہر سو بکھری ہوئی ہیں) اور آیاتِ تنزیلیہ (وحی کی صورت میں نازل ہونے والی آیات یا وہ آیات جن میں معاندین حق پر عذاب نازل ہونے کا ذکر ہے) کی طرف دلائی جائے۔ مگر یہ کچھ ایسے بدبخت واقع ہوئے ہیں کہ اللہ کی طرف سے جو بھی آیات یا معجزہ وغیرہ نازل ہوتا ہے تو بجائے اس کے یہ اس میں کچھ غور و فکر کریں اور توجہ دیں یہ الٹا اس سے منہ موڑ جاتے ہیں اور اللہ کی آیات کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں۔

[۵] یہ لوگ تو بار بار سمجھانے کے باوجود اپنی ضد، ہٹ دھرمی اور مخالفت پر اڑے بیٹھے ہیں۔ ان لوگوں کا علاج یہ نہیں کہ کوئی معجزہ ان پر نازل کیا جائے کہ وہ ایمان لانے پر مجبور ہو جائیں۔ بلکہ اب ان کا علاج صرف یہ باقی رہ گیا ہے کہ انہیں جوتوں سے سیدھا کیا جائے۔ اور عنقریب انہیں ایسی بھی خبریں ملتی رہیں گی جن سے ان کو واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ جن باتوں کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہی باتیں برحق اور درست تھیں۔ اس کی ایک شکل تو یہ تھی کہ ان کی تمام تر معاندانہ کوششوں کے باوجود اسلام کو غلبہ نصیب ہوتا چلا گیا اور یہ ہر ہر میدان میں مات کھاتے رہے اور ان کے لواحقین ایسی خبریں سنتے اور غم کے گھونٹ پیتے رہے اور پیتے رہیں گے اور دوسری صورت کی آخری منزل ان کی موت ہے۔ دنیا میں ہی جب یہ لوگ موت کی سرحد پر آن کھڑے ہوں گے تو ان پر ساری حقیقتیں منکشف ہوتی چلی جائیں گی۔ لہٰذا آپ ان کے غم میں ہلکان ہونا چھوڑ دیجیے۔

[۶] ❁ نباتات میں اللہ کی نشانیاں:۔ اگر کسی معجزہ ہی کی بات ہے تو یہ کیا کم معجزہ ہے کہ ایک ہی زمین میں، ایک ہی جیسا آسمان سے پانی برستا ہے۔ ایک ہی سورج سے نباتات کی نشوونما ہوتی ہے۔ لیکن نباتات ساری ایک جیسی نہیں ہوتی۔ ہزارہا قسم کی نباتات ہوتی ہے۔ کہیں رنگ برنگ کے پھول کھل رہے ہیں، کہیں لہلہاتی کھیتیاں ہیں۔ ان کی خوشبوؤں سے زمین مہک اٹھتی ہے۔ پھر اس نباتات اور وہاں کے باشندوں کی ضروریات میں ایک خاص مناسبت ہے۔ نباتات کی بے شمار انواع و اقسام کے باوجود یہ بھی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین کے تحت ہی اگتی، بڑھتی اور پھلتی پھولتی ہیں اور اس میں ایک خاص نظم و ضبط پایا جاتا ہے۔ غرضیکہ نباتات میں غور و فکر کا اتنا وسیع میدان موجود ہے کہ یہ علم کی ایک شاخ بن چکا ہے۔ اور غور و فکر کرنے والوں کے لیے قدرت کے نئے سے نئے عجائبات پیش کرتا رہتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص ان عجائبات کی طرف توجہ ہی نہ کرے تو اسے اللہ کی کوئی نشانی نظر بھی کیسے آسکتی ہے؟

ع ۵
ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۚ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۹﴾ وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ
مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰﴾ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۭ اَلَا يَتَّقُوْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ
يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۱۲﴾ وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ

ہے لیکن ان میں اکثر ایمان لانے والے نہیں (۸) بلاشبہ آپ کا پروردگار ہر چیز پر غالب [۷] ہے اور رحم کرنے والا ہے (۹) اور (وہ واقعہ یاد کرو) جب تمہارے [۸] پروردگار نے موسیٰ کو پکارا کہ : ظالم قوم کے پاس جاؤ (۱۰) یعنی فرعون [۹] کی قوم کے پاس کیا وہ ڈرتے نہیں ؟ (۱۱) موسیٰ نے عرض کیا: میرے پروردگار! میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلا دیں گے۔ (۱۲) میرا سینہ گھٹتا (دم رکتا) ہے اور زبان (بھی) نہیں چلتی۔ لہٰذا ہارون کو (بھی) رسالت عطا فرما (۱۳) اور میرے ذمہ ان کا ایک جرم (بھی) ہے میں ڈرتا ہوں کہ مجھے مار ہی [۱۰] نہ ڈالیں۔ (۱۴)

[۷] یعنی اللہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ ایسے ضدی اور معاند لوگوں کو فوراً صفحہ ہستی سے مٹا دے۔ مگر چونکہ وہ رحیم بھی ہے لہٰذا وہ انہیں فوراً تباہ نہیں کر دیتا بلکہ سمجھنے، سوچنے اور سنبھلنے کے لئے مہلت دیئے جاتا ہے۔

[۸] آپ ﷺ کی اور موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے پس منظر کا تقابل:۔ آیاتِ تکوینیہ کی طرف توجہ دلانے کے بعد آگے آیات تنزیلیہ کا آغاز ہو رہا ہے۔ اور اس سلسلہ میں اس سورت میں سات اقوام کا ذکر کیا گیا ہے۔ جنہوں نے اپنے رسول کی دعوت قبول کرنے کے بجائے سرکشی کی راہ اختیار کی تو ان پر عذابِ الٰہی نازل ہوا اور صفحہ ہستی سے ان اقوام کا نام و نشان مٹا دیا گیا۔ اور ان آیات کا آغاز سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ذکر سے کیا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو آغاز رسالت میں جن حالات سے سابقہ پیش آیا تھا وہ ان حالات سے سنگین تر تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئے تھے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس خاندان کے فرد تھے جو کعبہ کی تولیت کی وجہ سے عرب بھر میں معزز و محترم شمار ہوتا تھا جبکہ موسیٰ علیہ السلام اس قوم کے فرد تھے جو فرعون کی غلام تھی۔ دوسرے یہ کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف مبعوث کیا گیا۔ جس کے ہاں آپ نے پرورش پائی تھی۔ پھر آپ نے نادانستہ طور پر آلِ فرعون کے ایک آدمی کو بھی مار ڈالا تھا اور فرعونی حکومت کی طرف سے اس قتل کی سزا کے ڈر سے آپ وہاں سے ترکِ وطن پر مجبور ہوئے تھے گویا آپ فرعون کے ممنونِ احسان بھی تھے پھر اس کے مفرور مجرم بھی تھے۔ تیسرے یہ کہ فرعون ایک عظیم الشان سلطنت کا فرمانروا، ظالم و جابر اور اپنی خدائی کا دعویٰ رکھنے والا حکمران تھا۔ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن لوگوں کی طرف مبعوث ہوئے وہ یا تو آپ کے ہمسر تھے یا معاشرتی لحاظ سے کم تر درجہ رکھتے تھے۔ گویا موسیٰ علیہ السلام کے حالات سے آغاز میں دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دی جا رہی ہے کہ بعض سابقہ انبیاء کو آپ سے بھی زیادہ سنگین حالات میں دعوتِ دین کا فریضہ سرانجام دینا پڑا تھا۔ لہٰذا آپ کو ان کفار مکہ کی معاندانہ روش سے اتنا زیادہ افسردہ اور غمگین نہیں رہنا چاہیے۔

[۹] بنی اسرائیل پر فرعون اور اس کی حکومت نے جو مظالم ڈھا رکھے تھے ان کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس قوم کا تعارف ہی ظالم قوم سے کرایا اور جب وہ ایسے مظالم ڈھاتے تھے تو انہیں کبھی بھولے سے بھی یہ خیال نہیں آتا تھا کہ ان کے اوپر بھی کوئی ایسی ہستی موجود ہے جو ان سے ان کے مظالم کا بدلہ لینے کی قدرت رکھتی ہے۔ وہ اپنی طاقت اور حکومت کے نشہ میں اللہ کی گرفت سے بالکل بے خوف ہو چکے تھے۔

[۱۰] اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو مدین سے واپسی پر نبوت عطا فرمائی تو ساتھ ہی حکم دیا کہ تمہیں فرعون اور قوم فرعون

يَقْتُلُوْنِ ﴿١٤﴾ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿١٥﴾ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦﴾ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿١٧﴾ قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایسا ہرگز نہیں ہوگا تم دونوں ہماری نشانیاں لے کر جاؤ، ہم بھی تمہارے ساتھ [11] ہیں، سب کچھ سن رہے ہیں (۱۵) فرعون کے پاس جاکر اسے کہو کہ: "ہم رب العالمین کے رسول ہیں۔(۱۶) (اور اس لئے آئے ہیں کہ) تو بنی اسرائیل کو (آزاد کرکے) ہمارے ساتھ روانہ [12] کردے" (۱۷) فرعون کہنے لگا: "کیا ہم نے تمہیں اپنے ہاں بچپن میں پالا نہ تھا؟ اور تو نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے ہاں نہیں گزارے؟ (۱۸)

کے پاس جو اپنے ظلم کی وجہ سے مشہور ہو چکی ہے جاکر دعوت کا فریضہ سرانجام دینا ہے۔ تو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو سابقہ زندگی کے کئی واقعات آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ اور کئی قسم کے خطرات سامنے آنے لگے۔ جن میں سرِفہرست یہ تھا کہ وہ میری دعوت الی الحق کو کیا اہمیت دے گا جبکہ میں اس قوم کا ایک فرد ہوں جسے اس نے اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ اور خوب دبا کر رکھتا ہے۔ پھر میں اس کا پروردہ بھی ہوں۔ علاوہ ازیں میں ان کا مجرم بھی ہوں۔ ان سب باتوں کو ذہن میں رکھ کر جب اسے اللہ کا پیغام سنانے کا تصور کیا تو سینہ میں گھٹن سی محسوس ہوئی۔ چنانچہ اللہ کے حضور یہ خطرات بیان بھی کردیئے۔ مگر انکار کی مجال نہ تھی۔ اور یہی اولوالعزم انبیاء کی شان ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے ایسے فرمانبردار بندے ہوتے ہیں کہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر بھی اللہ کا پیغام پہنچانے سے دریغ نہیں کرتے۔ البتہ اتنی گزارش ضرور کی کہ میرے بھائی ہارون کو بھی نبوت عطا فرما کر میرے ہمراہ کردیجئے۔ جو اس کام میں میرا معاون و مددگار ہو اور ہم کم از کم ایک کے بجائے دو تو ہو جائیں جو ایک دوسرے کے غمگسار اور ہمدرد ہوں۔ علاوہ ازیں میری زبان بھی روانی سے نہیں چلتی جبکہ میرا بھائی ہارون فصیح اللسان ہے۔

[11] ❁ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی اللہ سے گزارشات اور ان کی قبولیت:۔ موسیٰ علیہ السلام کی اس التجا اور ان خطرات کے جواب میں فرمایا: کہ (۱) تمہاری التجا منظور ہے، میں ہارون کو نبوت عطا کردیتا ہوں اور وہ تمہارے ساتھ رہے گا اور اس کام میں تمہارا مددگار ہوگا، (۲) تمہیں جو اس بات کا خطرہ ہے کہ وہ مجھے مار ہی نہ ڈالیں تو اس بات کو دل سے نکال دو۔ وہ لوگ تمہارا بال بھی بیکا نہ کرسکیں گے۔ اور اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ تمہیں دو ایسے معجزات دے کر بھیجا جارہا ہے جو اس بات کا یقینی ثبوت پیش کرتے ہیں کہ تم فی الواقع اللہ کے رسول ہو اور دوسری وجہ یہ ہے کہ تم دونوں کے ساتھ تیسرا میں بھی ہوں۔ میں تمہاری سب باتیں سنتا ہوں اور تمہاری پوری پوری نگہداشت بھی کروں گا۔

❁ اللہ کی معیت کی مثال اور معتزلہ اور جہمیہ کا رد:۔ اس آیت اور اس جیسی بعض دوسری آیات سے جہمیہ نے استدلال کیا کہ اللہ کی ذات ہر جگہ موجود ہے اور جن آیات میں اللہ کے مستوی علی العرش ہونے کا ذکر تھا ان آیات کی تاویل کرڈالی۔ حالانکہ جن آیات میں اللہ کی معیت یا اس کے قریب ہونے کا ذکر ہے تو ایسی معیت یا قربت ذات کے لحاظ سے نہیں بلکہ صفات کے لحاظ سے ہے۔ اس کی ایک معمولی سی مثال یوں سمجھئے کہ سورج اور چاند اللہ کی بے جان اور ادنیٰ سی مخلوق ہے۔ جو مسافر کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ چلنے والا جہاں تک چلے وہ ساتھ ساتھ ہی رہتے ہیں۔ حالانکہ وہ آسمان پر ہیں اور انسان لاکھوں اور کروڑوں میل دور ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ مستوی علی العرش ہونے کے باوجود اپنے علم، اپنی قدرت اور مدد کے لحاظ سے ہر انسان سے بالکل نزدیک ہے اور اس کی صحیح کیفیت تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

[12] اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ منظور کرلینے کے بعد اور فرعون کی دست درازیوں سے حفاظت کی یقین دہانی

سِنِیْنَ ﴿۱۸﴾ وَ فَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِیْ فَعَلْتَ وَ اَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۹﴾ قَالَ فَعَلْتُهَاۤ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ ﴿۲۰﴾
فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِیْ رَبِّیْ حُكْمًا وَّ جَعَلَنِیْ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۲۱﴾ وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا

نیز تو نے وہ کام کیا جو کر کے چلا گیا اور تو تو ہے ہی ناشکرا [۱۳] (۱۹) موسیٰ نے کہا: "وہ کام تو اس وقت مجھ سے بھول چوک سے ہو گیا تھا (۲۰) لہٰذا میں تمہارے خوف [۱۴] سے بھاگ گیا۔ پھر مجھے میرے پروردگار نے حکمت عطا فرمائی اور مجھے رسول بنایا۔ (۲۱) اور جو احسان تو مجھے جتلا رہا ہے (اس کی وجہ تو یہی تھی) کہ

کے بعد ان دونوں کو حکم دیا کہ فرعون کے پاس جائیں اور اسے بتائیں کہ ہم رب العالمین کے رسول یا فرستادہ ہیں اگر وہ جھٹلائے تو پھر دو معجزات نشانی کے طور پر اسے دکھائیں اور ساتھ ہی اس سے یہ مطالبہ کر دیں کہ ہماری قوم بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے آزاد کر کے ہمارے ہمراہ روانہ کر دے۔ چنانچہ ان دونوں پیغمبروں نے اللہ کے اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ فرعون کے دربار تک پہنچے اور اسے جوں کا توں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا۔

[۱۳] ۞ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا مکالمہ:۔ فرعون نے اللہ کا پیغام سننے کے بعد اس پیغام کا کچھ جواب دینے کے بجائے وہی کچھ کہنا شروع کر دیا جس کا موسیٰ علیہ السلام کو پہلے سے خطرہ تھا۔ اس نے کہا کہ بچپن میں تمہاری پرورش ہم نے ہی کی تھی۔ تمہاری جوانی ہمارے درمیان گزری ہے۔ ہم تو تمہاری رگ رگ سے واقف ہیں۔ پھر تم ہمارے مجرم بھی ہو۔ اب تم نے یہ پیغمبری کا ڈھونگ رچا ڈالا ہے اور ہم پر دباؤ ڈالنے آ گئے ہو۔ تمہیں تو ہمارا ممنون احسان ہونا چاہئے تھا تم اٹھ کر رسالت کا دعویٰ کر کے اب ہمیں آنکھیں دکھانے لگے ہو تم جیسا بھی کوئی احسان فراموش شخص ہو سکتا ہے؟

﴿ انت من الکافرین ﴾ کا ترجمہ بعضوں نے یوں کیا ہے کہ آج جن لوگوں کو تم کافر کہہ رہے ہو اس پیغمبری کے دعویٰ سے پہلے تو تم خود بھی انہیں جیسے کافر تھے۔ (نعوذ باللہ) فرعون کی اس گفتگو سے ضمناً یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ یہ فرعون وہ فرعون نہیں تھا جس نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی تربیت کی تھی۔ بلکہ یہ اس کا بیٹا تھا ورنہ وہ ہم نے پرورش کرنے کی بجائے "میں نے پرورش کی تھی" کہتا۔ اور یہ تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

[۱۴] ۞ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا قتل خطأ کا اعتراف:۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی دونوں باتوں میں سے دوسری کو زیادہ اہم سمجھ کر اس کا جواب دیا اور کہا کہ میں قبطی کے قتل کا مجرم ضرور ہوں۔ لیکن میں نے یہ قتل عمداً نہیں کیا تھا۔ بلکہ نادانستہ طور پر قتل خطا واقع ہو گیا تھا۔ میرا قتل کا ارادہ ہرگز نہ تھا۔ نہ میں نے کوئی ایسا آلہ استعمال کیا تھا جو قتل کے لئے استعمال ہو سکتا ہے میری خطا صرف اتنی ہے کہ میری سبطی قوم کے ایک آدمی پر تیری قبطی قوم کا ایک آدمی زیادتی کر رہا تھا اس نے میرے سامنے فریاد کی میں نے جب دیکھا کہ زیادتی قبطی کی ہے اور سبطی مظلوم ہے تو میں نے اس مظلوم کی حمایت کرتے ہوئے قبطی کو مکہ مارا۔ اب یہ اتفاق کی بات ہے کہ وہ مر گیا۔ میں نے کسی برے ارادے سے ہرگز یہ کام نہیں کیا تھا۔ ہاں جب معلوم ہو گیا کہ مجھے سزا دینے کی تجویزیں ہو رہی ہیں تو میں نے راہِ فرار میں ہی اپنی عافیت سمجھی تھی۔ گویا اس واقعہ میں جتنا موسیٰ علیہ السلام کا قصور تھا اس کا انہوں نے فرعون کے سامنے برملا اعتراف کر لیا۔

رہی یہ بات کہ اب میں پیغمبری کا دعویٰ کر رہا ہوں۔ جب کہ پہلے کبھی میں نے ایسی بات نہیں کہی تھی تو اس کا جواب یہ

عَلَيَّ أَنْ عَبَّدتَّ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ﴿٢٢﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِينَ ﴿٢٣﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ
وَمَا بَيْنَهُمَآ إِن كُنتُم مُّوقِنِينَ ﴿٢٤﴾ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهُۥٓ أَلَا تَسْتَمِعُونَ ﴿٢٥﴾ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَآئِكُمُ

تو نے بنی اسرائیل کو غلام[١٥] بنا رکھا تھا۔(٢٢) فرعون کہنے لگا: "یہ رب العالمین[١٦] کیا ہوتا ہے؟(٢٣) موسیٰ نے کہا: "وہ جو آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا مالک[١٧] ہے، اگر تمہیں کچھ یقین آجائے"(٢٤) فرعون نے اپنے آس پاس والوں سے کہا: "کچھ سن[١٨] رہے ہو؟ (جو یہ کہتا ہے)(٢٥) موسیٰ نے کہا: "ہاں وہی تمہارا اور

ہے۔ کہ جب میں یہاں سے بھاگ کر گیا تھا تو اس کے مدتوں بعد مجھے اللہ تعالیٰ نے نبوت بھی عطا فرمائی اور حکمت بھی۔ اور ساتھ ہی مجھے تمہارے پاس پہنچ کر اپنا پیغام تجھے پہنچانے کا حکم دیا ہے۔

[١٥] اور تمہاری پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ میری تمہارے ہاں پرورش پانے کا سبب تو یہی چیز بنی تھی کہ تم لوگ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو زندہ نہیں رہنے دیتے تھے۔ اور انہیں ذبح کر ڈالتے تھے اگر ایسی بات نہ ہوتی تو میری ماں کیوں مجھے تابوت میں بند کر کے سمندر میں ڈالتی۔ پھر وہی تابوت اللہ کی قدرت سے تمہارے پاس پہنچ گیا۔ اگر تم نے بنی اسرائیل پر ایسے مظالم نہ ڈھائے ہوتے تو کیا میرے والدین میری پرورش نہ کر سکتے تھے؟ میری پرورش کے احسان کی آڑ میں اپنے سال ہا سال کے مظالم کو چھپانا چاہتے ہو؟ بنی اسرائیل کو انہیں مظالم اور تمہاری غلامی سے نجات دلانے کے لئے تو اللہ رب العالمین نے مجھے پیغمبر بنا کر تمہارے ہاں بھیجا ہے۔

[١٦] فرعون نے پوری مملکت کے وسائل معاش اپنے قبضہ میں کر رکھے تھے۔ اسی لحاظ سے وہ اپنے آپ کو اپنی رعیت کا پروردگار یا رب سمجھے بیٹھا تھا اور اپنے اعلیٰ رب ہونے کا دعویٰ بھی کرتا تھا۔ اس نے ملک بھر میں اپنے مجسمے نصب کروا رکھے تھے۔ جن کی پوجا کی جاتی تھی اس نے اپنی رعیت کے ذہنوں میں یہ بات راسخ کر دی تھی کہ ان کا پرورش کنندہ میں ہی ہوں۔ لہذا موسیٰ علیہ السلام نے یوں فرمایا کہ ہم "رب العالمین" کے رسول ہیں تو وہ فوراً چونک اٹھا اور ازراہ حقارت کہنے لگا کہ یہ رب العالمین کیا ہوتا ہے۔ اپنی رعیت کا رب تو میں خود ہوں۔ یہ کون سے رب العالمین کی بات کرتے ہو؟

[١٧] موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ رب العالمین وہ ہے جو اس پوری کائنات کا خالق و مالک ہے۔ اگر تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ اس کائنات کو وجود میں لانے والی کوئی ہستی موجود ہے تو سمجھ لو کہ میں اس ہستی کی طرف سے تیرے پاس رسول بن کر آیا ہوں اور تمہیں اسی کا پیغام پہنچا رہا ہوں۔

[١٨] فرعون اب اپنے درباریوں اور امیروں، وزیروں سے متوجہ ہو کر کہنے لگا: سن رہے ہو جو یہ شخص کہہ رہا ہے۔ یہ کہہ رہا ہے کہ تمام بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے رہا کر کے میرے ہمراہ کر دو۔ تاکہ یہ ہمارے مقابلہ پر اتر آئے۔ پھر ساتھ ہی یہ بھی کہے جاتا ہے کہ میں رب العالمین کا فرستادہ ہوں"

فرعون کے اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی خدائی اور فرعونیت کے باوجود موسیٰ علیہ السلام سے کچھ خطرہ محسوس کرنے لگا تھا اور اپنے درباریوں کو ان کے خلاف بھڑکانا چاہتا تھا۔

الْاَوَّلِیْنَ ﴿۲۶﴾ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْٓ اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَیْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالَ لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَیْرِیْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ ﴿۲۹﴾

تمہارے آباء واجداد[19] کا پروردگار ہے"(۲۶) فرعون کہنے لگا: "یہ رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے یہ تو دیوانہ[20] ہے؟(۲۷) موسیٰ نے کہا: "وہی مشرق اور مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا پروردگار[21] ہے۔ اگر تمہیں کچھ سمجھ آسکے۔(۲۸)

فرعون بولا: "دیکھو! اگر تم نے میرے سوا کوئی اور الٰہ مانا تو میں تجھے قید[22] میں ڈال دوں گا(۲۹)

[۱۹] درباریوں کے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی موسیٰ علیہ السلام نے بھرے دربار میں پھر فرعون کو مخاطب ہو کر کہا: تم یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ ملک بھر کے وسائل معاش کو اپنے قبضہ میں کر لینے کے بعد تم ہی اپنی رعایا کے پروردگار بن گئے ہو۔ میں اس پروردگار کی بات کر رہا ہوں جس کا تمام تر وسائل پر براہِ راست کنٹرول ہے۔ اگر وہ ایک سال یا چند سال بارش ہی نہ برسائے تو تم رعیت تو درکنار اپنی خوراک تک کے لئے ترس جاؤ گے۔ رب العالمین وہ ہے جو خود تمہیں اور تمہارے سب آباء واجداد کو رزق دیتا رہا ہے اور وہی تمہارا حقیقی پروردگار ہے۔ میں اس رب العالمین کا رسول ہوں۔

[۲۰] فرعون پھر موسیٰ علیہ السلام کے بجائے درباریوں کی طرف ہی متوجہ ہو کر کہنے لگا۔ اس شخص کی حقیقت دیکھو اور اس کا مطالبہ دیکھو۔ اگر یہ رسول ہے بھی تب بھی اس کے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں رہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں ہو رہا کہ وہ کس ہستی سے مخاطب ہے اور کیا مطالبہ کر رہا ہے؟

[۲۱] موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو جب یوں بوکھلایا ہوا دیکھا تو پھر سے اپنے دعویٰ پر زور دیتے ہوئے اور رب العالمین کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ روئے زمین پر جتنی بھی مخلوق آباد ہے۔ خواہ اس کا تعلق اس ملک مصر سے ہو یا مشرق سے ہو یا مغرب سے ہو یا کہیں سے بھی ہو ساری مخلوق کا پروردگار وہی رب العالمین ہے اب امید ہے تم لوگوں کو سمجھ آ ہی گئی ہو گی کہ رب العالمین کون ہے؟ اور میں کون ہوں؟ تم تو صرف زمین کے ایک چپہ بھر ملک کے فرمانروا ہو اور میں اس رب العالمین کا رسول ہوں جس کی فرمانروائی اس پوری زمین پر ہی نہیں پوری کائنات پر ہے۔ لہٰذا تمہارے حق میں بہتری اسی بات میں ہے کہ تم فرمانروائے کائنات کے رسول کی بات مان لو۔

[۲۲] ۞ فرعون کے خدائی کے دعویٰ کی نوعیت کیا تھی؟ دنیا میں جتنے بھی مشرکین یا خدائی کے دعوے دار گزرے ہیں وہ سب یہ بات تسلیم کرتے تھے کہ اس کائنات کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ فرعون کا بھی یہی حال تھا وہ خدائی کا دعویدار صرف ان معنوں میں تھا کہ وہ اپنے سیاسی اقتدار میں کسی بالاتر ہستی کی مداخلت کا قائل نہ تھا۔ بالفاظِ دیگر وہ اللہ تعالیٰ کے اس پوری کائنات کے خالق و مالک ہونے کا تو قائل تھا مگر اس کی قانونی یا سیاسی حاکمیت کا قائل نہ تھا۔ اور اپنی مملکت میں اپنے قانون کو ہی بالاتر قانون سمجھتا تھا۔ اور اپنی رعیت کو بھی اسی راستے پر لگائے ہوئے تھا۔ اور موسیٰ علیہ السلام نے اس سے جو مطالبہ کیا تھا وہ براہِ راست اس کے قانونی اور سیاسی اختیارات پر حملہ تھا۔ لہٰذا اس نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی کو حکومت کے باغی قرار دیتے

قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ﴿٣٠﴾ قَالَ فَاْتِ بِهٖٓ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٣١﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿٣٢﴾ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَاۗءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿٣٣﴾ قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿٣٤﴾

موسیٰ نے کہا: ''خواہ میں تیرے پاس [۲۳] واضح چیز (نشانی) بھی لاؤں؟'' (۳۰) فرعون کہنے لگا: ''لاؤ وہ چیز [۲۴]! اگر تم سچے ہو'' (۳۱) چنانچہ موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا تو وہ فوراً ہو بہو ایک اژدھا [۲۵] بن گیا۔ (۳۲) نیز موسیٰ نے اپنا ہاتھ (بغل سے) کھینچا تو وہ یکدم دیکھنے والوں کے سامنے چمک [۲۶] رہا تھا (۳۳) فرعون نے اپنے آس پاس والوں سے کہا: ''یہ تو یقیناً بڑا ماہر جادوگر ہے۔ (۳۴)

ہوئے یہ دھمکی دی کہ اگر تم اپنے مطالبہ سے باز نہ آئے تو میں تمہیں ملکی قانون بغاوت کے جرم میں قید میں ڈال دوں گا۔

[۲۳] اس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ''اگر میں اللہ کی عطا کردہ نشانیاں تمہیں دکھا کر یہ ثابت کر دوں کہ میں فی الواقع اللہ رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں تو کیا پھر بھی تمہارا یہی فیصلہ ہوگا؟

[۲۴] فرعون کی پہلی بحث تو اس امر میں تھی کہ رب تو میں خود ہوں یہ رب العالمین کیا ہوتا ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے بار بار کے تکرار سے اسے یہ بات ذہین نشین کرا دی کہ رب العالمین ہی وہ بالاتر ہستی ہے جو پوری کائنات کی خالق، مالک اور پرورش کنندہ ہے۔ حتیٰ کہ خود تمہارا بھی وہی پروردگار ہے۔ لہذا اسے ہی یہ حق سزاوار ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اس کے ہر حکم کو بجالایا جائے۔ اب بحث اس بات میں رہ گئی تھی کہ آیا موسیٰ علیہ السلام اس بالاتر ہستی کے رسول ہیں بھی یا نہیں؟ اس بحث کا آغاز بھی خود موسیٰ علیہ السلام نے کیا اور کہا کہ اس ہستی نے مجھے اپنے دعویٰ رسالت کی تائید میں کچھ نشانیاں بھی دی ہیں اور میں وہ نشانیاں پیش کر سکتا ہوں۔ جس کے جواب میں فرعون نے کہا ہاں اگر تم اپنے دعویٰ کی صداقت میں کوئی نشانی پیش کر سکتے ہو تو کرو۔

[۲۵] ۞ معجزات سے فرعون اور درباریوں کی اثر پذیری:۔ فرعون نے جب موسیٰ علیہ السلام سے اپنی رسالت کے ثبوت میں نشانی کا مطالبہ کیا تو آپ نے دربار میں ہی اپنا عصا زمین پر پھینک دیا وہ دیکھتے دیکھتے بہت بڑا سانپ یا اژدہا بن کر فرعون کی طرف بڑھا۔ جس سے فرعون سخت دہشت زدہ ہوگیا اور موسیٰ علیہ السلام سے التجا کی کہ اسے سنبھالو۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا اسے ہاتھ میں لینا ہی تھا کہ وہ پھر سے عصا بن گیا۔ عصا سے بننے والے سانپ کے لئے قرآن کریم میں تین لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ ایک مقام پر اسے حیّۃ فرمایا اور حیّۃ کا لفظ سانپ کے لئے اسم جنس ہے جو ہر قسم کے سانپ کے لئے نیز نر و مادہ کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ دوسرے مقام پر جانّ کا لفظ آیا ہے جس کا معنی پتلا، سبک رفتار اور پھرتیلا سانپ ہے اور یہاں ثعبان کا لفظ آیا ہے۔ یہ لفظ بڑے سانپ یا اژدہا کے لئے آتا ہے۔ اب ان کی تطبیق یا تو اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے عصا پھینکا تو وہ پہلے پتلا اور پھرتیلا سا سانپ بنا ہو۔ بعد میں دیکھتے ہی دیکھتے اژدہا بن گیا ہو اور یا اس طرح کہ عصا نے شکل تو اژدہا کی اختیار کر لی ہو مگر اس میں پھرتی پتلے سانپ جیسی ہو۔

[۲۶] یہ پہلا معجزہ ہی فرعون کی یقین دہانی کے لئے کافی تھا۔ ابھی فرعونیوں پر اس معجزہ کے اثرات باقی تھے کہ سیدنا موسیٰ علیہ

يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ

وہ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہارے ملک سے نکال[۲۷] دے۔ اب تم کیا مشورہ[۲۸] دیتے ہو" (۳۵) وہ کہنے لگے: اس کے اور اس کے بھائی کے معاملہ کو التوا میں ڈال دیجئے اور شہروں[۲۹] میں ایسے

السلام نے دوسری نشانی کا آغاز کیا اپنا دایاں ہاتھ اپنی بائیں بغل میں دبایا۔ پھر جب اسے نکالا تو اس سے روشنی کی شعاعیں نکل کر فرعون اور اس کے درباریوں کی نگاہوں کو خیرہ کرنے لگیں۔ فرعون اور سب درباری محوِ حیرت بنے ہوئے ان نشانیوں کا اثر قبول کر رہے تھے۔

[۲۷] ❁ **فرعون کی عیاری:۔** فرعون اگرچہ خود بھی ان نشانیوں سے متاثر ہو چکا تھا تاہم اس نے درباریوں کے ذہن سے یہ اثر زائل کرنے کے لئے یوں کہہ دیا کہ یہ تو بہت بڑا جادوگر معلوم ہوتا ہے۔ اور چاہتا یہ ہے کہ تمہیں اس طرح مرعوب اور دہشت زدہ کر کے تمہیں تمہارے ملک سے نکال دے اور خود اس ملک پر قبضہ جما لے۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ فرعون کی ان دونوں باتوں میں کھلا تضاد ہے پہلی بات تو اس نے درباریوں اور عام لوگوں کو الو بنانے کے لئے کہی تھی کیونکہ جادوگر تو ہر جگہ پائے جاتے ہیں اور ملک مصر میں بڑی تعداد میں موجود تھے۔ مگر کسی جادوگر میں یہ ہمت نہیں ہوئی کہ وہ جادو کے زور سے کوئی ملک تو بڑی چیز ہے کوئی چھوٹی سی بستی ہی فتح کر کے دکھا دے۔ وہ خود ایک مانگت اور سوالی قسم کا انسان ہوتا ہے۔ جو شعبدے دکھانے کے بعد لوگوں سے اس محنت کی اجرت کا مطالبہ کرتا ہے۔ بھلا کسی جادوگر کی یہ ہمت ہو سکتی ہے کہ وہ فرعون جیسے جابر حکمران کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے بات چیت کرے۔ اور دوسری بات فی الواقع حقیقت کے قریب تھی۔ جو فرعون کے منہ سے بے ساختہ نکل گئی تھی۔ اسے فی الواقع یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ شخص واقعی اللہ رب العالمین کا رسول ہے۔ اور اگر میں نے اس کی دعوت کو جھٹلا دیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہو گا کہ موسیٰ غالب آئے گا اور میں مغلوب ہو جاؤں گا مگر یہ بات وہ اپنے درباریوں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

[۲۸] ﴿تامرون﴾ کا ترجمہ یہاں عموماً "کیا حکم دیتے ہو یا کیا حکم کرتے ہو؟" کیا جاتا ہے جو میرے خیال میں درست نہیں۔ بھلا فرعون جیسا خودسر اور اپنے آپ کو رب کہلانے والا فرمانروا سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے سامنے اپنے درباریوں سے ایسا کہہ سکتا تھا امر کا لفظ مشورہ دینے کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ امرته عن امری کا معنی ہو گا۔ میں نے اپنے کام کے متعلق اس سے مشورہ کیا (منتہی الارب نیز مفردات امام راغب) چنانچہ اسی بدحواسی کے عالم میں فرعون نے اپنے درباریوں سے پوچھا کہ اس صورت حال میں اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟"

[۲۹] ❁ **ماہر جادوگروں کی طلبی:۔** درباری حضرات عموماً جی حضور کہنے اور بڑی سرکار کی ہاں میں ہاں ملانے کے عادی ہوتے ہیں۔ اور اسی میں ان کی عافیت ہوتی ہے۔ فوراً کہنے لگے۔ واقعی یہ بہت بڑا جادوگر ہے اور ہمیں جادو کا مقابلہ جادو ہی سے کرنا چاہئے۔ آپ یوں کیجئے کہ جلدی میں کچھ فیصلہ نہ کیجئے۔ بلکہ ملک بھر کے چوٹی کے جادوگروں کو اپنے ہاں بلا لیجئے۔ جو اس کا مقابلہ کر سکیں۔ فرعون اپنے درباریوں سے ایسا ہی جواب سننا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ خود اپنے درباریوں اور اپنی رعایا کو اسی چکر میں ڈالنا اور یہی کچھ ذہن نشین کرانا چاہتا تھا کہ موسیٰ اور اس کا بھائی اللہ کے رسول نہیں بلکہ محض جادوگر ہیں۔ چنانچہ فرعون نے اپنے درباریوں سے مشورہ کے بعد تمام شہروں کے نامور جادوگروں کو اپنے ہاں طلب کر لیا۔

حٰشِرِیْنَ ﴿۳۶﴾ یَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِیْمٍ ﴿۳۷﴾ فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۳۸﴾ وَّقِیْلَ لِلنَّاسِ
هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ﴿۳۹﴾ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِیْنَ ﴿۴۰﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ
قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِیْنَ ﴿۴۱﴾ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ ﴿۴۲﴾

آدمی بھیج دیجئے۔(۳۶) جو ہر سیانے جادوگر کو اکٹھا کر کے آپ کے پاس لے آئیں۔(۳۷) چنانچہ ایک معین دن کے ایک مقررہ وقت پر تمام جادوگروں کو اکٹھا کیا گیا۔(۳۸) اور لوگوں سے پوچھا گیا: "کیا تم بھی اس اجتماع[۳۰] میں شامل ہو گے؟(۳۹) اگر یہ جادوگر غالب رہے تو شاید ہمیں انہیں کی بات[۳۱] ماننی پڑے"(۴۰) پھر جب جادوگر (میدان میں) آگئے تو فرعون سے پوچھنے لگے کہ: "اگر ہم غالب رہے تو ہمیں کچھ صلہ بھی ملے گا؟"(۴۱) فرعون نے جواب دیا: ہاں (صلہ بھی ملے گا) اور تمہیں (ہمارے ہاں) کرسیاں بھی ملیں[۳۲] گی۔(۴۲)

[۳۰] مقابلہ کے لئے جگہ اور وقت کی تعیین:۔ جادوگری کے اس مقابلہ کے لیے سیدنا موسیٰ علیہ السلام فوراً تیار ہو گئے۔ وقت کا تعین ابھی باقی تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے خود ہی یہ تجویز کی کہ یہ مقابلہ بھرے مجمع میں ہونا چاہئے۔ اور اس کے لئے ان کے قومی میلہ یا جشن نوروز کا دن سب سے مناسب تھا۔ جبکہ اردگرد کے لوگ بھی اس قومی میلہ میں شرکت کے لئے دارالخلافہ جیسے بڑے شہر میں ازخود پہنچ جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس مقابلہ کے لئے چاشت کا وقت تجویز ہوا تاکہ اس وقت تک اردگرد کے سب لوگ بھی دارالخلافہ میں پہنچ سکیں۔ اور وقت بھی ایسا مناسب تجویز ہوا جس میں سورج کی روشنی پوری طرح کھل جاتی ہے اور دھوپ میں ابھی گرمی کی شدت بھی نہیں ہوتی۔ جب مقابلہ کے وقت کی تعیین ہو گئی تو فرعون نے اپنے درباریوں سے اس انداز میں سوال کیا جیسے اس کی خوشی اسی بات میں تھی کہ لوگ زیادہ سے زیادہ اس اجتماع میں شریک ہوں۔

[۳۱] فرعون کا غالب فریق کا ساتھ دینے کا اعلان:۔ فرعون نے لوگوں کو اس اجتماع میں شمولیت کی عام دعوت اس امید پر دی تھی کہ چوٹی کے جادوگروں کی اتنی بڑی تعداد جمع ہو گی پھر اعیانِ سلطنت بھی وہاں موجود ہوں گے تو ان کے دبدبہ اور رعب سے بھی موسیٰ مرعوب ہو کر رہ جائے گا۔ اپنی اس توقع کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ کہنے لگا کہ امید قوی یہی ہے کہ ہمارے جادوگر غالب آئیں گے۔ اس صورت میں ہمیں اپنے جادوگروں ہی کا ساتھ دینا ہو گا تاکہ موسیٰ کی شکست اور مغلوبیت پوری طرح سب لوگوں پر کھل کر واضح ہو جائے۔ گویا وہ لوگوں کو تاثر یہ دینا چاہتا تھا کہ جب مقابلہ میں ہمارا اپلہ بھاری رہے گا تو اس کا ایک نتیجہ یہ بھی سامنے آجائے گا کہ ہمارا ہی دین درست ہے اور اس سے منحرف ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ اور اس فیصلہ میں ہماری خود غرضی کو کچھ دخل نہ ہو گا۔ بلکہ انصاف کا تقاضا ہی یہ ہے کہ جو غالب ہو اس کا ساتھ دیا جائے۔

اور بعضوں نے کہا ﴿السحرۃ﴾ سے مراد سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور سیدنا ہارون علیہ السلام لیے ہیں۔ یعنی فرعون نے بھرے دربار میں اعلان یہ کیا ہے کہ ممکن ہے کہ اس مقابلہ میں سیدنا موسیٰ اور ان کا بھائی کامیاب ہو جائیں۔ اس صورت میں ہم ان کی راہ پر چلیں گے۔ اس صورت میں بھی فرعون کی مراد یہی تھی کہ مقابلہ کے بعد ہم انصاف کی راہ اختیار کریں گے جس میں ہماری خود غرضی کو کچھ دخل نہ ہو گا۔ جو فریق بھی غالب آیا ہمیں اس کا ساتھ دینا ہو گا۔

[۳۲] نبی اور جادوگر کے کردار کا تقابل:۔ مقررہ وقت سے پہلے جب تمام جادوگر اطراف واکناف سے دارالخلافہ پہنچ گئے تو انہوں

قَالَ لَهُمْ مُّوسَىٰٓ أَلْقُوا مَآ أَنتُم مُّلْقُونَ ﴿٤٣﴾ فَأَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَحْنُ الْغَالِبُونَ ﴿٤٤﴾ فَأَلْقَىٰ مُوسَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ ﴿٤٥﴾ فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سَاجِدِينَ ﴿٤٦﴾

موسیٰ نے جادوگروں سے کہا: "پھینکو جو تم پھینکنا[۳۳] چاہتے ہو۔(۴۳) چنانچہ انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینک دیں اور کہنے لگے: "فرعون کی جے! یقیناً ہم ہی غالب[۳۴] رہیں گے" (۴۴) پھر موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا تو جو کچھ جادوگروں نے شعبدے بنائے تھے، اس نے انہیں فوراً نگلنا شروع[۳۵] کر دیا۔(۴۵) یہ دیکھ کر جادوگر بے اختیار سجدہ[۳۶] میں گر پڑے (۴۶)

نے مل کر فرعون سے سوال کیا کہ اگر ہم کامیاب ہوگئے تو ہمیں کچھ معاوضہ یا انعام و اکرام بھی ملے گا؟" جادوگروں کے اس سوال سے ان کی ذہنیت سامنے آجاتی ہے کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں۔ پیٹ کے دھندے کے طور پر کرتے ہیں۔ اس سے بلند ان کا کوئی مطمع نظر ہوتا ہی نہیں۔ جبکہ نبی لوگوں کے معاوضہ سے مطلقاً بے نیاز ہوتا ہے وہ بے لوث ہو کر محض اللہ کی رضامندی کی خاطر اپنا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔

فرعون کی اس وقت جان پر بنی ہوئی تھی۔ جادوگروں کے اس سوال پر فوراً کہنے لگا۔ محض انعام و کرام کی کیا بات کرتے ہو اگر تم کامیاب ہوگئے میں انعام و اکرام کے بدلہ تمہیں بلند مناصب بھی دوں گا اور تم میرے مقربین میں سے ہو گے۔

[۳۳] فرعون کے اس جواب پر جادوگر بہت خوش ہوگئے۔ میدان مقابلہ میں آئے تو موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کے عام دستور کے مطابق پوچھا: پہلے آپ اپنا شعبدہ دکھائیں گے، یا ہم پہل کریں؟ موسیٰ علیہ السلام نے فوراً جواب دیا: نہیں پہلے تم ہی اپنا شعبدہ دکھاؤ گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ جواب محض رسماً یا رواداریاً ان کی عزت افزائی کے طور پر نہیں دیا بلکہ آپ چاہتے ہی یہ تھے کہ کہ باطل پوری طرح پہلے اپنا مظاہرہ کرلے۔ اس کے بعد ہی حق کی فتح پوری طرح واضح ہو سکے گی۔

[۳۴] جادوگروں کو فرعون کے اہل کاروں کی طرف سے صرف یہ بتایا گیا کہ دارالخلافہ میں بادشاہ سلامت کے ہاں دو جادوگر آئے ہیں۔ ان میں سے ایک اپنی لاٹھی پھینکتا ہے تو وہ سانپ بن جاتا ہے اور یہی ان کے پاس سب سے بڑا شعبدہ ہے اور تم لوگوں کو بادشاہ سلامت نے ان کے مقابلہ کے لئے بلایا ہے۔ لہذا ان لوگوں نے اسی خاص پہلو میں اپنی تیاریاں کی تھیں۔ انہوں نے کچھ اپنی لاٹھیاں پھینکیں اور کچھ رسیاں پھینکیں جو لوگوں کو جیتے جاگتے متحرک سانپ نظر آنے لگے۔ اور ان کی تعداد اتنی زیادہ تھا کہ سارا میدان مقابلہ ایسے سانپوں سے بھر گیا تھا سارا مجمع اس منظر سے دہشت زدہ ہونے لگا۔ حتی کہ سیدنا موسیٰ بھی دل ہی دل میں ڈرنے لگے۔ یہ منظر جادوگروں کے لئے بڑا خوش کن تھا۔ اور انہیں یقین تھا کہ ان کے اس کرشمہ کا کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اسی خوشی میں انہوں نے زور سے نعرہ مارہ "فرعون کی جے، یقیناً ہم ہی جیتیں گے"۔

[۳۵] ۞ عصائے موسیٰ کا جادوگروں کے سانپوں کو ہڑپ کرنا:۔ اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو فوراً وحی کی کہ ڈرو نہیں بس اپنا عصا ڈال دو۔ چنانچہ آپ نے عصا ڈالا تو وہ صرف حرکت ہی نہیں کر رہا تھا بلکہ جادوگروں کے بنائے ہوئے تمام سانپوں کو اپنا لقمہ بھی بنائے جارہا تھا حتیٰ کہ اس نے ایسے تمام بناوٹی سانپوں کو اپنا لقمہ بنایا کہ میدان سانپوں سے صاف ہو گیا۔ بھرے مجمع میں اس مقابلہ میں فرعون کو شکست ہوئی پھر موسیٰ علیہ السلام نے عصا کو ہاتھ میں لیا تو پھر وہ عصا بن گیا۔

[۳۶] ۞ جادوگر کیوں ایمان لائے؟ فرعون کی جے پکارنے والے جادوگروں نے جب دیکھا کہ موسیٰ علیہ السلام کے عصا سے بنا ہوا سانپ ان کے سانپ کو ہڑپ کر رہا ہے تو انہیں یقین ہو گیا تھا کہ یہ جادو کے فن سے ماورا کوئی اور چیز ہے۔ وہ کوئی معمولی

قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٧﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿٤٨﴾ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۬ؕ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٤٩﴾ قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۫ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿٥٠﴾ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ

(اور) کہنے لگے: "ہم پروردگار عالم پر ایمان لاتے ہیں (۴۷) جو موسیٰ اور ہارون کا پروردگار ہے" (۴۸) فرعون بول اٹھا: "تم موسیٰ کی بات مان گئے پیشتر اس کے کہ میں تمہیں اس کی اجازت دیتا۔ یقیناً یہ تمہارا بڑا استاد ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔ اس کا انجام تمہیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں میں کٹوا دوں گا اور تم سب کو سولی [۳۷] چڑھا دوں گا۔ (۴۹)

وہ کہنے لگے: "کچھ پروا نہیں! ہمیں اپنے پروردگار کے حضور حاضر ہونا ہے (۵۰) ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہمارا پروردگار ضرور ہماری خطائیں معاف فرمادے گا کیونکہ ہم سب سے پہلے ایمان [۳۸] لائے ہیں" (۵۱)

قسم کے جادوگر نہ تھے۔ بلکہ ملک بھر کے چوٹی کے ماہر اور نامور جادوگر تھے۔ لہذا جب ان کے بنائے ہوئے سب سانپ میدان مقابلہ سے ختم ہو گئے تو انہوں نے اپنی شکست کا برملا اعتراف کر لیا پھر اسی پر اکتفانہ کیا بلکہ اسی بھرے مجمع میں رب العالمین پر ایمان لانے کا اقرار کیا اور یہ بھی ساتھ ہی وضاحت کر دی کہ رب سے مراد ہماری مراد فرعون نہیں بلکہ رب العالمین سے ہماری مراد وہ پروردگار ہے جو ہر چیز کا پرورش کنندہ ہے اور جس کی طرف موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام دعوت دے رہے ہیں۔

[۳۷] ۞ فرعون کی شکست اور جادوگروں کو سزا دینے کا اعلان:۔ فرعون ایک تو بھرے مجمع میں اپنی واضح شکست دیکھ چکا تھا۔ یہ رنج ابھی تازہ ہی تھا کہ اوپر سے اس کے جادوگروں نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کی رسالت کا اور اپنے ایمان لانے کا اقرار کر لیا تو وہ اس دوہرے صدمہ سے پیچ پا ہو گیا۔ اسے خطرہ یہ تھا کہ اب یہ سارا مجمع اور اس کے بعد اس کی قوم بھی اس کا ساتھ چھوڑ کر ایمان لے آئیں گے۔ لہذا اب وہ تشدد پر اتر آیا۔ وہ مقابلہ سے پہلے اپنے اس اقرار کو بھی بھول گیا جو وہ کہہ رہا تھا کہ ہمیں جادوگروں کا ہی ساتھ دینا پڑے گا۔ فوراً ایک تجویز اس کے ذہن میں آئی اور اس نے جادوگروں پر یہ الزام لگا دیا کہ یہ جادوگر تو پہلے ہی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ وہ ان کا استاد تھا اور یہ اس کے چیلے تھے۔ ان دونوں نے مل کر مجھے اس انجام تک پہنچایا ہے اور اس کی دلیل یہ پیش کی کہ شکست کے بعد جادوگروں نے مجھے پوچھا تک نہیں نہ مجھ سے مشورہ کیا۔ جادوگر میرے تھے اور مل گئے (موسیٰ علیہ السلام) سے اب ان کی اس فریب کاری کی میں انہیں پوری پوری سزا دوں گا اور ایسی سزا دوں گا جس سے باقی لوگوں کو ایسی حرکت کرنے کی جرأت تک نہ ہو سکے۔

فرعون دراصل اس اعلان سے دوہرا فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا وہ پہلے بھی اپنے طور پر یہ سمجھ چکا کہ موسیٰ علیہ السلام واقعی اللہ کا رسول ہے۔ لیکن دوسروں کو الو بنانے کی خاطر انہیں یہ یقین دلا رہا تھا کہ موسیٰ اور اس کا بھائی ہارون اللہ کے رسول نہیں بلکہ جادوگر ہیں۔ ہر مقابلہ میں شکست کے بعد عوام الناس میں پھر اسی تاثر کو مزید تقویت دینے کی کوشش کی اور دوسرے جادوگروں کو سولی چڑھانے کا اعلان کر کے لوگوں کو خوف زدہ کر دیا تاکہ آئندہ کوئی شخص ان پر ایمان لانے کی جرأت نہ کر سکے۔

[۳۸] ۞ ایمان لانے کے بعد جادوگروں کے کردار میں تبدیلی:۔ مقابلہ سے پہلے جادوگروں کی یہ حالت تھی کہ وہ فرعون سے

الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۱﴾ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۵۲﴾ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ
حٰشِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴿۵۶﴾

اور ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ: ''راتوں رات میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ۔ تمہارا تعاقب کیا جائے گا'' (۵۲) اس پر فرعون نے (فوج اکٹھی کرنے کے لئے) شہروں میں آدمی بھیج دیئے۔ (۵۳) (اور انہیں کہلا بھیجا کہ) یہ مٹھی بھر لوگ ہیں (۵۴) جو ہمیں غصہ چڑھا رہے ہیں (۵۵) اور ہم یقیناً ایک مسلح جماعت [۳۹] ہیں'' (۵۶)

انعام واکرام حاصل کرنے کے لئے التجا کر رہے تھے لیکن جب وہ علیٰ وجہ البصیرت صدق دل سے ایمان لے آئے تو ان کے ذہن میں یک لخت انقلاب آگیا۔ جیسے یکدم کسی کی آنکھیں کھل جائیں۔ ان کے ایمان نے ان میں اتنی جرأت پیدا کر دی تھی کہ اب وہ اسی جابر اور ظالم فرعون کی سولی کی دھمکی کو بھی خاطر میں نہیں لا رہے تھے وہ یک زبان ہو کر بول اٹھے تم جتنا برا سلوک ہم سے کر سکتے ہو اس میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھو۔ زیادہ سے زیادہ تم ہمیں مار ہی سکتے ہو۔ اس سے زیادہ تو ہمارا کچھ بگاڑ سکو گے مگر ہمیں جو دولت ایمان میسر آئی ہے وہ ان تکلیفوں کے مقابلہ میں ہزار درجہ بہتر ہے۔ اور ہم توقع رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری سابقہ زندگی کی خطاؤں اور لغزشوں کو معاف فرمائے۔ انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس معرکہ حق و باطل میں جادوگروں کی شکست کے بعد جس طرح جادوگروں ایمان لائے تھے اسی طرح فرعون بھی ایمان لے آتا۔ مگر وہ پہلے سے زیادہ اکڑ بیٹھا جس کی وجہ محض یہ تھی کہ اگر وہ ایمان لاتا تو اس کی ساری حکومت اور اقتدار ہاتھ سے جاتا تھا اور اسے موسیٰ علیہ السلام کا مطیع فرمان بن کر رہنا پڑتا تھا۔ لیکن جادوگروں کو ایسی کوئی فکر لاحق نہ تھی۔ جس سے ایک واضح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایمان لانے میں سب سے بڑی رکاوٹ اپنے جاہ، اپنی سرداریوں اور اپنے اقتدار سے دستبرداری ہوتی ہے اور ایسے ہی لوگ انبیاء کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے مخالف اور دشمن ہوتے ہیں۔

[۳۹] ۞ بنی اسرائیل کے ایمان لانے پر لڑکوں کو قتل کرنے کی سزا:۔ اس مقام پر بہت سے واقعات چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ یہ بات بھی پوری طرح معلوم نہیں ہو سکی کہ آیا فرعون نے ان جادوگروں کو بعض مصلحتوں کی بنا پر سولی چڑھانے کی دھمکی دی تھی یا فی الواقع چڑھایا بھی تھا۔ غالب گمان یہی ہے کہ اس نے یہ کام ضرور کیا ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ باطل پرست جب دلائل کے میدان میں شکست کھا جاتے ہیں تو تشدد اور اوچھے ہتھیاروں پر اتر آتے ہیں۔ پھر بھی ان کا غصہ رفع نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایسے مظالم کے نتائج بسا اوقات توقع کے خلاف نکلتے ہیں اور جس کو جتنی قوت سے دبانے کی کوشش کی جائے اتنی ہی قوت سے ابھرتی اور اپنی جڑیں مضبوط بنا لیتی ہے۔ مصر میں بھی یہی کچھ ہوا۔ بے شمار اسرائیلی سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تو موجودہ فرعون نے اس اسرائیلیوں کے لئے وہی سزا تجویز کی جو اس کے باپ نے کی تھی۔ یعنی بنی اسرائیل کے نومولود سب لڑکوں کو مار ڈالا جائے اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے اور اس طرح بتدریج ان کی نسل کو ختم کر دیا جائے۔ یہ تو فرعون کا منصوبہ تھا لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ علاوہ ازیں فرعون کی قوم کے چند لوگ چوری چھپے سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے۔

۞ بنی اسرائیل کی شام کی طرف ہجرت:۔ جب فرعون کے مظالم کی حد ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو وحی کے ذریعہ ملک مصر سے ہجرت کر کے ملک شام کی طرف جانے کا حکم دیا کہ وہ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر راتوں رات نہایت خفیہ

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۵۷﴾ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾

فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ

اس طرح ہم فرعونیوں کو ان کے باغات اور چشموں سے (۵۷) اور خزانوں اور بہترین قیام گاہوں [۴۰] سے نکال لائے۔ (۵۸) اور اس طرح ہم نے بنی اسرائیل کو ان کا وارث [۴۱] بنا دیا۔ (۵۹) چنانچہ (ایک دن) صبح کے وقت فرعونی ان کے تعاقب میں چل پڑے۔ (۶۰) پھر جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تو موسیٰ کے ساتھی [۴۲] چیخ اٹھے کہ ہم تو پکڑے گئے۔ (۶۱) موسیٰ نے کہا: "ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ میرا پروردگار میرے

طریقہ سے یہاں سے نکل جائیں۔ اور پوری احتیاط ملحوظ رکھیں اور جب سفر شروع کریں تو جلد از جلد مصر کے ملک سے پار نکل جانے کی کوشش کریں فرعون یقیناً ان کا تعاقب کرے گا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ مصر کے اندر ہی تم لوگوں کے سر پر آن پہنچے۔

فرعون کو جب موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی روانگی کا علم ہوا تو بہت سٹ پٹایا۔ اس کے سارے منصوبے خاک میں مل رہے تھے اس نے ایک لشکر جرار تیار کرنے کا حکم دیا اور درباریوں سے کہنے لگا۔ یہ مٹھی بھر کمزور سی جماعت ہے اور ان لوگوں نے فرار کی راہ اختیار کر کے ہمیں خواہ مخواہ غصہ چڑھا دیا ہے لہذا ہمیں چاہئے کہ فوراً ان کا تعاقب کر کے انہیں کیفرِ کردار تک پہنچائیں۔ ہمارے مسلح اور جرار لشکر کے مقابلہ میں ان بے چاروں کی حقیقت ہی کیا ہے۔

[۴۰] ❁ فرعون کا تعاقب:۔ چند دنوں میں فرعون نے بنی اسرائیل کے تعاقب اور ان سے نمٹنے کے لئے ایک لشکرِ جرار اکٹھا کر لیا اور ان کی سرکوبی کے لئے روانہ ہو گئے۔ ان کا تو یہی خیال تھا کہ چند دنوں میں ہم انہیں گرفتار کر کے واپس لے آئیں گے اور جو مقابلہ پر آئیں گے انہیں قتل کر ڈالیں گے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ جن محلوں اور باغوں سے نکل کر وہ ان کے تعاقب میں جا رہے ہیں ان محلوں اور باغوں کو دوبارہ دیکھنا بھی ان کے نصیب میں نہ ہوگا۔ اور بنی اسرائیل کا شکار کرنے والا یہ لشکر خود موت کے ہاتھوں شکار بن جائے گا۔

[۴۱] اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے کچھ لوگ مصر میں بھی رہ گئے تھے سارے کے سارے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ روانہ نہیں ہوئے تھے۔ جب فرعون اور اس کے جملہ اعیانِ سلطنت غرق ہو کر ہلاک ہو گئے تھے۔ تو ساتھ ہی آلِ فرعون کا اقتدار بھی ختم ہو گیا تھا اور یہی پیچھے رہنے والے بنی اسرائیل ان کے محلوں اور باغات پر قابض ہو گئے تھے۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ بنی اسرائیل مصر کے کچھ حصہ پر قابض ہوئے ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس آیت میں اس عہد کی طرف اشارہ ہو۔ جب سیدنا سلیمان علیہ السلام کی حکومت مصر تک پھیل گئی اور بنی اسرائیل ہی فرعونیوں کے محلات اور باغات پر قابض ہو گئے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب

[۴۲] ❁ فرعون کی بدحواسی:۔ فرعون کی بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ ایک طرف تو وہ بنی اسرائیل کو ایک مٹھی بھر اور کمزور سی جماعت قرار دے رہا تھا دوسری طرف وہ ایک عظیم الشان مسلح لشکر کی تیاری کا حکم دے رہا تھا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کو یقین تھا کہ بنی اسرائیل محض ایک کمزور سی اور مٹھی بھر جماعت ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مدد بھی ان کے شامل حال ہے۔ لہذا اس نے ہر ممکن احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسا لشکرِ جرار تیار کرنے کا حکم دیا تھا جس کے تیار ہونے میں خواہ مخواہ کچھ

رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ﴿۶۲﴾ فَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ ﴿۶۳﴾ وَ اَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِیْنَ ﴿۶۴﴾ وَ اَنْجَیْنَا مُوْسٰی وَ مَنْ مَّعَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ ﴿۶۵﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِیْنَ ﴿۶۶﴾ اِنَّ

ساتھ ہے وہ جلد ہی میری رہنمائی[۴۳] کردے گا" (۶۲) چنانچہ ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ: "اپنا عصا سمندر پر مارو" چنانچہ سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ایک حصہ[۴۴] ایک بڑے پہاڑ کی طرح (ساکن و جامد) ہو گیا۔(۶۳) اور اسی جگہ ہم دوسرے گروہ کو بھی قریب لے آئے[۴۵]۔(۶۴) موسیٰ اور اس کے تمام ساتھیوں کو تو ہم نے بچا لیا(۶۵) اور دوسرے گروہ کو وہاں غرق کر دیا۔(۶۶)

عرصہ لگ گیا۔ فرعون کے اس لشکر نے بالآخر بنی اسرائیل کو بحیرہ قلزم کے کنارے پر جا پکڑا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ دونوں لشکروں میں صرف اتنا فاصلہ رہ گیا تھا کہ دونوں لشکر ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ بنی اسرائیل سمندر کے کنارے پر کھڑے تھے۔ پیچھے سے فرعون کا لشکر تیز رفتار گھوڑوں پر سوار ان کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ بنی اسرائیل جو فرعون سے پہلے ہی سخت خوف زدہ تھے یہ صورت حال دیکھ کر سخت گھبرا گئے۔ آگے سمندر تھا پیچھے فرعون کا لشکر، دونوں طرف موت ہی موت کھڑی نظر آ رہی تھی۔ لہذا ان کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل گئے، موسیٰ اب تو ہم مارے گئے۔

[۴۳] لیکن موسیٰ علیہ السلام پر اس صورت حال کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے جو فتح و نصرت کے وعدے کر رکھے ہیں وہ یقیناً پورے ہوں گے۔ اور اس مصیبت سے نجات کے لئے بھی اللہ ضرور کوئی راہ نکال دے گا۔ لہذا انہوں نے گھبرائے ہوئے بنی اسرائیل کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ فرعون تمہارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مدد ہمارے شامل حال ہے وہ ان حالات میں بھی ضرور ہماری رہنمائی فرمائے گا۔

[۴۴] ۞ عصا مارنے سے سمندر میں بارہ راستے بن جانا:۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے بموجب وحی الٰہی جب اپنا عصا سمندر پر مارا تو وہ دو حصوں میں بٹ گیا اور درمیان میں کافی کشادہ راستہ بن گیا۔ اور راستہ خشک بھی فوراً ہو گیا۔ نیچے دلدلی زمین نہیں تھی۔ ایک طرف کا پانی بھی ساکن جامد پہاڑ کی طرح کھڑا کا کھڑا رہ گیا اور دوسری طرف کا بھی۔ لیکن مفسرین کی نقل کردہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خشک راستہ نہیں بلکہ بارہ راستے بنے تھے اور ﴿كُلُّ فِرْقٍ﴾ کے الفاظ بھی ان روایات کی تائید کرتے ہیں کیونکہ کل کا لفظ دو کے لئے نہیں آتا۔ روایات کے مطابق سمندر میں بارہ راستے بنے تھے اور بنی اسرائیل کے بارہ ہی قبیلے تھے اور ہر قبیلے کے تقریباً بارہ ہزار افراد تھے جو ہجرت کر کے آئے تھے اس لحاظ سے ان مہاجرین کی تعداد ایک لاکھ چوالیس ہزار بنتی ہے اور بعض روایات کے مطابق یہ تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ جبکہ فرعون کے لشکر کی تعداد ان سے بہت زیادہ تھی۔

[۴۵] اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر بنی اسرائیل کے لئے نجات کی راہ پیدا کر دی۔ اور بنی اسرائیل اس میں سے گزر کر بخیر و عافیت اس بحیرہ کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے اس وقت فرعون کا لشکر انہی راستوں سے گزر کر سمندر پار کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ شاید اس وقت موسیٰ علیہ السلام کو یہ خیال آیا ہو تو اب دوبارہ سمندر پر اپنا عصا ماریں۔ تاکہ پانی پھر سے آپس میں مل جائے اور فرعون کا لشکر ان تک نہ پہنچنے پائے لیکن اسی وقت اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی کہ ﴿وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا﴾ (۴۴:۲۴) یعنی سمندر کو اسی حال میں پہاڑوں کی طرح کھڑا چھوڑ دو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی صرف یہی نہیں تھی کہ بنی اسرائیل ان فرعونیوں سے

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٦٧﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿٦٨﴾ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ

ع ۴ وقف لازم

اس واقعہ میں بھی ایک نشانی [۴۶] ہے لیکن ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں (۶۷) اور بلاشبہ تمہارا [۴۷] پروردگار ہی ہر چیز پر غالب اور رحم کرنے والا ہے۔ (۶۸) اور انہیں ابراہیم کا قصہ [۴۸] (بھی) سنایئے (۶۹)

نجات پا جائیں بلکہ یہ بھی تھی کہ اس ظالم قوم کو سمندر میں غرق کر کے صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دیا جائے۔

۞ فرعون اور اس کے لشکر کی غرقابی:۔ فرعون اور آل فرعون اگر بنی اسرائیل کا تعاقب نہ کرتے یا سمندر سے ہی واپس چلے جاتے تو ان کا صرف اتنا ہی نقصان ہوتا کہ ایک غلام قوم ہاتھ سے نکل گئی۔ مگر اللہ کی مشیت پوری ہو کے رہتی ہے۔ ان کی ہلاکت ہی انہیں مقام ہلاکت تک کھینچ لائی تھی۔ پھر جب انہوں نے سمندر میں کھلے راستے دیکھے۔ پھر بھی فرعون کو یہ خیال نہ آیا کہ ممکن ہے کہ سمندر میں اس طرح راستہ بن جانا ایک خرق عادت امر اور موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ہو۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ فوراً اپنے گھوڑے انہی راستوں پر ڈال دیئے۔ اور جب فرعون کا پورا لشکر سمندر کی زد میں آ گیا تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے پانی کو حکم دیا کہ وہ اپنی طبعی حالت پر واپس آ جائے اور آپس میں مل جائے۔ چنانچہ خدائی کے بلند و بانگ دعوے کرنے والا فرعون اپنے تمام اہلیانِ سلطنت اور لاؤ لشکر سمیت اس سمندر میں غرق ہو گیا۔

[۴۶] ۞ فرعون کے قصہ میں سامان عبرت:۔ یعنی اس واقعہ میں ہر طرح کے لوگوں کیلئے نشانی ہے۔ ظالموں کیلئے یہ نشانی ہے کہ وہ اپنے کرتوتوں کی سزا اور اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔ اللہ تعالیٰ کا دستِ قدرت انہیں ایسے راستوں سے مقام ہلاکت کی طرف کھینچ لاتا ہے جن کا انہیں وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا اے معاندینِ قریش تم بھی اس واقعہ سے عبرت حاصل کرو کہ کہیں تمہیں بھی ایسے انجام بد سے دوچار نہ ہونا پڑے اور اس واقعہ میں ایمان لانے والوں کیلئے بھی نشانی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمانداروں کو آزماتا ضرور ہے۔ انہیں تکلیفیں بھی پہنچتی ہیں۔ بالآخر اللہ تعالیٰ مظلوموں کی ہی مدد کرتا ہے اور ظالموں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔

[۴۷] یعنی ایسی واضح نشانی دیکھ کر بھی منکرین حق کم ہی ایمان لاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو سزا دینے کی اللہ پوری قدرت رکھتا ہے لیکن فوراً سزا اس لئے نہیں دیتا کہ وہ رحیم بھی ہے۔

[۴۸] سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا قصہ قریشِ مکہ سے گہری مناسبت رکھتا ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا پیروکار ہونے کا دعویٰ رکھتے تھے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام وہ ہستی ہیں جنہوں نے اپنی ساری زندگی شرک کے خلاف جہاد میں گزاری اور اس راہ میں آنے والی ہر مصیبت کو بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ جبکہ قریش مکہ اپنے اس اتباعِ ابراہیمی کے دعویٰ کے باوجود سر سے پاؤں تک شرک میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انہیں یہ اعتراف بھی تھا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام خالصتاً توحید پرست اور شرک سے سخت بیزار تھے اور یہ بھی اعتراف تھا کہ عرب میں شرکیہ رسوم سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی وفات کے صدیوں بعد رائج ہوئیں۔

۞ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا خانگی ماحول اور باپ کو نصیحت:۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی قوم بھی سر تا پا شرک میں مبتلا تھی۔ دوسروں کا کیا ذکر آپ کا باپ آزر نمرود کے دربار میں شاہی مہنت تھا۔ وہ خود بت تراش بھی تھا اور بت فروش بھی۔ اس کا ذریعہ معاش بھی بت گری اور بت فروشی تھا۔ اور جاہ و منصب بھی اسے اسی وجہ سے حاصل ہوا۔ ایسے باپ کے گھر اور ایسے ماحول میں سیدنا ابراہیم پیدا ہوئے۔ نبوت عطا ہوئی تو سب سے پہلے اپنے باپ کو ہی سمجھانا شروع کیا اور پھر اس کے بعد دوسرے لوگوں کو۔ اپنے باپ اور اپنی قوم سے ان کا پہلا سوال ہی یہ تھا کہ ان پتھر کے بتوں اور مورتیوں میں کیا خصوصیت ہے جو تم ان کی پوجا کرتے ہو۔ آخر تم ان کو کیا سمجھ کر ان کی

اِبۡرٰهِيۡمَ ﴿۶۹﴾ اِذۡ قَالَ لِاَبِيۡهِ وَقَوۡمِهٖ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۷۰﴾ قَالُوۡا نَعۡبُدُ اَصۡنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيۡنَ ﴿۷۱﴾ قَالَ هَلۡ يَسۡمَعُوۡنَكُمۡ اِذۡ تَدۡعُوۡنَ ﴿۷۲﴾ اَوۡ يَنۡفَعُوۡنَكُمۡ اَوۡ يَضُرُّوۡنَ ﴿۷۳﴾ قَالُوۡا بَلۡ وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ

جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے پوچھا: "یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم پوجا کرتے ہو؟" (۷۰) وہ کہنے لگے: ہم بتوں کی پوجا کرتے ہیں اور انہیں کے پاس بیٹھے [۴۹] رہتے ہیں (۷۱) ابراہیم نے پوچھا: "جب تم انہیں پکارتے ہو تو یہ تمہاری بات سنتے ہیں؟ (۷۲) یا تمہیں کچھ فائدہ یا نقصان پہنچا سکتے [۵۰] ہیں؟" (۷۳) وہ کہنے لگے: "نہیں بلکہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو ایسا کرتے پایا [۵۱] ہے" (۷۴)

پوجا کرتے ہو اور ان کی نذریں نیازیں دیتے ہو؟

[۴۹] لوگوں نے جواب میں کہا کہ تم نے ان سے متعلق نہایت حقارت کے لہجہ میں یہ سوال کیا ہے۔ حالانکہ ہمارے نزدیک یہ انتہائی قابل احترام چیزیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم عجز و نیاز سے سر جھکائے ان کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں۔

انسانی زندگی پر سیاروں کے اثرات کا عقیدہ:۔ پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ سیدنا ابراہیمؑ کی قوم حقیقتاً ستارہ پرست تھی۔ اور وہ سیاروں کے انسانی زندگی پر اثرات کے شدت سے قائل تھے۔ انہوں نے ہر سیارہ کی روح کی ایک تصویر اپنے ذہن میں طے کر رکھی تھی پھر اسی تصویر کے مطابق ان کے مجسمے یا بت بنائے جاتے تھے۔ مثلاً کوئی سورج دیوتا کا مجسمہ تھا تو کوئی چاند دیوی کا۔ اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ جس سیارہ کا وہ مجسمہ ہو اس سیارہ کی روح کا اس سے خاص تعلق ہوتا ہے۔ اور اگر ان بتوں کی پوجا پاٹ کریں گے تو سیاروں کے غضب اور ان کے مضر اثرات سے محفوظ رہیں گے۔ اور یہ سب کچھ ان کا وہم و قیاس ہی تھا۔ جس کے لئے کوئی دلیل ان کے پاس نہیں تھی۔

[۵۰] سیدنا ابراہیمؑ کا اگلا سوال یہ تھا کہ جب تم انہیں پکارتے ہو تو یہ کوئی جواب دیتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہی ہو سکتا تھا۔ بھلا پتھر کے خود ساختہ بتوں کا سننے یا سن کر جواب دینے سے کیا کام؟ سیدنا ابراہیمؑ نے اگلا سوال یہ کیا کہ یہ بت تمہارا کچھ سنوار یا بگاڑ سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب بھی نفی میں ہی ہو سکتا تھا بھلا جو بت اپنے وجود، اپنی حفاظت اور اپنے وجود کی بقا تک کے لئے اپنے عقیدت مندوں کے محتاج ہوں۔ نہ سنتے ہوں نہ بولتے ہوں۔ وہ اپنے عقیدت مندوں کی کون سی حاجت پوری کر سکتے ہیں یا ان کی کوئی تکلیف رفع کر سکتے ہیں؟

[۵۱] بتوں کے متعلق سیدنا ابراہیم کے اپنی قوم سے سوال:۔ سیدنا ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے مشرکوں سے جو سوال کئے وہ ایسی صفات ہیں جن کا ایک معبود حقیقی میں پایا جانا لازمی ہے۔ یعنی وہ پکارنے والے کی پکار یا فریاد کو سنتا ہو پھر اس کا جواب بھی دیتا ہو۔ اس کی حاجت براری کی طاقت بھی رکھتا ہو اور اسے نقصان اور تکلیف سے بچا بھی سکتا ہو۔ اگر کسی معبود میں یہ صفات نہ پائی جائیں تو وہ معبود باطل ہی ہو سکتا ہے حقیقی نہیں ہو سکتا۔ اور یہ سوالات دراصل "گفتہ آید در حدیث دیگراں" کے مصداق قریش مکہ سے ہی ان کے معبودوں کے متعلق سوال ہیں۔

سیدنا ابراہیمؑ کی قوم آپ کے سوالوں کا تو کوئی جواب دے نہیں سکتی تھی۔ لے دے کے ان کے پاس جو جواب ہو سکتا تھا وہ یہی تھا کہ چونکہ ہمارے آباء واجداد ایسا کرتے آئے ہیں اور مدتوں سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے لہذا ہم بھی یہ کام چھوڑ نہیں سکتے۔ ہمارے آباء واجداد ہم سے زیادہ سمجھدار زیادہ بزرگ اور زیادہ نیک تھے۔ آخر انہوں نے ان بتوں کی پرستش میں کچھ فائدہ

يَفْعَلُونَ ﴿٧٤﴾ قَالَ أَفَرَءَيْتُم مَّا كُنتُمْ تَعْبُدُونَ ﴿٧٥﴾ أَنتُمْ وَءَابَآؤُكُمُ الْأَقْدَمُونَ ﴿٧٦﴾ فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيٓ إِلَّا رَبَّ الْعَٰلَمِينَ ﴿٧٧﴾ الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ ﴿٧٨﴾ وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ ﴿٧٩﴾

ابراہیم نے کہا: ''بھلا دیکھو تو جن کو تم پوجتے ہو(۷۵) اور تمہارے پہلے آباء واجداد بھی پوجتے رہے ہیں۔(۷۶) یہ تو میرے دشمن [۵۲] ہیں (جو جہنم میں لے جائیں گے) بجز رب العالمین [۵۳] کے (۷۷) جس نے مجھے پیدا کیا، وہی میری رہنمائی [۵۴] کرتا ہے۔(۷۸) وہی مجھے کھلاتا [۵۵] ہے اور پلاتا ہے (۷۹)

دیکھا ہوگا۔ تبھی تو انہوں نے یہ کام شروع کیا تھا آخر ان کے پاس بھی کوئی دلیل تو ہوگی؟

[۵۲] سیدنا ابراہیم کی بتوں سے دشمنی: سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ بت تمہارے دشمن ہیں بلکہ یوں فرمایا کہ یہ میرے دشمن ہیں۔ تاکہ قوم کے لوگ چڑ نہ جائیں اور ضد بازی پر نہ اتر آئیں۔ اور ان کے دشمن ہونے کا ذکر سورہ مریم کی آیت نمبر ۸۲ میں موجود ہے کہ جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مشرکوں کو اور ان کے معبودوں کو آمنے سامنے لا حاضر کرے گا تو یہی معبود خواہ وہ جاندار ہوں یا بے جان، اپنے عبادت کرنے والوں کے دشمن بن جائیں گے اور کہیں گے کہ احمقو! تمہیں ہم نے کب کہا تھا کہ اللہ کو چھوڑ کر ہماری عبادت کیا کرو۔ یہ تو آخرت میں دشمنی ہوئی اور آج یہ میرے دشمن ہیں۔ لہذا یہ میرا جو کچھ بگاڑ سکتے ہیں میں حاضر ہوں، میں دیکھوں گا کہ میرا یہ کیا نقصان کر سکتے ہیں اور ان کے دشمن ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ میں بھی ان کا دشمن ہوں۔ یعنی جہاں تک مجھ سے بن پڑا میں بھی ان سے دو دو ہاتھ کروں گا۔ چنانچہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ان معبودوں کے ساتھ دو دو ہاتھ کئے بھی تھے۔ جس کا ذکر سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۵۷، ۵۸ میں گزر چکا ہے۔

[۵۳] میں اللہ رب العالمین کے سوا کسی کو بھی معبود تسلیم نہیں کرتا۔ کیونکہ وہی ساری کائنات کا خالق ہے، مالک ہے، ان کی تربیت کرنے والا اور ان پر کنٹرول اور ان کی نگہداشت کرنے والا ہے اور مخلوق اور مملوک کے لئے یہی سزاوار ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک کے علاوہ کسی دوسرے کی غلامی نہ کرے۔

[۵۴] ان چار آیات میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا ذکر کیا جن کا تعلق سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ذات سے ہی نہیں بلکہ ہر انسان سے تعلق ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی یہی وہ صفات ہیں جن کی بنا پر ہر انسان کو صرف ایک اللہ ہی کی عبادت کرنا چاہئے۔ پہلی صفت یہ ہے کہ اسی نے مجھے پیدا کیا اور وجود بخشا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ صفت ایسی ہے۔ جس کا کسی بھی دور کے مشرکوں نے کبھی انکار نہیں کیا۔ یعنی جب میری تخلیق میں کسی دوسری ہستی کا کچھ حصہ نہیں۔ تو میری عبادت میں کوئی دوسرا کیسے حصہ دار بن سکتا ہے؟ دوسری صفت یہ ہے کہ اللہ نے مجھے پیدا کر کے تنہا نہیں چھوڑ دیا۔ بلکہ ہر مقام پر میری رہنمائی بھی کرتا ہے۔ اس سے مراد فطری رہنمائی بھی ہے جو ہر جاندار کو مہیا ہوتی ہے۔ مثلاً جب پیدا ہوتا ہے تو اپنی خوراک حاصل کرنے کیلئے ماں کی چھاتیوں کی طرف لپکتا ہے۔ پھر اللہ نے ہی اسے دودھ پینے کا طریقہ بتا دیا۔ غرض موقع و محل کے لحاظ سے اللہ ہر مقام پر ہر جاندار کی رہنمائی اور دست گیری کرتا ہے اور انسانوں کی اخروی فلاح کے لئے وحی کے ذریعے رہنمائی فرماتا ہے اور اس ہمہ گیر قسم کی رہنمائی میں کسی دوسری ہستی کا کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔ لہذا میری عبادت میں اللہ کے علاوہ دوسرا کوئی کیسے شریک بن سکتا ہے؟

[۵۵] اللہ تعالیٰ نے جاندار مخلوق کو پیدا کرنے سے پیشتر ہی ایسا انتظام فرمایا جس سے ہر جاندار کو روزی اور خوراک میسر آسکے۔ وافر مقدار میں پانی پیدا کر دیا۔ زمین میں قوت روئیدگی بخشی۔ ہوائیں چلائیں۔ بارش کا نظام قائم کیا اور ہر جاندار کی

وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ﴿٨٠﴾ وَالَّذِي يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ ﴿٨١﴾ وَالَّذِي أَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لِي
خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ ﴿٨٢﴾ رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ ﴿٨٣﴾ وَاجْعَلْ لِي لِسَانَ صِدْقٍ فِي

اور جب میں بیمار[۵۶] پڑتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔(۸۰) نیز وہی مجھے مارے گا، پھر زندہ کرے[۵۷] گا(۸۱) اور جس سے میں توقع رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن میری خطائیں معاف[۵۸] کر دے گا" (۸۲) (اس کے بعد ابراہیم نے دعا کی کہ) پروردگار! مجھے حکمت عطا فرما اور مجھے صالح لوگوں میں شامل[۵۹] کر دے۔(۸۳) اور پچھلے لوگوں میں مجھے سچی

تمام ضروریات اسی زمین کے ساتھ وابستہ کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ کارنامہ بھی ایسا ہے جس میں دوسری ہستی شریک نہیں ہو سکتی تو پھر عبادت میں کیسے شریک ہو سکتی ہے؟

[۵۶] سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بیماری کی نسبت اللہ تعالیٰ کی بجائے اپنی طرف فرمائی تو یہ محض اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور اپنی کسر نفسی کی بنا پر ایسا کہا۔ ورنہ بیماری اور شفا سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ اب بیماری اور شفا کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ضابطہ یہ ہے کہ ہر جاندار کی طبیعت ہی اس کی سب سے بڑی معالج ہوتی ہے۔ بدن میں کسی مقام پر بھی کوئی نقص واقع ہو جائے تو طبیعت فوراً ادھر متوجہ ہو جاتی ہے۔ باہر سے کوئی آفت پڑنے کا خطرہ ہو تو ہر جاندار سے بلا ارادہ ایسی حرکات سرزد ہونے لگتی ہیں جو اس کی اس آفت سے حفاظت کر سکیں اور دوائی کی ضرورت صرف اس وقت پیش آتی ہے جب طبیعت کی مدافعت سے معاملہ بڑھ جائے اور دوائی کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ طبیعت کی مدد کرتی ہے ورنہ اصل معالج طبیعت ہی ہوتی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے ہی بنائی ہے علاوہ ازیں دواؤں میں تاثیر اور خاصیت بھی اللہ کی پیدا کردہ ہے پھر کبھی دوا اپنا اثر دکھاتی ہے کبھی بے اثر ثابت ہوتی ہے اور کبھی الٹا اثر دکھاتی ہے اسی لئے کوئی حکیم یا ڈاکٹر یہ بات دعویٰ سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ فلاں مرض کا علاج کر کے شفا دے سکتا ہے۔ بلکہ ہر شخص اس معاملہ میں اپنے عجز کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے کہ شفا من جانب اللہ ہوتی ہے۔ پھر جب شفا بخشنے میں اللہ کے علاوہ کسی دوسری ہستی کا دخل نہیں تو عبادت میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا کیسے شریک بنایا جا سکتا ہے؟

[۵۷] زندگی اور موت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے:۔ موت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس سے نہ کسی کو مفر ہے اور نہ اس میں کسی کا کچھ اختیار ہے۔ انسان نہ اپنی مرضی سے پیدا ہوا تھا اور نہ اپنی مرضی سے موت کو ٹال سکتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنی دوبارہ زندگی کو بھی روکنے میں بھی مجبور محض ہے۔ اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ ہر آن زندہ سے مردہ کو اور مردہ سے زندہ کرنے کے کرشمے دکھاتا رہتا ہے۔ لہٰذا دوبارہ پیدائش سے انکار کی معقول وجہ نہیں ہو سکتی۔ اور یہ ایسے کام ہیں جن میں اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کا کوئی عمل دخل نہیں۔ پھر اللہ کی عبادت میں آخر دوسروں کو کیوں شریک بنایا جا سکتا ہے۔ یا دوسروں کو عبادت کے لائق کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

[۵۸] قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جب عدالت قائم فرمائے گا تو اس وقت بھی اس کی عدالت، حاکمیت اور فیصلوں میں کسی دوسری ہستی کا کوئی عمل دخل نہ ہو گا۔ جس طرح مذکورہ بالا امور میں کسی دوسرے کا کچھ عمل دخل نہیں ہے۔ اور چونکہ میں نے اللہ کی عبادت میں دوسرے کسی کو اس کا شریک نہیں سمجھا لہٰذا مجھے توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دن میری چھوٹی موٹی خطاؤں اور لغزشوں کو معاف فرما دے گا۔ اس سے یہ نتیجہ بھی سامنے آتا ہے کہ جس کسی نے اللہ کی عبادت میں کسی دوسرے کو شریک بنایا ہو گا اس کی مغفرت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

[۵۹] اللہ تعالیٰ کی مندرجہ بالا صفات بیان کرنے کے بعد سیدنا ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حضور دست بدعا ہو جاتے ہیں۔

الْاٰخِرِیْنَ ﴿۸۴﴾ وَاجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِیْمِ ﴿۸۵﴾ وَاغْفِرْ لِاَبِیْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ ﴿۸۶﴾
وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ ﴿۸۷﴾ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ﴿۸۹﴾

ناموری[۶۰] عطا کر۔(۸۴) اور مجھے نعمتوں والی جنت کے وارثوں[۶۱] میں شامل فرما(۸۵) اور میرے باپ کو معاف کر دے بلاشبہ وہ گمراہوں[۶۲] میں سے ہے۔(۸۶) اور جس دن لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے، مجھے رسوا[۶۳] نہ کرنا۔(۸۷) جس دن نہ مال کوئی فائدہ دے گا اور نہ اولاد(۸۸) بجز اس کے کہ کوئی اطاعت گزار دل لے کر اللہ کے حضور[۶۴] حاضر ہو۔"(۸۹)

پہلی دعا یہ ہے کہ یا اللہ مجھے صحیح قوت فیصلہ اور دینی بصیرت عطا فرما اور میرے علم میں اضافہ کر اور مجھے نیک لوگوں کی سوسائٹی عطا فرما۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں ایک نیک بخت اور نیک سیرت انسان اگر کسی بری سوسائٹی میں پھنس جائے تو اسے جتنی تکلیف اور ذہنی کوفت ہوتی ہے، اسے سب جانتے ہیں۔ لہذا ہر شخص کو کوشش کرنی چاہئے اور اس کے لئے دعا بھی کرتے رہنا چاہئے کہ اسے نیک لوگوں کی صحبت حاصل ہو۔ اور آخرت میں اللہ تعالیٰ یقیناً نیک لوگوں کو نیک لوگوں سے ہی ملادے گا۔ تاہم اس نعمت کے لئے دعا کرتے رہنا چاہئے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بھی ایسی دعا کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی وفات کے ساتھ یہ دعا فرمائی تھی۔ **اللهم الرفيق الاعلىٰ۔**

[۶۰] یعنی اس دنیا میں، میں ایسے اچھے کام کر سکوں کہ بعد میں آنے والے لوگ میرا ذکر اچھے الفاظ میں کیا کریں۔ سیدنا ابراہیم کی یہ دعا حرف بحرف قبول ہوگئی۔ دنیا کے اکثر اہل مذاہب آپ کو اپنا دینی پیشوا ضرور تسلیم کرتے ہیں۔ اگرچہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم سے بہت سی باتوں میں منحرف ہو چکے ہیں۔ اسلام نے از سرِ نو دین ابراہیمی کو زندہ کیا۔ اور ہر نماز میں درود کو واجب قرار دے کر آپ کا ذکر خیر بھی جاری کیا۔ مگر افسوس ہے کہ دوسرے مذاہب کی طرح مسلمان بھی خالص دین ابراہیمی سے ہٹ چکے ہیں۔ اور اپنے دین میں شرک کی آمیزش کر لی ہے۔

[۶۱] وارث تو وہ اس لحاظ سے ہوں گے کہ ان کے جدِ امجد کا اصل مسکن جنت ہی تھا۔ اور جنت کے وارث صالحین ہی ہوں گے۔ جن کے ساتھ ملانے کے لئے سیدنا ابراہیم علیہ السلام دعا فرما رہے ہیں۔

[۶۲] جب باپ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو مشرک کے خلاف جہاد کی سزا کے طور پر گھر سے نکالا تھا۔ اس وقت سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے دعائے مغفرت کا وعدہ کیا تھا۔ (۱۹: ۴۷) اس کے بعد آپ نے دعائے مغفرت بھی فرمائی جیسا کہ یہاں مذکور ہے۔ اور ایک دفعہ اپنے والد اور والدہ دونوں کے حق میں دعائے مغفرت فرمائی تھی۔ (۱۴: ۴۱) پھر جب آپ پر یہ بات واضح ہوگئی کہ مشرک کی کسی حال میں مغفرت نہیں ہوگی تو آپ نے ایسی دعا کرنا چھوڑ دی تھی۔

[۶۳] ۞ سیدنا ابراہیم کے باپ کا حشر:۔ قیامت کے دن مجھے تمام اولین و آخرین کے سامنے یوں رسوا نہ کرنا کہ باپ سزا پا رہا ہو اور ابراہیم علیہ السلام کھڑا دیکھ رہا ہو۔ چنانچہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ سیدنا ابراہیم قیامت کے دن اپنے والد کو اس حال میں دیکھیں گے کہ منہ پر سیاہی اور گرد و غبار چڑھ رہا ہوگا۔ آپ والد سے کہیں گے۔ میں نے تمہیں کہا نہ تھا میری نافرمانی نہ کرو۔ باپ کہے گا: آج میں تمہاری نافرمانی نہیں کروں۔ پھر سیدنا ابراہیم علیہ السلام اپنے پروردگار سے کہیں گے کہ آپ نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا کہ قیامت کے دن تجھے ذلیل نہیں کروں گا۔ اس سے بڑھ کر میری کیا ذلت

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۹۰﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۹۲﴾
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ﴿۹۴﴾ وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ
اَجْمَعُوْنَ ﴿۹۵﴾ قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۹۶﴾ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۷﴾ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ

(اس دن) جنت پرہیز گاروں کے قریب لائی جائے گی۔(۹۰) اور گمراہ لوگوں کو جہنم سامنے دکھائی[۶۵] جائے گی۔(۹۱) اور ان سے کہا جائے گا: تمہارے وہ معبود کہاں ہیں جن کی تم اللہ کے سوا پوجا کرتے تھے۔(۹۲) کیا وہ تمہاری مدد کر سکتے[۶۶] ہیں یا وہ اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں(۹۳) ان معبودوں کو اور ان گمراہوں کو جہنم میں منہ کے بل پھینک دیا جائے گا(۹۴) اور ابلیس کے سب لشکروں[۶۷] کو بھی(۹۵) جہنم میں یہ سب آپس میں جھگڑ رہے ہوں گے۔ گمراہ لوگ (اپنے معبودوں سے) کہیں گے(۹۶) اللہ کی قسم! ہم تو واضح گمراہی میں مبتلا تھے۔(۹۷) جبکہ تمہیں رب العالمین کے برابر

ہو گی کہ میرا باپ ذلیل ہو رہا ہے اور تیری رحمت سے محروم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے کافروں پر جنت حرام کر دی ہے پھر سیدنا ابراہیمؑ سے کہا جائے گا۔ ذرا اپنے پاؤں تلے تو دیکھو وہ دیکھیں گے تو ایک نجاست سے لتھڑا ہوا بجو نظر آئے گا (اور والد کا کوئی پتہ نہیں لگے گا) پھر اس کے پاؤں سے پکڑ کر اس بجو کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا" (بخاری۔ کتاب الانبیاء۔ باب قول اللہ واتخذ الله ابراهیم خلیلا) گویا قیامت کے دن سیدنا ابراہیمؑ کی رسوائی کا علاج کیا جائے گا کہ آپ کے باپ کی شکل و صورت ہی مسخ کر دی جائے گی۔

[۶۴] آیت نمبر ۸۸، ۸۹ سیدنا ابراہیمؑ کی دعا کا حصہ بھی ہو سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد بھی۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ اس دن مجھے رسوا نہ کرنا جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد۔ یعنی میرے باپ کی دولت اس دن اس کے کسی کام نہ آئے گی اور نہ ہی میں کام آسکوں گا۔ کام آنے والی چیز تو صرف اللہ کی اطاعت ہو گی۔ جو شخص فرمانبردار دل لے کر حاضر ہوا وہی کامیاب ہو گا اور دوسری صورت میں قیامت کی یہ صفات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوئی ہیں۔

[۶۵] قیامت کے دن اہل جنت کے جنت میں داخل ہونے سے پہلے ہی جنت اپنی تمام دلکشیوں اور رعنائیوں سمیت پرہیز گاروں کے قریب کر دی جائے گی۔ جسے دیکھ کر وہ بہت مسرور ہوں گے اور اس میں داخلہ کے لئے بیتاب ہوں گے۔ اسی طرح دوزخ اپنی تمام ہولناکیوں اور چنگھاڑوں سمیت گمراہ لوگوں کے سامنے لائی جائے گی۔ اور اہل دوزخ کو دیکھ کر وہ اور بھی جوش دکھانے اور چنگھاڑنے لگے گی۔ یہ منظر دیکھ کر اہل دوزخ کے دوزخ میں داخل ہونے سے پہلے ہی پتے پانی ہو جائیں گے۔

[۶۶] اہل دوزخ سے پوچھا جائے گا۔ بتاؤ آج تمہارے وہ معبود کدھر ہیں جنہیں تم نے اللہ کے ہاں اپنے سفارشی سمجھ رکھا تھا اور اللہ کے بجائے انہی کی نذر و نیازوں اور نیاز مندیوں میں لگے رہتے تھے آج تو وہ اپنے آپ کو بھی دوزخ سے بچا نہیں سکتے تمہاری کیا خاک مدد کریں گے؟

[۶۷] اہل دوزخ کو دوزخ میں پھینکنے کا طریقہ یہ ہو گا پہلے ایک دوزخی کو اوندھے منہ دوزخ میں پھینکا جائے گا، اوپر سے دوسرے کو، پھر اوپر سے تیسرے کو، گویا ان کو دوزخ میں اس بیدردی سے پھینکا جائے جیسے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کو پھینکا جاتا

الْعٰلَمِیْنَ ﴿٩٨﴾ وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٩٩﴾ فَمَا لَنَا مِنْ شٰفِعِیْنَ ﴿١٠٠﴾ وَلَا صَدِیْقٍ حَمِیْمٍ ﴿١٠١﴾ فَلَوْ اَنَّ لَنَا

سمجھ [٦٨] رکھا تھا۔(٩٨) ہمیں مجرموں نے اس گمراہی میں ڈالا تھا۔(٩٩) آج تو ہمارا کوئی سفارشی بھی نہیں۔(١٠٠) نہ کوئی مخلص دوست ہے۔(١٠١) کاش! اگر ہمیں ایک دفعہ پھر (دنیا میں) لوٹنے کا موقع مل جائے تو ہم مومنوں [٦٩]

ہے۔ اور دوزخ میں یوں پھینکے جانے والے لوگ تین طرح کے ہوں گے ایک مشرک لوگ اللہ کے سوا دوسروں کی عبادت کرنے والے، دوسرے ان کے معبود، خواہ وہ جاندار ہوں یا بے جان تاکہ مشرکوں کی حسرت میں مزید اضافہ ہو۔ اور تیسرے ابلیس کے لشکر جو ان کی گمراہیوں کا اصل سبب بنے تھے۔

[٦٨] ۞ کون سے معبود جہنم میں ڈالے جائیں گے؟ معبود صرف وہ دوزخ میں پھینکے جائیں گے جو بے جان ہیں مثلاً شجرو حجر اور پتھر یا لکڑی کے بت وغیرہ۔ ان کو پھینکنے کی دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ مشرکوں کی ندامت اور حسرت میں اضافہ ہو اور دوسرے یہ کہ وہ جہنم کی آگ کو مزید بھڑکائیں۔ اور جاندار اشیاء میں سے صرف وہ بزرگ اور اولیاء حضرات دوزخ میں ڈالے جائیں گے جنہوں نے اپنے مریدوں سے شفاعت کے اور ان کو بخشوانے کے وعدے کر رکھے ہوں گے یا وہ ایسی آرزو رکھتے ہوں کہ جو صفات اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں۔ وہ ان میں بھی تسلیم کی جائیں۔ یا اگر کوئی شخص ایسی بات کرے تو اسے ناگوار سمجھنے کے بجائے انہیں خوشی محسوس ہو۔ رہے فرشتے یا انبیاء یا توحید پرست بزرگ جنہیں اس بات کی خبر تک نہیں کہ ان کی عبادت کی جاتی رہی ہے تو ایسے معبود ہرگز جہنم میں داخل نہ ہوں گے۔

۞ عابد اور معبود کا مکالمہ:۔ جہنم میں پھینکے جانے کے بعد مشرک اپنے معبودوں سے الجھ پڑیں گے اور انہیں مخاطب کر کے کہیں گے کہ ہم نے دنیا میں تمہیں اپنا حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ رکھا تھا۔ اسی خیال سے ہم تمہیں پکارتے رہے، تمہاری نذریں نیازیں دیتے رہے، تمہارے آگے جھکتے رہے اور سر تسلیم خم کرتے رہے اور ہر وہ کام کیا جو صرف اللہ رب العالمین کے لئے سزاوار تھا۔ تو یہ ہماری سخت بھول تھی، گمراہی تھی اور اس گمراہی میں ہمیں ابلیس کے ان ساتھیوں نے مبتلا کر رکھا تھا۔ اور آج جب حقیقت حال سامنے آئی ہے تو معلوم ہوا کہ تم بھی ایسے ہی بے بس ہو۔ جیسے ہم ہیں۔ تم خود عذاب میں پڑے ہو۔ تو تم سے سفارش کی کیا توقع کی جا سکتی ہے حالانکہ تمہیں ہی ہم نے اپنا سفارشی سمجھ رکھا تھا۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ آج ہمیں کوئی ایسا دوست بھی نظر نہیں آتا جسے کم از کم ہمارے دکھ درد کا احساس تو ہو۔ دکھ بانٹنا یا سفارش کرنا تو دور کی بات ہے۔ کم از کم ہمیں تسلی دینے کے لئے کوئی دو جملے ہی کہہ دے۔

[٦٩] مجرموں اور جہنمیوں کے اس قول اور اس آرزو کا ذکر بھی قرآن میں متعدد بار آیا ہے اور ساتھ ہی اس کا جواب بھی مذکور ہے۔ یعنی ان کو اگر دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے تو پھر بھی وہ وہی کام کریں گے جیسے پہلے کرتے رہے ہیں (٢٨:١٦) کیونکہ انسان کی تو عادت ہی یہ ہے کہ مشکل کے وقت جب جان پر بن جاتی ہے تو اس وقت وہ صرف ایک اللہ ہی کو یاد کرتا ہے اور دوسرے معبودوں کو بھول جاتا ہے۔ لیکن جب اللہ اسے مصیبت سے نجات دے دیتا ہے تو بعد میں وہ پھر اللہ کو بھول جاتا ہے اور اپنے معبودوں کو ہی پکارنے لگ جاتا ہے۔

كَرَّةً فَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٠٢﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٠٣﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ
الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٠٤﴾ كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٠٥﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٠٦﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ
أَمِينٌ ﴿١٠٧﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٠٨﴾ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٠٩﴾

میں شامل ہوں (۱۰۲) اس میں بھی ایک نشانی [۷۰] ہے اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔ (۱۰۳) اور بلا شبہ آپ کا پروردگار ہی سب پر غالب اور رحم کرنے والا ہے۔ (۱۰۴)

نوح کی قوم نے (بھی) رسولوں [۷۱] کو جھٹلایا تھا۔ (۱۰۵) جبکہ ان کے بھائی نوح نے انہیں کہا تھا کیا تم (اللہ سے) ڈرتے نہیں۔ (۱۰۶) میں تمہارے لئے ایک امانتدار [۷۲] رسول ہوں (۱۰۷) لہٰذا اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری اطاعت [۷۳] کرو۔ (۱۰۸) میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی صلہ نہیں مانگتا [۷۴] میرا صلہ تو اللہ رب العالمین کے ذمہ ہے۔ (۱۰۹)

[۷۰] سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے واقعات زندگی میں نشانی یہ ہے کہ شرک کے خلاف جہاد میں ان کے باپ اور ان کی قوم نے ان کو جس قدر تکلیفیں پہنچائیں اللہ نے انہیں اتنا ہی اعزاز بخشا۔ اسے تمام لوگوں کا امام اور پیشوا بنادیا۔ سب مذاہب کے لوگ ان کا انتہائی عزت و احترام کرتے ہیں اور انہیں اپنا روحانی پیشوا تسلیم کرتے ہیں۔ رہتی دنیا تک لوگ ان کا ذکر خیر کرتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر اس مصیبت سے نجات بخشی جس میں ان کی قوم نے انہیں ڈالا۔ اور ان کے مقابلہ میں ان مشرکوں کو ہر مقام پر ذلیل و رسوا کیا۔ یہ سب دیکھنے اور جاننے کے بعد بھی کم ہی لوگ ہیں جو ایمان لا کر شرک سے کلیتاً دستبردار ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام شرک کی ہر قسم سے بیزار رہے۔

[۷۱] قوم نوح کی طرف مبعوث تو نوح علیہ السلام ہوئے تھے لیکن یہاں جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ تمام انبیاء کی بنیادی تعلیم ایک ہی جیسی رہی ہے۔ لہٰذا ایک نبی کو جھٹلانا سب نبیوں کو جھٹلانے کے مترادف ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس قوم کے پاس نوح علیہ السلام سے پہلے کچھ نبی آئے ہوں۔ جن کا ذکر قرآن اور حدیث میں موجود نہ ہو۔

[۷۲] اس آیت کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کے ہاں سے جو وحی مجھ پر نازل ہوتی ہے بلا کم و کاست تمہیں پہنچا رہا ہوں۔ اس میں نہ کچھ اضافہ کرتا ہوں نہ اس میں کمی کرتا ہوں جوں کی توں تم لوگوں کو پہنچا دیتا ہوں۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ تو تم خود جانتے ہو کہ میں ایک راست باز اور امین انسان ہوں۔ کبھی کسی سے مکر و فریب یا ہیرا پھیری کی بات نہیں کی۔ تو کیا اب میں اللہ کے ذمہ جھوٹی باتیں منسوب کروں گا؟

[۷۳] لہٰذا تمہیں میرے متعلق ہرگز کچھ بدگمانی نہ رکھنا چاہئے اور ایسی بدگمانی کرنے کے سلسلہ میں اللہ سے ڈرتے رہنا چاہئے اور مجھے اللہ تعالیٰ کا امانت دار پیغمبر سمجھ کر میری اطاعت کرنا چاہئے۔

[۷۴] دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ میں بالکل مخلص اور بے غرض ہو کر تمہیں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ نہ اس میں میرا کوئی ذاتی مفاد ہے اور نہ ہی تم سے کسی معاوضہ و اجرت کا مطالبہ کرتا ہوں۔ میں جو بات کہتا ہوں بالکل بے لوث ہو کر اور تمہاری بھلائی کی خاطر کہتا ہوں۔ پھر بھی تم میرے درپے آزار بنے ہوئے ہو۔ اس معاملہ میں بھی تمہیں اللہ سے ڈرنا چاہئے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۱۰﴾ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰي رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ

لہٰذا تم اللہ سے ڈرتے رہو اور میری اطاعت کرو۔(۱۱۰) وہ کہنے لگے: "کیا ہم تجھ پر ایمان لائیں حالانکہ کمینے لوگوں[۷۵] نے تمہاری پیروی کی ہے۔(۱۱۱) نوح نے کہا: "میں کیا جانوں کہ وہ کیا کام کرتے ہیں۔(۱۱۲) ان کا حساب تو میرے پروردگار کے ذمہ[۷۶] ہے۔ کاش تم کچھ شعور رکھتے(۱۱۳) میں ایمان لانے والوں کو پرے ہٹانے[۷۷] والا نہیں۔(۱۱۴) میں تو بس ایک صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔(۱۱۵)

کیونکہ ظلم وزیادتی کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوا کرتا۔ اور ایسے بے غرض اور بے لوث آدمی کی بات مان لینا چاہئے۔

[۷۵] ۞ انبیاء کے اولین مخالف مترفین ہوتے ہیں:۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ ہر نبی کی دعوت کی مخالفت کرنے والے ہمیشہ وہی لوگ ہوتے ہیں جن کا معاشرہ میں کچھ اثر ورسوخ ہوتا ہے۔ جنہیں عموماً چودھری، اشراف یا شیوخ کہا جاتا ہے اور قرآن ان کا ذکر ملأ اور مترفین کے الفاظ سے کرتا ہے۔ اور یہ لوگ انبیاء کی مخالفت محض اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں نبی پر ایمان لانے کی صورت میں مطاع کے بجائے مطیع بننا پڑتا ہے۔ لہٰذا ابتدا میں نبیوں پر ایمان وہی لوگ لاتے ہیں جن کا معاشرہ میں کچھ اثر ورسوخ نہیں ہوتا اور جنہیں یہ اشراف عموماً حقیر اور کمینہ مخلوق تصور کرتے ہیں۔

۞ مترفین کا قول کہ تمہارے ساتھی رذیل لوگ ہیں:۔ دوسری یہ بات کہ یہ اشراف اس بات میں اپنی ہتک اور توہین سمجھتے ہیں کہ ہم ایمان لا کر خود بھی اس حقیر اور کمینہ قسم کے لوگوں میں شامل ہو کر ان میں برابر کی سطح پر آ جائیں۔ یعنی دوسری یہ چیز بھی ان کے ایمان لانے میں رکاوٹ کا سبب بن جاتی ہے اور اس طرح ان کی انا مجروح ہوتی ہے۔ چونکہ قریش مکہ بھی یہی کچھ کیا کرتے تھے لہٰذا اس سوال وجواب میں بھی گویا انہی کا ذکر ہے۔ بلکہ ان کا تو رسول اللہ ﷺ سے یہ مطالبہ بھی ہوتا تھا کہ اس قسم کے لوگوں کو اگر آپ اپنی مجلس سے کسی وقت اٹھا دیں تو ہم آپ کی باتیں سننے کو تیار ہیں۔ (تفصیل کے لئے سورہ انعام کی آیت نمبر ۵۲ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیے)

[۷۶] ان دو آیات کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ مجھے اس بات سے کچھ غرض نہیں کہ جو لوگ تمہاری نظروں میں کمینہ ہیں وہ کیا پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ موچی ہیں یا جولاہے ہیں یا لوہار ہیں یا کمہار ہیں مجھے یہ معلوم کرنے سے کوئی مطلب نہیں۔ مجھے مطلب ہے تو صرف اس بات سے کہ وہ ایمان لے آئے ہیں اور میرے ساتھی ہیں۔ باقی ان کا پیشہ کیا ہے یہ اللہ بہتر جانتا ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ میرے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ جو شخص میرے پاس آ کر ایمان لاتا ہے اور میرے کہنے کے مطابق اس پر عمل کرنے لگتا ہے تو اس کی تہ میں کیا محرکات کام کر رہے ہیں۔ یہ اندازہ لگانا نہ میرا کام ہے نہ تمہارا بلکہ یہ اللہ کا کام ہے۔

[۷۷] اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم نوح کے چودھریوں نے سیدنا نوح علیہ السلام سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اگر تم ان رذیل اور کمینہ لوگوں کو اپنے ہاں سے اٹھا دو تو ہم آپ کے پاس بیٹھنے اور آپ کی باتیں غور سے سننے کو تیار ہیں۔ لیکن ان کی موجودگی میں ہمیں آپ کے پاس بیٹھنا گوارا نہیں۔ اس کے جواب میں نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ تو بڑی بے انصافی اور کم عقلی کی

مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۵﴾ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ
كَذَّبُوْنِ ﴿۱۱۷﴾ فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ
مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۱۹﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۲﴾ كَذَّبَتْ عَادُ ا۟لْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ

النصف — ع ۱۰/۶

وہ کہنے لگے: "نوح! اگر تم باز نہ آئے تو تمہیں سنگسار[۷۸] کر دیا جائے گا۔(۱۱۶) تو نوح نے دعا کی: "پروردگار! میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا ہے۔(۱۱۷) لہٰذا میرے اور ان کے درمیان قطعی فیصلہ کر دے۔ اور مجھے اور میرے ساتھی مومنوں کو ان سے نجات[۷۹] دے۔(۱۱۸) چنانچہ ہم نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو ایک بھری ہوئی کشتی میں (سوار کر کے) بچا لیا۔(۱۱۹) اور اس کے بعد باقی لوگوں کو غرق[۸۰] کر دیا۔(۱۲۰) اس واقعہ میں (بھی) ایک نشانی[۸۱] ہے۔ مگر ان میں اکثر لوگ ماننے والے نہیں۔(۱۲۱) اور یقیناً تمہارا پروردگار سب پر غالب اور رحم کرنے والا ہے(۱۲۲) قوم عاد[۸۲] نے بھی رسولوں کو جھٹلایا تھا۔(۱۲۳) جبکہ ان کے بھائی ہود نے انہیں کہا تھا کہ

بات ہے کہ جو لوگ مجھ پر ایمان لائے ہیں، انہیں اپنے ہاں سے تمہاری خاطر دھکیل دوں جن کا بعد میں بھی ایمان لانے کا کچھ اعتبار نہیں۔ تم لوگ مجھ پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ تمہیں اختیار ہے۔ اور میں نے تمہیں تمہارے انجام سے پوری طرح آگاہ کر دیا ہے۔ بہر حال میں کسی قیمت پر بھی پہلے سے ایمان والوں کو اپنے ہاں سے اٹھانے کو تیار نہیں۔

[۷۸] رجم کا لغوی مفہوم:۔ لفظ من المرجومین کے بھی دو مطلب ہیں۔ رجم کے معنی دور سے پتھر، کنکر وغیرہ پھینکنا اور جان سے مار ڈالنا یا سنگسار کرنا ہے اور یہی معنی ترجمہ میں مذکور ہیں۔ پھر یہ لفظ مادی اور معنوی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اور رجیم اور مرجوم وہ شخص یا چیز ہے۔ جس پر لعنت اور پھٹکار پڑتی رہے۔ یعنی قوم نوح کے چودھریوں نے سیدنا نوح علیہ السلام سے کہا کہ اگر تم اپنی دعوت و تبلیغ سے باز نہ آئے تو ہر طرف سے تم پر لعنت اور پھٹکار پڑتی رہا کرے گی۔

[۷۹] بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے سرداروں میں کوئی دو چار دفعہ ایسے مکالمے اور بحثیں ہوئی ہوں گی۔ لیکن واقعہ ایسا نہیں۔ پورے ساڑھے نو سو سال نوح علیہ السلام اور ان کی قوم میں ایسے مکالمے اور بحث و تکرار ہوتی رہی۔ اور جب سیدنا نوح علیہ السلام اس قوم میں سے کسی نئے فرد کے ایمان لانے سے قطعاً مایوس ہو گئے تو اس وقت آپ نے یہ دعا کی تھی۔ اس دعا کا تفصیلی ذکر سورہ نوح میں آئے گا۔

[۸۰] کشتی نوح اور طوفانِ نوح کا ذکر پہلے سورہ اعراف آیت ۶۴، سورہ یونس آیت نمبر ۷۱، ۷۳، سورہ ہود آیت نمبر ۳۸، ۴۳ میں گزر چکا ہے۔ متعلقہ حواشی ملاحظہ فرما لئے جائیں۔

[۸۱] یعنی سیدنا نوح کی قوم کے انجام سے بھی عبرت حاصل کرنے والے عبرت حاصل کر سکتے ہیں کہ کس طرح اللہ تعالیٰ حق کو ٹھکرانے والوں کو نیست و نابود کر دیتا ہے اور اپنے انبیاء اور مومنوں کو ظالموں کے پنجہ سے نجات دلا کر انہیں باقی رکھتا ہے۔

[۸۲] قومِ نوح کے بعد جس قوم نے دنیا میں ناموری اور سربلندی حاصل کی وہ یہی قوم عاد تھی جسے عادِ اولیٰ بھی کہتے ہیں۔ یہ

هُودٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٢٤﴾ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿١٢٥﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿١٢٦﴾ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿١٢٧﴾ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِیْعٍ اٰیَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿١٢٨﴾ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿١٢٩﴾ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ ﴿١٣٠﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿١٣١﴾ وَاتَّقُوا الَّذِیْۤ

"کیا تم اللہ سے ڈرتے نہیں۔" (١٢٤) میں تمہارے لیے امانت دار رسول ہوں۔ (١٢٥) یقیناً اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ (١٢٦) میں تم سے اس (تبلیغ) کا کوئی صلہ نہیں مانگتا، میرا صلہ تو اللہ رب العالمین کے ذمہ ہے۔ (١٢٧) یہ کیا بات ہے کہ تم ہر بلند جگہ پر بے فائدہ ایک یادگار تعمیر بنا ڈالتے ہو؟ (١٢٨) اور عمارتیں اتنی شاندار بناتے ہو کہ شاید تم ہمیشہ ان میں رہو گے۔ (١٢٩) اور جب کسی [٨٣] پر ہاتھ ڈالتے ہو تو جبار بن کر ڈالتے ہو۔ (١٣٠) لہٰذا اللہ [٨٤] سے ڈرو اور میرا حکم مانو (١٣١) اور اس ذات سے ڈرو جس نے

قوم اللہ تعالیٰ کی ہستی کی تو قائل تھی مگر شرک میں بری طرح مبتلا تھی۔ ان کا اصل وطن احقاف تھا۔ یہ قوم بڑی قد آور، مضبوط اور سرکش تھی۔ ان کی طرف اللہ تعالیٰ نے ہود علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ اس قوم کا زمانہ عروج اڑھائی ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ ہے۔

[٨٣] ۞ یادگاریں تعمیر کرنا قوم عاد کا طریقہ اور عبث کام ہے: اس قوم کے تین افعال کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا جن میں سے پہلے دو فن تعمیر سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلا یہ کہ یہ لوگ یادگاریں بہت زیادہ تعمیر کرتے جن کا عملی طور پر کوئی فائدہ نہ ہوتا تھا۔ کسی نے اپنی یادگار میں شاندار مقبرہ تعمیر کرا لیا۔ کسی نے کوئی اونچا مینار بنایا۔ تو کسی نے کوئی بارہ دری تعمیر کرا دی۔ جیسے اہرام مصر ہیں یا روضہ تاج محل اور اسی طرح کی دوسری یادگاریں آج کل بھی پائی جاتی ہیں اور ان سے مقصود صرف ناموری یا نمود و نمائش ہوتا تھا۔ ﴿تعبثون﴾ سے بعض لوگوں نے مراد کھیل تماشا ہی لیا ہے۔ یعنی وہ ایسی بلند عمارتوں کے اوپر چڑھ کر کبوتر بازی اور پرندوں وغیرہ کا شکار بھی کیا کرتے تھے۔ دوسرا قابل ذکر فعل یہ ہے کہ وہ اپنے رہائشی گھر بھی بہت اونچے، شاندار اور مضبوط بناتے تھے فلک بوس عمارتیں کھڑی کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ ان کی ضرورت بھی تھی۔ ان کے قد بھی بہت لمبے ہوتے تھے اور عمریں بھی بہت دراز ہوتی تھیں اور اگر وہ معمولی قسم کا میٹریل عمارتوں میں استعمال کرتے وہ میٹریل ان کی زندگی میں ساتھ نہیں دیتا تھا اس صورت میں ہر شخص کو اپنی زندگی میں کئی بار مکان بنانے کی ضرورت پیش آسکتی تھی۔ قرآن نے ان کی اس عادت پر سخت نکیر فرمائی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکانوں کی تعمیر میں مضبوطی اور بلندی میں بہت مبالغہ سے کام لیتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ شائد ازل تا ابد انہیں ان مکانات میں رہنا ہے۔ جب یہ قوم اللہ کے عذاب سے تباہ ہوئی تو بعد میں ان کی یہ مضبوط عمارتیں بھی کھنڈرات میں تبدیل ہو گئیں اور آج وہ کھنڈرات بھی معدوم ہو چکے ہیں۔

ان لوگوں کی آسودہ حالی، عالیشان عمارات، اور جسمانی مضبوطی اور توانائی نے انتہائی متکبر بنا دیا تھا۔ انصاف اور نرمی کا برتاؤ ان کی سرشت سے معدوم ہو چکا تھا۔ وہ دوسروں کے حقوق غصب کرنے میں بہت دلیر اور جری تھے۔ اپنے معاشرہ کے کمزور اور ضعیف طبقہ پر بھی ظلم و ستم ڈھاتے تھے اور آس پاس کے علاقوں میں بھی ان کا رویہ جابرانہ اور قاہرانہ ہوتا تھا۔

[٨٤] ہود علیہ السلام نے شرک کے انجام سے ڈرایا اور ان تینوں قسم کے کاموں کی قباحت بیان کرتے ہوئے کہا کہ اللہ سے

أَمَدَّكُم بِمَا تَعْلَمُونَ ﴿۱۳۲﴾ أَمَدَّكُم بِأَنْعَامٍ وَبَنِينَ ﴿۱۳۳﴾ وَجَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿۱۳۴﴾ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ
يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿۱۳۵﴾ قَالُوا سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَوَعَظْتَ أَمْ لَمْ تَكُن مِّنَ الْوَاعِظِينَ ﴿۱۳۶﴾ إِنْ هَٰذَا إِلَّا خُلُقُ الْأَوَّلِينَ ﴿۱۳۷﴾

تمہیں وہ سب کچھ دیا ہے جو تم جانتے[۸۴-الف] ہو(۱۳۲) اس نے تمہیں چوپائے، بیٹے' باغات اور چشمے عطا کئے ہیں(۱۳۴) مجھے تو تمہارے حق میں ایک بڑے دن کے عذاب[۸۵] کا خطرہ ہے۔(۱۳۵) وہ کہنے لگے: ہمیں تو ایسا وعظ کریا نہ کرو، ہمیں اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔(۱۳۶) ایسی باتیں تو یوں ہی ہوتی[۸۶] چلی آئی ہیں۔(۱۳۷)

ڈرتے ہوئے زندگی گزارنے کا طرز عمل سیکھو اور خوب سمجھ لو کہ تمہیں یہاں ہمیشہ رہنا کبھی میسر نہ آئے گا۔ مرنے کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور تمہارے ان تمام افعال واعمال کی تم سے باز پرس بھی ہو گی۔ لہذا تمہارے لئے بہترین راستہ یہ ہے کہ میری بات مان لو اور جس طرح میں کہہ رہا ہوں اسی طرح کرتے جاؤ۔

[۸۴-الف] بعض حضرات نے اس جملہ میں ما کو نافیہ قرار دیا ہے اور ترجمہ یوں کیا ہے کہ اس ذات سے ڈرو جس نے تمہاری ان چیزوں سے مدد کی جن کا تمہیں علم نہیں۔ یعنی تم ان چیزوں کو اللہ کی امداد سمجھتے ہی نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اگلی دو آیات میں ان نعمتوں کا ذکر خود ہی کر دیا ہے۔

[۸۵] پھر ہود علیہ السلام نے ان پر اللہ تعالیٰ کے ایک ایک انعام کا ذکر کیا اور فرمایا کہ تمہیں چاہئے تو یہ تھا کہ اللہ کے انعامات کا شکریہ بجالاتے اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہ بناتے اور اس کے فرمانبردار بندے بن جاتے۔ لیکن تم نے اس کے بجائے فساد پھیلا رکھا ہے۔ لہذا اللہ کی گرفت اس کے عذاب سے ڈر جاؤ جو روش تم نے اختیار کر رکھی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تم پر اللہ کا عذاب آ کے رہے گا۔

﴿عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ﴾ سے مراد وہ دن بھی ہو سکتا ہے جس دن اس قوم پر عذاب نازل ہوا تھا اور قیامت کے دن کا عذاب بھی اور دونوں قسم کے عذاب بھی۔

[۸۶] اس نصیحت کے جواب میں یہ سرکش قوم کہنے لگی کہ ایسی باتیں تو ہم پہلے بھی سنتے چلے آئے ہیں۔ کچھ لوگ نبی بن کر ایسی باتیں کیا کرتے ہیں کہ تم پر اللہ کا عذاب آئے گا اور مرنے جینے کا سلسلہ ان سے پہلے بھی چلتا تھا۔ بعد میں بھی چلتا رہا ہے اور آئندہ بھی چلتا رہے گا۔ لہذا تمہاری ایسی نصیحتیں ہمارے لئے بے کار ہیں۔ نہ ہم ان باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔

۞ بنیاد پرستی کیا ہے؟ امام بخاری نے ﴿خُلُقُ الْأَوَّلِينَ﴾ میں خلق سے دین مراد لیا ہے۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ زیر تفسیر سورۂ روم) اس لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہو گا کہ یہ تو پرانے لوگوں کا مذہب ہے۔ پرانے لوگ ایسی باتیں کیا کرتے تھے۔ مگر اب ایسے اولڈ فیشن لوگوں کا زمانہ لد چکا۔ موجودہ دور میں ایسے لوگوں کے لئے بنیاد پرست (Fundamental) کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ یعنی وہ لوگ جو اپنے عقیدہ وعمل میں اپنے نبی کی تعلیم پر سختی سے عمل پیرا ہوں اور نئی روشنی یا نئی تہذیب کو پرانی جہالت سمجھتے ہوں۔

وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۱۳۸﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾
وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۴۰﴾ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۴۲﴾ ۷ ع ۸ ۱۱
اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۴۳﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۴۴﴾ وَمَا اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ

اور ہم پر کچھ عذاب نہیں آنے کا۔(۱۳۸) چنانچہ انہوں نے ہود کو جھٹلادیا تو ہم نے انہیں ہلاک کر ڈالا[۸۷]۔ اس واقعہ میں بھی ایک نشانی[۸۸] ہے لیکن ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔(۱۳۹) اور یقیناً آپ کا پروردگار سب پر غالب اور رحم کرنے والا ہے۔(۱۴۰) قوم ثمود[۸۹] نے بھی رسولوں کو جھٹلایا۔(۱۴۱) جبکہ ان کے بھائی صالح نے انہیں کہا تھا: "کیا تم اللہ سے ڈرتے نہیں؟(۱۴۲) میں یقیناً تمہارے لئے ایک امانت دار رسول ہوں۔(۱۴۳) لہذا اللہ سے ڈرو[۹۰] اور میری اطاعت کرو(۱۴۴) میں تم سے اس کام کا کوئی صلہ نہیں مانگتا، میرا صلہ تو اللہ رب العالمین کے

[۸۷] قوم عاد پر عذاب کی کیفیت: جب ان لوگوں نے سیدنا ہود علیہ السلام کو اور وعدہ عذاب کو جھٹلانے میں حد کردی اور ان پر حجت تمام ہوگئی تو ان پر اللہ کا عذاب آگیا۔ یہ عذاب قہر الٰہی بن کر نازل ہوا۔ تند و تیز آندھی چلی جو آٹھ دن اور سات راتیں مسلسل چلتی رہی۔ آندھی اتنی تیز تھی کہ کھڑے آدمیوں کو ان کے پاؤں سے اکھاڑ اکھاڑ کر ایک دوسرے پر پھینک رہی تھی۔ یہ آندھی ان کے مضبوط اور عالی شان گھروں میں گھس گھس کر ان کے ایک ایک فرد کو تباہ کر رہی تھی۔ اس عذاب کے وقت ان کے یہ مضبوط اور عالی شان مکان کسی بھی کام نہ آسکے۔ اور یہ سرکش اور متکبر قوم پوری کی پوری تباہ و برباد کردی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس عذاب سے پہلے ہی ہود علیہ السلام کو وحی کردی تھی۔ چنانچہ وہ عذاب سے پہلے اپنے پیروکاروں کو ساتھ لے کر وہاں سے ہجرت کرکے نکل گئے۔

[۸۸] اس قوم کے انجام سے بھی یہی نتیجہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ معاندینِ حق کو اتمام حجت کے بعد نیست و نابود کر دیتا ہے اور اپنے فرمانبرداروں کی نجات کی صورت خود ہی پیدا کر دیتا ہے۔ کاش! کوئی اس عبرت ناک انجام سے سبق حاصل کر سکے۔ مگر ایسے لوگ کم ہی ہوا کرتے ہیں۔

[۸۹] قوم ثمود کا مسکن اور خصائل:۔ قوم عاد اولیٰ کے بعد یہی قوم ثمود، جسے عاد ثانیہ بھی کہتے ہیں، نامور ہوئی۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰ کا ذکر فرمایا، پھر قوم ابراہیم کا، پھر قوم نوح کا، پھر قوم عاد اولیٰ کا اور پانچویں نمبر پر قوم عاد ثانیہ کا ذکر ہے۔ اس قوم کے مسکن کو الحجر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ تین چار سو کلومیٹر لمبا اور تقریباً سو کلومیٹر چوڑا علاقہ حجاز اور شام کے درمیان واقع ہے اور اس راستہ پر واقع ہے جو مدینہ سے تبوک جاتا ہے۔ اس قوم کے رنگ ڈھنگ تقریباً وہی تھے جو عاد اولیٰ کے تھے۔ اسی طرح کے تنومند' قد آور اور مضبوط جسموں کے مالک تھے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے قائل ضرور تھے مگر شرک کے امراض میں بری طرح مبتلا تھے۔ بڑی متکبر اور سرکش قوم تھی۔ ان کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اعلیٰ درجہ کے انجینئر اور بہترین قسم کے سنگ تراش تھے۔ وہ اپنے فن کا مظاہرہ یوں کرتے کہ پہاڑوں میں پتھر تراش تراش کر اپنے عالی شان مکان بنالیتے تھے۔ اسی طرح پہاڑوں کے اندر ہی اندر انہوں نے بستیوں کی بستیاں آباد کر رکھی تھیں۔

[۹۰] سیدنا صالح علیہ السلام کا شجرہ نسب:۔ قوم ثمود کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے اسی قوم کے ایک فرد سیدنا صالح علیہ

الْعٰلَمِيْنَ ۝ؕ اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَاۤ اٰمِنِيْنَ ۝ۙ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ۙ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ۝ۚ
وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ۝ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ۚ وَلَا تُطِيْعُوْۤا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ۙ

ذمہ ہے۔(۱۴۵) کیا تم یہاں کے سامان (عیش و عشرت) میں امن[۹۱] سے رہنے کے لئے چھوڑ دیئے جاؤ گے؟(۱۴۶) ان باغات میں اور ان چشموں میں(۱۴۷) اور کھیتوں میں اور کھجوروں میں جن کے خوشے بہت ملائم ہیں؟(۱۴۸) اور تم پہاڑوں کو تراش تراش کر فخریہ ان میں گھر بناتے ہو۔(۱۴۹) سو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔(۱۵۰) اور حد سے آگے گزرنے والوں کی بات[۹۲] نہ مانو(۱۵۱)

السلام کو مبعوث فرمایا۔ ثمود اس قوم کے جد اعلیٰ کا نام تھا اور صالح علیہ السلام کا شجرہ نسب یوں چلتا ہے۔ صالح بن عبید بن آصف بن ماشح بن عبید بن یاور بن ثمود۔ اس لحاظ سے یہ اپنی قوم کے بھائی ہوئے۔

انبیاء کی دعوت کا آغاز ہمیشہ توحید سے ہوتا ہے۔ وہ اپنی قوم کو اللہ کے احسانات یاد دلاتا ہے۔ ایسے احسانات جسے سب لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ اللہ ہی کے احسانات ہیں۔ پھر قوم کو دعوتِ فکر دی جاتی ہے کہ جب انعامات واحسانات کی بارش کرنے والا صرف اللہ ہے تو تم اس کی بندگی میں دوسروں کو کیوں اس کا شریک بناتے ہو۔ اور اگر قوم پیغمبر کی بات پر توجہ نہ دے یا اس کی دعوت کی مخالفت پر اتر آئے تو وہ انہیں اللہ کی گرفت اور عذاب سے ڈراتا ہے۔ یہی کام صالح علیہ السلام نے بھی اسی انداز پر سر انجام دیا۔

[۹۱] ❁ سیدنا صالح علیہ السلام کی اپنی قوم کو تبلیغ:۔ قوم ثمود کا یہ علاقہ پہاڑیوں کے دامن میں واقع تھا۔ وادیاں زرخیز تھیں۔ جا بجا میٹھے پانی کے چشمے موجود تھے۔ کھیتیاں اور باغات بکثرت تھے جن میں طرح طرح کے پھل اور اعلیٰ قسم کی کھجور پیدا ہوتی تھی۔ اور پہاڑوں کو تراش کر جو وہ مکان بناتے تھے تو وہ محض ضرورت رہائش پوری کرنے کے لئے نہیں بناتے تھے بلکہ خوبصورت سے خوبصورت اور اعلیٰ سے اعلیٰ مکان بنانے میں ہر کوئی ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتا تھا اور اس سے ان کا مقصد اپنے ٹھاٹھ باٹھ اور شان و شوکت کا مظاہرہ کرنا ہوتا تھا۔ سیدنا صالح علیہ السلام نے ان سے پوچھا، تمہارا کیا خیال ہے کہ تمہیں کبھی موت نہیں آئے گی جو اس قدر دنیا پر ریجھ گئے ہو اور اپنے پروردگار کو بالکل فراموش کر دیا ہے؟ اللہ نے اگر تمہیں یہ نعمتیں دی ہیں تو اس کی ناشکری کی بنا پر وہ تم سے چھین بھی سکتا ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ اور اس کی گرفت سے ڈرتے رہو اور اگر انجام بخیر چاہتے ہو تو میرے بتائے ہوئے راستہ پر عمل کرو۔

[۹۲] سیدنا صالح علیہ السلام کا یہ خطاب نچلے طبقہ کے لوگوں سے تھا جو تعداد میں زیادہ مگر چودھری ٹائپ لوگوں کے زیر نگیں ہوتے ہیں اور عموماً یہی لوگ انبیاء علیہم السلام کی دعوت پر توجہ دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ چودھریوں کے مظالم سے تنگ آئے ہوتے ہیں۔ آپ نے انہیں سمجھایا کہ اپنے ان چودھریوں اور رئیسوں کی اطاعت چھوڑ دو۔ کیونکہ یہ مُسرف لوگ ہیں جو اخلاق کی ساری حدیں پھلانگ کر شتر بے مہار بن چکے ہیں۔ ان کے ہاتھوں خیر اور بھلائی یا معاشرتی بگاڑ کی اصلاح کبھی نہیں ہو سکتی۔ تمہارے لئے ان لوگوں سے نجات حاصل کرنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ اپنے اندر اللہ کا خوف اور تقویٰ پیدا کرو

الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (۱۵۲) قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ (۱۵۳) مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ
مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۱۵۴) قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (۱۵۵)

جو ملک میں فساد کرتے پھرتے ہیں اور اصلاح کا کوئی کام نہیں کرتے۔(۱۵۲) وہ کہنے لگے: "تم تو ایک سحر زدہ [۹۳] آدمی ہو(۱۵۳) تم ہمارے ہی جیسے ایک آدمی ہو۔ اگر تم سچے ہو تو کوئی نشانی لاؤ۔(۱۵۴) صالح نے کہا: "نشانی یہ اونٹنی [۹۴] ہے ایک دن اس اونٹنی کے ۔۔پانی پینے کے لئے مقرر ہے اور ایک دن تم سب کے لئے (۱۵۵)

اور ان کی اطاعت کے بجائے میری اطاعت کرو۔ کیونکہ میں اللہ کا رسول ہوں اور اللہ کے بتائے ہوئے طریقے سے ہی تمہاری اخلاقی، تمدنی اور سیاسی اصلاح ممکن ہے۔

[۹۳] سیدنا صالح علیہ السلام کی دعوت پر جب چند کمزور قسم کے لوگ ایمان لے آئے۔ تو چودھری لوگ سیدنا صالح علیہ السلام کا مذاق اڑانے لگے کہ ان لوگوں کے سہارے تم انقلاب لانا چاہتے ہو؟ کیا تمہاری عقل تو جواب نہیں دے گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے جو ایسی بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہو۔ پھر جب صالح علیہ السلام کے پیروکاروں میں کچھ مزید اضافہ ہو گیا۔ تو چودھریوں کو کچھ فکر لاحق ہونے لگی اور ان کا اندازِ کلام بھی بدل گیا۔ کہنے لگے: تم بھی ہمارے ہی جیسے آدمی ہو آخر تم میں وہ کون سی زائد خوبی ہے کہ ہم تجھے اللہ کا رسول تسلیم کر لیں۔ ہاں اگر تم واقعی اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو کوئی نشانی پیش کرو۔

[۹۴] ۞ قوم ثمود کا سیدنا صالح علیہ السلام سے حسی معجزہ کا مطالبہ:۔ صالح علیہ السلام نے ان سے پوچھا: کونسی نشانی چاہتے ہو؟ وہ کہنے لگے ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ سامنے والا پہاڑ پھٹے اور اس میں سے ایک حاملہ اونٹنی برآمد ہو۔ پھر وہ حاملہ اونٹنی ہمارے سامنے بچہ جنے تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ صالح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی۔ جسے اللہ تعالیٰ نے شرف قبولیت بخشا۔ پہاڑ پھٹا جس سے ایک عظیم الجثہ اور دیو ہیکل اونٹنی پیدا ہوئی۔ جس نے ان لوگوں کے سامنے بچہ جنا۔ جب قوم کا مطلوبہ معجزہ ظہور میں آ گیا تو یہ ان لوگوں کے لئے ایک مصیبت بن گیا۔ کیونکہ اونٹنی اگر کسی کنوئیں یا چشمے پر پانی پینے جاتی تو قوم کے دوسرے جانور اس اونٹنی کے قد و قامت اور ڈیل ڈول سے ڈر کر بھاگ جاتے تھے۔

[۹۵] ۞ اونٹنی کے پانی پینے کی باری قوم نے کیوں تسلیم کی؟ عرب جیسے بے آب و گیاہ ملک میں پانی کی ہمیشہ کمی ہی رہی ہے اور پانی کا مسئلہ نہایت اہم مسئلہ تھا۔ لہذا صالح علیہ السلام نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک دن صرف یہ اللہ کی اونٹنی فلاں کنوئیں سے پانی پیا کرے گی۔ اس دن قوم کے جانور پانی پینے کے لئے ادھر نہ جائیں اور دوسرے دن قوم کے جانور پانی پیا کریں گے اور اونٹنی ادھر نہیں جائے گی۔ صالح علیہ السلام کا یہ فیصلہ اللہ کے حکم کے مطابق تھا۔ جسے قوم نے تسلیم کر لیا۔ مگر اس تسلیم کے پیچھے ان کی اپنی رضا کو کچھ دخل نہ تھا۔ بلکہ وہ یہ فیصلہ تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ اور اس کی دو وجوہ تھیں ایک یہ کہ فیصلہ کے ساتھ ہی صالح علیہ السلام نے یہ وارننگ بھی دے دی تھی کہ اگر تم لوگوں نے اس اونٹنی کو کوئی دکھ پہنچایا یا اس کے آزادی سے چرنے چگنے اور پانی پینے میں حائل ہوئے تو تم پر اللہ کا عذاب آ جائے گا اور دوسرے یہ کہ یہ اونٹنی کا معجزہ دیکھنے کے بعد انہیں یہ یقین ہو چکا تھا

وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵۶﴾ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿۱۵۷﴾ فَاَخَذَهُمُ

الْعَذَابُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۸﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۵۹﴾ ع

اسے کوئی دکھ نہ پہنچانا ورنہ ایک بڑے دن[۹۵] کا عذاب تمہیں آلے گا۔(۱۵۶) مگر ان لوگوں[۹۶] نے اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں پھر (عذاب کے ڈر سے) لگے پچھتانے (۱۵۷) آخر عذاب نے انہیں آلیا[۹۷]۔ اس واقعہ میں بھی ایک نشانی[۹۸] ہے مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔(۱۵۸) بلاشبہ آپ کا پروردگار ہی سب پر غالب اور رحم کرنے والا ہے۔(۱۵۹)

کہ صالح علیہ السلام واقعی اللہ کے رسول ہیں۔ لہذا وہ ان پر ایمان نہ لانے کے باوجود ان کی تنبیہ سے خائف تھے۔

[۹۶] لیکن یہ لوگ زیادہ مدت تک اس پابندی کو برداشت نہ کر سکے۔ چوری چھپے باتیں کرتے اور دل ہی دل میں اس پابندی سے کڑھتے رہتے تھے۔ پھر جب ان کے ایمان نہ لانے پر بھی اللہ کا عذاب نہ آیا تو وہ کچھ دلیر ہو گئے۔ ان میں ایک بدکار عورت تھی جس کے بہت سے مویشی تھے اور خاصی مالدار تھی۔ اس نے اپنے آشنا کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اس اونٹنی کا قصہ پاک کر دے۔ چنانچہ اب اونٹنی کو مار ڈالنے کے سلسلہ میں خفیہ مشورہ ہونے لگے۔ مویشیوں کے لئے پانی اور چارے کے آدھا رہ جانے کی وجہ سے سب لوگ ہی اس اونٹنی سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ لہذا سب نے ہاں میں ہاں ملا دی۔ چنانچہ وہی بدبخت زانی اس کام کے لئے تیار ہو گیا۔ چنانچہ عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ میں سیدنا صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا اور اس شخص کا ذکر کیا جس نے اونٹنی کو زخمی کیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ وہ شخص اپنی قوم میں سب سے زیادہ بدبخت تھا۔ وہ ایک زور آور، شریر اور مضبوط شخص تھا جو اپنی قوم میں ابوزمعہ (زبیر بن عوام کا چچا) کی طرح تھا اور اس کا نام قدار تھا" (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ تفسیر سورہ الشمس)

[۹۷] سیدنا صالح علیہ السلام پر قاتلانہ حملہ کی سازش:۔ اس بدبخت نے اونٹنی کی کونچیں (پاؤں کی رگیں) تلوار وغیرہ کے حملہ کر کے کاٹ ڈالیں۔ اونٹنی نے ایک زور کی چیخ ماری اور اسی پہاڑ میں جا کر غائب ہو گئی۔ اسی طرح اس کا بچہ بھی اسی پہاڑ میں جا کر غائب ہو گیا۔ اب ان لوگوں کو عذاب کا خطرہ محسوس ہونے لگا۔ جب حالات تشویشناک ہو جائیں تو عموماً انسان کی عقل ماری جاتی ہے۔ اور وہ الٹا سوچنے لگتی ہے۔ چنانچہ ان بدبختوں نے سیدنا صالح علیہ السلام کو بھی ٹھکانے لگانے کے لئے خفیہ مشورے شروع کر دیئے۔ ان کی عقل نے یہی کام کیا کہ اگر صالح علیہ السلام بھی نہ رہے تو شائد عذاب نہیں آئے گا ان حالات کا صالح علیہ السلام کو علم ہو گیا تو آپ نے انہیں بحکم الٰہی تین دن کا الٹی میٹم دے دیا کہ تین دن مزے اڑا لو۔ بعد میں تم پر عذاب آ جائے گا۔ (۱۱:۶۵)

سیدنا صالح علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کی کل تعداد ایک سو بیس تھی۔ آپ انہیں ساتھ لے کر المدائن کی طرف ہجرت کر گئے اور رملہ کے قریب جا کر آباد ہو گئے۔ اسی مقام پر سیدنا صالح علیہ السلام نے وفات پائی۔

[۹۸] قوم ثمود پر زلزلہ اور صاعقہ کا عذاب:۔ اس قوم پر زبردست زلزلے کا عذاب آیا۔ جس نے پہاڑوں تک جڑیں ہلا دیں۔ ان میں شگاف پڑ گئے اور پتھر پر پتھر گرنے لگے جس سے ان کے بیشتر مکانات کھنڈرات میں تبدیل ہو گئے اس دوران بڑی خوفناک اور کانوں کو پھاڑنے والی آوازیں بھی نکلتی تھیں۔ چنانچہ اس دوہرے عذاب سے یہ بدبخت قوم صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دی گئی۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٦٠﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٦١﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٦٢﴾

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٦٣﴾ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٦٤﴾ أَتَأْتُونَ

الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَالَمِينَ ﴿١٦٥﴾ وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُونَ ﴿١٦٦﴾

قَالُوا لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ يَا لُوطُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِينَ ﴿١٦٧﴾ قَالَ إِنِّي لِعَمَلِكُمْ مِنَ الْقَالِينَ ﴿١٦٨﴾ رَبِّ نَجِّنِي

لوط کی قوم نے (بھی) رسولوں[۹۹] کو جھٹلایا تھا۔(۱۶۰) جبکہ انہیں ان کے بھائی لوط نے کہا تھا کہ "تم کیا اللہ سے ڈرتے نہیں؟(۱۶۱) یقیناً میں تمہارے لئے امانت دار رسول ہوں۔(۱۶۲) لہٰذا اللہ سے ڈرتے رہو اور میری اطاعت کرو۔(۱۶۳) اور میں اس (تبلیغ) کا تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا، میرا صلہ تو اللہ رب العالمین کے ذمہ ہے۔(۱۶۴) کیا تم اہل عالم میں سے مردوں کے پاس جاتے ہو؟(۱۶۵) اور تمہارے پروردگار نے تمہارے لئے جو بیویاں پیدا کی ہیں انہیں چھوڑ دیتے ہو، بلکہ تم لوگ تو حد (انسانیت) سے آگے نکل گئے ہو"(۱۶۶) وہ کہنے لگے: "اے لوط! تم اگر ان باتوں سے باز نہ آئے تو تمہیں جلاوطن[۱۰۰] کر دیا جائے گا۔(۱۶۷) اس نے کہا: میں تمہارے اس کام سے سخت بیزار ہوں۔(۱۶۸) پھر (دعا کی)

قوم ثمود کی تباہی بھی اللہ کی سنت کے عین مطابق واقع ہوئی۔ اور اس میں بھی عبرت کے کئی اسباب پوشیدہ ہیں۔ کاش! یہ لوگ اس واقعہ سے ہی سبق حاصل کریں۔ مگر ان لوگوں کی اکثریت ایسی ہی ہے جو ایمان لانے کی طرف نہیں آتی۔

[۹۹] لوط علیہ السلام سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے وطن کو خیر باد کہا تو اس وقت صرف یہی ایک فرد آپ پر ایمان لایا تھا اور آپ کے ہمراہ فلسطین کی طرف ہجرت کی تھی۔ یہیں آپ کو نبوت عطا ہوئی۔ اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے آپ کو شرق اردن کی طرف روانہ کر دیا۔ آپ کی تبلیغ کا مرکز سدوم اور اس کے ارد گرد کا علاقہ اور عمورہ کی بستیاں تھیں۔ آپ کی قوم مشرک اور دوسری بداخلاقیوں کے علاوہ لواطت میں گرفتار بلکہ اس بدفعلی کی موجد تھی۔ ان لوگوں پر بھی خاندانی منصوبہ بندی کا بھوت سوار تھا۔ اسی لئے شہوت رانی کے فطری طریق کو چھوڑ کر لونڈے بازی کا فعل شروع کیا پھر یہ لوگ اپنی غیر فطری روش پر نادم نہیں تھے۔ نہ ہی اسے گناہ سمجھتے تھے۔ بلکہ عقلی لحاظ سے اس کے بہت فوائد بتاتے تھے۔

[۱۰۰] ❁ قوم کی سیدنا لوط علیہ السلام پر پابندی اور جلاوطنی کی دھمکی:۔ لوط علیہ السلام نے انہیں اللہ تعالیٰ کا پیغام سنایا اور ان کی بدفعلیوں کے برے انجام سے ڈرایا تو انہوں نے سیدنا لوط علیہ السلام کی بات ماننے کے بجائے الٹا ان پر کئی طرح کی پابندیاں لگا دیں۔ مثلاً اگر تم اس بستی میں رہنا چاہتے ہو تو ہمارے معاملات میں دخل دینا چھوڑ دو۔ دوسرے یہ کہ اپنے ہاں مہمانوں کو یا مسافروں کو پناہ نہ دیا کرو۔ ورنہ ہم تمہارا کچھ لحاظ نہیں کریں گے اور تمہارے مہمانوں یا مسافروں سے وہی سلوک کریں گے جو ہم کرنا چاہتے ہیں (یہ بدبخت قوم مسافروں یا مہمانوں تک کو بھی نہیں چھوڑتی تھی، پہلے ان سے لواطت کرتی۔ پھر ان سے مال اسباب اور نقدی وغیرہ چھین کر انہیں دھکے دے کر اپنی بستی سے باہر نکال دیتی تھی) اور اگر تمہیں ہماری یہ شرائط منظور نہ ہوں تو ہم تمہیں اپنے علاقہ سے نکال دیں گے۔ تمہارے جیسے پاکبازوں کی ہماری بستی میں رہنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

وَاَهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۷۲﴾

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۳﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۴﴾

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۷۵﴾ كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْئَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۶﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا ع ۹ ۱۳

پروردگار! جو کام یہ لوگ کررہے ہیں اس سے مجھے اور میرے گھر والوں[۱۰۱] کو نجات دے۔(۱۶۹)

چنانچہ ہم نے اسے اور اس کے سب اہلِ خانہ کو نجات دی۔(۱۷۰) بجز ایک بڑھیا کے جو پیچھے[۱۰۲] رہ جانے والوں میں شامل تھی۔(۱۷۱) پھر باقی ماندہ لوگوں کو ہم نے ہلاک کردیا۔(۱۷۲) اور ہم نے ان پر ایک (خاص) بارش برسائی۔ کتنی بری تھی وہ بارش جو ڈرائے جانے والے لوگوں پر برسائی[۱۰۳] گئی۔(۱۷۳) اس واقعہ میں (بھی) ایک نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔(۱۷۴) اور یقیناً آپ کا پروردگار سب پر غالب اور رحم کرنے والا ہے۔(۱۷۵)

اصحاب الایکہ[۱۰۴] (اصحابِ مدین) نے (بھی) رسولوں کو جھٹلایا(۱۷۶) جبکہ ان سے شعیب[۱۰۵] نے کہا: کیا

[۱۰۱] سیدنا لوط علیہ السلام اور آپ کے معدودے چند پیروکار اس اوباش اور گندے قسم کے معاشرے سے سخت بیزار تھے۔ جب لوط علیہ السلام ان لوگوں کے راہ راست پر آنے سے مایوس ہوگئے اور ان کی سرکشی بڑھتی ہی گئی تو اس وقت آپ نے سخت اضطراب کے عالم میں اللہ سے دعا کی کہ ہم اب زیادہ دیر اس اوباش سوسائٹی میں نہیں رہ سکتے لہذا ان لوگوں سے ہماری نجات کی کوئی صورت پیدا فرما دے۔

[۱۰۲] سیدنا لوط علیہ السلام کی بیوی کا کردار:۔ سیدنا لوط علیہ السلام کی بیوی بھی درپردہ ان اوباشوں سے ملی ہوئی تھی۔ جب کوئی مہمان آپ کے گھر آتا تو یہ ان اوباشوں کو اشاروں کنایوں سے خفیہ طور پر رپورٹیں دیا کرتی تھی۔ چنانچہ جب اس قوم پر عذاب لانے والے فرشتے سیدنا لوط علیہ السلام کے ہاں خوبصورت لڑکوں کی شکل میں تشریف لائے تو اسی بڑھیا کی رپورٹ پر آس پاس کے اوباش ہمسائے بری نیت سے آپ کے گھر میں گھس آئے تھے۔ لہذا یہ عورت کسی لحاظ سے بھی نجات کی مستحق نہ تھی۔

[۱۰۳] اس بدبخت قوم پر جس طرح عذاب آیا اس کی تفصیلات پہلے سورہ اعراف آیت نمبر ۸۴ سورہ توبہ آیت نمبر ۷۰، سورہ ہود آیت نمبر ۸۳، سورہ حجر آیت نمبر ۷۳ میں گزر چکی ہیں۔ ان کے حواشی ملاحظہ کرلئے جائیں۔

[۱۰۴] اصحاب الایکہ کون لوگ تھے؟ اس میں مفسرین کا خاصا اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اصحاب الایکہ اور اصحاب مدین دونوں ایک ہی قوم کے نام ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ایکہ ایک درخت کا نام تھا جس کی یہ لوگ پوجا کرتے تھے۔ اسی نسبت سے انہیں اصحاب الایکہ کہا گیا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ ان لوگوں کی بستی اور علاقہ اصحاب مدین سے الگ ہے۔ اصحاب الایکہ کا معنی بن والے یعنی یہ بستی ایک لمبی سی بلند جگہ پر آباد تھی۔ جہاں باغات کے جھنڈ بکثرت تھے اور شعیب علیہ السلام ان دونوں علاقوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔

[۱۰۵] یہ وہی شعیب علیہ السلام ہیں جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے سسر تھے اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے ان کے ہاں آٹھ

تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۷۸﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۷۹﴾ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ
اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۸۰﴾ اَوْفُوا الْكَیْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِیْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ
الْمُسْتَقِیْمِ ﴿۱۸۲﴾ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ﴿۱۸۳﴾ وَاتَّقُوا الَّذِیْ
خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۸۴﴾ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ ﴿۱۸۵﴾ وَمَاۤ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ

تم ڈرتے نہیں؟(۱۷۷) میں تمہارے لئے امانت دار رسول ہوں۔(۱۷۸) لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو(۱۷۹)
میں تم سے اس (تبلیغ) کا کوئی صلہ نہیں مانگتا، میرا صلہ تو اللہ رب العالمین کے ذمہ ہے۔(۱۸۰) ناپ[۱۰۶] پورا دیا
کرو اور لوگوں کو گھاٹا نہ دیا کرو۔(۱۸۱) اور سیدھی ترازو سے تولا کرو۔(۱۸۲) اور لوگوں کو ان کی اشیاء کم نہ دیا کرو اور
زمین میں فساد[۱۰۷] نہ مچاتے پھرو۔(۱۸۳) اور اس ذات سے ڈرو جس نے تمہیں بھی پیدا کیا اور تم سے پہلے لوگوں
کو بھی۔(۱۸۴) وہ کہنے لگے: "تم تو ایک جادو[۱۰۸] کے مارے ہوئے آدمی ہو(۱۸۵) اور ہم جیسے ہی ایک انسان ہو اور ہم

دس سال تربیت حاصل کی تھی۔ پانچویں نسبت پر سیدنا یعقوب علیہ السلام سے جا ملتے ہیں۔ شجرہ نسب یہ ہے شعیب بن میکیل بن یشجر بن لاوی بن یعقوب علیہ السلام۔

[۱۰۶] **سیدنا شعیب کی قوم لین دین میں ہیرا پھیری کی مرتکب تھی:۔** سیدنا شعیب علیہ السلام کی قوم دو تجارتی شاہراہوں کے تقاطع یا چوک پر آباد تھی۔ لہذا یہ پورے کا پورا علاقہ بڑا بھاری تجارتی مرکز بن گیا تھا۔ شرک اور دوسری اخلاقی برائیوں کے علاوہ ان میں جو سب سے بڑا مرض تھا وہ تجارتی ہیرا پھیری کرنا تھا۔ ناپ تول میں ایسے استاد تھے کہ بھلے بھلوں کے کان کتر دیتے تھے۔ تولتے اس طرح تھے کہ گاہک خواہ سو دفعہ ترازو دیکھتا رہے یہ اس کے دیکھتے دیکھتے ہی تیسرا یا چوتھا حصہ اس کا حق مار جاتے اور جب تول کر یا ناپ کر دینا پڑتا تو ایسی ہی ہاتھ کی صفائی دکھاتے تھے۔

[۱۰۷] یہ لوگ صرف ناپ اور تول میں ہی کمی بیشی نہ کرتے تھے بلکہ تجارتی بددیانتیوں کے سارے اسرار و رموز اور فریب کاریوں سے واقف تھے۔ عیب دار مال کا عیب چھپا کر فروخت کرنا، جھوٹ بول کر اور جھوٹی قسمیں کھا کر مال بیچنا، ایسا ماحول پیدا کر دینا کہ چیز کا مالک کم سے کم قیمت پر اپنی چیز فروخت کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اسی طرح اپنی چیز فروخت کرنے کے لئے ایسا ماحول بنا دینا کہ وہ زیادہ سے زیادہ رقم دینے پر مجبور ہو جائے۔ غرض ہر طریقہ جس سے دوسروں کے حقوق غصب کئے جا سکتے ہوں وہ جانتے تھے۔ اور یہی وہ فساد فی الارض یا شریفانہ قسم کی ڈاکہ زنی ہے۔ جس سے شعیب علیہ السلام نے انہیں منع کیا تھا۔ اور انہیں یہ نصیحت فرمائی تھی کہ میرے خیال کے مطابق تو تم سب اچھے بھلے کھاتے پیتے لوگ ہو۔ لہذا اگر ایسی بددیانتیاں چھوڑ دو اور حلال طریقے سے روزی کماؤ تو تمہارے گزارے کے لئے حلال کا رزق بھی بہت کافی ہو سکتا۔ لہذا اللہ سے ڈر جاؤ اور لوگوں کے حقوق غصب کرنا چھوڑ دو۔

[۱۰۸] **قوم کا سیدنا شعیب علیہ السلام کو مجنون اور بشر کہہ کر جھٹلا دینا:۔** اس کے جواب میں قوم نے کہا۔ تمہاری عقل ٹھیک کام نہیں کرتی۔ تم تجارت کے گر اور راز کیا جانو۔ اگر ہم تمہاری باتوں پر لگ جائیں تو چند ہی دنوں میں اس میدان میں مات کھا جائیں اور سرمایہ

نَظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۱۸۶﴾ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۷﴾ قَالَ رَبِّيْٓ
اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۸۹﴾ اِنَّ فِيْ
ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۹۱﴾ وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ ع ۱۴

تو تمہیں جھوٹا ہی خیال کرتے ہیں۔(۱۸۶) اگر تم سچے ہو تو ہم پر آسمان سے کوئی ٹکڑا گرا دو۔(۱۸۷) شعیب نے کہا: ''جو کچھ تم کرتے ہو[۱۰۹] میرا پروردگار اسے خوب جانتا ہے۔(۱۸۸) چنانچہ انہوں نے شعیب کو جھٹلا دیا تو سایہ والے دن کے عذاب نے انہیں آپکڑا۔ بلاشبہ وہ بڑے سخت[۱۱۰] دن کا عذاب تھا۔(۱۸۹) اس واقعہ میں (بھی) ایک نشانی[۱۱۱] ہے، مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں ہیں۔(۱۹۰) اور آپ کا پروردگار یقیناً سب پر غالب اور رحم کرنے والا ہے۔(۱۹۱) بلاشبہ یہ (قرآن) رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔(۱۹۲)

بھی ہاتھ سے گنوا بیٹھیں کیونکہ مقابلہ بڑا سخت ہے۔ اور ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ تمہارا یہ نبوت کا دعویٰ بھی بس ایک فریب ہی ہے۔ تم بھی ہمارے جیسے ایک محتاج انسان ہی ہو۔ تم میں ہم سے زائد کونسی خصوصیت ہے کہ ہم تمہیں نبی سمجھ لیں۔ اگر تم اپنے آپ کو اپنے اس دعویٰ نبوت میں سچا سمجھتے ہو کہ جس عذاب سے ہمیں ڈراتے دھمکاتے رہتے ہو وہ عذاب ہم پر لے آؤ۔ اور آسمان کا کوئی ٹکڑا ہی ہم پر گرا دو۔

واضح رہے کہ قریش مکہ نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی قسم کے عذاب کا مطالبہ کیا تھا جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۹۲ میں گزر چکا ہے۔ اور کفارِ مکہ کو بتایا جارہا ہے کہ تم سے پہلے بھی ایک قوم ایسے عذاب کا مطالبہ کر چکی ہے۔ پھر جو حشر اس قوم کا ہوا تھا وہی یا اس سے ملتا جلتا تمہارا بھی ہونے والا ہے۔

[۱۰۹] ۞ سیدنا شعیب علیہ السلام کا انتباہ:۔ یعنی عذاب نازل کرنا یا آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دینا میرا کام نہیں۔ میرا پروردگار تمہاری کرتوتوں کو دیکھ رہا ہے۔ جب تمہارے گناہوں کا ڈول بھر جائے گا یا جب وہ مناسب موقع سمجھے گا تم پر عذاب نازل کر دے گا میں تو تمہیں صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ جو لوگ اللہ کی نافرمانی میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اللہ کا طریقہ یہی ہے کہ ان پر عذاب بھیج کر انہیں تباہ کر دے۔

[۱۱۰] اس آیت سے چند باتوں کا پتہ چلتا ہے ایک یہ کہ اصحابِ مدین اور اصحاب الایکہ دو الگ الگ قومیں تھیں۔ اصحاب مدین پر زلزلہ اور اس سے پیدا ہونے والی ہولناک آواز کا عذاب آیا تھا (۷:۹۱، ۱۱:۹۴) جبکہ اصحاب الایکہ پر سائے کے دن کا عذاب آیا تھا اگرچہ اس عذاب کی تفصیل کتاب و سنت میں کہیں مذکور نہیں تاہم اتنا ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ عذاب کی الگ نوع ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سخت گہرے اور گاڑھے بادل ان پر چھتری کی صورت میں محیط ہو گئے تھے۔ اور اس کے تادیر ان پر سایہ کئے رکھنے اور اس کی دہشت سے ان کی تباہی ہوئی تھی۔ اور ایسے ہی عذاب کا ان لوگوں نے مطالبہ کیا تھا۔ اور دوسرے یہ کہ ان قوموں کی طرف شعیب علیہ السلام ہی مبعوث ہوئے تھے اور یہ دونوں اقوام ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلہ پر آباد تھیں اور یہ دونوں ہی تجارتی بددیانتیاں کرتے تھے۔

[۱۱۱] ۞ سات مستند تاریخی واقعات کا ماحصل۔ اللہ کی نافرمانی اور رسول کی تکذیب کے نتیجہ میں اللہ کا عذاب:۔ سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے سات اقوام کا ذکر کیا ہے۔ قوم موسیٰ، قوم ابراہیم، قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط اور قوم شعیب ان سب قوموں نے اپنے اپنے نبیوں کی تکذیب کی۔ اگرچہ ان اقوام کے تمدنی حالات ایک دوسرے سے مختلف تھے اور انبیاء سے ان کی بحث و جدال اور

الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٩٢﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿١٩٣﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿١٩٤﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿١٩٥﴾

جسے روح الامین لے کر آپ کے دل[۱۱۳] پر نازل ہوا۔(۱۹۳) تاکہ آپ ڈرانے[۱۱۳] والوں میں شامل ہو جائیں۔(۱۹۴) جو کہ فصیح عربی زبان[۱۱۴] میں ہے۔(۱۹۵)

سوال وجواب کا انداز بھی کچھ حد مختلف اور کچھ حد تک یکساں رہا۔ لیکن چونکہ ان کے بنیادی جرم کی نوعیت ایک جیسی تھی یعنی تکذیب رسالت۔ لہٰذا ان کا انجام بھی ایک ہی جیسا رہا یعنی وہ بالآخر اللہ کے عذاب سے تباہ و برباد ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں اور ان پر ایمان والوں کو ان ظالموں کے ہاتھوں سے بھی اور اپنے عذاب سے بھی بچا لیا۔ ان سات مستند تاریخی واقعات کے بعد بھی اگر کوئی شخص رسول کی تکذیب اور اللہ کی نافرمانی کے انجام یعنی عذاب الٰہی میں باہمی ربط کو توڑنا چاہے۔ اور عذاب الٰہی کے طبعی اسباب ڈھونڈنا شروع کر دے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے سات مرتبہ فرمایا ﴿وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ اور یہ خطاب صرف کفار مکہ کیلئے ہی نہیں بلکہ ہر اس شخص کے لئے جو اس سبب اور اس کے انجام کے ربط کو توڑنا چاہتا ہے۔ اور قیامت تک کے لئے ہے۔ اور ایسے شخص وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ کو بھول کر دنیا کے بندے ہی بن کر رہ گئے ہوں۔ خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔

ان مسلمہ تاریخی واقعات اور ان کے مسلمہ نتائج بیان کرنے کے بعد سلسلہ کلام اسی مضمون کی طرف پھر تا ہے جو اس سورہ کے ابتدا میں بیان ہوا تھا۔

[۱۱۲] یعنی قرآن اور اس میں بیان کردہ یہ تاریخی واقعات اس اللہ رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہیں جو عالم الغیب والشہادۃ ہے۔ پھر ان قرآنی آیات کو لے کر امین روح یعنی جبریل علیہ السلام نازل ہوئے جو اپنی طرف سے کچھ کمی بیشی نہیں کر سکتے۔ پھر جب بھیجنے والا غیب اور شہادت کو پوری طرح جانتا ہو اور اس کو لانے والا بھی امین ہو تو ان آیات کے مبنی بر حقائق ہونے میں شک کی کون سی گنجائش رہ جاتی ہے؟

[۱۱۳] پھر یہی مبنی بر حقائق آیات جبریل امین لے کر براہ راست آپ کے دل پر اس کلام کو نازل کرتے ہیں تاکہ آپ ایسے واقعات تمام لوگوں کو سنا کر نافرمانوں کو ان کے برے انجام سے بروقت متنبہ کر دیں۔

۞ وحی کے نزول کے وقت آپ ﷺ کی کیفیت:۔ واضح رہے وحی الٰہی کی تین صورتیں قرآن میں مذکور ہیں سب سے معروف شکل یہ ہے کہ جبریل پیغمبر کے دل پر نازل ہو کر وحی کے الفاظ اس میں ڈال دے اس صورت میں پیغمبر کا رشتہ عالم دنیا سے کٹ کر عالم بالا سے جڑ جاتا ہے۔ وحی کے دوران پیغمبر کے حواس ظاہری کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ اور قلبی حواس کام کرنے لگ جاتے ہیں۔ پیغمبر دل کی آنکھ سے فرشتہ کو دیکھتا ہے۔ دل کے کانوں سے وحی سنتا ہے۔ بالفاظ دیگر وحی کے دوران پیغمبر کو بشریت سے کٹ کر ملکیت کی طرف کرتا ہے۔ لہٰذا وحی کی یہ شکل جسمانی لحاظ سے آپ کے لئے نہایت تکلیف دہ ہوتی تھی۔ شدید قسم کا بوجھ آپ پر پڑ جاتا تھا اور حالت غیر ہو جاتی تھی اور اس بوجھ کو وہ جاندار بھی محسوس کرتے تھے جن کا جسم آپ کے جسم سے لگا ہوتا تھا۔ چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ "میں نے آپ ﷺ سے پوچھا: یا رسول اللہ! آپ پر وحی کیسے آتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ کبھی تو ایسے آتی ہے جیسے گھنٹے کی جھنکار اور یہ وحی مجھ پر بہت سخت گزرتی ہے۔ پھر جب فرشتے کا کہا مجھ کو یاد ہو جاتا تو یہ موقوف ہو جاتی ہے۔ اور کبھی فرشتہ مرد کی صورت میں میرے پاس آتا ہے، مجھ سے بات کرتا ہے میں اس کا کہا یاد کر لیتا ہوں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں "میں نے آپ کو اس حال میں دیکھا کہ سخت سردی کے دن میں آپ پر وحی اترتی پھر موقوف ہو جاتی اور آپ کی پیشانی سے پسینہ

وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٩٦﴾ اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿١٩٧﴾ وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى

اور یقیناً اس کا ذکر پہلے صحیفوں میں موجود[١١٥] ہے۔(١٩٦) کیا ان (اہل مکہ) کے لئے یہ نشانی (کافی) نہیں کہ اس بات کو بنی اسرائیل[١١٦] کے علماء جانتے ہیں۔(١٩٧) اور اگر ہم اس قرآن

ٹپکتا"(بخاری۔ کتاب الوحی۔ باب کیف کان بدء الوحی الی رسول الله صلی الله علیه وسلم)

نیز سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "آپ ﷺ نے مجھے جب یہ آیت لکھنے کو کہا: ﴿لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ اس وقت عبداللہ بن ام مکتوم (جو نابینا تھے) نے آپ کے پاس آکر کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اگر مجھے جہاد کی طاقت ہوتی تو میں ضرور جہاد کرتا۔ اسی وقت اللہ نے آپ پر وحی نازل فرمائی۔ اس وقت آپ کی ران میری ران پر تھی آپ کی ران اتنی بوجھل ہوگئی کہ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ نیچے سے میری ران ٹوٹ جائے گی پھر جب وحی کی کیفیت موقوف ہوئی تو اللہ نے ﴿غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ﴾ بھی نازل فرمایا۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ سورہ نساء)

(وحی کی دوسری صورتوں کے لئے دیکھئے سورہ شوریٰ کی آیت نمبر ۵۱ کا حاشیہ)

وحی کی اس قسم کو وحی جلی کہتے ہیں۔ قرآن کریم سارے کا سارا وحی جلی کی صورت میں نازل ہوا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وحی جلی ساری کی ساری قرآن میں محصور ہے۔ ایسی ہی وحی کا تھوڑا بہت حصہ احادیث میں بھی مذکور ہے۔ مثلاً زنا کی سزا سے متعلق عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کہ (خذوا عنی خذوا عنی قدجعل لهن سبیلا) عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ "اس وحی کے نزول کے وقت آپ ﷺ پر وہی کیفیت طاری ہوئی جو قرآن کی وحی کے نزول کے وقت طاری ہوتی تھی"(مسلم۔ کتاب الحدود۔ باب حد الزنا)

[١١٤] یہ وحی جو جبریل امین لے کر آپ کے دل پر اترا ہے بڑی فصیح، واضح اور شگفتہ زبان میں ہے۔ یہ اس لئے کہ آپ کی قوم عربی زبان ہی بولتی اور سمجھتی ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ آپ جب انہیں ان کے انجام سے خبردار کریں تو بات پوری طرح ان کی سمجھ میں آسکے۔ یہ واضح رہے کہ وحی جلی کے الفاظ بھی من جانب اللہ القا ہوتے ہیں۔

[١١٥] اس آیت کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ آپ کے عرب قوم کی طرف مبعوث ہونے کی خبر سابقہ آسمانی کتابوں میں موجود ہے۔ ان کتابوں میں بہت سی تحریف و تبدل کے باوجود بھی اب تک اس قسم کی پیشین گوئیوں کا ایک ذخیرہ پایا جاتا ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اسی قرآن کے مضامین اجمالاً یا تفصیلاً سابقہ آسمانی کتابوں میں پائے جاتے ہیں بالخصوص توحید، رسالت، قصص اور تذکیر بایام اللہ اور آخرت سے متعلق دلائل اور تفصیل جیسے مضامین جن پر تمام کتب سماویہ اور انبیاء و مرسلین کا اتفاق رہا ہے۔

[١١٦] ۞ علماء بنی اسرائیل خوب جانتے تھے کہ آپ ﷺ موعود رسول ہیں:۔ یعنی آپ کی رسالت کی صداقت کے لئے یہ ثبوت بھی کافی ہے کہ بنی اسرائیل کے علماء یہ بات خوب جانتے ہیں کہ آپ وہی رسول ہیں اور یہ کتاب قرآن وہی آسمانی کتاب ہے جس کی سابقہ آسمانی کتابوں میں خبر دی گئی ہے۔ پھر ان میں سے بعض منصف مزاج عالموں نے اسی خبر کی بنا پر اسلام قبول کر لیا جیسے عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھیوں نے کیا تھا اور بعض اپنی خصوصی مجلسوں میں اس بات کا اعتراف تو کرتے ہیں لیکن بعض مصلحتوں کی بنا پر اس کا اعلان و اقرار کرنے کی جرأت نہیں رکھتے۔

بَعْضِ الْاَعْجَمِیْنَ ﴿۱۹۸﴾ فَقَرَاَهٗ عَلَیْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۹۹﴾ كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۲۰۰﴾
لَا یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ﴿۲۰۱﴾ فَیَاْتِیَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ فَیَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ
مُنْظَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ اَفَبِعَذَابِنَا یَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ اَفَرَءَیْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِیْنَ ﴿۲۰۵﴾ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا
یُوْعَدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ مَآ اَغْنٰی عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یُمَتَّعُوْنَ ﴿۲۰۷﴾ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْیَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ﴿۲۰۸﴾ ذِكْرٰی

کو کسی عجمی پر اتارتے (۱۹۸) جو انہیں پڑھ کو سناتا تو بھی یہ اس پر[۱۱۷] ایمان نہ لاتے (۱۹۹) اس طرح ہم نے مجرموں کے دل میں (بس بیہودہ اعتراضات کرنا ہی) ڈال[۱۱۸] دیا ہے۔ (۲۰۰) کہ وہ جب تک دردناک عذاب[۱۱۹] دیکھ نہ لیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ (۲۰۱) پھر اچانک ان پر دردناک عذاب آجائے گا اور انہیں خبر تک نہ ہوگی۔ (۲۰۲) اس وقت وہ کہیں گے کہ "کیا ہمیں کچھ مہلت مل سکتی ہے؟ (۲۰۳) کیا یہ ہمارا عذاب[۱۲۰] جلد طلب کرتے ہیں۔ (۲۰۴) بھلا دیکھو! اگر ہم انہیں برسوں عیش کرنے کی مہلت دے دیں۔ (۲۰۵) پھر ان پر وہ عذاب آجائے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ (۲۰۶) تو بھی وہ سامان عیش و عشرت جس[۱۲۱] سے وہ لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان کے کچھ کام نہ آئے گا (۲۰۷) اور ہم نے کبھی کسی ایسی بستی کو ہلاک نہیں کیا جہاں کوئی ڈرانے والا نہ بھیجا ہو۔ (۲۰۸)

[۱۱۷] موجودہ صورت حال یہ ہے کہ نبی بھی عربی ہے اور قرآن بھی عربی زبان میں ہے تو ان کافروں کو یہ شبہ پڑ گیا ہے کہ کہیں قرآن اس نے خود ہی نہ تصنیف کر ڈالا ہو۔ اب فرض کیجئے کہ ہم یہی فصیح عربی زبان والا قرآن کسی عجمی پر نازل کرتے تو ان پر شک و شبہ کرنے کے لئے دوسری کئی راہیں کھل جاتیں۔ مثلاً یہ کہہ دیتے کہ یہ آیات اللہ نے جبریل کے ذریعہ اس پر نازل نہیں کیں بلکہ اسے تو کوئی جن یا شیطان پڑھا جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ "خوئے بد را بہانہ بسیار" والا معاملہ ہے۔ نیت میں فتور ہو تو شک و شبہ کے بہانے ہزاروں مل سکتے ہیں۔

[۱۱۸] اس کا ایک مطلب تو وہی ہے جو ترجمہ اور اوپر کے حاشیہ سے واضح ہے اور ربطِ مضمون کے لحاظ سے یہی راجح معلوم ہوتا ہے۔ تاہم بعض مفسرین نے سلکناہ میں ہ کی ضمیر کو قرآن کی طرف لوٹایا ہے۔ اس لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے قرآن کو ان مجرموں کے دلوں میں گھسا دیا ہے اور وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ کسی بشر کا کلام نہیں ہو سکتا۔ مگر اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر اس کو بہر حال جھٹلانے پر کمربستہ ہیں۔

[۱۱۹] یہ لوگ دراصل لاتوں کے بھوت ہیں۔ ان کا علاج دلائل نہیں بلکہ ڈنڈا ہے۔ جب انہیں جوتے پڑیں گے اور اللہ کا عذاب دیکھ لیں گے، خواہ یہ دنیا میں آئے یا موت کے وقت دیکھیں یا قیامت کو دیکھیں اس وقت یہ سب باتیں مانتے چلے جائیں گے۔ لیکن اس وقت ان کے ماننے کی کچھ قدر و قیمت نہ ہوگی۔

[۱۲۰] یعنی آج انہیں مہلت ملی ہوئی ہے تو عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں۔ پھر جب عذاب دیکھ لیں گے تو اس وقت مہلت کا مطالبہ کریں گے۔ حالانکہ نہ ان کا پہلا مطالبہ درست تھا اور نہ دوسرا درست ہوگا اس لئے کہ عذاب الٰہی کے لئے بھی ایک ضابطہ مقرر ہے اس کا دارومدار کسی کے مطالبہ کرنے یا نہ کرنے پر نہیں ہے۔ پھر جب معین وقت پر عذاب آجاتا ہے تو پھر اس میں تاخیر نہیں ہو سکتی۔ نہ کسی کے مطالبہ پر مزید مہلت مل سکتی ہے۔

[۱۲۱] یہ کافروں کے مہلت کے مطالبہ کا دوسرا جواب ہے یعنی ہم نے انہیں دنیا میں سال ہا سال تک مہلت دی تو کیا اس

وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ ﴿۲۰۹﴾ وَمَا تَنَزَّلَتۡ بِهِ الشَّيٰطِيۡنُ ﴿۲۱۰﴾ وَمَا يَنۡۢبَغِىۡ لَهُمۡ وَمَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ ﴿۲۱۱﴾ اِنَّهُمۡ عَنِ

جو انہیں نصیحت کرے اور ہم ظالم[۱۲۲] نہیں ہیں (۲۰۹) اور اس قرآن کو شیطان تو لے کر نہیں[۱۲۳] اترے۔ (۲۱۰) یہ بات تو ان کے لائق[۱۲۴] ہے اور نہ ہی وہ ایسا کر سکتے ہیں (۲۱۱) وہ تو اسے سن پانے سے بھی دور[۱۲۵]

مہلت سے انہوں نے کچھ فائدہ اٹھایا؟ اور اگر ہم انہیں دوبارہ مہلت دے بھی دیں پھر بھی یہ لوگ اس مہلت سے کچھ فائدہ نہیں اٹھائیں گے جب دی ہوئی مہلت میں ان کا سامان عیش و عشرت ان کے کسی کام نہ آئے گا تو اس سالہا سال تک دی ہوئی مہلت کو وہ بالکل تھوڑی مدت سمجھیں گے اور یہ خیال کریں گے کہ ہم بہت جلد پکڑ لیے گئے۔

[۱۲۲] اتمامِ حجت کے بعد ہی عذاب آتا ہے:۔ اور ہمارا ظلم یا زیادتی تو صرف اس صورت میں شمار ہو سکتا ہے جب ہم کسی قوم پر بغیر خبردار کئے یکدم عذاب نازل کر دیتے جبکہ اصلی صورت حال یہ ہے کہ ہم نے ہر بستی میں انبیاء بھیجے جو لوگوں کو ان کے برے انجام سے خبردار کرتے رہے اور لوگ انہیں جھٹلاتے رہے۔ اور نبیوں کو یہ کہہ کہہ کر پریشان کرتے رہے کہ جس عذاب سے تم ہمیں ڈراتے ہو وہ جلد از جلد لے کیوں نہیں آتے۔ جس سے ان کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ یہ عذاب کا وعدہ بھی سراسر جھوٹ اور فریب ہے ان باتوں کے باوجود ہم انہیں سنبھلنے کا موقع دیتے رہے۔ اور ہر ممکن طریقے سے حجت پوری کرنے کے بعد اور انہیں نصیحت کرنے کے بعد ان پر عذاب بھیجا اور اس لئے بھیجا کہ وہ ہر لحاظ سے عذاب کے مستحق ہو چکے تھے اس میں ہماری کچھ زیادتی نہیں تھی۔

[۱۲۳] کفار کا آپ پر الزامِ کہانت:۔ اس آیت کا تعلق سابقہ آیت ﴿وَاِنَّهٗ لَتَنۡزِيۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾ سے ہے درمیان میں قرآن کو جھٹلانے والوں کے کچھ احوال بیان کرنے کے بعد اصل مضمون کی طرف رجوع کیا گیا ہے کفار مکہ کے الزامات میں سے ایک الزام یہ بھی تھا کہ وہ آپ کو کاہن کہتے بھی تھے اور سمجھتے بھی تھے۔ چنانچہ جندب بن سفیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج ناساز ہوا اور آپ دو تین رات نماز تہجد کے لئے اٹھ نہ سکے۔ ایک عورت (عوراء بنت حرب، ابوسفیان کی بہن، ابولہب کی بیوی) آپ کے پاس آئی اور کہنے لگی "(محمد! صلی اللہ علیہ وسلم) میں سمجھتی ہوں۔ تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا۔ دو تین راتوں سے تیرے پاس نہیں آیا" اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں ﴿وَالضُّحٰى وَالَّيۡلِ اِذَا سَجٰى مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى﴾ (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ تفسیر سورۃ والضحیٰ)

[۱۲۴] ایسا قرآن نازل کرنا شیطانوں کے بس کا روگ نہیں۔ جو سراسر لوگوں کی ہدایت و فلاح کا ضامن ہو جس میں خالصتاً توحید باری کی تعلیم دی گئی ہے۔ اور شرک اور بت پرستی سے روکا گیا ہے۔ آخرت کی باز پرس کا خوف دلایا گیا ہے۔ ظلم اور بداخلاقی سے منع کیا گیا ہے۔ نیکوکاری اور راست بازی اور خلق خدا کے ساتھ احسان کی تعلیم دی گئی ہے اور اس پر ایمان لانے والوں کو ایک مکمل ضابطۂ حیات عطا کیا گیا ہے کیا کسی شیطان کے کلام میں ایسی باتوں کا پایا جانا ممکن ہے؟ شیطان تو قرآن کے نام تک سے بدکتے ہیں وہ ایسا کلام لا کیسے سکتے ہیں؟

[۱۲۵] اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام جبریل روح الامین کو دے کر بھیجا جو سیدھے یہ کلام لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر نازل ہوئے۔ اب اس راستہ میں کوئی ایسا مقام آتا ہے جہاں سے شیطان اس کلام کا کچھ حصہ سن سکتے ہوں؟ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس مضمون کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ جب یہ کلام نازل کیا جاتا ہے تو اس کے ارد گرد کڑا پہرہ بھی مقرر کیا جاتا ہے جس کے دو فائدے ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں کہیں سے بھی باطل کی آمیزش نہیں ہو سکتی (۴۱: ۴۲) اور دوسرا یہ کہ

السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿۲۱۳﴾ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ
الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۱۵﴾ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا

رکھے گئے ہیں(۲۱۲) پس (اے نبی) اللہ کے ساتھ کسی اور الٰہ کو نہ پکاریئے، ورنہ آپ بھی سزا پانے[۱۲۶] والوں میں سے ہو جائیں گے۔(۲۱۳) اور اپنے کنبہ کے قریبی رشتہ داروں[۱۲۷] کو (برے انجام سے) ڈرایئے(۲۱۴) اور ایمان لانیوالوں میں سے جو آپ کی اتباع کریں ان سے تواضع سے پیش آیئے۔(۲۱۵) پھر اگر آپ کی نافرمانی کریں تو ان سے کہئے کہ جو کچھ

شیاطین اگر اس کلام کو چوری چھپے سننے کی کوشش کریں بھی تو سن نہیں سکتے بلکہ شہابِ ثاقب کے ذریعہ ان کی تواضع کی جاتی ہے۔(۷۲:۹)

[۱۲۶] اس میں مخاطب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جو توحید کی طرف دعوت دینے والے اور شرک کے دشمن ہیں۔ اور آپ سے شرک کا صدور ناممکن ہے۔ اور انداز خطاب دراصل اس حکم میں تاکید مزید کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی آپ ﷺ جو سب سے افضل و اشرف ہیں اگر آپ بھی شرک کریں تو اللہ کے عذاب سے بچ نہیں سکتے تو دوسروں کا کیا حال ہو گا۔ دراصل مشرکینِ مکہ پر شرک کی شدید قباحت کی وضاحت کے لئے یہ انداز اختیار کیا گیا ہے فی الحقیقت اس آیت کے مخاطب وہی لوگ ہیں جو اپنی حاجت براری اور مشکل کشائی کے لئے دوسروں کو پکارتے ہیں۔

[۱۲۷] ❁ قریش کو آپ کی پہلی دعوت:۔ آپ بعثت کے بعد تین سال تک انتہائی خفیہ طریقہ پر دار ارقم میں فریضہ تبلیغ سرانجام دیتے رہے۔ بعد میں یہ حکم نازل ہوا کہ آپ اب اپنے قریبی رشتہ داروں کو بھی کھل کر شرک سے بچنے کی دعوت دیجئے اور اس شرک کے انجام سے انہیں ڈرایئے۔ اس آیت پر آپ نے جس طرح عمل فرمایا وہ درج ذیل احادیث سے واضح ہے:

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ ﷺ باہر نکلے اور صفا پہاڑ پر چڑھ گئے اور آواز دینے لگے: اے فہر کی اولاد، اے عدی کی اولاد، غرض قریش کے سب خاندانوں کو پکارا۔ وہ جمع ہو گئے جو کوئی خود نہ آسکا اس نے اپنی طرف سے ایک آدمی بھیج دیا تاکہ یہ دیکھے کہ کیا معاملہ ہے۔ ابولہب خود آیا اور قریش کے دوسرے لوگ بھی آگئے۔ آپ نے ان سے پوچھا: "اگر میں تم سے کہوں کہ اس وادی کے اس طرف کچھ سوار تم پر حملہ کرنے کے لئے جمع ہیں تو کیا تم میری بات سچ مانو گے؟" انہوں نے کہا۔ "بے شک! کیونکہ ہم نے آپ کو ہمیشہ ہی سچ بولتے دیکھا ہے" تو آپ ﷺ نے فرمایا: "میں تمہیں اس سخت عذاب سے ڈراتا ہوں۔ جو (قیامت کو) تمہیں پیش آنے والا ہے" اس پر ابولہب کہنے لگا: "تم پر بقیہ سارا دن ہلاکت ہو کیا تم نے اسی بات کے لئے ہمیں اکٹھا کیا تھا؟" اس وقت یہ سورت نازل ہوئی تبت یدا ابی لہب۔۔۔۔۔۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ ﷺ کھڑے ہو کر فرمانے لگے: "اے قریش کے لوگو! (یا کچھ ایسا ہی کلمہ کہا) تم اپنی اپنی جانیں بچالو۔ میں اللہ کے سامنے تمہارے کسی کام نہ آسکوں گا۔ اے بنو عبد مناف! میں اللہ کے سامنے تمہارے کسی کام نہ آسکوں گا۔ اے میری پھوپھی صفیہ! میں اللہ کے سامنے تمہارے کسی کام نہ آسکوں گا۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی فاطمہ! میرے مال سے جو چاہتی ہے مانگ لے لیکن اللہ کے سامنے میں تیرے کسی

تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۲۱۷﴾ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۸﴾ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿۲۱۹﴾ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۲۰﴾ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۲۱﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۲۲﴾ يُّلْقُوْنَ

تم کرتے ہو[۱۲۸]، میں اس سے بری الذمہ ہوں۔(۲۱۶) اور اس غالب[۱۲۹] اور رحیم پر بھروسہ کیجئے۔(۲۱۷) جو آپ کو اس وقت دیکھ رہا ہوتا ہے جب آپ کھڑے[۱۳۰] ہوتے ہیں(۲۱۸) اور سجدہ کرنے والوں کے درمیان[۱۳۱] آپ کے (رکوع و سجود) کی حرکات کو بھی دیکھتا ہے(۲۱۹) یقیناً وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔(۲۲۰) آپ لوگوں سے کہئے کہ: "کیا میں تمہیں بتاؤں شیطان کس پر نازل ہوتے ہیں؟(۲۲۱) وہ ہر جعل ساز، گنہگار[۱۳۲] پر نازل ہوتے ہیں۔(۲۲۲)

کام نہ آسکوں گا" (حوالہ ایضاً)

[۱۲۸] ربط مضمون کے لحاظ سے تو اس کا یہی مطلب ہے کہ ان قریبی رشتہ داروں سے جو آپ پر ایمان لے آئیں اور آپ کی دعوت کو تسلیم کرلیں آپ ان سے تواضع سے پیش آیئے۔ اور جو نہ مانیں انہیں صاف سنا دیجئے کہ قیامت کے دن میں تمہارے کسی کام نہ آسکوں گا۔ تمہیں اپنے ان شرکیہ اعمال و افعال کا نتیجہ خود ہی بھگتنا پڑے گا۔ تاہم یہ حکم عام ہے جس میں آپ کے رشتہ دار اور غیر رشتہ دار سب قسم کے لوگ شامل ہیں۔

[۱۲۹] اس اللہ پر بھروسہ کیجئے جو نہ ماننے والوں اور اس راہ میں روڑے اٹکانے والوں پر غالب ہے اور انہیں سزا دینے کی پوری قدرت رکھتا ہے اور مومنوں کے حق میں جو کافروں کے ہاتھوں نشانہ ستم بنے ہوئے ہیں رحیم بھی ہے وہ ان مظلوموں کی ضرور مدد کرے گا۔ اور ان کی محنتوں اور قربانیوں کا انہیں پورا بدلہ عطا کرنے کے علاوہ انہیں اپنے انعامات سے بھی نوازے گا۔

[۱۳۰] یعنی جب آپ نماز کے لئے رات کو اٹھتے ہیں یا کسی بھی نماز میں قیام کی حالت میں ہوتے ہیں یا تبلیغ رسالت کے فریضہ کی انجام دہی کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

[۱۳۱] اس آیت کے دو مطلب ہوسکتے ہیں ایک یہ کہ جب آپ نماز باجماعت میں اپنے مقتدیوں کے ساتھ رکوع و سجود کرتے ہیں، اس وقت اللہ تعالیٰ آپ کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ جب آپ رات کو اٹھ کر گشت کرتے ہیں کہ کون کون سے عبادت گزار اس وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہیں اور کون کون سے غافل ہیں۔ اس وقت بھی اللہ آپ کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ تیسرا یہ کہ سجدہ گزار لوگوں کے ساتھ مل کر آپ جو بھی اعلائے کلمۃ الحق کی سربلندی کے لئے تگ و دو کرتے ہیں اللہ آپ لوگوں کی ایک ایک نقل و حرکت سے واقف ہوتا ہے۔

[۱۳۲] ۞ شیطان صرف بدکردار لوگوں پر اترتے ہیں:۔ پہلے یہ بیان ہو رہا تھا کہ قرآن جیسی عظیم الشان کتاب کی تنزیل شیطانوں کے بس کا روگ نہیں اور یہ بات ناممکنات سے ہے کہ وہ اس جیسی ایک آیت بھی لاسکیں۔ اس آیت میں یہ بتایا جارہا ہے کہ شیطان کیسی چیز اتارتے ہیں اور کیسے لوگوں پر اترتے ہیں۔ شیطان صرف جھوٹوں، بدمعاشوں اور بدکاروں پر اترتے ہیں۔ وہ دیانتدار، راست باز اور نیک لوگوں سے بیزار ہوتے ہیں اور انہیں برا جانتے ہیں۔ وہ جھوٹے اور دغاباز قسم کے لوگوں پر خوش ہوتے ہیں اور یہی لوگ ان کی مرضی کے موافق ہوتے ہیں اور ایسے ہی لوگ شیطانوں کے القاء کے مطابق کہانت کا کاروبار چلاتے ہیں اور ان سے مراد کاہن، جوتشی، فال نکالنے والے، رمال، جفار اور عامل قسم کے لوگ ہیں جو اپنی غیب دانی کا

السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴿۲۲۳﴾ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ

جو (شیطانوں کی طرف) اپنے کان لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے[۱۳۳] ہوتے ہیں(۲۲۳) اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ[۱۳۴] ہی کرتے ہیں۔(۲۲۴) کیا تم دیکھتے نہیں کہ وہ (خیالوں کی) ہر وادی میں بھٹکتے[۱۳۵]

ڈھونگ رچاتے، لچھے دار باتیں بناتے اور لوگوں کو ان کی قسمتیں بتاتے پھرتے ہیں۔ پھر کچھ لوگ جنوں کی تسخیر اور مؤکلوں کے ذریعہ لوگوں کی بگڑی بناتے ہیں۔ اور اس سے ان کا مقصد محض پیسہ بٹورنا ہوتا ہے۔

❁ کہانت اور ابن صیاد:۔ دورِ نبوی میں مدینہ میں بھی ایک ایسا کاہن رہتا تھا جس کا نام ابن صیاد تھا جو غیب کی خبریں بتایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا: کیا تو گواہی دیتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ وہ کہنے لگا: میں گواہی دیتا ہوں کہ تو ان پڑھوں کا رسول ہے پھر اس نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ کیا آپ گواہی دیتے ہیں کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ آپ ﷺ نے اسے ٹھوکا مارا اور فرمایا: اللہ تجھے تیری حد سے آگے نہ بڑھنے دیگا۔ پھر آپ ﷺ نے پوچھا: اچھا بتاؤ۔ اس وقت میرے دل میں کیا ہے۔ اس وقت آپ کے دل میں سورہ دخان کا خیال آ رہا تھا۔ اس نے کہا "دخ" اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ سیدنا عمرؓ اور بعض دوسرے صحابہ اسے دجال خیال کرتے تھے۔ چنانچہ سیدنا عمرؓ نے آپ ﷺ سے اس کو قتل کرنے کی اجازت بھی طلب کی۔ آپ ﷺ نے سیدنا عمرؓ کو اس کام سے روک دیا اور فرمایا: اگر یہ فی الواقع دجال ہے تو اس کی موت تیرے ہاتھوں واقع نہیں ہوگی۔ اور اگر یہ دجال نہیں تو اسے قتل کرنا تیرے لئے بہتر نہیں۔ (بخاری۔ کتاب القدر۔ باب قوله تعالیٰ۔ يحول بين المرء وقلبه)

اب اس کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروکاروں کی زندگی کو دیکھا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے ان لوگوں کی راست بازی، صدق، امانت و دیانت، پرہیزگاری اور خوش اخلاقی وغیرہ ایسے اوصاف ہیں جن کی ان بد کرداروں کو ہوا بھی نہیں لگی ہوتی۔

[۱۳۳] ❁ کہانت کی بنیاد سراسر جھوٹ پر ہے:۔ یعنی ان کاہن قسم کے لوگوں کے ذرائع معلومات انتہائی ناقص قسم کے ہوتے ہیں۔ اور اس آیت کے بھی دو مطلب ہیں ایک یہ کہ شیطان ملاء اعلیٰ کی طرف کان لگاتے ہیں اور کوئی ایک آدھ بات سن پائیں تو اس میں سو جھوٹ ملا کر کاہنوں کو بتاتے ہیں اور دوسرا یہ کہ کاہن شیطانوں کی طرف کان لگائے رکھتے ہیں۔ پھر جب شیطان کسی کاہن کو کچھ القاء کرتا ہے تو یہ کاہن اس میں سو جھوٹ ملا کر لوگوں کو بتاتے ہیں۔ گویا ان کے کاروبار کی بنیاد سراسر جھوٹ پر مبنی ہوتی ہے۔

[۱۳۴] کفار مکہ کا ایک الزام یہ بھی تھا کہ آپ (معاذ اللہ) شاعر ہیں۔ اسی نسبت سے یہاں شاعروں اور شاعروں کو داد دینے والوں کے کچھ اوصاف بیان فرما دیئے۔ تاکہ ہر شخص از خود یہ فیصلہ کر لے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شاعر ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ پھر آپ کے پیروکاروں کے اوصاف کیسے ہیں۔ اور شاعروں کے پیروکار کیسے ہوتے ہیں؟ شاعروں کا کام محض گرمی محفل اور وقتی جوش پیدا کرنا ہوتا ہے جس کا مستقل ہدایت سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ اور ان کو داد دینے والے بھی ہدایت کی راہ سے بے بہرہ اور بہکے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔

[۱۳۵] ❁ شاعروں کی خصوصیات۔ تخیل ہی تخیل۔ تضاد بیانی اور عملی فقدان:۔ ان دو آیات میں شاعروں کی دو خصلتیں بیان

يَهِيمُونَ ﴿٢٢٥﴾ وَأَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ﴿٢٢٦﴾ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَذَكَرُوا اللَّهَ
كَثِيرًا وَانتَصَرُوا مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُوا ۗ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ ﴿٢٢٧﴾ ع ۱۱ ۱۵

پھرتے ہیں(۲۲۵) اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے [۱۳۶] نہیں۔(۲۲۶) بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اور اللہ کو بکثرت یاد کرتے رہے۔ اور جب ان پر ظلم ہوا تو انہوں نے بدلہ لے لیا [۱۳۷] اور عنقریب ان ظالموں کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس (برے) انجام سے دوچار [۱۳۸] ہوتے ہیں(۲۲۷)

فرمائیں ایک یہ کہ ان کے کلام میں تخیل ہی تخیل اور غلو کی حد تک پہنچا ہوا مبالغہ ہوتا ہے جس کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ہوتی۔ مثلاً کسی کی تعریف کرنے بیٹھے تو اسے آسمان پر چڑھا دیا کسی کی ہجو پر آئے تو اسے دنیا کی بدترین مخلوق بنا کر پیش کر دیا۔ پھر اگر کسی سے کچھ انعام واکرام مل گیا تو اس کی مدح سرائی شروع کر دی۔ کسی کی پگڑی اچھالی۔ کہیں فتنہ و فساد کی آگ بھڑکائی اور عشق لگائے بغیر تو کسی شاعر کی شاعری مکمل ہی نہیں ہوتی۔ کہیں محبوبہ سے شکایتیں ہیں، تو کہیں رقیبوں پر برس رہے ہیں، دوراز کار استعاروں اور تشبیہات کا استعمال اور اپنی ثناخوانیاں جن میں حقیقت کچھ بھی نہیں ہوتی۔ غرضیکہ زندگی کا کوئی میدان ایسا نہیں جن میں یہ اپنے تخیل کے گھوڑے نہ دوڑاتے ہوں اور سر نہ پھٹکتے پھرتے ہوں۔ ان کی زندگی کا نہ کوئی متعین مقصد ہوتا ہے اور نہ ہی یہ کسی اصول کے پابند ہوتے ہیں۔

[۱۳۶] شاعر حضرات کی دوسری خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان کے قول اور فعل میں نمایاں تضاد ہوتا ہے وہ کہتے کچھ اور ہوتے کچھ ہیں۔ اور یہ چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کی عین ضد تھی۔ آپ جو تعلیم پیش کرتے تھے سب سے پہلے خود اس پر عمل پیرا ہوتے تھے پھر ایمان لانے والوں کو اسی تعلیم کا نمونہ بناتے تھے۔ لہذا اے مشرکین مکہ! خود ہی اندازہ کر لو کہ اس پیغمبر کے شاعر ہونے کا جو الزام تم لگا رہے ہو وہ کہاں تک درست ہے؟

[۱۳۷] ۞ کون سے شعراء اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں؟ جن شعراء کی عام مذمت بیان کی گئی۔ ان میں سے مندرجہ ذیل چار خصائل والے شعراء مستثنیٰ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ایمان لائے ہوں۔ دوسرے انہوں نے نیک اعمال کو اپنا طرز زندگی بنا لیا ہو۔ تیسرے اللہ کو بکثرت یاد کرتے رہتے ہوں۔ کسی وقت بھی ان کے دل اللہ کی یاد سے غافل نہ ہوں۔ چوتھے یہ کہ جو کچھ کہیں، ظالموں کے مقابلہ میں حق کی حمایت کے شعر کہیں۔ کسی کی ہجو اپنی ذاتی اغراض کے ماتحت نہ کریں۔ مثلاً اشعار کے ذریعہ اللہ کی حمد و ثنا بیان کریں۔ نیکی کی ترغیب دیں۔ کفر کی اور گناہوں کی مذمت بیان کریں یا اگر کافر مسلمانوں یا اسلام یا پیغمبر اسلام کی ہجو بیان کریں تو ہجو کا اسی طرح جواب دے کر اس ظالم کا بدلہ لے لیں۔ چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ قریش نے مسلمانوں کی ہجو کی تو آپ نے مسلمانوں سے کہا کہ ان کی ہجو کا جواب دو۔ کیونکہ ہجو قریش کو تیروں کی بوچھاڑ سے زیادہ ناگوار ہے۔ پھر عبداللہ بن رواحہ سے ہجو کرنے کو کہا۔ لیکن ان کی ہجو آپ کو پسند نہ آئی۔ پھر آپ نے کعب بن مالک سے کہا پھر حسان بن ثابت سے ہجو کرنے کا کہا اور ساتھ ہی یہ بتا دیا کہ ذرا دھیان رکھنا میں بھی قریش سے ہوں۔ سیدنا حسان کہنے لگے اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچا پیغمبر بنا کے بھیجا۔ میں آپ کو قریش میں سے ایسے نکال لوں گا جیسے آٹے سے بال نکال لیا جاتا ہے۔ سیدہ عائشہ فرماتی ہیں کہ آپ نے حسان کے حق میں دعا کی یا اللہ اس کی روح القدس سے مدد کر۔ نیز فرمایا حسان! جب

تک تو اللہ اور اس کے رسول کے طرف سے جواب دیتا رہے گا روح القدس تیری مدد کرتا رہے گا۔ نیز فرمایا: حسان نے قریش کی ہجو کر کے مومنوں کے دلوں کو تسکین دی اور کافروں کی عزتوں کو تباہ کر دیا" (مسلم۔ کتاب الفضائل۔ باب فضائل حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ) اس کے بعد سیدنا حسان بن ثابت کا طویل قصیدہ مسلم شریف میں مذکور ہے۔

[۱۳۸] یعنی وہ لوگ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کاہن اور شاعر یا ساحر اور مجنون قرار دیتے تھے تاکہ دعوت دین اسلام میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کر کے حق کو نیچا دکھا سکیں۔

سورۃ النمل مکیۃ

۹۳ آیاتہا رکوعہا ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

طٰسٓ ۫ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۱﴾ هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ﴿۲﴾ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ
الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ
زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ۭ﴿۴﴾ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْۗءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي

کلمات ۱۱۶۷ آیت ۹۳ (۲۷) سورہ النمل مکی ہے (۴۸) رکوع ۷ حروف ۴۸۷۹

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

ط۔ س یہ قرآن اور وضاحت [۱] کرنے والی کتاب کی آیات ہیں (۱) جو ان ایمان لانے والوں کے لئے ہدایت [۲] اور بشارت ہیں۔ (۲) جو نماز قائم کرتے، زکوۃ ادا کرتے اور آخرت [۳] پر یقین رکھتے ہیں۔ (۳) اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے لیے ان کے کرتوتوں کو خوشنما بنا دیا ہے۔ لہٰذا وہ اندھے [۴] بنے پھرتے ہیں۔ (۴) یہی لوگ ہیں جن کے لئے برا عذاب ہے اور آخرت میں وہی سب سے

[۱] یعنی اس کتاب کے پڑھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ بالکل واضح ہے اس میں کوئی ابہام یا پیچیدگی نہیں جو کسی کی سمجھ میں نہ آسکے۔ اور تیسرا مطلب یہ ہے کہ حق اور باطل سب کچھ بڑی وضاحت سے بتا رہی ہے۔

[۲] اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کی صفات بیان کرتے ہوئے ہدایت دینے والی یا بشارت دینے والی کے بجائے صرف ہدایت اور بشارت فرمایا۔ گویا یہ کتاب مجسم ہدایت اور مجسم بشارت ہے۔ اور ان الفاظ کے استعمال میں بلاغت بھی ہے اور فصاحت بھی۔ البتہ یہ کتاب ہدایت اور بشارت صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ سمجھتے ہیں اور اللہ پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔ اور جو سرے سے اسے اللہ کی طرف سے نازل شدہ نہ سمجھیں ان کے لئے نہ یہ ہدایت بن سکتی ہے اور نہ بشارت۔

[۳] ۞ آخرت پر ایمان نہ رکھنے والے اور جزا و سزا کا تصور صحیح نہ رکھنے والے کافر ہیں:۔ ایمان کا دعویٰ رکھنے والوں کی ظاہری علامات یہ ہیں کہ کم از کم وہ نماز کو پوری درستی کے ساتھ قائم کریں۔ نیز زکوۃ ادا کریں اور روزِ آخرت پر ایمان بھی رکھتے ہوں۔ روز آخرت پر ایمان اگرچہ ایمان کے چھ اجزاء میں ایک جزء ہے اور ایمان لانے میں آخرت پر ایمان لانا از خود شامل ہو جاتا ہے۔ تاہم ایمان کے اس جزء کی اہمیت کے پیش نظر اس کو دوبارہ اور بڑی تاکید سے بیان فرمایا۔ اسی لئے قرآن کریم نے آخرت پر ایمان نہ لانے والوں کو مکمل کافر قرار دیا ہے۔ بلکہ ان لوگوں کو بھی کافر قرار دیا ہے جو آخرت کے دن پر ایمان تو رکھتے ہیں مگر جزا و سزا کے متعلق وہ تصور نہیں رکھتے جو قرآن پیش کرتا ہے۔

[۴] یعنی جو اللہ پر تو ایمان رکھتے ہوں مگر روزِ آخرت پر ایمان نہ رکھتے ہوں وہ اپنا معیار خیر و شر صرف انہی نتائج سے متعین

الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۝ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۝ اِذْ قَالَ مُوْسٰى
لِاَهْلِهٖٓ اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ۭ سَاٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِيْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝ فَلَمَّا جَاۗءَهَا

زیادہ خسارہ[۵] میں رہیں گے (۵) اور (اے نبی) آپ یہ قرآن ایک حکیم و علیم ہستی کی طرف سے پا[۶] رہے ہیں۔(۶)
جب موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ: ''مجھے آگ سی نظر آئی ہے میں ابھی وہاں سے کوئی (راستہ کی) خبر لے کر آتا ہوں یا کوئی دہکتا[۷] ہوا انگارا لاتا ہوں تاکہ تم تاپ سکو۔(۷) پھر جب وہ وہاں پہنچے

کرتے ہیں جو اس دنیا میں ظاہر ہوتے یا ہو سکتے ہیں۔ لہذا ان کی زندگی کسی اصول کی پابند نہیں ہوتی وہ جس کام میں اپنا ذاتی فائدہ دیکھتے ہیں وہی کام ان کے نزدیک خیر ہے۔ دوسروں کے نفع و نقصان سے انہیں کچھ غرض نہیں ہوتی۔ دنیا میں تمام فسادات روزِ آخرت اور باز پرس سے انکار یا بھول کی بنا پر ہی واقع ہوتے ہیں۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ ایسے دنیا پر ریجھنے والے لوگوں کو اپنے ایسے ہی خود غرضی پر مبنی اعمال اچھے نظر آنے لگتے ہیں۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ جو طرزِ عمل انہوں نے اختیار کر رکھا ہے وہی سب سے اچھا اور بہتر ہے۔

[۵] ایسے لوگوں کی زندگی شتر بے مہار کی طرح ہوتی ہے۔ ہر شخص اپنے ہی دنیوی مفاد کی فکر میں پڑا ہوتا ہے۔ حق و باطل' توحید اور شرک' اخلاق اور بد اخلاقی کی بحثیں ان کے لیے بے کار اور فضول ہوتی ہیں۔ ہر ایک کی غرض دوسرے کی غرض سے ٹکراتی ہے تو دنیا میں بھی ایسے ہی لوگ خسارہ میں رہتے ہیں اور آخرت میں ایسے لوگوں کا خسارہ میں رہنا ایک یقینی بات ہے۔ ان کو ایسے برے انجام سے سابقہ پیش آئے گا جس کا انہیں وہم و گمان بھی نہ تھا۔

[۶] یہ قرآن ایسی ہستی کی طرف سے نازل شدہ ہے جو تمام لوگوں کے احوال سے پوری طرح باخبر ہے۔ اس کی نظروں میں سب انسان بحیثیت انسان ایک جیسے ہیں جو ہر ایک کے حقوق و فرائض اپنے اسی وسیع علم کی بنا پر مقرر کرتی ہے۔ پھر وہ حکیم بھی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ہر حکم میں کچھ نہ کچھ حکمتیں مضمر ہوتی ہیں اور اس کے احکام بندوں کی مصلحت پر ہی مبنی ہوتے ہیں۔

[۷] ❁ سیدنا موسیٰ کے آغاز نبوت کا پس منظر:۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے اس دور کا واقعہ ہے جب آپ سیدنا شعیب علیہ السلام سے رخصت ہو کر واپس مصر اپنے وطن جا رہے تھے۔ بیوی ساتھ تھی اور وہ حاملہ تھی ایک بچہ اور ایک خادم بھی ساتھ تھے۔ جب طورِ سینا کے قریب پہنچے تو راستہ بھول گئے۔ سردیوں کا موسم' رات کا گھپ اندھیرا اور کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ اس حال میں راستہ بھی بھول گئے تو سخت پریشان ہوئے۔ دور کہیں آگ نظر آئی تو خیال کیا کہ وہاں ضرور کچھ لوگ ہوں گے۔ ان کے ہاں جاتا ہوں ان سے راستہ پوچھوں گا۔ اپنے بیوی بچوں سے کہنے لگے: تم یہیں ٹھہرو۔ میں وہاں جا کر راستہ پوچھ آتا ہوں اور اگر کسی نے راستہ نہ بھی بتایا تو کم از کم کچھ آگ کے انگارے ہی لیتا آؤں گا۔ تاکہ تم لوگ آگ تاپ کر کچھ گرمی حاصل کر سکو۔

نُوْدِيَ اَنْ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰمُوْسٰۤى اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ وَ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰى لَا

تو ندا آئی کہ ''مبارک ہے۔ وہ جو اس آگ میں ہے اور جو[٨] اس کے ارد گرد ہے اور پاک ہے اللہ جو سب جہان والوں کا پروردگار ہے۔ (٨) موسیٰ میں ہی اللہ[٩] ہوں۔ سب پر غالب اور حکمت والا۔ (٩) اپنی لاٹھی تو ذرا پھینکو، موسیٰ نے جب لاٹھی پھینکی تو دیکھا کہ وہ یوں حرکت کر رہی ہے جیسے سانپ ہو۔ آپ پیٹھ پھیر کر جو بھاگے تو پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا (ہم نے کہا) موسیٰ! ڈرو نہیں۔

[٨] وہاں پہنچے تو عجیب سا منظر دیکھا۔ آگ نے ایک درخت کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے مگر درخت ویسے کا ویسا سرسبز ہے اور لہلہا رہا ہے۔ آس پاس کوئی آدمی بھی نہیں ہے۔ آگ سے دھواں بھی نہیں اٹھ رہا۔ اور پورا خطہ زمین روشنی سے جگمگا رہا ہے۔ اسی حیرانی کے عالم میں کھڑے تھے کہ اس روشنی سے یا درخت میں سے ندا آئی، موسیٰ اپنے جوتے اتار لو۔ اس وقت تم طویٰ کی مقدس وادی میں پہنچ گئے ہو اور تم یہاں بھولے سے نہیں آگئے بلکہ ٹھیک ہمارے اندازے کے مطابق یہاں پہنچے ہو۔ اس آگ میں اور اس کے ارد گرد جو کوئی بھی ہے سب مبارک ہے۔ یہ آگ، یہ درخت، تم، خود اور آس پاس فرشتے سب مبارک اور بابرکت ہے۔ اور اللہ کی ذات، جو تمام جہانوں کی پروردگار ہے۔ ہر قسم کے جہات اور تشبیہات سے منزہ اور پاک ہے۔

[٩] اس منظر نے اور اس آواز نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تو پھر آواز آئی: موسیٰ ''میں اللہ ہوں، زبردست ہوں اور حکمت والا ہوں'' اور یہاں سبحان اللہ کہنے سے مقصود یہ تھا کہ اللہ رب العالمین ایسا نہیں جو اس درخت میں یا آگ میں موجود ہو یا ان میں حلول کر آیا ہو۔ بس اس مقام پر اللہ نے اپنی تجلی ڈالی تھی۔ جیسے سورج کے سامنے شیشہ رکھنے سے شیشے میں سے بھی روشنی اور اس کی شعاعیں اور سورج سب کچھ نظر آنے لگتے ہیں۔ لیکن یہ کہا جا سکتا ہے اتنا بڑا سورج چھوٹے سے آئینہ میں سما گیا ہے یا اس جگہ موجود ہے۔

۞ معتزلہ جہمیہ اور متصوفین کا رد:۔ جہمیہ اور معتزلہ جو اللہ تعالیٰ کی صفات کی بزعم خود تنزیہہ بیان کرتے اور اپنے آپ کو اہل التوحید کہتے تھے نیز بعض متصوفین اس بات کے قائل ہیں کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی آواز نہیں سنی بلکہ اس درخت میں اللہ تعالیٰ نے بات کرنے کی قوت پیدا کر دی تھی اور یہ آواز اسی درخت کی آواز تھی اور اسی درخت سے نکل رہی تھی۔ سوچنے کی بات ہے کہ کیا درخت بیچارے کی یہ مجال ہے کہ وہ کہے ''میں اللہ ہوں، زبردست اور حکمتوں والا'' اور درخت یہ دعویٰ کر سکتا ہے تو پھر حسین بن منصور بن حلاج کا کیا قصور تھا جس نے انا الحق کا دعویٰ کیا تھا؟ نیز جنید بغدادی اور دیگر علمائے حق نے اس کے قتل کا کیوں فتویٰ دیا تھا؟

دراصل یہ اللہ تعالیٰ کے اپنے بندے سے ہمکلام ہونے کی ایک خاص شکل ہے جسے سورہ شوریٰ کی آیت نمبر ۵۱ میں ﴿اومن ورای حجاب﴾ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور وراء کا لفظ آگے، پیچھے، اوپر، نیچے غرضیکہ سب سمتوں کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے حجاب میں رہ کر درخت کی طرف سے کلام کیا تھا اور اللہ کا حجاب نور ہے جیسا کہ احادیث میں

تَخَفْ ۟ اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝۱۰ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ
رَّحِیْمٌ ۝۱۱ وَ اَدْخِلْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ ۟ فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ
قَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ۝۱۲ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰیٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝۱۳

میرے حضور رسول [۱۰] ڈرا نہیں کرتے۔(۱۰) ڈرتا تو وہ ہے جس نے کوئی ظلم کیا ہو پھر اگر اس نے (بھی) برائی کے بعد (اپنے اعمال کو) نیکی [۱۱] سے بدل لیا تو میں یقیناً بخشنے والا مہربان ہوں۔(۱۱) اور اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں داخل کرو وہ کسی مرض کے بغیر چمکتا ہوا نکلے گا۔

(یہ دو معجزے) منجملہ ان نو معجزات کے تھے۔ جو فرعون اور اس کی قوم کیلئے (موسیٰ کو دیئے گئے) بلاشبہ [۱۲] وہ بدکردار لوگ تھے۔(۱۲) پھر جب ہمارے ایسے بصیرت افروز معجزے ان کے پاس پہنچے تو وہ کہنے لگے یہ تو صاف جادو ہے۔(۱۳)

وارد ہے کہ (حجابه النور) گویا اس روشنی کے پار سے اللہ تعالیٰ نے خود موسیٰ علیہ السلام سے باتیں کی تھیں اسی لئے موسیٰ علیہ السلام کو کلیم اللہ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ قرآن میں اللہ نے واضح طور پر فرمایا ہے ﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰی تَكْلِیْمًا﴾ جب کہ معتزلہ اللہ کے کلام کرنے کے منکر ہیں اور متصوفین عقیدہ حلول کو درست سمجھتے ہیں۔

[۱۰] ❁ نبی کو نبوت سے پہلے اپنے نبی بننے کا علم نہیں ہوتا:۔ اس آیت سے کئی امور پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کے سانپ بن جانے کا معجزہ، آپ کو سب سے پہلے اور اسی مقام پر عطا ہوا تھا۔ یہ لاٹھی زمین پر پڑتے ہی اژدہا کی شکل کا بڑا سانپ بن گیا جس میں پھرتی پتلے سانپ کی تھی۔ دوسرے یہ کہ چونکہ یہ پہلا موقع تھا اس لئے موسیٰ علیہ السلام خود بھی اس سانپ سے ڈر گئے تھے۔ تیسرے یہ کہ اس وقت ہی آپ کو معلوم ہوا کہ منصب رسالت آپ کے سپرد کیا جا رہا ہے اس سے پہلے آپ کو قطعی طور پر علم نہ تھا کہ آپ کو نبوت عطا ہوگی اور نبوت یا رسالت عطا ہونے کے وقت بھی طبیعت گرانبار ہو جاتی ہے اور کچھ نامعلوم سا خطرہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی غارِ حرا میں ایسا خوف لاحق ہوا تھا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ”رسول میرے حضور ڈرا نہیں کرتے“

[۱۱] ❁ عصائے موسیٰ علیہ السلام اور ید بیضا اور دوسرے معجزات:۔ ہاں میرے حضور ڈرنے کی صرف ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے کہ کسی شخص نے فی الواقع ظلم کیا ہو۔ اور ظالموں کو واقعی ڈرنا ہی چاہئے لیکن جو شخص ظلم کے بعد توبہ کر لے برے کاموں کے بعد نیکی کی راہ اختیار کر لے اور اپنا طرز عمل ہی بدل لے تو میں اسے معاف کر دیتا ہوں۔ غالباً اس آیت میں سیدنا موسیٰ کے اس دور کے ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ جب آپ سے ایک قبطی نادانستہ طور پر مارا گیا تھا۔ پھر آپ وہاں سے مفرور ہو کر مدین میں سیدنا شعیب علیہ السلام کے پاس آ گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ﴿فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ کہہ کر اس قصور کی معافی کی بھی بشارت سنا دی۔

[۱۲] پھر اسی مقام پر موسیٰ علیہ السلام کو ید بیضا کا دوسرا معجزہ عطا کیا گیا۔ جس کی تفصیل پہلے کئی مقامات پر گزر چکی ہے اور آئندہ بھی آئے گی۔ یہ دو بڑے بڑے واضح معجزے منجملہ ان نو معجزات کے تھے جن کا ذکر پہلے سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۭ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴﴾ وَلَقَدْ
اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰي كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵﴾ وَوَرِثَ

اور انہوں نے از راہِ ظلم اور تکبر انکار کر دیا حالانکہ ان کے دل یقین کر چکے [۱۳] تھے (کہ موسیٰ سچے ہیں) پھر دیکھئے ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا۔(۱۴) نیز ہم نے داوٗد اور سلیمان [۱۴] کو علم [۱۵] عطا کیا وہ دونوں کہنے لگے ہر طرح کی تعریف اس اللہ کو سزاوار ہے جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا کی۔(۱۵)

۱۰۱ کے حاشیہ میں گزر چکا ہے گویا ابتداءً یہی دو بڑے معجزے عطا کر کے سیدنا موسیٰ کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا کیونکہ فرعونیوں نے اپنے ملک میں فسادِ عظیم برپا کر رکھا تھا۔

[۱۳] موسیٰ علیہ السلام اپنے بھائی ہارون کے ہمراہ فرعون کے دربار میں پہنچے۔ اسے اللہ کا پیغام بھی پہنچایا اور اپنی رسالت کی صداقت کے طور پر یہ دونوں معجزات بھی دکھائے لیکن ان لوگوں نے ان معجزات کو جادو کے کرشمے یا شعبدہ بازیاں کہہ دیا۔ حالانکہ ان کے دلوں میں یہ یقین آ گیا تھا کہ یہ معجزات فی الواقع اللہ کی عطا کردہ نشانیاں ہیں۔ جادو کے کرشمے نہیں ہیں۔ اور موسیٰ علیہ السلام فی الواقع اللہ کے رسول ہیں اور دل میں یقین کے برعکس ان کا زبان سے انکار کر دینا محض تکبر کی بنا پر تھا اور یہ بہت بڑی بے انصافی کی بات تھی۔

ایمان اور کفر کی چار اقسام اور جحود کا مفہوم:۔ واضح رہے کہ تصدیق و تکذیب کے لحاظ سے ایمان اور کفر کی چار قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ دل بھی رسالت کی تصدیق کرے اور زبان سے بھی اقرار کرے یہ صحیح اور خالص ایمان ہے۔ دوسرے یہ کہ دل بھی تکذیب کرے اور زبان بھی انکار کرے۔ یہ خالص کفر ہے۔ تیسرے یہ کہ دل تکذیب کرے یعنی دل میں کفر ہو اور زبان سے ایمان کا اقرار کرے۔ یہ نفاق ہے۔ چوتھے یہ کہ دل تصدیق کرے لیکن زبان سے انکار کرے یہ جحود ہے۔ ان میں سے صرف پہلی قسم اللہ کے ہاں مقبول اور پسندیدہ ہے۔ اور تیسری اور چوتھی قسم بھی اگرچہ کفر میں شامل ہیں لیکن یہ بدترین قسم کا کفر ہیں۔ اور ایسے لوگ عام کافروں سے زیادہ سزا یا عذاب کے مستحق ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں اپنی دلی کیفیت کے خلاف گواہی دیتے ہیں۔

[۱۴] **سیدنا داوٗد علیہ السلام کو بادشاہی کیسے ملی؟** سیدنا داوٗد علیہ السلام کے چھ اور بھائی تھے آپ سب سے چھوٹے تھے۔ ریوڑ چرایا کرتے تھے۔ پست قامت اور مضبوط جسم کے مالک تھے۔ تیر اندازی اور نشانہ بازی میں خوب ماہر تھے اور یہ آپ کی پیشہ ورانہ ضرورت تھی۔ جالوت سے لڑائی کے وقت یہ طالوت کے لشکر میں محض ایک سپاہی تھے۔ نشانہ بازی میں مہارت کی بنا پر آپ نے فلاخن میں ایک پتھر کا نشانہ بنا کر جالوت کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اس کے بعد طالوت نے اپنی بیٹی کا ان سے نکاح کر دیا۔ اسی طرح طالوت کے بعد بادشاہی بھی ان کی طرف منتقل ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے نبوت سے بھی سرفراز فرمایا اور یہ تفصیل سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۵۱ کے تحت پہلے گزر چکی ہے۔ پھر ان کی اولاد انیس بیٹے تھے۔ ان میں سے سیدنا سلیمان علیہ السلام ہی سب سے چھوٹے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے نبوت اور بادشاہی کے لئے انہیں ہی منتخب فرمایا تھا۔

[۱۵] علم سے مراد علمِ شریعت بھی ہو سکتا ہے۔ حکمرانی اور جہانبانی کا علم بھی۔ لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کا علم بھی اور یہ علم بھی اگر اللہ تعالیٰ کسی بندے کو اپنی نعمتوں سے نوازے تو اسے ان پر فخر اور تکبر نہیں کرنا چاہئے جیسا کہ فرعون اور اس

سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ وَاُوْتِیْنَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ

اور داؤد کے سلیمان وارث [۱۶] ہوئے۔ انہوں نے کہا: لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی [۱۷] سکھائی گئی ہے اور ہر چیز بھی دی گئی ہے۔ بلاشبہ یہ اللہ کا نمایاں فضل ہے۔ (۱۶)

کی قوم کے حالات میں پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ بلکہ اللہ کی نعمتوں کا شکر بجا لانا چاہئے تاکہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو اپنے مزید انعامات سے نوازے۔ مندرجہ بالا مفاہیم میں سے اس مقام پر چوتھا مفہوم ہی زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

[۱۶] یہاں وراثت سے مراد سیدنا داؤد کے ذاتی مال و دولت کی وراثت نہیں بلکہ نبوت اور جہاں بانی کی وراثت مراد ہے۔

[۱۷] ❁ سیدنا سلیمان علیہ السلام کا جانوروں کی بولی سمجھنا اور اللہ کا شکر ادا کرنا:۔ اللہ تعالیٰ کی حیران کن قدرتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تمام انسان ایک ہی جیسی شکل رکھتے ہیں۔ ہر شخص کی ایک ناک، دو کان، دو آنکھیں، دو بازو اور دو پاؤں ہوتے ہیں لیکن اس قدر یکسانیت کے باوجود ہر ایک کی شکل دوسرے سے مختلف ہوتی ہے پھر ایک شخص کے اگر چھ لڑکے ہیں تو دوسرے لوگ یہ تو بتا سکتے ہیں کہ ان سب میں یک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے مگر ان میں تمیز صرف والدین اور قریبی رشتہ دار ہی یا دوست احباب ہی کر سکتے ہیں۔ پھر یہ اختلاف صرف شکل و صورت تک محدود نہیں۔ ہر انسان کی بولنے کی آواز کھانسنے کی آواز حتیٰ کہ پاؤں کی چاپ اور چلنے کی چال میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ قریبی لوگ کسی کے بولنے، کھانسنے یا چال ڈھال سے ہی یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ فلاں شخص ہے۔ بالکل ایسا ہی سلسلہ جانوروں اور پرندوں میں بھی ملتا ہے۔ جانوروں اور پرندوں کی بھی ایک بولی ہے۔ جسے انسان سمجھ نہیں سکتے مگر وہ آپس میں خوب سمجھتے ہیں۔ مثلاً ایک پرندہ جب اپنے جوڑے کو بلاتا یا دانہ دینے کے لئے اپنے بچوں کو بلاتا یا انہیں کسی خطرہ سے آگاہ کرتا ہے تو ان تمام صورتوں میں اس کی بولی اور لب و لہجہ ایک جیسا نہیں ہوتا۔ اور اس فرق کو اس کے مخاطب پوری طرح سمجھتے اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں اور جب یہ پرندے مل کر عموماً صبح کے وقت چہچہاتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ اگرچہ ہم ان مختلف حالات میں ان کی بولی میں تمیز نہیں کر سکتے، لیکن وہ آپس میں خوب سمجھتے ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے ایک ٹیلیگراف ماسٹر جب تار کے ذریعہ کوئی پیغام بھیجتا ہے تو آپ خواہ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھے رہیں۔ کھٹ کھٹ اور ٹک ٹک کی بے معنی آوازوں کے سوائے آپ کے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔ لیکن اس فن کو جاننے والا شخص فوراً بتا دے گا کہ یہ پیغام فلاں جگہ پر فلاں آدمی کے نام ہے اور اس پیغام کا مضمون یہ ہے۔

❁ ہر چیز تسبیح کرتی ہے:۔ پھر یہ بات صرف انسانوں، جانوروں اور پرندوں تک ہی محدود نہیں بلکہ حشرات الارض، نباتات اور جمادات تک میں احساسات کا یہ سلسلہ چلتا ہے اور یہ سب اشیاء اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہیں مگر اسے ہم سمجھ نہیں سکتے (۱۷: ۴۴) اور سیدنا سلیمان علیہ السلام نے اپنے آپ پر اللہ تعالیٰ کے جس فضل کا اعتراف کیا وہ دو باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ نے ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ پرندوں کی بولی بول سکتے تھے بلکہ یہ ہے کہ پرندے وغیرہ آپس میں ایک دوسرے سے جو باتیں کرتے ہیں انہیں آپ سمجھ جاتے تھے۔ پھر آپ جو کچھ کہنا چاہتے پرندے بھی اسے سمجھ جاتے تھے۔ اور دوسری نعمت یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری ضرورت کی تمام چیزیں ہمیں مہیا فرما دی ہیں۔

الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ
النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾

اور سلیمان کے لیے (کسی مہم کے سلسلہ میں) اس کے جنوں، انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کئے گئے اور ان کی جماعت [۱۸] بندی کر دی گئی تھی۔(۱۷) یہاں تک جب وہ چیونٹیوں کی ایک وادی پر پہنچے تو ایک چیونٹی [۱۹] بول اٹھی، "چیونٹیو! اپنے اپنے بلوں میں گھس جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تمہیں روند ڈالیں اور انہیں [۲۰] پتہ بھی نہ چلے۔(۱۸)

[۱۸] سیدنا سلیمان علیہ السلام کا لشکر انسانوں جنوں اور پرندوں پر مشتمل تھا:۔ یہ دراصل سابقہ آیت میں ﴿کل شیء﴾ کی تفصیل ہے۔ یعنی آپ کا لشکر تین انواع پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس میں انسان بھی شامل تھے، جن بھی اور پرندے بھی اور ان سے آپ مختلف قسم کے کام لیتے تھے اور یہ لشکر ملا جلا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ جب آپ کسی مہم پر جاتے تو انسانوں کا لشکر الگ، جنوں کا الگ اور پرندوں کا لشکر الگ الگ ساتھ چلتا تھا۔ بھاری اور زیادہ مشقت طلب کام آپ جنوں سے لیتے تھے اور پیغام رسانی، سراغ رسانی اور پانی وغیرہ کی تلاش کا کام آپ پرندوں سے لیتے تھے۔ نیز بعض دفعہ پرندوں کے جھنڈ سے لشکر پر سایہ کرنے کا کام بھی لیا جاتا تھا۔

جو لوگ معجزات اور خرقِ عادت امور سے گھٹن محسوس کرتے ہیں اور ایسے واقعات کی تاویلات کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ان کی تاویلات کے مطابق یہاں جن سے مراد جفاکش دیہاتی لوگ ہیں۔ اور الطیر سے وہ طیارے مراد لیتے ہیں۔ یعنی سیدنا سلیمان علیہ السلام کے پاس ہوائی فوج بھی موجود تھی ایسی تاویلات دراصل تاویلات نہیں بلکہ تحریفات ہیں جن کا قرآن کریم کا سیاق و سباق ساتھ نہیں دیتا ایسی تاویلات کا تجزیہ کرنا یہاں مشکل ہے۔ البتہ ایسی تمام تر تاویلات کا تفصیلا تجزیہ میں نے اپنی تصنیف "عقل پرستی اور انکارِ معجزات" میں پیش کر دیا ہے۔

[۱۹] چیونٹیوں کا معاشرتی اور سیاسی نظام:۔ علمائے حیوانات کی جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ جس طرح انسان اپنے اجتماعی اور سیاسی نظام کے لئے چند مخصوص ضوابط کی پابندی کرتا ہے۔ چیونٹی جیسے حقیر ترین جانور کی بستیوں میں بھی اسی سے ملتا جلتا نظام پایا جاتا ہے۔ آدمیوں کی طرح چیونٹیوں کے بھی خاندان اور قبائل ہوتے ہیں ان میں باہمی تعاون اور تقسیم کار کا اصول اور نظام حکومت کے ادارات پائے جاتے ہیں ان کی بھی زبان ہے جس کو سب چیونٹیاں سمجھتی ہیں۔

[۲۰] سیدنا سلیمان علیہ السلام اپنے لاؤ لشکر سمیت کسی مہم پر جا رہے تھے کہ چیونٹیوں کی ایک بستی پر ان کا گزر ہوا تو آپ نے ایک چیونٹی کو دوسری چیونٹی سے یوں خطاب کرتے ہوئے سنا۔ وہ شاید ان چیونٹیوں کی سردار چیونٹی تھی جو دوسری چیونٹیوں کو یہ خبر اور ہدایت دے رہی تھی کہ دیکھو سلیمان علیہ السلام اور اس کا لاؤ لشکر تمہارے سروں پر پہنچ رہا ہے۔ لہذا جلد از جلد اپنے اپنے بلوں میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو کہ تم ان کے پاؤں کے نیچے پس جاؤ۔ اور انہیں یہ خبر بھی نہ ہو کہ تمہاری جانوں پر کیسا حادثہ گزر گیا؟

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِيٓ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيٓ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى
وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصّٰلِحِينَ ﴿۱۹﴾ وَتَفَقَّدَ
الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ أَرَى الْهُدْهُدَ ۖ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِينَ ﴿۲۰﴾ لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا أَوْ

سلیمان چیونٹی کی اس بات پر مسکرا دیئے[۲۱] اور دعا کی: ''اے میرے پروردگار مجھے توفیق[۲۲] دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکر ادا کر سکوں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا کی ہے اور اس بات کی بھی کہ میں ایسے اچھے عمل کروں جو تجھے پسند ہوں اور اپنی رحمت سے مجھے اپنے صالح بندوں میں داخل کر'' (۱۹) (پھر ایک موقع پر) سلیمان نے پرندوں کا جائزہ لیا تو کہنے لگے: ''کیا بات ہے مجھے ہدہد نظر نہیں آ رہا، کیا وہ کہیں غائب ہو گیا ہے۔ (۲۰) (ایسی ہی بات ہوئی) تو میں اسے سخت سزا دوں گا یا اسے ذبح کر ڈالوں گا

[۲۱] ❁ چیونٹی کی فریاد اور سیدنا سلیمان علیہ السلام کی دعائے استسقاء:۔ آپ چیونٹی کی یہ بات سمجھ کر فرط سرور و انبساط سے ہنس دیئے اور اللہ کی اس نعمت کا شکر ادا کیا۔ پھر دست بدعا ہو کر فرمایا: پروردگار! مجھے ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرما جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کی ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ایک دفعہ سیدنا سلیمان علیہ السلام لوگوں کے ہمراہ نماز استسقاء کے لیے ایک میدان کی طرف نکلے۔ وہاں ایک چیونٹی کو دیکھا جو چت لیٹ کر اور اپنے پاؤں اوپر اٹھائے ہوئے اللہ سے دعا کر رہی تھی کہ یا اللہ! میں بھی تیری مخلوق ہوں اگر تو کھانے پینے کو نہ دے گا تو میں کیسے زندہ رہ سکتی ہوں یا ہمیں کھانے کو دے یا مار ڈال۔ سیدنا سلیمانؑ نے چیونٹی کی یہ دعا سن کر لوگوں سے فرمایا: اب اپنے اپنے گھروں میں لوٹ جاؤ۔ ایک چیونٹی نے تمہارا کام پورا کر دیا۔ اب انشاء اللہ بارش ہو گی۔ (دار قطنی بحوالہ مشکوٰۃ۔ کتاب الصلوٰۃ۔ باب الاستسقاء فصل ثالث)

[۲۲] ❁ وَزَعَ کا لغوی مفہوم:۔ یہاں ﴿أَوْزِعْنِي﴾ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور وَزَعَ کا لغوی معنی روکنا یا روکے رکھنا ہے۔ اور وزع الجیش یعنی فوج کو ترتیب وار صفوں میں رکھنا ہے۔ سیدنا سلیمان علیہ السلام دعا یہ فرما رہے ہیں کہ جس قدر تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر انعامات کی بارش کی ہے اس پر کہیں میرا نفس بے قابو اور بے لگام ہو کر سرکشی کی راہ نہ اختیار کر لے۔ جیسا کہ عموماً اللہ کی طرف سے انعامات کی فراوانی اکثر لوگوں کے ذہنوں کو بگاڑ دیتی ہے۔ مجھے ایسے لوگوں اور ایسی ذہنیت سے روکے رکھنا اور اس بات کی توفیق عطا فرما کہ میں ان نعمتوں پر تیرا شکر گزار بندہ بنوں اور وہی کام کروں جو تجھے پسند ہیں۔

❁ چیونٹی کی بات کرنے کی تاویل؟ عقل پرستوں نے اس وادی نمل کے قصہ میں بھی اپنی عقل کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وادی نمل فلاں مقام پر ایک بستی کا نام ہے اور نمل ایک قبیلہ کا نام تھا۔ اس کے افراد بھی نملی کہلاتے تھے۔ سلیمان علیہ السلام کا لاؤ لشکر دیکھ کر ایک نملہ نے دوسرے نملوں سے یہ بات کہی تھی۔ اس تاویل یا تحریف میں جتنا وزن ہو سکتا ہے وہ ان آیات کے سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھ لیجئے کہ آیا اس تاویل میں کچھ معقولیت نظر آتی ہے؟

لَاَاذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۱﴾ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَ
جِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۢ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿۲۲﴾ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا
عَرْشٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۳﴾ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ

یا وہ میرے سامنے کوئی معقول وجہ [۲۳] پیش کرے۔(۲۱) تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ (ہدہد آگیا اور) کہنے لگا: "میں نے وہ کچھ معلوم کیا ہے جو ابھی تک آپ کو معلوم نہیں، میں سبا [۲۴] سے متعلق ایک یقینی خبر آپ کے پاس لایا ہوں(۲۲) میں نے دیکھا کہ ایک عورت ان پر حکمرانی کرتی ہے جسے سب کچھ عطا کیا گیا ہے اور اس کا تخت عظیم الشان ہے(۲۳) میں نے (یہ بھی) دیکھا کہ وہ خود اور اس کی قوم اللہ کو چھوڑ کر سورج کو سجدہ کرتے ہیں اور شیطان نے ان کیلئے ان کے اعمال [۲۵]

[۲۳] سیدنا سلیمان علیہ السلام کو کسی موقعہ پر ہدہد کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ہدہد کے متعلق مشہور ہے کہ جس مقام پر پانی سطح زمین سے نزدیک تر ہو اسے معلوم ہو جاتا ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ انہیں یہی ضرورت تھی یا کچھ اور تھی، انہوں نے پرندوں کے لشکر میں ہدہد کو تلاش کیا لیکن وہ وہاں نہ ملا۔ آپ کو اس بات کا سخت رنج ہوا اور فرمایا کہ یا تو وہ اپنی غیر حاضری کی کوئی معقول وجہ پیش کرے۔ ورنہ میں اسے سخت سزا دوں گا یا ذبح ہی کر ڈالوں گا۔

[۲۴] ۞ سیدنا سلیمان علیہ السلام کی حدودِ سلطنت:۔ سیدنا سلیمان علیہ السلام کی سلطنت فلسطین، شرق اردن اور شام کے کچھ علاقہ پر مشتمل تھی۔ افریقہ میں بھی حبشہ اور مصر کا کچھ حصہ آپ کے زیر نگین آگیا تھا۔ لیکن جنوبی یمن کا علاقہ آپ کی سلطنت سے بہت دور تھا۔

۞ اہل سبا کے متعلق ہدہد کی اطلاع:۔ ہدہد سیدنا سلیمان علیہ السلام کے لشکر سے غائب ہو کر یمن کے علاقہ سبا میں پہنچا تھا۔ یہاں کے لوگ تجارت پیشہ اور آسودہ حال تھے۔ کچھ دیر بعد ہدہد سیدنا سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہو گیا اور کہنے لگا کہ میں اہل سبا کے کچھ ایسے یقینی حالات معلوم کر کے آرہا ہوں جن کی تاحال آپ کو کچھ خبر نہیں ہے۔ اور وہ یقینی خبر یہ ہے کہ سبا کا ملک ایک زرخیز و شاداب علاقہ ہے ان لوگوں کو وہاں سب ضروریات زندگی وافر مقدار میں میسر ہیں۔ ان لوگوں پر حکمران ایک عورت ہے۔ (ملکہ بلقیس) جو بڑے عالی شان تخت پر بیٹھ کر حکمرانی کر رہی ہے۔ اس کا تخت سونے کا ہے۔ جس میں ہیرے اور جواہرات جڑے ہوئے ہیں اور اس وقت ایسا تخت کسی بادشاہ کے پاس نہیں ہے۔ مذہبی لحاظ سے یہ لوگ مشرک اور آفتاب پرست ہیں۔ اور اپنے اس مذہب پر خوش اور نازاں بھی ہیں۔ سورج پرستی کو نیکی اور ثواب کا کام سمجھتے ہیں۔ ہدہد نے یہ الفاظ کہہ کر گویا سلیمان علیہ السلام کو اس قوم پر جہاد کرنے کی ترغیب دی۔

[۲۵] ۞ اہل سبا کی سورج پرستی:۔ یعنی یہ لوگ سورج پرست بھی ہیں اور آخرت کے منکر بھی۔ لہذا وہ اپنی ساری کوششیں زیادہ سے زیادہ دولت کمانے اور اپنا معیار زندگی بلند کرنے میں صرف کر رہے ہیں۔ اور اسی کام کو اپنی زندگی کا منتہائے مقصود سمجھے بیٹھے ہیں اور شیطان نے انہیں یہی بات سجھائی ہے کہ ان کی عقلی اور فکری قوتوں کا یہی بہترین مصرف ہے کہ وہ اپنی اس دنیا کی زندگی کو زیادہ سے زیادہ شاندار بنائیں۔

فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۲۴﴾ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۶﴾ السجدۃ قَالَ
سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَا

السجدۃ ۸

کو آراستہ کر کے انہیں راہ (حق) سے روک دیا ہے، لہٰذا وہ راہ (حق) نہیں پا رہے۔(۲۴)

اس اللہ کو سجدہ نہیں کرتے جو ان چیزوں کو نکالتا ہے جو آسمانوں اور زمین میں پوشیدہ ہیں اور وہ سب کچھ جانتا ہے جسے تم چھپاتے ہو[۲۶] اور جسے ظاہر کرتے ہو۔(۲۵) اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ وہی عرش عظیم[۲۷] کا مالک ہے۔"(۲۶) سلیمان نے کہا: "ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں کہ تو سچ کہہ رہا ہے یا جھوٹا ہے۔(۲۷) یہ میرا خط لے جا اور ان کی طرف پھینک دے پھر ان سے ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا جواب دیتے[۲۸] ہیں۔"(۲۸)

[۲۶] آیت نمبر ۲۵ اور ۲۶ کو بعض مفسرین نے ہدہد کے جواب کا ہی تتمہ قرار دیا ہے اور بعض نے اسے ہدہد کے کلام پر اللہ تعالیٰ کی طرف مناسب اضافہ قرار دیا ہے۔ اس آیت میں ﴿يَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ﴾ سے دوسرا قول ہی راجح معلوم ہوتا ہے۔

❁ لفظ خَبْءٌ کا لغوی مفہوم:۔ خَبْءٌ معنی پوشیدہ اور مخفی خزانہ (مفردات القرآن) اور اس سے مراد ایسا پوشیدہ اور مخفی خزانہ ہے جس کا پہلے سے کسی کو علم نہ ہو اور خبأ بمعنی کسی چیز کو چھپا رکھنا اور خابأ بمعنی کسی سے چیستان، پہیلی یا معمہ پوچھنا اور خبءُ الارض بمعنی زمین کی نباتات جو ابھی ظہور میں نہ آئی ہو۔ قوت روئیدگی اور خبءُ السماء بمعنی بارش اور اخرج خبءُ السماء خبءَ الارض بمعنی آسمان کی بارش نے زمین پر روئیدگی پیدا کی اور پودوں کو اگایا۔ اسی طرح زمین میں سے اگر کہیں سے تیل یا جلنے والی گیسیں یا معدنیات وغیرہ نکل آئیں تو یہ سب چیزیں خبءُ الارض میں شمار ہوں گی۔

اور اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ سجدہ کرنے کے لائق تو وہ ذات ہے جو زمین و آسمان سے ان کی پوشیدہ چیزوں اور مخفی قوتوں کو بروئے کار لا کر ان کی روزی کا سامان مہیا کرتی ہے۔ نہ کہ سورج اور اس جیسی دوسری بے جان، مخلوق یا محتاج اشیاء نیز سجدہ کے لائق وہ ذات ہے جس کا علم اتنا وسیع ہو جو صرف زمین و آسمان کی پوشیدہ قوتوں اور اشیاء کو ہی نہیں جانتی بلکہ وہ تمہارے بھی سب ظاہری اور پوشیدہ اعمال سے پوری طرح واقف ہے۔

[۲۷] ہدہد نے ملکہ سبا کے متعلق یہ یقینی خبر دی تھی کہ اس کا عرش عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا عرش عظیم تو صرف اللہ کا ہے۔ اس کے عرش کے مقابلہ میں کسی کا تخت عظیم نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی اللہ کے مقابلہ میں آفتاب یا دوسری اشیاء کو الٰہ کہا جا سکتا ہے۔ یا کسی ایسی چیز کو سجدہ کیا جا سکتا ہے۔

اس مقام پر سجدہ کرنا واجب ہے۔ جس سے مقصود یہ ہے کہ ایک مومن اپنے آپ کو ان آفتاب پرستوں سے جدا کرے جو سورج کو سجدہ کرتے ہیں اور اپنے عمل سے یہ ظاہر کرے کہ وہ آفتاب کو نہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کو ہی اپنا معبود و مسجود تسلیم کرتا ہے۔

[۲۸] ❁ سیدنا سلیمان علیہ السلام کا ہدہد کے ذریعہ ملکہ سبا کو خط بھیجنا:۔ سلیمان علیہ السلام نے ہدہد کا جواب یا اس کی معذرت سن کر فرمایا: میں تمہیں ایک خط لکھ کر دیتا ہوں۔ یہ خط لے جا کر دربار میں ملکہ اور اس کے درباریوں کے سامنے

ذَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۹﴾ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ
الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۰﴾ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْٓ اَمْرِيْ مَا ع ۲/۱۷

(سبا کی ملکہ) کہنے لگی: ''اے اہلِ دربار! میری طرف ایک بڑا اہم خط پھینکا گیا ہے (۲۹) اور وہ یہ ہے ''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے'' (۳۰) یہ کہ میرے مقابلے میں سرکشی اختیار نہ کرو، بلکہ فرمانبردار اور مطیع ہو کر میرے پاس [۲۹] آ جاؤ'' (۳۱) (یہ خط سنا کر) ملکہ کہنے لگی: ''اے اہلِ دربار! میرے اس معاملہ میں مجھے مشورہ دو۔

پھینک دو۔ پھر انتظار کی خاطر ایک طرف ہٹ جاؤ۔ پھر دیکھنا کہ اس خط کا ان پر رد عمل کیا ہوتا ہے۔ اور واپس آکر مجھے اس رد عمل کے مطابق اطلاع بھی دو۔ اس سے جہاں یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ اس یقینی خبر کو ہم تک پہنچانے میں کہاں تک سچے ہو وہاں ان لوگوں کے رد عمل سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ لوگ کس ذہنیت کے مالک ہیں۔

❁ ہدہد کی عقلی تاویل اور اس کا جواب:۔ بعض عقل پرستوں نے اس ہدہد کی پیغام رسانی کے قصہ کو بھی عقل کے مطابق بنانے کی کوشش فرمائی ہے۔ ان لوگوں نے طیر سے طیارے مراد لیا، ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ ہدہد اس طیارے کا پائلٹ تھا۔ اور جن لوگوں نے طیر کے معنی طیارہ لینا حماقت سمجھا وہ کہتے ہیں کہ ہدہد کسی فوجی افسر کا نام تھا۔ اور یہ دستور ہر جگہ پایا جاتا ہے کہ لوگ بعض انسانوں کے نام درختوں یا پرندوں کے نام پر رکھ لیتے ہیں۔ اس توجیہ میں یہاں تک تو بات کسی حد تک قابلِ تسلیم ہے۔ اب مشکل یہ پیش آتی ہے کہ سلیمان علیہ السلام ہدہد سے کہتے ہیں کہ میرا یہ خط لے جا اور ان کے آگے پھینک دے یا ڈال دے۔ ﴿فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ﴾ یہ کام پرندہ تو کر سکتا ہے۔ لیکن کوئی انسان سفیر کی حیثیت سے جا کر اگر ایسا کام کرے تو یہ انتہائی بد تمیزی کی بات ہوگی اور کچھ عجب نہیں کہ وہ اس بد تمیزی کی پاداش میں قید میں ڈال دیا جائے یا قتل ہی کر ڈالا جائے۔

دوسری مشکل یہ پیش آتی ہے کہ سیدنا سلیمان علیہ السلام ہدہد کو یہ ہدایت کرتے ہیں کہ یہ خط ان کے آگے پھینک دے۔ پھر ان سے پرے ہٹ کر دیکھ کہ اس خط کا ان پر رد عمل کیا ہوتا ہے؟ اب ظاہر ہے کہ کوئی بھی حکومت کسی غیر ملکی سفیر کے سامنے اپنے اندرونی معاملات کے مشورے نہیں کر سکتی۔ البتہ کسی پرندہ کی صورت میں یہ بات ممکن ہے۔ ہمارے خیال میں ان لوگوں کی یہ تاویلات خود ان کی اپنی ذات کو بھی مطمئن نہیں کر سکتیں۔ چہ جائیکہ دوسرے ان سے مطمئن ہوں۔ کیونکہ قرآن کے الفاظ واضح طور پر ایسے لوگوں کی تاویلات کی تردید کر رہے ہیں۔

[۲۹] ❁ سیدنا سلیمان علیہ السلام کے مختصر سے خط کی امتیازی خصوصیات:۔ جس وقت نامہ بر ہدہد نے یہ خط دربار میں ملکہ سبا کے سامنے پھینکا اس وقت وہ سورج کی عبادت کے لئے تیاری کر رہی تھی۔ اس خط نے اسے عجیب قسم کی کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ کیونکہ یہ خط کئی پہلوؤں سے بہت اہم تھا۔ مثلاً ایک یہ کہ یہ خط اسے غیر معمولی طریقہ سے ملا۔ یعنی یہ خط کسی ملک کے سفارت خانہ کی معرفت نہیں بلکہ ایک نامہ بر پرندہ کے ذریعہ ملا تھا۔ دوسرے یہ کہ یہ خط کسی معمولی درجہ کے حاکم سے نہیں بلکہ شام و فلسطین کے عظیم فرمانروا کی طرف سے موصول ہوا تھا۔ تیسرا یہ کہ یہ خط رحمٰن اور رحیم کے نام سے شروع کیا گیا تھا کہ ان ناموں سے یہ لوگ قطعاً متعارف نہ تھے۔ اور چوتھے یہ کہ اس انتہائی مختصر سے خط میں ملکہ سے مکمل اطاعت کا اور پھر اس کے

كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴿۳۳﴾ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ

جب تک تم لوگ میرے پاس موجود نہ ہو میں کسی معاملہ کو طے نہیں کیا کرتی۔(۳۲)

(درباری) کہنے لگے ''ہم بڑے طاقتور اور سخت جنگ جو ہیں مگر معاملہ کا اختیار[۳۰] تو آپ ہی کو ہے۔ آپ خود ہی غور کریں کہ آپ ہمیں کیا حکم دیتی ہیں؟''(۳۳) (ملکہ) کہنے لگی: ''بادشاہ لوگ جب کسی علاقہ میں داخل ہوتے ہیں تو اسے اجاڑ دیتے ہیں اور وہاں کے معززین کو ذلیل[۳۱]

بعد سیدنا سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہونے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اور یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ میرے مقابلہ میں سرکشی کی راہ اختیار نہ کرنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ پانچویں یہ کہ انداز خطاب ایسا تھا جس میں کسی قسم کی کوئی لچک نہ پائی جاتی تھی۔

اس آیت میں ﴿وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ مسلمین کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ میرے فرمانبردار بن کر میرے ہاں آؤ۔ اور یہ حکم آپ کی فرمانروائی سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اسلام لا کر یا مسلمان ہو کر میرے ہاں آؤ اور سورج پرستی چھوڑ دو۔ اور یہ حکم آپ کی نبوت سے تعلق رکھتا ہے اور آپ چونکہ بادشاہ بھی تھے اور نبی بھی۔ لہٰذا مسلمین میں دونوں ہی مفہوم پائے جاتے ہیں۔

۞ ملکہ سبا کا درباریوں سے مشورہ:۔ ایسے خط سے ملکہ سبا کا پریشان ہو جانا اور ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جانا ایک فطری بات تھی۔ لہٰذا اس سلسلہ میں اپنے سرکاری امیروں، وزیروں سے مشورہ کرنا ہی مناسب سمجھا۔ چنانچہ اس نے سب کو اکٹھا کر کے اس خط کے وصول ہونے اور اس کی مختلف پہلوؤں کی اہمیت سے آگاہ کیا پھر ان سے پوچھا کہ: تم لوگ مجھے اس خط کے جواب کے بارے میں کیا مشورہ دیتے ہو؟ اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ میں سلطنت کے ایسے اہم کاموں میں پہلے بھی تم سے مشورہ کرتی رہی ہوں۔ اور از خود میں نے کبھی مشورہ کے بغیر کسی کام کا فیصلہ نہیں کیا۔

[۳۰] ملکہ کے مشیروں اور درباری لوگوں نے وہی جواب دیا جو عام طور پر درباری لوگ دیا کرتے ہیں۔ نہ وہ اپنے ذہن پر بار ڈال کر کوئی دانشمندانہ جواب دینے کے عادی ہوتے ہیں اور نہ وہ اپنے سر کوئی ذمہ داری لینا چاہتے ہیں۔ وہ صرف جی حضور کہنا اور اپنے آپ کو حکم کے بندے ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہی کچھ ان لوگوں نے بھی کیا۔ کہ ہماری خدمات حاضر ہیں۔ ہم زور آور بھی ہیں اور لڑائی کا فن بھی خوب جانتے ہیں۔ تاہم یہ فیصلہ کرنا کہ سلیمان سے جنگ کرنی چاہئے یا مطیع فرمان بن جانا چاہئے آپ ہی کی صوابدید پر منحصر ہے۔ گویا ملکہ کو اپنے مشیروں سے مشورہ کرنے کا کوئی خاص فائدہ نہ ہوا ماسوائے اس کے کہ اگر ملکہ مقابلہ کا ارادہ رکھتی ہو تو انہوں نے اپنی وفاداریوں کا اسے یقین دلا دیا۔

البتہ اس سے یہ بات ضمناً معلوم ہو جاتی ہے کہ سبا میں اگرچہ شاہی نظام رائج تھا تاہم یہ استبدادی نظام نہ تھا۔ بلکہ فرمانروا اہم معاملات میں اپنے مشیروں سے مشورہ کرنا ضروری سمجھتے تھے۔

[۳۱] ۞ ملکہ کا اپنے خدشات سے درباریوں کو مطلع کرنا:۔ خط کے انداز خطاب سے ملکہ کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ سلیمان عام

أَهْلِهَا أَذِلَّةً ۚ وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ ﴿٣٤﴾ وَإِنِّي مُرْسِلَةٌ إِلَيْهِم بِهَدِيَّةٍ فَنَاظِرَةٌ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُونَ ﴿٣٥﴾

فَلَمَّا جَاءَ سُلَيْمَانَ قَالَ أَتُمِدُّونَنِ بِمَالٍ فَمَا آتَانِيَ اللَّهُ خَيْرٌ مِّمَّا آتَاكُم بَلْ أَنتُم بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُونَ ﴿٣٦﴾

بنا دیتے ہیں اور یہی کچھ یہ لوگ بھی کریں گے۔(۳۴) میں (تجربہ کے طور پر) ان کی طرف کچھ تحفہ بھیجتی ہوں پھر دیکھوں گی کہ میرے بھیجے ہوئے آدمی کیا جواب لاتے[۳۲] ہیں۔(۳۵)

پھر جب وہ وفد (تحفہ لے کر) سلیمان کے پاس آیا تو سلیمان نے کہا: "کیا تم مجھے مال کا لالچ دیتے ہو؟ وہ تو اللہ نے مجھے (پہلے ہی) تم سے زیادہ دے رکھا ہے۔ تمہارا یہ تحفہ تمہیں ہی مبارک ہو[۳۳] جس پر تم اِترا رہے ہو۔ (۳۶)

فرمانرواؤں کی طرح نہیں بلکہ ان کی پشت پر کوئی غیر معمولی طاقت ہے اور یہ بھی معلوم ہو رہا تھا کہ اگر ملکہ اور اس کے کارپرداز مطیع فرمان بن کر سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر نہ ہوئے تو سیدنا سلیمان ان کی سرکوبی کے لئے ضرور ان پر چڑھائی کریں گے۔ سیدنا سلیمان علیہ السلام یہ تو گوارا کر سکتے تھے کہ یہ لوگ سورج پرستی چھوڑ کر راہ راست پر آ جائیں تو ان سے کچھ تعرض نہ کیا جائے۔ مگر یہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ ان کے پاس اسباب و وسائل موجود ہونے کے باوجود ان کے قرب و جوار میں اس طرح علانیہ ملکی سطح پر شرک اور سورج پرستی ہوتی رہے۔ لہذا ملکہ کے خطرات کچھ موہوم خطرات نہ تھے۔ اس نے ٹھیک اندازہ کر لیا تھا کہ ایک تو سیدنا سلیمان علیہ السلام ان کی سرتابی کی صورت میں ضرور ان پر چڑھائی کریں گے اور دوسرے اس نے یہ بھی اندازہ کر لیا تھا کہ سیدنا سلیمان کے لشکروں کے مقابلہ کی ان میں تاب نہیں ہے۔ لہذا اس نے سرتابی یا خاموشی کے انجام سے اپنے مشیروں کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ دنیا میں اکثریوں ہی ہوتا آیا ہے کہ جب کوئی بادشاہ کسی ملک کو فتح کرتا ہے تو سب سے پہلے اس ملک کے وسائل معاش پر قبضہ کر کے اس ملک کو مفلس و قلاش بنا دیتا ہے۔ پھر وہاں کے سرکردہ لوگوں کو کچل کر ان کا زور ختم کر دیتا ہے تاکہ وہ دوبارہ کبھی اس کے مقابلہ کی بات بھی نہ سوچ سکے۔ اس طرح وہ اس مفتوحہ ملک کے تمام سیاسی، تمدنی اور معاشی وسائل پر قبضہ کر کے اس ملک کی طاقت کو عملاً ختم کر کے اپنی طاقت میں اضافہ کر لیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکابرینِ مملکت یا تو موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے ہیں یا پھر انہیں ذلیل و رسوا ہو کر رہنا پڑتا ہے۔ لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت عام ہوتا ہے اور بسا اوقات شہروں کو آگ لگا دی جاتی ہے اور عام حالات میں ایسے ہی نتائج متوقع ہیں۔

[۳۲] ❁ سیدنا سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں وفد کی روانگی:۔ ملکہ کی اس تقریر سے یہ تو صاف واضح تھا کہ وہ مقابلہ کے لئے تیار نہیں۔ مگر وہ فوری طور پر مطیع فرمان ہونے پر بھی آمادہ نہ تھی۔ لہذا اس نے ایک دانشمندانہ قدم اٹھاتے ہوئے درمیانی راستہ اختیار کیا جو یہ تھا کہ سیدنا سلیمان علیہ السلام کے پاس ایک وفد بھیجا جائے اور ساتھ کچھ تحفے تحائف بھی بھیجے جائیں ان لوگوں کے رد عمل سے ان کی ذہنیت پوری طرح واضح ہو جائے گی۔ چنانچہ اس نے ہدیہ کی صورت میں بہت سا مال و دولت کچھ سونے کی اینٹیں اور کچھ نوادرات بھیجے اور وفد کے لئے ایسے آدمی انتخاب کئے جو بہت خوبصورت تھے اور اس سے دراصل وہ سیدنا سلیمان علیہ السلام کا امتحان لینا چاہتی تھی وہ کس قسم کی اشیاء کا شوق رکھتے ہیں۔ نیز یہ کہ اگر وہ دنیادار بادشاہ ہے تو تحائف قبول کر لے گا۔ اندریں صورت اس سے جنگ بھی لڑی جا سکتی ہے اور نبی ہے تو تحفے قبول نہیں کرے گا نہ اس سے مقابلہ ممکن ہو گا۔

[۳۳] ❁ وفد کو سلیمان علیہ السلام کا جواب:۔ جب یہ وفد تحائف لے کر سیدنا سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہوا تو آپ

اِرۡجِعۡ اِلَيۡهِمۡ فَلَنَاۡتِيَنَّهُمۡ بِجُنُوۡدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمۡ بِهَا وَلَـنُخۡرِجَنَّهُمۡ مِّنۡهَاۤ اَذِلَّةً وَّهُمۡ صٰغِرُوۡنَ ﴿۳۷﴾ قَالَ
يٰۤاَيُّهَا الۡمَلَؤُا اَيُّكُمۡ يَاۡتِيۡنِىۡ بِعَرۡشِهَا قَبۡلَ اَنۡ يَّاۡتُوۡنِىۡ مُسۡلِمِيۡنَ ﴿۳۸﴾ قَالَ عِفۡرِيۡتٌ مِّنَ الۡجِنِّ اَنَا اٰتِيۡكَ
بِهٖ قَبۡلَ اَنۡ تَقُوۡمَ مِنۡ مَّقَامِكَ‌ۚ وَاِنِّىۡ عَلَيۡهِ لَقَوِىٌّ اَمِيۡنٌ ﴿۳۹﴾ قَالَ الَّذِىۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمٌ مِّنَ

ان کے پاس واپس چلے جاؤ ہم ان پر ایسے لشکروں سے چڑھائی کریں گے جن کا وہ مقابلہ نہ کر سکیں گے اور انہیں ذلیل کر کے وہاں سے نکال دیں گے اور وہ ہمارے سامنے پست ہوں گے۔" (۳۷) اب سلیمان نے (اپنے درباریوں سے) کہا: اے اہلِ دربار! تم میں سے کون ہے جو ان کے مطیع ہو کر آنے سے پہلے پہلے ملکہ کا تخت میرے پاس اٹھا لائے؟" (۳۸) ایک دیو ہیکل جن نے کہا: "آپ کے دربار کو برخواست کرنے سے پہلے میں اسے لا سکتا ہوں۔ میں اس کام کی پوری قوت رکھتا ہوں اور امانت دار بھی ہوں۔ (۳۹) پھر ایک اور شخص، جس کے پاس

نے یہ تحفے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور انہیں واضح طور پر بتا دیا کہ مال و دولت سے مجھے کچھ غرض نہیں۔ نہ ہی میں مال و دولت کی رشوت لے کر اپنے ارادہ سے باز رہ سکتا ہوں۔ میں یہ دولت لے کر کیا کروں گا وہ تو میرے پاس پہلے ہی تم سے بہت زیادہ موجود ہے۔ یہ تمہارے تحفے تمہیں ہی مبارک ہوں۔ تمہارے لئے صرف دو صورتیں ہیں کہ تم مسلمان ہو کر میرے پاس آجاؤ۔ اس صورت میں تمہارا ملک تمہارے ہی پاس رہے گا۔ مجھے کوئی اپنی سلطنت بڑھانے کا شوق نہیں ہے بلکہ میں شرک کا استیصال کر کے تمہیں اللہ کا فرمانبردار بنانا چاہتا ہوں۔ ورنہ پھر دوسری یہ صورت ہے کہ ہم تم لوگوں پر ایک پرزور حملہ کریں گے جس کی تم تاب نہ لا سکو گے۔ اس صورت میں تمہارا جو حشر ہو سکتا ہے وہ تم خود ہی سمجھ سکتے ہو۔

یہاں درمیان میں ایک خلا ہے جسے مخاطب کے فہم پر چھوڑ دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب یہ وفد واپس آیا اور تحائف کی واپسی اور سیدنا سلیمان علیہ السلام سے گفتگو کی تفصیلات ملکہ سبا نے سنیں تو انہیں اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ سیدنا سلیمان علیہ السلام کوئی دنیادار بادشاہ نہیں۔ وہ آپ کی شان و شوکت اور اس کے ساتھ ساتھ خداترسی کے قصے پہلے بھی سن چکی تھی۔ تحائف کی واپسی اور وفد کے تاثرات نے تائید مزید کر دی۔ لہذا ملکہ سبا نے یہی مناسب سمجھا کہ ایسے پاکیزہ سیرت بادشاہ کے حضور خود حاضر ہونا چاہئے۔ چنانچہ اس نے سیدنا سلیمان علیہ السلام کو یروشلم میں عنقریب اپنے حاضر ہونے کی اطلاع بھیج دی۔

۞ سیدنا سلیمان علیہ السلام کا ملکہ کے تخت کو طلب کرنا: جب سیدنا سلیمان علیہ السلام کو ملکہ سبا کے آپ کے ہاں آنے کی اطلاع مل گئی تو آپ نے چاہا کہ ملکہ سبا کا وہی تخت، جس کے متعلق ہدہد نے کہا تھا کہ وہ بڑا عظیم الشان ہے اس کے آنے سے پہلے پہلے یہاں اپنے پاس منگوا لیا جائے۔ جن آپ کے تابع فرمان تھے اور وہ یہ کام کر بھی سکتے تھے اس سے سیدنا سلیمان کا مقصد یہ تھا کہ تبلیغ کے ساتھ ساتھ ملکہ کو کوئی ایسی نشانی بھی دکھا دی جائے جس سے ملکہ پر پوری طرح واضح ہو جائے کہ وہ محض ایک دنیادار فرمانروا نہیں بلکہ اللہ نے انہیں بہت بڑی بڑی نعمتوں اور فضیلتوں سے نوازا ہے اور اسے یقین ہو جائے کہ آپ صرف ایک سلطنت کے فرمانروا ہی نہیں بلکہ اللہ کے نبی بھی ہیں۔

آپ کے دربار میں انسان، جن اور پرند سب حاضر ہوتے تھے۔ آپ نے سب درباریوں کو مخاطب کر کے پوچھا: تم میں

الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا

کتاب[۳۴] کا علم تھا، کہنے لگا: ''میں یہ تخت آپ کو آپ کی نگاہ لوٹانے سے پہلے ہی لائے دیتا ہوں'' پھر جب سلیمان نے اس تخت کو اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو پکار اٹھے: ''یہ میرے پروردگار

سے کون ہے جو ملکہ سبا کے یہاں پہنچنے سے پہلے پہلے اس کا تخت یہاں اٹھا لائے؟ ایک بھاری قد و قامت والا جن بول اٹھا: آپ تو ملکہ کے آنے سے پہلے کی بات کرتے ہیں میں اس تخت کو آپ کے یہ دربار برخواست کرنے سے پہلے پہلے یہاں آپ کے پاس لا سکتا ہوں۔ مجھ میں ایسی طاقت بھی ہے۔ علاوہ ازیں میں اس تخت کے قیمتی جواہر ہیرے وغیرہ چراؤں گا بھی نہیں۔ پوری ایمانداری کے ساتھ وہ تخت آپ کے پاس لا حاضر کروں گا۔

[۳۴] ❁ ملکہ سبا کا تخت کتنے عرصہ میں اور کیسے سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچا؟ ابھی اس دیو ہیکل کی بات ختم نہ ہونے پائی تھی کہ دربار میں ایک اور شخص بول اٹھا کہ میں اس تخت کو کم سے کم وقت میں آپ کے پاس لا سکتا ہوں۔ آپ اگر آسمان کی طرف نگاہ دوڑائیں پھر نگاہ نیچے لوٹائیں تو صرف اتنی مدت میں وہ تخت آپ کے قدموں میں پڑا ہوگا۔

❁ تخت لانے والا کون تھا؟ وہ شخص کون تھا؟ جن یا انسان؟ وہ کتاب کونسی تھی؟ ام الکتاب یعنی لوحِ محفوظ تھی یا قرآن تھا یا کوئی اور کتاب تھی؟ وہ علم تقدیر الٰہی کا علم تھا یا کسی اور قسم کا علم تھا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب قرآن و حدیث میں نہیں ملتا۔ اور غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ باتیں سمجھنا انسان کی محدود عقل سے ماوراء ہیں۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ وہ شخص آپ کا وزیر آصف بن برخیا تھا۔ کتاب سے مراد کتب سماوی ہے۔ اور وہ اسمِ اعظم کا عامل یا اللہ کے اسماء اور کلام اللہ کی تاثیر سے واقف تھا لیکن یہ سب قیاس آرائیاں ہیں۔ البتہ نتیجہ قرآن نے واضح طور پر بتا دیا کہ وہ شخص اپنے دعویٰ میں بالکل سچا تھا۔ اور فی الواقع اس نے چشم زدن میں ملکہ بلقیس کا تخت سیدنا سلیمان علیہ السلام کے پاس لا حاضر کیا تھا۔

ایسے واقعات اگرچہ خرق عادت ہیں تاہم موجودہ علوم نے ایسی باتوں کو بہت حد تک قریب الفہم بنا دیا ہے۔ مثلاً یہی زمین جس پر ہم آباد ہیں سورج کے گرد سال بھر چکر کاٹتی ہے اور اس کی رفتار چھیاسٹھ ہزار چھ سو میل فی گھنٹہ بنتی ہے۔ حیرانگی کی بات یہ ہے کہ اس قدر عظیم الجثہ کرہ زمین برق رفتاری کے ساتھ چکر کاٹ رہا ہے اور ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا اور یہ ایسی بات ہے کہ ہم ایمان کی حد تک یقین رکھتے ہیں۔ اب اس زمین کی جسامت اور وزن کے مقابلہ میں ملکہ بلقیس کے تخت کی جسامت اور وزن دیکھیے اور مآرب سے یروشلم کا صرف ڈیڑھ ہزار میل فاصلہ ذہن میں لا کر غور فرمائیے کہ اگر پہلی بات ممکن ہے تو دوسری کیوں ممکن نہیں ہو سکتی۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ جو شخص چشمِ زدن میں تخت لایا تھا تو وہاں بھی اللہ ہی کی قدرت کام کر رہی تھی۔ یہ اس شخص کا کوئی ذاتی کمال نہ تھا۔ اور نہ ہی وہ تخت ظاہری اسباب کے ذریعہ وہاں لایا گیا تھا۔

بعض عقل پرستوں نے اس تخت لانے کے واقعہ سے متعلق بھی عقل کے گھوڑے دوڑائے ہیں اور ایسی بیہودہ تاویلات پیش فرمائیں ہیں کہ عقل ہی سر پیٹ کر رہ جائے۔ مثلاً یہ کہ سیدنا سلیمان علیہ السلام کو ملکہ بلقیس کا تخت مطلوب نہ تھا بلکہ اس سے ملتا جلتا تخت مطلوب تھا اور اس غرض کے لئے انہوں نے ٹھیکیداروں سے ٹنڈر طلب کئے تھے۔ وغیر ذلک من

مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۖ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ؕ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ
فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ﴿۴۰﴾ قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ

کا فضل [۳۵] ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر [۳۶] کرتا ہوں یا ناشکری؟ اور جو شکر کرتا ہے تو اس کا شکر اس کے اپنے ہی لئے مفید [۳۷] ہے۔ اور اگر کوئی ناشکری کرے تو میرا پروردگار (اس کے شکر سے) بے نیاز ہے اور اپنی ذات [۳۸] میں بزرگ ہے۔" (۴۰) پھر (درباریوں سے) کہا: "اس کے تخت کا حلیہ [۳۹] تبدیل کر دو۔ ہم یہ دیکھیں گے کہ آیا وہ صحیح بات تک پہنچتی ہے یا ان لوگوں سے ہے جو راہِ راست پر نہیں آسکتے" (۴۱)

الخرافات۔ یہاں طویل بحثوں کا اندراج ممکن نہیں۔ البتہ میں نے اپنی تصنیف "عقل پرستی اور انکارِ معجزات" میں ایسی سب تاویلات اور ان کا تجزیہ و تردید تفصیل سے پیش کر دی ہے۔

[۳۵] جب سیدنا سلیمان نے چشم زدن میں ملکہ کا تخت اپنے قدموں میں پڑا دیکھا تو فوراً اس بات کا اعتراف کیا کہ یہ مجھ پر اللہ کا فضل ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ تخت معجزانہ طریق پر وہاں لایا گیا تھا اور اس کی عقلی توجیہات ناممکن ہیں۔ ورنہ اگر یہ کوئی عادی امر ہوتا تو نہ یہ اللہ کے فضل کی کوئی بات تھی اور نہ ہی اس وقت اللہ کا شکر ادا کرنے کا خیال آسکتا تھا۔

[۳۶] قرآن میں متعدد مقامات پر یہ مضمون دہرایا گیا ہے کہ انسان کی دنیا میں آزمائش صرف اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ اللہ کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرتا ہے یا ناشکرا بن کر رہتا ہے۔ نیز ایمان کی ضد بھی کفر ہے۔ اور شکر کی ضد بھی کفر ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ایمان اور شکر کا آپس میں گہرا تعلق ہے ویسا ہی کفر اور ناشکری میں گہرا تعلق ہے۔ جو شخص جس قدر زیادہ مضبوط ایمان والا ہوگا اس قدر وہ اللہ کا شکرگزار بندہ ہوگا اور جو شخص جس درجے کا کافر ہوگا اتنا ہی وہ ناشکرا ہوگا۔ سیدنا سلیمان چونکہ اللہ کے نبی تھے اس لئے وہ جب کوئی اللہ کا انعام یا اس کا فضل دیکھتے تو فوراً اللہ کا شکر ادا کرنے میں مشغول ہو جاتے۔ اور یہی انبیاء اور ایمانداروں کا دستور ہوتا ہے۔ اس کے برعکس کافر پر جب اللہ تعالیٰ کوئی انعام فرماتا ہے تو شکر ادا کرنے کی بجائے اس کی طبیعت مزید سرکشی اور تکبر کی طرف مائل ہونے لگتی ہے اور وہ اترانے اور شیخیاں بگھارنے لگتا ہے۔

[۳۷] ۞ **شکر کی تاثیر:۔** شکر اپنے اندر ایک خاص تاثیر رکھتا ہے اور وہ ہے نعمت کی افزونی یعنی شکر کی خاصیت ہے کہ وہ مزید نعمتوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے اس کے برعکس ناشکری کی خاصیت یہ ہے کہ ناشکرا آدمی موجودہ نعمت سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ ایسی حقیقت ہے جس کا ہر شخص ذاتی طور پر بھی تجربہ رکھتا ہے اور تجربہ کر سکتا ہے۔ تاہم ثبوت کے طور پر اس پر قرآن کریم کی صریح آیت بھی موجود ہے ارشاد باری ہے: "اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں تمہیں اور بھی زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو یاد رکھو میرا عذاب بڑا سخت ہے" (۱۴:۷) (شکر سے متعلق مزید تفصیلات جلد دوم اسی آیت کے تحت حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیے) اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ شکر ادا کرنے کا فائدہ شکر ادا کرنے والے کو ہی پہنچتا ہے۔

[۳۸] ۞ **ناشکری کا نقصان:۔** اور اگر کوئی شخص ناشکری کرتا ہے تو اس کا نقصان اسی کو پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نہ کسی کے شکر ادا کرنے سے کچھ سنور جاتا ہے اور نہ کسی کی ناشکری کرنے سے اس کا کچھ بگڑ جاتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ بندوں کے شکر یا ناشکری سے بے نیاز ہے۔ کیونکہ اس کی ذات اور اس کے سب کارنامے اپنی ذات میں محمود ہیں۔ وہ کسی کے تعریف بیان کرنے

لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿٤١﴾ فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴿٤٢﴾ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ

پھر جب ملکہ (مطیع ہو کر) آ گئی تو سلیمان نے اس سے پوچھا: کیا تمہارا تخت بھی اسی طرح کا ہے؟" وہ کہنے لگی: "یہ تو گویا ہو بہو وہی ہے۔ اور ہمیں اس سے پہلے ہی حقیقتِ حال معلوم ہو گئی تھی اور ہم فرمانبردار[۴۰] ہو گئے تھے۔" (۴۲) ملکہ کو (ایمان لانے سے) ان چیزوں نے روک رکھا[۴۱] تھا جنہیں وہ اللہ کے سوا پوجتی تھی کیونکہ وہ ایک کافر قوم سے تھی۔ (۴۳)

کے محتاج نہیں ہیں۔ اس مضمون کو درج ذیل قدسی حدیث میں پوری طرح واضح کر دیا گیا ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: کہ اے میرے بندو! اگر اول سے آخر تک تم سب انسان اور جن اپنے سب سے زیادہ متقی شخص کے دل جیسے ہو جاؤ تو اس سے میری بادشاہی میں کچھ اضافہ نہ ہو جائے گا اور اے میرے بندو! اگر اول سے آخر تک تم سب انسان اور جن اپنے سے زیادہ بدکار شخص کے دل کی طرح ہو جاؤ تو اس سے میری بادشاہت میں کوئی کمی واقع نہ ہو گی۔ اور اے میرے بندو! یہ تمہارے اپنے اعمال ہی ہیں جن کا میں تمہارے حساب میں شمار کرتا ہوں پھر تمہیں ان اعمال کی پوری جزا دیتا ہوں لہذا جسے کوئی بھلائی نصیب ہو اسے چاہئے کہ اللہ کا شکر ادا کرے اور جسے کچھ اور نصیب ہو تو وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے" (مسلم۔ کتاب البر والصلۃ۔ باب تحریم الظلم)

[۳۹] سیدنا سلیمان کا ملکہ کے تخت کی صورت بدل دینا:۔ یہاں ﴿نَكِّرُوْا﴾ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ نکر میں دو باتیں بنیادی طور پر پائی جاتی ہیں (۱) اجنبیت اور (۲) ناگواری، اور تنکیر کی ضد تعریف ہے۔ تعریف کے معنی کسی کو پہچان لینا اور تنکیر کے معنی کسی کو نہ پہچاننا اور اجنبیت محسوس کرنا۔ گویا ﴿نكروا﴾ کا معنی اس تخت میں ایسی تبدیلی لانا ہے جس سے وہ پوری طرح پہچانا نہ جا سکے اور اس سے سیدنا سلیمان علیہ السلام بلقیس کی عقل کا امتحان لینا چاہتے تھے کہ اس کی عقل کہاں تک کام کرتی ہے پھر اسی سے وہ یہ نتیجہ بھی اخذ کرنا چاہتے تھے کہ آیا وہ اتنی عقلمند ہے کہ شرک اور توحید میں تمیز کر سکے؟ چنانچہ آپ کے کاریگروں نے اس کے تخت میں اتنی تبدیلی کی کہ ایک جگہ کے جواہر وہاں سے اکھاڑ کر کسی دوسری جگہ فٹ کر دیئے۔

[۴۰] ملکہ سبا کی عقل کا امتحان:۔ بلقیس جب سیدنا سلیمان کے دربار میں پہنچی تو اسے تخت دکھا کر پہلا سوال ہی یہ کیا گیا کہ کیا تمہارے پاس بھی ایسا تخت ہے؟ وہ بڑی عقلمند عورت تھی اس نے فوراً پہچان لیا کہ یہ تخت اسی کا ہے۔ البتہ اس میں کچھ تبدیلیاں کر لی گئی ہیں۔ لہذا اس نے جواب بھی سوال کے مطابق دیتے ہوئے کہا کہ یہ تو بالکل ویسا ہی لگتا ہے اگر اس سے یہ سوال کیا جاتا کہ کیا یہ تیرا تخت ہے۔ تب وہ یہ جواب دیتی کہ ہاں یہ میرا ہی تخت ہے۔ اس امتحان سے سیدنا سلیمان نے اس کے عقلمند ہونے کا اندازہ کر لیا۔

اس سوال کے بعد جو بات سلیمان علیہ السلام اسے سمجھانا چاہتے تھے اس کا اس نے خود ہی اظہار کر دیا اور کہنے لگی۔ یہ عرش کے یہاں لانے کا کام واقعی معجزانہ ہے جو آپ کی نبوت پر دلیل ہے۔ لیکن ہمیں تو اس سے پہلے ہی آپ کے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل ہو چکی ہیں۔ اور آپ کے تابع فرمان بن کر ہی یہاں آئے ہیں۔

[۴۱] اس آیت کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ اسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد سمجھا جائے جیسا کہ ترجمہ میں بیان ہوا ہے اس لحاظ سے

قَوۡمٍ کٰفِرِیۡنَ ﴿۴۳﴾ قِیۡلَ لَہَا ادۡخُلِی الصَّرۡحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتۡہُ حَسِبَتۡہُ لُجَّۃً وَّ کَشَفَتۡ عَنۡ سَاقَیۡہَا ؕ

قَالَ اِنَّہٗ صَرۡحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنۡ قَوَارِیۡرَ ۬ؕ قَالَتۡ رَبِّ اِنِّیۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِیۡ وَ اَسۡلَمۡتُ مَعَ سُلَیۡمٰنَ

لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۴﴾ وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰی ثَمُوۡدَ اَخَاہُمۡ صٰلِحًا اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ فَاِذَا ہُمۡ ع ۳ ۱۸

اس ملکہ سے کہا گیا کہ "محل میں چلو" جب اس نے دیکھا تو سمجھی یہ پانی کا ایک حوض ہے چنانچہ اپنی پنڈلیوں [۴۲] سے کپڑا اٹھالیا۔ سلیمان نے کہا: "یہ تو شیشے کا چکنا فرش ہے۔ تب وہ بول اٹھی: "اے میرے پروردگار! میں (سورج کی پوجا کر کے) اپنے آپ [۴۳] پر ظلم کرتی رہی ہوں اور اب میں نے سلیمان کے ساتھ اللہ رب العالمین [۴۴] کی اطاعت قبول کر لی" (۴۴)

اور ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو (یہ پیغام دے کر) بھیجا کہ: اللہ کی عبادت کرو۔ تو اسی وقت

اس کا معنی یہ ہوگا کہ چونکہ اسے ماحول ہی کافرانہ اور مشرکانہ ملا تھا۔ لہذا وہ بھی قوم کی دیکھا دیکھی سورج کی پرستش کرنے لگی تھی۔ ورنہ اگر وہ کچھ بھی عقل سے کام لیتی تو ایسے شرک میں مبتلا نہ ہوتی۔ اور دوسرا مطلب ہے کہ اس جملہ کو سیدنا سلیمان علیہ السلام کا فعل تسلیم کیا جائے۔ اس لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کو ان تمام چیزوں کی پرستش سے روک دیا جن کی وہ اپنے زمانہ کفر میں پرستش کیا کرتی تھی۔

[۴۲] دوسرا امتحان پانی کے حوض سے:۔ یہ بلقیس کی عقل کا دوسرا امتحان تھا۔ سیدنا سلیمان علیہ السلام نے اپنے محل کا صحن کچھ اس انداز سے بنوایا تھا جس کے اوپر شیشہ جڑا ہوا تھا۔ لیکن جب کوئی شخص محل میں داخل ہوتا تو اس کا زاویہ نگاہ ایسا ہوتا تھا کہ اسے وہ صحن ایک گہرا پانی کا حوض معلوم ہوتا تھا۔ جس میں پانی لہریں مار رہا ہو۔ اور اس کی کیفیت کچھ ایسی تھی جیسے کسی دور سے دیکھنے والے کو ریت کا تودہ یا سراب ٹھاٹھیں مارتا ہوا پانی نظر آتا ہے۔ آپ نے بلقیس سے فرمایا کہ چلو اب محل میں چلیں۔ بلقیس نے جب صحن کا یہ نظارا دیکھا تو اسے پانی کا گہرا حوض سمجھ کر اپنی پنڈلیوں سے اپنے پائنچے اٹھالئے۔ تب سلیمان علیہ السلام نے اسے بتایا کہ پائنچے اوپر چڑھانے کی ضرورت نہیں یہ پانی کا حوض نہیں بلکہ شیشے کا چکنا فرش ہے۔ گویا وہ اس امتحان میں دھوکا کھا گئی۔

[۴۳] یعنی جس طرح میں نے شیشہ کے صحن کو پانی کا لہریں مارنے والا گہرا حوض سمجھ کر غلطی کھائی ہے اسی طرح میں اور میری قوم سورج کی چمک دمک دیکھ کر اسے معبود سمجھنے لگے تو یہ بھی ہماری فاش غلطی اور اپنے آپ پر ظلم تھا۔

[۴۴] ملکہ سبا کا ایمان لانا علیٰ وجہ البصیرت تھا:۔ بلقیس جو اللہ رب العالمین پر ایمان لائی تو یہ علیٰ وجہ البصیرت تھا۔ کئی واقعات پہلے ایسے گزر چکے تھے جن سے اسے یہ یقین ہو تا جا رہا تھا کہ سلیمان علیہ السلام واقعی حق پر ہیں اور اللہ کے نبی ہیں اور اس کے مذہب کی بنیاد باطل پر ہے۔ سب سے پہلے تو اس نے خط کے مضمون سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اس قسم کا خط بھیجنے والا کوئی عام فرمانروا نہیں ہو سکتا۔ پھر جس نامہ بر کے ذریعہ اسے یہ خط پہنچا تھا وہ بھی ایک غیر معمولی بات تھی۔ اور تحائف کی واپسی سے بھی اس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کوئی دنیادار فرمانروا نہیں نیز یہ کہ وہ کبھی اس کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکے گی۔ پھر تحائف لانے والے وفد نے جو عظیم فرمانروا کے منکسرانہ مزاج اور پاکیزہ سیرت کے حالات بیان کئے تھے تو ان باتوں سے بھی وہ شدید متاثر ہو چکی تھی۔ پھر جب وہ سیدنا سلیمان کے پاس پہنچی تو جس تخت کو وہ اپنے پیچھے چھوڑ کر آئی تھی اسے اپنے سامنے پڑا دیکھ کر وہ سیدنا سلیمان علیہ السلام کی نبوت کی دل سے قائل ہو چکی تھی۔ اب محل میں داخلہ کے وقت جس چیز نے اسے سب سے زیادہ

فَرِيقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٤٥﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٤٦﴾ قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ۚ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ

وہ دو فریق[۴۵] (مومن اور کافر) بن کر جھگڑنے لگے۔(۴۵) (صالح نے) کہا: "میری قوم کے لوگو! تم بھلائی سے پیشتر برائی کو کیوں جلدی طلب کرتے ہو؟ تم اللہ سے بخشش کیوں[۴۶] نہیں طلب کرتے تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔" (۴۶) وہ کہنے لگے ہم تو تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو منحوس سمجھتے ہیں[۴۷] (صالح نے) کہا: "تمہاری

متاثر کیا وہ یہ چیز تھی کہ اتنا بڑا فرمانروا جس کے پاس اس سے کئی گناہ زیادہ مال و دولت اور عیش و عشرت کے سامان موجود ہیں وہ اس قدر اللہ کا شکر گزار اور منکسر المزاج اور متواضع بھی ہو سکتا ہے۔ ان سب باتوں نے مل کر اسے مجبور کر دیا کہ وہ سیدنا سلیمان علیہ السلام کے سامنے اب برملا اپنے ایمان لانے کا اعلان کر دے۔

۞ ﴿كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا﴾ سے متعلق عقل پرستوں کی تاویل اور اس کا جواب:۔ سیدنا سلیمان علیہ السلام کے محل میں بلقیس کے داخل ہونے اور اپنی پنڈلیوں سے کپڑا اٹھانے کے بارے میں بھی عقل پرستوں نے بہت سی نامعقول تاویلات پیش فرمائی ہیں۔ مثلاً یہ کہ بلقیس نے اپنی پنڈلیوں سے کپڑا نہیں اٹھایا بلکہ اس شیش محل کی دیواروں پر جو کپڑے پڑے ہوئے تھے اس نے وہ اٹھائے تھے اور ﴿لُجَّةً﴾ کے معنی گہرا پانی ہی نہیں بلکہ پانی جیسی چمک دمک اور آب و تاب بھی ہے جو اس شیش محل میں پائی جاتی تھی۔ ان نامعقول تاویلات کے تفصیلی تجزیہ کا یہ موقع نہیں مختصراً ایک دو باتیں عرض کروں گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا﴾ (بلقیس نے اس محل کو دیکھا تو اسے گہرا پانی خیال کیا اور اپنی پنڈلیوں سے کپڑا اٹھا لیا) گویا محل کے لئے ضمیر مذکر استعمال ہوئی ہے۔ اور دیوار کا لفظ اگرچہ یہاں موجود نہیں تاہم اگر وہ بالفرض تسلیم کر بھی لیا جائے تو وہ بھی مذکر استعمال ہوتا ہے (۱۸:۸۲) لیکن جس کی پنڈلیوں سے کپڑا اٹھایا گیا اس کے لئے مونث کی ضمیر استعمال ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں محل کی یا کسی بھی کمرے کی چار دیواریں ہوتی ہیں دو نہیں ہوتی جبکہ یہاں تثنیہ کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ تیسرے یہ کہ ساق کا لفظ پنڈلی یا درخت کے تنہ کے لئے تو آتا ہے دیوار یا ہر اس چیز کے نچلے حصہ کے لئے نہیں آتا جو ساری کی ساری ایک جیسی ہو۔ اور یہ معلوم ہی نہ ہو سکے کہ ساق کہاں سے شروع ہوتی ہے۔

[۴۵] یہ معاملہ صرف صالح علیہ السلام سے ہی مختص نہیں بلکہ ہر نبی کی دعوت پر یہی کچھ ہوتا ہے کہ کچھ انصاف پسند، معاشرتی ناہمواریوں سے بیزار اور مظلوم قسم کے انسان نبی کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں۔ اور چودھری قسم کے کھاتے پیتے اور اثر و رسوخ رکھنے والے لوگ نبی کے دشمن بن جاتے ہیں۔ پھر ان کی آپس میں ٹھن جاتی ہے اور حق و باطل کے معرکہ کا آغاز ہو جاتا ہے یہی صورت حال قوم ثمود میں بھی رونما ہو گئی تھی۔

[۴۶] مخالفین یا چودھری حضرات چونکہ نبی کی نبوت کے ہی منکر ہوتے ہیں لہذا وہ اس کی ہر بات کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔ نبی انہیں بھلے کاموں کی دعوت دیتا ہے اور پہلے سے کئے ہوئے برے کاموں سے توبہ و استغفار کی تلقین کرتا ہے۔ نیز برے کاموں کے انجام بد اور عذاب الٰہی سے ڈراتا ہے۔ تو متکبر لوگ نبی سے یوں کہنے لگتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو اب تک ہم پر وہ عذاب آیا کیوں نہیں۔ جس کی تم رٹ لگا رہے ہو۔ اور جو کرنے کے کام ہوتے ہیں یعنی اللہ سے مغفرت اور رحمت طلبی، ان باتوں کی طرف وہ توجہ ہی نہیں کرتے۔ صالح علیہ السلام نے ان کے اسی طرز عمل پر تنقید فرمائی ہے۔

[۴۷] اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ جب سے تم نے اپنی نبوت کا ڈھونگ رچایا ہے۔ اس وقت سے

بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿٤٧﴾ وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿٤٨﴾
قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٤٩﴾

نحوست تو اللہ کے پاس ہے بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) تم لوگ آزمائش [٤٨] میں پڑے ہوئے ہو" (٤٧) اور اس شہر میں نو سر غنے [٤٩] تھے جو ملک میں تخریب کاریاں ہی کرتے تھے اصلاح کا کوئی کام نہ کرتے تھے۔ (٤٨) انہوں نے کہا: "سب آپس میں اللہ کی قسم کھاؤ کہ ہم رات کو صالح اور اس کے گھر والوں پر شب خون [٥٠] ماریں گے۔ پھر اس کے ولی سے کہہ دیں گے کہ ہم تو اس کے خاندان کی ہلاکت کے موقع پر موجود ہی نہ تھے۔ اور یقیناً ہم سچے ہیں۔" (٤٩)

ہم پر کوئی نہ کوئی افتاد پڑی ہی رہتی ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ پہلے ہم سب ایک ہی قوم تھے۔ تم نے آکر ہم میں پھوٹ ڈال دی اور ہماری زندگی اجیرن بنا رکھی ہے۔ یہ سب تمہاری ہی نحوست ہے اور یہی اعتراض کفار مکہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا۔

[٤٨] اس آیت کے بھی دو مطلب ہیں ایک یہ کہ تم پر جو وقتاً فوقتاً کوئی مصیبت آن پڑتی ہے تو یہ تمہاری تنبیہ کے لئے آتی ہے اور تمہیں سنبھلنے کے لئے کچھ مزید مہلت دی جاتی ہے اور دوسرا یہ کہ قوم کے جو دو فریق بن چکے ہیں تو اسی بات میں تمہاری آزمائش ہو رہی ہے تم حق کا ساتھ دیتے ہو یا باطل کا اور اگر باطل کا ساتھ دیتے ہو تو اس میں کس حد تک سرگرمیاں دکھاتے ہو۔

[٤٩] ❁ قوم ثمود کے نو غنڈہ سرغنے:۔ رھط بمعنی ایک ہی خاندان کے لوگوں کی مختصر سی جماعت جن کی تعداد دس سے کم ہو اور ان میں کوئی عورت نہ ہو۔ نیز اس کے جماعت کے سردار یا سرغنہ کو بھی رھط کہتے ہیں۔ (مفردات) اور یہ لفظ عموماً برے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اور رھط کی اضافت کسی عدد کی طرف ہو تو اس سے اشخاص مراد لئے جاتے ہیں۔ (منجد) اسی لئے ہم نے رھط کا ترجمہ سرغنہ کیا ہے یعنی کسی اوباش اور بدکردار چھوٹی سی جماعت کا لیڈر۔

قوم ثمود کی معروف بستی کا نام حجر ہے۔ اور اسے ام القریٰ بھی کہتے ہیں یہ مکہ سے شام جاتے ہوئے راستہ میں پڑتی ہے اس شہر میں ایسے نو سرغنے یا بدمعاش ٹائپ چوہدری تھے اور ان سب میں سرکردہ قدار تھا یعنی سب سے بڑا بدبخت اور حرامی یہی قدار ہی تھا جس نے اللہ کی اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالی تھیں۔ اور باقی آٹھ سرغنے اسی قدار کے ممد و معاون ساتھی تھے۔

[٥٠] ❁ قوم ثمود کے ان غنڈوں کی سازش:۔ جب ان لوگوں نے ملی بھگت سے قدار کو آگے لگا کر ناقۃ اللہ کو زخمی کر دیا تو سیدنا صالح نے ان لوگوں کو تین دن بعد عذاب آنے کا الٹی میٹم دے دیا۔ اس الٹی میٹم کے بعد بھی ان لوگوں نے یہی سمجھا کہ یہ عذاب تو آتا ہے یا نہیں اس سے پہلے ہی ہم کیوں نہ صالح اور اس کے گھر والوں کا قصہ تمام کر دیں۔ چنانچہ نو بدمعاشوں نے سیدنا صالح علیہ السلام کو بھی ٹھکانے لگا دینے کی ویسی ہی سکیم بنائی، جیسی قریش مکہ نے ہجرت سے پیشتر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قصہ پاک کر دینے کے لئے بنائی تھی۔ البتہ یہ فرق ضرور تھا کہ قریش نے یہ سمجھا کہ اس طرح بلوہ کی صورت میں قتل کرنے پر ہم سے دیت کا مطالبہ کیا جائے گا تو وہ ہم آپس میں بانٹ لیں گے۔ لیکن یہ بدمعاش ان سے بھی چار ہاتھ آگے کی بات سوچ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب سیدنا صالح علیہ السلام کے ولی (جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ولی ابو طالب تھے) ہم سے کوئی بات پوچھیں گے تو ہم کہہ دیں گے کہ ہم تو موقع پر موجود ہی نہ تھے۔ ہمیں کیا خبر کہ کون ان کو قتل کر گیا ہے۔ اور

وَمَكَرُوا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۱﴾ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ

چنانچہ انہوں نے ایک چال چلی اور ہم نے ان کی چال انہیں پر لوٹا دی جس کی انہیں خبر تک [۵۱] نہ ہوئی۔(۵۰) سو دیکھو ان کی چال کا انجام کیا ہوا۔ ہم نے ان سرغنوں اور ان کی قوم سب کو تباہ کر دیا۔(۵۱) سو یہ ہیں ان کے خالی پڑے ہوئے گھر، اس ظلم کی پاداش میں جو وہ کیا کرتے تھے۔ اس واقعہ میں بھی ایک نشان عبرت ہے ان لوگوں کے لئے جو علم [۵۲] رکھتے ہیں۔(۵۲) اور ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو ایمان لائے تھے اور (نافرمانی سے) پرہیز کرتے رہے۔(۵۳)

اور لوط (کا واقعہ یاد کرو) جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم سمجھ رکھنے [۵۳] کے باوجود بدکاری کے

دوسرا فرق یہ تھا کہ قریش مکہ نے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کا منصوبہ تیار کیا تھا جبکہ ان بدمعاشوں نے سیدنا صالح اور ان کے پورے خاندان کو مار ڈالنے کا منصوبہ بنایا تھا اور اپنے اس منصوبہ کے معاہدہ پر سب نے ایک دوسرے کے سامنے قسمیں کھائیں کہ ایک تو اس خاندان کو قتل کر کے دم لیں گے اور دوسرے اپنے جرم کا کبھی اعتراف نہ کریں گے۔

[۵۱] جب یہ لوگ اس منصوبہ پر قسمیں کھا رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے سیدنا صالح علیہ السلام کو وحی کر دی کہ وہ اپنے خاندان اور ایمان والوں کو لے کر فوراً اس بستی سے ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ آپ ۱۲۰ افراد کو اپنے ہمراہ لے کر فلسطین کی طرف چلے گئے اور رملہ کے قریب آ گئے۔ آپ کے اس بستی سے نکلنے کی دیر تھی کہ اس شہر بلکہ قوم ثمود کے پورے علاقہ میں شدید زلزلہ کا عذاب آیا اور اس سے دل دہلانے والی آوازیں اور چیخیں بھی پیدا ہوتی تھیں۔ زلزلہ اتنا شدید تھا جس نے ان کے پہاڑوں میں بنے ہوئے مکانوں کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیا اور خود بھی یہ قوم اسی عذاب سے ہلاک ہو گئی۔

[۵۲] اس جملہ کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ وہی لوگ عبرت حاصل کرتے ہیں جو ان کھنڈرات کو دیدہ بینا سے دیکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ جو اقوامِ عالم کے عروج و زوال کے قانون سے واقف ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ جس قوم نے رسولوں کی تکذیب کی اور انہیں دکھ پہنچایا وہ تباہ و برباد ہو کے رہی۔ تیسرے یہ کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو طبیعی اسباب کا پابند نہیں سمجھتے بلکہ یہ جانتے ہیں کہ طبیعی اسباب کا خالق وہ خود ہے اور ان میں جب چاہے رد و بدل بھی کر سکتا ہے اور سبب اور مسبب کا تعلق توڑ بھی سکتا ہے۔ ظاہری اور باطنی سب اسباب اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ یوں نہیں کہہ دیتے کہ فلاں عذاب مثلاً زلزلہ تو محض طبیعی اسباب کی بنا پر آیا تھا اس کا لوگوں کے گناہوں سے کیا تعلق؟

[۵۳] ذکر قومِ لوط:۔ یہاں لفظ ﴿تُبْصِرُوْنَ﴾ استعمال ہوا ہے جو دیکھنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور سمجھنے کے معنوں میں بھی۔ اس لحاظ سے ان دو آیات کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تم خود بھی یہ سمجھتے ہو کہ یہ گندا اور بے حیائی کا کام ہے۔ اور خلاف فطرت ہے۔ حقیر سے حقیر جانور بھی ایسا کام نہیں کرتے تم اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود ایسا کام

وَاَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۵۴﴾ اَئِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ شَهۡوَةً مِّنۡ دُوۡنِ النِّسَآءِ‌ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ
تَجۡهَلُوۡنَ ﴿۵۵﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوۡمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَخۡرِجُوۡۤا اٰلَ لُوۡطٍ مِّنۡ قَرۡيَتِكُمۡ‌ۚ اِنَّهُمۡ اُنَاسٌ
يَّتَطَهَّرُوۡنَ ﴿۵۶﴾ فَاَنۡجَيۡنٰهُ وَاَهۡلَهٗۤ اِلَّا امۡرَاَتَهٗ قَدَّرۡنٰهَا مِنَ الۡغٰبِرِيۡنَ ﴿۵۷﴾ وَاَمۡطَرۡنَا
عَلَيۡهِمۡ مَّطَرًا‌ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الۡمُنۡذَرِيۡنَ ﴿۵۸﴾ قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيۡنَ اصۡطَفٰى‌ؕ

کام کرتے ہو؟ (۵۴) کیا تم شہوت رانی کے لئے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس جاتے ہو بلکہ تم تو جہالت [۵۴] کے کام کرتے ہو؟ (۵۵) چنانچہ اس کی قوم کو کوئی جواب بن نہ آیا بجز اس کے کہ انہوں نے یہ کہہ دیا: لوط اور اس کے ساتھیوں کو اپنے شہر سے نکال دو یہ بڑے پاکباز [۵۵] بنتے ہیں۔ (۵۶) چنانچہ ہم نے لوط اور اس کے گھر والوں کو بچالیا۔ بجز اس کی بیوی کے جس کے لئے پیچھے رہ جانا ہم نے مقدر کر دیا تھا (۵۷) پھر ہم نے ان پر (پتھروں کی) بارش برسائی۔ کیسی بری تھی یہ بارش [۵۶] جو ان لوگوں پر ہوئی جنہیں (عذاب الٰہی سے) ڈرایا گیا تھا۔ (۵۸) آپ ان سے کہئے کہ: ”سب طرح کی تعریف اللہ کو سزاوار [۵۷] ہے اور اس کے ان بندوں پر سلامتی ہو

کرتے ہو۔ دوسرا یہ کہ تم خوب سمجھتے ہو کہ اس کام کے لئے اللہ نے بیویاں پیدا کی ہیں۔ لیکن تم ان سے بے تعلق ہو کر مردوں سے ہی یہ کام کرتے ہو۔ تیسرے یہ کہ تم اس قدر بے حیا ہو چکے ہو کہ ایک دوسرے کی آنکھوں کے سامنے یہ کام کرتے ہو۔

[۵۴] ❁ لواطت کے نتائج:۔ یعنی تم اس لواطت کے انجام سے آگاہ نہیں اس کا انجام یہ ہوگا کہ چند ہی سالوں کے بعد تمہاری نسل ختم ہو جائے گی نیز تمہاری عورتوں میں فحاشی پھیل جائے گی۔ یا تم اس فعل کے اس انجام سے بے خبر ہو کہ اس کے نتیجہ میں اللہ کا عذاب تم پر نازل ہو۔

[۵۵] ❁ بستی سے نکالنے کی دھمکی:۔ بجائے اس کے کہ وہ سیدنا لوط علیہ السلام کی نصیحت پر کچھ اپنی اصلاح کرتے وہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے۔ لوط علیہ السلام اور ان کے متبعین کو از راہ تمسخر پاکبازی کا طعنہ دیا۔ پھر انہیں اپنے شہر سے نکال دینے کی دھمکی بھی دینے لگے کہ تم جیسے پاکباز ہم گندے لوگوں میں کیونکر رہ سکتے ہیں۔ لہٰذا تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ۔

[۵۶] لوط علیہ السلام کا قصہ اور اس قوم پر عذاب کی تفصیل پہلے کئی مقامات پر گزر چکی ہے مثلاً سورہ اعراف کی آیت نمبر ۸۳، ۸۴، سورہ توبہ کی آیت نمبر ۷۰، سورہ ہود کی آیت نمبر ۸۳، سورہ حجر کی آیت نمبر ۷۳۔ وہاں سے حواشی ملاحظہ کر لئے جائیں۔

اس سورہ میں تین انبیاء سیدنا سلیمان، سیدنا صالح اور سیدنا لوط علیہم السلام کے حالات کا ذکر ہوا ہے۔ اور ان کے حالات میں اور رسول اللہ ﷺ کے حالات میں کوئی نہ کوئی مشابہت کا پہلو ضرور پایا جاتا ہے۔ مثلاً سیدنا سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کو یہ چیلنج کیا تھا کہ اگر تم مطیع فرمان بن کر حاضر ہو جاؤ تو بہتر ورنہ ہم ایسے لشکر سے تم پر حملہ کریں گے جس کے مقابلہ کی تم تاب نہ لا سکو گی۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ مشرکین مکہ پر ایسا ہی لشکر لائے تھے جس کے مقابلہ کی ان میں تاب نہ تھی۔ سیدنا صالح علیہ السلام کو ان کی قوم نے بلوہ کی صورت میں شبخون مار کر قتل کرنا چاہا تھا۔ لیکن اللہ نے انہیں نجات دی۔ قریش مکہ نے بھی آپ ﷺ سے یہی سلوک کرنا چاہا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ان کی اس سازش سے بال بال بچالیا۔ سیدنا لوط علیہ السلام کو ان کی قوم نے شہر سے نکال دینے کی دھمکیاں دیں۔ جبکہ قریش مکہ نے رسول اللہ ﷺ کو عملاً شہر مکہ سے نکل جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

[۵۷] ❁ الحمد للہ کے استعمال کا خاص موقع:۔ ویسے تو ہر حال میں اللہ کی تعریف بیان کرنا چاہئے اور اس کا شکر بجا لانا چاہئے۔

ءٰٓاللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٥٩﴾

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ۗ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴿٦٠﴾

جنہیں اس نے برگزیدہ[۵۸] کیا، کیا اللہ بہتر ہے یا وہ معبود جنہیں یہ اس کا شریک بنا رہے[۵۹] ہیں؟ (۵۹)
بھلا آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور آسمان سے تمہارے لئے پانی برسایا جس سے ہم نے پر بہار باغات اگائے جن کے درختوں کا اگانا تمہارے بس[۶۰] میں نہ تھا۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ بھی ہے؟ (جو ان کاموں میں اس کا شریک ہو؟) بلکہ یہ لوگ ہیں ہی ناانصافی[۶۱] کرنے والے (۶۰)

لیکن اہل عرب اس جملہ کا استعمال عموماً اس وقت کرتے ہیں جب فریق مخالف یا مخاطب پر دلائل کے ساتھ اتمام حجت کر دی جائے۔ اور اس کے پاس ان دلائل کا کوئی معقول جواب نہ ہو یا اسے کوئی معقول جواب میسر نہ آئے۔ یہاں بھی تین انبیاء کا ذکر کرنے اور منکرین حق کا ایک ہی جیسا انجام بتانے کے بعد یہ جملہ اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے۔

[۵۸] برگزیدہ لوگوں سے مراد انبیاء علیہم السلام ہیں جن کے ساتھ ان کے متبعین کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ جن کی اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی، انہیں کافروں کے مظالم سے نجات دلائی اور ان پر نازل کردہ عذاب سے انہیں بچا کر ان پر رحمت فرمائی۔ یہ مطلب تو ربط مضمون کے لحاظ سے ہے مگر اس جملہ کا حکم عام ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندوں پر ہر وقت اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی نازل ہوتی رہتی ہے۔

[۵۹] یعنی اللہ تو وہ ہے جو مجرموں کو سزا دے کر اپنے بندوں کو ان کے مظالم سے بچا لیتا ہے اور ان کی مدد بھی کرتا ہے سوائے مشرکین مکہ اب تم خود ہی فیصلہ کر لو کہ ایسی قدرتوں والا اللہ بہتر ہے یا تمہارے وہ معبود جو دوسروں کو کوئی فائدہ یا نقصان تو کیا پہنچائیں گے اپنی حفاظت تک کے لئے وہ تمہارے محتاج ہیں۔

[۶۰] ❁ اللہ کی ربوبیت عامہ:۔ اس آیت اور اس سے آگے تین چار آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ، رحمت، ربوبیت عامہ اور توحید پر چند ایسے دلائل کے انبار لگا دیئے ہیں جن میں سے اکثر دلائل کے مشرکین مکہ بھی معترف تھے۔ مثلاً سب سے پہلی دلیل تو یہی ہے کہ آسمانوں کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے اور زمین کا بھی۔ آسمان سے مینہ برستا ہے جسے زمین جذب کرتی ہے تو اس کی قوت روئیدگی اپنا کام کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اس سے فصلیں، غلے، پھل دار درخت، پھول اور مویشیوں کے لئے گھاس اور چارہ اگتا ہے۔ اس طرح روئے زمین پر جتنی بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق بس رہی ہے سب کی غذا کا سامان فراہم ہو جاتا ہے۔ کروڑوں اور اربوں کی تعداد میں صرف انسان ہیں جو صرف ایک نوع ہے۔ جبکہ جاندار اشیاء کی انواع کی تعداد لاکھوں تک جا پہنچتی ہے کچھ پانی کی مخلوق ہے۔ کچھ خشکی کی اور کچھ ہوائی مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب کی روزی کا ایسا جامع اور مکمل انتظام فرما دیا ہے کہ سب جانداروں کو روزی مہیا ہو رہی ہے۔ اب بتایئے کہ اس پورے نظام ربوبیت عامہ میں کوئی فرشتہ، کوئی نبی، کوئی ولی، کوئی بزرگ یا کوئی دوسرا معبود شریک ہے کہ اللہ کے علاوہ اس کی بھی عبادت کی جائے۔ عبادت تو انتہائی عاجزی اور تذلل کا نام ہے اور اسی کو سزاوار ہے۔ جو انتہائی درجہ میں کامل اور بااختیار ہو،، کسی ناقص، عاجز یا محتاج مخلوق کو یہ مقام کیسے دیا جاسکتا ہے؟

[۶۱] ❁ عدل کا لغوی مفہوم:۔ عدل کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا معنی برابر ہونا بھی اور برابر کا بدلہ بھی۔ پھر

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِیَ وَجَعَلَ بَیْنَ الْبَحْرَیْنِ

بھلا کس نے کو زمین جائے قرار[۶۲] بنایا اور اس کے اندر نہریں[۶۳] بنائیں اور اس کے لئے پہاڑ بنائے (تاکہ ہچکولے نہ کھائے) اور دو سمندروں کے درمیان ایک

یہ لفظ لغت ذوی الاضداد سے ہے۔ یعنی اس کا معنی انصاف کرنا بھی ہے اور بے انصافی کرنا بھی۔ اس لحاظ سے اس جملہ کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک تو ترجمہ سے ہی واضح ہے کہ جب ربوبیت عامہ کا پورے کا پورا نظام صرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہو تو عبادت میں دوسروں کو شامل کر لینا کس قدر بے انصافی اور ظلم کی بات ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس اعتراف حقیقت کے باوجود یہ لوگ اپنے معبودوں کو اللہ کے برابر کا درجہ دیتے ہیں۔ اور تیسرا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ راہ راست سے مڑ جاتے ہیں یعنی اعترافِ حقیقت کے باوجود اس کا نتیجہ غلط نکال رہے ہیں۔

[۶۲] ۞ زمین کے جائے قرار ہونے کی چھ توجیہات:۔ اس ایک جملہ کے اندر اللہ تعالیٰ کی کئی قدرتیں سمٹ کر آگئی ہیں۔ یہ بات تو ہزار ہا ہزار سال پہلے انسان کے علم میں آچکی تھی کہ ہمارا یہ عظیم الجثہ کرہ زمین گول ہے اور فضائے بسیط میں معلق ہے۔ زمین کا اکثر حصہ سمندر ہے۔ اور زمین کے گول ہونے کے باوجود پانی اس سے گر نہیں جاتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر کرہ سماوی کی طرح ہماری زمین میں بھی کشش ثقل موجود ہے۔ جس کی وجہ سے اشیاء زمین پر از خود گر تو سکتی ہیں مگر خود بخود کسی طاقت کے استعمال کے بغیر اوپر نہیں اٹھ سکتیں ماسوائے گیسوں اور آبی بخارات کے کہ ان کا کرہ ہی زمین سے اوپر ہے۔ اگر کوئی گیس جو عام ہوا سے ہلکی ہو گی زمین سے بھی نکلے گی تو از خود اوپر اٹھ جائے گی۔ یہ عجائبات ہی کیا کم تھے اب مزید علم ہیئت کی تحقیقات نے ان عجائبات میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔ مثلاً ایک یہ کہ ہماری زمین سورج کے سامنے رہتے ہوئے اپنے محور کے گرد تقریباً ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم رہی ہے۔ اور اس کا چکر ایک دن رات یا ۲۴ گھنٹوں میں پورا ہوتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ ہماری زمین سورج سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل دور ہے اور اس کے گرد بھی ایک سال میں ایک گردش پوری کرتی ہے گویا سورج کے گرد اس کی گردش کی رفتار چھیاسٹھ ہزار چھ سو میل فی گھنٹہ ہے۔ ان دونوں قسم کی گردشوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے زمین کو اس قدر جکڑ رکھا ہے کہ ہم محسوس تک نہیں کر سکتے اور آرام سے اس پر چلتے پھرتے اور زندگی بسر کرتے ہیں۔ زمین کے جائے قرار ہونے کا ایک مفہوم یہ ہوا اور صحیح احادیث میں وارد ہے کہ ہماری زمین پہلے ان گردشوں کی وجہ سے ہچکولے کھاتی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کے مختلف اطراف میں پہاڑ ایسی مناسبت سے رکھ دیئے کہ ہچکولے کھانا بند ہو گئی اور انسان اور دوسری تمام اشیاء کے لئے جائے قرار بن گئی۔ اس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ اگر زمین ہمیشہ سورج کے سامنے رہتی تو زمین کے نصف حصہ پر تو ہمیشہ دن ہی چڑھا رہتا اور باقی نصف پر ہمیشہ رات ہی رہتی۔ اس طرح پوری کی پوری زمین نباتات اور سب جانداروں کے لئے بالکل ناکارہ ثابت ہوتی۔ اس لئے کہ نباتات اور جانداروں کی زندگی اور نشوونما کے لئے جیسے دن کی ضرورت ہے ویسے ہی رات کی بھی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین پر رات اور دن کا نظام قائم فرما کر اسے تمام مخلوق کے لئے جائے قرار بنا دیا اور اس کا چوتھا پہلو یہ ہے کہ زمین سے سورج کا فاصلہ اگر موجودہ فاصلہ سے کم ہوتا تو تمام مخلوق گرمی کی شدت اور تپش سے مرجھا جاتی اور بالآخر ختم یا تباہ ہو جاتی اور اگر یہ فاصلہ زیادہ ہوتا تو اتنی زیادہ سردی ہوتی کہ تمام تر مخلوق سردی سے ٹھٹھر جاتی اور بالآخر تباہ یا ہلاک ہو جاتی۔ اس طرح بھی یہ زمین مخلوق کے لئے جائے قرار نہ بن سکتی تھی۔ اس کا پانچواں پہلو

حَاجِزًا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦١﴾ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ

پردہ[۶۴] (حد فاصل) بنادیا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ہے؟ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔(۶۱)

بھلا کون[۶۵] ہے جو لاچار کی فریاد رسی کرتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے اور اس کی تکلیف کو دور کر دیتا ہے اور

یہ ہے کہ ہماری زمین سورج کے گرد ۱/۲ ۶۶ ڈگری درجے کا زاویہ بناتے ہوئے گھوم رہی ہے۔ جس سے ایک تو دن اور رات کے اوقات میں بتدریج تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ کبھی دن بڑے ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور راتیں بتدریج چھوٹی ہوتی جاتی ہیں۔ اور کبھی اس کے برعکس معاملہ شروع ہو جاتا ہے پھر اس بنا پر موسموں میں تبدیلی آتی ہے کبھی موسم گرما ہوتا ہے، کبھی سرما، کبھی بہار، کبھی خزاں اور کبھی برسات اور ان موسموں کا مختلف قسم کی اجناس، غلے اور پھل دار درختوں کے پیدا ہونے، ان کی نشوونما اور فصلوں اور پھلوں کے پکنے سے گہرا تعلق ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ نظام قائم نہ فرماتے تو پھر اس زمین پر بسنے والوں کے لئے خوراک کا مسئلہ نہایت پریشان کن صورت اختیار کر سکتا تھا۔ اس صورت میں یہ زمین ہمارے لئے جائے قرار نہیں بن سکتی تھی اور اس کا چھٹا پہلو یہ ہے کہ ہماری زمین سے اوپر پانچ چھ سو میل کی بلندی تک کثیف ہوا کا کرہ بنا کر زمین کو آفات سماوی یا فضائی سے محفوظ بنا دیا گیا ہے۔ موجودہ تحقیق کے مطابق تقریباً دو کروڑ شہاب ثاقب روزانہ ۳۰ میل فی سیکنڈ کی برق رفتاری سے ہماری زمین کا رخ کرتے ہوئے گرتے ہیں۔ جب وہ اس کرہ ہوائی میں پہنچتے ہیں تو انہیں آگ لگ جاتی ہے اور وہیں ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر بعض اوقات کوئی بڑی زیادہ جسامت والا شہاب زمین پر گر بھی پڑتا ہے اور زمین میں گہرا گڑھا ڈال دیتا ہے لیکن ایسا کبھی کبھار ہوتا ہے جیسا اللہ کو منظور ہوتا ہے۔ عام حالات میں ہم ان سے محفوظ رہتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ زمین کے گرد کرہ ہوائی کا یہ نظام نہ فرماتے تو زمین کبھی محفوظ جائے قرار نہیں بن سکتی تھی۔ غرض اس مسئلہ کے اتنے زیادہ پہلو ہیں کہ جتنا بھی ان میں غور کیا جائے مزید پہلو سامنے آتے جاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا اس نظام کائنات میں اللہ کے علاوہ کسی اور معبود کا بھی کچھ دخل ہے خواہ یہ دخل کتنا ہی معمولی ہو؟ اور اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے تو پھر دوسروں کو اللہ کی عبادت میں کیسے شریک بنایا جا سکتا ہے؟۔

[۶۳] نہروں سے مراد تمام ندی، نالے 'نہریں اور دریا وغیرہ ہیں انہیں ایک تو بارش سے پانی مہیا ہوتا ہے بارش کا کچھ پانی زمین اپنے اندر جذب کر لیتی ہے باقی زائد پانی ندی نالوں کی طرف رخ کر لیتا ہے۔ اور ان کا سب سے بڑا منبع پہاڑ اور پہاڑوں کے درمیان چشمے ہیں سردیوں میں پہاڑوں پر برف جم جاتی ہے جو گرمیوں میں پگھل کر پہلے ندی نالوں کی اور پھر دریاؤں کی صورت اختیار کر لیتی ہے یا یہ پانی پہلے سے بنے ہوئے ندی نالوں کا رخ اختیار کر لیتا ہے۔ انہیں کے ذریعہ ان علاقوں میں سیرابی ہوتی ہے جہاں بارش کم ہوتی ہے یا وقت پر نہیں ہوتی۔ اور نہروں کا بالخصوص ذکر اس لئے فرمایا کہ تمام نباتات اور جانداروں کی زندگی اور نشوونما کا دارومدار پانی پر ہے۔ ہوا کے بعد پانی ہی ایسی اہم چیز ہے جس کے بغیر کوئی چیز اپنی زندگی باقی نہیں رکھ سکتی۔

[۶۴] اس کی تشریح کے لئے سورہ فرقان کی آیت نمبر ۵۳ کا حاشیہ نمبر ۶۶ ملاحظہ فرمائیے۔

[۶۵] ❁ مشکل اوقات میں اکیلے اللہ کو پکارنا:۔ یہ سوال اس لئے کیا گیا کہ مشرکین مکہ کو خوب معلوم تھا کہ جب کسی کی جان پر بن جاتی ہے تو اس وقت یہ معبود کسی کام نہیں آسکتے۔ لہٰذا وہ ایسے آڑے وقتوں میں صرف اکیلے اللہ کو مدد اور نجات کے لئے پکارتے تھے۔ (تشریح کے لئے دیکھئے سورہ انعام کی آیت نمبر ۴۱ کا حاشیہ) اور ان سے سوال یہ کیا جا رہا ہے کہ جب تمہیں اپنے

السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۳﴾ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ

(کون ہے جو) تمہیں زمین کے جانشین [۶۶] بناتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ہے؟ تم لوگ تھوڑا ہی غور کرتے ہو۔(۶۲) بھلا کون ہے؟ جو تمہیں خشکی اور سمندر کی تاریکیوں [۶۷] میں راہ دکھاتا ہے اور اپنی رحمت سے پیشتر ہواؤں کو بشارت کے طور پر [۶۸] بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ہے؟ اللہ اس شرک سے بہت بلند ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں(۶۳) بھلا کون ہے؟ جو خلقت کی ابتدا کرتا ہے پھر اس کا اعادہ [۶۹] کرے گا؟ اور کون ہے

بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور اس وقت نجات کے لئے اللہ ہی کو پکارتے ہو پھر وہ تمہاری اس مصیبت کو دور بھی کر دیتا ہے اس وقت نہ کوئی پتھر کا بت اس کو رفع کر سکتا ہے نہ کوئی دوسرا معبود تو پھر اللہ کی عبادت میں تم انہیں اس کا شریک یا ہمسر کیوں بناتے ہو؟

[۶۶] اس جملہ کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ ایک پشت یا نسل کے بعد۔ دوسری پشت یا نسل پہلی کی جانشین بن جاتی ہے تم اپنے آباؤاجداد کے جانشین بنے اور تمہاری اولادیں تمہاری جانشین بنیں گی۔ اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا آیا ہے اور چلتا جائے گا اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ تمہیں زمین میں تصرف واقتدار بخشتا ہے۔ اور تمہارے بعد یہ اقتدار کسی دوسرے کی طرف منتقل ہو جائے گا اور یہ سلسلہ ایسے ہی چل رہا ہے اور چلتا رہے گا۔

[۶۷] ❁ ستاروں کے فائدے:۔ رات کی تاریکیوں میں راہ معلوم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے چاند اور ستارے بنا دیئے جن کی گردش کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے ضابطے مقرر فرما دیئے ہیں کہ وہ سیارے ان کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ اور اس قدرتی نظام سے انسان کو یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ وہ ان سے یہ بھی معلوم کر سکتا ہے کہ رات کا کتنا حصہ گزر چکا ہے اور یہ بھی کہ اس وقت وہ کون سی سمت میں سفر کر رہا ہے۔ علاوہ ازیں اسے ان سیاروں کی روشنی سے راستے نظر بھی آنے لگتے ہیں۔ اور آج کل جو قطب نما کا آلہ ایجاد ہوا ہے تو یہ بھی سیاروں ہی کا مرہونِ منت ہے۔ اگر یہ ستارے اللہ تعالیٰ پیدا نہ کرتا، یا ان کے نظام گردش میں باقاعدگی نہ ہوتی یا یہ بے نور ہوتے تو انسان رات کی تاریکیوں میں سفر کر ہی نہ سکتا تھا۔ خواہ یہ سفر خشکی کا ہوتا یا سمندر کا اور سمندر کا سفر تو اس کے لئے موت کا باعث بن سکتا تھا۔ یہ سارا نظام تو اللہ نے بنایا جس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ لیکن اللہ کی عبادت کے وقت تو تم اسے بھول جاتے ہو یا دوسروں کو بھی اس کا ہمسر قرار دے کر انہیں بھی مستحقِ عبادت سمجھنے لگتے ہو۔

[۶۸] اس کی تشریح کے لئے دیکھئے سورۃ الفرقان کی آیت نمبر ۴۸ کا حاشیہ نمبر ۶۰

[۶۹] ❁ نباتات اور جاندار اشیاء کی انواع جو انسان کے علم میں آچکی ہیں:۔ آغاز خلق اور اعادہ خلق کا مسئلہ بھی اپنے اندر اللہ کی ہزارہا قدرتوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور انسان جتنا اس معاملہ میں غور کرتا ہے اس کی حیرانی میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ اس

مسئلہ میں سب سے پہلا سوال یہ پیش آتا ہے کہ روح کیا چیز ہے جس پر زندگی کا مدار ہے۔ اور یہ سوال آج بھی ایسا پیچیدہ اور لاینحل ہے جیسا کہ سیدنا آدم کے وقت تھا۔ انسان نے یہ تو دریافت کر لیا کہ مثلاً انسان فلاں فلاں عناصر کا مرکب ہے اور انسان کے جسم میں ان عناصر کی مقدار اتنی اور اتنی ہوتی ہے۔ مگر انہی عناصر کو اسی مقدار کے مطابق ترکیب دے کر ایک زندہ انسان بنا کھڑا کرنا انسان کی بساط سے باہر ہے۔ اور یہ مسئلہ غالباً تا قیامت لاینحل ہی رہے گا۔ پھر یہ صرف ایک انسان کا مسئلہ نہیں بلکہ تمام جاندار اشیاء کا مسئلہ ہے جس میں نباتات بھی شامل ہے۔ نباتات بھی جانداروں کی طرح بڑھتی ہے۔ پھلتی پھولتی ہے حتیٰ کہ احساس و شعور بھی رکھتی ہے۔ اس وقت تک روئے زمین پر نباتات کی تقریباً دو لاکھ انواع اور جاندار اشیاء کی تقریباً دس لاکھ انواع انسان کے علم میں آ چکی ہیں۔ جو اپنی ساخت، عناصر اور ترکیب کے لحاظ سے بالکل ایک دوسرے سے الگ ہیں اور جب سے انسان نے ان انواع کو جاننا شروع کیا اس وقت سے لے کر آج تک انسان کے علم میں یہ بات نہیں آ سکی۔ کہ نباتات یا حیوانات کی کوئی نوع ارتقاء کی منزل طے کر کے اپنے سے کسی اعلیٰ جنس میں تبدیل ہو گئی ہو۔ بلکہ جس حال میں انسان نے اسے پہلے دن دیکھا تھا اسی حال میں ہی یہ آج بھی پائی جاتی ہے جس سے ڈارون کے نظریہ کا از خود ابطال ہو جاتا ہے اگرچہ ڈارون کے نظریہ کے باطل ہونے کے اور بھی بے شمار دلائل موجود ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے نباتات کی اور حیوانات کی جس نوع کو جس طرح پہلے دن پیدا کیا تھا آج بھی وہ اسی صورت میں پائی جاتی ہے اور انسان کی تخلیق تو ایک بالکل خصوصی نوعیت رکھتی ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے اسے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ (۳۸:۷۵)

۞ <u>آغازِ خلق اور اعادہ خلق کا سلسلہ ہر آن جاری ہے:۔</u> اور اعادہ خلق سے صرف یہ مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام انسانوں کو ان کی قبروں سے زندہ کر کے اٹھا کھڑا کرے گا۔ بلکہ اعادہ خلق سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر آن مردہ سے زندہ اور زندہ سے مردہ پیدا کر رہا ہے اور یہ نظام نباتات اور حیوانات کی تمام تر اقسام میں جاری و ساری ہے۔ مثلاً ایک ننھے سے بیج کو لیجئے اس میں اس درخت کی وہ تمام تر خصوصیات سمو دی گئی ہیں جس کا وہ بیج ہے۔ جب اس بیج کو نشو و نما کا موقع ملے گا تو اس میں وہ تمام تر خصوصیات مثلاً اس کا رنگ، اس کا مزا، اس کی بو، اس کا قد و قامت، اس کا پھل اسی درخت جیسا ہو گا جس کا وہ بیج تھا۔ اسی طرح کسی جاندار یا انسان کے نطفہ میں اس انسان کی شکل و صورت ہی منتقل نہیں ہوتی بلکہ اس کی عادات و خصائل تک منتقل ہو جاتی ہیں۔ رہا انسان کا جسم اور اس کے اندر پیچیدہ مشینری، اس کا عصبی، عضلاتی، لحمی اور ہڈیوں کی پیدائش کا نظام یہ سب چیزیں اس انسان کے نطفہ میں ایک خوردبینی جرثومہ کی شکل میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ اور جب اسے نشو و نما کا موقع میسر آتا ہے تو یہ سب چیزیں عملی طور پر وجود میں آ جاتی ہیں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ ایک جاندار کے جرثومہ میں کسی دوسرے جرثومہ کے خواص منتقل ہو جائیں۔ یا مثلاً کسی عورت کے رحم میں اونٹ کا جرثومہ چلا جائے تو اس کے ہاں اونٹ کا بچہ پیدا ہو جائے اللہ کا اعادہ خلق کا نظام آغازِ خلق سے بھی زیادہ پیچیدہ اور حیران کن ہے۔ اب غور فرمائیے کہ اس آغازِ خلق اور اعادہ خلق کے نظام میں اللہ کے علاوہ کسی فرشتے، کسی نبی، کسی ولی، کسی جن، کسی پیر و فقیر، یا کسی سیارے یا بت کا عمل دخل ہے؟ اگر نہیں تو پھر وہ عبادت کے مستحق کیسے ہو سکتے ہیں؟

السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۶۴﴾ قُلْ لَّا يَعْلَمُ

جو تمہیں آسمان اور زمین[۷۰] سے رزق دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ہے؟ آپ ان سے کہئے کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی کوئی دلیل لاؤ۔(۶۴) آپ ان سے کہئے کہ: اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ[۷۱]

[۷۰] خوراک کی پیدائش کے عوامل:۔ تمام نباتات اور حیوانات کی ضروریات زندگی اگرچہ زمین ہی سے وابستہ ہیں۔ تاہم ان کی خوراک کی افزائش میں بہت سے دوسرے عوامل بھی کام کرتے ہیں۔ سب سے بڑا عامل تو زمین کی قوت روئیدگی ہے۔ مٹی کی تاریکی میں ہی بیج کی نشوونما شروع ہونے لگتی ہے۔ دوسرا عامل سورج ہے جس کی گرمی سے سطح سمندر سے آبی بخارات اٹھتے ہیں۔ تیسرا عامل ہوائیں ہیں جو ان آبی بخارات کی سمت موڑتی ہیں۔ چوتھا عامل پہاڑوں کی بلندی یا کسی بلند طبقہ کی ٹھنڈک ہے جو پھر سے ان آبی بخارات کو پانی کے قطروں کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے۔ پھر اسی پانی کے ساتھ زمین کو قوت روئیدگی ملتی ہے تب جاکر نباتات اگتی ہے اور انسان اور حیوانات کو رزق میسر آتا ہے۔ غور فرمائیے کہ ان سمندروں، اس سورج، ان ہواؤں، ان پہاڑوں اور اس زمین کی پیدائش میں اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کا کچھ عمل دخل ہے؟ اب اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ بارش فلاں سیارے کے فلاں پچھتر میں داخل ہونے پر یا اس سیارے کی روح کے مجسمے یا بت کی قربانی یا نذرانہ دینے سے ہوتی ہے تو اسے کوئی تجرباتی' مشاہداتی یا نقلی دلیل پیش کرنا چاہئے۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو اللہ کی رزاقیت میں دوسرے کیسے شامل ہو سکتے ہیں۔ اور لوگوں کے داتا کیسے بن سکتے ہیں؟

[۷۱] غیب اور شہادت کے مختلف پہلو:۔ غیب سے مراد ایک تو ایسی چیزیں ہیں جو کسی خاص انسان کے علم یا مشاہدہ میں نہ آئی ہوں۔ پھر جب وہ اس کے علم میں آجائیں گی تو اس کے لئے غیب نہ رہیں گی۔ مثلاً سڑک پر ایک بس اور کار کا حادثہ ہو گیا جس میں چار آدمی مر گئے۔ پھر جب اسے اس کا علم ہو جائے گا یا وہ خود مشاہدہ کر لے گا تو یہ واقعہ اس کے لئے غیب نہ رہا۔ ایسی خبریں ماضی کی بھی ہو سکتی ہیں۔ حال کی بھی جو کسی کو معلوم ہوتی ہیں اور کسی کے لئے غیب کا درجہ رکھتی ہیں۔ البتہ مستقبل کی خبریں سب کے لئے غیب ہوتی ہیں۔ دوسری قسم یہ ہے کہ جتنے علوم انسان دریافت کر چکا ہے یا جس حد تک دریافت کر چکا ہے۔ وہ سب انسان کے لئے علم الشہادۃ ہیں اور جن علوم تک انسان کی رسائی ہو ہی نہیں سکتی یا نہیں ہو سکی۔ وہ اس کے لئے علمِ غیب ہیں۔ تیسری قسم ان اشیاء کا علم ہے جن تک انسان کی رسائی نہ پہلے کبھی ہوئی اور نہ آئندہ کبھی ہو سکے گی اور کتاب و سنت کی تصریح کے مطابق یہ پانچ چیزیں ہیں۔ (۱) کل کیا کچھ ہونے والا ہے اور فلاں شخص کل کیا کچھ کرے گا، (۲) موت کب اور کہاں آئے گی۔ (۳) رحم مادر میں تغیرات کیونکر واقع ہوتے ہیں۔ (۴) نفع رساں بارش کب ہو گی اور (۵) قیامت کب آئے گی۔ (۳۱:۳۴) ان چیزوں کا علم صرف اللہ کو ہوتا ہے۔

علمِ غیب صرف اللہ کو ہے:۔ ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ غیب کا علم صرف اللہ کو ہے۔ البتہ اس علم میں سے جتنا وہ انسانی ہدایت کے لئے ضروری سمجھتا ہے اس سے اپنے انبیاء کو مطلع کر دیتا ہے۔ جیسے قیامت، بعث بعد الموت، جنت و دوزخ اور روز قیامت کے احوال اور ایسے ہی ماضی کے حالات جسے شرعی اصطلاح میں تذکیر بایام اللہ کہتے ہیں۔ انبیاء و اقوام کے قصص' حالات اور بعض مستقبل کے متعلق پیشین گوئیاں اور بشارات۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی زبان سے بار بار یہ اعلان کروایا کہ اللہ

مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿65﴾ بَلِ ادّٰرَكَ
عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۣ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۣ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴿66﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ

چیزوں کو کوئی بھی نہیں جانتا۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ کب انہیں اٹھایا[۷۲] جائے گا(۶۵) بلکہ آخرت کے بارے میں ان کے علم نے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں، بلکہ یہ اس کی نسبت شک میں ہیں بلکہ یہ اس سے اندھے ہو چکے[۷۳] ہیں۔(۶۶) اور کافر یہ پوچھتے

کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا۔ ایک مقام پر فرمایا: "اے نبی کہہ دو کہ اگر میں غیب جانتا ہوتا تو میں بہت بھلائیاں اکٹھی کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچتی" (۷:۱۸۸) اور انبیاء پر چونکہ بموجب تصریح احادیث صحیحہ ابتلاء کا دور آتا ہے تو جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء بھی اتنا ہی غیب کا علم جانتے ہیں۔ جتنا اللہ انہیں بتا دیتا ہے۔

❀ علم غیب اور الوہیت کا باہمی تعلق:۔ علم غیب کو اللہ تعالیٰ سے مخصوص رکھنا اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ الوہیت اور علم غیب ماننے میں ایک گہرا تعلق ہے۔ قدیم زمانے سے لے کر آج تک انسان نے جس ہستی میں الوہیت کے کسی شائبہ کا گمان کیا ہے اس کے متعلق یہ ضرور خیال کیا ہے کہ اس پر سب کچھ روشن ہے اور کوئی چیز اس پر پوشیدہ نہیں رہتی۔ آپ نے اکثر اولیاء اللہ کے تذکروں میں پڑھا یا سنا ہو گا کہ پیر اپنے مریدوں کے حالات سے آگاہ ہوتا ہے۔ پھر ایسے بے شمار واقعات بھی ان تذکروں میں پائے جاتے ہیں۔ ایسے سب قصے اس لئے گھڑے جاتے ہیں کہ ان پیروں میں الوہیت کی صفات کو تسلیم کیا جائے اگرچہ زبان سے ان کا اقرار نہ کیا جائے۔ گویا کسی کے متعلق ایسا عقیدہ رکھنا ہی شرک کی سب سے بڑی بنیاد ہے۔ کوئی بزرگ یا پیر خواہ زندہ ہو یا فوت ہو چکا ہو کسی کی فریاد تو اسی صورت میں سن سکتا ہے اور اس کی حاجت روائی اور مشکل کشائی اسی صورت میں کر سکتا ہے کہ سب سے پہلے وہ اپنے مریدوں کے احوال سے آگاہ ہو پھر اس کے بعد امور کائنات میں کچھ تصرف بھی رکھتا ہو۔

❀ علم غیب ناقابل تقسیم صفت ہے:۔ پھر جس طرح اللہ تعالیٰ کی بعض دوسری صفات مثلاً خلاقیت اور رزاقیت ناقابل تقسیم و تجزیہ ہیں اسی طرح علم غیب بھی ناقابل تقسیم و تجزیہ ہے۔ یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں بزرگ اپنے تمام مریدوں کے حالات سے یا اپنے علاقہ یا شہر کے حالات سے پوری طرح باخبر ہے اور ان کے غیب کے حالات بھی جانتا ہے۔ یا فلاں ہستی اس علاقہ کی زمین کے مدفون خزانوں کو جانتی ہے، ایسی تمام باتیں شرک میں داخل ہیں۔

[۷۲] آیت کے اس جملہ سے یہ معلوم ہوا کہ اس آیت میں صرف ان ہستیوں کے علم غیب جاننے کی تردید مقصود ہے جن پر بعث بعد الموت کا مرحلہ پیش آنے والا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس سے مراد نہ بت ہو سکتے ہیں نہ حجر و شجر نہ شمس و قمر اور نہ فرشتے۔ ان سے مراد صرف وہی بزرگ ہو سکتے ہیں جن میں کسی نہ کسی رنگ میں الوہیت کی کوئی صفت اور بالخصوص علم الغیب تسلیم کیا جاتا ہے۔

[۷۳] یعنی کوئی انسان خواہ کتنے ہی عقل کے گھوڑے دوڑائے یہ معلوم نہیں کر سکتا کہ قیامت کب قائم ہو گی۔ نہ ہی روز آخرت کی حقیقت معلوم کر سکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ وحی الٰہی پر ایمان لے آئے۔ اس صورت میں اسے آخرت اور اس کے احوال کے متعلق تو یقین حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر قیامت کے وقت کا علم پھر بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور ان لوگوں کی

كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَاۗؤُنَآ اَىِٕنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ﴿۶۷﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَ
اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ
فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۶۹﴾ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا

ہیں کہ: جب ہم اور ہمارے آباء واجداد مٹی بن جائیں گے تو کیا پھر (قبروں سے) نکالے جائیں گے؟ (۶۷) یہ بات تو ہمیں اور اس سے پیشتر ہمارے آباء واجداد کو بھی کہی جاتی رہی ہے۔ یہ تو بس پہلے لوگوں کے افسانے ہیں۔ (۶۸) آپ ان سے کہئے کہ: ذرا زمین میں چل پھر کر تو دیکھو کہ مجرموں [۷۴] کا انجام کیسا ہوا تھا۔ (۶۹) (اے نبی!) آپ ان کے حال پر غمزدہ نہ ہوں اور نہ ہی ان کی

حالت یہ ہے کہ پیغمبر کی دعوت نے انہیں اس شک میں مبتلا ضرور کر دیا ہے اور وہ روز آخرت سے انکار کے باوجود یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ ممکن ہے کہ پیغمبر سچ ہی کہہ رہا ہو۔ اس کے باوجود ان لوگوں نے اسی بات کو ترجیح دی کہ اس معاملہ پر غور و فکر کرنا چھوڑ دیا جائے اور ان دلائل و شواہد سے بالکل آنکھیں بند کر لیں جن میں غور و تامل کرنے سے ان کا شک رفع ہو سکتا ہے۔

[۷۴] سوال کیا ہم اٹھائے جائیں گے اور جواب مجرموں کا انجام دیکھ لو میں ربط:۔ ان دو آیات میں کافروں کا قول یہ نقل کیا گیا ہے کہ مر کر مٹی ہو جانے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کا وعدہ تو ہمارے آباء واجداد کو بھی دیا گیا تھا پہلے لوگ بھی ایسی باتیں کرتے رہے اور آج بھی ایسی ہی باتیں ہو رہی ہیں حالانکہ جو مر گیا ان میں کوئی شخص بھی آج تک زندہ ہو کر نہیں آیا۔ یہ تو بس ایک افسانوی سی بات ہے جس میں حقیقت کچھ نہیں۔ اور کافروں کے اس قول کا جواب یہ دیا جا رہا ہے کہ زمین میں ذرا چل پھر کر تو دیکھو کہ مجرموں کا انجام کیا ہوا تھا؟ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کافروں کے اس قول اور اس کے جواب میں کوئی ربط نہیں۔ حالانکہ اس قول اور اس کے جواب میں گہرا ربط ہے اور ایک بہت بڑی حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو قومیں بھی اللہ کے عذاب سے تباہ ہوئیں سب کی سب قیامت اور بعث بعد الموت کی منکر تھیں اور جو شخص یا جو قوم بھی آخرت کے دن اور اللہ کے حضور اپنے اعمال کی باز پرس کی منکر ہوتی ہے اس کی زندگی کبھی راہ راست پر نہیں رہ سکتی۔ اور وہ دنیا میں شتر بے مہار کی طرح زندگی گزارتا ہے کہ جس کام میں اس نے اپنا فائدہ دیکھا اسی کو اپنا لیا۔ خواہ اس سے دوسروں کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو رہا ہو۔ ایسے ہی لوگ فساد فی الارض کے مرتکب ہو کر مجرمانہ زندگی بسر کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور ایسے مجرموں کو تباہ کر دینا ہی اللہ کی سنت جاریہ ہے تاکہ باقی لوگ ایسے لوگوں کے شر سے محفوظ رہ سکیں۔

دوسرا سبق ان واقعات سے یہ ملتا ہے کہ تاریخ انسانی میں یہ کوئی ایک ہی واقعہ نہیں بلکہ بے شمار تاریخی شواہد سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ رسولوں کا انکار اور آخرت کا انکار کرنے والے مجرموں کا انجام ان کی تباہی اور ہلاکت کی صورت میں ہوا۔ جس۔ سے از خود ایک اور حقیقت سامنے آتی ہے جو یہ ہے کہ کوئی ایسی مقتدر ہستی موجود ہے جو مجرموں کو ایک مقررہ حد سے آگے نکلنے سے روک دیتی ہے اور انہیں تباہ کر دیتی ہے۔ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں کہ جس شخص کا جو جی چاہے کرتا پھرے اور اس پر گرفت کرنے والا کوئی نہ ہو۔

پھر جب یہ تجربہ حاصل ہو گیا کہ مجرمین کو ان کے کیے کی سزا مل کے رہتی ہے۔ تو اسی قانون مکافات کا تقاضا یہ ہے کہ

يَمْكُرُوْنَ ۝۷۰ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۷۱ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝۷۲ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ

چالوں[۷۵] سے دل میں تنگی محسوس کریں۔(۷۰) کافر یہ کہتے ہیں کہ: اگر تم سچے ہو تو یہ وعدہ (عذاب) کب پورا ہوگا۔(۷۱) آپ ان سے کہئے کہ: کیا عجب ہے کہ جس (عذاب) کے جلد آنے کا تم مطالبہ کر رہے ہو اس کا ایک حصہ تمہارے قریب[۷۶] ہی آ لگا ہو۔(۷۲) آپ کا پروردگار تو لوگوں پر بڑا فضل[۷۷] والا ہے لیکن اکثر لوگ

جن مجرموں کو اس دنیا میں سزا نہیں ملی یا ان کے جرم سے بہت کم سزا ملی ہے ان سے باز پرس اور ان کی سزا کے لئے ایک دوسرا عالم قائم ہو۔ جس میں تمام مجرموں کو ان کے جرائم کی پوری پوری سزا دی جائے۔ مجرموں کو عذاب سے تباہ کر دینا عدل کے سب تقاضے پورے نہیں کرتا۔ اس سے تو صرف یہ ہوتا ہے کہ مجرموں کو مزید جرائم کرنے سے روک دیا جاتا ہے۔ ان کے جرائم کی سزا کے لئے تو یہ دنیا کی زندگی بہت ناکافی ہے۔ اسی طرح جن مظلوموں نے ان مجرموں کے مظالم برداشت کئے تھے ان کی ہلاکت سے ان کو کیا ملا؟ آخر ان لوگوں نے راہِ حق میں جو مظالم و مصائب برداشت کئے ہیں اس کا اجر بھی تو انہیں ملنا چاہئے۔ ان باتوں پر غور کرنے سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لئے آخرت کا قیام انتہائی ضروری ہے۔

[۷۵] یعنی جو کافر آپ پر ایمان لانے کے بجائے آپ کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے ہیں اور اسلام کے خلاف سازشوں کا جال بچھانے میں مصروف ہیں ان کی ایسی سرگرمیوں سے آپ پریشان اور غمزدہ نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کی کسی چال کو کامیاب نہ ہونے دے گا۔

[۷۶] کافروں کا جلد عذاب لانے کا مطالبہ اس بنا پر نہیں تھا کہ فی الواقع یہ چاہتے تھے کہ ان پر عذاب نازل ہو۔ بلکہ اس سے ان کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کے ان وعدوں کو جھوٹا سمجھتے ہیں تو آپ انہیں کہہ دیجئے کہ یہ عین ممکن ہے کہ ایسے عذاب کا کچھ حصہ عنقریب تمہیں اپنی گرفت میں لے لے۔ عذاب کے اس کچھ حصے کا آغاز تو جنگ بدر سے ہی ہو گیا تھا۔ پھر آپ کی زندگی میں ہی اس کچھ حصے کی کئی اقساط سے ان کافروں کو سابقہ پیش آتا رہا۔ اور اس عذاب کا زیادہ حصہ بلکہ اصل عذاب تو انہیں آخرت میں بھگتنا پڑے گا۔

واضح رہے کہ اس آیت میں عسیٰ کا لفظ ان معنوں میں نہیں کہ شاید تم پر عذاب آ جائے یا نہ آئے بلکہ یہ شاہانہ انداز کلام ہے اور بڑے لوگ جب اس انداز سے خطاب کریں تو وہ بات یقینی ہی سمجھی جاتی ہے اور اگر ایسا کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو تو پھر اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور فعل میں کچھ فرق نہیں۔ ارادہ تو دور کی بات ہے اللہ تعالیٰ تو جو کچھ چاہے وہ بھی ہو کے رہتا ہے۔

[۷۷] یعنی اگر عذاب آنے میں کچھ تاخیر ہو رہی ہے تو وہ اس لئے نہیں کہ یہ لوگ عذاب کے مستحق نہیں بلکہ اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ ابھی انہیں سمجھنے سوچنے کے لئے کچھ اور مہلت دی جائے۔ اب چاہئے تو

أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٧٣﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿٧٤﴾ وَمَا
مِنْ غَائِبَةٍ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ﴿٧٥﴾ إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَقُصُّ
عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَكْثَرَ الَّذِي هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿٧٦﴾ وَإِنَّهُ لَهُدًى وَرَحْمَةٌ

شکر نہیں کرتے۔(۷۳) اور بلاشبہ تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے جو ان کے سینے چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر [۷۸] کرتے ہیں(۷۴) اور زمین و آسمان کی کوئی پوشیدہ چیز ایسی نہیں جو کتاب مبین (لوح محفوظ) میں لکھی ہوئی [۷۹] نہ ہو۔(۷۵)

بلاشبہ یہ قرآن بنی اسرائیل پر اکثر وہ باتیں بیان کرتا ہے جن میں وہ [۸۰] اختلاف رکھتے ہیں(۷۶) اور یہ مومنوں کیلئے

یہ تھا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اس مہلت دینے پر اس کا شکر ادا کرتے یہ الٹا عذاب کے واقع ہونے کا ہی مذاق اڑانے اور اسے جھٹلانے پر لگے ہیں۔

[۷۸] ان کا زبانی مطالبہ تو یہ ہے کہ عذاب جلد کیوں نہیں آجاتا۔ لیکن اس مطالبہ کے جو محرکات ہیں اور جو کچھ یہ اپنے آپ کو اپنے دلوں میں سمجھے بیٹھے ہیں۔ ان کا یہ تمہارے سامنے اظہار نہیں کرتے۔ ان کے دلوں کے پوشیدہ کینوں اور ناپاک ارادوں کو اللہ خوب جانتا ہے۔

[۷۹] یعنی ان لوگوں کے ظاہری اعمال سے بھی اللہ واقف ہے اور باطنی خیالات سے بھی، ان کی حالیہ کرتوتوں سے بھی اور جو کچھ یہ آئندہ کے لئے سازشیں تیار کر رہے ہیں ان سب باتوں سے صرف واقف نہیں بلکہ یہ سب کچھ پہلے سے ہی اس کے ریکارڈ میں درج ہے۔ نیز یہ بھی کہ ان لوگوں کو کتنی مہلت دی جائے گی اور کب ان پر عذاب آئے گا۔ جو چیز علمِ الٰہی میں طے شدہ ہے وہ اپنے وقت پر آکے رہے گی۔

[۸۰] بنی اسرائیل کے باہمی اختلافات کے متعلق قرآن کی نشاندہی:۔ یہ اختلاف صرف عقائد میں ہی نہیں تھے بلکہ احکام اور قصص میں بھی تھے۔ عقائد کے اختلاف یہ تھے کہ مثلاً یہود ہی کا ایک فرقہ آخرت کا منکر بن گیا تھا۔ پھر ان میں کچھ فرقوں کا آخرت کے متعلق تصور ہی غلط تھا جس کا قرآن نے کئی مواقع پر ذکر فرمایا ہے۔ عیسائیوں میں عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختلاف تھے کچھ انہیں اللہ کا بیٹا قرار دیتے تھے کچھ انہیں اللہ ہی سمجھتے تھے۔ کچھ بیٹے کو باپ کی طرح قدیم سمجھتے تھے اور کچھ اسے مخلوق اور حادث قرار دیتے تھے۔ کچھ یہ کہتے تھے کہ اللہ نے اپنے سارے اختیارات اپنے بیٹے کو سونپ دیئے ہیں۔ کچھ کہتے تھے کہ وہ تین میں کا تیسرا ہیں۔ اور احکام میں اختلاف ان کی تحریفات لفظی اور معنوی کی بنا پر تھا۔ بہت سی آیتوں کو وہ چھپا جاتے تھے اور بہت سی آیات کی تحریف کر لیتے تھے اور ان کی ایسی حرکات بھی قرآن میں متعدد مقامات پر بالوضاحت مذکور ہیں۔ ان سب اختلافات کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے۔ قرآن نے آکر ان اختلافات کو بیان بھی کیا اور ان میں صحیح راہ بھی متعین فرمادی کہ فلاں مسئلہ میں اصل حقیقت یہ ہے اور فلاں میں حقیقت اتنی ہے۔ یہاں اس آیت کے ذکر کرنے سے مطلب یہ ہے کہ اس وقت جو اختلافات کفارِ مکہ اور مسلمانوں کے درمیان ہیں ان میں بھی قرآن صحیح راستے کی نشان دہی کر رہا ہے۔

لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٧﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿٧٨﴾
فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّكَ عَلَي الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ﴿٧٩﴾ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ
الصُّمَّ الدُّعَاۗءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿٨٠﴾ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ اِنْ تُسْمِعُ

ہدایت[۸۱] اور رحمت ہے۔(۷۷) آپ کا پروردگار اپنے حکم سے ان کے درمیان فیصلہ کردے گا اور وہ زبردست[۸۲] اور سب کچھ جاننے والا ہے۔(۷۸) آپ اللہ پر بھروسہ کیجئے۔ یقیناً آپ[۸۳] صریح حق پر ہیں۔(۷۹) نہ تو آپ مردوں کو سنا سکتے ہیں اور نہ ایسے بہروں[۸۴] کو اپنی پکار سنا سکتے ہیں جو پیٹھ پھیر کر بھاگے جارہے ہوں۔(۸۰) اور نہ ہی آپ اندھوں[۸۵] کو ان کی گمراہی سے بچا کر راہِ راست پر لا سکتے ہیں آپ تو

[۸۱] یعنی یہ قرآن بنی اسرائیل کے اختلافات میں سیدھے راستہ کی نشاندہی کرتا ہے اور جو اس پر ایمان لے آئیں تو ان کو ان گمراہیوں سے بچا لیتا ہے جن میں یہ لوگ اس وقت مبتلا ہیں۔ نیز جب انہیں قرآن کی بدولت زندگی کا سیدھا راستہ مل جائے گا اور وہ اس پر عمل پیرا ہوں گے تو اللہ کی ان پر اس قدر رحمتیں نازل ہوں گی جن کا یہ قریش آج تصور بھی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اسی قرآن کی بدولت چند ہی سالوں میں ان ایمانداروں کی ایسی کایا پلٹی کہ وہی بدو جو لوٹ مار اور قتل و غارت میں مشہور تھے وہ دنیا کے پیشوا، تہذیبِ انسانی کے استاد اور زمین کے ایک بڑے حصے کے فرمانروا بن گئے۔

[۸۲] یعنی جو کفار اس وقت آپ سے ہر وقت الجھتے رہتے ہیں اور مسلمانوں کو تنگ اور پریشان کرتے اور ان کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں ان کے درمیان اور مومنوں کے درمیان جلد ہی اپنا فیصلہ نافذ کرنے والا ہے۔ اور اس کے فیصلے کے نفاذ کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ کیونکہ وہ سب سے زبردست ہے۔ نیز اس کے فیصلے میں غلطی کا بھی امکان نہیں۔

[۸۳] یعنی قریش کی تکذیب، استہزاء ایذا رسانیاں اور سازشیں فی الواقع پریشان کرنے والی باتیں ہیں۔ آپ ان سے زیادہ تاثر نہ لیں۔ بلکہ ہر وقت اللہ پر بھروسہ کریں۔ آپ یقیناً صحیح راستہ پر جارہے ہیں اور اللہ ہمیشہ حق کا ساتھ دیتا ہے۔ لہذا وہ ضرور اور بروقت آپ کی مدد کرے گا۔

[۸۴] اس آیت میں موتیٰ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے دل مردہ ہو چکے ہیں۔ یعنی آپ کی نصیحت اور ہدایت نہ تو ان لوگوں کو کچھ فائدہ دے سکتی ہے جن کے دل مر چکے ہیں اور نہ ان کو جن کے دلوں کے کان بہرے ہو چکے ہیں۔ بالخصوص اس صورت میں وہ بہرے الٹے پاؤں بھاگے جارہے ہوں۔ بہرے کا بھی چہرہ اگر بات کرنے والی کی طرف ہو تو وہ متکلم کے اشاروں سے یا بات کرنے کے انداز سے ہی اس کا کچھ نہ کچھ مفہوم سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کا رخ ہی بات کرنے والے سے الٹی طرف ہو، مزید برآں وہ بھاگے جارہا ہو تو اس سے کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ متکلم کی بات کو کچھ نہ کچھ سمجھ سکے گا۔

[۸۵] ۞ ہدایت پانے کی چار ممکنہ صورتیں:۔ یعنی ان کافروں کے ہدایت پانے کی چار ہی صورتیں ممکن ہیں۔ جن میں سے دو سننے سے تعلق رکھتی ہیں اور دو دیکھنے سے۔ سننے کی پھر دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ صرف زندہ سن سکتا ہے۔ مردہ نہیں سن سکتا۔ اب چونکہ ان کے دل مر چکے ہیں لہذا اس طریقہ سے ان کی ہدایت ناممکن ہوئی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ سماعت رکھنے والا تو بات سن سکتا ہے۔ لیکن بہرا نہیں سن سکتا۔ یہ لوگ چونکہ دل کے بہرے ہیں لہذا یہ صورت بھی ناممکن ہوئی۔ تیسری

اِلَّا مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَهُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۱﴾ وَ اِذَا وَقَعَ الۡقَوۡلُ عَلَیۡهِمۡ اَخۡرَجۡنَا لَهُمۡ
دَآبَّةً مِّنَ الۡاَرۡضِ تُكَلِّمُهُمۡ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوۡا بِاٰیٰتِنَا لَا یُوۡقِنُوۡنَ ﴿۸۲﴾ وَ یَوۡمَ نَحۡشُرُ
مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍ فَوۡجًا مِّمَّنۡ یُّكَذِّبُ بِاٰیٰتِنَا فَهُمۡ یُوۡزَعُوۡنَ ﴿۸۳﴾ حَتّٰۤی اِذَا جَآءُوۡ

صرف [۸۶] ان کو سنا سکتے ہیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں پھر فرمانبردار بن جاتے ہیں (۸۱) اور جب (عذاب کی) بات پوری ہونے کا وقت آجائے گا تو ہم ان کے لئے زمین سے ایک جانور نکالیں گے جو ان سے کلام کرے گا کہ (فلاں فلاں) لوگ ہماری آیتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے [۸۷] (۸۲) اور جس دن ہم ہر امت سے ایسے لوگوں کی ایک فوج اکٹھی کریں گے جو ہماری آیات کو جھٹلاتی تھی پھر ان کی گروہ بندی [۸۸] کی جائے گا۔ (۸۳) یہاں تک کہ جب وہ سب آجائیں گے

صورت یہ تھی کہ ہو تو بہرا مگر کم از کم وہ توجہ تو کرتا ہو۔ اور بات سننے کی کچھ خواہش تو رکھتا ہو۔ اس صورت میں بھی کچھ اشاروں اور اندازِ خطاب سے اس کے کچھ نہ کچھ پلے پڑ سکتا تھا۔ مگر یہ لوگ تو پیٹھ پھیرے بھاگے جا رہے ہیں لہٰذا یہ تیسری صورت بھی ناممکن ہوئی۔ اور چوتھی صورت یہ ہے کہ ہدایت کا طالب اگر کچھ سن نہیں سکتا تو دیکھ کر بات سمجھ لے۔ اگر اسے کوئی اشارہ سے راہ بتائے تو اس سیدھی راہ کی طرف آئے۔ یا کم از کم جو لوگ سیدھی راہ پر چل رہے ہیں انہیں دیکھ کر ہی ان کے پیچھے ہو لے۔ اب یہ کفار چونکہ دلوں کے اندھے بھی ہیں لہٰذا ان کے ہدایت پانے کی چوتھی صورت بھی ناممکن ہو گئی۔ لہٰذا ایسے مردہ دل، دل کے بہرے اور اندھے لوگوں سے ہدایت پانے اور اسلام لانے کی توقع رکھنا بے کار ہے۔

[۸۶] یعنی آپ کی نصیحت اور ہدایت صرف ان لوگوں کے حق میں مفید ہو سکتی ہے جو خود بھی ہدایت کے طالب ہوں۔ آپ کی باتوں کو غور سے سنتے ہوں ان کے دل زندہ ہوں۔ دل کے کانوں سے سنتے ہوں۔ اور دل کی آنکھوں سے اللہ کی آیات میں غور و فکر کرتے ہوں۔ اور ایسے ہی لوگ ایمان لاتے ہیں۔ اور ایسے ہی لوگوں سے ایمان لانے اور ہدایت پانے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

[۸۷] اس آیت میں ﴿دَآبَّةً﴾ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس کا مادہ د ب ب ہے اور دبّ بمعنی عام رفتار (مشی) سے ہلکی یا سست رفتار سے چلنا ہے۔ اور دابہ ہر اس جاندار کو کہتے ہیں جو ہلکی چال چلتا ہو۔ خواہ وہ پیٹ کے بل چلے جیسے سانپ اور چھپکلی وغیرہ یا خواہ دو پاؤں پر چلے جیسے انسان اور بندروں کی بعض اقسام یا چار پاؤں پر چلے جیسے وحشی جانور اور چوپائے وغیرہ۔ نیز مذکر و مونث کے لئے اس کا یکساں استعمال ہوتا ہے۔ اور قرآن میں یہ لفظ دیمک کے لئے بھی آیا ہے۔ جس نے سیدنا سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کی لاٹھی کو چاٹ کھایا تھا اور وہ ٹوٹ گئی تھی۔ (۳۴:۱۴)

اس آیت میں جس دابّہ کا ذکر ہے۔ معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ وہ انسان کی شکل کا یا اس سے ملتا جلتا ہو گا۔ تکلمھم کا لفظ اس قیاس کی تائید کرتا ہے۔ تاہم یہ ضروری بھی نہیں۔ جس طرح اس دابّہ کا خروج خرق عادت ہو گا اسی طرح اس کا لوگوں سے کلام کرنا بھی خرقِ عادت ہو سکتا ہے۔ بہر حال یہ یقینی بات ہے کہ اس کا خروج علامات قربِ قیامت میں سے ایک علامت ہے جیسا کہ درج ذیل احادیث سے واضح ہے:

۱۔ ❁ دابۃ الارض کی حقیقت:۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تین باتیں جب ظاہر ہو جائیں تو اس وقت

قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّاذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٨٤﴾ وَوَقَعَ الْقَوْلُ

تو اللہ ان سے پوچھے گا کہ: تم نے میری آیات کو جھٹلایا حالانکہ علمی لحاظ سے تم نے ان کا احاطہ نہیں کیا تھا؟ (اگر یہ بات نہیں تو) پھر تم کیا [٨٩] کرتے رہے۔ (٨٤) اور ان کے ظلم کی وجہ سے ان پر (عذاب کی) بات پوری

کسی کو ایمان لانے کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اِلا یہ کہ وہ پہلے ایمان لا چکا ہو اور نیک اعمال کرتا رہا ہو۔ ایک سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، دوسرے دجال کا نکلنا اور تیسرے دابۃ الارض کا خروج" (مسلم۔ کتاب الایمان۔ باب بيان الزمن الذى لايقبل فيه الايمان)

٢۔ سیدنا ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دابۃ الارض نکلے گا تو اس کے پاس سلیمان کی مہر اور موسیٰ کا عصا ہوگا۔ پھر وہ (عصائے موسیٰ سے) مومن کے منہ پر لکیر کھینچ دیگا جس سے وہ چمک اٹھے گا اور کافر کی ناک پر (سلیمان کی انگوٹھی سے) مہر لگا دے گا۔ یہاں تک کہ سب لوگ ایک خوان پر جمع ہوں گے تو وہ یہ کہے گا کہ یہ مومن ہے اور یہ کافر ہے۔ (یعنی مومن اور کافر ممتاز ہو جائیں گے) (ترمذی۔ ابواب التفسیر)

٣۔ سیدنا حذیفہ بن اسید غفاریؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس آئے جبکہ ہم گفتگو میں مشغول تھے۔ آپ نے پوچھا: "کیا باتیں کر رہے تھے؟" ہم نے عرض کیا: قیامت کا ذکر کرتے تھے: آپ ﷺ نے فرمایا: قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تم اس سے پہلے دس نشانیاں نہ دیکھ لو۔ پھر آپ ﷺ نے یہ نشانیاں بتائیں۔ دھواں، دجال، دابۃ الارض۔ سورج کا مغرب سے نکلنا، نزول عیسیٰ ابن مریم، یاجوج ماجوج کا خروج۔ تین مقامات پر زمین کا خسف مشرق میں، مغرب میں، جزیرہ عرب میں اور ان نشانیوں کے بعد ایک آگ پیدا ہوگی جو لوگوں کو یمن سے نکال کر ہانکتی ہوئی ان کے محشر (سرزمین شام) کی طرف لے جائے گی" (مسلم۔ كتاب الفتن واشراط الساعة)

بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت سے پہلے صفا پہاڑی پھٹے گی اس میں سے ایک جانور نکلے گا جو لوگوں سے باتیں کرے گا کہ اب قیامت نزدیک ہے اور سچے ایمان والوں اور چھپے منکروں کو نشان دے کر جدا کر دے گا۔ دابۃ الارض سے متعلق بہت سے رطب ویابس اقوال و روایات بعض تفاسیر میں درج ہیں۔ مگر معتبر روایات سے تقریباً اتنا ہی ثابت ہے جو اوپر درج ہے۔

[٨٨] انسان کو جس بات کی سمجھ نہ آئے انکار کر دیتا ہے:۔ اس آیت میں میدانِ محشر کا ایک منظر پیش کیا گیا ہے۔ مجرموں کی ان کے جرائم کے لحاظ سے الگ الگ جماعتیں بنادی جائیں گی۔ جیسے مثلاً مشرکوں کی الگ جماعت ہوگی۔ کافروں کی الگ، منافقوں کی الگ، اور بعض مفسرین نے اس سے یہ مراد لی ہے کہ مکذبین کو محشر کی طرف لے چلیں گے اور وہ اتنی کثرت سے ہوں گے کہ پیچھے چلنے والوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا جائے گا۔ جیسا کہ انبوہ کثیر میں انتظام قائم رکھنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ وزع کا بنیادی معنی صرف روک دینا یا روکے رکھنا ہے۔ لہذا اس کے معنی میں دونوں طرح کے مطالب کی گنجائش موجود ہے۔

[٨٩] یعنی میری آیات کے انکار کے سلسلہ میں تمہارے پاس کوئی معقول وجہ یا دلیل موجود نہیں تھی۔ اِلا یہ کہ وہ باتیں تمہارے علم کی گرفت یا سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ پھر بجائے اس کے کہ تم غور و فکر کر کے ان کو سمجھنے کی کوشش کرتے تم نے سرے سے انکار ہی کر دیا تھا۔ تمہارا معمول ہی یہ بن گیا تھا کہ بلا سوچے سمجھے اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا جائے۔ اگر یہ بات نہیں تو بتاؤ اور تم کیا کام کرتے رہے ہو؟ کیا تم یہ ثابت کر سکتے ہو کہ تم نے تحقیق کے بعد ان آیات کو جھوٹا ہی پایا تھا۔ اور تم میں یہ قطعی علم حاصل ہو گیا تھا کہ جو کچھ ان آیات میں مذکور ہے وہ درست نہیں ہے۔

عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۸۵﴾ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ
النَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۸۶﴾ وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ
مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَتَرَى

ہو جائے گی تو وہ بول [۹۰] بھی نہ سکیں گے (۸۵) کیا وہ غور نہیں کرتے کہ ہم نے رات اس لئے بنائی کہ وہ اس میں آرام کریں اور دن کو روشن بنایا (تاکہ وہ کام کاج کر سکیں) اس میں بھی ان لوگوں کے لئے بہت سی نشانیاں [۹۱] ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔(۸۶) اور جس دن صور پھونکا [۹۲] جائے گا تو جو کوئی بھی آسمانوں میں یا زمین میں ہوگا سب گھبرا اٹھیں گے بجز ان کے جنہیں اللہ اس ہول [۹۳] سے بچانا چاہے گا۔ اور یہ سب حقیر [۹۴] بن کر اللہ کے حضور پیش ہو جائیں گے۔(۸۷)

[۹۰] یعنی ان پر الٹ پڑے گی، ان کا قصور ثابت ہو جائے گا کہ وہ واقعی اللہ کی آیات کے ساتھ بے انصافی کا معاملہ کرتے رہے لہذا انہیں اس سوال کا کوئی جواب میسر نہ آئے گا۔

[۹۱] یعنی دن اور رات کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے اور آتے جاتے رہنے میں ایک نہیں غور و فکر کرنے والوں کے لئے بے شمار نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی توحید پر دلالت کرتی ہیں۔ اور یہ نشانیاں ایسی ہیں جنہیں ہر شخص ہر وقت مشاہدہ کر سکتا ہے کیا تم نے کبھی سوچا کہ یہ دن رات کیسے پیدا ہوتے ہیں۔ کبھی راتیں لمبی ہو جاتی ہیں اور کبھی دن اور کبھی اس کے برعکس۔ پھر موسموں کے تغیر و تبدل پر بھی غور کیا تھا کہ سورج اور تمہاری زمین کا باہمی تعلق کیا ہے؟ یہ عظیم الشان تعلق قائم کرنا پھر ہر وقت اس نظام پر کنٹرول رکھنا کیا یہ سب کچھ اتفاقی امور تھے یا کوئی مقتدر ہستی یہ نظام چلا رہی تھی۔ اور اس نظام سے تمہارے کس قدر مفادات وابستہ ہیں۔ دن بھر کام کرنے سے جسقدر بدن کے اجزاء تحلیل ہوتے ہیں اور تھکن ہو جاتی ہے رات کو وہ سب پھر سے پیدا ہو جاتے ہیں اور صبح انسان کی تھکن دور اور وہ تازہ دم ہو کر اٹھتا ہے۔ نیز ایسا مربوط اور حکیمانہ نظام اسی صورت میں ہی قائم رہ سکتا ہے کہ اس کو بنانے، چلانے اور کنٹرول کرنے والی صرف ایک ہی ہستی ہو یا کئی ہستیاں مل کر کیا ایسا حکیمانہ اور مربوط نظام چلا سکتی ہیں؟! اسی ایک رات اور دن کے مسئلہ میں تم غور و فکر کرتے تو تمہیں ہدایت نصیب ہو سکتی تھی۔

[۹۲] معتبر روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ نفخۂ صور دو بار ہوگا۔ پہلی بار جب سیدنا اسرافیل صور میں پھونکیں گے تو قیامت برپا ہو جائے گی اور تمام دنیا تباہ و برباد ہو جائے گی۔ یہ نظام کائنات بھی درہم برہم ہو جائے گا اور دوسری بار جب صور پھونکا جائیگا تو تمام مردے اپنی اپنی قبروں سے زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ مزید تفصیل سورہ انعام کی آیت نمبر ۷۳ کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

[۹۳] یہ ایماندار لوگ ہوں گے یا فرشتے مثلاً اسرائیل، میکائیل، جبرائیل وغیرھم۔ کیونکہ یہ نفخۂ صور ان کی توقع کے مطابق ہوگا۔ اس لئے ان پر وہ دہشت طاری نہیں ہوگی جو منکرین حق پر ہوگی۔ یہ غالباً نفخۂ ثانی کی بات ہے۔ کیونکہ نفخۂ اول کے وقت ایماندار لوگ نہایت قلیل بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوں گے۔ کیونکہ احادیث صحیحہ میں یہ وضاحت آچکی ہے کہ قیامت بدترین لوگوں پر قائم ہوگی۔ اور نیک لوگ قیام قیامت سے پیشتر اٹھا لئے جائیں گے۔

[۹۴] ۞ دَخَرَ کا لغوی مفہوم:۔ دَخَرَ کے معنی میں عاجزی، ذلت اور حقارت تین باتیں پائی جاتی ہیں اور داخر بمعنی عقل و

الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْۤ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ؕ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ۝۸۸ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ

اس دن تو سمجھے گا کہ پہاڑ اپنی جگہ پر جمے ہوئے ہیں حالانکہ وہ بادل کی سی چال[۹۵] چل رہے ہوں گے اور یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہوگا جس نے ہر چیز کو مضبوط[۹۶] بنایا۔ بلاشبہ تم جو کام کر رہے ہو وہ اس سے خبردار[۹۷] ہے (۸۸) جو شخص اس دن بھلائی[۹۸] لے کر آئے گا اسے اس سے بہتر بدلہ ملے گا اور ایسے ہی لوگ اس دن گھبراہٹ[۹۹] سے امن میں ہوں گے۔(۸۹)

ہوش کی کم مائیگی کی بناپر نکو بن کر ذلت کی اطاعت قبول کر لینے والا ہے۔ یعنی ساری کی ساری مخلوق عاجز اور حقیر بن کر اللہ کے حضور پیش ہو جائے گی۔ سب اپنے آپ کو قصور وار سمجھتے ہوئے یوں پیش ہوں گے جیسے کوئی قصور وار غلام اپنے آقا کے سامنے پیش ہوتا ہے۔

[۹۵] قیامت کو پہاڑوں کا انجام:۔ یعنی جب قیامت قائم ہوگی تو اس کا آغاز اس طرح ہوگا کہ نظام کائنات میں زبردست خلل واقع ہو جائے گا۔ زمین مسلسل ہچکولے کھانے لگے گی۔ اور پہاڑوں جیسی ٹھوس، سخت اور جامد چیز اپنی جڑیں چھوڑ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گی اور ان ریزوں کی دھول فضا میں اس طرح اڑتی پھرے گی جیسے دھنکی ہوئی روئی (القارعہ:۵) اور اس مقام پر یہ تشبیہ دی گئی ہے کہ جیسے بادل فضا میں اڑتے پھرتے ہیں ویسے ہی پہاڑ بھی اڑتے پھریں گے۔

[۹۶] اَتْقَنَ کا لغوی مفہوم:۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی جس چیز کو بھی بنایا وہ اس کی کاریگری کا بے مثال نمونہ ہے اور اتقن الامر کے معنی کسی چیز کو فنی مہارت کے ساتھ مضبوط بنانا ہے۔ جو مدت مدید تک کام کرنے پر بھی خراب نہ ہو۔ مثلاً یہ سورج، یہ چاند، یہ ستارے، یہ زمین اور یہ آسمان۔ یہ سب اللہ نے جس دن سے پیدا کی ہیں اور جس مقصد کے لیے پیدا کی ہیں وہ مقصد نہایت عمدگی سے پورا کر رہی ہیں۔ کبھی نہ ان کی چال میں فرق آتا ہے۔ نہ لحہ بھر کی تقدیم و تاخیر ہوتی ہے اور نہ وہ خراب ہوتی ہیں اور نہ اپنا کام چھوڑ دیتی ہیں۔ اور یہ چیزیں تا قیامِ قیامت اسی حال پر برقرار رہیں گی اور ان میں خلل یا بگاڑ صرف اس وقت پیدا ہوگا جب اللہ کو منظور ہوگا اور قیامت قائم ہوگی۔

[۹۷] تمہارے افعال و اعمال سے پوری طرح باخبر ہے اور تمہاری نیتوں سے بھی واقف ہے۔ پھر تمہارے ان اعمال و افعال اور اقوال کا پورا پورا ریکارڈ بھی اس کے پاس محفوظ ہے اور یہی وہ دن ہوگا جب تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔

[۹۸] یہاں بھلائی سے مراد ایمان اور اعمالِ صالحہ ہیں۔ جزا یعنی نیک اعمال کے اچھے بدلہ کے متعلق اللہ کا عام ضابطہ یا قانون یہ ہے کہ ہر نیکی کے عوض دس گنا زیادہ اجر عطا فرمائے اور یہ اس کا اپنے نیک بندوں پر فضل اور احسان ہوگا۔ (۶:۱۶۱) پھر اگر کوئی عمل انتہائی خلوص اور محض اللہ کی خوشنودی کی خاطر بجالایا گیا ہوگا اور بعد میں اس کی نگہداشت بھی کی گئی ہوگی تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ سات سو گنا یا اس سے زیادہ بھی دے سکتا ہے۔ (۲:۲۶۱)

[۹۹] ایمانداروں پر گھبراہٹ طاری نہ ہونے کی دو وجہیں ہوں گی ایک یہ کہ جو کچھ اس دن ہوگا ان کی توقع اور ان کے ایمان کے مطابق ہوگا اور جس حادثہ کی انسان کو پہلے سے خبر ہو وہ اس سے بچاؤ تو کر لیتا ہے مگر اس سے گھبراتا نہیں۔

اٰمِنُوْنَ ﴿۸۹﴾ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِی النَّارِؕ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّمَاۤ
اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِیْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَیْءٍ٘ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ
الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۹۱﴾ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا مِنَ

اور جو برائی لے کر آئے گا تو ایسے لوگ اوندھے منہ جہنم میں پھینک دیئے [۱۰۰] جائیں گے (اور کہا جائے گا) تمہیں اتنا ہی بدلہ ملے گا جو تم کام کرتے رہے۔(۹۰) (اے نبی! کہہ دیجئے:) مجھے تو یہی حکم ہوا ہے کہ میں اس شہر (مکہ) کے مالکِ حقیقی کی اطاعت کروں جس نے اسے [۱۰۱] احترام بخشا اور جو ہر چیز کا مالک ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں فرمانبردار بن کر رہوں۔(۹۱) اور یہ قرآن پڑھ کر سناؤں۔ اب جو شخص راہِ راست پر آتا ہے تو وہ اپنے ہی فائدہ [۱۰۲] کے لیے آتا ہے اور جو گمراہ ہوا تو اس سے آپ کہہ دیجئے کہ میں تو صرف ایک

دوسرے یہ کہ ان کو ان کے اچھے اعمال کا بدلہ ان کی توقع سے بڑھ کر مل رہا ہوگا۔ اس لحاظ سے یہ ان کے گھبرانے کا نہیں بلکہ خوشی کا موقع ہوگا۔

[۱۰۰] سزا یا برے اعمال کے برے بدلہ کے مطابق اللہ کا ضابطہ یا قانون یہ ہے کہ جتنا کسی نے جرم کیا ہے اسے اتنی ہی سزا دی جائے اس سے زیادہ نہ دی جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی حال میں بھی اپنے بندوں پر ظلم یا زیادتی نہیں کرتا۔ یہ الگ بات ہے کہ کئی جرائم ایسے ہیں جن کی سزا ہی خلود فی النار ہے۔

[۱۰۱] ❁ حرم مکہ کی وجہ سے قریش کو حاصل ہونے والے فوائد:۔ مکہ کے مالک ہونے کا اللہ تعالیٰ نے اس لئے ذکر فرمایا کہ اس سورہ کے نزول کے وقت تک دعوت اسلام کا مرکز تبلیغ صرف مکہ ہی تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت اس لحاظ سے بھی تمہارے لئے ضروری ہے کہ جس نے اس شہر کو قابل احترام قرار دیا ہے۔ جس کے بیشمار فوائد اے قریش مکہ! تم ہی اٹھا رہے ہو۔ ساری دنیا میں بالخصوص اس گھر کے متولی ہونے کے باعث تمہاری عزت اور تمہارا وقار قائم ہے اللہ کے اس عطا کردہ احترام ہی کی وجہ سے عرب کے ڈاکوؤں اور لیٹروں سے تمہاری جانیں اور تمہارے اموال محفوظ رہتے ہیں اور بالخصوص تمہارے تجارتی قافلوں کو کوئی لوٹنے کی جرأت نہیں کرتا۔ پھر جسے تم پروانہ راہداری عطا کر دو۔ لوگ اس پر بھی ہاتھ نہیں ڈالتے۔ آخر عرب کے ڈاکوؤں اور لٹیروں کے دلوں میں تمہارا یہ احترام اور اس گھر کی عزت اور ہیبت کس نے ڈالی ہے؟ یہ کوئی تمہارے معبودوں کا کارنامہ تو نہیں ہے۔ لہذا مجھے تو یہی حکم ہے کہ میں اسی پروردگار کی اطاعت کروں اور اس کا فرمانروا بن کر رہوں اور اللہ کا یہ پیغام تم لوگوں تک بھی پہنچادوں۔

[۱۰۲] اور یہ حکم ہوا ہے کہ جس قدر قرآن نازل ہوتا جائے ساتھ کے ساتھ تم لوگوں کو سناتا جاؤں۔ رہی یہ بات کہ تم ان قرآنی آیات کی طرف توجہ دیتے ہو یا نہیں' سیدھی راہ کی طرف آتے ہو یا نہیں' یہ میری ذمہ داری نہیں، میری ذمہ داری صرف قرآن سنا دینا ہے۔ پھر اگر ہدایت قبول کر لو گے تو اس میں تمہارا ہی بھلا ہے۔ دنیا میں اللہ عزت اور اقتدار بخشے گا اور آخرت میں جہنم کے عذاب سے بچ جاؤ گے اور گمراہ ہی رہنا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔ میں اپنا کام سرانجام دے چکا۔

الْمُنْذِرِیْنَ ﴿۹۲﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَیُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾ ع ۷ / ۲

ڈرانے والا ہوں (۹۲) نیز کہہ دیجئے کہ سب طرح کی تعریف اللہ ہی کے لئے ہے وہ عنقریب تمہیں اپنی ایسی نشانیاں [۱۰۳] دکھائے گا جنہیں تم پہچان لو گے اور جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو اس سے آپ کا پروردگار بے خبر نہیں۔ (۹۳)

[۱۰۳] یعنی ایسی نشانیاں جن سے تمہیں بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ جو باتیں میں کہتا تھا وہی حق اور درست تھیں۔ یعنی تمہیں اللہ تعالیٰ اس دنیا میں ذلیل و خوار کرے گا اور مسلمانوں کا ہر آڑے وقت میں ساتھ دے گا اور ان کی مدد فرمائے گا۔ اور تمہاری سر توڑ معاندانہ کوششوں کے باوجود اسلام سربلند ہو کے رہے گا۔ اس وقت تم ٹھیک طرح پہچان لو گے کہ تم سے کئے گئے وعدے بھی درست تھے، یہ قرآن بھی درست اور حق تھا اور میں بھی فی الواقع اللہ کا پیغمبر ہوں۔ اور یہ سب کچھ ماننے بغیر تمہارے لئے دوسرا کوئی چارہ کار نہ رہے گا۔ چنانچہ فتح مکہ اور پھر اس کے بعد اعلانِ براءت پر سب کفار اور مشرکینِ مکہ پر یہ حقائق منکشف ہو گئے اور ایمان لانے کے لیے ان کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہ رہا۔

۸۸ آیاتها ۔۔۔ سُوْرَةُ الْقَصَصِ مَكِّيَّةٌ ۔۔۔ رکوعها ۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

طٰسٓمّٓ ﴿۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾ نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ

کلمات ۱۴۵۴ ۔ آیت ۸۸ ۔ (۲۸) سورہ القصص مکی ہے (۴۹) ۔ رکوع ۹ ۔ حروف ۶۰۱۱

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

ط۔ س۔ م (۱) یہ واضح کتاب (قرآن) کی آیات ہیں (۲) ہم آپ کو موسیٰ[۱] اور فرعون[۲] کے بالکل سچے حالات پڑھ کر سناتے ہیں' ان لوگوں کے (فائدے کے) لئے جو ایمان لاتے[۳] ہیں (۳)

[۱] قرآن میں اکثر مقامات پر قصص الانبیاء کے ضمن میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا ذکر پہلے کیوں آیا ہے؟ قرآنِ کریم میں اکثر مقامات پر سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے انبیاء کے ذکر میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔ اس کی وجوہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ مختصراً یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ شدید حالات میں فریضہ رسالت سرانجام دینے کا حکم ہوا تھا۔ مثلاً یہ کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام جس قوم بنی اسرائیل کے فرد تھے، فرعون نے انہیں اچھوتوں کی طرح کم تر درجہ کی مخلوق اور عملاً غلام بنا کر رکھا ہوا تھا۔ جبکہ آپ ﷺ اپنی قوم قریش ہی کے ایک فرد تھے۔ پھر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو فرعون جیسے مغرور، متمرد اور سرکش، فوراً بھڑک اٹھنے والے فرمانروا کے ہاں دعوتِ رسالت کے لئے بھیجا گیا تھا جبکہ آپ ﷺ کے مخاطبینِ اول آپ ﷺ کی اپنی ہی قوم کے افراد تھے۔ تیسرے یہ کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو یہ بھی حکم تھا کہ دعوتِ توحید کے ساتھ اپنی قوم بنی اسرائیل کی رہائی کا بھی مطالبہ کریں جبکہ رسول اللہ ﷺ کو ایسا کوئی حکم نہ تھا۔ چوتھے یہ کہ آپ فرعون کے اشتہاری مجرم تھے۔ اور اس قصہ کا انجام یہ ہوتا ہے کہ بالآخر اللہ تعالیٰ سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی مدد کر کے انہیں فرعونیوں سے نجات دلاتے ہیں اور فرعون اور آلِ فرعون کو دریا میں غرق کر کے ایسے ظالموں کا صفحہ ہستی سے نام و نشان تک مٹا دیتے ہیں۔ گویا اس قصہ میں آپ ﷺ کے لئے اور مسلمانوں کے لئے سبق یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے ایسے شدید حالات میں اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے سب مصائب برداشت کئے تو آپ کو بھی کرنا چاہئیں اور بشارت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس معرکہ حق و باطل میں بالآخر اپنے پیغمبر اور ایمان لانے والوں کو ہی کامیاب کرتا ہے اور ان کے دشمن تباہ ہو جاتے ہیں۔

[۲] فرعون کا لقب اور زمانہ:۔ شاہانِ مصر کا لقب، جیسے قدیم زمانہ میں ترکوں کے بادشاہ خاقان، یمن کے بادشاہ تبع، حبشہ کے بادشاہ نجاشی، روم کے بادشاہ قیصر اور ایران کے بادشاہ کسریٰ کہلاتے تھے ایسے ہی مصر کے بادشاہ فرعون کہلاتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کو دو فرعونوں یا دو بادشاہوں سے سابقہ پڑا تھا۔ جس فرعون نے آپ کی پرورش کی تھی اس کا نام رعمسیس تھا اور نبوت ملنے کے بعد جس کے ہاں آپ کو بھیجا گیا تھا وہ رعمسیس کا بیٹا منفتاح تھا۔ ان کا عہد حکومت تقریباً چودہ سو سال قبل مسیح ہے۔

[۳] یعنی قرآن کا یہ قصہ بیان کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو بتایا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے نافرمانوں اور متکبروں کا آخر

يُؤْمِنُونَ ﴿٣﴾ إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ﴿٤﴾ وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى

فرعون نے ملک (مصر) میں سرکشی[۴] اختیار کر رکھی تھی۔ اور اپنی رعیت کو کئی گروہ بنا دیا تھا اور ان میں سے ایک گروہ (بنی اسرائیل) کو بہت کمزور[۵] بنا رکھا تھا۔ وہ اس گروہ کے لڑکوں کو تو قتل کر دیتا[۶] مگر لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتا تھا۔ بلاشبہ وہ (معاشرہ میں) بگاڑ پیدا کرنے والوں سے تھا۔(۴) اور ہم یہ چاہتے تھے کہ جس گروہ کو

کیا انجام ہوتا ہے اور اللہ کے فرمانبرداروں کا کیا؟ لیکن اس قصہ سے نصیحت، ہدایت اور سبق وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو ان واقعات کو درست تسلیم کر کے اور ان میں غور و فکر کر کے ایمان لانے والے ہوں اور جو لوگ اسے محض تاریخی داستان یا افسانہ سمجھتے ہوں، انہیں اس سے کیا عبرت حاصل ہو سکتی ہے؟

[۴] یعنی فرعون نے سر اٹھا رکھا تھا۔ اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھنے لگا تھا، لوگوں پر ظلم و زیادتی میں حد سے بڑھنے لگا تھا۔ اپنے آپ کو بندگی کے مقام سے اٹھا کر مکمل خود مختاری کے مقام تک لے گیا تھا اور سخت باغیانہ روش اختیار کر رکھی تھی۔ بعد میں فرعون کا لفظ لغوی لحاظ سے متکبر، سرکش اور متمرد کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے۔

[۵] ﷺ فرعون کی سیاسی پالیسی...... قبطی اور سبطی کون لوگ تھے؟:۔ اپنی حکومت کو مستحکم کرنے اور مستحکم بنائے رکھنے کے سلسلہ میں اس کی سیاسی پالیسی یہ تھی کہ اس نے اپنی رعایا میں طبقاتی تقسیم پیدا کر دی تھی۔ ایک تو اس کی اپنی قوم یا مصر کے قدیم باشندے تھے جنہیں قبطی کہتے ہیں اور یہ معزز طبقہ تھا۔ سرکاری مناصب بھی انہیں ہی مل سکتے تھے اور حکمران قوم ہونے کے ناطے سے ان کے حقوق کی ضرورت سے بھی زیادہ نگہداشت کی جاتی تھی۔ دوسرے بنی اسرائیل تھے۔ جو سیدنا یوسف علیہ السلام کے زمانہ یعنی تقریباً چار سو سال سے یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ اس وقت وہ حکمران قوم کی حیثیت سے آئے تھے لیکن ایک صدی بعد ہی ان میں جب بے دینی اور اخلاقی انحطاط شروع ہو گیا اور فرقوں میں بٹ گئے تو اللہ نے ان سے حکومت چھین لی اور مصری لوگ پھر سے قابض ہو گئے۔ انہوں نے ان بنی اسرائیل سے انتقاماً اچھوتوں اور شودروں کا سا سلوک روا رکھا ہوا تھا۔ معاشرہ میں ان کی کچھ عزت نہ تھی۔ کوئی سرکاری عہدہ انہیں نہیں مل سکتا تھا۔ یہ لوگ عموماً حکمران قوم کے افراد کے غلام، ملازم اور ان کی عورتیں بھی ان کے گھروں کا کام کاج کرتی تھیں۔ اس طرح فرعون نے عملاً ان لوگوں کو اپنا غلام بنا کر رکھا ہوا تھا۔

[۶] ﷺ سبطیوں کی نسل کشی کے لئے فرعون کا اقدام:۔ مصر کی قومیت پرستی کی تحریک تو مدتوں پہلے شروع ہو چکی تھی اور اسی کے نتیجہ میں بنی اسرائیل (یعنی سبطیوں) سے ایسا نارواسلوک کیا جاتا تھا۔ تاہم فرعون رعمسیس نے اس کے لئے انتہائی قدم یہ اٹھایا کہ آئندہ سے بنی اسرائیل کے ہاں پیدا ہونے والے لڑکے کو قتل کر دیا جائے اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے۔ لڑکیاں یا عورتیں تو از خود قبطیوں یا آل فرعون کے قبضہ میں آجائیں گی اور اس طرح کچھ مدت بعد بنی اسرائیل کی نسل ہی ختم ہو کر مصریوں میں مدغم ہو جائے گی۔ چنانچہ فرعون کے اس حکم کی تعمیل کے لئے جاسوس قسم کی عورتیں مقرر کی گئی تھیں۔ جو بنی اسرائیل کے ہاں نوزائیدہ بچوں کی رپورٹ حکومت کو پیش کیا کرتی تھیں۔ اور یہ محض احتیاطی تدبیر تھی ورنہ بنی اسرائیل کے

الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۝ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى

اس ملک میں کمزور بنایا[۷] گیا تھا اس پر احسان کریں، انہیں سرکردہ بنائیں اور (اس ملک کے) وارث بنائیں (۵) اور انہیں اس ملک میں اقتدار بخشیں اور فرعون اور ہامان[۸] اور ان کے لشکروں کو وہی کچھ دکھا دیں[۹] جس کا انہیں ان (بنی اسرائیل) سے خطرہ تھا۔ (۶)

لئے آرڈر یہی تھا کہ وہ نوزائیدہ لڑکے کی اطلاع حکومت کو فراہم کریں اور وہ اس بات پر مجبور بھی تھے۔

۞ فرعون کا خواب کہ ایک اسرائیلی اس کی حکومت کا خاتمہ کرے گا:۔ بعض تفاسیر میں منقول ہے کہ فرعون کو ایک پریشان کن خواب آیا تھا جس کی نجومیوں نے اسے تعبیر یہ بتائی تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہونے والا ہے جس کے ہاتھوں فرعون اور اس کی حکومت تباہ ہو جائے گی اور فرعون نے اسی خطرہ کے سدِباب کے لئے بنی اسرائیل کے لڑکوں کے قتل کا حکم دیا تھا۔ اس پہلو سے اگر غور کیا جائے تو فرعون کا یہ اقدام سراسر حماقت اور استبداد تھا۔ کیونکہ اگر نجومیوں کی یہ تعبیر درست تھی تو یہ کام ہو کے رہنا چاہئے تھا اور وہ ہو کے رہا۔ خواب یا اس کی تعبیر میں یہ اشارہ تک نہیں پایا جاتا کہ اگر فرعون اس خطرہ کا کوئی سدباب سوچ لے تو بچ سکے گا۔ اور اگر یہ تعبیر غلط تھی تو پھر ویسے ہی یہ ایک سفاکانہ حرکت تھی۔ بہر حال دونوں صورتوں میں اس کا یہ اقدام ظالمانہ اور وحشیانہ قسم کا تھا۔ اور جہاں تک اس واقعہ خواب یا اس کی تعبیر کا تعلق ہے، اس کی صحت اور عدمِ صحت کے متعلق اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اور یہ صورت نہ بھی ہوتی تو قومیت پرستی کی بنیاد پر حالات ایسے پیدا ہو چکے تھے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کو مکمل طور پر کچل دینے کے لئے یہی اقدام مناسب سمجھا۔

اور ابن کثیر اس خواب اور اس کی تعبیر کے واقعہ کی صورتِ حال یہ بتلاتے ہیں کہ بنی اسرائیل آپس میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ کی ایک پیشین گوئی کا تذکرہ کیا کرتے تھے کہ ایک اسرائیلی نوجوان کے ہاتھوں سلطنتِ مصر کی تباہی مقدر ہو گی۔ رفتہ رفتہ یہ بات فرعون کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ اس احمق نے قضا و قدر کی روک تھام کے لئے یہ سفاکانہ سکیم جاری کی تھی۔

[۷] ۞ مظلوم بنی اسرائیل پر اللہ کی نظرِ کرم:۔ فرعون تو اس مظلوم گروہ کا کلی طور پر استیصال کرنا چاہتا تھا۔ مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اللہ یہ چاہتا تھا کہ ایسی سفاک اور ظالم قوم کا استیصال ہونا چاہئے۔ اور جن بے چاروں پر یہ ظلم و ستم ڈھائے جا رہے ہیں انہیں نہ صرف ان سے نجات دلائی جائے بلکہ انہیں ان ظالموں کی جائیدادوں اور ملک کا وارث بھی بنا دیا جائے۔ دین کی امامت بھی انہی کے سپرد کی جائے اور دنیا کی سرداری کا تاج بھی ان کے سر پر رکھ دیا جائے۔ اور اللہ کی سنت جاریہ یہی ہے کہ وہ ظالموں اور متکبروں سے زمین کو خالی کرا کر ان کی جگہ ان مظلوموں کو آباد کرتا ہے۔ جن پر ظلم ڈھائے گئے تھے۔

[۸] فرعون کا وزیر جو اس ظلم و ستم میں اس کا شریک اور آلہ کار بنا ہوا تھا۔ اس کی تفصیل اسی سورہ میں آگے مذکور ہے۔

[۹] یعنی فرعون ہامان اور ان کے ساتھیوں کی کوشش یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو اتنا کمزور بنا دیا جائے کہ وہ آئندہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ اسی غرض سے ان کی نسل ختم کر دینے کی سکیم تیار کی گئی تھی۔ مگر ہم یہ چاہتے تھے کہ جس خطرہ کی روک تھام کے لئے وہ سارے پاپڑ بیل رہے تھے وہی خطرہ ہم ان کی آنکھوں سے انہیں دکھا دیں۔ اور وہ اپنے جیتے جی یہ دیکھ لیں کہ اللہ کی

أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ ۖ فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِي وَلَا تَحْزَنِي ۖ إِنَّا رَادُّوهُ
إِلَيْكِ وَجَاعِلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿٧﴾ فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَ

ہم نے موسیٰ کی والدہ کی طرف الہام [۱۰] کیا کہ اس بچے (موسیٰ) کو دودھ [۱۱] پلاتی رہو۔ پھر جب تجھے اس (کے قتل) کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دینا اور نہ کچھ خوف رکھنا اور نہ غم کھانا ہم اس بچے کو تیری طرف ہی لوٹا دیں گے اور اسے اپنا رسول بنا دیں گے۔(۷)

چنانچہ فرعون کے گھر والوں نے اس بچے کو اٹھا لیا کہ وہ (نتیجتاً) ان کے لئے دشمن اور رنج [۱۲] کا باعث بنے

تقدیر کبھی ٹل نہیں سکتی، نہ اسے کوئی طاقت روک سکتی یا اس میں تاخیر پیدا کر سکتی ہے۔

[۱۰] یہاں لفظ اَوْحَیْنَا استعمال ہوا ہے اور وحی کا لغوی معنیٰ صرف خفی اور تیز اشارہ ہے اور اَوْحٰی کے معنی کسی پوشیدہ اور نامعلوم بات کے متعلق سرعت سے اشارہ کرنا (مفردات، مقاییس اللغۃ) یعنی کسی تشویشناک معاملہ کے حل کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یکدم دل میں کوئی خیال آجانا اور ایسی وحی غیر نبی کی طرف بھی ہو سکتی ہے۔ ایسی ہی وحی امّ موسیٰ کو بھیجی گئی تھی۔ اور ممکن ہے یہ وحی فرشتوں کے خطاب کی صورت میں ہو۔ ایسی وحی بھی غیر نبی کو ہو سکتی ہے۔ جیسے سیدہ مریم علیہا السلام سے فرشتوں نے خطاب کیا تھا۔

[۱۱] سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور آپ کی والدہ کو وحی کے ذریعہ ہدایات:۔ یہ وحی موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بعد ہوئی اور یہ وحی چار اُمور پر مشتمل تھی: (۱) جب تک اس بچے کی سراغ رسانی نہیں ہوتی، اسے اپنے پاس ہی رکھو اور اسے دودھ پلاتی رہو۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ ام موسیٰ نے آپ کو تین ماہ تک چھپائے رکھا تھا۔ (۲) جب یہ راز فاش ہونے لگے اور تمہیں یہ خطرہ محسوس ہو کہ اب عمال حکومت اس بچے کو پکڑ کر لے جائیں گے تو اس کو کسی تابوت یا ٹوکرے میں رکھ کر دریا کی موجوں کے سپرد کر دینا (۳) اور دریا میں ڈالتے وقت اس بات کا ہرگز اندیشہ نہ کرنا کہ یہ بچہ ضائع ہو جائے گا۔ بلکہ ہم بہت جلد یہ بچہ تیری ہی طرف لوٹا دیں گے۔ تو ہی اسے دودھ پلائے گی اور اس کی پرورش کرے گی۔ (۴) یہی وہ بچہ ہے جو بنی اسرائیل میں رسول بننے والا ہے۔

[۱۲] سیدنا موسیٰ علیہ السلام فرعون کی بیوی کے پاس:۔ چنانچہ ام موسیٰ نے وحی کے مطابق اس بچہ کو کسی تابوت یا ٹوکرے میں رکھ کر دریائے نیل کی موجوں کے سپرد کر دیا۔ یہ تابوت موجوں پر سفر کرتے کرتے جب اس مقام پر پہنچا جہاں فرعون کے محلات تھے تو فرعون کے اہل کاروں نے اسے دیکھ لیا اور اسے پکڑ کر فرعون اور اس کی بیوی کے سامنے پیش کر دیا۔ یا ممکن ہے کہ فرعون اور اس کی بیوی سیر و تفریح کی غرض سے محل سے نکل کر دریا کے کنارے آئے ہوئے ہوں اور انہوں نے خود یہ تابوت دیکھ کر اسے نکال لانے کا حکم دیا ہو۔ چنانچہ فرعون اور اس کی بیوی اس بچہ کو اپنے ہاں لے آئے جو ان کا دشمن اور ان کی تباہی کا باعث بننے والا تھا۔

[۱۳] اس جملہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ ایک بچہ کے خطرہ کی بنا پر ہزارہا بچوں کا قتل کر دینا ان کی بہت بڑی غلطی اور حماقت تھی۔ اور ان کی یہ حماقت اس لحاظ سے اور بھی زیادہ واضح ہو گئی تھی کہ جس بچہ سے خطرہ کے سدباب کے لئے وہ یہ

حَزَنًا ۭ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـــِٕيْنَ ۝۸ وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ
قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ ۭ لَا تَقْتُلُوْهُ ڰ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا
يَشْعُرُوْنَ ۝۹ وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ۭ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰي
قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۰ وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ۡ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ

بلاشبہ فرعون، ہامان اور [۱۳] ان کے لشکر خطاکار لوگ تھے (۸) اور فرعون کی بیوی فرعون سے کہنے لگی: یہ بچہ تو میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، [۱۴] اسے قتل نہ کرو، کیا عجیب کہ یہ ہمارے لئے مفید ثابت ہو یا ہم اسے بیٹا بنالیں اور وہ (اس کے انجام سے) بے خبر [۱۵] تھے۔ (۹) اور موسیٰ کی والدہ کا دل سخت بے قرار ہو گیا۔ اور اگر ہم اس کی ڈھارس نہ بندھاتے تو قریب تھا کہ وہ راز فاش کر دیتی۔ (ڈھارس بندھانے کا دوسرا فائدہ یہ تھا) کہ وہ (موسیٰ کو واپس اس کے پاس لوٹانے کے وعدہ پر) یقین کرنے والوں [۱۶] سے ہو جائے۔ (۱۰) چنانچہ اس نے موسیٰ کی بہن سے کہا کہ: اس بچے کے پیچھے پیچھے چلتی جاؤ'' چنانچہ وہ تو آنکھیں بچا کر اسے دیکھتی رہی

سفاکی کر رہے تھے وہ تو ان کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ خطاکار اس لحاظ سے تھے کہ وہ اپنی اس ظالمانہ تدبیر سے اللہ کی تقدیر کو روکنا چاہتے تھے۔

[۱۴] اپنی بیوی کی درخواست پر فرعون کا سیدنا موسیٰ کو متبنیٰ بنانا اور پرورش کرنا:۔ اب ظاہری قیاس سے تو یہی معلوم ہو رہا تھا کہ یہ بچہ کسی بنی اسرائیل کے فرد کا ہی ہو سکتا ہے جس نے بچہ کے قتل کے خطرہ کی وجہ سے اس کے قتل ہونے سے بہتر یہی سمجھا کہ اسے دریا کے سپرد کر دیا جائے۔ اس لحاظ سے فرعون کو یہ بچہ فوراً مار ڈالنا چاہئے تھا۔ مگر بچے کی صورت ایسی پیاری اور پرکشش تھی کہ فرعون کی بیوی آسیہ جس کے متعلق قرآن نے ایک دوسرے مقام پر تصریح کر دی ہے کہ وہ فرعون کے ایسے ظالمانہ کاموں سے سخت بیزار تھی، نے جب یہ بچہ دیکھا تو فوراً اس کا دل محبت سے بھر آیا۔ مفسرین کہتے ہیں کہ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے ہاں اولاد نہ تھی۔ چنانچہ وہ فوراً کہنے لگی کہ یہ بچہ تو بہت پیارا ہے کہ جسے دیکھ کر ہی دل خوش ہو جاتا ہے اور ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ لہٰذا ہم خود اس کی تربیت کریں گے۔ اسے قتل کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ پھر یہ بچہ ہمارے لئے مفید بھی ہو سکتا ہے۔ جب اس کی پرورش کریں گے تو یہ ہمارا ہی بچہ ہے۔ اسے کیا خبر ہو سکتی ہے کہ اس کا بنی اسرائیل کے کسی فرد سے بھی کچھ تعلق ہے۔ اگر ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں گے تو اس کی ساری اہلیتیں بنی اسرائیل کے بجائے ہمارے کام آسکتی ہیں۔ لہٰذا اسے متبنیٰ بنالینے میں ہمیں بہت سے فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔

[۱۵] تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ:۔ یعنی ان دونوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ جو باتیں وہ کر رہے ہیں وہ خود نہیں کر رہے بلکہ مشیت الٰہی ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلوا رہی ہے۔ یا انہیں کیا خبر تھی کہ جس بچہ کو مارنے کی خاطر انہوں نے ہزار ہا بچے قتل کر دیئے ہیں یا کر رہے ہیں وہی بچہ ان کے اپنے ہاتھ میں ہے جسے یہ اپنا متبنیٰ بنانے کے مشورے کر رہے ہیں یا یہ کہ جس بچہ پر اس وقت ان کا اتنا دل بھر آیا ہے وہی ان کا دشمن بن جائے گا۔ اور اسی کے ہاتھوں ان کی اور ان کی حکومت کی تباہی واقع ہو گی۔

[۱۶] امِ موسیٰ کی بے قراری:۔ ام موسیٰ نے وحی کے مطابق سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو دریا کی موجوں کے سپرد کر تو دیا مگر بعد

وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ﴿۱۲﴾ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى اُمِّهٖ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ

اور دوسروں [۱۷] کو اس کا پتہ نہ چل سکا۔(۱۱) اور ہم نے پہلے سے ہی اس (موسیٰ) پر دائیوں کا دودھ حرام کر دیا تھا۔ اس وقت موسیٰ کی بہن نے کہا: کیا میں تمہیں ایسے گھرانے کا پتہ بتاؤں جو تمہارے لئے اس (بچہ) کی پرورش کریں اور وہ اس (بچہ) کے خیر خواہ [۱۸] بھی ہوں؟(۱۲) چنانچہ (اس طرح) ہم نے موسیٰ کو اس کی والدہ ہی کی طرف لوٹا دیا تاکہ

میں سخت بے تاب ہو گئیں۔ ماں کی مامتا چین نہ لینے دیتی تھی۔ کئی بار دل میں خیال آیا کہ لوگوں سے کہہ دیں کہ میں نے بچہ دریا میں ڈال دیا ہے۔ کوئی مجھ پر مہربانی کرے اور اسے وہاں سے نکال کر مجھے واپس لا دے۔ اس صورت میں کئی طرح کے خطرات نظر آ رہے تھے۔ پھر وحی میں یہ وعدہ بھی کیا گیا تھا کہ عنقریب وہ بچہ تمہاری طرف لوٹا دیا جائے گا۔ اس خیال سے پھر دل کو کسی قدر قرار آ جاتا تھا۔ یہ اللہ ہی کی مہربانی تھی کہ اس نے ام موسیٰ کے دل کو قرار بخش دیا اور یہ راز فاش نہ ہوا۔ جبکہ اسے اب یہ یقین ہو گیا کہ بس چند دن تک میرا بچہ مجھے واپس مل جانے والا ہے۔ اگرچہ اس کی کوئی صورت اس کے ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔

[۱۷] سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے دوسرے بہن بھائی اور بہن کا حالات کی خبر رکھنا: ام موسیٰ کے تین بچے تھے۔ سب سے بڑی لڑکی تھی۔ اس کے بعد ہارون علیہ السلام پیدا ہوئے پھر ان کے ایک سال بعد موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔ سیدنا ہارون کی پیدائش تک بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کا حکم نافذ نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا وہ بھی زندہ تھے اور بہن تو ان سے آٹھ دس سال بڑی تھی۔ جب ام موسیٰ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو دریا برد کر چکی اور دل بے قرار ہونے لگا تو ایک احتیاطی تدبیر اس کے ذہن میں آئی کہ شاید اس تدبیر کا کسی وقت فائدہ پہنچ جائے۔ اس نے موسیٰ علیہ السلام کی بہن سے کہا کہ اس دریا کے کنارے کنارے چلی جاؤ۔ اور بچہ کو دیکھتی رہو کہ کہاں جاتا ہے۔ لیکن یہ احتیاط ملحوظ رکھنا کہ اس طریقہ سے چھپتی چھپاتی جانا کہ کسی کو یہ گمان نہ ہو سکے کہ یہ لڑکی اس ٹوکرے کی نگہداشت کر رہی ہے۔ اور اس کی ٹوہ میں لگی ہوئی ہے۔

اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب آلِ فرعون نے یہ تابوت دریا سے نکالا اور اس سے بچہ برآمد ہوا تو اس واقعہ کی خبر سارے شہر میں آناً فاناً پھیل گئی۔ اس وقت ام موسیٰ نے سیدنا موسیٰ کی بہن سے کہا کہ جاؤ اور اس بچہ کا پتہ لگاؤ اور علیحدہ رہ کر دیکھنا کہ کیا ماجرا ہوتا ہے۔ لڑکی ہوشیار تھی وہ اس مقام پر پہنچ گئی جہاں بچہ کے گرد بھیڑ لگی تھی وہاں وہ ایک طرف کھڑے ہو کر اور بے تعلق سی بن کر دور سے دیکھتی رہی اور لوگوں کی باتیں سنتی رہی مگر کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ لڑکی اس بچہ کی بہن ہے۔

[۱۸] سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے لئے انا کی تلاش: جب فرعون اور اس کی بیوی نے یہ طے کر لیا کہ وہ خود اس بچہ کی پرورش کریں گے۔ تو اس کے لئے دودھ پلانے والی انا کی تلاش ہونے لگی۔ مگر جو بھی انا یا دایہ لائی جاتی سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو اس کا دودھ پینے کی کچھ رغبت نہ ہوتی۔

بہن کی انا کے لئے نشاندہی: یہ بھی دراصل مشیتِ الٰہی کا ایک کرشمہ تھا کہ کئی دنوں سے بھوکا بچہ کسی بھی دایہ کا دودھ

وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰۤى اٰتَيْنٰهُ
حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴﴾ وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا

وہ [۱۹] اپنی آنکھ ٹھنڈی کرے اور غمزدہ نہ رہے اور یہ جان لے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ لیکن اکثر لوگ [۲۰] یہ بات نہیں جانتے۔ (۱۳) اور جب موسیٰ اپنی جوانی کو پہنچے اور پورے توانا ہو گئے تو ہم نے انہیں قوت فیصلہ [۲۱] اور علم عطا کیا اور ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں۔ (۱۴) اور موسیٰ شہر میں اس وقت [۲۲] داخل ہوئے جب

پینے سے انکار کر دیتا تھا۔ فرعون کے گھر والوں کو سخت تشویش لاحق ہوئی کہ اس کی تربیت کا معاملہ ایک بڑا مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ لوگ اس تلاش و تجسس میں تھے کہ موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے مشورہ کے طور پر ان سے کہا کہ میں تم کو ایک گھرانے کا پتا بتائے دیتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ اس بچہ کو پال دیں گے۔ شریف گھرانہ ہے۔ غور و فکر سے اس بچے کی تربیت بھی کریں گے۔ چنانچہ لڑکی کے مشورہ کے مطابق امِ موسیٰ کو طلب کیا گیا جونہی امِ موسیٰ نے بچہ اپنی چھاتی سے لگایا تو بچہ نے دودھ پینا شروع کر دیا۔ اس طرح آلِ فرعون کی ایک بہت بڑی پریشانی دور ہو گئی۔

[۱۹] سیدنا موسیٰ کی اپنی ماں کے پاس واپسی:۔ ام موسیٰ کو وہاں محل میں رہ کر بچہ کی پرورش کے لئے کہا گیا تو اس نے یہ عذر پیش کر دیا کہ گھر کی دیکھ بھال بھی اس کے ذمہ ہے۔ لہٰذا یہ یہاں رہ کر یہ خدمت سرانجام نہیں دے سکتی۔ البتہ یہ کر سکتی ہوں کہ اس بچے کو اپنے ہمراہ لے جاؤں اور اس کی پرورش کروں۔ چنانچہ آلِ فرعون نے ام موسیٰ کا یہ عذر قبول کر لیا وہ بچہ کو اپنے گھر لے آئی۔ اس طرح سیدنا موسیٰ علیہ السلام صرف آغوش مادری میں ہی نہ پہنچے بلکہ اپنے گھر میں ہی واپس آ گئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ام موسیٰ سے جو وعدہ کیا تھا۔ وہ بھی پورا ہوا اور شاہی خزانہ سے جو ماں کو معاوضہ ملتا رہا وہ اللہ تعالیٰ کا زائد انعام تھا۔

[۲۰] آپ کی ذات پر دیندارانہ ماحول کا اثر:۔ یعنی اللہ کے کئے ہوئے وعدے بہرحال پورے ہو کے رہتے ہیں۔ خواہ ان کے امکانات بالکل معدوم نظر آ رہے ہوں۔ یا یہ کہ اکثر لوگ یہ بات نہیں جانتے کہ ظاہری اسباب کے علاوہ کچھ باطنی اسباب بھی ہوتے ہیں جو مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہوتے ہیں اور اکثر لوگ یہ نہیں جان سکتے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے کون کون سے راستے اور کون کون سے مراحل طے کرتے ہوئے پورے ہوتے ہیں۔

[۲۱] فرعون کے ہاں جدید علوم اور اصول جہانبانی کی تعلیم:۔ بچپن میں آپ کو خالص دیندارانہ ماحول میسر آ گیا۔ لہٰذا آپ سیدنا یعقوب علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کی تعلیم سے واقف ہو گئے۔ آپ کے والدین کا گھرانہ ایک شریف اور دیندار گھرانہ تھا اور بچہ جو عادات و خصائل اس عمر میں سیکھتا ہے وہی تمام زندگی اس میں نمایاں رہتی ہیں۔ اس کے بعد آپ شاہی خاندان کے فرد بنے تو مصر میں متداول جدید علوم سے بہرہ ور ہوئے اور اصول جہانبانی اور حکمرانی بھی از خود اخذ کرتے رہے کیونکہ آپ میں خداداد ذہانت موجود تھی۔ اس مقام پر حکمت اور علم سے مراد نبوت نہیں کیونکہ نبوت تو آپ کو بہت مدت بعد عطا ہوئی تھی۔

[۲۲] اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہی محلات شہر یا عام لوگوں کی رہائشی آبادی سے کچھ دور تھے۔ جیسا کہ عام دستور ہے کہ بڑے بڑے لوگ عام آدمیوں میں گھل مل کر رہنا پسند نہیں کرتے بلکہ شہر سے باہر کھلی فضا میں اپنی رہائش گاہیں، بنگلے،

فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ هٰذَا مِنْ شِيعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِي مِنْ
شِيعَتِهٖ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهٖ فَوَكَزَهٗ مُوسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ
عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِينٌ ﴿۱۵﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي فَغَفَرَ لَهٗ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿۱۶﴾

اہل شہر غفلت [۲۳] میں تھے۔ وہاں موسیٰ نے دو آدمیوں [۲۴] کو آپس میں لڑتے ہوئے دیکھا۔ ان میں ایک تو موسیٰ کی اپنی قوم سے تھا اور دوسرا دشمن کی قوم سے۔ جو موسیٰ کی اپنی قوم سے تھا۔ اس نے موسیٰ سے اس کے خلاف فریاد کی جو دشمن کی قوم سے تھا۔ موسیٰ نے اسے مکا مارا تو اس کا کام ہی تمام کر دیا۔ موسیٰ نے کہا: یہ تو ایک شیطانی حرکت ہے۔ [۲۵] بلاشبہ شیطان صریح بہکانے والا دشمن ہے۔(۱۵)

پھر دعا کی: ”پروردگار! بلاشبہ میں نے اپنے آپ پر [۲۶] ظلم کیا ہے۔ لہٰذا مجھے معاف فرما دے۔ چنانچہ اللہ نے اسے معاف کر دیا۔ بلاشبہ وہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔(۱۶)

کوٹھیاں اور محل بنواتے ہیں۔

[۲۳] یعنی جب لوگ سو رہے تھے اور راستے اور سڑکیں سنسان اور بے آباد معلوم ہوتی تھیں۔ ایسا وقت عموماً علی الصبح ہوا کرتا ہے سورج کے طلوع ہونے سے بہت پہلے یا گرمیوں میں دوپہر کے بعد جب اکثر لوگ آرام کر رہے ہوتے ہیں۔

[۲۴] ۞ ایک قبطی اور سبطی کی لڑائی اور موسیٰ علیہ السلام کا قبطی کو مکا مارنا اور اس کا کام تمام ہونا:۔ موسیٰ علیہ السلام جب ایسے شہر میں داخل ہوئے تو دیکھا دو آدمی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ان میں ایک قبطی ہے یعنی مصر کا قدیمی باشندہ یا حکمران جماعت سے تعلق رکھنے والا ہے اور دوسرا سبطی یا بنی اسرائیل سے تعلق رکھنے والا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام بچپن ہی میں دیکھ رہے تھے کہ بنی اسرائیل پر حکومت وقت کیا کیا مظالم ڈھا رہی ہے۔ اور انہیں کیسے معاشرہ میں ذلیل و رسوا بنا کر رکھا جا رہا ہے۔ ان لڑنے والوں میں سے سبطی نے آپ کو مدد کے لئے پکارا کہ میں اسے قبطی کے ظلم سے چھڑاؤں۔ یہ قبطی شاہی باورچی خانے کا نوکر تھا۔ جو سبطی سے بیگار یہ لینا چاہ رہا تھا کہ ایندھن کا گٹھا بلا معاوضہ باورچی خانہ تک چھوڑ کر آؤ۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے دل میں قبطیوں کے خلاف نفرت تو پہلے سے موجود تھی۔ سبطی کی فریاد پر وہاں پہنچے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ زیادتی قبطی ہی کر رہا ہے تو رگ حمیت جوش میں آ گئی اور اسے ایک گھونسا رسید کیا۔ آپ ماشاءاللہ بڑے طاقتور جوان تھے۔ گھونسے کا لگنا تھا کہ قبطی کا کام تمام ہو گیا۔

[۲۵] سیدنا موسیٰ سے اس طرح ایک قبطی کا قتل ہو جانا دراصل ایک بڑے فتنہ کا سبب بن سکتا تھا۔ اب یہ اتفاق کی بات ہے کہ آس پاس کوئی گواہ موجود نہ تھا۔ اور یہ بات صیغہ راز میں ہی رہ گئی کہ اس قبطی کا قاتل کون ہے اور اگر پتا چل بھی جاتا تو بنی اسرائیل پر ان کی زندگی اور بھی اجیرن بنا دی جاتی۔ موسیٰ علیہ السلام کو جب قتل کے اس انجام کا خیال آیا تو فوراً پکار اٹھے کہ یہ کام مجھ سے شیطان نے کروایا ہے۔ وہ تو چاہتا ہی یہ ہے کہ ایسے فتنے کھڑے ہوتے رہیں۔

[۲۶] ۞ قتل خطا پر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی دعائے مغفرت:۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مقتول کوئی بڈھا اور کمزور سا انسان ہو گا اور پہلے ہی مرنے کے قریب ہو گا۔ اور پرسے موسیٰ علیہ السلام جیسے طاقتور انسان کے ایک ہی مکا سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ ورنہ عام

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ فَلَنۡ اَكُوۡنَ ظَهِیۡرًا لِّلۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۱۷﴾ فَاَصۡبَحَ فِی الۡمَدِیۡنَةِ خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِی اسۡتَنۡصَرَهٗ بِالۡاَمۡسِ یَسۡتَصۡرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوۡسٰۤی اِنَّكَ لَغَوِیٌّ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۸﴾

پھر یہ عہد کیا کہ : "پروردگار! تو نے جو مجھ پر [۲۷] انعام کیا ہے تو میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا (۱۷) پھر دوسرے دن وہ صبح سویرے، ڈرتے ڈرتے اور ہر طرف سے خطرے کو بھانپتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہی شخص جس نے کل ان سے مدد مانگی تھی (آج پھر) ان سے فریاد طلب کر رہا ہے۔ موسیٰ نے جواب دیا: تو تو صریح [۲۸] گمراہ شخص ہے۔(۱۸)

حالات میں کسی طاقتور کے مکاسے بھی کم از کم موت واقع نہیں ہوتی۔ اور سبطی سے تو وہ اس شہ پر لڑ رہا تھا کہ وہ حکمران قوم کا فرد تھا۔ اب موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں جو اس کی موت واقع ہو گئی تو یہ بہر حال قتل کا جرم تو تھا اگرچہ نادانستہ طور پر ایسا ہوا تھا اس قتل خطا کے جرم کی موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ جرم معاف فرما دیا۔

اس آیت میں غَفَرَ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور غفر کا معنی معاف کرنا بھی ہے اور ڈھانپنا، چھپانا اور پردہ پوشی کرنا بھی اور مِغْفَرٌ اس خود کو کہتے ہیں جو سپاہی دوران جنگ سر پر رکھ لیتے ہیں۔ اور ان معنوں میں بھی اس لفظ کا استعمال عام ہے۔ اس لحاظ سے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا مطلب یہ ہو گا کہ یا اللہ! میرے اس جرم یا میری خطا پر پردہ ڈال دے تاکہ کسی کو اس کی خبر نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ یہی بات فرقہ وارانہ اشتعال کا باعث بن کر بنی اسرائیل پر کسی عظیم فتنہ کا پیش خیمہ بن جائے۔ اور بہتر یہی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا کو دونوں معنوں پر محمول کیا جائے۔ چنانچہ واقعتاً اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی اس خطا پر پردہ ڈال دیا اور سوائے اس اسرائیلی کے جس کی آپ نے مدد کی تھی اور علاوہ چند ایک آدمیوں کے کسی کو بھی اس واقعہ کی خبر نہ ہو سکی۔

[۲۷] موسیٰ علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کا انعام یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی خطا پر پردہ ڈال دیا۔ کہ حکومتی اہلکاروں میں سے کسی کو بھی یہ پتا نہ چل سکا۔ کہ اس مقتول قبطی کا قاتل کون ہے؟ اللہ تعالیٰ کے اس انعام کے شکریہ کے طور پر موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا کہ آئندہ وہ کسی مجرم کی حمایت یا مدد نہیں کریں گے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے پہلے کون سے مجرم کی حمایت کی تھی جو اب اللہ سے ایسا عہد کر رہے ہیں۔ اس کا جواب بعض لوگوں نے یہ دیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی اس سے مراد وہ سبطی تھا جو آپ سے یہ جرم کروانے کا باعث بنا تھا۔ ممکن ہے اس کا بھی کچھ قصور ہو۔ لیکن آپ نے بلا تحقیق اس سبطی کی حمایت میں قبطی کو گھونسا رسید کر دیا جس سے (اتفاقاً) قبطی کی موت واقع ہو گئی۔ لیکن ہمارے خیال میں اس کی وہی توجیہ درست ہے جسے اکثر مفسرین نے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے یہ عہد کیا تھا کہ آئندہ وہ اس مجرم اور کافرانہ حکومت کی امداد و اعانت سے مکمل طور پر دستبردار ہو جائیں گے۔ اور یہی وہ عہد تھا جسے انہوں نے بعد میں ساری عمر نبھایا تھا۔ یعنی اس واقعہ کے بعد انہوں نے شاہی خاندان کا فرد رہنے سے بیزاری کا اعلان کر دیا تھا۔

[۲۸] موسیٰ علیہ السلام دوسرے دن ڈرتے ڈرتے پھر شہر میں داخل ہوئے۔ آپ دراصل اس ٹوہ میں تھے کہ کسی کو کل کے واقعہ کی خبر تو نہیں ہو گئی۔ اسی خطرہ کے تحت آپ پوری طرح چوکنے ہو کر شہر کی طرف آئے تھے کہ اگر کسی کو خبر ہو گئی تو میں

فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا
قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ڰ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ
مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ ۞ ۱۹ وَجَاۗءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ۡ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ
يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ۞ ۲۰ فَخَرَجَ مِنْهَا خَاۗىِٕفًا يَّتَرَقَّبُ ۡ قَالَ

پھر جب موسیٰ نے ارادہ کیا کہ اس شخص کو پکڑ لیں جو ان لوگوں کا دشمن تھا تو وہ پکار اٹھا: ''موسیٰ! کیا تم مجھے بھی مار ڈالنا چاہتے ہو۔ جیسے کل تم نے ایک آدمی کو [۲۹] مار ڈالا تھا؟ تم تو ملک میں جبار بن کر رہنا چاہتے ہو۔ اصلاح نہیں کرنا چاہتے۔(۱۹) اور (اس واقعہ کے بعد) ایک شخص شہر کے پرلے کنارے سے دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا: ''موسیٰ! اہل دربار تیرے متعلق [۳۰] مشورہ کر رہے ہیں کہ تمہیں قتل کر ڈالیں لہٰذا یہاں سے نکل جاؤ۔ میں یقیناً تمہارا خیر خواہ ہوں'' (۲۰) چنانچہ (موسیٰ) ڈرتے ڈرتے اور ہر طرف سے خطرہ کو بھانپتے ہوئے نکلے اور دعا کی: پروردگار! مجھے

گرفتار ہی نہ کر لیا جاؤں۔ شہر میں داخل ہو کر آپ نے یہ منظر دیکھا کہ جس سبطی کی حمایت میں آپ نے پہلے دن ایک قبطی کا خون کر ڈالا تھا۔ وہی سبطی آج پھر ایک قبطی سے الجھ رہا ہے۔ اس نے آج پھر موسیٰ علیہ السلام کو اپنی مدد کے لئے پکارا۔ موسیٰ علیہ السلام کو کل کے واقعہ پر بہت رنج تھا۔ فوراً سبطی سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ تم تو کوئی بہکے ہوئے آدمی معلوم ہوتے ہو جو ہر روز کسی نہ کسی سے الجھتے رہتے ہو۔

[۲۹] قبطی کے قاتل کا راز فاش ہونا:۔ سبطی کو اس طرح ملامت کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ قبطی کو پکڑ کر اس سبطی کو اس سے نجات دلائیں۔ مگر سبطی یہ سمجھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے چونکہ آج مجھے ہی ملامت کی ہے۔ لہٰذا مجھی پر ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا وہ فوراً ہی اٹھا اور کہنے لگا کہ موسیٰ کیا تم مجھے اسی طرح موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے ہو جس طرح کل تم نے ایک آدمی کو مار ڈالا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان جھگڑے کی صورت میں کسی نہ کسی کو مار ڈالنا ہی جانتے ہو۔ ان کا مقدمہ سن کر ان میں صلح یا سمجھوتہ کرانا نہیں جانتے۔

قبطی نے جب سبطی کے منہ سے یہ بات سنی تو اس نے لڑائی جھگڑا تو وہیں چھوڑا اور ایک دم بھاگ کر فرعون اور اس کے اہلکاروں کو یہ اطلاع دے دی کہ کل جو قبطی قتل ہوا ہے اس کا قاتل موسیٰ ہے۔ گویا جس راز پر اللہ نے پردہ ڈال رکھا ہے۔ اسے اسی احمق سبطی نے فاش کر ڈالا جس کی حمایت میں آپ نے قبطی کو مارا تھا۔ جب فرعون کے اہلکاروں کو قتل کے مجرم کا پتا چل گیا تو موسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کا حکم صادر ہو گیا۔

[۳۰] سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو قتل کے مشورہ کی اطلاع ملنا اور مدین کی طرف روانگی:۔ فرعون کے درباریوں کو اب اس امر میں کچھ شبہ نہ رہا تھا کہ موسیٰ شاہی خاندان کا فرد ہونے کے باوجود بنی اسرائیل کا ساتھ دیتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے باہمی مشورے کے بعد یہی طے کیا کہ موسیٰ کو قتل کر دیا جائے۔ درباریوں میں سے ہی ایک آدمی سیدنا موسیٰ کا دل سے خیر خواہ تھا۔ وہ فوراً وہاں سے اٹھا اور دوڑتا ہوا موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچا اور کہا: جتنی جلدی ہو سکے اس شہر سے نکل جاؤ کیونکہ تمہارے قتل کے

رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِينَ ﴿۲۱﴾ وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ
السَّبِيْلِ ﴿۲۲﴾ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۥ وَوَجَدَ مِنْ
دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۖ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٚ وَاَبُوْنَا
شَيْخٌ كَبِيْرٌ ﴿۲۳﴾ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴿۲۴﴾

ع ۲ / ۵

ان ظالم لوگوں سے بچالے"(۲۱) پھر جب انہوں نے [۳۱] مدین کی طرف رخ کیا تو کہنے لگے امید ہے میرا پروردگار مجھے ٹھیک راستے میں ڈال دے گا(۲۲) پھر جب وہ مدین کے کنویں پر پہنچے تو دیکھا کہ بہت سے لوگ (اپنے جانوروں کو) پانی پلا رہے ہیں اور ان سے ہٹ کر ایک طرف دو عورتیں (اپنی بکریوں کو) روکے ہوئے کھڑی ہیں۔ موسیٰ نے ان سے پوچھا تمہارا کیا معاملہ ہے؟ وہ کہنے لگیں: "ہم اس وقت پانی پلا نہیں سکتیں [۳۲] جب تک یہ چرواہے پانی پلا کر واپس نہ چلے جائیں اور ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے"(۲۳)

چنانچہ موسیٰ نے ان عورتوں کی بکریوں کو پانی پلا دیا۔ پھر ایک سائے دار جگہ پر جا [۳۳] بیٹھے اور کہا: "میرے پروردگار! جو بھلائی بھی تو مجھ پر نازل کرے، میں اس کا محتاج ہوں۔"(۲۴)

مشورے ہو رہے ہیں اور میں صرف اس خیال سے بھاگ کر یہاں پہنچا ہوں کہ تمہیں بروقت صحیح صورتِ حال سے مطلع کر دوں۔ لہٰذا دیر نہ کرو اور فوراً یہاں سے کہیں دور چلے جاؤ۔

[۳۱] مدین یہاں سے آٹھ دن کی مسافت پر تھا اور فرعون کی حدودِ سلطنت سے باہر تھا۔ آپ نے اس مخلص ساتھی سے یہ اطلاع پاتے ہی مدین کا رخ کیا اور بچتے بچاتے خوب چوکنے ہو کر وہاں سے نکل کھڑے ہوئے اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ! مجھے ان ظالموں کی دستبرد سے بچالے اور ایسی راہ پر ڈال دے جو سیدھا مدین کو جاتا ہو اور میں ان ظالموں سے بچ کر وہاں پہنچ سکوں۔

[۳۲] ۞ مدین کے کنوئیں پر لوگوں کا ہجوم:۔ آٹھ دن کی مسافت طے کرنے کے بعد آپ علیہ السلام مدین کے کنوئیں پر پہنچ گئے۔ وہاں دیکھا کہ جانوروں کو پانی پلانے کے لئے کافی لوگ جمع ہیں۔ ایک بھاری سے ڈول سے دو مضبوط طاقتور آدمی بمشکل پانی نکالتے ہیں اور اپنے جانوروں کو پانی پلانے کے بعد وہ چلے جاتے ہیں تو دوسرے آدمی آکر کنوئیں سے پانی نکالنے لگتے ہیں اور ایک بھیڑ سی لگی ہوئی ہے اور ایک طرف دو لڑکیاں کھڑی ہیں جو اپنی بکریوں کو روک رہی ہیں۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس گئے اور پوچھا تم اس حال میں کیوں کھڑی ہو؟ انہوں نے کہا: ہم اس انتظار میں ہیں کہ یہ چرواہے اپنے جانوروں کو پانی پلا کر چلے جائیں تو بعد میں ہم پلالیں گی۔ ہم ہی ان بکریوں کو چرانے کے لئے لے جاتی ہیں۔ کیونکہ ہمارا باپ بہت بوڑھا اور کمزور ہے۔ وہاں آنے کے قابل نہیں۔ نہ وہ پانی نکال سکتا ہے نہ ہم اتنا بھاری ڈول نکال سکتی ہیں۔ چرواہے چلے جائیں تو ان کا بچا کھچا پانی ہم پلالیں گی۔ یا بعد میں ڈول میں تھوڑا تھوڑا پانی نکال کر انہیں پلالیں گی۔

[۳۳] ۞ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا شعیب علیہ السلام کی بکریوں کو پانی پلانا:۔ موسیٰ علیہ السلام ان لڑکیوں کی بات سن کر آگے بڑھے۔ طاقتور نوجوان تھے۔ اکیلے ہی پانی کا بھاری بھرکم ڈول نکالا اور ان کی بکریوں کو پانی پلا دیا۔ لڑکیاں اپنے جانور لے کر چلی گئیں تو

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ؗ قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ؕ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ٚ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا

اتنے میں ان دونوں عورتوں میں سے ایک عورت شرم سے لجاتی ہوئی ان کے پاس آئی اور کہنے لگی: ''آپ نے ہماری بکریوں کو جو پانی پلایا ہے تو میرا باپ آپ کو بلاتا ہے تاکہ آپ کو اس کا صلہ دے''[۳۴] پھر جب موسیٰ اس شخص (شعیب علیہ السلام) کے پاس آئے اور انہیں اپنا سارا[۳۵] حال سنایا تو اس نے کہا: ''ڈرو نہیں۔ تم نے ان ظالموں سے نجات پالی'' (۲۵) ان میں سے ایک بولی،

آپ ایک درخت کے سایہ تلے جا کر بیٹھ گئے۔ آٹھ دن کے تھکے ماندے اور بھوک سے بے تاب ہو رہے تھے۔ اللہ سے کھانا مانگا تو ایسا ادب و احترام کا انداز اختیار کیا جس سے پیغمبرانہ شان خُوب نمایاں ہو جاتی ہے۔ فرمایا اس وقت تیری طرف سے جو بھی مجھے بھلائی پہنچے میں اس کا محتاج ہوں۔

[۳۴] سیدنا شعیب علیہ السلام کا موسیٰ کو اپنے پاس بلانا:۔ یہ عورتیں دل ہی دل میں ان کی احسان مند تھیں کہ ایک اجنبی شخص نے ان سے کیسی بھلائی کی ہے۔ واپس جاتے ہوئے مڑ کر جو دیکھا تو موسیٰ علیہ السلام ایک درخت کے سایہ میں آبیٹھے تھے۔ اس سے انہوں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ کوئی مسافر ہے۔ جس کے رہنے کے لئے یہاں کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو ابھی سایہ میں بیٹھے اور اللہ سے دعا کئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی، کہ ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک لڑکی لجاتی شرماتی منہ چھپائے اور گھونگٹ لٹکائے آپ کے پاس آکر کہنے لگی کہ میرا والد آپ کو بلا رہا ہے۔ آپ نے ہماری بکریوں کو پانی پلا کر ہم پر جو احسان فرمایا ہے وہ آپ کو اس کا کچھ بدلہ دینا چاہتا ہے۔ گویا اللہ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی دعا کو بہت جلد شرف قبولیت بخشا اور جس خیر کو طلب کر رہے تھے اللہ نے غیر متوقع طور پر اس خیر کا فوراً سامان کر دیا۔

موسیٰ علیہ السلام فوراً اس لڑکی کے ساتھ ہو لئے۔ اسی بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ بھوک سے کس قدر بے تاب تھے۔ پھر وہ اس جگہ ٹھکانا بھی چاہتے تھے اور اپنا کوئی مونس غم خوار بھی انہیں درکار تھا۔ ورنہ ایک شریف آدمی نے اگر عورت ذات کو پریشانی میں مبتلا دیکھ کر اس کی کوئی مدد کر دی ہو تو سیدنا موسیٰ علیہ السلام جیسے عالی ظرف انسان کے لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کام کا بدلہ دینے کے لئے کہا جائے تو وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوں۔ آپ نے بھی اس لڑکی سے کہا کہ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں مگر میں آگے آگے چلوں گا تم میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ البتہ مجھے راستہ کی رہنمائی کرتے جانا اور یہ آپ نے اس لئے کہا کہ اجنبی عورت پر عمداً نظر پڑنے کی نوبت نہ آئے۔ چنانچہ وہ پیچھے پیچھے راستہ بتاتی انہیں لے کر اپنے گھر پہنچ گئی۔

[۳۵] مدین میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے قیام کا بندوبست:۔ گھر پہنچ کر موسیٰ علیہ السلام نے لڑکیوں کے باپ کو اپنی زندگی کے مختصر حالات، قتل اور وہاں سے فرار ہونے کا واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ سنا دیا۔ اگرچہ لڑکیوں کے باپ کے متعلق یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا وہ شعیب علیہ السلام تھے یا کوئی اور بزرگ تھے۔ لیکن اکثر مفسرین نے اسی قول کو ترجیح دی ہے کہ وہ شعیب علیہ السلام تھے۔ بہر حال جو بزرگ بھی وہ تھے، نیک اور دیندار تھے وہ دین ابراہیمی کے پیرو تھے۔ ان میں اور موسیٰ علیہ السلام کے

يَٰٓأَبَتِ ٱسۡتَـٔۡجِرۡهُۖ إِنَّ خَيۡرَ مَنِ ٱسۡتَـٔۡجَرۡتَ ٱلۡقَوِيُّ ٱلۡأَمِينُ ﴿٢٦﴾ قَالَ إِنِّيٓ أُرِيدُ أَنۡ أُنكِحَكَ

''اباجان! اسے اپنا نوکر رکھ لیجئے۔ بہترین آدمی جسے آپ نوکر رکھنا چاہیں وہی ہو سکتا ہے جو طاقتور اور امین ہو۔[۳۶]'' (۲۶) شعیب نے کہا: ''(موسیٰ!) میں چاہتا ہوں کہ اپنی[۳۷] دونوں بیٹیوں میں سے ایک کا تجھ سے اس

عقائد و خیالات اور کردار میں پوری ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کے حالات سن کر انہوں نے تسلی دی کہ اب گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آپ اس ظالم قوم کی حکومت کی حدود سے باہر آچکے ہیں اور اب آپ میرے ہاں قیام فرمایئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے وقتی طور پر موسیٰ علیہ السلام کے قیام و طعام کا مسئلہ حل فرمادیا۔

[۳۶] ❁ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو ملازم رکھنے کی سفارش:۔ سیدنا شعیب علیہ السلام کا کوئی لڑکا نہ تھا۔ بس دو لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں جنہیں اندر اور باہر دونوں طرف کے کام کرنا پڑتے تھے۔ لہٰذا شعیب علیہ السلام پہلے اس جستجو میں تھے کہ کوئی شریف آدمی مل جائے تو اسے ملازم رکھ لیا جائے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے چند روزہ قیام میں ہی گھر کے سب افراد نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ رائے قائم کرکے اس پر اتفاق کرلیا کہ اگر یہی پردیسی نوجوان ہمارے ہاں رہنا قبول کرلے تو یہ بہت مناسب رہے گا۔ چنانچہ ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک لڑکی نے اپنے باپ سے کہا کہ اگر آپ کوئی آدمی ملازم رکھنا ہی چاہتے ہیں تو شاید اس سے بہتر آپ کو کوئی آدمی نہ مل سکے۔ کیونکہ یہ شخص نوجوان ہے اور طاقتور ہے۔ ہلکے اور بھاری سب کام کرسکتا ہے۔ دوسرے یہ امین بھی ہے۔ اور یہ باتیں اس لڑکی نے اپنے مشاہدہ کی بنا پر کہی تھیں۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اکیلے وہ ڈول کنوئیں سے کھینچ لیا تھا جسے دو آدمی بمشکل کھینچتے تھے۔ پھر وہ لڑکی جب انہیں گھر لانے کے لئے گئی تھی تو اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کس قدر باحیا، دیانت دار، خداترس اور امین آدمی ہے۔

❁ ملازمت کی ضروری شرائط:۔ ضمناً اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ملازمت کے لئے دو باتوں کو دیکھنا ضروری ہے ایک یہ کہ جس کام کے لئے کوئی شخص ملازم رکھا جارہا ہے۔ وہ اس کی اہلیت بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ بالفاظ دیگر اس کام کا اسے پہلے سے کچھ علم اور تجربہ ہے؟ اور اگر کوئی محنت والا کام ہے تو کیا اس کی جسمانی حالت اور قوت اتنی ہے کہ وہ اس کام کو بجالا سکے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ دیانتدار اور امین ہو۔ اور یہ دیانت و امانت دین سے بیزار اور خدا فراموش آدمیوں میں کبھی پیدا نہیں ہوسکتی۔

❁ ان شرائط کو نظرانداز کرنے کے مفاسد:۔ اب تعجب کی بات یہ ہے کہ جب کسی شخص نے کوئی نجی یا گھریلو ملازم رکھنا ہو تو وہ ان دونوں باتوں کو ملحوظ رکھتا ہے جبکہ سرکاری ملازمتوں کے وقت صرف شرط اول یعنی اہلیت کو تو ملحوظ رکھا جاتا ہے اور دوسری شرط کو یکسر نظرانداز کردیا جاتا ہے۔ اور غالباً اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ملازم رکھنے والے افسروں میں بھی یہ دوسری شرط مفقود ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رشوت عام ہوجاتی ہے۔ جس کا تعلق ملازمین سے ہی ہوتا ہے۔ لوگوں کے حقوق غصب اور تلف ہوتے ہیں۔ ظالمانہ قسم کی حکومت قائم ہوجاتی ہے اور عوام کے لئے اتنی شکایات اور مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن کا حل ناممکن ہوجاتا ہے۔ اور اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہوتی ہے کہ شرائط ملازمت میں سے دوسری شرط دیانت و امانت کو درخور اعتناء سمجھا ہی نہیں جاتا۔

[۳۷] ❁ لڑکی سے نکاح کی شرط:۔ باپ نے بھی لڑکیوں کی اس رائے سے اتفاق کرلیا۔ مگر اب مشکل یہ تھی کہ گھر میں اتنی

اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰٓى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ

اَشُقَّ عَلَيْكَ ۭ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٢٧﴾ قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ۭ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ

قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿٢٨﴾ فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ ع

شرط پر نکاح کر دوں کہ تم میرے ہاں آٹھ برس ملازمت کرو۔ اور اگر دس سال پورے کر دو تو تمہاری مہربانی۔ میں اس معاملہ میں تم پر سختی نہیں کرنا چاہتا۔ ان شاء اللہ ! تم مجھے ایک خوش معاملہ آدمی پاؤ گے"(۲۷) (موسیٰ نے) جواب دیا: یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہو گئی۔ جونسی مدت بھی میں پوری کروں مجھ پر کچھ دباؤ نہ ہو گا۔ اور جو کچھ ہم قول و قرار کر رہے ہیں اس پر اللہ نگہبان ہے۔(۲۸) پھر جب موسیٰ نے وہ مدت پوری کر لی اور اپنے اہل خانہ [۳۸]

آسودگی تو تھی نہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو کچھ ماہوار تنخواہ پر ملازم رکھا جاسکتا۔ اور اس سے بھی بڑی مشکل یہ تھی کہ گھر میں ایک نوجوان کو کیسے ملازم رکھا جاسکتا ہے جبکہ گھر میں دو نوجوان لڑکیاں بھی موجود ہوں۔ لڑکیوں سے باہمی مشورہ کے بعد ایک دن موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ میں ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک کا نکاح آپ سے کر دوں اور آپ نکاح کے بعد میرے ہی پاس رہ کر گھر کا سارا کام کاج سنبھال لیں۔ اور نکاح کے بعد کم از کم آٹھ سال تو ضرور میرے پاس رہیں۔ اور اگر یہ مدت آٹھ سال سے بڑھا کر دس سال کر دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔ میری طرف سے اس زائد مدت کے لئے پابندی نہ ہوگی۔ اور میں ان شاء اللہ اس معاملہ کو نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کی کوشش کروں گا اور کوئی سخت خدمت تم سے نہ لوں گا۔ اور نہ کسی طرح کی سختی تم مجھ میں دیکھو گے۔

۞ آیا آٹھ سال کی خدمت بطور حق مہر تھی؟ اس مقام پر بعض لوگوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ آیا ایک باپ اپنی لڑکی کے حق مہر کے عوض خود معاوضہ لے سکتا ہے یا نہیں؟ ہمارے خیال میں یہ سوال خلط مبحث ہے۔ یہاں معاملہ ایک نہیں بلکہ دو ہیں۔ ایک نکاح کا معاملہ۔ دوسرے نکاح کے بعد گھر کا کام سنبھالنے کا معاملہ۔ یعنی شعیب علیہ السلام نے شرط صرف یہ لگائی تھی کہ نکاح کے بعد تم اپنی بیوی کو لے کر چلتے نہیں بنو گے۔ بلکہ تم کم از کم آٹھ سال میرے ہاں ہی قیام پذیر رہو گے۔ اس وقت یہ گھر جیسے میرا ہے ویسے ہی تمہارا بھی ہو گا۔ یہ سوال صرف اس صورت میں اٹھایا جاسکتا تھا جب آٹھ یا دس سال کی مدت گزرنے کے بعد شعیب علیہ السلام اپنی لڑکی کا نکاح موسیٰ علیہ السلام سے کرتے۔ آپ کی مجبوری ہی یہ تھی کہ لڑکیوں والے گھر میں ایک اجنبی آدمی کیسے رہ سکتا ہے۔ لہٰذا جلد از جلد اس کا نکاح کر کے اسے گھر میں رکھا جاسکے۔ رہا نکاح کے مہر کے مسئلہ تو وہ تھوڑے سے تھوڑا بھی ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ لوہے کی ایک انگوٹھی بھی اور اتنا حق مہر ایک پردیسی بھی ادا کر سکتا ہے۔

[۳۸] ۞ موسیٰ کی دعا کی قبولیت اور جملہ مسائل کا حل:۔ یہ تھی وہ بھلائی جو موسیٰ علیہ السلام کی دعا پر اللہ تعالیٰ نے فوراً نہیں مہیا فرمادی۔ آپ مفرور مجرم کی حیثیت سے آئے تھے اور ایک طویل عرصہ کے لئے کسی جگہ قیام چاہتے تھے۔ وہ اللہ نے مہیا فرما دیا۔ آپ جوان تھے آپ کو نکاح کی ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے وہ مسئلہ بھی حل فرما دیا۔ پھر آپ کو ذریعہ معاش کی بھی ضرورت تھی۔ یہ مسئلہ بھی از خود حل ہو گیا۔ گویا چند ہی دن میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے جملہ مسائل اس طرح حل فرما دیئے جس کا آپ کو وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جب شعیب علیہ السلام نے آپ کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا تو بمصداق

بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا

بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ

الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰۤی اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۳۰﴾ وَاَنْ اَلْقِ

کو لے کر چلے تو طور (پہاڑ) کے ایک طرف انہیں آگ نظر آئی، انہوں نے اپنے اہل خانہ سے کہا تم یہاں ٹھہرو میں نے ایک آگ سی دیکھی ہے۔ شاید میں وہاں سے تمہارے لیے کچھ (راستہ کی) خبر یا آگ کا کوئی انگارا ہی[۳۹] اٹھا لاؤں تاکہ تم تاپ سکو(۲۹) پھر جب موسیٰ وہاں پہنچے تو وادی کے دائیں کنارے مبارک خطہ کے ایک درخت سے آواز آئی کہ: "اے موسیٰ! میں ہی اللہ ہوں[۴۰] سارے جہانوں کا پروردگار۔(۳۰) اور (اللہ نے حکم دیا) کہ اپنی

"اندھے کو کیا چاہئے دو آنکھیں" موسیٰ علیہ السلام نے شعیب علیہ السلام کی اس پیش کش کو فوراً قبول کر لیا۔ اور ساتھ ہی یہ وضاحت بھی فرمادی کہ میں یہاں آپ کے پاس آٹھ سال رہوں یا دس سال یہ بات میری مرضی پر ہو گی۔ آپ مجھے اس زائد مدت کے لئے مجبور نہیں کریں گے۔ اور ہمارے اس زبانی قول و اقرار پر اللہ کی گواہی ہی کافی ہے۔

[۳۹] ❁ **دس سال بعد اپنے وطن کو روانگی:۔** اس معاہدہ کے بعد سیدنا شعیب علیہ السلام نے اپنی بیٹی کا سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے نکاح کر دیا۔ اور آپ وہاں متاہل زندگی گزارنے لگے۔ کہتے ہیں کہ جس لڑکی سے آپ کا نکاح ہوا اس کا نام صفورہ تھا۔ آپ نکاح کے بعد یہاں آٹھ کے بجائے دس سال ہی قیام پذیر رہے۔ پھر اپنے آبائی وطن مصر کی طرف جانے کے ارادہ سے اپنے اہل و عیال سمیت مدین سے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک تو آپ کو اپنے والدین اور بہن بھائی سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ دوسرے آپ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ ممکن ہے لوگ اب تک واقعہ قتل کو بھول چکے ہوں، اس لئے اپنے ہی وطن جانا مناسب سمجھا۔

❁ **سیدنا موسیٰ کا راہ بھولنا:۔** راستہ میں جب آپ طورِ سینا کے دامن میں پہنچے تو اندھیری رات کی وجہ سے راستہ بھول گئے۔ سردی کا موسم اور شدید ٹھنڈی رات اور بال بچے ساتھ تھے۔ سخت پریشان ہو گئے۔ ایسے حال میں کوئی راہ بتانے والا بھی نہیں مل رہا تھا۔ آخر دور سے انہیں ایک آگ نظر آئی جسے آپ نے غنیمت سمجھا اور خیال کیا کہ وہاں کوئی آگ جلانے والا تو ضرور ہو گا۔ لہٰذا اپنے اہل و عیال سے کہا تم یہیں ٹھہرو۔ میں اس آگ کے قریب جاتا ہوں۔ اگر کسی نے راستہ بتا دیا تو فبہا ورنہ کچھ آگ کے انگارے ہی لے آؤں گا۔ تاکہ آپ لوگ اس سے تاپ سکیں۔ (یہ پورا واقعہ تفصیل کے ساتھ سورہ طٰہٰ میں گزر چکا ہے)

[۴۰] ❁ **طویٰ میں پہنچنا اور اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونا اور نبوت ملنا:۔** یہ آگ نہیں تھی، نہ ہی اس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ بلکہ یہ اللہ کا نور تھا جس نے ایک درخت کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور اس آگ یا نور کے درمیان یہ سرسبز درخت لہلہا رہا تھا۔ اس درخت میں سے آواز آنے لگی کہ موسیٰ! تم یہاں اتفاقاً نہیں پہنچ گئے بلکہ ٹھیک میرے اندازہ کے مطابق اس مبارک وادی میں پہنچے ہو اور میں اللہ تم سے ہمکلام ہو رہا ہوں جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے (اس مقام پر اللہ تعالیٰ اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو کی تفصیل چھوڑ دی گئی ہے جو سورۂ طٰہٰ اور دوسرے مقامات پر مذکور ہے۔)

عَصَاكَ ۚ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۚ يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا
تَخَفْ ۣ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ۞ اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاۗءَ مِنْ غَيْرِ سُوْۗءٍ ۡ
وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا

لاٹھی پھینکو۔ پھر جب موسیٰ نے اس (پھینکی ہوئی) لاٹھی کو دیکھا تو وہ یوں حرکت کر رہی تھی جیسے کوئی سانپ ہے۔ موسیٰ پیٹھ پھیر کر پیچھے ہٹے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا (اللہ تعالیٰ نے فرمایا) آگے بڑھو اور ڈرو نہیں تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔(۳۱) (نیز) اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو، [۴۱] وہ بغیر کسی تکلیف کے چمکتا ہوا نکلے گا۔ اور اگر ڈر محسوس ہو تو اپنا بازو اپنے [۴۲] جسم سے لگالو۔ سو یہ تیرے پروردگار کی طرف سے دو معجزے ہیں جنہیں تم فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے پیش کر سکتے ہو۔ وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں [۴۳] (۳۲)

[۴۱] ❁ **دو معجزات عطا ہونا اور فرعون کے ہاں جانے کا حکم:۔** اسی مقام پر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو دو معجزے عطا کئے گئے۔ ان معجزات کی تفصیل بھی پہلے متعدد مقامات پر گزر چکی ہے۔ یہ دونوں معجزات آپ کی نبوت کی سند کے طور پر تھے اور ان سے مقصود یہ تھا کہ سب سے پہلے تو خود موسیٰ علیہ السلام کو یہ یقین کامل ہو جائے کہ جو ذات اس وقت ان سے ہمکلام ہو رہی ہے وہ فی الواقع اللہ ہی ہے جو ساری کائنات کا پروردگار اور مالک ہے۔ بالفاظ دیگر ایسے نمایاں معجزات اللہ رب العالمین کے علاوہ نہ کوئی عطا کر سکتا ہے اور نہ دکھا سکتا ہے۔ اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کو تن تنہا ایک ظالم اور جابر حکمران کے دربار میں تبلیغ رسالت اور دعوت توحید کے لئے بھیجا جا رہا تھا۔ ان کے ساتھ کوئی لاؤ لشکر تو تھا نہیں۔ لہٰذا ایسی نشانیاں تو موجود ہونا چاہئیں جن سے کم از کم یہ معلوم ہو جائے کہ موسیٰ اکیلے نہیں ہیں بلکہ ان کی پشت پر کوئی مقتدر ہستی موجود ہے۔ گویا یہ چیز سیدنا موسیٰ کے لئے تو باعثِ تسکین و اطمینان تھی۔ جبکہ یہی چیز دعوت سے انکار کرنے والوں کے لئے ایک ڈراوا اور دھمکی بھی تھی۔

[۴۲] جس مشن پر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا جا رہا تھا اس میں کئی مقام ایسے آ سکتے تھے جبکہ آپ خود اپنی جان تک کا خطرہ محسوس کرنے لگیں تو ایسے خطرہ کے اوقات کے لئے آپ کو تدبیر یہ بتائی گئی کہ اپنا بازو اپنے پہلو سے لگالو۔ اور صرف بازو کا لفظ بولا جائے تو اس سے عموماً دایاں بازو ہی مراد لیا جاتا ہے۔ یعنی اپنا دایاں بازو اپنی دائیں ران اور گھٹنے کے ساتھ چمٹا لو۔ ایسا کرنے سے اس خطرہ کا خیال دل سے جاتا رہے گا اور تمہارے دل کو قرار آ جائے گا۔

[۴۳] نبوت اور اس کے ساتھ دو معجزات تھے جو آپ کو اس مقام پر عطا ہوئے۔ اور ساتھ ہی یہ حکم ہوا کہ اب تمہیں فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس جانا ہے۔ یعنی ان لوگوں کے پاس جن سے بچتے بچاتے آپ اس ملک سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ آپ جا رہے تھے تو اس خیال سے کہ اب تک لوگ وہ واقعہ قتل بھول چکے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے براہِ راست ان لوگوں کے ہاں جانے کا حکم دیا کہ دوسروں کو خواہ وہ واقعہ بھول چکا ہو مگر یہ تو خصوصاً وہ لوگ تھے کہ موسیٰ علیہ السلام کو دیکھتے ہی انہیں سب کچھ یاد آ جائے۔ یہ مہم بہت بڑی ابتلا تھی جس کا آپ کو حکم دیا جا رہا تھا اور جس طرح کے وہ لوگ نافرمان اور بدکردار تھے۔

قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾ وَاَخِيْ هٰرُوْنُ
هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾ قَالَ
سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚ بِاٰيٰتِنَآ ۚ
اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا جَاۗءَهُمْ مُّوْسٰي بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا

موسیٰ نے عرض کیا: پروردگار! میں نے ان کے ایک آدمی کو مار ڈالا تھا لہٰذا مجھے خطرہ ہے کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے (۳۳) اور میرے بھائی ہارون کی زبان مجھ سے زیادہ صاف ہے اسے میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج تاکہ وہ میری تصدیق کرے مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ [۴۴] مجھے جھٹلا دیں گے (۳۴) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم تیرے بھائی سے تیرا بازو مضبوط کر دیں گے اور تم دونوں کو ایسا غلبہ عطا کریں گے کہ وہ تم پر دست درازی نہ کر سکیں گے۔ ہمارے معجزات کی وجہ سے تم دونوں اور تمہارے پیروکار ہی غالب رہیں گے۔[۴۵] (۳۵) پھر جب موسیٰ ہمارے واضح معجزات لے کر ان (فرعونیوں) کے پاس آگئے تو وہ کہنے لگے: یہ تو محض شعبدہ کی قسم کا جادو ہے [۴۶]

وہ موسیٰ علیہ السلام پہلے ہی خوب جانتے تھے۔

[۴۴] سیدنا موسیٰ کے خدشات اور التجا' اللہ کی طرف سے امن کی یقین دہانی اور ہارون کو نبوت ملنا:۔ موسیٰ علیہ السلام اس زبردست آزمائش سے انکار نہ کر سکے البتہ جو خطرات اس مہم میں انہیں نظر آرہے تھے وہ ضرور عرض کر دیئے ایک یہ کہ کہیں وہ سابقہ جرم میں دھر کر قتل ہی نہ کر ڈالیں اور دوسرا یہ کہ جو لوگ خود خدا بنے بیٹھے ہیں وہ میری یہ دعوت کیسے قبول کریں گے؟ لہٰذا مجھے کم از کم ایک ساتھی ضرور درکار ہے۔ اگر میرے بھائی ہارون کو بھی نبوت عطا کر دیں تو ایک تو اس کی زبان فصیح ہے۔ جو بات میں پیش کروں اسے وضاحت سے پیش کر دے گا۔ دوسرے وہ ایک آدمی تو میرا مددگار ہو جب سب لوگ مجھے جھٹلا دیں تو ایک تو میری تصدیق کرنے والا ہو جس سے مجھے کچھ سہارا مل جائے اور وہ بھی حوصلہ افزائی کا باعث بن سکے۔

[۴۵] اس مطالبہ کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے تین امور بیان فرمائے۔ سب سے پہلے یہ کہ وہ لوگ تم پر ہرگز دست درازی نہ کر سکیں گے۔ اور تمہارا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ تمہیں قتل کرنے کی بجائے انہیں اپنے معاملات حکومت کی فکر پڑ جائے گی۔ دوسرے تمہارا ہارون کو نبی بنا کر تمہارے ہمراہ بھیجنے کا مطالبہ منظور کیا جاتا ہے۔ وہ تمہارے ہمراہ فرعون کے دربار میں جائے گا اور تیسرے یہ کہ تم اس بات کا یقین رکھو کہ بالآخر فتح تمہاری ہی ہو گی۔

[۴۶] سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کو اللہ کا پیغام پہنچانا:۔ موسیٰ علیہ السلام یہ عظیم ذمہ داری اٹھائے طویٰ کے میدان سے واپس لوٹے۔ درمیان میں ایک خلا ہے جس کو قرآن نے غیر اہم سمجھ کر بتانا چھوڑ دیا ہے۔ جو یہ کہ وہاں سے موسیٰ علیہ السلام اپنے بال بچوں کو لے کر سیدھے اپنے گھر ہی پہنچے ہوں گے۔ وہاں والدین اور بہن بھائی سے ملاقات۔ اپنے بھائی ہارون سے تمام حالات کا تفصیلی تذکرہ وغیرہ چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ انہی ایام میں ہارون علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی ہو گی۔ قرآن آگے یہاں سے ان کا قصہ ذکر کرتا ہے کہ وہ دونوں بھائی فرعون کے دربار میں پہنچ گئے۔ ان کی رسائی دربار میں کس انداز سے ہوئی؟ یہ بات معلوم نہیں۔

سحر مفتری وما سمعنا بهذا في اباىنا الاولين ﴿۳۶﴾ وقال موسى ربي اعلم بمن جاء
بالهدى من عنده ومن تكون له عاقبة الدار انه لا يفلح الظلمون ﴿۳۷﴾ وقال فرعون
يايها الملا ما علمت لكم من اله غيري فاوقد لي يهامن على الطين فاجعل

اور ایسی باتیں تو ہم نے اپنے سابقہ باپ دادوں سے کبھی سنی ہی نہیں۔[۴۷] (۳۶) موسیٰ نے کہا: اس شخص کا حال تو میرا پروردگار ہی خوب جانتا ہے جو اس کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہے اور اس شخص کو بھی وہی جانتا ہے جس کے لئے آخرت کا گھر ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ظالم لوگ کبھی فلاح نہیں پاتے۔[۴۸] (۳۷) اور فرعون نے کہا: اے درباریو! میں تو اپنے علاوہ تمہارے لئے کسی الٰہ کو[۴۹] جانتا نہیں سوائے ہامان! تو مٹی (کی اینٹوں)

بہر حال دربار میں پہنچ کر موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا پیغام تفصیل سے فرعون اور اس کے درباریوں تک پہنچا دیا۔ اور اس کی تفصیل دوسرے مقامات پر مذکور ہے۔ یہاں صرف اسی قدر ذکر کیا گیا ہے کہ جب فرعون اور اس کے درباریوں کے مطالبہ پر موسیٰ علیہ السلام نے اپنی نبوت کی صداقت کے طور پر یہ دونوں معجزات دکھائے تو اگرچہ فرعون کو آپ کی نبوت کا دل میں یقین ہو چکا تھا اور اسی وجہ سے اسے قتل کے جرم میں آپ کو قتل کر دینے کی کسی وقت بھی ہمت نہ پڑی۔ تاہم عام لوگوں پر نبوت کے اثر کو دور رکھنے کے لئے انہوں نے فوراً یہ کہہ دیا کہ یہ بھلا کون سی نبوت کی علامت ہے۔ ایسی شعبدہ بازیاں تو دوسرے جادوگر بھی دکھا سکتے ہیں۔ ان کو بھلا کبھی کسی نے نبی تسلیم کیا ہے؟

[۴۷] فرعون کی خدائی کی نوعیت:۔ ان باتوں کی تفصیل پہلے متعدد مقامات پر گزر چکی ہے اور وہ باتیں یہ تھیں کہ مقتدر اعلیٰ اور مختارِ مطلق ہستی تم نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہے۔ جو ساری کائنات کے خالق و مالک ہیں۔ اسی نے مجھے رسول بنایا اور یہ معجزات بطور علامت دے کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور یہ پیغام دیا ہے کہ تم سرکشی چھوڑ دو اپنی خدائی کے دعویٰ سے باز آجاؤ۔ اسی اللہ کے قانونی اور سیاسی اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کر لو۔ اسی کی عبادت کرو۔ فرعون نے کہا یہ تھا کہ میرے اوپر بھی کسی مختارِ مطلق ہستی کے ہونے کی بات ایسی بات ہے۔ جو ہم نے اپنے آباء سے کبھی نہیں سنی۔ جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ یہ فراعنہ مصر کئی پشتوں سے خود مختار و مطلق فرمانروا بنے بیٹھے تھے۔ اور قانونی اور سیاسی اختیارات میں اپنے اوپر کسی بالاتر ہستی کے قائل نہ تھے۔ اسی بات کو ان کے خدائی کے دعویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

[۴۸] سیدنا موسیٰ اور فرعون کا مکالمہ:۔ یعنی تم نے مجھے ایک جادوگر سمجھا ہے حالانکہ میرا پروردگار میرے حال سے خوب واقف ہے کہ ہر شخص کے کاموں کے انجام کا فیصلہ بھی اسی کے ہاتھ میں ہے بہر حال ایک بات تو یقینی ہے اور وہ یہ ہے کہ ظالم اور بے انصاف لوگ کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ اگر میں نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر کے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا الزام لگا دیا ہے تو میرا انجام کبھی بخیر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اگر میں اللہ کی طرف سے سچا رسول ہوں اور تم مجھے جادوگر کہہ کر دوسرے حیلے بہانوں سے مجھے جھٹلاؤ گے تو تمہارا بھی کبھی انجام بخیر نہ ہوگا۔

[۴۹] فرعون کی خدائی کا دعویٰ اس حد تک تھا کہ اس نے ملک کے تمام وسائل معاش پر قبضہ کر رکھا تھا۔ دوسرے وہ اپنے قانونی اور سیاسی اختیارات میں کسی بالاتر ہستی کا قائل نہ تھا۔ ورنہ وہ دوسرے مشرکوں کی طرح کائنات کا خالق اللہ ہی کو سمجھتا تھا

لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّىْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝۳۸ وَاسْتَكْبَرَ هُوَ

کو آگ سے پکا۔ پھر میرے لئے ایک اونچی عمارت تیار کر تاکہ میں موسیٰ کے الٰہ کو جھانک [۵۰] سکوں اور میں اسے جھوٹا آدمی ہی سمجھتا ہوں۔(۳۸) اور فرعون اور اس کے لشکر

اور اللہ کے علاوہ دوسرے معبودوں کا بھی قائل تھا۔ چنانچہ خود اس کے درباریوں نے فرعون سے کہا تھا کہ "تو موسیٰ کو کھلی چھٹی دے دے گا کہ وہ اور اس کے پیروکار تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دیں گے" (۷:۱۲۷) فراعنہ مصر دراصل اپنے آپ کو سورج دیوتا کا اوتار سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ اپنی رعایا سے اپنے مجسموں کی پوجا بھی کرواتے تھے۔ علاوہ ازیں ان لوگوں میں گائے بیل کی پرستش کا عام رواج تھا۔

[۵۰] ۞ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے متعلق انکشاف اور اس کا جواب:۔ یہ بات دراصل اس نے اپنی رعایا کو اُلو بنانے اور ان سے دعوت حق کے اثر کو زائل کرنے کے لئے کہی تھی۔ اور یہ بالکل ایسی ہی بات تھی جیسے چند برس پیشتر روس نے جو ایک کمیونسٹ اور دہریت پسند ملک ہے، نے کہی تھی۔ اس نے اپنا ایک سپوتنک طیارہ چھوڑا جو چند لاکھ میل بلندی تک پہنچا تو واپسی پر ان لوگوں نے یہ دعویٰ کر دیا کہ ہم اتنے لاکھ میل کی بلندی تک ہو آئے ہیں۔ مگر ہمیں مسلمانوں کا خدا کہیں نہیں ملا۔ یعنی ان احمقوں کا یہ خیال تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ہستی موجود ہے تو یہی چند لاکھ میلوں کی بلندی پر ہی ہو سکتی ہے۔ اور اس واقعے کو بھی انہوں نے لوگوں کو الو بنانے کے لئے ہی سائنٹفک دلیل کے طور پر پیش کیا۔ کیونکہ یہی لوگ جب کائنات کی وسعت کا حال بتاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ سورج ہماری زمین سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل دور ہے اور زمین اس کے گرد گردش کر رہی ہے۔ یہ اس سورج کا تیسرا سیارہ ہے اور سورج کے گرد نواں سیارہ پلوٹو گردش کرتا ہے جو سورج سے ۳ ارب ۶۸ کروڑ میل کے فاصلہ پر ہے۔ نیز یہ کہ اس کائنات میں ہمارے نظام شمسی میں سورج ایک ستارہ یا ثابت ہے اور کائنات میں ایسے ہزاروں ستارے یا ثوابت مشاہدہ کئے جا چکے ہیں۔ اور یہ ستارے یا سورج جسامت کے لحاظ سے ہمارے سورج سے بہت بڑے ہیں۔ ہمارے سورج سے بہت دور تقریباً ۴۰۰ کھرب کلو میٹر کے فاصلہ پر ایک سورج موجود ہے جو ہمیں محض روشنی کا ایک چھوٹا سا نقطہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کا نام الفا قنطورس (Alfa Centoaris) ہے۔ ایسے ہی دوسرے سورج اس سے دور ہیں۔ اسی طرح ایک ستارے کا نام قلب عقرب ہے (Antares) ہے۔ اگر اسے اٹھا کر ہمارے نظام شمسی میں رکھا جائے تو سورج سے مریخ تک کا تمام علاقہ اس میں پوری طرح سما جائے گا۔ جبکہ مریخ کا سورج سے فاصلہ ۱۴ کروڑ ۱۵ لاکھ میل دور ہے۔ گویا قلب عقرب کا قطر ۲۸ کروڑ ۳۰ لاکھ میل کے لگ بھگ ہے۔ پھر جب کائنات میں ہر سو بکھرے سیاروں کے فاصلے کھربوں میل کے عدد سے بھی تجاوز کر گئے تو ہیئت دانوں نے نوری سال کی اصطلاح ایجاد کی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ روشنی ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ اس لحاظ سے ہماری زمین سے سورج کا فاصلہ جو حقیقتاً ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے۔ روشنی کا یہ سفر ۸ منٹ کا سفر ہے۔ گویا سورج ہم سے ۸ نوری منٹ کے فاصلہ پر ہے۔ اب کائنات میں ایسے سیارے بھی موجود ہیں جو ایک دوسرے سے ہزارہا بلکہ لاکھوں نوری سالوں کے فاصلہ پر ہیں۔

۞ فرعون کا ہامان کو ایک اونچا محل تعمیر کرنے کی ہدایت کرنا:۔ یہ تو ہے کائنات کی وسعت کا وہ مطالعہ جو انسان کر چکا ہے اور جو ابھی انسان کے علم میں نہیں آ سکا وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اب کیا وہ ہستی جو ان ساری چیزوں کی خالق اور سب سے اوپر

وَجُنُوۡدُہٗ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ وَظَنُّوۡۤا اَنَّہُمۡ اِلَیۡنَا لَا یُرۡجَعُوۡنَ ﴿۳۹﴾ فَاَخَذۡنٰہُ وَجُنُوۡدَہٗ فَنَبَذۡنٰہُمۡ فِی الۡیَمِّ ۚ فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۴۰﴾ وَجَعَلۡنٰہُمۡ اَئِمَّۃً یَّدۡعُوۡنَ

اس ملک میں ناحق ہی بڑے بن بیٹھے تھے اور انہیں یقین ہو گیا تھا کہ ہمارے حضور[۵۱] واپس نہ لائے جائیں گے۔(۳۹) چنانچہ ہم نے فرعون اور اس کے سب لشکروں کو پکڑا اور سمندر میں پھینک دیا۔ اب دیکھ لو کہ ان ظالموں کا[۵۲] انجام کیسا ہوا؟(۴۰) نیز ہم نے انہیں جہنم کی طرف دعوت دینے والے سرغنے بنا دیا[۵۳]

ہے کیا یہ احمق اسے چند لاکھ میلوں کی بلندی پر پالیں گے؟ نیز وہ سمجھ رہے ہیں جیسے وہ کوئی مادی جسم ہے۔ جو ان کی گرفت میں آسکتا ہے۔ ﴿قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ﴾

اس سے بڑی حماقت ان روسی داناؤں نے یہ کی کہ اپنی اس سائنٹفک تحقیق کو اپنے سکولوں میں پڑھانا شروع کر دیا۔ تو ایک لڑکی کے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ نکل گیا کہ جہاں تک یہ سپوتنک میزائل پہنچا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس سے بہت اوپر تھا۔

فرعون نے بھی ہامان سے ایسی ہی بات کہی تھی جس سے لوگوں کو اللہ کی ہستی کے بارے سے شک میں مبتلا کر دے۔ ورنہ عملاً نہ ہامان نے کوئی ایسا اونچا محل یا مینارہ بنایا تھا اور نہ ہی فرعون کا یہ مقصد تھا۔

[۵۱] انہیں اللہ نے زمین کے تھوڑے سے حصہ میں چند دن کے لئے اقتدار بخشا تو وہ یہ سمجھنے لگے کہ ان سے اوپر کوئی ہستی ہے نہیں جو ان سے یہ اقتدار چھین بھی سکتی ہے۔ نہ ہی انہیں کبھی یہ خیال آیا تھا کہ مرنے کے بعد ہمیں اللہ کے حضور پیش ہونا ہے اور ہمارے ایک ایک کام سے متعلق ہم سے باز پرس ہونے والی ہے۔

[۵۲] ❁ فرعون کا انجام:۔ اس مقام پر درمیان سے بہت سے واقعات چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ جو دیگر متعدد مقامات پر مذکور ہیں۔ یہاں صرف ان کے انجام کی خبر دی گئی ہے کہ ان ظالموں اور زمین میں بڑا بننے والوں کا انجام کیا ہوا۔ کس بے بسی کی حالت میں مرے۔ اور کیسی کیسی دل میں حسرتیں لے کر مرے۔ اور مرتے وقت کسی سے کوئی بات تک نہ کر سکے۔

[۵۳] ❁ فرعون منکرین حق کا رہنما تھا:۔ یعنی تمام منکرین حق اور باطل پرستوں کے لئے وہ مثال قائم کر گیا کہ حق کو کن کن حیلوں بہانوں سے ٹھکرایا جاسکتا ہے:۔ انکار حق پر ڈٹ جانے اور آخر دم تک ڈٹے رہنے کے لئے کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ حق پرستوں پر کیسے کیسے مظالم ڈھائے جاسکتے ہیں اور حق کو کیونکر دبایا جاسکتا ہے۔ یہ سب طریقے اپنے بعد میں آنے والوں کو دکھا کر وہ جہنم کو سدھار چکا اور آج کے مشرکین مکہ انہیں کے طور طریقے اختیار کر کے اسی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

پھر جس طرح فرعون نے اس دنیا میں حق کے دشمنوں کو جہنم کی راہ دکھائی اسی طرح قیامت کے دن بھی وہ اہل دوزخ کی پیشوائی کرے گا۔ اور انہیں جہنم میں جا پہنچائے گا اور خود ان کی قیادت کر رہا ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ ہود کی آیت نمبر ۹۸ میں اس بات کی صراحت فرما دی ہے۔

اِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ
الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْ بَعْدِ مَآ
اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۳﴾
وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَلٰكِنَّآ

اور قیامت کے دن انہیں کہیں سے مدد نہ [۵۴] مل سکے گی۔(۴۱) ہم نے اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی اور قیامت کے دن ان کا بہت برا حال [۵۵] ہو گا۔(۴۲)

پہلی نسلوں کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے موسیٰ کو کتاب دی۔ جس میں لوگوں کے لئے بصیرت افروز دلائل، ہدایت اور رحمت تھی [۵۶] تاکہ وہ سبق حاصل کریں(۴۳) اور جب ہم نے موسیٰ کے لیے امر (رسالت) کا فیصلہ کیا تھا تو آپ (طور کی) غربی جانب [۵۷] موجود نہ تھے۔ اور نہ ہی (اس واقعہ کے) گواہ [۵۸] تھے۔(۴۴)

[۵۴] یعنی اس دنیا میں تو فرعون اور اس کے درباریوں کو اپنے لاؤ لشکر پر بڑا ناز تھا۔ اور انہی فوجوں اور لاؤ لشکر نے ان کا دماغ خراب کر رکھا تھا۔ حالانکہ ان کا لاؤ لشکر ان کی غرقابی کے وقت کسی کام نہ آ سکا بلکہ ان کے ساتھ ہی غرق ہو گیا تو قیامت کو بھی یہ لاؤ لشکر ان کے کسی کام نہ آ سکے گا۔ نہ ہی کسی دوسرے ذریعہ سے یہ جہنم کے عذاب سے بچ سکیں گے۔

[۵۵] یعنی فرعون اور آل فرعون پر بعد میں آنے والی دنیا لعنت ہی بھیجتی رہے گی اور انہیں برے لفظوں میں یاد کیا جاتا رہے گا اور قیامت کے دن تو ان کی بڑی درگت بنائی جائے گی اور ان کے چہرے بگاڑ دیئے جائیں گے۔

[۵۶] پہلی نسلوں سے مراد اقوام سابقہ ہیں۔ مثلاً قوم نوح علیہ السلام، قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط علیہ السلام، قوم شعیب علیہ السلام اور قوم فرعون وغیرہ۔ یہ سب لوگ اللہ کے نافرمان اور سرکش لوگ تھے ان سب اقوام نے دنیا کی تکذیب کا نتیجہ بھگت لیا اور فرعون اور ان کے ساتھیوں کا جو انجام ہوا وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ اس کے بعد ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کی جس میں انہی تباہ شدہ اقوام سے متعلق بصیرت افروز دلائل بھی تھے اور آئندہ کے لئے بھی انسانیت کی ہدایت کے لیے واضح ہدایات دی گئیں۔ اور یہ لوگوں پر اللہ کی خاص مہربانی تھی اور ان سب باتوں کا مقصد یہ تھا کہ انسانیت آئندہ صحیح راہ پر گامزن ہو جائے اور اس کا نیا دور شروع ہو۔ اور صحیح حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے تورات نازل کرنے کے بعد پھر کسی قوم کو آسمان کے عذاب سے تباہ نہیں کیا البتہ ایک بستی کے لوگ (اصحاب السبت) بندر بنائے گئے تھے۔ ایک قوم کو سؤر بھی بنایا گیا تھا۔

[۵۷] ۞ انبائے غیب سے آپ ﷺ کی نبوت پر دلیل:۔ یعنی آپ کا وہاں موجود نہ ہونا پھر ان حالات کو یوں بیان کرنا جیسے کوئی عینی شاہد بیان کرتا ہے اس بات کی قوی دلیل ہے کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ ورنہ آپ کے پاس وحی الٰہی کے سوا ان واقعات کو جاننے کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔

[۵۸] ربطِ مضمون کے لحاظ سے تو اس کا وہی مطلب ہے جو اوپر بیان ہوا۔ اور اگر اس جملہ کو الگ واقعہ سمجھا جائے تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ آپ ان ستر (۷۰) آدمیوں سے بھی نہیں تھے جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے دیدار الٰہی کا مطالبہ کیا تھا۔ اور وہ واقعہ بھی آپ نے لوگوں کو ایسے بتا دیا جیسے آپ ان میں موجود تھے۔

أَنشَأْنَا قُرُونًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنتَ ثَاوِيًا فِي أَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَ
لَٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ ﴿٤٥﴾ وَمَا كُنتَ بِجَانِبِ الطُّورِ إِذْ نَادَيْنَا وَلَٰكِن رَّحْمَةً مِّن رَّبِّكَ لِتُنذِرَ
قَوْمًا مَّا أَتَاهُم مِّن نَّذِيرٍ مِّن قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٤٦﴾ وَلَوْلَا أَن تُصِيبَهُم

اس کے بعد ہم نے کئی نسلیں پیدا کیں اور ان پر بہت زمانہ بیت[۵۹] چکا ہے اور آپ مدین کے باشندے بھی نہ تھے کہ انہیں[۶۰] ہماری آیات پڑھ کر سناتے مگر ہم ہی ہیں جو (آپ کو رسول بنا کر اس وقت کی خبریں) بھیج رہے ہیں۔(۴۵) نیز آپ طور کے کنارے پر بھی نہ تھے جب ہم نے (موسیٰ کو)[۶۱] ندا کی تھی، لیکن یہ آپ کے پروردگار کی رحمت ہے (کہ اس نے آپ کو یہ سچی غیب کی خبریں دیں) تاکہ آپ ایسے لوگوں کو ڈرائیں جن کے ہاں آپ سے پہلے کوئی[۶۲] ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔ شاید وہ نصیحت قبول کریں۔(۴۶) اور (آپ کو اس لئے رسول بنا کر بھیجا ہے کہ) کہیں ایسا نہ ہو کہ انہیں ان کی اپنی کرتوتوں کی وجہ سے کوئی

[۵۹] موسیٰ علیہ السلام کے عہد سے لے کر دور نبوی تک تقریباً دو ہزار سال کی مدت ہے اور اس عرصہ میں تقریباً چالیس نسلیں یکے بعد دیگرے پیدا ہوتی رہیں۔ مگر اس دوران ملک حجاز میں کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا تھا۔ دو ہزار سال کے بعد سب سے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم البتہ ان لوگوں (اہل حجاز) کی طرف مبعوث ہوئے۔

[۶۰] یعنی مدین کا باشندہ نہ ہونے کے باوجود آپ ان لوگوں کو سیدنا شعیب علیہ السلام اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے حالات یوں بتا رہے ہیں گویا اس وقت آپ وہاں مقیم تھے اور ان لوگوں کو ہماری آیات پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ اور ان واقعات کے صرف عینی شاہد ہی نہ تھے۔ بلکہ عملی طور پر بھی ان واقعات میں آپ کا عمل دخل تھا۔ اور یہ بات چونکہ ناممکن ہے تو اس سے صاف واضح ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے یہ حالات بذریعہ وحی بتائے ہوں۔ اور یہی چیز آپ کی نبوت کی دلیل ہے۔

[۶۱] ❁ یہ تینوں واقعات آپ کی نبوت پر دلیل ہیں اور سابقہ کتب میں تحریف کی تصحیح بھی:۔ گویا ان تین واقعات کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے آپ کی نبوت کی صداقت کے طور پر پیش فرمایا۔ ایک وہ وقت جب اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو معجزات عطا کر کے انہیں فرعون اور اس کی قوم کے پاس بھیجا اور امرِ رسالت تفویض کیا تھا۔ دوسرے مدین کے حالات کی تفصیل اور تیسرے وہ وقت جب موسیٰ علیہ السلام رستہ بھول کر آگ لینے کی غرض سے آئے تھے۔ تو ہم نے خود انہیں پکار کر رسالت بھی عطا کی تھی اور ہم کلامی کا شرف بھی بخشا تھا۔ اور یہ واقعات آپ کی نبوت پر دلیل اس طرح ہیں کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے۔ کہ آپ نے کسی کتاب سے پڑھ کر یہ حالات معلوم کر لئے ہوں اور لوگوں کو سنا دیا ہو۔ دوسرے یہ کہ آپ کا کوئی استاد بھی نہ تھا جس کے آگے آپ نے زانوئے تلمذ تہ کیا ہو اور اس نے آپ کو ان واقعات سے مطلع کر دیا ہو۔ اب تیسری صورت یہی باقی رہ جاتی ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہوں اور اللہ نے بذریعہ وحی آپ کو ان حالات سے مطلع کر دیا ہو۔ پھر ان سابقہ کتب میں یا موجودہ میں انہی واقعات سے متعلق بے شمار جزوی اختلاف موجود تھے۔ اللہ نے جو حالات آپ کو وحی کے ذریعہ بتائے یہ حالات اصل حقائق کے عین مطابق ہیں۔

[۶۲] یعنی اہلِ حجاز کے لئے اس دو ہزار سال میں کوئی نبی مبعوث نہ ہوا تھا ان لوگوں کا ان واقعات سے متعلق ذریعہ معلومات بس

مُّصِيبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتۡ أَيۡدِيهِمۡ فَيَقُولُواْ رَبَّنَا لَوۡلَآ أَرۡسَلۡتَ إِلَيۡنَا رَسُولٗا فَنَتَّبِعَ ءَايَٰتِكَ وَنَكُونَ مِنَ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ ﴿٤٧﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ ٱلۡحَقُّ مِنۡ عِندِنَا قَالُواْ لَوۡلَآ أُوتِيَ مِثۡلَ مَآ أُوتِيَ مُوسَىٰٓۚ أَوَلَمۡ يَكۡفُرُواْ بِمَآ أُوتِيَ مُوسَىٰ مِن قَبۡلُۖ قَالُواْ سِحۡرَانِ تَظَٰهَرَا وَقَالُوٓاْ

مصیبت پہنچے تو کہنے لگیں: "ہمارے پروردگار! تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم تیری آیتوں کی پیروی کرتے اور ایمان لانے والوں میں شامل ہو جاتے۔[۶۳] (۴۷)

پھر جب ہماری طرف سے ان کے پاس حق آ گیا تو انہوں نے کہہ دیا: اسے ویسے معجزات کیوں نہیں دیئے گئے جیسے موسیٰ کو دیئے گئے تھے "کیا یہ لوگ ان معجزات کا انکار نہیں کر چکے جو پہلے[۶۴] موسیٰ کو دیئے گئے تھے؟ کہتے ہیں کہ: "یہ دونوں[۶۵] (تورات اور قرآن) جادو ہیں جو ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں" اور کہتے ہیں کہ:

وہی خبریں تھیں جو ادھر ادھر سے وہ سن لیتے تھے اور ان خبروں میں بھی کافی اختلافات تھے۔ اب ہم نے ان لوگوں میں آپ کو نبی بنا کر بھیجا ہے تاکہ انہیں صحیح حالات کا علم ہو جائے۔ اور وہ امم سابقہ کے انجام سے متنبہ ہو کر سبق حاصل کریں۔ اور اللہ سے شرک اور سرکشی کی راہ چھوڑ کر راہ راست پر آ جائیں تاکہ ان کا انجام بھی ویسا ہی نہ ہو جیسا کہ مذکورہ امتوں کا ہوا تھا۔

[۶۳] ۞ آپ ﷺ کی بعثت کے دو مقصد اتمام حجت اور رفع عذر:۔ ان لوگوں میں آپ کو رسول بنا کر بھیجنے کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اگر آپ کی بعثت سے پہلے ان پر ان کے اپنے شامت اعمال کی وجہ سے کوئی عذاب یا مصیبت آن پڑتی تو یہ کہہ سکتے تھے کہ ہم تو عرصہ دو ہزار سال سے صحیح حالات سے واقف ہی نہ تھے۔ یہ ممکن تھا کہ سزا ہی کے وقت یہ لوگ کہنے لگتے کہ ہمارے پاس کوئی پیغمبر تو بھیجا نہیں جو ہمیں ہماری غلطیوں پر کم از کم متنبہ کر دیتا اس طرح یکدم پکڑ کر عذاب میں دھر گھسیٹا۔ اور اگر اللہ ہماری طرف کوئی رسول بھیجتا جو ہمیں ہدایت کی راہ دکھاتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم اس رسول کی پیروی نہ کرتے اور دوسری موجود قوموں سے زیادہ ہدایت یافتہ نہ بن جاتے۔ گویا ان لوگوں کی طرف آپ کی بعثت کے دو مقصد تھے ایک اتمام حجت اور دوسرے ان لوگوں کے عذر یا اعتراض کو رفع کرنا یہی مضمون قرآن میں دیگر متعدد مقامات پر بھی مذکور ہے۔

[۶۴] ۞ موسیٰ علیہ السلام جیسے معجزے کا مطالبہ کرنے والے کفار کو کئی مُسکت جوابات:۔ اور اب جو کفار مکہ کے پاس ہمارا رسول آیا ہے اور اپنے ساتھ ہدایت کی کتاب بھی لایا ہے۔ تو انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی طرح اسے عصا کیوں نہیں دیا گیا۔ جو سانپ بن جاتا ہو یا سورج کی طرح چمکنے والا ہاتھ اسے کیوں نہیں دیا گیا یا یہ کتاب تختیوں کی صورت میں کیوں نازل نہیں ہوئی؟ مشرکین مکہ کے اس اعتراض کا جو جواب اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے یہ معجزات پیش کیے تھے تو کیا وہ ایمان لے آئے تھے؟ تمہارے خیال کے مطابق تو انہیں ضرور ایمان لانا چاہئے تھا۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر تم ان معجزات کو درست اور نبوت کی دلیل سمجھتے ہو تو کیا تم تورات پر ایمان لے آئے ہو؟ اور تم تورات پر اور سیدنا موسیٰ پر ایمان نہیں لائے تو اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ فی الحقیقت تمہیں ان معجزات کا بھی انکار ہے اور یہ دعویٰ تمہارا زبانی جمع خرچ ہے۔

[۶۵] اس جملہ کے کئی مطلب ہیں ایک یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کہنے لگی کہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام دونوں

إِنَّا بِكُلٍّ كَٰفِرُونَ ﴿٤٨﴾ قُلْ فَأْتُوا بِكِتَٰبٍ مِّنْ عِندِ ٱللَّهِ هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَآ أَتَّبِعْهُ إِن
كُنتُمْ صَٰدِقِينَ ﴿٤٩﴾ فَإِن لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَٱعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ أَهْوَآءَهُمْ ۚ وَمَنْ أَضَلُّ
مِمَّنِ ٱتَّبَعَ هَوَىٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ ٱللَّهِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿٥٠﴾ ع ۵

"ہم کسی کو بھی نہیں مانتے"[٦٦] (٤٨) آپ ان سے کہیے: اگر تم سچے ہو تو اللہ کی طرف سے تم ہی کوئی کتاب لے آؤ جو ان دونوں سے بڑھ کر رہنمائی کرنے والی ہو، میں بھی اس کی پیروی[٦٧] اختیار کروں گا۔(٤٩) پھر اگر وہ کوئی جواب نہ دے سکیں تو جان لیجئے کہ وہ صرف اپنی خواہشات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی ہدایت کو چھوڑ کر محض اپنی خواہش کے پیچھے لگا ہوا ہو۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے ظالموں[٦٨] کو ہدایت نہیں دیتا۔(٥٠)

جادوگر ہیں اور ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ کفارِ مکہ جب دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے عقائد میں کئی امور میں مماثلت پائی جاتی ہے مثلاً یہ دونوں فرقے بتوں کی عبادت سے بیزار اور اسے شرک اور کفر سمجھتے ہیں۔ آخرت پر دونوں ہی ایمان رکھتے ہیں۔ غیر اللہ کے نام پر ذبیحہ کو دونوں ہی حرام سمجھتے ہیں۔ مسلمان اگر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرتے ہیں تو کئی منصف مزاج یہود اس نبی کو برحق سمجھتے ہیں تو یہ کافر کہنے لگتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم دونوں ہی جادوگر ہیں اور ایک دوسرے کی تائید و تصدیق کرتے ہیں۔ اور تیسرا مطلب یہ ہے کہ کفارِ مکہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ تورات اور قرآن دونوں کھلا ہوا جادو ہیں کیونکہ یہ دونوں کتابیں ایک دوسری کی تائید و تصدیق کرتی ہیں۔

[٦٦] لہٰذا ہم نہ تورات پر ایمان لاتے ہیں، نہ انجیل پر اور نہ قرآن پر۔ یہ سب کتابیں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی کتاب ہمارے مطلب کی ترجمانی نہیں کرتی۔ لہٰذا ان میں سے کوئی کتاب ہی قابل قبول نہیں۔

[٦٧] آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کفارِ مکہ کو یہ جواب دیجئے کہ میں تو اللہ کی طرف سے نازل شدہ کتاب ہدایت کی پیروی کرنے کو تیار ہوں۔ اگر تمہارے پاس تورات اور قرآن سے بہتر کوئی ہدایت کی کتاب موجود ہے تو اسے چھپا کیوں رکھا ہے؟ وہ لاؤ سب سے پہلے میں اس کی پیروی کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ جواب اس لئے بتایا کہ وہ تورات اور قرآن دونوں کو جادو کہتے تھے اور جادو ایسی چیز ہے جس کا مقابلہ بھی کیا جا سکتا ہے اور اس سے بہتر قسم کا جادو لایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ کتابیں جادو ہیں تو تم اس سے بہتر چیز کیوں پیش نہیں کرتے۔

[٦٨] ان کی باتوں اور ان کے اعتراضات سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہ لوگ قطعاً ہدایت کے طالب نہیں ہیں بلکہ یہ صرف ایسی کتاب کی پیروی کر سکتے ہیں جو ان کے مشرکانہ مذہب اور ان کی خواہشات کے مطابق ہو۔ گویا یہ لوگ اپنی ہی خواہشات کے پیرو اور پرستار ہیں۔ لہٰذا ایسے لوگوں کو ہدایت کیسے نصیب ہو سکتی ہے؟

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٥١﴾ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ مِن قَبْلِهِ هُم بِهِ يُؤْمِنُونَ ﴿٥٢﴾ وَإِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ قَالُوا آمَنَّا بِهِ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّنَا إِنَّا كُنَّا مِن قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ ﴿٥٣﴾ أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا

اور ہم انہیں لگاتار (نصیحت کی) باتیں پہنچاتے رہے ہیں۔[۶۹] تاکہ وہ نصیحت کو قبول کریں۔(۵۱)

جن لوگوں کو اس سے پہلے ہم نے کتاب (تورات) دی تھی وہی اس[۷۰] (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں اور جب انہیں پڑھ کر سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں: ''ہم اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ یہ (قرآن) ہمارے پروردگار کی طرف سے[۷۱] سچی کتاب ہے، ہم تو اس سے پہلے (بھی اللہ کے سچے) فرمانبردار تھے۔(۵۳) یہی لوگ ہیں جنہیں ان کا اجر دوبارہ دیا جائے گا اس ثابت قدمی کے بدلے جو انہوں نے دکھائی ہے[۷۲] اور برائی کا جواب

[۶۹] اس آیت کے بھی دو مطلب ہیں۔ایک یہ کہ جتنے بھی نبی ان کے آس پاس مبعوث ہوئے ہیں ان سب کی تعلیمات ان تک بھی پہنچتی رہی ہیں اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ جب سے قرآن کا نزول شروع ہوا ہے لگاتار انہیں ہدایت کی آیات پہنچ رہی ہیں جس کا مقصد یہی تھا کہ وہ کچھ نصیحت قبول کر لیتے۔اور اگر یہ فی الواقع ہدایت کے طالب ہوتے تو کب کے ہدایت قبول کر چکے ہوتے۔

[۷۰] سابقہ آیات میں مشرکوں کا حال یہ بتایا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کی بات کرنے کے باوجود نہ تورات پر ایمان لاتے ہیں اور نہ قرآن پر اور اس کی وجہ محض ان کا تعصب اور خواہش نفس کی پیروی ہے۔اب ان لوگوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جن کی عادات و خصائل ان کے بالکل برعکس ہیں۔یعنی وہ خواہش نفس کی کسی وقت بھی پیروی نہیں کرتے۔بلکہ ہر وقت اللہ کے فرمانبردار بن کر رہتے ہیں۔تورات نازل ہوئی تو وہ اس پر ایمان لائے اور جب قرآن نازل ہوا تو اس پر ایمان لائے۔

[۷۱] اس لئے کہ تورات اور قرآن کی بنیادی تعلیمات آپس میں ملتی جلتی ہیں۔اور جن لوگوں کے دلوں میں تعصب نہ ہو نہ ہی ان کے ذاتی مفادات قبول حق کی راہ میں ان کے آڑے آئیں وہ فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ یہ قرآن بھی اللہ کی طرف سے ہی نازل شدہ کتاب ہے۔پھر اس پر ایمان لے آتے ہیں۔اور حقیقت تو یہ کہ وہ پہلے ہی مسلمان تھے۔اور اب بھی مسلمان ہی رہے۔کیونکہ اسلام تو دل و جان سے اللہ کی فرمانبرداری کا نام ہے اور وہ ان میں پہلے ہی موجود تھی قرآن میں اس حقیقت کی متعدد مقامات پر صراحت کر دی گئی ہے کہ اللہ کے نزدیک قابل قبول دین اسلام یعنی دل و جان سے اللہ کی فرمانبرداری ہی ہے۔رہا مسئلہ کسی دین کو اس کے پیغمبر کے نام سے منسوب کرنے کا۔جیسے یہودیت، نصرانیت اور محمدیت وغیرہ تو یہ زمانہ مابعد کی ایجادات ہیں جو لوگوں نے خود ہی رکھ لئے۔اللہ نے نہیں رکھے تھے۔ہر نبی پر ایمان لانے والوں کا نام اللہ نے مسلمان ہی رکھا ہے۔

[۷۲] ❁ اہل کتاب میں سے ایمان لانے والوں کو دوہرا اجر:۔ ثابت قدمی سے مراد ایک تو وہ استقلال ہے جو قبول حق کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ان کے دلوں میں اللہ کی فرمانبرداری کا جو مستقل جذبہ موجود تھا اسی نے اسے اس نبی پر ایمان لانے کی ترغیب دی اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ مذہب تبدیل کرنے میں اور پھر کسی دین کو ابتداءً قبول کرتے وقت ان مسلمانوں کو طرح

دَرَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ

بھلائی سے [۷۳] دیتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں [۷۴] ﴿۵۴﴾ اور جب کوئی لغو بات سنتے ہیں تو اس سے کنارہ کرتے ہیں [۷۵] اور کہتے ہیں: "ہمارے لئے ہمارے اعمال اور تمہارے لئے تمہارے

طرح کی مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے مصائب کو بھی انہوں نے صبر واستقلال کے ساتھ برداشت کیا۔ ایسے لوگوں کے لئے دوہرا اجر ہے ایک پہلے نبی کی کتاب پر لانے کا اور ایک دوسرے نبی اور اس کی کتاب پر لانے کا۔ چنانچہ سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تین طرح کے آدمیوں کا ذکر کیا ہے جن کو دوہرا اجر ملے گا ان میں سے ایک وہ یہودی یا نصرانی ہے جو پہلے اپنے پیغمبروں پر ایمان رکھتا تھا پھر رسول اللہ ﷺ پر ایمان لاکر مسلمان ہو گیا۔ (بخاری۔ کتاب الجہاد۔ باب فضل من اسلم من اهل الكتابين)

[۷۳] یہاں يَدْرَءُوْنَ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور دَرَءَ کے معنی دفع کرنا، دور کرنا یا پرے ہٹانا ہے۔ اس لحاظ سے اس آیت کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ اگر کوئی شخص ان سے برا سلوک کرے یا نقصان پہنچائے تو اس کا جواب برائی یا نقصان سے نہیں دیتے بلکہ اس سے بھی اچھا سلوک کرتے ہیں اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر ان سے کوئی برائی ہو جائے تو بعد میں نیک اعمال کر کے اس برائی کے اثر کو دور کر دیتے ہیں۔

[۷۴] جب رزق کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مراد ہمیشہ طیب اور پاکیزہ رزق ہوتا ہے کیونکہ حرام کی کمائی سے تو صدقہ بھی قبول نہیں ہوتا۔ اور خرچ کرنے سے مراد اللہ کی راہ میں بھی خرچ کرنا ہے اور جائز کاموں میں بھی یعنی اپنی ذات پر اپنے اہل و عیال کی ضروریات زندگی وغیرہ پر اور اس معاملہ سے بخل سے کام نہیں لیتے۔

[۷۵] ۞ لغو سے کنارہ کرنے والے تو مسلم عیسائی اور ابو جہل:۔ ایسے مسلمانوں کی تیسری صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ لغو کاموں یا بے ہودہ باتوں میں نہ صرف یہ کہ ان میں شامل نہیں ہوتے بلکہ ایسے کاموں سے کنارہ کش رہتے ہیں۔ اور اگر ایسے لوگوں سے سابقہ پڑ جائے تو ان سے تعرض نہیں کرتے بلکہ سلام کہہ کر گزر جاتے ہیں جس سے ان کی مراد ایسے کاموں سے بیزاری کا اظہار ہوتا ہے۔

سیرت کی کئی کتابوں میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ ہجرت حبشہ کے بعد جب حبشہ کے لوگ اسلام اور اس کی دعوت سے متعارف ہوئے تو وہاں سے بیس آدمی، جو عیسائی تھے اس غرض کے لئے مکہ آئے کہ یہ تحقیق کریں کہ پیغمبر اسلام کیسے شخص ہیں۔ جب وہ لوگ آپ سے ملے اور گفتگو شروع ہوئی تو آپ ﷺ نے انہیں قرآن پڑھ کر سنایا جس سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بڑے پرزور طریقہ پر آپ کی تصدیق و تائید کی۔ جب مشرف بہ اسلام ہو کر حبشہ واپس جانے لگے تو ابو جہل اور اس کے ساتھیوں نے ان پر آوازے کسے کہ ایسے احمقوں کا قافلہ آج تک کسی نے نہ دیکھا ہو گا جو ایک شخص کی تحقیق کرنے کے لئے آئے تھے۔ اور اب اس کے غلام بن کر اور اپنا دین چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ انہوں نے جواب میں کہا: ہماری طرف سے تم پر سلام ہے ہم تمہاری جہالت کا جواب جہالت سے نہیں دینا چاہتے۔ ہم میں اور تم میں جو جس حال پر ہے وہی کچھ اس کا حصہ ہے۔ ہم نے اپنے آپ کا بھلا چاہنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اسی کے متعلق یہ آیات نازل ہوئیں۔ (البدایة والنهایة ج ۳ ص ۸۲)

ضمناً اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص سے یہ توقع نہ ہو کہ ہدایت کی بات قبول کر لے گا بلکہ یہ خطرہ ہو کہ یہ الٹا چڑ جائے گا ایسے شخص کو سمجھانے کے بجائے اس سے کنارہ کرنا ہی بہتر ہے۔

[۷۶] ہدایت کے دو مختلف مفہوم اور ابوطالب کی وفات کا قصہ:۔ ہدایت کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ کسی کافر کے قلب و دماغ میں ایسی تبدیلی آجائے کہ وہ ہدایت یا اسلام قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائے یہ کام خالصتاً اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں اس کی صراحت موجود ہے۔ نیز درج ذیل حدیث بھی اسی معنی کی تائید کرتی ہے۔

سعید بن مسیب کے والد مسیب بن حزن کہتے ہیں کہ جب ابوطالب کی وفات کا وقت آیا تو آپ ﷺ ان کے ہاں تشریف لے گئے۔ وہاں دیکھا کہ ابو جہل اور عبداللہ بن ابی امیہ پہلے ہی وہاں بیٹھے ہیں۔ آپ ﷺ نے ابوطالب سے فرمایا: "چچا جان! اگر آپ لا الٰہ الا اللہ کہہ لیں تو میں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں دلیل پیش کر سکوں گا" اور ابو جہل اور عبداللہ بن ابی امیہ کہنے لگے: ابوطالب! کیا تم عبدالمطلب کا دین چھوڑ دو گے؟ آخر ابوطالب نے آخری بات جو کی وہ یہ تھی کہ میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں اور لا الٰہ الا اللہ کہنا قبول نہ کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ کی قسم! میں اس وقت تک تمہارے لئے دعا کرتا رہوں گا جب تک اس سے منع نہ کیا جاؤں" تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ﴾ اور ابوطالب کے بارے میں یہ آیت ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي۔۔۔۔۔۔﴾ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

۲۔ ترمذی کی روایت کے مطابق ابوطالب نے آپ ﷺ کو یہ جواب دیا اگر قریش مجھے یہ عار نہ دلائیں کہ موت کی گھبراہٹ نے اسے یہ کلمہ کہلوا دیا ہے تو بھتیجے! میں یہ کلمہ کہہ کر تیری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ (ترمذی۔ ابواب التفسیر)

اب رہا ابوطالب کا اخروی انجام، جس نے مکی دور میں اپنے آخری دم تک آپ کی حمایت اور سرپرستی کی اور ہر مشکل وقت میں آپ کا ساتھ دیا، تو اس کے متعلق درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیے:

ا۔ سیدنا عباس بن عبدالمطلب کہتے ہیں کہ میں نے کہا: یارسول اللہ! کیا آپ ﷺ کی ذات سے ابوطالب کو کچھ فائدہ پہنچے گا وہ آپ کی حفاظت کیا کرتے تھے اور آپ کی خاطر سب کی ناراضگی مول لے لی تھی؟ تو رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر میں نہ ہوتا تو وہ جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوتے" (مسلم۔ کتاب الایمان۔ باب شفاعۃ النبی لابی طالب)

۲۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آپ کے چچا ابوطالب کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "قیامت کے دن شائد ان کو میری سفارش سے فائدہ پہنچے اور وہ ہلکی آگ میں رکھے جائیں جو ان کے ٹخنوں تک ہو اور ان کا بھیجا پکتا رہے" (مسلم۔ حوالہ ایضاً)

۳۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جہنم کا سب سے ہلکا عذاب ابوطالب کو ہوگا وہ (آگ کی) دو جوتیاں پہنے ہوں گے جس سے ان کا بھیجا کھول رہا ہوگا" (مسلم۔ حوالہ ایضاً)

اور ہدایت کا دوسرا معنی یا دوسری صورت یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کی منزلِ مقصود تک رہنمائی کی جائے۔ ان معنوں میں آپ ﷺ اور دیگر انبیاء بلکہ علمائے کرام بھی ہدایت کی راہ بتا سکتے ہیں اور پیغمبروں کی تو ذمہ داری ہی یہی ہوتی ہے

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴿٥٥﴾ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ
مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿٥٦﴾ وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ
اَرْضِنَا ۭ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ

تم پر سلام! ہم جاہلوں سے تعلق نہیں رکھنا چاہتے" (۵۵)
(اے نبی!) جسے آپ چاہیں اسے ہدایت [۷۶] نہیں دے سکتے، اللہ ہی ہے جو جس کو چاہے ہدایت دیتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں [۷۷] کو خوب جانتا ہے۔(۵۶) اور کافر لوگ آپ سے یہ کہتے ہیں: "اگر ہم تمہارے ساتھ ہدایت کی پیروی کریں تو ہم تو اپنے ملک سے [۷۸] اچک لیے جائیں گے؟ کیا ہم نے پرامن حرم کو[۷۹] ان کی جائے قیام نہیں بنایا۔ جہاں ہماری طرف سے رزق کے طور پر ہر طرح کے پھل کھچے چلے آتے ہیں؟ لیکن ان

جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر فرمایا:۔﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾(۴۲:۵۲) یعنی آپ ﷺ یقیناً لوگوں کو سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

[۷۷] یعنی اللہ صرف ان لوگوں کو ایمان لانے کی توفیق دیتا ہے جو خود بھی ہدایت کے طلبگار ہوں۔ ایسے لوگوں کو وہ خوب جانتا ہے اور ان کی ہدایت کے اسباب بھی انہیں مہیا فرما دیتا ہے۔

[۷۸] یعنی عرب کے مشرک قبائل ہمارے دشمن بن جائیں گے اور ان میں جو سیاسی اقتدار ہمیں حاصل ہے وہ بھی چھن جائے گا۔ اور اسی سیاسی اقتدار کی وجہ سے جو ہمارے تجارتی قافلے پرامن سفر کر سکتے ہیں وہ بھی نہ کر سکیں گے۔ گویا اگر ہم آپ ﷺ کی بات مان کر آپ پر ایمان لے لائیں تو ہماری سیاسی ساکھ بھی تباہ ہو جائے گی اور معاشی آسودگی بھی ختم ہو جائے گی اور یہ قبائل ہم پر ہمارا جینا بھی حرام کر دیں گے۔

[۷۹] مشرکین مکہ کا یہ قول کہ اگر ہم ایمان لے آئیں تو ہمیں کوئی ٹھکانا نہ ملے اور اس کا جواب:۔ کفار کی یہ تراشیدہ بات بھی "خوئے بد را بہانہ بسیار" والی بات تھی، اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ سیاسی اور معاشی فوائد تمہیں صرف اس بنا پر حاصل ہو رہے ہیں کہ ہم نے اس سرزمین کو حرم بنا دیا ہے۔ یہاں عرب بھر کے تمام قبائل حج کرنے آتے ہیں۔ کعبہ پر تمہاری تولیت کی وجہ سے تمہارا بھی عزت و احترام کرتے ہیں۔ عرب بھر میں یہی ایک پرامن خطہ ہے۔ اور اسے اللہ نے ہی پرامن بنایا ہے ورنہ عرب کے لٹیرے اور ڈاکو تمہیں کیسے جینے دیتے تھے۔ پھر تمہارے تجارتی قافلے بھی اسی حرم کی تولیت کی وجہ سے محفوظ سفر کر لیتے ہیں اور تم لوگ تجارت سے آسودہ حال بنے ہوئے ہو وہ بھی اسی حرم کی بدولت ہے۔ تو کیا جس اللہ نے تمہارے مشرک ہونے کے باوجود حرم کی وجہ سے تمہیں فائدے بخشے ہوئے ہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد وہ تمہارے یہ فائدے روک دے گا یا ان میں مزید اضافہ کر دے گا؟ نیز یہ بھی حرم ہی کی برکت ہے کہ اس بے آب و گیاہ علاقہ میں دنیا جہاں کے میوے اور پھل اور غلے اور دوسری ضرورت کی اشیاء پہنچ جاتی ہیں۔ اور اس کثرت سے پہنچتی ہیں کہ جہاں یہ اشیاء پیدا ہوتی ہیں وہاں بھی اتنی وافر مقدار میں دستیاب نہیں ہوتیں۔ گویا مکہ اس لحاظ سے عالمی تجارتی مرکز کی بھی حیثیت رکھتا

أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٥٧﴾ وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا ۖ فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَن
مِّن بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا ۖ وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ ﴿٥٨﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ حَتَّىٰ يَبْعَثَ فِي
أُمِّهَا رَسُولًا يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَىٰ إِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُونَ ﴿٥٩﴾ وَمَا أُوتِيتُم مِّن

میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں۔(۵۷) اور کتنی ہی بستیوں کو ہم نے تباہ کر دیا جو اپنی معیشت پر[۸۰] اترایا کرتی تھیں۔ سو یہ ہیں ان کے گھر (ویران پڑے ہوئے) ان میں سے چند ہی گھر ہوں گے جو ان کے بعد آباد ہوئے اور آخر ہم ہی ان کے وارث ہوئے[۸۱](۵۸) اور آپ کا پروردگار کسی بستی کو ہلاک نہیں کرتا تا آنکہ کسی مرکزی بستی میں[۸۲] رسول نہ بھیج لے، جو انہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتے نیز ہم صرف ایسی بستی کو ہی ہلاک کرتے ہیں جس کے رہنے والے ظالم ہوں۔(۵۹) تمہیں جو کچھ بھی دیا گیا ہے

ہے اگر تمہیں کفر کی حالت میں بھی یہ فوائد حاصل ہو رہے ہیں تو اللہ کے فرمانبردار بن جانے کے بعد آخر تمہیں حاصل کیوں نہ ہوں گے۔

[۸۰] یہ کفارِ مکہ کے اعتراض کا دوسرا جواب ہے یعنی تمہیں خطرہ یہ ہے کہ اگر تم مسلمان ہوگئے تو تمہاری سیاسی برتری اور تمہاری معیشت تباہ ہو جائے گی اور جس معیشت پر اس وقت تم اترا رہے ہو تو جن لوگوں نے تم سے پہلے اپنی معیشت پر گھمنڈ کیا تھا ان کا انجام بھی تمہارے سامنے ہے۔ ان لوگوں نے اسی گھمنڈ میں آکر تکبر اور سرکشی کی راہ اختیار کی تھی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس طرح تباہ و برباد کر ڈالا کہ ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہ گیا۔ ان کی بستیوں کے کھنڈرات تم دیکھتے رہتے ہو۔ پھر اگر تم نے بھی انہی لوگوں کی روش اختیار کی تو کیا وجہ ہے کہ تمہارا وہی انجام نہ ہو جو ان کا ہوا تھا۔

[۸۱] ❁ کفار کے اعتراض کا دوسرا جواب 'معیشت عذاب سے نہیں بچا سکتی:۔ یعنی اپنی معیشت پر اترانے اور اپنا معیار زندگی بلند رکھنے والے لوگ مر کھپ گئے اور ان کی جائیدادیں جن پر وہ گھمنڈ کیا کرتے تھے سب وہیں دھری کی دھری رہ گئیں ان کا کوئی وارث بھی باقی نہ رہا۔ بالآخر ہم ہی ان کے وارث ہوئے کہ جنہیں ہم چاہیں وہاں آباد کر کے وہ جائیدادیں ان کے حوالے کر دیں۔

[۸۲] ❁ اعتراض کا تیسرا جواب 'عذاب یا ہلاکت کے لئے ضابطہ:۔ یہ بھی دراصل کفار مکہ کے اعتراض کا تیسرا جواب ہے ان کا اعتراض یہ تھا کہ اگر ہم ایمان لے آئے تو ہم تو سیاسی اور معاشی طور پر تباہ ہو جائیں گے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کسی قوم کی تباہی کے متعلق اپنا ضابطہ بیان فرما دیا ہے کہ وہ کیوں آتی ہے اور کب آتی ہے۔ اور وہ ضابطہ یہ ہے کہ پہلے ہم کسی مرکزی شہر یا صدر مقام میں اپنا رسول بھیجتے ہیں۔ مرکزی مقام کا انتخاب اس لئے کیا جاتا ہے کہ ایک تو ارد گرد کی آبادیوں کا اس سے رابطہ ہوتا ہے دوسرے مرکزی شہر کے لوگ نسبتاً پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ بات کو جلد سمجھ سکتے ہیں اور دیہاتیوں کی نسبت مہذب بھی ہوتے ہیں۔ پھر یہ رسول اس مرکزی بستی کے لوگوں کو اللہ کے پیغام پہنچاتا ہے اور اللہ کی آیات پڑھ پڑھ کر سناتا ہے۔ اب اگر لوگ اس رسول کی دعوت کو قبول نہ کریں اور نافرمانی، تکذیب اور سرکشی کی راہ اختیار کریں تو اس اتمامِ حجت کے بعد اس

شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ اَفَمَنْ
وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ

وہ بس دنیوی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے، اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر [۸۳] اور پائندہ تر ہے۔ کیا تم سوچتے نہیں ؟(۶۰) بھلا جسے ہم نے کوئی اچھا وعدہ دیا ہو اور وہ اسے پانے والا ہو، اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جسے ہم نے دنیوی زندگی کا [۸۴] سامان دے رکھا ہو پھر وہ قیامت کے دن (سزا یا جوابدہی کے لیے) پیش کیا جانے والا ہو ؟(۶۱)

بستی کو ہلاک کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اے اہل مکہ! تمہارا یہ خیال کہ اسلام لانے سے تم تباہ ہو جاؤ گے، بالکل غلط ہے۔ بلکہ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ اس رسول کی بعثت کے بعد اگر تم نے سرکشی اختیار کر لی تو اس صورت میں تمہاری تباہی واقع ہو گی اور اس تباہی کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔

[۸۳] ❁ چوتھا جواب 'معیشت محض فانی زندگی کا سامان ہے:۔ یہ بھی دراصل ان کے اعتراض کا جواب ہے۔ یعنی سامان معیشت پر تم اس وقت اترا رہے ہو اور اس کے ضائع ہو جانے کے خوف کی بنا پر اسلام لانا گوارا نہیں کرتے اس کی زیادہ سے زیادہ مدت تمہاری موت ہے۔ جبکہ یہ تمہاری موت سے پہلے بھی تم سے چھینا جا سکتا ہے۔ موت کے بعد تو تمہیں اپنی سرکشی کے نتیجہ میں دائمی عذاب بھگتنا ہو گا۔ اس کے برعکس اگر تم ایمان لے آتے ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ تم سے یہ نعمتیں چھن جائیں البتہ کچھ مشکلات اور مصائب ضرور پیش آ سکتے ہیں۔ لیکن ان کے عوض تمہیں اجر ملے گا۔ وہ دائمی اور لازوال ہو گا اب یہ دونوں پہلو سامنے رکھ کر اور خوب سوچ سمجھ کر اپنے متعلق خود ہی فیصلہ کر لو۔

[۸۴] ❁ دنیاوی متاع کا حصول مذموم نہیں اِلا یہ کہ اس میں اخروی نقصان ہو:۔ اس آیت میں دو آدمیوں کا تقابل پیش کیا گیا ہے۔ ایک وہ جو آخرت کے بہتر انجام پر نظر رکھتا ہو اور اس بہتر انجام کے لئے ہی اپنی کوششیں صرف کر رہا ہو۔ دوسرا وہ شخص جس کا مطمح نظر صرف دنیوی مفادات اور ساز و سامان تک محدود ہو اور آخرت میں اس سے سختی سے بازپرس کی جانے والی ہو۔ اور سوال یہ اٹھایا گیا کہ خود ہی فیصلہ کر لو۔ ان دونوں میں سے کون بہتر ہے؟ اس آیت اور اس جیسی بعض دوسری آیات سے بعض لوگوں نے یہ غلط نتیجہ نکالا کہ شریعت کی نگاہ میں دنیا اور دنیا کے مفادات کا حصول مذموم چیز ہے اور اس سے حتی الوسع اجتناب کرنا چاہئے اور اپنی نظر صرف اخروی مفادات پر رکھنی چاہئے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو دعا سکھائی اور جسے رسول اللہ ﷺ اکثر اوقات میں پڑھا کرتے تھے وہ یہ ہے: ﴿رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (۲:۲۰۱) اس آیت میں دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کا اللہ سے مطالبہ کیا گیا ہے۔ بلکہ دنیا کی بھلائی کا مطالبہ آخرت سے پہلے ہے۔ ان سب آیات کو ملانے سے جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ شریعت کی نگاہ میں دنیا اور اس کا ساز و سامان صرف اس صورت میں مذموم ہو گا جب کہ اس سے اخروی مفادات کا نقصان ہو رہا ہو۔ مذموم چیز صرف یہ ہے کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو ترجیح دی جائے۔ جب آخرت کا نقصان ہو رہا ہو تو اس وقت ایک مسلمان کا طرز عمل یہی ہو گا کہ دنیوی مفادات کو لات مار دے۔

❁ بھلائی میسر آنے کے لحاظ سے انسانوں کی چار قسمیں:۔ پھر یہ بھی عین ممکن ہے کہ ایک شخص نے اخروی انجام سے

الْمُحْضَرِينَ ﴿٦١﴾ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٦٢﴾ قَالَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَغْوَيْنَا أَغْوَيْنَاهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۖ تَبَرَّأْنَا إِلَيْكَ ۖ مَا كَانُوا إِيَّانَا

جس دن اللہ انہیں پکارے گا اور ان سے پوچھے گا: ''کہاں ہیں وہ جنہیں تم میرا [۸۵] شریک سمجھا کرتے تھے۔(۶۲) اور وہ لوگ (اللہ کے مزعومہ شریک) جن پر عذاب کی بات واجب [۸۶] ہو جائے گی: پروردگار! ہم نے ان لوگوں (اپنے پیروؤں) کو گمراہ کیا تھا (اور) انہیں ایسے ہی گمراہ کیا جیسے ہم خود گمراہ تھے۔ اب ہم آپ کے سامنے ان سے براءت کا اظہار کرتے ہیں۔ انہوں نے ہماری عبادت [۸۷] نہیں کی تھی۔(۶۳)

آنکھیں بند رکھی ہوں تاکہ وہ دنیوی مفادات تو حسب خواہش حاصل کر لے مگر اسے زندگی بھر سوائے غربت اور مصائب و مشکلات کے کچھ حاصل نہ ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ انسان کا مطمح نظر تو صرف اخروی مفادات ہو لیکن اللہ تعالیٰ اسے اس دنیا میں بھی ہر طرح کی بے بہا نعمتوں اور ساز و سامان سے نواز دے جیسا کہ بعض انبیاء بادشاہ وقت بھی تھے۔ اس لحاظ سے انسانوں کی چار قسمیں بن جاتی ہیں۔ ایک وہ جنہیں دنیا اور آخرت دونوں میں بھلائی نصیب ہو اور یہ سب سے بہتر ہیں۔ دوسرے وہ جنہیں آخرت کی بھلائی تو نصیب ہو لیکن دنیا میں مشکل سے گزر بسر کریں۔ ان کا شمار بھی بہتر لوگوں میں ہے۔ تیسرے وہ جن کی آخرت تو خراب ہو مگر دنیا میں عیش و آرام میسر ہو۔ یہ حقیقت میں برے لوگ ہیں اور چوتھے وہ جن کی دنیا بھی خراب اور آخرت بھی خراب ہو۔ ایسے لوگ ہر لحاظ سے بدترین ہوئے۔ واضح رہے کہ اس آیت میں دوسری اور تیسری قسم کے لوگوں کا تقابل پیش کیا گیا ہے۔

[۸۵] ۞ اعتراض کا پانچواں جواب:۔ یہ آیت بھی مشرکینِ مکہ ہی سے متعلق ہے جو دنیوی مفادات کی خاطر شرک اور بت پرستی سے چمٹے رہنا چاہتے تھے۔ انہیں ان کی کرتوت کے نتیجہ سے آگاہ کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایسے مشرکوں سے پوچھے گا تم یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ یہ دنیوی مفادات تمہیں میرے شریکوں کی وجہ سے مل رہے ہیں۔ اب بتاؤ' آج وہ کہاں ہیں تاکہ آج بھی تمہیں کچھ فائدہ پہنچا سکیں۔ اگر آج وہ تمہیں کچھ فائدہ پہنچا سکے تو سمجھ لینا کہ دنیا میں بھی وہی فائدہ پہنچا رہے تھے اور اگر کچھ فائدہ نہ دے سکیں تو حقیقت تم پر خود واضح ہو جائے گی۔

[۸۶] اس سے مراد وہ شیاطین جن و انس ہیں جن کی کسی نہ کسی رنگ میں دنیا میں عبادت کی جاتی رہی ہے۔ یہاں عبادت سے مراد محض پوجا پاٹ نہیں بلکہ بندگی اور غلامی ہے۔ یعنی وہ لوگ جو چاہتے تھے کہ اللہ کے احکام کے مقابلہ میں ان کے احکام کی اطاعت کی جائے۔ خواہ یہ دنیوی حکام ہوں یا پیر و مشائخ کی قسم کے لوگ ہوں۔

[۸۷] ۞ عابد و معبود دونوں اپنی خواہش کے پیروکار تھے اور معبودوں کا جواب:۔ یعنی سوال تو اللہ مشرکوں سے کرے گا کہ تم نے جو میرے مقابل شریک بنا رکھے تھے وہ کہاں ہیں۔ لیکن وہ مشرک تو ابھی کچھ جواب نہ دینے پائیں گے کہ اس سے پیشتر یہ معبود حضرات خود ہی بول اٹھیں گے اور کہیں گے کہ پروردگار! واقعی ہم ان لوگوں کی گمراہی کا سبب ضرور بنے تھے۔ مگر ہم نے انہیں زبردستی اس بات پر مجبور نہیں کیا تھا۔ بلکہ یہ لوگ بھی ایسے ہی گمراہ ہوئے جیسے ہم خود ہوئے تھے۔ ہمیں بھی ہماری خواہشات نفس کی پیروی نے گمراہ کیا تھا۔ اور انہیں بھی اسی بات میں اپنے مفاد نظر آئے کہ وہ

يَعۡبُدُوۡنَ ﴿۶۳﴾ وَقِيۡلَ ادۡعُوۡا شُرَكَآءَكُمۡ فَدَعَوۡهُمۡ فَلَمۡ يَسۡتَجِيۡبُوۡا لَهُمۡ وَرَاَوُا الۡعَذَابَ‌ ۚ لَوۡ

اَنَّهُمۡ كَانُوۡا يَهۡتَدُوۡنَ ﴿۶۴﴾ وَيَوۡمَ يُنَادِيۡهِمۡ فَيَقُوۡلُ مَاذَاۤ اَجَبۡتُمُ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ﴿۶۵﴾ فَعَمِيَتۡ

عَلَيۡهِمُ الۡاَنۡۢبَآءُ يَوۡمَئِذٍ فَهُمۡ لَا يَتَسَآءَلُوۡنَ ﴿۶۶﴾ فَاَمَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًـا فَعَسٰۤى

اور ان (پیروکاروں) سے کہا جائے گا کہ: اب اپنے شریکوں کو (مدد کے لئے) پکارو۔ چنانچہ وہ پکاریں گے مگر یہ (شریک) انہیں کوئی جواب [۸۸] نہیں دیں گے اور سب کے سب عذاب دیکھ لیں گے۔ کاش! وہ ہدایت پانے والے ہوتے (۶۴) اور جس دن اللہ تعالیٰ انہیں پکارے گا اور پوچھے گا کہ: ”تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا تھا؟“[۸۹] (۶۵) تو اس دن انہیں (جواب دینے کو) کوئی بات بھی سجھائی نہ دے گی۔ نہ ہی وہ آپس میں ایک دوسرے سے [۹۰] کچھ پوچھ سکیں گے۔ (۶۶) البتہ جس شخص نے توبہ کر لی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کئے تو امید ہے [۹۱]

ہمارا ساتھ دیں۔ اگر یہ ہدایت کی راہ اختیار کرنے والے ہوتے تو ہماری ان پر کچھ زبردستی نہیں تھی۔ لہٰذا یہ لوگ ہرگز ہماری بندگی نہیں کر رہے تھے بلکہ اپنے نفس کی خواہشات کی بندگی کر رہے تھے ہم بھی یہی کچھ کرتے رہے اور یہ بھی وہی کچھ کرتے رہے۔ اس میں ہمارا کیا قصور تھا؟

[۸۸] ❁ مشرکوں سے پہلا سوال شرک سے متعلق اور دوسرا رسالت کے متعلق ہوگا:۔ ان معبود حضرات کی اس معذرت کے بعد اللہ تعالیٰ پھر مشرکوں سے کہیں گے کہ آج بھی اپنے معبودوں کو اپنی مدد کے لئے پکارو تو سہی۔ لیکن وہ معبود جو پہلے ہی ان سے بیزاری کا اعلان کر چکے تھے وہ انہیں کچھ جواب نہ دے سکیں گے اور اس کی اصل وجہ یہ ہوگی کہ کیا عابد اور کیا معبود سب کو ہی اپنا انجام نظر آ رہا ہوگا۔ اس وقت یہ سب حضرات نہایت حسرت کے ساتھ بول اٹھیں گے۔ کاش! ہم نے دنیا میں ہدایت کا راستہ اختیار کیا ہوتا۔

[۸۹] مشرکوں سے پہلا سوال تو توحید سے متعلق تھا۔ اب یہ سوال پیغام رسالت سے متعلق ہوگا۔ یعنی بات اتنی ہی نہیں تھی کہ عابد و معبود دونوں اپنی خواہشات کے پیچھے لگ کر گمراہ ہو رہے تھے بلکہ رسولوں نے بروقت انہیں ہدایت اور ضلالت کا فرق واضح طور پر بتا دیا تھا تو کیا پھر تم لوگوں نے ان رسولوں کی بات مان لی تھی؟

[۹۰] انہیں اس بات کی سمجھ ہی نہ آسکے گی کہ اللہ تعالیٰ کے اس سوال کا کیا جواب دیں۔ نہ ہی ان سے یہ بن آئے گا کہ کسی دوسرے سے پوچھ کر ہی اس سوال کا جواب دے سکیں۔ اس دن کی دہشت اتنی زیادہ ہوگی کہ وہ ایک دوسرے سے کوئی بات پوچھ ہی نہ سکیں گے۔

[۹۱] یہ شاہانہ انداز کلام ہے۔ یعنی اس دن وہ شخص ضرور فلاح پالے گا جس نے خواہش نفس کی پیروی اور اللہ کی نافرمانی سے توبہ کر لی اور ایمان لے آیا۔ پھر اس کے بعد اعمال بھی صالح بجا لاتا رہا۔ گویا فلاح کے لئے صرف توبہ اور ایمان لانے کا اقرار ہی کافی نہیں بلکہ اس ایمان کا عملی اظہار بھی ضروری ہے جو صرف نیک اعمال بجا لانے کی صورت میں ہی ہو سکتا ہے۔

اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ ﴿٦٧﴾ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ۭ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٨﴾ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٦٩﴾ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ

کہ وہ فلاح پا سکے۔(۶۷) اور آپ کا پروردگار جو چاہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہے (اپنے کام کے لئے)[۹۲] منتخب کر لیتا ہے۔ انہیں اس کا کچھ اختیار[۹۳] نہیں۔ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور جو کچھ یہ شریک بناتے ہیں اس سے وہ بالاتر ہے۔(۶۸) اور آپ کا پروردگار خوب جانتا ہے جو کچھ یہ لوگ[۹۴] اپنے سینوں میں چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔(۶۹) وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اسی کے لئے حمد ہے[۹۵]

[۹۲] یعنی چونکہ اللہ تعالیٰ ہی سب لوگوں کا خالق ہے اس لئے وہی یہ بات جان سکتا ہے کہ اس نے کس شخص کو کس طرح کی خصوصیات اور استعداد عطا کی ہے۔ پھر وہ اپنے اسی علم کی بنا پر اپنی مخلوق میں سے جسے چاہے اور جس کام کے لئے چاہے' چن لیتا ہے اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ چونکہ اللہ نے سب لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ لہٰذا اوامر و نواہی یا لوگوں کو کسی کام کا حکم دینے اور کسی کام سے باز رہنے کا حکم دینے کا اختیار بھی صرف اللہ ہی کو ہے نیز اگر اللہ کسی کو اپنا رسول بنا دے تو دوسرے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس پر اعتراض کرے اور اگر اللہ تعالیٰ کہے کہ رسول کی اطاعت تم پر فرض ہے۔ جو کچھ وہ کہے تمہیں کرنا ہو گا اور جس کام سے روکے اس سے رک جانا ہو گا اور اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے کی بات قبول نہیں کی جا سکتی تو کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ رسول کے افعال و اقوال پر اعتراض کرے۔

[۹۳] ❁ پیروں کو اختیار بخشنے والے مریدانِ باصفا:۔ یعنی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اختیارات کو دوسروں میں تقسیم کرنا شروع کر دیں۔ کسی کو بارش کا دیوتا سمجھنے لگیں کسی کو داتا اور گنج بخش بنا دیں۔ کسی کو بیماری و صحت کا مالک سمجھنے لگیں اور کسی کو فریادرس اور دستگیر قرار دے لیں۔ غرضیکہ میرے اختیارات میں سے جو اختیار جسے چاہے سونپ دے۔ کوئی فرشتہ ہو یا جن' نبی ہو یا ولی ہو سب ہمارے ہی پیدا کئے ہوئے ہیں اور انہیں اگر کچھ کمالات حاصل ہیں تو وہ بھی ہمارے ہی عطا کردہ ہیں پھر اس برگزیدگی کے آخر یہ معنی کیسے بن گئے کہ کسی مخلوق کو بندگی کے مقام سے اٹھا کر اسے اللہ تعالیٰ کے اختیارات میں شریک بنا دیا جائے۔ یہ انہوں نے کیسے سمجھ لیا کہ ان کو بھی اللہ کے اختیارات تقسیم کرنے کا کچھ حق ہے؟

[۹۴] بات مشرکین مکہ کے ان حیلوں بہانوں کی ہو رہی تھی جو وہ اسلام نہ لانے کے سلسلہ میں دلیل کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مشرکین مکہ خود بھی خوب سمجھتے ہیں کہ ان کے ایسے حیلوں اور اعتراضات کی کیا حقیقت ہے اور اللہ ان کے دلوں کے خیالات تک سے خوب واقف ہے وہ جانتا ہے کہ ان کے ایسے لغو اعتراضات میں وہ کون سے محرکات ہیں جو انہیں ایسی باتیں بنانے پر اکساتے ہیں اور ان کے ایمان نہ لانے کے اصل اسباب کیا ہیں؟ پھر اسی کے مطابق ان سے معاملہ بھی کرے گا۔

[۹۵] یعنی کائنات کی ایک ایک چیز اور مخلوق کے ایک ایک فرد کو پیدا کرنے والا تو اللہ تعالیٰ ہے۔ اور اس کام میں کسی دوسری ہستی کا کوئی عمل دخل نہیں۔ پھر ان دوسرے معبودوں کی خدائی اور ان کے خدائی اختیارات کہاں سے آ گئے۔ کائنات کی ایک

الْحَمْدُ فِي الْأُولَىٰ وَالْآخِرَةِ ۖ وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٧٠﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِن جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَ سَرْمَدًا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُم بِضِيَاءٍ ۖ أَفَلَا تَسْمَعُونَ ﴿٧١﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِن جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُم

اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ حکم اسی کا چلتا ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔(۷۰) آپ ان سے پوچھئے: بھلا دیکھو تو! اگر اللہ قیامت کے دن تک ہمیشہ تم پر رات ہی طاری کر دیتا تو اللہ کے سوا کوئی الٰہ ہے جو تمہیں روشنی لا دیتا؟ کیا تم سنتے نہیں"(۷۱) (یا) ان سے یہ پوچھئے: بھلا دیکھو! اگر اللہ قیامت کے دن تک ہمیشہ تم پر دن ہی چڑھائے رکھتا تو اللہ کے سوا کوئی الٰہ ہے۔ جو تمہارے لئے رات لے آتا جس میں[۹۶] تم

ایک چیز پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قابل تعریف صرف اللہ کی ذات ہے اور اگر کسی اور ہستی سے کوئی قابل تعریف کام صادر ہو تو وہ بھی حقیقتاً اللہ ہی کی تعریف ہے کیونکہ قابل تعریف کام کرنے کی استعداد بھی اسی نے عطا کی ہے۔ پھر جس طرح اللہ تعالیٰ نے موجودہ زمین و آسمان اور کائنات پیدا کی ہے اسی طرح آخرت میں اس موجودہ زمین و آسمان کے بجائے اور ہی زمین و آسمان پیدا کرے گا۔ جو موجودہ کائنات سے زیادہ پائیدار ہوں گے۔ یہاں بھی اسی کا حکم چلتا ہے اور آخرت میں بھی اسی کا حکم چلے گا۔ کیونکہ اس عالم کا خالق بھی وہی ہو گا اور جس طرح وہ دوسرے زمین و آسمان پیدا فرمائے گا اسی طرح تمہیں دوبارہ پیدا کر کے اپنے پاس حاضر کر لے گا اور اس دنیا میں کیے ہوئے تمہارے اعمال کا تم سے محاسبہ کرے گا۔

[۹۶] دن رات کے نظام سے اللہ کی قدرتِ کاملہ پر دلیل:۔ رات اور دن کے نظام کو اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر اپنے بہت بڑے بڑے قدرت کے کارناموں اور عجائبات میں شمار کیا ہے۔ ایک ظاہر بین انسان ان نشانیوں کو روزمرہ کے معمولات سمجھ کر ان کی طرف توجہ ہی نہیں دیتا۔ لیکن جن لوگوں نے اس نظام کا تحقیقی مطالعہ کیا ہے وہ اس نظام کی پیچیدگیوں کو خوب جانتے ہیں۔ یہ تو واضح سی بات کہ دن اور رات کا تعلق سورج سے ہے۔ اختلاف اگر ہے تو اس بات میں رہا ہے کہ آیا ہماری زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد گردش کرتا ہے یا سورج ساکن ہے اور زمین اس کے گرد گھومتی ہے یا یہ دونوں سیارے ہی محوِ گردش ہیں۔ اس سلسلہ میں آج تک چار نظریات بدل چکے ہیں۔ دورِ نبوی میں فلکیات کے ماہرین اور ہیئت دانوں کا نظریہ یہ تھا کہ ہماری زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد گھومتا ہے جبکہ آج کا نظریہ (چوتھا اور آخری نظریہ) یہ ہے کہ ہماری زمین ایک تو اپنے محور کے گرد گھوم رہی ہے۔ دوسرے یہ اپنے محور پر ۶۶ ڈگری درجے کا زاویہ بنائے ہوئے گھوم رہی ہے تیسرے یہ سورج کے گرد بھی گھوم رہی ہے۔ پھر ہمارا یہ پورا نظامِ شمسی اپنے سیاروں سمیت اپنے سے کسی بڑے سورج کے گرد چکر لگا رہا ہے اور اپنے محور کے گرد بھی چکر لگاتا ہے۔ اور یہ سب سیارے فضائے بسیط میں اس طرح محوِ گردش ہیں کہ کوئی دوسرے سے ٹکراتا نہیں۔ اپنے فاصلے برقرار رکھتے ہیں اور ان کی رفتار میں نہ کمی آتی ہے نہ زیادتی ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے اپنے مقام پر پوری طرح جکڑے ہوئے محوِ گردش ہیں۔ یہ ہے وہ انتہائی پیچیدہ نظام جس سے ہمارا نظام لیل و نہار پیدا ہوتا ہے۔ موسموں میں تبدیلی آتی ہے۔ کبھی دن بڑے ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور کبھی راتیں پھر ان تغیرات کے تمام زمینی مخلوق پر طرح طرح کے اثرات

بِلَيْلٍ تَسْكُنُونَ فِيهِ ۖ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ﴿٧٢﴾ وَمِن رَّحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٧٣﴾ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٧٤﴾ وَنَزَعْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا فَقُلْنَا هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوا أَنَّ

آرام کر سکتے؟ کیا تم دیکھتے نہیں؟[۹۷] (۷۲) یہ اس کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لئے رات اور دن[۹۸] بنائے تاکہ تم (رات کو) آرام کر سکو اور دن کو اس کا فضل تلاش کر سکو۔ (اگر سوچو) تو شاید تم اس کے شکر گزار بن جاؤ (۷۳) اور جس دن اللہ انہیں پکارے گا اور پوچھے گا: ''کہاں ہیں وہ جنہیں تم میرا شریک خیال کرتے تھے؟'' (۷۴) اور ہم ہر ایک امت سے ایک گواہ[۹۹] نکال لیں گے، پھر اسے کہیں گے کہ: (اس شرک پر) اپنی دلیل[۱۰۰] پیش کرو۔

مرتب ہوتے ہیں۔

اب موجودہ نظریہ کی رو سے یہ سوال یوں بنتا ہے کہ بتاؤ اگر اللہ تعالیٰ زمین کی اس محوری گردش کو روک دے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ زمین کے آدھے حصہ میں ہمیشہ رات ہی طاری رہے اور آدھا حصہ جو سورج کے سامنے ہو اس میں ہمیشہ سورج ہی چڑھا رہے تو بتاؤ کہ اللہ کے بغیر تمہارا کوئی الٰہ ایسا ہے جو اس زمین کی گردش کو پھر سے چالو کر دے اور تمہیں ان تمام مصائب سے بچا سکے جو اس صورت میں تمہیں پہنچ سکتی ہیں؟ رات کو اللہ نے تاریک اور ٹھنڈا بنایا ہے تو جس حصہ میں ہمیشہ رات رہے گی وہاں کے لوگ تو سردی سے ہی مر جائیں گے کام کرنا تو دور کی بات ہے۔ اور جس حصہ میں سورج چمکے گا وہاں کے لوگ سورج کی تپش سے مر جائیں گے آرام کرنا تو دور کی بات ہے۔ اللہ نے ایسا حکیمانہ نظام بنا دیا ہے جو تمام مخلوق کے مصالح پر مبنی ہے۔

[۹۷] اللہ نے رات کے ہمیشہ رہنے کا ذکر کیا تو فرمایا: ﴿أَفَلَا تَسْمَعُونَ﴾ اور ہمیشہ دن کے رہنے کا ذکر کیا تو فرمایا: ﴿أَفَلَا تُبْصِرُونَ﴾ یہ اس لئے کہ دیکھنے کا کام روشنی سے تعلق رکھتا ہے۔ اور تاریکی میں انسان دیکھ تو نہیں سکتا البتہ سن ضرور سکتا ہے۔

[۹۸] یہ اللہ کی خاص رحمت ہے کہ اس نے دن رات کا نظام ایسا بنا دیا جس میں تمام مخلوق کے لئے فائدے ہی فائدے ہیں۔ کوئی جاندار مسلسل کام نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اللہ نے رات بنا دی جو تاریک بھی ہوتی ہے اور ٹھنڈی بھی اور آرام یا نیند کے لئے یہی دو باتیں ضروری ہیں۔ ان دونوں کی موجودگی میں انسان گہری نیند سو کر دن بھر کی تھکاوٹ دور کر سکتا ہے۔ اور کام کاج کے لئے روشنی ضروری تھی لہٰذا دن اس غرض کے لئے دن بنا دیا۔ اب چاہئے تو یہ تھا کہ انسان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرتا مگر اس اوندھی عقل کے انسان نے اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے الٹا اس کے شریک بنانا شروع کر دیئے۔ اور کئی ہستیوں میں اللہ کے اختیارات کو بانٹنا شروع کر دیا جس کا اسے کوئی حق نہ تھا۔

[۹۹] یہ گواہ وہ شخص ہو گا جس کے ذریعہ اللہ کا پیغام اس قوم یا گروہ کو پہنچا ہو۔ خواہ وہ کوئی پیغمبر ہو یا کوئی دوسرا بزرگ ہو۔ اور وہ گواہ اس بات کی گواہی دے گا کہ میں نے اللہ کا پیغام ان لوگوں تک پہنچا دیا تھا۔

[۱۰۰] ۞ بزرگوں کے اقوال اور مکاشفات وغیرہ شرعی دلیل نہیں بن سکتے:۔ اس گواہی کے بعد مجرموں کو موقعہ دیا جائے گا کہ وہ اس گواہی کے خلاف کوئی عذر پیش کر سکتے ہیں تو کریں اور جب وہ کوئی عذر پیش نہ کر سکیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ تم

الْحَقَّ لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى
عَلَيْهِمْ ۖ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ ۤ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ

اب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ بات اللہ ہی کی سچی تھی اور جو کچھ وہ افترا کیا کرتے تھے انہیں کچھ یاد نہ آئے گا۔(۷۵) بلاشبہ قارون موسیٰ کی قوم (بنی اسرائیل) سے تھا: پھر وہ اپنی قوم کے خلاف ہو گیا (اور دشمن قوم سے مل گیا) اور ہم نے اسے اتنے خزانے دیئے تھے جن کی چابیاں ایک طاقتور جماعت بمشکل اٹھا سکتی تھی۔[۱۰۱] ایک دفعہ اس کی قوم

اللہ کا پیغام پہنچنے کے بعد بھی جو شرک میں ہی مبتلا رہے تو اس بات کے لئے تمہارے پاس کوئی دلیل ہے؟ اور اگر ہے تو اسے پیش کیوں نہیں کرتے؟ دلیل سے یہاں مراد کسی الہامی کتاب یا کتاب و سنت کی دلیل ہے۔ جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ اللہ تعالیٰ نے واقعی فلاں فلاں قسم کے اختیارات اپنے فلاں بندوں یا فلاں قسم کے بندوں کو تفویض کر رکھے ہیں۔ اس وقت انہیں اپنے سب اجتہادات، استنباطات اور کج بحثیاں بھول جائیں گی۔ اس لئے کہ شریعت کے واضح احکام کے مقابلہ میں بزرگوں کے اقوال اور مکاشفات کی کچھ حقیقت نہیں ہوتی۔ نہ ہی ایسی باتیں شرعی دلیل کہلا سکتی ہیں۔

[۱۰۱] ۞ قریشی مالداروں کے لئے قارون کی مثال:۔ قریش مکہ کا عذر یہ تھا کہ اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو عرب مشرک قبائل ان کے دشمن بن جائیں گے۔ نیز ان کا سیاسی اقتدار ہی ختم نہیں ہو گا بلکہ وہ معاشی طور پر تباہ ہو جائیں گے۔ اگرچہ یہ بات ان کے اسلام نہ لانے کا محض ایک بہانہ تھی۔ تاہم اس میں اتنی حقیقت ضرور تھی کہ قریشی سرداروں میں سے اکثر بہت دولتمند اور رئیس تھے۔ ان میں کچھ سود خور بھی تھے اور بہت سے لوگ اپنا سرمایہ شراکت کی بنیاد پر تجارت کرنے والے قافلوں کے افراد کو بھی دیتے تھے۔ ان کے تجارتی قافلے لوٹ مار سے بھی محفوظ رہتے تھے۔ علاوہ ازیں مکہ تجارتی منڈی بھی بنا ہوا تھا۔ لہٰذا ان میں کئی کروڑ پتی سیٹھ موجود تھے۔ اور جہاں ماحول ہی سارا مادہ پرستانہ ہو اور کسی شخص کی بزرگی اور عزت کو محض دولت کے پیمانوں سے ماپا جاتا ہو۔ وہاں ایسے سیٹھ لوگوں کو جس قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ بالکل ایسی ہی صورت حال قارون کی تھا جو ان سے بڑا سیٹھ تھی۔ اسی مناسبت سے اللہ تعالیٰ نے یہاں قارون کی مثال بیان فرمائی ہے۔

۞ قارون اور اس کے خصائل:۔ قارون صرف یہی نہیں کہ بنی اسرائیل سے تعلق رکھتا تھا بلکہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا چچا زاد بھائی تھا۔ اللہ نے اسے بے پناہ دولت عطا کر رکھی تھی اور وہ پورے علاقے کا رئیس اعظم تھا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اس سے زکوٰۃ کی ادائیگی کا مطالبہ کیا۔ اس کی زکوٰۃ بھی کروڑوں کے حساب سے بنتی تھی۔ لہٰذا اس نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔ انسان کی فطرت ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ جتنا زیادہ دولت مند بنتا جاتا ہے اتنا ہی وہ ننانوے کے پھیر میں پڑ جاتا ہے۔ اپنی تجوریوں سے کچھ نکالنے کے بجائے اس کا یہی جی چاہتا ہے کہ ان میں مزید کچھ ڈالا جائے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے زکوٰۃ کی ادائیگی کے مطالبہ پر نہ صرف یہ کہ اس نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا بلکہ بنی اسرائیل سے نکل کر وہ مخالف پارٹی یعنی فرعون اور اس کے درباریوں سے مل گیا۔ آدمی مالدار بھی تھا اور ہوشیار بھی۔ لہٰذا فرعون کے دربار میں اس نے ممتاز مقام حاصل کر لیا اور فرعون اور ہامان کے بعد تیسرے نمبر پر اسی کا شمار ہونے لگا۔ جیسا کہ سورہ مومن کی آیت نمبر ۲۳ اور ۲۴ میں مذکور ہے کہ:

لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴿٧٦﴾ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ
نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٧٧﴾ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ عِنْدِيْ ۭ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ
اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ۭ وَلَا يُسْـَٔـلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ

کے لوگوں نے اس سے کہا: ”اتنا اتراؤ نہیں“[۱۰۲] اللہ تعالیٰ اِترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔(۷۶) جو مال و دولت اللہ نے تجھے دے رکھا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کرو[۱۰۳] اور دنیا میں بھی اپنا حصہ فراموش نہ کرو اور لوگوں سے ایسے ہی احسان کرو جیسے اللہ نے تمہارے ساتھ بھلائی کی ہے۔ اور ملک میں فساد پیدا کرنے کی کوشش نہ کرو کیونکہ اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا(۷۷) وہ کہنے لگا: ”یہ تو جو کچھ مجھے ملا ہے اس علم کی بدولت[۱۰۴] ملا ہے جو مجھے حاصل ہے“ کیا اسے یہ معلوم نہیں۔ کہ اللہ اس سے پہلے ایسے بہت سے[۱۰۵] لوگوں کو ہلاک کر چکا ہے جو قوت میں اس سے سخت اور مال و دولت میں اس سے زیادہ تھے۔؟ اور مجرموں کے گناہوں کے متعلق ان سے

”ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی نشانیوں اور کھلی دلیل کے ساتھ فرعون، ہامان اور قارون کی طرف بھیجا تو وہ کہنے لگے کہ یہ تو ایک جادوگر ہے سخت جھوٹا“ (۴۰: ۲۳، ۲۴)

[۱۰۲] یہ بھی انسان کی فطرت ہے کہ اگر اللہ اسے اپنے انعامات سے نوازے تو وہ اپنے آپ کو عام انسانوں سے کوئی بالاتر مخلوق سمجھنے لگتا ہے۔ اس کی گفتگو، اس کا لباس، اس کی چال ڈھال، اس کے رنگ ڈھنگ غرضیکہ اس کی ایک ایک ادا سے نخوت اور بڑائی ٹپکنے لگتی ہے۔ اور وہ دوسروں کو کسی خاطر میں نہیں لاتا یہی صورت حال قارون کی تھی۔ بنی اسرائیل کے کچھ بزرگوں نے اسے ازراہ نصیحت کہا کہ اگر اللہ نے تمہیں مال و دولت سے نوازا ہے تو اپنے آپ کو ضبط اور کنٹرول میں رکھو، بات بات پر اترانا کوئی اچھی بات نہیں ہوتی اور نہ ہی اللہ ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہے۔

[۱۰۳] ❁ قارون کو حقوق کی ادائیگی کی نصیحت:۔ یعنی تمہاری دولت کا بہترین مصرف یہ ہے کہ اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر کے اپنی عاقبت سنوارنے کی کوشش کرو۔ نہ یہ کہ مال کے نشہ میں چور ہو کر دوسروں کو حقیر سمجھنے لگو۔ اس سے خود کھاؤ پیئو پہنو اور جو بچ جائے اس سے خویش و اقارب اور دوسرے لوگوں کی مالی اعانت کرو۔ اللہ کی مخلوق پر تم بھی ایسے ہی احسان کرو جیسے اللہ نے تم پر احسان کیا ہے اور مخلوق خدا کی دعائیں لو۔ اور اللہ کے فرمانبردار بن کر رہو۔ اپنے مال و دولت کا دوسروں پر رعب جمانا کوئی اچھا طریقہ نہیں۔ تمہاری اس دولت میں جو دوسروں کا حق ہے اسے ادا کرو اور معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں کا باعث نہ بنو۔

[۱۰۴] قارون اس نصیحت کے جواب میں کہنے لگا: میری دولت میں دوسروں کا حق کیسے آگیا۔ یہ ساری دولت میں نے خود کمائی ہے۔ محنت کر کے کمائی ہے۔ اپنے ہنر، تجربہ اور قابلیت کی بنا پر کمائی ہے۔ پھر اس میں دوسروں کا حق کیوں کر شامل ہو گیا؟ جو تم مجھے دوسروں کا حق ادا کرنے کی تلقین کرنے لگے ہو۔

[۱۰۵] ❁ قارون کا جواب اور ناعاقبت اندیشی:۔ قارون کو یہ جواب دیتے وقت اتنا بھی خیال نہ آیا کہ جس ہنر، تجربہ اور

الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۷۸﴾ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۷۹﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ

تو نہ پوچھا جائے گا۔[۱۰۶] (۷۸) پھر (ایک دن) وہ اپنی قوم کے لوگوں کے سامنے [۱۰۷] بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے نکلا۔ جو لوگ حیات دنیا کے طالب گار تھے وہ کہنے لگے: کاش ہمیں بھی وہی کچھ میسر ہوتا جو قارون کو دیا گیا ہے، وہ تو بڑا ہی بختوں والا ہے۔ (۷۹) مگر جن لوگوں کو علم [۱۰۸] دیا گیا تھا وہ کہنے لگے: جو شخص ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو اس کیلئے اللہ کے ہاں جو ثواب ہے وہ (اس سے) بہتر ہے۔

قابلیت کا وہ ذکر کر رہا ہے وہ اسے اللہ نے ہی بخشی ہے۔ لہٰذا وہ اپنے حقیقی محسن کو بھول کر اپنی دولت اور لیاقت پر ناز کرنے لگا۔ پھر اسے یہ بھی خیال نہ آیا کہ دولت ڈھلتی چھاؤں ہے اس کے پاس اگر جمع ہو گئی ہے تو اس سے چھن بھی سکتی ہے۔ پھر یہ دولت کیا امن و سلامتی کی بھی ضامن بن سکتی ہے؟ کتنے ہی لوگ تھے جو اس سے طاقت اور دولت میں بڑھ کر تھے لیکن جب انہوں نے سرکشی دکھائی تو اللہ نے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ اور اپنی ساری دولت اور خزانے اپنے پیچھے چھوڑ کر انتہائی بے بسی اور حسرت و یاس کی موت مر گئے۔

[۱۰۶] یعنی مجرموں کے تمام اعمال و اقوال کا ریکارڈ اللہ کے ہاں پہلے سے ہی موجود ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ مجرموں سے ان کے گناہوں کے متعلق سوال کیا جائے اور اگر وہ ان کا اعتراف کر لیں تو تب ہی ان کے جرم ثابت ہوں گے۔ اور قیامت کے دن ان سے پوچھا بھی جائے گا تو ان کو خلق خدا کے سامنے ذلیل و رسوا کرنے اور زجر و توبیخ کے طور پر پوچھا جائے گا۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ مجرموں کے اعمال کے اچھا یا برا ہونے کا معیار مجرموں کے اپنے خیال پر منحصر نہیں۔ مجرم تو ہمیشہ یہی دعویٰ کریں گے کہ وہ بڑے اچھے لوگ ہیں اور ان میں کوئی برائی نہیں۔ جیسے کہ قارون بھی اپنے آپ کو درست ہی سمجھتا تھا۔ لہٰذا مجرموں کو جو سزا ملے گی اس کا انحصار اس بات پر نہیں ہو گا کہ آیا مجرم خود بھی اس کام کو جرم سمجھتا ہے یا نہیں؟

[۱۰۷] ۞ قارون کا شاہانہ ٹھاٹھ کا مظاہرہ کرنا اور دنیاداروں کی آرزو:۔ یعنی اس کے کچھ گھڑ سوار خادم اس سے آگے چل رہے تھے اور خود لباس فاخرہ پہنے ایک عمدہ گھوڑے پر سوار تھا۔ پھر اس کے پیچھے بھی اس کے خادم گھڑ سواروں کا دستہ تھا۔ اس سے دراصل وہ اپنی شان و شوکت اور ٹھاٹھ باٹھ کا لوگوں کے سامنے مظاہرہ کرنا چاہتا تھا۔ اور یہی وہ متکبرانہ مظاہرہ ہے جو اللہ کو سخت ناپسند ہے اور اللہ ایسے لوگوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ مگر جو لوگ دنیا پر ریجھے ہوئے ہوں، انہیں ایسا ہی مظاہرہ ترقی کی انتہائی منزل نظر آتا ہے۔ چنانچہ دنیادار مادہ پرستوں نے جب قارون کو اس ٹھاٹھ باٹھ سے نکلتے دیکھا تو خود بھی اس منزل تک پہنچنے کی آرزو کرتے ہوئے کہنے لگے کہ یہ شخص تو بڑا ہی خوش نصیب ہے۔ کاش ہمیں بھی ایسا ساز و سامان میسر آ جاتا۔

[۱۰۸] علم سے مراد علمِ شریعت ہے۔ یعنی جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آخرت کی کامیابی کے مقابلہ میں دنیا کا ساز و سامان جتنا بھی ہو وہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ ایسے عالم لوگوں نے قارون اور اس کے ٹھاٹھ باٹھ پر ریجھنے والوں سے کہا، تمہاری دنیا سے یہ محبت تمہاری خطرناک بھول اور غلطی ہے۔ اصل کامیابی دنیا کی نہیں بلکہ آخرت کی کامیابی اور وہ اجر ہے جو ایماندار نیک لوگوں کو ملے گا۔

خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴿٨٠﴾ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ ۫ فَمَا
كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ﴿٨١﴾ وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ
تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَآ
اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۭ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٨٢﴾ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ ع ۸

اور وہ ثواب صبر کرنے والوں کو ہی [۱۰۹] ملے گا۔(۸۰)

پھر ہم نے قارون اور اس کے گھر کو (سب کچھ) زمین میں دھنسا دیا [۱۱۰] تو اس کے حامیوں کی کوئی جماعت ایسی نہ تھی جو اللہ کے مقابلہ میں اس کی مدد کرتی اور نہ ہی وہ خود بدلہ لے سکا۔(۸۱) اب وہی لوگ جو کل تک قارون کے رتبہ کی تمنا کر رہے تھے، کہنے لگے: ”ہماری حالت پر افسوس! اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کا چاہے رزق کشادہ [۱۱۱] کر دیتا ہے اور جس کا چاہے تنگ کر دیتا ہے۔ اگر اللہ ہم پر احسان نہ کرتا تو ہمیں بھی دھنسا دیتا۔ افسوس! اصل بات یہی ہے کہ کافر لوگ فلاح نہیں پا سکتے (۸۲) یہ آخرت کا گھر تو ہم ان

[۱۰۹] صبر کے مفہوم کی وسعت:۔ یہاں صبر بڑے وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اپنے آپ کو صرف حلال کمائی کا پابند بنائے رکھنا بھی صبر ہے۔ اللہ کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لینا بھی صبر ہے۔ دنیوی جاہ و حشمت کو دیکھ کر اس پر فریفتہ نہ ہونا بھی صبر ہے۔ اور اخروی نجات اور کامیابی کو مطمع نظر بنا کر اپنے آپ کو احکامِ الٰہی کا پابند بنانا صبر ہے۔ یعنی آخرت کا ثواب اور کامیابی انہیں لوگوں کا نصیب ہو گی جنہوں نے اس دنیا میں صبر، استقلال اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا ہو گا۔

[۱۱۰] قارون کا انجام:۔ کہتے ہیں کہ قارون جب موسیٰ علیہ السلام کا مخالف بن کر فرعون سے جا ملا تو اس نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو بدنام کرنے کے لئے ایک سازش تیار کی اور ایک فاحشہ عورت کو کچھ دے دلا کر اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ آپ پر زنا کی تہمت لگا دے۔ چنانچہ جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اسے قسم دے کر سچ سچ بات بتانے کو کہا تو اس نے بتا دیا کہ اس نے قارون کے بہکانے سے یہ حرکت کی تھی اور اصل مجرم قارون تھا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو اس کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا۔ آپ نے اس کے لئے بددعا کی۔ یہ اسی بددعا کا اثر تھا کہ قارون اپنے محل، اپنے خزانوں اور خادموں سمیت زمین میں دھنسا دیا گیا۔ زمین کا اتنا ٹکڑا ہی سارے کا سارا عام سطح زمین سے بہت نیچے چلا گیا اور جب اس پر یہ قہر الٰہی نازل ہوا تو اس وقت نہ اس کے خزانے کچھ کام آ سکے نہ اس کے خدام اور نہ ہی فرعون اور اس کے درباری اس کی مدد کو پہنچ سکے کہ وہ اسے زمین میں دھنس جانے سے بچا لیں۔

[۱۱۱] قارون کا یہ انجام دیکھ کر ان دنیا پر فریفتہ ہونے والوں کی آنکھیں کھل گئیں جو کل یہ سمجھ رہے تھے کہ قارون کس قدر خوش نصیب آدمی ہے۔ اور ان پر حقیقت واضح ہو گئی کہ جس شخص کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہو ضروری نہیں کہ اللہ بھی

نَجۡعَلُهَا لِلَّذِيۡنَ لَا يُرِيۡدُوۡنَ عُلُوًّا فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فَسَادًا‌ ؕ وَالۡعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۸۳﴾ مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيۡرٌ مِّنۡهَا‌ ۚ وَمَنۡ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجۡزَى الَّذِيۡنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوۡا

لوگوں کے لئے مخصوص کر دیتے ہیں جو زمین میں بڑائی [۱۱۲] یا فساد [۱۱۳] نہیں چاہتے اور (بہتر) انجام تو پرہیزگاروں کے لئے ہی ہے۔(۸۳) جو کوئی نیکی لے کر آئے گا اسے اس سے بہتر نیکی ملے گی [۱۱۴] اور جو برائی لے کر آئے گا تو ایسے لوگوں کو برائیوں کا اتنا ہی بدلہ ملے گا جس قدر انہوں نے کی ہوں گی۔(۸۴)

اس پر خوش ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو قارون کبھی اس عذاب الٰہی کا شکار نہ ہوتا۔ اور دوسری بات انہیں معلوم ہوئی کہ جب اللہ کا عذاب آتا ہے تو مال و دولت کس قدر بھی زیادہ ہو کسی کام نہیں آسکتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات یہی مال و دولت عذاب الٰہی کو کھینچ لانے کا سبب بن جاتا ہے۔ لہٰذا انسان کی خوش نصیبی کا معیار مال و دولت ہرگز نہیں ہو سکتا۔ رزق کی کمی بیشی اور چیز ہے اور انسان کی فلاح اور خوش نصیبی اور چیز ہے۔ اور یہ اچھا ہوا کہ ہماری آرزو کرنے کے باوجود اللہ نے ہمیں مال و دولت کی فراوانی عطا نہیں کی ورنہ ہمارا بھی وہی حشر ہوتا جو قارون کا ہوا ہے۔

[۱۱۲] عُلُوًّا بمعنی سربلند، متکبر، مغرور یعنی وہ بڑا بن کر نہیں رہتے نہ دوسروں کو دبا کر رکھتے ہیں بلکہ متواضع اور منکسر المزاج بن کر اور اللہ کے فرمانبردار بن کر رہتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے آخرت کا گھر مختص ہے۔ سربلندی اور ناموری چاہنے والوں اور متکبر بن کر رہنے والوں کے لئے ہرگز نہیں ہے۔

[۱۱۳] ❁ فساد کا مفہوم...... فساد فی الارض کیا ہے؟:۔ فساد کے لفظ کا اطلاق عموماً چوری، ڈاکہ، غصب، غبن لوٹ مار اور قتل و غارت کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے جبکہ شرعی اصطلاح فساد فی الارض کے معنوں میں اس سے بہت زیادہ وسعت ہے یعنی وہ کام جس میں انسان اپنے حق سے تجاوز کر رہا ہو یا دوسرے کے حق پامال کر رہا ہو وہ فساد فی الارض کے ضمن میں آئے گا۔ قارون کے قصہ میں اللہ نے قارون کو فساد فی الارض کا مجرم قرار دیا ہے۔ حالانکہ وہ نہ چوری کرتا تھا نہ لوٹ مار یا قتل و غارت' ان میں سے کوئی کام بھی نہیں کرتا تھا۔ اس کا فساد فی الارض یہ تھا کہ اس کے مال میں دوسروں کا حق شامل تھا وہ اسے ادا نہیں کر رہا تھا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص دھوکے سے یا جھوٹی قسم کھا کر اپنا مال بیچ رہا ہے تو اگرچہ معاشرہ اسے فسادی نہیں سمجھتا لیکن شرعی لحاظ سے وہ فسادی ہے؟۔ کیونکہ اس نے فریب یا جھوٹی قسم کے ذریعہ چیز کی اصل قیمت سے زیادہ وصول کر کے خریدار کو نقصان پہنچایا یا اس کا حق غصب کیا ہے گویا فساد سے مراد انسانی زندگی کے نظام کا وہ بگاڑ ہے جو حق سے تجاوز کرنے کے نتیجہ میں لازماً رونما ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر احکام الٰہی سے تجاوز کرتے ہوئے انسان جو کچھ بھی کرتا ہے وہ فساد ہی فساد ہے اور سب سے بڑا فساد اللہ کی حق تلفی یا شرک ہے۔

[۱۱۴] اس آیت میں جزا و سزا سے متعلق ضابطہ الٰہی بتایا گیا ہے جو یہ ہے کہ نیکی کا بدلہ اللہ تعالیٰ اس کے اصل اجر سے بہت زیادہ دے گا جو دس گناہ سے سات سو گناہ تک بھی ہو سکتا ہے بلکہ اس سے زیادہ بھی اور یہ اس کے فضل و رحمت اور احسان کی بنا پر ہو گا۔ اور برائی کا بدلہ اتنا ہی ملے گا جتنی برائی تھی۔ یعنی اس بدلہ میں زیادتی نہ ہو گی اور یہ اس کی صفت عدل کا تقاضا ہے۔

دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ نیکی پر اللہ نے وعدہ فرمایا کہ اس کا بدلہ ضرور ملے گا اور برائی پر یہ وعدہ نہیں فرمایا کہ اس کا

يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾ اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ؕ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى وَمَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۸۵﴾ وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ

اے نبی! بلاشبہ جس (اللہ) نے آپ پر قرآن (پر عمل اور اس کی تبلیغ) [۱۱۵] فرض کیا ہے وہ آپ کو (بہترین) [۱۱۶] انجام کو پہنچانے والا ہے۔ آپ ان (کافروں) سے کہئے کہ: میرا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون ہدایت [۱۱۷] لے کر آیا ہے اور کون واضح گمراہی میں پڑا ہے۔(۸۵) آپ کو ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ یہ کتاب [۱۱۸] (قرآن) آپ پر نازل کی جائے گی۔

بدلہ ضرور مل کر رہے گا۔ کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ معاف فرمادے۔ البتہ یہ بیان فرمادیا کہ اپنے کئے سے زیادہ سزا نہیں ملے گی۔

[۱۱۵] یعنی قرآن لوگوں پر پڑھ کر سنانے، قرآن کی تعلیم دینے، اس پر عمل پیرا ہو کر دوسروں کو دکھانے اور اس کی اشاعت و تبلیغ کی ذمہ داری آپ پر ڈالی ہے۔

[۱۱۶] ۞ معاد کے مختلف مفہوم:۔ معاد کے معنی ہیں عود کرنے 'لوٹنے کی جگہ یا لوٹنے کا وقت۔ چونکہ اس لفظ کے معنی میں کافی وسعت ہے۔ لہٰذا اس کی تعبیر میں اختلاف ہے۔ اکثر مفسرین نے معاد سے مراد فتح مکہ ہی لیا ہے ان کے قول کے مطابق یہ آیت مکہ سے مدینہ کو ہجرت کے دوران نازل ہوئی تھی۔ اس وقت ہی آپ کو یہ خوشخبری سنادی گئی تھی کہ آپ پھر اس شہر مکہ کو آنے والے ہیں اور یہی مفہوم ﴿وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ﴾ سے بھی متبادر ہوتا ہے اور بعض لوگوں نے معاد سے جنت اور اس سلسلہ میں اللہ نے آپ سے جو وعدے کئے ہیں، یہ سب کچھ مراد لیا ہے اور بعض حضرات نے معاد سے مراد آپ کی زندگی کا آخری وقت لیا ہے۔ جبکہ پورے کا پورا جزیرۃ العرب اسلام کے زیر نگین آ گیا تھا۔ اور یہ برتری آپ ﷺ سے پہلے کسی شخص کو بھی حاصل نہ ہوئی تھی کہ کم از کم سیاسی طور پر ہی سارا عرب اس کے زیر نگین ہو اور پورے جزیرۃ العرب کے محض سیاسی حکمران ہی نہیں تھے بلکہ اسلام کے بغیر کوئی بھی دین جزیرۃ العرب میں باقی نہیں رہ گیا تھا۔

[۱۱۷] کفار مکہ جن جن القابات سے آپ ﷺ کو نوازا کرتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تم آبائی دین کو چھوڑ کر بہک گئے ہو اور یہ بات ایک دفعہ نہیں کئی بار وہ دہرا چکے تھے لہٰذا یہ اور ایسی ہی دیگر آیات آپ کی تسلی کے لئے مختلف اوقات میں اور مختلف سورتوں میں نازل ہوتی رہیں۔

[۱۱۸] ۞ نبی کو نبوت ملنے تک یہ علم نہیں ہوتا کہ اسے نبوت ملنے والی ہے:۔ اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کسی نبی کو بھی نبوت ملنے سے پہلے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اسے نبوت عطا ہوگی۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا ہونے کا واقعہ قرآن میں متعدد بار آیا ہے۔ کہ کس طرح وہ ایک اندھیری اور ٹھنڈی رات کو راہ بھولے ہوئے آگ کی تلاش میں نکلے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بلا کر نبوت سے سرفراز کر دیا۔ بالکل یہی صورت حال آپ سے بھی غار حرا میں پیش آئی تھی۔ پہلی وحی کے بعد آپ گھبرائے ہوئے گھر پہنچے اور کہا: "مجھے کپڑا اوڑھا دو، کپڑا اوڑھا دو" پھر جب ذرا گھبراہٹ دور ہوئی تو آپ ﷺ نے سیدہ خدیجہ سے غارِ حرا کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ((اِنِّيْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ)) یعنی "مجھے تو اپنی

الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَلَا تَدْعُ مَعَ

یہ تو صرف اللہ کی مہربانی ہے۔ لہٰذا آپ ہر گز کافروں کے مددگار نہ بنئے۔[۱۱۹] (۸۶)

اور ایسا نہ ہونا چاہئے کہ آپ کی طرف اللہ تعالیٰ کی آیات نازل ہونے کے بعد کافر آپ کو ان پر عمل پیرا ہونے سے روک دیں۔ آپ انہیں اپنے پروردگار کی طرف دعوت دیجئے اور شرک کرنے والوں میں شامل نہ ہوں[۱۲۰] (۸۷)

جان کا بھی خطرہ پڑ گیا تھا" پھر سیدہ خدیجہ آپ کو ساتھ لے کر اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو ایک نصرانی عالم اور نیک سیرت انسان تھے۔ انہوں نے آپ ﷺ کو بتایا کہ یہ تو وہی فرشتہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوتا تھا" (بخاری۔ باب کیف کان بدأ الوحی الی رسول اللہ ﷺ)

❁ آپ افضل الانبیاء کیسے ہیں؟ دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہر دور کا نبی اپنے دور کا بہترین انسان ہوتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ اسے نبوت کے لئے منتخب فرماتا ہے۔ نبوت عطا ہونے کے بعد اس کے فضل و شرف میں مزید اضافہ ہوجاتا اور ہوتا رہتا ہے۔ شریعت کا ایک اصول یہ ہے۔ (الدال علی الخیر کفاعله) یعنی "بھلائی کی طرف رہنمائی کرنے والا اس کے کرنے والے کی طرح ہی ہوتا ہے"۔ بمعنی اسے بھی اتنا ہی اجر ملتا ہے جتنا کرنے والے کو ملتا ہے۔ اس لحاظ سے ہر نبی اپنی امت کے نیک اعمال بجالانے والوں کے برابر کے اجر کا مستحق ہوتا ہے اور یہ اس کا اضافی اجر ہوتا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کی امت چونکہ تمام انبیاء سے زیادہ ہے لہٰذا تمام انبیاء پر آپ ﷺ کی افضلیت بھی ثابت ہوگئی۔ یہی وہ فضل و شرف ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا﴾ (۴: ۱۱۳) اور اللہ تعالیٰ کا آپ پر یہ فضل کہ آپ کو نبوت بھی عطا کی گئی اور کتاب بھی دی گئی ایسا فضل تھا جس کی آپ ﷺ کو بالکل توقع نہیں تھی۔

[۱۱۹] یعنی اگر آپ کی قوم قریش اور آپ کے بھائی بند اور رشتہ دار دین کے معاملہ میں آپ کا ساتھ نہیں دے رہے بلکہ مخالفت پر اتر آئے ہیں تو اب نہ انہیں اپنا رشتہ دار سمجھو اور نہ کسی بھی معاملہ میں ان کا ساتھ دو یا ان کی حمایت کرو۔ آپ کی مدد اور حمایت کے اب وہی لوگ مستحق ہیں جو آپ پر ایمان لا کر آپ کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اور اللہ نے آپ پر جو اتنی بڑی مہربانی فرمائی ہے تو اس کے شکریہ کے طور پر آپ دین کے معاملہ میں اپنی قوم کی رعایت اور خاطر ہر گز نہ کیجئے۔ اور نہ ہی اپنے آپ کو ان میں کا ایک فرد شمار کیجئے۔ ہاں ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت ضرور دیتے رہئے مگر احکام الٰہی میں قرابت داری کی بنا پر کوئی لچک نہ رہنے دیجئے۔

[۱۲۰] یہ خطاب آپ ﷺ کی طرف محض تاکید مزید کے لئے ہے۔ ورنہ آپ سب سے زیادہ شرک کے خلاف ہی جہاد فرما رہے تھے اور آپ سے شرک کا صدور نا ممکن تھا۔ گویا آپ کو خطاب اس لئے کیا گیا کہ دوسروں کو ٹھیک طرح تنبیہ ہو جائے۔

اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۟ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۭ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۸۸

اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے الٰہ کو مت پکاریں (کیونکہ) اللہ کے سوا [۱۲۱] کوئی الٰہ نہیں۔ اس کی ذات کے بغیر ہر چیز ہلاک ہونے والی [۱۲۲] ہے۔ حکم اسی کا چلتا ہے اور تم سب [۱۲۳] اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ (۸۸)

[۱۲۱] یہ وہ جملہ ہے جو کہ دعوت اسلام کا خلاصہ ہے۔ قرآن کریم کی اکثر سورتوں کا آغاز بھی شرک کی تردید اور توحید کی دعوت سے ہوتا ہے اور اختتام بھی ایسی ہی آیات پر ہوتا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا سب سے اہم موضوع یہی ہے۔

[۱۲۲] ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔ جو چیز بھی مخلوق ہے وہ ضرور فنا ہونے والی ہے یہ فنا کب ہوگی قیامت کو یا اس سے بھی مدتوں بعد؟ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے جس طرح اللہ خود مخلوق نہیں بلکہ ہر چیز کا خالق ہے اسی طرح اللہ کی صفات بھی مخلوق نہیں جیسے لوح محفوظ اور قلم جو کہ اللہ کی صفت علم سے تعلق رکھتی ہیں۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اللہ کے سوا آٹھ چیزیں ایسی ہیں جو قیامت کو بھی فنا نہ ہوں گی۔ اللہ کا عرش اور کرسی، بہشت اور دوزخ، روح اور ریڑھ کی ہڈی کا نقطہ عجب الذنب' لوح محفوظ اور قلم۔ واللہ اعلم بالصواب

[۱۲۳] چونکہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق اور مالک ہے لہٰذا کائنات کی ہر چیز پر حکم بھی اس کا چلتا ہے۔ اور جنوں اور انسانوں میں بھی طبعی امور میں اسی کا حکم چلتا ہے البتہ اختیاری امور میں بھی انہیں اللہ کے حکم کا پابند رہنے کا حکم دیا گیا ہے اور اسی میں ان کا بھلا ہے۔ رہا آخرت کو اللہ کی طرف لوٹنے کا حکم تو یہ اختیاری امر نہیں بلکہ اللہ کا ایسا حکم ہے جو ہو کر رہے گا۔ پھر اس دن حکم بھی صرف اسی کا چلے گا۔ اسی کی عدالت ہوگی اور اسی کے فیصلے نافذ ہوں گے۔

۶۹ آیاتھا سُورَةُ الْعَنْكَبُوتِ مَكِّيَّةٌ رکوعھا ۷

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

الٓمٓ ﴿۱﴾ أَحَسِبَ النَّاسُ أَن يُتْرَكُوا أَن يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ﴿۲﴾ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ
مِن قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ ﴿۳﴾ أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ

کلمات - ۹۹۰ آیت ۶۹ (۲۹) سورہ العنکبوت مکی ہے (۸۵) رکوع ۷ حروف ۴۴۱۰

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

الف۔ لام۔ میم (۱) کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اگر انہوں نے "ہم ایمان لائے" کہہ دیا ہے تو انہیں چھوڑ دیا
جائے گا اور ان کی آزمائش[۱] نہ کی جائے گی۔(۲) حالانکہ ہم نے ان لوگوں کو آزمایا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے[۲]
ہیں۔ اللہ تعالیٰ ضرور یہ معلوم[۳] کرنا چاہتا ہے کہ ان میں سے سچے کون ہیں اور جھوٹے کون (۳) یا جو لوگ برے

[۱] یہ سورت اس زمانہ میں نازل ہوئی جب مکہ میں مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھائے جا رہے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو دل سے تو اسلام کی حقانیت پر یقین رکھتے تھے مگر مصائب و مشکلات سے گھبرا کر اپنے ایمان کا اعلان نہیں کرتے تھے۔ کچھ ایسے بھی مسلمان تھے جو اسلام لانے کی حد تک تو بہت مخلص تھے مگر مشکلات کے وقت گھبرا جاتے تھے اور مسلمانوں کا ایک کثیر طبقہ ایسا راسخ الایمان لوگوں کا بھی تھا جو ان مصائب کو اللہ کی رضا کی خاطر بڑی فراخدلی اور خندہ پیشانی سے برداشت کر رہا تھا۔ اس آیت میں ہر طرح کے لوگوں کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ یہی مصائب و مشکلات ہی ان کے ایمان کی کسوٹی ہیں اور انہی سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ فلاں شخص کس حد تک اپنے ایمان کے دعویٰ میں پختہ ہے۔

[۲] ❁ ایمانداروں کی مصائب کی کسوٹی پر جانچ:۔ سیدنا خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اس وقت آپ کعبہ کے سایہ میں ایک چادر پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ اس زمانہ میں ہم مشرک لوگوں سے سخت تکلیفیں اٹھا رہے تھے۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: "آپ اللہ سے دعا کیوں نہیں کرتے؟" یہ سنتے ہی آپ (تکیہ چھوڑ کر سیدھے) بیٹھ گئے۔ آپ کا چہرہ (غصہ سے) سرخ ہو گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم سے پہلے ایسے لوگ گزر چکے ہیں جن کے گوشت اور پٹھوں میں ہڈیوں تک لوہے کی کنگھیاں چلائی جاتی تھیں مگر وہ اپنے سچے دین سے نہیں پھرتے تھے اور آرا ان کے سر کے درمیان میں رکھ کر چلایا جاتا اور دو ٹکڑے کر دیئے جاتے مگر وہ اپنے دین سے نہ پھرتے۔ اور اللہ اپنے اس کام (غلبہ حق) کو ضرور پورا کر کے رہے گا۔ (بخاری۔ کتاب المناقب۔ باب مالقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم و اصحابه من المشركين بمكة)

[۳] ❁ عقیدہ بدا اور اس کا جواب:۔ فلیعلمن سے ایک گمراہ فرقہ نے یہ عقیدہ اخذ کیا کہ جوں جوں واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں اللہ کو ان کا علم ہوتا جاتا ہے اور اس عقیدہ کو وہ لوگ اپنی اصطلاح میں بدا کہتے ہیں۔ حالانکہ بے شمار آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات اور اس میں ظہور پذیر ہونے والے تمام واقعات کا اللہ تعالیٰ کو پہلے سے ہی علم ہے۔ اور اس کا یہ علم

يَعْمَلُونَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۴﴾ مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ

کام کر رہے ہیں وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ وہ ہم سے بازی[۴] لے جائیں گے؟ وہ کیسا برا فیصلہ کر رہے ہیں(۴) جو شخص اللہ تعالیٰ[۵] سے ملنے کی توقع رکھتا ہے تو اللہ کا مقرر کردہ وقت آنے ہی والا ہے اور

بھی اس کی ذات کی طرح ازلی ابدی ہے۔ اور اس آیت یا اس جیسی بعض دوسری آیات سے جو اللہ تعالیٰ کے حدوث علم کا وہم پیدا ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ماضی، حال اور مستقبل کی تقسیم صرف ہم انسانوں کے لئے ہے اللہ تعالیٰ کے لئے زمانہ کی یہ تقسیم کوئی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ ہر واقعہ خواہ وہ ہمارے خیال کے مطابق زمانہ ماضی سے تعلق رکھتا ہو یا حال سے یا مستقبل سے اس کے لئے غیب نہیں بلکہ شہادت ہی شہادت ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے مستقبل کی خبروں کو بے شمار مقامات پر زمانہ ماضی کے صیغہ میں ذکر فرمایا ہے۔ جیسے ﴿وَنَادٰى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ......﴾(۷:۴۴) یا جیسے ﴿وَاِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ﴾(۸۱:۱) لیکن یہ ایسے واقعات کے متعلق ہوتا ہے جو انسانوں کے تجربہ و مشاہدہ میں نہ آسکتے ہوں۔ اور جو انسانوں کے تجربہ اور مشاہدہ میں آسکتے ہوں تو ان کا تعلق یقیناً حال اور مستقبل سے ہوگا۔ لہٰذا ایسے مقامات پر اللہ تعالیٰ نے مضارع کا صیغہ استعمال فرمایا ہے اور اس کا مطلب صرف یہ ہی نہیں ہوتا کہ ہم جان لیں یا معلوم کر لیں بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ تم لوگ جان لو۔ جیسا کہ اس مقام پر ہے یا اور بھی کئی مقامات پر ایسا انداز اختیار کیا گیا ہے۔

اور اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو فی الواقع ہر شخص کے متعلق پہلے سے علم ہے کہ فلاں شخص کیسے خصائل کا مالک ہے۔ لیکن محض اللہ اپنے علم کی بنا پر کسی کو جزا یا سزا نہیں دیتا جب تک فی الواقع وہ بات عملی صورت نہ اختیار کر لے۔ مثلاً یہ بات اللہ کے علم میں ہے کہ فلاں شخص فلاں وقت چوری کرے گا۔ لیکن اس علم پر سزا مترتب نہ ہوگی جب تک فی الواقع وہ شخص چوری نہ کر لے۔ گویا اللہ تعالیٰ یہ انداز بیان اس وقت اختیار کرتے ہیں جب اس کا تعلق دوسرے لوگوں کے علم سے ہو یا مشاہدہ سے ایسی آیات میں علم کا ترجمہ مشاہدہ یا دیکھنے سے کیا جا سکتا ہے اور سیدنا ابن عباس اس کا معنی لِنَرِيَ ہی کرتے ہیں۔ (ابن کثیر)

اور اگر علم کا ترجمہ جاننے سے ہی کیا جائے تو اس "جاننے" میں اللہ کے علاوہ دوسرے لوگ بھی شریک ہوں گے۔ اور بعض علماء نے ایسے مقامات پر لفظ علم کا ترجمہ جاننے کے بجائے جتلانے سے کیا ہے۔

[۴] اس جملہ کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ اگر ہم ان پر گرفت کرنا چاہیں تو یہ لوگ ہماری گرفت سے بچ کر کہیں جا نہیں سکتے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی سر توڑ مخالفانہ کوششوں اور سازشوں کے باوجود خود ہی ناکام رہیں گے اور غلبہ اسلام کی راہ روکنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں گے، اور اگر وہ ایسا گمان کرتے ہیں کہ وہ یقیناً کامیاب ہو جائیں گے تو یہ ان کی زبردست بھول اور غلط قسم کا فیصلہ ہے۔ واضح رہے کہ اس آیت میں روئے سخن صرف کافروں کی طرف ہے۔

[۵] اور جو لوگ دین اسلام کی سربلندی کے لئے ہر طرح کے مصائب و مشکلات بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کر رہے ہیں اس توقع پر کہ موت کے بعد یقیناً انہیں ان باتوں کا اجر ملنے والا ہے تو انہیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ان کی موت کا وقت آنے ہی والا ہے۔ دنیا کی زندگی بس چندروزہ زندگی ہے۔ اس کے بعد یقیناً ان کی اللہ سے ملاقات ہوگی اور انہیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا۔ کیونکہ ان کے تمام اعمال و اقوال اللہ سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

اٰتٍ ؕ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۵ وَ مَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ

اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔(۵) اور جو شخص جہاد کرے تو وہ اپنے ہی فائدے کے لئے جہاد[۶] کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ یقیناً اہل عالم سے بے نیاز[۷] ہے(۶)

اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ہم ضرور ان کی برائیاں دور کر دیں[۸] گے اور جو کچھ انہوں

[۶] جہاد کے مختلف محاذ اور اقسام:۔ جہاد بمعنی کسی انسان کی مقدور بھر کوشش جو اسلام کے نفاذ اور اس کی سربلندی کے لئے کی جائے۔ پھر اس جہاد کی اقسام بھی متعدد ہیں اور محاذ بھی متعدد ہیں۔ اقسام سے مراد مثلاً زبان سے جہاد ایک دوسرے کو سمجھانا اور تلقین کرنا یا تقریروں کے ذریعہ تبلیغ کرنا اور قلم سے جہاد یعنی اسلامی تعلیمات کی اشاعت اور اسلام پر وارد ہونے والے اعتراضات اور حملوں کا جواب لکھنا اور پھر اس کے بعد اجتماعی جہاد یا جہاد بالسیف یا قتال فی سبیل اللہ ہے۔ اور جہاد کا سب سے پہلا محاذ انسان کا اپنا نفس ہے۔ پھر اس کے بعد عزیز واقارب پھر اس کے بعد پورا معاشرہ ہے۔ اور آخری محاذ قتال فی سبیل اللہ یعنی ان کافروں سے جنگ کرنا ہے جو اسلام کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہو گئے ہوں یا اسلام کو نیست و نابود کرنے پر تلے بیٹھے ہوں۔

جہاد اگر نفس سے کیا جائے گا تو جہاد کرنے والے کی اپنی اخلاقی اور روحانی اصلاح ہو گی اگر اجتماعی جہاد اپنے معاشرہ سے کیا جائے گا تو پورا معاشرہ بے حیائیوں سے اور ظلم و جور سے پاک ہو گا اور اگر جہاد بالسیف کیا جائے گا تو اس سے مسلمانوں کو سیاسی فائدے حاصل ہوں گے۔ جس قسم کا بھی جہاد کیا جائے گا، بالآخر اس کا فائدہ جہاد کرنے والے کی ذات کو ہی پہنچے گا۔

[۷] جہاد کی توفیق دینا بھی اللہ کی مہربانی ہے:۔ یعنی جہاد کرنے والا اگر جہاد نہ کرے تو اللہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچے گا اور اگر جہاد کرتا ہے تو بھی اللہ کو اس کا کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اور اللہ کی بے نیازی کا تو یہ عالم ہے کہ اللہ فرماتے ہیں "اے میرے بندو! اگر تم تمام جن و انس سارے کے سارے اس شخص کی طرح بن جاؤ جو تم میں سے سب سے زیادہ پرہیزگار ہے تو اس سے میری بادشاہی میں ذرہ بھر بھی اضافہ نہیں ہو گا اور اے میرے بندو! اگر تم تمام جن و انس سارے کے سارے اس شخص کی طرح ہو جاؤ جو تم میں سے سب سے زیادہ میرا نافرمان اور بدکار ہے تو اس سے میری بادشاہی میں ذرہ بھر بھی کمی واقع نہ ہو گی" (مسلم۔ کتاب البر والصلۃ: باب تحریم الظلم)

پھر یہ بات بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اگر کوئی شخص اسلام کی سربلندی کے لئے کوئی کام کرتا ہے تو اسے ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ اللہ پر کچھ احسان کر رہا ہے بلکہ اسے اللہ کا ممنون احسان ہونا چاہئے اور اس کا شکر ادا کرنا چاہئے جس نے اسے جہاد کی توفیق بخشی جس میں ہر پہلو سے اس کا اپنا ہی بھلا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے کوئی سرکاری افسر ایک شخص کو اپنے ماتحت ملازم رکھ لیتا ہے تو ملازم کو اس افسر کا ممنون احسان ہونا چاہئے۔ چہ جائیکہ ملازم یہ کہنا شروع کر دے کہ میں نے ملازم ہو کر افسر پر احسان کیا ہے۔

[۸] نیکیوں سے برائیاں مٹنے کی مختلف صورتیں:۔ اس کی تین صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جو شخص اسلام لائے اس کے سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح نیک اعمال بجا لانے سے چھوٹی موٹی برائیاں معاف کر دی جاتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ جو

أَحْسَنَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِن جَاهَدَاكَ
لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ

نے کیا ہو گا انہیں اس سے[9] بہتر بدلہ دیں گے۔(۷) اور ہم نے انسان کو تاکیدی حکم دیا کہ وہ اپنے والدین[10] سے نیک سلوک کرے اور اگر وہ اس بات پر زور دیں کہ تو کسی کو میرا شریک ٹھہرائے جس کا تجھے علم نہیں[11] تو ان کا کہنا نہ مان[12]۔ میری طرف ہی تمہیں لوٹ کر آنا ہے تو میں تمہیں

شخص نیک کام بجالانا شروع کر دے۔ اس کو از خود برائیوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ تیسرے یہ کہ جس معاشرہ میں نیکیاں رواج پانے لگیں برائیاں از خود مٹتی چلی جاتی ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک چیز آئے گی تو لامحالہ دوسری کو رخصت ہونا پڑے گا۔ بالکل ایسا ہی معاملہ سنت اور بدعت کا ہے۔ جس کے متعلق واضح الفاظ میں رسول اللہ ﷺ نے فرمادیا کہ: "جہاں ایک بدعت رواج پاتی ہے تو وہاں سے ایک سنت اٹھالی جاتی ہے"۔ گویا بدعت کے رواج پانے کا ہی دوسرا پہلو سنت کا اٹھ جانا ہے۔

[9] اس جملہ کے بھی دو مطلب ہیں ایک تو ترجمہ سے واضح ہے۔ یعنی جتنا اس نیک عمل کا اجر تھا اس سے زیادہ یا بہتر عطا کرے گا اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ انسان کا جو بہتر عمل ہو گا اللہ اس کے باقی عملوں کا بھی اس بہتر عمل کے معاوضہ کے حساب سے بدلہ عطا فرمادے گا۔

[10] اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر اپنے حقوق کے بعد متصلاً والدین کے حقوق اور ان سے بہتر سلوک کا ذکر فرمایا ہے۔ جس سے اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ تفصیل کے لئے سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۲۳ کا حاشیہ ۲۵

[11] یعنی تمام کائنات میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اللہ کی شریک ہو سکے۔ اور اللہ کی اپنی شہادت بھی یہی ہے کہ وہ اللہ جو کائنات کی ایک ایک چیز کا ذرہ ذرہ بھر تک علم رکھتا ہے اس کے علم میں بھی کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی شریک ہو۔ تو پھر تجھے یا کسی دوسرے کو کیا علم ہو سکتا ہے اور اس آیت میں لَكَ کا لفظ محض تاکید مزید کے طور پر ہے اور جو لوگ بعض اشیاء یا ہستیوں کو اللہ کا شریک قرار دیتے ہیں تو یہ محض ان کے جاہلانہ اوہام اور بے سند خیالات ہیں۔ حقیقت کی انہیں بھی کچھ خبر نہیں۔

[12] ۞ حقوقِ والدین اور سعد بن ابی وقاص کی والدہ کا کردار:۔ یعنی والدین بھی تجھے شرک پر مجبور کریں تو ان کی یہ بات تسلیم نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ سیدنا سعد بن ابی وقاص کے بیٹے مصعب رحمہ اللہ بن سعد کہتے ہیں کہ اس کی ماں نے قسم کھائی تھی کہ وہ سعد سے کبھی بات نہ کرے گی جب تک وہ اپنا دین (اسلام) نہ چھوڑے گا، نہ ہی وہ کچھ کھائے گی اور نہ پئے گی۔ وہ سعد سے کہنے لگی کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے والدین کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور میں تیری ماں ہوں اور تجھے اس بات کا حکم دے رہی ہوں۔ پھر تین دن اس نے نہ کچھ کھایا نہ پیا اور نہ ہی سعد سے بات کی۔ تین دن کے بعد اسے غش آگیا تو اس کے ایک دوسرے بیٹے عمارہ نے اسے پانی پلایا۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ سعد کے حق میں بددعا کرنے لگی۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (مسلم، کتاب الفضائل، باب فی فضل سعد بن ابی وقاص)

اللہ کے مقابلہ میں کسی کی اطاعت نہیں:۔ اور دوسری احادیث وروایات سے جو تفصیل ملتی ہے وہ یہ ہے کہ جب اسلام لائے اس وقت آپ انیس بیس برس کے نوجوان تھے اور بالکل آغاز میں اسلام ایمان لائے تھے وہ خود روایت کرتے ہیں کہ اسلام لانے کے بعد مجھ پر سات دن ایسے گزرے ہیں کہ میں کل مسلمانوں کا تیسرا حصہ تھا(بخاری۔ کتاب المناقب۔ باب اسلام سعد) یعنی رسول اللہ ﷺ کے گھرانہ کے علاوہ اس وقت تک صرف تین آزاد مرد مسلمان تھے۔ جن میں سے ایک یہی سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ تھے اور وہ اپنے ایمان میں اس قدر پختہ تھے کہ جب ان کی ماں نے بھوک ہڑتال کی دھمکی دی تو آپ نے اپنی ماں سے کہا: ماں! اگر تیری سو جانیں ہوں اور ایک ایک کر کے سب نکل جائیں تو بھی میں سیدنا محمد ﷺ کے دین سے نہیں پھروں گا۔ تو کھا یا نہ کھا یہ تجھے اختیار ہے۔

شرک تو خیر سب گناہوں سے بڑا گناہ ہے۔ شریعت نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ اگر اللہ کی نافرمانی کی کوئی بھی بات ہو تو اللہ کے مقابلہ میں کسی کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ اطاعت صرف معروف کاموں میں ہو سکتی ہے۔ (متفق علیہ) خواہ حکم دینے والے والدین ہوں یا بادشاہ ہو یا امیر ہو، کسی کی بھی اللہ کے مقابلہ میں اطاعت نہیں کی جا سکتی۔

اس آیت سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ شرک یا اللہ کی نافرمانی کے علاوہ باقی ہر طرح کے معاملات میں والدین کی اطاعت فرض ہے۔ جیسا کہ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی والدہ نے بھی جو کافر تھی یہی کچھ سمجھا تھا۔ مگر دور حاضر کے مفسر قرآن جناب پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ قرآن میں اطاعت والدین کے متعلق کوئی حکم نازل نہیں ہوا۔ ان کے اپنے الفاظ ہیں:

کیا اطاعتِ والدین قرآن کی رو سے غیر ضروری ہے؟: ”دنیا کے تمام مذاہب اور اخلاق کے دبستانوں میں یہ چیز (اطاعت والدین) ایک مسلمہ کی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہے کہ ”ماں باپ کی اطاعت فرض ہے“ ایسے مسلمہ کی حیثیت جو کسی بھی غور و فکر یا تنقید کی محتاج ہی نہیں۔ ان کے ہاں کبھی کسی نے اتنا خیال کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی کہ یہ بھی کوئی ایسی بات ہے جس میں دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن قرآن کو دیکھئے۔ اس نے دنیا میں پہلی بار یہ آواز بلند کی ہے کہ جو لوگ عقل کے انحطاط کے دور میں پہنچ گئے ہوں ان کے فیصلے واجب الاتباع نہیں ہوا کرتے۔ ماں باپ حسن سلوک اور نرم برتاؤ کے مستحق ہیں اور بس۔ جب تک بچہ بچہ ہے وہ اس کے نگران اور کفیل ہیں۔ جب وہ عقل کی پختگی کو پہنچ جاتا ہے تو اپنے لئے آپ فیصلے کرنے کا مجاز ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں کے تجربوں سے مشورۃً فائدہ تو اٹھا سکتا ہے لیکن اسے ان کے فیصلوں کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔“ (قرآنی فیصلے ص ۱۳۸)

اس اقتباس سے درج ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ اخلاق کے تمام دبستان اور دنیا کے تمام مذاہب اطاعتِ والدین کی فرضیت پر متفق ہیں۔ ان مذاہب میں سب اہل کتاب بھی شامل ہیں جن کے انبیاء پر وحی الٰہی نازل ہوئی۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ والدین کی اطاعت سب انبیاء کی تعلیم کا حصہ رہا ہے۔

۲۔ پھر ان مذاہب میں یا اہلِ کتاب میں مسلمان بھی شامل ہیں جنہیں قرآن جیسی کتاب دی گئی۔ اس قرآن میں پہلی بار یہ صدا بلند کی گئی کہ اطاعت والدین ایک بے معنی اور لغو چیز ہے۔ لیکن قرآن کی اس صدا پر مسلمانوں نے بھی کان تک نہ دھرایا انہیں اس صدا کی سمجھ ہی نہ آسکی۔ اور وہ بھی اطاعت والدین دوسرے مذاہب کی طرح واجب ہی سمجھتے رہے تا آنکہ پرویز

صاحب نے قرآن کی اس پہلی بار کی صدا کا صحیح مفہوم سمجھا اور وہ مفہوم یہ ہے کہ "والدین کے فیصلے واجب الاتباع نہیں ہوا کرتے"

۳۔ ماں باپ اپنی اولاد سے صرف حسن سلوک اور نرم برتاؤ کے مستحق ہیں اور بس۔ گویا پرویز صاحب کے خیال کے مطابق والدین کی اطاعت کے بغیر بھی ان سے حسن سلوک اور نرم برتاؤ ممکن ہے۔

❁ **والدین کی اطاعت کے نقصانات:** پھر اس کے بعد پرویز صاحب اپنے موقف کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "جب تک ماں باپ زندہ ہیں ان کا لڑکا خواہ ساٹھ ستر برس کا ہی کیوں نہ ہو جائے اسے کوئی حق حاصل نہیں کہ اپنے فیصلے اپنی صوابدید کے مطابق کرے۔ اسے ان کے فیصلوں کی تعمیل کرنی ہوگی جن کی عقل کے متعلق اس کے خدا کا فیصلہ ہے کہ اس عمر میں اوندھی ہو جاتی ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ماں باپ کی اطاعت کو فرض سمجھنے والی اولاد ساری عمر عقلی طور پر اپاہج اور ذہنی طور پر بچے کے بچے رہ جاتے ہیں" (ایضا ص ۱۲۹)

اب دیکھئے اس اقتباس میں پرویز صاحب نے جو مثال پیش فرمائی ہے وہ عقل اور نقل دونوں لحاظ سے غلط ہے۔ عقلی لحاظ سے اس طرح کہ جو اولاد خود ساٹھ ستر برس کی عمر کو پہنچ چکی ہے اس کے والدین سو سال کے لگ بھگ ہی ہو سکتے ہیں۔ اس عمر میں وہ نان شبینہ حتی کہ نقل و حرکت تک کے لئے دوسروں کے محتاج ہوتے ہیں۔ اس حالت میں وہ کیا فیصلے دے سکتے ہیں اور اولاد کو کیسے حکم دے سکتے ہیں۔ وہ تو اس عمر میں اپنی رائے بتانے کے بھی قابل نہیں رہتے۔ اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو اولاد ساٹھ ستر برس کی عمر کو پہنچ چکی ہے وہ تو خود ارذل العمر کی حدود میں داخل ہو چکی ہے۔ اسے کیا حق ہے کہ اب وہ اپنے فیصلے آپ کرے۔ اب فیصلے کرنے کے لئے اس کی اولاد موجود ہے جو کم از کم چالیس سال کی عمر کو پہنچ کر عقل کی پختگی حاصل کر چکی ہے۔ لہذا ساٹھ ستر برس کی اولاد کے لئے اس واقعاتی دنیا میں اطاعت والدین کا سوال بھی کم ہی پیدا ہوتا ہے۔

اور نقلی لحاظ سے یہ دلیل اس لئے غلط ہے کہ قرآن نے یہ کہیں نہیں کہا کہ اس عمر میں لوگوں کی عقل اوندھی ہو جاتی ہے۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں:

﴿وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ﴾ (۳۶:۶۸) اور جس کو ہم بڑی عمر دیتے ہیں اسے خلقت میں اوندھا کر دیتے ہیں۔

یعنی بچے سے جوان، پھر جوان سے بوڑھا کر دیتے ہیں۔ جوانی میں وہ طاقتور تھا، بڑھاپے میں کمزور ہو جاتا ہے۔ پہلے اس کا جسم بھرا ہوا اور سڈول تھا، بڑھاپے میں وہ نحیف و نزار ہو جاتا ہے اور اس کے بند ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ اس آیت میں اس کی خلقت کے اوندھا ہونے کا ذکر ہے۔ عقل کا نہیں، اس مضمون سے ملتی جلتی دوسری آیت یہ ہے:

﴿وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا﴾ (۱۶:۷۰) "اور تم میں سے کچھ ایسے ہیں جو خراب عمر کو پہنچ جاتے ہیں اور جاننے کے بعد بے علم ہو جاتے ہیں"۔

یعنی ان کی یادداشت کمزور ہو جاتی ہے۔ وہ اپنا سابقہ حاصل کیا ہوا علم بھی بھول جاتے ہیں۔ اس آیت میں بھی عقل کے اوندھا ہونے کا کوئی ذکر نہیں۔ پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ "جب بچہ بچہ ہے، والدین اس کے نگران اور کفیل ہیں، جب وہ عقل کی پختگی کو پہنچ جاتا ہے تو اپنے لئے آپ فیصلے کرنے کا مجاز ہو جاتا ہے" اب سوال یہ ہے کہ بچپن میں تو بچہ والدین کے زیر تربیت و کفالت ہونے کی وجہ سے ان کی نافرمانی کر ہی نہیں سکتا، ورنہ اس کی تعلیم و تربیت رک جاتی ہے۔ پھر وہ نابالغ ہونے کی

بنا پر شرعی احکام کا مکلف بھی نہیں ہوتا۔ اطاعت والدین کا تو سوال ہی اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ عاقل و بالغ ہو جائے اور یہی وہ عمر ہوتی ہے جس میں جوانی کا جوش، جذبات کی فراوانی اور عقل کی ناپختگی ہوتی ہے اور در حقیقت یہی وہ دور ہوتا ہے جس میں اسے والدین کی اطاعت کرنا ضروری ہوتی ہے تا آنکہ وہ عقل کی پختگی کی عمر یعنی چالیس سال کی عمر کو پہنچ جائے جب وہ عقل کی پختگی کو پہنچ جاتا ہے تو وہ اپنے فیصلے آپ کرنے کا مجاز ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اولاد نے والدین کی خدمات کا کیا صلہ دیا؟ معلوم ہوتا ہے کہ پرویز صاحب کو بھی اپنے اس گھپلے کا احساس ہو گیا۔ چنانچہ بعد میں لکھتے ہیں کہ:

"اس میں شبہ نہیں کہ ہماری موجودہ معاشرت (جس میں خاندانوں میں مشترکہ زندگی بسر ہوتی ہے) کی عائلی زندگی کا تقاضا ہے کہ افراد' خاندان کے متفقہ فیصلوں کے ماتحت زندگی بسر کریں اور خود سر اور سرکش نہ ہو جائیں لیکن خود سری اور سرکشی اور شے ہے اور اصابت رائے اور شے" پھر اس عبارت پر حاشیہ دے کر فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں کہ یاد رکھئے خود فیصلے کرنے کے لئے عقل کی پختگی اور رائے کی اصابت لاینفک شرط ہے۔ اس لئے بچہ جب تک اس منزل تک نہ پہنچ جائے اسے لامحالہ بڑوں کے فیصلہ کے مطابق چلنا ہو گا۔ (ایضاص ۱۲۹)

اس اقتباس میں جواب طلب امور یہ ہیں:

۱۔ کیا بڑوں میں والدین بھی شامل ہیں یا نہیں؟ یا صرف اطاعت والدین کی مخالفت میں ان بڑوں میں والدین کا نام تک لینا گوارا نہیں کیا گیا؟

۲۔ قرآن نے جو پہلی بار صدا بلند کی تھی کہ بڑوں کے فیصلے واجب الاتباع نہیں ہوتے اس صدا کے خلاف اب آپ خود ہی کیوں نوجوانوں کو ایسے مشورے دینے لگے؟

۳۔ اگر چھوٹے بڑوں کے فیصلوں کے پابند ہوں گے تو اس طرح وہ عقلی لحاظ سے اپاہج بن جائیں گے اس بات کا آپ کے پاس کیا علاج ہے؟

۞ والدین کی اطاعت کے وجوب پر قرآن سے دلائل:۔ اب ہم قرآن ہی سے ایسے دلائل پیش کرتے ہیں جن سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ والدین کی اطاعت فرض ہے:

۱۔ سورۂ عنکبوت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾ (۸:۲۹)

"اور ہم نے انسان کو اپنے والدین سے حسن سلوک کا حکم دیا، پھر اگر وہ اس بات کے درپے ہوں کہ تو میرے ساتھ شریک کرے جس کی حقیقت کا تجھے علم نہیں تو پھر ان کی اطاعت نہ کر"

اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ اطاعت والدین حسن سلوک میں شامل ہے اور دوسری یہ کہ شرک کے معاملہ میں والدین کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔ باقی سب معاملات میں ان کی اطاعت لازم ہے۔

۲۔ اور سورۂ لقمان میں بالکل ایسے ہی الفاظ آئے ہیں البتہ یہ وضاحت زیادہ ہے:

﴿وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا﴾ (۱۵:۳۱)

"اور دنیوی معاملات میں والدین کا اچھی طرح ساتھ دے خواہ وہ مشرک ہوں"

﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (۴:۵۹)

”اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور ان کی بھی جو تم میں سے اولی الامر ہیں“

یہاں اولی الامر جمع کا صیغہ آیا ہے اور اس سے مراد صرف حکام سلطنت ہی نہیں بلکہ ہر وہ فرد بھی شامل ہے جس کی اطاعت کی جاتی ہے۔ مثلاً والدین، استاد، محلّہ کے چوہدری، خاندان کے سربراہ وغیرہ وغیرہ یعنی اگر وہ مسلمان ہیں اور اللہ کی معصیت کا حکم نہیں دیتے تو ان سب کی اطاعت لازم ہے۔ آخر ان اولی الامر کے زمرہ سے والدین کو کس لحاظ سے خارج کیا جاسکتا ہے۔

❁ کیا اطاعت کے بغیر حسن سلوک ممکن ہے:۔

۴۔ سیدنا یحیٰی علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

﴿وَبَرًّا بِوَالِدَیْهِ وَلَمْ یَكُنْ جَبَّارًا عَصِیًّا﴾ (۱۹:۱۴)

”یحیٰی علیہ السلام اپنے والدین سے نیک سلوک کرنے والے تھے۔ ان پر دباؤ ڈالنے والے اور نافرمان نہیں تھے“

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے والدین کا، خواہ وہ کسی عمر میں ہوں، سرکش اور نافرمان ہو وہ اپنے والدین سے نیک سلوک کرنے والا ہو ہی نہیں سکتا۔ گویا حسن سلوک میں دو باتیں ضرور ہیں، (۱) سختی کے بجائے نرمی کا سلوک اور (۲) ان کی فرمانبرداری۔ بالفاظِ دیگر والدین کی اطاعت کے بغیر ان سے حسن سلوک کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

۵۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بڑھاپے میں اولاد عطا فرمائی تھی۔ سیدنا اسماعیل علیہ السلام جب عاقل ہوگئے تو ان سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ:

﴿یٰبُنَیَّ اِنِّیْۤ اَرٰى فِی الْمَنَامِ اَنِّیْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى قَالَ یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ﴾ (۳۷:۱۰۲)

”میرے پیارے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں، تم دیکھو کہ اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ (سیدنا اسماعیل نے) کہا: اباجان آپ کو جو حکم ہوا ہے وہی کچھ کیجئے“

❁ سیدنا اسماعیل کی اطاعت کا بے نظیر نمونہ:۔ اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ سیدنا اسماعیل علیہ السلام اس وقت عاقل و بالغ اور رائے دینے کے لئے قابل ہو چکے تھے۔ دوسرے یہ کہ یہ اللہ کا حکم خواب میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو ہوا تھا۔ سیدنا اسماعیل علیہ السلام کو نہیں ہوا تھا۔ بایں ہمہ سیدنا اسماعیل علیہ السلام نے اپنے بوڑھے والد کی اطاعت کی وہ مثال قائم کی جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ نہ اس واقعہ سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔ سیدنا اسماعیل نے اپنے والد کی اطاعت میں جان کی قربانی پیش کرنے سے بھی انکار نہیں کیا۔ یہ نہیں سوچا کہ یہ تو خواب کی بات ہے یا یہ کہ نعوذ باللہ اب باپ بوڑھا ہو گیا ہے جو اس طرح کی بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے یا یہ کہ باپ تو محض میری رائے پوچھ رہا ہے کوئی حکم تو نہیں دے رہا۔ یا یہ کہ اگر خواب میں حکم ہوا ہے تو میرے باپ کو ہوا ہے، مجھے تو نہیں ہوا۔ بلکہ اپنے باپ کی منشا کے آگے (حکم کے آگے نہیں) سر تسلیم خم کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے ﴿فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا﴾ کہہ کر اس بات پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی اپنے باپ کی منشا کی اطاعت بھی عین اللہ کی اطاعت تھی، کیا اس سے بڑھ کر بھی بوڑھے والدین کی اطاعت کے سلسلہ میں قرآن سے کوئی ثبوت و دلیل درکار ہے؟

تَعْمَلُوْنَ ۝۸ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ ۝۹ وَمِنَ

بتادوں [۱۳] گا کہ جو کچھ تم کیا کرتے تھے۔(۸) اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے انہیں ہم صالح لوگوں [۱۴] میں شامل کریں گے(۹)

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

مندرجہ بالا تصریحات سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ بلوغت سے پہلے بچہ والدین کے زیر تربیت و کفالت ہونے کی وجہ سے والدین کی اطاعت پر مجبور ہوتا ہے اور اس بچہ کی اطاعت اس لحاظ سے بھی خارج از بحث ہے کہ اس عمر میں بچہ شرعی احکام کا مکلف نہیں ہوتا۔

۲۔ بلوغت سے لے کر چالیس سال کی عمر تک (یعنی پختگی عقل اور اصابت رائے کی عمر تک) کے عرصہ میں اولاد کو والدین کی اور بزرگوں کی اطاعت کرنا لازم ہے کیونکہ اس عمر میں جوانی کا جوش اور جذبات کی شدت انسان کی عقل پر غالب ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنا نفع و نقصان بھی درست طور پر سوچنے کے قابل نہیں ہوتا اور اس کی اپنی عافیت بھی اسی بات میں ہوتی ہے کہ وہ اپنے والدین اور بڑوں کی اطاعت کرے۔

۳۔ اندازاً چالیس سال کی عمر کے بعد جب اس کی عقل پختہ ہو جاتی ہے اس وقت تک اس کے والدین کہولت کی عمر کو پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ وہ خود اولاد کے محتاج ہونے کی وجہ سے اپنا کوئی حکم اپنی اولاد کے سر تھوپ نہیں سکتے۔ تاہم اس عمر میں بھی اگر اولاد اپنے والدین کی مرضی کو مقدم رکھے تو یہ بہت بڑی سعادت ہے۔ اگر کہیں اختلاف واقع ہو جائے تو پھر بھی اولاد کو یہ حق نہیں کہ وہ ان سے بحث و جدال کرے یا ان کو دبائے۔ بلکہ حکم یہ ہے کہ ایسی حالت میں بھی ان کو اف تک نہ کہے۔ انہیں دبانا یا ڈانٹنا تو بہت دور کی بات ہے۔ ایسی صورت میں وہ اپنی بات نرمی سے پیش کر کے دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کرے اور دنیوی امور میں یعنی ان کے قیام و طعام کے سلسلہ میں دل و جان سے ان کی خدمت کرے۔

۴۔ اطاعت والدین کی حدود:۔ اگر والدین اللہ سے شرک یا دوسرے کسی معصیت کے کام پر اولاد کو مجبور کریں یعنی اللہ کے مقابلے میں کوئی حکم دیں تو ان کی اطاعت نہیں کی جائیگی۔ بس یہی ایک صورت ہے جس میں ان کی نافرمانی کی جاسکتی ہے۔ خواہ یہ ان کی عمر کا کوئی دور ہو۔

[۱۳] یعنی والدین ہوں یا اولاد، فرمانروا ہو یا رعایا کا کوئی فرد سب کو اللہ کی عدالت میں پیش ہونا ہے۔ وہ ہر ایک معاملہ میں تمہیں بتادے گا کہ زیادتی کس کی تھی اور حق پر کون تھا؟

[۱۴] یعنی ایسے ناساعد اور پریشان کن حالات میں جو شخص ایمان لائے اور نیکی کی راہ پر قائم رہے جبکہ ان کے والدین بھی کافر تھے تو اللہ ایسے لوگوں کو صالحین کے زمرہ میں شامل فرمادے گا۔ نیز اللہ کا دستور یہ ہے کہ اگر والدین بھی مسلمان ہوں اور اولاد بھی تو اللہ تعالیٰ اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ ملادے گا۔ اگرچہ اولاد کے نیک اعمال اپنے والد کے اعمال کے پایہ کے نہ ہوں۔ اگر والدین کافر تھے تو اللہ ان کی اولاد کو صالحین کے زمرہ میں شامل فرمادے گا۔

النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ۭ وَلَىِٕنْ
جَاۗءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۭ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰﴾
وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ﴿۱۱﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ

اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو (زبان سے تو) کہتا ہے "ہم اللہ پر ایمان لائے[۱۵]" مگر جب اسے اللہ کی راہ میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے، تو لوگوں کی اس ایذا رسانی کو یوں سمجھتا ہے، جیسے اللہ کا عذاب ہو[۱۶] (اور کافروں سے جاملتا ہے) اور اگر آپ کے پروردگار کی طرف سے نصرت[۱۷] آجائے تو ضرور کہے گا کہ ہم (دل سے) تو تمہارے ہی ساتھ تھے۔ کیا اہل عالم کے دلوں کا حال اللہ کو بخوبی[۱۸] معلوم نہیں۔(۱۰)

اور اللہ تعالیٰ ضرور یہ دیکھ[۱۹] کے رہے گا کہ ایمان والے کون ہیں اور منافق کون؟(۱۱) اور کافر ایمان والوں سے کہتے ہیں

[۱۵] یعنی وہ ہوتا تو کمزور ایمان والا ہے مگر اپنے آپ کو راسخ العقیدہ مسلمانوں میں شامل سمجھتا ہے۔ اور انہی کی طرح اپنے ایمان کا اقرار اور دعویٰ کرتا ہے۔

[۱۶] اسلام لانے والوں کا بھی اسلام لانے کے ساتھ ہی امتحان شروع ہو جاتا ہے اور مسلمانوں کو کفار کی جانب سے طرح طرح کے دکھ اور مصائب برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ یہ دراصل حق و باطل کی سرد جنگ ہوتی ہے۔ اور ابتداءً چونکہ حق کمزور اور باطل اپنے جوبن پر ہوتا ہے لہٰذا مسلمانوں کو کئی طرح کی مشکلات اور پریشانیاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ کمزور ایمان والے اس صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتے اور اسی سے اپنی جان چھڑانا چاہتے ہیں اور اپنے دعویٰ ایمان سے دستبردار ہونے لگتے ہیں یا کم از کم عملی طور پر اپنے دعویٰ کی تردید کر دیتے ہیں۔

[۱۷] اور اگر سر دھڑ کی بازی لگانے کے بعد راسخ الایمان مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ فتح و نصرت سے ہمکنار کر دے تو ایسے لوگ فتح کے ثمرات سے حصہ بٹانے کے لئے فوراً موجود ہوں گے اور کہیں گے کہ ہم بھی تو تمہارے ساتھ اور تمہارے اسلامی بھائی ہیں۔

[۱۸] یعنی اللہ تعالیٰ ان کے زبانی دعووں کی حقیقت کو خوب جانتا ہے کہ وہ کون کون سے مفادات کی خاطر یہ ایمان لانے کے دعوے کرتے ہیں اور تکلیفوں سے بچاؤ کے کون کون سے طریقے سوچتے رہتے ہیں؟

[۱۹] ۞ راہ حق میں تکالیف و مصائب پیغمبروں کی میراث ہے:۔ یعنی اللہ تعالیٰ بار بار ایسے موقع پیدا کرتا رہتا ہے جس سے سب کو معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ فلاں شخص ایمان کے کس درجہ میں ہے۔ پختہ ایمان والا کون کون ہے، کمزور ایمان والا کون اور منافق کون ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ معرکہ حق و باطل کوئی وقتی اور عارضی سی چیز نہیں اور نہ ہی یہ معرکہ ایسی چیز ہے جس کے نتائج صرف کسی معرکہ کارزار میں سامنے آئیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ انبیاء چونکہ سب سے زیادہ پختہ ایمان والے ہوتے ہیں۔ اس لئے سب سے زیادہ ایذائیں اور مشکلات خود انہی کے حصہ میں آتی ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اَشَدُّ الْبَلَاءِ عَلَى الْاَنْبِيَاءِ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ" یعنی سب سے سخت مشکلات و مصائب انبیاء پر آتی ہیں پھر ان سے کم درجہ کے ایمان والوں پر پھر ان سے کم درجہ کے ایمان والوں پر۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان پر مشکلات کا دور آنا ضرور ہے۔ البتہ اس کا معیار یہ ہو گا کہ جتنا زیادہ پختہ ایمان والا ہو گا اتنی ہی سخت اس کی آزمائش ہو گی۔ ضمناً اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کی پیروی میں تکلیف پہنچنا پیغمبروں کی میراث ہے اور ضروری نہیں کہ یہ تکلیف کافروں کے ہاتھوں ہی پہنچے، یہ مشرکوں

آمَنُوا اتَّبِعُوا سَبِيلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ إِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿١٢﴾ وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ ؗ وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا

کہ تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو تو ہم تمہارے گناہوں کا بار اٹھالیں [٢٠] گے حالانکہ وہ دوسرے [٢١] کے گناہوں کا کچھ بھی بار نہیں اٹھائیں گے۔ یہ سراسر جھوٹے لوگ ہیں (١٢) یہ اپنے (گناہوں کے) بوجھ تو اٹھائیں گے ہی اور ساتھ ہی دوسروں کے بوجھ [٢٢] بھی اٹھائیں گے (جنہیں انہوں نے گمراہ کیا ہوگا) اور جو کچھ یہ افترا کرتے رہے قیامت کے دن [٢٣] اس سے متعلق ان سے ضرور باز پرس ہوگی۔ (١٣)

کی طرف سے بھی پہنچ سکتی ہے۔ اہل بدعت اور دوسرے گمراہ فرقوں سے بھی اور منافقوں سے بھی۔ لہٰذا مبارک ہیں وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں ستائے جائیں۔ ان کی عزت پر حملہ ہو یا ان کا کوئی جانی یا مالی نقصان ہو، ان کے لئے سب کچھ باعث فخر ہوتا ہے۔

[٢٠] ۞ کافروں کا مسلمانوں کو کہنا کہ اگر تم واپس آجاؤ تو ہم قیامت کو تمہارا بار اٹھالیں گے:۔ یہ بات مشرکین مکہ مسلمانوں سے اس لئے کہتے تھے کہ وہ خود آخرت کے قیام کے قائل ہی نہ تھے۔ نہ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ آخرت میں ان سے باز پرس بھی ہونے والی ہے پھر انہیں اپنے اپنے گناہوں کا بار بھی اٹھانا پڑے گا۔ دوسری طرف انہیں اپنا دین مرغوب بھی تھا اور وہ اس مشرکانہ دین کو برحق بھی سمجھتے تھے۔ اسی لئے وہ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ اگر تم واپس ہمارے دین میں آجاؤ۔ تو تمہارے خیال کے مطابق تمہارے اس ارتداد کا گناہ قیامت کو ہم اٹھائیں گے۔ گویا اس طرح کے سمجھوتہ میں انہیں فائدہ ہی فائدہ نظر آتا تھا۔ یعنی ان کا مطالبہ ارتداد تو ابھی پورا ہو جائے اور اس کے معاوضہ کا جو وعدہ کرتے تھے اس پر وہ ایمان ہی نہیں رکھتے تھے۔

[٢١] اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہ اٹھاتا ہے نہ اٹھا سکتا ہے۔ لہٰذا یہ لوگ جھوٹ بکتے ہیں۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ جب یہ جہنم کا عذاب دیکھیں گے اور انہیں اپنا انجام معلوم ہو جائے گا۔ تو اس وقت کبھی نہ کہیں گے کہ فلاں شخص ہمارے کہنے پر اسلام سے پھر گیا تھا لہٰذا اسے تو جنت میں بھیج دو اور اس کے عذاب کا بھی میرے عذاب میں اضافہ کردو۔ اس لحاظ سے بھی یہ جھوٹ بک رہے ہیں۔

[٢٢] ۞ دوسرے کا عذاب و ثواب کس صورت میں؟ البتہ یوں ہو سکتا ہے کہ اگر ان لوگوں کے بہکانے سے کوئی شخص گمراہ ہو گیا تو گمراہ ہونے والے کو اپنی گمراہی کا عذاب دیا جائے گا اور گمراہ کرنے والے کو دوہرا عذاب اس شکل میں ہوگا کہ ایک تو اسے اپنی گمراہی کی سزا بھگتنا ہوگی اور دوسرے اس گمراہ ہونے والے شخص کا حصہ رسدی عذاب اسے بھی دیا جائے گا جسے اس نے گمراہ کر دیا تھا۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث اس مضمون کو پوری طرح واضح کر رہی ہے:

منذر بن جریر اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ جاری کیا اس کے لئے اس کے اپنے عمل کا بھی ثواب ہے اور جو لوگ اس کے بعد اس طریقہ پر عمل کریں ان کا بھی ثواب ہے اور عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ اور جس نے اسلام میں کوئی بری طرح ڈالی اس پر اس کے اپنے عمل کا بھی بار ہے اور ان لوگوں کا بھی جو اس کے بعد اس برے طریقہ پر عمل کریں۔ لیکن عمل کرنے والوں کے بوجھ میں کچھ کمی نہ ہوگی“ (مسلم۔ کتاب الزکوٰۃ۔ باب الحث علی الصدقة......)

[٢٣] مشرکوں کا یہ قول اللہ پر افتراء اس لحاظ سے ہے کہ انہوں نے دراصل اللہ کے بتائے ہوئے عقیدہ آخرت، باز پرس اور

يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا
فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۵﴾
وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾

ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تو وہ پچاس برس کم ایک ہزار سال ان [۲۴] کے درمیان رہے۔ پھر ان لوگوں کو طوفان نے آگھیرا کہ وہ ظالم تھے۔(۱۴) پھر ہم نے نوح کو اور کشتی والوں کو (اس طوفان سے) بچا لیا اور کشتی کو اہل عالم [۲۵] کے لئے ایک نشانی بنا دیا۔(۱۵) اور ابراہیم (کا واقعہ یاد کرو) جب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو۔ اگر تم جانو تو یہی بات تمہارے لئے بہتر ہے۔(۱۶)

گناہوں کی سزا ان سب باتوں کا مذاق اڑایا تھا جس سے اللہ کی آیات کی بھی تکذیب ہوتی تھی اور اس کے رسول کی بھی۔ یعنی ان مشرکوں کے اپنے شرکیہ کارناموں کے علاوہ یہ اللہ پر افتراء کا جرم مزید اضافہ ہے اور اس جرم کی ان سے باز پرس بھی ہوگی اور عذاب بھی ہوگا۔

[۲۴] ذکرِ نوح علیہ السلام:۔ پچھلی آیات میں ان کفار کا ذکر ہو رہا تھا جو دور نبوی میں رسول اللہ ﷺ کے مخاطب اور مخالف تھے۔ آگے بعض دوسرے انبیاء اور ان کے مخالفین کا ذکر آرہا ہے اور ایسے واقعات کا آغاز سیدنا نوح علیہ السلام سے کیا جا رہا ہے۔ سیدنا نوح علیہ السلام کو چالیس سال کی عمر میں نبوت عطا ہوئی۔ نو سو پچاس برس آپ نے اپنی قوم کو تبلیغ کی پھر طوفان نوح کے بعد آپ ساٹھ برس زندہ رہے۔ اس لحاظ سے آپ کی کل عمر ایک ہزار پچاس برس بنتی ہے اور اپنی عمر کا بیشتر حصہ آپ نے اپنی قوم کو سمجھانے اور ان سے بحث و جدال میں گزارا۔ وہ لوگ گویا ان کفارِ مکہ سے بھی زیادہ بدبخت تھے۔ انہوں نے سیدنا نوح علیہ السلام کو اس قدر پریشان کیا اور ناک میں دم کر دیا تھا کہ نوح علیہ السلام نے ان سے تنگ آکر اور ان سے سخت مایوس ہو کر اللہ سے بددعا کی تھی کہ یا اللہ ان پر ایسی تباہی نازل فرما کہ ان میں سے ایک گھرانہ بھی زندہ نہ بچے۔ چنانچہ اللہ نے طوفان کے ذریعہ اس قوم کو تباہ کر ڈالا۔ اور یہ واقعہ پہلے کئی مقامات پر تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے۔

[۲۵] اصحاب السفینہ اور کشتی نوح:۔ لفظ وَجَعَلْنٰهَا میں "ھا" کی ضمیر کشتی کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ کشتی اس طوفان کے بعد طویل مدت تک جودی پہاڑ پر ہی ٹکی رہی۔ لوگ اسے دیکھتے رہے اور اس سے طوفان نوح اور مجرم قوم کے انجام کی یاد تازہ ہوتی رہی۔ اور "ھا" کی ضمیر اس پورے قصہ قوم نوح کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس قوم کی سرکشی پھر ان کی سرکشی کے اس دردناک انجام کو ہم نے بعد میں آنے والے سب لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دیا کہ لوگ اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں۔

اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّ تَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا

اللہ کے سوا جنہیں تم پوجتے ہو وہ تو محض [۲۶] بتوں کے تھان ہیں اور تم جھوٹ گھڑتے ہو [۲۷] اور جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو وہ تمہیں رزق دینے [۲۸] کا اختیار نہیں رکھتے۔ لہٰذا اللہ سے رزق مانگو، اس کی عبادت کرو اور اسی کا شکر کرو

[۲۶] ❁ بتوں کے لئے قرآن میں مستعمل الفاظ:۔ قرآن میں بتوں کے لئے تین الفاظ استعمال ہوئے ہیں (۱) صنم (ج الاصنام) کے معنی وہ بت ہیں جو قابل انتقال اور قابل فروخت ہوں خواہ یہ پیتل یا لوہے یا چاندی کے ہوں یا لکڑی کے یا پتھر کے اور صناعۃ الاصنام بمعنی بت تراشی کا فن جیسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا باپ آذر بت تراش بھی تھا اور بت فروش بھی۔ (۲) نصب ایسے بتوں یا مجسموں کو کہتے ہیں جنہیں کسی جگہ پوجا پاٹ کے لئے نصب کر دیا گیا ہو۔ جیسے مشرکین مکہ کے بت لات و منات، عزیٰ اور ھبل وغیرہ تھے (۳) اوثان (وثن کی جمع) وثن کا تعلق زیادہ تر مقامات سے ہوتا ہے۔ یعنی آستانے وغیرہ خواہ وہاں بت نصب ہوں یا نہ ہوں۔ بعض دفعہ بعض مخصوص مقامات پر پتھروں، درختوں، ستاروں یا دریاؤں وغیرہ سے الٰہی صفات کا عقیدہ رکھ کر ان کی پرستش شروع کر دی جاتی ہے۔ اور ایسے مقامات بسا اوقات کسی بزرگ یا ولی سے یا کسی بت سے منسوب ہوتے ہیں اور سیدنا ابراہیمؑ نے جو اوثانا کا ذکر کیا تو اس سے مراد قوم ابراہیم کے بت خانے ہیں جن میں بت از خود شامل ہیں۔

[۲۷] ❁ آستانوں کے لئے جھوٹے قصے کہانیاں گھڑنا کیوں ضروری ہے؟:۔ یعنی تم لوگ بت نہیں گھڑتے بلکہ جھوٹ کا پلندہ گھڑتے ہو۔ اور ان بتوں اور بت خانوں سے تم کئی قصے اور کہانیاں خود گھڑ کر ان سے منسوب کر دیتے ہو۔ مثلاً اگر فلاں آستانے پر مہینہ میں ایک دفعہ دودھ کا چڑھاوا نہ چڑھایا جائے تو جانور بیمار پڑ جاتے ہیں یا مر جاتے ہیں۔ یا فلاں آستانے کی گستاخی یا توہین کا انجام اس قدر خطرناک ہوتا ہے یا فلاں بت خانے یا مزار پر حاضری دینے سے رزق میں فراوانی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا تم جو ان بتوں کو گھڑتے ہو تو ساتھ ہی جھوٹ کے پلندے بھی گھڑتے ہو۔ ورنہ صرف بت گھڑنے کا تمہیں کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔

[۲۸] ❁ شرک کے خلاف سیدنا ابراہیم کے تین دلائل:۔ اس آیت اور اس سے پہلی آیت میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے شرک کے ابطال پر تین دلائل قوم کے سامنے رکھے۔

ایک یہ کہ یہ بت تمہارے اپنے گھڑے ہوئے ہیں۔ گویا تم اللہ کی مخلوق ہو اور یہ تمہاری مخلوق ہیں۔ اور اللہ کی سب سے اہم صفت یہ ہے کہ وہ خالق ہے۔ باقی سب اس کی مخلوق ہے اور جو مخلوق ہے وہ اللہ نہیں ہو سکتی اور یہ بت تو مخلوق در مخلوق ہیں یہ اللہ کیسے بن گئے؟

دوسری دلیل یہ ہے کہ ان بتوں کے نفع یا نقصان سے متعلق تمہیں ہی داستانیں اور قصے کہانیاں تراشنا پڑتی ہیں۔ اگر تمہارے ان قصے کہانیوں کو ان سے علیحدہ کر دیا جائے تو باقی یہ پتھر کے پتھر یا بے جان مادے ہی رہ جاتے ہیں اور ایسے مادے اللہ کیسے ہو سکتے ہیں۔؟

تیسری دلیل یہ کہ یہ تمہیں رزق کیا دیں گے رزق تو تم خود ان کے آگے چڑھاووں اور نذروں نیازوں کی صورت میں رکھتے ہو۔ چاہو تو تم ان کے آگے رزق رکھ دو چاہے اٹھا لو۔ چاہے ان کے اوپر مَل دو۔ لہٰذا ایسے غلط عقائد ان سے منسوب نہ کرو۔ اور رزق مانگنا ہے تو اللہ سے مانگو اور جس کا کھاؤ اسی کے گن گاؤ۔ اسی کی عبادت کرو اور اسی کا شکر بجا لاؤ۔

لَهٗۤ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ وَمَا عَلَى
الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۸﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ

تم اسی کی طرف ہی لوٹائے[۲۹] جاؤ گے۔(۱۷) اور اگر تم جھٹلاتے ہو تو تم سے پہلے بھی کئی امتیں[۳۰] (اپنے رسولوں کو) جھٹلا چکی ہیں اور رسول کے ذمہ تو صرف صاف صاف پیغام پہنچانا ہے۔(۱۸) کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ اللہ تعالیٰ کس طرح خلقت کی ابتدا کرتا ہے پھر کس طرح اعادہ[۳۱] کرتا ہے۔

[۲۹] یعنی بالآخر تم نے اللہ کی طرف پلٹنا ہے اور تمہارا انجام اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ان بتوں کی طرف نہ تم نے پلٹنا ہے نہ تمہارا انجام ان کے ہاتھ میں ہے لہٰذا تمہیں عبادت تو اس کی کرنا چاہئے جو تمہاری عاقبت کو سنوار سکتا ہے اور رزق بھی اس سے مانگنا چاہئے۔

[۳۰] یعنی قوم نوح علیہ السلام، قوم عاد اور قوم ثمود نے اپنے اپنے پیغمبروں کی دعوت کو جھٹلایا تھا پھر دیکھ لو ان کا کیا حشر ہوا تھا۔ وہی تمہارا ابھی ہونے والا ہے۔ اگر تم نے نبی کی دعوت کو جھٹلایا ہے تو اس کا تمہیں ہی نقصان پہنچے گا اور نبی کے ذمہ جو کام تھا وہ اپنی ذمہ داری پوری کر چکا ہے۔

[۳۱] ❁ رحم مادر میں انسان کی تخلیق:۔ اللہ تعالیٰ کے تخلیقی کارنامے لاتعداد ہیں۔ زمین پر بسنے والے جانداروں کی دس لاکھ انواع کا تاحال پتہ چل چکا ہے۔ آئندہ کا حال اللہ کو معلوم ہے۔ ان میں سے ہر نوع کی تخلیق جداگانہ ہے۔ اب مثلاً ہم ایک نوع انسان ہی کو لیتے ہیں اس لئے کہ اس کے متعلق زیادہ معلومات حاصل ہیں۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے مٹی سے اس کا پتلا اپنے ہاتھ سے بنایا۔ اس وقت وہ مردہ تھا۔ اس میں روح پھونکی تو زندہ ہو گیا۔ پھر اس کی نسل توالد و تناسل سے چلی۔ انسان نے زمین سے حاصل ہونے والی غذائیں کھائیں یہ غذائیں مردہ اور بے جان تھیں۔ انہیں سے مرد میں منی بن گئی جس میں لاتعداد جرثومے ہوتے ہیں۔ یہی منی مادہ کے رحم میں پہنچتی تو اس کے مادہ سے مل کر نطفہ بنی، نطفہ سے علقہ، علقہ سے مضغہ یعنی گوشت کا لوتھڑا بنی۔ اب تک یہ سب کچھ مردہ اور بے حرکت تھا۔ بعد میں اللہ نے اس لوتھڑے کو روح عطا کی تو یہ لوتھڑا جاندار اور متحرک بن گیا۔ اب انسان کی شکل و صورت کی باری آئی۔ رحم مادر میں اتنے خلیے (Cell) ہوتے ہیں جن کی تعداد صرف اللہ کو معلوم ہے ان میں سے ہر ایک خلیہ اپنے ہی کام میں لگا ہوتا ہے نہ یہ اپنے راستے سے ہٹتا ہے کہ راستہ بھولتا ہے نہ کسی دوسرے خلیے کے کام میں دخل دیتا ہے۔ ناک کا خلیہ اسی جگہ پہنچے گا جہاں ناک کی جگہ ہے، آنکھ کا آنکھ کی جگہ، کان کا کان کی جگہ اور ایڑی کا ایڑی کی جگہ پر پہنچے گا۔ اور یہ خلیے براہ راست اپنے اپنے مقام پر پہنچ کر اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ تاآنکہ انسان کی ایک خاص شکل و صورت بن جاتی ہے اور رحم مادر میں یہ ایسا منضبط اور مضبوط نظام ہے جس میں تخلف نہیں ہوتا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ کسی انسان کی ناک کا ایک نتھنا چھوٹا ہو، دوسرا بڑا ہو، یا ایک نتھنا لمبوترا ہو تو دوسرا چپٹا ہو۔ یہی حال دوسرے اعضاء کا ہے۔ پھر ایک مقررہ مدت کے بعد انسان زندہ اور شکل و صورت والا بن کر رحم مادر سے باہر آ جاتا ہے۔ گویا مردہ غذاؤں سے اللہ نے زندہ چیز بنا دی۔ اور یہ عمل حیوانات' نباتات اور انسان غرضیکہ تمام انواع میں ہمہ وقت جاری و ساری ہے۔ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ توالد و تناسل کے ذریعہ پیدائش ہر نوع کے ابتدائی جاندار کی

إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴿١٩﴾ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٠﴾ يُعَذِّبُ

یقیناً یہ (اعادہ) اللہ پر آسان تر ہے۔(۱۹) آپ ان سے کہئے کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ اللہ نے کس طرح مخلوق [۳۲] کو پہلی بار پیدا کیا ہے۔ پھر اللہ ہی دوسری بار پیدا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے(۲۰) وہ جسے

نسبت اللہ کے لئے زیادہ آسان ہے۔

❁ نقش ثانی نقشِ اول سے آسان:۔ اب اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان زندہ تھا وہ مر گیا۔ اور مٹی میں مل گیا۔ اور قیامت کو وہی انسان دوبارہ اٹھا کھڑا کیا جائے گا۔ مٹی کے اندر جو تغیرات ہوں گے اور جس طرح انسان دوبارہ پیدا ہوگا یہ باتیں انسان کی تحقیق سے باہر ہیں۔ تاہم یہ ایک بدیہی حقیقت ہے جس کے لئے ضرورت نہیں کہ نقش ثانی کا بنانا نقش اول کی نسبت زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اور دوسری عقلی دلیل یہ ہے کہ جو ہستی رحم مادر میں اس قدر منضبط اور مربوط نظام قائم کرکے مردہ اشیاء سے زندہ انسان بنا کھڑا کر سکتی ہے وہ یقیناً مٹی میں ملے ہوئے اجزا سے بھی ہر انسان کو دوبارہ پیدا کر سکتی ہے۔ اور یہ دوسری بار کی پیدائش اس کے لئے نسبتاً آسان چیز ہے۔

[۳۲] ❁ ہر ایک ذرے کے اندر کائناتی نظام:۔ اب اگر انسان کائنات کی دوسری اشیاء اور جمادات میں غور کرے تو اور بھی زیادہ ورطہ حیرت میں گم ہو جاتا ہے۔ ہر مادی چیز ان گنت چھوٹے چھوٹے ذرات سے مل کر بنی ہے۔ سب سے چھوٹا ذرہ جو انسان کے علم میں آیا ہے وہ ایٹم (Atom) ہے۔ جو انیسویں صدی تک جزو لایتجزیٰ سمجھا جاتا رہا۔ یعنی اتنا حقیر ذرہ جس کی مزید تقسیم ناممکن تھی۔ اور اسے صرف کسی طاقتور خوردبین کی مدد سے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر موجودہ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اس حقیر سے ذرے میں بھی ایک بڑا ہی مضبوط نظام قائم ہے۔ اس میں الیکٹران (Electron) بھی ہے اور پروٹون (Proton) بھی۔ اور دونوں بڑے منضبط طریقے سے اس حقیر سے ذرہ کے اندر اس طرح محو گردش ہیں جس طرح ہمارا نظام شمسی اور سورج کے گرد سیارے محو گردش ہیں۔ ان کو اپنا مفوضہ کام کرنے سے کوئی چیز بھی روک نہیں سکتی۔ نہ ہی یہ ایک دوسرے کے کام میں خلل اندازی کرتے ہیں۔ ہر مادی جسم ایسے ہی لاتعداد ذرات سے مل کر بنتا ہے۔ اور اگر اس ذرہ میں موجود نظام کو توڑا جائے تو اس حقیر سے ذرے سے بے پناہ توانائی حاصل ہوتی ہے۔ جن سے موجودہ دور میں ایٹم بم تیار کیا جاتا ہے۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ اس توانائی کو اپنی تعمیری ضرورتوں کے لئے استعمال کرے یا اسے نوع انسانی کو تباہ و برباد کر دینے اور تخریبی کاموں کے لئے استعمال کرے۔ اب سوال یہ ہے کہ جس ہستی نے ہر مادہ چیز کو اس محیر العقول طریق سے پہلی بار پیدا کر لیا کیا وہ دوبارہ ایسی ہی مخلوق پیدا نہ کر سکے گا؟

موجودہ تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ مادہ صرف اپنی شکل بدلتا رہتا ہے۔ اس میں سے کچھ بھی اس کا حصہ بالکل فنا نہیں ہو جاتا۔ اس تحقیق نے بعث بعد الموت کے عقیدے کو بہت حد تک قریب الفہم بنا دیا ہے کیونکہ مادہ کے ایک ایک ذرہ پر اللہ تعالیٰ کا براہِ راست کنٹرول ہے۔

مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ﴿٢١﴾ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي
السَّمَآءِ ۡ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿٢٢﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
وَلِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٢٣﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ

چاہے سزا دے اور جس پر چاہے رحم کرے[۳۳] اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔(۲۱) تم اسے نہ زمین میں عاجز کر سکتے ہو اور نہ آسمان میں اور نہ ہی اللہ کے سوا تمہارا کوئی حامی یا مددگار[۳۴] ہو سکتا ہے(۲۲) اور جن لوگوں نے اللہ کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا وہ میری رحمت سے مایوس[۳۵] ہو چکے ہیں۔ اور انہی کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔(۲۳) تو ابراہیم[۳۶] کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ

[۳۳] روزِ آخرت اور انسان کے دوبارہ پیدا ہونے پر دلائل دینے کے بعد فرمایا کہ تم بہر حال اللہ کے سامنے پیش کئے جاؤ گے۔ ایسی کوئی صورت ممکن نہیں کہ تم اس حاضری سے بچ سکو۔ پھر وہ تمہارے اعمال کے مطابق تمہیں سزا دے گا اور کسی کے حق میں اس کی حکمت کا یہ تقاضا ہو کہ اس پر رحم کیا جائے تو وہ اسے اپنی رحمت کی بنا پر معاف بھی کر سکتا ہے۔

[۳۴] یعنی نہ تم میں اتنا زور ہے کہ زمین کی حدود سے باہر نکل جاؤ اور نہ اتنی طاقت ہے کہ آسمانوں تک پہنچ جاؤ۔ یہ غالباً اس لئے فرمایا کہ انسان اس زمین کے علاوہ کسی دوسری جگہ زندہ رہ ہی نہیں سکتا کیونکہ اس کی تمام غذائی اور جسمانی ضروریات اس زمین سے وابستہ ہیں الا یہ کہ چند دنوں کے لئے کوئی عارضی سا بندوبست کر لے اور جب اللہ کی گرفت آجائے تو نہ تم میں اتنا زور ہے کہ اس کی گرفت سے بچ سکو اور نہ کوئی دوسری ہستی اتنی طاقتور ہے کہ وہ اس کے عذاب سے تمہیں پناہ دے سکے یا اس کے عذاب کو روک سکے۔

[۳۵] اللہ کی آیات سے انکاری درحقیقت اللہ کی رحمت سے دوری کا سب سے بڑا سبب ہے۔ یعنی جو لوگ عقیدہ آخرت، اللہ سے ملاقات اور بعث بعد الموت کے منکر ہیں انہیں رحمتِ الٰہی کی امید کیونکر ہو سکتی ہے جبکہ وہ اس بات کے قائل ہی نہیں۔ لہٰذا وہ آخرت میں اللہ کی رحمت سے محروم اور مایوس ہی رہیں گے پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ جو لوگ اللہ سے ملاقات کی امید رکھتے ہیں تو انہیں یقین رکھنا چاہئے کہ ان کی موت جلد ہی آنے والی ہے (۲۹:۵) یعنی موت کے فوراً بعد اللہ کی رحمت اسے اپنی آغوش میں لے لے گی۔ یہ دونوں طرح کی آیات ایک دوسری کا عکس ہیں۔

[۳۶] ۞ قوم کا سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو آگ کے الاؤ میں پھینک دینا: سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے حالات کے درمیان آیت نمبر ۱۹ سے لے کر آیت نمبر ۲۳ تک اللہ تعالیٰ کا اپنا کلام ہے۔ جس میں ربطِ مضمون کی نسبت سے توحید اور آخرت پر کچھ دلائل پیش کرنے کے بعد اب پھر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے حالات کی طرف عود کیا جا رہا ہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے دلائل توحید کا جب قوم ابراہیم سے کوئی جواب بن نہ پڑا تو وہ اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے اور یہی باطل پرستوں کی عادت ہوتی ہے۔ یہاں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ان کے بتوں کو توڑنے پھوڑنے کا واقعہ حذف کر دیا گیا ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے یہ کام اس لئے کیا تھا کہ قوم پر عملی طور پر واضح کر سکیں کہ ان کے معبود بالکل ناکارہ چیزیں ہیں جو اپنی

قَوۡمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوا اقۡتُلُوۡهُ اَوۡ حَرِّقُوۡهُ فَاَنۡجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۲۴﴾ وَ قَالَ اِنَّمَا اتَّخَذۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَوۡثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَیۡنِكُمۡ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا ۚ ثُمَّ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ یَكۡفُرُ بَعۡضُكُمۡ بِبَعۡضٍ وَّ یَلۡعَنُ بَعۡضُكُمۡ

نہ تھا کہ انہوں نے کہہ دیا کہ ''اسے مار ڈالو یا جلا ڈالو'' پھر اللہ نے اسے آگ سے بچالیا۔ یقیناً اس واقعہ میں ایمان لانے والوں کے لئے کئی نشانیاں [۳۷] ہیں۔ (۲۴) نیز ابراہیم نے ان سے کہا: تم نے دنیا کی زندگی میں تو اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو آپس میں محبت [۳۸] کا ذریعہ بنالیا ہے مگر قیامت کے دن تم ایک دوسرے کا انکار کر دو گے اور ایک

حفاظت اور اپنے آپ سے بھی نقصان کو دور نہیں کر سکتے وہ دوسروں کی مشکل کشائی کیسے کر سکتے ہیں۔ اسی مشاہداتی دلیل نے ان لوگوں کو اور بھی زیادہ مشتعل اور سیخ پا کر دیا۔ آخر انہوں نے یہ مشورہ کیا کہ ابراہیم علیہ السلام کو مار ہی ڈالو اور اگر ایسا نہ کرو تو اسے آگ میں جلا ڈالو۔ آگ میں جلانے کے مشورہ میں بھی دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ اسے دکھ دینے والا آگ کا عذاب دے کر مارنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ شاید کہ آگ کا عذاب دیکھ کر اپنی باتوں سے باز رہنے کا عہد کر لے۔ بہر حال ان لوگوں نے لمبا چوڑا آگ کا الاؤ تیار کیا اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اس آگ میں پھینک دیا۔

[۳۷] لیکن اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم دیا کہ وہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے حق میں ٹھنڈی اور غیر مضر بن جائے۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام اس آگ میں اس طرح رہے جیسے کوئی شخص باغ اور گلزار میں رہتا ہے۔ اور اس میں نشانیاں یہ ہیں:

(۱) ہر چیز کے کچھ طبیعی خواص ہیں اور یہ خواص اللہ تعالیٰ نے ہی ہر چیز میں ودیعت کر رکھے ہیں۔

(۲) ان خواص میں اللہ تعالیٰ جب چاہے تبدیلی لا سکتا ہے۔ اگرچہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر اللہ چاہے تو بعض اشیاء کے طبیعی خواص سلب بھی کر سکتا ہے اور ان میں تبدیلی بھی لا سکتا ہے۔

(۳) اللہ کے بندوں کو اللہ کی مدد پہنچتی ضرور ہے۔ مگر پہلے انہیں ابتلا کے دور سے گزارا جاتا ہے اور ایسی خرق عادت مدد صرف اس وقت آتی ہے جب اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو۔

اس واقعہ پر منکرین معجزات کی تاویل اور اس کا جواب سورہ انبیاء کے حاشیہ نمبر ۵۸ کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

[۳۸] قوم کے باہمی اتحاد کی بنیاد شرکیہ رسوم:۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے آگ سے صحیح سلامت نکل آنے کے بعد کہا تھا۔ یعنی تم لوگوں نے آپس میں باہمی محبت، بھائی چارہ اور قومی شیرازہ بندی کی بنیاد ان مشرکانہ رسوم کو بنالیا ہے تاکہ ایسے مذہب کے نام پر ساری قوم متحد اور متفق رہے۔ قومی یگانگت کے لئے کوئی بھی بنیاد بنائی جا سکتی ہے خواہ یہ بنیاد بجائے خود کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو جیسے کہ آج کل وطن پرستی، قوم پرستی، نسل پرستی، ایسی ہی غلط بنیادوں پر لوگ متحد و متفق ہو جاتے ہیں اور یہ بنیادیں فساد کا باعث بن رہی ہیں۔ تاہم ان غلط قسم کی بنیادوں پر بھی لوگوں کو اکٹھا کیا جا سکتا ہے، اکٹھا رکھا جا سکتا ہے اور ان میں باہمی محبت ہو سکتی ہے۔ بالکل اسی طرح بت پرستی اور شرکیہ عقائد پر بھی ایسا اتحاد و اتفاق ممکن ہے۔ اور بت پرستوں کی یہی آپس کی باہمی محبت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال کر ان سے انتقام لینے کا باعث بنی تھی۔

بَعۡضًا وَّمَاۡوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ ﴿۲۵﴾ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوۡطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّىۡ مُهَاجِرٌ

وقف لازم

دوسرے[۳۹] پر لعنت بھیجو گے۔ اور تمہارا ٹھکانا آگ ہوگا اور تمہارا کوئی مددگار بھی نہ ہوگا۔(۲۵) (آگ کو ابراہیم پر ٹھنڈا ہوتے دیکھ کر) لوط سیدنا ابراہیم پر[۴۰] ایمان لے آئے اور ابراہیم نے کہا کہ میں تو اپنے پروردگار کے حکم کے

مفسرین نے اس کی دوسری توجیہ یہ بیان کی ہے جو قوم نوح کے بتوں سے متعلق صحیح احادیث میں مذکور ہے کہ اس قوم میں پانچ ایسے بزرگ تھے جو بڑے نیک بڑے عبادت گزار تھے اور انہیں دیکھ کر اللہ یاد آتا تھا۔ جب یہ بزرگ فوت ہوگئے تو پچھلوں کو اپنی عبادت میں وہ مزا نہ آتا تھا جو ان کی موجودگی میں آتا تھا۔ اب شیطان نے انہیں یہ پٹی پڑھائی کہ اگر وہ موجود نہیں رہے تو کوئی بات نہیں ان کے مجسمے بنا کر اپنے سامنے رکھ لو گے تو تمہیں عبادت میں وہی لطف آیا کرے گا جو ان کی موجودگی میں آتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ان پانچ بزرگوں کے مجسمے اپنی عبادت گاہ میں رکھ لئے مگر وہ عبادت اللہ ہی کی کرتے تھے۔ پھر بعد کی نسلوں نے ان مجسموں کو ہی پوجنا شروع کر دیا۔ اس طرح اس قوم میں بت پرستی کا رواج ہو گیا۔ اور اس کی بنیاد ہی بزرگوں سے ان کی باہمی محبت تھی۔

اور اس کی تیسری توجیہ یہ ہے کہ سب مشرکوں کو بتوں یا اپنے معبودوں سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ ان کے عقیدہ کے مطابق ان کے حاجت روا اور مشکل کشا ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿اَنۡدَادًا يُّحِبُّوۡنَهُمۡ كَحُبِّ اللّٰهِ﴾ (۲:۱۶۵) پھر اسی بنیاد پر ان مشرکوں کی آپس میں بھی محبت ہو جاتی ہے جیسے اللہ کے پرستاروں کی اصل محبت تو اللہ سے ہوتی ہے۔ لیکن اللہ والوں کی آپس میں باہمی محبت بھی ان کے ایمان کا جز بن جاتی ہے۔

[۳۹] ۞ **معبودوں کا عبادت سے انکار اور عابد و معبود کی دشمنی:۔** یعنی قیامت کے دن معبود حضرات خود اپنے پرستاروں کی عبادت کا انکار کرتے ہوئے کہیں گے کہ کم بختو! ہم نے تمہیں کب کہا تھا کہ ہمارے بعد ہماری پوجا شروع کر دینا اور اس بات کا بھی اقرار کریں گے کہ ہمیں کچھ خبر نہیں کہ ان لوگوں نے ہمیں اپنا معبود بنا لیا تھا۔ جب معبودوں کا یہ حال ہوگا تو عبادت گزاروں پر، جنہوں نے ان سے کئی طرح کی توقعات وابستہ کر رکھی ہوں گی، جو گزرے گی اس کا بہ آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا عابد، معبود دونوں ایک دوسرے پر لعنتیں بھیجنے لگیں گے اور آپس میں ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے۔ جتنی آج یہ اپنے معبودوں اور اپنے ساتھیوں سے دوستی جتلا رہے ہیں اتنے ہی زیادہ اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔

[۴۰] ۞ **سیدنا لوط کا ایمان لانا اور ہجرت کرنا:۔** سیدنا لوط علیہ السلام سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ دونوں ہی عراق کے شہر بابل کے رہنے والے تھے۔ جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام آگ کے امتحان سے صحیح سلامت باہر نکل آئے اس وقت سیدنا لوط علیہ السلام نے ان پر ایمان لانے کا اعلان کیا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سیدنا لوط علیہ السلام پہلے مشرک تھے۔ کیونکہ نبیوں کی نبوت سے پہلی زندگی بھی اللہ کی مہربانی سے ایسی نجاستوں سے پاک و صاف ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ اور بھی کئی ایسے آدمی ہوتے ہیں جو شرک سے بیزار قلب سلیم رکھتے ہیں مگر انہیں صحیح رہنمائی نہیں ملتی۔ دور نبوی میں بھی آپ کی نبوت سے پہلے ایسے چھ آدمی موجود تھے۔

إِلَىٰ رَبِّيْ ۖ إِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٢٦﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ إِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ
ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ أَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَإِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ
الصّٰلِحِيْنَ ﴿٢٧﴾ وَلُوْطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ إِنَّكُمْ لَتَأْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۡ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ
أَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٨﴾ أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَأْتُوْنَ فِيْ

مطابق ہجرت [۴۱] کرنے والا ہوں۔ وہ یقیناً سب پر غالب اور حکمت والا ہے (۲۶) اور ہم نے انہیں اسحاق اور (اسحاق سے) یعقوب عطا کیے اور انہی کی اولاد میں نبوت [۴۲] اور کتاب رکھ دی۔ اور ہم نے دنیا میں بھی انہیں اجر عطا کیا اور آخرت [۴۳] میں وہ یقیناً صالح لوگوں سے ہوں گے۔ (۲۷)

اور لوط (کا واقعہ یاد کرو) جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: تم ایسی بدکاری کے مرتکب ہو رہے ہو جو تم سے پہلے دنیا والوں میں سے کسی نے نہیں کی تھی۔ (۲۸) کیا تم لوگ (شہوت سے) مردوں کے پاس جاتے ہو، راہزنی [۴۴] کرتے ہو

[۴۱] مفسرین کہتے ہیں کہ یہ ہجرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا لوط علیہ السلام دونوں نے مل کر کی تھی۔ اور یہ سفر ہجرت بابل سے فلسطین کی طرف تھا۔ اللہ کی حکمت اسی میں تھی کہ آپ وہاں چلے جائیں، اسی مقام پر سیدنا لوط علیہ السلام کو بھی نبوت ملی تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے سیدنا لوط علیہ السلام کو سدوم کے علاقے کی طرف بھیج دیا۔

[۴۲] ۞ **سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر اللہ کی مہربانیاں:۔** سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر جتنے بھی ابتلاء کے دور آئے ان سب میں آپ کامیاب رہے جب ہجرت کی تو اس وقت تک آپ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ گھربار اور وطن اور عزیز و اقارب چھوڑنے پر اللہ نے آپ کو اولاد عطا فرمادی کہ دل بہلا رہے۔ مزید یہ انعام فرمایا کہ نبوت آپ ہی کے خاندان سے مختص فرمادی۔ آپ کے بعد جتنے بھی نبی آئے آپ ہی کی نسل سے آئے۔ اسی لئے آپ کو ابوالانبیاء بھی کہا جاتا ہے۔ ان میں سے صرف آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے مبعوث ہوئے باقی سب سیدنا اسحاق علیہ السلام بلکہ ان کے بیٹے سیدنا یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ جنہیں اسرائیل بھی کہا جاتا ہے۔

[۴۳] دنیا میں ایک تو یہ اجر دیا کہ نبوت کو ان کے خاندان سے مختص کر دیا اور دوسرا اجر یہ دیا کہ آپ کو تمام لوگوں کا امام اور پیشوا بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ یہودیوں، عیسائیوں، مسلمانوں بلکہ اور بھی کئی مذاہب کے ہاں یکساں محترم ہیں حتیٰ کہ مکہ کے مشرکین بھی اپنے آپ کو انہی سے منسوب کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی آپ پر مزید مہربانی یہ تھی کہ رہتی دنیا تک آپ کا ذکر خیر ان میں چھوڑ دیا۔ امتِ محمدیہ میں اس ذکر خیر کی صورت یہ ہے کہ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اپنی ہر نماز میں آپ پر درود پڑھے۔ اور آخرت میں آپ کو اعلیٰ درجہ کے صالحین (جو انبیائے اولوالعزم کی جماعت ہے) میں شامل کیا۔

[۴۴] ﴿تَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ﴾ کے دو مطلب ہیں ایک تو ترجمہ سے واضح ہے۔ ان لوگوں کی صرف یہی بدعادت نہیں تھی کہ وہ لونڈے بازی کرتے تھے بلکہ مسافروں کی راہ تکتے رہتے، پھر انہیں اپنے ساتھ بستی میں لے آتے اس سے لواطت بھی کرتے پھر اس کا مال اسباب نقدی وغیرہ چھین کر اسے اپنی بستی سے باہر نکال دیتے تھے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ عورتوں کو چھوڑ

نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ۭ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٢٩﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَي الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٣٠﴾ وَلَمَّا جَاۗءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿٣١﴾

ع ۳ / ۱۵

اور اپنی مجالس [۴۵] میں برے کام کرتے ہو؟ تو اس کی قوم کا اس کے سوا کچھ جواب نہ تھا کہ انہوں نے یہ کہہ دیا اگر تم سچے ہو تو ہم [۴۶] پر اللہ کا عذاب لے آؤ۔(۲۹) لوط نے دعا کی: "پروردگار! ان مفسد لوگوں کے مقابلہ میں میری مدد [۴۷] فرما"(۳۰)

اور جب ہمارے بھیجے ہوئے [۴۸] (فرشتے اسحاق کی) بشارت لے کر ابراہیم کے پاس آئے تو کہنے لگے کہ: ہم اس بستی (سدوم) کو ہلاک کرنے والے ہیں۔ کیونکہ اس کے باشندے ظالم ہیں(۳۱)

کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کر کے بقائے نقل انسانی کے فطری طریق کو قطع کرتے تھے۔

[۴۵] قوم لوط کی کارستانیاں:۔ یعنی یہ لوگ اجتماعی قسم کی لواطت کرتے تھے۔ مثلاً جب کوئی مسافر یا کوئی خوبصورت لڑکا ان کے ہتھے چڑھ جاتا تو اسے اپنے ڈیرے پر لے جاتے پھر باری باری ایک دوسرے کے سامنے اس سے لواطت کرتے تھے۔ اور اس میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے تھے۔ اور اپنی مجالس میں ایک دوسرے سے انتہائی لچر اور بے حیائی کی زبان استعمال کرتے تھے۔

[۴۶] یہ اس قوم کا پہلا جواب تھا۔ اور منکرین حق یہ جواب عموماً اس لئے دیتے ہیں کہ وہ انبیاء علیہم السلام کو اور ان کی دعوت کو جھوٹا سمجھتے ہیں اور ان کے وعدہ عذاب کا انہیں قطعاً یقین نہیں ہوتا۔ اس مقام پر ان لوگوں کے اسی جواب کا ذکر ہے اور دوسرے مقام پر ان کا دوسرا جواب مذکور ہے جو یہ تھا۔ کہ تم لوگ اپنے آپ کو پاکباز اور ہمیں گندے لوگ سمجھتے ہو تو پاکباز لوگوں کا ہم جیسے گندے لوگوں میں کیا کام؟ لہٰذا تم لوگ یہاں سے نکل کر کسی دوسری جگہ چلے جاؤ۔ اور اگر تم نے اپنا وعظ نصیحت نہ چھوڑا تو پھر ہم تم لوگوں کو اپنی بستی سے نکال باہر کریں گے۔

[۴۷] جب ان لوگوں کی سرکشی اور مخالفت اس حد تک پہنچ گئی اور سیدنا لوط علیہ السلام ان کے راہ راست پر آنے سے مایوس ہو گئے تو اس وقت آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ جس طریقے سے تو مناسب سمجھے میری مدد فرما اور مجھے ان لوگوں سے نجات دے۔

[۴۸] سیدنا لوط علیہ السلام کی دعا کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا۔ اور اس بدکار قوم کی بستی کو ہلاک کرنے اور سیدنا لوط علیہ السلام کو نجات دینے کے لئے اپنے فرشتے بھیج دیئے۔ پہلے یہ فرشتے انسانوں کی شکل میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام ان کی مہمانی کے لئے بچھڑا بھون کر لے آئے۔ مگر جب ان نووارد مسافروں نے کھانے کی طرف ہاتھ تک نہ بڑھایا تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام دل میں ڈر گئے۔ پھر جب فرشتوں نے بتایا کہ ہم فرشتے ہیں اور آپ کو ایک بیٹے کی بشارت دینے آئے ہیں۔ تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا ڈر جاتا رہا۔ اور یہ واقعہ کئی مقامات پر تفصیل سے گزر چکا ہے۔

قَالَ إِنَّ فِيهَا لُوطًا ۚ قَالُوا نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَن فِيهَا ۖ لَنُنَجِّيَنَّهُ وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ ﴿٣٢﴾ وَلَمَّا أَن جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ

سیدنا ابراہیم نے کہا: ”وہاں تو لوط بھی موجود ہیں۔ وہ کہنے لگے: ہم خوب[۴۹] جانتے ہیں کہ وہاں کون کون ہے۔ ہم انہیں اور ان کے گھر والوں کو بچالیں گے بجز ان کی بیوی جو پیچھے رہ جانے والوں سے ہو گی۔“ (۳۲)

اور جب ہمارے یہ رسول (فرشتے) لوط کے پاس آئے[۵۰] تو ان کی آمد پر انہیں دکھ ہوا اور دل میں گھٹن پیدا ہو گئی۔

[۴۹] قوم لوط پر عذاب لانے والے فرشتوں سے ابراہیم علیہ السلام کی بحث:۔ اس خوشخبری کے بعد فرشتوں نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو بتایا کہ وہ دراصل ایک اور مہم پر بھیجے گئے ہیں۔ وہ جو سامنے بستی نظر آ رہی ہے۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اسے تباہ و برباد کر دیں۔ کیونکہ اس بستی کے باشندے اللہ کے نافرمان اور سرکش لوگ ہیں۔ فرشتوں نے جس طرف اشارہ کیا وہ وہی سدوم کا علاقہ تھا۔ جہاں خود سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے سیدنا لوط علیہ السلام کو تبلیغ کے لئے بھیجا تھا۔ لہٰذا وہ فوراً بول اٹھے۔ وہاں تو لوط علیہ السلام بھی موجود ہیں۔ کیا تم اس کے وہاں ہوتے ہوئے اس بستی کو تباہ و برباد کر دو گے۔ اس آیت میں تو اتنی ہی بات مذکور ہے۔ لیکن ایک دوسرے مقام پر ﴿يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوطٍ﴾ (۱۱: ۷۴) کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں سے پوری طرح بحث کی تھی کہ لوط علیہ السلام کے علاوہ فلاں فلاں ایمان دار بھی وہاں موجود ہے۔ اور فلاں بھی۔ تو ان لوگوں کے ہوتے ہوئے تم کیونکر اس بستی کو ہلاک کر دو گے؟ فرشتوں نے اس کا جواب یہ دیا کہ ہمیں پوری طرح معلوم ہے کہ وہاں کون کون ایماندار موجود ہے۔ ہم پہلے ان کو بچانے کی صورت بنائیں گے۔ تب ہی اس بستی کو غارت کریں گے۔ البتہ لوط کے گھر والوں میں سے سیدنا لوط علیہ السلام کی بیوی بھی اس عذاب سے تباہ ہو گی۔ کیونکہ وہ اپنے خاوند کی وفادار نہیں بلکہ خائن ہے۔ فرشتوں کے اس جواب سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ اب اس بستی کی شامت آ کے رہے گی۔ دراصل وہ اپنی طبیعت کی نرمی کی وجہ سے چاہتے یہ تھے کہ اس ظالم قوم کو سنبھلنے کے لیے کچھ مزید مہلت مل جائے۔ مگر ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ کیونکہ عذابِ الٰہی کا نزول طے ہو چکا تھا۔

[۵۰] فرشتوں کو دیکھ کر لوط علیہ السلام کی بے چینی:۔ فرشتے وہاں سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے رخصت ہو کر سیدھے سیدنا لوط علیہ السلام کے گھر آ پہنچے۔ اب صرف انسانی شکل میں نہیں بلکہ بے ریش خوبصورت لڑکوں کی شکل میں آئے تھے جو قوم لوط کے اوباش لوگوں کے لئے اپنے اندر کشش رکھتے تھے۔ ان کو دیکھ کر سیدنا لوط علیہ السلام کے دل میں سخت اضطراب پیدا ہوا۔ کہ اب یہ اوباش قوم ان سے بھی وہی سلوک کرے گی جو مسافروں، مہمانوں اور راہ گیروں سے کیا کرتی ہے۔ فرشتوں نے سیدنا لوط علیہ السلام کے اس خوف اور خطرہ کو فوراً بھانپ لیا اور کہنے لگے۔ تمہارے ڈرنے اور غمگین ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ ہم انسان نہیں بلکہ فرشتے ہیں۔ ہم خود ان سے نمٹ لیں گے۔ اس مقام پر کچھ تفصیلات حذف کر دی گئی ہیں۔ جو دوسرے مقامات پر ذکر کی گئی ہیں۔

ذَرۡعًا وَّ قَالُوۡا لَا تَخَفۡ وَ لَا تَحۡزَنۡ ۟ اِنَّا مُنَجُّوۡكَ وَ اَهۡلَكَ اِلَّا امۡرَاَتَكَ كَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِیۡنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا مُنۡزِلُوۡنَ عَلٰۤی اَهۡلِ هٰذِهِ الۡقَرۡیَةِ رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوۡا یَفۡسُقُوۡنَ ﴿۳۴﴾ وَ لَقَدۡ تَّرَكۡنَا مِنۡهَاۤ اٰیَةًۢ بَیِّنَةً لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۳۵﴾ وَ اِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاهُمۡ

انہوں نے کہا: نہ ڈرو اور نہ غمزدہ ہو۔ ہم تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو بچالیں گے بجز تمہاری[۵۱] بیوی کے کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں سے ہے۔(۳۳) ہم اسی بستی کے رہنے والوں پر آسمان سے عذاب[۵۲] نازل کرنے والے ہیں کیونکہ یہ بدکاری کر رہے تھے۔(۳۴) اور سمجھنے سوچنے والے لوگوں کے لئے ہم نے اس بستی کی ایک واضح نشانی[۵۳] چھوڑ دی ہے۔(۳۵) اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔

[۵۱] قوم لوط پر عذاب آنا:۔ سیدنا لوط علیہ السلام اس علاقہ کے قدیمی باشندے نہیں تھے۔ بلکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ہمراہ بابل سے ہجرت کر کے پہلے فلسطین آئے تھے پھر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے حکم سے یہاں بھیجے گئے تھے۔ لیکن آپ کی بیوی اسی بدمعاش قوم کی بیٹی تھی۔ نبی کی صحبت بھی اسے اپنی قوم اور بھائی بندوں کی عصبیت سے پاک نہ کر سکی۔ وہ نبی کے بجائے اپنے بھائی بندوں کا ساتھ دیتی تھی اور اگر سیدنا لوط علیہ السلام کے ہاں کوئی مہمان آتا تو یہ فوراً ان کو خبر کر دیتی تھی۔ وہ اپنے خاوند کے بجائے اپنے بھائی بندوں کی وفادار اور انہی کی ہمراز تھی۔ فرشتوں نے سیدنا لوط علیہ السلام سے کہا: آپ کی دعا قبول ہوگئی، ہم آپ کو اس ظالم قوم سے نجات دلانے کے لئے آئے ہیں۔ تم یوں کرو کہ اپنے اہل خانہ اور ایماندار ساتھیوں کو ساتھ لے کر راتوں رات یہاں سے نکل جاؤ۔ اور دیکھو تمہاری بیوی تمہارے ہمراہ نہیں جائے گی۔ اور جب تم لوگ اس بستی سے نکلو تو اس طرح کہ تمہارے سب ہمراہی آگے ہوں اور تم ان سے پیچھے رہو۔ جیسے تم ہی انہیں چلا کر اس بستی سے دور لے جا رہے ہو اور یہ بھی خیال رکھنا کہ تم میں سے کوئی شخص بھی پلٹ کر پیچھے کی طرف نہ دیکھے مبادا کہ عذاب کا کچھ حصہ اسے بھی پہنچ جائے۔

[۵۲] اللہ کا عذاب صبح دم ان پر نازل ہونے والا ہے۔ لہٰذا تم دیر نہ کرو اور اپنے ہمراہیوں کو لے کر صبح ہونے سے پہلے پہلے ہی اس بستی سے کافی فاصلہ تک پہنچ جانا چاہئے ہم اس بدکار قوم پر شدید ترین عذاب نازل کرنے کے لئے آئے ہیں۔

[۵۳] عذاب کی نوعیت:۔ اس بدبخت قوم پر سب قوموں سے سخت عذاب آیا تھا۔ پہلے فرشتوں نے اس پورے خطہ زمین کو اپنے پروں پر اٹھایا۔ پھر بلندی پر لے جا کر اسے الٹا کر زمین پر پٹخ دیا۔ اور اس زور سے زمین پر دے مارا کہ سارا خطہ زمین کی سطح سے کافی نیچے دھنس گیا۔ پھر اس بدبخت قوم پر پتھر برسائے گئے۔ اور اب یہ سارا علاقہ زیر آب آچکا ہے۔ اور اس سمندر کا نام بحر موت یا بحیرہ مردار ہے جس کی گہرائیوں میں یہ بدمعاش قوم دفن کر دی گئی تھی۔ اور یہ واقعہ نشانی اس لحاظ سے ہے کہ یہ علاقہ اس تجارتی شاہراہ پر واقع ہے جو مکہ سے شام کو جاتی ہے اور کفار مکہ اسے اپنے تجارتی سفروں میں آتے ہوئے بھی اور جاتے ہوئے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے کہ اس نافرمان اور بدمعاش اور سرکش قوم کا کیا حشر ہوا تھا۔

شُعَيْبًا فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿٣٦﴾
فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٣٧﴾ وَعَادًا وَّثَمُوْدَا۟ وَقَدْ
تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۣ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا

انہوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت[۵۴] کرو اور آخرت کے دن[۵۵] کی توقع رکھو اور ملک میں فساد نہ مچاتے[۵۶] پھرو۔(۳۶) ان لوگوں نے شعیب کو جھٹلا دیا[۵۷] تو آخر انہیں ایک سخت زلزلہ نے آلیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔(۳۷) اور قوم عاد اور ثمود (کو بھی ہم نے ہلاک کر دیا) اور یہ بات تمہیں ان کی رہائش گاہوں سے واضح[۵۸] ہو چکی ہے۔ شیطان نے انہیں ان کے کرتوت بڑے خوشنما کر کے دکھائے تھے اور انہیں راہ حق سے برگشتہ کر دیا تھا حالانکہ وہ بڑے سمجھ دار[۵۹] لوگ تھے۔(۳۸)

[۵۴] ❁ ذکر شعیب علیہ السلام:۔ سیدنا شعیب علیہ السلام اہل مدین کی طرف بھی مبعوث ہوئے تھے اور اصحاب ایکہ کی طرف بھی۔ اور یہ دونوں علاقے آس پاس تھے۔ شعیب علیہ السلام نے پہلی بات یہی کی کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور شرک ایسا مرض ہے جو تمام انبیاء کی قوموں میں پایا جاتا ہے۔ شیطان ہر دور میں انسان کو شرک کی نئی سے نئی شکلیں سمجھاتا رہتا ہے اور اس کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کو خالص اللہ کی عبادت سے برگشتہ کر کے کسی نہ کسی طرح کے شرک میں مبتلا کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کی دعوت کا پہلا قدم یہی ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو شرک کی نجاستوں سے لوگوں کو مطلع کریں اور انہیں ایک اللہ کی عبادت کی طرف بلائیں۔

[۵۵] اس جملہ کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ آخرت کے دن پر ایمان لاؤ وہ یقیناً آنے والا ہے جس میں تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس ہو گی۔ دوسرا یہ کہ اگر تم خالصتاً اللہ کی عبادت کرو گے تو تمہیں آخرت کے دن اس کے اچھے اجر کی توقع رکھنا چاہئے۔

[۵۶] اہلِ مدین کا فساد فی الارض یہ تھا کہ وہ اپنے لین دین کے معاملات میں دغا بازیاں کرتے تھے۔ ناپ تول میں کمی بیشی کرنے کے فن میں خوب ماہر تھے اور اس طرح دوسرے لوگوں کے حقوق پر مہذبانہ ڈاکے ڈالتے تھے۔

[۵۷] یعنی شعیب علیہ السلام کی نبوت کو، آپ کی دعوت کو اور اس وعدے کو بھی جھٹلا دیا کہ اگر تم اپنی ان بداعمالیوں سے باز نہ آئے تو تم پر اللہ کا عذاب آئے گا۔

[۵۸] قومِ عاد (اولیٰ) کا وطن پورا جنوبی عرب تھا یعنی یمن، حضر موت اور احقاف کا علاقہ اور ثمود کا علاقہ شمالی عرب تھا۔ ان دونوں علاقوں کی تاریخ سے عرب کا بچہ بچہ واقف تھا۔ پھر وہ ان کی تباہ شدہ بستیاں دیکھتے بھی رہتے تھے۔

[۵۹] ❁ عاد و ثمود 'دیوانہ بکار خویش ہشیار':۔ وہ دنیا کے کاموں میں بڑے ہوشیار اور ماہر فن تھے۔ اپنے اپنے دور کی ترقی یافتہ اور مہذب قومیں تھیں۔ سمجھدار تھے۔ طاقتور تھے اور بالخصوص سنگ تراشی کے فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ لیکن اللہ کے معاملہ

مُسْتَبْصِرِيْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۣ وَلَقَدْ جَاۗءَهُمْ مُّوْسٰي بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا
فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ﴿۳۹﴾ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَ
مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ
اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۰﴾ مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

اور قارون، فرعون، اور ہامان (کو بھی ہم نے ہلاک کیا) ان کے پاس موسیٰ واضح معجزات لے کر آئے مگر وہ ملک میں بڑے بن بیٹھے حالانکہ وہ (ہم سے) آگے[۶۰] نہیں جا سکتے تھے۔(۳۹) ان میں سے ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ کی پاداش میں دھر لیا۔ پھر ان ہلاک ہونے والوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جن پر ہم نے پتھراؤ کیا[۶۱] اور کچھ ایسے جنہیں زبردست[۶۲] چیخ نے آلیا اور کچھ ایسے جنہیں ہم نے زمین میں دھنسا دیا[۶۳] اور کچھ ایسے جنہیں ہم نے غرق[۶۴] کر دیا۔ اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہیں تھا بلکہ یہ لوگ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کر رہے[۶۵] تھے(۴۰) جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اوروں کو سرپرست بنا رکھا ہے

میں شیطان نے ان کی مت مار دی تھی۔ جیسا کہ آج کل عیسائی اقوام کے محققین جب تحقیق و تنقید کے میدان میں اترتے ہیں تو بال کی کھال اتار کے رکھ دیتے ہیں۔ مگر عقیدہ تثلیث کو عقلی دلائل سے ثابت کرنے کا وقت آتا ہے تو بات گول کر جاتے ہیں اور ان کی عقلیں جواب دے جاتی ہیں۔ پھر بھی اسی پر اصرار کرتے جاتے ہیں یا جیسے آج کل کے ماہرینِ فلکیات ہیں جو بڑی سے بڑی طاقتور دوربینوں سے اجرامِ فلکی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان میں بعض علمائے ہیئت کی تو ایسے مت ماری جاتی ہے کہ ایک طرف تو کائنات کے اس مربوط و منظم نظام پر حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے ہیں مگر دوسری طرف یہ سب کچھ اتفاقات کا نتیجہ قرار دینے لگتے ہیں اور لطف یہ کہ اپنے انہی موہوم قیاسات کو علمی تحقیق کے خوبصورت نام سے دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ عاد اور ثمود کے محققین بھی کچھ ایسے ہی لوگ تھے۔

[۶۰] یعنی نہ تو یہ لوگ اپنی تدبیروں سے اللہ کی تدبیر کو ناکام بنا سکتے تھے اور نہ ہی اللہ کی گرفت سے بچ کر کہیں جا سکتے تھے۔

[۶۱] یعنی ہر قوم کو اس کے جرم کے مطابق سزا دے کر صفحہ ہستی سے چلتا کیا اور زمین کو ان لوگوں سے پاک کر دیا۔ ان میں پتھروں کی بارش کا عذاب صرف قوم لوط پر آیا تھا۔ اور قوم عاد پر جو عذاب آیا تھا وہ تیز آندھی کی شکل میں تھا جس میں چھوٹے چھوٹے پتھر کنکر بھی ملے ہوئے تھے۔

[۶۲] قوم ثمود (سیدنا صالح علیہ السلام کی قوم) اور اہل مدین (سیدنا شعیب علیہ السلام کی قوم) پر یہی عذاب آیا تھا۔

[۶۳] یعنی قارون اور اس کے خدام کو پورے خزانوں سمیت، جس کا قصہ سورہ قصص میں پوری تفصیل سے گزر چکا ہے۔

[۶۴] یعنی قوم نوح کو اور فرعون اور آل فرعون کو۔

[۶۵] ان سب قوموں کی طرف ہم نے نبی بھیجے تاکہ وہ انہیں ان کی گمراہیوں سے مطلع کریں۔ لیکن ان لوگوں نے نبیوں کو جھوٹا سمجھا اور اپنی گمراہیوں پر اور بھی زیادہ ڈٹ گئے۔ اللہ کی فرمانبرداری کے بجائے انبیاء کے دشمن بن گئے اور انہیں طرح

أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا ۖ وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ ۖ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٤١﴾ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُونَ مِن دُونِهِ مِن شَيْءٍ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٤٢﴾ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۖ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ ﴿٤٣﴾ خَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ

ان کی مثال مکڑی جیسی ہے جس نے اپنا گھر بنایا ہو اور سب گھروں سے کمزور گھر مکڑی[۶۶] کا گھر ہی ہوتا ہے۔ کاش! یہ لوگ کچھ جانتے (۴۱) یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر جس جس چیز کو پکارتے ہیں۔ اللہ اسے خوب جانتا[۶۷] ہے اور وہی سب پر غالب اور حکمت[۶۸] والا ہے۔ (۴۲) ہم یہ مثالیں لوگوں[۶۹] (کو سمجھانے) کے لیے بیان کرتے ہیں۔ مگر انہیں سمجھتے وہی ہیں جو اہل علم ہیں (۴۳)

طرح کی تکلیفیں دینا شروع کر دیں۔ پھر جب ہماری طرف سے پوری طرح حجت قائم ہو گئی تو اس وقت ہم نے انہیں تباہ کیا اور اس تباہی کے ذمہ دار وہ خود تھے، ہم نہیں تھے۔

[۶۶] ❁ مشرکوں کے معبودوں کی مثال جیسے مکڑی کا گھر ہو:۔ یعنی اوپر جن جن اقوام کا ذکر آیا ہے یہ سب ہی شرک اور بت پرستی میں مبتلا تھیں۔ انہیں چیزوں کو انہوں نے اپنا مشکل کشا سمجھ رکھا تھا اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ان کے سامنے قربانیاں بھی پیش کی جاتیں اور نذروں و نیازوں کے چڑھاوے بھی چڑھائے جاتے تھے، اس امید پر کہ ہمارے یہ سرپرست حضرات ہم سے خوش رہیں۔ اور مصیبت کے وقت ہمارے کام آئیں مگر ان مشرکوں کے معبودوں یا سرپرستوں کی مثال تو مکڑی کے گھر جیسی ہے جو اس قدر کمزور ہوتا ہے کہ انگلی کی ایک ہلکی سی جنبش سے تار تار ہو جاتا ہے اور گر پڑتا ہے۔ اسی طرح ان مشرکوں پر جب اللہ کا عذاب آیا تو اس عذاب کی پہلی اور ہلکی سی ضرب۔۔ سے ہی ان کی تمام تر توقعات کا قصر تار تار ہو گیا اور ان کے معبود جہاں تھے وہیں پڑے کے پڑے رہ گئے۔

[۶۷] اس آیت کے دو مطلب ہیں۔ ایک تو ترجمہ سے ہی واضح ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ جن جن چیزوں کو یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں ان کی حقیقت کچھ بھی نہیں اور محض لاشیٔ ہیں۔

[۶۸] یعنی اللہ کو نہ تو ان معبودان باطل کی رفاقت مطلوب ہے۔ کیونکہ خود ہی سب سے زبردست اور سب پر غالب ہے۔ اور نہ ہی ان سے کسی قسم کے مشورہ کی ضرورت ہے کیونکہ حکیم مطلق ہے۔ اپنے ہر کام کی حکمت اور مصلحت سے خوب واقف ہے۔

[۶۹] ❁ کس قسم کی مثال درست ہوتی ہے؟ اس آیت کے بھی دو مطلب ہیں ایک یہ کہ اقوام عالم کے یہ واقعات اس لئے بیان کرتے ہیں کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ انبیاء کی تکذیب اور اللہ کی نافرمانی کرنے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے۔ اور اللہ اپنے فرمانبرداروں کو ظالموں سے نجات دینے کی کیسی کیسی صورتیں پیدا کر دیتا ہے۔

اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ کفار مکہ کو ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اللہ کی شان اس بات سے بہت بلند تر ہے کہ مکھی، مچھر اور مکڑی جیسی حقیر مخلوق کی مثالیں بیان کرے۔ ایسا اعتراض جاہل قسم کے لوگ ہی کر سکتے ہیں اہل علم نہیں کر سکتے۔ اہل علم تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ آیا ممثل اور ممثل لہ میں جو تشبیہ بیان کی جا رہی ہے وہ درست ہے؟ اگر وہ درست ہے تو پھر مثال بھی درست ہے وہ یہ نہیں دیکھتے کہ مثال بیان کرنے والی ہستی کوئی بڑی ہستی ہے یا چھوٹی۔

وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۴۴﴾ ع ۴ ١٦

اُتْلُ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ

اللہ تعالیٰ نے آسمانوں [٧٠] اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ ان کی پیدائش میں بھی ایمان لانے والوں کے لئے ایک نشانی [٧١] ہے (۴۴)

(اے نبی!) اس کتاب کی تلاوت [٧٢] کیجئے جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہے اور نماز قائم کیجئے۔ نماز یقیناً بے حیائی

[٧٠] یعنی زمین و آسمان یا نظام کائنات کو بے فائدہ ہی نہیں بنا دیا بلکہ اس نظام سے بے شمار مصالح اور فوائد حاصل ہو رہے ہیں۔ زمین پر بسنے والی ہر طرح کی مخلوق کی زندگی اور زندگی کی بقا کا انحصار اسی نظام کائنات پر ہے۔ اگر اس نظام میں سے ایک بھی کل پرزہ اٹھا لیا جائے تو صرف یہی نہیں کہ جاندار اشیاء کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا بلکہ زمین پر نباتات، پودے اور درخت تک بھی نہ اگ سکیں گے۔

[٧١] ۞ اللہ نے کسی کو اپنے اختیارات تفویض نہیں کیے:۔ ہر صاحبِ علم و دانش کے لئے لمحہ فکریہ یہ ہے کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ کائنات کو پیدا تو اللہ کرے، زمین کی روئیدگی کی قوتیں اللہ عطا کرے، بارش برسائے تو اللہ، تمام مخلوق کی ضروریات زندگی مہیا کرے تو اللہ مگر جب اس کے رزق، اس کے فضل اور اس کی رحمت کی لوگوں میں تقسیم کی باری آئے تو دوسرے معبودانِ باطل ہزارہا کی تعداد میں میدان میں آ موجود ہوں۔ اور انسان یہ سوچنے لگے کہ واقعی سب کچھ کیا کرایا تو اللہ نے ہی ہے مگر اس نے رحمت کی تقسیم کے اختیارات دوسرے حضرات کو سونپ دیئے ہیں اور خود فارغ ہو بیٹھا ہے؟ کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی بے انصافی اور ظلم کی بات ہو سکتی ہے؟

[٧٢] ۞ تلاوتِ قرآن کے فائدے:۔ اس آیت میں یہ بظاہر خطاب صرف رسول اللہ ﷺ کو ہے لیکن مخاطب سارے ہی مومن ہیں۔ جو مکہ میں کافروں کے ہاتھوں تکلیفیں اٹھا رہے تھے۔ ان مصائب کے مداوا کے طور پر انہیں تین باتوں کی تلقین کی گئی ایک قرآن کی تلاوت، دوسرے نماز پر ہمیشگی اور تیسرے ہر وقت اللہ کو یاد رکھنا۔

تلاوت قرآن کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے دل میں صبر اور برداشت کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ﴾ (٢٥:٣٢) بشرطیکہ قرآن کریم کو سوچ سمجھ کر پڑھا جائے اور اس کی اقتضاآت کو اپنی ذات پر نافذ کیا جائے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ قرآن کی تلاوت بذات خود باعث اجر و ثواب ہے اور اس کے ایک ایک حرف کے عوض دس نیکیاں ملتی ہیں۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اللہ کی کتاب سے ایک حرف پڑھا، اس کے لئے ایک نیکی ہے اور ہر نیکی کا ثواب دس گنا ہے۔ اور میں نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے۔ بلکہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔ (ترمذی۔ ابواب فضائل القرآن۔ باب ماجاء فی من قرء حرفا من القرآن۔۔۔۔۔)

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ تلاوت قرآن سوچ سمجھ کر پڑھنے سے اس کے معارف و حقائق پڑھنے والے پر منکشف ہوتے چلے جاتے ہیں۔ چوتھا فائدہ یہ ہے کہ تلاوت قرآن سے دوسرے لوگ بھی اس کے مواعظ اور علوم و برکات سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ پانچواں فائدہ یہ ہے کہ دعوت و اصلاح کے فریضہ کی اصل بنیاد تلاوت قرآن کریم ہی ہے۔ پھر جو لوگ قرآن کی ہدایت کو تسلیم نہ کریں ان پر اللہ کی حجت قائم اور پوری ہو جاتی ہے۔

۞ کیا بلاسوچ سمجھے قرآن کی تلاوت بے سود ہے؟ لیکن ہمارے دور کے مفسر قرآن جناب پرویز صاحب بلاسوچ سمجھے تلاوتِ قرآن کو ایک بے ہودہ فعل قرار دیتے ہیں، فرماتے ہیں کہ:

"قرآن ایک کتاب ہے جس میں لکھا ہے کہ اس کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہئے۔ کہئے اس کے الفاظ دہرا دینے سے یہ مقصد حاصل ہو جائے گا؟ نیز قرآن اپنے مضامین پر بار بار غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کیا یہ مقصود بلاسوچ سمجھے پڑھنے سے حاصل ہو سکتا ہے؟ آپ کسی مصنف سے یہ کہئے کہ میں تمہاری کتاب کے ایک لفظ کو بھی نہیں سمجھتا لیکن اس کے باوجود ہر روز اسے پڑھتا ہوں۔ حتیٰ کہ مجھے وہ زبان بھی نہیں آتی جس میں تم نے یہ کتاب لکھی ہے۔ اس کے باوجود اس کتاب کو دہراتا رہتا ہوں۔ آپ خود ہی سوچئے کہ وہ مصنف آپ کو کیا جواب دے گا؟ یہ عقیدہ دراصل مسلمانوں کو قرآن سے الگ رکھنے کے لئے تراشا گیا تھا جو عجمی سازش کا نتیجہ ہے اور یہ عقیدہ یکسر غیر قرآنی ہے جو در حقیقت عہد سحر کی یادگار ہے۔ جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ الفاظ (معانی نہیں) اپنے اندر تاثیر رکھتے ہیں۔ یہ قرآنی اعمال، تعویذ، نقوش، وظائف اوراد، سب اسی عقیدہ کی مستعار شکلیں ہیں" (قرآنی فیصلے ص ۱۰۳)

پھر یہی خیالات مقام حدیث کے ص ۲۲۱ پر دہرائے گئے ہیں اور اس کے بعد قرآنی سورتوں یا آیات کی تلاوت کی فضیلت کے متعلق چند احادیث درج کر کے ایسی احادیث کے موضوع ہونے کا تاثر دیا گیا ہے نیز یہی افکار اسباب زوالِ امت کے ص ۵۹ پر بھی دیئے گئے ہیں اور دلیل میں یہ آیت بھی پیش کی گئی ہے:

﴿وَیَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَالَیْسَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ﴾ (۳:۱۶۷) وہ زبان سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتا (اسباب زوال امت، ص ۵۹)

جواب دینے سے پیشتر ہم جناب پرویز کی ہشیاری کی داد ضرور دینا چاہتے ہیں کہ جو آیت منافقوں سے تعلق رکھتی تھی اسے آپ نے اس مقام پر فٹ کر دکھایا ہے۔ یہ آیت ﴿وَلِیَعْلَمَ الَّذِیْنَ نَافَقُوْا﴾ سے شروع ہوتی ہے اور اس آیت کے مندرجہ ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ منافقوں کی زبان پر کوئی اور بات ہوتی ہے جبکہ دل میں کچھ اور ہوتا ہے یعنی جس بات کا وہ زبان سے اقرار کرتے ہیں ان کے دل اس سے منکر ہوتے ہیں لیکن بلاسوچ سمجھے یا معنی نہ سمجھنے کے باوجود قرآن پاک کی تلاوت کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ اس لئے کہ ایسے شخص کے دل میں کچھ ہوتا ہی نہیں یا اگر کچھ ہوتا ہے تو صرف یہ کہ وہ اپنے پروردگار کے کلام کی تلاوت کر رہا ہے۔ اور یہ ایک اچھا باعث برکت و ثواب عمل ہے۔

قرآن میں تلاوت قرآن پر بہت زور دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی سب سے پہلی ذمہ داری تھی کہ آپ امت پر اللہ کی آیات تلاوت کرتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہی حکم تھا اور مسلمان مردوں اور عورتوں کو یہ بھی حکم تھا کہ وہ ان تلاوت شدہ آیات کو زبانی یاد کر لیا کریں۔ اللہ تعالیٰ ازواج النبی سے فرماتے ہیں: ﴿وَاذْکُرْنَ مَایُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ

وَالْحِكْمَةِ﴾ (۳۳: ۳۴) "اور تمہارے گھروں میں جو اللہ کی آیات و حکمت پڑھی جاتی ہیں، ان کو یاد رکھو"

❁ تلاوتِ قرآن اور حفظِ قرآن:۔ اور یہ تو واضح ہے کہ آیات کو یاد رکھنے اور حفظ کرنے کے لئے ان آیات کو بار بار پڑھنا اور دور کرنا پڑتا ہے اور بار بار تلاوت کرنے کا مقصد غور و تدبر ہی نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ صحابہ کو قرآنی آیات سکھاتے بھی تھے، پڑھاتے بھی تھے، یاد بھی کرواتے تھے، پھر ان سے سنتے بھی تھے، انہیں سناتے بھی تھے، تب جا کر صحابہ کو حفظ اور ضبط ہوتا تھا۔ حفظ کرتے وقت جو تکرار، اعادہ یا دور کیا جاتا ہے اس کا مقصد غور و تدبر کرنا نہیں ہوتا بلکہ حفظ ہی ہوتا ہے اب حفظ کرنے کے لئے آیات کی جو بار بار تلاوت کی جاتی ہے، وہ اگرچہ بلا سوچے سمجھے ہوتی ہے تاہم یہ ایک بہت بڑی دینی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ یعنی قرآن سینوں میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ ایک مستحسن فعل ہوا۔ خواہ یہ حفظ کرتے وقت طوطے کی طرح رٹنا ہی پڑے۔

❁ قانون کی کتاب کیلیے ترتیل کی کیا ضرورت ہے؟۔ نبوت کے ابتدائی ایام میں ہی سورہ مزمل نازل ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا:

﴿وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا﴾ (۷۳: ۴) "اور قرآن کو خوب حسنِ تناسب سے پڑھا کرو"

رَتِّل کا معنی کسی چیز کا حسنِ تناسب کے ساتھ مرتب اور منظم ہونا ہے۔ (مفردات) پھر اس میں کسی عبارت کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا، حسنِ ادائیگی الفاظ اور خوش آوازی یا خوش الحانی سب شامل ہوتے ہیں۔ اگر ہم قرآن کو محض ایک قانون اور ضابطہ حیات کی کتاب ہی تصور کریں تو پھر قانون کی کتاب پڑھنے کے لئے ایسی ہدایات کی کیا ضرورت ہے؟ قانون کی کتاب میں غور و فکر کرنے کے لئے الفاظ کو بلند آواز سے پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی چہ جائیکہ اسے ترتیل سے پڑھا جائے۔

❁ متشابہات کی تلاوت کا فائدہ؟ علاوہ ازیں قرآن میں کچھ ایسی متشابہ آیات بھی ہیں جن کی تاویل اللہ ہی جانتا ہے یا پھر کچھ راسخون فی العلم جان سکتے ہیں۔ عام لوگ جن کی ہر دور میں اکثریت ہوتی ہے، اس کے مفہوم و معانی اور صحیح تاویل و تعبیر تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔ اور ایسی آیات کے مفہوم و معانی کے پیچھے پڑنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے فتنہ پرور قرار دیا ہے۔ اور صفاتِ الٰہی سے تعلق رکھنے والی تقریباً سب آیات اسی قبیل سے ہیں۔ پھر قرآن میں حروف مقطعات بھی اسی قبیل سے ہیں جن کا انسان کی عملی زندگی سے کچھ بھی تعلق نہیں، نہ ہی ان کا صحیح مفہوم معلوم ہو سکا ہے۔ اب اگر قرآن کو صرف قانون اور ضابطہ حیات کی کتاب ہی سمجھا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن میں ایسی آیات کی کیا ضرورت تھی؟ یا کیا تلاوت قرآن کرتے وقت ایسی آیات کو چھوڑ دینا چاہیے؟ یہ باتیں اس چیز پر واضح دلیل ہیں کہ قرآن پاک کو سمجھنے اور عمل کرنے کے علاوہ صرف تلاوت بھی انتہائی ضروری ہے۔

اب رہی یہ بات کہ آیا قرآن کے الفاظ میں کوئی تاثیر ہے یا نہیں؟ جسے پرویز صاحب عہدِ سحر سے منسلک فرما رہے ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم قرآن کے الفاظ کی تاثیر کے بھی قائل ہیں اور اس کی وجوہ درج ذیل ہیں:

۱۔ قرآن کسی انسان کا کلام نہیں، بلکہ اس کے الفاظ کی بندش اور فصاحت و بلاغت کا یہ عالم ہے کہ فصحاء اور بلغاء عرب بار بار کے چیلنج کے باوجود اس جیسا کلام لانے سے قاصر رہے لہٰذا اسے عام انسانی تصانیف کے مثل قرار دینا بہت بڑی جسارت ہے۔ جیسا کہ پرویز صاحب نے کسی مصنف کی کتاب کی بلا سوچے سمجھے پڑھنے کی مثال دی ہے۔

۲۔ کفارِ مکہ میں سے اکثر فصحائے عرب تھے۔ ان میں شاعر بھی موجود تھے۔ وہ قرآن کی آیات کو سنتے اور خوب سمجھتے تھے کیونکہ ان کی زبان عربی تھی۔ وہ دل سے قرآن کے مخالف بھی تھے۔ پھر بھی قرآن کے الفاظ کی اعجازی حیثیت ان کو مسحور کر دیتی تھی۔ آخر یہ کیا بات تھی کہ وہ اپنی لگائی ہوئی پابندیوں کے علی الرغم رات کو پہروں چوری چھپے قرآن سنتے تھے؟ کیا یہ الفاظ ہی کی تاثیر نہ تھی؟

۳۔ الفاظ کی اس اعجازی حیثیت کا پرویز صاحب خود بھی ایک دوسرے مقام پر زیر عنوان "مشاعرے" بدیں الفاظ اقرار کرتے ہیں:

"آپ کسی شاعر سے کہئے کہ جو کچھ آپ نے نظم میں لکھا ہے اسے ذرا نثر میں پڑھ کر سنائیے، پھر دیکھئے اس کے جذبات کا کیا عالم ہوتا ہے۔ غور کیجئے، کتنا بڑا ہے یہ سحر جس کی رو سے محض الفاظ کے ادھر ادھر رکھ دینے سے آپ کے تاثرات بدل جاتے ہیں۔" (قرآنی فیصلے، ص۳۰۵)

اب اگر کسی عام شاعر کی نظم میں الفاظ کی بندش میں یہ تاثیر ممکن ہے تو کیا قرآن کے الفاظ کی بندش میں اتنی بھی تاثیر نہیں اور ایسی تاثیر شعر ہی میں نہیں نثر میں بھی ممکن ہے۔ قرآن مجید شاعرانہ بیہودگی سے یکسر پاک ہے تاہم اس کی اعجازی حیثیت مسلمہ ہے اور اس کی تاثیر کی بھی۔

۴۔ رجز (جنگی گیت) اور حدی کا اثر اونٹ وغیرہ پر بھی ہونا مشاہدات سے ثابت ہے۔ حالانکہ اونٹ نہ وہ زبان جانتا ہے نہ اس کا مطلب سمجھتا ہے تاہم متاثر ضرور ہو جاتا ہے تو کیا اونٹ میں بھی کوئی عجمی سازش کام کر رہی ہوتی ہے؟

اسی مضمون سے متعلق ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ کوئی صاحب قرآن کے الفاظ کی تاثیر کے قائل نہ تھے اور اسی موضوع پر اپنے ایک دوست سے بحث فرما رہے تھے۔ اس دوست نے جواب میں صرف اتنا ہی کہہ دیا کہ تم تو نرے گدھے ہو۔ اس بات پر وہ صاحب سیخ پا ہو گئے اور غصہ کی وجہ سے چہرہ تمتما اٹھا اور اپنے دوست کو بدتمیزی کے القابات سے نوازنے لگے۔ دوست نے بڑے آرام سے کہا کہ اگر الفاظ میں کچھ تاثیر نہیں ہوتی تو آپ اس قدر برہم کیوں ہو گئے؟ آپ فی الواقع کوئی گدھا بن تو نہیں گئے۔ یہ جواب سن کر وہ صاحب کچھ کھسیانے سے ہو گئے اور غصہ بھی فرو ہو گیا۔

بلا سوچے سمجھے تلاوت کرنا اگرچہ کوئی بامقصد عمل نہیں کہلا سکتا تاہم اس سے بھی تین فائدے حاصل ہوتے ہیں:

۱۔ تلاوت کرنے والا جب تک تلاوت میں مشغول رہے گا دوسری خرافات سے محفوظ رہے گا۔

۲۔ جو شخص اس بلا سوچے سمجھے تلاوت کو اپنا معمول بنا لے گا کسی نہ کسی دن ضرور وہ اس کا مفہوم سمجھنے کی بھی کوشش کرے گا۔

۳۔ کلامِ الٰہی کی تلاوت اگر ترتیل سے کی جائے تو کائنات کی کئی دوسری اشیاء بھی اس سے اثر قبول کرتی اور ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ داؤد علیہ السلام جب زبور کی آیات تلاوت فرماتے تو پہاڑ اور پرندے بھی آپ کی ان تسبیحات سے مسحور ہو کر ان میں شامل ہو جاتے تھے جیسا کہ ارشاد باری ہے: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ﴾ (۳۴:۱۰)

"اور ہم نے اپنی طرف سے داؤد کو برتری بخشی تھی کہ اے پہاڑو اور پرندو! (جب داؤد زبور کی تلاوت کریں تو) تم بھی اس کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاؤ"

بالکل ایسا ہی مضمون سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۷۹ اور سورہ ص کی آیت نمبر ۱۹ میں بھی مذکور ہے۔

الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ۝٤٥ وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ

اور برے کاموں[۷۳] سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر تو سب سے بڑی چیز[۷۴] ہے اور جو کام تم کرتے ہو اللہ اسے جانتا[۷۵] ہے۔(۴۵) (اے مسلمانو!) اہل کتاب سے جھگڑا نہ کرو مگر ایسے

ان آیات میں جبال یا پہاڑ جمادات سے اور پرندے حیوانات سے تعلق رکھتے ہیں گویا یہ سب چیزیں آیاتِ الٰہی کی تلاوت سے اثر پذیر ہوتی ہیں۔ حالانکہ وہ نہ ان کے معنی سمجھ سکتی ہیں اور نہ غور و فکر کر سکتی ہیں۔

ان تمام تصریحات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگرچہ قرآن کریم کی تلاوت کا اصل مقصد اسے سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ہے تاہم قرآن کے الفاظ کی بندش میں بلا کی تاثیر ہے۔ جس سے انکار ناممکن ہے۔ لہٰذا اگر تلاوت کرنے والا اس کے مفہوم کو نہ جانتا ہو تب بھی اسے اس کی تلاوت سے کئی طرح سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

رہا مسئلہ قرآنی عملیات، نقوش، تعویذات اور اوراد وغیرہ کا تو ان باتوں کا ثبوت کتاب و سنت میں کہیں بھی نہیں ملتا۔ لہٰذا یہ افعال بدعیہ اور شرکیہ ہیں اور ایسی باتوں کا اگر پرویز صاحب عہد سحر سے تعلق قائم کرنا چاہیں تو بصد شوق ایسا کر سکتے ہیں۔

[۷۳] اگر نماز برائی اور فاحشات سے نہیں روکتی تو یہ نماز میں غافل رہنے کا ثبوت ہے:۔ اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نماز میں تاثیر ہی یہ رکھ دی ہے کہ اس سے بے حیائی اور برے کاموں کا ارادہ ختم ہو جاتا ہے۔ جیسے پانی میں اللہ نے یہ تاثیر رکھ دی ہے کہ وہ پیاس کو بجھا دیتا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ نماز سے مطلوب یہ ہے کہ نمازی بے حیائی اور برے کاموں سے باز آ جائے۔

اور یہ دونوں مطلب درست ہیں بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ دونوں مطالب کا مفہوم بالآخر ایک ہی بن جاتا ہے تو بھی درست ہے۔ اب آپ نماز کے ارکان پر اور جو کچھ نماز میں پڑھا جاتا ہے اس پر غور کریں تو خود بخود یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جو شخص نماز بھی پڑھتا رہے اور اس سے بے حیائی اور برائیاں بھی دور نہ ہوں تو وہ محض بے سوچے سمجھے اور عادتاً نماز ادا کرتا ہے۔ بھلا جس کی نماز کی ہر رکعت میں دل کی توجہ سے اللہ کے سامنے شرک سے براءت کا اور دوسروں سے استمداد سے براءت کا اقرار کیا جائے ایسا شخص بھی شرک میں مبتلا رہ سکتا ہے اور جس نماز کی رکعت میں اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی جائے وہ نماز سے برے اور بے حیائی کے کاموں سے بچنے کی کوشش نہ کرے گا اور جو انسان اپنی نماز کی ہر رکعت میں اللہ سے سیدھے راستے پر گامزن رہنے کی دعا کرتا ہے وہ برے کام اور بے حیائی کے کام کر سکتا ہے؟ غرض نماز میں اللہ کے سامنے اقرار اور اس کے حضور دعاؤں پر جتنا بھی غور کیا جائے تو یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ صحیح طریقہ سے نماز کو ادا کرنے والا لازماً برے کاموں سے رک جائے گا اور اگر نہیں رکتا تو اس کا منطقی نتیجہ یہی ہے کہ وہ نماز ٹھیک طرح ادا نہیں کرتا۔ وہ نماز میں اللہ کی یاد سے غافل اور دوسرے دنیوی خیالات میں منہمک رہتا ہے۔ اور ایسی نماز منافق کی نماز ہوتی ہے۔ مومن کی نہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے نمازیوں کو بھی برے انجام کی تنبیہ فرمائی ہے۔ جو اپنی نماز میں اللہ کی یاد سے غافل رہتے ہیں۔ (۱۰۷: ۴، ۵)

[۷۴] اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز کیسے؟ اس جملہ کے بھی کئی مطلب ہیں ایک یہ کہ تمام تر عبادتوں کی روح رواں اللہ کی یاد ہی ہے۔ اللہ سے ہی انسان غافل ہو تو انسان عبادت کر کیسے سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ تمام عبادات اسی صورت میں بطریق

اِلَّا بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ ٭ۖ اِلَّا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡہُمۡ وَ قُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا بِالَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡنَا وَ اُنۡزِلَ

طریق[۷۶] سے جو بہتر ہو۔ اور صرف انہیں سے جھگڑا کرو جو ان میں سے بے انصاف[۷۷] ہیں اور ان سے یوں کہو کہ: ہم تو اس پر بھی ایمان لاتے ہیں جو ہماری طرف نازل کی گئی اور اس پر بھی جو تمہاری طرف نازل

احسن سرانجام دی جاسکتی ہیں کہ اس عبادت کے دوران اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو۔ تیسرا مطلب یہ ہے، اللہ کو یاد کرنا، زبان سے اللہ اللہ کہنا اور دل میں ہر وقت اللہ کو یاد رکھنا بذات خود بہت بڑا نیکی کا کام ہے۔ اور اس مطلب کی تائید درج ذیل حدیث سے ہوتی ہے:

سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو چکی سے آٹا پیسنے سے بہت تکلیف ہوگئی۔ انہیں خبر ملی کہ آپ ﷺ کے پاس کچھ قیدی آئے ہیں۔ (غنیمت سے جس کا پانچواں حصہ آپ کے لئے مختص اور اس کی تقسیم آپ کی صوابدید پر منحصر تھی) وہ آپ ﷺ کے پاس تشریف لائیں تاکہ آپ سے ایک لونڈی یا غلام کا مطالبہ کریں۔ اتفاق سے آپ ﷺ گھر پر نہ ملے تو انہوں نے یہ بات سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہہ دی۔ جب آپ ﷺ تشریف لائے تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے انہیں بتایا تو آپ ﷺ اسی وقت (رات کو ہی) ہمارے ہاں تشریف لائے جبکہ ہم بستروں پر لیٹ چکے تھے۔ ہم نے اٹھنا چاہا مگر آپ ﷺ نے فرمایا: لیٹے رہو (آپ ﷺ میرے اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے درمیان بیٹھ گئے) میں نے آپ ﷺ کے پاؤں کی ٹھنڈک اپنے سینے پر محسوس کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "کیا میں تمہیں ایسی بات نہ بتاؤں جو اس سے بہتر ہے جو تم نے مانگی تھی؟ (اور وہ یہ ہے کہ) جب تم اپنے بستروں پر جاؤ تو اللہ اکبر ۳۴ بار، الحمد للہ ۳۳ بار اور سبحان اللہ ۳۳ بار کہہ لیا کرو۔ یہ تمہارے لئے اس چیز سے بہتر ہے جس کا تم نے سوال کیا تھا" (بخاری۔ کتاب الجہاد۔ باب الدلیل علی الخمس لنوائب رسول اللہ ﷺ)

اور چوتھا مطلب یہ ہے کہ اگر بندہ اللہ کو یاد کرے تو اللہ بھی بندے کو یاد کرتا ہے (۲: ۱۵۲) اور ظاہر ہے کہ اللہ کا بندے کو یاد کرنا بہت بڑی چیز ہے۔

[۷۵] یعنی اللہ اسے بھی جانتا ہے جو اس کے ذکر سے رطب اللسان رہتا ہے اور اسے بھی جو اس کی یاد سے غافل رہتا ہے۔ پھر ہر ایک سے اس کے عمل کے مطابق سلوک کرے گا۔

[۷۶] ۞ اہل کتاب کے ہاں جتنی سچائی ہے اس کا اعتراف کرنا چاہئے:۔ یعنی مشرکوں کا دین تو سراسر باطل ہے۔ مگر اہل کتاب کا دین اپنی اصل کے لحاظ سے سچا تھا۔ لہٰذا ان سے تمہاری بحث کا انداز مشرکوں سے جداگانہ ہونا چاہئے۔ اور ان کے مذاہب میں جتنی سچائی موجود ہے اس کا اعتراف کرنا چاہئے۔ پھر جس مقام سے اختلاف واقع ہوتا ہے وہ نرمی، متانت سے اور خیر خواہی کے جذبے سے انہیں سمجھانا چاہئے۔ بحث کا انداز یہ نہ ہونا چاہئے کہ دوسرے کو سراسر غلط اور نیچا دکھانے کی کوشش کی جائے۔ بلکہ ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے جس سے اسے اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا آسان ہو جائے۔

[۷۷] بے انصاف یا ظالم سے مراد وہ لوگ ہیں جو مذہبی تعصب کو ہی سب سے بڑی قدر سمجھتے ہوں۔ اور ضد اور ہٹ دھرمی پر اتر آئے ہوں جیسا کہ یہود مدینہ میں کعب بن اشرف اور ابو رافع سلام بن ابی الحقیق اور مشرکین مکہ میں ابو جہل اور اس کے

إِلَـٰهُنَا وَإِلَـٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿٤٦﴾ وَكَذَٰلِكَ أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ ۚ فَالَّذِينَ
آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۖ وَمِنْ هَـٰؤُلَاءِ مَن يُؤْمِنُ بِهِ ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الْكَافِرُونَ ﴿٤٧﴾
وَمَا كُنتَ تَتْلُو مِن قَبْلِهِ مِن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ ۖ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ ﴿٤٨﴾ بَلْ

کی گئی اور ہمارا اور تمہارا الٰہ [۷۸] ایک ہی ہے اور ہم اس کے فرمانبردار ہیں۔(۴۶) اور (اے نبی!) ہم نے اسی طرح آپ پر یہ کتاب (قرآن) نازل کی ہے۔ اس پر وہ لوگ ایمان لاتے ہیں جنہیں ہم نے (پہلے) کتاب دی تھی اور ان (اہلِ مکہ) [۷۹] میں سے کچھ لوگ ایمان لاتے ہیں۔ اور ہماری آیات سے انکار تو کافر لوگ ہی کرتے ہیں۔(۴۷) اور (اے نبی!) اس سے پہلے آپ نہ تو کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھ سکتے [۸۰] تھے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو باطل پرست شبہ میں پڑ سکتے تھے۔(۴۸)

ساتھی تھے۔

[۷۸] دوسروں سے بحث کیسے؟ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بحث کا انداز بھی خود ہی سمجھا دیا۔ یعنی جن جن باتوں میں فریقین میں موافقت اور مطابقت پائی جاتی ہے۔ پہلے ان کا ذکر کر کے انہیں اپنی طرف مائل کیا جائے۔ یہ نہ ہونا چاہئے کہ ابتدا میں اختلافی امور کو زیر بحث لا کر فریق مخالف کو اپنا مزید مخالف بنالیا جائے۔ یعنی زبان شیریں اور اندازِ گفتگو ایسے ناصحانہ ہونا چاہئے جس سے وہ چڑ جانے کی بجائے بات کو تسلیم کر لینے پر آمادہ ہو جائے۔

[۷۹] یعنی جس طرح ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی تھی بالکل ویسے بھی آپ پر یہ کتاب نازل کی ہے۔ اور اہل کتاب میں سے جو منصف مزاج ہیں وہ یہ سمجھ کر کہ ان دونوں کتابوں کا سر چشمہ ایک ہی ہے، قرآن پر ایمان لے آئے تھے اور اہلِ مکہ میں بھی کچھ منصف مزاج موجود ہیں جو قرآن کے دلائل سن کر فوراً اس سے متاثر ہو جاتے ہیں اور ایمان لے آتے ہیں۔ گویا ایک انسان کی ہدایت کے لئے اس کتاب میں نہ نقلی دلائل کی کمی ہے اور نہ عقلی دلائل کی۔ اس سے انکار صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنے مذہبی تعصبات کو چھوڑ کر حق بات ماننے کو تیار نہیں۔ نہ وہ اپنی خواہش نفس اور بے لگام آزادی پر کسی قسم کی پابندی قبول کرنے کو تیار ہیں۔

[۸۰] آپ کے اُمّی ہونے کی مصلحت:۔ آپ ﷺ کی رسالت کو جھٹلانے یا اسے کم از کم مشکوک بنانے کے لئے قریش نے جو باتیں اختراع کی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اس شخص نے سابقہ آسمانی کتابوں سے فیض حاصل کیا ہے اور اس کی بنیاد یہ تھی کہ آپ کی پیش کردہ کتاب یعنی قرآن کے بہت سے مضامین تورات سے ملتے جلتے تھے اور بعض منصف اہل کتاب اس بات کی تصدیق بھی کر دیتے ہیں۔ اس آیت میں ان کے اسی اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ آپ نبوت سے پیشتر نہ تو کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے کہ اس کے مطالعہ سے آپ کو ایسی معلومات حاصل ہوں اور نہ ہی لکھ سکتے تھے کہ علمائے اہل کتاب سے سن کر اسے نوٹ کرتے جائیں اور بعد میں اپنی طرف سے پیش کر دیں۔ ہاں ان میں سے کوئی بھی صورت ہوتی تو ان کافروں کے شک و شبہ کی کچھ نہ کچھ بنیاد بن سکتی تھی۔ لیکن جب یہ دونوں صورتیں موجود نہیں تو پھر ان لوگوں کا آپ کی

رسالت سے انکار، تعصب، ضد اور ہٹ دھرمی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

مِنۡ قَبۡلِهٖ سے بعض مسلمانوں نے اس بات پر استشہاد کیا ہے کہ نبوت سے پیشتر تو آپ فی الواقع لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے، لیکن نبوت کے بعد آپ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ اس اختراع کی بنیاد ان مسلمانوں کی آپ سے فرطِ عقیدت ہے۔ وہ یہ سوچتے ہیں کہ جو رسول سارے جہاں کے لئے رسول اور معلم بنا کر بھیجا گیا تھا کیسے ممکن ہے کہ وہ لکھا پڑھا نہ ہو۔ بالفاظ دیگر وہ نبی کی ذات سے لکھا پڑھا نہ ہونے کے نقص کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ پھر ان لوگوں کے اس دعویٰ میں موجودہ دور کے مخالفینِ اسلام اور مستشرق محققین بھی شامل ہو گئے۔ کیونکہ یہ دعویٰ ان کے حق میں مفید تھا۔

❁ کیا آپ نے بعد میں لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا؟ عقیدت مند مسلمانوں کے اس دعویٰ کے جذبہ کی ہم قدر کرتے ہیں لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ان نادان دوستوں کا یہ دعویٰ دانا دشمنوں کے کام آ رہا ہے۔ اب ہم اس دعویٰ کی تردید دو طرح سے کریں گے ایک عقلی لحاظ سے اور دوسرے تاریخی لحاظ سے۔ عقلی لحاظ سے ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ اگر ایک شخص ان پڑھ ہو کر سارے جہان کا معلم بنے تو یہ زیادہ حیران کن بات اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ ہے یا ایک شخص بہت عالم فاضل اور پڑھا لکھا ہو کر معلم بنے؟ ظاہر ہے کہ پہلی صورت کو ہی معجزہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر اس سے وہ تمام شکوک و شبہات بھی دور ہو جاتے ہیں جو اس دور کے مخالفین اسلام نے پیغمبر اسلام پر وارد کئے تھے یا اس دور کے مخالفینِ اسلام کر رہے تھے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن نے دو آیات میں آپ کو مدح کے طور پر امی کے لقب سے نوازا ہے (۷: ۱۵۷، ۱۵۸) اور سورہ جمعہ میں فرمایا: وہی تو ہے جس نے امی لوگوں میں سے ہی ایک فرد کو رسول بنا کر بھیجا (۶۲: ۲) قرآن کے انداز بیان سے بھی واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ امی کا لقب آپ کے لئے مایہ صد افتخار ہے۔

اور تاریخی لحاظ سے یہ دعویٰ اس لئے غلط ہے کہ حدیبیہ کا صلح نامہ ۶ھ میں لکھا گیا تھا۔ لکھنے والے سیدنا علی رضی اللہ عنہ تھے اور لکھانے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ جب آپ ﷺ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھوایا تو قریشیوں کے سفیر سہیل بن عمرو نے یہ اعتراض کیا کہ اس کے بجائے باسمك اللهم لکھو۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے لکھوایا من محمد رسول الله اس پر اس نے یہ اعتراض کیا کہ من محمد بن عبدالله لکھو۔ کیونکہ اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول مان لیں تو پھر جھگڑا ہی کاہے کا ہے؟ پھر جب سفیر سہیل بن عمرو نے اپنی بات پر اصرار کیا تو آپ ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ یہ الفاظ مٹا کر قریشی سفیر کی مرضی کے مطابق لکھ دو۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ میرا تو ضمیر یہ گوارا نہیں کرتا کہ رسول اللہ ﷺ کا لفظ اپنے ہاتھوں سے مٹا دوں۔ آپ ﷺ نے سیدنا علی سے پوچھا اچھا بتاؤ وہ لفظ کون سا ہے؟ اور جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بتایا تو آپ نے خود اسے مٹا دیا۔ (بخاری۔ کتاب الشروط۔ باب الشروط فی الجهاد والمصالحة)

یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب آپ کو نبوت عطا ہوئے ۱۹ سال گزر چکے تھے اور اس وقت آپ کی عمر ۵۹ تقریباً سال ہو چکی تھی۔ اور اس واقعہ کے چار پانچ سال بعد آپ ﷺ کی وفات ہو جاتی ہے پھر آپ ﷺ نے لکھنا پڑھنا کب سیکھا تھا؟

اور دوسرا ثبوت رسول اللہ ﷺ کا اپنی زبانی یہ اعتراف ہے کہ: ''ہم امی لوگ ہیں، لکھنا اور حساب کرنا نہیں جانتے (قمری) مہینہ اتنا بھی ہوتا ہے اور اتنا بھی، پھر آپ نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بلند کر کے بتایا کہ کبھی تیس دن کا ہوتا ہے اور کبھی انتیس دن کا'' (بخاری۔ کتاب الصوم۔ باب قول النبی لانکتب ولانحسب)

هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ

بلکہ وہ (قرآن) تو واضح آیات ہیں [۸۱] جو ان لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہیں جنہیں علم دیا گیا ہے۔ اور ہماری آیات سے بے انصاف لوگوں کے سوا کوئی انکار نہیں کرتا۔(۴۹) نیز وہ کہتے ہیں کہ اس (نبی) پر اس کے

[۸۱] قرآن کے علاوہ آپ کی ذات بھی کئی واضح معجزات کا مجموعہ تھی:۔ اس آیت کے دو مطلب ہیں اگر ھُوَ کی ضمیر کو قرآن کی طرف راجع قرار دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن کی آیات بڑے واضح دلائل پر مشتمل ہیں۔ اور یہ آیات اہلِ علم کے سینوں میں محفوظ ہیں۔ یعنی ان اہل علم نے ان آیات کو حفظ یا ازبر کر لیا ہے۔ اور یہ قرآن اسی طرح سینہ بہ سینہ اہلِ علم میں منتقل ہوتا جائے گا۔ اور یہ قرآن کی ایسی ناقابل تردید صفت ہے جو ابتدائے اسلام سے آج تک اور آئندہ بھی تا قیامت ہر شخص مشاہدہ کر سکتا ہے اور کرتا رہے گا۔ ہر دور میں مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد حافظ قرآن رہی ہے۔ اور یہی قرآن کی اعجازی حیثیت اور اس کی حفاظت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ قرآن کی حفاظت کا دوسرا ذریعہ کتابتِ قرآن ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے حفاظت قرآن کے پہلے ذریعہ حفظ پر ہی نسبتاً زیادہ توجہ مبذول فرمائی تھی۔ (اکثر مفسرین نے اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے)

اب قرآن کے مقابلہ میں دوسری الہامی کتابوں کو دیکھئے ان کا شاذ و نادر ہی آپ کو کوئی حافظ نظر آئے گا جیسے سیدنا عزیر علیہ السلام کے متعلق منقول ہے کہ وہ تورات کے حافظ تھے۔

اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ ھو کی ضمیر کو رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع قرار دیا جائے اور یہ تفسیر اس لحاظ سے راجح ہے کہ ربط مضمون اسی بات کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اہل علم اور اہل دانش و بینش کے لئے رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے ثبوت میں ایک نہیں بلکہ بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔ وہ اس طرح کہ دنیا میں جتنے بھی نامور شخص گزرے ہیں ان کی شخصیت بنانے والے عوامل کا تاریخ سے پتہ لگایا جا سکتا ہے مگر یہاں یہ بات یکسر مفقود نظر آتی ہے۔ مثلاً تمام مخالفینِ اسلام یعنی قریش مکہ جانتے تھے کہ آپ لکھنا پڑھنا تک نہیں جانتے تھے۔ علم ادب عربی سے یا تاریخِ امم سے واقف ہونا تو دور کی بات ہے۔ لیکن آپ نے جو کلام پیش کیا۔ بار بار کے چیلنج کے باوجود عرب بھر کے فصحاء اور بلغاء اس جیسا کلام پیش کرنے سے عاجز رہ گئے تھے۔ اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ آپ فن حرب و ضرب سے قطعاً نابلد تھے۔ نہ ہی آپ کسی جرنیل' فوجی یا کسی سپاہی کے گھر پیدا ہوئے تھے لیکن جب میدان جہاد میں فوجی لشکر کی قیادت آپ نے سنبھالی تو آپ ﷺ نے ایسی جنگی تدابیر اختیار کیں کہ تمام جہانوں کے جرنیلوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ غرضیکہ آپ ﷺ کی زندگی کا ہر پہلو ایسے ہی حیران کن کمالات کا مجموعہ ہے۔ جن کے اسباب و عوامل تلاش کرنے پر دور تک کہیں نظر نہیں آتے۔ یہی وہ واضح نشانیاں ہیں جو آپ کی رسالت کا بین ثبوت ہیں۔ اور ان کا انکار کوئی کٹر متعصب ہی کر سکتا ہے۔ جبکہ اہل علم آپ کی ان خوبیوں کے دل و جان سے معترف ہوتے ہیں۔

عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۰﴾ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ
الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ ع قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ
شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵۲﴾

پروردگار کی طرف سے معجزے کیوں نہیں اتارے [۸۲] گئے۔ آپ ان سے کہئے کہ معجزے تو اللہ کے پاس ہیں اور میں تو صرف ایک کھلا کھلا ڈرانے والا ہوں۔(۵۰) کیا انہیں یہ کافی نہیں کہ ہم نے ان پر یہ کتاب نازل [۸۳] کی ہے جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ اس میں ایمان لانے والوں کے لئے یقیناً رحمت اور نصیحت ہے۔(۵۱) آپ ان سے کہئے کہ میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لئے اللہ کافی [۸۴] ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسے وہ جانتا ہے اور جو لوگ باطل کو مانتے اور اللہ کا انکار کرتے ہیں وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔(۵۲)

[۸۲] معجزات کا اتارنا اللہ کا کام ہے اور میرا الوہیت کا کوئی دعویٰ نہیں کہ تمہارے معجزہ کے مطالبہ پر تمہیں تمہارے حسب پسند معجزہ دکھا سکوں۔ میرا کام صرف تمہیں اللہ کا پیغام پہنچانا اور تمہیں برے انجام سے بچانا ہے۔ اس میں اگر میں کوئی کوتاہی کر رہا ہوں تو وہ مجھے بتا دو۔

[۸۳] ۞ قرآن زندہ و جاوید معجزہ ہے:۔ یعنی پہلے انبیاء کو جتنے معجزات عطا کئے جاتے رہے وہ سب وقتی اور عارضی تھے جو کسی نے دیکھے کسی نے نہ دیکھے اور آج وہ سب ختم ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ قرآن ایسا زندہ جاوید معجزہ ہے جس کی اعجازی حیثیت کو تم خود بھی تسلیم کرتے ہو۔ پھر اور کون سا معجزہ چاہتے ہو؟ پھر یہ کتاب اس لحاظ سے سب کے لئے اللہ کی خاص مہربانی ہے کہ وہ تمہاری زندگی کے ہر پہلو میں تمہاری ٹھیک ٹھیک رہنمائی بھی کرتی ہے۔

۞ آپ کی نبوت کے بعد صرف قرآن ہی کتاب ہدایت ہے:۔ ربط مضمون کے لحاظ سے اس آیت کے مخاطب کفار ہیں اور اس کا وہی مطلب ہے جو اوپر بیان ہوا تاہم اس کے مخاطب مسلمان بھی ہیں۔ انہیں بھی اس کتاب کی موجودگی میں کسی اور کتاب ہدایت کی ضرورت نہیں ہے خواہ وہ کوئی سابقہ آسمانی کتاب ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ سیدنا عمر رسول اللہ ﷺ کے پاس تورات کے کچھ اوراق لائے اور انہیں پڑھنا شروع کیا۔ آپ ﷺ کا چہرہ متغیر ہو رہا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم رسول اللہ ﷺ کے چہرہ کی طرف نہیں دیکھتے؟۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو دیکھا تو کہنے لگے کہ میں اللہ اور اس کے رسول کے غضب سے پناہ مانگتا ہوں، ہم اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور آپ ﷺ کے نبی ہونے پر راضی ہو گئے۔ اس پر آپ ﷺ کا غصہ فرو ہو گیا اور آپ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ اگر آج موسیٰ ظاہر ہو جائیں اور تم مجھے چھوڑ کر اس کی پیروی کرو تو تم گمراہ ہو جاؤ گے۔ اور آج اگر موسیٰ زندہ ہوتے اور میری نبوت کا زمانہ پاتے تو میری اتباع کے سوا انہیں کوئی چارہ نہ ہوتا" (مشکوٰۃ۔ کتاب الایمان۔ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ۔ الفصل الثالث)

[۸۴] کفار مکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے خالق و مالک ہونے کی صفات کے قائل تھے۔ لہٰذا ان سے یہ کہا گیا کہ آپ ان سے کہیے اگر میں رسالت کا دعویٰ کر کے اس پر جھوٹ باندھنے کا ارتکاب کر رہا ہوں تو چاہئے تو یہ تھا کہ وہ مجھے ہلاک کر دیتا مگر عملاً

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ ۚ وَلَوْلَآ أَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ وَلَيَأْتِيَنَّهُم بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٥٣﴾
يَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌۢ بِالْكَٰفِرِينَ ﴿٥٤﴾ يَوْمَ يَغْشَىٰهُمُ الْعَذَابُ مِن فَوْقِهِمْ
وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ وَيَقُولُ ذُوقُوا۟ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٥٥﴾ يَٰعِبَادِىَ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِنَّ أَرْضِى وَٰسِعَةٌ

یہ لوگ آپ سے جلد عذاب لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور اگر عذاب کا وقت مقرر نہ ہوتا تو وہ ان پر آچکا ہوتا اور وہ ان پر اس طرح اچانک آجائے گا کہ انہیں[۸۵] خبر تک نہ ہوگی۔(۵۳) یہ آپ سے جلد عذاب لانے کا مطالبہ کرتے ہیں حالانکہ جہنم[۸۶] کافروں کو گھیرے میں لے چکی ہے۔(۵۴) جس دن عذاب انہیں اوپر سے ڈھانپ لے گا اور پاؤں کے نیچے سے بھی اور اللہ تعالیٰ[۸۷] فرمائے گا، جو کچھ تم کرتے رہے اب اس کا مزا چکھو(۵۵)

اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! (اگر تم پر مکہ کی سرزمین تنگ ہو گئی ہے تو) میری زمین یقیناً بڑی وسیع ہے لہذا میری ہی عبادت[۸۸] کرو۔(۵۶)

یہ ہو رہا ہے کہ وہ روز بروز مجھے اور میرے ساتھیوں کو بڑھا رہا ہے۔ پھر مجھے معجزہ بھی دیا ہے جس کا جواب پیش کرنے سے تم عاجز ہو تو کیا میری رسالت پر اللہ کی یہ گواہی کافی نہیں؟ ہاں کوئی شخص اگر یہ تہیہ کر لے کہ وہ حق بات کبھی نہ مانے گا تو وہ اور بات ہے اور یہی انسان کی سب سے بڑی بدبختی اور اس کے حق میں نقصان دہ بات ہے۔

[۸۵] اس آیت میں جس عذاب کی جلدی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے وہ دنیا کا عذاب ہے۔ اور وہ اللہ کے ضابطہ کے مطابق فتح مکہ کے دن آیا تھا۔ جب کفار مکہ کو یک دم مسلمانوں کی یلغار کی خبر ہوئی اور ان میں مقابلہ کی سکت ہی نہ رہی۔

[۸۶] اس آیت میں عذاب سے مراد اخروی عذاب ہے۔ جس میں یہ ابھی سے پڑ چکے اور جہنم انہیں اپنے گھیرے میں لے چکی ہے۔ یہ لوگ خواہ مخواہ جلدی مچا رہے ہیں ان کے مرنے کی دیر ہے۔ یہ اپنے مطلوبہ عذاب کی آغوش میں جا پہنچیں گے۔

[۸۷] یَقُوْلُ کا ایک معنی تو وہی ہے جو ترجمہ میں مذکور ہے اور دوسرا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جہنم کا عذاب خود انہیں یہ بات کہے گا۔ چنانچہ سیدنا ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جس شخص کو اللہ مال دے اور وہ اس کی زکوٰۃ ادا نہ کرے تو قیامت کے دن اس کا مال ایک گنجے سانپ کی شکل بن کر، جن کی آنکھوں پر دو کالے داغ ہوں گے اس کے گلے کا طوق بن جائے گا پھر اس کی دونوں باچھیں پکڑ کر کہے گا: میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں۔" (بخاری۔ کتاب الزکوٰۃ باب اثم مانع الزکوٰۃ)

[۸۸] ۞ وطن پرستی اور قوم پرستی کفر ہے۔ اہم چیز دین کی آزادی کے لئے ہجرت:۔ آیت کے الفاظ سے ہی معلوم ہو رہا ہے کہ یہ اس وقت نازل ہوئی تھی جب کفار مکہ نے مسلمانوں پر اس قدر سختیاں روا رکھی تھیں کہ انہیں جینا بھی دوبھر ہو گیا تھا۔ اس مشکل کا حل اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ اس علاقہ سے ہجرت کر جاؤ اور وہاں جا کر رہو جہاں تم آزادی سے میری عبادت کر سکو۔ واضح رہے کہ اپنے وطن اور اپنے اقرباء سے محبت انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ لیکن یہ حب الوطنی، وطن پرستی کی حد تک، اور اقرباء سے محبت قوم پرستی کی حد تک نہیں ہونی چاہئے۔ اصل چیز اللہ کی عبادت اور اپنے دین کی حفاظت ہے اس کے

فَإِيَّايَ فَاعْبُدُونِ ﴿٥٦﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ إِلَيْنَا تُرْجَعُونَ ﴿٥٧﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا
الصَّالِحَاتِ لَنُبَوِّئَنَّهُم مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نِعْمَ أَجْرُ
الْعَامِلِينَ ﴿٥٨﴾ الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٥٩﴾ وَكَأَيِّن مِّن دَابَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا
اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٦٠﴾ وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَ

ہر شخص کو[۸۹] موت کا مزا چکھنا ہے۔ پھر تم ہماری طرف ہی لوٹائے جاؤ گے۔(۵۷) اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے ہم انہیں جنت کے بالا خانوں[۹۰] میں جگہ دیں گے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ عمل کرنے والوں کے لئے کیا ہی اچھا اجر ہے(۵۸) جنہوں نے (مصائب پر) صبر کیا اور اپنے پروردگار[۹۱] پر بھروسہ رکھتے ہیں(۵۹) اور کتنے ہی ایسے جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ انہیں[۹۲] رزق دیتا ہے اور تم کو بھی وہی دیتا ہے اور وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے(۶۰) اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا

مقابلہ میں وطن اور قبیلہ کچھ چیز نہیں۔ اور اگر دین کا نقصان کر کے وطن اور قوم کو ترجیح دی جائے تو یہی چیز وطن پرستی اور قوم پرستی بن جائے گی اور یہ کفر ہے۔

[۸۹] اس حکم کے مطابق مختلف اوقات میں تراسی افراد مکہ سے ہجرت کر کے حبشہ کی طرف چلے گئے تھے۔ انہیں مہاجرین کی تسلی کے لئے فرمایا کہ اپنی جانوں کی فکر نہ کرو۔ یہ چند روزہ زندگی ہے۔ موت تو بہر حال آکے رہے گی یہ چند دن کی زندگی جہاں میسر آئے کاٹ لو۔ پھر ہمارے پاس اکٹھے ہو جاؤ گے۔ تمہارا مقصد یہ نہیں ہونا چاہئے کہ اپنا جان و مال اور گھر بار کیسے بچایا جائے بلکہ یہ ہونا چاہئے کہ اپنا ایمان کیسے بچایا جائے۔

[۹۰] یعنی ہجرت کی صورت میں تمہارے دنیوی مفادات بھی مجروح ہوں گے اور کئی طرح کی مشکلات بھی پیش آسکتی ہیں۔ ان کے بدلہ میں اللہ نے تمہارے لئے جو اجر تیار کر رکھا ہے وہ ان سب چیزوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ جن کی تمہیں فکر ہے۔

[۹۱] ❁ صبر کے مفہوم کا دائرہ 'اخلاقی اقدار میں سر فہرست صبر ہے اور دوسرے نمبر پر توکل:۔ نیک اعمال میں سر فہرست صبر ہے۔ اور صبر کا لفظ بڑے وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اللہ کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کو اللہ کی رضا کے لئے خندہ پیشانی سے برداشت کرنا بھی صبر ہے۔ اور احکام شریعت پر استقلال کے ساتھ کاربند رہنا بھی صبر ہے۔ اور مالی مفادات کے ضیاع کو درخور اعتناء نہ سمجھنا بھی صبر ہے۔ اور نیک اعمال میں سے دوسرے نمبر پر اللہ پر توکل کا ذکر فرمایا۔ اللہ پر توکل کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے ان وعدوں پر یقین کیا جائے جو اس نے اپنے فرمانبردار بندوں سے کر رکھے ہیں۔ بالخصوص اس صورت میں جبکہ ان وعدوں کے پورا ہونے کے ظاہری اسباب بھی مفقود نظر آرہے ہوں۔

[۹۲] ❁ توکل کا مفہوم:۔ ہجرت کرنے میں ایک بڑی رکاوٹ اپنے ذریعہ معاش کی فکر ہوتی ہے۔ مہاجر ایک تو اپنے وطن سے اپنا ذریعہ معاش چھوڑ کر جاتا ہے دوسرے اسے یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ جہاں وہ ہجرت کر کے جا رہا ہے وہاں اس کے ذریعہ

سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۱﴾ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۲﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ

اور سورج اور چاند کو کس نے مسخر کر رکھا ہے تو ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ پھر [۹۳] یہ کہاں سے دھوکہ کھا جاتے ہیں ؟(۶۱) اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کیلئے چاہے کم کر دیتا ہے [۹۴] اور وہ یقیناً ہر بات سے خوب [۹۵] واقف ہے۔(۶۲) اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان سے پانی کس نے برسایا پھر

معاش کی کیا صورت ہو گی ؟ ایسے خطرات کو اللہ کے وعدہ پر یقین کرتے ہوئے قبول کر لینے کا نام ہی توکل ہے۔ اور بتایا یہ جا رہا ہے کہ بے شمار جاندار ایسے ہیں۔ ہر روز نئی روزی ملتی ہے اور جو اللہ جانوروں تک کو روزی پہنچاتا ہے وہ اپنے فرمانبرداروں کو کیوں نہ پہنچائے گا۔ چنانچہ سیدنا عمرؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم اللہ پر ایسا توکل کرتے جیسا کرنے کا حق ہے تو تم کو بھی اسی طرح رزق دیا جاتا ہے جس طرح پرندوں کو دیا جاتا ہے۔ وہ صبح بھوکے جاتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر واپس آتے ہیں "(ترمذی۔ ابواب الزہد۔ باب ماجاء فی قلة الطعام)

[۹۳] یہ خطاب صرف مہاجرین کو ہی نہیں بلکہ اس خطاب میں سب مشترک ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ زمین و آسمان اور سورج اور چاند، سب کو پیدا کرنے والا اور انہیں اپنے اپنے کام پر لگانے والا اللہ ہے۔ اور انسان کی تمام ضروریات زندگی اسی نظام سے وابستہ ہیں۔ انہیں ضروریات میں سے ایک ضرورت کھانے پینے کی اور ذریعہ معاش کی ضرورت ہے تو مسلمان جہاں بھی ہجرت کر کے جائیں گے یہ سارا نظام وہاں بھی موجود ہو گا اور اللہ تمہیں وہاں بھی ایسے ہی روزی مہیا کرے گا جیسے یہاں کر رہا ہے لہٰذا اس پر توکل کرو۔

اور اس خطاب کا روئے سخن مشرکینِ مکہ کی طرف سمجھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تمہاری زندگی اور زندگی کی بقا کا سارا سامان تو اللہ نے مہیا کیا ہے۔ پھر تم اپنے معبودوں کو اللہ کے شریک اور مدمقابل کیسے ٹھہراتے ہو؟ یہ کہاں سے تمہیں عقل کا پھیر لگ جاتا ہے ؟

[۹۴] ۞ مال کی محبت انسان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور ہر انسان چاہتا ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ مال و دولت ملے۔ لیکن اللہ اتنا ہی دیتا ہے جتنا وہ خود چاہتا ہے۔ کسی کو زیادہ، کسی کو کم۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی کو کچھ بھی نہ دے، دیتا ضرور ہے اور اس میں بھی اس کی کئی حکمتیں اور بندوں کی مصلحتیں مضمر ہیں۔

[۹۵] ۞ کسی کو کم یا زیادہ رزق دینے میں اللہ کی حکمتیں اور بندوں کے مصالح:۔ وہ یہ بات خوب جانتا ہے کہ فلاں بندے کو اگر رزق زیادہ دیا گیا تو وہ اس سے خیر اور بھلائی ہی کمائے گا اور فلاں کو زیادہ دیا گیا تو وہ میری یاد سے غافل، سرکش اور متکبر بن جائے گا اور کہیں کسی کو مال زیادہ دے کر اسے ابتلاء میں ڈال دیتا ہے۔ غرضیکہ مال سے جتنی انسان کو محبت ہے اتنا ہی وہ مال اس کے حق میں فتنہ بھی بن سکتا ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ایک شخص جنگل میں کھڑا تھا۔ اس نے بادل سے آواز سنی۔ (کسی نے آواز دی) کہ فلاں آدمی کے باغ کو پانی پلاؤ۔ چنانچہ بادل ایک طرف چلا۔ اور اپنا پانی ایک سنگلاخ زمین پر انڈیل دیا۔ اچانک نالیوں میں سے ایک نالے نے سارا پانی جمع کر لیا۔ وہ آدمی پانی کے پیچھے

۶ ع ۲ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُولُنَّ اللَّهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٦٣﴾ وَمَا هَٰذِهِ

اس پانی سے مردہ پڑی ہوئی زمین کو زندہ کس نے کیا؟ تو ضرور کہیں گے کہ "اللہ نے" ان سے کہئے پھر ہر طرح کی حمد کا سزا وار[۹۶] بھی اللہ ہی ہے۔ مگر اکثر لوگ کچھ سمجھتے سوچتے نہیں (۶۳) یہ دنیا کی زندگی ایک

چلا۔ دیکھا کہ ایک شخص اپنے باغ میں کھڑا ہے۔ اور اپنے بیلچے سے پانی اِدھر اُدھر تقسیم کر رہا ہے۔ اس آدمی نے کہا: "اللہ کے بندے تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے کہا فلاں' وہی نام جو اس نے بادل سے سنا تھا۔ پھر اس نے دریافت کیا کہ اے اللہ کے بندے تو نام کیوں پوچھتا ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے اس بادل سے جس کا یہ پانی ہے آواز سنی تھی کہ فلاں کے باغ کو پانی پلا اور تیرا نام لیا' پس تو اپنے باغ میں کیا کرتا ہے' اس نے کہا جب تو نے پوچھا ہے تو میں بتا دیتا ہوں کہ جو کچھ میرے باغ میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کا تہائی حصہ صدقہ کر دیتا ہوں اور ایک تہائی میں اور میرا عیال کھاتا ہے۔ اور ایک تہائی اس باغ میں لگا دیتا ہوں۔ (صحیح مسلم۔ کتاب الزھد۔ باب فضل الانفاق علی المساکین وابن السبیل)

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ صدقہ کا کچھ مال تقسیم فرما رہے تھے۔ آپ نے سب کو نہیں دیا' کسی کو دیا اور کسی کو چھوڑ دیا۔ پھر آپ ﷺ نے اس تقسیم کی وضاحت فرماتے ہوئے کہا میں اس شخص کو مال دیتا ہوں جس کے دل میں بے چینی اور بوکھلا پن پاتا ہوں۔ حالانکہ جن لوگوں کو نہیں دیتا وہ مجھے ان سے زیادہ محبوب ہوتے ہیں جنہیں میں یہ مال دیتا ہوں اور جن محبوب لوگوں کو نہیں دیتا تو اس وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں میں سیر چشمی اور بھلائی رکھی ہوتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک عمرو بن تغلب ہے۔ عمرو بن تغلب کہتے ہیں کہ اللہ کی قسم! کہ جو خوشی مجھے آپ ﷺ کی اس بات سے ہوئی اگر مجھے سرخ اونٹ بھی ملتے تو اتنی خوشی نہ ہوتی۔ (بخاری۔ کتاب الجمعہ۔ باب من قال فی الخطبة بعد الثناء امابعد)

ان واقعات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی کو کم یا زیادہ دینے میں اللہ کی کیا کچھ حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔

[۹۶] زمین پر آسمان سے بارش برسنے، پھر زمین سے نباتات برآمد ہونے میں اللہ نے اپنی جس قدر مخلوق کو لگا رکھا ہے۔ پھر اس بارش سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں ان پر غور کرنے سے بے اختیار انسان کی زبان سے اللہ کی تعریف جاری ہو جاتی ہے۔ اور الحمد للہ کا عربی زبان میں دوسرا استعمال یہ ہے کہ جب فریق مخالف پر کوئی ایسی دلیل پیش کی جائے جو اس کے ہاں مسلم ہو اور وہ اس کے برعکس کام کر رہا ہو تو اس وقت اتمام حجت کے طور پر الحمد للہ کہا جاتا ہے۔ اس آیت میں الحمد للہ کا لفظ اپنے دونوں مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

اس سلسلہ میں سیدنا ثعلبہ بن حاطب انصاری کا واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی دعا کے سبب بہت مال دار ہو گئے اور مال و دولت کی کثرت کے سبب ان کی نمازیں بھی جاتی رہیں۔ حتی کہ جمعہ بھی ترک کرنے لگے مگر محدثین کرام نے اس واقعہ کی صحت سے انکار کیا ہے۔ جن میں امام ابن حزم' بیہقی' ابن اثیر' قرطبی' حافظ ابن حجر اور امام سیوطی رحمہم اللہ شامل ہیں۔ تیسیر القرآن جلد دوم (طبع اول) میں بھی صفحہ نمبر ۲۳۸ پر یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے۔ آئندہ ایڈیشن میں اس کو ان شاء اللہ محو کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم سب کو اور مفسر مرحوم کو بھی معاف فرمائے اور ہمیں دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے۔ آمین (پروفیسر نجیب الرحمٰن کیلانی)

وقف لازم

الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦٤﴾ فَاِذَا رَكِبُوْا
فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڬ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٥﴾
لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ڔ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٦٦﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ

کھیل تماشے کے سوا کچھ نہیں[٩٧]۔ اصل زندگی تو آخرت کا گھر ہے۔ کاش! وہ لوگ یہ بات جانتے ہوتے۔(٦٤) پھر جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ کی مکمل حاکمیت کو تسلیم کرتے ہوئے خالصتاً اسے ہی پکارتے ہیں اور جب وہ انہیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو اس وقت پھر شرک کرنے لگتے ہیں(٦٥) تاکہ ہم نے جو کچھ انہیں دے رکھا ہے اس کی ناشکری کریں[٩٨] اور مزے اڑاتے رہیں۔ جلد ہی انہیں (اس کا انجام) معلوم ہو جائے گا(٦٦) کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے حرم[٩٩] کو پر امن بنا دیا ہے

[٩٧] ۞ دنیا کن لوگوں کے لئے کھیل تماشا ہے؟ اس کا مطلب یہ نہیں کہ دنیا میں سرے سے کوئی سنجیدگی اور حقیقت ہے ہی نہیں۔ اللہ کے فرمانبرداروں اور اسے آخرت کے مقابلہ میں حقیر سمجھنے والوں کے لئے اس دنیا کی زندگی کا ایک ایک لمحہ نہایت قیمتی ہوتا ہے اور وہ اس زندگی سے فائدہ اٹھا کر آخرت کماتے ہیں۔ دنیا کی زندگی محض کھیل تماشا آخرت کے مقابلہ میں ہے۔ اور ان لوگوں کے لئے ہے جو دنیا کی محبت میں مستغرق رہتے اور اللہ اور آخرت کی یاد سے غافل رہتے ہیں۔ انہیں واقعی یہ دنیا ایک کھیل تماشا ہی معلوم ہوگی۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی بازی گر کٹھ پتلیوں کا تماشا دکھاتا ہے۔ ایک بادشاہ ہوتا ہے کچھ وزیر اور کچھ دوسرے کردار ہوتے ہیں۔ اور ڈرامہ مکمل ہونے کے بعد سب لوگوں کے سامنے تماشا دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ بالکل یہی صورت حال دنیا کے بادشاہوں اور دوسرے لوگوں کی ہوتی ہے۔ لہٰذا کسی شخص کو بھی دنیا کی دلفریبیوں اور رعنائیوں میں پھنس کر اللہ کی یاد سے غافل نہیں رہنا چاہئے۔

[٩٨] ۞ غیروں سے استمداد:۔ یعنی اس سے زیادہ ناشکری کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کی ضروریات زندگی تو سب اللہ تعالیٰ مہیا کرے اور جب جان پر بن جائے تو اس مصیبت سے نجات بھی اللہ ہی دے۔ لیکن جب آسودہ حالی کا وقت آئے تو انسان نہ صرف یہ کہ اللہ کو بھول جائے بلکہ اس کے اختیارات میں دوسروں کو بھی شریک بنانے لگے۔ اس آیت میں دور نبوی کے مشرکوں کا ذکر ہے جو کم از کم آڑے وقتوں میں تو اکیلے اللہ کو پکارتے تھے مگر آج کا مشرک ان مشرکوں سے بازی لے گیا ہے جو عقیدہ ہی یہ رکھتا ہے کہ اس کا پیر اس کے ہر کام اور اس کے سارے احوال سے واقف ہوتا ہے اور مشکل وقت میں اس سے فریاد کرنے پر فوراً وہ مدد کو پہنچ جاتا ہے۔ اور موت سامنے کھڑی دیکھ کر بھی ”یا بہاء الحق بیڑا بنے دھک“ جیسے نعرے لگاتا اور اپنے پیر کو فریاد رسی کے لئے پکارتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کی وجہ کے لئے سورہ یونس کا حاشیہ نمبر ٣۴ ملاحظہ فرمایئے۔

[٩٩] ۞ قریش مکہ کو حرم مکہ کی وجہ سے حاصل ہونے والے فوائد:۔ مکہ اور اس کے مضافات کو اللہ تعالیٰ نے ہی حرم بنایا کہ عرصہ اڑھائی ہزار سال سے یہ لوگ اس پر امن حرم کی برکات سے فائدے اٹھا رہے ہیں اور عربی قبائل کی لوٹ مار سے محفوظ اور پر امن زندگی گزار رہے ہیں۔ پھر اسی وجہ سے انہیں عرب بھر میں سیاسی اقتدار حاصل ہے۔ انہیں دور دراز مقامات سے رزق

يُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۚ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَكْفُرُونَ ﴿٦٧﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ

افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُ ۚ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكَافِرِينَ ﴿٦٨﴾

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٦٩﴾

جبکہ ان کے ارد گرد کے لوگ اچک لئے جاتے ہیں کیا پھر بھی یہ لوگ باطل کو مانتے اور اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں۔(۶۷) اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو خود جھوٹ گھڑ کر اللہ کے ذمہ لگادے یا اس کے پاس حق آئے[۱۰۰] تو اسے جھٹلا دے۔ کیا ایسے کافروں کے لئے دوزخ کا ٹھکانا کافی نہیں؟(۶۸) اور جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم یقیناً انہیں اپنی راہیں دکھا دیتے[۱۰۱] ہیں اور اللہ تعالیٰ یقیناً اچھے کام کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔(۶۹)

بھی پہنچ جاتا ہے۔ اور بہت سے تجارتی فوائد بھی حاصل کر رہے ہیں۔ ان کے کسی بت، لات، منات، ہبل یا کسی دوسرے بت میں یہ طاقت نہ تھی کہ وہ اس خطہ ارضی کو پر امن حرم بنا سکتا۔ اللہ کی اس نعمت کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ لوگ اللہ کا شکر ادا کرتے اور اس کے فرمانبردار بن کر رہتے۔ مگر یہ لوگ اللہ کا شکر ادا کرنے کی بجائے الٹا دوسرے معبودوں کو اللہ کا شریک بنا رہے ہیں۔

[۱۰۰] اللہ کے رسول نے اپنی رسالت کا دعویٰ کیا تو ان لوگوں نے اس کو جھٹلا دیا۔ اب اس کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ رسول نے یہ جھوٹا دعویٰ کیا ہو اور اللہ پر جھوٹ باندھا ہو۔ تو وہ سب سے زیادہ ظالم ہوا۔ اور اگر وہ سچا ہو اور فی الواقع اللہ نے اسے رسول بنایا ہو لیکن یہ لوگ اسے جھٹلا دیں تو یہ سب سے زیادہ ظالم ہوئے۔ اب جو بھی ظالم ہو گا اسے بہرحال دوزخ کا عذاب بھگتنا ہو گا۔ آگے یہ لوگ اپنا انجام خوب سوچ سمجھ لیں۔

[۱۰۱] ❁ اللہ کن لوگوں کو اپنی راہیں سجھاتا ہے؟ خلوص نیت سے جہاد پر اللہ کی راہیں کھلنا: یعنی انسان کا کام یہ ہے کہ وہ نہایت نیک نیتی سے اللہ کی راہ پر گامزن ہو جائے۔ اس راستہ میں کون کون سی مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ اور ان کا کیا حل ہو سکتا ہے یہ سوچنا انسان کے بس سے باہر ہے کیونکہ نہ اسے پیش آنے والی مشکلات کا پہلے سے صحیح اندازہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی اللہ کی تقدیر کے مقابلہ میں انسان کی تدبیر کسی کام آسکتی ہے۔ انسان کا کام اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے اس کی مقدور بھر کوشش ہے اور اس کی لازمی شرط محض اللہ کی رضامندی اور خلوص نیت ہے۔ اس شرط کے ساتھ اگر کوئی فرد یا کوئی جماعت جہاد کی کسی بھی قسم کے لئے گامزن ہو جائے گا تو اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات کا حل اللہ تعالیٰ خود ہی سجھاتا جائے گا خلوص اور نیک نیتی ہو گی تو راہیں خود بخود کھلتی جائیں گی اور اللہ تعالیٰ دستگیری اور مدد فرماتا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود بھلے کام کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ راہیں سجھاتا بھی ہے، کھولتا بھی ہے اور بروقت مدد کو بھی پہنچتا ہے۔ انسان کا کام صبر و استقلال اور نیک نیتی کے ساتھ آگے بڑھتے جانا ہے۔

واضح رہے کہ یہاں جہاد سے مراد صرف قتال فی سبیل اللہ ہی نہیں بلکہ جہاد کی جملہ اقسام ہیں جن کی تفصیل کسی دوسرے مقام پر دی جا چکی ہے۔

۶۰ آیاتہا سورۃ الروم مکیۃ رکوعہا ۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓمّٓ ﴿۱﴾ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ ﴿۲﴾ فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ وَ ہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ غَلَبِہِمۡ سَیَغۡلِبُوۡنَ ﴿۳﴾ فِیۡ بِضۡعِ
سِنِیۡنَ ۬ؕ لِلّٰہِ الۡاَمۡرُ مِنۡ قَبۡلُ وَ مِنۡۢ بَعۡدُ ؕ وَ یَوۡمَئِذٍ یَّفۡرَحُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۴﴾ بِنَصۡرِ

کلمات ۸۲۷ آیت ۶۰ (۳۰) سورہ الروم مکی ہے (۸۴) رکوع ۶ حروف ۳۵۴۷

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

الف۔ لام۔ میم (۱) رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے (۲) تاہم وہ مغلوب ہونے کے چند ہی سال بعد پھر غالب آجائیں گے (۳) اس (شکست) سے پہلے بھی اللہ ہی کا حکم چلتا تھا اور بعد میں بھی اسی کا چلے گا اور (جب رومیوں کو فتح ہو گی) اس دن مسلمان خوشیاں[۱] منائیں گے (۴) انہیں بھی اللہ کی مدد حاصل ہو گی۔ اللہ

[۱] سورہ روم میں دو بہت بڑی پیشین گوئیاں:۔ سورہ روم کی ان ابتدائی آیات میں دو ایسی پیشین گوئیاں کی گئی ہیں جو اسلام اور پیغمبر اسلام کی رسالت کی حقانیت پر زبردست دلیل ہیں۔ ان میں پہلی پیشین گوئی یہ ہے کہ اگر آج روم شکست کھا گیا ہے تو چند ہی سالوں بعد روم پھر ایران پر غالب آجائے گا۔ اور دوسری پیشین گوئی یہ تھی کہ اگر آج مسلمان مشرکین مکہ کے ہاتھوں مظلوم و مقہور ہیں تو ان کو بھی اسی دن مشرکین مکہ پر غلبہ حاصل ہو گا جس دن روم ایران پر غالب آئے گا اور قرآن نے یہ دونوں پیشین گوئیاں ایسے وقت میں بیان کیں جبکہ ان پیشین گوئیوں کے پورا ہونے کے دور دور تک کہیں آثار نظر نہیں آرہے تھے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جس زمانہ میں آپ ﷺ کو نبوت عطا ہوئی (۶۱۰ء میں) اس وقت عرب کے اطراف میں دو بڑی طاقتیں (SuperPower) موجود تھیں۔ ایک روم کی عیسائی حکومت جو دو باتوں میں مسلمانوں سے قریب تھی۔ ایک یہ کہ دونوں اہل کتاب تھے، دوسرے دونوں آخرت پر ایمان رکھتے تھے۔ لہٰذا مسلمانوں کی ہمدردیاں انہیں کے ساتھ تھیں۔ مسلمانوں کی عیسائی حکومت سے ہمدردی کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ اسی زمانہ میں مسلمانوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی اور قریشیوں نے مسلمانوں کو واپس لانے کی کوشش کے باوجود حبشہ کے عیسائی بادشاہ نجاشی نے مسلمانوں کو اپنے ہاں پناہ دی اور قریش کی سفارت کو بری طرح ناکام ہو کر وہاں سے واپس آنا پڑا تھا۔

اور دوسری ایران کی حکومت جو دو وجوہ سے مشرکین مکہ سے قریب تھی۔ ایک یہ کہ دونوں مشرک تھے۔ ایرانی دو خداؤں کے قائل اور آتش پرست تھے اور مشرکین بت پرست تھے اور دوسرے یہ کہ دونوں آخرت کے منکر تھے۔ انہی وجوہ کی بنا پر مشرکینِ مکہ کی ہمدردیاں ایران کے ساتھ تھیں۔

آپ ﷺ کی پیدائش ۵۷۰ء میں ہوئی اور آپ ﷺ کو نبوت ۶۱۰ء میں عطا ہوئی تھی۔ روم اور ایران میں جنگ ۶۰۲ء سے شروع ہو کر ۶۱۴ء تک جاری رہی اور یہ جنگی خبریں مکہ بھی پہنچتی رہتی تھیں۔ جب ایران کی فتح کی کوئی خبر آتی تو مشرکین مکہ بغلیں بجاتے اور اس خبر کو اپنے حق میں نیک فال قرار دیتے تھے اور کہتے کہ جس طرح ایران نے روم کا سر کچلا ہے ایسے ہی ہم

اللّٰہِ ؕ یَنۡصُرُ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ۙ﴿۵﴾ وَعۡدَ اللّٰہِ ؕ لَا یُخۡلِفُ اللّٰہُ وَعۡدَہٗ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶﴾ یَعۡلَمُوۡنَ ظَاہِرًا مِّنَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚۖ وَ ہُمۡ عَنِ الۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ

جسے چاہے نصرت بخشتا ہے اور وہ سب پر غالب اور رحم کرنے والا ہے۔(۵) یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کبھی اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ مگر اکثر لوگ (یہ بات) نہیں جانتے[۲]۔(۶) وہ صرف دنیا کی زندگی کا ظاہری پہلو ہی جانتے ہیں اور آخرت سے وہ بالکل[۳] غافل ہیں۔(۷)

بھی کسی وقت مسلمانوں کا سر کچل دیں گے۔ اور واقعہ بھی یہ تھا کہ ۶۱۰ء کے بعد یہ جنگ دو ملکوں کی جنگ نہ رہی تھی بلکہ اب یہ مجوسیت اور عیسائیت کی جنگ بن چکی تھی۔ ۶۱۴ء میں خسرو پرویز نے روم کو ایک مہلک اور فیصلہ کن شکست دی۔ شام، مصر اور ایشائے کوچک کے سب علاقے رومیوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔

✿ **سیدنا ابو بکر اور مشرکوں میں شرط:۔** ہرقل قیصر روم کو ایرانی فوجوں نے قسطنطنیہ میں پناہ گزیں ہونے پر مجبور کر دیا اور رومیوں کا دارالسلطنت بھی خطرہ میں پڑ گیا۔ بڑے بڑے پادری قتل یا قید ہو گئے۔ بیت المقدس عیسائیوں کی سب سے زیادہ مقدس صلیب بھی ایرانی فاتحین اٹھا لے گئے اور قیصر روم کا اقتدار بالکل فنا ہو گیا۔ یہ خبر مشرکین مکہ کے لئے بڑی خوش کن تھی انہوں نے مسلمانوں کو چھیڑنا شروع کر دیا اور سیدنا ابو بکر سے کہنے لگے کہ جس طرح ایران نے روم کو ختم کر ڈالا ہے ایسے ہی ہم بھی تمہیں مٹا ڈالیں گے۔ یہ آپ کی نبوت کا پانچواں سال تھا۔ مسلمان حبشہ کی طرف ہجرت کر چکے تھے۔ ایسے ہی حالات میں سورہ روم کی یہ آیات نازل ہوئیں۔ اگرچہ بظاہر اہل روم کی فتح کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے اور مشرکین مکہ ان آیات کا بھی تمسخر اڑا رہے تھے، تاہم سیدنا ابو بکر نے اسی پیشین گوئی کی بنا پر مشرکین سے شرط باندھ لی کہ اگر بضع کی زیادہ سے زیادہ مدت (بضع تین سے نو تک کے لئے آتا ہے) یعنی ۹ سال تک رومی غالب نہ آئے تو میں سو اونٹ تم کو دوں گا ورنہ اتنے ہی اونٹ تم مجھے دو گے۔ اس وقت تک شرط حرام نہیں ہوئی تھی۔

اب حالات نے یوں پلٹا کھایا کہ قیصر روم نے اندر ہی اندر یہ تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو ضرور واپس لے گا۔ ایک طرف تو اس نے اللہ کے حضور منت مانی کہ اگر اللہ نے اسے ایران پر فتح دی تو حمص سے پیدل چل کر ایلیا (بیت المقدس) تک پہنچوں گا۔ دوسری طرف نہایت خاموشی کے ساتھ ایک زبردست حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ۶۲۳ء میں اس نے اپنی مہم کا آغاز آرمینیا سے کیا اور آذربائیجان میں گھس کر زرتشت کے مقام پیدائش ارمیاہ کو تباہ کر دیا اور ایرانیوں کے سب سے بڑے آتش کدے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ رسول اللہ ﷺ ۶۲۲ء میں ہجرت کر کے مدینہ آئے اور ۶۲۳ء میں مسلمانوں نے مشرکین مکہ کو بدر کے مقام پر شکست فاش دی۔ اسی دن مسلمانوں کو یہ خبر مل گئی کہ روم نے ایران کو شکست فاش دے کر اپنا علاقہ آزاد کرا لیا ہے۔ اس طرح مسلمانوں کو تو دوہری خوشیاں نصیب ہو گئیں اور ان مشرکین مکہ کو دوہری ذلت سے دوچار ہونا پڑا۔

قرآن کی اس عظیم الشان اور محیر العقول پیشین گوئی کی صداقت کا مشاہدہ کر کے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اور سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مشرکین مکہ سے سو اونٹ وصول کئے جو آپ ﷺ کے حکم کے مطابق صدقہ کر دیئے گئے۔

[۲] یعنی اللہ کا وعدہ پورا ہو کے رہتا ہے اور نظر آنے والی سب رکاوٹیں خود بخود ہٹتی چلی جاتی ہیں۔

[۳] اس کے دو مطلب ہیں۔ ربط مضمون کے لحاظ سے تو اس آیت کا یہی مطلب ہے کہ ظاہر بین لوگوں کی نظر صرف

غٰفِلُوْنَ ﴿۷﴾ اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ ۫ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ

کیا انہوں نے کبھی اپنے آپ میں[۴] غور و فکر نہیں کیا؟ اللہ نے آسمانوں' زمین اور ان کے درمیان جو کچھ ہے

ظاہری اسباب پر ہوتی ہے۔ اور انہیں اسباب کو دیکھ کر وہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں مگر اس کائنات میں ظاہری اسباب کے علاوہ بے شمار باطنی اسباب بھی موجود ہیں۔ جنہیں صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ اور ہر کام کا انجام تو صرف اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ بسا اوقات ظاہری اسباب کے بالکل الٹ نتیجہ برآمد ہوتا ہے اور یہ ایسی بات ہے جو عام لوگوں کے علم میں نہیں آسکتی۔ اور اگر اس آیت کو عام معنوں پر محمول کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ عام لوگوں کی نظر بس دنیا کے مال و اسباب پر ہی ہوتی ہے اور اسی پر وہ فریفتہ و مفتون ہوتے ہیں۔ وہ اس انجام سے قطعاً غافل ہوتے ہیں کہ انہیں مر کر اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے جہاں ان کے اعمال کا محاسبہ بھی ہوگا پھر اس کے مطابق انہیں سزا بھی ملنے والی ہے۔

[۴] ۞ انسان کن کن باتوں میں دوسرے جانداروں سے ممتاز ہے: انسان کے اندر بھی ایک پوری کائنات آباد ہے۔ اسی لئے انسان کے اندر کی دنیا کو عالم اصغر کہا جاتا ہے۔ اور بیرونی دنیا یا کائنات کو عالم اکبر۔ پھر اس اندرونی دنیا کے بھی بے شمار پہلو ہیں۔ ہم سردست انسان کے اس پہلو پر غور کریں گے جس میں وہ دوسرے جانوروں سے ممتاز ہے۔ مفاد خویش، تحفظ خویش اور بقائے نسل وغیرہ ایسے طبعی تقاضے ہیں جو ہر جاندار اور اسی طرح انسان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اور جن باتوں میں وہ ممتاز ہے وہ یہ ہیں (۱) زمین اور اس کے ماحول میں بے شمار چیزیں ایسی ہیں جو انسان کے لئے مسخر کر دی گئی ہیں۔ اور وہ ان سے جیسے چاہے کام لے سکتا ہے اور یہ صفت انسان کے علاوہ دوسرے کسی جاندار میں نہیں (۲) اسے خیر اور شر کی تمیز بخشی گئی ہے۔ وہ اپنے ہی کئے ہوئے کاموں پر حکم لگا سکتا ہے کہ میں نے فلاں اچھا کام کیا ہے اور فلاں کام برا تھا۔ یہ بات کافی حد تک اس کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے۔ پھر اسے وحی کے ذریعہ متنبہ بھی کیا جاتا رہا ہے (۳) اسے قوت ارادہ و اختیار بھی بخشا ہے اور وہ اپنے لئے اچھا یا برا، کوئی بھی طرز زندگی اپنانے کا پورا اختیار رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ اپنے تحفظ کے فطری داعیہ کے علی الرغم کسی جذبہ کے تحت اپنی جان تک دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا اور (۴) اسے عقل و شعور کا وافر حصہ عطا کیا گیا ہے جس کے ذریعے وہ چند معلوم اور دیکھی ہوئی اشیاء سے مزید کچھ حقائق اور نتائج کا سراغ لگانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ جسے اصطلاحی زبان میں علت (Cause) اور معلول (Effect) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ مشاہدات کو دیکھ کر اس کی علت بھی معلوم کرنا چاہتا ہے اور اس سے آگے معلول بھی۔

۞ انسان کے امتحان کا پورا وقت اس کی موت تک ہے۔ یہ وہ اللہ کے عطیات ہیں جو انسان کے علاوہ کسی جاندار کو عطا نہیں کئے گئے اور ان کے عطا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کا امتحان لیا جائے کہ آیا وہ ان امور میں بھی اللہ کا فرمانبردار بن کر رہتا ہے جس میں اسے اختیار دیا گیا ہے یا نہیں؟ جیسا کہ وہ طبعی امور میں اللہ کے قوانین و احکام کا پابند ہے۔ گویا یہ دنیا صرف انسان کے لئے دارالامتحان ہے اور کسی جاندار کے لئے نہیں اور اس امتحان کا وقت اس کی موت تک ہے۔ موت دراصل اس کے امتحان کے نتیجہ کے اعلان کا دن ہے۔

۞ رزلٹ کا اعلان موت کا دن ہے اور اسی وقت سے جزا و سزا شروع ہو جاتی ہے:۔ اور موت کے فوراً بعد پاس ہونے والوں

اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ۞ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ

ان سب کو کسی حقیقی مصلحت [۵] اور ایک مقررہ وقت تک [۶] کے لئے پیدا کیا ہے۔ مگر لوگوں میں سے اکثر اپنے پروردگار کی ملاقات سے منکر ہیں۔(۸) کیا ان لوگوں نے زمین میں چل پھر کر یہ نہیں دیکھا

کو انعام واکرام دیئے جائیں گے اور ان کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور فیل ہونے والے کو اپنے اپنے رزلٹ کے حساب سے سخت اور سخت تر سزائیں دی جائیں گی۔ اسی حقیقت سے عالم آخرت کے یقینی طور پر واقع ہونے کی عقلی دلیل پیش کی گئی ہے۔ کیونکہ یہ تو ناممکن ہے کہ کسی شخص کا امتحان تو لیا جائے لیکن اس کے نتیجہ کا اعلان ہی نہ کیا جائے یا اعلان کے بعد نہ پاس ہونے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور نہ فیل ہونے والوں کو کچھ سزا دی جائے اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ امتحان کا وقت ختم ہونے سے پہلے ہی کسی کو سزا دے ڈالی جائے۔ لہٰذا جزا و سزا کا اصل مقام دار الآخرت ہے نہ کہ یہ دنیا۔ اور اس دنیا میں جو بعض افراد یا اقوام پر عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے تو وہ محض مجرموں کی گرفتاری ہوتی ہے پوری سزائے جرم نہیں ہوتی تاکہ دوسرے لوگ ایسے مجرموں کے مظالم سے محفوظ رہ سکیں اور آئندہ کے لئے ان کے مظالم کا سلسلہ بند ہو جائے۔

۞ **اخروی زندگی کیوں ضروری ہے:۔** گویا انسان کے اندر کی دنیا کے اس پہلو پر بھی غور کرنے سے یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ انسان کو اس کے اچھے اور برے اعمال کی سزا ملنا ضروری ہے۔ اور نیز یہ کہ یہ سزا موت کے بعد ہی ہو سکتی ہے لہٰذا روز آخرت کا قیام ضروری ہوا۔ اب جو لوگ انسان کے اعمال کی جزا و سزا اور روز آخرت پر یقین ہی نہیں رکھتے ان سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آخر تمہیں یہ زائد عطیات کیوں عطا کئے گئے تھے؟ اگر دنیا میں رہنے کا مقصد کھانا پینا، بقائے نسل اور اس کے بعد مر کر مٹی ہو جانا ہی تھا تو یہ کام تو دوسرے جاندار بھی کر رہے ہیں۔ پھر تم میں اور ان میں کیا امتیاز باقی رہ گیا؟ بلکہ ایک لحاظ سے ایسا انسان جانوروں سے بدتر ہوا کہ اللہ نے اسے جو دوسرے جانوروں سے زائد صلاحیتیں عطا کی تھیں ان سے اس نے کچھ بھی فائدہ نہ اٹھایا۔

[۵] ۞ **کائنات میں نظم وضبط سے ہی ایجادات ہوتی ہے اور تمدن کو فروغ ملتا ہے:۔** بالحق سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی جملہ اشیاء کے ذمہ جو کام لگا دیا ہے اور اس کے لئے جو قوانین مقرر کر دیئے ہیں کہ وہ ان پر سختی سے پابند ہیں۔ نہ وہ ایک لمحہ آگے پیچھے ہو سکتی ہیں اور نہ ایک آدھ انچ بھی ہٹ سکتی ہیں۔ مثلاً سورج کے ایک دن طلوع ہونے سے دوسرے دن طلوع ہونے تک ۲۴ گھنٹے لگتے ہیں۔ سورج کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اس وقت میں ایک لمحہ کی بھی تقدیم و تاخیر کرے۔ پانی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی وقت نشیب سے فراز کی طرف بہنا شروع کرے یا سطح ہموار نہ رکھے یا ۱۰۰ درجہ سنٹی گریڈ سے پہلے ہی کھولنا شروع ہو جائے، نہ آگ کے لئے ممکن ہے کہ وہ اشیاء کو جلانا چھوڑ دے۔ یا گرمی سے اشیاء پھیلنا اور سردی سے سکڑنا چھوڑ دیں۔ یہی وہ قوانین ہیں جن میں نظم وضبط کی بنا پر انسان نت نئی ایجادات کو ظہور میں لانے کے قابل ہو سکتا ہے بلکہ تھوڑا سا آگے غور و فکر کیا جائے کہ اگر اشیاء کائنات میں یہ نظم وضبط نہ ہوتا تو انسان اس دنیا میں زندہ بھی نہ رہ سکتا تھا۔

۞ **توحید' انسانی زندگی کے مقصد اور روز آخرت پر دلائل:۔** جس سے صاف واضح ہے کہ کائنات کی ایک ایک چیز بے شمار فوائد اور مصالح کی بنا پر بنائی گئی ہے یہ محض کسی بچے کا کھیل نہیں کہ جس نے اپنا دل بہلانے کے لئے ایک گھروندا بنا لیا ہو اور جب اس کا جی اکتا جائے تو اس پر ہاتھ پھیر کر اسے مٹا ڈالے۔ بلکہ یہ کسی حکیم مطلق کی ایک سوچی سمجھی تدبیر اور کارنامہ ہے جس سے ایک نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ ایسے منظم و مربوط کارخانہ کا خالق و مالک ایک ہی ہستی ہو سکتی ہے اور دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے

فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَ

عَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا

کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ وہ لوگ قوت میں بھی ان سے زیادہ تھے اور جتنا ان لوگوں نے زمین کو آباد کیا ہے انہوں نے زمین کو جوت کر اس[۷] سے زیادہ آباد کیا تھا۔ ان کے پاس (بھی) ہمارے رسول[۸] واضح دلائل لے کر آئے تھے۔ اللہ کا ان پر ظلم کرنے کا ارادہ نہیں تھا بلکہ وہ خود ہی اپنے

کہ انسان کی ایجادات اور تسخیرِ کائنات کا راز اسی بات میں ہے۔ کائنات کی جملہ اشیاء طبعی قوانین کی پابند ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو نہ علوم سائنس کا تصور کیا جا سکتا تھا اور نہ انسانی تہذیب و تمدن کا۔ اب سوال یہ ہے کہ ایک طرف کائنات کی بنیاد ٹھوس حقائق پر مبنی ہے، دوسری طرف انسان کو وہ صلاحیتیں دی گئی ہیں جو کسی اور جاندار کو نہیں دی گئیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے۔ ان باتوں کے باوجود یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ انسان کی زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو۔ اور وہ جیسے چاہے اس دنیا میں زندگی گزار کر، عیش و عشرت کے مزے اڑا کر اور دوسروں پر ظلم کر کے اور ان کے حقوق پامال کر کے دنیا سے رخصت ہو جائے اور پھر مٹی میں مل کر مٹی بن جائے اور اس سے کوئی باز پرس تک کرنے والا نہ ہو۔ گویا اس آیت میں توحید باری پر انسان کی زندگی کے مقصد پر اور روز آخرت پر قوی دلائل اور شہادتیں پیش کی گئی ہیں۔

[۶] ❁ آخرت پر تیسری دلیل:۔ قیامت اور عالمِ آخرت پر یہ تیسری دلیل ہے۔ ہر چیز جو پیدا ہوئی ہے یا اصطلاحی زبان میں حادث ہے۔ وہ فنا ضرور ہو گی۔ کائنات کا یہ مربوط پائیدار نظام دیکھ کر انسان یہی سوچتا ہے کہ تا ابد یہ نظام یونہی چلتا جائے گا۔ اصل چیز مادہ ہے جو ازلی ابدی ہے۔ مادہ صرف اپنی شکلیں بدلتا ہے، فنا نہیں ہوتا یہی دہریہ حضرات کے عقیدہ کی اصل بنیاد ہے۔ لیکن موجودہ دور کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مادہ بھی فنا ہو سکتا ہے اور اسے توانائی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ایٹم کے اجزاء الیکٹرون اور پروٹون کا نظام درہم برہم کر کے اسے توانائی میں تبدیل کر لیا جاتا ہے پھر توانائی بھی مادہ میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اللہ کی ذات اور اس کی صفات کے سوا نہ کوئی چیز ازلی ہے اور نہ ابدی۔ اور ہر چیز فنا ہو سکتی ہے۔ جب یہ بات سائنس کے ذریعہ پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے تو اب اس کائنات کے نظام کے درہم برہم ہونے اور قیامت قائم ہونے میں کیا استحالہ باقی رہ جاتا ہے؟ رہی یہ بات کہ اس کائنات کا یہ موجودہ نظام کب درہم برہم ہو گا اور کب قیامت قائم ہو گی اور یہ بات صرف خالق کائنات ہی جان سکتا ہے اور یہ بات معلوم کر لینا انسان کی دسترس سے باہر ہے۔

[۷] یعنی ظلم کی عمارت ہمیشہ عقیدہ آخرت سے انکار کی بنیاد پر اٹھتی ہے۔ اور جن ظالم اقوام کو اللہ تعالیٰ نے تباہ کیا ہے ان سب میں قدرِ مشترک یہی تھی کہ آخرت کے منکر تھے۔ کیونکہ جو شخص یا جو قوم آخرت میں اللہ کے حضور اپنے اعمال کی جوابدہی کی قائل ہو گی وہ ظلم کر ہی نہیں سکتی۔ ان تباہ ہونے والی قوموں میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو تم سے بہت زیادہ طاقتور تھے۔ فنون دنیا کے ماہر تھے۔ انہوں نے زرعی میدان میں بھی خوب ترقی کی تھی اور زمین کو چیر کر اس میں سے خزانے بھی نکالے تھے اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے تم سے بہت زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ لیکن جب انہوں نے ظلم اور زیادتی پر کمر باندھی تو اللہ نے انہیں تباہ و برباد کر کے رکھ دیا اب اگر اے کفار مکہ! تم بھی وہی سرکشی اور ظلم کی راہ اختیار کرو گے تو آخر کیا وجہ ہے کہ تمہارا بھی انجام ویسا ہی نہ ہو۔

[۸] یعنی ایک تو تمہارے اندر آخرت کے لازمی ہونے کے دلائل موجود تھے، دوسرے کائنات میں موجود تھے، تیسرے تم

أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٩﴾ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِينَ أَسَاءُوا السُّوأَىٰ أَنْ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَكَانُوا بِهَا يَسْتَهْزِئُونَ ﴿١٠﴾ ع اللَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿١١﴾ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ ﴿١٢﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ مِنْ شُرَكَائِهِمْ شُفَعَاءُ وَكَانُوا بِشُرَكَائِهِمْ

آپ پر ظلم کر رہے تھے۔(۹) پھر جن لوگوں نے برائیاں کی تھیں ان کا انجام بھی بُرا ہی ہوا کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلایا اور وہ ان کا مذاق[۹] اڑایا کرتے تھے۔(۱۰)

اللہ ہی مخلوق کی ابتدا کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ[۱۰] کرے گا۔ پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔(۱۱) اور جس دن قیامت قائم ہوگی تو مجرم لوگ سخت مایوس[۱۱] ہو جائیں گے(۱۲) اور ان کے شریکوں میں کوئی بھی ان کا سفارشی نہ بنے گا اور وہ خود بھی اپنے شریکوں[۱۲] کے منکر ہو جائیں گے(۱۳)

پر اللہ کی رحمت ہوئی کہ اس نے رسول بھیجے جو تمہیں مابعد الموت پیش آنے والے حقائق سے خبردار کرتے رہے۔ پھر بھی اگر تم لوگ عقیدہ آخرت کے منکر بن کر اپنی عاقبت تباہ کر لو تو اس میں تمہارا اپنا ہی قصور ہے۔ اللہ تعالیٰ کبھی کسی پر زیادتی اور ظلم نہیں کرتا۔

[۹] یہ ان کے ظلم اور زیادتی کی آخری حد تھی۔ نہ انہوں نے اپنے اندر کی شہادت پر غور کیا، نہ نظامِ کائنات میں غور کیا اور رسولوں نے انہیں جب اصل حقائق سے آگاہ کیا تو انہیں صرف جھٹلایا ہی نہیں بلکہ ان کا اور اللہ کی آیات کا مذاق بھی اڑانے لگے۔ جب ان کی سرکشی اس حد تک پہنچ گئی اور عملی طور پر اس ظلم اور زیادتی میں آگے ہی بڑھتے چلے گئے تو انہیں ان کی بداعمالیوں کی سزا بھی اتنی ہی بری ملی جس حد تک ان کے اعمال برے تھے۔

[۱۰] اس کی تشریح کے لئے دیکھئے سورہ النمل کی آیت نمبر ۶۴ کا حاشیہ نمبر ۶۹ اور سورہ العنکبوت کی آیت نمبر ۱۹ کا حاشیہ نمبر ۳۱

[۱۱] یعنی وہ اپنی نجات سے مایوس ہو جائیں گے اور کسی کی سفارش یا امداد سے بھی۔ اور ان کی حالت ایسی ہوگی جیسے کوئی مجرم رنگے ہاتھوں لوگوں کے سامنے جرم کرتا ہوا پکڑا جائے۔ اور ایسے شخص پر سخت افسردگی اور مایوسی کی حالت طاری ہو جاتی ہے کیونکہ اسے اس جرم کی سزا سے بچنے کی کوئی امکانی صورت نظر نہیں آتی۔

[۱۲] ❁ معبودانِ باطل کی تین اقسام:۔ دنیا میں جن چیزوں کو اللہ کا شریک سمجھا جاتا رہا ہے یا اس کی صفات و اختیارات میں شریک بنایا جاتا رہا ہے ان کی تین ہی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ ایک بے جان اشیاء جیسے پتھر کے بت یا شمس و قمر اور ستارے یا دوسرے شجر و حجر۔ دوسرے ایسے جاندار جنہوں نے کبھی اپنی خدائی کا دعویٰ نہ کیا ہو۔ جیسے ملائکہ، انبیاء، اولیاء اور صالحین۔ نیز بعض جاندار حیوانات، جیسے سانپ اور گائے وغیرہ۔ ان میں انبیاء اور صالحین تو ایسے لوگ ہیں جو دوسروں کو شرک سے سختی سے منع بھی کرتے رہے چہ جائیکہ وہ خود خدائی اختیارات کے طالب ہوں اور تیسرے وہ جاندار جو اپنی خدائی لوگوں سے منوانا چاہتے ہیں جیسے شیاطین، اللہ کے نافرمان بادشاہ، ادارے یا حکومتیں اور وہ اولیاء حضرات جنہوں نے اپنے مریدوں کی سفارش کی ذمہ داری اٹھا رکھی ہے یا یہ کہتے ہیں کہ پیر اپنے مریدوں کے اعمال و احوال سے ہر وقت باخبر رہتا ہے اور مشکل کے وقت انہیں پکارنے

كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ
الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ

اور جس دن قیامت قائم ہوگی لوگ الگ الگ گروہوں میں بٹ جائیں گے (۱۴) یعنی جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے وہ تو جنت کے باغیچوں میں شاداں و فرحاں ہوں گے۔ (۱۵)

اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا تو ایسے لوگوں کو عذاب [۱۳] میں رکھا جائے گا۔ (۱۶) پس تم اللہ کی تسبیح [۱۴] کرو شام کے وقت بھی اور صبح کے وقت بھی۔ (۱۷)

پر وہ فریاد کو بھی پہنچ جاتا ہے۔

۞ **ان میں سے کوئی بھی سفارش نہ کر سکے گا:۔** اب دیکھئے پہلی قسم کے یعنی بے جان معبودوں سے تو سفارش کی توقع ہی عبث ہے۔ البتہ ان پتھروں اور شجر حجر کو بھی مشرکوں کے ساتھ جہنم میں ڈال دیا جائے گا تاکہ ایسے احمقوں کی حسرت میں اضافہ ہو نیز یہ اشیاء جہنم کی آگ کو مزید بھڑکا کر ان کے لئے مزید عذاب کا باعث بن جائے۔ دوسری قسم کے معبود اللہ کے حضور صاف کہہ دیں گے کہ ہم تو ان کم بختوں کو شرک سے منع ہی کرتے رہے ہمیں کیا خبر تھی کہ یہ بدبخت ہماری ہی عبادت شروع کر دیں گے۔ لہٰذا یہ لوگ بھی اپنے عابدوں سے سخت بیزار ہوں گے۔ وہ ان کی سفارش کیا کریں گے۔ تیسری قسم کے لوگ جو فی الواقع مجرم ہوں گے۔ وہ تو خود گرفتار بلا اور عذاب میں ماخوذ ہوں گے۔ وہ اس بات کو غنیمت سمجھیں گے کہ اپنے عابدوں کے گناہوں کا کچھ حصہ ان پر نہ ڈالا جائے لہٰذا وہ ایسے دلائل دینا شروع کر دیں گے جن سے یہ ثابت کر سکیں کہ یہ عابد حضرات اپنے جرائم کے خود ہی ذمہ دار تھے۔ اور اس طرح ان کے دشمن بن جائیں گے اور اپنے آپ کو ان سے چھڑانا چاہیں گے۔ اس حال میں بھلا وہ کیا سفارش کر سکیں گے۔ غرضیکہ مشرکوں کے شریکوں میں سے کوئی بھی اللہ کے ہاں ان کی سفارش نہ کرے گا یا کرنے کے قابل ہی نہ ہوگا۔

[۱۳] اس دنیا میں گروہوں اور جماعتوں کی بنیاد قوم ہوتی ہے یا وطن' رنگ' زبان' برادری یا بالخصوص سیاسی عقائد ہوتے ہیں لیکن قیامت میں ان کی گروہ بندی ان اصولوں کے مطابق ہوگی جو دین کے تقاضے ہیں۔ مثلاً اللہ کے نیک اور فرمانبردار بندوں کی ایک ہی جماعت ہوگی خواہ وہ دنیا کے کسی بھی کونہ میں بستے ہوں البتہ یہ ممکن ہے کہ ہر پیغمبر کی امت کا الگ الگ گروہ ہو۔ قیامت کے منکروں کی الگ جماعت ہوگی، مشرکوں کی الگ، منافقوں کی الگ۔ نیز یہ گروہ بندی بعض جرائم کے لحاظ سے بھی ہوگی۔ جیسے زانیوں کی الگ، ڈاکوؤں کی الگ، متکبروں کی الگ وغیر ذلک۔ ان میں سے صرف پہلا گروہ جنت میں داخل ہوگا۔ اور وہاں ان کی عزت و تکریم اور تواضع بھی خوب ہوگی۔ باقی سب گروہ جہنم میں داخل ہوں گے گویا لوگوں کی اکثریت تو جہنم کا لقمہ بنے گی اور تھوڑے ہی لوگ ہوں گے جو جنت میں داخل ہوں گے۔

[۱۴] ۞ **نمازوں کے اوقات میں آفتاب پرستوں کی مخالفت:۔** مشرکین کے عقائد باطلہ سے اللہ کی تنزیہہ بیان کرو۔

تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ وَكَذٰلِكَ

آسمانوں اور زمین میں حمد اسی کو سزاوار ہے۔ نیز پچھلے پہر اور ظہر کے وقت بھی (اس کی تسبیح کرو) (۱۸) وہی زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ[۱۵] سے نکالتا ہے اور زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کرتا ہے۔ اسی طرح تم بھی (مرنے کے بعد زمین سے) نکالے[۱۶] جاؤ گے (۱۹)

مشرکین اپنے عقائد باطلہ کی ایک دلیل یہ بھی دیتے تھے کہ اللہ اکیلا اس ساری کائنات کا انتظام کیسے سنبھال سکتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ وہ کچھ اختیارات دوسری ہستیوں کو تفویض کر دے۔ لہٰذا مسلمانوں کو حکم ہوا کہ وہ ایسے بیہودہ اور لچر عقائد سے اللہ کی پاکیزگی بیان کریں۔

اکثر مفسرین نے یہاں تسبیح سے مراد نماز لی ہے اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ یہاں نمازوں کے اوقات بیان ہوئے ہیں۔ مشرکوں کی اکثریت ایسی رہی ہے جو انسانی زندگی پر سیاروں کے اثرات اور تاثیر کے قائل تھے۔ اور سورج کی تاثیر سے چونکہ تمام زمینی مخلوق متاثر ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے معبودِ اکبر سمجھ کر مختلف رنگوں میں سورج کی اور آگ کی پوجا کی جاتی رہی ہے۔ سورج پرست عموماً طلوع آفتاب اور غروب کے وقت اس کی پرستش کرتے تھے۔ لہٰذا مسلمانوں کو حکم ہوا کہ ان اوقات میں کوئی فرض نماز تو کجا نفلی نماز بھی ادا نہ کی جائے۔ نیز سورج پرست سورج کی پوجا ان اوقات میں کیا کرتے تھے جب سورج مائل بہ عروج ہو۔ یعنی طلوع آفتاب سے نصف النہار تک۔ لہٰذا اس دوران کسی فرض نماز کا وقت مقرر نہیں کیا گیا۔ دو نمازیں تو اس وقت آتی ہیں جب سورج زوال پذیر ہو اور تین نمازیں اس وقت مقرر کی گئیں جبکہ سورج غائب ہوتا ہے۔ آیت نمبر ۱۷ میں صبح اور شام کی نماز کے اوقات کا ذکر آ گیا اور بعض کے نزدیک تُمْسُوْنَ میں شام اور عشا دونوں شامل ہیں اور آیت نمبر ۱۸ میں تیسرے پہر یعنی عصر کی نماز اور ظہر کی نماز کا ذکر آ گیا۔ اور نماز بجائے خود اللہ کی تسبیح و تحمید کی بہترین شکل ہے۔

اور اگر ان دو آیات سے چار نمازوں کا ہی وقت سمجھا جائے تو سورہ ہود کی آیت نمبر ۱۱۴، بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۷۸ اور سورہ طٰہٰ کی آیت نمبر ۱۳۰ کو سامنے رکھا جائے تو قرآن سے ہی پانچ نمازوں کے اوقات کی صراحت ثابت ہو جاتی ہے۔

[۱۵] اور یہ عمل ہر وقت جاری و ساری ہے۔ اللہ تعالیٰ حیوانات کی بے جان غذاؤں سے نطفہ کو، پھر نطفہ سے حیوانات کو پیدا کرتا رہتا ہے اور اس عمل میں انسان بھی شامل ہے۔ اور پرندوں سے انڈے کو، پھر انڈے سے زندہ پرندہ کو پیدا کرتا رہتا ہے اور اللہ کا یہ کارنامہ سب لوگ ہر وقت دیکھتے رہتے ہیں۔

[۱۶] ❁ نباتات اور انسان کی پیدائش سے بعث بعد الموت پر دلائل:۔ جب مردہ زمین پر بارش پڑتی ہے تو اس سے نباتات، پودے اور درخت ہی نہیں اگ آتے بلکہ حیوانات بھی پیدا ہو جاتے ہیں موسم برسات آتا ہے تو ہزارہا مینڈک ٹرانے لگتے ہیں۔ جھینگر اور پپیہے درختوں پر بولنے لگتے ہیں اور بے شمار قسم کے حشرات الارض زمین کے پیٹ سے باہر آ جاتے ہیں جن کا پہلے نام و نشان تک نہ تھا۔ سوچنے کی بات ہے کہ جاندار مخلوق آخر کیسے اور کہاں سے وجود میں آ گئی؟ تو جیسے یہ وجود میں آ سکتی ہے خواہ تمہیں اس کی سمجھ آئے نہ آئے ویسے ہی جب صور میں پھونکا جائے گا جو مردہ انسانوں کے لئے موسم برسات کا حکم رکھتا

ہے تو تم بھی زمین سے ایسے ہی پیدا ہو جاؤ گے جیسے ان جانوروں کو پیدا ہوتے دیکھتے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بے شمار مقامات پر بعث بعد الموت پر بارش کے پانی سے نباتات کے اگ آنے کو دلیل کے طور پر پیش فرمایا ہے چنانچہ سورۂ قٓ میں تقریباً ایسے الفاظ سے ارشاد فرمایا۔﴿وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ﴾ (۵۰:۱۱) نباتات کا اگنا بعث بعد الموت پر کیسے دلیل بن سکتا ہے اس مقام پر قارئین کے غور و فکر کے لئے ایک وسیع میدان چھوڑ دیا گیا ہے۔ پھر بعض مقامات پر بعث بعد الموت یعنی انسان کی دوسری بار کی پیدائش کو پہلی بار کی پیدائش سے تشبیہ دے کر اسے آسان تر قرار دیا گیا ہے جیسے فرمایا: ﴿كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ﴾ (۲۱:۱۰۴) گویا اب تین باتیں سامنے آگئیں۔ ایک انسان کی پہلی بار کی پیدائش، دوسرے نباتات کی پیدائش اور ان دونوں کی تشبیہ اور دلیل کے طور پر تیسری چیز انسان کی دوسری بار کی پیدائش پر بطور دلیل لایا گیا ہے۔ ان میں سے تیسری چیز کے متعلق ہم مشاہدہ اور تجربہ سے کچھ بھی جان نہیں سکتے۔ البتہ پہلی چیز کو دوسری سے نسبتاً زیادہ جان سکتے ہیں۔ اور پہلی چیز سے متعلق بھی ہمارا علم جو تجربہ اور مشاہدہ سے حاصل ہوا ہے صرف اتنا ہی ہے کہ جب رحم مادر میں ماں باپ کے نطفہ کا ملاپ ہو جاتا ہے تو عورت کا ماہواری خون آنا بند ہو جاتا ہے اور جو خون ماہواری ایام کی صورت میں عورت کے جسم سے خارج یا ضائع ہو جاتا تھا وہی خون اب اس مخلوط نطفہ کی تربیت میں صرف ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور عورت کے خون سے ماہواری خون یا حیض کا خون بننا اور اسی طرح عورت کے اصل خون سے نطفہ بننا کوئی مستقل عادی امر نہیں تھا بلکہ یہ دونوں چیزیں اس وقت بننا شروع ہوئیں جب عورت جوان اور اولاد پیدا کرنے کے قابل بن گئی۔ اس سے پیشتر اس کے اصل خون سے یہ دونوں چیزیں پیدا نہیں ہوئی تھیں حالانکہ اس کے جسم کی ساخت میں یہ صلاحیت اس کی پیدائش کے پہلے دن سے ہی اس میں ودیعت کر دی گئی تھی۔ یہی حال مرد کے نطفہ کا ہوتا ہے اس کے خون سے نطفہ یا منی صرف اس وقت بنتی ہے جب وہ جوان اور اولاد پیدا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اس کے جسم کی ساخت میں منی بنانے والے آلات یعنی خصیے وغیرہ اس کی پیدائش کے پہلے دن سے ہی بنائے گئے تھے گویا عورت اور مرد کے نطفہ بنانے والے اعضاء نے اپنا اپنا کام بھی اس وقت شروع کیا جب وہ دونوں اولاد بنانے کے قابل ہو گئے۔ اور جب بڑھاپے کا دور آتا ہے تو دونوں کے جسم سے منی بنانے والے آلات موجود ہونے کے باوجود بھی اپنا اپنا کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور اس معاملہ میں عورت اور مرد دونوں بے بس ہوتے ہیں اگر وہ چاہیں بھی کہ عورت اور مرد کے جسم میں نصب شدہ آلات بڑھاپے میں بھی منی بنانے کا کام کرتے رہیں تو وہ ایسا کر نہیں سکتے۔

مرد کے جسم میں صرف منی بنانے والے اعضاء ہوتے ہیں جو جوانی کے وقت اپنا کام شروع کرتے اور بڑھاپا آنے پر چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن عورت کے جسم میں ایسے اعضاء تین طرح کے ہوتے ہیں ایک حیض کا خون بنانے والے، دوسرے منی بنانے والے اور یہ دونوں جوانی کے وقت اپنا کام شروع کرتے اور بڑھاپا آنے پر کام چھوڑ دیتے ہیں۔ اور تیسری قسم کے اعضاء وہ ہیں جو خون کے کچھ حصے کو دودھ میں منتقل کرتے ہیں۔ اور یہ اعضاء اس کے پستان ہیں۔ پستانوں کے نشانات عورت اور مرد دونوں کے سینے پر پہلے دن سے ہی موجود ہوتے ہیں۔ جوان ہونے پر عورت کے ان نشانات میں ابھار شروع ہو جاتا ہے تا آنکہ وہ اپنی مکمل صورت اختیار کر لیتے ہیں اور یہ تبدیلی صرف عورت کے جسم میں ہوتی ہے۔ مرد کے جسم میں نہیں ہوتی۔ یہی مشینری خون کو دودھ میں منتقل کرنے کا کارخانہ ہوتا ہے اور یہ مشینری صرف اس وقت اپنا کام شروع کرتی ہے۔ جب حمل قرار پا جاتا ہے۔ اس سے پہلے کام نہیں کرتی۔ خواہ عورت بالکل جوان اور اولاد پیدا کرنے کے قابل ہو۔ حمل قرار پانے کے بعد یہ مشینری حرکت میں تو آجاتی ہے۔ مگر

خون سے دودھ بننے کا عمل اس وقت مکمل ہوتا ہے جب بچہ ماں کے پیٹ سے باہر آجاتا ہے تاکہ بچہ کے پیدا ہوتے ہی اسے غذا میسر آسکے اور اس کی تربیت کا سلسلہ جو پہلے حیض کے خون سے ہوتا تھا وہ جاری رہ سکے پھر کیا ان اعضاء کا صرف اپنے اپنے مقررہ وقت ہی کام کرنا اور بعد میں اپنا کام چھوڑ دینا ہی اللہ تعالیٰ کے خَلَّاقُ الْعَلِيمِ ہونے پر زبردست دلیل نہیں؟

رحم مادر میں استقرارِ حمل کے بعد اس مخلوط نطفہ کی تربیت حیض کے گندے اور سیاہ رنگ کے خون سے ہوتی ہے جو اس مخلوط مادہ منویہ پر حاوی ہو کر اسے منجمد اور لبوترے سے منجمد خون کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے اور مخلوط مادہ منویہ کا وجود اس میں باقی نہیں رہتا بلکہ وہ اس میں مدغم ہو جاتا ہے۔ پھر یہی جما ہوا خون گوشت کے لوتھڑے کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یعنی اس جمے ہوئے خون میں سختی آنا شروع ہو جاتی ہے۔ پھر اسی گوشت کے لوتھڑے سے بچہ کی صورت کے نقش و نگار بننا شروع ہو جاتے ہیں۔ رحم مادر میں ایسے سات قسم کے تطورات ہوتے ہیں۔ جنہیں انسان خود بھی آلات کے ذریعہ مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعہ ان کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ وہ ان چیزوں کا مشاہدہ اور علم تو حاصل کر سکتا ہے جو وقوع پذیر ہو رہی ہوتی ہیں لیکن وہ یہ نہیں جان سکتا کہ ایسا کیوں اور کیسے ہوتا ہے؟

بالکل یہی صورت کسی غلے یا درخت یا پودے کے بیج کی ہوتی ہے جو دراصل مرد یا کسی بھی نر کے نطفہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ زمین اس کے لئے رحم مادر کا درجہ رکھتی ہے۔ تو جس طرح مرد کے نطفہ کا کسی عورت کے رحم میں جا پڑنے سے استقرارِ حمل ضروری نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہر بیج میں جو زمین پر گر پڑے اس سے درخت بننا ضروری نہیں ہوتا۔ پھر جب ایسی زمین جس میں بیج پڑا ہو بارش کے پانی سے سیراب ہو جاتی ہے اور موسم سازگار ہوتا ہے تو یہ گویا اس بیج کے استقرارِ حمل کا وقت ہوتا ہے۔ پانی سے زمین کے ذرات میں حرکت پیدا ہونے لگتی ہے، وہ پھول جاتے ہیں اور زمین میں دفن شدہ بیج سے مل جاتے ہیں اور اسے اپنے اندر ڈھانپ لیتے ہیں۔ اس طرح بیج اپنا وجود ختم کر کے ایک ملغوبہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر اسی ملغوبہ سے نرم و نازک کونپل بنتی ہے۔ زمین کے اندر بیج پر بعینہٖ اس قسم کے تطورات آتے ہیں جس طرح انسان کے نطفہ پر رحم مادر میں آتے ہیں۔ تا آنکہ یہی نرم و نازک کونپل چند دن بعد زمین کا سینہ چیر کر زمین سے باہر نکل آتی پھر زمین ہی سے اپنی خوراک حاصل کرنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ باتیں ہم مشاہدہ تو کر سکتے ہیں لیکن یہ نہیں جان سکتے کہ کیوں اور کیسے ہوتا ہے؟

پھر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ مرے ہوئے انسان کے جسم کے ذرات بالآخر زمین میں پہنچ جاتے ہیں۔ خواہ کسی کی میت زمین میں دفن کی گئی ہو۔ یا جلادی گئی ہو یا دریا برد ہوئی ہو یا اسے درندوں نے پھاڑ کر کھایا ہو۔ بالآخر اس کے ذرات بلاواسطہ یا بالواسطہ زمین میں پہنچ جاتے ہیں اور یہی زمین انسان کی دوسری پیدائش کے لئے رحم مادر کا کام دیتی ہے۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ انسان کی ریڑھ کی ہڈی کی دم جس کا نام عجب الذنب ہے۔ اس کے ذرات کبھی فنا نہیں ہوتے، انہیں ذرات میں سے ایک ذرہ انسان کے بیج یا نطفہ کا کام دیتا ہے، لیکن یہ زمین میں اس وقت تک بیکار پڑا رہے گا جب تک اسے مناسب موسم میسر نہ آئے۔ اور اس کا مناسب موسم وہ بارش ہے جو قیامِ قیامت کے بعد نفخہ صور ثانی یا حشر کے دن سے پہلے اسی زمین پر برسے گی اور یہ چیز بھی صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ پھر اس بارش کے پانی سے زمین کے ذرات پھول کر انسان کے بیج کو ڈھانپ لیں گے پھر اس ملغوبہ پر وہی تطورات شروع ہو جائیں گے جو حیض کی صورت میں ماں کے پیٹ میں اور بیج کی صورت میں زمین کے پیٹ میں واقع ہوتے ہیں پھر معینہ مدت کے بعد تمام کے تمام انسان زمین میں سے اس طرح نکل آئیں گے جس طرح زمین کو پھاڑ کر نباتات اگ آتی ہے اور جس طرح یہ تطورات ماں کے یا زمین کے پیٹ میں طبعی طور پر واقع ہوتے ہیں جس میں انسان کا یا بیج کا

تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ

اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہیں مٹی[۱۷] سے پیدا کیا۔ پھر اب تم ایک انسان ہو جو ہر جگہ پھیل رہے ہو۔(۲۰)

اپنا عمل دخل کچھ نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہی تطورات دوسری پیدائش کی صورت میں انسان پر طبعی طور پر واقع ہوں گے۔ جس میں اس کے اپنے ارادہ و اختیار کو کچھ دخل نہ ہوگا اور معینہ مدت کے بعد وہ زمین سے باہر نکل آنے پر مجبور ہوگا۔ ﴿كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ﴾ اور ﴿كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ﴾ سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ تطورات بالکل ویسے ہی طبیعی طور پر واقع ہونے والے امور ہوں گے جیسا کہ ماں کے یا زمین کے پیٹ میں واقع ہوتے ہیں اور یہ تو واضح بات ہے کہ یہ دوسری بار کی پیدائش اللہ تعالیٰ کے لئے پہلی بار کی پیدائش سے آسان تر ہوگی۔

اس آیت میں تُخْرَجُوْنَ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یعنی تم زمین سے نکال لئے جاؤ گے۔ اور تمہارا یہ نکالا جانا ایک اضطراری عمل ہوگا جس میں تمہاری مرضی کو کچھ عمل دخل نہ ہوگا جیسے تم جب اس دنیا میں آئے یا اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اس میں تمہاری اپنی مرضی کا کچھ عمل دخل نہ تھا اسی طرح تمہارا دوبارہ جی اٹھنا بھی ایک قہری اور اضطراری امر ہوگا۔ اس سلسلہ میں تمہاری رائے نہیں لی جائے گی نہ تمہارا کچھ عمل دخل ہوگا۔

[۱۷] ❁ انسان کی تخلیق میں اختلاف اور یکسانیت کا حسین امتزاج: انسان کی خودکار مشینری:۔ انسان کیا ہے؟ چند عناصر کا مجموعہ جو سطح ارضی پر ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سوڈیم، کیلشیم، کاربن، اور چند دوسرے نمکیات اور یہ انسان میں کتنی کتنی مقدار میں موجود ہوتے ہیں۔ یہ بھی حضرت انسان نے پتہ لگا لیا ہے مگر انہیں عناصر کو اسی مقدار میں لے کر ایک زندہ انسان پیدا کر دینا اس کی بساط اور اس کی سمجھ سے باہر ہے۔ روح کیا چیز ہے، کہاں سے آتی ہے اور کب آتی ہے؟ یہ سمجھنا بھی ناممکنات سے ہے۔ پھر اس مٹی کے پتلے کے اندر اللہ تعالیٰ نے جذبات، احساسات، عقل، شعور، ارادہ، اختیار اور بے شمار قوتیں پیدا کر دی ہیں جو از خود کام کر رہی ہیں اور اس میں انسان کے ارادہ کو ذرہ بھر دخل نہیں ہوتا۔ سامنے سے کسی خطرناک چیز کے منہ پر گرنے کا خطرہ ہو تو انسان کے سوچنے سے پہلے ہی اس کی آنکھ کے پپوٹے بند ہو کر اس کی آنکھوں کو محفوظ کر دیتے ہیں۔ خوراک ہضم ہو کر معدہ خالی ہو جائے تو از خود بھوک لگ جاتی ہے۔ اور انسان مجبور ہوتا ہے کہ کچھ کھائے۔ بدن کو پانی کی ضرورت ہو تو انسان پانی پینے پر مجبور ہوتا ہے۔ اسی طرح ہضم شدہ خوراک کے فضلات کے دفع کرنے کے لئے طبیعت اس کو مجبور کر دیتی ہے کہ اٹھ کر سب سے پہلے یہ کام کرے۔ پھر اس آدم کے مٹی کے پتلے سے ہی اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے اربوں کی تعداد میں انسان پیدا کر دیئے۔ جن میں سے ہر ایک کی شکل و صورت، آواز، لب و لہجہ، حتیٰ کہ کھانسنے کی آواز دوسرے سے الگ ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ اللہ نے ایک مشین لگا دی ہو جس سے ایک ہی ماڈل کے انسان بن کر نکل رہے ہوں۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی انفرادی توجہ ہوتی ہے۔ کیا اس تخلیق کے عظیم کارنامہ کو اتفاقات کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے؟ جیسا کہ مادہ پرستوں کا خیال ہے۔ اور یہ اتفاقات کا ہی نتیجہ ہو تو ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ایک شخص کی ایک ٹانگ لمبی ہو اور دوسری چھوٹی ہو۔ یا ایک آنکھ کی پتلی کالی ہو اور دوسری کی نیلی ہو۔ اختلاف اور یکسانیت کا یہ حسین امتزاج اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ انسان کو بنانے والی ذات قادر مطلق بھی ہے اور حکیم مطلق بھی اور وہ صرف ایک ہی ہو سکتی ہے؟

اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ
فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢١﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ

اور ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری ہی جنس سے تمہارے لیے بیویاں[۱۸] پیدا کیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ غور و فکر کرنے والوں کے لئے اس میں کئی نشانیاں ہیں (۲۱) اور ایک یہ کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہاری زبانیں اور تمہارے رنگ مختلف[۱۹] بنا دیئے۔

[۱۸] مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کے طالب بھی ہیں اور مطلوب بھی:۔ یعنی مٹی کے پتلے سے ہی اس کا جوڑا پیدا کرتا ہے جو انسانیت کے لحاظ سے ایک ہی جنس ہے۔ لیکن جسمانی ساخت کے لحاظ سے یہ دو قسمیں ہیں۔ جو دونوں ایک دوسرے کے طالب بھی ہیں اور مطلوب بھی۔ مرد کو عورت سے اور عورت کو مرد سے سکون حاصل ہوتا ہے۔ اور دونوں میں ایک دوسرے کے لئے اس قدر کشش رکھ دی کہ وہ ایک دوسرے سے الگ رہ کر سکون حاصل کر ہی نہیں سکتے۔ پھر اللہ تعالیٰ کسی جوڑے کو لڑکے ہی عطا کرتا جاتا ہے اور کسی کو لڑکیاں ہی لڑکیاں اور کسی کو ملی جلی اولاد دیتا ہے مگر نوع انسانی پر کبھی کوئی ایسا دور نہیں آیا کہ دنیا میں مرد اتنے زیادہ ہو گئے ہوں کہ انہیں بیویاں نہ مل سکیں اور یا عورتیں اس کثیر تعداد میں پیدا ہو جائیں اور مردوں کی تعداد ان کے مقابلہ میں اتنی کم ہو کہ عورتوں کو کوئی خاوند ہی میسر نہ آئے۔

مردوں اور عورتوں کی پیدائش میں ایسا تناسب جو بقائے نوع کے لئے ضروری ہے:۔ گویا مرد و عورت کی تخلیق میں بھی اللہ تعالیٰ اس تناسب کو بھی ملحوظ رکھتا ہے جو بقائے نوع کے لئے ضروری ہے۔ پھر مرد اور عورت کے اسی جذبہ کے نتیجہ میں ہی بقائے نسل انسانی کا راز مضمر ہے۔ اسی سے خاندان اور قبیلے بنتے ہیں اور تمدن اور معاشرت کی داغ بیل پڑتی ہے۔ پھر ان زوجین (میاں، بیوی) میں اس قدر محبت رکھ دی کہ وہ ایک دوسرے پر فدا ہونے کو تیار ہوتے ہیں اور پیدا ہونے والی اولاد کے حق میں دونوں شفیق اور رحیم ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ یہی احساسات و جذبات ان دونوں میں اس حد تک پیدا ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے مقدس رشتہ ازدواج کو تا زیست نباہنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ اب ذرا غور کیجئے کہ اگر اللہ تعالیٰ زوجین میں یہ جذبات و احساسات پیدا نہ کرتا تو کیا زمین کی آبادی یا نسل انسانی کی بقا ممکن تھی۔ اور کیا یہ کام اللہ کے سوا کوئی دوسرا الٰہ کر سکتا ہے؟ یا بے جان، بے شعور اور اندھے مادے کے اتفاقات سے یہ ممکن ہے کہ وہ ان حکمتوں اور مصلحتوں کا لحاظ رکھ سکے؟

[۱۹] اختلاف اور یکسانیت کا امتزاج اللہ کی انفرادی توجہ پر دلالت کرتا ہے؟ سب سے پہلے تو انسان ایک ہی جیسے عناصر کا مرکب ہے پھر ہر ایک کا منہ، زبان، گلا اور لب سب کچھ ایک جیسے ہیں لیکن آواز اور لب و لہجہ ہر شخص کا دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ کسی کی آواز سریلی اور شیریں ہوتی ہے کسی دوسرے کی بھاری اور ناگوار۔ حالانکہ قوائے نطقیہ سب انسانوں کے ایک جیسے ہیں۔ پھر ہر ایک علاقہ اور ملک کی زبان ایک دوسرے سے مختلف ہے کہیں عربی زبان بولی جاتی ہے، کہیں فارسی، کہیں انگریزی، کہیں پشتو، کہیں اردو غرضیکہ سینکڑوں قسم کی زبانیں ہیں اور یہ سب انواع ہیں۔ پھر ایک ہی علاقہ میں چند میلوں کے فاصلہ پر ہی زبان میں ذیلی قسم کی تبدیلیاں اور محاورات میں اختلاف ہوتے ہیں جن میں فرق صرف اس علاقہ کے لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ پھر ہر علاقہ کی زبان کے ساتھ اس کے حروف تہجی میں ان کے مخارج میں اور لب و لہجہ میں اختلاف واقع ہوتا ہے یہی حال

اَلۡسِنَتِكُمۡ وَاَلۡوَانِكُمۡ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلۡعٰلِمِيۡنَ ﴿۲۲﴾ وَمِنۡ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمۡ بِالَّيۡلِ وَ
النَّهَارِ وَابۡتِغَآؤُكُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّسۡمَعُوۡنَ ﴿۲۳﴾ وَمِنۡ اٰيٰتِهٖ يُرِيۡكُمُ

اہل علم کے لئے اس میں بھی کئی نشانیاں ہیں۔(۲۲)

نیز تمہارا رات اور دن کو سونا اور اس کا فضل تلاش کرنا[۲۰] بھی اس کی نشانیوں میں سے ہے۔ جو لوگ غور سے سنتے ہیں ان کے لئے اس میں بھی بہت سی نشانیاں ہیں(۲۳) اور ایک یہ کہ وہ تمہیں بجلی دکھاتا ہے۔

رنگوں کا ہے۔ کسی علاقہ کے لوگ سفید رنگ کے ہوتے ہیں کسی کے کالے، کسی کے سرخ، اور کسی کے گندمی رنگ کے، کہا جاتا کہ انسان کی جلد کے رنگ پر اس علاقہ کی مخصوص آب و ہوا کا اثر ہوتا ہے جس سے رنگت میں تبدیلی آجاتی ہے۔ یہ بات بھی صرف جزوی طور پر ہی تسلیم کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک ہی ماں باپ اور ایک ہی علاقہ ہوتا ہے مگر اولاد کی رنگت میں فرق ہوتا ہے۔ اگرچہ اس آیت میں صرف دو چیزوں لسان اور رنگ کا ذکر کیا گیا ہے مگر اور بھی بہت سے پہلو ہیں جن کے اختلافات واقع ہوتے ہیں مثلاً کسی علاقے کے لوگ بلند قد و قامت رکھتے ہیں، کہیں پست قامت ہوتے ہیں اور کہیں درمیانہ قد والے۔ اسی طرح کہیں لوگ چپٹی ناک والے ہوتے ہیں اور کہیں لمبوتری اور اونچی ناک والے۔ مثلاً ایک ہی والدین کی اولاد کی شکلوں میں جو فرق ہوتا ہے اسے والدین اور قریبی رشتہ دار تو محسوس کر سکتے ہیں لیکن اجنبی لوگ ان میں یکسانیت ہی محسوس کرتے ہیں اور بعض دفعہ امتیاز بھی نہیں کر سکتے۔ ان سب باتوں سے یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ رحم مادر میں پرورش پانے والا ہر جاندار اللہ تعالیٰ کی انفرادی توجہ کا محتاج ہوتا ہے۔ بے شمار ایسی باتیں ہیں جو رحم مادر میں ہی انسان کے حصہ میں آتی ہیں۔

[۲۰] ۞ نیند اور نیند میں خواب دیکھنا دونوں سربستہ راز ہیں:۔ کام کاج کرنے کے بعد انسان کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے اگر آرام نہ کرے تو جینا ہی محال ہو جائے۔ لیکن آرام سے مراد یہ نہیں کہ انسان کچھ وقت کام نہ کرے یا بستر پر لیٹ جائے بلکہ جب تک اسے گہری نیند نہ آئے نہ اس کی تھکن دور ہوتی ہے اور نہ وہ مزید کام کاج کرنے کے قابل ہوتا ہے اور محض کام چھوڑنے یا لیٹے رہنے سے مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ نیند کیا چیز ہے اس کی کیفیت اور ماہیت کیا ہے؟ یہ ایسا سربستہ راز ہے جسے انسان ابھی تک نہیں پاسکا۔ اس نے خواب آور دوائیں بھی دریافت کر لیں اور گولیاں بھی بنالیں مگر وہ اس کی ماہیت کو نہیں پا سکا کہ خواب کے دوران انسان سے کیا چیز کم ہو جاتی ہے کہ اس کے حواس کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر نیند کی حالت میں خواب دیکھنا دوسرا حیران کن مسئلہ ہے کہ یہ خواب انسان کن حواس سے دیکھتا ہے۔ انسان کو بس اتنا معلوم ہے کہ جب وہ زیادہ تھک جائے تو اس کی مرضی ہو یا نہ ہو نیند اسے آدبوچتی ہے۔ کام کاج کے دوران جو Cell انسان کے جسم سے جاتے ہیں ان کی مرمت شروع ہو جاتی ہے اور ان کے بجائے نئے سیل بن جاتے ہیں اور جب یہ سارا کام سرانجام پا جاتا ہے تو انسان کو خود بخود جاگ آجاتی ہے یعنی نیند کا آنا، نیند سے تھکن دور ہونا پھر تھکن دور ہونے پر تازہ دم ہو کر از خود ہی بیدار ہو جانا، یہ سب قوتیں اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہیں جو سراسر حکمت اور مصلحت پر مبنی ہیں اور ان میں کسی دوسرے الٰہ کا کوئی عمل دخل نہیں۔

۞ رات کو کام اور دن کو سونا دینی اور دنیوی لحاظ سے مضر ہیں:۔ انسان کے وسائل معاش اور ضروریات زندگی زمین میں چار سو بکھرے ہوئے ہیں۔ نیند کے بعد آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ تازہ دم ہو کر اپنا رزق تلاش کرے۔ رزق تلاش کرنے کے

الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَاۗءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ۭ ثُمَّ اِذَا

جس سے تم ڈرتے بھی ہو اور امید[۲۱] بھی رکھتے ہو اور آسمان سے پانی برساتا ہے جس سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ[۲۲] کر دیتا ہے۔ سمجھنے سوچنے والوں کے لئے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔(۲۴) اور (اس کی نشانیوں میں سے) ایک یہ کہ زمین و آسمان اسی کے حکم سے (بلا ستون) قائم[۲۳] ہیں۔ پھر جب وہ

لئے روشنی کی ضرورت تھی لہٰذا اس کام کے لئے دن کا وقت مختص کیا اور نیند کے لئے تاریکی اور خنکی کی ضرورت تھی ایک تاریکی تو انسان کو آنکھیں بند کرنے سے ہی حاصل ہو جاتی ہے، دوسری تاریکی رات کی ہوئی۔ اس طرح آرام کے لئے اللہ نے رات کا وقت مقرر کیا۔ گو آج کل انسان نے ایسے مصنوعی طریقے ایجاد کر لئے ہیں جس سے انسان رات کو کام کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ اور دن کو بھی آرام کر سکتا ہے لیکن یہ غیر فطری طریقے ہیں اور اس سے دین اور دنیا دونوں کا نقصان ہے۔ دین کا نقصان یہ ہے کہ انسان محض طمع اور زیادہ حصولِ دولت کی خاطر رات کو کام کرتا ہے اور مادہ پرستانہ دور کا ہی یہ تقاضا ہے۔ اس سے اتنا ہی انسان اللہ کی یاد سے غافل ہو گیا ہے اور دنیا کا نقصان یہ ہے کہ اس سے انسان کی صحت پر ناخوشگوار اثرات مترتب ہوتے ہیں اور قوائے انسانی وقت سے پہلے کمزور ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

[۲۱] بجلی اور بارش دونوں میں خوف اور امید یا فائدہ کے پہلو موجود ہیں۔ بجلی کی کڑک اور چمک سے جہاں یہ خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں گر کر تباہی نہ مچادے۔ وہاں اس سے اندھیرے میں نظر بھی آنے لگتا ہے نیز بجلی کی کڑک اور چمک عموماً زیادہ بارش ہونے کی علامت بھی ہوتی ہے۔ اور بارش کے باعث رحمت میں تو کسی کو شک نہیں تاہم اگر بارش ضرورت سے زیادہ ہو جائے اور سیلاب کی صورت اختیار کر لے تو اس سے کئی طرح کے نقصان بھی پہنچ سکتے ہیں۔

[۲۲] ❁ بارش کے عوامل میں اللہ کی نشانیاں:۔ زمین پر بسنے والی تمام مخلوق کا انحصار زمین کی پیداوار پر ہے۔ اللہ نے زمین پر بارش برسا کر زمین کو زندہ کیا تو گویا اس نے تمام مخلوق کو زندہ کیا۔ اب اس بارش کے برسنے میں جو عوامل کام کرتے ہیں۔ سورج کی حرارت سے سطح سمندر سے بخارات کا اٹھنا، ہواؤں کا رخ، پہاڑوں کا رخ اور ٹھنڈے علاقوں کی موجودگی، اور بارش کے بعد زمین کی قوت روئیدگی گویا سورج، ہوائیں، پانی، حرارت، برودت اور زمین کے اندر قوت روئیدگی یہ سب چیزیں ایک مربوط نظام کے تحت کام کریں تو تب جا کر انسان کو اور دوسری مخلوق کو روزی میسر ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان چیزوں کو اور ان چیزوں کے درمیان نظم و ضبط کو اللہ کے سوا کسی اور الٰہ نے قائم کیا ہے؟ یا مادہ پرستوں کے خیالات کے مطابق یہ مادہ اور طبعی قوانین کا ہی کھیل ہے؟ اگر یہی بات ہے تو ایک مخصوص مقام پر ایک مخصوص موسم میں ایک سال تو خوب بارشیں ہو جاتی ہیں اور اگلا سال بالکل خشک کیوں گزر جاتا ہے؟ اس آیت سے صرف یہی معلوم نہیں ہوتا کہ روزی کا یہ نظام قائم کرنے والی ذات صرف ایک ہی ہستی ہو سکتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکیم مطلق بھی ہے اور مختارِ مطلق بھی۔

[۲۳] ❁ ستاروں کی گردش پر کنٹرول کرنے والی ہستی کا وجوب:۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں آسمان اور زمین کا ذکر کیا تو اس سے مراد کائنات کا نظام ہوتا ہے۔ جس میں لاتعداد اجرامِ فلکی محو گردش ہیں۔ اور موجودہ نظریہ کے مطابق ہماری زمین، چاند اور

دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖ مِّنَ الْأَرْضِ ۖ إِذَا أَنتُمْ تَخْرُجُونَ ﴿٢٥﴾ وَلَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ كُلٌّ
لَّهُ قَانِتُونَ ﴿٢٦﴾ وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ ۚ وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ
فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٢٧﴾ ضَرَبَ لَكُم مَّثَلًا مِّنْ أَنفُسِكُمْ ۖ هَل لَّكُم مِّن

تمہیں ایک ہی دفعہ زمین میں سے [۲۴] پکارے گا تو تم زمین سے نکل کھڑے ہو گے۔(۲۵) آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے سب کے سب اسی [۲۵] کے فرمانبردار ہیں (۲۶) اور وہی تو ہے جو خلقت کی ابتدا کرتا ہے پھر [۲۶] وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ (دوسری بار کی پیدائش) اس پر زیادہ آسان ہے۔ آسمانوں اور زمین [۲۷] میں اسی کی شان بالاتر ہے اور وہ سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔(۲۷) اللہ تمہارے لیے ایک مثال بیان کرتا ہے جو خود تمہی سے تعلق رکھتی ہے۔

کئی دیگر سیارے سورج کے گرد گردش کر رہے ہیں۔ عموماً سمجھایہ جاتا ہے کہ ہر سیارے کی کشش ثقل اسے ایک مخصوص مقام پر جکڑے ہوئے ہے۔ مگر بات صرف اتنی نہیں۔ ہمارے نظام شمسی میں سورج ہی سب سے بڑا ستارہ یا سیارہ ہے۔ لہٰذا اس کی کشش ثقل یا قوتِ جاذبہ اتنی زیادہ ہونی چاہئے کہ وہ ہر سیارہ کو اپنی طرف کھینچ لے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ کوئی ایسی مقتدر اور قادرِ مطلق ہستی موجود ہو جو باوجود قوت جاذبہ کی کشش کے ان سیاروں کو اپنے اپنے مدارات پر قائم رکھ سکے۔ کوئی سبب طبیعی ایسا نہیں بتایا جا سکتا جس نے تمام کواکب کو کھلی فضا میں جکڑ کر بند کر دیا ہے کہ وہ سب سورج کے گرد چکر لگانے میں ہمیشہ معین مدارات پر ایک خاص حیثیت میں بھی حرکت کریں جس میں کبھی تخلف نہ ہو۔ پھر کواکب کی حرکات اور درجات سرعت میں ان کی اور سورج کی درمیانی مسافت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو دقیق تناسب اور عمیق توازن قائم رکھا گیا ہے کوئی سبب طبیعی نہیں جن سے ان منظم و مربوط سیاروں کو وابستہ کر سکیں۔ ناچار اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ سارا نظام کسی ایسے زبردست حکیم و علیم کے تحت ہے جو ان تمام اجرام سماویہ کے مواد اور ان کی ماہیت سے پورا واقف ہے وہ جانتا ہے کہ کسی مادہ کی کس قدر مقدار سے کتنی قوتِ جاذبہ صادر ہو گی اس نے اپنے زبردست اندازہ سے کواکب اور سورج کے درمیان مختلف مسافتیں اور حرکت کے مختلف مدارج مقرر کئے ہیں تاکہ ایک دوسرے سے تصادم اور تزاحم نہ ہو اور سارا عالم ٹکرا کر تباہ نہ ہو جائے۔

[۲۴] اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے اسرافیل کے صور پھونکنے کو اپنی پکار سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی جتنے انسان مر چکے یا قیام قیامت تک مریں گے سب اللہ کی ایک پکار پر اپنی اپنی قبروں سے زندہ ہو کر میدان محشر کی طرف چل کھڑے ہوں گے۔

[۲۵] یعنی کائنات کی ایک ایک چیز اللہ کی مملوک اور وہ ان کا خالق اور مالک ہے اور کوئی بھی چیز اس کے حکم تکوینی سے سرتابی کی مجال نہیں رکھتی ہر چیز اللہ کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے اور یہی ہر چیز کا سجدہ ہے اور یہی ہر چیز کی تسبیح ہے۔ حتیٰ کہ انسان بھی طبیعی امور میں اللہ کے مقررہ قوانین کا پابند ہے۔ وہ چاہے بھی تو جوانی کو واپس نہیں لا سکتا۔ نہ موت کو ٹال سکتا ہے۔ نہ کھانے پینے کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کی اگر سرکشی ہے تو محض اختیاری امور میں ہے۔

[۲۶] اس کی تشریح کے لئے دیکھئے سورۂ النمل کی آیت نمبر ۶۴ اور سورہ العنکبوت کی آیت نمبر ۱۷ کے حواشی۔

[۲۷] یعنی اعلیٰ سے اعلیٰ صفات اور اونچی سے اونچی شان اسی کی ہے۔ زمین و آسمان کی کوئی بھی چیز حسن اور خوبی میں اللہ

مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِىْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ
اَنْفُسَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۲۸ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ

تمہارے کچھ غلام ہوں اور جو کچھ ہم نے تمہیں مال و دولت دے رکھا ہے اس میں تم اور وہ غلام برابر کے شریک ہو جائیں تو کیا تم ایسا گوارا کر سکتے ہو؟ تم تو ان سے ایسے ہی ڈرو گے جیسے اپنے ہمسروں[۲۸] سے ڈرتے ہو۔ سمجھنے سوچنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ ایسے ہی اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے۔(۲۸) بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان ظالموں نے بغیر علم اپنی خواہشات کی پیروی[۲۹] کر رکھی ہے۔

کی شان اور صفات سے کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتی۔ بلکہ اگر کسی چیز میں کوئی خوبی موجود بھی ہے تو وہ اسی کے کمالات کا ادنیٰ پرتو ہے۔

[۲۸] شرک کیسے بہت بڑی بے انصافی ہے؟ ایک مثال سے وضاحت:۔ یعنی یہ مثال تمہارے حسب حال ہے جس سے بات بآسانی تمہاری سمجھ میں آسکتی ہے۔ مثال یہ ہے کہ فرض کرو تمہارے کچھ غلام ہیں۔ کیا تم ان غلاموں میں اپنا مال و دولت تقسیم کر سکتے ہو کہ وہ تمہارے ہمسر بن جائیں۔ تم تو اس بات سے اس طرح خائف ہو جاؤ گے جیسے تم اپنے ان بھائی بندوں سے ڈرتے ہو جو تمہاری جائیداد میں پہلے سے شریک ہیں۔ اگر تم اس مشترکہ جائیداد میں کچھ تصرف کرنے لگو تو وہ تمہیں روک بھی سکتے ہیں۔ تمہارا محاسبہ بھی کر سکتے ہیں اور مشترکہ جائداد کو تقسیم کرنے کا مطالبہ بھی کر سکتے ہیں۔ اب اگر تم اپنے غلاموں کو اپنی جائیداد میں برابر کا شریک بنالو۔ تو ان کے تمہارا غلام ہونے کے باوجود تمہیں ضرور ان سے ایسے ہی خطرات لاحق ہو جائیں گے اور تم یہ کام کبھی گوارا نہ کرو گے۔ حالانکہ تمہارے یہ غلام انسانیت کے لحاظ سے تمہارے بھائی بند اور برابر درجہ کے لوگ ہیں۔ اب جو بات تم اپنے لئے گوارا نہیں کر سکتے وہ اللہ کے لئے کیسے گوارا کر لیتے ہو کہ اللہ کی مخلوق کو جو نوع کے لحاظ سے بھی اس کے مساوی نہیں بلکہ اس کی مخلوق اور مملوک ہے، اللہ کے اختیارات میں شریک قرار دے دیا جائے؟ یہ کیسی دھاندلی کی تقسیم ہے؟

[۲۹] شرک کے کاروبار کی بنیاد مفاد پرستی ہے:۔ بات یہ نہیں کہ ان مشرکوں کو حقیقت کی سمجھ نہیں آتی۔ بلکہ شرک کے اس دھندے میں ان کے بہت سے دنیوی مفادات وابستہ ہیں۔ مہنتوں اور پروہتوں اور مجاوروں کو ایسے ہی عقائد کی وجہ سے نذرانے وصول ہوتے ہیں اور یہ ایک انتہائی منافع بخش کاروبار ہے جس میں کچھ سرمایہ بھی نہیں لگانا پڑتا۔ وہ اپنے مریدوں یا عبادت گزاروں کو کئی قصے کہانیاں گھڑ کر سناتے، ان کی بزرگی اور اولیائی کی شان سے ڈراتے دھمکاتے اور انہیں نذرانے دینے پر مجبور بنا دیتے ہیں۔ نیز یہ لوگ اپنے مریدوں کو شفاعت کی خوشخبریاں سناتے رہتے ہیں۔ کہ فلاں پیر صاحب سے اپنا دامن وابستہ کر لینا ہی ان کی شفاعت اور اخروی نجات کی ضمانت ہے۔ اس طرح عابد و معبود دونوں مذہب کے نام پر حقیقتاً اپنی ہی خواہش نفس کے پیچھے لگے ہوتے ہیں۔ اور اللہ کا قانون ہی یہ ہے کہ انسان جس طرح کا طرز زندگی اختیار کرنا چاہے اللہ اسے ویسی ہی توفیق دے دیتا ہے اور جو لوگ نہ خود غور و فکر کریں نہ انبیاء کی بات مانیں، محض اپنی ضد، ہٹ دھرمی اور وہم و گمان پر جمے رہنا چاہیں اللہ ایسے لوگوں کو انہیں کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ زبردستی ہدایت دینا اللہ کا دستور نہیں۔

فَمَنۡ يَّهۡدِىۡ مَنۡ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَـلۡقِ اللّٰهِ ؕ ذٰ لِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ وَ

پھر جسے اللہ نے گمراہ کر دیا ہو اسے کون راہِ راست پر لا سکتا ہے اور ان کا کوئی مددگار بھی نہ ہوگا۔(۲۹)

لہٰذا (اے نبی!) یکسو ہو کر اپنا رخ دین[۳۰] پر مرتکز کر دو۔ یہی فطرتِ الٰہی[۳۱] ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی اس خلقت[۳۲] میں کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتا یہی درست دین[۳۳] ہے۔

[۳۰] یعنی جب یہ بات واضح ہو چکی کہ مشرک اپنے حق میں ایسی تقسیم گوارا نہیں کرتے، پھر بھی اگر اللہ کی مخلوق کو اس کا شریک بنا ڈالیں تو اس سے بڑی دھاندلی کوئی نہیں ہو سکتی۔ تو آپ کو چاہئے کہ ان مشرکوں کی لغویات پر ہرگز توجہ نہ دو اور دوسرے تمام مذاہب سے اپنی توجہ ہٹا کر صرف دین اسلام یا خالص اللہ ہی کی عبادت کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

[۳۱] ۞ ہر بچہ اصل فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے:۔ یہ بات ہر انسان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے کہ اس کا خالق ومالک اللہ تعالیٰ ہے۔ اور وہ اس کا بندہ اور غلام ہے۔ لہٰذا اسے صرف ایک اللہ ہی کی عبادت کرنا چاہئے۔ چنانچہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اسے یہودی بنا لیں یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر) اور ایک روایت میں ہے کہ کسی غزوہ میں صحابہ کرام نے مشرکوں کے بچوں کو بھی مار ڈالا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا۔ تم نے بچوں کو کیوں مار ڈالا۔ انہوں نے جواب دیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ مشرکوں کی اولاد تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اب جو تم میں عمدہ مسلمان ہیں کیا وہ مشرکوں کی اولاد نہیں ہیں؟"

۞ ہر انسان میں قبولِ حق کی استعداد موجود ہے اور یہی اللہ کی فطرت ہے:۔ ان احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت اصلی پر اس کے والدین یا ماحول کا گہرا اثر ہوتا ہے اور غلط ماحول میں وہ فطرت اصلیہ دب جاتی ہے۔ اسی دبی ہوئی فطرت سے ماحول کے دباؤ کو زائل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ انبیاء کو بھیجتا اور کتابیں نازل فرماتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہر انسان کی فطرت میں قبول حق کی استعداد رکھ دی گئی ہے اور اسی لئے اسے قبول حق کا مکلف بھی بنایا گیا ہے۔ مثلاً اگر فرعون یا ابو جہل کی فطرت میں یہ استعداد اور صلاحیت ہی موجود نہ ہوتی تو انہیں حق کی طرف دعوت دینا ہی بے معنی ہوتا۔

[۳۲] اس جملہ کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ نے انسان کو جس فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ معبود صرف اللہ تعالیٰ ہے اس کے ساتھ دوسروں کو بھی معبود نہیں بنایا جا سکتا۔ اور انسان عبد اور غلام ہے۔ اسے کسی طرح یہ سزاوار نہیں کہ وہ اللہ کا نافرمان اور سرکش ہو جائے یا خود ہی معبود بن بیٹھے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جس جاندار کو جس حال میں پیدا کیا ہے اسے اسی حال میں رہنے دینا چاہئے۔ یعنی جانوروں کے بچے تندرست اور صحیح شکل وصورت پر پیدا ہوتے تھے تو مشرکین جن جانوروں کو بتوں کے نام پر وقف کرتے ان کے کان چیر دیتے تھے۔ علاوہ ازیں بچوں کے سر پر کسی کے نام کی چوٹی رکھنا، داڑھی منڈانا، خوبصورتی کی خاطر جسم کو گودنا یا گدوانا اور اس میں نیلا داغ دینا یا دانتوں میں مصنوعی طریقوں سے خلا پیدا کرنا سب اسی ضمن میں آتا ہے۔

[۳۳] یہ سیدھا دین کیا ہے؟ چند موٹی موٹی اور سیدھی سادی باتیں جنہیں سب مذاہب والے یکساں تسلیم کرتے ہیں اور وہ

لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا

مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۳۱﴾ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۳۲﴾

لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔(۳۰) اسی کی طرف [۳۴] رجوع کرتے ہوئے (اسی بات پر قائم ہو جاؤ) اور اس سے ڈرتے رہو اور نماز قائم کرو اور ان مشرکوں سے نہ ہو جاؤ(۳۱) جنہوں نے اپنا دین الگ کر لیا اور گروہوں [۳۵] میں بٹ گئے۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی میں مگن [۳۶] ہے۔(۳۲)

باتیں یہ ہیں۔ اللہ ہی سب کا خالق ہے مالک ہے اور حاکم ہے۔ وہ اپنی ذات میں یکتا ہے اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ اس کا سب پر زور چلتا ہے۔ اس پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ لہٰذا اسی کی تسبیح کرنا یا نام جپنا چاہیے۔ اسی طرح کسی کے جان و مال کو نقصان پہنچانا، کسی کی عزت پر حملہ کرنا یا تہمت لگانا، دوسروں سے دغا فریب کرنا سب برا سمجھتے ہیں۔ اور سچ بولنا، غریب پر ترس کھانا، حقدار کو اس کا حق پورا ادا کرنا سب ہی اسے بہتر سمجھتے ہیں اور اس کی تلقین کرتے ہیں۔ یہی سچا دین ہے جسے ہر انسان کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ اور انہی فطری امور کو پیغمبر یاد دلاتے رہے ہیں۔

[۳۴] لہٰذا جس کسی نے بھی اس فطری دین کے خلاف کوئی غلط طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے اسے چاہیے کہ وہ اسی فطری دین کی طرف لوٹ آئے۔ اور اللہ کی نافرمانی اور سرکشی سے ڈر جائے اور سب سے بڑی سرکشی اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق کو پامال کرنا ہے۔ اور چونکہ اللہ سے ڈرنا ایک قلبی عمل ہے لہٰذا اس صفت کے اظہار کے لئے نماز کو ہمیشگی سے ادا کرتے رہو۔ اس سے تم میں مزید تقویٰ پیدا ہو گا۔

[۳۵] ❁ **توحید کے عقیدہ میں ترمیم یا اضافہ کرنے والے سب مشرک ہیں:۔** فطری دین تو خالص توحید پر مبنی ہے۔ اب جو کوئی اس فطری دین میں کچھ بگاڑ پیدا کرے گا یا اس میں کچھ اضافے کرے گا پھر ان بگڑے ہوئے یا زائد عقائد پر لوگوں کی جتھہ بندی کر کے کوئی ایک فرقہ کھڑا کر دے گا جس کا امتیاز وہی بگڑا ہوا یا زائد عقیدہ ہی ہو سکتا ہے تو ایسے سب کام شرک میں داخل ہیں اس طرح اس فطری دین میں بگاڑ پیدا کرنے والے، ان میں اضافے کرنے والے اور ان کی اتباع کرنے والے سب کے سب مشرک ہوئے۔

❁ **انسان کی ابتدا توحید سے ہوئی تھی نہ کہ شرک سے:۔** اس آیت کی رو سے یہ معلوم ہوا کہ انسان ابتداءً توحید پرست تھا۔ توحید ہی اس کا فطری مذہب ہے۔ نیز ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام خود نبی تھے اور نبی فطری دین یعنی توحید کا داعی ہوتا ہے لیکن جب موجودہ دور کے محققین مذہب کی تاریخ لکھنے بیٹھتے ہیں تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسان ابتداءً مظاہر پرست تھا پھر آہستہ آہستہ توحید کی طرف پلٹا ہے۔ یہ فلسفہ مذاہب سراسر وہم و قیاس پر مبنی ہے۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ انسانوں نے فطری حقائق کو مسخ کر کے اور ان میں اضافے کر کے نئے نئے مذاہب اور فرقے ایجاد کر ڈالے ہیں (تفصیل کے لئے سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۱۳ کا حاشیہ نمبر ۲۸۱ ملاحظہ فرمایئے)

[۳۶] ❁ **ہر فرقہ اپنے ہی عقائد کا گرویدہ ہے:۔** مزید بگاڑ یہ پیدا ہو گیا کہ جو فطری حقائق تھے انہیں تو لوگوں نے درخور اعتنا ہی نہ سمجھا اور اپنی اپنی اضافہ کردہ چیزوں کا ہی گرویدہ اور مفتون ہو گیا۔ جس کی بدولت وہ دوسروں سے جدا ہو کر ایک الگ فرقہ

وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ
بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ۝ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ فَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ
يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ ۝ وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ

جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے پروردگار کی طرف رجوع[۳۷] کر کے اسے پکارتے ہیں پھر جب اللہ انہیں اپنی رحمت کا مزا چکھاتا ہے تو اس وقت ان میں سے کچھ لوگ اپنے پروردگار سے شرک[۳۸] کرنے لگتے ہیں۔(۳۳) تاکہ اس نعمت کی ناشکری کریں جو ہم نے انہیں دے رکھی ہے۔ اچھا مزے کر لو۔ جلد ہی تم (حقیقت کو) جان لو گے(۳۴) یا ہم نے ان پر کوئی سند اتاری[۳۹] ہے جو اس شرک کو صحیح بتاتی ہو جو یہ لوگ کر رہے ہیں(۳۵) اور جب ہم انہیں اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو یہ اترانے[۴۰] لگتے ہیں۔ اور جب ان کے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے

بنا تھا۔ پھر ہر فرقہ کے لوگوں میں اپنے ٹھہرائے ہوئے اصول وعقائد پر کچھ ایسا تعصب پیدا ہو گیا کہ اسے اپنے ان غیر فطری اور مہمل عقائد میں غلطی کا امکان تک تصور میں نہیں آتا تھا۔ اور ہر کوئی دوسرے فرقوں کو گمراہ قرار دینے لگا اور صرف اپنے آپ کو حق پر سمجھ کر اسی میں مگن ہو گیا۔

[۳۷] جب انسان کو موت سامنے کھڑی نظر آتی ہے یا کوئی اور سخت مشکل پیش آتی ہے تو اس وقت وہ صرف اکیلے اللہ کو پکارتا ہے بلکہ بعض دفعہ وہ بلا ادارہ اور بے اختیار اللہ کو پکارنے لگتا ہے۔ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ توحید کی پکار انسان کا فطری داعیہ ہے۔ اور اس کے دل کی گہرائیوں میں توحید کی شہادت موجود ہے۔

[۳۸] یعنی جب خوشحالی کے دن آتے ہیں تو اللہ کو تو بھول جاتا ہے اور دوسرے معبودوں یا پیروں، فقیروں کی نذریں نیازیں چڑھنا شروع ہو جاتی ہیں۔ کہ فلاں مصیبت ہم سے فلاں حضرت یا فلاں آستانے کے طفیل دور ہوئی تھی۔ یا یہ خوشحالی ہمیں فلاں حضرت کی نظرِ کرم کی وجہ سے ملی ہے۔

[۳۹] کیا ان لوگوں کے پاس کوئی ایسی دلیل ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ فلاں مصیبت سے اللہ نے نہیں بلکہ فلاں حضرت نے نجات دی تھی۔ یا یہ خوشحالی کے دن اللہ کی مہربانی سے نہیں بلکہ فلاں حضرت کی نظرِ کرم کی وجہ سے میسر آئے ہیں۔ کیا کسی آسمانی کتاب میں یہ لکھا ہوا ہے کہ اللہ نے اپنے فلاں فلاں اختیارات و تصرفات فلاں فلاں حضرت کو یا فلاں دیوتا کو یا بت کو تفویض کر دیئے ہیں اور ان کاموں کے لئے تم ان کی طرف رجوع کر سکتے ہو۔

[۴۰] ❁ انسان کی تنگ ظرفی اور چھچھوراپن:۔ اس آیت میں انسان کی ناشکری، تنگ ظرفی اور چھچھورے پن کا ذکر ہے۔ انسان کی عادت ہے کہ جب اس پر خوشحالی کے دن آتے ہیں تو پھولا نہیں سماتا۔ اس کی وضع قطع چال ڈھال اور گفتگو سے ہی اس کی نخوت کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس وقت وہ نہ اپنے خالق کو خاطر میں لاتا ہے اور نہ اس کی مخلوق کو اور یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اسے ہی سرخاب کے پر لگے ہوئے تھے جو اسے یہ عیش و آرام میسر ہے۔ پھر جب کسی وقت اس پر برے دن آجاتے ہیں۔ تو بھی اللہ

اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ﴿٣٦﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٣٧﴾ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ

تو آس توڑ بیٹھتے ہیں۔(۳۶) کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ اللہ جس کا چاہے رزق زیادہ کر دیتا ہے اور (جس کا چاہے) کم کر دیتا ہے۔ ایمان[۴۱] لانے والوں کے لئے اس میں بھی کئی نشانیاں ہیں۔(۳۷)

(اے مسلمانو!) اپنے قرابت والے کو، مسکین[۴۲] اور مسافر کو اس کا حق دو۔ یہ بات ان لوگوں کیلئے بہتر ہے

کی ناشکری ہی کرنے لگتا ہے اور اللہ کی رحمت سے مایوسی کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس مومن کی حالت اس کے بالکل الٹ ہوتی ہے۔ اس پر خوشحالی کے دن آئیں تو وہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور اس کے آگے پہلے سے زیادہ جھک جاتا ہے۔ اور جب سختی کے دن آئیں تو نہایت صبر و تحمل سے یہ زمانہ گزارتا ہے اور اللہ کا شکر ہر حال میں ادا کرتا ہے۔

[۴۱] رزق کی کمی بیشی میں اللہ کی مصلحتیں:۔ رزق کی فراخی اور تنگی تو خالصتاً اللہ کے ہاتھ میں ہے جسے چاہے وہ زیادہ دے اور جسے چاہے کم دے اور اس رزق کی کمی و بیشی میں بھی اس کی کئی مصلحتیں ہوتی ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے سورہ عنکبوت کی آیت نمبر ۶۲ کا حاشیہ) لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ رزق کی کمی بیشی کی بنا پر انسان اپنے اخلاق ہی بگاڑ لے۔ خوشحالی کا دور آئے تو پھولا نہ سمائے اور کسی کو حتی کہ اللہ کو بھی خاطر میں نہ لائے اور تنگی کا دور آئے تو اللہ کو ہی اپنے شکوؤں کا ہدف بنا لے اور اس کی رحمت سے مایوس ہو جائے۔ بلکہ صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ رزق کی کمی بیشی سے اللہ اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے اور کامیاب وہ انسان ہے جو ہر حال میں اخلاق فاضلہ کا مظاہرہ کرے۔ خوشحالی آئے تو اللہ کا شکر ادا کرے اور مزید سرنگوں ہو جائے اور تنگی کا وقت آئے تو صبر و تحمل سے کام لے اور اللہ کی رحمت کا امیدوار رہے۔ یہ اخلاقِ فاضلہ بذات خود اللہ کی ایسی نعمت ہے جو نہ کسی کافر و مشرک کو میسر آسکتی ہے اور نہ کسی دہریے کو، یہ صرف اسے میسر آتی ہے جو صرف اللہ پر ہی توکل رکھتا ہو۔

[۴۲] مال و دولت میں دوسروں کا حق:۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ قرابتداروں کو، محتاجوں کو اور مسافروں کو بطور صدقہ خیرات کچھ دے دیا کرو۔ بلکہ یوں فرمایا کہ ان کا حق انہیں ادا کرو۔ اور اس لفظ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعدد مقامات پر دہرایا ہے جس کا واضح مطلب ہے کہ تمہارے اموال میں ان قرابتداروں اور محتاجوں کا رزق بھی آگیا ہے۔ لہٰذا ان کا حق انہیں ادا کر دو۔ اور اس کی ادائیگی میں تمہارا ان پر کچھ احسان نہیں ہوگا۔ بلکہ تمہارے سر سے تمہارا اپنا بوجھ اترے گا۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ قرابت داروں سے مراد وہ رشتہ دار ہیں جن سے نکاح حرام ہے۔ لیکن اس صراحت کا کوئی خاص فائدہ معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہر شخص اپنے ناطے والوں کو خوب جانتا ہے اور سب رشتہ دار تو حقدار نہیں ہوتے بلکہ وہ حقدار ہیں جو محتاج ہوں۔ گویا سب سے پہلے وہ محتاج حقدار ہیں جو رشتہ دار ہوں، اس کے بعد عام محتاجوں کی باری آئے گی۔ اور مسافر جب راستہ میں محتاج ہو جائے تو وہ بھی حقدار ہے خواہ وہ اپنے گھر پر کتنا ہی امیر کیوں نہ ہو۔ اب دیکھئے جس معاشرہ میں ہر انسان ان مذکورہ حقداروں کے حق ادا کرتا رہے اس معاشرہ میں کوئی شخص مفلس اور قلاش رہ سکتا ہے؟

لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۠ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

جو اللہ کی رضا چاہتے ہیں اور یہی لوگ کامیاب[۴۳] ہوں گے۔(۳۸)

اور جو کچھ تم بطور سود دیتے ہو کہ لوگوں کے اموال سے تمہارا مال بڑھتا رہے تو ایسا مال اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا[۴۴]، اور جو کچھ تم اللہ کی رضا چاہتے ہوئے بطور زکوۃ دیتے ہو۔ تو ایسے ہی لوگ اپنے مال کو

[۴۳] مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مذکورہ حقوق ادا نہیں کرتے وہ فلاح نہیں پا سکتے۔ فلاح صرف وہ پا سکتے ہیں جو مذکورہ حقداروں کو ان کے حقوق ادا کریں۔ اور اللہ کی رضامندی کے لئے ادا کریں۔ ان پر احسان رکھ کر نہ کریں، نہ ہی ان سے کسی قسم کے شکریہ یا بدلہ کے طلبگار ہوں۔

[۴۴] سود سے قومی معیشت تباہ ہوتی اور زکوۃ سے پھلتی پھولتی ہے:۔ یہ پہلی آیت ہے جو سود کی مذمت کے سلسلہ میں نازل ہوئی، پھر سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۳۰ کی رو سے مسلمانوں کو سود در سود سے روک دیا گیا۔ پھر آپ ﷺ کی وفات سے چار ماہ پیشتر سورہ بقرہ کی آیات نمبر ۲۷۵ تا ۲۸۱ کی رو سے مکمل طور پر حرام قرار دے دیا گیا۔ چونکہ شراب کی طرح سود بھی اہل عرب کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ لہٰذا ایسی برائیوں کا کلی استیصال بتدریج ہی ممکن تھا۔

اب اصل مسئلہ کی طرف آیئے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ سود سے مال بڑھتا ہے۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ کسی بھی معاشرہ میں دولت مندوں کی تعداد غریبوں کی تعداد کی نسبت بہت قلیل ہوتی ہے اور سود لینے والے دولت مند ہوتے ہیں اور دینے والے غریب اور محتاج۔ اب سود سے فائدہ تو ایک شخص اٹھاتا ہے اور نقصان سینکڑوں غریبوں کا ہو جاتا ہے۔ اور اللہ کی نظروں میں اس کی سب مخلوق یکساں ہے بلکہ اسے دولتمندوں کے مفاد سے غریبوں کے مفادات زیادہ عزیز ہیں۔ اور سود خور سود کے ذریعہ بے شمار غریبوں کا مال کھینچ کر انہیں مزید مفلس اور کنگال بنانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ تو اسی حقیقت کو اللہ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ سود کے ذریعہ مال بڑھتا نہیں بلکہ گھٹتا ہے۔ یہ اس مسئلہ کا ایک پہلو ہوا اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ علم معیشت کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے۔ کہ جس معاشرہ میں دولت کی گردش جتنی زیادہ ہو گی اتنا ہی وہ معاشرہ خوشحال ہو گا اور اس کی قومی دولت میں اضافہ ہو گا۔ اور اگر دولت کا بہاؤ غریب سے امیر کی طرف ہو گا تو یہ گردش بہت کم ہو جائے گی۔ کیونکہ امیر طبقہ کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے بھی سود قومی معیشت پر تباہ کن اثر ڈالتا ہے۔ اور اگر دولت کا بہاؤ امیر سے غریب کی طرف ہو اور یہ بات صرف زکوۃ و صدقات کی صورت میں ہی ممکن ہوتی ہے، تو دولت کی گردش تیز ہو جائے گی۔ کیونکہ ایک تو غریبوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے دوسرے ان کی ضروریات محض پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے اٹکی ہوتی ہیں۔ لہٰذا دولت کی گردش میں تیزی آنے کی وجہ سے ایک تو سارا معاشرہ خوشحال ہو جائے گا دوسری قومی معیشت پر بھی خوشگوار اثر پڑے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا: ﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ﴾ (۲:۲۷۶) یعنی جس معاشرہ میں سود کا رواج ہو گا اس میں برکت نہیں رہے گی وہ بالآخر قلاش ہو جائے گا۔ غریب طبقہ کی تعداد دن بدن بڑھتی جائے گی اور وہ اپنا پیٹ پالنے کی خاطر امیر طبقہ پر جائز اور ناجائز طریقوں سے حملہ آور ہو کر ان کا مال ان سے چھین لے اور اس غرض

الْمُضْعِفُوْنَ ﴿۳۹﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ هَلْ مِنْ
ع ۴ شُرَكَاۗىِٕكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۴۰﴾ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ

دگنا چوگنا کر رہے[۴۵] ہیں۔(۳۹) اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، روزی دی، پھر تمہیں موت دے گا، پھر تمہیں زندہ کرے گا۔ کیا تمہارے شریکوں میں بھی کوئی ایسا ہے جو ان میں سے کوئی بھی کام کر سکتا ہو[۴۶]۔ وہ پاک ہے اور جو کچھ وہ شریک ٹھہراتے ہیں ان سے بالاتر ہے۔(۴۰) بحر و بر میں فساد پھیل گیا ہے جس کی وجہ

کے لئے اگر اس کا کام چوری اور ڈاکہ، لوٹ مار سے چلتا ہے تو ٹھیک ورنہ وہ قتل و غارت سے بھی کبھی دریغ نہ کرے گا۔

❁ اسلامی نظام معیشت کی بنیاد دو چیزیں:۔ اسلامی اقتصادیات یا اسلامی نظام معیشت پر بڑی لمبی چوڑی تصانیف بازار میں دستیاب ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اسلامی نظام معیشت کے بنیادی اصول صرف دو ہی ہیں۔ ایک ملک سے سود کا خاتمہ اور دوسرے اس کے بجائے نظام زکوٰۃ و خیرات کی ترویج۔ سود ہی وہ لعنت ہے جو نظام سرمایہ داری کی جان ہے۔ اس کے خاتمہ سے نظام سرمایہ داری کی جان از خود نکل جاتی ہے۔ رہی سہی کسر اسلام کا قانون میراث نکال دیتا ہے۔ سود کے خاتمہ کے بعد جب نظام زکوٰۃ و صدقات اس کی جگہ لے لیتا ہے تو طبقاتی تقسیم از خود ختم ہو جاتی ہے۔ اور معاشرہ خوشحال بن جاتا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے معاشیات کی کتابیں پڑھنے اور اس کے اصول سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ صرف تجربہ کی ضرورت ہے اور یہ تجربہ ہر انسان کم از کم اپنے خاندان میں کر کے اس کے ثمرات و برکات کو بچشم خود ملاحظہ کر سکتا ہے۔ اگرچہ اتنے چھوٹے پیمانے پر سود کے خاتمہ اور زکوٰۃ و خیرات کی ترویج سے پورے ثمرات تو حاصل نہیں ہو سکتے تاہم ایسے خاندان کی حالت پہلے سے بدرجہا بہتر ہو سکتی ہے۔ غریب کی امیر سے نفرت۔ حسد اور کینہ وغیرہ جیسے قبیح جذبات ماند پڑ جاتے ہیں۔ اور ان کی جگہ مروت، ہمدردی اور اخوت جیسی اعلیٰ قدریں پیدا ہونے لگتی ہیں جس سے ایک طرف تو معاشرہ میں کشیدگی کے بجائے محبت کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے دولت کی ناہموار تقسیم میں خصوصی کمی واقع ہو جاتی ہے جس سے معاشرہ کے ہر فرد کو کم از کم بنیادی ضروریات ضرور مہیا ہوتی رہتی ہیں۔

[۴۵] ❁ زکوٰۃ سے مال کیسے بڑھتا ہے؟ اس کا ایک مطلب تو اوپر بیان ہو چکا ہے کہ جو لوگ اللہ کی رضا کی خاطر زکوٰۃ و خیرات دیتے ہیں تو وہ معاشرہ خوشحال ہو جاتا ہے۔ غریبوں کی قوت خرید بڑھ جاتی ہے جس کا فائدہ بالآخر پھر دولت مند تاجروں اور صنعت کاروں کو ہی پہنچتا ہے اور اس طرح انہیں جو فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ سود پر روپیہ دینے کی نسبت بہت زیادہ ہو جاتا ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر جو لوگ صدقات و زکوٰۃ ادا کرتے ہیں انہیں قیامت کو اس سے بہت زیادہ اجر ملے گا۔ یہ اجر دس گنا بھی ہو سکتا ہے۔ ستر گنا بھی سات سو گنا بھی بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اور اس اجر کی کمی بیشی کے لئے بھی اللہ کے ہاں چند اصول ہیں۔ مثلاً جس محتاج کی ضرورت پوری کی گئی وہ کس حد تک ضرورت مند تھا۔ خرچ کرنے والے کی نیت میں خلوص کتنا تھا۔ اور پھر اس نے یہ نیکی کرنے کے بعد کوئی ایسا کام تو نہیں کیا جس سے وہ اپنا اجر ضائع کر دے۔ یا خرچ کرتے وقت کچھ ریا کا عنصر تو شامل نہیں تھا اور خرچ کرتے وقت شریعت کی ہدایات کو ملحوظ رکھا گیا تھا یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

[۴۶] یعنی جب تمہارے بنائے ہوئے معبودوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس نے تمہیں پیدا کیا ہو یا تمہارے رزق کا ذمہ دار ہو یا تمہیں مار سکتا ہو یا تمہیں دوبارہ زندگی بخش سکتا ہو تو پھر آخر یہ ہیں کس کام کے؟ اور کس لحاظ سے تم انہیں اللہ کے

وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۴۱﴾

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ ﴿۴۲﴾

لوگوں کے اپنے کمائے[۴۷] ہوئے اعمال ہیں۔ تاکہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کے کچھ اعمال[۴۸] کا مزا چکھادے۔ شاید وہ ایسے کاموں سے باز آجائیں(۴۱) آپ ان سے کہئے: ذرا زمین میں چل پھر کر تو دیکھو کہ جو لوگ تم سے[۴۹] پہلے تھے ان کا انجام کیسا ہوا؟ ان میں اکثر مشرک ہی تھے۔(۴۲)

شریک بناتے ہو؟ واضح رہے کہ مشرکین مکہ ان چار باتوں میں سے پہلی تین باتوں کے قائل تھے کہ جو امور اس آیت میں مذکور ہوئے ہیں۔ یہ صرف اللہ ہی کے کارنامے ہیں اور ان میں ان کے معبودوں کا کوئی حصہ نہیں۔

[۴۷] فسادفی الارض کا اصل سبب:۔ یہاں بر و بحر سے مراد پورا مشرق وسطی بھی ہو سکتا ہے جو ان دنوں روم اور فارس کی جنگوں کی وجہ سے ظلم اور فساد کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اور عرب کا علاقہ بھی۔ کیونکہ اکثر عربی قبائل کا پیشہ ہی مار دھاڑ، لوٹ کھسوٹ اور قتل وغارت تھا۔ اور اس فساد سے محفوظ اگر کوئی جگہ تھی تو وہ صرف حرمِ مکہ کی حدود تھیں۔ اور اس ظلم و فساد اور طغیانی کی اصل وجہ یہی تھی کہ وہ لوگ نہ بعث بعد الموت کے قائل تھے اور نہ اللہ کے حضور پیش ہو کر اپنے اعمال کی جواب دہی اور جزاء وسزا کے۔ لہٰذا ہر شخص اپنے ذاتی اور دنیوی مفادات کی خاطر دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے ہر وقت مستعد رہتا تھا اور نتیجتاً یہ سرزمین ظلم وجور سے بھر گئی تھی۔

[۴۸] یعنی یہ فساد ان کی اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ظہور پذیر ہوا تھا۔ اور یہ ان کے اعمال کا بدلہ تھا۔ بلکہ اللہ کی طرف سے تھوڑا سا بدلہ تھا۔ اور اس تھوڑے سے بدلہ سے عام لوگ سخت پریشان حال تھے اور ان کے لئے زندگی اجیرن بن گئی تھی۔ اور یہ تھوڑی سی سزا اللہ نے انہیں اس لئے دی کہ شاید اب بھی وہ غور کر کے اس ظلم و فساد کی اصل وجہ تلاش کر لیں۔ اور اصل دین فطرت کی طرف لوٹ آئیں۔ آخرت کی جوابدہی سے ڈر جائیں اور اللہ کے فرمانبردار بن جائیں۔

[۴۹] ہر قسم کے فساد کی اصل وجہ شرک اور یومِ آخرت سے انکار ہے:۔ سابقہ اقوام کی تباہی کا اصل سبب شرک تھا۔ اب مشرکین میں سے اکثر تو ایسے ہوتے ہیں جو روزِ آخرت کے منکر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ مشرکینِ مکہ کا حال تھا اور اگر ان کا آخرت پر عقیدہ ہو بھی تو پھر وہ اس عقیدہ میں کچھ ایسے اضافے کر لیتے ہیں جو عقیدہ آخرت کے اصل مقصد کو بے کار کر کے رکھ دیتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی کا یہ عقیدہ ہو کہ ہم قیامت کے دن فلاں حضرت کا دامن پکڑ لیں گے اور ان کے ساتھ ہی جنت میں جا داخل ہوں گے۔ یا مثلاً فلاں پیر صاحب کی بیعت کر لی جائے تو ان کی شفاعت سے ہم نجات پا جائیں گے یا یہ کہ فلاں بزرگ کے مزار پر جو بہشتی دروازہ بنا ہوا ہے اس کے عرس کے دن اگر گزرا جائے تو بہشت واجب ہو جائے گی۔ اب دیکھئے کہ اگر سستی نجات کے اس قسم کے عقیدے اپنا لئے جائیں تو اللہ کے سامنے اپنے اعمال کی جوابدہی کا کچھ خوف باقی رہ جاتا ہے۔ پھر ایسے مشرکوں میں اور عقیدہ آخرت کے منکر مشرکوں میں کتنا فرق باقی رہ جاتا ہے؟ عقیدہ آخرت کا صحیح تصور ہی انسان کو گناہوں سے باز رکھ سکتا ہے ورنہ انسان گناہوں پر دلیر ہو جاتا ہے۔ پھر یہی گناہ افراد اور اقوام کی تباہی کا باعث بن جاتے ہیں۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ يَوْمَئِذٍ
يَّصَّدَّعُوْنَ ﴿۴۳﴾ مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ﴿۴۴﴾ لِيَجْزِيَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ

پس (اے نبی!) اپنی توجہ درست اور متوازن دین کی طرف[۵۰] مرکوز کیجئے بیشتر اس کے کہ وہ دن آ جائے جس کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ٹلنے کی کوئی صورت[۵۱] نہیں ہے۔ اس دن لوگ پھٹ[۵۲] کر الگ الگ ہو جائیں گے (۴۳) جس نے کفر کیا تو اس کا وبال اسی پر ہے اور جس نے نیک عمل کئے تو وہ اپنی ہی (فلاح کی) راہ ہموار کر رہے ہیں۔ (۴۴) تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے انہیں اپنی مہربانی[۵۳] سے اس کا بدلہ دے۔ وہ یقیناً کافروں کو پسند نہیں کرتا۔ (۴۵) اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ---------

[۵۰] لہٰذا اے نبی! اور اے مسلمانو! مشرکوں کے ان تمام لغویات سے منہ موڑ کر دین فطرت کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ کیونکہ ہر طرح کی خرابیوں اور فسادات کی جڑ یہ شرک ہی ہے۔ اور ان کا علاج صرف یہی ہے کہ اپنی تمام تر توجہ اللہ کی طرف مبذول کر لو اور اسی پر توکل رکھو۔

[۵۱] یعنی جیسے موت ایک اٹل حقیقت ہے اور اسے کوئی بھی اپنے سے ٹال نہیں سکتا اور نہ اس کے وقت میں تقدیم و تاخیر ہو سکتی ہے۔ اسی طرح قیامت بھی ایک اٹل حقیقت ہے جو نہ کسی کے ٹالے ٹل سکتی ہے نہ کوئی اسے اپنے آپ سے ٹال سکتا ہے اور نہ ہی اس میں تقدیم و تاخیر ممکن ہے اور ان دونوں حقیقتوں میں مناسبت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو کوئی مر گیا تو اسی دن اس کی قیامت قائم ہو گئی۔ (مشکوٰۃ کتاب الفتن۔ باب فی قرب الساعة وان من مات فقد قامت قیامته) بالفاظ دیگر اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اپنے مرنے سے پہلے پہلے شرکیہ عقائد سے کلیتاً دستبردار ہو کر دین فطرت کی طرف آ جاؤ۔

[۵۲] یعنی کسی کافر کو یہ مجال نہ ہو گی کہ وہ مسلمانوں کی جماعت میں جا ملے۔ یا اگر پہلے ملا ہے تو وہیں رہ جائے بلکہ سب لوگ مجبور ہوں گے کہ اپنے سے تعلق رکھنے والی جماعت میں فوراً جا شامل ہوں۔ اور یہ کام اتنی سرعت سے ہو گا جیسے کوئی اکٹھا مجمع فوراً پھٹ کر کئی حصوں میں بٹ جائے۔

[۵۳] ❁ جنت میں داخلہ استحقاق کی بنا پر نہیں بلکہ محض اللہ کے فضل سے ہو گا: ایمان والوں اور نیک لوگوں کو بھی جنت میں داخلہ کسی استحقاق کی بنا پر نہیں ملے گا بلکہ محض اللہ کے فضل یعنی اصل بدلہ سے زائد اجر کے طور پر ملے گا۔ کیونکہ دنیا میں انسان نے اگر اللہ کا شکر ادا کیا یا اس کا فرمانبردار بن کر رہا تو اس سے تو اللہ کے سابقہ احسانات کا بدلہ پورا نہیں ہوتا اب مزید کیسا؟ یہ اجر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیں گے تو محض اس لئے کہ انہوں نے جو بھی کام کئے تھے اللہ کی رضا کی خاطر کئے تھے اور اللہ ان سے راضی ہو کر زائد بدلہ خاص اپنی مہربانی سے جنت کی صورت میں عطا کرے گا۔ چنانچہ سیدنا ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "کسی شخص کو اس کا عمل بہشت میں نہیں لے جائے گا" صحابہ نے

يُّرْسِلَ الرِّيٰحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ
فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ۭ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ

ہے کہ وہ ہواؤں[۵۴] کو خوشخبری دینے والی بنا کر بھیجتا ہے اور اس لئے کہ تمہیں اپنی رحمت سے لطف اندوز کرے، نیز اس لئے کہ اس کے حکم سے کشتیاں رواں ہوں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکر گزار بنو۔(۴۶)

اور آپ سے پیشتر ہم نے کئی رسول ان کی قوموں کی طرف بھیجے جو روشن دلیلیں[۵۵] لے کر ان کے پاس آئے۔ پھر جو لوگ مجرم تھے ہم نے ان سے انتقام لے لیا اور مومنوں کی مدد کرنا ہمارا حق تھا۔(۴۷) اللہ وہ ہے جو

عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا آپ کے اعمال بھی؟ (آپ ﷺ کو جنت میں نہیں لے جائیں گے ؟) فرمایا: ''ہاں میرے اعمال بھی مجھے جنت میں نہیں لے جائیں گے، اِلا یہ کہ اللہ اپنے فضل اور اپنی رحمت سے مجھے ڈھانپ لے'' (بخاری۔ کتاب المرضیٰ۔ باب تمنی المریض الموت)

[۵۴] ❁ ہواؤں کے فائدے:۔ قرآن میں جہاں بھی ارسال الریاح کے الفاظ مذکور ہوں (یعنی ریح کا لفظ جمع کے صیغہ میں ہو) تو اس سے مراد خوشگوار ہوائیں ہوتی ہیں اس آیت میں دو قسم کی خوشگوار ہواؤں اور ان کے فوائد کا ذکر کیا۔ ایک باران رحمت سے پہلے دلوں کو فرحت بخشنے والی اور بارش کی بشارت دینے والی ہوائیں، جس سے زمین سیراب ہوتی ہے اور اس بارش میں طرح طرح کے فائدے ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ موافق ہوائیں جو کشتیوں اور جہازوں کے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ پہلے زمانہ میں تو رواج ہی بادبانی کشتیوں کا تھا جن کے چلنے کا زیادہ تر انحصار باد موافق پر ہی ہوتا ہے۔ آج دخانی کشتیوں اور جہازوں کا دور ہے۔ پھر بھی بادِ موافق اور باد مخالف کا دن دخانی کشتیوں اور جہازوں پر خاصا اثر پڑتا ہے یہ کشتیاں جو باد موافق کے سہارے چلتی ہیں ان میں تم سفر ہی نہیں کرتے بلکہ اپنا تجارتی سامان بھی ایک ملک سے دوسرے ملک میں لے جا کر خوب نفع کماتے ہو۔ یہ ہوائیں تو اللہ ہی بھیجتا ہے۔ پھر کیا تم اس کی اس نعمت کا شکر بھی ادا کرتے ہو؟ اللہ کی ان مہربانیوں کا تقاضا تو یہی ہے کہ اس کا شکر ادا کیا جائے۔

[۵۵] وہ روشن دلیلیں کیا تھیں؟ وہ اللہ کی کتاب تھی، رسولوں کی اپنی پاکیزہ سیرت تھی جسے اللہ تعالیٰ نے ان کی نبوت کے ثبوت کے طور پر پیش کیا۔ پھر ان نبیوں نے ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جو احکامِ الٰہی کا چلتا پھرتا عملی نمونہ تھا۔ اللہ کی کتاب میں اللہ کی ہر سو بکھری ہوئی نشانیوں میں غور و فکر کی دعوت دی گئی تھی۔ کتاب کی آیات کائناتی آیات کی تائید کرتی تھیں اور کائناتی آیات کتاب کی آیات کی تائید کرتی تھیں۔ یہ دونوں قسم کی نشانیاں ایک دوسری کی تائید و تصدیق کرتی تھیں۔ پھر بھی لوگ اس نبی پر ایمان نہ لائے اور اکڑ گئے۔ الٹا ایمان لانے والوں پر ستم ڈھانا شروع کر دیئے۔ پھر جب ان کی سرکشی بڑھتی ہی گئی تو ہم نے ایمانداروں کو تو بچا لیا اور انہیں بچا لینا ہی ہماری ذمہ داری بھی تھی۔ اور مجرم لوگوں کو تباہ کر ڈالا۔

يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى
الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۸﴾
وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ
كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾ وَلَىِٕنْ
اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ ﴿۵۱﴾ فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ

ہوائیں بھیجتا ہے تو وہ بادل کو اٹھالاتی ہیں۔ پھر اللہ جیسے چاہتا ہے اس بادل کو آسمان میں پھیلا دیتا ہے اور اسے ٹکڑیاں بنا دیتا ہے پھر تو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے اس میں سے نکلتے آتے ہیں پھر جب اللہ اپنے بندوں [۵۶] میں سے جن پر چاہے بارش برسا دیتا ہے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں۔ (۴۸) حالانکہ وہ اس بارش کے برسنے سے پہلے مایوس ہو چکے تھے۔ (۴۹) اب اللہ کی اس رحمت کے نتائج پر غور کیجئے کہ وہ کیسے زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کر دیتا ہے۔ یقیناً وہی مُردوں کو زندگی بخشنے والا ہے اور وہی ہر ایک چیز پر قادر ہے (۵۰) اور اگر ہم ایسی ہوا بھیج دیں جس کے اثر سے وہ اپنی کھیتی کو زرد پڑتا دیکھیں تو اس کے بعد [۵۷] وہ کفر بکنے لگ جاتے ہیں۔ (۵۱) (اے نبی!) آپ نہ تو مُردوں کو سنا سکتے ہیں اور نہ بہروں کو اپنی پکار سنا سکتے ہیں

[۵۶] بارش برسنے کے عمل میں اللہ کی قدرتیں اور حکمتیں:۔ اس ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کئی نشانیاں بیان فرما دیں مثلاً ہوا جو ایک کنکر کا بوجھ بھی برداشت نہیں کر سکتی اور کنکر زمین پر آ پڑتا ہے مگر یہ ہوا آبی بخارات کو ایک کاغذ کے پرزے کی طرح اپنے دوش پر اٹھائے پھرتی ہیں۔ وہ آبی بخارات جن میں کروڑوں ٹن پانی موجود ہوتا ہے۔ اور اس وزن کا اندازہ زمین کے اس رقبہ سے لگایا جا سکتا ہے جس میں یہ بارش ہوئی اور جتنے انچ بارش ہوئی۔ دوسری یہ کہ ان باربردار ہواؤں کا رخ طبیعی طور پر متعین نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ جس طرف خود چاہے اسی طرف ہی موڑ دیتا ہے اس لئے جہاں چاہتا ہے وہیں بارش ہوتی ہے دوسرے علاقہ میں نہیں ہوتی۔ تیسری یہ کہ جب یہ بادل کسی ایسے ٹھنڈے فضائی علاقے میں پہنچتے ہیں جو آبی بخارات کو پھر سے پانی میں منتقل کر سکیں تو وہاں بھی بادلوں کا سارا پانی یک لخت پانی بن کر زمین پر نہیں گر پڑتا، بلکہ قطرہ قطرہ بن کر گرتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر برودت زیادہ ہو تو بھی وہ قطرے ہی اولے بن کر گرتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ زیادہ سردی کی وجہ سے یک لخت سارا پانی بن کر ایک ہی دفعہ کسی جگہ پر گر پڑے۔ اور اس میں اللہ کی بہت سی حکمتیں ہیں۔

❁ بارش کے خوشگوار نتائج:۔ بارش سے پہلے زمین کا یہ حال تھا کہ دھول اڑتی پھرتی تھی۔ درختوں کے پتوں پر گرد و غبار پڑا تھا۔ بارش ہوتی ہے درخت دھل جاتے ہیں۔ زمین لہلہانے لگتی ہے۔ گویا اسے نئی زندگی مل گئی۔ پھر کئی قسم کے جاندار بھی بارش میں پیدا ہو کر بولنے اور چلنے پھرنے لگتے ہیں۔ ایک بہار آ جاتی ہے جس سے دل مسرور ہو جاتے ہیں اور ساتھ ہی تمام مخلوق کی روزی کا سامان بھی میسر آنے لگتا ہے۔ اور انسان جو برسات سے پیشتر مایوسی کا شکار ہو رہا تھا۔ پھر سے خوش ہو کر پھولنے اور اترانے لگتا ہے۔

[۵۷] ❁ نعمت اور زوالِ نعمت پر ایک دنیادار کا کردار:۔ پھر اس کے بعد جب خزاں کا موسم آتا ہے۔ اور نباتات سرد پڑنے لگتی ہے تو انسان پھر سے مایوس ہو جاتا ہے اور اللہ کے حق میں کفریہ کلمات بکنے اور شکوے شکایات کرنے لگ جاتا ہے۔

الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ

بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۵۳﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ع ۵

ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ﴿۵۴﴾

جبکہ وہ پیٹھ پھیرے بھاگے جا رہے ہوں۔(۵۲) اور نہ ہی آپ اندھوں کو ان کی گمراہی سے نکال کر ہدایت دے سکتے ہیں۔ آپ تو صرف انہیں سنا سکتے ہیں جو ہماری آیات [۵۸] پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ سر تسلیم خم کر دیتے ہیں (۵۳)

اللہ وہ ہے جس نے تمہیں کمزور سی حالت سے پیدا کیا۔ پھر اس کمزوری کے بعد تمہیں قوت بخشی پھر اس قوت کے بعد تمہیں کمزور اور بوڑھا بنا دیا [۵۹]۔ وہ جیسے چاہے [۶۰] پیدا کرتا ہے اور وہ سب کچھ جاننے والا اور قدرت والا ہے۔(۵۴)

ان آیات میں دراصل ایک دنیادار اور خدا فراموش انسان کی فطرت بیان کی گئی ہے کہ جب کسی دنیادار پر اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے تو اس وقت خوش تو ہوتا ہے مگر اللہ کا شکر پھر بھی ادا نہیں کرتا اور جب نعمت کے زوال کا وقت آتا ہے تو اس وقت اسے اللہ یاد تو آتا ہے مگر شکر گزاری کے لئے نہیں بلکہ اسے کفریہ اور ناشکری کے کلمات کا ہدف بنانے کے لئے۔ نعمت ملنے پر اللہ کا احسان ماننے کے لئے تو قطعاً تیار نہ تھا۔ زوال نعمت پر اور بھی برگشتہ ہو گیا اور اللہ کو کوسنے لگ گیا کہ اس نے ہم پر کیسی یہ مصیبت ڈال دی ہے۔

ان آیات میں ایک لطیف اشارہ بھی پایا جاتا ہے۔ یعنی جب اللہ کے رسول اس کی طرف سے پیام رحمت لاتے ہیں تو لوگ اس کی بات نہیں مانتے اور اس نعمت کو ٹھکرا دیتے ہیں پھر جب ان کے کفر کی پاداش میں اللہ تعالیٰ ان پر ظالموں اور جباروں کو مسلط کر دیتا ہے اور وہ جو ظلم و ستم ڈھاتے ہیں تو وہی لوگ اللہ کو گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں اور اس پر الزام یہ دیتے ہیں کہ اس نے کیسی ظلم و جور سے بھری ہوئی دنیا بنا ڈالی ہے۔

[۵۸] اس سورہ کی آیات نمبر ۵۲، ۵۳ اور سورۂ نمل کی آیات نمبر ۸۰، ۸۱ کے الفاظ تک آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ لہٰذا انہی آیات کے حواشی ملاحظہ فرما لئے جائیں۔

[۵۹] ❁ زندگی کے سب مراحل اضطراری ہیں:۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی وہ تدریجی حالتیں بیان فرمائی ہیں جن میں مجبور محض ہوتا ہے اور اپنے اختیار سے ان حالتوں میں خود کوئی تبدیلی لانا ممکن نہیں ہے، پیدا ہوتا ہے تو اس قدر کمزور کہ کسی بھی جاندار کا بچہ اتنا کمزور پیدا نہیں ہوگا۔ ہر جاندار کا بچہ پیدا ہوتے ہی چلنے پھرنے لگتا ہے مگر انسان کا بچہ چلنا تو درکنار بیٹھ بھی نہیں سکتا اور چلنے کی نوبت تو ڈیڑھ دو سال بعد آتی ہے۔ پھر اس کے بعد اس پر بلوغت اور جوانی کا دور آتا ہے تو وہ جسمانی طور پر طاقتور اور مضبوط ہوتا ہے۔ اس کے قوائے عقلیہ، اس کا فہم و شعور سب جوبن پر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اس پر انحطاط کا دور آتا ہے۔ قوتیں جواب دینے لگتی ہیں۔ اعضاء مضمحل ہونے لگتے ہیں۔ کئی طرح کے عوارض اور بیماریاں اسے آگھیرتی ہیں حتیٰ کہ اس کی عقل بھی زائل ہونا شروع ہو جاتی ہے اور یہ سب ایسے مدارج زندگی ہیں جن سے انسان کو نہ کوئی مفر ہے اور نہ ان میں تبدیلی لا سکتا ہے وہ لاکھ چاہے کہ بڑھاپے کے بعد پھر اس پر جوانی کا دور آئے وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ جس تدریج کے ساتھ اللہ اسے ان مراحل سے گزارتا ہے۔ اسے بہر حال گزرنا پڑتا ہے۔

[۶۰] ❁ طبعی امور کے علاوہ اللہ کی مشیت سے اختلافی حالات:۔ مندرجہ بالا مراحل ایسے تھے جو طبعی تقاضے تھے جو سب

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ۭ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ۡ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ

اور جس دن قیامت قائم ہوگی تو مجرم لوگ قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ: ''ہم تو ایک گھڑی [۶۱] سے زیادہ نہیں ٹھہرے تھے'' اسی طرح وہ (دنیا میں بھی) غلط اندازے لگایا کرتے تھے (۵۵) اور جنہیں علم اور ایمان دیا گیا تھا وہ کہیں گے: تم تو اللہ کے نوشتہ کے مطابق روزِ حشر [۶۲] تک پڑے رہے۔ سو یہی ہے حشر کا دن لیکن تم تو اسے (حق) نہ جانتے تھے۔ (۵۶) پس اس دن ظالموں کو نہ ان کی معذرت کچھ فائدہ دے گی اور نہ ہی ان سے یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ اپنے [۶۳] پروردگار کو راضی کر لیں (۵۷)

کے لئے یکساں ہیں پھر کچھ ایسے امور ہیں جن میں اللہ تعالیٰ خاص انسانوں کو خاص صفات سے نوازتا ہے وہ چاہے تو کسی کو کمزور الخلقت پیدا کر دے اور اس کے اعضاء کی نشوونما کی رفتار بہت کم رہ جائے۔ چاہے تو کسی کو بونا بنادے۔ کسی کو مادرزاد اندھا پیدا کر دے کسی کو بلا کا عقل و فہم عطا کر دے۔ اور اسے ذہین و فطین بنادے اور چاہے تو کسی کو بلید الذہن پیدا کر دے پھر چاہے تو کسی پر جوانی اور بڑھاپے کے مراحل آنے ہی نہ دے اور بچپن میں ہی اسے موت سے دوچار کر دے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک بوڑھا کھوسٹ بسترِ مرگ پر سال ہا سال ایڑیاں رگڑتا رہے مگر اسے موت نہ آئے۔ اور چاہے تو کسی کو لمبی عمر بھی عطا کرے اور تندرست و صحت یاب بھی رکھے۔ یہ سب امور اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں اور انسان کا ان میں کچھ بھی اختیار نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کس شخص کو کس حال میں رکھنا ہے؟

[۶۱] ۞ کافروں کے اندازے دنیا میں بھی غلط اور آخرت میں بھی غلط ہوں گے:۔ یہ مدت دنیا کی بھی ہو سکتی ہے اور عالم برزخ کی بھی اور دونوں کی بھی۔ اگرچہ مجرموں کو قبر میں بھی عذاب ہوتا ہے مگر یہ عذاب اخروی عذاب کے مقابلہ میں اتنا ہلکا ہوتا ہے کہ مجرم لوگ اس عذاب قبر کو بھی راحت کی گھڑیاں ہی تصور کریں گے۔ قیامت میں اپنا انجام اور اپنے لئے عذاب دیکھ کر قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم محض ایک گھڑی دنیا میں رہے تھے کیا اچھا ہوتا کہ اتنا تھوڑا سا وقت ہم اللہ کی فرمانبرداری میں گزار لیتے اور یہ برادن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ وہاں تو ان کا یہ اندازہ ہوگا اور دنیا میں وہ ایسے اندازے لگاتے ہیں اور ایسے کام کرتے ہیں جیسے انہیں اس دنیا میں ہمیشہ کے لئے رہنا ہے۔ اللہ سے بھی غافل ہیں اور اپنی موت سے بھی۔ دنیا میں بھی ان کے اندازے غلط اور سراسر باطل تھے۔ آخرت میں بھی غلط ہی اندازے لگائیں گے۔

[۶۲] ان کی ایسی قسمیں سن کر ایمان دار انہیں کہیں گے کہ یہ گھڑی دو گھڑی کا معاملہ نہیں تم دھوکہ میں پڑے ہوئے ہو۔ اللہ کے علم یا لوح محفوظ میں نوشتہ کے مطابق تم قیامت کے دن تک ٹھہرے رہے اور دیکھو یہ آج قیامت کا دن ہے اور یہ وہی دن ہے جسے تم ماننے کو قطعاً تیار نہ تھے۔ اور تم اسے جاننا چاہتے بھی نہ تھے۔

[۶۳] قیامت کا دن دنیا میں کئے ہوئے اعمال کے بدلہ کا دن ہوگا، عذر معذرت کا دن نہیں ہوگا۔ دنیا میں تو انہیں کہا جاتا تھا

يَسْتَعْتَبُوْنَ ۝۵۷ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۭ وَلَىِٕنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ

لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ۝۵۸ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِ الَّذِيْنَ

لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۵۹ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ۝۶۰ ع ۶ ۹

ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہر طرح کی مثالیں بیان[۶۴] کر دیں ہیں۔ اور اگر آپ ان کے پاس کوئی معجزہ بھی لے آئیں تو کافر لوگ یہی کہیں گے کہ تم تو جعلسازی کر رہے ہو (۵۸) اسی طرح اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے دلوں پر مہر[۶۵] لگا دیتا ہے جو (حق بات کو) نہیں سمجھتے (۵۹) لہٰذا آپ صبر کیجئے۔ اللہ کا وعدہ سچا[۶۶] ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جو لوگ یقین نہیں کرتے وہ آپ کو ہلکا بنا دیں[۶۷]۔ (۶۰)

کہ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لو۔ توبہ استغفار کر لو اور اپنے پروردگار کو راضی اور خوش کر لو۔ لیکن اس دن ان ظالموں کو یہ بات بھی کوئی نہ کہے گا۔ کیونکہ عذر معذرت اور توبہ تائب کا وقت صرف دنیا میں ہے اور موت تک ہے۔

[۶۴] یعنی موت کے بعد دوسری زندگی میں پیش آنے والے ہر طرح کے حالات سے قرآن کے ذریعہ لوگوں کو خبردار کر دیا ہے۔ اب بھی اگر کوئی بدبخت اپنے انجام سے بے خبر رہنا چاہتا ہے تو اس کی مرضی ہے۔ اللہ نے تو ہر طرح سے لوگوں پر حجت تمام کر دی ہے اور ان بدبختوں کی تو یہ حالت ہو چکی ہے کہ اگر آپ انہیں کوئی حسی معجزہ بھی دکھا دیں تو یہ کہنے لگیں گے کہ یہ بھی کوئی شعبدہ اور فریب کاری ہی معلوم ہوتی ہے جسے پیغمبر اور اس کے پیروکاروں نے ملی بھگت سے لوگوں کے سامنے پیش کر دیا ہے اور وہ آپس میں ہی ایک دوسرے کی تائید و توثیق کر کے دوسروں کو الو بنا رہے ہیں۔

[۶۵] یعنی جب لوگوں کا بغض و عناد، ضد اور ہٹ دھرمی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ کوئی سچی بات قبول کرنے کو تیار نہ ہوں تو عین یہی وقت ہوتا ہے جب اللہ ایسے لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب ان لوگوں میں حق کو قبول کرنے کی استعداد ختم ہو چکی ہے۔

[۶۶] اللہ کا یہ وعدہ اس سورہ کی آیت نمبر ۴۷ میں گزر چکا ہے اور وہ یہ ہے ﴿حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ یعنی اللہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مومنوں کی مدد کرے۔ آپ کفار کی ایذاؤں پر صبر کیجئے خود بھی اور مسلمانوں کو بھی صبر و برداشت کی تلقین کیجئے۔ اللہ کا وعدہ اپنے وقت پر پورا ہو کے رہے گا۔

[۶۷] یعنی ان کافروں کی مکاریوں اور سازشوں سے، ان کے مذاق و تمسخر سے، ان کی اسلام دشمن کارروائیوں سے، ان کی ایذاؤں اور مظالم سے، ان کے منافقانہ سمجھوتوں کی کوششوں سے اور ان کی دھمکیوں سے آپ کے پائے ثبات میں ہرگز لغزش نہ آنی چاہئے اور ان کو اسی بات کا یقین آ جانا چاہئے کہ آپ اپنے مشن میں صبر و ثبات کا ایسا عظیم پیکر ہیں جسے کسی قیمت پر اپنی جگہ سے ہلایا نہیں جا سکتا۔

سُوْرَۃُ لُقْمٰنَ مَکِّیَّۃٌ ۳۴ آیاتھا رکوعھا ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۝ ۱ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝ ۲ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۝ ۳ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ
الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ ۴ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ۵ وَمِنَ

کلمات ۵۵۴ آیت ۳۴ (۳۱) سورہ لقمان مکی ہے (۵۷) رکوع ۴ حروف ۲۲۱۷

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

ا۔ل۔م۔(۱) یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں(۲) جو نیکو کار لوگوں کے لئے[۱] ہدایت اور رحمت[۲] ہیں(۳) یعنی وہ لوگ جو نماز قائم کرتے، زکوۃ ادا کرتے اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں(۴) یہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے سیدھی راہ پر ہیں[۳] اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں(۵)

[۱] قرآن کی اور اس کی آیات کی بعض مقامات پر یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ سب لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔ سورہ بقرہ کی ابتدا میں فرمایا کہ یہ متقین کے لئے ہدایت ہے اور اس مقام پر فرمایا کہ یہ محسنین کے لئے ہدایت ہے۔ تو ان آیات میں کچھ تضاد نہیں۔ اور ان کی تطبیق کی صورت یہ ہے کہ قرآن فی الواقع سارے لوگوں کے لئے یعنی تمام بنی نوع انسان اور جنوں کے لئے ہدایت کی کتاب ہے، مگر اس کی ہدایت سے مستفید وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو خود بھی ہدایت کے طالب ہوں اللہ سے ڈرنے والے ہوں۔ اس کتاب کے منکر اور بدکار لوگ اس سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ ہاں اگر وہ اپنی ضد سے باز آ جائیں تو وہ بھی ہدایت پا سکتے ہیں۔

[۲] ❁ قرآن رحمت کس لحاظ سے ہے؟ اور قرآن کی آیات رحمت اس لحاظ سے ہیں کہ قرآن ایک طرزِ حیات سکھاتا ہے جو ایک طرف تو اخروی فلاح کا ضامن ہے اور دوسری طرف دنیوی زندگی کے ہر پہلو کے لئے ایسی متوازن اور متناسب راہیں دکھاتا ہے جس سے نہ فرد کے حقوق مجروح ہوتے ہیں نہ معاشرہ کے اور وہ ان میں حسین امتزاج پیدا کر دیتا ہے۔ وہ تدبیر منزل یعنی عائلی زندگی سے لے کر حکمرانی تک بین المملکتی تعلقات اور خارجہ پالیسی کی ایسی معتدل راہ پیش کرتا ہے کہ اگر انسانی عقل ہزاروں سال بھی بھٹکتی پھرتی تو ایسی متوازن راہیں تلاش نہیں کر سکتی تھی۔ اللہ کی یہ انتہائی رحمت اور مہربانی ہے کہ اللہ نے وحی کے ذریعہ انسانوں کو مفت میں ہی ایسی راہیں اور ایسے طریقے بتا دیئے ہیں۔

[۳] اس مقام پر محسنین کی اور سورہ بقرہ میں متقین کی ان ہی تین صفات کا ذکر فرمایا جو یہاں مذکور ہیں یعنی اقامت صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ اور ایمان بالآخرت یعنی جس شخص میں کم از کم یہ تین صفات پائی جائیں نہ اس کے راہ راست پر ہونے میں کوئی شک ہو سکتا ہے اور نہ فلاح پانے میں۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے سورہ بقرہ کی ابتدائی پانچ آیات)

النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۚ اُولٰٓئِكَ

لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو اس لئے بیہودہ [۴] باتیں خرید تا ہے کہ بغیر علم [۵] کے اللہ کی راہ سے بہکا دے اور اس کا

[۴] لھوالحدیث سے کیا مراد ہے؟ گانے بجانے اور سازو مضراب سے کراہیت:۔ لھو الحدیث سے مراد ہر وہ بات، شغل یا کھیل یا تفریح ہے جو انسان کو اللہ کی یاد سے غافل کردے یا غافل رکھے۔ خواہ یہ شغل، گانا بجانا ہو یا دلچسپ ناول اور ڈرامے ہوں یا کلب گھروں کی تفریحات ہوں یا ٹی وی کا شغل ہو یا ڈرامے اور سینما بینی ہو۔ غرض لھوالحدیث کا اطلاق عموماً مذموم اشغال پر ہوتا ہے۔ اب اس لفظ کی تشریح مندرجہ ذیل احادیث و آثار کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیے:

(۱) سیدنا عبداللہ بن مسعود قسم کھا کر کہا کرتے تھے کہ قرآن میں لھو الحدیث کا لفظ گانا اور موسیقی کے لئے آیا ہے۔ نیز آپ فرمایا کرتے کہ گانا بجانا دل میں یوں نفاق پیدا کرتا ہے جیسے پانی سے گھاس اور سبزہ اگ آتا ہے (فتاویٰ ابن باز۔ اردو ترجمہ ج ۱ص ۲۱۳)

(۲) سیدنا ابوامامہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے مجھے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے اور میرے پروردگار عزوجل نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں باجوں گاجوں، ساز و مضراب، بتوں، صلیبوں اور امرِ جاہلیت کو ختم کروں" (احمد بحوالہ مشکوۃ۔ کتاب الحدود۔ باب بیان الخمرو وعید شاربها فصل ثالث)

(۳) آپ ﷺ نے فرمایا: "گانا بجانا کرنے والی عورتوں کو نہ بیچو، نہ خریدو اور نہ انہیں یہ کام سکھاؤ اور ان کی اجرت حرام ہے" (ترمذی۔ ابواب البیوع۔ باب کراهیة المغنیات)

(۴) ابومالک اشعری کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ میری امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو زنا کو، ریشم کو، شراب کو اور معازف یعنی آلات ساز و مضراب اور گانے بجانے کو حلال کرلیں گے" (بخاری۔ کتاب الاشربہ باب ما جاء فیمن یستحل الخمرو یسمیه بغیر اسمه) یعنی ان چیزوں کے دوسرے نام رکھ کر انہیں جائز بنالیں گے۔

نضر بن حارث کا اسلام روکنے میں کردار:۔ اور اس آیات کا شان نزول یہ بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو غیر موثر بنانے کے لئے جو لوگ ادھار کھائے بیٹھے تھے ان میں سے ایک نضر بن حارث بھی تھا۔ اس کا طریق کار ابولہب سے بالکل جداگانہ تھا۔ ایک دفعہ وہ سرداران قریش سے کہنے لگا: قریشیو! محمد ﷺ تمہارے سب سے زیادہ پسندیدہ آدمی تھے۔ سب سے زیادہ سچے اور سب سے زیادہ امین تھے اب اگر وہ اللہ کا پیغام لے کر آئے ہیں تو تم کبھی انہیں شاعر کہتے ہو، کبھی کاہن، کبھی پاگل اور کبھی جادوگر کہتے ہو حالانکہ وہ نہ شاعر ہیں، نہ کاہن، نہ پاگل اور نہ جادوگر ہیں۔ کیونکہ ہم ایسے لوگوں کو خوب جانتے ہیں۔ اے اہل قریش! سوچو! تم پر یہ کیسی افتاد آپڑی ہے۔

پھر اس افتاد کا جو حل نضر بن حارث نے سوچا وہ یہ تھا کہ وہ خود حیرہ گیا۔ وہاں سے بادشاہوں کے حالات اور رستم واسفندیار کے قصے سیکھے۔ آپ ﷺ جہاں کہیں بھی جاکر اپنا پیغام سناتے، ابولہب کی طرح نضر بن حارث بھی وہاں پہنچ کر یہ قصے سناتا پھر لوگوں سے پوچھتا کہ آخر کس بنا پر محمد ﷺ کا کلام مجھ سے بہتر ہے؟ علاوہ ازیں اس نے چند لونڈیاں بھی خرید رکھی تھیں۔ جب کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کی طرف مائل ہونے لگتا تو وہ کسی لونڈی کو اس پر مسلط کردیتا کہ وہ لونڈی اسے کھلائے پلائے اور اس کی فکر کا رخ موڑ دے۔ اسی سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔ (ابن ہشام۔ ۱: ۲۷۱)

[۵] بغیر علم کی نسبت اللہ کی راہ کی طرف بھی ہوسکتی ہے اور لھو الحدیث کی طرف بھی۔ پہلی صورت تو ترجمہ سے واضح ہے۔ یعنی اس کا اللہ کی راہ سے بہکانا محض بغض و عناد اور ضد پر مبنی ہے۔ اس کے لئے اس کے پاس کوئی علمی دلیل نہیں ہے۔ اور

لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿٦﴾ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا وَلَّىٰ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا كَأَنَّ فِي أُذُنَيْهِ

وَقْرًا ۖ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٧﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتُ النَّعِيمِ ﴿٨﴾ خَالِدِينَ

فِيهَا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٩﴾ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ۖ وَأَلْقَىٰ فِي الْأَرْضِ

مذاق اڑائے[۶]۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے رسوا کرنے[۷] والا عذاب ہے۔(۶) اور جب اسے ہماری آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو تکبر سے یوں منہ پھیر لیتا ہے جیسے اس نے کچھ سنا[۸] ہی نہیں گویا اس کے کانوں میں ثقل ہے۔ آپ اسے دردناک عذاب کی بشارت دے دیجئے۔(۷) البتہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کے لئے نعمتوں والے باغ ہیں۔(۸) جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے اور وہ ہر چیز پر غالب ہے اور حکمت[۹] والا ہے(۹) اس نے آسمانوں کو بغیر ستونوں[۱۰] کے پیدا کیا (جیسا کہ) تم انہیں دیکھتے ہو اور زمین میں

دوسری صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ اس قدر جاہل ہے جو اللہ کی سیدھی راہ اور ہدایت جیسی قیمتی چیز کے عوض تباہ کن چیز خرید رہا ہے۔

[۶] ❁ ثقافتِ جاہلیہ:۔ یعنی وہ شخص گانا، بجانا، قصے کہانیاں اور رقص و سرور جیسی ثقافتی سرگرمیوں کے ذریعہ لوگوں کو اللہ کی آیات سے دور رکھنا اور ان آیات کا مذاق اڑانا چاہتا ہے۔

[۷] اس کے جرم اور اس کی سزا میں مناسبت یہ ہے کہ وہ اللہ کی آیات اور اس کے رسول کی تذلیل کرنا چاہتا ہے تو اس کو عذاب بھی ذلیل کرنے والا دیا جائے گا۔

[۸] یہ ہے اللہ کی آیات سے اس کی شانِ بے نیازی گویا وہ اللہ کی آیات سننے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا اور اگر کانوں میں آواز پڑ بھی جائے تو ایسے سنی ان سنی کر دیتا ہے جیسے وہ ثقلِ سماعت کی وجہ سے بات سن ہی نہ پایا ہو۔ اور یہ سب کچھ وہ تکبر و نخوت کی بنا پر کرتا ہے لہٰذا اسے اس تکبر کی سزا دردناک عذاب کی صورت میں ملے گی۔

[۹] یعنی اللہ نے مومنوں سے جن جن نعمتوں اور باغات دینے کا وعدہ فرمایا ہے وہ انہیں دینے پر قادر بھی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ نعمتیں مومنوں کو مل نہ سکیں۔ اور وہ حکیم بھی ہے نہ تو وہ کسی مستحق کو محروم رکھے گا اور نہ ہی غلط بخششوں کا ہی وہاں کچھ امکان ہے۔

[۱۰] ❁ سماء اور فلک میں فرق:۔ اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ ستون ہیں تو سہی مگر تمہیں نظر نہیں آتے اور دوسرا یہ کہ تم دیکھ تو رہے ہو کہ ستون وغیرہ کچھ نہیں اور ستونوں کے سہاروں کے بغیر ہی قائم ہیں۔ اس مقام پر دو تین امور کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ جس جس مقام پر اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کا اکٹھا ذکر کیا ہے اس سے مراد پوری کائنات اور نظام کائنات لیا جائے گا۔ دوسرا یہ کہ لفظ آسمان کے لئے عربی میں دو لغت ہیں ایک فلك (ج افلاک) دوسرا سماء (ج سماوات) فلک سے مراد سیاروں کے مدارات ہیں جن پر وہ گھوم رہے ہیں۔ اور سماء مراد بلندی بھی ہے اور آسمان کا وجود بھی جسے اللہ تعالیٰ نے ایک ٹھوس حقیقت اور جسم رکھنے والی چیز کے طور پر پیش فرمایا ہے۔ اور یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے

کہ موجودہ نظریہ ہیئت کے مطابق آسمان کوئی چیز نہیں بلکہ فقط حدِ نگاہ کا نام ہے۔ جبکہ آسمانوں کا ذکر قرآن میں متعدد بار اور اس کے علاوہ احادیث میں بھی ہے۔ اور اس صورت میں آیا ہے کہ آسمانوں میں دروازے بھی ہیں۔ لہٰذا لفظ سماء کی تحقیق ضروری ہے۔

۞ لفظ سماء کے مختلف معانی: سات زمینوں کی تخلیق:۔ سماء کا لفظ بلندی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے یعنی ہر چیز جو ہمارے سر پر سایہ فگن ہو وہ سماء ہے۔ سماء کی ضد ارض ہے جس کے معنی زمین بھی ہے اور پستی بھی۔ اور یہ دونوں الفاظ اسمائے نسبیہ میں سے ہیں۔ یعنی ایک ہی چیز اپنے سے پست چیز کے مقابلہ میں سماء بھی ہے اور وہی چیز اپنے سے بلند چیز کے مقابلہ میں ارض بھی۔ یعنی ہماری زمین ارض ہے تو پہلا آسمان اس کے مقابلہ میں سماء ہے۔ اور یہی پہلا آسمان دوسرے آسمان کے مقابلہ میں ارض ہے اور تیسرے آسمان کے مقابلہ میں دوسرا آسمان ارض (نمبر ۳) ہوئی۔ گویا اس لحاظ سے سات آسمانوں کے مقابلہ سات زمینیں بھی آ گئیں جیسا کہ ارشاد باری ہے۔ ﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ﴾ (۶۵: ۱۲) یعنی اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان اور ویسی ہی زمینیں پیدا کیں۔

۞ کائنات کی وسعت:۔ پھر یہ بلندی تھوڑی سی ہو تب بھی اس پر سماء کے لفظ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ جیسے ارشاد باری ہے۔ ﴿وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً﴾ (۲: ۲۲) (اور اس نے آسمان سے مینہ برسایا) یہاں سماء سے مراد بادل ہیں جو میل ڈیڑھ میل کی بلندی پر اڑتے پھرتے ہیں اور اس معمولی سی بلندی کے لئے بھی سماء (آسمان) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جبکہ درج ذیل آیت: ﴿اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ﴾ (۳۷: ۶) (بیشک ہم نے ہی آسمان دنیا کو ستاروں کی زینت سے مزین کیا) میں اتنی زیادہ بلندی مراد ہے جتنی دوری پر ستارے چمکتے ہیں۔ خواہ وہ دوری لاکھوں میل پر مشتمل ہو یا کروڑہا اور اربہا میلوں پر اور درج ذیل آیت میں سماء (آسمان) کا لفظ یعنی بہت ہی زیادہ بلندی، اتنی بلندی جو سات آسمانوں سے بھی زیادہ ہو یعنی لامحدود بلندی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ ارشاد باری ہے۔ ﴿ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ﴾ (۲: ۲۹) (پھر اللہ تعالیٰ آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو انہیں ٹھیک سات آسمان بنا دیا)

موجودہ ہیئت دان کسی آسمان کے قائل نہیں ہیں ہم ان سے گذارش کریں گے کہ ان کی تمام تر تحقیقات کی رسائی ابھی پہلے آسمان یعنی آسمان دنیا تک بھی نہیں ہو سکی تو پھر وہ اس کی تردید کیونکر کر سکتے ہیں؟ ان کی تحقیق خواہ کتنی طاقتور اور جدید قسم کی دوربینوں سے ہو خواہ وہ پلوٹو کی دوری ہو یا الفاقنطورس کی یا قلب عقرب کی یہ سب کچھ آسمان دنیا کی زینت بنے گا۔ اور جو کچھ ابھی مزید تحقیق کے دائرہ میں آئے گا وہ بھی آسمان دنیا تک ہی محدود ہو گا۔ باقی چھ آسمان اس آسمان دنیا سے ماوراء اور ان تک دسترس انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ ان تک رسائی رسول اللہ ﷺ کو اللہ کی قدرت کاملہ کی وجہ سے ہوئی۔ اور وحی کے ذریعہ ہی ہمیں سات آسمانوں، ان کی جسامت اور ان کے درمیان فاصلے تک کا علم ہوا ہے۔ آج کا ہیئت دان بھی جب کائنات کی وسعت کا خیال کر کے ورطہ حیرت میں ڈوب جاتا ہے تو دبی زبان سے اس کے منہ سے ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں جن سے اس علم وحی کی تائید ہوتی ہے اور وہ برملا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ اس لامحدود کائنات کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ جتنی طاقتور دوربینیں وہ ایجاد کرتے ہیں۔ کائنات اس کے سامنے اور بھی زیادہ وسیع ہوتی جاتی ہے۔

رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ ۚ وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ ﴿١٠﴾ هَٰذَا خَلْقُ اللَّهِ فَأَرُونِي مَاذَا خَلَقَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ ۚ بَلِ الظَّالِمُونَ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴿١١﴾ وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنِ اشْكُرْ لِلَّهِ ۚ وَمَنْ يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ كَفَرَ

ع ۱۱

سلسلہ ہائے کوہ رکھ دیئے[۱۱] تاکہ وہ تمہیں لے کر ہچکولے نہ کھائے اور اس میں ہر طرح کے جاندار پھیلا دیئے[۱۲]۔ نیز ہم نے آسمان سے پانی برسایا جس سے ہم نے زمین میں ہر قسم کی عمدہ اجناس اگا دیں۔(۱۰)

یہ تو ہے اللہ کی مخلوق، اب مجھے دکھلاؤ کہ اللہ کے سوا دوسرے معبودوں نے کیا کچھ پیدا کیا ہے؟ (کچھ نہیں) بلکہ یہ ظالم[۱۳] صریح گمراہی میں پڑے ہیں۔(۱۱) ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی (جو یہ تھی) کہ اللہ کا شکر ادا کرتے رہو۔ جو کوئی شکر ادا کرتا ہے وہ اپنے ہی (فائدہ کے) لئے کرتا ہے اور جو ناشکری[۱۴] کرے

[۱۱] تشریح کے لئے دیکھئے سورہ نحل کی آیت نمبر ۱۵ کا حاشیہ نمبر ۱۵ اور سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۳۱ کا حاشیہ نمبر ۲۷

[۱۲] جدید تحقیق کے مطابق جانداروں کی دس لاکھ انواع کا علم انسان کو حاصل ہو چکا ہے اور اسی طرح دو لاکھ کے لگ بھگ نباتات کی انواع کا۔ جانداروں کی طرح نباتات، پودوں اور درختوں میں نر اور مادہ موجود ہوتے ہیں اور ان معاملات میں جتنی بھی تحقیق ہو رہی ہے زیادہ سے زیادہ عجائبات قدرت یا اللہ کی نشانیاں انسان کے علم میں آ رہی ہیں۔

[۱۳] یعنی جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے وہ سب کچھ تو اللہ نے پیدا کیا ہے۔ اب جن چیزوں کو تم نے معبود بنا رکھا ہے بتاؤ انہوں نے کیا پیدا کیا ہے؟ پھر ایک غیر خالق کو معبود بنا لینا سراسر گمراہی نہیں تو اور کیا ہے؟

[۱۴] ❁ سیدنا لقمان کون تھے ...... شکر کی تلقین اور اللہ کی بے نیازی:۔ سیدنا لقمان حبشہ یا مصر کے رہنے والے تھے۔ بعد میں شام میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ سیدنا داؤد علیہ السلام کا زمانہ پایا۔ آپ کی نبوت میں اختلاف ہے اور راجح یہی بات ہے کہ آپ نبی نہیں تھے۔ البتہ حکیم اور دانا ضرور تھے۔ عرب بھر میں وہ اپنی حکمت و دانائی کی وجہ سے مشہور تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو حکمت اور دانائی کی باتیں سکھائی تھیں ان میں سرِ فہرست یہ بات تھی کہ اگر اللہ کی نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کیا جائے تو اس کا فائدہ شکر ادا کرنے والے کو پہنچتا ہے۔ شکر میں اللہ تعالیٰ نے یہ تاثیر رکھ دی ہے کہ وہ مزید توجہ اور مہربانی کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اللہ کا اس لئے بھی شکر ادا کرنا چاہئے تاکہ وہ مزید انعامات فرمائے اور بندوں کا بھی ضرور احسان مند ہونا چاہئے جو کوئی احسان کرے۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو تقریباً ہر انسان کے تجربہ میں آتی رہتی ہیں۔ ناشکری اور نمک حرامی یا احسان فراموشی کے نتائج اس کے بالکل برعکس نکلتے ہیں۔ پہلی نعمتیں بھی چھین لی جاتی ہیں۔ بہر حال شکر کرنے کا فائدہ بھی شکر کرنے والے کو ہی پہنچتا ہے اور ناشکری کا نقصان بھی اسے ہی پہنچتا ہے۔ رہا اللہ کا معاملہ تو اللہ لوگوں کے شکر یا ناشکری سے بے نیاز ہے۔ کیونکہ اس کے سب کارنامے ہی ایسے ہیں جو قابل ستائش ہیں اور وہ اپنی ذات میں ہی محمود ہے۔ یہ تھی وہ پہلی دانائی کی بات جو اللہ تعالیٰ نے سیدنا لقمان علیہ السلام کو سکھائی تھی۔

فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۱۲﴾ وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ

تو اللہ یقیناً (اس کے شکر سے) بے نیاز ہے اور خود اپنی ذات میں محمود ہے (۱۲) اور (یاد کرو) جب لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا کہ: ''پیارے بیٹے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک[۱۵] نہ بنانا، کیونکہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔(۱۳)

[۱۵] بیٹے کو پہلی نصیحت 'اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا:۔ ایک دفعہ سیدنا لقمان نے چند نصیحتیں اپنے بیٹے کو فرمائیں وہ اتنی اہم تھیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ذکر فرمایا۔ دنیا میں اولاد ہی ایک ایسا رشتہ ہے جس کے متعلق انسان انتہائی خلوص برتتا ہے اور نفاق نہیں کر سکتا۔ اور اولاد ہی کے متعلق اس کی آرزو ہو سکتی ہے کہ وہ ہر بھلائی کی بات میں اس سے آگے نکل جائے۔ حتیٰ کہ ایسی آرزو انسان اپنے حقیقی بہن بھائیوں اور دوستوں تک سے بھی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ پہلی نصیحت جو سیدنا لقمان نے اپنے بیٹے کو کی وہ یہ تھی کہ اللہ کے ساتھ کبھی کسی کو شریک نہ بنانا۔ کیونکہ دنیا میں سب سے بڑی ناانصافی اور اندھیر کی بات یہی شرک ہی ہے۔ شرک مجسم ظلم اور سب سے بڑا ظلم ہے۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے بھی واضح ہوتا ہے:

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب (سورہ انعام کی) یہ آیت اتری۔ ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ﴾ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر بہت شاق گزری۔ وہ کہنے لگے ''ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے ایمان کے ساتھ ظلم (یعنی کوئی گناہ) نہ کیا ہو۔ تو آپ ﷺ نے انہیں بتایا کہ اس آیت میں ظلم سے ہر گناہ مراد نہیں ہے (بلکہ شرک مراد ہے) کیا تم نے لقمان کا قول نہیں سنا جو انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا تھا۔ ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

اللہ کا اپنے بندوں پر اور بندوں کا اپنے اللہ پر حق:۔ یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ اہل مکہ ایک طرف تو لقمان کے حکیم اور دانا ہونے کے قائل تھے، دوسری طرف شرک میں بھی بری طرح مبتلا تھے۔ انہیں بتایا جا رہا ہے کہ لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں کی تھیں ان میں سر فہرست شرک سے ان کی نفرت اور بیزاری تھی کیونکہ اللہ کا بندے پر سب سے بڑا حق یہ ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائے۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

رسول اللہ ﷺ نے سیدنا معاذ بن جبل سے فرمایا: ''تجھے معلوم ہے کہ اللہ کا اس کے بندوں پر کیا حق ہے اور بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے؟'' سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ: ''اللہ اور اس کا رسول ہی خوب جانتا ہے'' آپ ﷺ نے فرمایا'': اللہ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ وہ اسی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں۔ اور بندوں کا اللہ پر یہ حق ہے کہ جو بندہ شرک نہ کرتا ہو اللہ اسے عذاب نہ کرے'' (ہمیشہ دوزخ میں نہ رکھے) میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا میں لوگوں کو یہ خوشخبری نہ سنا دوں؟'' فرمایا: ایسا نہ کرو ورنہ وہ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے'' (بخاری۔ کتاب الجہاد۔ باب اسم الفرس والحمار)

عَظِيمٌ ﴿١٣﴾ وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ

اور ہم[۱۶] نے انسان کو اپنے والدین سے (نیک سلوک کرنے کا) تاکیدی[۱۷] حکم دیا۔ اس کی ماں نے اسے کمزوری پر کمزوری سہتے ہوئے (اپنے پیٹ میں) اٹھائے رکھا اور دو سال اس کے دودھ[۱۸] چھڑانے میں لگے (اسی لئے یہ حکم دیا کہ) میرا شکر ادا کرو

[۱۶] آیت نمبر ۱۴ اور ۱۵ القمان کی نصائح کے درمیان اللہ تعالیٰ کی طرف سے جملہ معترضہ کے طور پر بیان ہوئی ہیں۔ کیونکہ ان آیات کا بھی بالواسطہ شرک کی مذمت ہی سے تعلق ہے۔

[۱۷] اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر اپنے حق کے ساتھ والدین سے بہتر سلوک کا ذکر فرمایا ہے اس کی وجہ اور تشریح کے لئے دیکھئے سورہ بنی اسرائیل آیت نمبر ۲۳ اور ۲۴ کے حواشی نیز درج ذیل حدیث بھی والدین کی اطاعت کی اہمیت پر پوری روشنی ڈالتی ہے:

❀ حدیث جریج:۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین بچوں کے سوا کسی نے مہد میں کلام نہیں کیا۔ عیسیٰ بن مریم اور صاحب جریج۔ جریج ایک عابد تھا۔ جس نے ایک عبادت خانہ بنا رکھا تھا ایک دن اس کی ماں آئی اور وہ نماز پڑھ رہا تھا۔ ماں نے کہا: اے جریج! اس نے دل میں کہا یا اللہ! ایک طرف ماں ہے اور ایک طرف نماز۔ وہ نماز میں لگا رہا۔ حتیٰ کہ اس کی ماں واپس چلی گئی۔ دوسرے دن پھر اس کی ماں آئی اور پکارا اے جریج! اس نے دل میں کہا: یا اللہ! ایک طرف ماں ہے اور ایک طرف نماز، آخر وہ نماز میں ہی لگا رہا۔ (اب اس کی ماں کے منہ سے بددعا نکل گئی) کہنے لگی "یا اللہ اسے موت نہ دینا جب تک یہ کسی بدکار عورت کا منہ نہ دیکھ لے" بنی اسرائیل میں جریج اور اس کی عبادت کا چرچا ہونے لگا۔ ان میں ایک بدکار عورت تھی جس کی خوبصورتی کی مثال دی جاتی تھی۔ وہ کہنے لگی: اگر تم چاہتے ہو تو میں اسے پھنساؤں؟" چنانچہ اس نے اپنے آپ کو جریج پر پیش کیا لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ پھر وہ ایک چرواہے کے پاس گئی جو اس کے عبادت خانہ کے پاس ٹھہرا کرتا تھا اور اس نے اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دیا۔ چنانچہ چرواہے نے اس سے صحبت کی تو وہ حاملہ ہو گئی۔ پھر جب بچہ پیدا ہوا تو کہنے لگی "یہ جریج کا بچہ ہے" لوگ آئے: اسے عبادت خانہ سے نکالا اور اسے گرا دیا اور اس کی پٹائی کرنے لگے۔ جریج نے پوچھا: کوئی بات تو بتاؤ؟" وہ کہنے لگے: تو نے اس فاحشہ سے زنا کیا اور اب تو اس کے بچہ بھی پیدا ہو چکا ہے جریج نے کہا: "وہ بچہ کہاں ہے؟" لوگ بچہ لے آئے تو جریج نے کہا: ذرا ٹھہرو! میں نماز پڑھ لوں۔ پھر وہ نماز سے فارغ ہو کر بچہ کے پاس آیا۔ اس کے پیٹ میں کچوکا دیا اور کہا: بچے! بتاؤ! تمہارا باپ کون ہے؟" بچہ بول اٹھا: فلاں چرواہا ہے۔ پھر تو لوگ جریج کے پاس آ کر اسے بوسے دینے لگے اور کہنے لگے کہ ہم تمہارے لئے سونے کا عبادت خانہ بنا دیتے ہیں۔ جریج نے کہا: نہیں بس ایسا ہی مٹی کا بنا دو" چنانچہ انہوں نے عبادت خانہ بنایا۔ تیسرے بنی اسرائیل میں ایک عورت جو اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی ادھر سے ایک نہایت خوش وضع سوار گزرا وہ عورت اس سوار کو دیکھ کر کہنے لگی: یا اللہ! میرے بچے کو اس سوار جیسا بنا دے" بچے نے ماں کی چھاتی چھوڑ کر کہا: "یا اللہ! مجھے ایسا نہ بنانا" پھر وہ دودھ پینے لگا۔ پھر وہاں سے ایک لونڈی گزری (جسے لوگ مارتے جاتے تھے) وہ عورت کہنے لگی "یا اللہ میرے بیٹے کو ایسا نہ بنانا" بچے نے چھاتی چھوڑ دی اور بول اٹھا! "یا اللہ! مجھے ایسا ہی بنانا" میں نے اپنے بچے سے کہا کہ تو ایسا کیوں کہتا ہے؟" بچے نے کہا: وہ سوار تو ظالم لوگوں سے تعلق رکھتا ہے اور ظالم ہے اور اس لونڈی کے متعلق

لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۭ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ؀ وَاِنْ جٰهَدٰكَ عَلٰٓي اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۡ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؀ يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي

اور اپنے والدین کا بھی (آخر) میرے پاس ہی (تجھے) لوٹ کر آنا ہے۔(۱۴) اور اگر وہ تجھ پر یہ دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک بنائے جس کا تجھے کچھ بھی علم نہیں[۱۹] تو ان کا کہنا نہ ماننا۔ البتہ دنیوی معاملات میں ان سے بھلائی کے ساتھ رفاقت کرنا مگر پیروی اس شخص کی راہ کی کرنا جس نے میری طرف رجوع[۲۰] کیا ہو۔ پھر تمہیں میرے پاس[۲۱] ہی لوٹ کر آنا ہے تو میں تمہیں بتادوں گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے۔(۱۵) پیارے بیٹے! اگر (تیرا عمل) رائی کے دانہ کے برابر بھی ہو وہ خواہ کسی چٹان میں ہو یا

لوگ کہتے ہیں کہ اس نے چوری کی اور زنا کیا۔ حالانکہ اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔ (مسلم۔ کتاب البر والصلۃ باب تقدیم بر الوالدین علی التطوع بالصلوٰۃ وغیرھا بخاری۔ کتاب الانبیاء۔ باب واذکر فی الکتب مریم) یہ حدیث، حدیث جریج کے نام سے مشہور ہے اور اس سے علماء نے یہ مسئلہ استنباط کیا ہے کہ اگر اولاد نفلی نماز میں مشغول ہو اور والدین میں سے کوئی اسے پکارے تو اسے نماز توڑ کر بھی اس آواز پر لبیک کہنا چاہئے۔ اور ان کا حکم بجالانا چاہئے۔

[۱۸] رضاعت کی مدت:۔ اس آیت سے نیز سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۳۳ سے صراحتاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ رضاعت کی زیادہ سے زیادہ مدت دو سال ہے۔ اس مدت میں کمی تو ہو سکتی ہے اگر والدین کسی ضرورت کے تحت دو سال سے پہلے دودھ چھڑانا چاہیں تو چھڑا سکتے ہیں۔ لیکن اس مدت میں بیشی نہیں ہو سکتی۔ نیز سورۂ احقاف کی آیت نمبر ۱۵ میں فرمایا کہ ''حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ ہے اس میں بھی علماء نے رضاعت کی مدت دو سال شمار کر کے حمل کی مدت میں کمی کے امکان یعنی چھ ماہ کو بھی ممکن قرار دیا ہے۔ لیکن ان سب تصریحات کے باوجود امام ابو حنیفہؒ رضاعت کی زیادہ سے زیادہ مدت اڑھائی سال قرار دیتے ہیں اور وہ اپنی اس رائے میں منفرد ہیں اور کسی فقہ کے امام نے بھی ان کی تائید نہیں کی۔ اور اس مسئلہ کی اہمیت یہ ہے کہ حرمتِ نکاح کا فیصلہ اسی مدت کی صحیح تعیین کی بنا پر ہی کیا جا سکتا ہے۔

[۱۹] اس کی تشریح کے لئے دیکھئے سورہ عنکبوت کی آیت نمبر ۸ کا حاشیہ نمبر ۱۲

[۲۰] یعنی والدین بھی اگر شرک پر یا دین کے خلاف کسی بات کے لئے مجبور کریں تو ان کی بات اللہ کے حکم کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ البتہ دنیوی معاملات میں ان سے اچھا سلوک کیا جائے خواہ والدین کافر ہی کیوں نہ ہوں۔ مثلاً محتاج ہوں، تو ان کی مالی اعانت کی جائے۔ اور دین کے علاوہ دوسری باتوں میں ان کی اطاعت کی جائے۔ ان کا ادب واحترام ملحوظ رکھا جائے۔ ان سے محبت اور شفقت سے سلوک کیا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ اللہ کے مخلص بندوں کی راہ ہے۔ لہٰذا انہی کی راہ اختیار کرنی چاہئے۔

[۲۱] یعنی والدین کو بھی اور اولاد کو بھی سب کو میرے حضور ہی پیش ہونا ہے۔ میں سب کو بتادوں گا کہ زیادتی اور تقصیر

السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ ﴿۱۶﴾ یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَ
اْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ انْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اصْبِرْ عَلٰی مَاۤ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۷﴾
وَ لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَ لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴿۱۸﴾

آسمانوں میں ہو یا زمین میں، اللہ اسے [۲۲] نکال لائے گا۔ اللہ یقیناً باریک بین اور باخبر ہے (۱۶) پیارے بیٹے! نماز قائم کرو، نیکی کا حکم کرو اور بُرے کام سے منع کرو اگر تجھے کوئی تکلیف پہنچے تو اس پر صبر کرو [۲۳]۔ بلاشبہ یہ سب باتیں بڑی ہمت کے کام ہیں (۱۷) اور (از راہِ تکبر) لوگوں سے اپنے گال نہ پھلانا، نہ ہی زمین میں اکڑ کر چلنا (کیونکہ) اللہ کسی خود پسند [۲۴] اور شیخی خور کو پسند نہیں کرتا (۱۸)

کس کی تھی۔

[۲۲] اللہ تعالیٰ کا علم اور قدرت:۔ اس آیت میں سیدنا لقمان نے اللہ تعالیٰ کے علم غیب کی وسعت بھی بیان فرمائی اور اس کی قدرت بھی۔ علمِ غیب کی اس طرح کہ تم کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام کرو۔ علانیہ کرو یا کئی پردوں میں چھپ کر کرو وہ تمہارے اعمال سے خوب واقف ہے۔ تمہارے دلوں کے خیالات تک جانتا ہے۔ اس کے پاس تمہارا پورا پورا ریکارڈ بھی موجود ہے۔ لہٰذا جو کام بھی کرو سوچ سمجھ کر اور اللہ سے ڈر کر کرو۔ اور اس کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ موت کے بعد تمہیں دوبارہ اپنے پاس حاضر کرنا تو بہت بڑی بات ہے وہ تو رائی کے ایک دانہ تک کو جو کسی کھوہ کی تاریکیوں میں پڑا ہو، اپنے پاس لا حاضر کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ سیدنا لقمان یہ بات اپنے بیٹے کو سمجھا کر اس کے اخلاق کو درست کرنا اور اس میں تقویٰ کی صفت پیدا کرنا چاہتے تھے۔

سیدنا لقمان کی اپنے بیٹے کو دوسری نصیحتیں:۔

[۲۳] مصائب برداشت کرنا پیغمبروں کی میراث ہے:۔ نماز کو ہمیشگی کے ساتھ باجماعت ادا کرتے رہنا یہ کوئی معمولی کام نہیں بلکہ یہ کام باہمت لوگوں کا کام ہے۔ اسی طرح اچھے کاموں کا حکم دینا اور لوگوں کو برے کاموں سے روکتے رہنا بھی عام لوگوں کے بس کی بات نہیں بلکہ یہ بھی صاحب عزم لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ اس سے یہ بھی از خود معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ دوسروں کو اچھے کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکنے کا فریضہ سرانجام دیں انہیں لامحالہ لوگوں کی طرف سے ایذائیں پہنچیں گی۔ کیونکہ یہ پیغمبروں کا اسوہ ہے اور اسی لئے پیغمبروں کو لوگ ستاتے اور دکھ پہنچاتے تھے۔ اسی لئے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اس راہ میں اگر تجھے دکھ اور ایذا پہنچے تو اسے خندہ پیشانی سے برداشت کر اور یہ کہ مصائب پر صبر کرنا بھی کوئی معمولی کام نہیں۔ صاحب عزم وہمت ہی یہ تینوں کام بجا لا سکتے ہیں۔

[۲۴] متکبرانہ حرکات:۔ گال پھلا پھلا کر باتیں کرنا اور اکڑ اکڑ کر چلنا یہ سب خود پسندوں اور متکبروں کی ادائیں ہیں۔ متکبر لوگوں کی گفتگو سے، وضع قطع سے، چال ڈھال سے غرضیکہ ان کی ایک ایک ادا سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلہ میں بہت کچھ سمجھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگوں کی ایک ایک حرکت سخت ناگوار ہے (مزید تشریح کے لئے دیکھئے سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۳۷ کا حاشیہ نمبر ۴۷ اور سورہ الفرقان کی آیت نمبر ۶۳ کا حاشیہ نمبر ۸۰)

وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ ﴿۱۹﴾ اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ

ع ۲ ۱۱

اور اپنی چال میں اعتدال ملحوظ رکھو اور اپنی آواز پست[۲۵] کرو۔ بلاشبہ سب آوازوں سے بری آواز گدھے کی آواز ہے۔(۱۹) کیا تم دیکھتے نہیں کہ جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ نے تمہارے لئے کام[۲۶] پر لگا دیا ہے اور اس نے اپنی تمام ظاہری و باطنی[۲۷] نعمتیں تم پر پوری کر دی ہیں (اس کے باوجود) لوگوں میں کوئی ایسا ہے

[۲۵] ضرورت کے لئے بلند آواز مذموم نہیں بلکہ وہ جو دھونس جمانے کیلئے ہو: بعض دفعہ ضرورت کی وجہ سے انسان کو بلند آواز سے پکارنا پڑتا ہے۔ مثلاً دو چار آدمی آس پاس بیٹھے ہوں تو پست آواز سے کام چل جاتا ہے۔ مگر زیادہ آدمیوں کو بات سنانا مقصود ہو یا کوئی شخص خطاب کر رہا ہو اذان دیتے وقت انسان کو بلند آواز نکالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پست آواز سے کام ہی نہیں چلتا۔ ایسے مواقع پر بلند آواز سے بات کرنا یا خطاب کرنا ہرگز مذموم نہیں ہے۔ اسی طرح بعض دفعہ استاد کو اپنے شاگرد کو سرزنش کرنے یا ڈانٹنے کی ضرورت ہوتی ہے اس وقت بھی اگر وہ آواز پست اور نرم لہجہ رکھے گا تو شاگرد پر خاک بھی اثر نہ ہوگا۔ مذموم چیز یہ ہے کہ کوئی شخص ازراہ تکبر دوسروں پر دھونس جمانے اور انہیں ذلیل یا مرعوب کرنے کے لئے بتکلف گلا پھاڑے یا چلا کر بات کرے۔ اس غرض سے جب کوئی چلا چلا کر بولتا ہے تو بسا اوقات آواز بے ڈھنگی اور بے سری ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر یہ بھی کوئی خوبی کی بات ہوتی تو یہ کام تو گدھے تم سے اچھا کر سکتے ہیں۔ حالانکہ ان کی آواز سے سب نفرت کرتے ہیں۔

[۲۶] تسخیر کائنات کا مفہوم:۔ تسخیرِ کائنات کے دو مطلب ہیں ایک کہ کائنات کی ہر چیز انسان کی خادم ہے اور انسان مخدوم ہے۔ زمین، سمندر، پانی، ہوائیں، پہاڑ، چاند، سورج، ستارے یہی موٹی موٹی اشیائے کائنات گنی جاتی ہیں۔ ان کے انسان کا خادم ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اگر ان میں سے ایک چیز بھی نہ ہو تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ مگر انسان کے بغیر ان چیزوں میں سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ زمین میں جتنی بھی اشیاء موجود ہیں۔ خواہ وہ جمادات ہوں 'نباتات ہوں یا حیوانات ہوں اللہ نے انسان کو اتنی عقل عطا فرما دی ہے کہ وہ ان میں سے جس کو چاہے اپنے قابو میں لا سکتا ہے اور اس سے حسب ضرورت فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ رہیں وہ چیزیں جن کا تعلق زمین سے نہیں مثلاً سورج، چاند، ستارے اور ہوائیں وغیرہ تو ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے قوانین بنا دیئے ہیں اور انہیں ایسے نظم و ضبط سے جکڑ رکھا ہے کہ انسان ان سے فائدے اٹھا سکتا ہے۔ اور اپنے معمولات زندگی اور کاروبار وغیرہ ٹھیک طرح سے سرانجام دے سکتا ہے۔ وہ مدتوں پہلے یہ معلوم کر سکتا ہے کہ سورج گرہن یا چاند گرہن کب لگے گا۔ بحر و بر کی تاریکیوں میں وقت اور راستے اور سمتیں معلوم کر سکتا ہے حتیٰ کہ ہزار ہا سال بعد تک کے لئے تقویم بھی تیار کر سکتا ہے۔ اور نت نئی سے نئی ایجادات بھی وجود میں لا سکتا ہے اور یہی تسخیر کائنات کا مطلب ہے۔ تسخیر کائنات کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان پہلے اپنے قریبی سیارچہ چاند پر پہنچنے کی کوشش کرے پھر دوسرے سیاروں پر پہنچنے میں اپنی قیمتی عمر برباد کرے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ:

تو کار جہاں رانکو ساختی کہ با آسمان نیز پرداختی؟

یعنی اس دنیا میں جو تیرے کرنے کے کام تھے کیا تو نے انہیں بخوبی سرانجام دے چکا ہے کہ اب تجھے آسمان پر اڑنے کی فکر پڑ گئی ہے۔

[۲۷] ظاہری اور باطنی نعمتوں سے مراد؟ ظاہری نعمتیں وہ ہیں جن کو ہم حواس خمسہ کے ذریعہ معلوم کر سکتے ہیں۔ اور ان

يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ﴿۲۰﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۲۱﴾ وَمَنْ
يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ؕ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ

جو اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتا ہے جبکہ اس کے پاس نہ علم ہے نہ ہدایت اور نہ کوئی روشنی[۲۸] دکھانے والی کتاب ہے۔(۲۰) اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے۔ اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں (نہیں) "بلکہ ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا ہے" کیا (یہ انہی کی پیروی کریں گے) خواہ شیطان انہیں دوزخ کے عذاب[۲۹] کی طرف بلاتا رہا ہو؟(۲۱)

اور جو شخص اپنا چہرہ اللہ کے آگے جھکا دے اور نیکوکار ہو تو اس نے یقیناً ایک مضبوط حلقے[۳۰] کو تھام لیا۔ اور سب کاموں کا انجام تو اللہ ہی کی طرف ہے۔(۲۲)

کا تعلق ہماری مادی زندگی اور معاشیات وغیرہ سے ہے۔ اور یہ بھی لاتعداد ہیں۔ اور باطنی سے مراد وہ نعمتیں ہیں جن سے ہماری اخلاقی تربیت ہوتی ہے اور روح کا تزکیہ ہوتا ہے۔ اور یہ بھی لاتعداد اور ان کا ذریعہ معلومات وحی الٰہی ہے۔ پھر کچھ ایسی نعمتیں ہیں جن کا تعلق دونوں سے ہے۔ مثلاً آنکھ سے ہم دیکھتے ہیں یہ آنکھ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ لیکن قوتِ باصرہ کا علم اس سے علیحدہ چیز ہے اسی طرح انسان کی قوتِ سامعہ، قوتِ ہاضمہ، قوتِ متخیلہ، قوتِ دافعہ وغیرہ بے شمار قوتیں انسان کے جسم کے اندر کام کر رہی ہیں۔ اگر یہ ٹھیک کام کرتی رہیں تو انسان تندرست رہتا ہے اگر ان میں سے کسی ایک میں بھی گڑبڑ ہو جائے تو انسان بیمار پڑ جاتا ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ تندرستی ہزار نعمت ہے۔ یہی وہ قسماقسم کی نعمتیں ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے خود ہی فرمادیا کہ "اگر تم اللہ کی نعمتیں شمار کرنا چاہو بھی تو کبھی ان کو شمار کرنا نہ کر سکو گے" (۱۴: ۳۴، ۱۶: ۱۸)

[۲۸] یعنی اللہ کی ان گنت نعمتوں کے باوجود کچھ لوگ ایسے نمک حرام ہیں کہ اللہ کے بارے میں بحث کرنے لگتے ہیں کہ اللہ کی ذات موجود بھی ہے یا نہیں یا اس کی صفات اور قدرتوں میں جھگڑا کرنے لگتے ہیں۔ اس آیت کی تشریح کے لئے دیکھئے سورہ حج کی آیت نمبر ۸ کا حاشیہ نمبر ۸)

[۲۹] ۞ تقلیدِ آباء شیطان کی پیروی ہے:۔ تقلید آباء کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ بزرگوں میں سے کسی ایک نے کوئی غلطی کی۔ کوئی غلط عقیدہ اپنا لیا یا کوئی بدعی کام شروع کر دیا۔ پھر بعد کی نسلوں نے بزرگوں سے عقیدت کی بنا پر اس غلطی کو درست تسلیم کرتے ہوئے رائج کر لیا۔ اور اس کی تحقیق کی کسی نے ضرورت ہی نہ سمجھی۔ اس آیت میں دو باتوں کی صراحت کی گئی ہے۔ ایک یہ کہ تقلیدِ آباء بلا تحقیق اور شیطان کی پیروی ایک ہی چیز ہے۔ اور دوسرے یہ کہ شیطان کی پیروی کا لازمی نتیجہ جہنم کا عذاب ہے۔ گویا ان سے سوال یہ کیا جا رہا ہے کہ اگر شیطان تمہارے آباء واجداد کو جہنم کی طرف لے جا رہا ہو تو بھی تم اپنے آباء واجداد کی پیروی کرو گے؟

[۳۰] ۞ شریعت مضبوط حلقہ کیسے ہے؟ مضبوط حلقہ کی تعریف اللہ تعالیٰ نے خود ہی بیان کر دی۔ یعنی جو شخص اللہ کے

الْاُمُوْرِ ﴿۲۲﴾ وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ۭ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ
بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۲۳﴾ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۲۴﴾ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ
خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۭ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾ لِلّٰهِ مَا فِي

اور جس نے کفر کیا تو اس کا کفر آپ کو غمزدہ نہ کر دے [۳۱]۔ انہیں ہماری طرف ہی آنا ہے پھر ہم انہیں بتا دیں گے جو کچھ وہ کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ تو یقیناً دلوں کے راز تک جانتا ہے (۲۳) ہم انہیں تھوڑی مدت مزے کر لینے کا موقعہ دے رہے ہیں پھر انہیں بے بس کر کے سخت عذاب کی طرف کھینچ لائیں گے (۲۴) اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو فوراً کہیں گے کہ: "اللہ نے" آپ کہئے کہ سب تعریف [۳۲] اللہ ہی کے لئے ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔ (۲۵) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ ہی کا ہے [۳۳]۔

احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور پھر اس کے احکام کے مطابق نیک اعمال بھی بجا لائے گویا اس میں ساری شریعت آ گئی۔ اس شریعت پر عمل پیرا ہونا ہی ایسے مضبوط حلقے یا کڑے کو تھامنا ہے جو اپنی مضبوطی کی وجہ سے ٹوٹنے والا نہیں۔ لہٰذا جو شخص اسے مضبوطی سے پکڑے رکھے گا اس کو نہ گر پڑنے کا خطرہ ہے اور نہ کہیں چوٹ لگ جانے کا۔ پھر اسی حلقہ کو تھامے ہوئے وہ بالآخر اللہ تک پہنچ جائے گا۔ جب تک وہ یہ حلقہ تھامے رہے گا، شیطان نہ اسے دھوکا دے سکے گا نہ گمراہ کر سکے گا یا دوسری راہ پر ڈال سکے گا۔

[۳۱] یعنی جو شخص آپ کی دعوت کا انکار کرتا ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس نے آپ ﷺ کی دعوت کا انکار کر کے تمہیں اور اسلام کو زک پہنچائی ہے۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ وہ دراصل اپنا ہی نقصان کر رہا ہے۔ اور آپ ﷺ کو اس معاملہ میں افسردہ خاطر نہ ہونا چاہئے۔ آپ ﷺ اللہ پر توکل کر کے اپنی دعوت کا کام کرتے جائیں۔ ان منکروں سے ہم نمٹ لیں گے۔ چند دن یہ اپنی سرکشی دکھا لیں اور مزے اڑا لیں آخر انہیں ہمارے ہاں ہی آنا ہے یہ ہماری گرفت سے بچ نہیں سکتے۔

[۳۲] ۞ الحمد للہ جب فریق مخالف اپنے ہی اعتراف میں پھنس جائے:۔ یعنی اللہ کی تعریف اس بات پر ہے کہ انہوں نے یہ تو خود ہی تسلیم کر لیا کہ آسمانوں اور زمین یعنی کل کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اب ان کے اس اعتراف کا جو لازمی نتیجہ نکلتا ہے اس سے یہ لوگ بے خبر ہیں یا بے خبر رہنا چاہتے ہیں۔ اور ایسی باتیں کر جاتے ہیں جو ان کے اس اعتراف کی عین ضد ہیں۔ مثلاً ایک شخص جب یہ اعتراف کرتا ہے کہ زمین و آسمان کا خالق صرف اللہ تعالیٰ ہے تو پھر اسے لازماً یہ بھی تسلیم کر لینا چاہئے کہ الٰہ اور رب بھی صرف اللہ ہی ہو سکتا ہے۔ بندگی اور عبادت کا مستحق بھی وہی ہو سکتا ہے۔ اپنی مخلوق کا حاکم وہی اور شارع بھی وہی ہو سکتا ہے۔ دعا اور فریاد بھی صرف اسی سے کرنا چاہئے۔ عقلی لحاظ سے یہ کیسے قابلِ تسلیم ہو سکتا ہے کہ خالق تو کوئی اور ہو اور معبود اس کی مخلوق بن بیٹھے۔ اور جو شخص اللہ کو خالق تسلیم کر لینے کے بعد دوسروں کو معبود سمجھتا ہے اور اپنی حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لئے دوسروں کو پکارتا ہے اسے اپنی عقل کا ماتم کرنا چاہئے۔

[۳۳] پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی صفت خالقیت کا ذکر تھا اور اس پہلو سے شرک کے بطلان پر دلیل پیش کی گئی تھی۔ اس

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝ وَلَوْ اَنَّمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ
الْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

بلاشبہ اللہ ہی بے نیاز[۳۴] اور لائق حمد و ثنا ہے۔(۲۶)

زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب قلمیں بن جائیں اور سمندر روشنائی بن جائے پھر اس کے بعد سات مزید سمندر بھی روشنائی مہیا کریں تو بھی اللہ کی باتیں[۳۵] ختم نہ ہوں گی۔ بلاشبہ اللہ غالب اور حکمت والا ہے(۲۷)

آیت میں اللہ کے ہر چیز کا مالک ہونے کا ذکر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کائنات کو پیدا کر کے کہیں علیحدہ نہیں جا بیٹھا بلکہ وہ اس کے سر پر ہر آن موجود ہے۔ وہ ان چیزوں پر کنٹرول رکھے ہوئے ہے۔ ان پر قابض ہے۔ اور جس طرح ان چیزوں میں چاہے تصرف بھی کر سکتا ہے اور کر رہا ہے اور اس کی ساری مخلوق اس کی مملوک بھی ہے۔ کسی مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی اس ملکیت میں سے کسی چیز پر بھی شاہانہ اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ بلکہ اگر اللہ نے کوئی چیز کسی کی مِلک میں کر دی ہے تو وہ اس میں اسی حد تک تصرف کر سکتا ہے یا اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے جس حد تک شریعت نے اجازت دے رکھی ہے۔

[۳۴] اس جملہ کی تشریح کے لئے اسی سورہ کی آیت نمبر ۱۲ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیے۔

[۳۵] ۞ اللہ کے کلمات سے مراد اور اللہ کے کلمات لاتعداد ہیں:۔ اللہ کے کلمات سے مراد اس کے تخلیقی کارنامے، اس کے عجائبات، کرشمے اور اس کی خوبیاں ہیں۔ اور ان کے بے شمار پہلو ہیں۔ مثلاً انسان کے اندر کی دنیا کے عجائبات اور بیرونی دنیا کے عجائبات۔ انسان کی عقل اور علم ان دونوں میں کسی کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ اور جو کچھ وہ جان سکا ہے اسے بھی ضابطۂ تحریر میں لانا ناممکن ہے اور نہ بیان کیا جا سکتا ہے جہاں انسان کی عقل اور اس کا علم خود ہی ورطہ حیرت میں پڑ جائے اسے وہ لکھے گا کیا اور بیان کیا کر سکتا ہے؟ پھر یہ ایک نوع انسان ہی کی بات نہیں جو اربوں کی تعداد میں دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ حیوانات کی تقریباً دس لاکھ انواع ایسی ہیں جو انسان کے علم میں آچکی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی جسمانی ساخت اور نظام زیست دوسری تمام انواع سے الگ ہے۔ یہی حال نباتات اور جمادات اور سمندری مخلوق کا ہے پھر بہت سی ایسی مخلوق ہے جو انسان کے علم میں آہی نہیں سکی اور نہ آسکتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے یہ تخلیقی کارنامے ختم نہیں ہو گئے بلکہ ہر آن جاری ہیں اور اس کی مخلوق میں ہر آن ترقی اور اضافہ ہو رہا ہے۔ جیسا کہ بعض دوسری آیات مثلاً ۵۱: ۴۷ اور ۵۵: ۲۹ میں یہ صراحت موجود ہے۔ لہٰذا اس آیت میں جو یہ بیان ہوا ہے کہ تمام درختوں کی قلمیں بنالی جائیں اور سارے سمندر بلکہ اتنے اور بھی سیاہی بن جائیں تو یہ چیزیں تو ختم ہو سکتی ہیں مگر اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے۔ اس میں کچھ مبالغہ معلوم نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ ان چیزوں کی خواہ کتنی ہی زیادہ تعداد ہو بہر حال وہ محدود ہے اور ان کا شمار کیا جا سکتا ہے جبکہ اللہ کے کلمات لامحدود ہیں جن کا کچھ حد و حساب ممکن نہیں۔ اور یہ تو مسلّمہ امر ہے کہ محدود چیز لامحدود کا کبھی احاطہ نہیں کر سکتی۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ ۗ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ﴿٢٨﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى وَأَنَّ اللَّهَ

تم سب کو پیدا کرنا اور دوبارہ زندہ کر کے اٹھا دینا (اللہ تعالیٰ کے لئے) ایسا ہی ہے جیسے صرف ایک نفس کو پیدا کرنا[۳۶]، اللہ بلاشبہ سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے (۲۸) کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور سورج اور چاند کو کام[۳۷] پر لگا دیا ہے۔ ہر ایک مقررہ وقت تک چلتا[۳۸] رہے گا

[۳۶] اللہ کے تخلیقی اور توصیفی کارنامے:۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ اربوں انسانوں کی پکار بیک وقت سن لیتا ہے۔ ایک انسان کی دعا سننا اسے دوسروں کی دعا سننے سے غافل یا قاصر نہیں بنا سکتا۔ اس کے لئے ایک انسان کی ایک وقت میں دعا سننا اور اربوں انسانوں کی اسی وقت میں دعا سننا برابر ہے۔ پھر اس کی مخلوق صرف انسان ہی نہیں لاکھوں انواع ہیں اور اربوں کھربوں کی تعداد میں ہیں۔ وہ ان سب کی وہ دعا و فریاد سنتا ہے۔ اور ایک چیونٹی کی بھی فریاد اسی طرح سنتا ہے جیسے ایک انسان کی۔ پھر معاملہ صرف سننے تک محدود نہیں۔ بلکہ انہی کمالات کے ساتھ وہ اپنی ساری مخلوق کو دیکھ بھی رہا ہے۔ ان کے ظاہری اور باطنی حالات سے واقف بھی ہے۔ انہیں رزق بھی پہنچا رہا ہے اور ان کی جملہ ضروریات بھی پوری کر رہا ہے۔ یہی حال اس کی تخلیق کا بھی ہے۔ اس کا ایک انسان کو پیدا کرنا بھی ایسے ہی ہے جیسے سب انسانوں کا پیدا کرنا۔ وہ ایک ہی وقت میں لاکھوں انسانوں اور اربوں دوسری مخلوق کو اس وقت بھی پیدا کر رہا ہے اور قیامت کو مرنے کے بعد دوبارہ بھی انسانوں کو ایسے ہی بیک وقت اٹھا کھڑا کرے گا اور اس کے لئے ایک انسان کے دوبارہ پیدا کرنے اور سب انسانوں کے دوبارہ پیدا کرنے میں کوئی فرق نہیں۔

[۳۷] چاند اور سورج کی الوہیت کی تردید:۔ اللہ تعالیٰ نے رات اور دن کا ذکر فرمایا تو ساتھ ہی سورج اور چاند کا بھی ذکر فرمادیا۔ سورج کا تعلق دن کے اوقات سے ہے اور چاند کا رات کے اوقات سے اور یہی دو سیارے ہیں جو اہلِ زمین کو سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ اور اکثر ادوار میں ان دونوں کی ہی پوجا اور عبادت کی جاتی رہی ہے۔ اور ان دونوں کو اللہ تعالیٰ نے ایسے کام پر لگا دیا ہے جس سے وہ سر مو سرتابی نہیں کر سکتے۔ قابلِ غور و فکر بات یہ ہے کہ اللہ کی جو مخلوق اپنے کام میں اس طرح جکڑی ہوئی ہو کیا وہ معبود ہونے کی اہلیت رکھتی ہے؟ جو چیز اپنے اختیار سے نہ ایک لحہ آگے پیچھے رہ سکتی ہے اور نہ ایک انچ ادھر ادھر سرک سکتی ہے، ایسی بے اختیار مخلوق کو معبود سمجھ لینا حماقت نہیں تو کیا ہے؟

[۳۸] مشرکین اور دہریہ کا رد:۔ اس مقررہ وقت کے بعد ان کی حرکت یا ان کی گردش ختم ہو جائے گی۔ بالفاظ دیگر یہ نظام لیل و نہار ختم کر دیا جائے گا۔ اور اس سورج اور چاند کا وجود فنا ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ چیزیں ایک مقررہ وقت تک ہیں ابدی نہیں ہیں۔ اور اگر ابدی نہیں تو ازلی بھی نہیں ہو سکتیں۔ گویا یہ چیزیں حادث ہیں اور فنا ہونے والی ہیں۔ گویا اس آیت میں دہریوں کا رد بھی موجود ہے جو اس کائنات کو ازلی ابدی سمجھتے ہیں اور مشرکوں کا بھی رد ہے جو ان فانی چیزوں کو معبود سمجھے بیٹھے ہیں۔

بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۹﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ
الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۳۰﴾ ع اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ ۳ ع ۱۱ ۱۲
لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۳۱﴾ وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا

اور جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ اس سے [۳۹] باخبر ہے۔(۲۹)

یہ اس لئے کہ اللہ ہی حق ہے اور اس کے علاوہ جنہیں وہ پکارتے ہیں سب باطل [۴۰] ہے اور اللہ ہی عالی شان اور کبریائی والا [۴۱] ہے۔(۳۰) کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے سمندر میں کشتی چلاتا ہے تاکہ تمہیں اپنی نشانیاں [۴۲] دکھائے۔ اس میں ہر صابر و شاکر کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں (۳۱) اور جب ان پر سائبانوں جیسی کوئی موج چھا جاتی ہے تو اللہ کی مکمل حاکمیت کو تسلیم کرتے ہوئے خالصتاً [۴۳] اسے پکارتے ہیں

[۳۹] دہریہ حضرات تو سرے سے روزِ آخرت کے منکر ہوتے ہیں اور مشرکین میں سے اکثر تو آخرت کے منکر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ دور نبوی میں مشرکین مکہ اور ایران کے آتش پرست دونوں آخرت کے منکر تھے اور بعض مشرک عقیدہ آخرت کے منکر تو نہیں ہوتے مگر اس عقیدہ میں کچھ مزید ایسے عقیدے شامل کر لیتے ہیں جو عقیدہ آخرت کے اصل مقصد کو فنا کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے سب لوگوں کی طرز زندگی اس دنیا میں شتر بے مہار کی طرح گزرتی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ساتھ ہی یہ وعید سنا دی کہ اللہ تمہارے اعمال سے پوری طرح باخبر ہے اور ان کی تمہیں سزا دینے پر بھی قادر ہے۔

[۴۰] یعنی اللہ تعالیٰ کے معبود برحق ہونے کی دلیل تو یہ ہے کہ اس نے رات اور دن کا نظام قائم کیا اور یہ نظام اس قدر پیچیدہ ہے جس کے مطالعہ سے از خود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایسا نظام کوئی کمال درجے کی مقتدر اور حکیم ہستی ہی قائم کر سکتی ہے اور سورج اور چاند بھی اسی نظام کا ایک حصہ ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اللہ کے سوا جن چیزوں کو لوگوں نے معبود بنا رکھا ہے اور انہیں پکارتے ہیں انہوں نے کیا بنایا ہے کہ انہیں بھی الوہیت کا مستحق اور حصہ دار بنایا جائے؟ اور اس کا جواب نفی میں ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ معبود سراسر باطل ہیں۔

[۴۱] یعنی کائنات کی ہر چیز سے اس کی شان بھی بلند اور بڑائی میں بھی کائنات کی ہر چیز سے بڑا ہے اور ان دونوں صفات کا مجموعہ ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ میں پایا جاتا ہے۔ اس میں ایک لطیف اشارہ یہ بھی پایا جاتا ہے اللہ کی ان صفات کے مقابلہ میں بندہ میں انتہائی پستی اور تذلیل (یہی دراصل عبادت کا معنی ہے) اللہ ہی کے لئے ہونا چاہئے۔

[۴۲] ۞ پانی کی خاصیت اور کشتی سازی:۔ کشتیوں اور جہازوں کے سطح آب پر چلنے میں اللہ کی کئی نشانیاں اور مہربانیاں ہیں۔ پانی کی یہ خاصیت ہے کہ وہ ہر چیز کو اوپر کی طرف اٹھاتا ہے۔ بالفاظ دیگر پانی میں ہر چیز کا وزن ہوا میں وزن کی نسبت کم ہوتا ہے اور یہ کمی کسی چیز کے حجم کے برابر پانی کے حجم کے مطابق ہوتی ہے۔ یہی وہ طبعی قانون ہے جس کے باعث انسان سمندر پر کشتیاں اور جہاز چلانے پر قادر ہو سکا ہے۔ پھر سمندر میں تلاطم خیز موجیں اور آندھی کے طوفان انسان کو ہلاکت سے فوراً دوچار کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں سمندر میں اتنی عظیم الجثہ مخلوق موجود ہے جو ایک ٹکر سے ہی کشتیوں اور جہازوں کو ڈبو سکتی ہے۔ یہ بس اللہ کی خاص مہربانی ہی ہوتی ہے کہ انسان اکثر اوقات سمندری سفر خیر و عافیت سے طے کر لیتا ہے۔

[۴۳] تلاطم خیز موجوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس لئے فرمایا کہ ایسے طوفان سمندر میں اکثر اٹھتے رہتے ہیں۔ اس وقت تو سب

نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ۝۳۲ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ
اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۡ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ
شَيْـًٔا ۭ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۪ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝۳۳ اِنَّ اللّٰهَ

پھر جب وہ انہیں بچا کر خشکی تک لے آتا ہے تو پھر کچھ ہی لوگ حد اعتدال پر رہتے [۴۴] ہیں اور ہماری نشانیوں کا انکار صرف وہی کرتے ہیں جو غدار [۴۵] اور ناشکرے ہوں۔(۳۲) اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرتے رہو اور اس دن سے ڈر جاؤ جب نہ تو کوئی باپ اپنے بیٹے کے کچھ کام [۴۶] آئے گا اور نہ بیٹا باپ کے۔ اللہ کا وعدہ یقیناً سچا ہے لہٰذا یہ دنیا کی زندگی تمہیں دھوکہ [۴۷] میں نہ ڈال دے اور نہ کوئی دھوکے باز تمہیں اللہ کے بارے [۴۸] دھوکہ میں ڈالے(۳۳)

لوگ کیا مشرک اور کیا دہریے سب ہی اللہ کو پکارنے لگتے ہیں۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وجود اور توحید باری تعالیٰ دونوں باتیں ہی انسان کی فطرت میں موجود ہیں۔

[۴۴] ❁ مقتصد کے دو مفہوم:۔ مقتصد ذو معنی لفظ ہے۔ اس کا اصل معنی تو اعتدال پر قائم رہنے والا ہے۔ پھر اس کے مفہوم میں راہ راست پر آجانے والا بھی شامل ہے۔ یعنی وہ شخص جو مصیبت میں اللہ سے کئے ہوئے وعدہ کو یاد رکھے اور اسے پورا کرے جیسا کہ عکرمہ بن ابو جہل کے متعلق پہلے لکھا جاچکا ہے۔ (دیکھئے سورہ الانعام کی آیت نمبر ۴۱ کا حاشیہ)

دوسرا مطلب یہ ہے کہ دہریے لوگ بھی اللہ سے انکار اور اللہ کے اقرار کے درمیان کی سطح پر آجاتے ہیں۔ کٹر منکر نہیں رہتے۔ یہی حال مشرکوں کا ہوتا ہے وہ اپنے معبودوں کی حاجت روائی اور مشکل کشائی کے بارہ میں شک میں پڑ جاتے ہیں۔ مشرکوں کا اپنے معبودوں پر پورا اعتقاد نہیں رہتا۔

[۴۵] جن لوگوں کی عادت ہی یہ ہو کہ خواہ ان پر انعامات کی کس قدر بارش کر دی جائے انہوں نے شکر ادا کرنا یا احسان مان لینا سیکھا ہی نہ ہو، ایسے لوگ خطرہ ٹل جانے کے بعد پھر اپنے سابقہ طرز زندگی یعنی کفر، شرک یا دہریت کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔

[۴۶] دنیا میں باپ بیٹے کا رشتہ ہی ایسا ہے جو مصیبت کے وقت ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ مگر قیامت کے دن دہشت اتنی زیادہ ہوگی کہ باپ بیٹے سے چھپتا پھرے گا۔ اور بیٹا باپ سے 'ہر ایک اپنی مصیبت میں ہی ایسا گرفتار ہوگا کہ دوسرے کی طرف توجہ کرنے کا ہوش نہ ہوگا۔ اور نہ ہی کوئی شخص دوسرے کی مصیبت اپنے سر لینے کے لئے تیار ہوگا۔ نہ بیٹے میں اتنی ہمت ہوگی کہ وہ یہ کہہ سکے کہ باپ کے بدلے مجھے جہنم میں بھیج دیا جائے اور نہ باپ ہی ایسا کہہ سکے گا جب ایسے قریبی رشتہ داروں تک کا یہ حال ہوگا تو اور کوئی شخص کیسے کسی دوسرے کے کام آسکتا ہے؟ لہٰذا ہر انسان کو اس دن کی ہولناکی سے اپنے بچاؤ کی فکر خود کرنا چاہئے۔ چنانچہ جب آیت ﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ نازل ہوئی، آپ ﷺ نے کوہ صفا پر چڑھ کر اپنے قریبی رشتہ داروں کو بلایا اور ہر ایک کا نام لے لے کر فرمایا تھا کہ اپنی فکر خود کر لو۔ اس دن میں تمہارے کسی کام نہ آسکوں گا۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ زیر آیت متعلقہ)

[۴۷] ❁ دنیا کی زندگی میں دھوکے کے مختلف پہلو:۔ یعنی اسی دھوکہ میں نہ پڑے رہو کہ تمہارا مقصد حیات ہی یہ بن جائے کہ ہمارا معیار زندگی بلند سے بلند تر ہونا چاہئے یا تم دنیا کی زندگی پر اس قدر فریفتہ اور مفتون ہو جاؤ کہ یہ سمجھ بیٹھو کہ بس

عِندَهُۥ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ
غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿٣٤﴾ ع ۴ ۱۴

قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس[۴۹] ہے وہی بارش برساتا ہے، وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے بطنوں میں کیا کچھ ہے۔ نہ ہی کوئی یہ جانتا ہے کہ کل کیا کام کرے گا۔ اور نہ ہی یہ جانتا ہے کہ کس سرزمین[۵۰] میں وہ مرے گا۔ اللہ ہی ہے جو سب کچھ جاننے والا اور وہ بڑا باخبر ہے۔(۳۴)

جو کچھ ہے یہی دنیا کی زندگی ہے اور عملاً اخروی زندگی کے منکر بن جاؤ یا یہ سمجھنے لگ جاؤ کہ اس دنیا میں خوشحالی کی زندگی ہی حق و باطل کا معیار ہے یا یہ سمجھو کہ دنیا میں خوشحالی اللہ کی رضامندی کی دلیل ہے۔ یا یہ سمجھ بیٹھو کہ ابھی تو مزے کر لیں۔ بڑی عمر پڑی ہے بعد میں توبہ کر لیں گے۔ دنیوی زندگی کے متعلق یہ سارے نظریہ ہائے فکر سراسر دھوکا اور فریب ہیں۔

[۴۸] اللہ کے نام پر دھوکا دینے والے شیطان:۔ غرور (غ پر فتحہ) مبالغہ کا صیغہ ہے۔ یعنی بڑا دھوکہ باز۔ ہر وقت دھوکہ دینے والا۔ اگرچہ اکثر لوگ اس سے مراد شیطان ہی لیتے ہیں۔ تاہم اس سے مراد انسان بھی ہو سکتے ہیں۔ افراد بھی، ادارے بھی اور حکومتیں بھی۔ جو شخص یا ادارہ کسی انسان کو فریب میں مبتلا کر کے اس کے لئے گمراہی کا سبب بن جائے وہ اس کے لئے دھوکا باز یا غرور ہے۔ اور وہ دھوکا بھی اللہ کے معاملہ میں دیتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اللہ نے اپنے سارے اختیارات اپنے پیارے بندوں اور ولیوں کو دے رکھے ہیں۔ لہٰذا اب جو کچھ مانگنا ہو انہیں سے مانگنا چاہئے۔ یا یہ کہ اللہ بڑا غفور و رحیم ہے وہ ہمیں دوزخ میں کیوں ڈالے گا؟ یا ڈال کر کیا کرے گا؟ پھر یہ خیال کر کے گناہوں پر دلیر ہو جاتے ہیں یا اگر فلاں بدعی کام کیا جائے تو اللہ یقیناً اس سے خوش ہو گا اور ہمیں اس کا اجر و ثواب ملے گا۔ غرضیکہ شیطان اور اس کے ایجنٹ اس کی نت نئی نئی شکلیں بجھاتے رہتے ہیں۔

[۴۹] حدیث جبریل:۔ کفارِ مکہ اکثر آپ سے پوچھتے رہتے تھے کہ قیامت کب آئے گی؟ کتاب و سنت میں اس کے کئی الگ الگ جواب مذکور ہیں۔ مثلاً ایک جواب یہ ہے کہ قیامت جب بھی آئی یک لخت ہی آ جائے گی۔ کبھی قربِ قیامت کی علامات بتا دی گئیں۔ ایک صحابی نے یہی سوال کیا تو آپ ﷺ نے اسے پوچھا: کیا تم نے اس کے لئے کچھ تیاری کر رکھی ہے؟ ایک سائل کو آپ ﷺ نے یہ جواب دیا کہ جو شخص مر گیا بس اس کی قیامت قائم ہو گئی۔ لیکن اس سوال کا بالکل ٹھیک جواب یہی ہے کہ قیامت کا علم صرف اللہ کو ہے۔ کسی نبی کو بھی نہیں حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی نہ تھا۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے۔

سیدنا ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک آدمی پیدل چلتا ہوا آیا (یہ جبریل علیہ السلام تھے) اور کہنے لگا: ”یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ایمان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی نازل کردہ کتابوں اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے، اور (قیامت کے دن) ان سے ملنے کا یقین رکھے اور مر کر جی اٹھنے پر ایمان لائے، پھر وہ کہنے لگا: ”اسلام کیا ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ تو صرف اللہ ہی کی پرستش کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائے (فرض) نماز اور زکوٰۃ ادا کرتا رہے، اور رمضان کے روزے رکھے“ پھر اس نے

پوچھا: "احسان کیا ہے؟" آپ نے فرمایا: احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی یوں عبادت کرے جیسے اسے دیکھ رہا ہے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو کم از کم یہ سمجھے کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ پھر اس نے پوچھا: "اے اللہ کے رسول ﷺ! قیامت کب آئے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جس سے یہ سوال کر رہے ہو وہ بھی سائل سے زیادہ نہیں جانتا (یعنی دونوں ایک جیسے ناواقف ہیں) البتہ میں تجھے قیامت کی وہ نشانیاں بتاتا ہوں ایک یہ ہے کہ عورت اپنا مالک جنے گی۔ دوسرے یہ کہ ننگے پاؤں پھرنے والے اور ننگے بدن (گنوار قسم کے لوگ) لوگوں کے رئیس ہوں گے۔ دیکھو ان پانچ باتوں میں سے ایک قیامت بھی ہے جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، وہی جانتا ہے کہ قیامت کب آئے گی، اور بارش کب برسے گی، اور ماؤں کے پیٹ میں کیا کچھ (تغیر و تبدل ہوتا رہتا) ہے پھر وہ شخص لوٹ کر چل دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ذرا اسے بلا لاؤ۔ لوگ بلانے لگے تو دیکھا وہاں کوئی نہ ملا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ جبرئیل تھے جو آپ لوگوں کو دین کی باتیں سکھانے آئے تھے" (بخاری۔ کتاب التفسیر)

یہ حدیث، حدیثِ جبرئیل علیہ السلام کے نام سے مشہور ہے۔ اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ قیامت کا معین وقت نہ جبرئیل علیہ السلام کو معلوم تھا اور نہ رسول اللہ ﷺ کو۔ اس کا معین وقت نہ بتانے میں حکمت یہ ہے کہ قیامت کا معین وقت اور اسی طرح کسی کو اس کی موت کا متعین وقت بتا دینے سے اس دنیا کے دارالامتحان ہونے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ اسی لئے نہ موت کے وقت کا ایمان مقبول ہے اور نہ قیامت کو مقبول ہوگا نیز جب قیامت کی صریح علامات مثلاً سورج کا مغرب سے طلوع ہونا وغیرہ ظاہر ہو گئیں تو اس وقت بھی ایمان لانا مقبول نہ ہوگا۔

[۵۰] ۞ غیب کے جن امور کا انسان کو علم نہیں ہو سکتا:۔ قیامت کے علاوہ چار باتیں اور بھی ہیں۔ جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ان چار میں سے پہلی بات یہ ہے کہ نفع رساں بارش کب ہوگی۔ دوسری یہ کہ مادر رحم میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ اور اس میں یہ بھی شامل ہے کہ جب جنین میں روح ڈالی جاتی ہے تو ساتھ ہی فرشتہ اس کی عمر، اس کی روزی، (یعنی اسے کتنا رزق ملے گا) خوشحال ہوگا یا تنگ دست، نیز یہ کہ نیک بخت ہوگا یا بد بخت یہ باتیں بھی مادر رحم کے مراحل میں شامل ہیں۔ تیسری یہ بات وہ کل کیا کرے گا یعنی اسے توبہ کی توفیق نصیب ہوگی یا نہیں۔ بلکہ اسے کل تک جینا بھی نصیب ہوگا یا نہیں۔ اور چوتھی یہ بات کہ وہ کب اور کہاں مرے گا۔ یہ چار باتیں ایسی ہیں جن سے ہر انسان کو دلچسپی ہوتی ہے۔ اس لئے بالخصوص ان باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ورنہ اور بھی کئی امور ایسے ہیں۔ جو غیب سے تعلق رکھتے ہیں اور ان تک انسان کی رسائی نہیں ہو سکتی۔

۳۰ آیاتھا سُوْرَةُ السَّجْدَةِ مَكِّيَّةٌ رکوعھا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۝١ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٢ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ

کلمات ۳۷۴ آیت ۳۰ (۳۲) سورۃ السجدۃ مکی ہے (۷۵) رکوع ۳ حروف ۱۵۷۷

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

ا۔ل۔م (۱) اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب (قرآن) پروردگار عالم کی طرف سے [۱] نازل شدہ ہے۔(۲) کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ اس (نبی) نے اس (قرآن) کو خود ہی گھڑ لیا ہے (بات یوں نہیں) بلکہ یہ آپ کے پروردگار [ا۔الف]

[۱] اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی درست ہیں۔ ایک تو ترجمہ سے ہی واضح ہے یعنی اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب فرمانروائے کائنات کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب جو فرمانروائے کائنات کی طرف سے نازل شدہ ہے اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس آیت میں دراصل مشرکین مکہ کے کئی اعتراضات کا جواب آ گیا ہے۔ کبھی وہ کہتے تھے کہ اسے کوئی عجمی سکھا جاتا ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ اس نے خود ہی تصنیف کر ڈالی ہے۔ اس اعتراض کے پہلو بے شمار تھے مگر سب کا ماحصل یہی تھا کہ یہ کتاب نہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے، نہ ہی یہ اللہ کا رسول ہے۔ بلکہ اس نے خود بعض دوسرے لوگوں کی مدد سے اسے گھڑ کر یہ بات اللہ کے ذمہ لگا دی ہے جیسا کہ اگلی آیت سے ظاہر ہے۔

[ا۔الف] تصنیف کے لئے مہارت لازمی ہے:۔ سوچنے کی بات ہے کہ کوئی انسان صرف اسی موضوع پر کتاب لکھ سکتا ہے جس میں اسے مہارت حاصل ہو اور لوگوں میں وہ اس فن کے عالم کی حیثیت سے کسی حد تک معروف ہو۔ اور تصنیف اس لئے کرتا ہے کہ وہ لوگوں پر اپنی علمیت اور مہارت کا سکہ بٹھائے اور لوگوں میں اور اس کی کتاب کو عام مقبولیت حاصل ہو۔ لیکن یہاں معاملہ سارے کا سارا اس سے بالکل برعکس تھا۔ نبوت کے بعد آپ نے جو کلام پیش کیا۔ نبوت سے پیشتر آپ نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی جس سے نبوت کے بعد والے کلام کے لئے کوئی اشارہ تک بھی پایا جاتا ہو۔ پھر آپ ﷺ نے جو کلام پیش کیا جو ان لوگوں کی عادات، رسوم، مزاج اور طبائع کے یکسر مخالف تھا اس سے آپ کا لوگوں میں مقبول ہونا تو دور کی بات ہے آپ ﷺ نے گویا یہ کلام پیش کر کے کسی بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا جس سے پوری قوم آپ کی دشمن بن گئی۔ اب کفار سے سوال یہ ہے کہ کیا کوئی شخص ایسا کام اپنی مرضی سے کر سکتا ہے جس سے سب لوگ اس کے دشمن بن جائیں؟ اور اگر یہ بات عقلاً محال ہے تو پھر یہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس کام پر مامور کیا ہے کہ وہ اللہ کا کلام لوگوں کے سامنے پیش کر دے۔ اس سے لوگ اس کے مخالف ہوتے ہیں تو ہو جائیں، اسے دکھ پہنچاتے ہیں تو پہنچالیں اور اس کے دشمن بنتے ہیں تو بن جائیں مگر وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت قاہرہ کے سامنے اس بات کا پابند ہے کہ حالات خواہ کتنے ہی ناخوشگوار پیش آئیں وہ اللہ کا کلام لوگوں تک پہنچا دے۔

مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۳﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ
خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ
مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ۭ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴﴾ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاۗءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ

کی طرف سے حق ہے۔ تاکہ آپ اس قوم کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا[۲]۔ شاید وہ ہدایت[۳] پا جائیں (۳) اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کچھ چھ دنوں میں پیدا کیا پھر عرش[۴] پر قائم ہوا۔ اس کے سوا تمہارا نہ کوئی سرپرست ہے اور نہ سفارشی[۵]۔ کیا تم کوئی سبق حاصل نہیں کرتے۔ (۴) وہی آسمان سے زمین تک کے انتظام کی تدبیر کرتا ہے۔ پھر ایک روز جس کی مقدار

[۲] ❁ عرب میں کون کون سے انبیاء مبعوث ہوئے؟:۔ عرب میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے مدتوں پہلے سیدنا ہود علیہ السلام، قوم عاد کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور صالح علیہ السلام قوم ثمود کی طرف ان کے بعد سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا اسماعیل علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ پھر ان کے بعد سیدنا شعیب علیہ السلام پیدا ہوئے۔ باقی زیادہ تر انبیاء شام اور فلسطین کے علاقہ میں بھی مبعوث ہوتے رہے۔ سیدنا شعیب علیہ السلام اور رسول اللہ ﷺ کا درمیانی وقفہ دو ہزار سال کے لگ بھگ ہے۔ اور چونکہ یہ دو ہزار سال کی مدت بھی ایک طویل مدت ہے جس میں بہت سے انبیاء عرب کی حدود سے باہر مبعوث ہوتے رہے اسی لئے فرمایا کہ اہل عرب کے پاس پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔

[۳] ❁ آپ کی نبوت سے پہلے کے اسلام پسند حضرات:۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب دو ہزار سال تک اہل عرب کے ہاں کوئی رسول ہی نہ آیا ہو نہ ہی اللہ کی طرف سے حجت پوری ہوئی ہو تو پھر ان لوگوں کو ان کے کفر و شرک کی بنا پر عذاب کیوں کر ہو گا جبکہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ وہ عذاب سے پہلے لوگوں پر حجت پوری کر لیتا ہے اور کسی پر ذرہ بھر بھی ظلم و زیادتی نہیں کرتا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء کی تعلیم ان لوگوں تک بھی برابر پہنچتی رہی تھی۔ کیونکہ ان لوگوں کا شام و فلسطین کے لوگوں سے گہرا میل جول بھی تھا اور تجارتی قافلے بھی آتے جاتے رہتے تھے لہٰذا ان مشرکینِ مکہ میں بھی ایسے لوگ ہر دور میں موجود رہے جو شرک سے بیزار اور توحید کے قائل تھے بعثت نبوی کے وقت بھی ایسے لوگ موجود تھے جو شرک سے بیزاری کے علاوہ شراب نوشی، جاہلی حمیّت اور جدال و قتال سے بھی متنفر تھے۔ لیکن انہیں کوئی واضح راہ نہیں مل رہی تھی۔ نہ ہی ایسے لوگوں کے باہمی اتحاد کی کوئی صورت ممکن تھی۔ ایسے لوگوں کو جب ایک پیغمبر کے مبعوث ہونے کی خبر ملی تو گویا ان لوگوں کے دل کی مراد بر آئی اور وہ فوراً اسلام لے آئے۔ ان میں سرفہرست تو ورقہ بن نوفل ہیں جو بعثت کے وقت صاحبِ فراش تھے۔ جلد ہی فوت ہو گئے اور انہیں باقاعدہ اسلام لانے کا اعزاز حاصل نہ ہو سکا۔ باقی سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا عثمان بن مظعون، سیدنا صہیب رومی، سیدنا ابوذر غفاری، سیدنا سعید بن زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہم وغیرہ سب کے سب شرک سے بیزار اور موحد تھے جو فوراً اسلام لے آئے تھے۔ پھر بے شمار ایسے موحد بھی ہمیں تاریخ میں ملتے ہیں جو آپ کی بعثت سے پیشتر فوت ہو چکے تھے اور یہ سب انبیائے بنی اسرائیل کی تعلیمات کا اثر تھا۔

[۴] ﴿اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ کی تفسیر کے لئے سورہ اعراف آیت نمبر ۵۴ کا حاشیہ ملاحظہ فرمایئے۔

[۵] یعنی جو ہستی اتنی زبردست ہے کہ پوری کائنات کو عدم سے وجود میں لا سکتی ہے اس کے مقابلہ میں تمہارے یہ معبود جنہیں

فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝۵ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝۶

الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝۷ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ

تمہارے حساب سے ایک ہزار سال ہے وہی انتظام[۶] اس کی طرف اٹھ جائے گا(۵) یہ (ہے اللہ جو) ہر پوشیدہ اور ظاہر بات کا جاننے والا ہے وہ سب پر غالب[۷] اور رحم کرنے والا ہے۔(۶) جس نے جو چیز بھی بنائی خوب[۸] بنائی اور انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی(۷) پھر اس کی نسل کو

تم اپنا سرپرست اور سفارشی سمجھے بیٹھے ہو تمہارے کس کام آسکتے ہیں۔ کیا تمہیں ایسی موٹی سے بات کی بھی سمجھ نہیں آتی؟

[۶] اللہ تعالیٰ ہزار سالہ پروگرام مدبرات امر کے حوالہ کر دیتا ہے جس میں کسی قوم پر عذاب بھی شامل ہے:۔ اس کے تخلیقی کارناموں کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک کام کا ارادہ کرتا ہے یا اس کی اسکیم بناتا ہے تو تدبیر امور پر مامور فرشتوں کو اس کی خبر دیتا ہے جو اللہ کے حکم کے مطابق نیچے اترتے ہیں۔ تمام اسباب ظاہری و باطنی خواہ زمین سے متعلق ہوں یا آسمان سے سب کے سب خود بخود جمع ہو کر اس کام کی تکمیل کے انصرام میں لگ جاتے ہیں۔ اور ایک دن میں جب یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے تو فرشتے اللہ کے حضور حاضر ہو کر اس کی روداد پیش کر دیتے ہیں۔ اور یہ ایک دن اہل دنیا کے حساب کے مطابق ایک ہزار سال کی مدت ہوتی ہے۔ گویا فرشتوں کو ایک ہزار سالہ پروگرام اللہ تعالیٰ دے دیتے ہیں۔ جب یہ کام سرانجام پا چکتا ہے تو پھر اگلا ایک ہزار سالہ پروگرام مدبرات امر فرشتوں کے حوالہ کر دیا جاتا ہے۔

اس آیت میں دراصل ان مشرکوں کے اس اعتراض کا جواب دیا جا رہا ہے جو اس بات پر مصر تھے اور نبیوں سے کہتے رہتے تھے کہ جس عذاب کی تم دھمکی دیتے ہو وہ آ کیوں نہیں جاتا؟ یا تم اسے ابھی ہم پر لے کیوں نہیں آتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس ہزار سالہ پروگرام میں کسی قوم پر عذاب آنے کا پروگرام بھی شامل ہوتا ہے۔ اور وہ پروگرام کے مطابق اپنے وقت مقررہ پر ہی آتا ہے اس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ جو عذاب کسی قوم کے مقدر ہو چکا ہے وہ اس پر نہ آئے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے سارے کام سوچے سمجھے پروگرام کے مطابق بروئے کار لاتا ہے۔ تمہارے جلدی مچانے کا کچھ فائدہ یا اثر نہیں ہوگا۔

[۷] یعنی وہ ہستی جو اتنے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دے سکے ضروری ہے کہ اس کا علم لامحدود ہو۔ ہر چیز کی ماہیت اور کیفیت اس کے علم میں ہو اور کوئی بھی چیز اس سے چھپی ہوئی نہ ہو نہ چھپ سکتی ہو۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں اتنی قدرت ہو کہ وہ ہر چیز کو اپنی مرضی کے مطابق کام میں لا سکتا ہو۔ نیز اتنی زبردست اور قاہرانہ قدرت رکھنے کے باوجود وہ اپنی مخلوق پر رحیم اور شفیق بھی ہو۔

[۸] مقصد کے لحاظ سے ہر چیز کی اعلیٰ شکل و صورت:۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو چیز بھی بنائی اور جس مقصد یا مقاصد کے لئے بنائی تو اسے ایسی شکل و صورت عطا فرمائی جس سے بہتر شکل و صورت کا تصور میں آنا محال ہے۔ اس شکل و صورت پر کوئی بھی حرف گیری نہیں کر سکتا۔ مثلاً پانی اور ہوا میں اس نے جو جو خواص رکھے ہیں اور جن مقاصد کے لئے یہ چیزیں پیدا کی گئی ہیں ان کے لئے یہی شکل و صورت سب سے بہتر تھی۔ یہی صورت ہر جاندار چیز اور نباتات کی ہے۔ کسی بھی چیز کی شکل و صورت بے

مِّن مَّآءٍ مَّهِينٍ ۝٨ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِۦ ۖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْـِٔدَةَ ۚ
قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۝٩ وَقَالُوٓا أَءِذَا ضَلَلْنَا فِى الْأَرْضِ أَءِنَّا لَفِى خَلْقٍ جَدِيدٍۭ ۚ بَلْ

حقیر [۹] پانی (نطفہ) کے سَت سے چلایا۔ (۸) پھر اسے (رحم مادر) میں درست [۱۰] کیا اور اس میں اپنی (پیدا کی ہوئی) روح پھونکی اور تمہارے کان، آنکھیں اور دل بنائے (مگر) تم کم ہی شکر کرتے ہو۔ (۹) یہ لوگ کہتے ہیں کہ: "جب ہم مٹی میں رل مل جائیں گے تو کیا از سرِ نو پیدا کئے جائیں گے ؟" حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے

ڈھنگی اور بے تکی نہیں ہے۔ انسان کے پورے جسم اور اس کے ایک ایک عضو کا یہی حال ہے۔ مثلاً اللہ نے آنکھ دیکھنے کے لئے اور کان سننے کے لئے بنائے ہیں تو اس مقصد کے لئے جو شکل اللہ نے آنکھ اور کان کی بنا دی ہے یہی اس کے لئے بہتر بھی ہے اور خوبصورت بھی۔

[۹] نطفہ کے ہر جرثومہ میں صاحب نطفہ کی شکل اور عادات و خصائل کا عکس:۔ ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے دو اہم تخلیقی کارناموں کی طرف توجہ دلائی ہے پہلا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مٹی کو مختلف مراحل سے گزار کر انسان کا پتلا اپنے ہاتھ سے تیار کیا پھر اس میں اپنے ہاں سے روح پھونکی یا اپنی روح میں سے روح پھونکی تو ایک محیر العقول اور عظیم الشان چیز وجود میں آ گئی۔ جس میں عقل و شعور، قوتِ ارادہ و اختیار اور قوتِ تمیز و استنباط سب کچھ موجود تھا اور وہ اس قابل بنا دیا گیا کہ وہ خلافت ارضی کا بار اٹھا سکے۔ اور اللہ کا دوسرا محیر العقول تخلیقی کارنامہ یہ ہے کہ پھر انسان کی نسل کو نطفہ اور توالد و تناسل سے چلا دیا۔ جس سے کروڑوں انسان پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ نطفہ کیا ہے؟ حکماء کہتے ہیں کہ یہ چوتھے ہضم کے نتیجہ میں ظہور میں آتا ہے جبکہ خون تیسرے ہضم کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس نطفہ کے ہر قطرہ میں ہزاروں جرثومے ہوتے ہیں اور ایک ایک جرثومہ میں اصل انسان کی شکل و صورت، اس کی عادات اور اس کے خصائل موجود ہوتے ہیں۔ گویا نطفہ کا ایک ایک جرثومہ اس چیز کا چھوٹے سے چھوٹا اور مکمل ترین عکس ہوتا ہے جو صرف طاقتور خوردبین کے ذریعہ سے ہی نظر آ سکتا ہے۔

[۱۰] تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی انفرادی توجہ:۔ پھر اسی انتہائی چھوٹے سے جرثومہ کو رحم مادر میں پیوست کیا تو اس کے بالکل ویسے ہی اعضاء بننے لگے اور ان پر گوشت پوست چڑھنے لگا جس چیز کا وہ جرثومہ تھا اللہ تعالیٰ نے پھر اپنی انفرادی توجہ سے اس میں چند نمایاں اختلاف بھی رکھ دیئے۔ لیکن اعضاء کے توازن و تناسب میں کچھ فرق نہ آنے دیا۔ پھر یہ سب کچھ درست کرنے اور آنکھ، ناک، کان، دل وغیرہ سب اعضاء کو درست اور ٹھیک ٹھاک کر دینے کے بعد اس میں اپنے ہاں سے روح پھونک دی اور مقررہ وقت کے بعد وہ ایک تندرست اور جیتا جاگتا انسان بن کر رحم مادر سے باہر نکل آیا۔ یہ سب باتیں ایسے بدیہی امور ہیں جو سب انسانوں کے مشاہدہ میں آتی رہتی ہیں۔ پھر بھی انسانوں کی اکثریت ایسی ہے جو نہ ان قدرتوں کا اعتراف کرتی ہے اور نہ ان نعمتوں پر اللہ کا شکر بجا لاتی ہے۔ (نیز دیکھئے سورہ حجر کا حاشیہ ۱۹)

هُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۝۱۰ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ
تُرْجَعُوْنَ ۝۱۱ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا

پروردگار کی ملاقات[۱۱] ہی کے منکر ہیں(۱۰) آپ ان سے کہہ دیجئے کہ: موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر ہے تمہاری روح قبض[۱۲] کر لے گا پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔(۱۱) کاش آپ دیکھیں جب مجرم اپنے پروردگار کے حضور سر جھکائے کھڑے ہوں گے (اور کہیں گے) ''اے ہمارے رب! ہم نے (سب کچھ) دیکھ لیا اور سن لیا لہٰذا ہمیں واپس بھیج دے کہ ہم اچھے عمل کریں[۱۳]۔

[۱۱] انسان کی روزِ آخرت سے انکار کی اصل وجہ:۔ یعنی انسان غور کرے تو اسے یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جس اللہ تعالیٰ نے پہلے مٹی کے اجزاء سے ہی انسان کو بنایا تھا وہ دوبارہ اسی مٹی کے اجزاء سے انہیں کیوں نہیں بنا سکتا۔ موجودہ تحقیق کے مطابق انسان جن عناصر کا مرکب ہے۔ وہ سب زمین میں ہی پائے جاتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے انہی عناصر کو ترکیب دے کر پہلے انسان کو پیدا کیا تھا تو وہ عناصر تو اب بھی زمین میں موجود ہیں۔ پھر ان لوگوں کا یہ اعتراض کہ ''جب ہم مٹی میں مل کر مٹی بن جائیں گے تو کیا از سر نو پیدا کئے جائیں گے'' کیا معنی رکھتا ہے اصل بات یہ نہیں کہ انسان کو اس موٹی سی بات کی سمجھ نہیں آسکتی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کے حضور پیش ہونے اور آخرت میں اپنے اعمال کی جوابدہی سے گھبراتے اور جی چراتے ہیں۔ اور یہ تصور چونکہ ان کی آزادانہ زندگی اور خواہشات نفس پر پابندیاں لگاتا ہے۔ لہٰذا وہ ایسے غیر معقول قسم کے اعتراضات گھڑنے لگتے ہیں۔

[۱۲] دوبارہ زندگی پر عقلی دلیل۔ انا یا روح فنا نہیں ہوگی:۔ یہ کفار کے اعتراض کا مکمل جواب ہے یعنی کفار جو یہ کہتے ہیں کہ جب ''ہم'' مٹی میں مل جائیں گے تو یہ ''ہم'' کا تصور کہاں سے آیا؟ واضح سی بات ہے کہ گوشت پوست کے مجموعہ پر لفظ ''ہم'' یا ''تم'' کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اور مرنے کے بعد گوشت پوست تو واقعی مٹی میں مل جائے گا۔ مگر یہ ''ہم'' یا ''تم'' تو مٹی میں نہیں مل سکتا۔ یہی وہ چیز ہے جو تم میں ہم نے پھونکی تھی۔ جس کی وجہ سے تم لوگ اپنے آپ کو ''ہم'' یا ''تم'' کہتے ہو۔ اور یہی چیز یا روح ہماری طرف سے تمہاری موت پر مقرر کردہ فرشتہ اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے۔ اب تمہاری روح پھر ہمارے پاس آگئی۔ زمین کے جن عناصر سے تم پہلے بنے تھے انہیں عناصر سے تم پھر بھی بنائے جا سکتے ہو۔ بلکہ زیادہ آسانی سے بنائے جا سکتے ہو اور تمہاری روح جو ہمارے قبضہ میں ہے وہ پھر ہم تمہارے اجسام 'مٹی سے ہی بنا کر ان میں ڈال دیں گے اور اپنے پاس تمہیں لا حاضر کریں گے۔ اس وقت بھی وہی ''ہم'' تم میں موجود ہوگا۔ جو آج موجود ہے۔ اور اسی ''ہم'' سے تمہارے اعمال کی باز پرس ہوگی۔ واضح رہے کہ یہاں روح سے مراد روح حیوانی نہیں ہے جو ہر ذی حیات کو متحرک کرنے کا سبب ہوتی ہے بلکہ یہاں روح سے مراد روح نفسانی ہے۔ جس کی بنا پر انسان دوسرے تمام حیوانات سے ممتاز ہوا۔ اسے عقل و شعور بخشا گیا اور ارادہ و اختیار دے کر خلافتِ ارضی کا حامل بنایا گیا۔

[۱۳] ان کا یہ مطالبہ بھی بالکل عبث ہوگا کیونکہ انسان کو عقل و شعور تو اس لئے دیا گیا تھا کہ ان سے کام لیتے ہوئے اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور یہی ایمان بالغیب کا مطلب ہے۔ اور اسی چیز کا انسان سے مطالبہ ہے۔ پھر جب انسان نے اپنی

نَعْمَلْ صَالِحًا إِنَّا مُوقِنُونَ ﴿۱۲﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا وَلَٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي
لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿۱۳﴾ فَذُوقُوا بِمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا إِنَّا
نَسِينَاكُمْ ۖ وَذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۱۴﴾ إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا

اب ہمیں یقین آ گیا ہے۔(۱۲) اور اگر ہم چاہتے تو (پہلے ہی) ہر شخص کو ہدایت دے [۱۴] دیتے لیکن میری بات پوری ہو کے رہی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے [۱۵] بھر دوں گا۔(۱۳) پس اب اس بات کا مزا چکھو۔ جو تم نے اس دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا۔ اب ہم نے بھی تمہیں [۱۶] بھلا دیا ہے اور جو کچھ تم کرتے رہے اس کی پاداش میں اب دائمی عذاب کا مزا چکھو(۱۴) ہماری آیات پر تو وہی لوگ ایمان لاتے ہیں کہ جب انہیں ان آیات سے نصیحت کی

آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا تو اس کا ایمان اضطراری ہوا، اختیاری نہ رہا۔ نہ ہی اسے ایمان بالغیب کہہ سکتے ہیں۔ اس مقام پر ان کے اس مطالبہ کا جواب نہیں دیا گیا۔ جبکہ ایک دوسری جگہ پر یہ جواب دیا گیا ہے کہ دوبارہ دنیا میں بھیجنا اللہ کا دستور نہیں تاہم بفرض محال اگر ہم انہیں دوبارہ دنیا میں بھیج بھی دیں تو پھر یہ لوگ ویسے ہی کام کریں گے جیسے پہلے کر کے آئے ہیں۔ یہ لوگ پھر دنیا اور اس کی دلفریبیوں پر ویسے ہی مفتون ہو جائیں گے جیسا کہ پہلے تھے۔ اور پہلی سی شرارتیں پھر شروع کر دیں گے۔

[۱۴] ۞ انسان اور جن جبری اطاعت کے لئے پیدا نہیں ہوئے:۔ یعنی ہمیں انسان کے اضطراری ایمان کی ضرورت نہیں۔ اس صورت میں انسان کو اختیار دینا بالکل عبث تھا۔ اب چونکہ اسے اچھے یا برے راستہ کی تمیز بھی بخش دی گئی ہے اور ان میں سے کسی ایک راہ کے انتخاب کا اختیار دے دیا گیا ہے۔ لہٰذا اب اللہ کا کام یہ نہیں کہ ہر ایک کو ہدایت کی راہ پر لانے پر مجبور کر دے بلکہ یہ ہے کہ جس راہ پر کوئی چلتا ہے اسی راستہ کے لئے اسے توفیق دے دے۔

[۱۵] ۞ آدم کس کا خلیفہ ہے؟ اللہ تعالیٰ کی تمام جاندار مخلوق میں سے جن اور انسان دو نوع ایسی ہیں جن کو اللہ نے قوت تمیز اور قوت ارادہ و اختیار بخشی ہے۔ اور یہی دو انواع شریعت الٰہی کی مکلف ہیں۔ انہیں کے لئے یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ انسانوں سے پہلے جنات ہی اس زمین پر آباد تھے۔ جب ان میں سرکشی بڑھی تو اللہ نے ایک دوسری مخلوق انسان کو ان کا جانشین بنا دیا۔ پہلے نبوت کا سلسلہ جنوں میں تھا۔ پھر یہ سلسلہ نبوت انسان کی طرف منتقل ہو گیا۔ جو نبی انسانوں کی طرف مبعوث ہوتا وہی جنوں کے لئے بھی ہوتا تھا۔ اور جن بھی بالتبع اسی نبی کی اطاعت کے پابند بنا دیئے گئے۔ لیکن حضرت انسان بھی سرکشی اور انکار حق میں جنوں سے پیچھے نہ رہا۔ دونوں نے اللہ کے عطا کردہ اختیار کا ناجائز اور غلط استعمال کیا۔ دونوں انواع کی اکثریت دنیا پر فریفتہ ہو کر اس امتحان میں فیل ہو گئی۔ جنوں اور انسانوں کے شیاطین نے خلقت کو اللہ کی راہ سے روکنے اور انہیں گمراہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور یہ سب باتیں اللہ کے علم میں پہلے سے موجود تھیں کہ جنوں اور انسانوں کی اکثریت اس امتحان میں ناکام ہو کر جہنم کا ایندھن بنے گی۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مختلف مقامات پر مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے کبھی اس ناکامی کی نسبت اپنی طرف کی ہے کبھی شیاطین جن وانس کی طرف اور کبھی ان گمراہوں کی طرف۔

[۱۶] ۞ اعمال اور ان کے نتائج میں مماثلت:۔ یعنی تم دنیا کی دلفریبیوں میں اس قدر منہمک ہوئے کہ ہمیں کبھی بھولے سے

سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۩ ﴿۱۵﴾ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ

جاتی ہے۔ تو سجدہ[۱۷] میں گر پڑتے ہیں اور اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے۔(۱۵) ان کے پہلو بستروں[۱۸] سے الگ رہتے ہیں۔ وہ اپنے پروردگار کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں

بھی یاد نہ کیا۔ اور ساری عمر اللہ کی نافرمانیوں اور سرکشی میں گزار دی۔ اب جہنم میں پڑے رہو اور اپنے اعمال کی سزا بھگتو۔ ہماری طرف سے کسی طرح کے رحم اور مہربانی کی توقع نہ رکھو۔ ہم بھی تمہیں ابدالآباد تک یہیں جہنم میں پڑا رہنے دیں گے اور اسی طرح تمہیں بھلا دیں گے جیسے دنیا میں تم نے ہمیں بھلا رکھا تھا۔

[۱۷] ایمان لانے والوں کی صفات انکار کرنے والوں سے بالکل جداگانہ ہوتی ہیں۔ ان کے دلوں میں ضد، ہٹ دھرمی اور عناد نہیں ہوتا، ان کی طبیعتیں اتنی سلیم ہوتی ہیں کہ حق بات کو قبول کرنے پر فوراً آمادہ ہو جاتی ہیں۔ ان میں تکبر اور غرور نام کو نہیں ہوتا۔ بلکہ انہیں جب اللہ تعالیٰ کے عجائبات اور کارنامے بتائے جاتے ہیں تو اللہ کی عظمت سے ان کے دل فوراً دہل جاتے ہیں وہ قبولِ حق پر فوراً آمادہ ہو جاتے ہیں پھر اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور ان کی زبانوں پر اللہ تعالیٰ کی حمد اور تسبیح و تقدیس جاری ہو جاتی ہے۔

اس آیت پر سجدہ ہے۔ اس کو پڑھنے اور سننے والوں کو یہاں سجدہ کرنا چاہئے تاکہ وہ بھی ان صفات میں شامل ہو جائیں جو اللہ تعالیٰ نے ایمانداروں کی بیان فرمائی ہیں۔

سیدنا ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ جمعہ کے دن فجر کی نماز میں ﴿الم تَنْزِيل السجدة﴾ اور ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ﴾ پڑھا کرتے تھے۔ (بخاری۔ کتاب الصلوٰۃ ابواب ماجاء فی سجود القرآن و سنتها)

[۱۸] اللہ سے ڈرنے کے باوجود حسنِ ظن رکھنے کا حکم:۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ساری رات سوتے ہی نہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ جس طرح دنیادار لوگ دن بھر محنت کر کے رات کو داد عیش دیتے ہیں۔ رقص و سرود کی محفلیں قائم کرتے ہیں۔ شراب نوشی کے دور چلتے ہیں۔ سینما اور کلب گھروں کا رخ کرتے ہیں۔ اور کچھ نہیں تو ٹی وی پر ہی اپنا دل بہلا لیتے ہیں۔ اللہ کے بندے ان کے برعکس اپنا وقت اللہ کی یاد میں گزارتے ہیں۔ یہی ان کی تفریح طبع ہوتی ہے۔ وہ راتوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور جتنا وقت دنیادار اللہ کی نافرمانیوں میں گزارتے ہیں اللہ کے بندے اس کی فرمانبرداری اور عبادت میں گزارتے ہیں۔ وہ عذاب جہنم سے ڈر کر اور جنت کی امید رکھ کر اللہ کو پکارتے ہیں یا عبادت تو اللہ کی رحمت اور مہربانی کی امید رکھ کر کرتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ اللہ سے ڈرتے بھی رہتے ہیں کہ کہیں ان کے اس عمل میں کچھ تقصیر نہ رہ جائے۔ اور وہ اللہ کے ہاں مقبول ہی نہ ہو۔ تاہم ان میں اللہ سے حسن ظن یا اس کی رحمت اور مہربانی کا پہلو ہی غالب رہتا ہے۔ اور یہ پہلو زندگی بھر غالب رہتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "تم میں سے کوئی شخص اس حال میں نہ مرے کہ وہ اللہ عزوجل سے حسنِ ظن نہ رکھتا ہو" (مسلم۔ کتاب الجنۃ۔ باب الامر بحسن الظن باللہ تعالیٰ عند الموت)

اگرچہ اس آیت سے معلوم یہی ہوتا ہے کہ اس آیت میں بستروں سے الگ رہنے اور اللہ کو پکارنے سے مراد نمازِ تہجد ہے۔

رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۷﴾ اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ۭ لَا يَسْتَوٗنَ ﴿۱۸﴾ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ

اور جو رزق ہم نے انہیں[۱۹] دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔(۱۶) کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کی کیا کچھ چیزیں ان کے لئے چھپا[۲۰] رکھی گئی ہیں یہ ان کاموں کا بدلہ ہوگا جو وہ کیا کرتے تھے۔(۱۷) کیا مومن ایسے ہی ہوتا ہے جیسے فاسق[۲۱] یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔(۱۸) جو لوگ ایمان لائے

جس کی احادیث میں بہت فضیلت مذکور ہے۔ تاہم بعض علماء نے اس سے صبح کی نماز مراد لی ہے۔ بعض نے عشاء کی اور بعض نے نماز مغرب اور عشاء کے درمیان نوافل کی۔ تاہم راجح بات وہی معلوم ہوتی ہے جو اولاً مذکور ہوئی۔

[۱۹] غریب اور مفلس لوگوں کو بھی صدقہ کرنا ضروری ہے:۔ اس سے مراد صرف مال حلال ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حرام مال کی نسبت کبھی اپنی طرف نہیں کی۔ نہ ہی ایسے مال سے صدقہ قبول کرتا ہے۔ اور خرچ کرنے سے بھی مراد عیاشیوں پر خرچ کرنا نہیں بلکہ جائز طریقوں سے خرچ کرنا ہے خواہ وہ اپنی ذات پر یا اہل و عیال پر ہو، یا قرابتداروں اور دوسرے محتاجوں کی ضروریات اور حاجات پوری کرنے پر ہو۔ اور اگر حلال مال سے دوسروں پر خرچ کرنے کی توفیق میسر نہیں ہوتی تو بھی حرام کمائی سے بہر حال بچنا چاہئے۔ اس پر قناعت اور اللہ کا شکر کرنا چاہئے۔ اور اس میں سے خواہ بہت تھوڑا ہی سہی، کچھ نہ کچھ ضرور خرچ کرنا چاہئے۔ کیونکہ غریبوں کو بھی تزکیہ نفس کی ضرورت ہوتی ہے۔ بخل کے مرض سے ان کا بھی دل پاک ہونا چاہئے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "آگ سے اپنا بچاؤ کرو خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے سے ہی کرو" (بخاری۔ کتاب الزکوۃ۔ باب اتقوا النار ولو بشق تمرة)

[۲۰] جنت کی نعمتوں کی صفات:۔ ایسے لوگ جو رات کی تاریکیوں میں، لوگوں سے چھپ کر، ریاکاری سے بچتے ہوئے اللہ کو یاد کرتے اور اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو ان کا بدلہ بھی ایسی چیزیں ہوں گی جو اللہ نے ان کے لئے چھپا رکھی ہیں۔ وہ نعمتیں کیا ہوں گی وہ ایسے لوگوں کے دلوں اور ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوں گی۔ ان کی صفات بیان کرنے سے انسان کو اس دنیا میں سمجھ بھی نہیں آسکے گی۔ جس طرح اگر کسی شخص نے آم کبھی نہ کھایا ہو تو خواہ اس کے مزے کی تفصیل کتنی ہی بیان کی جائے ایسے کبھی نہیں ہو سکتا جیسے کوئی شخص آم کھا کر محسوس یا معلوم کر سکتا ہے۔ اور جنت کی نعمتوں کا تو یہ حال ہے کہ نہ کبھی کسی نے دیکھیں، نہ سنیں، نہ چکھیں حتیٰ کہ کسی کے دل میں ان کا خیال تک بھی نہ آیا جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

سیدنا ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ "اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے (نیک) بندوں کے لئے وہ نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جنہیں نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، ہو اور نہ ہی کسی کے دل میں ان کا خیال تک آیا ہو" سیدنا ابو ہریرہؓ نے کہا کہ اگر تم چاہو تو (دلیل کے طور پر) یہ آیت پڑھ لو۔ ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ...... الآية﴾ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

[۲۱] اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فاسق کو مومن کی عین ضد کے طور پر بیان فرمایا، یعنی مومن اور فاسق برابر کیا ہوں گے یہ تو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جیسے دن کے مقابلہ میں رات ہوتی ہے، یعنی مومن اگر ایماندار ہے تو فاسق بے ایمان ہوگا۔ مومن

عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى نُزُلًا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٩﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ
النَّارُ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ
بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿٢٠﴾ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ
يَرْجِعُوْنَ ﴿٢١﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ۭ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ

اور نیک اعمال کیے ان کی قیام گاہ باغات ہوں گے یہ ان کے اعمال کے صلہ میں ان کی مہمانی ہو گی۔(۱۹) اور جو نافرمان ہیں ان کا ٹھکانا دوزخ ہو گا جب بھی وہ اس سے نکلنا چاہیں گے اسی میں لوٹا دیئے جائیں گے اور انہیں کہا جائے گا کہ اب اس آگ کے عذاب [۲۲] کا مزہ چکھو جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔(۲۰)

ہم انہیں (قیامت کے) بڑے عذاب سے پہلے ہلکے عذاب کا مزا بھی ضرور چکھائیں گے شاید وہ (اپنی روش سے) باز آجائیں (۲۱) اور اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہو گا جسے اس کے پروردگار کی آیات سے نصیحت کی جائے پھر وہ اس سے منہ موڑ لے۔ ہم یقیناً ایسے مجرموں سے انتقام [۲۳] لے کر رہیں گے۔(۲۲)

اگر اللہ کا مطیع فرمان ہے تو فاسق اللہ کا باغی ہو گا۔ تو جس طرح یہ اپنے اعمال کے لحاظ سے ایک دوسرے کی عین ضد ہیں۔ اسی طرح اخروی اجر کے لحاظ سے بھی ان کا معاملہ ایسا ہی ہو گا۔ چنانچہ اگلی دو آیات میں انہی دونوں قسم کے لوگوں کا انجام اور ان کو ملنے والی جزاء و سزا کا ذکر کیا گیا ہے۔

[۲۲] بڑے عذاب سے مراد قیامت کے دن جہنم کا عذاب ہے اور عذاب الادنیٰ سے مراد دنیا میں پہنچنے والے مصائب ہیں جو انفرادی طور پر بھی ہر انسان کو دیکھنا پڑتے ہیں۔ مثلاً بیماریاں، مالی نقصان، عزیز و اقرباء کی موت یا کئی دوسرے حادثے اور اجتماعی زندگی کے مصائب الگ نوعیت کے ہوتے ہیں۔ مثلاً قحط، زلزلے، وبا، فسادات اور لڑائیاں جن سے بیک وقت ہزاروں انسان لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے ہلکے ہلکے عذاب ہی نہیں بلکہ تنبیہات بھی ہیں کہ وہ بروقت سنبھل جائیں اور انہیں معلوم ہو جائے کہ ان سے بالاتر کوئی ہستی موجود ہے جو ان کی بداعمالیوں پر ان پر گرفت کر سکتی ہے۔ اور اس سے انہیں اپنا عقیدہ اور عمل درست کرنے میں مدد ملے۔ اس طرح شاید وہ بداعمالیوں سے اور آخرت میں ان کے برے انجام سے بچ جائیں۔

[۲۳] ❁ اللہ کی آیات کی پانچ اقسام:۔ یعنی قیامت کا دن دراصل مجرمین سے بدلہ لینے کا دن ہے۔ اس دن کوئی بھی مجرم اپنے جرم کی سزا سے بچ نہیں سکے گا۔ اور جو شخص اپنے کبر و نخوت کی بنا پر اللہ کی آیات سننا اور ان سے سبق حاصل کرنا گوارا نہیں کرتا بلکہ پہلے سے ہی منہ موڑ کر چل دیتا ہے وہ تو سب سے بڑھ کر ظالم ہے۔ وہ بھلا اس دن انتقام سے کیسے بچ سکے گا؟ واضح رہے کہ اللہ کی آیات کی بہت سی اقسام ہیں۔ مثلاً ایک تو وہ آیات ہیں جو کائنات میں ہر سو بکھری ہوئی ہیں۔ جنہیں ہم آفاقی نشانیاں کہہ سکتے ہیں اور ان میں سورج، چاند، ستارے، گردش لیل و نہار۔ زمین کی قوت روئیدگی۔ ہواؤں اور بارشوں کا نظام وغیرہ وغیرہ امور شامل ہیں۔ دوسری قسم وہ آیات ہیں جو انسان کے اندر کی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ انسان کی تخلیق، جسم کی ساخت، اعضاء کا خودکار نظام، اور محیر العقول قوتیں جو اللہ نے انسان کے اندر رکھ دی ہیں۔ اسی جسم میں بعض ایسے داعیے بھی موجود ہیں جو انسان کے تحت الشعور

مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ وَ

ہم نے موسیٰ کو کتاب[۲۴] دی تھی لہٰذا (اے نبی!) آپ کو اس کتاب کے ملنے[۲۵] میں شک نہ رہنا چاہئے۔ یہ

میں ہوتے ہیں۔ لیکن وقت پڑنے پر فوراً جاگ اٹھتے ہیں۔ جیسے جب موت سامنے کھڑی نظر آئے تو مشرکین کیا دہریے تک اللہ کو پکارنے لگتے ہیں۔ اس قسم کو قرآن آیاتِ انفس کا نام دیتا ہے تیسری قسم وہ تاریخی واقعات ہیں جن سے ہمیشہ ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جس قوم نے بھی اللہ کے مقابلہ میں سرکشی کی راہ اختیار کی اور اس کے رسول اور آیات کو جھٹلایا تو اللہ نے اسے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ اس قسم کو شرعی اصطلاح میں تذکیر بایام اللہ کہا جاتا ہے۔ اور یہ اصطلاح قرآن ہی کے الفاظ ﴿وذکرھم بایام اللہ﴾ سے ماخوذ ہے اور چوتھی قسم وہ نشانیاں ہیں جو مصائب کی شکل میں تنبیہ کے طور پر انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر انسانوں پر بصورت عذاب ادنیٰ نازل کی جاتی ہیں۔ اور جن کا ذکر سابقہ آیت میں ہوا ہے۔ اور پانچویں قسم اللہ تعالیٰ کی وہ آیات ہیں جو اس نے انسانوں کی ہدایت کے لئے اپنے انبیاء پر وقتاً فوقتاً نازل کیں۔ ان آیات میں دراصل انسان پر سابقہ چاروں قسم کی آیات کو غور و فکر کے لئے پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اور عقلی اور عام فہم دلائل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

❁ اللہ کی تمام تر آیات کا ماحصل:۔ اور یہی وہ دلائل یا آیات ہیں جن کے متعلق قرآن میں بار بار یہ مذکور ہوا ہے کہ یہ آیات بالکل واضح ہیں، روشن ہیں ان میں کوئی پیچیدگی نہیں، کوئی ابہام نہیں، کوئی ٹیڑھ نہیں بلکہ سیدھی سادی اور عام فہم دلیلیں ہیں۔ قرآن کی آیات باقی چاروں قسم کی آیات کی طرف توجہ دلاتی ہیں اور اسی کا نام ذکر اور تذکرہ ہے اور پہلی چاروں قسم کی آیات قرآن کی آیات کی تائید و تصدیق کرتی ہیں۔ اور ان سب آیات کا ماحصل ایک ہی سامنے آتا ہے اور وہی دراصل انبیاء کی تعلیم کا نچوڑ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس کائنات کی تدبیر و تخلیق کرنے والی ہستی بڑی مقتدر اور حکیم ہستی ہے اور وہ صرف ایک ہی ہو سکتی ہے اس میں دوئی یا کسی دوسرے کی شراکت کی کوئی گنجائش نہیں۔ دوسرے یہ کہ کائنات اور اس کی کوئی بھی چیز بے مقصد پیدا نہیں کی گئی۔ لہٰذا انسان جو اشرف المخلوقات ہے کی زندگی کا بے مقصد ہونا ناممکنات سے ہے۔ تیسرے یہ کہ انسان کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح وہ طبعی اور اضطراری امور میں اللہ کے قوانین کے سامنے مجبور محض اور ان قوانین کا پابند ہے اسی طرح وہ اپنے اختیاری امور میں بھی اللہ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور کائنات کی باقی تمام اشیاء کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے صرف ایک ہی اللہ کی عبادت اور تسبیح و تقدیس بیان کرے اور اسی کا ہو کر رہے۔ اور چوتھے یہ کہ جو شخص اللہ کا فرمانبردار بن کر رہے اسے ضرور اس کا اچھا بدلہ ملنا چاہئے اور جو نافرمان ہو اسے ضرور سزا مل کر رہے اور چونکہ یہ دنیا کی زندگی اور ہر انسان کی پوری مدت عمر امتحان کا عرصہ ہے لہٰذا اس عرصہ امتحان کے بعد کامیاب اور ناکام انسانوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دیا جائے۔ اس لحاظ سے روز آخرت کا قیام نہایت ضروری ہوا۔ ورنہ یہ دنیا ایک اندھیر نگری قرار پاتی ہے۔ نیز انسان جیسی اشرف المخلوقات مخلوق کا مقصد حیات ہی فوت ہو جاتا ہے۔

[۲۴] اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی آیات سے منہ موڑنے کا ذکر تھا۔ اسی نسبت سے یہاں تورات کا ذکر ہوا جو قرآن کے بعد سب الہامی کتابوں سے زیادہ مشہور ہے۔ تورات صرف بنی اسرائیل کے لئے ہدایت کی کتاب تھی جبکہ یہ قرآن پوری بنی نوع انسان کے لئے کتاب ہدایت ہے۔

[۲۵] اس جملہ میں خطاب اگرچہ رسول اللہ ﷺ کو ہے مگر مخاطب سارے مومنین ہیں۔ کیونکہ نبی سب سے پہلے خود اپنی

جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۲۳﴾ وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا
صَبَرُوْا ؕ۟ وَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ ﴿۲۴﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ یَفْصِلُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا
كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۲۵﴾ اَوَ لَمْ یَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ یَمْشُوْنَ فِیْ

کتاب بنی اسرائیل کے لئے ہدایت تھی (۲۳) جب انہوں نے (مصائب پر) صبر کیا تو ہم نے ان میں سے کئی ایسے پیشوا [۲۶] بنا دیئے جو ہمارے حکم سے ان کی رہنمائی کرتے تھے۔ اور یہ لوگ ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے۔ (۲۴) آپ کا پروردگار قیامت کے دن یقیناً ان لوگوں میں ان باتوں کا فیصلہ کردے گا جن میں وہ اختلاف [۲۷] کرتے تھے۔ (۲۵) کیا انہیں اس بات سے کچھ رہنمائی نہیں ملی کہ ان سے پیشتر ہم کئی ایسی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جن کے رہائشی مقامات پر (آج) یہ لوگ چل پھر رہے ہیں۔

نبوت پر ایمان لاتا ہے۔ پھر دوسروں کو ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ لہٰذا منزل من اللہ کلام پر رسول کا شک کرنا محالات سے ہے۔ اور ایسا انداز خطاب عموماً تاکید مزید کے لئے آتا ہے۔ یعنی مسلمانوں کو کسی قیمت پر بھی اس میں شک نہ کرنا چاہئے۔

بعض علماء نے اس آیت لقائہ میں ہٗ کی ضمیر کو موسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع سمجھا ہے اور اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ آپ کی موسیٰ علیہ السلام سے اسی دنیا کی زندگی میں ضرور ملاقات ہوگی اور آپ کو اس ملاقات کے بارے میں شک میں نہ رہنا چاہئے کہ آپ کی سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے یہ ملاقات معراج کے موقعہ پر چھٹے آسمان پر ہوئی تھی۔

[۲۶] ❁ امام کی لازمی خصوصیات:۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پیشوائی کے لئے لازمی صفات کا ذکر فرمایا: پہلی صفت یہ ہے کہ ان کا تازیست یہ طرز عمل ہونا چاہئے کہ وہ اللہ کے احکام کی دعوت دیتے رہیں اور لوگوں کی رہنمائی کرتے رہیں دوسرے یہ کہ یہ کام پورے صبر واستقلال سے سرانجام دیں۔ اور اس راہ میں پیش آنے والے مصائب پر صبر کریں اور تیسرے یہ کہ وہ اللہ کی آیات اور اس کے وعدوں پر پختہ یقین رکھتے ہوں۔ جتنا زیادہ یقین پختہ ہوگا اسی قدر وہ صبر کر سکیں گے اور اسی قدر زیادہ وہ امامت یا پیشوائی کے حقدار ہوں گے۔ اور بنی اسرائیل میں سے جو شخص ان صفات کے حامل تھے انہیں اللہ تعالیٰ نے امامت کے منصب پر سرفراز فرمادیا۔

[۲۷] ❁ تفرقہ بازی کا انجام: تعصب اور ذلت:۔ اصول دین سے اختلاف کرنے کی وجہ دنیوی مفادات اور قائد بن کر اپنا جھنڈا الگ بلند کرنے کی خواہش ہوتی ہے اور اس روش کا لازمی نتیجہ امت میں انتشار اور دنیا میں ذلت وخواری ہوتی ہے۔ یہی کچھ یہود کو اختلافات کے نتیجہ میں حاصل ہوا اور یہی کچھ آج کل مسلمانوں کو حاصل ہو رہا ہے۔ پھر جو فرقہ بن جاتا ہے اس میں کچھ ایسا فرقہ وارانہ تعصب پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی روش بدلنا قطعاً گوارا نہیں کرتا۔ وہ دوسرے سب فرقوں کو گمراہ سمجھتا ہے لیکن اپنے متعلق اسے خیال تک نہیں آتا کہ وہ بھی گمراہ ہو سکتا ہے۔ گویا دنیا میں تو کوئی فرقہ اپنی غلطی تسلیم کرنے کو آمادہ نہیں ہوتا۔ ہاں اللہ تعالیٰ ہی ان کے درمیان یہ فیصلہ کرے گا کہ کس فرقہ کے پاس کس قدر حق کا حصہ تھا اور کس قدر باطل کا یا ان سب میں سے فلاں فرقہ حق پر تھا اور باقی سب گمراہ تھے۔ لوگوں کے تعصب کی وجہ سے دنیا میں یہ مسئلہ لاینحل ہی رہتا

مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ۭ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۲۶﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَاۗءَ اِلَى الْاَرْضِ
الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ ۭ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَيَقُوْلُوْنَ
مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۸﴾ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ

اس میں بھی بہت سی نشانیاں ہیں۔ کیا یہ سنتے[۲۸] نہیں؟ (۲۶) کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ہم پانی کو بنجر زمین کی طرف بہالاتے ہیں جس سے ہم کھیتی پیدا کرتے ہیں تو اس سے ان کے چوپائے بھی کھاتے ہیں اور وہ خود بھی کھاتے ہیں۔ پھر کیا یہ غور[۲۹] نہیں کرتے۔ (۲۷) نیز کہتے ہیں کہ "اگر تم سچے ہو تو یہ فیصلہ کب ہو گا؟" (۲۸) آپ ان سے کہئے کہ: "جب فیصلہ کا دن ہو گا تو جن لوگوں نے کفر کیا[۳۰] ہے انہیں فیصلہ کے دن ایمان لانا کچھ فائدہ نہ دے گا اور

ہے خواہ امت کتنی ہی ذلت اور خواری سے دوچار رہے۔

[۲۸] قوم عاد، قوم ثمود اور قوم شعیب عرب سے ہی تعلق رکھنے والی قومیں تھیں۔ یہ سب تباہ ہوئیں اور اہل عرب ان کے کھنڈرات اپنی آنکھوں سے دیکھتے بھی تھے اور ان اقوام کے حالات زندگی اپنے بزرگوں سے سنتے بھی تھے۔ پھر بھی ان سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتے تھے۔

[۲۹] ۞ وحی الٰہی کی مردہ زمین پر بارش:۔ یعنی بارش کا ریلا یا نہروں کا پانی جب بنجر زمین کو سیراب کرتا ہے تو بے آب و گیاہ اور بنجر زمین بھی لہلہانے لگتی ہے۔ اس پر بہار آجاتی ہے۔ جس سے ہر قسم کے جانداروں کو رزق مہیا ہوتا ہے۔ بعینہ یہی صورت وحی الٰہی کی بارش کی بھی ہوتی ہے یہی خطہ عرب جس میں توحید کی آواز نکالنا بھی اپنے لئے مصائب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اور لوگوں کے دل حق کی دعوت کو قبول کرنے کے سلسلہ میں بالکل مردہ ہو چکے ہیں۔ اگر بارش کا ریلا بنجر زمین کو لہلہاتے کھیت میں تبدیل کر سکتا ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خطہ وحی کی بارش سے توحید کی آواز سے لہلہانے لگے مردہ لوگوں میں زندگی عود کر آئے۔ لوگ سمجھنے سوچنے لگ جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ اسلام کو اتنا فروغ بخشے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جائیں۔ پھر اسلام کی برکات سے صرف انسان ہی نہیں اللہ کی ساری مخلوق مستفید اور سرشار ہو جائے۔

[۳۰] یعنی کافروں کا ہمیشہ یہ سوال ہوتا ہے کہ یہ جو ہم پر عذاب کے نزول کی دھمکی دی جاتی ہے یا ایمان لانے والوں کے لئے مدد اور فتح و نصرت کی نوید سنائی جاتی ہے تو ایسے وعدے کا کوئی معین وقت بتادیا جائے۔ اور یہ معین وقت بتادینا ہی حکمتِ الٰہی کے خلاف ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسے سوال کے جواب میں کفار کی توجہ اس کے دوسرے پہلوؤں کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے جن پر عمل کی بنیاد اٹھتی ہو۔ اور یہی قرآن کا حقیقی مقصد ہوتا ہے۔ یہاں بھی اس سوال کا جواب اسی انداز میں دیا گیا ہے کہ تم اس مہلت کو غنیمت سمجھو جو اس وقت تمہیں حاصل ہے۔ کیونکہ وہ فیصلہ کا دن آگیا تو اس وقت نہ تمہارا اسلام لانا کچھ فائدہ دے سکتا ہے اور نہ مزید مہلت ملے گی۔ نہ تمہیں سنبھلنے کا موقع ملے گا لہٰذا اس کے لئے بے چین ہونا چھوڑ دو۔ البتہ اگر اپنے فائدہ کی بات سوچ سکتے ہو تو سوچو۔

۳ ع ۱۲

وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ﴿۳۰﴾ ع

نہ ہی انہیں کچھ مہلت دی جائے گی" (۲۹) سو آپ ان سے اِعراض کیجئے اور انتظار کیجئے، وہ بھی یقیناً انتظار [۳۱] کر رہے ہیں۔ (۳۰)

[۳۱] آپ ان سے الجھنا اور بحث کرنا چھوڑ دیجئے۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیجئے۔ آپ اس بات کے منتظر رہئے کہ کب اللہ کا وعدہ پورا ہوتا ہے اور وہ انشاء اللہ ضرور پورا ہوگا اور وہ لوگ اس بات کے انتظار میں ہیں کہ تم اور تمہاری یہ چھوٹی اور کمزور سی جماعت کب گردشِ ایام کا شکار ہوتی ہے؟

۷۳ آیاتھا ۔۔۔ سُوْرَةُ الْأَحْزَابِ مَدَنِيَّةٌ ۔۔۔ رکوعھا ۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ﴿۱﴾ وَّاتَّبِعْ

کلمات ۱۲۱۰ ۔۔۔ آیت ۷۳ ۔۔۔ (۳۳) سورہ الاحزاب مدنی ہے (۹۰) ۔۔۔ رکوع ۹ ۔۔۔ حروف ۵۹۰۹

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

اے نبی! اللہ سے ڈرتے رہئے[۱] اور کافروں اور منافقوں کا کہنا مانیے۔ اللہ تعالیٰ یقیناً سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔(۱)

[۱] ❁ جنگ احد کے بعد مدینہ پر خوف و ہراس کی فضا:۔ اگرچہ اس سورہ کا اکثر حصہ جنگ (احزاب ۵ھ) کے بعد نازل ہوا تاہم ابتدائی آیات جنگِ احزاب سے بہت پہلے کی ہیں۔ مکہ میں تو آپ ﷺ کے اور مسلمانوں کے دشمن صرف قریش مکہ تھے۔ مگر مدینہ جانے کے بعد مدینہ کے یہود، مشرکین اور منافقین سب آپ ﷺ کے دشمن بن گئے تھے۔ جو اسلام اور پیغمبر اسلام کو بدنام کرنے اور صفحہ ہستی سے مٹا دینے پر تُلے بیٹھے تھے۔ غزوہ اُحد میں مسلمانوں کو جو عارضی طور پر شکست ہوئی تھی اس نے دشمنوں کے حوصلے بہت بڑھا دیئے تھے۔ مُشرک قبائل نے دو دفعہ رسول اللہ ﷺ کو دھوکا دے کر تبلیغ کے لئے قاریوں کا مطالبہ کیا اور پھر انہیں قتل کر دیا۔ مدینہ پر ہر وقت خوف و ہراس کی فضا طاری رہتی تھی۔ اور اعدائے اسلام نے اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کی مہم بڑی تیز کر رکھی تھی۔

❁ معاشرتی اصلاحات اور غلامی کا مسئلہ:۔ اور یہی وہ دور تھا جس میں بذریعہ وحی مسلمانوں کی اخلاقی تربیت اور معاشرتی اصلاحات کا سلسلہ بھی جاری تھا اور معاشرتی اصلاحات کے سلسلہ میں ایک نہایت اہم مسئلہ غلامی کا تھا۔ عرب معاشرہ میں غلامی کا اتنا زیادہ رواج تھا کہ اگر یوں کہا جائے کہ اس دور میں عرب آبادی کا آدھے سے زیادہ حصہ غلاموں پر مشتمل تھا تو غلط نہ ہوگا۔ پھر ان غلاموں کو آزاد انسانوں سے بہت حقیر اور کم تر درجہ کی مخلوق سمجھا جاتا تھا اور اسلام اس سلسلہ میں کئی اصلاحات کرنا چاہتا تھا۔

❁ غلام اور آزاد کی طبقاتی تقسیم:۔ اِسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ تھی کہ زید بن حارثہ آپ ﷺ کا غلام تھا۔ جسے آپ ﷺ نے آزاد کر کے اپنا متبنیٰ بنا لیا تھا۔ چنانچہ لوگ سیدنا زید کو زید بن محمدؐ کہا کرتے تھے۔ یہ آزاد کردہ غلام بھی معاشرہ میں وہ مقام نہیں رکھتے تھے جو آزاد لوگوں کا ہوتا تھا۔ گویا یہ معاشرتی عزت و وقار کے لحاظ سے ایک درمیانہ قسم کا تیسرا طبقہ بن جاتا تھا جو غلاموں سے تو اُوپر ہوتا تھا لیکن آزاد لوگ انہیں بھی اپنا ہم پلہ قرار نہیں دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں اسلام نے کئی اقدامات کئے اور کئی اصلاحات کیں۔ مثلاً اسلام نے اگرچہ کُلّی طور پر غُلامی کا استیصال نہیں کیا کیونکہ اس میں بھی کچھ مصلحتیں تھیں تاہم ایسی تدابیر اختیار کیں جن سے زیادہ سے زیادہ غلاموں کو آزادی کی نعمت میسر ہو اور یہ ایک جُداگانہ موضوع ہے۔ جو خاصا تفصیل طلب ہے۔

❁ آپ کے آزاد کردہ غلام زید کا سیدہ زینب سے نکاح:۔ آزاد شدہ غُلاموں کے سِلسلہ میں اسلام کا منشا یہ تھا کہ کم از کم ایسے

لوگوں کو آزاد لوگوں کے برابر درجہ دیا جائے۔ چنانچہ اسی منشائے الٰہی کے مطابق آپ ﷺ نے اپنے آزاد کردہ غلام اور متبنیٰ زید کے لئے اپنی پھوپھی زاد بہن سیدہ زینب سے رشتہ کا مطالبہ کر دیا۔ سیدہ زینب کا خاندان آپ ہی کا خاندان تھا۔ جو آزاد معاشرہ میں بڑے اونچے درجہ کے لوگ شمار ہوتے تھے وہ بھلا کیسے اس رشتہ کو قبول کر سکتے تھے؟ چنانچہ انہوں نے اسی بنا پر رشتہ سے صاف انکار کر دیا اور رشتہ کا یہ مطالبہ چونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اللہ کے حکم سے کیا تھا۔ لہٰذا ان لوگوں کے انکار پر اسی سورہ کی آیت نمبر ۳۶ نازل ہوئی۔ جس میں سیدہ زینب کے رشتہ داروں کو مطلع کر دیا گیا کہ ”جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا فیصلہ کر لیں تو مومنوں کا کچھ اختیار باقی نہیں رہ جاتا“ چنانچہ انہوں نے اللہ کے اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور سیدنا زید اور سیدہ زینب کی شادی ہو گئی۔ مگر شادی کے بعد بھی زوجین کے تعلقات میں خوشگواری نہ آسکی۔ اور اس کی وجہ وہی طبقاتی امتیاز تھا جو معاشرہ میں جڑ پکڑ چکا تھا۔

❁ **آپ کا زید کو سمجھانا اور طلاق کی نوبت:۔** سیدہ زینب نے اللہ کے حکم کے سامنے تو سر تسلیم خم کر دیا مگر طبیعت کا یکدم بدل جانا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اور وہ اپنے خاوند کا وہ احترام نہ کر سکیں جو ایک بیوی کو اپنے خاوند کا کرنا چاہئے۔ سیدنا زید چونکہ رسول اللہ ﷺ کے چہیتے بھی تھے اور متبنیٰ بھی۔ لہٰذا انہوں نے کئی بار آپ ﷺ سے اپنی اس تکلیف اور ذہنی کوفت کی شکایت کی۔ اور یہ بھی کہا کہ میں زینب کو طلاق دے دوں گا۔ مگر آپ ﷺ سیدنا زید کو طلاق سے منع ہی فرماتے رہے۔

❁ **ہر مشکل کام کا آغاز نبی کی ذات سے: سیدہ زینب سے نکاح کا حکم:۔** عرب معاشرہ میں ایک اور بگاڑ بھی موجود تھا جو یہ تھا کہ یہ لوگ متبنیٰ کو ہر لحاظ سے اپنے حقیقی بیٹوں کی مانند قرار دیتے تھے اور اس مسئلہ میں بھی اسلام اصلاحی قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ قدم چونکہ انتہائی مشکل قدم تھا۔ اور جو شخص بھی اس بند دروازے کو کھولنے کا ارادہ کرتا اسے سارے عرب معاشرہ کے طعن و تشنیع کا ہدف بننا پڑتا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس مشکل کام کے لئے نبی کی ذات کو منتخب کیا۔ جن دنوں سیدنا زید سیدہ زینب کو طلاق دینے کا سوچ رہے تھے۔ اسی دور میں آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ مل چکا تھا کہ اب سیدہ زینب کا آپ ﷺ سے نکاح کیا جائے گا۔ اس اشارہ حکم الٰہی سے دو مصلحتیں مقصود تھیں ایک یہ کہ سیدہ زینب جس نے اپنی طبیعت کی ناگواری کے باوجود اللہ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تھا آئندہ آپ ﷺ سے نکاح کر کے اس کی دلجوئی کی جائے اور دوسری مصلحت یہ تھی کہ معاشرہ میں اس غلط نظریہ کا قلع قمع کیا جائے کہ متبنیٰ بھی ہر لحاظ سے حقیقی بیٹے کی طرح ہوتا ہے۔

❁ **نکاح پر کافروں اور منافقوں کا طعن و تشنیع:۔** جب آپ ﷺ کو وحی سے سیدہ زینب سے نکاح کا اشارہ ملا۔ تو آپ ﷺ کے سامنے وہ سارے خطرات آنے لگے۔ جب سارے کے سارے دشمن آپ کو یہ طعنہ دیں گے کہ دیکھو! اس نبی نے تو اپنی بہو سے نکاح کر لیا ہے حالانکہ یہ خود ہی بہو سے نکاح کرنا حرام بتاتا ہے۔ غالباً طعن و تشنیع کے انہیں خطرات کے پیش نظر آپ زید کو بار بار طلاق دینے سے روکتے رہے۔ اسی پس منظر میں اس سورہ کی یہ ابتدائی آیات نازل ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے براہ راست اپنے نبی کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہیں ان کافروں اور منافقوں سے نہ ڈرنے کی ضرورت ہے نہ ان کی باتوں پر کان دھرنے کی۔ ڈرنے کے لائق تو صرف اللہ کی ذات ہے۔ تم صرف اسی سے ڈرو اور اسی کی وحی کی اطاعت کرو۔ اللہ اپنے احکام کی حکمت خوب جانتا ہے کہ وہ کیوں ایسا حکم دے رہا ہے اور جو لوگ اس نکاح کے ردِ عمل میں شور و غوغا بپا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے بھی پوری طرح باخبر ہے۔

مَا يُوحَىٰٓ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿٢﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى ٱللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِٱللَّهِ وَكِيلًا ﴿٣﴾
مَّا جَعَلَ ٱللَّهُ لِرَجُلٍ مِّن قَلْبَيْنِ فِى جَوْفِهِۦ ۚ وَمَا جَعَلَ أَزْوَٰجَكُمُ ٱلَّٰٓـِٔى تُظَٰهِرُونَ مِنْهُنَّ أُمَّهَٰتِكُمْ

اور جو کچھ آپ کے پروردگار کی طرف سے آپ پر وحی کی جاتی ہے اسی کی اتباع کیجئے، اور تم جو کچھ بھی عمل کرتے ہو اللہ تعالیٰ یقیناً ان سے باخبر ہے۔(۲) اور اللہ پر بھروسہ کیجئے اور اللہ کا کارساز ہونا ہی کافی [ا۔الف] ہے۔(۳) اللہ تعالیٰ نے کسی آدمی کے اندر دو دل [۲] نہیں بنائے۔ نہ ہی تمہاری ان بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو تمہاری مائیں

[ا۔الف] یعنی تمہارے دشمن جیسی بھی باتیں بناتے ہیں اور جو الزام بھی آپ پر دھرتے ہیں دھرنے دو۔ تمہارا کام فقط یہ ہے کہ وحی کا حکم بجالاؤ اور اللہ پر پورا بھروسہ رکھو۔ ان دشمنوں سے نمٹنا یا ان کی سازشوں اور چالوں کو ناکام بنانا میرا کام ہے۔

[۲] اللہ کا دو دل نہ بنانے کا مفہوم:۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تین حقائق بیان فرمائے ہیں۔ ایک یہ کہ سب انسانوں کا اللہ نے ایک ہی دل بنایا ہے دو نہیں بنائے۔ لہٰذا ایک دل ایک وقت میں ایک ہی حقیقت کو تسلیم کر سکتا ہے۔ دو متضاد حقیقتوں کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک ہی شخص بیک وقت مومن بھی ہو اور منافق بھی۔ یا وہ کافر بھی ہو اور مسلم بھی۔ ان میں سے ایک وقت میں ایک ہی حقیقت کی تسلیم کیا جا سکتا ہے کیونکہ دو متضاد باتوں میں سے حقیقت ایک ہی ہو سکتی ہے۔ اور اگر کوئی منافق دل میں نفاق چھپا کر ایمان کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ حقیقت بیان نہیں کرتا۔ بلکہ جھوٹ بولتا اور دھوکا دیتا ہے اور اس نکاح کے ردعمل سے مسلمانوں کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ان میں مخلص مسلمان کتنے اور کون کون ہیں اور منافق کون ہیں جو اللہ کے حکم کے علی الرغم دوسرے دشمنوں کی دیکھا دیکھی زبان دراز کرتے ہیں۔

ظہار کا دستور بھی لغو ہے اور متبنیٰ بنانے کا بھی کیونکہ ماں اور باپ ایک ہی ہو سکتے ہیں:۔ عرب میں طلاق کے علاوہ یہ بھی دستور تھا کہ جس عورت پر غصہ آتا اور اس سے ان بن ہو جاتی تو کہہ دیتے تو مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے۔ اس کام کو وہ ظہار کہتے تھے۔ یہ کہنے پر وہ عورت خاوند پر حرام ہو جاتی تھی۔ یہ دستور بھی اصلاح طلب تھا۔ اس کی اصلاح کا طریقہ اور کفارہ تو سورہ مجادلہ میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہاں صرف یہ بتایا جا رہا ہے کہ تمہارے کہنے سے بیوی ماں نہیں بن جاتی۔ ماں تو وہ ہوتی ہے جس نے جنا ہو۔ تو جس طرح کسی آدمی کے اندر دو دل نہیں ہو سکتے اسی طرح کسی کی دو مائیں بھی نہیں ہو سکتیں۔ اب اگر تم بیوی کو ماں کہہ کر اسے فی الواقع ماں سمجھ بیٹھو تو یہ تو تمہارے منہ کی بات ہے جس کا حقیقت سے کچھ تعلق نہیں۔

متبنیٰ اور وراثت کے دستور کی اصلاح:۔ اور تیسری حقیقت یہ ہے کہ متبنیٰ حقیقی بیٹے کا مقام نہیں لے سکتا۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی کے دو باپ ہوں۔ باپ وہی ہے جس کے نطفہ سے وہ پیدا ہوا ہے۔ دوسرا کوئی شخص نہ اس کا حقیقی باپ ہو سکتا ہے اور نہ وہ اس کا حقیقی بیٹا ہو سکتا ہے۔ متبنیٰ اپنے نقلی باپ کا وارث نہیں بن سکتا۔ نہ باپ متبنیٰ کا وارث ہو سکتا ہے۔ ہر شخص اپنے متبنیٰ کی مطلقہ بیوہ سے نکاح کر سکتا ہے۔ اسی طرح متبنیٰ بھی اپنے نقلی باپ کی مطلقہ یا بیوہ سے نکاح کر سکتا ہے۔ اور یہی غلط دستور معاشرہ میں رائج تھا۔ جس کی اصلاح اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کے سیدہ زینب کے ساتھ نکاح سے فرمانا چاہتا تھا۔

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَاۗءَكُمْ اَبْنَاۗءَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي
السَّبِيْلَ ۝۴ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَاۗىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَاۗءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي
الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ۭ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ

بنایا ہے اور نہ تمہارے منہ بولے بیٹوں[۳] کو تمہارے حقیقی بیٹے بنایا ہے۔ یہ تو تمہارے منہ کی باتیں ہیں مگر اللہ حقیقی بات کہتا ہے اور وہی صحیح راہ دکھاتا ہے(۴) ان (منہ بولے بیٹوں) کو ان کے باپوں کے نام سے پکارا کرو۔ اللہ کے ہاں یہی انصاف کی بات ہے۔

اور اگر تمہیں ان کے باپوں (کے نام) کا علم نہ ہو[۴] تو وہ تمہارے دینی بھائی اور تمہارے دوست ہیں۔ اور کوئی بات تم بھول چوک کی بنا پر کہہ دو تو اس میں تم پر کوئی گرفت[۵] نہیں، مگر جو دل کے ارادہ[۶] سے کہو (اس پر ضرور

[۳] اس آیت میں اسی اصلاحی اقدام کی چند جزئیات بیان فرمائی جا رہی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے حقیقی باپ کی نسبت سے پکارا جائے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے سیدنا زید کو اپنا متبنیٰ بنا لیا تو ہم لوگ انہیں زید بن محمد کہہ کر پکارتے تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو پھر زید بن حارثہ کہنا شروع کر دیا۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر) اور رسول اللہ ﷺ خود بھی انہیں زید بن حارثہ ہی کہنے لگے۔ ضمناً اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا باپ نہیں تھا۔ ورنہ اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریم کبھی نہ فرماتے۔ سیدنا عیسیٰ ابن مریم کی معجزانہ پیدائش کے منکرین کے لئے یہ لمحہ فکریہ اس لحاظ سے ہے کہ قرآن نے اور کسی مرد یا عورت کا نام ابنیت سمیت ذکر نہیں کیا۔

[۴] ۞ سلمان فارسیؓ اور صہیب رومیؓ:۔ جیسے سیدنا سلمان فارسیؓ کے باپ کا علم خود انہیں بھی نہیں تھا۔ بچپن میں ہی انہیں غلام بنا لیا گیا۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ مجھے دس سے زیادہ مرتبہ بیچا اور خریدا گیا۔ (بخاری۔ کتاب المناقب۔ باب اسلام سلمان الفارسی) اور جیسے سیدنا صہیب رومی جو اصل میں ایرانی تھے۔ مگر اہل روم نے جب فارس پر حملہ کیا تو انہیں بچپن ہی میں قیدی بنا کر روم لے گئے تھے اور دونوں صحابہ کرامؓ کو اپنے اپنے والد کے نام تک معلوم نہ تھے۔

[۵] یعنی اگر کوئی کسی کو پیار سے بیٹا یا بیٹی کہہ دے یا کسی کا احترام ملحوظ رکھ کر کسی بزرگ کو باپ یا بزرگ عورت کو ماں کہہ دے یا محض اخلاقاً یہ الفاظ استعمال کیے جائیں تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ حرج اس وقت واقع ہوتا ہے کہ اگر کسی کو بیٹا یا بیٹی کہے تو حقیقی بیٹے یا بیٹی جیسے فرائض، حقوق بھی اپنے اوپر لازم کر لے۔

[۶] ۞ اپنے آپ کو کسی دوسرے فرد یا قوم کی طرف منسوب کرنا کبیرہ گناہ ہے:۔ جس طرح عام مومنوں کو حکم ہے کہ وہ کسی شخص کو اس کے حقیقی باپ ہی کی طرف منسوب کریں کسی دوسرے کی طرف نہ کریں۔ اسی طرح یہ بھی حکم ہے کہ کوئی شخص خود بھی اپنے آپ کو اپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے شخص یا کسی قوم کی طرف منسوب نہ کرے۔ چنانچہ سیدنا ابوذر کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے دوسرے شخص کو جان بوجھ کر اپنا باپ بنایا وہ کافر ہو گیا اور جو شخص اپنے تئیں دوسری قوم کا بتائے وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا لے'' (بخاری۔ کتاب المناقب۔ باب نسبۃ الیمن الی اسمٰعیل) ہمارے ملک میں سید بننے کا یا کسی اونچی ذات سے نسبت قائم کرنے کا عام رواج ہے۔ ایسے حضرات اس حدیث کے آئینے میں اپنا انجام دیکھ سکتے ہیں۔

غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۵﴾ اَلنَّبِیُّ اَوۡلٰی بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ وَ اَزۡوَاجُہٗۤ اُمَّہٰتُہُمۡ ؕ وَ اُولُوا الۡاَرۡحَامِ

گرفت ہوگی۔) اللہ تعالیٰ یقیناً معاف[۷] کرنے والا ہے، رحم کرنے والا ہے۔(۵) بلاشبہ نبی مومنوں کے لئے ان کی اپنی ذات سے بھی مقدم[۸] ہے اور آپ کی بیویاں مومنوں[۹] کی مائیں ہیں۔ اور کتاب اللہ کی رو سے

[۷] اس کا ایک مطلب تو ہے کہ اس سلسلہ میں تم سے جو پہلے لغزشیں اور غلطیاں ہو چکی ہیں اللہ انہیں معاف کرنے والا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ اگر تم نادانستہ کوئی ایسی بات کہہ دو یا بھول چوک کہہ دو تو ایسی خطائیں بھی اللہ معاف کرنے والا ہے۔

[۸] ❁ آپ مومنوں کے ان کی ذات سے بھی زیادہ خیر خواہ ہیں:۔ اس آیت کے بھی دو مطلب ہیں۔ ایک مطلب یہ ہے کہ تم خود بھی اپنے اتنے خیر خواہ نہیں ہو سکتے جتنا کہ نبی تمہارا خیر خواہ ہے۔ پھر اس کے بھی دو پہلو ہیں ایک دینی دوسرا دنیوی۔ دینی لحاظ سے آپ کی تمام امت کو آپ ہی کی وساطت سے ہدایت کا راستہ ملا جس میں ہماری دنیوی اور اخروی فلاح ہے۔ آپ ہمارے معلم بھی ہیں اور مربی بھی، اس لحاظ سے آپ تمام امت کے روحانی باپ بھی ہوئے اور روحانی استاد بھی۔ اور دنیوی پہلو میں آپ کی سب سے زیادہ خیر خواہی درج ذیل حدیث سے واضح ہوتی ہے۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جتنے بھی مومن ہیں میں ان سب کا دنیا اور آخرت کے کاموں میں سب لوگوں سے زیادہ حقدار (اور خیر خواہ) ہوں۔ جو مومن مرتے وقت مال و دولت چھوڑ جائے اس کے وارث اس کے عزیز و اقارب ہوں گے جو بھی ہوں اور اگر وہ کچھ قرضہ یا چھوٹے چھوٹے بال بچے چھوڑ جائے تو وہ میرے پاس آئیں میں ان کا کام چلانے والا ہوں'' (بخاری۔ کتاب التفسیر)

❁ تمام لوگوں سے بڑھ کر آپ سے محبت کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا:۔ اور آپ کی اس حد درجہ کی خیر خواہی کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ تمام مسلمان بھی آپ کا دوسرے سب لوگوں سے بڑھ کر احترام کریں اور ان کی اطاعت کریں تاکہ آپ کی تعلیم و تربیت سے پوری طرح فیض یاب ہو سکیں اور اس پہلو پر درج ذیل احادیث روشنی ڈالتی ہیں:

۱۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کو میری محبت، اولاد، والدین اور سب لوگوں سے زیادہ نہ ہو'' (مسلم کتاب الایمان۔ باب وجوب محبة رسول الله ﷺ)

۲۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ ''کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنی خواہش نفس کو اس چیز کے تابع نہ کر دے جو میں لایا ہوں'' (شرح السنۃ۔ بحوالہ مشکوۃ۔ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنہ۔ فصل ثانی)

۳۔ سیدنا عبداللہ بن ہشام فرماتے ہیں کہ ہم آپ ﷺ کے ساتھ تھے اور آپ ﷺ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: یارسول اللہ ﷺ آپ ﷺ میرے نزدیک اپنی جان کے علاوہ ہر چیز سے محبوب ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ جب تک میں تمہارے نزدیک تمہاری جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں، تم مومن نہیں ہو سکتے'' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کی قسم! اب آپ ﷺ میرے نزدیک میری جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اب اے عمر!'' (یعنی اب تم صحیح مسلم ہو) (بخاری۔ کتاب الایمان والنذور۔ باب کیف کان یمین النبی ﷺ)

[۹] جب نبی روحانی باپ ہوا تو اس کی بیویاں روحانی مائیں ہوئیں۔ یا جب نبی کی بیویاں امت کی مائیں ہیں تو نبی ان کا باپ ہوا۔

بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ إِلَّا أَنْ تَفْعَلُوا إِلَىٰ
أَوْلِيَائِكُمْ مَعْرُوفًا ۚ كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا ﴿٦﴾ وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ
وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۖ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا ﴿٧﴾ لِيَسْأَلَ

مومنین اور مہاجرین کی نسبت، رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ (ترکہ کے) حقدار ہیں۔ البتہ اگر تم اپنے دوستوں سے کوئی[۱۰] بھلائی کرنا چاہو (تو کرسکتے ہو) کتاب[۱۱] اللہ میں یہی کچھ لکھا ہوا ہے۔(۶) اور اس عہد کو یاد رکھو جو ہم نے سب نبیوں سے لیا اور آپ سے بھی اور نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم[۱۲] سے بھی۔ ان سب سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا۔(۷)

لیکن ازواج النبی صرف احترام کے پہلو میں امت کی مائیں ہیں اور ان سے کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد نکاح بھی نہیں کرسکتا اور باقی احکام بدستور رہیں گے۔ مثلاً وہ مومنوں سے باقاعدہ پردہ کریں گی اور وہ انہیں اجنبی ہی سمجھیں گی نہ ہی وہ کسی امتی کی وراثت میں دعویدار بن سکتی ہیں۔ وغیرہ۔

[۱۰] **مؤاخات اور وراثت:۔** جب رسول اللہ ﷺ اور دوسرے مسلمان ہجرت کرکے مدینہ تشریف لائے تو ایک نہایت اہم مسئلہ مہاجرین کی آبادکاری اور ان کے ذریعہ معاش کا بھی تھا۔ جو اس نوزائیدہ مسلم ریاست کے لئے فوری طور پر حل طلب تھا۔ آپ ﷺ نے اس نازک مسئلہ کے حل میں نہایت دانشمندی سے کام لیا۔ اور ایک مہاجر کو ایک انصاری کے ساتھ ملاکر اس کی آبادی اور اس کے معاش کی ذمہ داری اس پر ڈال دی۔ اس ذمہ داری کو انصار نے بڑی فراخدلی سے قبول کیا۔ اس سلسلہ کو مؤاخات کہتے ہیں۔ آپ ﷺ نے سیدنا انس بن مالک کے گھر میں مختلف اوقات کی تین مجالس میں تقریباً نتالیس مہاجرین کو اتنے ہی انصار کا بھائی بنادیا۔ اس طرح عارضی طور پر مہاجرین کی آبادکاری اور معاش کا مسئلہ حل ہوگیا۔ پھر یہ بھائی چارہ اس حد تک بڑھا کہ وہ ایک دوسرے کے وارث اور ولی قرار پاگئے۔ مہاجر کی وراثت اس کے انصاری بھائی کو ملتی تھی اور انصاری کی اس کے مہاجر بھائی کو۔ پھر جب مسلمانوں کی معاشی حالت نسبتاً بہتر ہوگئی تو اس عارضی قانون کو ختم کردیا گیا اور اصل وارث قریبی رشتہ دار ہی قرار پائے۔ ہاں ان بھائیوں سے حق وراثت کے علاوہ دوسرے ذرائع سے بہتر سلوک کی اجازت دی گئی۔ مثلاً کوئی شخص ان کے حق میں وصیت کرسکتا ہے۔ اپنی زندگی میں مالی امداد اور ہبہ کرسکتا ہے۔ تحفے تحائف دے سکتا ہے۔

[۱۱] یعنی مؤاخات کے بھائیوں کو ایک دوسرے کا وارث بنادینا ایک عارضی قانون تھا۔ مستقل قانون شریعت یہی ہے کہ وراثت کے حقدار قرابتدار ہی ہوتے ہیں۔

[۱۲] **انبیاء کا عہد کیا ہے؟** انبیاء کا عہد، عہد الست سے الگ ہے۔ اور اس عہد کا بھی قرآن میں متعدد بار ذکر آیا ہے (۲: ۸۳، ۳: ۱۸۷، ۵: ۶۷، ۷: ۱۶۹ تا ۱۷۱، ۴۲: ۱۳ میں) اور وہ عہد یہ تھا کہ ہر پیغمبر اپنے سے پہلے پیغمبروں کی اور ان کی کتابوں کی تصدیق کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی سب سے پہلے خود اطاعت کرے گا پھر دوسروں سے کرائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے پیغام کو بلاکم و کاست دوسروں تک پہنچائے گا اور ان احکام کو عملاً نافذ کرنے میں اپنی مقدور بھر کوشش سے دریغ نہ کرے گا۔ اور اس مقام پر اس عہد کو یاد دلاتے اور بالخصوص منك کہنے سے مراد یہ ہے کہ آپ جو منہ بولے رشتوں کے معاملہ میں جاہلیت کی رسم توڑنے سے جھجک رہے ہیں اور دشمنوں کے طعن و تشنیع سے ڈر رہے ہیں تو ان لوگوں کی قطعاً پروانہ کیجئے۔ دوسرے پیغمبروں کی طرح آپ

ع ۸/۱۷

الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ⑧ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ
عَلَيْكُمْ اِذْ جَاۗءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ⑨
اِذْ جَاۗءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ
الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ⑩ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ⑪ وَاِذْ يَقُوْلُ

تاکہ اللہ تعالیٰ سچے لوگوں سے ان کی سچائی کے بارے میں سوال [۱۳] کرے اور کافروں کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔(۸)

اے ایمان والو! اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جب (کفار کے) لشکر تم پر چڑھ آئے تھے تو ہم نے آندھی اور ایسے لشکر بھیج دیئے جو تمہیں [۱۴] نظر نہ آتے تھے اور جو کچھ تم کر رہے تھے اللہ اسے خوب دیکھ رہا تھا۔(۹)
جب وہ تمہارے اوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے تھے اور جب آنکھیں پھر گئی تھیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے تھے اور تم اللہ تعالیٰ کے متعلق طرح طرح کے گمان کرنے لگے تھے(۱۰) اس موقع پر مومنوں کی آزمائش کی گئی اور وہ بُری طرح ہلا دیئے گئے۔(۱۱)

سے بھی ہمارا پختہ معاہدہ ہے کہ جو کچھ بھی ہم تمہیں حکم دیں گے اسے بجالاؤ گے اور دوسروں کو اس کی پیروی کا حکم دو گے۔ لہٰذا جو خدمت ہم آپ سے لینا چاہتے ہیں اسے بلا تامل سر انجام دو اور شماتتِ اعداء کا خوف نہ کرو۔

[۱۳] انبیاء کے عہد کی ان سے باز پرس بھی ہو گی:۔ یہ محض عہد لینے تک ہی معاملہ نہیں ہو جاتا بلکہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس عہد سے متعلق پیغمبروں سے بھی سوال کرے گا۔ ان کی بھی باز پرس ہو گی۔ انہیں بھی پوچھا جائے گا کہ آیا تم نے اپنی قوم کو میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟ پھر اس قوم نے تمہیں کیا جواب دیا تھا؟ یا تمہاری دعوت کا ردِ عمل کیا ہوا تھا؟ یہ مطلب تو ربطِ مضمون کے لحاظ سے ہے۔ تاہم یہاں رسولوں کے بجائے صادقین کا لفظ آیا ہے۔ گویا ہر ایماندار سے اس کے عہد کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ پھر جن لوگوں نے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو پورا کیا ہو گا وہی لوگ صادق العہد قرار پائیں گے۔

[۱۴] جنگِ احزاب کے اصل محرک خیبر میں پناہ گزین یہودی تھے:۔ آیت نمبر ۹ سے لے کر آیت نمبر ۲۷ تک جنگ احزاب کا یا جنگِ خندق کا بیان ہے۔ مگر اس میں تسلسل کا وہ انداز نہیں جو ایک انسان یا مورخ کے بیان یا اس کی تصنیف میں پایا جاتا ہے۔ وہ سب سے پہلے جنگ کے اسباب بیان کرے گا۔ پھر واقعات کی تفصیل بتائے گا پھر اس کے بعد اس کے نتائج پر تبصرہ کرے گا۔ لیکن قرآن کا اندازِ بیان اس سے بالکل جداگانہ ہوتا ہے۔ قرآن کا اصل موضوع انسان کی ہدایت اور مسلمانوں کی اخلاقی اور عملی تربیت ہے۔ لہٰذا اس مخصوص اندازِ بیان سے اس جنگ کے بیان کا آغاز کیا گیا ہے اور انہیں بتایا ہے کہ جب اللہ کے فرمانبردار صرف اللہ پر توکل کرتے ہیں تو وہ کن کن غیر مرئی اسباب سے اپنے بندوں کی مدد فرماتا ہے لہٰذا مسلمانوں کو مشکل سے مشکل آزمائش کے وقت بھی صرف اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھنا چاہئے اور جو کام وہ کر سکتے ہیں وہ بہر حال انہیں پوری

محنت سے سرانجام دینا چاہئیں۔ پھر بعد میں قرآن کے بیان میں ان تمام فرقوں کے کردار پر بھی تبصرہ آ گیا ہے جو اس جنگ میں شریک تھے۔ اب ہم پہلے اس جنگ کے مختصر حالات ترتیب وار بیان کرتے ہیں تاکہ اس جنگ کا پس منظر اور واقعات بھی سامنے رہیں اور آیات قرآنی کا مفہوم سمجھنے میں آسانی ہو۔

۞ کفار کے متحدہ گروپ میں کون کون سے گروپ اور قبائل شامل تھے؟ اس جنگ میں قریش مکہ، یہود مدینہ اور مشرک بدوی قبائل سب نے حصہ لیا تھا اسی لئے اسے "جنگ احزاب" کہا جاتا ہے۔ رہے منافقین تو وہ کھل کر سامنے آنے کی بجائے مسلمانوں میں بددلی پھیلانے اور ان کی حوصلہ شکنی کرنے، ان کا مذاق اڑانے اور دشمنوں سے ساز باز کا کردار ادا کر رہے تھے۔ کافر اتحادیوں کے اس مشترکہ لشکر کا سردار چونکہ ابوسفیان ہی تھا لہٰذا اس جنگ میں زیادہ تر حصہ قریش مکہ کا ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس جنگ کا آغاز یوں ہوا کہ جنگ احد کے بعد غزوہ بنونضیر پیش آیا۔ جس کے نتیجہ میں یہودیوں کو مدینہ سے نکال دیا گیا اور انہوں نے خیبر میں جا کر پناہ لی تھی۔ انہیں جلاوطن شدہ یہودیوں میں سے بیس افراد پر مشتمل ایک وفد قریش مکہ کے پاس آیا اور انہیں مسلمانوں پر ایک اجتماعی اور کاری ضرب لگانے کی ترغیب دی۔ ایسی ضرب جس سے مسلمانوں کی جڑ کٹ جائے اور یہ روز مرہ کی بک بک ختم ہو۔ قریش مکہ نے یہودی وفد کی اس آواز پر لبیک کہا اور انہوں نے اس موقعہ کو اس لحاظ سے بھی غنیمت جانا کہ جنگ احد کے اختتام پر ابوسفیان نے ایک سال بعد بدر کے میدان میں جنگ لڑنے کا چیلنج دیا تھا۔ مسلمانوں کے وقت مقررہ پر میدان بدر میں پہنچنے کے باوجود ابوسفیان وہاں نہ پہنچ سکا تھا۔ یہود کی اس پیش کش نے اس کے حوصلے بڑھا دیئے اور فوراً ان کا ہمنوا بن گیا۔ قریش مکہ کی طرف سے حوصلہ افزا جواب پانے کے بعد یہ وفد بنوغطفان کے پاس گیا۔ یہ قبیلہ چونکہ پہلے ہی یہود کا حلیف تھا لہٰذا وہ بھی فوراً تیار ہو گیا۔ بعد ازاں یہ وفد دوسرے اسلام دشمن قبائل میں گھوما پھرا حتیٰ کہ تمام اسلام دشمن عناصر کو مسلمانوں کے خلاف آمادہ جنگ کر لیا۔ چنانچہ ذی قعدہ ۵ھ میں ابوسفیان کی سرکردگی میں جنوبی اطراف سے قریش، کنانہ اور تہامہ میں آباد دوسرے حلیف قبائل کا چار ہزار افراد پر مشتمل لشکر مدینہ کی جانب روانہ ہوا۔ مرالظہران کے مقام پر بنوسلیم کے ذیلی قبائل جنہوں نے بیئر معونہ کے قریب چوٹی کے ستر (۷۰) قاریوں کو دھوکے سے شہید کر دیا تھا، ابوسفیان کے لشکر سے آ کر مل گئے۔ مشرقی اطراف سے غطفانی قبائل فزارہ، حرہ اور اشجع بھی اس لشکر سے آ ملے۔ غرضیکہ مدینہ تک پہنچتے پہنچتے اس لشکر کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی۔ جبکہ مدینہ کی کل آبادی بھی دس ہزار سے کم تھی اس میں سے جنگجو افراد صرف تین ہزار تھے اور ان تین ہزار میں منافقین بھی شامل تھے۔ اگر مسلمانوں نے خندق کھود کر بروقت اپنا دفاع نہ کر لیا ہوتا تو فی الواقع یہ عظیم لشکر مسلمانوں کو ایک ہی حملہ میں نیست و نابود کرنے کے لئے کافی تھا۔

۞ مجلس مشاورت اور خندق کی کھدائی:۔ دوسری طرف مسلمانوں کا محکمہ خبر رسانی (Intelligence) کفار کی نسبت بہت زیادہ فعال اور متحرک تھا۔ جب یہود بنونضیر کا وفد قریش اور دوسرے قبائل کو آمادہ جنگ کر رہا تھا تو جلد ہی یہ خبریں مدینہ پہنچ گئیں اور آپ ﷺ نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ دفاع کے لئے کیا صورت اختیار کی جائے؟ چنانچہ سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ کے مطابق مدینہ کے سامنے والی سمت میں خندق کھود کر دفاع کرنے کی تجویز پاس ہوئی۔ چنانچہ خندق کی کھدائی کا کام شروع ہو گیا۔ خندق ۱۵ فٹ گہری کھودی۔ ہر دس آدمیوں کو چالیس ہاتھ لمبی خندق کھودنے پر مامور کیا گیا اور صحابہ کرامؓ نے مل کر یہ خندق بیس دن میں مکمل کی۔ معاشی لحاظ سے بھی مسلمانوں پر یہ وقت انتہائی تنگی کا دور تھا۔ مسلمان پیٹ پر پتھر باندھ کر خندق کھود رہے تھے۔ اور سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مہاجرین اور انصار نے مدینہ کے گرد خندق کھودنا شروع کی تو

مٹی اپنی پیٹھ پر ڈھو رہے تھے اور یہ شعر پڑھتے جاتے تھے۔ "ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس بات پر بیعت کی کہ جب تک زندہ رہیں گے۔ اسلام کی خاطر زندہ رہیں گے اور آپ ﷺ انہیں یہ جواب دے رہے تھے۔ یا اللہ! بھلائی تو وہی ہے جو آخرت کی ہے۔ لہٰذا مہاجرین وانصار میں برکت عطا فرما"

❁ **خوراک کی قلت:۔** سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس وقت خوراک کی قلت کا یہ حال تھا کہ تھوڑے سے جو بدبودار چربی میں ملا کر پکاتے۔ لوگ بھوکے ہوتے وہ اسے بھی کھا جاتے۔ حالانکہ وہ بدمزا چربی حلق پکڑ لیتی اور اس سے خراب بو آتی تھی۔ (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب غزوۃ الخندق)

❁ **آپ کا اکیلے چٹان توڑنا۔** اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہم خندق کھود رہے تھے تو زمین میں ایک بڑا سخت قطعہ آگیا جو کدال سے کھد نہ سکا۔ لوگوں نے آپ ﷺ کو اس صورت حال سے مطلع کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں خود اترتا ہوں۔ آپ کھڑے ہوئے بھوک کی وجہ سے آپ ﷺ کے پیٹ پر پتھر بندھا تھا اور ہم لوگ نے بھی تین دن سے کوئی کھانے کی چیز نہ چکھی تھی۔ آپ ﷺ نے کدال اس قطعہ پر اس زور سے ماری کہ وہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ میں نے جب بھوک سے آپ ﷺ کا یہ حال دیکھا تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ سیدھا گھر اپنی بیوی (سہلہ) کے پاس آیا اور کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کی یہ حالت دیکھی ہے۔ تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے۔ وہ کہنے لگی ایک صاع جو اور ایک بکری کا بچہ ہے۔ میری بیوی نے جو پیسے اور میں نے بکری ذبح کر کے اس کا گوشت ہانڈی میں ڈالا اور رسول اللہ ﷺ کو بلانے کے لئے روانہ ہوا تو بیوی کہنے لگی۔ "رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھوڑے ہی آدمی بلانا اور مجھے سب کے سامنے شرمندہ نہ کرنا"

❁ **جابر بن عبداللہ کے ہاں دعوت اور آپ کا معجزہ:۔** میں نے آپ ﷺ کے پاس حاضر ہو کر چپکے سے کہا کہ ہم نے ایک صاع جو کا آٹا پیسا ہے اور ایک بکری کا بچہ ذبح کیا ہے۔ لہٰذا آپ چند آدمیوں کو ہمراہ لے کر ہمارے ہاں چلئے۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے بلند آواز سے پکارا، خندق والو! جابر کے ہاں تمہاری دعوت ہے۔ چلو، جلدی کرو" اور جابر سے فرمایا کہ: "جب تک میں نہ آوں۔ ہانڈی چولھے پر سے مت اتارنا اور نہ آٹے کی روٹیاں بنانا" میں گھر واپس لوٹا ہی تھا، آپ ﷺ کے ساتھ بہت سے لوگ موجود تھے۔ میری بیوی مجھے کہنے لگی "اللہ تجھ سے سمجھے" میاں نے کہا جیسا تو نے کہا تھا میں نے ویسا ہی آپ ﷺ سے کہا تھا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے آٹے میں اپنا لب ڈال دیا اور برکت کی دعا کی۔ اس کے بعد آپ ہانڈی کی طرف گئے۔ اس میں بھی لب ڈالا۔ اور میری بیوی سے فرمایا: "روٹی پکانے والی ایک اور بلا لے اور کفگیر سے ہانڈی میں سے گوشت نکالتی جا اور اس کو چولہے سے نہ اتارنا۔ سیدنا جابر کہتے ہیں کہ کھانے والے ایک ہزار آدمی تھے اور میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ سب نے کھانا خوب سیر ہو کھایا مگر ہانڈی کا وہی حال تھا۔ وہ گوشت سے بھری جوش مار رہی تھی اور آٹے میں سے بھی روٹیاں بن رہی تھیں۔ (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب غزوۃ الخندق)

❁ **بنو قریظہ کی عہد شکنی:۔** خندق تیار ہونے کے بعد ایک افتاد یہ پیش آئی کہ مدینہ کے اندر جو یہود کا قبیلہ بنو قریظہ، جو مسلمانوں کا معاہد اور اب تک اپنے عہد پر قائم تھا۔ حیی بن اخطب کی انگیخت اور جنگ کے بعد بھی تعاون کی یقین دہانی کی بنا پر عہد شکنی پر آمادہ ہو گیا۔ آپ ﷺ نے اس خبر کی تحقیق کے لئے انصار کے 4 سرداروں کو بھیجا اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دی کہ اگر بنو قریظہ کی عہد شکنی کی خبر درست ہو تو دوسروں کی موجودگی میں مجھے نہ بتائیں بلکہ صرف اشارے سے کام لیں۔ جب انہوں نے صورتحال کی تحقیق کے بعد آپ کو بتایا کہ بنو قریظہ کی عہد شکنی والی بات درست ہے۔ اس خبر سے آپ ﷺ کو انتہائی صدمہ ہوا۔ مسلمانوں کے لئے یہ وقت کڑی

آزمائش کا وقت تھا۔ خندق پار دشمن کا سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہوا لشکر اور مدینہ کے اندر منافقین مارِ آستین بن گئے۔ خوراک کی شدید قلت الگ تھی۔ کفار کا یہ محاصرہ تقریباً ایک ماہ تک جاری رہا۔ ہر روز خندق کے آرپار دونوں طرف سے نیزہ باری اور تیر اندازی ہوتی رہی مگر جنگ کسی فیصلہ کن مرحلہ پر نہ پہنچتی تھی۔ یہ اس قدر کڑی آزمائش تھی کہ بھلے بھلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قدم ڈگمگا گئے۔ اس حال میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی دو طرح سے مدد فرمائی۔

❁ نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ کی سیاسی چال اور اتحادی گروپ میں پھوٹ:۔ ایک صورت تو یہ بنی کہ بنو غطفان کا ایک رئیس نعیم بن مسعود، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لے آیا۔ اور اس بات کا علم نہ قریش کو ہو سکا اور نہ یہود کو۔ دونوں اسے اپنا اتحادی دوست سمجھتے تھے۔ نعیم بن مسعود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میں ان حالات میں آپ کی اور اسلام کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ چنانچہ آپ نے اس کے ذمہ قریش اور یہود میں پھوٹ ڈالنے کی ڈیوٹی لگائی۔ آدمی بڑا عقلمند تھا۔ اسے فوراً ایک ترکیب سوجھ گئی وہ پہلے بنو قریظہ کے ہاں گیا اور کہنے لگا: دیکھو اگر جنگ میں اتحادیوں کو ناکامی ہوئی تو قریش تو اپنے گھروں کو چلے جائیں گے لیکن تم مسلمانوں کے اندر بیٹھے ہو۔ وہ تمہارا بھرکس نکال دیں گے۔ لہٰذا میرا مشورہ یہ ہے کہ تم قریش سے بطور یرغمال دس آدمیوں کا مطالبہ کرو تاکہ ایسی صورت میں وہ تمہارے ساتھ تعاون کرنے پر مجبور ہوں۔ یہود کو یہ بات بہت پسند آئی۔ پھر وہ ابوسفیان کے پاس جاکر کہنے لگا: یہود تم سے بدظن ہو چکے ہیں۔ اور وہ تم سے بطور یرغمال دس آدمیوں کا مطالبہ کرنا چاہتے ہیں۔ جنہیں وہ کسی وقت بھی مسلمانوں کے حوالہ کر کے جنگ کا نقشہ بدل سکتے ہیں اور اپنے آپ کو مسلمانوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا تم ان کا مطالبہ ہرگز تسلیم نہ کرنا۔ ابوسفیان کے دل میں یہ بات کھب گئی۔ ابوسفیان نے دوسرے دن بنو قریظہ کو مشترکہ حملہ کے لئے پیغام بھیجا تو انہوں نے بطور یرغمال دس آدمیوں کا مطالبہ کر دیا۔ اس طرح یہ دونوں فریق پھوٹ کا شکار ہو گئے۔

❁ سخت ٹھنڈی ہوا کی آندھی:۔ مسلمانوں کی مدد کی دوسری صورت جو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی اور جس کا آیت میں ذکر ہے، یہ تھی کہ ٹھنڈی یخ ہوا اتنی تیز چلی جس نے خیمے اکھاڑ دیئے۔ گھوڑوں کے رسے ٹوٹ گئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہنڈیاں ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ آگ بجھ گئی، ہوا اتنی سخت ٹھنڈی تھی کہ بدن کو چھید کرتی اور آرپار ہوتی معلوم ہوتی تھی۔ غرض لشکر کفار میں سخت بدحواسی پھیل گئی اور بھگدڑ مچ گئی۔

❁ زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کا دشمن کی خبر لانے کو تیار ہونا:۔ ان حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو مخاطب کر کے پوچھا کہ کون ہے جو جاکر دشمن کی خبر لائے؟ مگر اتنی ٹھنڈی آندھی میں کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ آخر سیدنا زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو اس خدمت کے لئے پیش کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ یہی سوال کیا تو بھی سیدنا زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ ہی نے کہا، میں جاتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سہ بار یہی سوال کیا تو پھر سیدنا زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ لشکر کفار کی طرف روانہ ہو گئے۔ آپ رضی اللہ عنہ خود کہتے ہیں کہ اس وقت مجھے قطعاً کچھ سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے واپس آکر وہی حالات بیان کئے جو لوگ سن رہے تھے۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر پیغمبر کا ایک حواری ہوتا ہے اور میرا حواری زبیر رضی اللہ عنہ ہے" (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب غزوۃ خندق وھی الاحزاب)

❁ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان کہ آئندہ کفار ہم پر حملہ نہ کر سکیں گے:۔ چنانچہ ان حالات نے دشمن کو واپسی پر مجبور کر دیا اور وہ

الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲﴾ وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا

جبکہ منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا یہ کہہ رہے تھے کہ: اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے جو وعدہ[۱۵] کیا تھا وہ بس دھوکا ہی تھا(۱۲) اور جب ان کا ایک گروہ کہنے لگا: "یثرب[۱٦] والو! (آج) تمہارے ٹھہرنے کا کوئی موقعہ نہیں لہٰذا واپس آجاؤ[۱۷]" اور ان کا ایک گروہ نبی سے (واپس جانے کی) اجازت مانگ رہا تھا اور کہتا تھا کہ: "ہمارے گھر غیر محفوظ (لگتے) ہیں حالانکہ ان کے گھر غیر محفوظ نہیں تھے

افراتفری کے عالم میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا: "آج کے دن کے بعد کفار ہم پر چڑھ کر نہیں آئیں گے بلکہ ہم ان پر چڑھائی کریں گے" (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب غزوہ خندق) چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد حرف بحرف پورا ہوا۔

❁ اللہ تعالیٰ کے غیر مرئی لشکر:۔ اس آیت میں ایک تو ہوا سے مدد کا ذکر ہے اور دوسرے ایسے لشکروں سے مدد کا ذکر ہے جو تمہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ اس سے مراد وہ باطنی اسباب ہیں جن کی بنا پر کفار بھاگ کھڑا ہونے پر مجبور ہوتے تھے۔ ممکن ہے اس سے مراد فرشتے ہوں جو ہوا وں پر مامور تھے۔ واللہ اعلم۔ بہرحال اس جنگ میں فرشتوں کا نزول احادیث صحیحہ سے صراحت سے ثابت نہیں۔

[۱۵] ❁ منافقوں کے مسلمانوں کو طعنے:۔ جب بنو قریظہ بھی مسلمانوں سے بدعہدی پر آمادہ ہوگئے تو اب مسلمانوں کے لئے اندر اور باہر ہر طرف دشمن ہی دشمن تھے۔ اس تشویشناک صورت حال میں منافقوں نے مسلمانوں ہی کو یہ طعنے دینا شروع کر دیئے کہ تم تو ہمیں یہ بتاتے تھے کہ ہمیں قیصر و کسریٰ کے خزانے ملیں گے اور یہاں یہ صورت حال ہے کہ رفع حاجت کو جانے میں بھی جان کی سلامتی نظر نہیں آتی" دراصل منافقوں کا خیال کچھ ایسا تھا کہ بس ان کے ایمان کا دعویٰ کرنے کی دیر ہے کہ آسمان سے فرشتے اتر پڑیں گے۔ اور ان کی تاج پوشی کی رسم ادا کریں گے۔ انہیں انگلی تک بھی ہلانے کی نوبت نہ آئے گی۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ ایمان لانے کے بعد انہیں سخت آزمائشوں کے دور سے گزرنا ہوگا۔ مصائب کے پہاڑ ان پر ٹوٹیں گے اور انہیں سر دھڑ کی بازی لگانا پڑے گی۔ تب کہیں جا کر اللہ کی مدد آتی ہے۔ البتہ اس کے وعدہ کے مطابق آتی ضرور ہے۔

[۱٦] یہ مدینہ کا پہلا نام ہے۔ جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو یہ مدینۃ النبی ﷺ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے بعد المدینہ کے نام سے دنیا بھر میں مشہور و معروف ہوگیا۔

[۱۷] اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ پریشان کن صورت حال دیکھ کر منافقین اپنے ساتھیوں کو یہ دعوت دینے لگے کہ محاذ جنگ چھوڑ کر اپنے گھروں کو واپس لوٹ آؤ اور دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی دعوت یہ تھی کہ اسلام کو چھوڑ کر پھر سے اپنے پہلے دین کی طرف واپس آجاؤ۔ اسی میں تمہاری عافیت اور خیریت ہے کہ اسلام کو چھوڑ کر اتحادیوں سے مل جاؤ۔

عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ إِنْ يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا ﴿١٣﴾ وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِنْ أَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا
الْفِتْنَةَ لَآتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوا بِهَا إِلَّا يَسِيرًا ﴿١٤﴾ وَلَقَدْ كَانُوا عَاهَدُوا اللَّهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّونَ
الْأَدْبَارَ ۚ وَكَانَ عَهْدُ اللَّهِ مَسْئُولًا ﴿١٥﴾ قُلْ لَنْ يَنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ إِنْ فَرَرْتُمْ مِنَ الْمَوْتِ أَوِ الْقَتْلِ

وہ تو صرف (جنگ سے) فرار[۱۸] چاہتے تھے(۱۳) اور اگر کفار کے لشکر اطراف مدینہ سے ان پر چڑھ آتے اور انہیں فتنہ کی دعوت دیتے تو یہ منافق فوراً مان لیتے اور اس میں کچھ زیادہ[۱۹] دیر نہ کرتے(۱۴) حالانکہ اس سے بیشتر وہ اللہ سے عہد[۲۰] کر چکے تھے کہ وہ پیٹھ نہ پھریں گے۔ اور اللہ سے کئے ہوئے عہد کی باز پرس تو ہو کر ہی رہے گی(۱۵) آپ ان سے کہئے کہ اگر تم موت اور قتل ہونے سے بھاگتے ہو تو تمہارا بھاگنا تمہیں کچھ فائدہ[۲۱] نہ دے گا،

[۱۸] ❁ منافقوں کا گھروں کی حفاظت کا بہانہ:۔ اکثر منافق جنگ میں شمولیت سے فرار کے لئے مختلف بہانے سوچ رہے تھے۔ عام بہانہ یہ تھا کہ ان کے گھر دشمن کے سامنے کھلے پڑے ہیں۔ لہٰذا ان کی حفاظت کے لئے انہیں واپس چلے جانے کی اجازت دی جائے۔ اور آپ ﷺ اپنی نرمی طبع کی بنا پر ایسے لوگوں کو اجازت دیتے رہے۔ یا شاید آپ اسی میں بہتری سمجھتے ہوں کہ ایسے لوگ مسلمانوں کے لشکر میں رہ کر بگاڑ ہی پیدا کریں گے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ان کا یہ عذر بھی محض ایک جھوٹا بہانہ تھا۔ کیونکہ مسلمان مدینہ کی اور مدینہ کے گھروں کی پوری حفاظت کا انتظام کر کے محاذ جنگ پر نکلتے تھے۔

[۱۹] یعنی اگر اتحادی کافر انہیں مسلمانوں سے لڑنے کی دعوت دیتے تو یہ فوراً ان کی بات مان کر مسلمانوں سے لڑنے کو تیار ہو جاتے اور ایک منٹ کی بھی تاخیر نہ کرتے۔ اس وقت انہیں قطعاً یہ خیال نہ آتا کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں اور اگر ہم اپنے گھروں کی حفاظت نہ کریں گے تو دشمن لوٹ لے گا۔ یہی بات ان کے جھوٹ اور نفاق کی ایک بڑی دلیل ہے۔

[۲۰] ❁ منافقوں کا اپنے عہد سے انحراف:۔ یہ عہد ان منافقوں نے جنگ احد کے بعد کیا تھا کہ اگر آئندہ کوئی آزمائش کا موقع آیا تو ہم اپنے سابقہ قصور کی تلافی کر دیں گے۔ پھر جب دو ہی سال بعد آزمائش کا موقعہ آ گیا تو ان لوگوں نے پہلے سے بھی زیادہ بزدلی دکھائی اور جنگ سے فرار کی راہیں سوچنے لگے بلکہ دوسروں کی بھی حوصلہ شکنی کرنے لگے۔ حتیٰ کہ سب کو معلوم ہو گیا کہ یہ اپنے عہد میں کس قدر مخلص تھے۔ اب ان کے اصل جرم کے علاوہ اس بدعہدی کی بھی باز پرس ہو گی۔

[۲۱] ❁ عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہت بہتر ہے:۔ موت کے متعلق چند اٹل حقائق ہیں۔ ایک یہ کہ موت اپنے وقت سے پہلے نہیں آتی۔ کیا یہ ضروری ہے کہ جو لوگ جنگ میں شریک ہوں اور نہایت خلوص سے جنگ کریں وہ سب کے سب شہید ہو جاتے ہیں؟ دوسری حقیقت یہ ہے کہ موت آ کے رہے گی اس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ اگر تم جنگ سے فرار کی راہ اختیار کرو گے تو زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ چند سال مزید جی لو گے۔ آخر تمہیں مرنا ہی ہے اور مر کر ہمارے ہی پاس آنا ہے۔ یہ تو بہر حال ناممکن ہے کہ موت کی گرفت سے بچ سکو۔ مگر ایسی زندگی پر لعنت ہے جو بدنامی اور ذلت سے گزرے۔ کیونکہ عزت کے ساتھ مرنا ذلت کے ساتھ جینے سے بہر حال بہتر ہوتا ہے۔

وَإِذًا لَّا تُمَتَّعُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿١٦﴾ قُلْ مَن ذَا الَّذِي يَعْصِمُكُم مِّنَ اللَّهِ إِنْ أَرَادَ بِكُمْ سُوءًا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ
رَحْمَةً ۚ وَلَا يَجِدُونَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿١٧﴾ قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الْمُعَوِّقِينَ مِنكُمْ وَالْقَائِلِينَ
لِإِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ إِلَيْنَا ۖ وَلَا يَأْتُونَ الْبَأْسَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿١٨﴾ أَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۖ فَإِذَا جَاءَ الْخَوْفُ رَأَيْتَهُمْ
يَنظُرُونَ إِلَيْكَ تَدُورُ أَعْيُنُهُمْ كَالَّذِي يُغْشَىٰ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۖ فَإِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوكُم

اس صورت میں بھی تم تھوڑا (عرصہ) ہی فائدہ اٹھا سکو گے" (۱۶)

آپ ان سے پوچھئے کہ: اگر اللہ تمہیں تکلیف دینا چاہے تو کون ہے جو اس سے تمہیں بچا سکے؟ یا اگر تم پر مہربانی کرنا چاہے[۲۲] (تو کون ہے جو اسے روک سکے) اللہ کے مقابلے میں یہ لوگ نہ کوئی اپنا حامی پا سکتے ہیں اور نہ مددگار (۱۷) اللہ تعالیٰ تم سے (جہاد میں) رکاوٹ ڈالنے والوں کو خوب جانتا ہے اور ان کو بھی جو اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں کہ "ہمارے پاس آجاؤ" اور جہاد میں[۲۳] یہ کم ہی حصہ لیتے ہیں۔ (۱۸) وہ تمہارا ساتھ دینے میں سخت بخیل ہیں۔ پھر جب (جنگ کا) خطرہ آن پڑتا ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ آنکھیں[۲۴] پھیر پھیر کر آپ کی طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے کسی پر موت کی غشی طاری ہو چکی ہو پھر جب خطرہ دور ہو جاتا ہے تو اموالِ غنیمت کے انتہائی[۲۵]

[۲۲] یعنی موت و حیات بھی سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور دنیا میں عیش و آرام کرنا یا تکلیفیں اٹھانا بھی۔ اگر تمہارے مقدر میں موت آچکی ہے تو جنگ سے فرار کے بعد آ ہی جائے گی۔ اسی طرح اگر چند دن عیش و آرام تمہاری قسمت میں ہے تو تبھی تمہیں نصیب ہو سکتا ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو ایک مخلص مومن کو بے پناہ جرأت عطا کرتا ہے۔ مگر منافق صرف ظاہری اسباب پر نظر رکھتے اور انہیں پر بھروسا کرتے ہیں۔ انہیں صرف دنیوی مفادات ہی عزیز ہوتے ہیں مگر اس حقیقت سے غافل ہیں انہیں وہی کچھ مل سکتا ہے جو اللہ انہیں دینا چاہتا ہے۔

[۲۳] یعنی نہ صرف یہ کہ خود جہاد سے فرار کے بہانے سوچتے رہتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس پیغمبر کا اور مسلمانوں کا ساتھ چھوڑو۔ یہ ایمان اور صداقت کے کس چکر میں پڑے ہو۔ اور خواہ مخواہ اپنی زندگی کو تلخ بنا رکھا ہے۔ مصائب اور خطرات میں پڑنے کی بجائے وہی امن و عافیت کی راہ اختیار کرو جو ہم نے اختیار کر رکھی ہے۔ اور ان کا اپنا حال یہ ہے کہ کبھی کبھار محض ظاہری وضع داری اور دکھاوے کے لئے میدان عمل میں آ کھڑے ہوتے ہیں۔

[۲۴] ۞ منافقوں کی بزدلی کا منظر:۔ ان کی بزدلی کا یہ عالم ہے کہ کوئی خطرے یا دشمن کے حملے کی بات بھی سن لیں تو ان پر پہلے سے موت کی غشی طاری ہونے لگتی ہے۔ یہ حال ہو تو وہ مسلمانوں کا ساتھ دے بھی کیسے سکتے ہیں؟

[۲۵] أَشِحَّةً (مادہ ش ح ح) شحیح ایسے شخص کو کہتے ہیں جو مال سمیٹنے میں تو انتہا درجہ کا حریص ہو مگر خرچ کرنے میں سخت بخیل ہو۔ یعنی جب جنگ میں تمہارا ساتھ دینے کا معاملہ ہو تو اس معاملہ میں وہ انتہائی بخل سے کام لیتے ہیں۔ مگر جب جنگ ختم ہو جائے میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہے 'اموالِ غنیمت کی تقسیم کا موقعہ ہو تو پھر یہ لوگ مال پر مرے جاتے ہیں اور

بِالْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ
يَسِيْرًا ۝۱۹ يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا ۚ وَاِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي
ع ۱۸ الْاَعْرَابِ يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَاۗىِٕكُمْ ۭ وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا ۝۲۰ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ

حریص بن کر تیز تیز زبانیں چلانے لگتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو قطعاً ایمان نہیں لائے۔ لہٰذا اللہ ان کے اعمال برباد[۲۶] کر دے گا اور یہ بات اللہ کے لئے بہت آسان[۲۷] ہے۔(۱۹)

وہ یہی سمجھ رہے ہیں کہ ابھی لشکر گئے نہیں[۲۸] اور اگر یہ لشکر چڑھ آئیں تو وہ یہ تمنا کریں گے کہ کاش وہ دیہاتیوں میں رہنے والے ہوتے اور بس تمہارے حالات ہی پوچھ لیا کرتے اور اگر وہ تم میں موجود بھی ہوتے تو (دشمن سے) لڑائی میں کم ہی حصہ لیتے۔(۲۰) (مسلمانو!) تمہارے لیے اللہ کے رسول (کی ذات) میں بہترین نمونہ[۲۹] ہے،

چاہتے یہ ہیں کہ یہ سارا مال ہمارے ہی ہاتھ آ جائے پھر وہ طرح طرح کی اپنی وفاداریاں اور ہمدردیاں جتلانے لگتے ہیں تاکہ اموال غنیمت میں اپنا استحقاق ثابت کر سکیں۔

[۲۶] یعنی ان کے دلوں میں کفر ہی کفر چھپا ہے اور اعمال کی اخروی جزا کے لئے ایمان شرط اول ہے جو ان میں سرے سے ہی نہیں۔ لہٰذا ان کے سب اعمال رائیگاں جائیں گے اور جو بداعمالیاں ہیں ان پر ضرور گرفت ہوگی اور ان کی سب سے بڑی بدعملی نفاق ہے۔

[۲۷] یعنی اپنے اعمال کی جزا ثابت کرنے کے لئے ان لوگوں کے پاس کوئی دلیل نہیں کہ ان کے پاس کچھ زور اور قوت ہے کہ اللہ کے لئے ان کے اعمال کو برباد کرنا کچھ قابل التفات یا مشکل ہو۔

[۲۸] ۞ منافقوں کی بزدلی کی انتہا:۔ بزدل اور ڈرپوک اتنے ہیں کہ اتحادی فوجیں کب کی واپس جا بھی چکی ہیں لیکن انہیں اب تک یقین نہیں آ رہا کہ دشمن جا چکا ہے اور ممکن ہے منافق یہ سمجھ رہے ہوں کہ مسلمانوں نے پروپیگنڈا کے طور پر ایسی خبر مشہور کر دی ہے۔ انہیں یہ بھی فکر لاحق ہے کہ موسم کی خرابی سے اگر دشمن چلا گیا ہے تو موسم درست ہونے پر پھر دوبارہ نہ چڑھائی کر دے۔ اندریں صورت وہ یہ سوچ رہے ہیں کہ کیا اچھا ہو تاکہ وہ مدینہ کے باشندے نہ ہوتے بلکہ کسی گاؤں کے رہنے والے ہوتے۔ جہاں دشمن کی چڑھائی کا خطرہ ہی نہ ہوتا تو انہیں ایسی پریشانیاں لاحق نہ ہوتیں۔ بس ادھر ادھر سے ہی مسلمانوں کے حالات پوچھ پاچھ لیتے یا ان تک ان کی کچھ خبریں پہنچ جاتیں۔ اور اگر انہیں حالات امید افزا نظر آتے اور مسلمانوں کی کامیابی یقینی دکھائی دینے لگتی تو وہ بھی اموال غنیمت میں حصہ بٹانے کی خاطر لڑائی میں آ شامل ہوتے۔

[۲۹] ۞ جنگ کے دوران آپ ﷺ کا کردار۔ آپ سب مسلمانوں کے لئے واجب الاتباع نمونہ ہیں:۔ جنگ کی سب سے زیادہ ذمہ داری سپہ سالار پر ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے سپہ سالار خود رسول اللہ ﷺ تھے۔ دشمن کی کثرت تعداد خوراک کی شدید قلت، حالات کی سنگینی اس نبی کے پائے ثبات پر ذرہ بھر بھی لغزش پیدا نہیں کر سکی۔ وہ ہر حال میں اللہ پر بھروسہ رکھنے اور اللہ کی طرف سے پر امید اور اس کی مدد کے منتظر ہیں۔ مگر ساتھ ساتھ پوری جانفشانی سے تمہارے دوش بدوش جنگ کے ایک

اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿۲۱﴾ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَ صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۫ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ

جو بھی اللہ اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہو[۳۰] اور اللہ کو بکثرت یاد کرتا ہو۔(۲۱) اور جب مومنوں نے ان لشکروں کو دیکھا تو کہنے لگے: "یہ تو وہی بات ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے سچ فرمایا تھا۔ اس واقعہ نے ان کے ایمان اور فرمانبرداری[۳۱] کو مزید بڑھا دیا۔(۲۲)

ایک کام تمہارے ساتھ مل کر کر رہے ہیں۔ مسلمانو! تمہارا کردار بھی ایسا ہی ہونا چاہئے اور رسول اللہ ﷺ کی ذات کو بطور نمونہ اپنے سامنے رکھنا چاہئے۔ ربطِ مضمون کے لحاظ سے تو اس جملہ کا یہی مطلب ہے مگر یہ حکم عام ہے صرف جنگ میں ہی نہیں بلکہ ہر حالت میں اور صرف جنگی احکام و تدابیر میں ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر پہلو میں رسول کی ذات کو بطور نمونہ اپنے پیش نظر رکھنا چاہئے۔ گویا اس ایک مختصر سے جملہ میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور اتباع دونوں کو تمام مسلمانوں پر لازم اور واجب قرار دیا گیا ہے۔

[۳۰] کس طرح کے لوگ آپ کی اتباع نہیں کرتے؟:۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتا دیا کہ رسول کی اتباع صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جن میں تین شرائط پائی جاتی ہوں ایک یہ کہ وہ اللہ پر صدق دل سے ایمان رکھتے ہوں دوسرے یوم آخرت پر ایمان بھی رکھتے ہوں اور اپنے اعمال کے اچھے بدلہ کی اللہ سے امید بھی رکھتے ہوں اور ہر وقت اللہ کو یاد رکھتے ہوں۔ بالفاظ دیگر جو لوگ رسول کی ذات کو اپنے لئے نمونہ نہیں بناتے یا اس کے کسی قول یا عمل سے انحراف کرتے ہیں یا اس کی اطاعت و اتباع کو لازم و واجب نہیں سمجھتے فی الحقیقت نہ ان کا اللہ پر ایمان ہے اور نہ یوم آخرت پر۔ یہ آیت رسول اللہ ﷺ کی غیر مشروط اطاعت اور اتباع کے وجوب پر صریح اور قوی دلیل ہے۔

[۳۱] آپ کا بنو غطفان کو اتحادیوں سے توڑنے کا خیال اور انصار کا جواب:۔ منافقوں کے کردار پر تبصرہ کرنے کے بعد اللہ نے مسلمانوں کا کردار بیان فرمایا۔ کہ جوں جوں ان پر مشکلات پڑتی ہیں اور حالات سنگین ہوتے جاتے ہیں توں توں ان کا حوصلہ بڑھتا جاتا ہے۔ ان کے اللہ پر توکل اور ان کے ایمان میں بھی مزید اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ انہیں خوب معلوم ہوتا ہے کہ ان مشکلات کا مقابلہ ہم نے ہی کرنا ہے۔ پھر جو کام ہماری بساط سے باہر ہو تو اس وقت ضرور اللہ کی مدد ہمارا ساتھ دے گی۔ پھر جب اللہ کی مدد فی الواقع ان کو پہنچ جاتی ہے تو ان کے ایمان میں اور بھی زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب بنو قریظہ بھی عہد شکنی کر کے اتحادی لشکروں سے مل گئے اور مسلمانوں کے لئے اندر بھی اور باہر بھی خطرہ پیدا ہو گیا تو اس وقت رسول اللہ ﷺ کے ذہن میں ایک تجویز آئی جو محض انصار کی دلجمعی کی خاطر تھی۔ وہ تجویز یہ تھی کہ بنو غطفان۔۔۔۔۔۔ جو ایک انتہائی لالچی اور حریص قبیلہ تھا اور ان کی سیاست کا سنہری اصول محض پیسہ کا حصول تھا ان کو مدینہ کی تہائی پیداوار کا لالچ دے کر انہیں اتحادیوں سے کاٹ دیا جائے اور وہ اپنا قبیلہ لے کر واپس چلے جائیں۔ چونکہ یہ قبیلہ سخت جنگجو تھا لہٰذا اس کی واپسی سے باقی سارے لشکر میں عام بددلی پھیل جانے کا امکان تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آپ ﷺ نے قبیلہ اوس کے سردار سعد رضی اللہ عنہ بن معاذ اور قبیلہ خزرج کے سردار سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو بلا کر ان سے مشورہ کیا۔ دونوں نے یک زبان ہو کر پوچھا: "یہ اللہ کا حکم ہے

اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ؁ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ؁ لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ

مومنوں میں سے کچھ ایسے لوگ ہیں کہ انہوں نے اللہ سے جو عہد [۳۲] کیا تھا اسے سچا کر دکھایا۔ ان میں سے کوئی تو اپنی ذمہ داری [۳۳] پوری کر چکا ہے اور کوئی موقع کا انتظار کر رہا ہے۔ اور انہوں نے اپنے عہد میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ (۲۳) (یہ سب کچھ اس لئے ہے) تاکہ اللہ تعالیٰ سچے لوگوں کو ان کے سچ کی جزا دے اور منافقوں کو اگر چاہے تو

یا آپ ہماری رائے لینا چاہتے ہیں؟ اگر اللہ کا حکم ہے تو سر آنکھوں پر اور اگر آپ ﷺ یہ کچھ ہماری خاطر کرنا چاہتے تو ہمیں یہ بات قطعاً منظور نہیں۔ واللہ ہم نے شرک کی حالت میں بھی ان لوگوں کو ایک دانہ تک نہ دیا۔ اب مسلمان ہو کر کیوں دیں گے۔ ان کے لئے ہمارے پاس صرف تلوار ہے" انصاری سرداروں کے اس جواب سے آپ خوش ہو گئے اور فرمایا: "یہ اللہ کا حکم نہیں یہ تو میں نے صرف تمہاری دلجمعی کی خاطر سوچا تھا" (الرحیق المختوم اردو ص ۴۸۷)

[۳۲] اس عہد سے مراد وہ عہد ہے جو لیلۃ العقبہ ثانیہ میں انصار کے بہتر (۷۲) افراد نے رسول اللہ ﷺ سے کیا تھا اور وہ عہد یہ تھا کہ ہم مرتے دم تک آپ کا ساتھ دیں گے۔

[۳۳] ۞ اللہ سے کئے ہوئے عہد کو نباہنے والے:۔ اس سلسلہ میں درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیے:

(۱) سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: "میں سمجھتا ہوں کہ یہ آیت (میرے چچا) انس بن نضر کے حق میں نازل ہوئی ہے" (بخاری۔ کتاب التفسیر)

(۲) سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: "میرا نام میرے چچا انس بن نضر کے نام پر رکھا گیا تھا۔ وہ جنگ بدر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حاضر نہ ہو سکے اور یہ بات ان پر بہت شاق گزری اور کہا کہ: "یہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حاضر رہنے کا پہلا موقع تھا جس سے میں غائب رہا۔ اللہ کی قسم! اب اگر آپ ﷺ کے ساتھ حاضر ہونے کا کوئی موقع آیا تو اللہ تعالیٰ خود دیکھ لے گا کہ میں کیا کچھ کرتا ہوں" راوی کہتا ہے کہ: پھر وہ ڈر گئے کہ ان الفاظ کے علاوہ کچھ اور لفظ کہنا مناسب تھا۔ پھر جب اگلے سال احد کے دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حاضر ہوئے تو انہیں (راہ میں) سعد بن معاذ ملے۔ انہوں نے پوچھا: "ابو عمرو! کہاں جاتے ہو؟" انس کہنے لگے: "واہ میں تو احد (پہاڑ) کے پار جنت کی خوشبو پا رہا ہوں۔ چنانچہ وہ (بڑی جرأت سے) لڑے۔ حتیٰ کہ شہید ہو گئے اور ان کے جسم پر ضربوں، نیزوں اور تیروں کے اسی (۸۰) سے زیادہ زخم پائے گئے۔ میری پھوپھی ربیع بنت نضر کہنے لگی: میں اپنے بھائی کی نعش کو صرف اس کے پوروں سے پہچان سکی اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ (ترمذی۔ ابواب التفسیر)

(۳) موسیٰ بن طلحہ کہتے ہیں کہ: جب میں معاویہ کے ہاں گیا تو انہوں نے کہا: میں تمہیں ایک خوشخبری نہ سناؤں؟ میں نے کہا: ضرور سناؤ۔ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ طلحہ ان لوگوں میں سے تھے جو اپنی ذمہ داریاں پوری کر چکے۔ (ترمذی۔ حوالہ ایضاً) یہ وہ بزرگ ہیں جو جنگ احد میں رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لئے اپنے ہاتھ پر تیر روکتے رہے حتیٰ کہ ایک ہاتھ شل ہو گیا تو دوسرا ہاتھ آگے کر دیا تھا۔ (بخاری۔ کتاب المناقب۔ باب ذکر طلحہ بن عبید اللہ)

إِن شَآءَ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿٢٤﴾ وَرَدَّ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوا۟ خَيْرًا ۚ وَكَفَى ٱللَّهُ ٱلْمُؤْمِنِينَ ٱلْقِتَالَ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ قَوِيًّا عَزِيزًا ﴿٢٥﴾ وَأَنزَلَ ٱلَّذِينَ ظَٰهَرُوهُم

عذاب دے یا پھر ان کی توبہ قبول کرے۔ اللہ تعالیٰ یقیناً معاف کر دینے والا اور رحم کرنے والا ہے (۲۴) اور کفار (کے لشکروں) کو اللہ تعالیٰ نے بے نیل و مرام اپنے دلوں کی جلن دلوں میں ہی لئے واپس لوٹا [۳۴] دیا اور لڑائی کے لئے مومنوں کی طرف سے اللہ ہی کافی ہو گیا وہ یقیناً بڑی قوت والا اور زبردست [۳۵] ہے۔ (۲۵) اور اہل کتاب [۳۶] میں

[۳۴] ❁ عبدودّ کی لاش کا عوضانہ:۔ یعنی اتحادیوں کا لشکر نہایت ذلت، ناکامی اور غصہ سے پیچ و تاب کھاتا ہوا بے نیل و مرام میدان چھوڑ کر واپسی پر مجبور ہو گیا اور مسلمانوں کے لئے اپنا بہت سامان چھوڑ گیا۔ اسی جنگ میں عمرو بن عبدودّ نے، جو ایک ہزار سواروں پر بھاری سمجھا جاتا تھا، مسلمانوں کو دعوتِ مبارزت دی اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ اس کے مقابلے میں اترے اور اس کا کام تمام کر دیا۔ مشرکوں نے درخواست کی کہ دس ہزار درہم کے عوض اس کی لاش انہیں دے دی جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: لاش تم مفت ہی لے جاؤ ہم مردوں کی قیمت نہیں کھایا کرتے۔

[۳۵] ❁ حیی بن اخطب نے بنو قریظہ کو کیسے بدعہدی پر آمادہ کیا؟ اللہ تعالیٰ نے عام لڑائی کی نوبت ہی نہ آنے دی اور ان کے محاصرہ کو اٹھانے کے لئے یخ بستہ ہوا اور فرشتے بھیج دیئے۔ یہود میں اور اتحادیوں میں پھوٹ ڈال دی۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن سخت بدحواس ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ بھلا اللہ کی زبردست قوت کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے؟

[۳۶] یہ یہود بنو قریظہ تھے جو مسلمانوں کے معاہد تھے۔ بنو قینقاع اور بنی نضیر کی جلاوطنی کے بعد مدینہ میں یہود کا یہی قبیلہ باقی رہ گیا تھا۔ کیونکہ یہ قبیلہ دوسروں کی نسبت قدرے شریف اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والا تھا۔ جب بنو نضیر کو خیبر کی طرف جلاوطن کر دیا گیا اور جنگِ احزاب کی تیاریاں شروع ہو گئیں تو بنو نضیر کا رئیس حیی بن اخطب رات کی تاریکیوں میں بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد کے پاس گیا۔ کعب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ حیی مجھے مسلمانوں سے عہد شکنی پر آمادہ کرنے کے لئے آیا ہے۔ لہٰذا اس نے دروازہ ہی نہ کھولا۔ حیی نے اس سے کچھ چکنی چپڑی باتیں کیں تو آخر اس نے دروازہ کھول دیا۔ حیی کہنے لگا: "کعب! میں تمہارے پاس زمانے کی عزت اور چڑھتا ہوا سمندر لے کر آیا ہوں۔ ان لوگوں نے مجھ سے عہد و پیمان کیا ہے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے ساتھیوں کا صفایا کئے بغیر یہاں سے نہ ٹلیں گے" اس کے جواب میں جو کچھ کعب نے کہا: وہ سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔ اس نے کہا: "حیی! واللہ تم میرے پاس زمانے کی ذلت اور برسا ہوا بادل لے کر آئے ہو جو صرف گرج چمک رہا ہے۔ تم پر افسوس۔ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں صدق و صفا کے سوا کچھ نہیں دیکھا" (ابن ہشام ۲: ۲۲۰، ۲۲۱) مگر حیی نے کعب کو سبز باغ دکھا دکھا کر بالآخر بدعہدی پر مجبور کر ہی لیا وہ کہنے لگا: اگر قریش محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتمہ کئے بغیر ہی واپس چلے گئے تو میں بھی تمہارے ساتھ قلعہ بند ہو جاؤں گا اور واپس نہیں جاؤں گا پھر جو انجام تمہارا ہو گا وہی میرا ہو گا۔ اس شرط پر کعب بھی اتحادیوں میں شامل ہو گیا۔

❁ مدینہ میں اندرونی خطرات:۔ اس صورتِ حال کی تحقیق کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے سرداروں (سعد بن عبادہ، سعد بن معاذ، عبداللہ بن رواحہ اور خوات بن جبیر رضی اللہ عنہم) کو تحقیق حال کے لئے بھیجا اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دی کہ

مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ مِنۡ صَيَاصِيۡهِمۡ وَقَذَفَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمُ الرُّعۡبَ فَرِيۡقًا تَقۡتُلُوۡنَ وَتَاۡسِرُوۡنَ

سے جنہوں نے کافروں کی مدد کی تھی انہیں اللہ تعالیٰ ان کے قلعوں[۳۷] سے اتار لایا اور ان کے دلوں میں رعب ڈال[۳۸] دیا کہ ان کے ایک گروہ کو تم قتل کر رہے تھے اور دوسرے کو قیدی[۳۹] بنا رہے تھے۔(۲۶)

اگر بنو قریظہ کی بدعہدی کی خبر درست ہو تو دوسروں کی موجودگی میں مجھے نہ بتائیں بلکہ صرف اشارہ سے کام چلالیں۔ جب انہوں نے واپس آکر رسول اللہ ﷺ کو اشارہ سے بتایا کہ یہ خبر درست ہے تو اس سے آپ کو سخت صدمہ ہوا۔ اس خبر کے اخفاء کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کی حوصلہ شکنی نہ ہو۔ مسلمان کم از کم مدینہ کی اندرونی حفاظت کی طرف سے مطمئن تھے مگر اس صورت حال سے مدینہ کے اندر بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب غزوہ خندق)

[۳۷] ❁ بنو قریظہ کا محاصرہ:۔ تقریباً ایک ماہ کے محاصرہ کے بعد جب اتحادی لشکر بھاگ نکلا تو اب بنو قریظہ کو ان کی عہد شکنی کی سزا دینے کا وقت بھی آن پہنچا۔ جنگ خندق سے فراغت کے بعد رسول اللہ ﷺ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں غسل فرما رہے تھے کہ جبرئیل آئے اور کہا کہ ''آپ نے ہتھیار اتار دیئے ہیں حالانکہ فرشتوں نے ابھی تک نہیں اتارے'' رسول اللہ ﷺ نے اسی وقت منادی کرادی کہ مجاہدین عصر کی نماز بنو قریظہ کے ہاں جا کر ادا کریں'' (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب مرجع النبی ﷺ من الاحزاب الی بنی قریظۃ ومحاصرتہ ایاھم)

چنانچہ چند گھنٹوں کے اندر اندر تین ہزار مسلح مجاہدین نے بنو قریظہ کے ہاں پہنچ کر ان کا محاصرہ کر لیا۔ بنو قریظہ قلعہ بند ہو گئے (حیی بن اخطب بھی حسب وعدہ ان کے ساتھ قلعہ بند ہوا تھا) ان کے سردار کعب بن اسد نے قوم کے سامنے تین تجاویز رکھیں:

❁ یہود کی سپر اندازی:۔ ۱۔ اسلام قبول کر لو۔ اس صورت میں تمہارا مال و جان سب کچھ محفوظ رہے گا اور تم پر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ یہ وہی نبی برحق ہے جس کی بشارت تم اپنی کتاب میں پاتے ہو۔

۲۔ اپنے بیوی بچوں کو خود اپنے ہاتھوں سے قتل کر دو۔ پھر خود مردانہ وار لڑائی لڑو۔ پھر مر جاؤ یا فتح پاؤ۔

۳۔ یا پھر مکر و فریب کی راہ اختیار کرو۔ مسلمانوں پر ہفتہ کے دن حملہ کر دو۔ کیونکہ انہیں اطمینان ہو گا کہ آج لڑائی نہیں ہو گی۔ مگر بنو قریظہ نے اپنے سردار کی ایک تجویز بھی نہ مانی تو وہ جھنجھلا کر کہنے لگا: تم میں سے کسی نے آج تک ایک رات بھی ہوشمندی کے ساتھ نہیں گزاری۔ (الرحیق المختوم۔ اردو ص ۴۹۴) اب ان کے سامنے بس ایک ہی راستہ باقی رہ گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے آگے ہتھیار ڈال دیں۔

[۳۸] ❁ یہود کا سیدنا سعد بن معاذ کو حکم تسلیم کرنا:۔ بدعہدی اور عہد شکنی قوم کو انتہا درجہ کا بزدل بنا دیتی ہے۔ ان کے پاس وافر مقدار میں راشن موجود تھا اور انہوں نے مسلمانوں کے استیصال کے لئے ڈیڑھ ہزار تلواریں، دو ہزار نیزے تین سو زرہیں اور پانچ سو ڈھالیں بھی تیار کر رکھی تھیں۔ مگر وقت پر کوئی چیز بھی ان کے کام نہ آئی۔ انہوں نے صرف ۲۵ دن کے محاصرہ کے بعد اس شرط پر ہتھیار ڈال دیئے کہ ان کے حق میں جو بھی فیصلہ ان کے حلیف سیدنا سعد بن معاذ کریں گے وہ انہیں منظور ہو گا۔ ان کے پاس قلعہ میں جس قدر راشن موجود تھا اگر وہ چاہتے تو سال بھر قلعہ بند رہ کر آسانی سے گزر بسر کر سکتے تھے مگر ان کے مجرم ضمیر نے انہیں جلد ہی بے چین کر دیا اور اللہ نے ان کے دلوں میں مسلمانوں کی دھاک بٹھا دی۔

[۳۹] ❁ بنو قریظہ کا انجام:۔ سیدنا سعد بن معاذ کو جنگِ احزاب میں ایک کاری زخم لگا تھا جیسا کہ درج ذیل حدیث سے ظاہر ہے:

فَرِيقًا ﴿٢٦﴾ وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيرًا ﴿٢٧﴾ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ
أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ﴿٢٨﴾ وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ

ع ۳ / ۱۹

اور تمہیں ان کی اراضی، ان کے گھروں اور ان کے اموال کا وارث بنا دیا اور اس زمین کا بھی جہاں تم نے قدم تک نہ رکھا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری پوری قدرت رکھتا ہے۔(۲۷)

اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دیجئے کہ (اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زیبائش ہی چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے [۴۰] سے رخصت کر دوں (۲۸) اور اگر تم اللہ، اس کا رسول اور آخرت کا گھر چاہتی ہو تو

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جنگ خندق میں سعد بن معاذ کر ہفت اندام کی رگ میں تیر لگ گیا تو آپ ﷺ نے مسجد میں ہی ان کے لئے خیمہ لگا دیا۔ تاکہ قریب سے عیادت کر سکیں۔ مسجد میں بنو غفار کا خیمہ بھی تھا۔ جب (سیدنا معاذ کا) خون بہہ بہہ کر ان کے خیمہ کی طرف آنے لگا تو وہ ڈر گئے، کہنے لگے: اے خیمہ والو! یہ کیا ہے جو تمہاری طرف سے بہہ کر ہمارے پاس آرہا ہے۔ دیکھا تو سعد کے زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ آخر اسی زخم سے وہ چل بسے۔ (بخاری۔ کتاب الصلوٰۃ۔ باب الخیمة فی المسجد للمرضیٰ وغیرهم)

لہٰذا وہ غزوہ بنو قریظہ میں شامل نہ ہو سکے۔ فیصلہ کے لئے انہیں گدھے پر سوار کر کے موقعہ پر لایا گیا تو آپ نے اپنے عہد شکن حلیف کی کوئی رو رعایت نہیں کی۔ اور یہ فیصلہ دیا کہ: (۱) سب مردوں کو قتل کر دیا جائے (۲) عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے، (۳) ان کے اموال مجاہدین میں تقسیم کر دیئے جائیں" رسول اللہ ﷺ نے یہ فیصلہ سن کر فرمایا: "تم نے وہی فیصلہ کیا جو سات آسمانوں کے اوپر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے" (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب مرجع النبی ﷺ من الاحزاب الیٰ بنی قریظة ومحاصرته ایاهم)

چنانچہ اس فیصلہ کے مطابق چھ سو سے کچھ زائد مردان جنگی کو قتل کر دیا گیا اور ان مقتولین میں حیی بن اخطب بھی تھا۔ جس نے بنو قریظہ کو عہد شکنی پر مجبور کر کے ان پر یہ مصیبت ڈھائی تھی۔ یہ مقتولین صرف اس بنا پر قتل نہیں کئے گئے کہ وہ جنگی قیدی تھے بلکہ ان کے جرائم اور بھی تھے مثلاً:

(۱) تجدید معاہدہ کے باوجود انہوں نے نہایت نازک موقعہ پر عہد شکنی کر کے مسلمانوں کو اندرونی خطرات سے دوچار کر دیا تھا۔

(۲) انہوں نے مردانہ وار سامنے آنے کی بجائے عورتوں اور بچوں کے قلعوں پر حملہ کی کوشش کی تھی۔

(۳) جنگ احزاب کے بعد بھی حیی بن اخطب کو ساتھ ملا کر مدینہ میں اشتعال انگیزی شروع کر دی تھی اور بجائے اس کے کہ اپنی عہد شکنی پر پشیمان ہوتے" انہوں نے مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔

[۴۰] بیویوں کا آپ سے خرچ کا مطالبہ:۔ یہاں سے ایک بالکل نیا موضوع شروع ہوتا ہے۔ اموال غنیمت سے جب مسلمانوں میں کچھ آسودگی آگئی۔ تو ازواج مطہرات نے بھی آپ ﷺ سے کچھ زائد اخراجات کا مطالبہ کر دیا۔ حالات کے

مطابق ان کا یہ مطالبہ کچھ ایسا ناجائز بھی نہ تھا۔ کیونکہ دوسرے سب مسلمان آسودہ ہو رہے تھے۔ مگر آپ کی فقر پسند طبیعت پر بیویوں کا یہ مطالبہ سخت شاق گزرا۔ اور آپ ﷺ نے اسی کبیدگی طبع کی بنا پر ایک ماہ کے لئے اپنی بیویوں سے کنارہ کش رہنے کا ارادہ کر لیا جیسا کہ درج ذیل احادیث سے معلوم ہوتا ہے:

۱۔ سیدنا جابر کہتے ہیں کہ: سیدنا عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں آئے اور اجازت چاہی، آپ ﷺ نے انہیں اندر آنے کی اجازت دے دی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ آپ ﷺ کے پاس آپ کی بیویاں غمگین اور خاموش بیٹھی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ میرے گرد بیٹھی خرچ کا مطالبہ کر رہی ہیں جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو" پھر آپ ﷺ نے ان سے ایک مہینہ کے لئے علیحدگی اختیار کر لی۔ (بخاری۔ کتاب النکاح باب موعظة الرجل ابنته)

واقعہ ایلاء کی تفصیل:۔ ۲۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں اور میرا ایک انصاری پڑوسی بنی امیہ بن زید کے گاؤں میں جو مدینہ کے بالائی دیہات میں سے ایک گاؤں ہے، رہا کرتے۔ اور باری باری آپ ﷺ کے پاس آیا کرتے۔ ایک دن وہ آتا اور ایک دن میں۔ جب میں آتا تو اس دن کی ساری خبر وحی جو آپ پر نازل ہوتی اسے بتاتا اور جس دن وہ آتا تو وہ بھی ایسا ہی کرتا ایک دن میرا انصاری ساتھی اپنی باری کے دن آیا تو واپس آکر زور سے میرا دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا: "عمر رضی اللہ عنہ ہیں؟" میں گھبرا کر باہر آیا تو کہنے لگا: "آج ایک بڑا حادثہ ہو گیا، (آپ ﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی) میں حفصہ کے پاس گیا تو وہ رو رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔" (بخاری۔ کتاب العلم۔ باب التناوب فی العلم)

۳۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: "مجھے میرے ایک انصاری ہمسایہ نے ایک دن خبر دی کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ میں حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس گیا تو وہ رو رہی تھی۔ میں نے اسے پوچھا: "کیا رسول اللہ ﷺ نے تمہیں طلاق دے دی؟" وہ کہنے لگیں: "میں نہیں جانتی اور وہ اس جھروکے میں الگ ہو بیٹھے ہیں" میں وہاں سے (مسجد میں) چلا گیا اور اسود (دربان) سے کہا کہ عمر رضی اللہ عنہ کے لئے اندر آنے کی اجازت حاصل کرو" لڑکا اندر گیا پھر باہر آکر کہنے لگا: "میں نے آپ کا ذکر کیا تھا مگر آپ ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا" میں پھر مسجد کی طرف چلا گیا۔ لوگ وہاں منبر کے ارد گرد بیٹھے رو رہے تھے۔ میں ان کے پاس بیٹھ گیا، مگر مجھ پر پھر وہی فکر غالب آئی۔ میں لڑکے کے پاس آیا اور کہا: "عمر رضی اللہ عنہ کے لئے اجازت حاصل کرو" لڑکا اندر گیا۔ پھر اس نے باہر آکر مجھے کہا: "میں نے آپ کا ذکر کیا تھا۔ مگر آپ ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا" میں پھر مسجد میں آیا اور بیٹھ گیا۔ پھر مجھ پر وہی فکر غالب ہوئی۔ میں لڑکے کے پاس آیا اور کہا: "عمر کے لئے اجازت مانگ" لڑکا اندر گیا، پھر باہر آکر کہنے لگا: "میں نے آپ کا ذکر کیا کوئی جواب نہیں دیا" جب میں وہاں سے لوٹ آیا تو اس وقت لڑکے نے مجھے پکار اکہ آجاؤ۔ تمہارے لئے اجازت مل گئی میں اندر گیا تو اس وقت آپ ﷺ ایک بوریے پر تکیہ لگائے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کے پہلوؤں میں بوریے کے نشان پڑ گئے ہیں۔ میں نے پوچھا: "یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "نہیں" میں نے اللہ اکبر پکارا۔ پھر کہا: یا رسول اللہ ﷺ! آپ دیکھئے۔ ہم قریشی لوگ اپنی عورتوں کو دبا کر رکھتے تھے پھر جب ہم مدینہ آئے تو ایسے لوگ دیکھے جنہیں ان کی بیویاں دبا کر رکھتی ہیں۔ ہماری عورتیں بھی ان کی عادات سیکھنے لگیں۔ میں ایک دن اپنی بیوی پر ناراض ہوا تو وہ مجھے جواب دینے لگی جو مجھے برا لگا تو وہ کہنے لگی: برا کیوں مناتے ہو۔ اللہ کی قسم! آپ ﷺ کی بیویاں آپ ﷺ کو جواب دیتی ہیں۔ اور کئی تو رات تک خفا رہتی ہیں۔ میں نے

فَإِنَّ اللّٰهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿٢٩﴾ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّأْتِ مِنْكُنَّ

اللہ تعالیٰ نے تم میں سے نیکو کاروں[۴۱] کے لئے بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے(۲۹) اے نبی کی بیویو! تم سے جو

حفصہ سے پوچھا: "کیا تو بھی آپ ﷺ کو جواب دیتی ہے؟" وہ کہنے لگیں "ہاں! اور ہم میں سے کوئی تورات بھر آپ ﷺ سے خفا رہتی ہے" میں نے کہا: "تم میں سے جس نے یہ کام کیا وہ نامراد ہوئی اور نقصان اٹھایا۔ کیا تم اس بات سے ڈرتی نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی ناراضگی کی وجہ سے اللہ بھی ان سے ناراض ہو جائے گا اور وہ تباہ ہو جائے گی" اس بات پر نبی اکرم ﷺ مسکرائے۔ پھر اپنی بیٹی حفصہ سے کہا "حفصہ! تم رسول اللہ ﷺ کو کبھی جواب نہ دینا اور نہ ہی ان سے کچھ مطالبہ کرو۔ بلکہ جو تم چاہو مجھ سے مانگ لیا کرو اور کسی دھوکہ میں نہ رہنا کیونکہ تمہاری ساتھی عائشہ تم سے خوبصورت اور رسول اللہ ﷺ کی چہیتی ہے" اس بات پر رسول اللہ ﷺ دوبارہ مسکرائے۔ پھر میں نے آپ ﷺ سے کہا: "یا رسول اللہ ﷺ! میں آپ کا جی بہلاؤں؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "ٹھیک ہے، میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو مجھے اس گھر میں کچھ نظر نہ آیا۔ بجز تین چمڑوں کے، میں نے کہا: "یا رسول اللہ ﷺ! اللہ سے دعا کیجئے کہ وہ آپ کی امت کو کشادگی بخشے۔ اللہ نے روم اور فارس کو کشادگی دی ہے۔ حالانکہ وہ اس کی عبادت بھی نہیں کرتے۔ یہ سن کر آپ ﷺ اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا: خطاب کے بیٹے! کیا تم ابھی تک شک میں پڑے ہو۔ ان لوگوں کو تو ان کی نیکیوں کا بدلہ دنیا میں ہی مل گیا ہے" سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ ایک مہینہ بھر اپنی بیویوں کے پاس نہ گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر عتاب اور قسم کے کفارہ کا حکم دیا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب انتیس دن گزر گئے تو آپ ﷺ ہمارے پاس آئے۔" (ترمذی۔ باب التفسیر۔ سورہ تحریم)

[۴۱] ❁ آیت تخییر:۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مکمل اختیار دیا تھا کہ آپ چاہیں تو ایسی اجتماعی طور پر خرچ کے اضافہ کا مطالبہ کرنے اور اس طرح دباؤ ڈالنے والی بیویوں کو طلاق دے کر فارغ کر دیں اور چاہیں تو اپنے پاس رکھیں۔ بشرطیکہ آئندہ وہ آپ ﷺ کو اس سلسلہ میں پریشان نہ کریں۔ آپ ﷺ نے ایک ماہ کے ایلاء (بیویوں سے الگ رہنے) کا فیصلہ کیا تھا۔ انتیس دن گزرنے کے بعد آپ ﷺ مسجد کے بالا خانہ سے واپس اپنے گھر تشریف لائے سب سے پہلے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کے گھر آئے۔ پھر جس طرح آپ ﷺ نے اس اختیار کو استعمال کیا وہ درج ذیل احادیث سے واضح ہے:

❁ بیویوں کا جواب:۔ ا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: جب آپ ﷺ کو حکم ہوا کہ وہ اپنی بیویوں کو اختیار دیجئے (خواہ وہ آپ کے ساتھ رہنا چاہیں یا طلاق لے لیں) تو آپ ﷺ نے سب سے پہلے مجھ سے پوچھا اور فرمایا: عائشہ! میں تمہیں ایک بات کہتا ہوں مگر تم اس میں جلدی نہ کرنا بلکہ اپنے والدین سے مشورہ کر کے جواب دینا۔ اور آپ ﷺ یہ بات خوب جانتے تھے کہ میرے والدین آپ ﷺ سے جدا ہونے کا کبھی مشورہ نہ دیں گے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ...... عَظِيمًا﴾ (تک آپ ﷺ نے پڑھا) میں نے کہا: "میں اس معاملہ میں اپنے والدین سے کیا مشورہ کروں گی میں تو خود (بہر حال) اللہ، اس کے رسول اور آخرت کی بھلائی چاہتی ہوں" پھر آپ ﷺ نے یہی بات دوسری بیویوں سے پوچھی تو سب نے وہی جواب دیا جو میں نے دیا تھا۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

سیدہ عائشہ فرماتی ہیں کہ: میں نے آپ ﷺ سے کہا کہ آپ ﷺ نے تو ایک ماہ کا کہا تھا اور آج انتیس دن ہوئے ہیں۔

بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۗ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿٣٠﴾

وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَ

اَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ﴿٣١﴾ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ

کوئی کھلی بے حیائی کا ارتکاب [۴۲] کرے تو اسے دگنا عذاب دیا جائے گا۔ اور یہ بات اللہ کے لئے [۴۳] بہت آسان ہے۔(۳۰)

اور جو تم میں سے اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبردار بن جائے اور نیک عمل کرے تو ہم اسے اجر بھی دگنا دیں گے اور اس کے لئے ہم نے عزت کی روزی [۴۴] تیار کر رکھی ہے(۳۱) اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح [۴۵] نہیں ہو۔ اگر تم اللہ سے ڈرتی ہو تو (کسی نامحرم سے)

آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کے اشارے سے بتایا کہ مہینہ تیس دن کا بھی ہوتا ہے اور انتیس دن کا بھی۔ (گویا وہ مہینہ انتیس دن کا تھا)(بخاری۔ کتاب الصوم۔ باب قول النبی ﷺ اذا رأیتم الھلال فصوموا، مسلم کتاب الصیام۔ باب وجوب صوم رمضان لرؤیۃ الھلال ......)

[۴۲] ❁ نبی کی بیویوں کا مقام:۔ نبی کی بیویوں کا مقام عام عورتوں سے بہت بلند ہے کیونکہ وہ امہات المومنین ہیں۔ جس طرح نبی کی ذات مومنوں کے لئے نمونہ ہے۔ اسی طرح نبی کا گھر اور اس کی بیویاں بھی سب کے لئے نمونہ ہیں۔ اگر نبی کی بیوی کوئی غلطی کرے گی تو اس کو اپنی ہی غلطی کی سزا نہیں ملے گی بلکہ اس کی اقتداء میں جو لوگ بھی وہ غلطی کریں گے ان سب کی سزا سے حصہ رسدی اسے بھی ملے گا۔ لہٰذا اس کی سزا عام لوگوں کی سزا سے دوگنی بلکہ بہت زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔

اس آیت میں ﴿فَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ﴾ سے مراد زنا ہے اور یہ بفرض تسلیم ہے جس طرح اللہ نے اپنے پیارے نبی کو فرمایا کہ اگر تم بھی شرک کرو تو تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے تو جس طرح آپ ﷺ سے شرک کا صدور ممکن نہیں اسی طرح نبی کی بیویوں سے زنا کا ارتکاب ممکن نہیں۔ اور یہ انداز خطاب تاکید مزید کے طور پر اختیار کیا گیا ہے۔

[۴۳] یعنی اللہ تعالیٰ یہ نہیں دیکھے گا کہ اگر تم کوئی برا کام کرو تو تمہیں نبی کی بیویاں سمجھ کر چھوڑ دیا جائے بلکہ عدل و انصاف کا تقاضا یہ ہوگا کہ تمہیں دوسروں سے دگنی سزا دی جائے اور اللہ اس پر پوری قدرت رکھتا ہے۔

[۴۴] اسی طرح اگر تم میں سے کوئی اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبردار بن جائے تو اسے اجر بھی دگنا ملے گا۔ یہاں تک تو ایک اصولی معاملہ تھا کہ بُروں کے گناہوں کا بدلہ بھی دگنا اور اچھے اعمال کا ثواب بھی دگنا ہو۔ اور رزق کریم میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ ازواج النبی کا اصل مطالبہ خرچ میں اضافہ کا تھا کہ انہیں بھی اب کھانے اور پہننے کو پہلے سے بہتر ملنا چاہئے تو اس کے جواب میں فرمایا کہ آج دنیا میں اگر تم اس معاملہ میں نبی کو پریشان نہ کرو گی اور جو مل گیا اس پر قانع اور صابر و شاکر رہو گی تو اس کے عوض ہم نے تمہارے لئے بہت شاندار رزق تیار کر رکھا ہے۔

[۴۵] ❁ معاشرہ سے فحاشی کے خاتمہ کے لئے احکام:۔ سابقہ دو آیات سے دراصل معاشرہ سے فواحش کی تطہیر کا پروگرام

بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ﴿۳۲﴾ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ

دبی زبان[۴۶] سے بات نہ کرو، ورنہ جس شخص کے دل میں روگ ہے وہ کوئی غلط توقع لگا بیٹھے گا لہٰذا صاف سیدھی بات کرو (۳۲) اور اپنے گھروں میں قرار[۴۷] پکڑے رہو، پہلے

دیا جارہا ہے۔ اس کے آغاز میں دو باتوں کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ایک تو اس کا آغاز نبی کے گھرانہ سے کیا گیا۔ دوسرے سب سے پہلے فاحشہ مبینہ (یعنی زنا) کا ذکر کر دیا گیا۔ اس کے بعد اب زنا کے سدباب کے احکام کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے اور اس میں پہلے یہ خاص طور پر وضاحت کر دی گئی کہ تمہارا معاملہ عام عورتوں کا سا نہیں ہے۔ بلکہ تمہارے کردار کے نتائج بڑے دور رس ہیں۔ لہٰذا تمہیں پوری طرح ان احکام پر عمل کرنا ہوگا۔ تمہارے ہر عمل کو لوگ حجت سمجھیں گے اور بطور حجت ہی پیش کریں گے۔

[۴۶] ۞ آواز پر پابندی:۔ جنگ احزاب سے پہلے تک عرب معاشرہ کا یہ حال تھا کہ مسلمان عورتیں بھی اپنی پوری زینت اور میک اپ کے ساتھ بے حجاب پھرتی تھیں۔ مسلم گھرانوں میں بھی غیر مردوں کے داخلہ پر کوئی پابندی نہ تھی۔ ازواج مطہرات بھی اسی طرح گھروں سے باہر جایا آیا کرتی تھیں۔ جیسے دوسری عورتیں، اس بے حجابانہ معاشرہ کی اصلاح کے لئے سب سے پہلے غیر مرد اور غیر عورت کی باہمی گفتگو اور آواز پر پابندی لگائی گئی اور اس حکم میں مخاطب نبی کی بیویوں کو بالخصوص اس لئے کیا گیا کہ ان سے بھی لوگوں کو مسئلے مسائل پوچھنے کی ضرورت پیش آتی رہتی تھی۔ چنانچہ انہیں حکم دیا گیا کہ ان کی آواز شیریں اور لوچدار ہونے کی بجائے روکھی اور معقول حد تک بلند ہونا چاہئے۔ دبی زبان میں ہر گز بات نہ کی جائے۔ جو نرم گوشہ لئے ہوئے ہو۔ لوچدار اور شیریں آواز بذات خود دل کا ایک مرض ہے۔ پھر اگر مخاطب کے دل میں پہلے سے ہی اس قسم کا روگ موجود ہو تو وہ صرف اسی لذیذ گفتگو سے کئی غلط قسم کے خیالات اور تصورات دل میں جمانا شروع کر دے گا اگرچہ ربط مضمون کے لحاظ سے اس کا مطلب وہی ہے جو اوپر بیان ہوا۔ تاہم یہ حکم عام ہے۔ اور عورت کی آواز پر اصل پابندی یہ ہے کہ غیر مرد اس کی آواز نہ سننے پائیں۔ نیز اس کی آواز میں نرمی، لوچ، بانکپن اور شیرینی نہ ہونی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت اذان نہیں کہہ سکتی یا نماز باجماعت میں اگر امام غلطی کر جائے تو وہ نہ سبحان اللہ کہہ سکتی ہے اور نہ لقمہ دے سکتی ہے۔ بلکہ اس کے لئے تصفیق کا حکم ہے یعنی اپنے ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ مار کر آواز پیدا کرنے سے متنبہ کرے۔

[۴۷] ۞ بن سنور کر آزادانہ پھرنا:۔ قرن کو اگر مادہ ق ر ر سے مشتق قرار دیا جائے تو اس کا معنی وہی ہے جو ترجمہ سے ظاہر ہے اور اگر اس کا مادہ و ق ر سمجھا جائے تو اس کا مطلب ہو کہ گھروں میں وقار کے ساتھ رہا کرو۔ مطلب دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے یعنی عورت کا دائرہ عمل اس کا گھر ہے۔ گویا اس آیت کی رو سے گھروں سے باہر آزادانہ آنے جانے پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ سیدنا عمرؓ کو عورتوں کا اور بالخصوص ازواج النبی کا گھر سے باہر بے حجاب پھرنا سخت شاق گزرتا تھا۔ چنانچہ آپؓ رسول اللہ ﷺ سے کہا کرتے تھے کہ آپ ﷺ اپنی بیویوں کو پردہ میں رکھئے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے سیدنا عمرؓ کی بات پر کچھ توجہ نہ دی۔ آپ ﷺ کی بیویاں اکثر رات کو باہر نکلا کرتیں اور (رفع حاجت کے لئے) مناصع کی طرف جاتیں۔ ایک رات سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا بنت زمعہ جو قد کی لمبی تھیں نکلیں تو سیدنا عمرؓ لوگوں میں بیٹھے بیٹھے ہی کہنے لگے: سودہ! ہم نے تجھے پہچان لیا" سیدنا عمرؓ نے اس توقع پر یہ بات کی کہ کسی طرح

جلد پردہ کا حکم نازل ہو۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ پھر اللہ تعالیٰ نے آیہ حجاب نازل فرمائی۔

آیہ حجاب کا نزول اور ضرورت سے نکلنے کی اجازت:۔ سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا نے جب یہ بات سیدنا عمرؓ کے منہ سے سنی تو گھر آ کر رسول اللہ ﷺ سے کہا: میں ضرورت سے باہر نکلی تھی، لیکن عمرؓ نے ایسی ایسی گفتگو کی۔ اس وقت آپ میرے گھر میں تھے اور بیٹھے رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ ایک ہڈی آپ ﷺ کے ہاتھ میں تھی، اسی حالت میں آپ ﷺ پر وحی آنا شروع ہوئی۔ پھر وحی کی حالت موقوف ہو گئی اور ہڈی اسی طرح آپ کے ہاتھ میں تھی جسے آپ نے ہاتھ سے رکھا نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم عورتوں کو ضرورت سے باہر نکلنے کی اجازت دی گئی“ (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ باب قوله تعالیٰ لاتدخلوا بیوت النبی)

عورتوں کی حقیقی ضروریات:۔ گویا سیدنا عمرؓ یہ چاہتے تھے کہ عورتوں کے باہر نکلنے پر مکمل پابندی لگ جائے۔ وحی الٰہی نے عورتوں کے گھر سے باہر نکلنے پر پابندی تو لگا دی جیسا کہ سیدنا عمرؓ چاہتے تھے مگر مکمل پابندی نہیں لگائی بلکہ ضرورت کے تحت عورتوں کو گھر سے باہر جانے کی اجازت مل گئی۔

اب سوال یہ ہے کہ عورتوں کی وہ ضروریات کیا ہو سکتی ہیں جن کی بنا پر وہ گھر سے نکل سکتی ہیں؟ وہ یہ ہیں: فریضہ حج کی ادائیگی، نماز کے لئے مسجد یا عید گاہ میں جانا، اپنے اقارب سے ملاقات اور ان کی تقاریب مثلاً نکاح اور شادی میں شمولیت یا مثلاً عیادت مریض اور تعزیت موتی کے لئے جانا۔ ان میں کچھ حاجات تو سفر کی نوعیت رکھتی ہیں اور بعض پر سفر کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اب ان کے متعلق ارشادات نبوی ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ سیدنا ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ: ایک آدمی کھڑا ہوا اور کہنے لگا: ”یارسول اللہ ﷺ! میری بیوی حج کے لئے نکلی ہے اور میرا نام فلاں غزوہ میں لکھا گیا ہے“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”لوٹ جا اور اپنی بیوی کے ساتھ حج کر“ (بخاری۔ کتاب النکاح۔ باب لایخلون رجل۔۔۔۔۔)

عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے:۔ گویا آپ ﷺ نے جہاد جیسے اہم دینی فریضہ سے اس آدمی کو رخصت دے دی۔ مگر یہ گوارا نہیں فرمایا کہ اس کی عورت اکیلی حج پر چلی جائے۔

۲۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: کوئی عورت ایک دن رات کی مسافت کا سفر نہ کرے الا یہ کہ اس کے ساتھ کوئی محرم ہو۔ (ترمذی۔ ابواب الرضاع۔ باب کراهية ان تسافر المرأة وحدها۔)

اس حدیث سے سفر کی تعریف بھی معلوم ہو گئی کہ سفر کا اطلاق اتنی مسافت پر ہوتا ہے جہاں سے کوئی شخص پیدل رات تک گھر واپس نہ پہنچ سکے۔ اس سے زیادہ مسافت ہو تو عورت محرم کے بغیر سفر نہیں کر سکتی۔

۳۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: جب عورت اکیلی گھر سے نکلتی ہے تو شیطان اس کو تاکتا ہے (یعنی اپنا آلہ کار بناتا ہے) (ترمذی۔ ابواب الرضاع۔ باب کراهية دخول على المغيبات)

۴۔ عورتوں کو نماز کے لئے مسجد میں جانے کا حکم نہیں بلکہ صرف اجازت ہے اور اجازت بھی عدم ممانعت کی صورت میں ہے۔ یعنی عورت اپنے خاوند کی اجازت سے ہی مسجد میں جا سکتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ: ”اگر تمہاری بیویاں تم سے مسجد جانے کی اجازت طلب کریں تو انہیں مت روکو“ (مسلم۔ کتاب الصلوٰۃ۔ باب خروج النساء الى المساجد اذ لم

يترتب عليه فتنة)

❁ مسجد میں جانے کی مشروط اجازت:۔ امام مسلم نے باب کے عنوان میں یہ وضاحت بھی کر دی کہ یہ اجازت بھی اس صورت میں ہوگی جب کسی فتنہ کا خدشہ نہ ہو۔

۵۔ چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے (اپنی زندگی کے آخری ایام میں) فرمایا: اگر رسول اللہ ﷺ موجودہ صورت حال دیکھتے تو عورتوں کو مساجد میں جانے سے روک دیتے جیسا کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو روک دیا گیا تھا۔ (بخاری۔ کتاب الاذان۔ باب خروج النساء الى المساجد بالليل)

❁ عورت کی بہترین جائے نماز گھر کی اندرونی جگہ ہے:۔ غور فرمائیے مسجد نبوی میں ایک نماز باجماعت کا ثواب ہزار نماز کے ثواب کے برابر ہے اور امام خود رسول اللہ ﷺ ہیں جو امام الانبیاء ہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ام حمید ساعدیہ نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میری پسند خاطر یہ ہے کہ میں آپ کے ساتھ نماز ادا کروں تو آپ ﷺ نے فرمایا: "تیرے گھر کی کوٹھری میں نماز تیرے گھر کے دالان سے افضل ہے اور دالان میں نماز صحن کی نماز سے افضل ہے۔ اور صحن کی نماز محلہ کی مسجد کی نماز سے افضل ہے اور محلہ کی مسجد میں نماز جامع مسجد کی نماز سے افضل ہے" اور سیدہ ام سلمہ کی روایت میں رسول اللہ ﷺ کے الفاظ یہ ہیں: "عورتوں کے لئے بہترین مساجد ان کے گھروں کے اندرونی حصے ہیں" (احمد۔ طبرانی)

❁ عورتوں کے مسجد میں جانے پر پابندیاں:۔ پھر اس طرح مسجد میں جانے پر بھی سنت نبوی نے کئی طرح کی پابندیاں لگائی ہیں مثلاً:

(۱) وہ صرف اندھیرے کی نمازوں (عشاء اور فجر) میں شامل ہو سکتی ہیں ماسوائے جمعہ اور عیدین کے (بخاری۔ کتاب الاذان۔ باب خروج النساء الى المساجد بالليل و الغلس)

(۲) جس رات عورت مسجد میں جانا چاہے خوشبو نہیں لگا سکتی۔ (بخاری۔ حوالہ ایضاً)

(۳) مردوں کے لئے بہتر صف پہلی ہے اور بری سب سے آخری صف ہے اور عورتوں کے لئے پہلی صف سب سے بری ہے اور آخری سب سے بہتر (مسلم۔ کتاب الصلوٰۃ۔ باب امر النساء المصليات وراء الرجال ......)

(۴) اسے چاہئے کہ رکوع و سجود سے سر مردوں کے بعد اٹھائے۔ (مسلم۔ حوالہ ایضاً)

(۵) نماز باجماعت سے فراغت کے بعد فوراً مردوں سے پہلے مسجد سے نکل جائے۔ (مسلم و بخاری۔ حوالہ ایضاً)

(۶) اگر واپسی پر ہجوم ہو اور مرد اور عورتوں کے مخلوط ہونے کا خطرہ ہو تو عورتیں راستہ کے کناروں پر چلیں۔ (ابوداؤد۔ کتاب الادب)

(۷) عیدین کی نمازیں چونکہ کھلے میدان میں پڑھی جاتی ہیں لہٰذا وہاں عورتیں بالکل الگ مقام پر جمع ہوتی تھیں۔ (مسلم۔ کتاب الصلوٰۃ، باب صلوٰۃ العيدين)

❁ آزادانہ اختلاط کی ممانعت:۔ اب دیکھئے مندرجہ بالا احادیث کی صراحت کے بعد مسلمان عورتوں کے لئے ان باتوں کی کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ وہ کونسلوں اور پارلیمنٹوں کی ممبر بنیں۔ بیرونِ خانہ کی سوشل سرگرمیوں میں دوڑتی پھریں۔ سرکاری دفتروں میں مردوں کے ساتھ مل کر کام کریں۔ کالجوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم ہو۔ ہسپتالوں میں

تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ وَأَقِمْنَ الصَّلَوٰةَ وَآتِينَ الزَّكَوٰةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ﴿٣٣﴾ وَاذْكُرْنَ مَا

دورِ جاہلیت[۴۸] کی طرح اپنی زیب و زینت کی نمائش[۴۹] نہ کرتی پھرو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو' اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔

اے اہلِ بیت[۵۰] (نبی) اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی[۵۱] کو دور کر کے اچھی طرح پاک صاف بنا دے (۳۳)

نرسنگ کی خدمات انجام دیں اور ہوائی جہازوں اور ریل کاروں میں مسافر نوازی کے لئے استعمال کی جائیں۔ یا گاہکوں میں کشش پیدا کرنے کی خاطر انہیں سیلزمین کے طور پر استعمال کیا جائے؟

[۴۸] جاہلیت کا لفظ دراصل قرآن نے اسلام کے مقابلہ پر استعمال فرمایا ہے۔ یعنی زندگی کا وہ طرزِ عمل جو اسلامی تہذیب و ثقافت، اخلاق و آداب اور اسلامی ذہنیت کے خلاف ہو وہ جاہلیت ہے۔ اور جاہلیتِ اولیٰ سے مراد اسلام سے پہلے کا تاریک دور ہے۔ اور اگر آج بھی معاشرہ میں وہی پرانی رسوم رائج ہو جائیں تو یہ دور بھی دورِ جاہلیت ہی کہلائے گا۔

[۴۹] ❁ تبرج میں کیا کچھ شامل ہے؟ تبرج بمعنی اپنی زینت، جسمانی محاسن اور میک اپ دوسروں کو اور بالخصوص مردوں کو دکھانے کی کوشش کرنا اور اس میں پانچ چیزیں شامل ہیں۔ (۱) اپنے جسم کے محاسن کی نمائش (۲) زیورات کی نمائش اور جھنکار، (۳) پہنے ہوئے کپڑوں کی نمائش، (۴) رفتار میں بانکپن اور ناز و ادا، (۵) خوشبویات کا استعمال جو غیروں کو اپنی طرف متوجہ کرے۔

[۵۰] ❁ اہلِ بیت سے مراد کون لوگ ہیں؟ اہل بیت اور اہل خانہ یا گھر والے یہ سب ہم معنی الفاظ ہیں۔ اور اس سے مراد کسی مرد کی بیوی یا بیویاں تو ضرور شامل ہوتی ہیں جیسے یہاں سیاق و سباق میں ازواج النبی کو ہی خطاب کیا جا رہا ہے۔ اور اگر اولاد ہو تو وہ بھی اہل بیت میں شامل سمجھی جاتی ہے۔ مگر بدقسمتی سے مسلمانوں کے ایک فرقہ نے اہل بیت سے ازواج النبی کو تو خارج کر دیا اور اس کے بجائے اہلِ بیت سے مراد سیدہ فاطمہ سیدنا علی، سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ لے لیا اور اس کی بنیاد امام احمد کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ان چاروں حضرات کو ایک چادر میں لے کر کہا: (اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَاءِ اَھْلَ بَیْتِیْ......) (یا اللہ! یہ میرے گھر والے ہیں) حالانکہ اس سے آپ ﷺ کی مراد صرف یہ تھی کہ اے اللہ تطہیر کے اس پاکیزہ عمل میں میری اولاد کو شامل کر لے اور یہ آپ ﷺ نے اس لئے کیا کہ سیاق و سباق میں خطاب صرف ازواج النبی سے تھا۔ آپ کی اولاد سے نہیں تھا۔

[۵۱] ❁ پاکیزگی کے مختلف پہلو:۔ یہاں ربطِ مضمون کے لحاظ سے رِجْسٌ (ناپاکی۔ گندگی) سے مراد صرف وہ حرکات اور افعال ہیں جو بے حیائی سے تعلق رکھتے ہیں اور شہوانی جذبات میں تحریک پیدا کرنے کا سبب بن سکتے ہیں اور سیاق و سباق میں یہی مضمون مذکور ہے۔ تاہم رجس کے معنی میں بہت وسعت ہے اور اس سے مراد شرک، کفر اور نفاق کی گندگی، اخلاق رذیلہ کی گندگی حتیٰ کہ ظاہری نجاست بھی شامل ہے اور مطلب یہ ہے کہ ایسی ناپاکی کو دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اے ازواج النبی تم جاہلیت کے دور والی نمود و نمائش کے بجائے نمازیں قائم کرو، زکوٰۃ ادا کیا کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ کے

ع ۴

يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ۝۳۴ۧ اِنَّ

اور جو تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت کی باتیں پڑھ کر سنائی[۵۲] جاتی ہیں انہیں[۵۳] یاد رکھو۔ بلاشبہ اللہ بڑا باریک بین اور باخبر ہے۔(۳۴)

رسول کو خرچ وغیرہ کے مطالبات کر کے پریشان نہ کرو۔ اس طرح اللہ تمہارے دلوں سے ہر طرح کی نجاست دور کر کے پاک وصاف بنا دے گا۔

[۵۲] ❁ **حکمت کیا چیز ہے:۔** حکمت کا معنی صرف دانائی یا دانائی کی باتیں ہیں۔ پھر اس کی دو قسمیں ہیں ایک حکمت علمی یعنی آیات قرآنی سے استنباطات اور اجتہادات دوسرے حکمت عملی۔ یعنی احکامِ الٰہی کو عملی طور پر نافذ کرنے کا طریقۂ کار۔ قرآن میں بے شمار مقامات پر کتاب وحکمت کا لفظ اکٹھا آیا ہے۔ اور امام شافعی نے بے شمار دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ حکمت سے مراد سنت نبوی ہے۔ یعنی خواہ آپ زبانی کسی آیت کی تشریح و تفسیر امت کو سمجھا دیں یا کسی حکم پر عمل کر کے امت کو دکھا دیں۔ یہ سب کچھ حکمت کے مفہوم میں شامل ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ساری حکمت صرف سنتِ نبوی میں ہی محصور ہے بلکہ قرآن میں بھی موجود ہے اسی لئے اسے القرآن الحکیم کہا گیا ہے۔ اب چونکہ منکرین حدیث، حدیث کی حجیت کے قائل نہیں تو ان کے ایک نمائندہ حافظ اسلم صاحب جیراجپوری نے اس آیت پر اعتراض جڑ دیا کہ کیا ازواج مطہرات کے گھروں میں اللہ کی آیات کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں بھی پڑھی جاتی تھیں؟ (مقام حدیث ص ۱۲ مطبوعہ ادارہ طلوع اسلام، لاہور)

❁ **منکرین حدیث کا ایک اعتراض اور اس کا جواب:۔** حافظ صاحب نے اس اعتراض میں دھوکا دینے کی کوشش فرمائی ہے۔ امام شافعی نے حکمت سے مراد سنت نبویؐ بتایا ہے۔ حدیث نہیں بتایا۔ اور حدیث اور سنت میں کئی لحاظ سے فرق ہے۔ جس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے آئینہ پرویزیت) لہٰذا صرف ایک آدھ اشارہ پر ہی اکتفا کروں گا۔ مثلاً قرآن میں تقریباً سات سو مقامات پر نماز کی ادائیگی کا حکم ہے۔ مگر اس کی مکمل ترکیب کسی ایک جگہ بھی مذکور نہیں۔ یہ ہمیں صرف آپ کے نماز ادا کرنے سے معلوم ہوئی۔ یہ حکمت ہے اور حکمتِ عملی لیکن یہ حکمت قرآن میں مذکور نہیں۔ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق آپ صحابہ کو التشہد اسی طرح پڑھاتے اور یاد کراتے اور پھر سنتے تھے جیسے قرآنی آیات پڑھاتے تھے اور حکمتِ علمی اور عملی دونوں قرآن میں مذکور نہیں۔ یہی حال باقی سب احکام کا ہے۔ گویا قرآن کے حکیم ہونے کے باوجود حکمت کا کثیر حصہ سنت نبوی سے ہمیں معلوم ہوا ہے۔

[۵۳] ❁ **تبلیغ دین میں ازواج کا کردار:۔** لفظ وَاذْكُرْنَ کے دو معنی ہیں ایک معنی "یاد رکھو" اور دوسرا معنی "بیان کرو" پہلے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ اے نبی کی بیویو! تمہارا گھر وہ گھر ہے جہاں سے دنیا بھر کو آیاتِ الٰہی اور حکمت ودانائی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لہٰذا تم اس بات کو خوب یاد رکھو اور اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ اس معاملہ میں تمہاری ذمہ داری بڑی سخت ہے۔ تمہیں اپنا ہر عمل اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی منشا کے مطابق کرنا ہوگا اور دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ جو کچھ تم آیات الٰہی اور حکمت کی باتیں سنو اور دیکھو۔ اسے لوگوں کے سامنے بیان کرو۔ کیونکہ زندگی کا ایک اہم پہلو یا گھریلو زندگی سے متعلق بہت سے امور ایسے ہیں جو تمہارے علاوہ کسی اور ذریعہ سے معلوم نہیں ہو سکتے۔

الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِينَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِينَ
وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِينَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِينَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَ
الْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِينَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ
وَالذّٰكِرِينَ اللّٰهَ كَثِيرًا وَّالذّٰكِرٰتِ أَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّأَجْرًا عَظِيمًا ﴿٣٥﴾

یقیناً جو مرد اور جو عورتیں مسلمان ہیں، مومن ہیں، فرمانبردار ہیں، سچ بولنے والے ہیں، صبر کرنے والے ہیں، فروتنی کرنے والے ہیں، صدقہ دینے والے ہیں، روزہ رکھنے والے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے اور اللہ کو بکثرت یاد کرنے والے ہیں، ان سب کے لئے اللہ تعالیٰ نے بخشش [۵۴] اور بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔ (۳۵)

[۵۴] **اسلام کی دس بنیادی اقدار:۔** اس آیت میں مسلمانوں کی دس ایسی صفات کا ذکر آیا ہے جنہیں اسلام کی بنیادی اقدار کا نام دیا جاسکتا ہے۔ پہلی صفت اسلام لانا ہے۔ اور اس کا انحصار دو شہادتوں پر ہے کہ جو شخص یہ اقرار کرے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسلام کے بعد دوسری صفت ایمان ہے۔ ایمان کا مطلب یہ ہے کہ دو شہادتیں اس کے دل میں جانشین ہو جائیں اور دل بھی ان کی تصدیق کرے اور انسان اسلام کے تقاضے اور بنیادی ارکان کے لئے مستعد ہو جائے۔ جب تک انسان دعوئ اسلام کے ساتھ دل کی تصدیق اور ساتھ ہی ساتھ اعمال صالح بجا نہ لائے اس کے ایمان کے دعویٰ کو غلط اور جھوٹ سمجھا جائے گا۔ تیسری صفت یہ ہے کہ وہ لوگ صرف زبانی حد تک ہی اللہ کے اور اس کے رسول کے احکام کے قائل نہیں ہوتے۔ بلکہ عملی لحاظ سے بھی ہر وقت انہیں ماننے پر اور مطیع فرمان بن کر رہنے پر تیار رہتے ہیں۔ چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ سچے اور راست باز ہوتے ہیں۔ اپنے معاملات میں جھوٹ، مکر، ریاکاری اور دغابازی سے حتی الوسع اجتناب کرتے ہیں۔ پانچویں صفت یہ ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں۔ نیز احکامِ الٰہی پر پورے صبر و ثبات کے ساتھ عمل پیرا ہوتے ہیں۔ چھٹی صفت یہ ہے کہ ان میں تکبر نام کو نہیں ہوتا۔ ان کی وضع قطع، چال ڈھال، اور گفتگو کبر و نخوت سے پاک ہوتی ہے۔ اس کے بجائے ان میں دوسروں کے لئے تواضع اور انکسار موجود ہوتا ہے۔ وہ ہر ایک سے عزت و احترام سے پیش آتے ہیں۔ اس مقام پر لفظ خاشعین استعمال ہوا ہے اور خشوع کے معنی ایسا خوف یا جذبہ ہے جس کے اثرات جوارح پر ظاہر ہونے لگیں۔ پھر یہی لفظ بول کر اس سے نماز بھی مراد لی جاسکتی ہے کیونکہ خشوع ہی نماز کی روح ہے اور یہاں نماز مراد لینا اس لحاظ سے بھی مناسب ہے کہ آگے صدقہ اور روزہ کا ذکر آرہا ہے۔ ساتویں صفت یہ ہے کہ وہ متصدق ہوتے ہیں اور اس لفظ میں تین مفہوم شامل ہیں۔ ایک یہ کہ وہ زکوٰۃ (فرضی صدقہ) ادا کرتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ نفلی صدقات سے محتاجوں کی احتیاج کو دور کرتے اور ان کاموں میں خرچ کرتے ہیں جن کا شریعت نے حکم دیا ہے اور تیسرا یہ کہ اگر کسی سے قرض وغیرہ لینا ہو تو وہ معاف کر دیتے ہیں۔ یعنی اپنے حق سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ آٹھویں صفت یہ ہے کہ وہ فرضی روزے تو ضرور رکھتے ہیں ان کے علاوہ نفلی روزے بھی حسب توفیق رکھتے ہیں۔ نویں صفت یہ ہے کہ وہ زنا سے بھی بچتے ہیں اور عریانی اور برہنگی سے بھی اجتناب کرتے ہیں اور دسویں صفت یہ ہے کہ وہ اپنے اکثر اوقات میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور یاد رکھتے ہیں۔ یاد کرنے سے مراد تسبیح و تہلیل اور اللہ کے ذکر سے زبان کو تر رکھنا ہے اور یاد رکھنے سے مراد یہ ہے کہ وہ کوئی کام کریں انہیں ہر وقت

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝ وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ

کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا فیصلہ کر دے تو ان کے لئے اپنے معاملہ میں کچھ اختیار باقی رہ جائے اور جو اللہ اور اسکے رسول کی نافرمانی [۵۵] کرے تو وہ یقیناً صریح گمراہی میں جا پڑا۔(۳۶) اور جب آپ اس شخص [۵۶] کو، جس پر اللہ نے بھی احسان کیا تھا اور آپ نے بھی، یہ کہہ

دل میں اللہ کا خوف رہتا ہے۔ جو انہیں اللہ کی نافرمانی سے بچاتا ہے۔ اور حقیقت ہے کہ تمام عبادتوں کی روح یہی اللہ کا ذکر یا اللہ کی یاد ہے۔ باقی سب عبادتوں کا کوئی نہ کوئی وقت ہوتا ہے مگر اس عبادت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ اور یہ ہر وقت کی جا سکتی ہے اور اسی اللہ کی یاد سے ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ بندے کا اپنے اللہ سے تعلق کس حد تک مضبوط ہے یا کمزور ہے۔

❁ عام طور پر مردوں کو ہی کیوں مخاطب کیا جاتا ہے اعمال کے اجر میں مرد اور عورت برابر ہیں:۔ اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ بعض ازواجِ مطہرات نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ قرآن میں عام طور پر مردوں کو ہی خطاب کیا گیا ہے۔ عورتوں کا ذکر کم ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں ایک ایک صفت میں مردوں کے ساتھ عورتوں کا بھی ذکر کیا گیا۔ اور یہ بعض ازواج (سیدہ ام سلمہ) کا محض جذبہ اشتیاق ہی تھا کہ عورتوں کا الگ سے نام لیا جانا چاہئے۔ ورنہ ہر زبان کا اور اسی طرح عربی زبان کا یہ ہی دستور ہے کہ جب کسی مردوں اور عورتوں کے مشترکہ اجتماع کو خطاب کرنا ہو تو جمع مذکر کا صیغہ ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ اور عورتیں بالتبع اس خطاب میں شامل ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس آیت میں یہ وضاحت کر دی گئی کہ عمل کرنے والا مرد ہو یا عورت کسی کی محنت اور کمائی اللہ کے ہاں ضائع نہیں جاتی۔ دوسرے یہ کہ ان دونوں کی کمائی کے اجر میں کچھ فرق نہ ہوگا۔ اخلاقی ترقی اور روحانی کمال دونوں کے سامنے ایک جیسا وسیع ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مردوں کا دائرہ عمل عورتوں کے دائرہ عمل سے الگ ہے۔ مرد کے لئے اگر جہاد میں بڑا درجہ ہے تو عورتوں کے لئے اولاد کی صحیح تربیت میں بڑا درجہ ہے۔ البتہ جن مسائل کا تعلق ہی عورتوں سے ہے ان میں عورتوں کو ہی خطاب کیا گیا ہے۔

[۵۵] ❁ آزاد شدہ غلاموں کا معاشرہ میں مقام:۔ اس سورہ کے آغاز میں پہلے بتایا جا چکا ہے کہ عرب معاشرہ میں کثیر تعداد غلاموں کی تھی۔ اور غلاموں کو ایک حقیر اور دوسرے درجہ کی مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اگر کوئی غلام آزاد کر دیا جاتا، جسے مولیٰ کہا جاتا تھا، تو بھی آزاد لوگوں کا معاشرہ اسے اپنے آپ میں جذب کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا تھا۔ اسلام اس معاشرتی بگاڑ کی اصلاح کرنا چاہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہوا کہ اس اصلاح کا آغاز نبی کی ذات اور اس کے گھرانہ سے کیا جائے۔

❁ سیدہ زینب کا اللہ اور اس کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا:۔ آپ ﷺ کا ایک غلام زید بن حارثہ تھا جسے آپ ﷺ نے آزاد کرنے کے بعد اسے اپنا متبنّیٰ بھی بنا لیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود آزاد لوگ اسے معاشرتی لحاظ سے اپنے برابر کا درجہ دینے کو تیار نہ تھے۔ آپ ﷺ نے زید کے لئے اپنی پھوپھی زاد بہن زینب کا رشتہ طلب کیا۔ تو ان لوگوں کو یہ بات توہین آمیز معلوم ہوئی اور سخت ناگوار گزری۔ اسی وجہ سے ان لوگوں نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ مگر اللہ کو منظور تھا کہ یہ کام ضرور ہونا چاہئے۔ اسی ضمن میں یہ آیت نازل ہوئی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے یہ آیت سیدہ زینب بنت جحش کو سنائی تو انہوں نے اللہ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور یہ رشتہ قبول کر لیا۔ اور سیدنا زید کا زینب بنت جحش سے نکاح ہو گیا۔

[۵۶] ❁ آپ ﷺ کے سیدنا زید بن حارثہ پر احسانات:۔ اس شخص سے مراد زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان پر اللہ اور اللہ کے

اَمۡسِكۡ عَلَیۡكَ زَوۡجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخۡفِیۡ فِیۡ نَفۡسِكَ مَا اللّٰهُ مُبۡدِیۡهِ وَتَخۡشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ

رہے تھے کہ: "اپنی بیوی کو اپنے[۵۷] پاس ہی رکھو اور اللہ سے ڈرو" تو اس وقت آپ ایسی بات اپنے دل میں چھپا[۵۸] رہے تھے جسے اللہ ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ آپ لوگوں سے ڈر رہے تھے، حالانکہ اللہ اس بات کا زیادہ حقدار

رسول کا احسان یہ تھا کہ آپ قبیلہ کلب کے ایک شخص حارثہ بن شرحبیل کے بیٹے تھے۔ آٹھ سال کے ہی تھے کہ ایک قبائلی جنگ میں گرفتار ہوئے ان حملہ آوروں نے انہیں عکاظ کے میلہ میں جاکر بیچ ڈالا۔ خریدنے والے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے حکیم بن حزام تھے۔ انہوں نے مکہ آکر اس غلام کو اپنی پھوپھی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں تحفتاً پیش کر دیا۔ جب رسول اللہ ﷺ کا سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا اس وقت زید بن حارثہ ۱۵ سال کے تھے۔ ان کی عادات واطوار رسول اللہ ﷺ کو اس قدر پسند آئیں کہ آپ ﷺ نے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اپنے لئے مانگ لیا اور انہوں نے آپ ﷺ کو دے دیا۔ کچھ عرصہ بعد سیدنا زید کے لواحقین کو آپ کا سراغ مل گیا تو سیدنا زید کے والد، چچا اور بھائی تین افراد رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور عرض کی کہ آپ ﷺ جتنا زر فدیہ چاہیں لے لیں اور بچے کو ہمارے ساتھ بھیج دیں۔ آپ ﷺ نے انہیں کہا میں زر فدیہ کچھ نہیں لیتا۔ البتہ تم زید سے پوچھ لو۔ اگر وہ تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہے تو مجھے کچھ عذر نہ ہوگا۔ انہوں نے سیدنا زید سے جانے کو کہا تو سیدنا زید نے ہمراہ جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے یہاں والدین سے بڑھ کر پیار اور شفقت میسر ہے۔ چنانچہ سیدنا زید کے لواحقین واپس چلے گئے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے سیدنا زید کو کعبہ میں لے جاکر سب کے سامنے اعلان کر دیا۔ کہ میں نے زید کو آزاد کر دیا ہے اور اسے اپنا متبنیٰ بنالیا ہے۔ لہٰذا یہ میرا وارث ہوگا۔ آپ کے اس اعلان کے بعد لوگ آپ کو زید بن حارثہ کے بجائے زید بن محمد کہنے لگے۔

[۵۷] ۞ اللہ اور اس کے رسول کے سیدنا زید پر احسانات:۔ سیدنا زید پر اللہ اور اس کے رسول کا دوسرا احسان یہ تھا کہ آپ ﷺ نے اپنے ہی قبیلہ سے جو معاشرتی لحاظ سے بہت اونچے درجے کا شریف قبیلہ شمار ہوتا تھا، سیدنا زید کے لئے رشتہ طلب کر لیا۔ لیکن چونکہ سیدنا زید پر سابقہ غلامی کا داغ موجود تھا۔ لہٰذا سیدہ زینب خود اور اس کے اولیاء نے اس رشتہ کے مطالبہ میں ہی اپنی توہین سمجھی تو اللہ نے ان لوگوں کو بذریعہ وحی بتادیا کہ یہ نبی کی خواہش نہیں بلکہ میرا حکم ہے۔ اس حکم الٰہی کے سامنے ان لوگوں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ ورنہ یہ رشتہ یا نکاح ہو جانا ناممکن نظر آرہا تھا۔ اللہ کے حکم کے تحت سیدہ زینب سے نکاح تو ہو گیا لیکن معاشرتی تفاوت ذہنوں سے اتنی جلد دور نہ ہو سکا اور نہ ہو سکتا ہے اور سیدہ زینب اپنے شوہر کا وہ احترام نہ کر سکیں جو انہیں کرنا چاہیے تھا۔ اسی لئے سیدنا زید اس بات کا رسول ﷺ سے شکوہ کرتے رہے دریں اثناء آپ کو بذریعہ وحی یہ اشارہ مل چکا تھا کہ زینب کا آپ سے نکاح ہوگا اس اشارہ سے کئی باتیں معلوم ہو رہی تھیں۔ ایک یہ کہ سیدنا زید طلاق دیئے بغیر نہ رہیں گے۔ دوسرے یہ کہ سیدہ زینب نے اور ان کے اولیاء نے اللہ کے حکم کے سامنے اپنی خواہش کی جو قربانی کی ہے اس کا صلہ انہیں اس صورت میں ملے کہ نبی ﷺ خود اس سے نکاح کر لیں اور تیسرے یہ کہ معاشرہ میں جو متبنیٰ سے متعلق غلط باتیں رواج پا گئی ہیں ان کا استیصال کیا جائے۔

[۵۸] ۞ آپ کونسی بات دل میں چھپاتے تھے؟ آپ ﷺ سیدنا زید کی شکایت پر ہر بار اسے ہی سمجھاتے رہے کہ جب اس

أَحَقُّ أَن تَخْشَاهُ ۖ فَلَمَّا قَضَىٰ زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي
أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ﴿٣٧﴾ مَّا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ

ہے کہ آپ اس سے ڈریں۔ پھر جب[۵۹] زید اس عورت سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو ہم نے آپ[۶۰] سے اس (عورت) کا نکاح کر دیا، تاکہ مومنوں پر ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی تنگی نہ رہے جبکہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں اور اللہ کا حکم ہو کر رہنے والا[۶۱] ہے۔(۳۷) جو بات اللہ نے

عورت نے اپنی خواہش کی قربانی دے کر تم سے نکاح کر لیا ہے تو آخر تمہیں بھی کچھ برداشت سے کام لینا چاہئے۔
آپ ﷺ کے زید کو طلاق سے منع کرنے اور اس طلاق کے معاملہ کو التوا میں ڈالے رکھنے سے آپ ﷺ کا مقصد یہ بھی تھا کہ جب بھی طلاق واقع ہو گئی تو سیدہ زینب کو مجھے اپنے نکاح میں لانا ہو گا۔ اس وقت مجھے تمام دشمنانِ اسلام کے طعن و تشنیع کا نشانہ بننا پڑے گا۔ یہ تھی وہ بات جسے آپ ﷺ دل میں چھپانا چاہتے تھے۔ جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اگر آپ ﷺ قرآن سے کوئی آیت چھپانے والے ہوتے تو اس آیت کو ضرور چھپاتے۔
اگرچہ دلوں کے خیالات پر اللہ تعالیٰ مؤاخذہ نہیں فرماتا مگر چونکہ آپ کی عظمتِ شان کے لحاظ سے دل میں ایسا خیال آنا بھی فروتر تھا۔ اس لئے ایسے خیال پر بھی اللہ کی طرف سے عتاب نازل ہوا۔

[۵۹] اس جملہ کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ جب اپنی بیوی سے اپنی نفسانی خواہش پوری کر چکا تو طلاق دے دی اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ سیدنا زید کی خواہش ہی یہ تھی کہ اسے طلاق دے دیں۔ چنانچہ انہوں نے طلاق دے دی اور عدت گزر گئی۔

[۶۰] اللہ کا حکم ہی زینب کے لئے نکاح کے قائم مقام تھا۔ اس کے بھی دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ نکاح تم نے اپنی مرضی اور اپنی خواہش کے مطابق نہیں کیا تھا بلکہ ہمارے حکم کے مطابق کیا تھا اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ نکاح اس دنیا میں ہوا ہی نہیں تھا، بلکہ اللہ کا یہ حکم ہی نکاح کا درجہ رکھتا تھا اور یہی مطلب درج ذیل احادیث کی رو سے راجح معلوم ہوتا ہے:

۱۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ زید بن حارثہ اپنی بیوی (زینب بنت جحش) کا شکوہ کرنے آتے تو آپ ﷺ ان سے فرماتے تھے: اللہ سے ڈر اور اپنی بیوی کو اپنے پاس ہی رہنے دے۔ سیدہ عائشہ کہتی ہیں کہ آپ ﷺ قرآن سے کچھ چھپانے والے ہوتے تو اس آیت کو چھپاتے اور سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بی بی زینب رسول اللہ کی دوسری بیویوں پر فخر کیا کرتیں کہ تم کو تو تمہارے اولیاء نے بیاہا اور مجھے اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کے اوپر سے بیاہ دیا۔ (بخاری۔ کتاب التوحید۔ باب قوله وكان عرشه على الماء)

۲۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب سیدہ زینب کی عدت پوری ہو گئی تو آپ ﷺ نے سیدنا زید سے کہا کہ زینب سے میرا ذکر کرو۔ زید کہتے ہیں کہ جب میں ان کے پاس آیا تو وہ اپنے آٹے کا خمیر اٹھا رہی تھیں۔ میں ان کی عظمت کی وجہ سے انہیں نظر بھر کر نہ دیکھ سکا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں یاد کیا تھا۔ پھر میں نے ان سے کہا: زینب مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا ہے۔ وہ آپ کو یاد کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا: میں اس وقت تک کوئی بات نہیں کرتی جب تک اپنے پروردگار سے مشورہ نہ کر لوں (استخارہ نہ کر لوں) پھر وہ اپنی جائے نماز پر کھڑی ہوئیں تو قرآن اترا اور رسول اللہ ﷺ بغیر اذن کے ان کے پاس چلے گئے۔ (مسلم۔ کتاب النکاح۔ باب زواج زينب بنت جحش)

[۶۱] وہ اللہ کا حکم یہ تھا کہ متبنّیٰ اصل بیٹے کا مقام نہیں رکھتا کہ اس کی مطلقہ بیوی حرام ہو جائے اور اللہ اس غلط رسم کو بہر حال ختم کرنا چاہتا تھا۔

فِيمَا فَرَضَ اللَّهُ لَهُ ۖ سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا ﴿٣٨﴾ الَّذِينَ
يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ ۗ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ﴿٣٩﴾ مَّا كَانَ مُحَمَّدٌ
أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿٤٠﴾ ع

نبی (ﷺ) کے لئے مقرر کر دی ہے اس میں نبی پر کوئی تنگی نہیں۔ یہی اللہ کی سنت ہے جو ان نبیوں میں بھی جاری رہی جو پہلے گزر چکے ہیں اور اللہ کا حکم ایک طے شدہ فیصلہ [۶۲] ہوتا ہے۔(۳۸) جو اللہ کے پیغام پہنچایا کرتے تھے اور اسی سے ڈرتے تھے۔ اللہ کے سوا اور کسی سے مطلق نہیں ڈرتے تھے۔ اور حساب [۶۳] لینے کو اللہ ہی کافی ہے۔(۳۹)

محمد (ﷺ) تمہارے مردوں میں کسی کے باپ [۶۴] نہیں ہیں بلکہ وہ اللہ کے رسول [۶۵] اور خاتم النبیین [۶۶] ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز [۶۷] کو خوب جاننے والا ہے(۴۰)

[۶۲] یعنی اللہ کا یہ حکم ایسا تھا۔ جس کا اللہ پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا اور یہ نکاح کرنا نبی پر فرض کیا گیا تھا۔ کیونکہ اللہ اپنے نبی کے ذریعہ ہی اس رسم کو مٹانا چاہتا تھا۔ اور یہ کام بہرحال ہو کر ہی رہنا تھا۔ سابقہ انبیاء میں بھی اللہ کی سنت یہی رہی ہے کہ اللہ کا حکم بہرحال انہیں سرانجام دینا ہوتا تھا خواہ اس سلسلہ میں کتنی ہی مشکلات پیش آئیں اور پریشانیاں لاحق ہوں۔

[۶۳] اس جملہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ حساب تو اللہ ہی نے لینا ہے لہٰذا کسی اور کی باز پرس سے ڈرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہر طرح کے خطرے اور پریشانیوں کے مقابلہ میں اللہ کافی ہے۔

[۶۴] ❁ معترضین کے اس نکاح کے بارے میں اعتراضات:۔ اس جملے میں دشمنانِ اسلام کے اس طعن کی تردید ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے بیٹے کی مطلقہ بیوی یعنی اپنی بہو سے نکاح کر لیا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ زید کے باپ ہیں ہی نہیں اور ایک زید ہی کیا کسی بھی مرد کے باپ نہیں۔ یعنی ان کی کوئی اولاد ایسی نہیں جو جوان ہو اور مرد کہلائے جانے کے قابل ہو۔ واضح رہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دو بیٹے قاسم اور طیب (جنہیں طاہر بھی کہا جاتا ہے) فوت ہو چکے تھے اور ابراہیم ابھی پیدا ہی نہ ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے نواسے تھے۔ جنہیں آپ ﷺ نے اپنا بیٹا بھی فرمایا مگر ایک تو وہ حقیقی بیٹے نہ تھے۔ دوسرے وہ بھی کمسن تھے جنہیں مرد نہیں کہا جا سکتا۔

[۶۵] ہنگامہ بپا کرنے والوں کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اگر زید کی مطلقہ بیوی سے آپ ﷺ کا نکاح جائز بھی تھا تو کیا یہ ضروری تھا کہ آپ ﷺ اس سے نکاح کرتے۔ یہ بات ویسے بھی کہی جا سکتی تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ انہیں تو وہ کام بہرحال کرنا ہوتا ہے جو اللہ کا حکم ہو اور اللہ کا حکم یہی ہے کہ اس بری رسم کی اصلاح کا آغاز نبی کی ذات سے کیا جائے۔

[۶۶] ربطِ مضمون کے لحاظ سے تو اس کا یہی مطلب ہے کہ محمد ﷺ کے بعد کوئی رسول تو کیا کوئی نبی بھی آنے والا نہیں۔ لہٰذا آپ ﷺ کے بعد اس برے دستور کی اصلاح ممکن ہی نہ تھی۔ لہٰذا ضروری تھا کہ آپ ﷺ خود اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح کرتے تاکہ دوسرے مسلمانوں کے لئے یہ راستہ ہموار ہو جائے اور انہیں ایسا کرنے میں کوئی پریشانی لاحق نہ

ہو۔ تاہم یہ جملہ ایک ٹھوس حقیقت پر مبنی ہے جیسا کہ درج ذیل احادیث سے واضح ہوتا ہے:

(۱) عامر الشعبی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا کوئی بیٹا زندہ نہ رہا تاکہ اس آیت کا مضمون صادق آجائے کہ آپ ﷺ کسی کے باپ نہیں۔ (ترمذی۔ ابواب التفسیر)

(۲) ۞ آپ خاتم النبیین ہیں:۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: میری اور اگلے پیغمبروں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک گھر بنایا۔ اس کو خوب آراستہ پیراستہ کیا۔ مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی۔ لوگ اس میں آتے جاتے اور تعجب کرتے ہیں کہ اس اینٹ کی جگہ کیوں چھوڑ دی۔ وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں"۔ بخاری۔ کتاب المناقب۔ باب خاتم النبیین علیہم السلام)

(۳) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "بنی اسرائیل پر نبی حکومت کیا کرتے جب ایک نبی فوت ہو جاتا تو اس کی جگہ دوسرا نبی ہوتا۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ البتہ میرے بعد کثرت سے خلفاء پیدا ہوں گے" (بخاری۔ کتاب الانبیاء۔ باب ما ذکر عن بنی اسرائیل) (مسلم۔ کتاب الامارۃ۔ باب الامر بالوفاء ببیعة الخلفاء)

(۴) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: آپ ﷺ نے فرمایا: "قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک دو گروہ آپس میں نہ لڑیں۔ دونوں میں بڑی جنگ ہوگی اور دونوں کا دعویٰ ایک ہوگا اور قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تیس کے قریب جھوٹے دجال ظاہر نہ ہو لیں ان میں سے ہر ایک یہی کہے گا کہ میں اللہ کا رسول ہوں" (بخاری۔ کتاب المناقب۔ باب علامات النبوت فی الاسلام)

(۵) ۞ اسود عنسی اور مسیلمہ کذاب:۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے زمانہ میں مسیلمہ کذاب مدینہ آیا اور کہنے لگا: اگر محمد ﷺ اپنے بعد مجھے اپنا جانشین بنائیں تو میں ان کی تابعداری کرتا ہوں" اور مسیلمہ کذاب اپنے ساتھ بہت سے لوگوں کو بھی لایا تھا۔ آپ ﷺ اس کے پاس چلے گئے اور آپ ﷺ کے ساتھ ثابت بن قیس (بن شماس۔ خطیب انصار) بھی تھے۔ اس وقت آپ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ آپ ﷺ نے مسیلمہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: اگر تم محمد ﷺ سے یہ چھڑی بھی مانگو تو میں نہیں دوں گا۔ (جانشینی تو دور کی بات ہے) اور اللہ نے جو کچھ تیری تقدیر میں لکھ دیا ہے تو اس سے بچ نہیں سکتا۔ اور تو اسلام نہ لائے گا اور اللہ تجھے تباہ کر دے گا۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ تو وہی دشمن ہے جس کا حال مجھے اللہ تعالیٰ (خواب میں) دکھا چکا ہے۔ اور یہ ثابت بن قیس میری طرف سے تمہیں جواب دے گا" یہ کہہ کر آپ ﷺ واپس چلے گئے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کے ارشاد کا مطلب پوچھا تو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے مجھے بتایا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "ایک دفعہ میں سویا ہوا تھا میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے ہاتھ میں سونے کے دو کنگن ہیں۔ تو میں بہت پریشان ہو گیا۔ خواب ہی میں مجھے حکم دیا گیا کہ ان پر پھونک مارو میں نے پھونک ماری تو وہ دونوں اڑ گئے۔ میں نے اس کی یہ تعبیر سمجھی کہ میرے بعد دو جھوٹے شخص پیغمبری کا دعویٰ کریں گے ان میں سے ایک اسود عنسی ہے اور دوسرا مسیلمہ کذاب۔ (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب وفد بنی حنیفة.....)

(۶) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: تم سے پہلے اگلی امتوں میں ایسے لوگ گزرے ہیں جن کو اللہ کی طرف سے الہام ہوتا تھا۔ اگر میری امت سے کوئی ایسا ہو تو وہ عمر بن خطاب ہوتے" (حوالہ ایضاً)

اور قیامت کے قریب سیدنا عیسیٰ کا نزول ہوگا تو وہ یہاں رسول اللہ ﷺ کے امتی بن کر رہیں گے۔ اور آپ ﷺ ہی کی شریعت کی اتباع کریں گے علاوہ ازیں نبی ہونے کی حیثیت سے بھی ان کا شمار رسول اللہ ﷺ سے پہلے کے انبیاء میں ہے۔ وہ کوئی نیا دعویٰ نہیں کریں گے۔

ختم نبوت اور آپ ﷺ کے بعد وحی کے اِنقطاع کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہے جس پر تمام امت کا اجماع ہو چکا ہے۔ اس آیت، ان صریح احادیث صحیحہ اور اجماع کے علی الرغم قادیان ضلع گورداسپور میں ایک شخص مرزا غلام احمد نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ ہم یہاں مختصراً اُس کے اس دعویٰ کا جائزہ لینا چاہتے ہیں:

(۱) مرزا صاحب پہلے خود بھی ختمِ نبوت کے قائل اور نبوت کا دعویٰ کرنے والے کو کافر سمجھتے تھے۔ چنانچہ حمامۃ البشریٰ میں لکھتے ہیں کہ بھلا نبی کریم ﷺ کے بعد نبی آئے تو کیسے آئے جبکہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد وحی بند ہو چکی ہے اور اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کے ساتھ نبیوں کو ختم کر دیا ہے" (حمامۃ البشریٰ ص ۲۰) پھر اسی کتاب کے صفحہ ۷۹ پر لکھتے ہیں کہ "مجھے یہ بات زیبا نہیں کہ میں نبوت کا دعویٰ کر کے اسلام سے خارج ہو جاؤں اور کافروں میں جا ملوں" اس وقت تک آپ کا صرف مجدد ہونے کا دعویٰ تھا۔

(۲) ❁ <u>مرزا قادیانی کی نبوت کے تدریجی مراحل:۔</u> پھر اس کے بعد آپ مثیل مسیح بنے۔ پھر مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ اسی بنا پر آپ نے رفع عیسیٰ کا انکار کر دیا بلکہ بذریعہ کشف والہام کشمیر میں آپ کی قبر کی نشاندہی بھی فرما دی اور اعلان فرمایا کہ:

ابن مریم کے ذکر کو چھوڑو اس سے بہتر غلام احمد ہے

پھر اس کے بعد آپ نے کھل کر اپنی نبوت کا دعویٰ کر دیا اور یہ بھی کہ مجھ پر وحی آتی ہے اور میں اللہ سے ہم کلام ہوتا ہوں۔ پھر جب آپ ہی کی تحریروں کے مطابق علماء نے آپ پر گرفت کی تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ میں کوئی مستقل نبی نہیں نہ ہی کوئی صاحبِ شریعت رسول ہوں بلکہ آپ ﷺ کی اطاعت ہی کی وجہ سے نبی ہوا ہوں اور آپ ہی کا ظل اور بروز (یعنی سایہ یا عکس) ہوں آپ کی اسی ظلی اور بروزی کی اصطلاح پر مولانا ظفر علی خان ایڈیٹر روزنامہ "زمیندار" نے ایک بار یوں تبصرہ کیا تھا:

بروزی ہے نبوت قادیان کی برازی ہے خلافت قادیان کی

گویا آپ بتدریج نبی بنے تھے، پہلے مجددیت کے مدعی تھے پھر مثیلِ مسیح کے، پھر مسیح موعود کے پھر جب کچھ کام چلتا دیکھا تو نبوت کا دعویٰ کر دیا اور قادیان کی سرزمین کو حرام قرار دیتے ہوئے فرمایا:

زمینِ قادیان ارض حرم ہے ہجومِ خلق سے اب محترم ہے

اگر غور کیا جائے تو آپ کی تدریجی نبوت ہی آپ کے نبوت کے دعویٰ کے ابطال کے لئے بہت کافی ہے کیونکہ تمام تر سلسلہ انبیاء میں سے کوئی نبی اس طرح بتدریج نبی نہیں بنایا گیا تاہم آپ کی پیش کردہ توجیہات کا بھی ہم جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

(۳) ❁ <u>ظلی اور بروزی نبی کی اصطلاح:</u> آپ کی پہلی توجیہ یہ ہے کہ آپ کو رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتے کرتے یہ درجہ ظلی نبوت حاصل ہوا۔ گویا آپ کے نظریہ کے مطابق "نبوت وہبی نہیں بلکہ کسبی چیز ہے اس نظریہ کی قرآن

نے ﴿وَاللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ﴾ کہہ کر بھرپور تردید کی ہے۔ علاوہ ازیں اگر نبوت کسبی چیز ہوتی اور آپؐ کی اتباع کامل کی وجہ سے حاصل ہو سکتی ہے تو اس کے سب سے زیادہ حقدار صحابہ کرامؓ تھے۔ بالخصوص سیدنا عمرؓ جن کے متعلق صراحت سے احادیث مبارکہ میں آیا ہے کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتے۔ اور ظل اور بروز کا نظریہ تو کئی لحاظ سے آپ کی نبوت کا ابطال کرتا ہے۔ مثلاً

(۴) رسول اللہ ﷺ شاعر نہیں تھے۔ آپ ﷺ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ شاعری آپؐ کے شایان شان بھی نہیں۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے سورہ یٰسین کی آیت نمبر ۶۹ اور اس کا حاشیہ) جبکہ مرزا صاحب شاعر تھے۔ آپ نے اردو، عربی، فارسی میں بہت سے اشعار اور قصیدے لکھے حتیٰ کہ ایک بہت بڑی کتاب بطور کلیات مرزا صاحب مسمی بہ "درثمین" تصنیف اور شائع کی ہے۔ اگر آپ رسول اللہ ﷺ کے ظل اور بروز ہیں تو آپ ﷺ تو شاعر نہیں تھے۔ یہ عکس میں شاعری کہاں سے آگئی؟ مطلب واضح ہے کہ مرزا صاحب رسول اللہ کا عکس نہیں۔

(۵) آپ کی تضاد بیانی کا یہ حال ہے کہ ایک وقت آپ دعویٰ نبوت کو کفر سمجھتے تھے پھر مثیلِ مسیح بنے، پھر مسیح موعود بنے، پھر نبوت کا دعویٰ کیا پھر یہ بھی دعویٰ کر دیا کہ تمام انبیاء کی خوبیاں مجھ میں جمع اور موجود ہیں۔ چنانچہ اس درثمین میں اردو زبان میں کہا کہ: میں کبھی عیسیٰ کبھی موسیٰ کبھی یعقوب ہوں...... نیز ابراہیم ہوں نسلیں ہیں میری بے شمار

فارسی میں کہا:

انبیاء گرچہ بودہ اند بسے من بعرفان نہ کمترم زکسے ...... آنچہ داد ست ہر نبی را جام داد آں جام را مرا بہ تمام

ترجمہ: اگر انبیاء بہت گزرے ہیں تاہم میں معرفت میں کسی سے کم نہیں ہوں۔ ان میں جس کسی کو کوئی جام معرفت دیا گیا وہ سب کے سب جام مجھے دیئے گئے ہیں۔

اپنی ذات سے متعلق ایسی تضاد بیانی کو رسول اللہ ﷺ کا عکس کہا جا سکتا ہے؟ یا سابقہ انبیاء میں سے کسی کو تدریجاً کبھی نبی بنایا گیا ہے؟

(۶) چھٹی بات آپ کے مخالفوں کے حق میں آپ کی بدزبانی ہے جنہیں آپ ولد الزنا اور ولد الحرام کہہ کر پکارا کرتے ہیں اور آئینہ کمالات اسلام میں فرمایا کہ ذُرِّیَّۃُ الْبَغَایَا (یعنی کنجریوں کی اولاد) کے علاوہ ہر مسلمان نے مجھے قبول کیا اور میری دعوت کی تصدیق کی بالفاظ دیگر جن مسلمانوں نے میری نبوت کی تصدیق نہیں کی وہ سب کنجریوں کی اولاد ہیں اور ایک بار اپنے مخالف پر لعنت بھیجنے کو جی چاہا تو ہزار بار لعنت کہنے یا لکھنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ فی الواقع ہزار بار لعنت کا لفظ لکھ کر کتاب کے تین چار صفحے سیاہ کر ڈالے۔ کیا یہ بھی رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا نمونہ اور ان کا عکس ہے؟ کیا رسول اللہ ﷺ سے اپنے مخالفوں کے حق میں ایسی غلیظ گالیاں ثابت کی جا سکتی ہیں؟

(۷) ❁ آپ کی نبوت کی تردید پر دلائل:۔ اور جب اپنی کسر نفسی پر آتے ہیں تو بھی غلیظ زبان استعمال کرتے اور حقائق کا منہ چڑاتے ہیں۔ درثمین ہی میں فرماتے ہیں:

کرم خاکی ہوں میرے پیارے نہ آدم زاد ہوں ...... ہوں بشر کی جائے نفرت اور انسانوں کی عار

یعنی اے میرے پیارے میں نہ تو مٹی کا کیڑا ہوں اور نہ آدم کی نسل سے ہوں۔ بلکہ میں بشر کی "جائے نفرت" ہوں جس

سے سب لوگوں کو شرم آئے۔

اب آپ خود ہی فیصلہ فرمالیجئے کہ وہ بشر کی جائے نفرت کیا چیز ہو سکتی ہے۔ بس وہی چیز مرزا صاحب تھے۔ بایں ہمہ آپ کا دعویٰ یہ ہے آپ ﷺ کا عکس ہیں۔ نیز آپ نہ مٹی سے پیدا ہوئے تھے نہ آدم کی نسل سے تھے۔ تو پھر کیا تھے؟ سابقہ انبیاء تو سب آدم زاد ہی تھے۔

(۸) قرآن اور احادیث میں جہاد فی سبیل اللہ اور بالخصوص قتال فی سبیل اللہ پر جس قدر زور دیا گیا ہے اور جتنے فضائل کتاب وسنت میں مذکور ہیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ نے خود سترہ غزوات میں حصہ لیا۔ اور ساتھ ہی یہ فرمادیا کہ یہ جہاد تا قیامت جاری رہے گا۔ لیکن مرزا صاحب نے اس جہاد کی ممانعت کا یوں فتویٰ دیا کہ :

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال! ...... دین کے لئے حرام ہے اب جنگ و قتال

دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد ...... منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد

(در ثمین ص ۵۳) آخری مصرع میں نبی سے مراد غالباً مرزا صاحب خود ہیں۔ غور فرمائیے کہ ایسا شخص رسول اللہ ﷺ کا عکس ہو سکتا ہے؟ جبکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذات کے متعلق فرمایا کہ: "میں چاہتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں، پھر زندہ ہوں پھر مارا جاؤں، پھر زندہ ہوں پھر مارا جاؤں" (بخاری۔ کتاب التمنی۔ باب من تمنی الشھادۃ) پھر یہ بھی غور فرمائیے مرزا صاحب رسول اللہ ﷺ کا عکس ہیں یا ان کی آرزو اور تعلیم کو ملیامیٹ کرنے پر تلے بیٹھے ہیں اور ان کی ضد ہیں۔

(۹) ۞ جہاد بالسیف کی بھرپور مخالفت:۔ کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے حکومت وقت کا ساتھ دیا ہو بلکہ نبی کا تو کام ہی یہ ہوتا ہے کہ بگڑے ہوئے معاشرہ کی اصلاح کرے اور سرکاری درباری حضرات، آسودہ حال طبقہ اور چودھری لوگ ہمیشہ انبیاء کے مخالف رہے ہیں۔ مگر یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ مرزا صاحب اور ان کی نبوت انگریز بہادر کے سایہ عاطفت میں پروان چڑھتی ہے۔ اور آپ بھی ہر وقت گورنمنٹ عالیہ کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں نیز وہ اپنی زبان سے اپنے آپ کو گورنمنٹ کا "خود کاشتہ پودا" ہونے کا اقرار فرماتے ہیں۔ اب دو ہی باتیں ممکن ہیں ایک یہ کہ انگریز کی حکومت کو صحیح اسلامی حکومت تسلیم کر لیا جائے۔ اس صورت میں مرزا صاحب کی نبوت کی ضرورت ہی ختم ہو جاتی ہے کیونکہ نبی ہمیشہ بگاڑ کی اصلاح کے لئے آتا ہے اور دوسری صورت یہی باقی رہ جاتی ہے کہ نبی اپنے دعویٰ نبوت میں جھوٹا ہو۔ اور یہی صورت حال مرزا صاحب کی نبوت پر صادق آتی ہے۔

۞ آپ کا اپنے بارے میں انگریز کا خود کاشتہ پودا ہونے کا اعتراف:۔ ہوا یہ تھا کہ جب ہندوستان میں انگریز بہادر کی حکومت قائم ہو گئی تو ساتھ ہی زیر زمین جہاد کی تحریک شروع ہو گئی جس سے انگریز کو ہر وقت خطرہ لاحق رہتا تھا۔ اس نے اس کا حل یہ سوچا کہ مسلمانوں کی آپس میں پھوٹ ڈال دی جائے اور دوسرے جہاد کی روح کو حتی الامکان مسلمانوں کے اذہان سے خارج کر دیا جائے۔ ان کاموں کے لئے اس کی نظر انتخاب مرزا غلام احمد قادیانی پر پڑی۔ مرزا صاحب نے انگریز بہادر کے دونوں کام سرانجام دیئے۔ جہاد بالسیف کی جی بھر کر مخالفت کی اور اپنے پیروکاروں کے علاوہ باقی سب مسلمانوں پر کفر کا فتویٰ بھی لگا دیا۔ جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ مرزائی مسلمانوں کا جنازہ تک نہیں پڑھتے۔ قائد اعظم کی نماز جنازہ کے وقت سر ظفر اللہ خاں پرے ہی کھڑے رہے مگر نماز جنازہ میں شریک نہ ہوئے۔ اور انگریز نے مرزا صاحب کے ان "احسانات" کا بدلہ یہ دیا کہ ان کی نبوت

اور ان کی امت کو پورا پورا تحفظ دیا اور انہیں زیادہ سے زیادہ ملازمتیں دے کر انہیں حکومت میں آگے لے آیا۔ یہی وجہ ہے کہ مرزائی اقلیت میں ہونے کے باوجود حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر براجمان ہیں۔ علاوہ ازیں ان حضرات کو ہر طرح مراعات بھی دی جاتی ہیں۔

(۱۰) محمدی بیگم سے نکاح کی پیشگوئی کا حشر:۔ آپ کی نبوت کے ابطال پر دسویں دلیل آپ کی جھوٹی پیشین گوئیاں ہیں۔ آپ محمدی بیگم سے نکاح کرنا چاہتے تھے۔ تو آپ نے مشہور کر دیا کہ مجھے بذریعہ وحی معلوم ہوا ہے کہ میرا محمدی بیگم سے آسمانوں پر نکاح ہوا ہے۔ محمدی بیگم کے اولیاء سے جو مرزا صاحب کی اپنی برادری کے لوگ تھے، مرزا صاحب نے درخواست کی تو انہوں نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ جس پر آپ اپنی وحی کی بنا پر کئی طرح کی دھمکیاں اور وعیدیں محمدی بیگم کے اولیاء کو سناتے رہے۔ لیکن ان لوگوں پر مرزا صاحب کی دھمکیوں کا خاک بھی اثر نہ ہوا۔ اور نہ ہی ان دھمکیوں کے مطابق انہیں کچھ نقصان پہنچا۔ انہوں نے محمدی بیگم کو کسی دوسری جگہ بیاہ دیا۔ جہاں اسکے ہاں اولاد بھی ہوئی اور سکھ چین سے زندگی بسر کرتی رہی اور مرزا صاحب اس سے شادی کی حسرت دل میں لئے اگلے جہان کو سدھار گئے۔ اور آسمانوں کا نکاح آسمانوں پر ہی رہ گیا زمین پر نہ ہو سکا۔ بعد میں آپ کے متبعین نے مرزا صاحب کے الہامات اور وحیوں کی یہ تاویل فرمائی کہ کسی دور میں مرزا صاحب کی اولاد در اولاد میں سے کسی لڑکے کا محمدی بیگم کی اولاد در اولاد میں سے کسی لڑکی سے نکاح ضرور ہوگا۔ ایسی اندھی عقیدت بھی قابل ملاحظہ ہے۔

(۱۱) مولانا ثناء اللہ امرتسری سے مباہلہ اور مرزا صاحب کی وفات:۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری کے مرزا صاحب سخت دشمن تھے۔ کیونکہ وہ بھی ہاتھ دھو کر مرزا صاحب کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ آخر مرزا صاحب نے مولوی ثناء اللہ کو ۱۵ اپریل ۱۹۰۷ء کو ایک طویل خط لکھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ "اے اللہ! اگر میں جھوٹا اور مفتری ہوں تو میں ثناء اللہ کی زندگی میں ہلاک ہو جاؤں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ کذاب اور مفتری کی لمبی عمر نہیں ہوتی۔ اور اگر ثناء اللہ جھوٹا ہے تو اسے میری زندگی میں نابود کر مگر نہ انسانی ہاتھوں سے بلکہ طاعون اور ہیضہ وغیرہ امراض مہلکہ سے" اور ساتھ ہی مرزا صاحب نے یہ استدعا بھی کی کہ میرے اس خط کو من وعن اپنے اخبار میں شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ مولوی ثناء اللہ امرتسری نے مرزا صاحب کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس طویل خط کو اپنے ہفت روزہ "اہلحدیث" کی ۲۵ مئی ۱۹۰۷ء کی اشاعت میں شائع کر دیا۔

اس خط کا انداز بیان اگرچہ دعائیہ تھا تاہم مرزا صاحب نے بذریعہ الہام اس بات کی توثیق فرما دی کہ ان کی دعا قبول ہو گئی اور یہ الہام البدر قادیان ۲۵ اپریل ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرزا صاحب اس سے تیرہ ماہ بعد ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو بعارضہ ہیضہ بمقام لاہور انتقال کر گئے اور مولانا ثناء اللہ امرتسری صاحب اللہ کے فضل سے مارچ ۱۹۴۸ء تک یعنی مرزا صاحب کی وفات سے چالیس سال بعد تک زندہ رہے۔

مرزا صاحب کے انتقال کے بعد جب یہ شور اٹھا کہ مرزا صاحب اپنے دعوائے نبوت میں جھوٹے ثابت ہوئے تو اتباع مرزا نے اس شرط کو بدل دینا چاہا کہ شرط دراصل یہ تھی کہ جو جھوٹا ہوگا وہ زندہ رہے گا اور مباحثہ کرنا چاہا اور خود ہی یہ صورت پیش کی کہ فیصلہ کے لئے ایک غیر مسلم ثالث ہوگا اور ہم اگر ہار جائیں تو مولوی ثناء اللہ امرتسری صاحب کو تین سو روپے (یعنی آج کے لحاظ سے کم از کم تیس ہزار روپے) دیں گے۔ ورنہ مولوی ثناء اللہ ہمیں اتنی ہی رقم دے۔ اس اعلان کے مطابق اپریل

۱۹۱۲ء میں بمقام لودھیانہ مباحثہ ہوا جس میں ثالث سردار بچن سنگھ جی پلیڈر لودھیانہ مقرر ہوئے۔ اس مباحثہ میں ثالث نے مولانا ثناء اللہ کے حق میں فیصلہ دیا اور انعام یا شرط کی مجوزہ رقم آپ کو مل گئی۔ یہ تھی مرزا صاحب کی ذات گرامی جو اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کا ظل اور بروز ہونے کی مدعی تھی۔

اور جو حکومتِ پاکستان نے ۱۹۷۴ء میں قومی اسمبلی میں کثرت رائے کی بنا پر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا تھا تو اس کی وجہ ان صریح احادیث کا انکار ہے جو ہم ابتدا میں درج کر آئے ہیں بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان بھی لائے پھر ان کی بات بھی نہ مانے بلکہ آپ ﷺ کے ارشادات کے علی الرغم نہ صرف ان احادیث کا انکار کرے بلکہ اپنی نبوت ورسالت کا بھی دعویٰ کرے۔

❁ حکومتِ پاکستان کا مرزائیوں کو کافر قرار دینا:۔ مرزائی حضرات مرزا صاحب کی نبوت کی صداقت پر عموماً سورہ الحاقہ کی آیات نمبر ۴۴ تا ۴۶ پیش کیا کرتے ہیں کہ "اگر یہ رسول (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے پاس سے کوئی بات گھڑ کر ہمارے ذمہ لگادے تو ہم اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی رگ جان کاٹ دیں" اور وجہ استدلال یہ بیان کی جاتی ہے کہ نبی ﷺ کا زمانہ نبوت ۲۳ سال ہے اور مرزا صاحب تو اس مدت سے زیادہ زندہ رہے اگر انہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا تھا تو اللہ کی طرف سے ایسی کوئی سزا ضرور ملنا چاہئے تھی اور جب ایسی سزا نہیں ملی تو معلوم ہوا کہ آپ اپنے دعویٰ نبوت میں سچے تھے۔ اس کا تفصیلی جواب تو ہم سورہ الحاقہ میں ہی دیں گے۔ مختصراً یہ کہ اگر ایسا افترا کوئی نبی لگائے تو اسے تو یقیناً ایسی سزا بھی ملے گی۔ لیکن کوئی عام شخص اللہ پر جھوٹ باندھے تو یہ سزا نہیں ملتی جیسے ایک گورنر اپنی طرف سے کوئی فرمان جاری کر کے اسے صدرِ مملکت کے ذمہ لگائے تو اس سے ضرور مواخذہ ہوگا۔ لیکن ایک خاکروب یا کوئی عام آدمی صدر کے خلاف جو جی چاہے بکتا رہے۔ اسے کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ مرزا صاحب کو ایسی سزا نہ ملنے سے تو الٹا آپ کی نبوت کی تردید ہو جاتی ہے۔

❁ قادیانیوں کی طرف سے آپ کی نبوت پر دلائل اور ان کا جواب:۔ مرزائی حضرات نبوت کے اجراء کے لئے ایک عقلی دلیل بھی دیا کرتے ہیں۔ کہ نبوت اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ جس کے لوگ ہر وقت محتاج ہیں۔ بالخصوص آج کے دور انحطاط میں تو ایسی رحمت کی اشد ضرورت ہے۔ لہٰذا خاتم کے معنی مہر تصدیق ہونا چاہیں۔ یعنی اس نبی کی نبوت درست ہوگی جو رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرتا ہو اور آپ کی شریعت کا متبع ہو۔ اس دلیل کے جوابات درج ذیل ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ اور ساتھ ہی فرمادیا کہ: ﴿وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ یعنی اللہ تعالیٰ اس بات کو بھی خوب جانتا ہے کہ آئندہ تا قیامت کسی نبی کو بھیجنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

۲۔ یہ دلیل جو کچھ بھی ہے بہر حال ایک عقلی دلیل ہے۔ اور نص کے مقابلہ میں قیاس یا عقل کے گھوڑے دوڑانا حرام ہے۔

۳۔ ان حضرات کا دعوائے ضرورت اس لحاظ سے بھی غلط ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے واشگاف الفاظ میں بتادیا کہ "میری امت میں سے ایک فرقہ تا قیامت حق پر قائم رہے گا" صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! وہ کون سا گروہ ہوگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں" (ترمذی۔ کتاب الایمان۔ باب الافتراق هذه الامة)

گویا آج صرف دیکھنے کا کام یہ ہے کہ وہ کون سا فرقہ یا گروہ ہے جو صرف کتاب و سنت سے رہنمائی لیتا ہے۔ اس میں کچھ کمی بیشی نہیں کرتا نہ کتاب و سنت کے مقابلہ میں کسی دوسری شخصیت کا قول یا فتویٰ قبول کرتا ہے اور نہ ہی دین میں کوئی نئی بات،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿٤١﴾ وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿٤٢﴾ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ﴿٤٣﴾ تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ

اے ایمان والو! اللہ کو بکثرت یاد کیا کرو(۴۱) اور صبح و شام [۶۸] اس کی تسبیح کیا کرو(۴۲) وہی ہے جو تم پر رحمت فرماتا [۶۹] ہے اور اس کے فرشتے بھی تمہارے لئے دعائے رحمت کرتے ہیں تاکہ وہ تمہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف [۷۰] لے جائے اور اللہ مومنوں پر بہت مہربان ہے۔(۴۳) جس دن وہ اللہ سے ملیں گے ان کا استقبال [۷۱] سلام

خواہ عقیدہ سے تعلق رکھتی ہو یا عمل سے، شامل کرتا ہے۔ اور ایسے گروہ کی موجودگی کسی نئے نبی کی آمد کی ضرورت کو ختم کر دیتی ہے۔ اور ایسا فرقہ چونکہ تاقیامت باقی رہے گا لہٰذا تاقیامت کسی نبی کی ضرورت باقی نہ رہی۔

❁ **نئے نبی کی ضرورت کس صورت میں ہوتی ہے:۔** علاوہ ازیں انبیاء کی بعثت کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ سابقہ قومیں یا امتیں کتاب اللہ میں تحریف کر ڈالتی ہیں یا ان میں علمائے امت کے اقوال اور الحاقی مضامین شامل کر کے کتاب اللہ کو گڈمڈ کر دیتی ہیں نبی کا کام یہ ہوتا ہے کہ جو سچی الہامی تعلیم ہوتی ہے اس کی نشاندہی کرتا اور اس کے متعلق دوٹوک فیصلہ دیتا ہے۔ لیکن امت مسلمہ میں یہ صورت بھی نہیں ان کے پاس کتاب اللہ اسی صورت میں موجود اور محفوظ ہے جس صورت میں آپ ﷺ پر نازل ہوئی تھی۔ پھر کتاب اللہ کے علاوہ اس کی تشریح و تفسیر بھی، جسے حدیث یا سنت کہا جاتا ہے، امت کے پاس موجود اور محفوظ ہے۔ تو پھر آخر کسی نئے نبی کی ضرورت بھی کیا تھی؟ کیا یہی کہ وہ کتاب اللہ پر ایمان رکھنے والوں میں انتشار ڈال دے اور باقی سب مسلمانوں پر کفر کے فتوے صادر کرنے لگے؟

[۶۷] یعنی وہ ان لوگوں کے اعمال سے خوب واقف ہے جنہوں نے اودھم مچا رکھا ہے۔ اور وہ اپنے احکام کی مصلحتوں کو بھی خوب جانتا ہے۔

[۶۸] یعنی جب تمہیں پریشانیوں کا اور اعدائے اسلام کے طعن و تشنیع کا سامنا کرنا پڑے تو ایسے اوقات میں اللہ کو بکثرت یاد کیا کرو اور صبح و شام کی نمازوں کے علاوہ بالخصوص ان اوقات میں اللہ کی تسبیح و تہلیل بھی کیا کرو۔ اس طرح تمہارے اندر ایسی پریشانیوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت پیدا ہو گی۔ اور دلوں کو اطمینان نصیب ہو گا۔

[۶۹] ❁ **صحابہ کرام پر صلوٰۃ و سلام:۔** یصلی کا صلہ علیٰ اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کا معنی اللہ کا بندے پر اپنی مہربانی اور رحمت نازل کرنا ہوتا ہے اور اگر یہ نسبت فرشتوں کی طرف ہو تو دعائے رحمت کرنا اور اگر بندے کی طرف ہو تو اس کے معنی دعائے رحمت بھی، دعائے جنازہ بھی اور نماز جنازہ بھی اور درود پڑھنا اور بھیجنا بھی ہوتا ہے۔ اسی سورہ کی آیت نمبر ۵۶ میں مذکور ہے کہ اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت اور دعائے رحمت بھیجتے ہیں اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے صحابہ کرام اور پیروکاروں کو بھی اس فضل و رحمت میں شریک فرمایا۔

[۷۰] یعنی اللہ تعالیٰ کو بکثرت یاد کرنے کے نتیجہ میں اللہ تم پر اپنی رحمت فرماتا ہے اور یہ رحمت فرشتوں کے توسط سے نازل ہوتی ہے اور یہ اللہ کی رحمت ہی کا نتیجہ ہے کہ تمہیں کفر کی جہالتوں سے چھٹکارا حاصل ہوا اور علم اور ایمان کی روشنی اور دولت نصیب ہوئی اور اس میں ہر آن اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔

[۷۱] اس سلام کی بھی تین صورتیں ہیں اور تینوں ہی قرآن کی بعض دوسری آیات سے ثابت ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ خود

يَلْقَوْنَهُ سَلٰمٌ ۚ وَّاَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا ﴿٤٤﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿٤٥﴾
وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿٤٦﴾ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ﴿٤٧﴾

سے ہوگا اور اس نے ان کے لئے باعزت اجر تیار کر رکھا ہے۔(۴۴) اے نبی! ہم نے آپ کو گواہی[۷۲] دینے والا بشارت دینے والا اور ڈرانے والا[۷۳] بنا کر بھیجا ہے۔(۴۵) نیز اللہ کے حکم سے اس کی طرف بلانے والا اور روشن[۷۴] چراغ (بنا کر بھیجا ہے)(۴۶) آپ مومنوں کو خوشخبری دے دیجئے کہ ان پر اللہ کا بہت[۷۵] بڑا فضل ہے۔(۴۷)

انہیں سلام کہے گا، دوسرے یہ کہ فرشتے انہیں سلام کہیں گے اور تیسرے یہ کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو سلام کہیں گے۔

[۷۲] **نبی کی شہادت کی تین صورتیں:۔** وہ گواہی یہ ہے کہ اس کائنات کا خالق و مالک اور معبودِ برحق صرف ایک اللہ ہے دوسرا کوئی اس الوہیت اور حاکمیت میں شریک نہیں۔ اور نبی کی یہ گواہی تین طرح سے ہوتی ہے ایک یہ کہ نظامِ کائنات کے مطالعہ سے وہ خود اس نتیجہ پر پہنچتا ہے اور بعض انبیاء کو ملکوت السمٰوات والارض دکھائی اور اس کی سیر بھی کرائی جاتی ہے تاکہ جس شہادت کے وہ داعی بننے والے ہیں اس کا انہیں عین الیقین حاصل ہو۔ دوسری گواہی ان کی دعوت پر سب سے پہلے ان کا اپنا عمل ہوتا ہے۔ یعنی ان کی عملی زندگی اس بات پر گواہ ہوتی ہے کہ نبی جو شہادت دے رہا ہے وہ درست اور برحق ہے۔ اور تیسری شہادت وہ قیامت کے دن اپنی امت کے حق میں اور منکروں کے خلاف دیں گے۔

[۷۳] یعنی ایمان لانے والوں کو یہ بشارت دیتا ہے کہ ان سے مصائب کے بادل چھٹ جانے والے ہیں اور عنقریب اللہ تعالیٰ مومنوں کو اپنی فتح و نصرت سے سرفراز فرمائے گا اور مرنے کے بعد انہیں جنت اور اس کی نعمتیں میسر آنے والی ہیں۔ اسی طرح وہ دعوت حق کے مخالفین کو دنیا میں بھی ان کے برے انجام اور ذلت و خواری سے ڈراتا ہے اور آخرت میں جہنم کے عذاب سے بھی۔ اور یہ بشارت اور وعید وہ اپنی طرف سے نہیں دے رہا بلکہ وہ ہماری طرف سے اس بات پر مامور ہے۔

[۷۴] اس مادی دنیا یا کائنات میں اللہ تعالیٰ نے سورج کو سراج (چراغ) کا نام دیا (سورہ نوح:۱۶) جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ چاند اور ستارے بالواسطہ اسی سورج سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور روحانی دنیا میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو سراج منیر (چمکتا ہوا چراغ) کا لقب عطا فرمایا۔ گویا نبوت کے آفتاب آپ ﷺ ہیں آپ کے طلوع ہونے کے بعد اب کسی دوسری روشنی کی ضرورت نہیں رہی۔ اب ہر انسان کو اپنے ہر شعبہ زندگی کے لئے ہدایت اسی آفتاب نبوت و ہدایت سے حاصل کرنا ہوگی۔

[۷۵] **مومنوں پر اللہ کا بہت بڑا فضل کیا ہے؟ اور امتِ مسلمہ کی فضیلت:۔** مومنوں پر اللہ کا فضل کبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آفتاب نبوت کو ان لوگوں میں مبعوث فرمایا اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو سب انبیاء سے افضل بنایا اسی طرح آپ کی امت کو دوسری امتوں پر فضیلت اور بزرگی عطا فرمائی۔ جیسا کہ درجِ ذیل احادیث سے واضح ہے:

۱۔ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”گذشتہ قوموں (یہود و نصاریٰ) کے مقابلہ میں تمہارا رہنا ایسا ہے جیسے عصر سے سورج غروب ہونے کا وقت۔ اہل تورات کو تورات دی گئی انہوں نے (صبح سے) دوپہر تک مزدوری کی پھر تھک گئے تو انہیں ایک ایک قیراط ملا۔ اہل انجیل کو انجیل دی گئی انہوں نے (دوپہر سے) عصر کی نماز تک مزدوری کی پھر تھک گئے۔ انہیں بھی ایک قیراط ملا۔ پھر ہم مسلمانوں کو قرآن دیا گیا ہم نے سورج غروب ہونے تک مزدوری کی (اور کام پورا

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿٤٨﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ
عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿٤٩﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا

نیز آپ کافروں اور منافقوں کی بات نہ مانیے اور ان کی ایذا رسانی کی پروا[٧٦] نہ کیجئے اور اللہ پر بھروسہ کیجئے اور کام بنانے کو اللہ ہی کافی ہے۔(٤٨)

اے ایمان والو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو پھر انہیں چھونے سے پیشتر طلاق دے دو تو تمہارے لئے ان[٧٧] پر کوئی عدت نہیں جس کے پورا ہونے کا تم مطالبہ کر سکو۔ لہٰذا (اسی وقت) انہیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقہ سے رخصت کر دو۔(٤٩) اے نبی! ہم نے آپ پر آپ کی وہ بیویاں حلال کر دی

کر دیا) تو ہمیں دو قیراط دیئے گئے۔ اب اہل کتاب کہنے لگے: پروردگار! تو نے انہیں دو قیراط دیئے اور ہمیں ایک ایک حالانکہ ہم نے ان سے زیادہ کام کیا ہے؟" اللہ عزوجل نے انہیں جواب دیا: "میں نے تمہاری مزدوری سے (جو تم سے طے کی تھی) کچھ دبا لیا تو نہیں؟" وہ کہنے لگے: "نہیں" اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "پھر یہ میرا فضل ہے جسے جو کچھ چاہوں دوں" (بخاری۔ کتاب مواقیت الصلوٰۃ۔ باب من ادرك ركعة من العصر)

۲۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ "ہمیں دوسری امتوں پر تین باتوں میں فضیلت ملی۔ ہماری صفیں فرشتوں کی صفوں کی طرح کی گئیں اور ہمارے لئے ساری زمین نماز کی جگہ ہے اور زمین کی خاک ہمیں پاک کرنے والی ہے جب پانی نہ ملے۔" ایک بات اور بیان کی" (مسلم۔ کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ)

[٧٦] یعنی جن لوگوں نے طعن و تشنیع سے یہ طوفان بدتمیزی اٹھا رکھا ہے ان کی نہ پروا کیجئے اور نہ ان سے بدلہ لینے کی فکر کیجئے۔ ورنہ یہ لوگ آپ کی منزل کھوٹی کر دیں گے۔ آپ پوری توجہ سے اپنا کام کرتے جائیے اور انہیں خائب و خاسر بنانے کے لئے آپ کی طرف سے اللہ ہی کافی ہے۔

[٧٧] ❁ طلاق دینے والے کو ہدایات:۔ اس آیت میں چند امور قابل ذکر ہیں۔ پہلا یہ کہ اگرچہ آیت میں مومن عورتوں سے نکاح کا ذکر ہے۔ تاہم اگر نکاح کتابیہ عورت سے ہو تو وہ بھی اسی حکم میں داخل ہوگا۔ دوسرا یہ کہ صحبت سے پیشتر طلاق دینے سے بھی نصف حق مہر ادا کرنا واجب ہے۔ بشرطیکہ حق مہر طے ہو چکا ہو۔ (۲: ۲۳۷) تیسرا یہ کہ اگر حق مہر مقرر ہی نہ کیا گیا ہو تو پھر کچھ نہیں دینا ہوگا۔ البتہ دونوں صورتوں میں عورت کو کچھ نہ کچھ دے دلا کر رخصت کرنا چاہئے۔ اور اس کچھ نہ کچھ کی مقدار طلاق دینے والے کی مالی حیثیت کے لحاظ سے ہوگی۔ چوتھا یہ کہ اگر عورت کو طلاق ہی دینا ہے تو پھر اس پر کوئی الزام نہ لگانا چاہئے۔ نہ ہی اسے بدنام کر کے گھر سے نکالنا چاہئے جو اس کی آئندہ زندگی پر ناخوشگوار اثر ڈالے۔ بھلے طریقہ سے رخصت کرنے کا یہی مطلب ہے اور پانچواں اور سب سے اہم امر یہ ہے کہ عدت کے دوران بھی مطلقہ عورت اپنے خاوند کی بیوی ہی رہتی ہے۔ اور یہ مرد کا عورت پر حق ہے۔ اس دوران مرد رجوع کا حق بھی رکھتا ہے اور اس میں زبردستی بھی کر سکتا ہے۔ علاوہ

لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَاۗءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ
عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۡ وَامْرَاَةً

ہیں جن کے حق مہر آپ ادا کر چکے ہیں اور وہ کنیزیں بھی جو آپ کے قبضہ میں ہیں جو اللہ نے آپ کو غنیمت کے مال سے دی ہیں۔ نیز آپ کے چچا، پھوپھیوں [۷۸]، ماموں اور خالاؤں کی بیٹیاں بھی جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہے۔

ازیں اگر اس دوران حمل معلوم ہو جائے۔ تو بچہ بھی طلاق دینے والے مرد کا ہوگا۔ اور وہ اس کا وارث بھی ہوگا۔ صحبت سے پہلے طلاق دینے میں چونکہ حمل وغیرہ کا احتمال ہی نہیں ہوتا لہٰذا غیر مدخولہ عورت پر کوئی عدت نہیں۔ وہ اگر چاہے تو طلاق کے فوراً بعد نکاح کر سکتی ہے۔

ہمارے ہاں عموماً یہ رواج ہے کہ نکاح کے ساتھ ہی رخصتی ہو جاتی ہے اور اسے شادی کہتے ہیں۔ تاہم یہ رواج پایا جاتا ہے کہ پہلے نکاح ہو جاتا ہے مثلاً بچپن میں والدین نے نکاح کر دیا اور رخصتی یا شادی کچھ مدت کے بعد یا زوجین کے جوان ہونے کے بعد ہوتی ہے۔ اس آیت میں مذکورہ صورت کا احتمال دوسری شکل میں ہی پایا جاتا ہے اور عرب میں یہ عام رواج تھا کہ نکاح پہلے ہو جاتا تھا اور رخصتی بعد میں ہوتی تھی۔

احناف نے خلوتِ صحیحہ کو بھی صحبت ہی کے مترادف قرار دیا ہے اور یہ ایسی بات ہے جس کی دلیل یا مثال کتاب و سنت میں نہیں ملتی۔

[۷۸] ۞ <u>آپ کو چار سے زائد بیویوں کی خصوصی اجازت اور اس کی وجہ:</u۔ یہ دراصل ایک اعتراض کا جواب ہے۔ سیدنا زینب بنت جحش جن سے آپ ﷺ نے اللہ کے حکم سے نکاح کیا تھا یا جن کا نکاح سات آسمانوں پر ہوا تھا آپ کی پانچویں بیوی تھیں۔ اس سے پہلے چار بیویاں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بنت ابی بکر رضی اللہ عنہ سیدہ سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا' سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا بنت عمر رضی اللہ عنہ اور سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا موجود تھیں۔ اور عام مومنوں کے لئے چار بیویوں سے زائد کا جواز نہیں تھا۔ اس آیت کی رو سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس عام قاعدہ سے مستثنیٰ کر دیا۔ یہ اعتراض کافروں کی طرف سے تو یقیناً تھا تاہم مسلمانوں کو بھی اس کا خیال آ سکتا تھا۔ لہٰذا اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ وضاحت فرما دی کہ عام مومنوں کے لئے چار تک بیویوں کے جواز کا قانون بھی ہمارا ہی قانون ہے۔ اور نبی سے ہم جو کچھ کام لینا چاہتے ہیں اور جو ذمہ داریاں اس پر عائد ہوتی ہیں اس کی بنا پر ہم ہی نبی کے لئے اس عام قانون میں استثناء کرنے والے ہیں۔ نیز اس آیت کی رو سے اللہ نے آپ ﷺ کو مزید بھی تین قسم کی عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت فرما دی۔ پہلی قسم وہ عورتیں جو مال غنیمت کے طور پر آپ کی ملکیت میں آئیں۔ دوسری آپ کے چچاؤں، پھوپھیوں، ماموؤں اور خالاؤں کی بیٹیاں جو ہجرت کر کے مدینہ آ چکی ہوں۔ اور سیدہ زینب بنت جحش ایسی ہی تھیں۔ تیسری قسم وہ عورتیں جو از خود اپنے آپ کو آپ سے نکاح کے لئے پیش کریں اور اگر اپنا نفس ہبہ کرنے والی کوئی عورت آپ ﷺ کو پسند آ جائے تو اس کا حق مہر کچھ نہیں ہوگا۔ نہ گواہوں کی ضرورت ہوگی اور نہ اس عورت کے ولی کی رضا کی۔ بس عورت کا اپنا نفس ہبہ کر دینا ہی نکاح سمجھا جائے گا۔ اس سلسلہ میں درج ذیل دو احادیث ملاحظہ فرمالیجئے۔

۞ <u>کون کون سی عورت نبی ﷺ کی بیوی بن سکتی ہے؟</u> ا۔ ام ہانی رضی اللہ عنہا (ابو طالب کی بیٹی اور آپ کی چچا زاد بہن)

مُؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۗ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ

نیز وہ مسلمان عورت بھی جو اپنے آپ کو نبی کے لئے ہبہ کر دے اور نبی اس کو نکاح میں لینا چاہے یہ رعایت صرف آپ[۷۹] کے لئے ہے دوسرے مسلمانوں کو نہیں۔

کہتی ہیں کہ آپ ﷺ نے مجھے نکاح کا پیغام دیا مگر میں نے معذرت کر دی (کہ میرے چھوٹے چھوٹے رونے پیٹنے والے بچے ہیں) آپ نے میرا عذر قبول فرمالیا۔ پھر جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے آپ ﷺ سے کہا کہ میں تو آپ ﷺ پر حلال بھی نہیں کیونکہ میں نے ہجرت نہیں کی تھی اور فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والوں سے تھی۔ (ترمذی کتاب التفسیر)

سیدہ عائشہ کا تبصرہ:۔ ۲۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے ان عورتوں پر غیرت آئی تھی جو اپنے تئیں نبی کریم ﷺ کو بخش دیتی تھیں میں کہتی، بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ کوئی عورت اپنے تئیں بخش دے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تو میں نے (آپ ﷺ سے) کہا: ”میں تو یہ دیکھ رہی ہوں کہ جیسی آپ کی خواہش ہو آپ ﷺ کا پروردگار فورا ویسا ہی حکم دیتا ہے“ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

[۷۹] خصائصِ انبیاء:۔ اس رعایت کا تعلق قریبی مضمون سے بھی ہو سکتا ہے اور سارے مضمون سے بھی۔ قریبی مضمون سے ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ اگر کوئی عورت آپ کے لئے اپنا نفس ہبہ کرے تو آپ کو حق مہر نہیں دینا ہوگا۔ نہ گواہوں کی ضرورت ہے اور نہ ولی کی اجازت کی۔ اور سارے مضمون سے جوڑا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ چار سے زائد بیویوں کی اجازت صرف آپ ﷺ کو ہے دوسرے مسلمانوں کو نہیں ہے۔ نبی کی چونکہ ذمہ داریاں عام مسلمانوں سے زیادہ ہوتی ہیں پھر ان کا عزوشرف بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے شریعت کے کئی احکام وارشادات ایسے ہیں جو عام مسلمانوں سے الگ ہیں۔ پھر ان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو ایسے امور ہیں جو تمام انبیاء سے مختص ہیں اور انہیں ہم خصائصِ انبیاء کہہ سکتے ہیں اور وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کو مدینہ میں صلح حدیبیہ سے پیشتر عمرہ کرنے کا خواب آیا تھا۔ (۴۸: ۲۷) یا سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو سیدنا اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کا خواب آیا تھا۔ (۳۷: ۱۰۲)

۲۔ انبیاء کا ترکہ وارثوں میں تقسیم نہیں ہوتا بلکہ وہ صدقہ ہوتا ہے جیسا کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ہمارا (پیغمبروں کا) کوئی وارث نہیں ہوتا۔ ہم جو کچھ چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے“ (مسلم۔ کتاب الجہاد والسیر۔ باب حکم الفئی) اور ابوہریرہ کی دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے وارث ایک دینار بھی بانٹ نہیں سکتے۔ میری بیویوں کے خرچ اور میرے عامل کی اجرت کے بعد جو کچھ میں چھوڑ جاؤں وہ صدقہ ہے۔ (مسلم۔ حوالہ ایضا)

۳۔ انبیاء کے اجسام کو مٹی نہیں کھاتی۔ اوس بن اوس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے دنوں میں سب سے افضل جمعہ کا دن ہے۔ اسی دن آدم پیدا کیے گئے، اسی دن فوت ہوئے۔ اسی دن صور پھونکا جائے گا اور اسی میں نفخہ ہے۔ اس دن مجھ پر زیادہ درود بھیجو کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا: ”یا رسول اللہ ﷺ! ہمارا درود آپ ﷺ پر کیسے پیش کیا جاتا ہے جبکہ آپ کی ہڈیاں پرانی ہو چکی ہوں گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کے جسموں کو کھانا حرام کر دیا ہے“ (ابوداؤد۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔ دارمی۔ بیہقی فی دعوات الکبیر۔ بحوالہ مشکوٰۃ۔ کتاب

الصلوٰۃ۔ باب الجمعۃ۔ فصل ثانی)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ انبیاء کے علاوہ سب لوگوں کے مردہ اجسام کو مٹی کھا جاتی ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ انبیاء کے اجسام کو تو بہرحال نہیں کھاتی اور امت میں سے بھی ایسے لوگ ہو سکتے ہیں جنہیں مدت دراز تک مٹی نہ کھائے۔ البتہ عام قاعدہ یہی ہے کہ مردہ اجسام کو زمین کھا جاتی ہے۔

۴۔ موت سے پہلے اختیار۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں سنا کرتی تھی کہ کوئی پیغمبر اس وقت تک نہیں مرتا جب تک اس کو یہ اختیار نہیں دیا جاتا کہ دنیا اختیار کرے یا آخرت۔ پھر میں نے رسول اللہ ﷺ کی مرض الموت میں سنا۔ آپ ﷺ کو ایک اچھو ہوا اور فرمانے لگے۔ یااللہ! ان لوگوں کے ساتھ جن پر تو نے انعام کیا آخر آیت تک۔ اس وقت میں سمجھ گئی کہ آپ کو وہ اختیار مل گیا۔" (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب مرض النبی ﷺ ووفاته)

۵۔ ہر نبی کو مرنے سے پہلے جنت میں ٹھکانا دکھا دیا جاتا ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب تندرست تھے تو فرماتے تھے کہ کوئی پیغمبر اس وقت تک نہیں مرا جب تک اس کو بہشت میں اس کا مقام دکھا نہیں دیا جاتا۔ پھر اسے اختیار دیا جاتا ہے زندہ رہے چاہے آخرت اختیار کرے۔ (بخاری۔ حوالہ ایضاً)

۶۔ سیدنا انس بن مالک معراج کا قصہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں اس کے بعد آپ نے ان فرشتوں کو دوسری رات دیکھا۔ جیسے آپ دل سے دیکھا کرتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی آنکھیں سوتی تھیں اور دل نہیں سوتا تھا اور سب پیغمبروں کا یہی حال ہے کہ ان کی آنکھیں سوتی ہیں مگر دل نہیں سوتا۔ (بخاری۔ کتاب المناقب۔ باب کان النبی ﷺ تنام عینه ولا ینام قلبه.....)

۷۔ نبی جس مقام پر فوت ہوا اسی مقام اور جگہ پر دفن ہوتا ہے۔ نبی ﷺ کی وفات کے بعد یہ معاملہ زیر بحث آیا کہ آپ کو کہاں دفن کیا جائے؟ اور اس تکرار کا اسی حکم کے مطابق ہی فیصلہ ہوا اور آپ کو سیدہ عائشہ کے گھر میں دفن کیا گیا۔

اور استقصاء کرنے سے ان امور میں مزید اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔

❁ خصائص النبی ﷺ:۔ اور دوسری قسم وہ ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کے لئے احکام الگ ہیں اور آپ کی امت کے الگ۔ ایسے امور کو ہم خصائص النبی ﷺ کہہ سکتے ہیں اور وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ امتی کے لئے زیادہ سے زیادہ چار بیویاں جائز ہیں۔ جبکہ آپ کو چار سے زائد بیویوں کی خصوصی اجازت دی گئی جیسا کہ اسی حاشیہ کی ابتدا میں ذکر ہو چکا ہے۔

۲۔ آپ پر بیویوں کا حق مہر اور نان و نفقہ واجب نہیں تھا۔ تفصیل اسی سورہ کے حاشیہ نمبر ۸۰ میں دیکھئے۔

۳۔ بیویوں کی باری کے سلسلہ میں بھی آپ سے یہ پابندی اٹھالی گئی۔ تفصیل اسی سورہ کے حاشیہ نمبر ۸۱ میں دیکھئے۔

۴۔ آپ پر نماز تہجد فرض تھی جبکہ امت کے لئے اس کی حیثیت سنت موکدہ کی ہے۔ تفصیل سورہ بنی اسرائیل کے حاشیہ ۹۸، ۹۹ء میں دیکھئے۔

❁ وصلی روزوں کی ممانعت:۔ ۵۔ آپ خود وصلی روزے رکھتے ہیں لیکن امت کو وصلی روزے سے منع فرمایا۔ چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو وصلی روزے رکھنے سے، ان پر رحم کی بنا پر منع فرمایا (یعنی روزہ پر

روزہ رکھنے سے جن کے درمیان افطار نہ کیا جائے) صحابہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! آپ تو وصل کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ میری صورت حال تمہارے جیسی نہیں ہے۔ مجھے تو میرا پروردگار کھلا اور پلا دیتا ہے (مسلم۔ کتاب الصیام۔ باب النھی عن الوصال)(بخاری۔ کتاب التمنی۔ باب مایجوز من اللّو۔۔۔)

بودار اشیاء کے استعمال سے متعلق حکم:۔ ۶۔ لہسن یا بو والی چیزوں کا حکم۔ جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ جو شخص لہسن یا پیاز (کچی) کھائے وہ ہم سے الگ رہے یا یوں فرمایا کہ ہماری مسجد سے الگ رہے اور اپنے گھر میں بیٹھا رہے (جب تک اس کے منہ میں بو رہے) نیز جابر نے کہا کہ بدر کے مقام پر آپ ﷺ کے سامنے طباق لایا گیا جس میں کچھ سبزی ترکاری تھی۔ آپ ﷺ کو اس میں بو محسوس ہوئی۔ آپ نے اس کے متعلق پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ اس میں فلاں فلاں ترکاری ہے۔ (آپ ﷺ نے اسے نہیں کھایا اور) فرمایا کہ اسے فلاں صحابی (ابو ایوب انصاری) کے پاس لے جاؤ جو آپ ﷺ کے ساتھ رہتے تھے۔ ابو ایوب انصاری نے جب یہ معاملہ دیکھا تو انہوں نے بھی اسے کھانے میں کراہت کی۔ آپ ﷺ نے انہیں فرمایا: تم کھالو۔ کیونکہ میں تو ان (فرشتوں) سے سرگوشی کرتا ہوں جن سے تم نہیں کرتے۔ (بخاری۔ کتاب الاعتصام۔ باب الاحکام التی تعرف بالدلائل۔۔۔)

۷۔ آپ نے صدقہ کے متعلق امت کو حکم دیا کہ افضل الصدقة ما کان عن ظھر غنی یعنی بہتر صدقہ وہ ہے کہ صدقہ کرنے کے بعد انسان خود محتاج نہ ہو جائے۔ (بخاری۔ کتاب النفقات۔ باب وجوب النفقة علی الاھل والعیال) لیکن آپ خود قرضہ اٹھا کر بھی صدقہ کر دیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ زکوٰۃ جو آپ پر بھی فرض تھی، اس کے ادا کرنے کا کبھی موقعہ ہی نہ آیا۔

۸۔ آپ اور آپ کے اہل خانہ کوئی نیکی کا کام کریں تو دگنا اجر اور نافرمانی پر دگنی سزا قرآن سے ثابت ہے۔ حتیٰ کہ آپ کو بخار بھی دوگنی شدت سے چڑھتا تھا۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں آپ کے ہاں گیا۔ آپ کا جسم بخار سے جل رہا تھا۔ میں نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! آپ کو بخار بہت سخت آیا ہے۔ فرمایا: مجھ پر اتنی سخت تپ آتی ہے جیسے تم میں دو آدمیوں کی تپ ملائی جائے۔ میں نے عرض کیا آپ کو اجر بھی دوگنا ملے گا۔ فرمایا: ہاں! پھر فرمایا: جس شخص کو کوئی تکلیف بیماری وغیرہ ہو اللہ اس کے گناہ ایسے جھاڑ دیتا ہے جیسے درخت (موسم خزاں میں) اپنے پتے جھاڑ دیتا ہے۔ (بخاری۔ کتاب المرضیٰ۔ باب وضع الید علی المریض)

۹۔ آپ کی وفات کے بعد کوئی شخص آپ کی بیویوں سے نکاح نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کی مائیں ہیں اور یہ اعزاز صرف آپ ﷺ کی ازواج سے مخصوص ہے کوئی امتی اس اعزاز میں شریک نہیں ہو سکتا۔

کیا نکاح کا مقصد صرف جنسی خواہش کی تکمیل یا حصولِ اولاد ہی ہے؟ یہاں ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ نکاح کا مقصد شہوت رانی یا زیادہ سے زیادہ اولاد کا حصول ہے۔ یہ نظریہ کسی حد تک درست ہے مگر انتہائی تنگ نظری پر مبنی ہے۔ کسی حد تک ہم نے اس لئے کہا ہے کہ نکاح سے شریعت کا اصل مقصد معاشرہ کو فحاشی اور بے حیائی سے پاک وصاف رکھنا ہے۔ اسی لئے شریعت نے اس بات پر زور دیا ہے کہ بلوغت کے بعد کوئی مرد یا عورت بے زوج نہ رہے۔ اگر زوج فوت ہو جائے یا شوہر طلاق دے دے تو ہر ایک کے لئے مستحب یہی ہے کہ وہ نکاح کر لے۔ (ملاحظہ ہو سورہ نور کی آیت نمبر ۳۲ کا

حاشیہ) حالانکہ جوانی کے انحطاط کے بعد انسان کی شہوت میں معتدبہ حد تک کمی واقع ہو جاتی ہے اور اگر اولاد ہو تو اسے اللہ کی قدرت ہی سمجھا جاتا ہے۔ بڑھاپے میں اولاد کا ہونا کوئی عادی امر نہیں ہے۔ البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اصل مقصد یعنی معاشرہ کی پاکیزگی کا ایک ثمرہ اولاد کا حصول بھی ہے۔ جو کبھی حاصل ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ زوجین کے بالغ اور بظاہر صحت مند ہونے کے باوجود ان کے ہاں ساری عمر اولاد نہیں ہوتی۔ اور صرف اولاد کے حصول کو تنگ نظری پر محمول ہم نے اس لئے کہا ہے کہ نکاح سے اور کئی مقاصد اور فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں مثلاً نکاح کا دوسرا مقصد قریبی رشتہ داروں میں قرابت کے تعلق کو برقرار رکھنا اور مودت بڑھانا ہے۔ تیسرا مقصد دینی اخوت کا قیام اور اس میں اضافہ ہے چوتھا مقصد کئی طرح کے دینی، سیاسی، معاشی فوائد کا حصول ہے اور بعض دفعہ ایسے مقاصد حصول اولاد سے بھی زیادہ اہمیت اختیار کر جاتے ہیں آپ ذرا رسول اللہ ﷺ کی زندگی پر نظر ڈالئے کہ آپ ﷺ نے کتنے نکاح کئے؟ کس عمر میں کئے؟ کس قسم کی عورتوں سے کئے اور کن کن مقاصد کے تحت کئے تو یہ حقیقت از خود منکشف ہو جائے گی کہ نکاح کا مقصد صرف جنسی خواہشات کی تکمیل یا حصول اولاد ہی نہیں ہوتا بلکہ اس سے بلند تر مقاصد بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔

۞ <u>آپ نے کتنی شادیاں کیں اور کن کن اغراض کے تحت کیں؟</u>:۔ آپ ﷺ کا پہلا نکاح ۲۵ سال کی عمر میں سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہوا جو اس وقت چالیس سال کی تھیں اور ان کو پہلے دو مرتبہ طلاق ہو چکی تھی۔ ان کی وفات ۱۰ نبوی میں ہوئی جبکہ رسول اللہ ﷺ کی عمر پچاس سال تھی۔ ماسوائے سیدنا ابراہیم کے آپ ﷺ کی ساری اولاد سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا ہی کے بطن سے پیدا ہوئی۔ یعنی جوانی کا پورا زمانہ آپ ﷺ نے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا ایک ہی بیوی کے ساتھ گزارا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے سیدہ سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا جو ایک بوڑھی، بھاری بھرکم اور مطلقہ عورت تھیں اور اس نکاح سے آپ کا مقصد اولاد کی تربیت تھی۔ کیونکہ آپ ﷺ نبوت کی ذمہ داریوں کی وجہ سے اولاد کی تربیت پر توجہ نہیں دے سکتے تھے۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹیوں سے آپ ﷺ نے نکاح اس غرض سے کیا کہ یہ شیخین آپ ﷺ کے دنیا و آخرت میں رفیق اور وزیر ہیں۔ اور تعلقات میں مزید محبت اور خوشگواری پیدا کرنے کے لئے آپ نے یہ نکاح کئے تھے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ آپ ﷺ کی ساری بیویوں میں سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کنواری تھیں جن سے آپ ﷺ نے نکاح کیا باقی سب بیویاں مطلقہ تھیں یا بیوہ۔ پھر آپ ﷺ کی ایک ذمہ داری یہ بھی تھی کہ قبائلی جاہلی نظام اور اس کی عصبیت کو ختم کر کے اسلامی نظام قائم کریں۔ اور سابقہ عداوتوں کو ختم کریں۔ آپ ﷺ نے سیدہ ام سلمہ سے نکاح کیا جو اس خاندان کی بیٹی تھی جس سے ابو جہل اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا تعلق تھا۔ سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ابو سفیان کی بیٹی تھیں۔ ان شادیوں نے بڑی حد تک ان خاندانوں کی دشمنی کا زور توڑ دیا۔ سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا، سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا اور ریحانہ رضی اللہ عنہا یہودی خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ انہیں آزاد کر کے جب آپ ﷺ نے ان سے نکاح کئے تو یہود کی معاندانہ سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ گئیں۔ کیونکہ عرب روایات کے مطابق کسی شخص کا داماد اس شخص کے پورے قبیلے کا داماد سمجھا جاتا تھا۔ اور اس سے لڑنا یا عداوت رکھنا بڑے عار کی بات تھی۔ پھر آپ کی نبوت کا ایک مقصد جاہلانہ رسوم کا قلع قمع بھی تھا۔ سیدہ زینب بنت جحش سے آپ ﷺ نے اسی مقصد کے تحت نکاح کیا تھا۔ پھر ہر خاندان اور ہر عمر کی عورتوں سے نکاح کا ایک اہم مقصد دینی تعلیم بھی تھا۔ شریعت کے احکام کے کئی گوشے ایسے بھی ہیں جو صرف عورتیں ہی عورتوں کو سمجھا سکتی ہیں یا صرف بیویاں ہی اپنے شوہر

دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ
لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵۰﴾ تُرْجِيْ مَنْ تَشَاۗءُ مِنْهُنَّ وَتُـــْٔوِيْٓ
اِلَيْكَ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ وَمَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ وَلَا

ہم جانتے ہیں کہ ہم نے مومنوں پر ان کی بیویوں اور مقبوضہ کنیزوں کے بارے میں کیا فرض[۸۰] کیا ہے۔ (اور آپ کو یہ رعایت اس لئے ہے) کہ آپ پر کوئی تنگی نہ رہے اور اللہ معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے(۵۰) آپ جس بیوی کو چاہیں علیحدہ رکھیں اور جسے چاہیں اپنے پاس رکھیں اور علیحدہ رکھنے کے بعد جسے چاہیں اپنے پاس بلائیں آپ پر کوئی مضائقہ نہیں[۸۱]۔ اس طرح زیادہ توقع ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ غمزدہ

کے اوصاف و خصائل اور ان کی پرائیویٹ زندگی امت کو بتا سکتی ہیں۔ پھر آپ ﷺ کی بیویوں سے چند ایک فقیہ بھی تھیں حتیٰ کہ بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم آپ سے مسائل پوچھنے آتے تھے یہ تھے وہ مقاصد جن کی تکمیل کے لئے اللہ نے آپ ﷺ کے لئے تعدد ازواج پر پابندی نہیں لگائی اور فرما دیا کہ ایسے مقاصد کی تکمیل میں آپ پر تعدد ازواج کی پابندی کہیں تنگی اور رکاوٹ کا سبب نہ بن جائے۔

[۸۰] ❁ آپ پر حق مہر یا نان و نفقہ واجب نہیں تھا:۔ عام مسلمانوں پر اپنی بیویوں کو حق مہر ادا کرنا بھی واجب ہے اور نان و نفقہ کی ادائیگی بھی۔ اگر کوئی عورت اپنا نفس ہبہ کرے تب بھی اس سے حق مہر ساقط نہیں ہو گا۔ اور نبی پر اپنی بیویوں کا نان و نفقہ اس طرح واجب نہیں جس طرح عام مسلمانوں پر ہے۔ بلکہ نبی جو کچھ اور جتنا کچھ اپنی بیویوں کو دے یا دے سکے اس پر انہیں صابر و شاکر رہنا ہو گا جیسا کہ پہلے واقعہ ایلاء میں وضاحت سے گزر چکا ہے۔

[۸۱] ❁ بیویوں کی باری کے سلسلے میں آپ کو خصوصی رعایت:۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو ایک اور رعایت یہ مل گئی کہ آپ ﷺ پر سے اپنی بیویوں کے پاس باری باری رہنے کی پابندی اٹھا لی گئی۔ بالفاظ دیگر آپ ﷺ کی بیویوں کا آپ پر یہ حق ساقط کر دیا گیا کہ فلاں رات آپ باری کے حساب سے فلاں بیوی کے پاس رہیں گے۔ اور اس سقوط حق سے اللہ تعالیٰ کا مقصد نبی اور اس کی بیویوں دونوں پر سے تنگی کو رفع کرنا مقصود تھا۔ نبی کی تنگی کا دور ہونا تو واضح ہے اور بیویوں سے تنگی کا دور ہونا اس لحاظ سے ہے کہ جب انہیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ فلاں باری کے دن نبی کا اس کے ہاں شب بسری کرنا اس کا حق نہیں ہے تو ان کے باہمی تنازعات اور چپقلش از خود ختم ہو جائیں گے کیونکہ تنازعات کی بنیاد ہی حقوق سے تعلق رکھتی ہے۔ پھر جب حق ہی نہ رہا تو تنازعات کیسے؟ لیکن آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دی گئی اس رعایت سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا اور اپنی بیویوں کی باری کو ملحوظ خاطر رکھا جیسا کہ مندرجہ ذیل احادیث سے واضح ہے۔

❁ رعایت کے باوجود آپ نے ہمیشہ باری کو ملحوظ رکھا:۔ (۱) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آپ ﷺ کو ایک بیوی کی باری کے دن دوسری بیوی کے ہاں جانا منظور ہوتا تو آپ باری والی بیوی سے اجازت لیا کرتے تھے۔ معاذہ (راوی) کہتے ہیں کہ اس آیت کے اترنے کے بعد میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: "اگر نبی اکرم ﷺ آپ سے اجازت لیتے

يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَآ اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا (۵۱)
لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاۗءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ

نہ ہوں[۸۲] اور جو کچھ بھی آپ انہیں دیں اسی پر خوش رہیں اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے اللہ جانتا[۸۳] ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور بردبار ہے۔(۵۱) اس (حکم) کے بعد آپ پر دوسری[۸۴] عورتیں حلال نہیں اور نہ ہی یہ جائز ہے کہ آپ ان میں کسی کو تبدیل کریں خواہ ان کا حسن آپ کو کتنا ہی اچھا لگے۔

تو آپ کیا کہتیں؟" تو انہوں نے جواب دیا کہ "میں تو کہتی کہ اگر آپ ﷺ مجھ سے پوچھتے ہیں تو میں تو یہ چاہتی ہوں کہ آپ ﷺ میرے پاس ہی رہیں"۔ (حوالہ ایضا)

(۲) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر پر جانا چاہتے تو اپنی عورتوں پر قرعہ ڈالتے جس عورت کا نام قرعہ میں نکلتا اس کو ساتھ لے جاتے اور ہر عورت کے پاس باری باری ایک ایک دن رات رہتے۔ صرف سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا نے (جو بہت بوڑھی ہو گئی تھیں) اپنا دن رات سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو بخش دیا تھا۔ ان کی غرض یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ خوش ہوں۔ (بخاری۔ کتاب الھبہ۔ باب ھبة المرأة لغير زوجها)

(۳) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آپ ﷺ بیمار ہوئے اور آپ کی بیماری سخت ہو گئی تو آپ ﷺ نے دوسری بیویوں سے بیماری میں میرے گھر رہنے کی اجازت چاہی تو انہوں نے اجازت دے دی۔ (بخاری۔ کتاب الھبۃ۔ باب ھبة الرجل لامرأته والمرأة لزوجها)

[۸۲] یعنی وہ اللہ کے احکام سے خوش ہو جائیں اور باہمی جذبہ رقابت اور مسابقت کی الجھنوں میں پڑنے کی بجائے یکسو ہو کر نبی کے مشن میں اس کا ہاتھ بٹائیں اور جس طرح نبی اپنے کام میں پوری جدوجہد کر رہا ہے مصائب برداشت کر رہا ہے اور تنگی ترشی سے بے نیاز رہ کر کر رہا ہے۔ اسی طرح وہ بھی قناعت اور ایثار سے کام لیں۔ بلکہ اسلام کی تبلیغ واشاعت کو اپنا مقصدِ حیات قرار دے کر خوشدلی سے سب کام انجام دیں اور یہ سمجھ لیں کہ باری کے حق کا سقوط آپ کی مرضی سے نہیں بلکہ اللہ کے حکم سے ہوا ہے۔

[۸۳] "تمہارے دلوں" کا خطاب ازواج کی طرف بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی اگر تم نے اللہ کے ان احکام کو خوشدلی کے بجائے دل کی گھٹن سے یا کبیدہ خاطر ہو کر کیا ہے تو اللہ اسے بھی جانتا ہے اور اس پر گرفت ہو گی اور اگر اس لفظ کا خطاب عام لوگوں کی طرف ہو تو مطلب یہ ہو گا کہ اگر ان حقائق کے بجائے نبی کی ازدواجی زندگی سے متعلق تمہارے دلوں میں کوئی اور بدگمانی پیدا ہو تو وہ بھی اللہ سے چھپی نہ رہے گی۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں ساتھ ہی اپنی صفت حلیم کا ذکر فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کے دل میں کوئی وسوسہ پیدا ہو جسے وہ دل سے نکال دے تو اللہ اس پر گرفت نہیں فرمائے گا۔

[۸۴] اس آیت کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ آپ کو جن چار قسم کی بیویوں سے نکاح کر لینے کی اجازت دی جا چکی ہے ان کے علاوہ دوسری عورتیں آپ پر حلال نہیں بس یہی کافی ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ آپ کی بیویاں اس بات پر آمادہ ہو گئی

إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيبًا ﴿٥٢﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا
بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَن يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَىٰ طَعَامٍ غَيْرَ نَاظِرِينَ إِنَاهُ وَلَٰكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا

البتہ کنیزوں[۸۵] کی آپ کو اجازت ہے اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔(۵۲) اے ایمان والو! نبی کے گھروں[۸۶] میں نہ جایا کرو الا یہ کہ تمہیں اجازت دی جائے اور کھانے کی تیاری کا انتظار[۸۷] نہ کرنے لگو۔ البتہ جب تمہیں (کھانے پر) بلایا جائے تو آؤ

ہیں کہ جو آپ کی طرف سے روکھا سوکھا ملے اس بات پر وہ صابر و شاکر رہیں۔ اور باری کا مطالبہ کر کے بھی آپ کو پریشان نہ کریں نہ اسے وجہ نزاع بنائیں تو اب آپ ﷺ کے لئے بھی یہ جائز نہیں کہ ان صابر و شاکر بیویوں سے کسی کو طلاق دے دیں اور اس کی جگہ کوئی اور لے آئیں۔ خواہ وہ خوبصورت ہی کیوں نہ ہو۔ آپ کو بھی اب انہیں بیویوں پر صابر و شاکر رہنا چاہئے۔

ضمناً اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرد جس عورت سے شادی کرنا چاہے، اسے دیکھنا درست ہے۔ اور احادیث صحیحہ میں اس کی صراحت مذکور ہے۔

[۸۵] ❁ **کنیزوں کی رخصت کا غلط استعمال:۔** یعنی کنیزوں کی تعداد پر شریعت نے کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ کیونکہ ان کا انحصار کسی جنگ میں قیدی عورتوں پر ہوتا ہے۔ اور یہ مستقبل کے حالات ہیں جو کبھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ لیکن اس اجازت کا یہ مطلب بھی نہیں کہ نواب اور امیر کبیر حضرات عیش و عشرت کے لئے جتنی کنیزیں چاہیں خرید خرید کر اپنے گھروں اور محلات کے اندر ڈالتے جائیں یہ اس اجازت کا غلط استعمال ہے۔ آپ ﷺ کی کنیزیں صرف دو تھیں ایک ماریہ قبطیہ جن کے بطن سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے تھے اور دوسری ریحانہ (رضی اللہ عنہما)

[۸۶] ❁ **گھروں میں داخلہ پر پابندی (استیذان):۔** اس آیت میں کئی ایک معاشرتی آداب بیان فرمائے جا رہے ہیں۔ اسی سورہ میں پہلے ازواج النبی کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا کہ عورتوں کا اصل مقام گھر ہے۔ انہیں نہ تو بلا ضرورت گھر سے باہر نکلنا چاہئے اور نہ پہلی جاہلیت کی طرح عورتوں کو بن ٹھن کر باہر نکلنا اور اپنی زیب و زینت کی نمائش کرنا چاہئے اور یہ حکم بس باہر نکلنے تک یا آواز پر پابندی تک موقوف تھا۔ اب بھی لوگ سب گھروں میں حتیٰ کہ خود رسول اللہ ﷺ کے گھروں میں بلا روک ٹوک آتے جاتے تھے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو بالخصوص یہ بات ناگوار تھی کہ نبی ﷺ کے گھر میں ہر طرح کے لوگ بلا روک ٹوک داخل ہوا کریں۔ چنانچہ انہیں کی اس خواہش کے مطابق وحی الٰہی نازل ہوئی جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

سیدنا انس رضی اللہ عنہ بن مالک کہتے ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا: "یا رسول اللہ ﷺ! آپ کے ہاں اچھے اور برے ہر طرح کے لوگ آتے رہتے ہیں۔ کیا اچھا ہو، اگر آپ امہات المؤمنین (اپنی بیویوں) کو پردے کا حکم دیں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے پردے کا حکم نازل فرمایا" (بخاری۔ کتاب التفسیر)

اس کے بعد سورہ نور کی آیات نازل ہوئیں اور آیت نمبر ۲۷ کی رو سے یہ حکم تمام مسلم گھرانوں پر نافذ کر دیا گیا کہ کوئی شخص بھی کسی دوسرے کے گھر میں بلا اجازت داخل نہ ہوا کرے۔

[۸۷] ❁ **آداب دعوتِ طعام:۔** اس جملہ میں مزید دو ہدایات دی گئیں۔ ایک یہ کہ اگر صاحب خانہ خود تمہیں بلائے اور بالخصوص کھانے پر مدعو کرے تو تمہیں اس کے ہاں جانا چاہئے اور اس کا یہ بلانا ہی اس کی اجازت ہے۔ دوسری ہدایت یہ تھی کہ

فَاِذَا طَعِمۡتُمۡ فَانۡتَشِرُوۡا وَلَا مُسۡتَاۡنِسِيۡنَ لِحَدِيۡثٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكُمۡ كَانَ يُؤۡذِى النَّبِىَّ فَيَسۡتَحۡىٖ مِنۡكُمۡ وَاللّٰهُ لَا يَسۡتَحۡىٖ مِنَ الۡحَـقِّ ؕ وَاِذَا سَاَلۡتُمُوۡهُنَّ مَتَاعًا فَسۡـَٔلُوۡهُنَّ مِنۡ وَّرَآءِ

اور جب کھا چکو تو چلے جاؤ اور باتوں[۸۸] میں دل لگائے وہیں نہ بیٹھے رہو۔ تمہاری یہ بات نبی کے لئے تکلیف دہ تھی مگر تم سے شرم کی وجہ سے کچھ نہ کہتے تھے اور اللہ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا اور جب تمہیں ازواج نبی سے کوئی چیز[۸۹] مانگنا ہو تو پردہ کے پیچھے رہ کر مانگو۔

جس وقت بلایا جائے اسی وقت آؤ پہلے نہ آؤ۔ ایسا نہ ہونا چاہئے کہ پہلے آکر دعوت پکنے والے اور کھانے والے برتنوں کی طرف دیکھتے رہو کہ کب کھانا پکتا ہے اور ہمیں کھانے کو ملتا ہے یہ بات بھی صاحب خانہ کے لئے پریشانی کا باعث بن جاتی ہے۔

[۸۸] اس ضمن میں چوتھی ہدایت یہ ہے کہ جب کھانا کھا چکو تو وہیں دھرنا مار کر بیٹھ نہ جاؤ اور ادھر ادھر کے حالات اور قصے کہانیاں شروع کر دو۔ بلکہ کھانا کھا چکو تو چلتے بنو۔ اور صاحب خانہ کے لئے انتظار اور پریشانی کا باعث نہ بنو۔ کیونکہ دعوت کے بعد انہیں بھی کئی طرح کے کام ہوتے ہیں۔

[۸۹] آیہ حجاب:۔ یہی وہ آیت ہے جسے آیہ حجاب کہتے ہیں۔ حجاب کے معنی کسی کپڑا یا کسی دوسری چیز سے دو چیزوں کے درمیان ایسی روک بنا دینا ہے جس سے دونوں چیزیں ایک دوسرے سے اوجھل ہو جائیں۔ اس آیت کی رو سے تمام ازواج النبی کے گھروں کے باہر پردہ لٹکا دیا گیا۔ پھر دوسرے مسلمانوں نے بھی اپنے گھروں کے سامنے پردے لٹکا لیے اور یہ دستور اسلامی طرز معاشرت کا ایک حصہ بن گیا۔ اب اگر کسی شخص کو ازواج مطہرات سے کوئی بات پوچھنا یا کوئی ضرورت کی چیز مانگنے کی ضرورت ہوتی تو اسے حکم ہوا کہ پردہ سے باہر رہ کر سوال کرے۔ اب اس آیت کا شان نزول سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

ولیمہ کی دعوت کھانے کے بعد بیٹھ رہنے والے تین شخص:۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب آپ ﷺ نے زینب بنت جحش سے نکاح کیا اور صحبت کی تو (ولیمہ میں) گوشت روٹی تیار کیا گیا مجھے لوگوں کو بلانے کے لئے بھیجا گیا۔ لوگ آتے جاتے، کھانا کھاتے اور چلے جاتے، پھر اور لوگ آتے وہ بھی کھانا کھا کر چلے جاتے۔ میں نے سب کو بلایا حتیٰ کہ کوئی شخص ایسا نہ رہ گیا جسے میں نے بلایا نہ ہو۔ آپ ﷺ نے مجھے فرمایا: اچھا اب کھانا اٹھاؤ (لوگ چلے گئے مگر) تین شخص بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ آپ ﷺ گھر سے اٹھ کر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے کمرہ کی طرف گئے اور فرمایا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: وعلیک السلام ورحمۃ اللہ! آپ ﷺ نے بیوی کو کیسا پایا، اللہ آپ ﷺ کو برکت دے" پھر آپ ﷺ نے سب بیویوں کے کمروں کا دورہ کیا اور سب کو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرح سلام کیا اور انہوں نے بھی ویسا ہی جواب دیا۔ پھر آپ ﷺ لوٹ کر گھر آئے تو وہ تین آدمی ابھی تک بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ آپ ﷺ کے مزاج میں بڑی شرم تھی (لہٰذا انہیں کچھ نہ کہا) اس لئے پھر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے کمرہ کی طرف چلے گئے۔ پھر کسی نے آپ ﷺ کو اطلاع دی کہ اب وہ تینوں آدمی چلے گئے۔ چنانچہ آپ ﷺ واپس آئے اور دروازے کی چوکھٹ میں آپ ﷺ کا ایک پاؤں اندر تھا اور دوسرا باہر کہ آپ نے میرے اور اپنے درمیان پردہ لٹکا لیا اس وقت اللہ تعالیٰ نے پردے کی آیت اتاری۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ؕ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا

اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا ﴿۵۳﴾ اِنْ تُبْدُوْا شَيْــًٔا اَوْ تُخْفُوْهُ

فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۵۴﴾ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَآئِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآئِهِنَّ وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ

وَلَآ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ وَاتَّقِيْنَ

یہ بات تمہارے دلوں کے لئے بھی پاکیزہ تر ہے اور ان کے دلوں[۹۰] کے لئے بھی۔ تمہارے لئے یہ جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول[۹۱] کو ایذا دو اور نہ یہ جائز ہے کہ اس (کی وفات) کے بعد کبھی اس کی بیویوں[۹۲] سے نکاح کرو۔ بلاشبہ اللہ کے ہاں یہ بڑے گناہ کی بات ہے۔(۵۳) تم کوئی بات ظاہر کرو یا اسے چھپاؤ[۹۳]، اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔(۵۴) ان (ازواج نبی) پر کچھ گناہ نہیں اگر ان کے باپ، ان کے بیٹے، ان کے بھائی' ان کے بھتیجے، ان کے بھانجے، ان کی میل جول کی عورتیں[۹۴] اور ان کے لونڈی غلام، ان کے گھروں میں داخل ہوں۔

[۹۰] مرد اور عورت کے آزادانہ اختلاط کی روک تھام اور پردہ کا حکم:۔ مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط اور فحاشی کی روک تھام کے لئے یہ ایک موثر اقدام ہے کہ کوئی غیر مرد کسی اجنبی عورت کو نہ دیکھے اور نہ ہی کسی کے دل میں کوئی وسوسہ یا برا خیال پیدا ہو۔ گویا معاشرہ سے بے حیائی اور فحاشی کے خاتمہ کے لئے پردہ نہایت ضروری چیز ہے۔ اب جو لوگ مسلمان ہونے کے باوجود یہ کہتے ہیں کہ اصل پردہ دل کا پردہ ہے کیونکہ شرم وحیا کا اور برے خیالات کا تعلق دل سے ہے یہ ظاہری پردہ کچھ ضروری نہیں۔ ایسے لوگ دراصل اللہ کے احکام کا مذاق اڑاتے ہیں۔

[۹۱] جس بات سے اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچے وہ ناجائز ہے:۔ ربط مضمون کے لحاظ سے تو اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو کھانا کھانے کے بعد وہاں سے ہلنے کا نام تک نہ لیتے تھے۔ ان کی اس حرکت کو رسول اللہ ﷺ نے بہت ناگوار اور تکلیف دہ محسوس کیا مگر شرم اور نرمی طبع کی بنا پر انہیں اٹھ کر چلے جانے کو نہ کہہ سکے۔ تاہم یہ حکم عام ہے اور اس کا میدان بڑا وسیع ہے۔ اس میں وہ الزام تراشیاں بھی شامل ہیں جو اس زمانے میں کافروں کے ساتھ منافق بھی رسول اللہ ﷺ پر کر رہے تھے نیز ہر وہ بات بھی جسے رسول اللہ ﷺ ناگوار محسوس کریں اس سے مسلمانوں کو اجتناب ضروری ہے مثلاً کوئی شخص اللہ کے رسول کے مقابلہ میں دوسرے کی بات مانے یا سنت رسول کے مقابلہ میں کسی دوسرے کے قول کو ترجیح دے یا آپ ﷺ کی سنت چھوڑ کر بدعات کو رائج کرے یا فروغ دے تو ان باتوں سے رسول اللہ ﷺ کو تکلیف ہوتی ہے اور ایسے تمام امور میں مسلمانوں کو محتاط رہنا چاہئے۔

[۹۲] یہ گناہ عظیم اس لحاظ سے ہے کہ ازواج النبی ﷺ مسلمانوں کی مائیں ہیں۔ اور اگر کوئی آدمی ان سے نکاح کرے تو گویا اس نے اپنی ماں سے نکاح کیا۔ پھر جو احترام انہیں اللہ نے بخشا ہے وہ کبھی ملحوظ نہ رکھ سکے گا۔ اور اپنی عاقبت تباہ کرے گا۔

[۹۳] یعنی زبان سے تو کجا، کسی مومن کے دل میں ایسا خیال تک بھی نہ آنا چاہئے۔ کیونکہ اللہ کے سامنے تو ظاہر و باطن اور دل کے خیالات سب کچھ یکساں ہے۔ کوئی بات اس سے چھپی نہیں رہ سکتی۔

[۹۴] کون کون سے رشتہ دار محرم ہیں؟۔ اس آیت میں ان محرم رشتہ داروں کا ذکر ہے۔ جو نبی کے گھر میں آ جا سکتے ہیں

اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿55﴾ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰۗىِٕكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَي النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿56﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ

اور (اے عورتو!) اللہ سے ڈرتی رہو۔ اللہ تعالیٰ یقیناً ہر چیز[۹۵] پر حاضر و ناظر ہے۔(۵۵) اللہ اور اس کے فرشتے نبی (ﷺ) پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی اس پر درود و سلام[۹۶] بھیجا کرو۔(۵۶)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو دکھ پہنچاتے[۹۷] ہیں۔ اللہ نے ان پر دنیا میں بھی لعنت فرمائی اور آخرت

اور ان سے پردہ کی ضرورت نہیں۔ یا لونڈی غلام وغیرہ اور ان کی تفصیل پہلے سورہ نور کی آیت ۳۱ کے حواشی کے تحت گزر چکی ہے۔ پھر ان میں رضاعی رشتے بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ درج ذیل احادیث سے واضح ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پردہ کا حکم اترنے کے بعد ابو القُعَیس کے بھائی افلح نے (جو میرے رضاعی چچا تھا) مجھ سے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ میں نے جواب دیا کہ میں نبی اکرم ﷺ سے پوچھے بغیر اجازت نہیں دے سکتی۔ کیونکہ افلح کے بھائی ابو القعیس نے تو مجھے دودھ نہیں پلایا تھا بلکہ اس کی بیوی نے پلایا تھا۔ جب آپ ﷺ تشریف لائے تو میں نے عرض کیا: ”یارسول اللہ ﷺ! ابو القعیس کے بھائی افلح نے مجھ سے اندر آنے کی اجازت مانگی تھی تو میں نے اسے کہا کہ جب تک آپ ﷺ سے پوچھ نہ لوں اجازت نہیں دے سکتی“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم نے اپنے چچا کو اجازت کیوں نہ دی؟“ میں نے عرض کیا: ”یارسول اللہ ﷺ! مجھے دودھ مرد نے تو نہیں پلایا وہ تو ابو القعیس کی بیوی نے پلایا تھا“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں۔ اسے اندر آنے کی اجازت دو، وہ تمہارا چچا ہے“ عروہ بن زبیر (سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے) کہتے ہیں کہ اسی لئے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی تھیں کہ ”جتنے رشتے خون کی وجہ سے حرام سمجھتے ہو دودھ کی وجہ سے بھی وہ حرام ہیں“ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

[۹۵] یعنی اللہ یہ چیز دیکھ رہا ہے کہ جو احکام تمہیں پردہ سے متعلق دیئے جا رہے ہیں۔ اللہ سے ڈر کر ان پر کس قدر عمل پیرا ہوتی ہو۔

[۹۶] اس زمانہ میں کفار اور منافقین آپ پر طرح طرح کی الزام تراشیاں کر کے آپ ﷺ کو بدنام کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ خود اپنے نبی پر رحمتوں کی بارش کر رہا ہے۔ فرشتے بھی اس کے حق میں دعائے رحمت و برکت کرتے ہیں۔ تو پھر ان لوگوں کے بے ہودہ بکواس سے کیا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ساتھ ہی مومنوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اس نبی پر بکثرت درود یا دعائے رحمت و مغفرت اور سلامتی کی دعا کیا کرو۔ وہ الزام تراشیاں تو وقتی اور عارضی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایسا طریقہ بتا دیا کہ تاقیامت آپ ﷺ پر سلامتی اور رحمت و مغفرت کی دعائیں مانگی جایا کریں۔ اور ہمیشہ آپ ﷺ کا ذکر بلند رہا کرے۔ اس سلسلہ میں درج ذیل دو احادیث بھی ملاحظہ فرمالیجئے:

۞ آپ پر درود و سلام کیوں ضروری ہے؟ ۱۔ ابو العالیہ نے کہا کہ اللہ کی صلوٰۃ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں میں آپ ﷺ کی تعریف کرتا ہے اور فرشتوں کی صلوٰۃ سے دعا مراد ہے۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یصلون کا معنی یہ ہے کہ برکت کی دعا کرتے ہیں۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ عنوان باب)

۲۔ سیدنا کعب رضی اللہ عنہ بن عجرہ کہتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ سے پوچھا: ”یارسول اللہ ﷺ! آپ پر سلام کرنا تو ہم کو

معلوم ہو گیا ہے۔ آپ ﷺ پر درود کیسے بھیجیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا: یوں کہو: (اللھم صل علیٰ محمد وعلیٰ آل محمد کما صلیت علیٰ ابراھیم انك حمید مجید۔ اللھم بارك علیٰ محمد وعلیٰ آل محمد کما بارکت علیٰ ابراھیم انك حمید مجید) اور یزید بن ہاد کی روایت میں علی ابراھیم کے بعد دونوں جگہ علیٰ آل ابراھیم کے الفاظ بھی ہیں۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

درود و سلام کی اصل بنیاد یہ ہے کہ ہر مومن کو رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے ہی ایمان کی نعمت نصیب ہوئی۔ اور ایمان اتنی بڑی نعمت ہے کہ دین و دنیا کی کوئی نعمت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور اس نعمت کا احسان مومن کبھی اتار نہیں سکتے۔ تاہم ایمانداروں کو اتنا ضرور کرنا چاہئے کہ وہ اپنے اس محسنِ اعظم کی محبت سے سرشار ہوں اور اس کے حق میں دعائے رحمت و برکت اور مغفرت کیا کریں۔ اس سے ان کے اپنے بھی درجات بلند ہوں گے اور ہر دفعہ درود پڑھنے کے عوض اللہ ان پر دس گناہ درود یا اپنی رحمتیں نازل فرمائے گا۔ (مسلم۔ کتاب الصلوٰۃ۔ باب الصلوٰۃ علی النبی ﷺ بعد التشهد)

❁ **سلموا تسلیما کے دو مطلب:۔** سلموا تسلیما کے بھی دو معنے ہیں۔ ایک تو درج بالا حدیث سے واضح ہے کہ اس کے لئے سلامتی کی دعا کیا کریں۔ اور اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ دل و جان سے اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیں۔ جیسا کہ سورہ نساء کی آیت نمبر ۶۵ میں ان الفاظ کے یہی معنی مراد ہیں۔

❁ **صلوٰۃ و سلام کے فضائل:۔** درود و سلام پڑھنے کے فضائل میں اب چند مزید احادیث ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص ایک بار مجھ پر درود بھیجے گا تو اللہ اس پر دس رحمتیں بھیجے گا۔ اس کے دس گناہ معاف کئے جائیں گے اور دس درجے بلند کئے جائیں گے۔ (حوالہ ایضاً)

۲۔ سیدنا ابی رضی اللہ عنہ بن کعب فرماتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں آپ پر بکثرت درود بھیجتا ہوں۔ میں اپنی دعا کا کتنا حصہ درود کے لئے مقرر کروں؟ فرمایا: جتنا تو چاہے" میں نے کہا: ایک چوتھائی؟ فرمایا "جتنا تو چاہے اور اگر زیادہ کرے تو تیرے حق میں بہتر ہے" میں نے کہا: آدھا حصہ؟ فرمایا: "جتنا تو چاہے اور اگر زیادہ کر لے تو تیرے حق میں بہتر ہے" پھر میں نے پوچھا: "دو تہائی؟" فرمایا: "جتنا تو چاہے اور اگر زیادہ کرے تو تیرے لئے بہتر ہے" پھر میں نے کہا: میں اپنے دعا کا سارا وقت آپ پر درود کے لئے مقرر کر لیتا ہوں۔ فرمایا: "اب تو اپنے غم سے کفایت کیا جائے گا اور تیرے گناہ تجھ سے دور کر دیئے جائیں گے" (ترمذی۔ بحوالہ مشکوٰۃ۔ کتاب الصلوٰۃ۔ باب الصلوٰۃ عن النبی ﷺ فصل ثانی)

۳۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب تک تو اپنے نبی پر درود نہ بھیجے دعا زمین و آسمان کے درمیان موقوف رہتی ہے اور اوپر نہیں چڑھتی۔ (ترمذی۔ بحوالہ مشکوٰۃ۔ باب الصلوٰۃ علی النبی۔ فصل ثانی)

۴۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "وہ شخص بڑا بخیل ہے جس کے پاس میرا ذکر ہوا پھر اس نے مجھ پر درود نہ بھیجا" (ترمذی۔ بحوالہ مشکوٰۃ ایضاً)

[۹۷] ❁ **اللہ اور اس کے رسول کو ایذا کی صورتیں:۔** اللہ کو دکھ پہنچانے کی کئی صورتیں ہیں۔ پہلی صورت شرک ہے کہ اس کی ذات اور صفات میں دوسروں کو شریک بنالیا جائے چنانچہ ایک حدیث قدسی کے مطابق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آدم کا بیٹا مجھے

فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿٥٧﴾ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا
اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ﴿٥٨﴾ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ ع
الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَن يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ

میں بھی اور ان کے لئے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے (۵۷) اور جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو ان کے کسی قصور کے بغیر دکھ پہنچاتے ہیں تو انہوں [۹۸] نے بہتان اور صریح گناہ کا بار اٹھا لیا۔ (۵۸)

اے نبی! اپنی بیویوں، اپنی بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی چادروں کے پلو اپنے اوپر [۹۹] لٹکا لیا کریں۔ اس طرح زیادہ توقع ہے کہ وہ پہچان لی جائیں اور انہیں ستایا نہ جائے اور اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ (۵۹)

سخت دکھ پہنچاتا ہے۔ جب کہتا کہ اللہ کی اولاد ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دین اسلام کے خلاف معاندانہ سرگرمیوں میں حصہ لینے والے سب لوگ فی الحقیقت اللہ اور اس کے رسول دونوں کو دکھ پہنچاتے ہیں۔ اور تیسری صورت یہ ہے کہ جو رسول اللہ ﷺ کو الزام تراشیوں اور طعن و تشنیع سے دکھ پہنچاتے ہیں۔ اور ایسے مواقع رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بکثرت آتے رہے۔ وہ لوگ حقیقتاً اللہ ہی کو دکھ پہنچاتے ہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی ذات اللہ کی طرف سے مامور ہے اسی لحاظ سے رسول کی اطاعت ہی فی الحقیقت اللہ کی اطاعت ہے (۴: ۸۰) اسی طرح اللہ کے رسول کی نافرمانی فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔ اسی طرح اللہ کے رسول کو ستانا اور تکلیف پہنچانا فی الحقیقت اللہ کو دکھ پہنچانا ہے۔ پھر آخر اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ذلت و رسوائی کا عذاب کیوں نہ دے گا۔

[۹۸] جب مسلمان عورتیں رات کو رفع حاجت کیلئے باہر نکلتیں تو کچھ اوباش لونڈے اور منافق ان سے بے ہودہ قسم کی گفتگو اور چھیڑ چھاڑ کرتے اور جب ان سے باز پرس کی جاتی تو کہہ دیتے کہ ہم سمجھے یہ لونڈیاں ہیں۔ پھر کچھ منافق ایسے بھی تھے جو رسول اللہ ﷺ کی پیٹھ پیچھے بدگوئی کرتے اور ازواج مطہرات پر بے ہودہ قسم کے الزام تراشتے یہ سب قسم کے لوگ تہمت تراش اور بدترین قسم کے مجرم ہیں۔

[۹۹] اس حکم کے ذریعہ اوباش منافقوں کی چھیڑ چھاڑ کا سد باب کر دیا گیا۔ نبی کی بیویوں، بیٹیوں اور سب مسلمان عورتوں کو حکم دیا گیا کہ بڑی چادریں اپنے سر کے اوپر سے نیچے لٹکا لیا کریں۔ اس سے بآسانی معلوم ہو سکے گا کہ یہ لونڈیاں نہیں بلکہ شریف زادیاں ہیں۔ لہٰذا منافق انہیں چھیڑ چھاڑ کی جرأت نہ کر سکیں گے۔

❁ بنات النبی ﷺ:۔ ضمناً اس سے اس بات کا پتہ لگتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بیٹیاں تین یا تین سے زیادہ تھیں اور حقیقتاً یہ چار تھیں۔ سیدہ زینب، سیدہ رقیہ، سیدہ ام کلثوم اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہن۔ جبکہ شیعہ حضرات آپ ﷺ کی صرف ایک بیٹی (سیدہ فاطمہ) تو تسلیم کرتے ہیں۔ باقی کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔

❁ بڑی چادر اوڑھ کر عورتیں باہر نکلیں:۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ بعض حضرات چہرہ کو پردہ کے حکم سے مستثنیٰ

قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ﴿یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ﴾ کا مطلب چادر لٹکا کر گھونگھٹ نکالنا نہیں بلکہ اس سے مراد چادر کو اپنے جسم کے ارد گرد اچھی طرح لپیٹ لینا ہے جسے پنجابی میں "بکل مارنا" کہتے ہیں۔ اس توجیہ کی تہ میں جو کچھ ہے وہ سب کو معلوم ہے ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یہ توجیہ لغت، عقل اور نقل تینوں لحاظ سے غلط ہے۔ وہ یوں کہ:

۱۔ لغوی لحاظ سے دنٰی یدنی کا مطلب قریب ہونا، جھکنا اور لٹکنا سب کچھ آتا ہے۔ قرآن میں ہے ﴿وَجَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ﴾ (۵۵: ۵۴) یعنی ان دونوں باغوں کے پھل جھک رہے ہیں یا لٹک رہے ہیں اور اَدْنٰی یَدْنِی یعنی قریب کرنا، جھکانا اور لٹکانا اور ادنی الستر بمعنی پردہ لٹکانا ہے (منجد) اب اگر ادنٰی الیهن من جلابیبهن کے الفاظ ہوتے تو پھر ان معانی کی بھی گنجائش نکل سکتی تھی جو یہ حضرات چاہتے ہیں لیکن قرآن میں ادنٰی کا صلہ علٰی سے ہے جو اس کے معنی کو اِرْخَاء یعنی اوپر سے لٹکانے کے معنوں سے مختص کر دیتا ہے۔ اور جب لٹکانا معنی ہو تو اس کا مطلب سر سے نیچے کو لٹکانا ہو گا جس میں چہرہ کا پردہ خود بخود آ جاتا ہے۔

۞ ہاتھوں اور چہرے کا پردہ:۔ ۲۔ اور عقلی لحاظ سے یہ توجیہ اس لئے غلط ہے کہ عورت کا چہرہ ہی وہ چیز ہے جو مرد کے لئے عورت کے تمام بدن سے زیادہ پر کشش ہوتا ہے۔ اگر اسے ہی حجاب سے مستثنٰی قرار دیا جائے تو حجاب کے باقی احکام بے سود ہیں۔ فرض کیجئے آپ اپنی شادی سے پہلے اپنی ہونے والی بیوی کی شکل و صورت دیکھنا چاہتے ہیں۔ اب اگر آپ کو اس لڑکی کا چہرہ نہ دکھایا جائے باقی تمام بدن ہاتھ، پاؤں وغیرہ دکھا دیئے جائیں تو کیا آپ مطمئن ہو جائیں گے؟ اس سوال کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ آپ کو اس لڑکی کا صرف چہرہ دکھا دیا جائے اور باقی بدن نہ دکھایا جائے اس صورت میں آپ پھر بھی بہت حد تک مطمئن نظر آئیں گے۔ پھر جب یہ سب چیزیں روزمرہ کے تجربہ اور مشاہدہ میں آ رہی ہیں تو پھر آخر چہرہ کو احکام حجاب سے کیونکر خارج کیا جا سکتا ہے؟

چنانچہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس تھا۔ ایک شخص آیا اور آپ ﷺ کو خبر دی کہ اس نے ایک انصاری عورت سے عقد کیا ہے۔ آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: کیا تم نے اسے دیکھا بھی ہے؟" وہ کہنے لگا "نہیں" آپ ﷺ نے فرمایا: جا اس کو دیکھ لے اس لئے کہ انصار کی آنکھوں میں کچھ عیب ہوتا ہے" (مسلم۔ کتاب النکاح۔ باب ندب من اراد نکاح امرأۃ الیٰ ان ینظر الیٰ وجهها وکفیها قبل خطبتها)

اس حدیث میں بھی آپ ﷺ نے چہرہ دیکھنے کی ہی ہدایت فرمائی۔

۞ آیت کے غلط معنی اور اس کا جواب:۔ ۳۔ نقلی لحاظ سے بھی یہ توجیہ غلط ہے۔ یہ سورہ احزاب ذیقعد ۵ھ میں نازل ہوئی اور واقعہ افک شوال ۶ھ میں پیش آیا۔ اور واقعہ افک بیان کرتے ہوئے خود سیدہ عائشہ فرماتی ہیں کہ "میں اسی جگہ بیٹھی رہی۔ اتنے میں میری آنکھ لگ گئی۔ ایک شخص صفوان بن معطل سلمی اس مقام پر آئے اور دیکھا کوئی سو رہا ہے۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا کیونکہ حجاب کا حکم اترنے سے پہلے اس نے مجھے دیکھا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ پڑھا تو میری آنکھ کھل گئی تو میں نے اپنا چہرہ اپنی چادر سے ڈھانپ لیا" (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب حدیث الافک۔۔۔۔۔۔)

اب سوال یہ ہے کہ اگر ﴿یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ﴾ کا معنی وہ ہو جو یہ حضرات ہمیں سمجھانا چاہتے ہیں تو کیا (معاذ اللہ) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کا معنی غلط سمجھا تھا؟

غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٥٩﴾ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي

اگر منافق لوگ اور وہ جن کے دلوں میں مرض[۱۰۰] ہے اور مدینہ میں دہشت انگیز افواہیں پھیلانے والے باز نہ آئے تو

[۱۰۰] منافقوں اور یہودیوں کا گٹھ جوڑ واقعات کی روشنی میں:۔ یعنی ایک تو انہیں بد نظری اور شہوت پرستی کا روگ لگا ہوا ہے۔ دوسرے نفاق کا کہ وہ اپنے آپ کو شمار تو مسلمانوں میں کرتے ہیں۔ لیکن ہر معاملہ میں اس کے بدخواہ تنگ کرنے والے انہیں بدنام کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ ان کے ساتھی مدینہ کے یہود ہیں۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے کے ہمراز اور دونوں مسلمانوں کے ایک جیسے دشمن ہیں۔ جو مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے کے لئے مختلف قسم کی سنسنی خیز افواہیں گھڑتے اور پھیلاتے رہتے ہیں۔ مثلاً فلاں مقام پر مسلمانوں نے بڑی مار کھائی اور زک اٹھائی، فلاں مقام پر مسلمانوں کے لئے ایک بڑا بھاری لشکر جمع ہو رہا ہے اور عنقریب مدینہ سے مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

منافقوں اور یہود مدینہ کی مسلمانوں کے خلاف مشترکہ سازباز اور گٹھ جوڑ کی داستان بڑی طویل ہے۔ میں یہاں چند اشارات پر اکتفا کروں گا۔ جب بدر میں اللہ نے مسلمانوں کو فتح عظیم عطا فرمائی تو آپ ﷺ نے دو صحابہ زید بن حارثہ اور عبداللہ بن رواحہ کو خوشخبری دینے کے لئے پہلے مدینہ بھیج دیا تھا۔ دریں اثنا، منافق یہ خبر مشہور کر چکے تھے کہ مسلمانوں کو عبرتناک شکست ہوئی ہے اور محمد ﷺ قتل کر دیئے گئے۔ اس افواہ سے مدینہ کے مسلمان بہت سہمے ہوئے تھے کہ زید بن حارثہ دور سے اونٹنی پر سوار آتے دکھائی دیئے۔ ایک منافق کہنے لگا دیکھو زید بن حارثہ کا اترا ہوا چہرہ صاف بتا رہا ہے کہ مسلمان شکست کھا چکے ہیں پھر جب اصل حالات کا علم ہوا تو مدینہ تکبیر و تہلیل کے نعروں سے گونج اٹھا اور یہی نعرے یہود و منافقین کے قلب و جگر کو چھلنی چھلنی کر رہے تھے۔

قبیلہ بنو قینقاع یہود مدینہ میں سب سے زیادہ امیر اور شرارتی قبیلہ تھا۔ اس نے جنگِ بدر کے فوراً بعد شرارتیں شروع کر دیں تو رسول اللہ ﷺ نے ان کا محاصرہ کر لیا اور یہ بدعہد قوم جلد ہی ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہو گئی۔ آپ ﷺ انہیں قتل کر دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر عبداللہ بن ابی کی پرزور سفارش کی بنا پر اپنی نرمی طبع کی بنا پر یہود کی جان بخشی کر دی اور صرف جلاوطنی پر اکتفا کر لیا۔

جنگِ احد کے موقعہ پر عبداللہ بن ابی منافق نے عین موقعہ پر جس طرح مسلمانوں کا ساتھ چھوڑا تھا وہ واقعہ پہلے تفصیل سے گزر چکا ہے۔ اس وقت بھی منافقوں نے مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے اور مسلمانوں کو شکست سے دوچار کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔

یہود کے دوسرے قبیلہ بنو نضیر نے جب آپ ﷺ پر چکی کا پاٹ گرا کر آپ ﷺ کو ہلاک کرنے کی سازش کی اور آپ ﷺ کو اللہ نے بچا لیا تو آپ ﷺ نے بنو نضیر کو الٹی میٹم دے دیا کہ دس دن کے اندر اندر وہ مدینہ کو خالی کر دیں اور جو کچھ لے جا سکتے ہیں لے جائیں دس دن بعد جو شخص بھی مدینہ میں نظر آیا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ (یہ واقعہ سورہ حشر میں تفصیل سے آئے گا) جب یہود نکلنے کی تیاری کرنے لگے تو عبداللہ بن ابی نے انہیں کہلا بھیجا کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں میرے پاس دو ہزار مسلح آدمی ہیں جو تمہاری حفاظت میں جان دے دیں گے۔ لہٰذا اپنی جگہ پر برقرار رہو اور ڈٹ جاؤ۔ اس پیغام پر اس

الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا ﴿٦٠﴾ مَّلْعُونِينَ ۖ أَيْنَمَا ثُقِفُوا
أُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيلًا ﴿٦١﴾ سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ
اللَّهِ تَبْدِيلًا ﴿٦٢﴾ يَسْأَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ۖ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ اللَّهِ ۚ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ ع ۷

ہم آپ کو ان کے خلاف اٹھا کھڑا [۱۰۱] کریں گے۔ پھر وہ تھوڑی ہی مدت آپ کے پڑوس میں رہ سکیں گے (۶۰) یہ لوگ ملعون ہیں جہاں بھی یہ پائے جائیں انہیں پکڑ کر بری طرح قتل کر دیا [۱۰۲] جائے گا۔ (۶۱) گزشتہ لوگوں میں اللہ کا یہی طریقہ [۱۰۳] جاری رہا ہے اور آپ اللہ کے اس طریقہ میں کوئی تبدیلی نہ پائیں گے۔ (۶۲) لوگ آپ سے قیامت کے متعلق [۱۰۴] پوچھتے ہیں۔ آپ ان سے کہئے کہ "اس کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ اور آپ کو کیا خبر،

قبیلہ کے سردار حیی بن اخطب کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس نے رسول اللہ ﷺ کو پیغام بھجوا دیا کہ ہم یہاں سے نہیں نکلیں گے تم سے جو بن پڑتا ہے کر لو۔ اس چیلنج پر جب مسلمانوں نے یہود کا محاصرہ کر لیا تو نہ رئیس المنافقین خود ان کی مدد کو پہنچا نہ اس کے مردان جنگی۔ وہ بھی ویسا ہی بزدل نکلا جیسا کہ یہود تھے۔ بالآخر بنو نضیر کو جلاوطن کر دیا۔

غزوہ احزاب میں یہود کی عہد شکنی اور منافقوں کے کردار پر تبصرہ اسی سورہ میں گزر چکا ہے۔ اسی عہد شکنی کی سزا دینے کے لئے جنگ احزاب کے فوراً بعد بنو قریظہ کا محاصرہ کر کے ان کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اب بچے کھچے سب یہودی خیبر کی طرف اکٹھے ہو رہے تھے۔

غزوہ بنی مصطلق میں منافقوں نے مسلمانوں کو دو طرح سے شدید نقصان پہنچایا۔ ایک تو عبداللہ بن ابی نے قبائلی عصبیت کو ابھار کر مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی اور دوسرے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگا کر مسلمانوں کے اخلاقی محاذ پر کاری ضرب لگائی اور انہیں کئی طرح کی پریشانیوں سے دوچار کر دیا۔ (ان میں سے پہلا واقعہ تو سورہ منافقون میں آئے گا اور دوسرا سورہ نور میں گذر چکا ہے)

[۱۰۱] اس سے مراد جنگ بنو قریظہ ہے جس کے بعد مدینہ یہودیوں سے مکمل طور پر پاک ہو گیا اور جو یہودی غزوہ بنو قینقاع اور بنو نضیر کے موقعوں پر جلاوطن کئے تھے وہ سب خیبر کی طرف چلے گئے تھے۔

[۱۰۲] اس سے مراد بنو قریظہ کا انجام ہے۔ بنو نضیر کا سردار حیی بن اخطب بھی ان کے ساتھ ہی قتل ہوا تھا جس نے بنو قریظہ کو عہد شکنی پر مجبور کیا تھا۔

[۱۰۳] یعنی اللہ کی سنتِ جاریہ یہی ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کے رسولوں کے خلاف شرارتیں کیں اور فتنے فساد پھیلائے انہیں اسی طرح ذلیل و خوار اور ہلاک کر دیا گیا۔

[۱۰۴] چونکہ قیامت کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں اور اس کا متعین وقت بتانا بھی مصلحتِ الٰہی کے خلاف ہے۔ لہٰذا اس کا وقت معین کسی کو نہیں بتایا گیا اور کافر اور منافق یہ سوال بار بار اس لئے کرتے رہتے تھے کہ انہوں نے مسلمانوں کو زچ کرنے کے لئے ایک شغل بنایا ہوا تھا۔ جس سے ان کی مراد محض پیغمبر اسلام اور دعوتِ اسلام کا مذاق اڑانا اور اضحوکہ بنانا ہوتا تھا اسے وہ

السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ﴿٦٣﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ﴿٦٤﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ لَا
يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿٦٥﴾ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا
الرَّسُوْلَا ﴿٦٦﴾ وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاۗءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴿٦٧﴾ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ
الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴿٦٨﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ ع ۸

شاید وہ قریب ہی آ پہنچی ہو" (۶۳) اللہ تعالیٰ نے یقیناً کافروں پر لعنت کی [۱۰۵] ہے اور ان کے لئے بھڑکتی ہوئی دوزخ تیار رکھی ہے (۶۴) جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور کوئی اپنا حامی یا مددگار نہ پائیں گے۔ (۶۵) جس دن ان کے چہرے آگ میں الٹ پلٹ کئے جائیں گے وہ کہیں گے: "اے کاش! ہم نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی" (۶۶) نیز کہیں گے: "ہمارے پروردگار! ہم نے تو اپنے سرداروں اور بڑوں کا حکم مانا تھا تو انہوں نے ہمیں راہ [۱۰۶] (حق) سے بہکا دیا (۶۷) (لہٰذا) اے پروردگار! ان پر دگنا عذاب کر اور ان پر سخت لعنت کر" (۶۸)

اے ایمان والو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں [۱۰۷] نے موسیٰ کو اذیت پہنچائی تھی۔ پھر اللہ نے موسیٰ کو

محض ایک خالی خولی دھمکی سمجھتے تھے۔

[۱۰۵] یہ اسی لعنت کا اثر ہے کہ بس فضول سے سوالات کئے جاتے ہیں جس سے ان کا مقصد محض شغل اور استہزاء ہوتا ہے اور اس دوزخ کی آگ سے نہیں ڈرتے جو ان کے لئے تیار کی جا چکی ہے۔

[۱۰۶] ❁ سادات اور کبراء سے کون لوگ مراد ہیں؟ ان دو آیات سے چند باتیں مستفاد ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کی راہ سے مراد اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہے۔ دوسری یہ کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت سے برگشتہ کرنے والے حضرات دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک دنیوی سردار، حاکم، رئیس، چودھری وغیرہ جن کا عوام پر اثر ہوتا ہے۔ اور وہ یہ چاہتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے بجائے لوگوں سے اپنی اطاعت کروائیں۔ دوسری قسم کے لوگ علماء اور مشائخ یعنی مذہبی پیشوا ہوتے ہیں۔ ان کے گمراہ کرنے کا انداز دنیوی سرداروں سے بالکل جداگانہ ہوتا ہے۔ وہ لوگوں میں شرکیہ رسوم اور بدعات رائج کرتے، غلط فتوے دیتے، اولیاء اللہ کے تصرف کی دھاک بٹھاتے اور اس طرح کئی طرح کے مفادات حاصل کرتے ہیں۔ مقصد دونوں کا حب مال اور جاہ ہوتا ہے۔ تیسری یہ بات کہ مطیع اور مطاع یعنی گمراہ ہونے والے اور گمراہ کرنے والے سب کے سب جہنمی ہوتے ہیں۔ جب وہ جہنم کا عذاب دیکھ لیں گے تو اپنے جرم میں اور اسی طرح عذاب میں تخفیف کی خاطر اطاعت کرنے والے اپنے بڑوں اور پیشواؤں پر یہ الزام لگائیں گے کہ ہمیں گمراہ کرنے والے تو یہ لوگ تھے۔ لہٰذا اے پروردگار! انہیں دوگنا عذاب کر۔ بالفاظ دیگر ان کی التجا یہ ہوگی کہ ہمارے عذاب میں ان کے مقابلہ میں آدھی تخفیف ہونی چاہئے اور ان دونوں فریقوں کے درمیان مکالمہ پہلے قرآن میں کئی مقامات پر گزر چکا ہے۔

[۱۰۷] اس آیت کی تائید و توثیق درج ذیل حدیث سے بھی ہوتی ہے:

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے (حنین کی جنگ کا) مال غنیمت تقسیم کیا تو ایک شخص کہنے لگا: اس تقسیم سے اللہ کی رضامندی مقصود نہیں ہے۔ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور انہیں یہ بات بتائی۔ آپ ﷺ کے چہرہ مبارک پر غصہ کے اثرات نمودار ہوئے اور فرمایا: اللہ موسیٰ علیہ السلام پر رحم کرے انہیں اس سے بھی زیادہ تکلیف دی گئی لیکن انہوں نے صبر کیا۔ (بخاری۔ کتاب الجهاد باب ماکان النبی ﷺ یعطی المؤلفة قلوبهم وغیرهم من الخمس ونحوه)

اور درج ذیل حدیث اس آیت کی تفسیر پیش کرتی ہے:

۞ بنی اسرائیل کی موسیٰ علیہ السلام کو ایذا رسانی:۔ سیدنا ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: بنی اسرائیل برہنہ غسل کیا کرتے تھے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھا رہتا تھا۔ مگر موسیٰ علیہ السلام تنہا غسل فرمایا کرتے۔ بنی اسرائیل کہنے لگے۔ واللہ موسیٰ کو ہمارے ساتھ غسل کرنے سے بجز اس کے اور کوئی بات مانع نہیں کہ وہ فتق (جلدی بیماری) میں مبتلا ہیں۔ اتفاق سے ایک دن موسیٰ علیہ السلام غسل کرنے لگے تو اپنا لباس ایک پتھر پر رکھ دیا وہ پتھر ان کا لباس لے بھاگا اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام اس کے تعاقب میں یہ کہتے ہوئے دوڑے کہ ثوبی یا حجر۔ ثوبی یا حجر (اے پتھر! میرے کپڑے۔ اے پتھر! میرے کپڑے) یہاں تک بنی اسرائیل نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو (ننگے) دیکھ لیا اور کہنے لگے: واللہ! موسیٰ علیہ السلام کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ (پتھر ٹھہر گیا) موسیٰ علیہ السلام نے اپنا لباس لے لیا اور پتھر کو مارنے لگے۔ ابو ہریرہؓ کہتے ہیں: خدا کی قسم اس پتھر پر چھ یا سات نشان ہیں۔ (بخاری۔ کتاب الغسل۔ باب من اغتسل عریاناً)

اب ظاہر ہے کہ جو لوگ خرق عادت واقعات یا معجزات کے منکر ہیں۔ انہیں یہ تفسیر راس نہیں آسکتی۔ تاہم اس حدیث کے الفاظ میں اتنی گنجائش موجود ہے کہ وہ بھی اسے تسلیم کر لیں وہ یوں کہ حجر کے معنی پتھر بھی ہیں اور گھوڑی بھی۔ (منجد) اس لحاظ سے یہ واقعہ یوں ہوگا کہ موسیٰ علیہ السلام گھوڑی پر سوار تھے۔ کسی تنہائی کے مقام پر نہانے لگے تو گھوڑی کو کھڑا کیا اور اسی پر اپنے کپڑے رکھ دیئے۔ جب نہانے کے بعد کپڑے لینے کے لئے آگے بڑھے تو گھوڑی دوڑ پڑی اور موسیٰ علیہ السلام ثوبی یا حجر کہتے اس کے پیچھے دوڑے تاآنکہ کچھ لوگوں نے آپ کو ننگے بدن دیکھ لیا کہ آپ بالکل بے داغ اور ان کی مزعومہ بیماری سے پاک ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ان لوگوں کے الزام سے بری کر دیا۔ رہی یہ بات کہ سیدنا ابو ہریرہؓ قسم اٹھا کر کہتے ہیں کہ پتھر پر مار کے چھ یا سات نشان ہیں تو یہ سیدنا ابو ہریرہؓ کا اپنا قول ہے۔ ارشادِ نبوی نہیں جس کا ماننا حجت ہو۔

علاوہ ازیں قارون نے بھی ایک فاحشہ عورت کو کچھ دے دلا کر اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر اپنے ساتھ زنا کی تہمت لگا دے۔ پھر جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اسے اللہ کی قسم دے کر پوچھا تو اس پر کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ اس نے صاف انکار کر لیا کہ میں نے قارون کی انگیخت پر یہ تہمت لگائی تھی۔

اور بنی اسرائیل کا موسیٰ علیہ السلام کو اس طرح دکھ پہنچانا اس لحاظ سے اور بھی شدید جرم بن جاتا ہے کہ آپ ہی کے ذریعہ بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات ملی تھی۔ اور ان کی مصر میں وہی حالت تھی جو ہندوستان میں شودروں کی ہے۔ بلکہ اس سے بھی بدتر حالت میں وہاں زندگی گزار رہے تھے۔

اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ؕ وَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ؕ﴿۶۹﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿۷۰﴾ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا

ان کی بنائی ہوئی باتوں سے بری کر دیا اور وہ اللہ کے ہاں بڑی عزت[۱۰۸] والے تھے۔(۶۹)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور بات صاف سیدھی کیا کرو۔(۷۰) (اس طرح) اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال[۱۰۹] کو درست کر دے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔ اور جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول کا کہا مان لیا اس نے بڑی کامیابی حاصل کر لی۔(۷۱)

[۱۰۸] وَجِيْهًا کا دوسرا معنی ایسا آبرو اور رعب والا شخص ہے جس کے متعلق لوگوں کو کچھ اعتراض ہو بھی تو وہ اس کے منہ پر کچھ نہ کہہ سکیں اور ادھر ادھر باتیں کرتے پھریں۔ یہی لفظ اللہ تعالیٰ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے لئے استعمال فرمایا اور کہا ﴿وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ (۳:۴۵) یعنی عیسیٰ دنیا میں بھی وجیہ تھے اور آخرت میں بھی وجیہ ہوں گے۔ چنانچہ دنیا میں یہود ان کی پیدائش سے متعلق الزام لگاتے تھے لیکن منہ پر بات کہنے کی کوئی جرات نہ کرتا تھا۔

اس آیت میں روئے سخن غالباً منافقوں کی طرف ہے جو مسلمانوں میں ملے جلے رہتے تھے۔ ورنہ مخلص مومنوں سے یہ بات ناممکن ہے کہ وہ اپنے محبوب اور محسن اعظم کو دکھ پہنچائیں۔

[۱۰۹] ۞ راست بازی کے فوائد:۔ ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے دین و دنیا میں کامیاب زندگی کا ایک زریں اصول بیان فرما دیا جو کسی انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے اور وہ اصول یہ ہے کہ بات سیدھی اور صاف کہا کرو جس میں جھوٹ نہ ہو۔ کوئی ایچ پیچ اور ہیرا پھیرا بھی نہ ہو۔ کسی کی جانبداری بھی نہ ہو۔ بات جتنی ہی ہو اتنی ہی کرو اس پر حاشیے نہ چڑھاؤ۔ اور اپنی طرف سے کمی بیشی بھی نہ کرو۔ اسی کا دوسرا نام راست بازی ہے۔ راست بازی سے بعض دفعہ اپنی ذات کو، اپنے اقرباء کو اور اپنے دوست احباب کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ سب کچھ برداشت کرو لیکن راست بازی کا دامن نہ چھوڑو۔ اس لئے کہ اس کے نتائج بڑے مفید اور دور رس ہوتے ہیں۔ اس سے انسان کا وقار قائم ہوتا ہے۔ عزت ہوتی ہے، ساکھ بنتی ہے پھر اس ساکھ سے انسان کو بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ یہ تو دنیوی فوائد ہوئے اور روحانی فوائد یہ ہیں کہ اس سے انسان کے اعمال خود بخود درست ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میں شہادتین کا اقرار کرتا ہوں مگر اسلام لانے کی اپنے آپ میں جرأت نہیں پاتا کیونکہ مجھ میں فلاں عیب بھی ہے اور فلاں عیب بھی اور فلاں بھی۔ آپ ﷺ نے اسے فرمایا: ”کیا تم مجھ سے جھوٹ چھوڑنے کا اقرار کرتے ہو؟“ وہ کہنے لگا ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تمہارا اسلام منظور ہے۔ چنانچہ جب بھی وہ کوئی قصور کرنے لگتا تو اسے خیال آتا کہ فلاں آدمی یا اللہ کا رسول مجھ سے پوچھے گا یا قیامت کو اللہ پوچھے گا تو اب میں جھوٹ تو بول نہیں سکتا پھر کیا ہوگا۔ اس خیال سے وہ اس عیب سے باز رہتا۔ آہستہ آہستہ اس کے تمام اعمال درست ہو گئے۔

یہ تو صرف جھوٹ چھوڑنے کی بات تھی جبکہ قول سدید جھوٹ ترک کرنے سے بہت اعلیٰ اخلاقی قدر ہے۔ پھر اس سے انسان کے اعمال کیوں درست نہ ہوں گے۔ اور جب اس کے اعمال درست ہو گئے تو سابقہ گناہ اللہ تعالیٰ خود ہی حسب وعدہ

عَظِيمًا ۝ إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَ
أَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۝٧٢ لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِينَ
وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ

ہم نے اپنی امانت [۱۱۰] آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اٹھا لیا۔ یقیناً وہ بڑا ظالم [۱۱۱] اور جاہل ہے۔(۷۲) (جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا) کہ اللہ منافق مردوں اور عورتوں، اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے۔ اور مومن مردوں اور

معاف فرما دیں گے اور یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ وہ اللہ سے ڈرتا ہو اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا مطیع فرمان ہو۔ اور ایسے شخص کی اخروی زندگی بھی بہر حال بہت کامیاب زندگی ہو گی۔

[۱۱۰] امانت کا بار جو انسان نے اٹھالیا:۔ امانت سے مراد بار خلافت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا تھا کہ "میں دنیا میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں" اللہ تعالیٰ نے آسمان، زمین اور پہاڑوں جیسی عظیم الجثہ مخلوق کو پیدا کر کے ان سے پوچھا: بتاؤ اگر میں تمہیں قوتِ ارادہ و اختیار عطا کر دوں اور تمہیں عقل و تمیز کی قوت بھی بخش دوں تو بتاؤ تم میرا خلیفہ بننے کو تیار ہو؟ تمہیں وہی کام کرنا ہو گا جو میں کہوں تمہیں نافرمانی کے اختیار کے باوجود میرے احکام پر کاربند رہنا اور اسے نافذ کرنا ہو گا تو یہ تینوں قسم کی عظیم الجثہ مخلوق اس بارِ عظیم کو اٹھانے سے ڈر گئی اور اسے تسلیم نہ کیا۔ لیکن ان کے مقابلہ میں ضعیف البنیان مخلوق جو ایک منٹ سانس نہ چلنے سے مر بھی سکتی ہے۔ اس بارِ عظیم کو اٹھانے کے لئے تیار ہو گئی۔ حضرت انسان نے بڑی جرأت سے کہہ دیا کہ مجھے اگر قوت تمیز، عقل و فہم اور ارادہ و اختیار دے دیا جائے تو میں اس بار کو اٹھانے کے لئے تیار ہوں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان سے اس بات پر عہد بھی لیا۔ جو عہدِ الست بربکم کے نام سے مشہور ہے۔

یہ مکالمہ زبان حال سے ہوا تھا یا قال سے؟ یا یہ محض تمثیلی انداز ہے؟ یہ باتیں تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ عہد الست تا قیامت پیدا ہونے والے انسان کی ارواح سے لیا گیا تھا اور اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ انسان میں خلیفہ بننے اور نظام خلافت کو رائج کرنے کی صلاحیت بالقوہ موجود ہے۔

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مکلف مخلوق ایک نہیں بلکہ دو ہیں۔ ایک انسان دوسرے جن لیکن یہاں صرف انسان کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ اس لئے کہ جتنی استعداد اللہ تعالیٰ نے انسان میں رکھی ہے جنوں میں نہیں رکھی۔ اشرف المخلوقات انسان ہے، جن نہیں۔ لہٰذا جن اس مکالمہ میں بالتبع شامل ہیں۔ بالاصل نہیں۔

[۱۱۱] ظَلُوْم اور جھول دونوں ہی مبالغہ کے صیغے ہیں۔ یعنی انسان بڑا ہی ظالم اور بڑا ہی جاہل ہے جو اس نے یہ بار امانت اٹھالیا۔ وہ ظالم تو اس لحاظ سے ہے کہ تمام مخلوق میں سب سے بلند منصب پر فائز ہونے کی خواہش کی وجہ سے اس نے اس ذمہ داری کو قبول تو کر لیا مگر اس دار الامتحان دنیا میں آکر وہ کچھ دنیا کی رنگینیوں اور دلفریبیوں میں اس قدر محو و مستغرق ہو گیا کہ اسے یہ خیال بھی نہیں آتا کہ وہ کتنی بڑی عظیم ذمہ داری اپنے سر پر لادے ہوئے ہے۔ اس طرح جو امانت اس کے سپرد کی گئی تھی اس میں وہ خیانت کا مرتکب ہوا۔ اور جاہل اس لحاظ سے ہے کہ اس کی ساری توجہ اسی بات کی طرف رہی کہ اسے، تمام مخلوق میں

غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۷۳﴾ ع ۹/۶

عورتوں پر مہربانی کرے[۱۱۳] اور اللہ معاف کر دینے والا اور بخشنے والا ہے۔(۷۳)

سے سب سے اونچا اعزاز ملنے والا ہے۔ مگر اس اعزاز کی ذمہ داریوں کا اندازہ کرنے سے قاصر رہا۔ اکثر انسانوں نے یہ جاننے کی کبھی کوشش ہی نہیں کہ اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے سے اس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

[۱۱۳] انسان کو قوتِ ارادہ واختیار دینے کا لازمی نتیجہ یہ نکل سکتا تھا کہ کچھ لوگ اس اختیار کا غلط استعمال کریں اور کچھ صحیح۔ پھر چونکہ انسان ظالم اور جاہل بھی ثابت ہوا۔ لہٰذا اس ارادہ واختیار کا غلط استعمال کرنے والے بہت زیادہ نکلے اور صحیح استعمال کرنے والے ان کے مقابلہ میں بہت کم۔ اور دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ غلط استعمال کرنے والے مشرکوں، کافروں اور منافقوں کو ان کے اعمال کی سزا دی جائے۔ اور جن لوگوں نے اس ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے اپنا طرز زندگی اللہ کی مرضی کے مطابق بنالیا انہیں اس کا اچھا بدلہ بھی دیا جائے۔

۵۴ آیاتھا ۔۔۔ سُوْرَةُ سَبَا مَكِّيَّةٌ ۔۔۔ رکوعھا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِیْمُ
الْخَبِیْرُ ○ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ؕ

کلمات ۸۹۶ ۔۔۔ حروف ۳۶۳۹ ۔۔۔ آیت ۵۴ ۔۔۔ (۳۴) سورہ سبا مکی ہے (۵۸) ۔۔۔ رکوع ۶

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

ہر طرح کی تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہر چیز کا مالک ہے اور آخرت[۱] میں (بھی) تعریف اسی کے لئے ہے اور وہ حکمت والا[۲] اور باخبر ہے(۱) جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے یا اس سے نکلتا ہے نیز جو کچھ آسمان سے اترتا اور جو کچھ آسمان[۳] میں چڑھتا ہے، وہ ہر چیز کو جانتا ہے اور وہ رحم کرنے والا ہے اور معاف[۴] کرنے والا ہے(۲)

[۱] فی الآخرۃ کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ اس دنیا میں اگر کسی انسان کے کارناموں کی تعریف کی جائے تو وہ بالآخر اللہ کی ہی تعریف ہوگی کیونکہ انسان کو ہر طرح کی قوت، صلاحیت اور استعداد عطا کرنے والا اللہ ہی ہے۔ یعنی فی الاخرۃ کا لفظ یہاں بالآخر کا معنی دے رہا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں تو کچھ اسباب ظاہر ہیں جو سب کو دکھائی دیتے یا محسوس ہوتے ہیں لیکن کچھ اسباب ایسے بھی ہیں جن پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ آخرت میں ایسے سب پردے اور حجابات اٹھ جائیں گے اور ہر ایک کو یہ نظر آئے گا کہ قابل تعریف ذات تو صرف اللہ ہی کی ہے۔

[۲] حکیم اس لحاظ سے ہے کہ اس نے کائنات میں جو چیز بھی بنائی ہے وہ ایک نہیں متعدد مقاصد پورے کر رہی ہے پھر کائنات کے نظام کا مربوط اور منظم ہونا بھی اس کی حکمت کی بہت بڑی دلیل ہے اور باخبر اس لحاظ سے ہے وہ کائنات کے ایک ایک کل پرزے کی براہ راست نگرانی کر رہا ہے اور مدت ہائے دراز گزرنے پر بھی کائنات کے کسی کل پرزے کی کبھی کوئی کمی، کوتاہی یا گڑبڑ واقع نہیں ہوتی۔

[۳] ۞ زمین میں داخل ہونے والی 'زمین سے نکلنے والی 'زمین پر اترنے والی اور زمین سے چڑھنے والی اشیاء:۔ زمین میں داخل ہونے والی چیزیں یہ ہیں: ہر قسم کی نباتات کے بیج، بارش کا پانی، تمام جانوروں کے مردہ اجسام۔ اور حشرات الارض وغیرہ اور زمین سے نکلنے والی چیزیں مثلاً کھیتی، پودے، درخت، معدنیات۔ کئی قسم کے تیل اور گیسیں وغیرہ اور آسمان سے اترنے والی چیزیں مثلاً بارش اللہ کی رحمت و برکت، وحی الٰہی، فرشتے وغیرہ اور جو آسمان کی طرف چڑھنے والی چیزیں مثلاً دعا، فرشتے، انسانوں کے اعمال وغیرہ ان سب انواع اور ان کی جزئیات سب کچھ اللہ کے علم میں ہے۔

[۴] یعنی انسانوں کی بداعمالیوں پر انہیں فوراً سزا نہیں دے ڈالتا۔ یہ اس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ انسانوں کو سنبھلنے کی مہلت

وَهُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ ﴿۲﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ

الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ

اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳﴾ لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ

كَرِيْمٌ ﴿۴﴾ وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ﴿۵﴾ وَيَرَى

کافر کہتے ہیں کہ "ہم پر قیامت نہیں آئے گی" آپ ان سے کہئے کہ: "کیوں نہیں آئے گی، میرے پروردگار کی قسم! وہ تم پر آکے رہے گی۔ (اس پروردگار کی قسم) جو غیب[۵] کا جاننے والا ہے۔ اس سے آسمانوں اور زمین میں کوئی ذرہ بھر چیز بھی چھپی نہیں رہ سکتی۔ اور ذرہ سے چھوٹی یا بڑی کوئی چیز ایسی[۶] نہیں جو واضح کتاب میں درج نہ ہو۔(۳) (اور قیامت اس لئے آئے گی) تاکہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جزا دے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے ایسے لوگوں کے لئے بخشش[۷] اور عزت و اکرام کی روزی ہوگی۔(۴) اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو نیچا[۸] دکھانے (تردید کرنے) پر زور لگایا ان کے لئے بدترین قسم کا دردناک عذاب ہے۔(۵)

دیتا ہے اور جو سنبھل جائے تو اس کی سابقہ لغزشیں معاف بھی کر دیتا ہے۔

[۵] جس دعویٰ پر کوئی ظاہری دلیل موجود نہ ہو یا مخاطب اسے تسلیم کرنے سے منکر ہو تو اللہ کی قسم سے اپنے دعویٰ کو موکد کیا جاتا ہے۔ یہاں قسم کھانے والی وہ ہستی ہے جسے کفار مکہ صادق اور امین سمجھتے تھے اولاً تو انہیں اس بات یاد دعویٰ پر یقین کر لینا چاہئے تھا کیونکہ وہ صادق اور امین ہے ثانیاً وہ اللہ کی قسم اٹھا کر اپنے دعویٰ کو موکد بنا رہا ہے۔ اور ضمناً اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قیامت کا علم صرف اسے ہو سکتا ہے جو عالم الغیب ہو اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

[۶] یعنی کائنات کی ہر چھوٹی بڑی، خفیہ اور علانیہ غرض ہر چیز سے اللہ تعالیٰ واقف ہی نہیں بلکہ کائنات میں کوئی بھی چھوٹا یا بڑا پیش آنے والا واقعہ یا حادثہ اس کے پاس پہلے سے لکھا ہوا ہے۔ پھر جب ایسی ذات قیامت کے واقع ہونے کی خبر دے رہی ہے تو پھر اس میں کیا شک و شبہ ہو سکتا ہے؟

[۷] یہ قیامت یا اُخروی زندگی پر عقلی دلیل ہے۔ اس دنیا میں بے شمار ایسے افراد موجود ہیں جنہوں نے ایمان لا کر راہ حق میں بے شمار جانی اور مالی قربانیاں دیں اور تمام عمر فقر و فاقہ پریشانیوں اور کفار کے ہاتھوں ظلم و ستم سہنے میں گزارا۔ کیا یہ انصاف کا تقاضا نہیں کہ انہیں ان کے اعمال کی جزا دی جائے؟ اور دکھوں کے بدلے انہیں انعامات سے نوازا جائے؟ لہٰذا ضروری ہے کہ اللہ انسانوں کو ایک دوسری زندگی عطا فرمائے جس میں ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ دیا جائے۔

[۸] یعنی ایسی سازشوں اور کوششوں میں اپنی ساری عمر گزار دی کہ کہیں اسلام کو غلبہ اور سربلندی حاصل نہ ہو جائے۔ یا اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے عقیدہ آخرت کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ اللہ کی گرفت سے بچ نہیں سکتے اور انہیں ان کے ناپاک ارادوں کے عوض عذاب بھی اسی قسم کا دیا جائے گا۔

سابقہ آیات میں ایمانداروں کے لئے رزق کریم اور مغفرت دونوں کا ذکر فرمایا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصائب و مشکلات اور فقر و فاقہ میں زندگی گزارنے والے مومنوں کو عزت کی روزی بھی ملے گی اور مغفرت بھی ہوگی اور جن

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ وَيَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ
الْحَمِيْدِ ﴿٦﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ
مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿٧﴾ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلِ الَّذِيْنَ لَا

اور جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے وہ خوب سمجھتے ہیں کہ جو کچھ آپ کی طرف آپ کے پروردگار سے نازل ہوا وہ حق ہے اور اس اللہ کی راہ دکھاتا ہے جو غالب اور حمد وثنا کے لائق ہے(۶) اور کافر (ایک دوسرے سے) کہتے ہیں: "کیا ہم تمہیں ایسا آدمی نہ بتائیں جو یہ خبر دیتا ہے کہ جب تم (مرنے کے بعد) بالکل ریزہ ریزہ[9] ہو جاؤ گے تو از سر نو پیدا کئے جاؤ گے(۷) معلوم نہیں کہ وہ اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے یا اسے جنون لاحق ہو گیا[10] ہے؟" یہ بات نہیں[11] بلکہ جو لوگ

ایمانداروں کو ابتلا کا دور دیکھنا ہی نہیں پڑا ان کی بھی مغفرت ضرور ہو جائے گی۔ اسی طرح جن کافروں کا جرم صرف کفر تک ہی محدود رہا اور انہوں نے مخالفانہ اور معاندانہ سرگرمیوں اور سازشوں میں حصہ نہیں لیا انہیں صرف جہنم کا عذاب ہو گا جو ناپاک قسم کا اور ذلیل وخوار کرنے والا نہ ہو گا۔

[9] یعنی اہل علم ودانش لوگ اللہ کی آیات، عقیدہ آخرت، انسانوں کی دوبارہ زندگی 'اللہ کے حضور جواب دہی کا تصور اور اچھے اور برے اعمال کا بدلہ ملنے پر اس طرح یقین رکھتے ہیں جیسے وہ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ کفار اللہ کی آیات کا مذاق اڑانے سے ضدی، ہٹ دھرم اور جاہل قسم کے لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کر سکتے ہیں مگر اہل علم ان کے فریب میں نہیں آسکتے۔

[10] کفار مکہ کا مسلمانوں سے تین باتوں میں عقائد کا اختلاف:۔ کفار مکہ آپ کو جھوٹا نہیں کہہ سکتے تھے۔ کیونکہ یہ بات ان کے زندگی بھر کے تجربہ کے خلاف تھی۔ لیکن وہ آپ کی دعوت کو بھی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوت میں تین باتیں تھیں جو انہیں ناگوار تھیں یا جن پر وہ ایمان نہیں رکھتے تھے۔ (۱) وہ اس زمین وآسمان یا کائنات کے فنا ہونے کا یقین نہیں رکھتے تھے۔ بالفاظ دیگر وہ قیامت کے قائم ہونے کے قائل نہیں تھے۔ (۲) وہ بعث بعد الموت کے بھی قائل نہیں تھے۔ یعنی جب انسان مر کر مٹی میں مل کر مٹی بن جائے تو اس کا دوبارہ جی اٹھنا ان کے خیال کے مطابق ناممکنات سے تھا۔ اور (۳) اسی کے نتیجہ میں وہ آخرت کے ثواب وعذاب کے بھی قائل نہیں تھے۔ لہٰذا وہ اپنی دنیوی زندگی میں احکام الٰہی کا پابند بن جانے کے بجائے آزاد رہنا ہی پسند کرتے تھے۔ جب بھی ان لوگوں نے مذاق اڑایا تو انہیں باتوں کا اور ان میں سے بھی پہلی دو باتیں تو وہ اکثر مختلف پیرایوں میں دہراتے رہتے تھے۔ اس آیت میں ان کے سوال کا انداز تمسخر کا ہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس نبی کی یہ دعوت دو حالتوں سے خالی نہیں ہو سکتی۔ یا تو وہ اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے یا پھر اس کی عقل جواب دے گئی ہے۔

[11] ولید بن مغیرہ کے ہاں مجلس مشاورت:۔ وہ خود بھی اپنے ان دونوں احتمالات کو درست نہیں سمجھتے تھے اور سرداران قریش اپنی نجی گفتگو میں خود بھی ان احتمالات پر مطمئن نہ ہو سکے۔ نہ ایک دوسرے کو مطمئن کر سکے تھے۔ آپ کے صادق ہونے کا تقاضا یہ تھا کہ جو شخص لوگوں سے جھوٹ نہیں بولتا وہ اللہ کے بارے میں کیسے جھوٹ بول سکتا ہے؟ اور دیوانگی کی بات تو اور بھی زیادہ مہمل تھی۔ یہی سرداران قریش جب ولید بن مغیرہ کے ہاں اکٹھے ہوئے تو زیر بحث یہی موضوع تھا کہ ہم اس نبی کی دعوت کو کیسے روک سکتے ہیں اور لوگوں کو اس کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں تو ایک سردار نے یہ کہا تھا کہ ہم دوسروں سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دیوانہ ہے۔ تو ولید بن مغیرہ رئیس قریش نے کہا تھا: "اللہ کی قسم! وہ دیوانہ بھی نہیں، ہم نے دیوانوں کو

يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلَالِ الْبَعِيدِ ﴿٨﴾ أَفَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۚ إِن نَّشَأْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْأَرْضَ أَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَاءِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ ﴿٩﴾ وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُودَ مِنَّا فَضْلًا ۖ يَا جِبَالُ أَوِّبِي مَعَهُ

ع ۹/۱

آخرت پر ایمان نہیں لاتے وہی عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں اور گمراہی میں دور تک چلے گئے ہیں۔(۸)

کیا انہوں نے آسمان اور زمین کو نہیں دیکھا جو انہیں آگے سے اور پیچھے سے (گھیرے ہوئے ہیں) اگر ہم چاہیں تو انہیں زمین میں دھنسا دیں یا ان پر آسمان کے کچھ ٹکڑے گرا دیں[۱۲]۔ بلاشبہ اس بات میں ہر رجوع کرنے والے بندے کے لئے ایک نشانی[۱۳] ہے۔(۹)

اور ہم نے داؤد کو اپنے ہاں سے بزرگی[۱۴] عطا کی تھی (اور پہاڑوں کو حکم دیا تھا کہ) اے پہاڑو! داؤد[۱۵] کے ساتھ

دیکھا ہے اس کے اندر دیوانوں جیسی دم گھٹنے کی کیفیت ہے، نہ الٹی سیدھی حرکتیں ہیں اور نہ ان جیسی بہکی بہکی باتیں ہیں" ولید بن مغیرہ کا یہ جواب بھی صرف سلبی انداز سے دیوانگی کی تردید تھا کیونکہ وہ بھی آپ ﷺ کا دشمن تھا۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ آپ کے دوسرے لوگوں سے معاملات اور آپ کی بلندی کردار اور معقول مدلل گفتگو سے کوئی ناواقف آدمی آپ کے عظیم انسان ہونے کا بآسانی اندازہ لگا سکتا تھا۔ دیوانگی کا تصور تو بڑی دور کی بات تھی۔ اللہ تعالیٰ نے کافروں کی تینوں باتوں میں سے بالخصوص تیسری بات کو انکار کی اصل وجہ قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ روزِ آخرت کا انکار اس بنا پر نہیں کرتے کہ انہیں آخرت کے دلائل کی سمجھ نہیں آرہی یا نہیں آسکتی۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ آخرت کی بازپرس سے ڈرتے ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ بس کبوتر کے آنکھیں بند کرنے سے بلی ازخود غائب ہو جائے گی۔ انہوں نے خود ہی اپنی آنکھیں حقائق کو دیکھنے اور ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنے سے بند کر رکھی ہیں۔ اور اسی طریق کار سے مسلسل آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔

[۱۲] وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اس زمین و آسمان کو پیدا کرنے والا اور اس کائنات کا انتظام چلانے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اور یہی زمین و آسمان انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اس کی حدود سے وہ باہر نہیں جا سکتے۔ زمین کا مالک اللہ ہے وہ زمین کو حکم دے کر انہیں پکڑ لے یا اندر جذب کر لے تو زمین کی مجال نہیں کہ وہ اللہ کے حکم سے سرتابی کرے۔ آسمان سے بھی وہ ان پر عذاب نازل کر سکتا ہے اور زمین کے نیچے سے بھی۔ پھر آخر یہ کس برتے پر اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت پر تلے بیٹھے ہیں۔

[۱۳] نظامِ کائنات میں صرف ایک نشانی نہیں بے شمار نشانیاں ہیں۔ مگر یہ نشانیاں ہر ایک کے لئے نہیں بلکہ صرف اس شخص کے لئے جو عقل و انصاف اور سوچ سمجھ سے کام لے کر اس کائنات کے خالق کی طرف جھکتے اور رجوع ہوتے ہیں۔ وہ اس مربوط اور منظم نظام کائنات کو دیکھ کر فوراً اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ کسی حکیم و خبیر ہستی کا قائم کردہ نظام ہے۔ اور چونکہ اللہ نے کوئی بھی چیز بے مقصد پیدا نہیں کی لہٰذا یہ نظام ضرور ایک دن کسی اعلیٰ و اکمل نتیجہ پر پہنچنے والا ہے۔ یہ اندازِ فکر انہیں اپنے خالق و مالک کی طرف مزید جھکا دیتا ہے۔ آگے اللہ اپنے ایک رجوع کرنے والے بندے سیدنا داؤد علیہ السلام اور ان پر اپنے انعامات کا ذکر فرما رہے ہیں۔

[۱۴] وہ بزرگی یہ تھی کہ آپ بچپن میں محض ایک گڈریے تھے۔ اور بکریاں چرایا کرتے تھے۔ پھر اللہ نے آپ کو حکومت بھی عطا فرمائی اور نبوت بھی۔ اور یہ تفصیل پہلے سورہ بقرہ کی آیات نمبر ۲۵۱ کے تحت گزر چکی ہے۔

[۱۵] آپ کی خوش الحانی، پہاڑوں اور پرندوں کی آپ سے ہم آہنگی کیلئے (سورۃ انبیاء کی آیت نمبر ۷۹ کا حاشیہ نمبر ۶۷ ملاحظہ کیجئے)

وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ﴿۱۰﴾ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱﴾ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ۭ
وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۭ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ

(تسبیح میں) ہم آہنگ ہو جاؤ اور پرندوں کو بھی (یہ حکم دیا تھا) اور ہم نے اس کے لئے لوہے[۱۶] کو نرم کر دیا تھا۔(۱۰) (اور اسے کہا) کہ کھلی ڈھلی زرہیں بناؤ اور اندازہ کے مطابق اس کی کڑیاں جوڑو اور (اے آلِ داؤد) نیک عمل کرو[۱۷]۔ جو کچھ تم کر رہے ہو بلاشبہ میں اسے خوب دیکھ رہا ہوں۔(۱۱) اور سلیمان کے لئے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا تھا۔ پہلے پہر[۱۸] اس کا چلنا ایک ماہ کی مسافت ہوتا تھا اور پچھلے پہر چلنا بھی ایک ماہ کی مسافت ہوتا تھا۔ نیز ہم نے ان کے لئے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ[۱۹] بہا دیا تھا۔ اور بعض جن[۲۰] بھی (اس کے مسخر کر دیئے) جو اپنے پروردگار کے حکم سے ان کے سامنے کام کرتے تھے۔ اور ان میں سے اگر کوئی ہمارے حکم سے سرتابی کرتا تو ہم اسے بھڑکتی آگ کے عذاب کا مزا چکھاتے تھے۔(۱۲)

[۱۶] آپ کے ہاتھ میں لوہے کا نرم ہونا اور آپ کے لوہے کی زرہیں بنانے کے لئے (دیکھئے سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۸۰ کا حاشیہ نمبر ۶۸)

[۱۷] آپ کے نیک اعمال میں سے ایک قابل ذکر نیک عمل یہ بھی تھا کہ آپ بادشاہ اور نبی ہونے کے باوجود اپنے ذاتی اخراجات کا بار بھی بیت المال پر ڈالنا گوارا نہ کرتے تھے۔ بلکہ زرہیں بنا کر ان کی آمدنی سے بسر اوقات کرتے تھے جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے۔

مقدام بن معد یکرب کہتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا: "کسی آدمی کے لئے اس سے بہتر کوئی کھانا نہیں جسے وہ اپنے ہاتھ سے محنت کر کے کھائے اور اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ سے (زرہ بنا کر) کھایا کرتے تھے" (بخاری۔ کتاب البیوع۔ باب کسب الرجل و بعمله بیده)

[۱۸] اس کی تشریح کے لئے دیکھئے (سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۸۱ کا حاشیہ نمبر ۶۹)

[۱۹] ❁ سیدنا سلیمان علیہ السلام اور تانبا پگھلانے کا فن:۔ اس کی دو توجیہات بیان کی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ آپ کے عہد حکومت میں یمن میں تانبے کا ایک پگھلا ہوا چشمہ نکل آیا تھا اور دوسری یہ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کے والد داؤد علیہ السلام کو لوہا پگھلانے کا فن عطا فرمایا تھا اور آپ اس سے زرہیں بنایا کرتے تھے، اسی طرح سیدنا سلیمان علیہ السلام کو تانبا پگھلانے کا فن عطا فرمایا تھا۔ آپ وسیع پیمانے پر تانبا پگھلاتے۔ پھر اس کو سانچوں میں ڈال کر جنات بڑے بڑے برتن، دیگیں اور لگن وغیرہ تیار کرتے تھے۔ جن میں ایک لشکر کا کھانا پکتا اور کھلایا جاتا، یہ تو سرکاری ضروریات تھیں۔ علاوہ ازیں آپ تانبے کی اشیاء عام لوگوں کی ضروریات کے لئے بھی بناتے تھے۔

[۲۰] ❁ جنوں کا آپ کے لئے مزدوروں کی طرح کام کرنا:۔ اس مقام پر جن کا لفظ آیا ہے۔ جبکہ سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۸۲ میں انہی معنوں میں شیاطین کا لفظ آیا ہے۔ بات ایک ہی ہے جن کا لفظ اسم جنس ہے۔ جبکہ شیاطین کا اطلاق صرف سرکش اور

السَّعِيْرِ ﴿۱۲﴾ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْٓا

اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴿۱۳﴾ فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى

مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ

جو کچھ سلیمان چاہتے تھے وہی کچھ وہ جن ان کے لئے بناتے تھے۔ مثلاً قلعے، مجسمے اور حوض جتنے بڑے لگن اور دیگیں ایک جگہ جمی رہنے[۲۱] والی۔ اے آلِ داؤد! شکر کے طور پر عمل کرو[۲۲]۔ اور میرے بندوں میں سے کم ہی شکر گزار ہوتے ہیں (۱۳) پھر جب ہم نے سلیمان پر موت کا فیصلہ کر دیا تو جنوں کو گھن کے کیڑے کے سوا کسی چیز نے سلیمان کی موت کا پتہ نہ دیا، جو ان کے عصا کو کھائے جا رہا تھا۔ پھر جب وہ گر پڑا تو جنوں[۲۳] پر واضح ہو گیا کہ اگر وہ غیب

متکبر قسم کے جنوں پر ہوتا ہے۔ (اور شیاطین انسانوں میں سے بھی ہو سکتے ہیں) یہ جن معمولی قلیوں، خدمتگاروں اور مزدوروں کی طرح آپ کے کام کرتے اور آپ کے حکم پر چلتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جنوں کو سیدنا سلیمان کا تابع بنا رکھا تھا اور وہ آپ کی اطاعت پر مجبور تھے۔ اگر وہ ذرا بھی سرکشی کرتے تو آگ میں جھونک دیئے جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ان جنوں پر اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ مقرر کر دیا تھا جس کے ہاتھ میں آگ کا کوڑا ہوتا۔ جو کوئی جن سیدنا سلیمان علیہ السلام کی نافرمانی کرتا یہ فرشتہ اس کو کوڑا مار کر جلا دیتا تھا۔

[۲۱] یہ جنات سیدنا سلیمان علیہ السلام کے آرڈر کے مطابق بڑے بڑے محل، مساجد، قلعے، مختلف مسجدوں کے ماڈل یا سینریوں کے ماڈل، بڑے بڑے لگن اور اتنی بڑی دیگیں بناتے تھے جو بڑی بوجھل اور ناقابلِ حمل و نقل ہونے کی وجہ سے کسی خاص مقام پر نصب کر دی جاتی تھیں اور ان میں سیدنا سلیمان علیہ السلام کے لشکروں کے لئے کھانا تیار کیا جاتا تھا۔ بعض لوگوں نے جنوں یا شیاطین سے دیہاتی مضبوط قسم کے انسان مراد لئے ہیں یہ توجیہ غلط اور قرآن کے سیاق و سباق کے خلاف ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے سورہ انبیاء کی آیت ۸۲ کا حاشیہ)

[۲۲] یعنی ایسے عمل کرو جو شکر گزار بندے کیا کرتے ہیں۔ شکر گزار بندے ایک تو وہ ہر وقت اللہ کا شکر ادا کرتے رہتے ہیں اور اس کی نعمتوں کا ہر ایک کے سامنے برملا اعتراف کرتے ہیں۔ پھر وہ جو کام بھی کرتے ہیں اللہ کی مرضی کے مطابق کرتے ہیں اور اس کی رضا کے لئے کرتے ہیں۔ اور شکر گزار بندے تھوڑے ہی ہوتے ہیں اور جو چیز تھوڑی ہو اس کی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے۔ یعنی اگر تم شکر گزار بن جاؤ گے تو میرے ہاں تمہاری قدر و منزل اور بڑھ جائے گی۔ کہتے ہیں کہ اس حکم کے بعد داؤد علیہ السلام نے دن اور رات کے پورے اوقات اپنے گھر والوں پر تقسیم کر رکھے تھے اور کوئی وقت ایسا نہ ہوتا تھا جبکہ آپ کے گھر کا کوئی نہ کوئی فرد اللہ کی عبادت میں مصروف نہ رہتا ہو۔

[۲۳] ❁ جن اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر:۔ جس وقت سیدنا سلیمان علیہ السلام کی وفات کا وقت قریب آ گیا اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ ہو گیا کہ اب دنیا سے رخصت ہونے والے ہیں۔ اس وقت آپ نے جنوں کو بیت المقدس کی تعمیر پر لگایا ہوا تھا جسے ہیکل سلیمانی کہتے ہیں۔ اس وقت تعمیر کا ابھی خاصا کام باقی تھا۔ آپ نے باقی کام کا پورا نقشہ جنوں کے سربراہ کے حوالہ کر دیا اور پوری طرح مکمل کام سمجھا دیا تھا۔ پھر اپنے عبادت خانے میں آ کر عبادت میں کھڑے ہو گئے۔ اور اپنی لاٹھی سے ٹیک لگا لی۔

الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ ﴿١٤﴾ لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ ۖ جَنَّتَانِ عَن يَمِينٍ وَ
شِمَالٍ ۖ كُلُوا مِن رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ ۚ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ ﴿١٥﴾ فَأَعْرَضُوا

جانتے ہوتے تو ایسے ذلت کے عذاب میں نہ پڑے رہتے۔(۱۴) قوم سبا کے لئے ان کے مسکن میں ہی ایک نشانی[۲۴] موجود تھی۔ اس مسکن کے دائیں، بائیں دو باغ[۲۵] تھے۔ (ہم نے انہیں کہا تھا کہ) اپنے پروردگار کا دیا ہوا رزق کھاؤ[۲۶] اور اس کا شکر ادا کرو۔ پاکیزہ اور ستھرا شہر ہے اور معاف فرمانے والا پروردگار(۱۵)

۞ سیدنا سلیمان کی وفات اور جنوں کا کام کرتے رہنا:۔ آپ کا یہ عبادت خانہ ایسا تھا جس میں شیشے کی کھڑکیاں تھیں اور باہر سے دیکھنے والا سیدنا سلیمانؑ کو عبادت میں مصروف دیکھ سکتا تھا۔ آپ عبادت میں کھڑے ہوئے تو اسی حالت میں فرشتے نے روح قبض کر لی اور آپ لاٹھی کے سہارے کھڑے ہی رہے۔ جن اور بعض دوسرے لوگ آپ کو کبھی کبھار عبادت میں مصروف دیکھ جاتے تھے۔ اسی حالت میں تقریباً چار ماہ گزر گئے۔ چار ماہ بعد ادھر بیت المقدس کی تعمیر مکمل ہوئی اور ادھر وہ لاٹھی ٹوٹ گئی جس کے سہارے آپ کی میت کھڑی تھی۔ لاٹھی کو اندر ہی اندر دیمک نے چاٹ کر ختم کر دیا تھا۔

۞ جن بھی غیب نہیں جانتے:۔ لاٹھی ٹوٹی تو آپ کی میت گر پڑی۔ تب لوگوں کو اور تعمیر پر متعین جنوں کو معلوم ہوا کہ سیدنا سلیمان تو بہت عرصہ پہلے کے فوت ہو چکے ہیں۔ اس وقت جنوں کو سخت افسوس ہوا کہ وہ اتنا عرصہ مفت میں محنت مشقت جھیلتے رہے۔ اس وقت جنوں کی یہ غلط فہمی دور ہو گئی کہ وہ غیب جانتے ہیں اور ان لوگوں کی بھی جو یہ سمجھتے تھے کہ جن غیب جانتے ہیں اور اپنے اسی اعتقاد کی بنا پر جنوں کی تسخیر کے لئے طرح طرح چلے کاٹتے اور پاپڑ بیلتے تھے۔ نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ جس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہے اس کے لئے کیسے کیسے اسباب مہیا کر دیتا ہے۔

[۲۴] یہاں نشانی سے مراد تاریخی شہادت ہے اور وہ یہ ہے کہ جب تک کوئی قوم اللہ کی فرمانبردار اور شکر گزار بن کر رہتی ہے وہ پھلتی پھولتی اور ترقی کی منازل طے کرتی جاتی ہے اور جب وہ اللہ کی نافرمانی اور ناشکری کرنے لگے تو اسے بتدریج زوال آنا شروع ہو جاتا ہے اور اگر وہ اپنا رویہ نہ بدلے تو اسے صفحہ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے یہی حال قوم سبا کا ہوا تھا۔

[۲۵] ۞ قوم سبا کے حالات:۔ قوم سبا کا علاقہ عرب کا جنوب مغربی علاقہ تھا۔ اور یہی علاقہ آج کل یمن کا علاقہ کہلاتا ہے۔ سبا دراصل ایک شخص کا نام تھا جس کے دس بیٹے تھے۔ بعد میں یہی دس قبیلے بن گئے انہی میں سے چار بیٹے اپنے خاندان سمیت شام کی طرف منتقل ہو گئے تھے۔ اس قوم کے عروج و زوال کا زمانہ تیرہ صدیوں پر محیط ہے (۸۰۰ ق م تا ۴۵۰ء) ایک زمانہ تھا جب تہذیب و تمدن کے لحاظ سے اسی قوم کا طوطی بولتا تھا اور روم اور یونان کی تہذیبیں ان کے سامنے ہیچ تھیں۔ زراعت اور تجارت کے میدان میں ان لوگوں نے خوب ترقی کی۔ ان لوگوں کا آب پاشی کا نظام نہایت عمدہ تھا۔ اس علاقہ کے دو طرف پہاڑی سلسلے تھے۔ جگہ جگہ ان لوگوں نے بارش کا پانی روکنے اور ذخیرہ رکھنے کے لئے بند بنا رکھے تھے۔ ان کا دارالخلافہ مآرب تھا اور سب سے اعلیٰ اور بڑا عظیم الشان بند بھی اسی جگہ تعمیر کیا گیا تھا جو سدِ مآرب کے نام سے معروف تھا۔ ان کے علاقہ کے دونوں طرف پہاڑوں کے دامن میں باغات کا سینکڑوں میلوں میں پھیلا ہوا سلسلہ موجود تھا اور انسان کو یوں معلوم ہوتا تھا کہ جس جگہ وہ کھڑا ہے اس کے دونوں طرف باغات ہی باغات ہیں۔

[۲۶] ۞ قوم سبا پر اللہ تعالیٰ کے احسانات اور زرعی نظام:۔ بارشوں کے لحاظ سے یہ علاقہ کچھ اتنا زرخیز نہیں تھا مگر ان لوگوں کے نظامِ آبپاشی کی عمدگی کی وجہ سے ملک کے اندر تین سو مربع میل کا علاقہ جنت نظیر بن گیا تھا۔ جس میں انواع و اقسام کے

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ﴿۱۶﴾ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ؕ وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ﴿۱۷﴾ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ

مگر ان لوگوں نے سرتابی کی تو ہم نے ان پر زور کا سیلاب چھوڑ دیا۔ اور ان کے دونوں باغوں کو دو ایسے باغوں میں بدل دیا جن کے میوے بدمزہ تھے اور ان میں کچھ پیلو کے درخت تھے کچھ جھاؤ کے اور تھوڑی سی بیریاں[۲۷] تھیں۔(۱۶) ہم نے یہ سزا انہیں ان کی ناشکری کی وجہ سے دی تھی اور ہم ناشکروں کو ایسا ہی بدلہ[۲۸] دیا کرتے ہیں(۱۷) ہم نے ان کی

پھلوں کے درخت بھی تھے جن کی خوشبو سے یہ پوری سرزمین معطر بن گئی تھی اور کھیتی بھی خوب پیدا ہوتی تھی۔ اندرون ملک بخورات، دار چینی اور کھجور کے نہایت بلند و بالا درختوں کے جنگل تھے اور ان سے میٹھی میٹھی خوشبو تمام فضا کو خوشبودار بنا دیتی تھی۔ اور جب ہوا چلتی تو اس خوشبو سے سب لوگ لطف اندوز ہوتے تھے۔ اسی علاقہ کو اللہ تعالیٰ نے بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا۔ یعنی سرسبزی' زرخیزی' فضا کا خوشبو سے ہر وقت معمور رہنا، موسم اور آب و ہوا میں اعتدال، رزق کی فراوانی اور سامان عیش و عشرت کی بہتات یہ وہ نعمتیں تھیں جو اللہ تعالیٰ نے عطا کر رکھی تھیں۔ مارب کے ایک پہاڑی علاقہ میں گنجان درختوں کے درمیان حکمرانوں کے محلات واقع تھے۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی نعمتوں کی بارش کر رکھی تھی۔

[۲۷] ۞ بیراج اور ڈیموں کا نظام:۔ پھر جب یہ قوم اپنی خوشحالی میں ہی مست ہو کر رہ گئی اور دنیا کے مال و دولت اور اس کی دلفریبیوں میں مستغرق ہو کر اپنے منعم حقیقی کو یکسر بھلا دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف انبیاء مبعوث فرمائے۔ کہتے ہیں وقتاً فوقتاً ان کی طرف تیرہ انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے تھے۔ لیکن ہر بدمست قوم کی طرح انہوں نے بھی یہی سمجھا کہ ان کی اس معاشی ترقی اور زرعی ترقی کا اصل سبب تو ہمارا اپنا نظام آب پاشی یا ہماری اپنی ذہانت اور محنت ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے انعامات کا کیا دخل ہے۔ تو انہوں نے انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو رد کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں سنبھلنے کی کافی مہلت دی لیکن انہوں نے اس سے کچھ بھی فائدہ نہ اٹھایا۔ تو آخر ان پر اللہ کی گرفت کا وقت آ گیا۔ ان کا سب سے بڑا اور عالیشان بند (ڈیم) مارب میں تھا جس میں بہت سے لوہے کے دروازے لگے ہوئے تھے۔ جنہیں بوقت ضرورت اٹھا لیا جاتا اور پانی چھوڑ دیا جاتا۔ ان دروازوں کا دوسرا بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہ جس طرح چاہتے پانی کا رخ موڑ لیتے اور نہروں کے ذریعہ قابل کاشت زمین کو سیراب کر لیتے تھے۔

۞ سبا پر سیلاب کا عذاب:۔ اسی بند میں نیچے رخنے پڑنے شروع ہو گئے اور پرسے اللہ تعالیٰ نے زوردار بارش برسا دی اور پانی اس قدر وافر مقدار میں آ جمع ہوا جس نے اس بند کو توڑ پھوڑ دیا۔ اس کے پانی میں اتنی فراوانی اور بہاؤ میں اتنی شدت تھی جس سے باقی بند بھی از خود ٹوٹتے چلے گئے اور یہ سارا قابل کاشت علاقہ زیر آب آ گیا۔ جس سے فصلیں اور کھیتیاں سب کچھ گل سڑ کر تباہ و برباد ہو گئیں۔ پھر جب کچھ مدت بعد زمین خشک ہوئی تو پورے آب پاشی کے نظام کی تباہی کے باعث اس سرزمین میں کوئی چیز بھی بارآور نہ ہو سکتی تھی۔ اب وہی سرزمین جو سونا اگلا کرتی تھی اس پر جھاڑ جھنکار، خاردار پودے، تھوہر کے درخت اور اسی قبیل کی دوسری چیزیں از خود پیدا ہو گئیں۔ جنہیں اکھاڑے بغیر نئی فصل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور یہ خاصا محنت طلب کام تھا آ جا کے اگر کوئی کھانے کی چیز وہاں اگی تو وہ چند بیریوں کے درخت تھے جن سے وہ کسی حد تک اپنا پیٹ بھر سکتے تھے۔ یہ تھا ان کی زرعی ترقی کا حشر جس پر وہ اس قدر پھولے ہوئے تھے۔

[۲۸] یعنی یہ سزا کچھ قوم سبا سے ہی مختص نہ تھی بلکہ جو قوم بھی اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے بعد اپنے محسن حقیقی کو

الْقُرَى الَّتِي بٰرَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ ۖ سِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا اٰمِنِينَ ﴿١٨﴾
فَقَالُوا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا وَظَلَمُوٓا أَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۭ

بستی اور اس بستی کے درمیان جس میں ہم نے برکت رکھی تھی، کھلے راستہ پر کئی بستیاں آباد کر دی تھیں اور ان میں چلنے کی منزلیں مقرر کر دی تھیں کہ ان میں رات دن بلا خوف و خطر امن سے[۲۹] سفر کرو۔(۱۸)

مگر وہ کہنے لگے: ''اے ہمارے پروردگار! ہمارے سفر کی مسافتیں دور دور[۳۰] کر دے اور (یہ کہہ کر) انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ چنانچہ ہم نے انہیں افسانے[۳۱] بنا دیا اور تتر بتر کر ڈالا۔

بھول جاتی ہے اور اس کا شکر ادا کرنے کے بجائے سرتابی کی راہ اختیار کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ وہ اس قوم کو ایسے ہی انجام سے دوچار کر دیتا ہے۔

[۲۹] تجارتی نظام:۔ ان کی ترقی اور خوشحالی کی دوسری وجہ ان کا تجارتی نظام تھا۔ ان کے تجارتی قافلے اپنے علاقہ (موجودہ یمن) سے لے کر شام تک جاتے تھے اور یہ شام ہی کی سرزمین ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعدد مقامات پر ''ایسی سرزمین جسے ہم نے برکت دے رکھی ہے'' کے الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ان دنوں یہ چار ماہ کا سفر تھا اور اس تجارتی شاہراہ کو اللہ تعالیٰ نے ''امام مبین'' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے اسی تجارتی شاہراہ پر قریش کے تجارتی قافلے مکہ سے شام تک سفر کرتے تھے۔ یہ تجارتی شاہراہ اس لحاظ سے تھی کہ برلبِ سڑک اور نزدیک نزدیک آبادیاں موجود تھیں۔ جہاں مسافروں کو کھانا پانی مل سکتا تھا ایک بستی پر انسان پہنچ جائے تو اگلی بستی سامنے نظر آنے لگتی تھی (اور یہ قُرًى ظَاهِرَةً کا مطلب ہے) اس شاہراہ کی بڑی خوبی یہ تھی کہ کوئی شخص جس وقت بھی آرام کرنا چاہتا تو وہ کر سکتا تھا اور آرام کرنے کے لئے اگلی منزل اس کے قریب ہی ہوتی تھی۔ پھر چونکہ اس شاہراہ پر بکثرت آمد و رفت رہتی تھی اس لئے لوٹ مار کا بھی اس پر اتنا خطرہ نہیں ہوتا تھا جتنا کہ عرب کے دوسرے علاقوں میں تھا۔ اس لحاظ سے ان کا یہ تجارتی سفر دوسرے علاقوں کی نسبت بہت آسان بھی تھا اور پرامن بھی۔

[۳۰] جب انسان مال و دولت کے نشہ میں مست ہو جاتا ہے اور اسے ہر طرف سے آسودگی اور آسانیاں ہی میسر ہونے لگتی ہیں تو بعض دفعہ وہ اسی مستی میں بعض انہونی باتیں بھی بکنے لگتا ہے کہ لوگ جو سفر سے متعلق ایسی اور ایسی مشکلات بیان کرتے ہیں کہ اتنے دن کچھ کھانے کو ملا نہ پینے کو، یا ہم فلاں مقام پر جا کر راستہ بھول گئے تو ہمیں کوئی آدم زاد نظر نہ آتا تھا جس سے راستہ ہی پوچھ سکیں وغیرہ وغیرہ چنانچہ وہ آرزو کرنے لگے کہ ہمارا بھی کوئی سفر تو ایسا ہونا چاہئے ممکن ہے ان لوگوں نے یہ بات زبان قال سے نہ کہی ہو زبان حال سے کہی ہو۔ یعنی دل میں ایسے خیالات آنے لگے ہوں۔

[۳۱] زراعت کے علاوہ تجارت کی بھی تباہی:۔ جب ان لوگوں کی زرعی معیشت تباہ ہو گئی تو یہی چیز ان کی تجارتی ترقی کی تباہی کا باعث بن گئی۔ جب اپنے مال کی پیداوار ہی ختم ہو جائے تو پھر تجارت کیسی؟ اگر بیرون ملک کی چیزیں ہی خریدی جائیں اور بیرون ملک ہی بیچی جائیں تو ان سے آخر کتنا منافع ہو سکتا ہے۔ اور اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کثیر آبادیاں جو اس شاہراہ کے کنارے آباد تھیں۔ وہاں سے اٹھ کر دوسرے مقامات کی طرف چلی گئیں کیونکہ ان کی معیشت کا انحصار بھی زیادہ تر انہی تجارتی قافلوں کی اشیائے خوردنی کی خرید و فروخت پر تھا۔ اس طرح سبا کی تمام نو آبادیاں تباہ و برباد ہو کر رہ گئیں۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۱۹﴾ وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا
فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ
هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ۭ وَرَبُّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۲۱﴾ۧ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ ع ۲/۸

اس میں یقیناً ہر صابر و شاکر [۳۲] کے لئے کئی نشانیاں ہیں۔(۱۹) ان لوگوں کے متعلق ابلیس نے اپنا گمان درست پایا [۳۳]۔ چنانچہ مومنوں کے گروہ کے سوا سب نے اسی کی پیروی کی۔(۲۰)

حالانکہ ابلیس کا ان پر کچھ زور نہیں [۳۴] تھا (اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا) تاکہ ہم معلوم کرلیں کہ کون آخرت پر ایمان لاتا ہے اور کون اس بارے میں شک میں پڑا رہتا ہے اور آپ کا پروردگار ہر چیز [۳۵] پر نگران ہے۔(۲۱) (اے نبی!) آپ ان سے کہئے کہ: جن کو تم اللہ کے سوا (الٰہ) سمجھ رہے ہو انہیں پکار کر دیکھ لو۔

[۳۲] صَبَّار اور شَکُوْرٌ دونوں مبالغے کے صیغے ہیں اور یہ ایک مومن کی پوری طرز زندگی پر محیط ہیں۔ اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ مومن کی شان یہ ہوتی ہے کہ جب اسے اللہ کی طرف سے نعمتیں عطا ہوتی ہیں تو وہ شکر بجالاتا ہے اور زندگی بھر اس کا یہی معمول ہوتا ہے اور جب اسے کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو وہ اسے صبر و استقامت سے برداشت کرتا ہے اور آئندہ کے لئے اللہ کی رحمت کا امیدوار رہتا ہے۔ اس آیت کا یہی مفہوم ہے اور ہر مومن خوب سمجھ سکتا ہے کہ قوم سبا کے عروج کے اصل اسباب کیا تھے اور ان کی بربادی اور ہلاکت کا اصل سبب کیا چیز تھی؟

[۳۳] جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کر کے فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا تو ابلیس نے سجدہ سے انکار کر دیا تھا اور جب آدم و ابلیس کی آپس میں ٹھن گئی تو ابلیس آدم کو چکمہ دینے پر اور اللہ کی نافرمانی پر اکسانے میں کامیاب ہو گیا تو اس وقت ہی اس نے یہ خیال ظاہر کر دیا تھا اور اللہ تعالیٰ کو برملا کہہ دیا تھا کہ میں اولاد آدم کے اکثر حصہ کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ تھوڑے ہی تیرے ایسے بندے ہوں گے جو تیرے شکرگزار بن کر رہیں گے۔ قومِ سبا کے حالات سے بھی یہی نتیجہ سامنے آتا ہے اور دوسری اقوام کے حالات سے بھی کہ ابلیس فی الواقع ایسا گمان کرنے میں سچا تھا۔

[۳۴] ۞ شیطان کن راہوں سے انسان کو گمراہ کرتا ہے؟ ابلیس کے پاس کوئی ایسی طاقت نہیں کہ وہ زبردستی لوگوں کو اللہ کی راہ سے اپنی راہ پر ڈال دے۔ وہ صرف یہی اختیار رکھتا ہے کہ انسان کے دل میں وسوسہ ڈال سکے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتا اور شیطان کے انسان کو گمراہ کرنے کے سب سے زیادہ موثر تین طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ انسان کو شرک کی نئی سے نئی راہیں بڑے خوبصورت انداز میں پیش کر دیتا ہے۔ اور دوسرے اسے عقیدہ آخرت کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یا عقیدہ آخرت میں ایسے جزوی عقائد شامل کر دیتا ہے کہ عقیدہ آخرت کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے اور عقیدہ آخرت کا صحیح مفہوم ہی وہ چیز ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی سیدھی راہ پر قائم رکھ سکتا ہے اور اس کا تیسرا وار اس کے لباس پر ہوتا ہے اور وہ لوگوں کو عریانی، بے حیائی اور فحاشی کی راہیں خوبصورت انداز میں بھاتا رہتا ہے۔

[۳۵] یعنی اللہ یہ بات بھی خوب جانتا ہے کہ اس نے ابلیس کو کس حد تک لوگوں کو گمراہ کرنے کا اختیار دے رکھا ہے اور وہ یہ

لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ
مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿۲۲﴾ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ

وہ تو آسمانوں اور زمین کے موجودات میں ذرہ بھر بھی اختیار نہیں رکھتے، نہ ہی ان موجودات میں ان کی کچھ شرکت ہے اور نہ ہی ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہے (۲۲) اس کے ہاں صرف اس کی سفارش فائدہ دے سکتی ہے جس کے لئے وہ خود اجازت دے[۳۷]۔ حتیٰ کہ جب لوگوں کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوگی تو وہ پوچھیں

خوب جانتا ہے کہ ابلیس صرف ان لوگوں کو ہی گمراہ کرسکتا ہے جو پہلے سے شیطان کے اشارے کے منتظر بیٹھے ہوتے ہیں اور جو لوگ اللہ اور روز آخرت پر پختہ یقین رکھتے ہیں وہ اس کے چکمے میں نہیں آتے اور کبھی آ بھی جائیں تو انہیں جلد ہی اس بات کا احساس ہو جاتا ہے اور فوراً پھر اللہ کی طرف پلٹ آتے ہیں۔

[۳۶] یعنی ان کفارِ مکہ سے کہیے کہ میرا پروردگار وہ ہے جو کائنات کی ہر چیز کا خالق ہے جو اس کا شکر ادا کرتا ہے اسے وہ نعمتوں سے نوازتا ہے۔ سیدنا داؤد علیہ السلام اور سیدنا سلیمان علیہ السلام اللہ کے شاکر بندے تھے تو اللہ نے انہیں بے شمار نعمتوں سے نوازا تھا۔ اور قوم "سبا" نے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیا تھا۔ اب تم بتاؤ کہ جن معبودوں کو تم پکارتے ہو ان میں سے کوئی ایسا کام کرسکتا ہے؟ اگر تمہیں کچھ شک ہے تو انہیں پکار کے دیکھ لو کہ کیا وہ آڑے وقت کسی کے کام آسکتے ہیں؟ اس بات کو اس پہلو سے بھی سمجھو کہ کائنات میں کسی بھی چیز پر ان کا کچھ اختیار ہے؟ نہ انہوں نے کسی چیز کو بنایا ہے، نہ ہی کسی چیز کی تخلیق میں ان کی شرکت ہے۔ نہ ہی ان کا ظاہری اور باطنی اسباب پر کچھ کنٹرول ہے پھر وہ تمہاری بگڑی کو سنوار کیسے سکتے ہیں اور فائدہ کیا پہنچا سکتے ہیں؟ فائدہ یا نقصان تو وہی ہستی پہنچا سکتی ہے جس کے پاس کچھ ایسے اختیارات بھی ہوں۔ اور جو چیز خود بے اختیار اور مجبور محض ہے اس سے نفع یا نقصان کی کیسے توقع کی جاسکتی ہے؟

[۳۷] اللہ کے ہاں سفارش کا ضابطہ:۔ اکثر مشرکوں کا اپنے معبودوں کے متعلق یہ عقیدہ بھی پایا جاتا ہے کہ وہ بڑے خدا یعنی اللہ کے ہاں ان کی سفارش کرتے ہیں اگرچہ کام بنانے والا اللہ ہی ہوتا ہے۔ ہمارے یہ معبود یا بزرگ اللہ کے ہاں ہماری سفارش کرکے ہمارے کام اللہ سے کروانے کا سبب ہوتے ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ نے سفارش کے متعلق بھی اپنا ضابطہ بیان فرما دیا۔ اور یہ ضابطہ پہلے قرآن میں متعدد بار گزر چکا ہے۔ مختصراً یہ کہ (۱) اللہ کے ہاں سفارش وہی شخص کرسکے گا، جس کو اللہ کی طرف سے اجازت ملے گی۔ یہ کیا معلوم کہ جسے تم نے سفارشی سمجھ رکھا ہے اسے اجازت بھی ملتی ہے یا نہیں، (۲) اس شخص کے حق میں سفارش کی جاسکے گی، جس کے متعلق اللہ چاہے اور تمہیں یہ کیسے معلوم ہوسکتا ہے کہ تمہارے حق میں اللہ کی طرف سے سفارش کی اجازت کسی کو ملتی بھی ہے یا نہیں؟ (۳) اور صرف اس گناہ کی مغفرت کی سفارش کی جاسکتی ہے جس کے متعلق اللہ چاہے۔ یہ قید سفارش کے تصور کو اور بھی محدود بنا دیتی ہے۔ پھر تم کس خیال میں ان معبودوں یا بزرگوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔ بروقت اپنی فکر خود کرلو اور کسی کی سفارش پر تکیہ مت رکھو۔

قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ۝۲۳ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ

گے کہ ”تمہارے [۳۸] پروردگار نے کیا جواب دیا؟“ وہ کہیں گے کہ ٹھیک جواب ملا ہے۔ اور وہ عالی شان اور سب سے بڑا ہے۔ (۲۳) آپ ان سے پوچھئے کہ آسمانوں اور زمین سے تمہیں کون رزق دیتا ہے؟ آپ کہئے کہ

[۳۸] اللہ تعالیٰ کا جلال اور دہشت:۔ تم اللہ کے ہاں سفارش کی بات کرتے ہو جس کی جلالت اور عظمتِ شان کا یہ حال ہے کہ جب اس کی طرف سے کوئی حکم نازل ہوتا ہے تو اس کے پاس رہنے والے مقرب فرشتے تھر تھر کانپنے لگتے ہیں اور گھبرا جاتے ہیں۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

سیدنا ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جب اللہ تعالیٰ کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو فرشتے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے لئے ازراہ عاجزی اپنے پر مارتے ہیں اور ایسی آواز آتی ہے جیسے کسی زنجیر کو صاف پتھر پر کھینچنے سے آتی ہے۔ پھر جب انہیں ہوش آتا ہے تو ایک دوسرے سے پوچھتا ہے تمہارے پروردگار نے کیا کہا۔ دوسرا کہتا ہے کہ جو کہا درست کہا اور وہ بزرگ و برتر ہے آپ ﷺ نے فرمایا: اور شیطان زمین اور آسمان کے درمیان ایک دوسرے کے اوپر جمع ہو جاتے ہیں (تاکہ آسمانی خبریں چرا سکیں) (ترمذی۔ کتاب التفسیر)

ایسے جاہ و جلال والے اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کو یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کر سکے۔ اور تم لوگ کس قسم کی خوش فہمیوں میں مبتلا ہو؟“

محدثین اس حدیث کو اس آیت کی تفسیر میں اس لئے لائے ہیں کہ اہل عرب میں سے ایک گروہ فرشتوں کو کارگاہ عالم میں متصرف سمجھ کر ان کی پوجا کرتا تھا اور جو لوگ ان میں سے آخرت کے کسی حد تک قائل تھے وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر قیامت کو باز پرس ہوئی بھی تو یہ فرشتے اللہ کے ہاں ہماری سفارش کر کے ہمیں چھڑا لیں گے۔ اور بعض مفسرین نے اس آیت کو ان مشائخ اور پیروں سے متعلق کیا ہے جو اپنے مریدوں کو شفاعت کر کے چھڑا لینے کے وعدے کرتے اور کسی نہ کسی پیر کے دامن سے وابستہ رہنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ یعنی کیا شافع اور کیا مشفوع دونوں قیامت کے دن کی گھبراہٹ سے سخت گھبرائے ہوئے ہوں گے اور دونوں اس انتظار میں ہوں گے کہ شفاعت کرنے کی اجازت ملتی بھی ہے یا نہیں۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے شافع کو شفاعت کی اجازت مل جائے تو اس کی گھبراہٹ کسی حد تک دور ہو جاتی ہے جس کو مشفوع بھانپ کر اس سے پوچھتا ہے کہ کیا جواب ملا تو شافع کہتا ہے کہ معاملہ ٹھیک ہے اجازت مل گئی ہے تو اس وقت مشفوع کی جان میں جان آتی ہے۔ اس میں شافع اور مشفوع دونوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تم نے شفاعت سے متعلق جس قسم کا تصور باندھ رکھا ہے وہ قطعاً غلط ہے۔ اللہ کی بارگاہ اتنی عالی مرتبہ اور بڑی ہے کہ وہاں اللہ کی اجازت کے بغیر نہ مقرب فرشتوں کو دم مارنے کی ہمت ہوتی ہے اور نہ کسی اور بڑی شخصیت کو۔ کسی کو یوں کہنے کی ہمت نہ ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ سے یوں کہہ سکے کہ یہ تو میرے دامن سے وابستہ ہے۔ لہٰذا اسے بخشنا ہی پڑے گا۔ کیونکہ شافع کو تو اپنی بھی خبر نہیں کہ اس کا کیا حال ہوگا وہ بھلا دوسروں کی ذمہ داری کیسے لے سکتا ہے؟

قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔلُ
عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ۭ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۶﴾ قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ
اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَاۗءَ كَلَّا ۭ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا

اللہ (ہی رزق دیتا ہے) اور ہم میں [۳۹] اور تم میں سے ایک فریق ہی ہدایت پر یا کھلی گمراہی میں پڑا ہوا ہے۔(۲۴)
آپ ان سے کہئے کہ ہم اگر جرم کریں تو اس کی باز پرس تم سے نہیں ہوگی اور جو کچھ تم کر رہے [۴۰] ہو اس کی ہم
سے باز پرس نہیں ہوگی (۲۵) آپ کہئے کہ اللہ ہم سب کو اکٹھا کرلے گا پھر ہمارے درمیان انصاف سے فیصلہ کر
دے [۴۱] گا۔ اور وہی فیصلے کرنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے (۲۶) آپ ان سے کہئے: مجھے وہ ہستیاں دکھاؤ تو سہی
جنہیں تم نے اللہ کا شریک بنا کر اس سے ملا دیا ہے۔ وہ ہرگز نہ بتا سکیں گے۔ بلکہ اللہ ہی سب [۴۲] پر غالب اور
حکمت والا ہے۔(۲۷) اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لئے بشارت دینے والا [۴۳] اور ڈرانے والا ہی بنا کر بھیجا ہے

[۳۹] یعنی یہ بات تو فریقین (یعنی رسول اللہ ﷺ اور قریش مکہ) میں مسلم تھی کہ رزق دینے والا ''اللہ'' ہی ہے اب انسانوں کے لئے لازم تو یہی ہے کہ عبادت بھی اسی کی کی جانی چاہئے جو کھانے کو دیتا ہے اور دیتا رہتا ہے۔ پھر آخر دوسرے معبودوں کو جن کا رزق کی پیدائش یا تقسیم میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ کس خوشی میں پوجا جائے، بنیاد تو دونوں کی ایک ہے کہ رازق اللہ ہے اور آگے اس کی دو راہیں بن گئیں۔ ایک ہم ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ گن اسی کا گانا چاہئے جو کھانے کو دیتا ہے اور ایک تم ہو کہ رزق دینے والے کو چھوڑ کر دوسروں کے گن گا رہے ہو۔ یا اللہ کی عبادت میں بلاوجہ شریک کر رہے ہو۔ اب ظاہر ہے کہ ہم دونوں فریقوں میں سے ایک ہی حق پر ہو سکتا ہے اور تم خود ہی سوچ لو کہ حق پر کون ہو سکتا ہے اور گمراہی پر کون؟

[۴۰] اس سے اگلا سوال یہ ہے کہ عقل و فہم ہم سب کو یکساں دیا گیا ہے۔ تم اگر ایک مسلمہ کلیہ سے غلط نتیجہ اخذ کر کے اس پر اپنی زندگی کی راہ استوار کرتے ہو تو اس کے جواب دہ ہم تو نہیں ہو سکتے اور اگر بالفرض ہم غلط نتیجہ نکال کر اس پر عمل پیرا ہو گئے ہیں تو ہمارے متعلق تم سے سوال نہیں ہوگا۔ ہر ایک اپنے اپنے اعمال کا خود جواب دہ اور ذمہ دار ہے۔

[۴۱] اور اگر تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ آخرت کا اور جواب دہی کا تصور ہی غلط ہے تو یقین جانو کہ جو اللہ ہم سب کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ پھر بھی ہم سب کو دوبارہ مرنے کے بعد زندہ کر کے اکٹھا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ آج تم اپنے آپ کو درست سمجھتے ہو اور ہم اپنے آپ کو درست سمجھتے ہیں۔ لیکن اس دن اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان اس طرح انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دے گا جس کی تمہیں بھی ٹھیک سمجھ آ جائے گی۔ اور اس کا فیصلہ اس لحاظ سے درست ہوگا کہ وہ ہم سب کا خالق ہے۔ اور خالق کو اپنی بنائی ہوئی چیز کی جس قدر سمجھ ہو سکتی ہے دوسروں کو نہیں ہو سکتی۔ وہ تو ہمارے اور تمہارے ارادوں اور نیتوں تک سے واقف ہے لہٰذا اس کے فیصلہ پر کسی غلطی یا زیادتی کا امکان نہیں ہو سکتا۔

[۴۲] یہ کفار مکہ سے دوسرا سوال ہے۔ پہلا سوال اللہ کی رزاقیت سے متعلق تھا۔ دوسرا اس کی خالقیت سے متعلق ہے کہ اللہ نے تو اس تمام کائنات کو اور ہمیں بھی اور تمہیں بھی پیدا کیا ہے۔ لہٰذا مخلوق کا یہی حق ہے کہ اپنے خالق کی عبادت کرے اور حمد و ثنا بیان کرے۔ اب یا تو یہ نشان دہی کرو کہ تمہارے ان معبودوں نے بھی اس کائنات کی فلاں یا فلاں چیز بنائی ہے اور ہمیں

عدم سے وجود میں لانے والے تمہارے یہ معبود ہیں۔ آخر کچھ تو ان کا تخلیقی کارنامہ دکھاؤ۔ اور اگر تم ان کا کوئی تخلیقی کارنامہ نہیں دکھا سکتے تو پھر آخر تم نے کس دلیل کی بنا پر کس خوشی میں ان معبودوں کو اللہ کا شریک بنادیا ہے۔ علاوہ ازیں جب یہ واضح ہو گیا کہ ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے تو ہر چیز کا مالک اور ہر چیز پر غالب بھی ہوا جس نے حکمتوں سے لبریز یہ نظام کائنات تخلیق کیا ہے۔ لہٰذا تمہارے معبود مخلوق بھی ہیں، مملوک بھی ہیں اور مقہور بھی۔ پھر یہ عبادت کے لائق کیسے بن گئے؟

[۴۳] ۞ آپ افضل الانبیاء بھی ہیں اور خاتم النبیین بھی:۔ آپ ﷺ صرف عرب کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے اور صرف اپنے دور کے لئے نہیں بلکہ قیامت تک کے لئے اللہ کے رسول، ایمانداروں کو جنت کی بشارت دینے والے اور منکرینِ حق کو اخروی انجام بد سے ڈرانے والے ہیں۔ جبکہ آپ ﷺ سے پہلے کے سب انبیاء کسی خاص قوم کے لئے، کسی خاص علاقہ کے لئے اور کسی خاص دور کے لئے مبعوث کئے جاتے رہے ہیں۔ یہ مضمون قرآن کریم میں بھی متعدد مقامات پر وارد ہوا ہے اور احادیث صحیحہ میں بھی کثرت سے وارد ہے اس مضمون سے دو باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ آپ سب انبیاء سے افضل و اشرف ہیں۔ اور دوسری یہ کہ آپؐ کے بعد تا قیامت کوئی رسول یا نبی آنے والا نہیں۔ لہٰذا صرف اہل عرب کو نہیں بلکہ بیرونِ عرب تبلیغ کی بھی ذمہ داری آپ پر عائد تھی۔

صلح حدیبیہ تک تبلیغ اسلام کا جتنا کام ہوا تھا وہ سب اندرون عرب ہی ہوا تھا۔ صلح حدیبیہ کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ آپ ابھی تک بیرونِ عرب تبلیغ پر توجہ ہی نہ دے سکے تھے اور چاہتے تھے کہ چاروں طرف سے بیرونی خطرات سے کچھ سکون ملے تو ادھر توجہ کی جائے۔ صلح حدیبیہ کے بعد فوراً یہود خیبر کی سرکوبی کی گئی۔

۞ ہمسایہ ممالک کو تبلیغی خطوط:۔ پھر آپ ﷺ نے ہمسایہ ممالک کے سربراہوں کو تبلیغی خطوط لکھنے کے بارے میں صحابہ کرام ؓ سے مشورہ کیا تو صحابہ کرام ؓ نے یہ عرض کیا کہ ملوک عجم صرف اس خط کو پڑھتے ہیں جس پر مہر لگی ہو چنانچہ آپ ﷺ نے چاندی کی ایک مہر بنوائی جس پر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے الفاظ کندہ تھے۔ انس بن مالک ؓ کہتے ہیں کہ میں گویا اب بھی اس مہر کی چمک اور نقوش دیکھ رہا ہوں (بخاری۔ کتاب الاحکام۔ باب الشهادة على الخط المختوم۔۔۔۔۔) اور ایک روایت میں ہے کہ ان الفاظ کی ترتیب یہ تھی کہ سب سے اوپر اللہ کا لفظ تھا اس کے نیچے رسول کا اور اس کے نیچے محمد کا۔



اس زمانہ میں دو بڑی سلطنتیں تھیں ایک روم کی، دوسرے ایران کی۔ اس لئے پہلے ہم انہی کا ذکر کرتے ہیں۔

۞ قیصرِ روم کو آپ کا نامہ مبارک:۔ روم کا شہنشاہ ہرقل خود تورات اور انجیل کا عالم تھا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ نبی آخر الزمان کے ظہور کا وقت آچکا ہے۔ اور نبی آخر الزماں کی خبریں اسے پہنچ بھی چکی تھیں اور وہ دل سے جان چکا تھا کہ نبی آخر الزمان آچکا ہے جس کی بشارات تورات اور انجیل میں موجود ہیں۔ پھر اس موقعہ کے چودہ سال پیشتر جب شہنشاہ روم کو ایران کے ہاتھوں شکست ہوئی تھی تو قرآن نے سورہ روم کے دوبارہ فتح پانے کی خوشخبری دی تھی۔ جبکہ ایسی معجزانہ فتح کے دور دور تک کہیں آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ اور یہ پیشین گوئی فتح بدر کے دن پوری ہو چکی تھی۔ اس سے بھی نبی آخر الزمان کی صداقت کا یقین ہو چکا تھا۔ اور اس فتح سے وہ اتنا خوش ہوا تھا کہ پیدل بیت المقدس پہنچ کر اللہ تعالیٰ کا شکرانہ ادا کیا تھا۔ اس کی طرف آپ ﷺ نے دحیہ کلبی کو خط دے کر بھیجا دحیہ کلبی ایک خوش شکل صحابی تھے، جن کی شکل رسول اللہ ﷺ سے ملتی

جلتی تھی اور جبرئیل علیہ السلام جب بھی انسانی شکل میں آپ ﷺ کے پاس آتے تو دحیہ کلبی ہی کی شکل میں آتے تھے۔ آپ ﷺ نے ہرقل کی طرف جو خط لکھا اس کا مضمون یہ تھا:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم...... محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول کی طرف سے ہرقل رئیس روم کے نام، امابعد! میں تمہیں اسلام کے کلمہ کی طرف بلاتا ہوں اگر مسلمان ہو جاؤ تو سلامتی سے رہو گے اور اللہ تمہیں دوہرا اجر دے گا اور اگر اعراض کیا تو رعایا کا بار گناہ بھی تجھ پر ہوگا (پھر آپ نے سورہ آل عمران کی یہ آیت لکھوائی۔ اے اہل کتاب! اس بات کی طرف آؤ جو ہم اور تم میں یکساں ہے۔ کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ ہی ہم میں سے کوئی اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا رب بنائے۔ پھر اگر وہ اعراض کریں تو اے پیغمبر! تم ان سے کہہ دو کہ گواہ رہنا کہ ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں۔" (بخاری۔ باب کیف کان بدء الوحی)

دحیہ کلبی یہ خط لے کر حارث غسانی حاکم بصریٰ کے پاس پہنچے تاکہ وہ باضابطہ طور پر اسے شہنشاہ روم تک پہنچا دے۔ اس نے دحیہ کلبی کو شہنشاہ روم کے ہاں جانے کی اجازت دے دی وہاں جا کر سیدنا دحیہ کلبی کو معلوم ہوا کہ ہرقل بیت المقدس آیا ہوا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بیت المقدس پہنچ کر یہ گرامی نامہ بادشاہ کے حوالہ کر دیا۔ وہ خود تو دل سے ایمان لا چکا تھا اور چاہتا یہ تھا کہ اس کی رعایا بھی اس کے ساتھ مسلمان ہو جائے تاکہ اس کی سلطنت اسی کے پاس بحال رہ جائے۔ اس کے لئے وہ تدبیریں سوچنے لگا۔ آخر ایک تدبیر اس کے ذہن میں آئی۔ اس نے لوگوں سے پوچھا کیا ان دنوں قریش کا تجارتی قافلہ یہاں آیا ہوا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ ہاں ابوسفیان کا قافلہ آیا ہوا ہے۔ اور غزہ میں مقیم ہے۔ بادشاہ نے ابوسفیان کو اپنے ہاں بلوایا۔ اور دریں اثنا اس نے گیارہ سوالات پر مشتمل ایک ایسا سوالنامہ تیار کیا جس سے حقیقت کھل کر سامنے آجائے۔ یہ سوال بالکل ایسا ہی تھا جیسے کوئی وکیل اپنے موقف کی وضاحت کے لئے جرح کے دوران کیا کرتا ہے۔ اور اس سے اپنا مقصد یہ تھا کہ اس کے امیر و وزیر، فوجی افسر اور رعایا اسلام کی طرف مائل ہو جائیں اور اسلام لانا اس کے لئے سہل ہو جائے اب وہ سوالنامہ ابوسفیان کے جواب اور بعد میں اس پر اس کا اپنا تبصرہ صحیح بخاری سے درج کرتے ہیں۔ ابوسفیان کے ساتھ دو اور ساتھی بادشاہ کے سامنے پیش کئے گئے۔ بادشاہ نے اپنے سامنے ابوسفیان کو کھڑا کیا اور اس کے ساتھیوں کو اس کے پیچھے اور ساتھیوں سے یہ کہہ دیا کہ اگر ابوسفیان کسی سوال کے جواب میں جھوٹ بولے تو فوراً اسے ٹوک دینا۔ ایک ترجمان درمیان میں ترجمانی کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ ابوسفیان خود اپنے اسلام لانے کے بعد کہتے ہیں کہ اس دن ان سوالات نے میرا گھیرا اس قدر تنگ کر دیا تھا کہ میں جھوٹ بولنا چاہتا تھا لیکن بول نہیں سکتا تھا۔ بادشاہ نے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کو دربار میں حاضر ہونے پر پوچھا تم میں سے کون اس پیغمبر کا نزدیکی رشتہ دار ہے؟ ابوسفیان نے کہا کہ میں ہوں۔ چنانچہ سوال و جواب شروع ہو گئے۔ جس کے راوی بھی ابوسفیان ہی ہیں:

❁ ہرقل اور ابوسفیان کا مکالمہ:۔

قیصر نے پوچھا: تم میں اس پیغمبر کا خاندان کیسا ہے؟۔ میں نے کہا: اس کا نسب اچھا ہے۔

قیصر: تم میں سے پہلے بھی کسی نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا؟ میں نے کہا: نہیں۔

قیصر: اس کے بزرگوں میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔

قیصر: اس کی پیروی امیر لوگ کر رہے ہیں یا غریب؟ میں نے کہا: غریب لوگ۔
قیصر: اس کے پیروکار بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟ میں نے کہا: بڑھتے جاتے ہیں۔
قیصر: کوئی شخص اس پر ایمان لا کر پھر اسے برا سمجھ کر پھر بھی جاتا ہے؟ میں نے کہا۔ نہیں
قیصر: نبوت کے دعویٰ سے پہلے تم نے اسے کبھی جھوٹ سے متہم کیا ہے؟ میں نے کہا، نہیں
قیصر: اس نے کبھی عہد شکنی کی ہے؟ میں نے کہا نہیں، اب ہم نے صلح کا معاہدہ کیا ہے۔ دیکھیں اب وہ کیا کرتا ہے؟ ابوسفیان کہتے ہیں مجھے اس بات کے علاوہ کوئی اور بات شامل کرنے کی گنجائش نہ مل سکی۔
قیصر: کیا تم نے اس سے کبھی جنگ کی؟ میں نے کہا ہاں
قیصر: پھر اس لڑائی کا نتیجہ کیا رہا؟ میں نے کہا: لڑائی تو ڈول کی طرح ہے۔ کبھی ہمارا نقصان کبھی اس کا۔
قیصر: اچھا تمہیں وہ کیا حکم دیتا ہے؟ میں نے کہا: وہ کہتا ہے بس ایک اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ اپنے باپ دادا کی باتیں چھوڑ دو۔ وہ نماز پڑھنے، سچ بولنے، حرام کاری سے بچنے اور ناتا جوڑنے کا حکم دیتا ہے۔
یہ گیارہ سوال کرنے کے بعد ہرقل نے ابوسفیان کے جوابات پر جو اپنی طرف سے تبصرہ کیا وہ درج ذیل ہے:
میں نے تم سے اس کا خاندان پوچھا تو تم نے کہا وہ صاحب نسب ہے اور پیغمبر اپنی قوم میں صاحب نسب اور اعلیٰ خاندان ہی سے بھیجے جاتے ہیں۔
میں نے تم سے پوچھا کہ کیا کسی نے اس کے خاندان سے پیغمبری کا دعویٰ کیا تو تم نے کہا نہیں۔ اگر کسی نے دعویٰ کیا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ شخص اس کی پیروی میں دعویٰ نبوت کر رہا ہے۔
میں نے پوچھا کہ اس کے بزرگوں میں کوئی بادشاہ ہوا ہے تو تم نے کہا نہیں۔ اگر کوئی بادشاہ ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ اپنے باپ کی بادشاہت حاصل کرنا چاہتا ہے۔
میں نے تم سے پوچھا، اس نے کبھی جھوٹ بولا؟ تو تم نے کہا نہیں۔ اور ایسا کبھی نہیں ہو سکا کہ جو شخص لوگوں پر جھوٹ باندھنے سے پرہیز کرے وہ اللہ پر جھوٹ باندھے۔
میں نے تم سے پوچھا، کہ اس کی اطاعت امیروں نے کی ہے یا غریبوں نے تو تم نے کہا غریبوں نے۔ اور پیغمبروں کے تابعدار غریب ہی ہوتے ہیں۔
میں نے تم سے پوچھا کہ اس کے پیروکار بڑھ رہے ہیں یا گھٹ رہے ہیں تو تم نے کہا بڑھ رہے ہیں۔ اور ایمان کا یہی حال ہوتا ہے تا آنکہ وہ پورا ہو جائے۔
میں نے تم سے پوچھا کہ کوئی شخص اسلام لانے کے بعد اس سے بیزار ہو کر نکلا بھی ہے؟ تو تم نے کہا نہیں۔ اور ایمان کا یہی حال ہے جب اس کی بشاشت دل میں سما جاتی ہے۔
میں نے پوچھا، وہ عہد شکنی کرتا ہے تو تم نے کہا نہیں۔ اور پیغمبر کبھی اپنا عہد نہیں توڑا کرتے۔
میں نے پوچھا: وہ تمہیں کیا حکم دیتا ہے تو تم نے کہا کہ اللہ کی عبادت کرو۔ کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔ وہ تمہیں بت پرستی سے منع کرتا ہے۔ نماز، سچائی کا اور حرام کاری سے بچ رہنے کا حکم دیتا ہے اگر تمہاری یہ سب باتیں سچ ہیں تو وہ عنقریب اس جگہ کا

مالک ہو جائے گا جہاں میرے یہ پاؤں ہیں۔ اور میں یہ جانتا تھا کہ یہ پیغمبر آنے والا ہے لیکن یہ نہیں سمجھتا تھا کہ وہ تم میں سے ہو گا اور اگر میں جانوں کہ میں اس تک پہنچ جاؤں گا تو اسے ضرور ملنے کی کوشش کروں گا اور اگر میں اس کے پاس ہوتا تو اس کے پاؤں دھوتا"

یہ کہہ کر بادشاہ نے آپ کا نامہ مبارک سب کے سامنے پڑھ کر سنایا۔ جب درباریوں اور امیروں، وزیروں نے بادشاہ کو اس حد تک اسلام کی طرف مائل دیکھا تو غصہ سے ان کے نتھنے پھولنے اور آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔ شور مچا اور آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کو وہاں سے نکال دیا گیا۔ ابوسفیان کہتے ہیں کہ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ابوکبشہ کے بیٹے (یہ آپ کے رضاعی باپ کی کنیت تھی اور ابوسفیان نے ازراہِ حقارت یہ نام لیا تھا) کا تو بڑا درجہ ہو گیا۔ اس سے تو رومیوں کا بادشاہ ڈرتا ہے۔ اس دن سے مجھے یقین ہو گیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) غالب ہوں گے۔ تا آنکہ اللہ نے مجھے مسلمان کر دیا۔ (بخاری۔ باب کیف کان بدء الوحی)

❁ اعیان سلطنت کی اسلام سے نفرت اور قیصر روم کی بے بسی:۔ رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے ہرقل نے دوسرا کام یہ کیا کہ آپ کا نامہ مبارک ایک ممتاز عالم دین اور اپنے دوست ضغاطر کے پاس بھیج دیا۔ بعد میں خود بھی اس کے پاس پہنچ گیا۔ نبی آخر الزمان کے ظہور کے متعلق ضغاطر کی رائے بھی ہرقل کے موافق ثابت ہوئی۔ جسے ہرقل نے اپنی بھرپور تائید سمجھ کر رومی سرداروں کو اپنے حمص والے محل میں بلایا۔ اس کے دروازے بند کروا دیئے اور خود بالاخانے سے برآمد ہوا اور کہنے لگا۔ رومی سردارو! کیا تم اپنی کامیابی، بھلائی اور اپنے اپنے مناصب پر بحال رہنا چاہتے ہو؟ اگر چاہتے ہو تو اس نبی کی بیعت کر لو یہ سنتے ہی وہ لوگ مشتعل ہو کر جنگلی گدھوں کی طرح دروازوں کی طرف لپکے۔ دیکھا تو وہ بند ہیں۔ جب ہرقل کو معلوم ہوا کہ انہیں ایمان لانے سے اس قدر نفرت ہے اور ان کے ایمان لانے سے ناامید ہو گیا تو کہنے لگا، ان سرداروں کو میرے پاس لاؤ۔ جب وہ آئے تو انہیں کہنے لگا کہ میں نے یہ بات صرف تمہیں آزمانے کو کہی تھی کہ تم اپنے دین میں کتنے مضبوط ہو اور وہ مجھے معلوم ہو گیا اس پر سرداروں نے اسے سجدہ کیا اور اس سے خوش ہو گئے یہ تھی ہرقل کی آخری صورت حال" (بخاری۔ باب کیف کان بدء الوحی)

اس طویل حدیث سے، جسے امام مسلم نے پورے کا پورا درج کیا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہرقل کو پورا یقین ہو چکا تھا کہ محمد ﷺ اللہ کے سچے پیغمبر ہیں اور وہ دل سے ایمان لا بھی چکا تھا مگر اعیان سلطنت کے ڈر سے اپنے اس ایمان کا برملا اظہار نہ کر سکا۔ وہ نہ تو اپنی رعایا کی رائے عامہ کو اپنے حق میں سازگار کرنے میں کامیاب ہو سکا اور نہ ہی ایسی جرأت کا مظاہرہ کر سکا کہ ایمان کی خاطر خود سلطنت سے دستبردار ہو جائے وہ اپنے اعیان سلطنت سمیت ایمان لانا چاہتا تھا تاکہ اسلام لانے کے بعد سلطنت بھی اسی کے پاس رہے۔ لیکن اس کے متعصب اعیان سلطنت نے اس کی یہ آرزو پوری نہ ہونے دی۔

۲۔ دوسری بڑی سلطنت شہنشاہ ایران یا کسریٰ فارس کی تھی۔ اس کا نام پرویز تھا۔ نوشیروان عادل کا پوتا اور ہرمز کا بیٹا تھا۔ انتہائی متکبر انسان اور کبر و نخوت کا پتلا تھا۔ زرتشتی مذہب کا قائل تھا، نہ آخرت کا قائل تھا نہ انبیاء کا۔ مشرک اور آتش پرست تھا۔ مسلمانوں کے مقابلہ میں قریش مکہ کی ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں اور اسے ہی بدر کے دن قیصر روم کے ہاتھوں شکست بھی ہوئی تھی۔ اس کی طرف رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن حذافہ کو اپنا نامہ مبارک دے کر بھیجا اور فرمایا کہ یہ خط بحرین کے حاکم

منذر بن ساویٰ کو پہنچائے وہ اسے شاہ ایران تک پہنچادے گا۔ خط کا مضمون یہ تھا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم...... محمد رسول اللہ کی طرف سے عظیم فارس کے نام۔ سلامتی اس شخص کے لئے جو ہدایت کی اتباع کرے۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور یہ کہ اللہ نے مجھے تمام دنیا کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تاکہ وہ ہر زندہ شخص کو اللہ کا خوف دلائے۔ اسلام قبول کر لو تو سلامت رہو گے اور اگر تم نے یہ بات تسلیم نہ کی تو تمام مجوس کا بار گناہ بھی تم پر ہو گا"

❁ پرویز کا آپ ﷺ کے نامہ مبارک کو پھاڑنا اور اس کا قتل ہونا:۔ عجم کا طریقہ یہ تھا کہ جو خط سلاطین کو لکھے جاتے ان میں بادشاہ کا نام سب سے پہلے ہوتا تھا اور مکتوب نگار کا بعد میں مگر یہاں ترتیب بالکل برعکس تھی سب سے پہلے اللہ کا نام تھا پھر رسول اللہ کا اور پھر کسریٰ کا۔ اسی بات پر ہی وہ سیخ پا ہو گیا۔ سیدنا عبداللہ سے کہا: اگر تم قاصد نہ ہوتے تو میں تمہیں قتل کرا دیتا۔ پھر کہنے لگا کہ میں ایسے گستاخ شخص کے لئے ابھی گرفتاری کا فرمان جاری کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر آپ ﷺ کا نامہ مبارک پھاڑ ڈالا۔ اور کچھ عرصہ بعد جب سیدنا عبداللہ نے واپس آکر رسول اللہ ﷺ کو اس کے خط پھاڑنے کا قصہ سنایا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ ایسے ہی اس کی سلطنت کو پھاڑ ڈالے گا۔ (بخاری۔ کتاب العلم۔ باب ماذکر فی المناولة وکتاب اھل العلم) چنانچہ آپ کی یہ پیشین گوئی خلفائے راشدین کے دور میں حرف بہ حرف پوری ہو گئی۔

چنانچہ پرویز شاہ ایران نے یمن کے حاکم باذان کو، جو شاہ ایران کا باجگذار تھا، خط لکھا کہ عرب میں جس شخص نے پیغمبری کا دعویٰ کیا ہے اسے گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دو۔ ان دنوں عرب قبائل کی بالکل وہی نوعیت تھی جیسے پاکستان اور آزاد قبائل کی ہے۔ آزاد قبائل کئی باتوں میں آزاد ہیں اور بعض امور میں پاکستان سے ملحق ہیں۔ ایسے ہی کسریٰ عرب قبائل کو اپنی ہی سلطنت کا حصہ تصور کرتا تھا۔ جس کی بنا پر اس نے حاکم یمن کو ایسا خط بھیجا تھا۔ چنانچہ باذان نے دو آدمی مدینہ بھیجے۔ انہوں نے آپ ﷺ کے ہاں پہنچ کر عرض کی کہ شہنشاہ عالم کسریٰ نے آپ ﷺ کو بلایا ہے اگر اس کے حکم کی تعمیل نہ کرو گے تو وہ تمہیں اور تمہارے ملک کو تباہ و برباد کر دے گا۔ آپ ﷺ نے ان قاصدوں سے کہا کہ اب رات ہو گئی ہے۔ تم اب کل آنا۔ دوسرے دن جب وہ حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: کہ تمہارے شہنشاہ عالم کو تو آج رات اس کے بیٹے شیرویہ نے قتل کر ڈالا ہے۔ تم واپس چلے جاؤ اور اسے کہہ دینا کہ اسلام کی حکومت ایران کے پایہ تخت تک پہنچے گی۔

❁ باذان حاکم یمن کا قبول اسلام:۔ جب یہ قاصد واپس یمن پہنچے تو اس وقت تک یمن میں پرویز شاہ ایران کے قتل ہونے کی خبر پہنچ چکی تھی۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر باذان خود بھی مسلمان ہو گیا۔ یہ قاصد بھی اور رعایا کے اور بھی بہت سے لوگ حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

۳۔ ❁ شرحبیل کا قاصد کو قتل کرنا اور غزوہ موتہ:۔ آپ ﷺ نے تیسرا خط حاکم بصریٰ کو لکھا جس کا نام شرحبیل بن عمرو غسانی تھا۔ اس کا علاقہ مدینہ کے شمال یمن شام کی سرحد پر واقع تھا۔ غسانی اگرچہ عرب تھے لیکن ایک مدت سے عیسائی ہو چکے تھے۔ ان کا دارالحکومت بصریٰ تھا اور شرحبیل قیصر روم کے ماتحت اور اس کا باجگزار تھا۔ اس کے پاس آپ ﷺ کے قاصد حارث بن عمیر خط لے کر گئے تو اس بدبخت نے آپ ﷺ کے قاصد کو شہید کر دیا۔ یہ چونکہ بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی اور اعلان جنگ کے مترادف تھا۔ لہٰذا آپ ﷺ نے اس کے خلاف لشکر کشی کی تیاری شروع کر دی اور جمادی الاول ۸ھ میں تین

ہزار کا لشکر روانہ فرمایا اور اس کا سپہ سالار زید بن حارثہ کو مقرر فرمایا۔ جو آپ کے آزاد کردہ غلام تھے اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اگر زید شہید ہو جائیں تو پھر جعفر طیار جھنڈا سنبھالیں اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ سپہ سالار ہوں گے" (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب غزوۃ موتہ من ارض الشام) اس لشکر کو رخصت کرنے کے لئے آپ بنفسِ نفیس مدینہ سے باہر کچھ دور تک تشریف لے گئے۔

شرحبیل کو بھی اسلامی لشکر کشی کی خبر ہو چکی تھی۔ اس نے اس مقابلہ کے لئے ایک لاکھ فوج تیار کی اس کے علاوہ اس کے جھنڈے تلے عرب قبائل کے مزید ایک لاکھ افراد بھی جمع ہو گئے جب مسلمانوں کو اس صورت حال کا علم ہوا وہ تردد میں پڑ گئے کہ تین ہزار اور دو لاکھ کی کیا نسبت ہے؟ چنانچہ سیدنا زیدؓ کی رائے یہ تھی کہ ابھی توقف کیا جائے اور رسول اللہ ﷺ کو مطلع کر کے مدینہ سے مزید کمک منگوائی جائے۔ لیکن عبداللہ بن رواحہ کہنے لگے کہ ہم تو شہادت کے متمنی ہیں۔ فتح و شکست اللہ کے ہاتھ میں ہے پھر ہم تاخیر کیوں کریں۔ چنانچہ فوری طور پر مقابلہ کرنے پر سب کا اتفاق ہو گیا۔

❁ اسلامی لشکر کی بے مثال جرأت:۔ موتہ کے مقام پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ اگرچہ مسلمان شوقِ شہادت میں انتہائی بے جگری سے لڑے مگر تین ہزار کا مقابلہ دو لاکھ سے تھا۔ صحابہ کرام نے بہادری و شجاعت کے بے مثال کارنامے انجام دیئے۔ زید بن حارثہؓ شہید ہو گئے تو جھنڈا جعفر طیارؓ نے جو سیدنا علیؓ کے حقیقی بھائی تھے سنبھالا آپ کا دایاں ہاتھ کٹ گیا تو جھنڈا بائیں ہاتھ میں سنبھالے رکھا۔ وہ بھی کٹ گیا تو ٹانگوں سے دبائے اور اٹھائے رکھا۔ آپ جس بے جگری اور بہادری سے لڑے۔ اس کے متعلق عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ جب جعفر شہید ہو گئے تو میں ان کی لاش پر کھڑا ہوا۔ میں نے ان کے جسم پر تیروں اور تلواروں کے پچاس زخم دیکھے اور ان میں سے کوئی زخم بھی ان کی پشت پر نہیں تھا۔ (بخاری۔ حوالہ ایضاً) لیکن لڑائی کے بعد جب سب لوگوں نے یہ نشان شمار کئے تو یہ نوے (۹۰) نشان تھے۔ (حوالہ ایضاً) ان کے دونوں بازو کٹ گئے تھے ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے بتایا کہ انہیں جنت میں دو پر عطا کئے گئے اسی نسبت سے ان کا لقب طیار بھی مشہور ہو گیا تھا اور ذوالجناحین بھی۔ چنانچہ عبداللہ بن عمرؓ عبداللہ بن جعفر سے سلام کرتے تو کہتے: دو پروں والے کے بیٹے! تم پر سلام۔ (بخاری۔ حوالہ ایضاً)

سیدنا جعفرؓ کے بعد عبداللہ بن رواحہؓ نے جھنڈا سنبھالا اور بالآخر وہ بھی شہید ہو گئے۔ اب سیدنا خالد بن ولیدؓ نے جھنڈا سنبھالا۔ خالد بن ولیدؓ آزمودہ کار جرنیل تھے۔ جنگ احد میں انہوں نے درہ خالی دیکھ کر حملہ کر کے مسلمانوں کو شکست سے دوچار کر دیا تھا۔ آپ نے باقی فوج کو اس انداز سے از سرِ نو ترتیب دیا کہ وہ اپنی اصل تعداد میں بہت زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ یہ صورت حال دیکھ کر دشمن نے جو ان سے بیسیوں گنا زیادہ تھے اسلامی لشکر کو ہر طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ سیدنا خالد نے پورے جوش سے حملہ کر کے ایک مقام سے اس گھیرے کو توڑ دیا اور اسلامی فوج کو دشمن کے محاصرہ سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ ادھر یہ کارروائی ہو رہی تھی ادھر مدینہ میں رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو ان الفاظ میں اطلاع دے دی۔ "پہلے زید نے جھنڈا سنبھالا وہ شہید ہوئے، پھر جعفرؓ نے جھنڈا سنبھالا وہ شہید ہوئے، پھر عبداللہ بن رواحہؓ نے سنبھالا وہ شہید ہوئے اور آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ پھر فرمایا اس کے بعد اللہ کی تلواروں میں ایک تلوار نے جھنڈا سنبھالا یہاں تک کہ اللہ نے اس کے ہاتھ پر فتح دی" (بخاری۔ حوالہ ایضاً)

۞ خالد بن ولید سیف اللہ کا نمایاں کارنامہ:۔ چنانچہ اسی دن سے سیدنا خالد بن ولیدؓ کا لقب "سیف اللہ" یعنی اللہ کی تلوار مشہور ہو گیا۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ غزوہ موتہ کے دن میرے ہاتھ پر نو تلواریں ٹوٹیں صرف ایک یمنی تیغہ میرے ہاتھ میں رہ گیا تھا۔ (بخاری۔ حوالہ ایضا) آپ کا نمایاں کارنامہ یہ تھا کہ آپ نے اسلامی لشکر کو دشمن کے نرغہ سے نکال لیا۔ اور خیر و عافیت سے بچالائے اور اسی بات کو رسول اللہ ﷺ نے فتح قرار دیا تھا۔

جب یہ لشکر واپس مدینہ آیا تو بعض صحابہ کو یہ شبہ ہوا کہ یہ لوگ جنگ سے بھاگ آئے ہیں اور انہیں ایسا طعنہ بھی دیا لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس کی پرزور تردید فرمائی اور فرمایا یہ جنگی بھگوڑے نہیں بلکہ پینترا بدل کر لڑنے والوں کے ضمن میں آتے ہیں۔ جس میں اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ ابھی ہمارا کام باقی ہے۔ اور وہ باقی کام غزوہ تبوک تھا۔ جس کا ذکر سورہ توبہ میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔

۴۔ ۞ نجاشی کے نام خط: اس کا جواب اور قبول اسلام:۔ چوتھا خط آپ ﷺ نے نجاشی شاہ حبشہ کے نام لکھا۔ حبشہ میں مسلمان مہاجرین مقیم تھے اور نجاشی نے ان سے نہایت اچھا سلوک کیا یہ خود عیسائی تھا اور قیصر روم کا باجگوار تھا۔ مگر اسلام کی دعوت کو دل سے تسلیم کر چکا تھا۔ اور بعض روایات کے مطابق اس نے سیدنا جعفر طیار کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کی طرف آپ ﷺ نے عمرو بن امیہ ضمری کو نامہ مبارک دے کر بھیجا جس کا مضمون یہ تھا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم...... محمد رسول اللہ کی طرف سے نجاشی اصحمہ شاہ حبش کے نام۔ تجھ پر سلام ہو میں اللہ کی حمد و ستائش کرتا ہوں جو پاک ہے۔ اور ایمان اور سلامتی دینے والا ہے اور میں شہادت دیتا ہوں کہ عیسیٰ بن مریم اللہ کی مخلوق اور اس کا کلمہ ہیں۔ جسے اللہ نے پاکباز مریم کی طرف القاء کیا اور وہ عیسیٰ سے حاملہ ہوئیں تو اللہ نے انہیں پیدا فرمایا' اپنے نفخہ اور اپنے روح سے۔ میں تمہیں اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہوں۔ ایمان لے آؤ تو سلامتی سے رہو گے اور میری پیروی کرو کیونکہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ میں نے اس سے پہلے اپنے چچیرے بھائی جعفرؓ کو مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ تمہارے پاس بھیجا ہوا ہے۔ انہیں آرام سے رکھنا۔ نجاشی تکبر چھوڑو۔ میں تمہیں اور تمہارے درباریوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں دیکھو! میں نے تمہیں اللہ کا حکم پہنچا دیا اور خوب سمجھا دیا۔ اب مناسب ہے کہ میری نصیحت قبول کرو اور سلامتی اس شخص کے لئے ہے جو ہدایت قبول کرے۔

جب یہ خط نجاشی کو ملا تو اس نے جعفر کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا اور جواباً رسول اللہ ﷺ کو تحریر کیا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم...... محمد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں نجاشی اصحم بن ابجر کی طرف سے۔ اے اللہ کے نبی! آپ ﷺ پر اللہ کی سلامتی، رحمت اور برکتیں ہوں اس اللہ کی جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور جس نے ہمیں اسلام کی طرف ہدایت فرمائی۔ امابعد۔ آپ کا فرمان میرے پاس پہنچا سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق آپ ﷺ نے تحریر فرمایا ہے، اللہ کی قسم وہ اس سے ذرہ بھر بھی بڑھ کر نہیں ہم نے آپ کی تعلیم سیکھ لی ہے اور آپ کا چچا زاد بھائی اور مسلمان میرے پاس آرام سے ہیں۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ آپ ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ میں نے آپ ﷺ کے چچیرے بھائی کے ہاتھ پر بیعت اور اللہ کی فرمانبرداری کا اقرار کر لیا ہے اور آپ ﷺ کی خدمت میں اپنے بیٹے ارہا کو روانہ کرتا ہوں۔ اگر آپ ﷺ کا یہ منشا ہو کہ میں خود آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوں تو میں ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔ کیونکہ میں یقین رکھتا ہوں کہ آپ ﷺ جو فرماتے

ہیں، وہی حق ہے۔ والسلام علیک یارسول اللہ ﷺ۔

ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ نجاشی نے اپنے بیٹے ارہا کو ساٹھ آدمیوں کے ہمراہ روانہ کیا مگر راستہ میں یہ جہاز مسافروں سمیت غرق ہو گیا۔

۵۔ ❁ مقوقس مصر کا جواب اور تحائف:۔ ان دنوں مصر کے حکمران مقوقس کہلاتے تھے۔ مصر کا مقوقس عیسائی اور اہل علم آدمی تھا اور قیصر روم کے زیر اثر تھا۔ اس کا دارالحکومت موجودہ اسکندریہ تھا۔ اس کے ہاں آپ ﷺ نے حاطب بن ابی بلتعہ کو درج ذیل خط دے کر روانہ فرمایا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم...... محمد رسول اللہ کی طرف سے مقوقس مصر قبط کے نام۔ اس پر سلامتی ہے جس نے ہدایت کا اتباع کیا۔ بعد ازاں میں تمہیں اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ مسلمان ہو جاؤ، سلامتی پاؤ گے اور اللہ تمہیں دگنا اجر عطا فرمائے گا۔ اور اگر تم نے نہ مانا تو تمام قبطیوں کا بار گناہ تم پر ہوگا۔ اے اہل کتاب اس کلمہ کی طرف آؤ۔ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں۔ پھر اگر وہ اعراض کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ گواہ رہو کہ ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں۔

مقوقس بھی حقیقت سمجھ چکا تھا مگر اسے بھی قیصر روم کی طرح اسلام لانے کی جرأت نہ ہوئی تاہم اس نے قاصد کو جواب میں ایک خط اور کچھ تحائف دے کر عزت واحترام کے ساتھ رخصت کیا۔ خط کا مضمون یہ تھا:

محمد بن عبداللہ کی طرف مقوقس رئیس قبط کی طرف سے سلام علیک کے بعد۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے لیکن میں سمجھتا تھا کہ وہ شام میں ظہور کرے گا۔ میں نے آپ ﷺ کے قاصد کی عزت کی۔ دو لڑکیاں بھیج رہا ہوں جن کی قبطیوں میں بہت عزت کی جاتی ہے۔ اور میں آپ ﷺ کے لئے کپڑا اور آپ کی سواری لئے ایک خچر بطور ہدیہ بھیجتا ہوں۔ والسلام

یہ دو لڑکیاں جن کا نام ماریہ اور سیرین تھا۔ راہ میں ہی حاطب بن ابی بلتعہ کی تبلیغ سے مسلمان ہو گئی تھیں یہ شاہی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان میں سے ماریہ سے تو آپ ﷺ نے خود نکاح کر کے حرم میں شامل کر لیا اور اسی کے بطن سے سیدنا ابراہیم پیدا ہوئے اور سیرین سیدنا حسان بن ثابت کے حبالہ عقد میں آئیں۔ اور یہ دونوں حقیقی بہنیں تھیں۔ اور خچر سفید رنگ کی قد آور اور خوبصورت تھی اس کا نام دُلدُل تھا۔ جنگ حنین میں آپ ﷺ اسی خچر پر سوار تھے۔

۶۔ ❁ والی بحرین کا قبول اسلام:۔ چھٹا خط آپ ﷺ نے منذر بن ساویٰ والی بحرین کے نام سیدنا علاء بن حضرمی کے ہاتھ روانہ فرمایا۔ یہ حکمران ساسانی یا ایرانی بادشاہوں کے زیر اثر اور باجگزار تھے اور رعایا میں سے کچھ لوگ یہودی تھے اور کچھ مجوسی۔ جب اس کے پاس آپ کا گرامی نامہ پہنچا تو اس نے اسلام قبول کر لیا لیکن اس کی رعایا میں کچھ لوگ تو مسلمان ہو گئے اور کچھ اپنے سابقہ مذہب پر قائم رہے۔ ان کے متعلق منذر نے بارگاہ رسالت سے حکم دریافت فرمایا۔ آپ نے منذر کی سعادت اور صلاحیت کو بنظر عزت دیکھا اور یہود اور مجوس سے جزیہ وصول کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ یہ جزیہ تو مدینہ کے بیت المال میں جاتا تھا اور بحرین کی حکومت ان ہی کے پاس رہی۔

۷۔ ❁ اہل عمان کا قبول اسلام:۔ عمان میں جیفر بن جلندی اور عبد بن جلندی دو بھائیوں کی حکومت تھی۔ آپ ﷺ نے ان

کے پاس سیدنا عمرو بن عاص کو اپنا خط دے کر بھیجا۔ ان دونوں بھائیوں نے سیدنا عمرو بن عاص کے ساتھ طویل مکالمہ اور گہرے غور و خوض کے بعد اسلام قبول کر لیا اور ان کے اثر سے رعایا کا اکثر حصہ بھی اسلام لے آیا۔

۸۔ ۞ والی یمامہ ہوذہ کی شرط قبولِ اسلام اور آپ کا جواب:۔ آٹھواں خط آپ نے ہوذہ بن علی والی یمامہ کے نام لکھا جو قبیلہ بنو حنیفہ کا رئیس تھا۔ سیدنا سلیط بن عمر بن عبد شمس اس کے ہاں آپ ﷺ کا نامہ مبارک لے کر گئے۔ ہوذہ نے قاصد رسول کی خوب عزت و تکریم کی اور تحائف بھی دیئے اور جواب میں آپ کو لکھا کہ جن باتوں کی طرف آپ بلاتے ہیں ان کے مستحسن ہونے میں کوئی شک نہیں۔ مگر آپ ﷺ کو معلوم ہے کہ اہل عرب مجھے عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کے دلوں میں میری ہیبت بیٹھی ہوئی ہے۔ اس لئے اگر حکومت کا نصف حصہ اور مخصوص اختیارات مجھے دیئے جائیں تو اسلام لانے کے لئے تیار ہوں۔ آپ ﷺ نے یہ خط دیکھ کر فرمایا کہ ایک بالشت بھر زمین بھی مانگے تو نہیں مل سکتی۔ وہ خود اور اس کا مال و متاع عنقریب فنا ہونے والا ہے۔ پھر جب آپ فتح مکہ کے بعد عازم مدینہ ہوئے تو بذریعہ وحی آپ کو خبر مل گئی کہ ہوذہ حاکم یمامہ اس دنیا کو چھوڑ گیا ہے نیز آپ ﷺ نے صحابہ کو یہ اطلاع بھی دی کہ یمامہ میں ایک جھوٹا مدعی نبوت پیدا ہوگا جو میرے بعد قتل کیا جائے گا۔ چنانچہ مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اس کا قصہ سورہ مائدہ کے حاشیہ نمبر ۹۶ اور سورہ احزاب کے حاشیہ نمبر ۶۶ میں مذکور ہے۔ یہ جھوٹا نبی آپ ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق خلافتِ صدیقی میں سیدنا حبشی کے ہاتھوں مارا گیا۔

۹۔ آپ ﷺ نے نواں خط حارث بن ابی عمر غسانی حاکم (دمشق) حدود شام کی طرف سیدنا شجاع بن وہب کو دے کر بھیجا۔ یہ دمشق اور آس پاس کے علاقوں کا حاکم اور قیصر روم کا باجگذار تھا۔ جب اسے نامہ مبارک ملا تو پہلے تو بہت بگڑا اور مدینہ پر حملہ کی دھمکی بھی دی مگر بعد میں آپ ﷺ کے قاصد کو عزت و احترام کے ساتھ رخصت کیا۔ لیکن اسلام قبول نہیں کیا۔

۞ تبلیغی خطوط کے اندرون و بیرون عرب اثرات:۔ ہمسایہ ممالک میں آپ ﷺ کے خطوط بھیجنے اور اس کے رد عمل سے اسلام اور مسلمانوں کو چند در چند فوائد حاصل ہوگئے۔ مثلاً

(۱) اس ذریعہ سے آپ ﷺ نے تبلیغ رسالت کا فریضہ انجام دیا جو اللہ کی طرف سے آپ ﷺ پر گرانبار ذمہ داری تھی اور پہلے اس کا موقعہ نہیں مل رہا تھا۔

(۲) ان تبلیغی خطوط سے بعض حکمران اور ان کی رعایا اسلام لے آئے جیسے حبشہ، یمن، عمان اور بحرین کے حکمرانوں نے اسلام قبول کر لیا۔ رعایا میں سے بھی بہت سے مسلمان ہوگئے۔ اور کچھ حکمران اسلام کے قریب ہوگئے۔ تاہم اسلام کی آواز عرب سے باہر دور دور تک پہنچ گئی۔

(۳) غزوہ موتہ اور اس کے نتائج نے یہ ثابت کر دیا کہ اب اسلامی حکومت کسی بڑی سے بڑی سلطنت سے ٹکر لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ قیصرِ روم کے اعیان سلطنت جو دعوت اسلام پر نتھنے پھلانے لگے تھے ان کے دماغ سے فرعونیت کا بت ٹوٹ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ غزوہ تبوک میں آپ ﷺ وہاں بیس دن مقیم رہے لیکن غسانیوں اور رومیوں کو مقابلے پر آنے کی جرأت نہ ہوئی۔

(۴) اندرونِ عرب بھی مشرک قبائل اور بالخصوص قریش مکہ پر مسلمانوں کا ایسا رعب طاری ہوا کہ فتح مکہ کے موقعہ پر کسی بھی

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾ قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ
يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا
الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚۖ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى

مگر اکثر لوگ جانتے [۴۴] نہیں۔(۲۸) اور یہ لوگ آپ سے کہتے ہیں کہ: "اگر تم سچے ہو تو یہ وعدہ (قیامت) کب پورا ہو گا؟" (۲۹) آپ انہیں کہئے کہ تمہارے لئے وعدہ کا ایک دن مقرر ہے۔ تم اس سے ایک گھڑی بھی نہ پیچھے رہ سکو گے [۴۵] اور نہ آگے جا سکو گے۔(۳۰)

اور کافر کہتے ہیں کہ ہم نہ تو اس قرآن پر ایمان لائیں گے اور نہ اس کتاب پر جو اس سے پہلے موجود [۴۶] ہے۔ کاش آپ ان ظالموں کو دیکھتے جب وہ اپنے پروردگار کے حضور کھڑے ہوں گے اور ایک دوسرے [۴۷] کی

قریشی اتحاد کو مقابلے پر آنے کی سکت نہ رہی۔ اور یہ سب کچھ ان تبلیغی خطوط اور ان کے رد عمل کا نتیجہ تھا۔

[۴۴] آپ ﷺ افضل الانبیاء بھی ہیں اور خاتم النبیین بھی:۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ پیغمبری کیا چیز ہے؟ اور کس قدر ارفع و اعلیٰ مقام ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ اللہ نے آپ ﷺ کو کس قدر بلند مقام پر فائز کیا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ وہ آپ ﷺ کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ کی کس عظیم نعمت کا انکار کر رہے ہیں اور وہ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ آپ کا انکار کر کے انہیں کس قدر برے انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔

[۴۵] یعنی یہ تو اللہ ہی کو معلوم ہے کہ ابھی اس نے کتنے انسان اور پیدا کرنے ہیں۔ جن کا اسی دنیا اور اس نظام کائنات کے تحت امتحان لیا جانے والا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس کے پہلے سے طے شدہ سکیم کے مطابق ہو رہا ہے۔ وہ ہو کے رہے گا۔ تمہارے طلب کرنے یا جلدی مچانے سے یا پوچھتے رہنے سے وہ وقت سے پہلے نہیں آسکتا ہاں جب اس کا وقت آگیا تو پھر اس میں تاخیر ناممکن ہے۔ لہٰذا کرنے کا کام یہ ہے کہ اس دن کے آنے سے پہلے پہلے جو بہتر سے بہتر کام تم اپنے لئے کر سکتے ہو کر لو۔

[۴۶] یعنی مشرکینِ مکہ صرف قرآن کے ہی منکر نہ تھے۔ بلکہ پہلی آسمانی کتابوں مثلاً تورات، انجیل وغیرہ کے بھی منکر تھے اور ان کے انکار کی وجہ یہ تھی کہ ان سب کتابوں کے مرکزی اور بنیادی مضامین ملتے جلتے تھے۔ سب کتابوں میں توحید کی دعوت دی گئی تھی اور شرک کو ناقابلِ معافی جرم قرار دیا گیا تھا۔ اسی طرح عقیدہ آخرت کے بارے میں بھی سب الہامی کتابیں ایک دوسری کی تائید و توثیق کرتی تھیں۔ اور یہی دو باتیں تھیں جن پر محاذ آرائی شروع ہو چکی تھی۔ اور مشرکینِ مکہ انہیں کسی قیمت پر بھی ماننے کو تیار نہ تھے۔ لہٰذا سب الہامی کتابوں کا انکار کر دیتے تھے۔

[۴۷] قرآن کریم میں ان دو فریقوں کا مکالمہ بہت سے مقامات پر مذکور ہے۔ ایک فریق مطیع ہے یعنی کمزور قسم کے لوگ جو اپنے بڑوں کی اطاعت کرتے رہے۔ اور دوسرا فریق مطاع ہے یعنی بڑے لوگ جن کی اطاعت کی جاتی رہی۔ پھر ان بڑے لوگوں میں حکمران بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ سیاسی لیڈر، چودھری بھی، مولوی بھی، پروفیسر بھی یعنی ہر وہ شخص جو دینی یا دنیوی لحاظ سے عام لوگوں پر فوقیت رکھتا ہو۔ اور اس کی بات تسلیم کی جاتی رہی ہو اور یہ مکالمہ جہنم میں داخلہ سے پیشتر ہو گا۔ تاہم اس

بَعْضِ ۨ الْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ الَّذِيْنَ
اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَاۗءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾
وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ
وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۭ وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْٓ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

بات کا جواب دیں گے۔ جو لوگ (دنیا میں) کمزور سمجھے جاتے تھے وہ بڑا بننے والوں[۴۸] سے کہیں گے کہ "اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے" (۳۱) اور جو بڑا بنتے تھے وہ کمزور لوگوں کو جواب دیں گے کہ: "جب تمہارے پاس ہدایت آگئی تھی تو کیا ہم نے تمہیں اس سے[۴۹] روکا تھا؟ بلکہ تم خود ہی مجرم تھے۔ (۳۲)

اور جو کمزور سمجھے جاتے تھے وہ بڑا بننے والوں سے کہیں گے: "بات یوں نہیں بلکہ یہ تمہاری شب و روز کی چالیں تھیں جب تم ہمیں[۵۰] حکم دیتے تھے کہ ہم اللہ کا انکار کریں اور اس کے شریک بنائیں" پھر جب وہ عذاب دیکھیں گے تو اپنی[۵۱] ندامت کو چھپائیں گے اور ہم ان کافروں کی گردنوں میں طوق ڈال دیں گے۔

وقت تک سب لوگوں کو اپنا انجام معلوم ہو چکا ہوگا۔

[۴۸] مطیع اور مطاع لوگوں کا مکالمہ:۔ کمزور لوگ یا اطاعت کرنے والے اپنے بڑے بزرگوں سے کہیں گے کہ ہماری گمراہی کا باعث تو تم ہی لوگ تھے۔ اگر تم لوگ ہمیں انبیاء علیہم السلام کے خلاف استعمال نہ کرتے تو ہم یقیناً ان پر ایمان لے آتے اور اس برے انجام سے ہمیں دوچار نہ ہونا پڑتا۔

[۴۹] یعنی انبیاء علیہم السلام نے جیسی دعوت ہمیں دی تھی ویسی ہی تمہیں بھی دی تھی۔ ہم نے زبردستی کسی کو بھی ان کی دعوت قبول کرنے سے نہیں روکا تھا۔ اگر تم ایمان لانا چاہتے تو ہم تمہیں کیسے روک سکتے تھے۔ اس کے بجائے حقیقت یہ ہے کہ تم خود بھی انبیاء علیہم السلام کی پیش کردہ دعوت اور اس کی پابندیوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے نہ ہی تم ان سختیوں کو برداشت کرنے پر آمادہ تھے جو انبیاء علیہم السلام کو ماننے والوں کو پیش آتی تھیں۔ اس لحاظ سے ہم اور تم دونوں ایک جیسے مجرم ہیں۔ اگر کچھ فرق ہے تو یہ صرف یہ کہ ہم نے تمہیں اپنی طرف بلایا۔ اور ہمارا یہ بلانا چونکہ تمہارے اپنے ہی ضمیر کی آواز اور اپنی ہی خواہش نفس کی تکمیل تھی۔ لہذا تم نے فوراً ہماری دعوت کو قبول کر لیا۔ اس وقت حقیقت میں تم ہماری پیروی نہیں بلکہ اپنے نفس اور اپنے مفادات کی پیروی کر رہے تھے۔ ورنہ تم لوگ ہم سے تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ اگر تم ایمان لانا چاہتے اور اس کام میں مخلص ہوتے تو تم ہمارا بھی ناطقہ بند کر سکتے تھے کیونکہ اکثریت میں تم تھے ہم نہیں تھے۔

[۵۰] اب عوام اپنے لیڈروں اور پیشواؤں سے یوں مخاطب ہوں گے کہ تمہارے دن رات کے پروپیگنڈے سے ہی ہم متاثر ہو جاتے تھے تم ہمیں پھانسنے کے لئے ہر روز کوئی نئے سے نیا جال لاتے رہے۔ تم لوگ نام تو اسلام کا لیتے رہے مگر حقیقتاً تم اپنی ہی حکومت اور اپنی ہی چودھراہٹ چاہتے تھے۔ تمہارے جھوٹے پروپیگنڈہ نے ہماری مت مار دی تھی۔ اور ہم تمہیں مخلص سمجھ کر تمہارا ساتھ دیتے رہے۔ لہذا ہماری گمراہی کا باعث تم ہی لوگ ہو۔

[۵۱] ان دونوں فریقوں کے مکالمہ سے ہر فریق کو معلوم ہو جائے گا کہ دونوں فریق قصوروار ہیں۔ اور یہ مکالمہ محض بحث

هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٣٣﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ ﴿٣٤﴾ وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ﴿٣٥﴾ قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٦﴾ وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُم

انہیں ایسا ہی بدلہ دیا جائے گا جیسے وہ کام کیا کرتے تھے۔(۳۳) اور ہم نے جس بستی میں بھی کوئی رسول بھیجا تو اس کے کھاتے پیتے لوگوں نے اسے یہی کہا کہ: ”جو پیغام تم لے کر آئے ہو، ہم اس کے[۵۲] منکر ہیں(۳۴) اور یہ بھی کہا کہ: ”ہم مال اور اولاد[۵۳] کے لحاظ سے تم سے بڑھ کر ہیں اور ہمیں کوئی عذاب نہیں دیا جائے گا۔(۳۵)

آپ ان سے کہیے کہ: رزق تو میرا پروردگار جس کے لئے چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہے کم بھی کر دیتا ہے لیکن اکثر لوگ (یہ بات) جانتے[۵۴] نہیں(۳۶) تمہارے اموال اور اولاد ایسی چیزیں نہیں ہیں

برائے بحث ہی ہے۔ لہٰذا ہم ان دونوں کو ایک جیسی سزا دیں گے ان کے گلوں میں طوق اور پاؤں میں زنجیریں ڈال کر انہیں جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

[۵۲] انبیاء کی مخالفت میں سب سے پیش پیش آسودہ حال لوگ ہوتے ہیں:۔ یہ صرف قریش مکہ کی بات نہیں بلکہ ہر نبی کے ساتھ (اور اسی طرح آپ ﷺ کے ساتھ) یہی معاملہ پیش آیا کہ جب نبی نے انہیں اللہ کا پیغام پہنچایا تو اس کی مخالفت کرنے میں سب سے پیش پیش وہی لوگ تھے جو خوشحال اور آسودہ تھے۔ جن کے پاس کوٹھیاں اور بنگلے تھے۔ نوکر چاکر تھے۔ بنک بیلنس بھی موجود تھا اور سواریاں بھی خاصی تعداد میں تھیں۔ ایسے لوگ بھلا پیغمبروں کی بات کاہے کو مانتے جبکہ پیغمبر انہیں ہر جائز و ناجائز طریقے سے مال جمع کرنے سے روکتے تھے۔ پھر وہ یہ بھی کہتے تھے کہ سارا مال و دولت اپنے پاس ہی سمیٹ کر نہ رکھو بلکہ اس سے اقرباء اور محتاجوں کا حق ادا کرو۔ پھر اگر وہ لوگ پیغمبروں کی دعوت قبول کرتے تو انہیں مندرجہ بالا پابندیوں کے علاوہ پیغمبر کا مطیع فرمان بن کر بھی رہنا پڑتا تھا۔ لہٰذا یہ خوشحال طبقہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا کہ نبی کی دعوت کو خود ہی رد کرے بلکہ جن لوگوں پر اس طبقہ کا اثر ورسوخ ہوتا ہے ان سب کو نبی کی مخالفت پر آمادہ کر دیتے ہیں اور اس کام پر وہ پیسہ بھی بے دریغ خرچ کرتے ہیں۔

[۵۳] خوش حال لوگوں کا آخرت کے بارے میں نظریہ:۔ یہ خوشحال طبقہ اپنے انکار کی اصل وجوہ تو بیان نہیں کرتا اور اس کے بجائے ایک ایسی بات کو خوبصورت بنا کر اپنے انکار کی وجہ کے طور پر پیش کر دیتا ہے۔ جو عام دنیادار لوگوں کو بھی معقول معلوم ہوتی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہوتی ہے جسے وہ پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ کہ اللہ تو ہم پر مہربان ہے تم پر نہیں۔ اللہ نے ہمیں کوٹھیاں دی ہیں۔ کاریں دی ہیں، مال و دولت ڈھیروں دیا ہے۔ اولاد عطا کی ہے۔ وہ ہم سے خوش ہے تبھی تو اس نے ہمیں ان نعمتوں سے نوازا ہے۔ اور جس آخرت سے تم ہمیں ڈرا رہے ہو۔ اگر وہ ہوئی بھی تو آخر کیا وجہ ہے کہ جو اللہ آج ہم پر مہربان ہے کل ہم پر مہربان نہ ہو۔ اور ہمیں خواہ مخواہ عذاب دے دے۔

[۵۴] مال دولت کی فراوانی اللہ کی رضا کی دلیل نہیں:۔ وہ یہ بات نہیں سمجھتے کہ رزق کی کمی بیشی کا معاملہ تو اللہ کی مشیت سے تعلق رکھتا ہے، اس کی رضا سے تعلق نہیں رکھتا۔ اللہ کی مشیت یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں اپنے نافرمانوں اور فرمانبرداروں سب کو رزق دے۔ اسی صورت میں اس دنیا میں انسان کی آزمائش ہو سکتی ہے۔ اگر وہ اس دنیا میں نافرمانوں کو رزق نہ دے یا ان

بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ
بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ فِي
الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ

جن سے تم ہمارے ہاں مقرب بن سکو[۵۵]۔ ہاں جو شخص ایمان لائے اور نیک عمل کرے (وہ مقرب بن سکتا ہے)
یہی لوگ ہیں جنہیں ان کے اعمال کا دگنا[۵۶] صلہ ملے گا اور وہ بالاخانوں میں امن و چین[۵۷] سے رہیں گے (۳۷) جو
لوگ ہماری آیات کو نیچا[۵۸] دکھانے میں زور صرف کر رہے ہیں۔ انہیں عذاب میں حاضر کیا جائے گا۔ (۳۸) آپ ان
سے کہئے کہ: ”میرا پروردگار اپنے بندوں میں جس کے لئے چاہے رزق فراخ کر دیتا[۵۹] ہے اور جس کیلئے چاہے کم

پر رزق تنگ کر دے اور اپنے فرمانبرداروں کو ہی رزق دے یا انہیں وافر رزق عطا کرنے لگے۔ تو پھر تو ہر ایک ایمان لے آئے گا اس میں انسانوں کی آزمائش کی کیا گنجائش رہ گئی؟ اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات ظالموں، چوروں، ڈاکوؤں، خائنوں، مکاروں اور فریب کاروں کو وافر رزق عطا کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان صفات کو اور ایسی صفات رکھنے والے لوگوں کو کوئی بھی اچھا نہیں سمجھتا۔ پھر بسا اوقات یوں بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ شریف لوگ سچ بولنے والے، عہد کے پابند، کسی کو ہاتھ یا زبان سے تکلیف نہ پہنچانے والے اللہ کے فرمانبردار اور عبادت گزار لوگ فقر و فاقہ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ حالانکہ ان صفات کو اور ایسی صفات رکھنے والے انسانوں کو سب ہی اچھا سمجھتے ہیں۔ پھر قسم اول کے لوگوں کی آسودگی کو اور قسم دوم کے لوگوں کی تنگی کو اللہ کی رضا کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ جبکہ زبان خلق بھی اس بات کی تردید کر رہی ہے۔

[۵۵] اس جملہ کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ مال اور اولاد ایسی چیزیں نہیں ہیں جو اللہ کے ہاں تقرب کا ذریعہ بن سکیں۔ بلکہ یہی چیزیں اکثر انسانوں کے لئے اللہ کے تقرب کے بجائے الٹا اس کے غضب اور غصہ کا سبب بن جاتی ہیں اور اسے لے ڈوبتی ہیں۔ اس کے بجائے اللہ کے ہاں تقرّب کا معیار ایمان اور اعمال صالحہ ہیں اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایمان لائے اور اعمالِ صالحہ بھی بجا لائے تو یہی مال اور اولاد اس کے لئے اللہ کے ہاں تقرب کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ وہ یوں کہ اپنے مال و دولت کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتا رہے اور اولاد کی صحیح تعلیم و تربیت کر کے اسے اللہ کا فرمانبردار بنا دے۔

[۵۶] ضِعْفٌ (ضد نصف یعنی آدھا) یعنی کسی چیز کی مثل اتنا ہی اور (مفردات القرآن) پھر یہی لفظ کئی گنا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور کتاب و سنت کی صراحت کے مطابق یہ دس گنا بھی ہو سکتا ہے۔ سات سو گنا بھی بلکہ اس سے زیادہ بھی۔

[۵۷] اس میں ایک لطیف اشارہ یہ بھی ہے کہ ایماندار جنت کے ان بالاخانوں میں دائمی اور ابدی طور پر قیام پذیر رہیں گے۔ کیونکہ اگر ٹھکانہ عارضی ہو تو انسان کو امن و چین اور اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔

[۵۸] نیچا دکھانے سے مراد ان کا مذاق اڑانا، انہیں تسلیم نہ کرنا، اللہ کے راستے میں روڑے اٹکانا، ایمانداروں کو ایذائیں دینا، اور ایسی تدبیریں اور سازشیں تیار کرنا جن سے وہ اسلام کو کمزور یا نیست و نابود کر سکیں۔ سب باتیں شامل ہیں۔

[۵۹] یعنی رزق کی فراخی نہ اللہ کی رضا کا معیار ہے نہ انسان کی اپنی فلاح کا۔ بلکہ رزق کا تعلق صرف مشیتِ الٰہی سے ہے جس میں اس کی اپنی کئی حکمتیں مضمر ہیں۔ بسا اوقات وہ ظالموں کو زیادہ رزق دے کر انہیں عذابِ شدید کا مستحق بنا دیتا ہے۔ اور

لَهٗ ؕ وَ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ ۚ وَ هُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ﴿۳۹﴾ وَ یَوْمَ یَحْشُرُهُمْ
جَمِیْعًا ثُمَّ یَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰۤؤُلَآءِ اِیَّاكُمْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ ﴿۴۰﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِیُّنَا

کر دیتا ہے اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو تو وہی اس کی جگہ تمہیں اور دے دیتا[۶۰] ہے اور وہی سب سے بہتر رازق[۶۱] ہے" (۳۹) اور جس دن اللہ تمام انسانوں کو جمع کرے گا پھر فرشتوں[۶۲] سے پوچھے گا: "کیا یہ لوگ تمہاری ہی عبادت کیا کرتے تھے؟" (۴۰) وہ کہیں گے: "تو پاک ہے ہمارا سرپرست تو ہے نہ کہ یہ (مشرک)

بعض دفعہ اپنے فرمانبرداروں کو فقر و فاقہ میں مبتلا کر کے ان کے درجات کو مزید بڑھا دیتا ہے۔ دولت بذات خود ایک ڈھلتی چھاؤں ہے۔ ایک ہی آدمی کے پاس کبھی زیادہ آجاتی ہے پھر اسی سے چھن بھی جاتی ہے۔ پھر جب مال و دولت میں ہی استقرار و استقلال نہیں تو پھر اسے خیر و شر کا معیار کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔؟

[۶۰] ۞ **اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے رزق زیادہ ہوتا ہے:۔** اس جملہ میں صدقہ و خیرات کرنے والے لوگوں کے لئے ایک عظیم خوشخبری ہے اور ایک ایسی حقیقت بیان کی گئی ہے جو بارہا لوگوں کے تجربہ میں آچکی ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں اور اللہ کی رضا کے لئے خلوصِ نیت کے ساتھ انسان جو کچھ بھی خرچ کرتا ہے۔ اللہ اس کی جگہ اس خرچ کئے ہوئے مال جتنا یا اس سے زیادہ دے دیتا ہے وہ کس ذریعہ سے دیتا ہے اس کی کوئی مادی توجیہ پیش نہیں کی جا سکتی۔ تاہم ہمارا تجربہ اور ہمارا وجدان دونوں اس بات کی تصدیق کرتے ہیں اور درج ذیل احادیث بھی اسی مضمون کی تائید و توثیق کرتی ہیں:

۱۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اے آدم کے بیٹے! تو (دوسروں پر) خرچ کر۔ میں تجھ پر خرچ کروں گا" (بخاری۔ کتاب الزکوۃ۔ باب الصدقة فیما استطاع)

۲۔ سیدہ اسماء بنت ابی بکرؓ ایک دفعہ آپ ﷺ کے پاس آئیں تو آپ ﷺ نے اسے ہدایت فرمائی کہ روپیہ پیسہ ہتھیلی میں بند کر کے مت رکھو ورنہ اللہ بھی تمہارا رزق بند کر کے رکھے گا۔ بلکہ جہاں تک ہو سکے خیرات کرتی رہو۔ (بخاری۔ کتاب الزکوۃ۔ باب الصدقة فیما استطاع)

۳۔ سیدنا ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بندوں پر کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جس دن صبح دو فرشتے نازل نہ ہوں۔ ان میں ایک یوں دعا کرتا ہے "یا اللہ! خرچ کرنے والے کو اس کا بدل دے" اور دوسرا یوں دعا کرتا ہے "یا اللہ بخیل کا مال تباہ کر دے" (بخاری۔ کتاب الزکوۃ۔ باب قوله فاما من اعطیٰ واتقیٰ......)

۴۔ سیدنا انسؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جس شخص کو یہ بات اچھی لگے کہ اس کا رزق کشادہ اور اس کی عمر دراز ہو وہ رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرے" (بخاری۔ کتاب البیوع۔ باب من احب البسط فی الرزق)

[۶۱] اللہ تعالیٰ کی کئی صفات ایسی ہیں جو انسانوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً حقیقی رازق تو اللہ تعالیٰ ہی ہے مگر ہر انسان اپنے بال بچوں کو رزق مہیا کرتا ہے۔ مالک اپنے ملازموں کو رزق عطا کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ جب ایسی صورت ہو تو اللہ کے لئے کوئی مزید امتیازی صفت بھی استعمال ہو گی۔ گویا اگر انسان کسی کا رازق ہو سکتا ہے تو اللہ خیر الرازقین ہے یعنی سب کو رزق دینے والا بھی ہے اور بہتر رزق دینے والا بھی ہے۔ اسی طرح اللہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے تو انسان بھی تخلیق و ایجاد کرتا ہے۔ اس نسبت سے انسان کو موجد اور خالق تو کہہ سکتے ہیں مگر احسن الخالقین اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

[۶۲] ۞ **بت پرستی اور قبر پرستی میں قدرِ مشترک:۔** مشرکین خواہ دور نبوی کے ہوں یا اس سے پہلے ادوار کے یا مابعد کے دور

مِنۡ دُوۡنِهِمۡ ۚ بَلۡ كَانُوۡا يَعۡبُدُوۡنَ الۡجِنَّ ۚ اَكۡثَرُهُمۡ بِهِمۡ مُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۴۱﴾ فَالۡيَوۡمَ لَا يَمۡلِكُ بَعۡضُكُمۡ

بلکہ یہ لوگ تو جنوں کو پوجتے تھے[۶۳] اور ان میں اکثر انہی پر ایمان[۶۴] رکھتے تھے۔(۴۱) (اس وقت ہم کہیں گے کہ) آج تم میں سے کوئی بھی دوسرے[۶۵] کے نفع و نقصان کا کچھ اختیار

کے، وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ ہم ان بتوں کو پوجتے ہیں یا ان قبروں کو پوجتے ہیں۔ بلکہ ان کے اعتقاد کے پیچھے ان کا ایک پورا گھڑا ہوا فلسفہ ہوتا ہے۔ مثلاً سورج کی پوجا کرنے والے پہلے سورج کی روح کا ایک خیالی نقشہ یا تصویر قائم کرتے ہیں پھر اس خیالی تصویر کے مطابق اس کا مجسمہ بناتے ہیں۔ پھر یہ سمجھتے ہیں کہ اس مجسمہ کے ساتھ سورج کی روح کا ہر وقت تعلق قائم رہتا ہے اور ہم جو سورج کے مجسمہ کو پوجتے ہیں تو یہ دراصل اس بت کی نہیں بلکہ ہم سورج دیوتا کی عبادت کرتے ہیں۔ مشرکین نے اس طرح کی کئی دیویاں اور دیوتا بنا رکھے تھے۔ پھر یہ مجسمے محض مظاہر قدرت کے ہی نہیں بلکہ بعض صفات کے بھی ہوتے تھے۔ اور ان صفات کو بھی سیاروں سے منسوب کر دیا جاتا تھا۔ مثلاً فلاں علم کی دیوی، فلاں دولت کی دیوی ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر کچھ مشرک فرشتوں کے خیالی مجسمے بنا کر ان کی پوجا کرتے تھے۔ مشرکین عرب کی ایک کثیر تعداد ایسی ہی تھی جو فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ اور لات و منات اور عزیٰ کے مجسمے بنا کر ان کی عبادت کرتے تو سمجھتے یہی تھے کہ ہم ان بتوں کی نہیں بلکہ ان فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں جن کی ارواح ان مجسموں یا بتوں سے وابستہ رہتی ہیں۔ اسی طرح قبر پرست بھی یہ سمجھتے تھے کہ ہم اس قبر کے پرستار نہیں بلکہ ہماری سب نیاز مندیاں اور نذریں نیازیں تو صاحب قبر کے لئے ہیں۔ جس کی روح اس کی قبر کے ساتھ وابستہ رہتی ہے۔

۞ فرشتوں سے الوہیت کے متعلق سوال:۔ ان تمام معبودوں سے چونکہ فرشتے ہی برتر مخلوق ہیں۔ لہٰذا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مشرکوں کو شرمندہ کرنے اور انہیں حسرت دلانے کے لئے انہی سے سوال کرے گا کہ یہ لوگ تمہاری ہی عبادت کرتے تھے؟ کیا تم نے انہیں ایسا کہا تھا کہ تمہاری عبادت کیا کریں؟ یا کچھ اس قسم کی آرزو تم نے کی تھی؟

واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرشتوں کے علاوہ دوسرے معبودوں سے بھی ایسا سوال کرے گا اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق ایسا سوال تو بالتفصیل اور بالصراحت قرآن میں مذکور ہے۔

[۶۳] ۞ اللہ کے سوا جس کی بھی عبادت کی جائے وہ دراصل شیطان کی عبادت ہوتی ہے:۔ یہاں جن سے مراد شیاطین ہیں اور قرآن میں یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کے سوال کے جواب میں کہیں گے ہمیں ان بدبخت مشرکوں سے کیا سروکار جنہوں نے تجھے چھوڑ کر ہمیں اپنا سرپرست سمجھ رکھا تھا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا بھی سرپرست تو ہی ہے اور ان کا بھی تو ہی ہے اور تھا۔ مگر انہوں نے جو ہمیں اپنا سرپرست سمجھ رکھا تھا تو ہم نے انہیں ایسی بات قطعاً نہیں کہی تھی۔ یہ پٹی ان کو شیطان نے پڑھائی تھی۔ اسی کی ترغیب پر یہ ہماری پوجا کرتے رہے تو دراصل یہ ہماری نہیں بلکہ ان شیطانوں کی پوجا کر رہے تھے جن کے یہ فرمانبردار بن کر ان کے کہنے پر لگ گئے تھے۔

[۶۴] یعنی کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا کہ جس غرض کے لئے انہوں نے کسی بت کے آگے نذریں نیازیں چڑھائیں تو ان کی غرض پوری ہو گئی یا بت کے اندر سے شیطان بول پڑا تو ایسی اتفاقی باتوں سے ان کا اعتقاد اور بھی پختہ ہو جاتا تھا حالانکہ ان کی غرض بھی صرف وہی پوری ہوتی تھی جن کا پورا ہونا اللہ کی طرف سے پہلے ہی مقدر ہو چکا ہوتا تھا۔

[۶۵] اس وقت اللہ کے حضور فرشتے بھی موجود ہوں گے، مشرکین بھی اور شیاطین بھی۔ اور یہ سب کے اللہ کے سامنے

لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا ۭ وَنَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿٤٢﴾
وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ
اٰبَاۗؤُكُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى ۭ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ
اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٤٣﴾ وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ ۭ﴿٤٤﴾

نہیں رکھتا اور ظالموں سے ہم کہیں گے کہ اس آگ کا مزا چکھو جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔(۴۲) اور جب ان پر ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں: "یہ آدمی تو ایسا ہے جو یہ چاہتا ہے کہ تمہیں تمہارے ان (معبودوں) سے روک دے جنہیں تمہارے آباء واجداد[٦٦] پوجا کرتے تھے۔" نیز وہ کہتے ہیں کہ "یہ قرآن تو جھوٹ ہی گھڑا ہوا ہے۔ اور ان کافروں کے پاس جب حق آگیا تو کہنے لگے کہ: "یہ تو صریح جادو[٦٧] ہے"(۴۳) حالانکہ ہم نے ان (کفارِ مکہ) کو نہ تو کوئی کتاب دی تھی جسے[٦٨] وہ پڑھتے ہوں اور نہ ہی آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا ان کے پاس بھیجا تھا۔(۴۴)

محکوم اور بے بس ہوں گے۔ فرشتے بھی مشرکوں سے بیزار ہوں گے اور شیاطین بھی اور مشرک فرشتوں کے جواب کی وجہ سے ان سے بھی بیزار ہوں گے اور شیطانوں سے بھی جنہوں نے انہیں شرک کی راہ پر ڈالا تھا۔ گویا ہر ایک کو دوسرے سے بیزاری بھی ہوگی اور ہر ایک بے بس بھی ہوگا تو اس صورت میں دوسرے کو کیا فائدہ پہنچا سکے گا اور کیوں فائدہ پہنچائے گا؟

[٦٦] کفارِ مکہ قرآن کو جادو کیوں کہتے تھے؟ کفار کہتے تھے کہ ہمیں ہمارے طرز زندگی سے ہٹا کر ایک نئی راہ پر ڈالنا چاہتا ہے۔ ہمارا طرزِ زندگی وہ ہے جو ہمارے آباؤ اجداد سے بڑی مدت سے رائج چلا آرہا ہے اور یہ شخص جس راہ پر ڈالنا چاہتا ہے اس کی بنیاد محض اس کی اپنی اختراع کردہ باتیں ہیں۔ اور چاہتا یہ ہے کہ یہ خود ہمارا متبوع بن جائے اور ہم اس کے تابع بن کر رہیں۔ ہم بھلا یہ بات کیسے گوارا کر سکتے ہیں؟ گویا قریش مکہ کے نزدیک پیغمبر اسلام کی دعوت محض ایک اقتدار کا مسئلہ تھا۔ اس کے علاوہ وہ کوئی بات یا دلیل ماننے کو تیار نہ تھے۔

[٦٧] اللہ کے کلام یا قرآن کریم کو کفار مکہ کا جادو کہنا اس لحاظ سے تھا کہ قرآن کی جادو اثر تاثیر سے وہ خود خائف رہتے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں پر یہ پابندی بھی لگا رکھی تھی کہ وہ قرآن بلند آواز سے نہ پڑھا کریں کیونکہ اس طرح ان کے بیوی بچے قرآن سے متاثر ہو جاتے ہیں حالانکہ وہ کم بخت خود اس کی تاثیر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ مگر محض ضد، ہٹ دھرمی، اور چند دنیوی مفادات کی خاطر قرآن اور دعوتِ قرآن کا انکار کرتے اور مذاق اڑاتے تھے۔ پھر وہ جادو سے یہ مطلب بھی لیتے تھے کہ جو شخص بھی ایمان لے آتا تھا۔ اسے پھر یہ پروا نہ رہتی تھی کہ فلاں شخص میرا باپ ہے یا بھائی ہے یا بیٹا ہے یا فلاں میری ماں ہے یا بیٹی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور مشرکین مکہ چونکہ ایسی جدائی ڈالنے کے لئے جادوگروں کی خدمات حاصل کیا کرتے تھے اور اس کلام سے بھی ایسی جدائی پڑ جاتی تھی۔ تو اس لحاظ سے بھی وہ قرآن کو جادو کہہ دیتے تھے۔ بالفاظ دیگر وہ قرآن کے منکر ہونے کے باوجود اس بات کے قائل تھے کہ قرآن اپنے اندر جادو سے بھی زیادہ تاثیر رکھتا ہے۔

[٦٨] یعنی ان کے پاس نہ کوئی نبی آیا اور نہ ہی اللہ کی کتاب نازل ہوئی جو اس بات کی تعلیم دیتی ہو یا کم از کم تائید ہی کرتی ہو کہ

وَكَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ وَمَا بَلَغُوا مِعْشَارَ مَا آتَيْنَاهُمْ فَكَذَّبُوا رُسُلِي ۖ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿٤٥﴾
قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۖ أَنْ تَقُومُوا لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفُرَادَىٰ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا ۚ مَا
بِصَاحِبِكُمْ مِنْ جِنَّةٍ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ لَكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ ﴿٤٦﴾ قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ

جو لوگ ان سے پہلے گزر چکے ہیں انہوں نے (بھی حق کو) جھٹلایا تھا اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا تھا یہ لوگ تو اس کے عشر عشیر[۶۹] کو بھی نہیں پہنچے۔ انہوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا تو دیکھ لو میری سزا کیسی (سخت) تھی۔(۴۵) آپ ان سے کہئے کہ: میں تمہیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ کے واسطے[۷۰] تم دو دو مل کر اور اکیلے اکیلے رہ کر خوب سوچو کہ آیا تمہارے صاحب (رسول اللہ) میں کوئی جنون کی بات ہے؟ وہ تو محض ایک سخت عذاب سے پہلے تمہیں ڈرانے والا[۷۱] ہے۔(۴۶) آپ ان سے کہئے کہ: اگر میں نے تم سے کچھ

جس آبائی اور مشرکانہ دین پر یہ لوگ چل رہے ہیں وہی دین برحق ہے یعنی ان کے پاس اپنے دین کی صداقت کے لئے کوئی سند نہیں ہے۔ یہ لوگ بس اسی بات پر مطمئن ہو بیٹھے ہیں کہ یہ ان کا آبائی دین ہے۔ ان کے پاس نہ آپ کو جھٹلانے کے لئے کوئی دلیل ہے اور نہ اپنے مشرکانہ عقائد کو درست ثابت کرنے کے لئے کوئی دلیل ہے۔

[۶۹] یعنی اقوامِ سابقہ جو تباہ کی جا چکیں وہ ان قریشِ مکہ سے قد و قامت، ڈیل ڈول، قوت، مال و دولت اور عیش و فراوانی غرض ہر لحاظ سے بہت زیادہ تھیں۔ یہ قریشِ مکہ تو ان کے مقابلہ میں دسواں حصہ بھی نہیں۔ پھر جب ان اقوام نے ہمارے رسولوں کی تکذیب کی تو انہیں اس قوت اور سطوت کے باوجود تباہ و برباد کر کے رکھ دیا گیا تو آخر یہ لوگ کس کھیت کی مولی ہیں جو ہماری گرفت سے بچ سکیں گے۔

[۷۰] ❁ حجرِ اسود کو نصب کرنے کا جھگڑا ختم کرنا آپ کی دانشمندی پر دلیل ہے:۔ میری صرف ایک بات مان لو۔ ضد اور تعصب کو چھوڑ کر پوری نیک نیتی سے یہ بات سوچو، اکیلے اکیلے بھی سوچو، دو دو اور اس سے زیادہ بھی مل بیٹھ کر اور سر جوڑ کر اس بات پر غور کرو کہ جو الزام تم مجھ پر لگا رہے ہو کیا وہ درست ہیں؟ اور تم جو کچھ کہہ رہے ہو نیک نیتی سے کہہ رہے ہو؟ میری بچپن سے لے کر آج تک کی زندگی سے تم خوب واقف ہو۔ میری صداقت اور میری دیانت کے تم آج تک قائل رہے ہو۔ کیا یہ امر واقع نہیں کہ آج سے چند ہی برس پیشتر تعمیر کعبہ کے دوران جب تم میں حجرِ اسود کو رکھنے کے مسئلہ پر تم میں تنازعہ پیدا ہو گیا تھا تو تم نے کہا تھا کہ صبح جو شخص سب سے پہلے کعبہ میں داخل ہو گا تم اسے حکم تسلیم کر لو گے۔ پھر جب میں صبح کعبہ میں آیا تو تم سب نے برضا و رغبت مجھے حکم تسلیم کرنے پر اتفاق کر لیا تھا۔ پھر جب میں نے ایک چادر بچھا کر اس پر حجرِ اسود رکھ دیا اور تم سب کو کونوں سے چادر اٹھانے کو کہا تھا پھر مطلوبہ بلندی پر پہنچنے پر میں نے حجرِ اسود خود اٹھا کر اس مقام پر رکھ دیا تھا تو تم سب نے نہ صرف یہ کہ میرے فیصلہ کو برضا و رغبت تسلیم کر لیا تھا بلکہ میری دانشمندی کی داد بھی دی تھی اور آج تم ہی لوگ ہو جو مجھے دیوانہ کہتے ہو، کبھی یہ کہتے ہو کہ میں نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے اور کبھی یہ کہتے ہو کہ میں قرآن خود بنا کر تمہیں دھوکا دے رہا ہوں۔ خدارا کچھ تو انصاف کی بات کرو۔

[۷۱] کیا تمہارے خیال میں میں اس لئے دیوانہ ہوں کہ تمہیں یہ بتا رہا ہوں کہ جو طریقِ زندگی تم نے اپنا رکھا ہے وہ غلط ہے۔

مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۴۷﴾ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ
يَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۴۸﴾ قُلْ جَاۗءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ ﴿۴۹﴾ قُلْ اِنْ
ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰي نَفْسِيْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ ﴿۵۰﴾

اجرت مانگی تو وہ تم ہی رکھو[۷۲]۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے اور وہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے۔(۴۷) آپ انہیں کہہ دیجئے کہ: میرا پروردگار حق کے ساتھ (باطل پر) ضرب لگاتا[۷۳] ہے اور وہ سب چھپی باتوں کو جاننے والا ہے۔(۴۸) آپ کہئے کہ حق آگیا اور باطل[۷۴] نے تو نہ تو پہلی بار کچھ پیدا کیا تھا نہ دوبارہ کچھ کر سکے گا۔(۴۹) آپ ان سے کہئے کہ "اگر میں راہ بھولا ہوا ہوں تو اس بھول کا وبال مجھ پر[۷۵] ہو گا اور اگر میں سیدھی راہ پر گامزن ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا پروردگار میری طرف وحی کرتا ہے وہ یقیناً سب کچھ سننے والا ہے اور قریب ہے۔(۵۰)

اور اس کے برے انجام سے ڈرا رہا ہوں۔ اور اگر میں یہ کہہ دیتا کہ شاباش! تم لوگ بہت ٹھیک جا رہے ہو تب تو سب معاملہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ اور اگر میں تمہیں چند ٹھوس حقائق کی اطلاع دیتا ہوں تو تم مجھے دیوانہ کہنے لگے ہو۔

[۷۲] دوسری یہ بات بھی سوچو کہ جب سے میں نے دعوت الی اللہ کا کام شروع کیا ہے دن رات اسی کام میں لگا ہوا ہوں۔ تم سب لوگوں کی دشمنی بھی مول لے لی ہے۔ اپنا روزگار بھی ختم کر دیا ہے۔ تم سے بھی نہ کوئی معاوضہ طلب کرتا ہوں نہ کوئی دوسری غرض رکھتا ہوں۔ تو کیا ایک دنیادار یا فریب کار اور اقتدار کا بھوکا یہ کام کر سکتا ہے یا ایسی بے لوث خدمت سرانجام دے سکتا ہے؟ میں تم سے پیسہ نہیں مانگتا البتہ یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم غلط راستہ کو چھوڑ کر سیدھے راستہ کی طرف آ جاؤ۔ یہی میرا تم سے معاوضہ ہے اور یہی مطالبہ ہے اور اس میں تمہاری ہی بھلائی ہے۔

[۷۳] یعنی آسمان سے جو وحی نازل ہو رہی ہے وہ حق ہے اور جو تمہارا طرزِ عمل ہے وہ باطل ہے۔ یہ حق باطل کا سر توڑ دے گا اور اس کا کچومر نکال دے گا۔ باطل کو بالآخر راہ فرار اختیار کرنا ہی پڑے گی۔ اور حق اس پر غالب آ کے رہے گا۔ اللہ علام الغیوب ہے۔ اس نے عین موقعہ پر مجھے اپنی وحی کے ساتھ بھیجا ہے۔ اور وہ خوب جانتا ہے کہ باطل کا سر توڑنے کے لئے یہی مناسب موقعہ ہے۔

[۷۴] ❁ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے:۔ یہاں باطل سے بعض لوگوں نے مراد معبودانِ باطل لیا ہے۔ یعنی ان باطل معبودوں نے کائنات میں پہلے بھلا کون سی چیز پیدا کی تھی کہ اب وہ دوبارہ وہ کچھ کر سکیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ معبود قطعی بے اختیار اور مجبور محض ہیں۔ تم لوگ ان سے خواہ مخواہ ہی کئی طرح کی توقعات وابستہ کئے بیٹھے ہو۔ اور اگر باطل کو اپنے ہی معنوں میں لیا جائے تو مطلب یہ ہو گا۔ کہ باطل کو کبھی استقلال نصیب نہیں ہوتا۔ جسے ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ کسی بھی بات کی تحقیق شروع کرو۔ باطل کو فوراً وہاں سے رخصت ہونا پڑے گا۔ باطل کی ضد حق ہے۔ یعنی جوں جوں حق آ جاتا ہے، باطل از خود رخصت ہوتا چلا جاتا ہے۔ فتح مکہ کے دن جب آپ ﷺ اپنی چھڑی سے بتوں کو گرا رہے تو اس وقت ساتھ ساتھ یہ آیت بھی پڑھتے جاتے تھے۔ ﴿جَاۗءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾

[۷۵] یعنی اگر میں نے یہ محض ایک ڈھونگ ہی رچایا ہوا ہے تو آخر یہ کتنے دن چل سکتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ اس صورت میں تمہیں میری فکر چھوڑ دینا چاہئے میں اس باطل کے انجام سے جلد از جلد خود ہی دوچار

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿۵۱﴾ وَّقَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَاَنّٰى لَهُمُ
التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۵۲﴾ وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍۢ
بَعِيْدٍ ﴿۵۳﴾ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ﴿۵۴﴾

کاش آپ دیکھیں جب وہ وہ گھبرائے ہوئے ہوں گے تو بچ نہ سکیں گے بلکہ قریب ہی سے پکڑ[۷۶] لئے جائیں گے۔(۵۱) اور کہیں گے کہ (اب) ہم اس پر ایمان لے آئے اور اتنے دور[۷۷] مقام سے اب انہیں (ایمان) حاصل کرنا کہاں سے میسر ہوگا۔(۵۲) حالانکہ اس سے پہلے وہ (دنیا میں) انکار کر چکے تھے اور بن دیکھے (اندھیرے میں) انہیں بہت دور کی سوجھتی[۷۸] تھی۔(۵۳) اس وقت ان کے اور ان کی خواہش کی چیزوں کے درمیان[۷۹] پردہ حائل کر دیا جائے گا۔ جیسا کہ اس سے پہلے ان کے ہم جنسوں سے یہی سلوک کیا گیا تھا۔ وہ بھی ایسے شک میں پڑے[۸۰] ہوئے تھے جو انہیں بے چین کئے ہوئے تھا۔(۵۴)

ہو جاؤں گا اور اس کا وبال تم پر کچھ نہ ہوگا۔ لیکن اگر میں راہِ راست پر ہوں تو اس راست روی کا ذریعہ سوا وحی الٰہی کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ تمہارے پاس تو تقلید آباء ذریعہ معلومات ہے۔ میرے پاس تو وہ بھی نہیں اس صورت میں تم خود ہی سوچ لو کہ تمہارا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ میرا پروردگار جو اس پیغام کو بھیجنے والا ہے ہماری سب باتیں سن رہا ہے اور وہ جلد ہی حق کی مدد فرمائے گا۔

[۷۶] یعنی ایسے مجرموں کو کہیں دور سے تلاش نہیں کرنا پڑے گا بلکہ وہ جہاں بھی ہوں گے وہیں گرفتار کر لئے جائیں گے کہیں بھاگ کھڑا ہونے کی ان میں ہمت ہی نہ ہوگی۔

[۷۷] ❁ ایمان لانے کا مقام دنیا ہے آخرت نہیں:۔ یعنی ایمان لانے کا مقام تو دنیا ہے اور اس وقت وہ عالمِ آخرت میں پہنچ چکے۔ اور ان دونوں کے درمیان طویل فاصلہ ہے اور طویل مدت ہے۔ پھر وہ ایمان کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ایمان تو ایمان بالغیب کا نام ہے۔ اور اس کا مقام دنیا ہے جہاں کئی غیب کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اور آخرت میں غیب کا کوئی پردہ باقی نہ رہے گا۔ ہر شخص حقیقت حال کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لے گا۔ وہاں ایمان لانے یا ایسی بات کہنے کا کچھ مطلب ہی نہ ہوگا۔

[۷۸] یعنی جب دنیا میں ان سے عالمِ آخرت کی بات کی جاتی تھی تو اس پر غور کرنے کے بجائے اسے دیوانگی پر محمول کرتے تھے۔ کبھی داعی حق کو مفتری علی اللہ کے لقب سے نوازتے تھے۔ کبھی کہتے تھے کہ اسے کوئی عجمی سکھا جاتا ہے۔ کبھی اسے ساحر، کاہن اور شاعر کے طعنے دیتے تھے۔ ان دل کے اندھوں کو جہالت کے اندھیروں میں بہت دور کی سوجھتی تھی لیکن نیک نیتی کے ساتھ غور و فکر کرنے کا نام تک نہ لیتے تھے۔

[۷۹] اس وقت ان کی خواہشات کیا ہوں گی۔ یہی کہ ہم ایمان لے آئیں یا ہمیں دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے یا کوئی ایسی صورت بن جائے کہ ہم عذاب سے بچ سکیں یا ہمارے لئے کوئی سفارش کرنے والا یا ہمارا کوئی مددگار ہی اٹھ کھڑا ہو۔ اس دن ان کی اس قسم کی تمام خواہشات کو یوں ختم کر کے انہیں مایوس کر دیا جائے گا جیسے ان کی خواہشات کے آگے بند باندھ کر انہیں ان سے یکسر اوجھل کر دیا گیا ہے۔ پھر انہیں سوا عذاب بھگتنے کے کوئی دوسرا خیال بھی نہ آ سکے گا۔

[۸۰] ❁ اشیاع کا لغوی مفہوم:۔ اَشیاع شیعہ کی جمع ہے اور شیعہ کے معنی پارٹی یا سیاسی فرقہ ہے۔ جس کی بنیاد عقیدہ کا

اختلاف ہو اور شیعہ کی جمع شیعا بھی آتی ہے۔ اور جب اس کی جمع اشیاع آئے تو اس کے معنی ایک ہی جیسی عادات و اطوار رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں خواہ وہ پہلے گزر چکے ہوں یا موجود ہوں۔ اور قریش مکہ کی بنیادی گمراہیاں دو تھیں ایک بت پرستی اور اللہ سے شرک اور اپنے بتوں کو اختیار و تصرف میں اللہ کا شریک سمجھنا دوسرے انکار آخرت۔ اب جو لوگ بھی ان دو قسم کی گمراہیوں میں قریش کے ہمنوا ہوں گے وہ سب قریش کے اشیاع ہیں۔ خواہ وہ قریش سے پہلے گزر چکے ہوں یا بعد میں آئیں۔ اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ اس قسم کے لوگوں کے ان عقائد کی بنیاد علم پر نہیں ہوتی۔ بلکہ محض شکوک و ظنون پر ہوتی ہے۔ وہ یہ کبھی بدلائل ثابت نہیں کر سکتے کہ ان کے معبود فی الواقع اللہ کے اختیارات میں شریک ہیں نہ ہی وہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ دوبارہ پیدا نہیں کیے جا سکتے یا قیامت نہیں آ سکتی۔ وہ خود بھی اس بارے میں ہمیشہ مشکوک ہی رہتے ہیں۔ اور شک بھی ایسا جو انہیں بے چین کیے رکھتا ہے۔ مگر وہ محض اپنے بعض مفادات کی خاطر اپنے ان شکوک کا برملا اظہار نہیں کرتے۔

۴۵ آیاتها — سُورَۃُ فَاطِرٍ مَّکِّیَّۃٌ — رکوعها ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ
يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ① مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ

کلمات ۷۵۲ آیت ۴۵ (۳۵) سورہ فاطر مکی ہے (۴۳) رکوع ۵ حروف ۳۲۸۹

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

سب تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو آسمانوں اور زمین کو پیدا[۱] کرنے والا اور فرشتوں کو پیغام رساں[۲] بنانے والا ہے۔ جن کے دو دو[۳]، تین تین اور چار چار بازو ہیں۔ وہ اپنی مخلوق کی ساخت میں جیسے چاہے اضافہ[۴] کر دیتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔① اللہ اگر لوگوں کیلئے اپنی رحمت (کا دروازہ) کھول دے تو اسے کوئی بند کرنے والا نہیں

[۱] فطر کا مفہوم:۔ پیدا کرنے کے معنوں میں قرآن کریم میں چھ مترادف الفاظ آئے ہیں۔ اور ہر لفظ کے مفہوم میں کچھ نہ کچھ فرق ہوتا ہے۔ فطر کا معنی کسی چیز کو پیدا کرنا، پھر اس کو تراش خراش کر کے اسے خوبصورت شکل دینا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں یا زمین یعنی کائنات کو صرف پیدا ہی نہیں کیا بلکہ اسے تراش خراش کر بہترین شکل و صورت پر بنایا ہے۔

[۲] پیغام رساں فرشتے:۔ فرشتوں کے ذمہ کئی قسم کے کام ہیں۔ جن میں سے ایک کام پیغام رسانی بھی ہے۔ پیغام رسانی کی ایک قسم تو معروف ہے کہ جبرئیلؑ فرشتہ اللہ کا پیغام لے کر نبی کے دل پر نازل ہوتا ہے۔ باقی صورتیں یہ ہیں کہ جو فرشتے تدبیر امور کائنات پر مامور ہیں ان کے ہاں بھی بعض فرشتے اللہ کا حکم لے کر پہنچتے ہیں اور پیغام رسانی کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔

[۳] فرشتوں کے پر اور سرعت رفتار:۔ فرشتوں کے پر کیسے ہوتے ہیں؟ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہمارے ذہن میں تو پرندوں کے پر ہی آ سکتے ہیں۔ جو فضا میں اڑنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے پرندوں کو عطا کیے ہیں اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے۔ جس فرشتے کو جتنی زیادہ سرعت رفتار سے اپنی ڈیوٹی پر پہنچنا ہوتا ہے اسی قدر اسے زیادہ پر عطا کیے جاتے ہیں، کم سے کم دو پر ہوتے ہیں پھر کسی فرشتے کے تین پر بھی ہوتے ہیں اور کسی کے چار بھی۔ اس آیت سے اس حقیقت کا بھی پتا چلتا ہے کہ فرشتے دراصل اللہ تعالیٰ کے خادم اور فرمانبردار بندے ہیں۔ وہ وہی کام کرتے ہیں جس کا اللہ انہیں حکم دیتا ہے اور اتنا ہی کرتے ہیں جتنا انہیں حکم ہوتا ہے۔ وہ اپنے ارادہ و اختیار سے نہ اللہ کے حکم میں سرمو کمی بیشی کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ گویا اس آیت سے تمام مشرکوں کے اس نظریہ کی تردید ہو گئی جو انہیں ایک بااختیار بلکہ اللہ کے اختیار و تصرف میں شریک سمجھ کر ان کی پرستش کرتے ہیں۔

[۴] ربط مضمون کے لحاظ سے اس جملہ کا معنی یہ ہو گا کہ بعض فرشتوں کے پر چار سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے ایک دفعہ جبرئیلؑ کو اس کی اصلی حالت میں دیکھا۔ اس کے چھ سو پر تھے۔ اور مشرق و مغرب کی پوری فضا اس سے بھری ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ تفسیر سورہ نجم)

لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهُ مِنْ بَعْدِهِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٢﴾ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ
عَلَيْكُمْ ۚ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۚ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ﴿٣﴾
وَإِنْ يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٤﴾ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ

اور جسے وہ بند کر دے تو اس کے بعد اسے کوئی کھولنے والا[۵] نہیں۔ اور وہ سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔(۲)

لوگو! اپنے آپ پر اللہ کے احسان کو یاد رکھو، کیا اللہ کے سوا کوئی خالق ہے جو تمہیں آسمانوں اور زمین سے رزق دے (یاد رکھو) اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، پھر تم کہاں[۶] سے دھوکہ کھا جاتے ہو(۳) (اے نبی!) اگر ان لوگوں نے آپکو جھٹلایا[۷] ہے تو آپ سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا جا چکا ہے اور سب کام لوٹائے تو اللہ ہی کی طرف جائیں گے۔(۴) لوگو! اللہ کا وعدہ

اگر اس جملہ کو عام سمجھا جائے تو یہ بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوگا۔ مثلاً وہ انسان کی نسل جتنی چاہے بڑھاتا رہتا ہے۔ حیوانات اور نباتات کی نئی سے نئی انواع وجود میں لاتا رہتا ہے۔ نئے سے نئے سیارے کائنات میں پیدا کرتا رہتا ہے اور کائنات کو ہر آن وسیع کر رہا ہے۔

[۵] رحمت کی مادی شکل بارش اور روحانی شکل وحی الٰہی ہے۔ باقی ہر طرح کی رحمتیں ان کے بعد ہیں۔ اور یہ دونوں باتیں خالصتاً اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ جن میں مشرکوں کے معبودوں کا ذرہ بھر بھی دخل نہیں۔ وہ چاہیں بھی کہ وحی الٰہی کو روک دیں تو کبھی نہیں کر سکتے۔ اور نہ ہی وہ یہ کر سکتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ قریش پر قحط مسلط کر دے تو وہ بارش برسا کر اپنے عبادت گزاروں کی تکلیف کو رفع کر دیں اور جو کچھ خود چاہتا ہے اپنی حکمت بالغہ کے مطابق کرتا ہے اور جو کچھ کرنا چاہتا ہے وہ کر گزرتا ہے۔ اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ سب پر غالب ہے۔

[۶] ۞ بارش سب جانداروں کے رزق کا ذریعہ ہے:۔ آسمانوں سے جو بارش نازل ہوتی ہے۔ وہ زمین میں جذب ہو کر سب جانوروں کی روزی اور ان کی زندگی کی بقا کا ذریعہ بنتی ہے۔ اب اگر اس بارش برسنے کے نظام پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے عوامل و عناصر ہیں جنہیں اللہ نے اس خدمت پر مامور کر رکھا ہے۔ تب جا کر بارش برستی ہے اور یہ سب عناصر و عوامل خالصتاً اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ اور ان میں مشرکوں کے معبودوں کا کوئی عمل دخل نہیں۔ جس سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی بھی ہستی عبادت کا استحقاق نہیں رکھتی۔ پھر یہ کس قدر ناقدر شناسی اور نمک حرامی کی بات ہے کہ روزی تو اللہ کی دی ہوئی کھائیں اور عبادت کریں اللہ کے سوا دوسروں کی۔ یا دوسروں کو بھی اس عبادت میں شریک بنا لیں؟ لہٰذا اے مشرکین مکہ! کچھ بتاؤ تو سہی کہ تمہاری عقلوں کو یہ پھیر کہاں سے لگ جاتا ہے؟

[۷] یہ مضمون قرآن میں متعدد بار آیا ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اکثر مکی سورتوں میں آیا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ تیرا سالہ مکی دور میں کفار مکہ ڈٹ کر آپ کی مخالفت کرتے رہے اور اس سلسلہ میں انہوں نے اوچھے سے اوچھے ہتھکنڈے بھی استعمال کئے۔ ایذائیں بھی پہنچائیں، تکذیب بھی کرتے رہے۔ تمسخر بھی اڑاتے رہے۔ جبکہ مسلمانوں کو صرف یہ حکم تھا کہ یہ سب باتیں صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرتے جائیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار بار پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کی تسلی اور حوصلہ

اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۗ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ
عَدُوًّا ۭ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ۭ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ڛ وَ

سچا ہے لہٰذا تمہیں دنیا کی زندگی دھوکہ[۸] میں نہ ڈال دے اور نہ ہی اللہ کے بارے میں وہ دھوکہ باز[۹] (شیطان) تمہیں دھوکہ دینے پائے۔(۵) شیطان یقیناً تمہارا دشمن ہے۔ لہٰذا اسے دشمن ہی سمجھو۔ وہ تو اپنے پیروکاروں کو صرف اس لئے بلاتا ہے کہ وہ[۱۰] دوزخی بن جائیں(۶) جو لوگ کافر ہوئے انہیں سخت عذاب ہوگا۔

افزائی کے لئے ایسے جملے نازل کرتا رہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ حق و باطل کی کشمکش میں پہلے بھی رسولوں سے ایسا ہی سلوک ہوتا رہا ہے اور کسی بھی بات کا فیصلہ اور انجام ان لوگوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ سب کاموں کا انجام اور فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا اطمینان رکھئے اور اللہ پر توکل کیجئے۔

[۸] یعنی دنیا کے مال و دولت، اس کے عیش و آرام، اس کی دلکشیوں اور دلفریبیوں میں محو اور مستغرق ہو کر اپنے انجام کو بھول نہ جانا۔ اللہ کے ہاں ہر نعمت سے متعلق باز پرس ہونے والی ہے کہ اس کا شکریہ ادا کیا تھا یا ناشکری کی تھی۔ نیز اس دنیا میں کوئی بھی چیز بے کار پیدا نہیں کی گئی۔ ہر عمل اپنا ایک نتیجہ رکھتا ہے۔ اور اس کے محاسبہ سے تم بچ نہیں سکتے۔ لہٰذا اس دھوکہ میں نہ رہنا کہ زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے۔ تمہارے تمام تر اعمال ریکارڈ ہو رہے ہیں اور ان کے نتائج تمہیں دوسری زندگی میں بھگتنا ہوں گے۔ اللہ کا یہ وعدہ ہے اور یہی اس کا قانون مکافات ہے جس کا خلاف کبھی نہیں ہو سکتا۔

[۹] ۞ شیطان کا اللہ کے نام پر لوگوں کو دھوکا دینا:۔ غرور بمعنی بہت بڑا دھوکا باز اور یہ شیطان ہے۔ جو اللہ ہی کے بارے میں انسان کو دھوکا میں ڈالے رکھتا ہے۔ سب سے پہلے تو وہ اللہ کی ہستی کے بارے میں لوگوں کو دھوکا دیتا ہے اور وہ اس کے دھوکہ میں آکر اللہ کی ہستی کے ہی منکر بن جاتے ہیں اور جو لوگ شیطان کے اس فریب سے بچ نکلتے ہیں تو وہ اللہ کی صفات میں بہت سی دوسری ہستیوں کو شریک بنانے کی راہیں سجھاتا ہے اور ہر دور میں نئی نئی راہیں سجھاتا ہے کچھ لوگ مظاہر کائنات کے پجاری ہیں کچھ فرشتوں، کچھ جنوں، کچھ اولیاء اللہ اور ان کی قبروں سے امید لگائے بیٹھے ہیں۔ ہر دور میں شیطان انہیں شرک کے جواز پر نئی سے نئی دلیلیں سجھاتا رہتا ہے۔ پھر جو لوگ اس فریب سے بھی بچ نکلتے ہیں انہیں یہ پٹی پڑھاتا رہتا ہے کہ اگر تم سے یہ گناہ سرزد ہو بھی گیا تو اللہ بڑا غفور رحیم ہے یا ابھی بہت زندگی پڑی ہے۔ بعد میں توبہ تائب کر لیں گے۔ اس طرح شیطان لوگوں کو اللہ اور اس کے عذاب سے نڈر اور گناہوں پر جری بنا دیتا ہے۔

[۱۰] لہٰذا اے لوگو! تم شیطان کے فریب میں نہ آجانا۔ اس کی ایک بھی بات نہ ماننا۔ وہ پہلے دن سے تمہارا دشمن ہے۔ لہٰذا تم اسے دشمن ہی سمجھو گے تو اسی میں تمہاری عافیت ہے وہ کبھی تمہارا دوست نہیں بن سکتا۔ وہ شرکیہ عقائد و بدعات خواہ کس خوبصورت انداز میں پیش کرے اور تم اسے کار ثواب اور اس میں فلاح دارین ہی سمجھنے لگو حقیقت میں وہ تمہارے ساتھ دشمنی کر رہا ہوتا ہے۔ اس کا تو اولین مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اکیلا دوزخ میں نہ جائے بلکہ جنوں اور انسانوں کی ایک کثیر تعداد کو اپنا ساتھی بنا کر اپنے ہمراہ دوزخ میں لے جائے۔

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۟ اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ۭ فَاِنَّ
اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ڮ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا
يَصْنَعُوْنَ ۝ وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ

اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کے لئے بخشش اور بہت بڑا [۱۱] اجر ہے۔(۷) بھلا جس شخص کا برا عمل خوشنما بنا دیا جائے اور وہ اسے اچھا سمجھنے لگے [۱۲] (اس کی گمراہی کا کوئی ٹھکانا ہے)؟ اللہ تعالیٰ (اسی طرح) جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ لہٰذا آپ ان پر افسوس کے مارے اپنے آپ کو ہلکان نہ کریں، جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ یقیناً انہیں خوب جاننے والا ہے۔(۸) اللہ ہی تو ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے تو وہ بادل اٹھا لاتی ہیں پھر ہم اس بادل کو کسی مردہ بستی کی طرف چلا کر لے جاتے ہیں اور اس زمین کے مردہ ہونے کے بعد اسے زندہ کر دیتے ہیں۔ انسانوں [۱۳] کا جی اٹھنا بھی اسی طرح ہو گا۔(۹)

[۱۱] یعنی ایماندار نیک اعمال کرنے والوں کے گناہ تو سارے کے سارے معاف کر دیئے جائیں گے۔ رہے نیک اعمال تو ان کا بدلہ بھی اعمال کے مطابق نہیں بلکہ ان سے بہت زیادہ دیا جائے گا۔

[۱۲] ❁ کافروں کے ایمان نہ لانے پر آپ کا پریشان رہنا:۔ اس آیت میں ایک جملہ محذوف ہے جسے قاری کے فہم و بصیرت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور یہ فصاحت و بلاغت کی دلیل ہوتی ہے۔ اور قرآن میں ایسے محذوفات بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہاں سوال یہ کیا گیا ہے کہ بھلا ایسا شخص جس کے ذہن میں اتنا بگاڑ پیدا ہو چکا ہو کہ اس کے نزدیک نیکی اور بدی کی تمیز ہی ختم ہو جائے اور اسے اپنی بداعمالیاں ہی اچھے اعمال نظر آنے لگیں، اس سوالیہ جملے کا اگلا حصہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ جو ایک تو یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی گمراہی کا کوئی ٹھکانا ہے؟ جیسا کہ ترجمہ میں (بریکٹوں میں لکھ دیا گیا ہے) اور دوسرا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیا ایسے بگڑے ہوئے ذہن والا آدمی اس آدمی کی طرح ہو سکتا ہے جس کا ذہن بالکل درست ہو جو برے کام کو برا ہی سمجھتا ہو اور اچھا صرف اسے سمجھتا ہو جو فی الواقع اچھا ہو؟ اور اس کا واضح جواب یہ ہے کہ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ مقصود یہ ہے کہ جس شخص کا ذہن اس قدر بگڑ چکا ہو کہ اس میں بدی کو بدی سمجھنے کی اہلیت ہی باقی نہ رہ گئی ہو ایسے شخص کو اللہ کبھی ہدایت کی راہ نہیں دکھاتا۔ اللہ تو صرف اسے ہدایت کی راہ دکھاتا ہے جو کم از کم بدی کو بدی سمجھتا تو ہو۔ اور ان مشرکین مکہ کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ وہ مسلمانوں پر جس قدر بھی ظلم ڈھائیں۔ وہ اپنے اس ظلم و تشدد کو خوبی اور اچھا کام ہی سمجھتے ہیں۔ پھر انہیں ہدایت کیسے مل سکتی ہے لہٰذا ایسے ذہنی بگاڑ میں مبتلا مریضوں کی ہدایت کی فکر میں اپنے آپ کو ہلکان نہ کریں۔ ایسے لوگوں پر افسوس کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے وہ خود ان سے نمٹ لے گا اور مسلمانوں کے لئے ان ظالموں کے ظلم سے نجات کی راہ خود پیدا کر دے گا۔

[۱۳] ❁ نباتات کی پیدائش سے معاد پر دلیل:۔ یہ ایک عام انسانی مشاہدہ سے معاد پر دلیل ہے۔ انسانی مشاہدہ یہ ہے کہ بارش ہوتی ہے تو خشک، بنجر اور مردہ زمین یک دم زندہ ہو کر نباتات سے لہلہا اٹھتی ہے پھر اس سے صرف نباتات ہی پیدا نہیں ہوتی

مَوْتِهَا ؕ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۝٩ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ؕ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ
الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ؕ وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَمَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ ۝١٠

جو شخص عزت چاہتا ہے تو عزت [۱۴] تو تمام تر اللہ ہی کے لئے ہے۔ پاکیزہ کلمات اسی کی طرف چڑھتے ہیں [۱۵] اور صالح عمل انہیں اوپر اٹھاتا ہے اور جو لوگ بری چالیں [۱۶] چلتے ہیں تو ایسے لوگوں کے لئے سخت عذاب ہے، اور ان کی چال ہی برباد ہونے والی ہے۔(۱۰)

ہزاروں جانور، مینڈک، حشرات الارض اور جھینگر وغیرہ بھی پیدا ہو کر اپنی اپنی بولیاں بولنے لگتے ہیں۔ یہ آخر کہاں سے پیدا ہو گئے؟ بالکل یہی کیفیت انسانوں کے زمین سے جی اٹھنے کی بھی ہو گی۔ اور روایات میں آیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا کہ تمام انسان زندہ ہو کر اپنی اپنی قبروں سے اگ آئیں یا اٹھ کھڑے ہوں تو عرش کے نیچے سے ایک خاص قسم کی بارش ہو گی جس سے سب انسان زندہ ہو کر زمین سے اس طرح نکل آئیں گے جس طرح برسات سے کھیتی اور حشرات الارض نکل آتے ہیں۔ ان میں فرق صرف یہ ہے کہ جو چیز انسان کے مشاہدہ میں آچکی ہے۔ اسے من وعن تسلیم تو کر لیتا ہے لیکن اس میں غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا اور جو چیز اس کے مثل ہے مگر ابھی اس کے مشاہدہ میں نہیں آئی اس سے انکار کر دیتا ہے۔

[۱۴] مشرکینِ مکہ کی حرم کعبہ کی وجہ سے عرب بھر میں عزت کی جاتی تھی وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ اسلام لے آئے تو یہ سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ انہیں یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ یہ عزت بھی تمہیں کعبہ کے متولی اور پاسبان ہونے کی وجہ سے حاصل ہے۔ اور کعبہ کو حرم بنانے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ تم اور تمہارے معبودوں میں یہ طاقت نہیں تھی کہ تم مکہ کو حرم بنا سکتے۔ اب اگر تم کعبہ کے مالک ہی کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے ہو تو سوچ لو تمہاری یہ عزت کیسے برقرار رہ سکتی ہے؟ عزت تو صرف اسے ملے گی جو اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار ہو کیونکہ تمام تر عزت کا سرچشمہ تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تم لوگ اس کے دشمن بن کر کبھی عزت نہ پا سکو گے۔

[۱۵] ۞ **پاکیزہ کلمہ اور اعمالِ صالحہ کا باہمی تعلق:۔** پاکیزہ کلمات اور پاکیزہ اعمال دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اور دونوں ایک دوسرے کے مؤید اور مددگار ہیں۔ پاکیزہ کلمات یا اقوال اللہ کی طرف اس وقت چڑھتے ہیں جب کہ ان کی تائید اعمال صالحہ سے بھی ہو رہی ہو۔ اور اگر عمل پاکیزہ اقوال کے خلاف ہو تو یہ پاکیزہ اقوال بھی نہ اوپر چڑھ سکتے ہیں نہ اللہ کے ہاں مقبول ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح اعمال صالحہ بھی اسی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف چڑھتے ہیں جبکہ ان کی بنیاد پاکیزہ اقوال یا درست عقیدہ پر ہو۔ اگر عقیدہ درست نہ ہو گا تو ایسے اعمال بھی نہ اوپر چڑھیں گے اور نہ ہی مقبولیت کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں۔

پاکیزہ کلمات میں سب سے پہلے نمبر پر تو کلمہ طیبہ ہے جس میں شرک کا پورا رد موجود ہے اور توحید خالص کا اقرار ہے۔ پھر اللہ کا ذکر، دعا، قرآن کی تلاوت وغیرہ آخرت وغیرہ سے متعلق ٹھوس حقائق پر مبنی ہیں۔ یہ کلمات اللہ کی طرف بلند ضرور ہوتے ہیں مگر اس شرط پر کہ انہیں اعمال صالحہ یا ان اقوال پاکیزہ کے مطابق افعال کی تائید بھی حاصل ہو۔ یہی صورت اعمال صالحہ کی ہے ان کی مقبولیت کی شرط یہ ہے کہ ان کی بنیاد اقوال پاکیزہ پر اٹھی ہو۔

[۱۶] ۞ **کفار مکہ کی چال کیسے ان پر الٹ پڑی؟** بری چالوں سے مراد کفار کی ہر وہ تدبیر ہے جس سے اسلام کی راہ روکی جا سکتی ہو۔ اور کفار مکہ کی تو ساری زندگی ہی بری چالوں میں گزری تھی۔ تا آنکہ مکہ فتح ہو گیا اور کفر کی کمر ہی ٹوٹ گئی۔ ویسے تو کفار مکہ

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ۭ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا
بِعِلْمِهٖ ۭ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۱۱﴾ وَمَا يَسْتَوِي
الْبَحْرٰنِ ڰ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَاۗىِٕغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۭ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا
وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ

اللہ نے تمہیں مٹی سے، پھر نطفہ سے پیدا کیا ہے پھر تمہیں جوڑے جوڑے[۱۷] بنایا۔ جو بھی مادہ حاملہ ہوتی یا بچہ جنتی ہے تو اللہ کو اس کا علم ہوتا ہے۔ اور کوئی بڑی عمر والا جو عمر دیا جائے یا اس کی عمر کم کی جائے تو یہ سب کچھ کتاب میں درج ہے۔ اللہ کے لئے یہ بات بالکل آسان ہے۔ (۱۱)

دو طرح کے سمندر ایک جیسے نہیں ہو سکتے جن میں ایک کا پانی میٹھا، پیاس بجھانے والا اور پینے میں خوشگوار ہو اور دوسرا کھاری ہو، چھاتی جلانے والا۔ اور تم دونوں سے تازہ گوشت (بھی حاصل کر کے) کھاتے ہو اور زیور بھی نکالتے ہو جو تم پہنتے ہو[۱۸]۔ اور اسی سمندر میں تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں پانی کو چیرتی پھاڑتی چلی جا رہی ہیں تاکہ

پیغمبرِ اسلام کی زندگی کا خاتمہ کرنے کی بھی کئی کوششیں کر چکے تھے تاہم ان سب سے زیادہ خطرناک چال وہ تھی جو دار الندوہ میں ابو جہل نے پیش کی تھی اور جس پر شیطان بھی خوش ہو گیا تھا۔ کہ واقعی یہ چال بڑے بلند درجہ کی چال ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے سورہ انفال کی آیت نمبر ۳۰ کا حاشیہ) اور یہی تدبیر ان کافروں کی ہلاکت کا باعث یوں بنی کہ ان کی اس سازش کے فوراً بعد اللہ نے اپنے پیغمبر کو صحیح وسالم نکال کر مدینہ میں آباد کیا۔ کفار نے بدلہ لینے کی ٹھانی تو جنگِ بدر کے مقام پر اللہ نے انہیں شکست فاش سے دوچار کر دیا۔ ان کے ستر بڑے بڑے سرغنے قتل ہو گئے۔ جنہیں نہایت ذلت کے ساتھ قلیب بدر میں پھینک دیا گیا۔ اور اتنے ہی آدمی قید ہو گئے تو ان کے سب کس بل نکل گئے۔

[۱۷] ❁ جنین پروار د ہونے والے تغیرات اور اللہ تعالیٰ کی انفرادی توجہ:۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مٹی کے چند اجزاء سے آدم کا پتلا بنایا۔ پھر اس میں اپنے ہاں سے روح پھونکی، تو یہی مٹی کے اجزاء، گوشت پوست، ہڈیوں اور عضلات میں تبدیل ہو گئے پھر صرف اتنا ہی نہیں ہوا بلکہ اس میں اللہ کی اپنی کئی صفات بھی منعکس ہو گئیں وہ بولنے لگا۔ دیکھنے اور سننے لگا، سمجھنے لگا اس میں عقل پیدا ہو گئی۔ فہم و تدبر پیدا ہو گیا اور استنباط کا ملکہ پیدا ہو گیا۔ پھر آگے جو اس کی نسل چلی تو اس کے نطفہ سے چلی۔ یہ نطفہ کیا تھا، مٹی کے بے جان عناصر سے ہی حاصل شدہ چیز تھی۔ اور اس حقیر سے قطرہ میں اس انسان کے کثیر خواص منتقل ہو گئے جس کا یہ نطفہ تھا پھر اسی نطفہ سے اللہ نے جنس انسان کو مرد اور عورت کی دو نوعوں میں تبدیل کر دیا۔ غرضیکہ اللہ کے عجائبات کا کہاں تک ذکر کیا جائے۔ مزید حیران کن بات یہ ہے کہ رحم مادر میں اللہ تعالیٰ ہر پیدا ہونے والے بچے کی طرف انفرادی توجہ مبذول فرماتے ہیں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ رحمِ مادر میں کیا کیا تغیرات واقع ہوتے ہیں جن کا اس کی ماں کو بھی علم نہیں ہوتا۔ جس کے پیٹ میں یہ جنین ہوتا ہے پھر اس دوران ہر نو مولود کی عمر بھی طے کر دی جاتی ہے کہ وہ کس عمر میں مرے گا، اسے رزق کتنا ملے گا اور اس کا انجام کیسا ہو گا۔ گویا یہ آیت اللہ تعالیٰ کی خالقیت، اس کے لامحدود اور ہر چیز پر مکمل تصرف پر روشنی ڈالتی ہے۔

[۱۸] ❁ میٹھا پانی اور کھاری پانی اور ان کے مشترکہ فوائد:۔ دریاؤں، چشموں اور جھیلوں کا پانی عموماً میٹھا ہوتا ہے اور سمندروں

تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۱۲﴾ يُوۡلِجُ الَّيۡلَ فِى النَّهَارِ وَيُوۡلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيۡلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجۡرِىۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمۡ لَهُ الۡمُلۡكُ ؕ وَالَّذِيۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ مَا يَمۡلِكُوۡنَ مِنۡ

(ایسے سفر سے) تم اللہ کا فضل تلاش کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔(۱۲) وہ رات کو دن اور دن کو رات[۱۹] میں داخل کرتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو کام پر لگا دیا ہے۔ ہر ایک 'ایک مقررہ مدت تک چلتا رہے گا۔ یہ ہے اللہ (کی شان) جو تمہارا پروردگار ہے۔ اسی کی بادشاہی ہے اور اسے چھوڑ کر جنہیں تم پکارتے ہو وہ تو ایک پرِ کاہ کا بھی اختیار نہیں رکھتے(۱۳)

کا پانی کھاری اور کڑوا۔ پہلی قسم کا پانی زندگی بخش ہے۔ اور دوسری قسم کا پانی پینا تو در کنار اس سے انسان نہا بھی نہیں سکتا۔ گویا پانی ہی دو قسموں میں بٹ گیا۔ اور کبھی کبھی ان دونوں قسم کے پانیوں کے دریا ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ مگر ان کے درمیان کچھ ایسا پردہ حائل ہوتا ہے کہ یہ آپس میں ملنے نہیں دیتا یہ تو ایک الگ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہے یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ زندگی بخش اور حیات افزا پانی کا ذخیرہ اور کڑوے کسیلے پانی کا ذخیرہ دونوں ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ تاہم کچھ فوائد ایسے ہیں جو تمہیں ان دونوں قسم کے پانیوں سے حاصل ہوتے ہیں۔ دونوں طرح کے سمندروں میں آبی جانور اور بالخصوص مچھلی پائے جاتے ہیں اور وہ تمہارے لئے حلال ہیں۔ دونوں میں تم کشتی اور جہاز رانی کر کے تجارتی فوائد حاصل کرتے ہو اور دونوں میں سے موتی، مونگے، ہیرے جواہرات اور مرجان وغیرہ نکلتے ہیں۔ جو تمہارے زیورات میں کام آتے ہیں۔ گویا جو پانی تمہارے پینے کے لحاظ سے ناکارہ تھا اس میں اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اتنے کثیر فوائد رکھے ہوئے ہیں اور یہ نعمتیں تمہیں مفت حاصل ہو رہی ہیں جن پر تمہیں اللہ کا شکر بجالانا چاہئے۔

[۱۹] دن اور رات کے نظام میں تدریج:۔ یعنی جب سورج نکلنے کے قریب ہوتا ہے تو سب سے پہلے روشنی کی ایک لکیر آسمان پر نمودار ہوتی ہے یہ دن کا آغاز ہے۔ پھر یہ روشنی پھیلنا شروع ہو جاتی ہے۔ اور ہر چیز نظر آنے لگتی ہے پھر سورج نکلتا ہے تو روشنی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے حتیٰ کہ دوپہر ہونے تک اس کی روشنی بڑھتی ہی جاتی ہے اور اس میں حرارت اور شدت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے پھر زوال کا وقت شروع ہوتا ہے تو اسی طرح بتدریج گرمی میں اور روشنی میں کمی واقع ہونے لگتی ہے۔ حتیٰ کہ غروبِ آفتاب کے کچھ عرصہ بعد روشنی ختم ہو جاتی ہے تو اس کی جگہ تاریکی بڑھنے لگتی ہے اور یہ سب کچھ اس طرح آہستہ آہستہ اور تدریج کے ساتھ واقع ہوتا ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ رات کو دن پر اور دن کو رات پر لپیٹا جا رہا ہے۔ رات اور دن دونوں ایک دوسرے کے اندر آہستہ آہستہ داخل ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس رات اور دن کی آمد و رفت میں سورج کو بڑا دخل ہے۔ رات کو سورج کی جگہ چاند اہل زمین کو روشنی مہیا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ رات اور دن کا یہ نظام نہ بناتا تو بھی کوئی چیز زندہ نہ رہ سکتی تھی اور نہ ہی کوئی نباتات وغیرہ اگ سکتی تھی۔ اور یہ نظامِ کائنات تا قیامت مسلسل اسی طرح برقرار رہے گا۔ اور جب اس کی بساط لپیٹ دی جائے گی تو اسی کا نام قیامت ہے۔ یہ سب کارنامے تو پروردگار حقیقی کے ہیں اس لئے وہ تو بندگی کا صحیح مستحق ہے۔ اب تم بتاؤ کہ تمہارے معبودوں نے تمہارے لئے کون کون سی فائدہ بخش چیزیں پیدا کی ہیں؟ اور اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے تو پھر ان کا اس کائنات میں تصرف اور اختیار کہاں سے آگیا؟

قِطْمِيْرٍ ﴿۱۳﴾ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۗ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ
بِشِرْكِكُمْ ۗ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ﴿۱۴﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ

اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار سن نہیں سکتے اور اگر سن بھی لیں تو تمہیں جواب نہیں [۲۰] دے سکتے اور قیامت کے دن تو وہ تمہارے شرک [۲۱] کا انکار ہی کر دیں گے۔ اور اللہ خبیر [۲۲] کی طرح آپ کو دوسرا کوئی صحیح خبر نہیں دے سکتا۔ (۱۴) لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو [۲۳] اور وہ (ہر چیز سے) بے نیاز اور حمد کے لائق ہے۔ (۱۵)

[۲۰] ❁ مشرکوں کی فریاد کیسے رائیگاں جاتی ہے؟ اِسْتَجَابُوْا کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک کسی پکار یا سوال کا جواب دینے میں مثلاً ایک شخص مجھ سے پوچھتا ہے کہ کراچی شہر کہاں واقع ہے؟ تو میں اسے جواب دیتا ہوں کہ وہ پاکستان کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اور دوسرا استعمال یہ ہے کہ کوئی شخص مثلاً مجھ سے ایک سو روپیہ مانگتا ہے تو اس کی استجابت کا تعلق فعل سے ہو گا خواہ میں اسے سو روپیہ دے دوں یا نہ دوں اور جواب دے دوں۔ ان بتوں کی کیفیت یہ ہے کہ یہ کچھ سنتے ہی نہیں اور بالفرض سنتے بھی ہوں تو پھر نہ وہ کوئی جواب دے سکتے ہیں اور نہ ہی اس پر کچھ عمل درآمد کر سکتے ہیں گویا ان کے آگے درخواست پیش کرنا بالکل بے محل ہوگی مثلاً ایک شخص درخواست یہ لکھتا ہے کہ میرے گھر میں سوئی گیس کا کنکشن لگایا جائے لیکن وہ یہ درخواست سوئی گیس کے ہیڈ آفس میں بھیجنے کی بجائے محکمہ پولیس کے ہیڈ آفس میں بھیج دیتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اس درخواست پر کچھ عمل درآمد نہ ہو سکے گا خواہ کتنی ہی مدت گزر جائے۔ اس لئے کہ سوئی گیس کا کنکشن دینا محکمہ پولیس کے دائرہ اختیار میں نہیں ہے۔ حالانکہ وہ لوگ سنتے سمجھتے ضرور ہیں۔ یہی حال ان مشرکوں کا ہے وہ اپنی درخواستیں وہاں پیش کرتے ہیں جن کے دائرہ اختیار میں کچھ ہے ہی نہیں۔ لہٰذا قیامت تک بھی مشرکوں کی اس درخواست پر کبھی عمل درآمد نہ ہو سکے گا۔

اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا: ﴿وَمَا دُعَاءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ﴾

[۲۱] اس جملہ سے معلوم ہوا کہ ہر قسم کے معبودوں کو قیامت کے دن حاضر کر لیا جائے گا۔ خواہ وہ پیغمبر تھے یا فرشتے تھے یا بزرگ اور مشائخ تھے۔ خواہ سیاسی قائدین تھے یا بت وغیرہ بے جان قسم کے معبود تھے۔ اور اس مقام پر تو بالخصوص بے جان معبودوں یا بتوں کا ذکر چل رہا ہے۔ یعنی بتوں میں بھی جان ڈال کر میدان محشر میں لا کھڑا کیا جائے گا۔ اور ان معبودوں اور ان کے عبادت گزاروں یعنی مشرکوں کے درمیان مکالمہ ہوگا۔ تو یہ بے جان بت بھی ڈٹ کر مشرکوں کے خلاف شہادت دیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان بتوں کے بجائے وہ مخصوص ارواح ہوں جو مشرکوں نے ان بتوں کے ساتھ تجویز کر رکھی ہیں۔ وہ معبود مشرکوں کو یہی جواب دیں گے کہ بدبختو! ہم نے تمہیں کب کہا تھا کہ تم ہماری عبادت کرنا اور اگر تم ہماری عبادت کرتے بھی رہے ہو تو ہمیں اس کی کچھ خبر نہیں ہے۔

[۲۲] ❁ قیامت کو معبود اپنے عابدوں کے دشمن بن جائیں گے:۔ خبیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو موجود اور غیر موجود، گذشتہ اور آنے والے حالات سے پوری طرح خبردار ہے۔ اور اس کے سامنے کوئی چیز غیب ہے ہی نہیں بلکہ سب کچھ شہادت ہی شہادت ہے۔ اب اگر دوسرا کوئی شخص مستقبل کے متعلق کوئی خبر دے گا تو ظاہر ہے کہ وہ یقینی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کی بنیاد ظن و تخمین پر ہوگی اس کے مقابلہ میں اللہ کی خبر یقینی ہے کیونکہ وہ آئندہ کے واقعات سے خبردار بھی ہے اور انہیں دیکھ بھی رہا ہے۔ اور اللہ کی بتائی ہوئی خبر یہ ہے کہ قیامت کے دن ہر قسم کے معبود اپنے عبادت گزار مشرکوں کے خلاف گواہی دیں گے ان کی عبادت سے انکار کر دیں گے اور ان کے دشمن بن جائیں گے۔

[۲۳] یہ خطاب تمام جہان کے انسانوں سے ہے کہ تم اپنی صحت کے لئے، اپنے رزق کے لئے، اپنی زندگی کی بقاء غرض ایک،

الْحَمِيْدُ ﴿۱۵﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۱۷﴾
وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ
ذَا قُرْبٰى ؕ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَمَنْ

اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور (تمہاری جگہ) کوئی نئی خلقت[۲۴] لے آئے (۱۶) اور یہ بات اللہ تعالیٰ پر کچھ دشوار نہیں (۱۷) اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کے (گناہوں کا) بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اور اگر بوجھ[۲۵] سے لدا ہوا شخص کسی دوسرے کو اٹھانے کے لئے بلائے گا بھی تو کوئی اس کے بوجھ کا کچھ بھی حصہ اٹھانے کو تیار نہ ہوگا اگرچہ وہ اس کا قرابت دار ہو۔ (اے نبی!) آپ تو صرف ان لوگوں کو ہی ڈرا سکتے ہیں جو بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ اور جو شخص پاکیزگی[۲۶] اختیار کرتا ہے۔

ایک چیز کے لئے اللہ کے محتاج ہو تمہارے رزق اور بقائے حیات کے لئے اللہ تعالیٰ نے جن جن اشیائے کائنات کو کام پر لگا رکھا ہے۔ ان میں سے کسی ایک کو ہٹا لے تو تم زندہ بھی نہیں رہ سکتے۔ دوسری ضرورتوں کی احتیاج بعد کی چیز ہے اور اللہ کی شان یہ ہے کہ اسے کسی انسان بلکہ کائنات کی کسی بھی چیز کی احتیاج نہیں۔ وہ بذاتِ خود ازل سے لے کر ابد تک قائم و دائم ہے۔ اور کوئی اس کی حمد و ثنا نہ بھی کرے تو بھی وہ اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔

[۲۴] یعنی اگر تم اللہ کی نافرمانی کی راہ اختیار کرو گے تو تمہیں پرے ہٹا دے گا۔ صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دے گا اور تمہاری جگہ ایسے لوگوں کو لا آباد کرے گا جو اس کے فرمانبردار ہوں۔ پھر ان کی آزمائش کرے گا۔ ابتدائے نوعِ انسان سے اللہ کا یہی دستور رہا ہے۔ کہ وہ نافرمان اور سرکش قوموں کا سر کچل کر ان کی جگہ دوسری قومیں لا آباد کرتا ہے اور یہ بات اللہ کے لیے کچھ مشکل بھی نہیں۔

[۲۵] ۞ وزر کا لغوی مفہوم اور قانون جزاء و سزا:۔ وزر کا لفظ، بالخصوص گناہوں کے بوجھ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کا ضابطہ یہ ہے کہ جو کرے گا، وہی بھرے گا۔ یہ ناممکن ہے کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی دوسرا یہ کہ اسے اتنی ہی سزا ملے گی جتنا اس نے گناہ کیا ہوگا اس سے زیادہ نہیں۔ البتہ اگر کوئی شخص ایسا گناہ کا کام رائج کر جائے جس پر بعد میں آنے والے لوگ عمل پیرا ہوں مثلاً کوئی شرکیہ عقیدہ یا کام یا کوئی بدعت رائج کر جائے تو حصہ رسدی کے طور پر اس کے اپنے گناہوں کے بوجھ میں اضافہ بھی ہوتا رہے گا۔ اور دوسری حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ اپنے ذمہ لینے کو تیار بھی نہ ہوگا۔ نہ باپ بیٹے کا گناہ اپنے سر مول لے گا اور نہ بیٹا باپ کا۔ ہر ایک کو اپنی اپنی ہی فکر لاحق ہوگی۔ کفارِ مکہ بعض مسلمانوں کو یہ بات کہا کرتے تھے کہ تم اپنے آبائی دین میں واپس آجاؤ۔ اگر کوئی عذاب و ثواب کی بات ہوئی بھی تو تمہارا بوجھ ہم اپنے ذمہ لے لیں گے۔ اور یہ بات وہ اس لحاظ سے کہتے تھے کہ وہ آخرت اور آخرت کی باز پرس کے قائل ہی نہ تھے۔ اس آیت میں ان لوگوں کے اس قول کا بھی جواب آگیا کہ یہ محض ان کے منہ کی باتیں ہیں۔ جب انہیں محاسبہ سے دوچار ہونا پڑا تو اس کے حواس ٹھکانے آجائیں گے۔

[۲۶] یعنی ضدی اور ہٹ دھرم قسم کے لوگ آپ کے سمجھانے اور ڈرانے سے کبھی اپنا رویہ نہ بدلیں گے۔ نصیحت صرف اس شخص کے حق میں کارگر ہو سکتی ہے؟ جو بن دیکھے آخرت پر یقین رکھتا ہو اور اللہ کے حضور اپنے اعمال کی جوابدہی سے ڈرتا

تَزَکّٰی فَاِنَّمَا یَتَزَکّٰی لِنَفْسِهٖ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِیْرُ ﴿۱۸﴾ وَ مَا یَسْتَوِی الْاَعْمٰى وَ الْبَصِیْرُ ﴿۱۹﴾ وَ لَا
الظُّلُمٰتُ وَ لَا النُّوْرُ ﴿۲۰﴾ وَ لَا الظِّلُّ وَ لَا الْحَرُوْرُ ﴿۲۱﴾ وَ مَا یَسْتَوِی الْاَحْیَآءُ وَ لَا الْاَمْوَاتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
یُسْمِعُ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَ مَاۤ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ ﴿۲۲﴾ اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِیْرٌ ﴿۲۳﴾ اِنَّاۤ

تو وہ اپنے ہی لئے اختیار کرتا ہے اور (سب کو) اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔(۱۸)

نہ تو نابینا اور بینا برابر ہو سکتے ہیں،(۱۹) نہ اندھیرے اور روشنی(۲۰) اور نہ سایہ[۲۷] اور دھوپ ایک جیسی ہے۔(۲۱) اور نہ ہی زندے اور مردے[۲۸] یکساں ہوتے ہیں۔ اللہ تو جسے چاہے سنا سکتا ہے لیکن آپ ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں[۲۹] میں پڑے ہیں(۲۲) آپ تو صرف ایک ڈرانے والے ہیں۔(۲۳)

ہو۔ ایسے ہی لوگ نمازیں بھی قائم کرتے ہیں۔ اور اپنا طرز عمل پاکیزہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس میں ان کا اپنا ہی بھلا ہے وہ اللہ پر کچھ احسان نہیں کرتے۔ اور یہ فائدہ اس وقت پوری طرح ظاہر ہوگا جب سب لوگ اللہ کے حضور پیش ہوں گے۔

[۲۷] بینا اور نابینا کون لوگ ہیں؟ یعنی ایک شخص اس طرح دل کا اندھا بنا ہوا ہے کہ کائنات میں ہر سو اللہ تعالیٰ کی بکھری ہوئی نشانیوں میں غور کرنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ دوسرا شخص انہی نشانیوں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی توحید کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور عجائبات قدرت میں غور کرنے کے بعد اس کا دل اللہ تعالیٰ کی محبت سے سرشار ہو جاتا ہے اور بے اختیار اللہ کی حمد و ثنا اس کی زبان پر آجاتی ہے۔ تو کیا یہ دونوں ایک جیسے ہو سکتے ہیں؟ یا ایک شخص جہالت کی تاریکیوں میں مسلسل آگے بڑھتا جا رہا ہے اور دوسرا علم کی روشنی میں محتاط رہ کر اپنا سفر زندگی جاری رکھتا ہے کیا یہ دونوں ایک جیسے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ دونوں اپنے اپنے طرز زندگی کے لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد ہیں تو ان کا انجام بھی ایک دوسرے کے برعکس ہی ہونا چاہئے یعنی جس طرح ٹھنڈی چھاؤں اور چلچلاتی دھوپ ایک دوسرے کی ضد ہیں اسی طرح علم کی روشنی میں سفر کرنے والے کو ٹھنڈی چھاؤں والی اور دوسری نعمتوں والی جنت نصیب ہوگی۔ اور جہالت کے اندھیروں میں آگے بڑھنے والا یک لخت جہنم کے کنارے جا پہنچے گا۔

[۲۸] یہاں زندہ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے دل اور ضمیر زندہ ہیں۔ جو بدی کو بدی ہی سمجھتے ہیں اور نیکی کی راہ کی تلاش میں رہتے ہیں۔ پھر اس پر عمل پیرا بھی ہوتے ہیں۔ اور مردہ سے مردہ دل لوگ یا کافر ہیں۔ ان کے ضمیر اور ان کے دل اس قدر مر چکے ہیں کہ ہدایت کی بات ان کے دل تک پہنچتی ہی نہیں۔ نہ وہ اسے سننا گوارا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آپ کا ایسے لوگوں کو نصیحت کرنا بے سود ہے۔

[۲۹] سماع موتیٰ کا رد:۔ ربط مضمون کے لحاظ سے یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے کہ قبروں میں پڑے لوگوں سے مراد یہی مردہ دل کافر لوگ ہیں مگر الفاظ کے ظاہری معنوں کا اعتبار کرنا زیادہ صحیح ہوگا۔ یعنی جو لوگ قبروں میں جا چکے ہیں انہیں اللہ تو سنا سکتا ہے آپ نہیں سنا سکتے۔ کیونکہ قبروں میں پڑے ہوئے لوگ عالم برزخ میں جا پہنچے ہیں۔ عالم دنیا میں نہیں ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک سویا ہوا شخص اپنے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کی گفتگو نہیں سن سکتا۔ اس لیے عالم خواب الگ عالم ہے۔ اور عالم بیداری الگ عالم ہے۔ حالانکہ یہ دونوں عالم، عالم دنیا سے ہی متعلق ہیں مگر عالم برزخ دنیا سے متعلق نہیں بالکل الگ عالم ہے۔ لہٰذا قبروں میں پڑے ہوئے لوگ بدرجہ اولیٰ دنیا والوں کی بات سن نہیں سکتے۔ یہ آیت سماع موتیٰ کا کلیتاً رد ثابت

اَرۡسَلۡنٰكَ بِالۡحَقِّ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا ؕ وَاِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيۡهَا نَذِيۡرٌ ﴿۲۴﴾ وَاِنۡ
يُّكَذِّبُوۡكَ فَقَدۡ كَذَّبَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ۚ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَ
۳ ع ۱۵ بِالۡكِتٰبِ الۡمُنِيۡرِ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اَخَذۡتُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فَكَيۡفَ كَانَ نَكِيۡرِ ﴿۲۶﴾ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ
اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُهَا ؕ وَمِنَ الۡجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيۡضٌ

یقیناً ہم نے آپ کو سچا دین دے کر بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی امت [۳۰] ایسی نہیں گزری جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔(۲۴) اور اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے کے لوگ بھی جھٹلاتے رہے ہیں۔ ان کے رسول ان کے پاس واضح دلائل [۳۱]، صحیفے اور روشنی بخش کتاب لے کر آئے تھے (۲۵) پھر جن لوگوں نے کفر کیا انہیں میں نے پکڑ لیا پھر دیکھ لو میری گرفت کیسی سخت تھی۔(۲۶) کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے جس سے ہم رنگارنگ [۳۲] کے پھل پیدا کرتے ہیں۔ اور پہاڑوں میں بھی مختلف رنگوں کی سفید ......

کرتی ہے۔ رہا قلیبِ بدر کا واقعہ جو احادیثِ صحیحہ میں مذکور ہے۔ کہ جنگ بدر میں ستر مقتول کافروں کی لاشیں بدر کے کنوئیں میں پھینک دی گئیں۔ تو تیسرے دن رسول اللہ ﷺ نے اس کنوئیں کے کنارے کھڑے ہو کر فرمایا: ”تمہارے مالک نے جو سچا وعدہ تم سے کیا تھا وہ تم نے پا لیا؟“ لوگوں نے عرض کیا: ”یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ ﷺ مردوں کو سناتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم کچھ ان سے زیادہ نہیں سنتے، البتہ وہ جواب نہیں دے سکتے“ (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب قتل ابی جھل ...... بخاری کتاب الجنائز۔ باب ماجاء فی عذاب القبر) اور سیدنا قتادہ نے اس حدیث کی تفسیر میں کہا کہ اللہ نے اس وقت ان مردوں کو جلا دیا تھا ان کی زجر و توبیخ، ذلیل کرنے، بدلہ لینے اور شرمندہ کرنے کے لیے“ (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب قتل ابی جھل) گویا یہ ایک معجزہ تھا اور فی الحقیقت سنانے والا اللہ تعالیٰ ہی تھا۔ اور یہ اس آیت کا مفہوم ہے۔

[۳۰] اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر امت اور بستی میں اللہ نے کوئی نہ کوئی نبی یا رسول ضرور بھیجا ہے۔ بلکہ اس سے مراد صرف وہ امت یا وہ لوگ ہیں جن تک کسی نبی کی تعلیم نہ پہنچ سکی ہو۔ خواہ اس کی وجہ فاصلہ کی دوری ہو یا مدت کی دوری ہو۔ بالفاظ دیگر تمام انسانوں تک اللہ کی دعوت کی آواز یقینی طور پر پہنچ چکی ہے خواہ ان کے پاس کوئی رسول آیا ہو یا نہ آیا ہو۔

[۳۱] بینات کا لفظ معجزات کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور ایسے دلائل کے لیے بھی جن سے نبی اپنی نبوت کو ثابت کر سکے۔ صحیفے بمعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل احکام جو عام طور پر پند و نصائح اور اخلاقی ہدایات پر مشتمل ہوتے تھے۔ تورات کے نزول سے پہلے سب انبیاء پر صحائف ہی نازل ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ موسیٰ پر بھی تورات کے نزول سے پیشتر صحیفے ہی نازل ہوتے رہے اور کتاب منیر سے مراد وہ مفصل کتب الٰہیہ ہیں جو زندگی کے ہر پہلو میں انسان کو روشنی مہیا کرتی ہیں۔ اور یہ چار ہیں۔ تورات، زبور، انجیل اور قرآن۔

[۳۲] ہر قسم کی مخلوق میں تنوع بھی ہے فوائد بھی اور خوبصورتی بھی:۔ یہ دو آیات اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی طرف ہر انسان کی توجہ مبذول کراتی ہیں۔ یعنی زمین ایک ہے پانی ایک ہے، ہوا ایک ہے۔ لیکن نباتات جو اگتی ہے ان کی شکلیں مختلف

رنگ مختلف اور پھول ہیں تو خوشبوئیں مختلف ہوتی ہیں۔ گلاب کے پھول کی رنگت، ساخت اور خوشبو، لالہ کے پھول سے مختلف ہے اسی طرح چنبیلی کے پھول' نیلو فر اور سورج مکھی کے پھول بھی آپس میں مختلف ہیں۔ پھر ایک ہی پھول میں کئی رنگوں کی آمیزش کچھ ایسی خوبصورتی سے ترکیب دی گئی ہے جو فوراً دل کو موہ لیتی ہے اور اگر پھل پیدا ہوتے ہیں تو انگور کی شکل، رنگ، ذائقہ، اور خواص اور ہوں گے۔ سیب کے اور کھجور کے اور آم کے اور۔ پھر مثلاً آم ہی کو یا کھجور کو لیجئے۔ اس جنس کی آگے بے شمار انواع ہیں۔ اور ہر نوع میں ایسی امتیازی خصوصیات موجود ہیں کہ انسان یہ معلوم کر لیتا ہے کہ یہ کھجور یا آم فلاں قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر یہ تنوع صرف پھولوں، پھلوں اور سبزیوں میں نہیں بلکہ جمادات کی طرف دیکھو تو وہاں بھی اللہ کی یہ قدرت کار فرما نظر آئے گی کہیں خشک کالے مٹیالے اور سیاہ پہاڑ ہیں۔ کہیں پہاڑوں پر بلند و بالا درخت اور سبزہ اگ کر نہایت خوشنما منظر پیش کر رہا ہے۔ کہیں نمک کا پہاڑ ہے کہیں سنگ مر مر کا پہاڑ ہے۔ پھر ایک ہی پہاڑ میں کہیں سیاہ دھاریاں دور تک چلی گئی ہیں۔ کہیں سپید ہیں اور کہیں سرخ۔ اب جانداروں کی طرف آیئے تو یہاں بھی ہم یہی منظر دیکھتے ہیں۔ مویشیوں میں سے ایک جنس کے کئی کئی رنگ ہیں انسانوں کا بھی یہی حال ہے کچھ گورے ہیں کچھ سفید ہیں کچھ سرخ ہیں کچھ کالے اور کچھ سانولے ہیں۔ حالانکہ ان کی پیدائش اور ترکیب کے اجزاء و عناصر پر غور کیا جائے تو وہ سب یکساں ہی ہوتے ہیں اس کے باوجود ہر جنس میں اللہ تعالیٰ نے اتنے لاتعداد نئے سے نئے ڈیزائن تیار کر دیئے ہیں جنہیں دیکھ کر ہی عقل دنگ رہ جاتی ہے یہ یکسانیت میں اختلافات اور اختلافات میں یکسانیت، یہ مختلف رنگ اور ان رنگوں کا حسین امتزاج ان میں توازن و تناسب اور ان سب باتوں کے باوجود ان سب چیزوں میں انسان کے لئے خوشنمائی اور دلنشینی پھر ان میں سے ہر چیز کا انسان کیلئے مفید اور کار آمد ہونا کیا یہ سب چیزیں کسی عظیم مدبر اور حکیم صناع کی طرف رہنمائی نہیں کرتیں؟ کیا یہ سب باتیں اتفاقات کا نتیجہ قرار دی جا سکتی ہیں؟

۞ علم صرف وہ مفید ہے جس سے اللہ کا خوف پیدا ہو اور حقیقی عالم وہ ہے جو اللہ سے ڈرتا بھی ہو:۔ ایک باشعور انسان جب ان باتوں میں غور کرتا ہے تو اس صانع حقیقی کی عظمت اس کے دل میں جاگزیں ہوتی جاتی ہے۔ اسے اس ہستی سے محبت ہو جاتی ہے۔ جو اتنی قدرتوں کی مالک ہے پھر اس کے سامنے سجدہ ریز ہونے میں اسے مزا آنے لگتا ہے اور یہی وہ نتیجہ ہے جسے قرآن ان الفاظ میں پیش کرتا ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف عالم لوگ ہی اللہ سے ڈرتے ہیں" اور اس جملہ سے کئی باتیں مستفاد ہوتی ہیں مثلاً۔

۱۔ جتنا بھی ان مظاہر قدرت میں غور و فکر کیا جائے گا اتنی اس سے اللہ کی معرفت پیدا ہو گی اور اتنی ہی اللہ کی خشیت پیدا ہو گی۔

۲۔ علوم کی بھی تین قسمیں ہیں ایک وہ علم جس سے اللہ کی خشیت پیدا ہوتی ہے یہ علم کا اعلیٰ درجہ ہے۔ خواہ ایسا شخص اصطلاحی معنوں میں پڑھا لکھا ہو یا نہ ہو۔ دوسرے وہ علوم ہیں جو خشیت تو پیدا نہیں کرتے تاہم انسانیت کے لئے مفید ہیں جیسے حساب اور مختلف زبانوں کا علم ان پر بھی علم کا اطلاق ہو سکتا ہے اور جو علم اللہ سے دور کر دے وہ علم نہیں بلکہ ضلالت ہے۔

۳۔ ۞ کیا علماء سے مراد سائنٹسٹ ہیں؟ ہر شخص اللہ کی آیات میں غور کرنے کے بعد ایک ہی نتیجہ پر نہیں پہنچتا مثلاً پرویز صاحب انہی آیات کا نتیجہ یہ پیش کرتے ہیں کہ "ان آیات میں نباتات، جمادات اور حیوانات کا ذکر ہے اور یہی چیزیں علم سائنس کی بڑی بڑی شاخیں ہیں لہٰذا ان علوم کے ماہر ہی حقیقتاً "عالم" ہیں۔ جنہیں آج کی اصطلاح میں سائنٹسٹ کہا جاتا ہے۔" (اسباب زوال امت ص ۹۵) اب ان حضرات سے سوال یہ ہے کہ کیا یہ عالم یا سائنٹسٹ حضرات اللہ سے ڈرتے بھی

وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ﴿٢٧﴾ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ
مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ﴿٢٨﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا
وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ﴿٢٩﴾ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ

سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں ہوتی ہیں۔(۲۷)

اور اسی طرح انسانوں، جانوروں اور مویشیوں کے بھی رنگ مختلف ہیں۔ بلاشبہ اللہ کے بندوں میں سے اس سے ڈرتے وہی ہیں جو علم رکھنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ یقیناً ہر چیز پر غالب[۳۳] اور بخشنے والا ہے۔(۲۸) جو لوگ اللہ کی کتاب پڑھتے، نماز قائم کرتے، اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس میں سے خفیہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں وہ ایسی تجارت کے امیدوار[۳۴] ہیں جس میں کبھی خسارہ نہ ہوگا۔(۲۹) تاکہ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ ان کا پورا پورا اجر دے اور اپنی مہربانی سے کچھ زیادہ بھی دے۔ بلاشبہ وہ معاف کرنے والا ہے اور قدردان[۳۵] ہے۔(۳۰)

ہیں؟ اصل شرط تو خشیۃ اللہ ہے نہ کہ ان علوم میں مہارت۔ اگر وہ ڈرتے بھی ہیں تو پھر وہ فی الواقع عالم ہیں۔ ورنہ نہیں۔

۴۔ اس آیت میں لفظ علماء سے مراد وہ اصطلاحی علماء بھی مراد نہیں ہیں جو قرآن و حدیث اور فقہ و کلام کا علم رکھنے کی بنا پر علمائے دین کہلاتے ہیں وہ اس آیت کے مصداق صرف اس صورت میں ہوں گے جبکہ ان کے اندر اللہ کی خشیت موجود ہو۔

[۳۳] یعنی وہ چاہے تو اپنے باغیوں، کج فہموں اور نافرمانوں کو فوراً پکڑ سکتا ہے۔ مگر یہ اس کی صفت عفو کا ہی تقاضا ہے کہ وہ لوگوں کو مہلت دیئے جاتا ہے۔

[۳۴] دنیا میں انسان جس چیز کی بھی تجارت کرتا ہے۔ اس پر فوری توجہ بھی صرف کرتا ہے اور اس کام کے لئے مخلص بھی ہوتا ہے اس کے باوجود اسے نقصان کا خطرہ بھی رہتا ہے لیکن اللہ کا مخلص بندہ جو اپنے اللہ کے ساتھ تجارت کرتا ہے اس میں کبھی خسارے اور نقصان کا اندیشہ نہیں۔

[۳۵] ❁ **اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں کے اعمال کی قدر دانی' پیاسے کو پانی پلانے اور راہ سے کانٹے ہٹانے پر بخشش:۔** یعنی اللہ کا اپنے بندوں سے معاملہ ایسا نہیں ہے جیسا ایک تنگ ظرف آقا کا معاملہ اپنے ملازم سے ہوتا ہے۔ جو بات بات پر اپنے ملازم پر گرفت تو کرتا ہے مگر اس کی خدمات کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اللہ کا اپنے بندوں سے معاملہ اس سے بالکل برعکس ہے۔ وہ اپنے بندوں کی چھوٹی موٹی غلطیاں معاف کر دیتا ہے اور ان سے ان کی باز پرس بھی نہیں کرتا اور انسان جو نیک اعمال بجالاتا ہے ان کا ان کے اجر سے بہت زیادہ بدلہ عطا فرماتا ہے۔ اسے اپنے بندے کی کوئی بھی ادا پسند آجائے تو اسے اجر عظیم عطا فرماتا ہے۔ چنانچہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: "ایک شخص نے ایک کتا دیکھا جو پیاس کے مارے گیلی مٹی چاٹ رہا تھا۔ اس نے اپنا موزا اتارا اور اس میں پانی بھر بھر کر اس کو پلانا شروع کیا یہاں تک کہ وہ سیر ہو گیا۔ اللہ نے اس کے اس کام کی قدر کی اور اس کو جنت عطا فرمائی" (بخاری۔ کتاب الوضوء۔ باب اذا شرب الکلب فی الاناء) نیز سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿٣٠﴾ وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ﴿٣١﴾ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ
وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿٣٢﴾ جَنّٰتُ

(اے نبی!) جو کتاب ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے وہی حق [۳۶] ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے باخبر اور انہیں دیکھنے والا ہے۔(۳۱)

پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب [۳۷] کا وارث بنایا جنہیں ہم نے (اس وراثت کے لئے) اپنے بندوں میں سے چن لیا۔ پھر ان میں سے کوئی تو اپنے آپ پر ظلم کرنے والا ہے۔ کوئی میانہ رو ہے اور کوئی اللہ کے اذن سے نیکیوں میں آگے نکل جانے والا ہے۔ یہی بہت بڑا فضل ہے۔(۳۲)

ہی سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ”ایک مرتبہ ایک شخص کہیں جا رہا تھا اس نے راستہ میں کانٹوں والی ایک ٹہنی دیکھی جسے اس نے راہ سے ہٹا دیا۔ اللہ تعالیٰ کو اس کا یہ کام بہت پسند آیا اور اسے بخش دیا“ (بخاری۔ کتاب الاذان۔ باب فضل التهجير الى الظهر)

[۳۶] ❁ قرآن کے حق ہونے کا مطلب زندگی کے حقائق کا لحاظ رکھنا ہے:۔ وہ حق اس لئے ہے کہ وہ اس ہستی کی طرف سے نازل ہوئی ہے جس نے انسان کو بنایا ہے۔ جتنا وہ انسان کی فطرت سے واقف ہو سکتا ہے دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس کتاب کے جملہ احکام وارشادات انسان کی فطرت کے مطابق بھی ہیں اور پوری انسانیت کے مصالح پر مبنی ہیں۔ اور بنی نوع انسان کی فلاح کے ضامن بھی ہیں۔ وہ ذات اپنے بندوں کی فطرت اور ان کے حالات سے پوری طرح باخبر ہے۔ اسی لئے اس کے بعض احکام تو غیر متبدل اور دائمی ہیں جو سابقہ آسمانی کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ اسی لحاظ سے یہ قرآن ان کی تصدیق کرتا ہے۔ اور بعض نئے احکام بھی ہیں۔ بعض میں تبدیلی بھی کی گئی ہے اور یہ سب کچھ بندوں کے حالات کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ پھر وہ اپنے کمزور اور معذور بندوں کو رخصتیں بھی عطا فرماتا ہے۔ اور حالات کے مطابق احکام میں رعایتیں بھی ملحوظ رکھتا ہے اس لئے کہ وہ اپنے سب بندوں کے حالات سے پوری طرح باخبر ہے۔

[۳۷] ❁ اعمال کے لحاظ سے تین قسم کے مسلمان اور ان کا انجام:۔ اس آیت میں کتاب سے مراد قرآن کریم ہے۔ اس کے اولین وارث صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت ہے۔ اس آیت سے ان کی بہت فضیلت ثابت ہوئی۔ پھر ان کے بعد درجہ بدرجہ اور نسل بعد نسل آپ کی ساری امت بھی اس کتاب کی وارث ہے۔ پھر ان وارثوں کے تین طبقات ہیں یا تین قسم کے گروہ ہیں۔ ایک وہ جو اپنے نفس پر ظلم کر رہے ہیں۔ یعنی وہ اللہ کے باغی نہیں ہیں، مشرک بھی نہیں ہیں۔ کتاب وسنت کی اتباع کے داعی بھی ہیں۔ مگر ان کے اعمال ان کے دعوے کی پوری طرح تصدیق نہیں کرتے۔ وہ خطاکار ضرور ہیں مگر اپنے جرائم پر نادم ضرور ہوتے ہیں۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو نیک اعمال بجا لا رہا ہے تاہم کبھی کبھار ان سے گناہ کے کام بھی ہوتے ہیں۔ یہ درمیانہ درجہ کے لوگ ہیں۔ اور ایک وہ لوگ ہیں جو ہر نیکی کے کام کی طرف آگے بڑھ کر لپکتے ہیں۔ ان کی ارزو یہ رہتی ہے

جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا ۚ وَ لِبَاسُهُمْ فِیْهَا حَرِیْرٌ ﴿۳۳﴾
وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ﴿۳۴﴾ ۙ الَّذِیْۤ اَحَلَّنَا
دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ﴿۳۵﴾ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا

وہ ہمیشہ رہنے والے باغات میں داخل ہوں گے۔ وہاں انہیں سونے کے کنگنوں اور موتیوں[۳۸] سے آراستہ کیا جائے گا اور وہاں ان کا لباس ریشم کا ہو گا۔(۳۳) اور وہ کہیں گے اس اللہ کا شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کر دیا[۳۹]۔ یقیناً ہمارا پروردگار بخشنے والا، قدر دان ہے(۳۴) جس نے اپنے فضل سے ہمیں ابدی قیام گاہ میں اتارا جہاں ہمیں مشقت اٹھانی پڑتی ہے اور نہ تھکان لاحق ہوتی ہے۔(۳۵) اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لئے

کہ جتنی زیادہ بھلائیاں سمیٹ سکتے ہیں سمیٹ لیں۔ وہ گناہوں سے اجتناب میں بھی ممکن حد تک احتیاط کرتے ہیں۔ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ تینوں قسم کے لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ (ترمذی۔ ابواب التفسیر) اور ان میں فرق یہ ہو گا کہ افضل قسم کے لوگ بلا حساب جنت میں داخل ہوں گے۔ درمیانہ طبقہ سے حساب تو لیا جائے گا مگر یہ آسان سا اور سرسری قسم کا حساب ہو گا اور زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی جائے گی۔ اور تیسرے درجہ کے لوگوں کو روک لیا جائے گا اور قیامت کا سارا دن جو پچاس ہزار سال کا ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہو سکیں گے۔ پھر اس مدت کے اختتام پر اللہ تعالیٰ ان پر مہربانی فرمائے گا اور انہیں بھی داخلہ کی اجازت مل جائے گی۔ تاہم یہ قیامت کے دن کی سختیاں ضرور برداشت کریں گے اور اللہ کا فضل تو ان سب پر ہو گا۔

[۳۸] نوابوں اور راجوں اور مہاراجوں میں یہ دستور تھا کہ وہ سونے کے کنگن پہنتے جن میں ہیرے اور جواہرات وغیرہ جڑے ہوتے تھے۔ نیز وہ ریشم کا نرم و نازک لباس پہنتے تھے یہی عیش و عشرت کی وہ انتہا تھی جو اس دنیا میں سمجھی جا سکتی تھی۔ اس لئے ان چیزوں کا نام لیا گیا۔ مقصد یہ ہے کہ جنت والوں کا لباس اور عیش و عشرت اس دنیا کے بادشاہوں اور راجوں مہاراجوں سے کم نہ ہو گا۔ سونا اور ریشم اس دنیا میں امت مسلمہ کے مردوں پر حرام کیا گیا ہے۔ جس میں بے شمار حکمتیں پوشیدہ ہیں سب سے بڑی اور عام فہم بات ہے کہ جو لوگ ایسی عیاشیوں میں پڑ کر اپنی ذات پر ہی اس طرح خرچ کرنا شروع کر دیں تو وہ غریبوں کا کیا خیال رکھ سکیں گے۔ یہی باتیں طبقاتی تقسیم اور اس سے آگے بہت بڑے فتنہ و فساد کا پیش خیمہ بنتی ہیں۔ مگر جنت میں چونکہ ایسی خرابیوں کا احتمال ہی نہ ہو گا۔ لہٰذا وہاں یہ چیزیں جائز ہوں گی۔

[۳۹] یہ جملہ بالخصوص تیسرے طبقہ کے لوگوں کا وظیفہ ہو گا۔ جنہوں نے قیامت کے دن کی ساری مدت اس فکر میں گزاری ہو گی کہ دیکھیں کہ ان کے حق میں کیا فیصلہ صادر ہوتا ہے پھر جب انہیں جنت میں داخلہ کی اجازت مل جائے گی تو خوشی سے اللہ کی حمد بیان کریں گے۔ جس نے ان کے سارے غم و فکر دور کر دیئے۔ ہمارا پروردگار تو واقعی بڑا بخشنے والا اور بڑا قدر دان ہے۔ جس نے ہماری خطائیں تو معاف فرما دیں اور ہمارے اعمال سے بہت زیادہ ہمیں بدلہ عطا فرما دیا۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ہمارا کون سا ٹھکانا ہو گا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں جائے رہائش دی جو لازوال ہے۔ ہر طرح کی نعمتیں اور رزق پہلے سے ہی موجود ہے جس کے لئے ہمیں چنداں محنت و مشقت نہیں کرنی پڑے گی۔

لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ۭ كَذٰلِكَ
نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ﴿٣٦﴾ وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ
الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ۭ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاۗءَكُمُ النَّذِيْرُ ۭ فَذُوْقُوْا

جہنم کی آگ ہے۔ نہ تو ان کا قصہ پاک کیا جائے گا کہ وہ مر جائیں [۴۰] اور نہ ہی ان سے جہنم کا عذاب ہلکا کیا جائے گا۔ ہم ہر ناشکرے کو ایسے ہی سزا دیا کرتے ہیں۔ (۳۶) وہاں وہ چیخ چیخ کر کہیں گے: "ہمارے پروردگار! ہمیں (اس سے) نکال کہ ہم نیک عمل کریں۔ ویسے نہیں جیسے پہلے کیا کرتے تھے۔ (اللہ تعالیٰ جواب میں فرمائے گا) کیا ہم نے تمہیں اتنی عمر نہیں [۴۱] دی تھی جس میں اگر کوئی نصیحت حاصل کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا؟ حالانکہ تمہارے پاس ڈرانے والا (بھی) آیا تھا اب (عذاب کا)

[۴۰] ❁ مینڈھے کی شکل میں موت کا ذبح ہونا:۔ صحیح احادیث میں آیا ہے کہ میدان محشر میں جب ایمانداروں اور نافرمانوں کا فیصلہ ہو چکے گا تو سب کے سامنے ایک مینڈھا لا کر اسے ذبح کر دیا جائے گا اور لوگوں سے پوچھا جائے گا کہ جانتے ہو یہ مینڈھا کیا چیز ہے؟ سب کہیں گے۔ ہاں ہم جانتے ہیں یہ موت ہے۔ پھر ایک فرشتہ اہل جنت کو مخاطب کر کے کہے گا۔ اب تم ہمیشہ جنت میں رہو گے اور تمہیں کبھی موت نہیں آئے گی۔ پھر وہی فرشتہ اہل دوزخ کو مخاطب کر کے کہے گا کہ اب تم ہمیشہ دوزخ میں رہو گے اور تمہیں کبھی موت نہیں آئے گی۔ (مسلم کتاب الجنة وصفة نعیمها واهلها. باب جهنم)

یہ تو کافروں اور اللہ کی نمک حرامی کرنے والوں کی ایک سزا ہوگی۔ دوسری سزا یہ ہوگی کہ ان کے عذاب میں نہ کبھی وقفہ آئے گا اور نہ عذاب کی شدت میں کمی کی جائے گی۔ بلکہ اس کے بجائے ان کے عذاب میں دم بدم اضافہ ہی کیا جاتا رہے گا۔

[۴۱] ❁ جہنمیوں کی فریاد کے مختلف جوابات:۔ اہل دوزخ کی اس فریاد کا ذکر بھی قرآن کریم میں متعدد مقامات پر مذکور ہے اور اس کے مختلف جواب بھی۔ مثلاً ایک مقام پر یہ جواب دیا گیا کہ اگر ہم انہیں دوبارہ دنیا میں بھیج بھی دیں تو وہ پھر دل کی دلفریبیوں پر مفتون ہو جائیں گے اور پھر ویسے ہی کام کریں گے جیسے پہلے کر کے آئے ہیں۔ دوسرے مقام پر یہ جواب دیا گیا کہ ان کی یہ آرزو بالکل لغو ہوگی۔ کیونکہ ایمان لانے سے مراد غیب پر ایمان لانا ہے اور اعمالِ صالحہ کا نمبر اس کے بعد آتا ہے اور یہاں روز آخرت میں جب سب کچھ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو پھر یہ تو ایمان بالشہادت ہو گیا۔ اور شہادت یا دیکھی ہوئی چیز پر تو ہر کوئی یقین کر لیتا ہے۔ پھر ان کی آزمائش کیا رہی جبکہ ہر انسان کو قوت ارادہ و اختیار اور عقل و فہم اس لئے دیا گیا تھا کہ اس کی آزمائش ہوگی اور تیسرا جواب یہاں دیا گیا ہے کہ کیا تمہیں اتنی عمر دنیا میں نہیں دی گئی تھی کہ اگر غور و فکر کر کے تم ایمان لانا چاہتے تو اس میں کوئی بات مانع نہ تھی اس کے علاوہ تمہارے پاس نبی بھی آئے تھے جنہوں نے تمہیں تمہارے اس برے انجام سے پوری طرح آگاہ کر دیا تھا۔ اس بات کا ان مجرموں کے پاس کوئی جواب نہ ہوگا۔

"اتنی عمر" سے مراد سن شعور ہے۔ بلوغت کے بعد انسان میں عقل و شعور آ جاتا ہے وہ اپنا نفع و نقصان سوچنے کے قابل ہو جاتا ہے اسی لئے اس عمر میں وہ شرعاً مکلف سمجھا جاتا ہے۔ اس عمر سے پہلے اگر کوئی شخص مر جائے تو اس کا عذر قابل قبول

فَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ نَّصِیْرٍ ﴿۳۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَیْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ
الصُّدُوْرِ ﴿۳۸﴾ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ ؕ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَیْهِ كُفْرُهٗ ؕ وَلَا یَزِیْدُ الْكٰفِرِیْنَ
كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ۚ وَلَا یَزِیْدُ الْكٰفِرِیْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا ﴿۳۹﴾ قُلْ اَرَءَیْتُمْ
شُرَكَآءَكُمُ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِی
السَّمٰوٰتِ ۚ اَمْ اٰتَیْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰی بَیِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ اِنْ یَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ

مزا چکھو یہاں ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔(۳۷) اللہ تعالیٰ یقیناً آسمانوں اور زمین کی چھپی چیزوں کو جاننے والا ہے۔ وہ تو دلوں کے راز[۴۲] تک خوب جانتا ہے۔(۳۸) وہی تو ہے جس نے تمہیں زمین میں جانشین بنایا[۴۳]۔ پھر جو کوئی کفر کرے تو اس کے کفر کا وبال اسی پر ہے۔ اور کافروں کا کفران کے پروردگار کے ہاں اس کا غضب ہی بڑھاتا ہے یا پھر ان کافروں کا کفر خسارے میں ہی اضافہ کرتا ہے۔(۳۹)

آپ ان کافروں سے کہئے: اپنے ان شریکوں کو تو ذرا دیکھو جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو (اور) مجھے بتاؤ کہ انہوں نے زمین کا کون سا حصہ پیدا کیا ہے؟ یا آسمانوں میں ان کی شراکت ہے یا ہم نے انہیں کوئی ایسی تحریر دی[۴۴] ہے جس کی رو سے وہ کوئی واضح دلیل رکھتے ہیں۔ (ان میں سے کوئی بات بھی نہیں) بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے

ہو سکتا ہے۔ اور جس شخص کو چالیس یا پچاس یا ساٹھ برس عمر مل جائے تو اس پر تو مکمل طور پر حجت تمام ہو جاتی ہے۔

[۴۲] یعنی وہ ان فریاد کرنے والے اہل دوزخ کے متعلق خوب جانتا ہے کہ وہ اب بھی جھوٹ بک رہے ہیں۔ ان کی افتاد طبع ہی ایسی ہے کہ اگر انہیں دنیا میں بھیج بھی دیا جائے تو اپنی خباثتوں اور شرارتوں سے کبھی باز نہ آئیں گے جیسا کہ سورہ انعام میں فرمایا: ﴿ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ (۲۸:۶)

[۴۳] ❁ انسان زمین میں خلیفہ کس کا ہے؟ اس جملہ کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تم سے پہلی قوم کو ان کے جرم کی پاداش میں ہلاک کر کے تمہیں ان کا جانشین بنایا۔ دوسرا یہ کہ تم سے پہلی نسل مر گئی تو ان کی جگہ تم ان کے جانشین ہوئے۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کا اور اسی طرح اس زمین کا اصل مالک اور حاکم تو اللہ تعالیٰ ہے اور تمہیں اس کے نائب کی حیثیت سے یہاں بھیجا گیا ہے۔ اور اس لئے بھیجا گیا ہے کہ تم اس کی عطا کردہ چیزوں کو اسی کے حکم اور اسی کی مرضی کے مطابق استعمال کرتے ہو۔ یا اس کے باغی بن کر اپنی خواہشات کی پیروی کرنے لگ جاتے ہو۔ اور اگر تم اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اختیارات کا اس کی مرضی کے خلاف غلط استعمال کرو گے تو یہ بددیانتی ہوگی اور اس کا تمہیں بہت بڑا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ تمہارا اصل مالک یقیناً تم سے ناراض ہو جائے گا پھر اس کی ناراضگی اور غصہ تمہارے لئے مزید نقصان کا باعث بن جائے گا۔

[۴۴] ❁ شریکوں کے جواز کی ممکنہ بنیادیں؟ یعنی تم لوگوں نے اپنے جن معبودوں کو اللہ تعالیٰ کے اختیارات و تصرفات میں اللہ کا شریک بنا رکھا ہے اس کی بنیاد کیا ہے؟ ایک بنیاد تو یہ ہو سکتی ہے کہ کائنات کا کوئی دسواں بیسواں حصہ انہوں نے بھی بنایا

بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ۝۴۰ اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَىِٕنْ زَالَتَآ اِنْ

کو فریب کے وعدے[۴۵] دیتے رہتے ہیں۔(۴۰) اللہ تعالیٰ ہی یقیناً آسمانوں[۴۶] اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ کہیں سرک نہ جائیں اور اگر وہ سرک جائیں تو اس کے

ہو۔ دوسری بنیاد یہ ہو سکتی ہے کہ انہوں نے کائنات کا الگ تو کوئی حصہ نہیں بنایا، البتہ جب اللہ تعالیٰ کائنات پیدا کر رہا تھا تو اس وقت تمہارے ان معبودوں نے اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بٹایا ہو اس طرح اختیارات و تصرفات میں ان کا بھی کچھ حق بن سکتا ہے۔ تیسری بنیاد یہ بھی بن سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی انہیں کوئی مختار نامہ لکھ دیا ہو کہ فلاں علاقہ کے لوگ، فلاں آستانے یا فلاں بزرگ کے پاس اپنی درخواستیں پیش کیا کریں اور انہیں پکارا کریں اور انہی کے حضور نذریں نیازیں چڑھایا کریں۔ یا فلاں فلاں ہستیوں کو ہم نے فلاں فلاں بیماری سے تندرست کرنے کے اختیار دے رکھے ہیں اور اگر بیروزگاروں کو روزگار دلوانا ہو تو فلاں بزرگ کے پاس جانا چاہئے۔ وہ آپ کی حاجات کو پورا کر سکتے ہیں۔ اور بگڑی بنا بھی سکتے ہیں اور اگر چاہیں تو بگاڑ بھی سکتے ہیں۔ اگر ہم نے کوئی ایسی سند کسی آسمانی کتاب میں لکھی ہے تو وہ دکھا دو۔ اور اگر ان تینوں باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے تو پھر کیا تم خود اللہ تعالیٰ کے اختیار و تصرف کے اجارہ دار بن بیٹھے ہو۔ اور اپنی طرف سے ہی ان اختیارات میں اپنے اپنے معبودوں اور پیروں فقیروں کے حصے کر لئے ہیں۔

[۴۵] ❁ شرک کی اصل بنیاد مفاد پرستی ہے:۔ بات یوں نہیں بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ پروہت اور گورو اور ان کے چیلے یا یہ بزرگ پیر فقیر اور ان کے مرید ان باصفا اور قبروں کے مجاور سب مل کر اپنے مفادات دنیوی کی خاطر عوام الناس کو بیوقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کر رہے ہیں۔ یہ اپنی اپنی دکانیں چمکانے کے لئے طرح طرح کے افسانے اور قصے گھڑتے ہیں پھر ان کا خوب پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ فلاں صاحب بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ ان کا دامن پکڑ لیا جائے تو وہ اپنے مریدوں کی سفارش کر کے اللہ سے بخشوا کے چھوڑیں گے۔ فلاں صاحب کی تقدیر میں کوئی اولاد نہ تھی مگر فلاں بزرگ نے اللہ سے اصرار کر کے اسے سات بیٹے دلوا دیئے۔ اور فلاں صاحب نے فلاں قبر پر جا کر فلاں حرکت کی تھی تو چند ہی دنوں میں وہ تباہ و برباد ہو گیا۔ ان کی دکانیں محض جھوٹ اور پروپیگنڈے کی بنیاد پر چل رہی ہیں۔ اور اس سے ان کے دنیوی مفادات وابستہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیارات و تصرفات کسی بندے کو ہرگز تفویض نہیں کئے۔

[۴۶] آسمانوں اور زمین کے الفاظ بول کر قرآن کریم بالعموم اس سے پورا نظام کائنات مراد لیتا ہے اور یہ اس قدر پیچیدہ نظام ہے جو سائنس کے آئے دن کے انکشافات اور ایجادات کے باوجود انسان کے لئے محیر العقول بنا پڑا ہے۔ کہ آیا یہ سب سیارے فضا میں پوری تیزی کے ساتھ گھومنے کے باوجود کس طرح اس قدر جکڑے ہوئے ہیں کہ کوئی سیارہ ایک دوسرے پر گر نہیں پڑتا کہیں ٹکراتا بھی نہیں۔ اس کی رفتار میں بھی فرق نہیں آتا۔ وہ اپنے رخ اور سمت میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو انسان کو اس اعتراف پر مجبور کر دیتی ہے کہ اس نظام کو بنانے والی، جاری رکھنے والی اور کنٹرول کرنے والی ہستی انتہائی جہ کی دانشور، مدبر اور صاحب اقتدار اور اختیار ہو۔ جس کی حکمت بالغہ کے تحت اس قدر گرانڈیل اور عظیم الجثہ کرے فضائے کائنات میں تیرتے پھرتے ہیں۔

اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۱﴾ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ

اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا

زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۲﴾ اِسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۚ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا

بِاَهْلِهٖ ؕ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ

بعد انہیں کوئی بھی اپنی جگہ پر برقرار نہیں رکھ سکتا۔ بلاشبہ وہ بڑا بردبار[۴۷] اور معاف کرنے والا ہے۔(۴۱) یہ لوگ اللہ کی پختہ قسمیں کھایا کرتے تھے کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا (پیغمبر) آجائے تو کسی بھی دوسری امت سے زیادہ[۴۸] ہدایت پالیں گے مگر جب ان کے پاس ڈرانے والا آگیا تو ان میں نفرت ہی بڑھتی گئی۔(۴۲) جس کی وجہ ان کا زمین میں بڑا بن کر رہنا اور بری چالیں چلنا تھا۔ حالانکہ بُری چال تو چال چلنے والے پر ہی آپڑتی ہے۔ پھر یہ صرف اس سنت الٰہی کا انتظار کر رہے ہیں جو پہلے لوگوں میں جاری رہی۔ اللہ کی اس سنت میں آپ نہ تو کبھی کوئی تبدیلی[۴۹] پائیں گے

[۴۷] وہ ہستی اس قدر صاحب قوت، اقتدار اور اختیار رکھنے کے باوجود بردبار ہے۔ جو اس کے اختیارات کو دوسروں میں بانٹنے والوں کو فوراً تباہ نہیں کر دیتا۔ اور اپنے باغیوں، منکروں اور نافرمانوں سے درگزر کیے جاتا ہے۔

[۴۸] ❁ مشرکین مکہ کا یہ قول کہ اگر نبی ہم میں آتا تو ہم تم سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے:۔ آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے کفار مکہ جب یہود و نصاریٰ کی بگڑی ہوئی اخلاقی حالت کو دیکھتے تھے تو ان سے بڑھ چڑھ کر باتیں بناتے اور قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ اگر ہمارے پاس بھی کوئی پیغمبر آیا ہوتا جو ہماری رہنمائی کرتا تو ہم یقیناً ہر لحاظ سے تم سے بہتر ہوتے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان میں اپنا نبی مبعوث فرما دیا اور انہیں یہ معلوم ہوا کہ اب انہیں اپنی اپنی سرداریوں اور چودھراہٹوں سے دستبردار ہو کر اس نبی کا مطیع فرمان بن کر رہنا پڑے گا تو اکڑ بیٹھے۔ انہیں یہود و نصاریٰ کے سامنے کیے ہوئے قول و قرار بھول بھلا گئے۔ اور اپنی سرداریوں اور چودھراہٹوں کو تحفظ دینے کی خاطر الٹا نبی کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے اور برابر ایسی کوششوں میں لگ گئے کہ اس ڈرانے والے نبی اور اس کے متبعین پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ پھر اس سلسلہ میں انہوں نے ظاہری مخالفت کے علاوہ خفیہ سازشوں کے بھی کئی جال پھیلائے۔ مگر اللہ تعالیٰ اپنے نبی اور اپنے ایمانداروں کی مدد پر تھا۔ لہٰذا جو چال بھی وہ چلتے انہی پر الٹی پڑتی تھی۔ جس کے نتیجہ میں وہ خود ہی ذلیل و رسوا ہوتے رہے اور ان کی ہزار مخالفتوں کے باوجود اسلام کو غلبہ اور سربلندی حاصل ہوتی گئی۔ اور جوں جوں اسلام کو سربلندی ہوتی تو وہ اپنے بغض، نفرت اور عناد کی وجہ سے اور زیادہ چڑ جاتے تھے۔

[۴۹] یعنی ان چودھریوں اور سرداروں کا اپنے نبی کی مخالفت کرنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پہلے بھی سرکش اور نافرمان قوموں میں یہی کچھ کرتی رہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ بھی ہمیشہ یہی رہی کہ وہ ایسے باغیوں کو سرکچلتا رہا۔ اور اپنے انبیاء کی اور اس پر ایمان لانے والوں کی سرپرستی کرتا اور ان کی مدد کر کے ان ظالموں سے نجات دلاتا رہا ہے۔ اور اللہ کا یہ ایسا طریقہ ہے جس میں تخلف یا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ گویا اس آیت میں معاندینِ حق کے لئے یہ دھمکی اور پیشین گوئی تھی کہ اگر تم نے اپنا یہ معاندانہ رویہ نہ بدلا تو تمہیں بھی ایسے برے انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔ جس سے سابقہ اقوام دوچار ہو چکی ہیں۔

لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيلًا ﴿۴۳﴾ اَوَلَمْ يَسِيرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ
وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا ﴿۴۴﴾ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ
عَلٰي ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَاۗءَ
اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ﴿۴۵﴾

ع ۵ / ۱۷

اور نہ تغیر [۵۰] ۔(۴۳) کیا وہ زمین میں چلتے پھرتے نہیں کہ ان لوگوں کا انجام دیکھیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں اور وہ ان سے طاقتور بھی [۵۱] زیادہ تھے۔ اور اللہ کو تو آسمانوں کی یا زمین کی کوئی چیز بھی عاجز نہیں کر سکتی۔ بلاشبہ وہ سب کچھ جاننے والا اور قدرت والا ہے۔(۴۴) اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کے اعمال کے مطابق ان کا مواخذہ کرتا تو سطح زمین پر کوئی جاندار [۵۲] (زندہ) نہ چھوڑتا لیکن وہ تو ایک مقررہ وقت تک انہیں ڈھیل دیے جاتا ہے۔ پھر جب ان کا وہ مقررہ وقت آجائے گا تو اللہ یقیناً اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے (وہ ان سے نمٹ لے گا)(۴۵)

[۵۰] اللہ کا دستور یہ ہے کہ وہ اپنے انبیاء کے مخالفوں کی کمر توڑ دے۔ اس دستور میں ایسا تغیر کبھی نہیں آسکتا کہ اللہ تعالیٰ ایسے مجرموں کو سزا دینے کی بجائے ان پر انعام واکرام کرنے لگے یا ان مجرموں کی سزا دوسرے لوگوں کو دینے لگے۔

[۵۱] اگر قریش مکہ نے پہلی قوموں کے کھنڈرات کو پہلے اس نظر سے نہیں دیکھا تو اب جاکر دیکھ لیں۔ ان کے کھنڈرات سے بھی یہ معلوم ہو جائے گا کہ یہ لوگ اپنے اپنے وقتوں میں شان و شوکت، قوت و دبدبہ اور عیش و عشرت میں ان قریش مکہ سے کہیں بڑھ کر تھے۔ پھر جب انہوں نے یہ سرکشی کی روش اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں کچل کے رکھ دیا۔ اس وقت اللہ کے مقابلہ میں نہ ان کی شان و شوکت کسی کام آئی اور نہ قوت و دبدبہ۔ پھر کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اپنی اس معاندانہ روش اور خفیہ سازشوں سے اللہ کے دین کی راہ روک سکو گے؟ تم اس کی گرفت سے کیسے بچ سکو گے جب کہ وہ تمہاری ایک ایک حرکت کو جانتا بھی ہے اور تمہیں سزا دینے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔

[۵۲] ❁ دنیا دار العمل ہے دار الجزاء نہیں۔ ورنہ زمین پر کوئی جاندار زندہ نہ رہ سکتا:۔ انسان اور جن کے علاوہ دوسرا کوئی جاندار نہ شریعت کا مکلف ہے اور نہ اللہ کا نافرمان ہوتا ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ اصل مجرم تو انسان ہے۔ مگر اس کی سزا سے دوسرے جاندار بیچارے مفت میں مار کھاتے ہیں جیسے گندم کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ مثلاً انسانوں کے جرم کی پاداش میں اگر اللہ تعالیٰ بارش روک دے تو دوسرے جاندار بھی بے چارے پانی کی نایابی کی وجہ سے تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے۔ اسی طرح اگر سیلاب آجائے یا زلزلہ آجائے تو متاثرہ علاقہ کے جاندار بھی متاثر ہوں گے اور مر جائیں گے۔ مجرم انسانوں کو فوری طور پر گرفت نہ کرنے اور انہیں ڈھیل دینے میں اللہ ہی جانتا ہے کہ اس کی کیا مصلحتیں پوشیدہ ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ بے زبان جانوروں کی فریاد کی وجہ سے ہی مجرموں پر عذاب نہ بھیج رہا ہو۔ بہر حال یہ مہلت بھی ایک مقررہ وقت تک ہی ہے۔ انفرادی لحاظ سے یہ

مہلت ہر انسان کی موت کا وقت ہے۔ اور اجتماعی لحاظ سے کسی قوم پر اللہ کے عذاب کا یا قیامت کا وقت ہے۔ اس مقررہ وقت کے بعد محاسبہ کا وقت ہے۔ کوئی مجرم نہ اس سے چھپ سکے گا نہ بھاگ سکے گا۔ اور اس کا یہ محاسبہ حق و انصاف پر مبنی ہو گا کیونکہ وہ اپنے بندوں کے ایک ایک عمل اور ان کی ایک ایک حرکت کو خود دیکھ رہا ہے۔

٨٣ آياتها سُوْرَةُ يٰسٓ مَكِّيَّةٌ رکوعها ٥

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰسٓ ﴿١﴾ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ﴿٢﴾ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٣﴾ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٤﴾ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ

کلمات ٧٢٩ آیت ٨٣ (٣٦) سورہ یٰسین [١] مکی ہے (٤١) رکوع ٥ حروف ٣٠٩٠

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

یٰس [٢] (١) حکمت والے قرآن کی قسم [٣]! (٢) آپ بلاشبہ رسولوں میں سے ایک رسول ہیں (٣) سیدھی راہ پر ہیں (٤) جو

[١] فضائل سورہ یٰس:۔ سورہ یٰسین میں قرآن مجید کی دعوت کو بڑے پرزور دلائل کے ساتھ اور نہایت موثر پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ بندہ مومن کا ایمان تازہ ہو جاتا ہے اور عالم آخرت کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ بہتر ہے کہ اس کی تلاوت کے ساتھ ساتھ ترجمہ بھی ذہن میں رکھا جائے اور جو لوگ ترجمہ نہیں جانتے وہ ساتھ ساتھ اردو ترجمہ پڑھتے جائیں تاکہ اس سورت کی برکات سے مستفید ہوا جائے۔ یہ جو عام طور پر جامع ترمذی کی روایت مشہور ہے کہ سورہ یٰسین قرآن کا دل ہے جس نے سورۃ یٰسین پڑھی اس کے عوض دس بار قرآن پڑھنے کا ثواب ملے گا۔ بیہقی کی روایت کے مطابق اپنے مرنے والوں پر سورۃ یٰسین پڑھا کرو جس نے جمعہ کے روز سورہ یٰسین پڑھی اس کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ یہ روایات ضعیف ہیں۔ یاد رہے کہ سورۃ یٰسین کی فضیلت میں جتنی احادیث ملتی ہیں ان میں سے کوئی بھی حدیث صحیح نہیں ہے وہ سب کی سب ضعیف یا موضوع ہیں۔

[٢] اگرچہ یہ لفظ بھی دو حروف مقطعات کا مجموعہ ہے۔ تاہم اس کے پہلے لفظ یا سے جو حرف ندا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف ندا اور منادیٰ سے مل کر ایک جملہ بن رہا ہے۔ اسی لئے اکثر مفسرین نے اس کا ترجمہ اے شخص، اے مرد یا اے انسان سے کیا ہے۔ اور اس سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں۔

[٣] قرآن کا نزول ہی آپ کی رسالت کی سب سے بڑی دلیل ہے:۔ واؤ قسمیہ ہے اور قسم شہادت کے قائم مقام ہوا کرتی ہے۔ لعان کی صورت میں جو قسمیں اٹھائی جاتی ہیں تو وہ شہادتوں ہی کے قائم مقام ہوتی ہیں۔ ان تین مختصر سی آیات کا مطلب یہ ہے کہ یہ حکمتوں سے لبریز قرآن حکیم اس بات پر قوی شہادت ہے کہ (١) آپ فی الواقع اللہ کے رسول ہیں اور (٢) یہ کہ آپ سیدھی راہ پر گامزن ہیں اور وہ شہادت یہ ہے کہ آپ امی تھے۔ کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا تھا۔ لکھ پڑھ بھی نہیں سکتے تھے۔ نبوت سے پہلے آپ نے کبھی کوئی ایسا کلام یا اس سے ملتا جلتا کلام بھی پیش نہیں کیا تھا جس سے یہ شبہ ہو سکے کہ شاید یہ ملکہ اس کی فطرت میں موجود تھا۔ اور وہی ملکہ ترقی کرتا رہا حتیٰ کہ آپ ایسا کلام پیش کرنے پر قادر ہو گئے اور یہ سب باتیں کفار مکہ ذاتی طور پر جانتے تھے پھر چالیس سال کی عمر میں آپ کی زبان سے یک لخت ایسے کام کا جاری ہونا جس

الرَّحِيمِ ﴿٥﴾ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أُنذِرَ آبَاؤُهُمْ فَهُمْ غَافِلُونَ ﴿٦﴾ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلَىٰ أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ

غالب اور رحم کرنے والے کا نازل[۴] کردہ ہے۔(۵) تاکہ آپ ایسی قوم کو ڈرائیں جن کے آباء واجداد نہیں[۵] ڈرائے گئے تھے لہٰذا وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں(۶) ان میں سے اکثر پر (اللہ کا یہ) قول ثابت[۶] ہو چکا کہ وہ

نے تمام فصحاء و بلغائے عرب کو اپنے مقابلہ میں گنگ بنا دیا تھا اور بار بار کے چیلنج کے باوجود ایسا کلام پیش کرنے سے عاجز آ گئے تھے تو اس سے صاف واضح تھا کہ یہ کلام آپ ﷺ کا کلام نہیں ہو سکتا بلکہ کسی ایسی ہستی کا ہی ہو سکتا ہے جو مافوق الفطرت ہو۔ حکیم ہو اور خبیر ہو۔ گویا ایسے کلام کی تنزیل ہی بیک وقت کئی ایک امور پر قوی شہادت مہیا کرتی تھا۔ مثلاً یہ کہ

(۱) اللہ تعالیٰ کی ہستی موجود ہے اور یہ کلام اسی کا ہی ہو سکتا ہے۔ (۲) یہ کہ آپ بلاشبہ اس اللہ کے رسول ہیں اور (۳) ان دونوں باتوں سے لازمی نتیجہ یہ بھی نکلتا تھا کہ جو طرز زندگی آپ پیش فرما رہے ہیں۔ وہی انسانیت کے لئے سیدھی راہ ہو سکتی ہے۔ اس میں نہ افراط ہے اور نہ تفریط۔ (۴) یہ کہ قریش مکہ کے ہر قسم کے شکوک و شبہات لغو اور باطل ہیں۔ جیسے کبھی وہ کہتے تھے کہ اس نے یہ خود ہی گھڑ لیا ہے۔ کبھی کہتے تھے کہ اللہ پر جھوٹ باندھ رہا ہے۔ کبھی کہتے تھے کہ اسے کوئی دوسرا آدمی سکھا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

[۴] یعنی اس قرآن حکیم کو نازل کرنے والا کوئی کمزور قسم کا ناصح نہیں ہے جس نے کچھ احکام اور نصائح بھیج دیئے ہوں۔ جسے اگر تم قبول کر لو تو اچھا ہے اور اگر نظر انداز کر دو تو بھی تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ بلکہ اس کا نازل کرنے والا فرمانروائے کائنات ہے جو سب پر غالب ہے۔ اور اپنے فیصلوں کو نافذ کرنے کی طاقت رکھتا ہے اور وہ رحیم اس لحاظ سے ہے کہ اس نے تمہاری رہنمائی کے لئے یہ قرآن اور یہ نبی بھیج کر تم پر بہت مہربانی فرمائی ہے۔ تاکہ تم لوگ گمراہیوں سے بچ کر دنیا و آخرت کی فلاح سے ہمکنار ہو سکو۔

[۵] ۞ مکہ میں شعیب علیہ السلام کے دو ہزار سال بعد آپ ﷺ مبعوث ہوئے:۔ اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی درست ہیں۔ مَّا أُنذِرَ میں اگر ما کو نافیہ سمجھا جائے جیسا کہ اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ چونکہ ان کی طرف کوئی نبی نہیں آیا لہٰذا یہ لوگ گہری غفلت اور جہالت میں پڑے ہوئے ہیں اور اگر ما کو موصولہ سمجھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کے قدیمی آباء واجداد مدتوں پہلے جس چیز سے ڈرائے گئے تھے اسی چیز سے آپ ان کو ڈرائیں۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام، سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام اور سیدنا شعیب علیہ السلام انہی کے آباء واجداد کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور آخری نبی شعیب علیہ السلام تھے انہیں بھی دو ہزار سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور اتنی مدت بعد رسول اللہ ﷺ ان کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔

۞ آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے عرب کی حالت:۔ اور یہ اس طویل مدت کا ہی اثر تھا کہ یہ لوگ انتہائی جہالت اور غفلت میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کے عادات و خصائل سخت بگڑ چکے تھے۔ شرک اس قدر عام تھا کہ کعبہ کے اندر تین سو ساٹھ بت موجود تھے اور ہر قبیلہ کا الگ الگ بت بھی موجود تھا۔ ان میں اکثر لوگوں کا پیشہ لوٹ مار اور رہزنی تھا۔ شراب کے سخت رسیا تھے۔ فحاشی اور بے حیائی عام تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے کھڑے کر دینا ان کا معمول تھا۔ پھر ان کے قبائلی نظام کی وجہ سے قبیلوں میں ایسی جنگوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو ختم ہونے میں آتا ہی نہ تھا۔ غرض ہر لحاظ سے یہ قوم ایک اجڈ، تہذیب سے ناآشنا اور ایک ناتراشیدہ اور اکھڑ قوم تھی جس کی اصلاح و ہدایت کے لئے آپ ﷺ کو مبعوث فرمایا گیا تھا۔ اسی صورت حال سے اس بات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ کی یہ ذمہ داری کس قدر سخت اور عظیم تھی۔

[۶] قرآن کریم نے جہاں بھی حق القول کا لفظ استعمال فرمایا تو اس کے مخاطب عموماً وہ لوگ ہوتے ہیں جو یا تو آخرت پر

لَا يُؤْمِنُوْنَ ۞ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۞ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۞

ایمان نہیں[۷] لائیں گے (۷) ہم نے ان کے گلوں میں طوق[۸] ڈال دیئے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک پہنچ گئے ہیں۔ لہٰذا وہ سر اٹھائے ہی رہتے ہیں۔(۸) نیز ہم نے ایک دیوار تو ان کے سامنے کھڑی کر دی ہے اور ایک ان کے پیچھے۔(اس طرح) ہم نے ان پر پردہ[۹] ڈال رکھا ہے کہ وہ کچھ دیکھ نہیں سکتے (۹)

ایمان ہی نہ رکھتے ہوں۔ جیسے کفارِ مکہ یا ان جیسی دوسری قومیں جو پہلے گزر چکیں یا بعد میں آنے والی ہیں۔ یا پھر وہ لوگ ہوتے ہیں جو آخرت کو مانتے تو ہیں مگر ساتھ ہی انہوں نے کچھ ایسے سستی نجات کے عقیدے گھڑ رکھے ہوتے ہیں کہ آخرت پر ایمان لانے کے اصل مقصد کو فوت کر دیتے ہیں۔ جیسے یہود کا یہ عقیدہ کہ انہیں چند دنوں کے سوا جہنم کی آگ چھوئے گی ہی نہیں۔ یا جیسے یہود و نصاریٰ کا یہ عقیدہ کہ وہ اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ اللہ انہیں کیوں عذاب کرے گا؟ یا مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ سید قوم کی پشت ہی پاک ہوتی ہے۔ وہ جو کام بھی کرتے رہیں وہ پاک ہی رہتی ہے۔ یا یہ عقیدہ کہ فلاں حضرت صاحب کی بیعت کر لی جائے یا دامن پکڑ لیا جائے تو وہ اپنے ساتھ ہی انہیں جنت میں لے جائیں گے۔ پیچھے نہیں رہنے دیں گے یا یہ کہ وہ اللہ سے سفارش کر کے انہیں بخشوا کے چھوڑیں گے وغیر ذلک ایسے تمام تر عقیدے فی الحقیقت آخرت کے عقیدہ کی نفی کر دیتے ہیں۔

[۷] اس جملہ کی تکمیل یوں ہوتی ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اور جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ یہاں ایمان سے مراد ایمان بالآخرت ہے۔ ورنہ اللہ کی ہستی کو تو کفارِ مکہ بھی تسلیم کرتے تھے۔ البتہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور اسی وجہ سے آپ کی رسالت کا بھی انکار کر دیتے تھے۔

[۸] ۞ تقلیدِ آباء اور رسم و رواج کے طوق:۔ یہ طوق ان کی تقلید آباء کے طوق تھے، ان کی جاہلانہ اور مشرکانہ رسوم کے طوق تھے، ان کے کبر و نخوت کے طوق تھے جنہوں نے ان کے گلوں کو اس حد تک دبا رکھا تھا اور ان کے سر اس قدر جکڑے ہوئے تھے کہ وہ کسی دوسری طرف دیکھ ہی نہ سکتے تھے۔ نہ ہی ان کی نگاہیں نیچے اپنی طرف دیکھ سکتی تھیں کہ وہ کم از کم اپنے اندر ہی موجود اللہ کی نشانیوں اور قدرتوں کو دیکھ کر کچھ سبق حاصل کر سکیں۔

[۹] آگے بھی دیوار ہو، پیچھے بھی دیوار ہو اور جس جس طرف دیوار نہ ہو، وہاں کوئی پردہ ڈال کر ڈھانپ دیا جائے تو کوئی شخص دیکھ بھی کیسے سکتا ہے۔ ان کی یہ حالت اس لئے ہو گئی ہے کہ وہ اپنی ان جاہلانہ اور مشرکانہ رسوم ہی سے چمٹا رہنا پسند کرتے ہیں۔ اور ان باتوں کے باطل ہونے پر جو دلیل بھی پیش کی جائے اس پر غور کرنا تو درکنار اسے سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔

اس مقام پر مختصراً یہ اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ اسباب کو اختیار کرنا انسان کے اپنے بس میں ہوتا ہے بالفاظ دیگر حق کو قبول نہ کرنے یا سرکشی کی راہ اختیار کرنے کی ابتدا ہمیشہ انسان کی طرف سے ہوتی ہے۔ پھر جو راہ انسان اختیار کرتا ہے اسے اللہ کی طرف سے اسی راہ کی توفیق و تائید ملتی جاتی ہے۔ پھر ان اسباب کے اختیار کرنے کی بنا پر جو نتیجہ مترتب ہوتا ہے اس کی نسبت کبھی تو اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے، جیسے اس مقام پر ہے، کیونکہ نتائج مترتب کرنا اللہ کا کام ہے بندے کا نہیں اور کبھی اس کی

وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝١٠ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَ
خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ۝١١ اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ

آپ انہیں ڈرائیں یا[۱۰] نہ ڈرائیں ان کے لئے یکساں ہے۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے (۱۰) آپ تو صرف اسے ڈرا سکتے ہیں جو اس ذکر (قرآن) کی پیروی کرے اور بن دیکھے رحمان[۱۱] سے ڈرے، ایسے لوگوں کو آپ مغفرت اور باعزت اجر کی خوشخبری دے دیجئے۔ (۱۱) بلاشبہ ہم ہی مردوں کو زندہ کرتے ہیں[۱۲]۔ ہم ان کے وہ اعمال بھی لکھتے

نسبت بندے کی طرف ہوتی ہے کیونکہ اسباب بندے نے ہی اختیار کئے تھے۔

[۱۰] یہ حالت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی شخص اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ کوئی معقول سے معقول دلیل سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور "میں نہ مانوں" کی خصلت اس میں پختہ ہو جاتی ہے لیکن وہ دل میں حقیقت کو تسلیم کر لینے کے باوجود زبان سے انکار کر دیتا ہے۔ یہی کیفیت ہوتی ہے جب اس پر کوئی نصیحت اور ہدایت کی بات کارگر ثابت نہیں ہوتی۔ اور اسی کیفیت کو اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر دلوں پر مہر لگا دینے سے تعبیر فرمایا ہے۔

[۱۱] بن دیکھے رحمان سے صرف وہی لوگ ڈرتے ہیں جو آخرت کے دن پر اور اللہ کے حضور اپنے اعمال کی بازپرس پر ٹھیک طرح سے ایمان رکھتے ہیں اور اپنے اس ایمان بالآخرت کے عقیدے کو سستی نجات کے عقیدے سے خراب نہیں کر لیتے اور ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ دنیا میں اللہ سے ڈر کر انتہائی محتاط زندگی گزارتے ہیں۔ اور ایسے ہی لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے گناہوں اور خطاؤں کی بخشش کے مستحق ہوتے ہیں۔ گناہ تو ان کے معاف کر دیئے جاتے اور نیک اعمال کا اجر بہت بڑھ چڑھ کر ملتا ہے۔

[۱۲] اس کا ایک مفہوم تو واضح ہے اور یہی مفہوم دنیا میں بھی ہر آن مشاہدہ میں آ رہا ہے۔ اور یہی مفہوم عقیدہ آخرت کی بنیاد ہے اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ قرآن نے بعض مقامات پر موتیٰ سے مراد مردہ دل کافر بھی لئے ہیں۔ اس لحاظ سے اس جملہ کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ عرب قوم جس کی اخلاقی اور روحانی قوتیں بالکل مر چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت حاصل ہے کہ پھر ان میں زندگی کی روح پھونک دے کہ وہ دنیا میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دے اور بعد میں آنے والی نسلوں کے لئے اپنے عظیم آثار چھوڑ جائے۔

۞ اثر کا لغوی مفہوم:۔ اثر کا معنی دراصل قدموں کے نشان ہیں۔ جو کسی انسان کے چلنے کے بعد زمین پر پڑ جاتے ہیں۔ پھر اس لفظ کا اطلاق زمین پر پڑے ہوئے قدموں پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ بن مالک فرماتے ہیں کہ قبیلہ بنی سلمہ کے لوگوں نے (جن کے مکان مسجد نبوی سے دور تھے) ارادہ کیا کہ وہ اپنے مکان چھوڑ دیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آ کر رہائش پذیر ہوں۔ (تاکہ آسانی سے نماز باجماعت میں شامل ہو سکیں۔) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ کی سرحدوں کا اجڑنا برا معلوم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: کیا تم اپنے قدموں کا ثواب نہیں چاہتے۔ مجاہد کہتے ہیں کہ اٰثَارَهُمْ سے مراد زمین پر چلنے سے پاؤں کے نشانات مراد ہیں۔ (بخاری۔ کتاب الاذان۔ باب احتساب الآثار)

مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۭ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿١٢﴾ۧ وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا

اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَاۗءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿١٣﴾ۚ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا

جاتے ہیں جو وہ آگے بھیج چکے اور وہ آثار بھی جو پیچھے[۱۳] چھوڑ گئے۔ اور ہم نے ہر چیز کا ایک واضح کتاب[۱۴] (لوح محفوظ) میں ریکارڈ رکھا ہوا ہے۔(۱۲) آپ انہیں اس بستی والوں کی مثال[۱۵] بیان کیجئے جبکہ ان کے پاس رسول آئے تھے۔(۱۳) جب ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے تو انہوں نے ان دونوں کو جھٹلا دیا پھر ہم نے ایک تیسرے رسول

[۱۳] ❁ **زندگی کے بعد اعمال نامہ میں درج ہونے والے اعمال:۔** ہر انسان کے اعمال نامہ میں تین طرح کے اندراجات ہوتے ہیں۔ ایک وہ اعمال و اقوال جو اس نے اپنی زندگی کے دوران سرانجام دیئے تھے۔ دوسرے اعمال کے اثرات جو عمل کرنے سے انسان کے اپنے جسم، اس کے اعضاء و جوارح، زمین یا فضا میں مرتسم ہوتے رہتے ہیں۔ اور تیسرے وہ اعمال جن کے اچھے یا برے اثرات اس کی زندگی کے بعد بھی باقی رہ گئے۔ مثلاً کسی شخص نے کوئی مفید کتاب تصنیف کی یا لوگوں کو علم دین سکھایا اور یہ سلسلہ آگے چلتا رہا یا کوئی چیز اللہ کی راہ میں وقف کر گیا۔ یہ سب کچھ اس کے عمل کے اثرات ہیں اور ان کا ثواب اس کے اعمال نامہ میں اس زندگی کے بعد بھی درج ہوتا رہے گا۔ اسی طرح اگر کسی نے کوئی شرکیہ عقیدہ یا بدعت یا کوئی بدرسم نکالی تو جو شخص ان باتوں کو اپنائیں گے حصہ رسدی ان کا گناہ اس کے ایجاد کرنے والے کے اعمال نامہ میں بھی درج ہوتا رہتا ہے۔

[۱۴] ❁ **لوحِ محفوظ کے نام اور صفات:۔** کتاب مبین سے مراد لوح محفوظ ہے۔ جس کے مزید نام ام الکتاب اور کتاب مکنون بھی قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ اس امام مبین کا مکمل ادراک تو انسان کے احاطہ سے باہر ہے تاہم روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسی تختی یا کتاب ہے جس میں کائنات کی تقدیر کے متعلق تمام امور پہلے سے لکھ دیئے گئے ہیں۔ اور ان میں رد و بدل نہیں ہوتا اور یہ تمام احکام و فرامین اور کلمات الٰہی کا مصدر رہے اور مکنون اس لحاظ سے ہے کہ اس کے مندرجات کی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو خبر نہیں۔ گویا لوگوں کے جو اعمال نامے تیار ہو رہے ہیں جو اعمال و آثار کے وقوع کے بعد لکھے جاتے ہیں۔ عین اللہ کے اس علم کے مطابق ہوتے ہیں جس کے مطابق اس نے ہر چیز پہلے سے ہی امام مبین میں درج کر رکھی ہے۔

[۱۵] ❁ **اصحاب القریہ اور مردِ حق گو:۔** یہ بستی کون سی تھی؟ اس کے متعلق قرآن و حدیث میں کوئی صراحت نہیں۔ مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد روم میں واقع انطاکیہ شہر ہے۔ پھر اس بات میں بھی اختلاف ہے کہ یہ رسول بلاواسطہ رسول تھے یا بالواسطہ رسول یا مبلغ تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ مبلغ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے ہی بھیجے تھے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں سے تھے۔ قرآن کے بیان سے سرسری طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بلاواسطہ اللہ کے رسول تھے۔ اور اگر یہی بات ہو تو ان کا زمانہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے کا زمانہ ہونا چاہئے کیونکہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بعد رسول اللہ ﷺ کی بعثت تک کوئی نبی یا رسول مبعوث نہیں ہوا۔ اور بستی کے نام کی تعیین یا رسول کے بلاواسطہ یا بالواسطہ ہونے کی تعیین کوئی مقصود بالذات چیز بھی نہیں کہ اس کی تحقیق ضروری ہو۔ مقصود بالذات چیز تو کفارِ مکہ کو سمجھانا ہے کیونکہ کفارِ مکہ اور ان بستی والوں کے حالات میں بہت سی باتوں میں مماثلت پائی جاتی تھی۔

بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ
الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ﴿۱۵﴾ قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾
وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ
وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸﴾ قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ۭ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ۭ بَلْ

سے انہیں تقویت دی۔ تب ان تینوں نے کہا: ”ہم تمہاری طرف (رسول کی حیثیت سے) بھیجے گئے ہیں۔(۱۴)
وہ کہنے لگے: ”تم تو ہمارے ہی جیسے انسان ہو اور اللہ نے تو کچھ بھی نہیں اتارا (بلکہ) تم تو محض جھوٹ[۱۷] بولتے
ہو“(۱۵) وہ کہنے لگے: ”ہمارا پروردگار جانتا ہے کہ ہم یقیناً تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں(۱۶) اور ہمارے
ذمہ تو صرف واضح طور پر پیغام پہنچا دینا ہے“(۱۷) وہ کہنے لگے کہ: ”ہم تو تمہیں منحوس[۱۸] سمجھتے ہیں۔ اگر تم باز
نہ آئے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے اور ہمارے[۱۹] ہاتھوں تمہیں دردناک سزا ملے گی“(۱۸) وہ کہنے لگے:
”تمہاری نحوست تو تمہارے اپنے ساتھ[۲۰] لگی ہے۔ اگر تمہیں نصیحت کی جائے (تو کیا اسے تم نحوست ......

[۱۶] قریش بھی رسول اللہ ﷺ کو یہی کچھ کہتے تھے کہ تم بھی ہمارے ہی جیسے بشر ہو آخر تم میں ہم سے بڑھ کر وہ کون سی خوبی ہے جو اللہ نے تمہیں ہی نبوت کے لئے منتخب کیا اور یہ ایسا اعتراض ہے جو ہر نبی کے منکر اپنے اپنے نبی کے متعلق کرتے آئے تھے۔ گویا نبوت کے متعلق جاہلی تصور یہ ہے کہ جو بشر ہو وہ رسول نہیں ہو سکتا اور اس کے عین برعکس دوسرا جاہلی تصور یہ ہے کہ جو رسول ہو وہ بشر نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ قرآن سب انبیاء کو بشر بھی ثابت کرتا ہے اور رسول بھی۔

[۱۷] قریش مکہ بھی آپ ﷺ کو یہ الزام دیتے تھے کہ جو کلام یہ پیش کرتا ہے خود ہی تصنیف کر کے اللہ کے نام سے منسوب کر دیتا ہے۔

[۱۸] ۞ انبیاء کی دعوت پر کافروں کو کیا مصیبت پڑتی ہے؟ منکرین حق کو جھنجھوڑنے کے لئے ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ چھوٹے موٹے عذاب یا سختیاں بطور تنبیہ نازل ہوا کرتی ہیں۔ اور اگر ایسا کوئی عذاب نہ بھی آئے تو بھی ایک بات کا وقوع پذیر ہونا یقینی ہے۔ نبی جب دعوت دیتا ہے تو کچھ اس کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں اور کچھ اس کی مخالفت پر اتر آتے ہیں۔ اس طرح دو فریق بن جاتے ہیں جن کی آپس میں ٹھن جاتی ہے۔ ایک آدمی اگر ایماندار ہے تو اس کے رشتہ دار کافر ہوتے ہیں۔ منکرین حق کے لئے یہ ایک الگ مصیبت بن جاتی ہے۔ بہر حال عذاب کی صورت ہو یا ایسی تفریق کی، منکرین حق اس کا الزام رسولوں پر دھرتے اور کہتے تھے کہ جب سے تم آئے ہو ہمیں یہ مصیبت پڑ گئی ہے اور یہ تمہاری ہی نحوست کا نتیجہ ہے۔ ورنہ پہلے سب مل جل کر اچھے خاصے آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

[۱۹] ۞ کافر قوم کی دھمکی:۔ ان لوگوں نے اپنے رسولوں کو محض ایسی دھمکی ہی دی تھی جب کہ کفارِ مکہ نے کئی بار آپ ﷺ کو انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی جان سے مار ڈالنے کی کوششیں اور سازشیں کی تھیں۔

[۲۰] یعنی تمہاری نحوست کی اصل وجہ وہ نہیں جو تم سمجھے بیٹھے ہو۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ پہلے تمہارے پاس کوئی تنبیہ کرنے والا نہیں آیا تھا۔ لہٰذا تم اللہ کی طرف سے معذور تھے۔ اب ہم نے اگر تمہیں اللہ کا پیغام پہنچا دیا تو تم نے اس سے سرتابی کی

اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ رَجُلٌ یَّسْعٰی قَالَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوا
الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۲۰﴾ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾
وَمَا لِیَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۲﴾ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً

سمجھتے ہو؟) بلکہ تم ہو ہی حد سے گزرے[۲۱] ہوئے لوگ۔(۱۹) اس وقت شہر کے پرلے کنارے سے ایک شخص دوڑتا[۲۲] ہوا آیا اور کہنے لگا: ”میری قوم کے لوگو! ان رسولوں کی پیروی اختیار کر لو(۲۰) ایسے رسولوں کی جو تم سے کچھ اجر نہیں مانگتے اور وہ خود راہ راست[۲۳] پر ہیں۔(۲۱) اور میں اس ہستی کی کیوں نہ عبادت کروں جس نے مجھے پیدا کیا[۲۴] اور تم (سب) کو اسی کی طرف لوٹ[۲۵] کر جانا ہے۔(۲۲) کیا میں اللہ کے سوا دوسرے ا کو الٰہ بنالوں کہ

اور اکڑ بیٹھے۔ اس کی پاداش میں تمہیں اللہ کی طرف سے یہ سزا مل رہی ہے اور یہ تمہارے اپنے ہی اعمال کی نحوست ہے کہیں باہر سے نہیں آئی۔

[۲۱] یعنی تمہارا اندازِ فکر اس قدر بگڑ چکا ہے کہ جو لوگ تمہارے خیر خواہ ہیں اور سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں ان کو تم جان سے مار ڈالنے یا تکلیفیں پہنچانے کی دھمکیاں دیتے ہو۔ اور اللہ کی نافرمانی پر اگر تمہیں کوئی دکھ پہنچے تو اس کا ذمہ دار بھی ہمیں ٹھہراتے ہو۔ کچھ انصاف کی بات کرو۔ تم تو عقل اور آدمیت کی سب حدیں پھاند گئے ہو۔

[۲۲] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان رسولوں اور ان کی قوم میں جو مکالمہ اوپر مذکور ہوا ہے وہ کوئی چند دنوں پر مشتمل نہیں بلکہ کئی سالوں کی مدت پر محیط تھا اور رسولوں کی دعوت اور ان کے انکار اور دھمکیوں کا چرچا اس شہر کے علاوہ ارد گرد کے مضافات میں بھی پھیل چکا تھا۔ چنانچہ انہیں مضافات میں سے ایک صالح مرد جس کا نام حبیب بتایا جاتا ہے نے جب یہ سنا کہ شہر والے اپنے رسولوں کو قتل کی دھمکیاں دے رہے ہیں اور مبادا وہ کوئی ایسی حرکت کر نہ بیٹھیں، تو اس سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ خود ایک عبادت گزار انسان تھا۔ اور اپنے ہاتھوں کی حلال کمائی کھاتا تھا۔ اور اچھی شہرت رکھتا تھا، یہ باتیں سنتے ہی دوڑتا ہوا اس کی طرف آیا تاکہ وہ اپنی قوم کے لوگوں کو سمجھائے کہ وہ ان رسولوں کی مخالفت سے باز آ جائیں۔

[۲۳] ۞ اس مردِ حق گو نے اصحاب قریہ کو کیا کیا باتیں سمجھائیں؟ اس صالح مرد نے قوم کے پاس آ کر انہیں دو باتیں سمجھائیں ایک یہ کہ یہ رسول جو تعلیم پیش کرتے ہیں پہلے خود اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور ان کی اخلاقی حالت بھی تم سے بہت بلند ہے۔ دوسرے جو کچھ وہ تمہیں تعلیم دیتے ہیں اس پر نہ تو تم سے کچھ معاوضہ طلب کرتے ہیں اور نہ اس کام سے ان کا اپنا کوئی ذاتی مفاد وابستہ ہے۔ اور جو بات وہ کہتے ہیں تمہاری ہی بھلائی کے لئے کہتے ہیں۔ لہٰذا ایسے بے لوث مخلصوں کی بات تمہیں ضرور مان لینا چاہئے۔ بلکہ ان کی قدر کرنا چاہئے۔

[۲۴] تیسری بات جو مردِ صالح نے سمجھائی۔ اس میں قوم کو مخاطب نہیں کیا تاکہ وہ چڑ نہ جائیں بلکہ اسے اپنی ذات سے منسوب کرتے ہوئے کہا کہ میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ عبادت کی مستحق وہی ہستی ہو سکتی ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور اسی لئے میں صرف اسی کی عبادت کرتا ہوں۔ اور اللہ کے سوا جن ہستیوں کو تم نے اپنا حاجت روا قرار دے رکھا ہے ان کا میرے پیدا کرنے اور رزق دینے میں کچھ حصہ ہی نہیں تو آخر میں انہیں کیوں پکاروں اور کیوں ان کی عبادت کروں۔

[۲۵] چوتھی بات ان کے انجام سے متعلق انہیں سمجھائی کہ آخر تم سب نے مرنا ہے۔ اور تم سب کی روحیں اللہ کے قبضہ میں

اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ﴿۲۳﴾ اِنِّيْۤ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾

اِنِّيْۤ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾ قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ

اگر رحمٰن مجھے کوئی تکلیف دینا چاہے تو نہ ان کی سفارش میرے کسی کام آئے اور نہ ہی وہ خود[۲۶] مجھے چھڑا سکیں؟(۲۳) تب تو میں یقیناً صریح گمراہی میں جا پڑا(۲۴) میں تو بلاشبہ تمہارے[۲۷] پروردگار پر ایمان لاچکا، تم میری بات توجہ سے سنو (اور مان لو)(۲۵) (آخر جب اسے قتل کر ڈالا گیا تو) اسے کہا گیا کہ "جنت میں داخل[۲۸] ہو جاؤ" وہ کہنے لگا: "کاش میری قوم کو علم ہو جاتا(۲۶) کہ میرے پروردگار نے مجھے بخش دیا[۲۹] اور مجھے

ہیں۔ اور تمہیں اس ہستی کی طرف لوٹ کر جانا ہے جس کی بندگی کی دعوت پر آج تمہیں اعتراض ہے اور جو تمہیں یہ بات سمجھائے اس کے درپے آزار ہو جاتے ہو۔ پھر تم خود ہی سوچ لو کہ تمہارا انجام کیا ہو سکتا ہے؟

[۲۶] پانچویں بات اس نے یہ سمجھائی کہ میں ایسے مشکل کشاؤں کی مشکل کشائی کا ہرگز قائل نہیں کہ اگر میرا پروردگار مجھے کسی تکلیف میں مبتلا کر دے تو ان میں نہ تو اتنی طاقت ہے کہ وہ اللہ کے مقابلہ میں مجھے اس تکلیف سے بچا سکیں اور نہ یہ کر سکتے ہوں کہ اللہ سے سفارش کر کے مجھے اس مشکل سے نجات دلا سکیں۔ یہ باتیں وہ کہہ تو اپنے آپ رہا تھا مگر "بمصداق گفتہ آید در حدیث دیگراں" سناسب کچھ قوم کو رہا تھا کہ تمہیں اس طرح کی بے بس اور بے اختیار چیزوں کو ہرگز معبود نہ بنانا چاہیے۔ اور یہی عیوب کفارِ مکہ میں پائے جاتے تھے۔

[۲۷] ۞ اپنے ایمان کا برملا اعلان:۔ یہ باتیں سمجھانے کے بعد اس نے کافروں کے بھرے مجمع میں پوری جرأت کے ساتھ اپنے ایمان کا اعلان کر دیا اور اعلان بھی اس انداز میں کیا کہ "میں تمہارے پروردگار پر ایمان لاچکا" یہ نہیں کہا کہ میں اپنے پروردگار پر ایمان لاچکا۔ یعنی جیسے وہ میرا پروردگار ہے ویسے ہی تمہارا بھی ہے۔ اور میں اس پر ایمان لا کر غلطی نہیں کر رہا بلکہ تم ایمان نہ لا کر غلطی کر رہے ہو۔

[۲۸] ۞ مردِ حق گو کی شہادت:۔ رسولوں کی دعوت پر تو یہ لوگ محض دھمکیاں ہی دے رہے تھے اور شاید ڈرتے بھی ہوں کہ اگر فی الواقع رسول ہوں تو ہم پر کوئی آفت نہ آئے۔ مگر جب اس مرد حق گو نے ناصحانہ انداز میں ان کے معبودوں کی سب خامیاں ان پر واضح کر دیں تو اسے انہوں نے اپنی اور اپنے معبودوں کی توہین اور ان کی شان میں گستاخی سمجھ کر اسے فوراً قتل کر دیا اور اس کے قتل ہونے کے ساتھ اسے فرشتوں نے یہ خوشخبری دے دی کہ جنت تمہاری منتظر ہے۔ اس میں داخل ہو جاؤ۔ کیونکہ وہ صحیح معنوں میں شہید تھا اور اس نے اللہ کے دین کی خاطر اپنی جان دی تھی۔ اور شہداء کے متعلق قرآن اور صحیح احادیث میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ شہید براہِ راست جنت میں چلے جاتے ہیں اور وہاں انہیں رزق دیا جاتا ہے۔ ان کی روحیں سبز پرندوں کی شکل میں جنت کے باغوں میں چہچہاتی پھرتی ہیں۔

[۲۹] قوم اس کی اس قدر دشمن بن گئی تھی کہ اسے جان سے ہی مار ڈالا۔ مگر اس کا اخلاق اس قدر بلند تھا کہ اپنے جانی دشمنوں کے لئے بددعا کے بجائے ان کے حق میں خیر خواہی کی بات ہی اس کے ذہن میں آئی۔ اگر اسے کچھ تمنا تھی تو صرف یہ کہ کاش میری قوم کو یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ نے مجھ پر کس قدر انعام و کرام کیے ہیں۔ تو شاید وہ بھی ایمان لے آئیں۔ اس قصہ کو بیان

وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿٢٧﴾ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ﴿٢٨﴾
اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ﴿٢٩﴾ يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا
كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٣٠﴾ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿٣١﴾ وَاِنْ كُلٌّ
لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿٣٢﴾ ع وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ

معززین میں شامل کر دیا" (۲۷) اس کے بعد ہم نے اس کی قوم پر آسمان سے کوئی لشکر نہیں اتارا، نہ ہی ہمیں لشکر اتارنے کی حاجت تھی۔ (۲۸) وہ تو بس ایک دھماکہ ہوا جس سے وہ سب بجھ [۳۰] کر رہ گئے (۲۹) افسوس ہے بندوں پر کہ ان کے پاس جو بھی رسول آیا اس کا مذاق ہی اڑاتے رہے۔ (۳۰) کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ کتنی ہی قومیں ہم ان سے [۳۱] پہلے ہلاک کر چکے ہیں جو ان کے پاس لوٹ کر نہیں آئیں گی (۳۱) اور یہ سب لوگ (ایک دن) ہمارے حضور حاضر کئے جائیں گے۔ (۳۲)

ان لوگوں کے لئے مردہ زمین (بھی) ایک نشانی ہے ہم نے اسے زندہ کیا اور اس سے اناج [۳۲] نکالا جس کا کچھ

کر کے اللہ تعالیٰ نے دراصل کفارِ مکہ کو اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ جس طرح وہ مردِ صالح اپنی قوم کا سچا ہمدرد اور خیر خواہ تھا، اسی طرح محمد ﷺ بھی تمہارے سچے خیر خواہ ہیں۔

[۳۰] اصحاب القریہ پر چیخ کا عذاب:۔ یہ مردِ صالح تو شہید ہو گیا، رہے پیغمبر تو ان کے متعلق کوئی صراحت نہیں کہ ان کا کیا انجام ہوا؟ تاہم قرآن کی صراحت سے ایک ضابطہ الٰہی معلوم ہوتا ہے کہ جس بستی پر اللہ اپنا عذاب نازل کرتا ہے تو اپنے رسولوں اور ایمانداروں کو اس عذاب سے بچانے کا پہلے انتظام کر دیتا ہے۔ اور یہ تو اس آیت سے واضح ہے کہ ان رسولوں کی تکذیب اور اس مردِ مومن کی شہادت کے بعد اس قوم پر عذاب آیا تھا اور یہ عذاب کچھ ایسا نہ تھا جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی فوجیں نازل کی ہوں نہ ہی اتنے معمولی سے کام کے لئے اللہ تعالیٰ کو فوجیں بھیجنے کی ضرورت تھی۔ اس قوم سے بس اتنا ہی معاملہ ہوا کہ زور کا ایک دھماکہ ہوا جس کی پہلی ضرب بھی وہ سہار نہ سکے اور جہاں جہاں تھے۔ اسی مقام پر ہی ڈھیر ہو کر رہ گئے۔

[۳۱] یعنی سابقہ اقوام کے انجام کی طرف نہ دیکھتے ہیں نہ اس میں غور و فکر کرتے ہیں وہ قومیں بھی اپنے رسولوں کا مذاق اڑاتی رہیں۔ اور اس کی پاداش میں انہیں ہلاک کر دیا جاتا تھا اور ان کا ایسا نام و نشان تک مٹ گیا کہ ان میں سے کوئی بھی بچ کر ان کے پاس واپس نہیں لوٹا پھر بھی ان کافروں کا یہی دستور رہا کہ جب کوئی نیا رسول آتا تو اس سے اسی طرح تمسخر اور استہزاء شروع کر دیتے جو پہلے کفار کی عادت تھی اور کچھ سبق حاصل نہیں کرتے تھے۔ اور آج کفارِ مکہ کا بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہے۔

[۳۲] دلائلِ توحید...... ہر قسم کی نباتات کا بہترین حصہ انسان کے لئے ہوتا ہے:۔ زمین سے جو اناج بھی پیدا ہوتا ہے اس کا بہتر حصہ تو انسانوں کی خوراک بنتا ہے اور ناقص حصہ مویشیوں اور دوسرے جانوروں کی۔ مثلاً گندم کے اناج میں سے گندم کے دانے بہتر حصہ ہے اور یہ انسانوں کی خوراک ہے۔ اور باقی کا حصہ جسے بھوسہ یا توڑی کہتے ہیں مویشیوں کی خوراک بنتا

يَأْكُلُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ﴿۳۴﴾ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ

حصہ وہ کھاتے ہیں (۳۳) نیز ہم نے اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کئے اور اس کے اندر سے چشمے بہا دیئے تاکہ وہ اس کے پھل کھائیں حالانکہ یہ سب کچھ ان[۳۳] کے ہاتھوں نے نہیں بنایا۔ پھر کیا وہ شکر ادا نہیں کرتے۔ (۳۵) پاک ہے وہ ذات جس نے زمین کی نباتات سے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کئے اور خود ان کی اپنی[۳۴] جنس کے

ہے۔ یہی حال سب غلوں کا ہے اور پھل دار درختوں میں سے پھل انسان کی خوراک بنتے ہیں اور پتے وغیرہ بھیڑ بکریوں اور اونٹوں کی خوراک بنتے ہیں۔ پھر کچھ چیزیں انسانوں کے لباس کے کام آتی ہیں اور کچھ دواؤں کے اور کچھ جھاڑ جھنکاڑ ایندھن کے کام آتے ہیں اور کچھ سے انسان کئی قسم کی مصنوعات تیار کرتا ہے۔ غرضیکہ زمین کی نباتات میں کوئی چیز ایسی نہیں جو بلاواسطہ یا بالواسطہ آخر انسان ہی کے کام نہ آتی ہو۔

[۳۳] ۞ **وما عملتہ ایدیھم کے مختلف مفہوم...... زرعی پیداوار میں انسان کا حصہ:۔** ﴿وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ﴾ میں اگر ما کو نافیہ قرار دیا جائے تو اس کا یہ مطلب ہوگا۔ نباتات کو پیدا کرنا انسان کا کام نہیں۔ نباتات اور پھلوں کی پیدائش میں جس قدر عناصر سرگرم عمل ہیں وہ سب کے سب اللہ کے حکم کے تحت اپنے اپنے کام میں لگے رہتے ہیں تب جاکر نباتات وجود میں آتی، بڑھتی، پھلتی پھولتی اور انسانوں اور دوسرے جانداروں کا رزق بنتی ہے۔ اور مَا کو موصولہ قرار دیا جائے تو پھر اس کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ اگرچہ نباتات کو وجود میں لانے والے سارے عناصر اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں۔ تاہم اس میں کچھ نہ کچھ کام انسانوں کا بھی ہوتا ہے۔ مثلاً انسان بیج ڈالتا ہے، ہل چلاتا ہے، زمین کی سیرابی اور فصل کی نگہداشت کرتا ہے، لیکن اگر وہ غور کرے تو انسان کی یہ استعداد بھی اللہ ہی کا عطیہ ہے۔ اور انسان کے اتنا کام کرنے کے بعد بھی نباتات تب ہی اگ سکتی ہے جب پیداوار کے بڑے بڑے وسائل انسان کی اس حقیر سی کوشش کا ساتھ دیتے ہیں۔ لہٰذا اللہ کا شکر بہر حال واجب ہوا۔

۞ **تمام خوردنی اشیاء کی اصل زرعی پیداوار ہے:۔** اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا ہے وہی اصل اشیاء ہیں پھر انسان ان پر محنت کرکے بعض دوسری اشیائے ضرورت تیار کرلیتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے گندم، گنا، چنے اور دودھ پیدا کیا ہے۔ اب انسان ان سے کچھ چیزیں انفرادی طور پر حاصل کرتا ہے۔ مثلاً گندم سے روٹی، اور اس کی قسمیں اور گنے سے گڑ، شکر اور چینی اور دودھ سے دہی، مکھن، لسی، بالائی اور گھی وغیرہ پھر انہیں چیزوں کے امتزاج سے ہزاروں چیزیں بناتا چلا جاتا ہے۔ اور کئی طرح کے سالن، اچار، چٹنیاں، مربے، مٹھائیاں وغیرہ تیار کرلیتا ہے۔ کئی چیزوں سے اپنی پوشاک کی ضروریات بناتا ہے یہ استعداد بھی انسان کو اللہ ہی نے بخشی ہے۔ لہٰذا ہر حال میں اللہ کا شکر واجب ہوا۔

[۳۴] ۞ **زوج کے مختلف معانی اور ان کی وسعت:۔** ازواج کے کئی معنی ہیں مثلاً اس کا اطلاق نر و مادہ پر بھی ہوتا ہے۔ مرد، عورت کے لئے زوج ہے اور عورت مرد کے لئے۔ اور ان دونوں میں اللہ تعالیٰ نے فطرتی طور پر ایک دوسرے کے لئے کشش رکھ دی ہے۔ پھر اس زوج کے ایک دوسرے سے ملنے سے آگے مزید تخلیق کا سلسلہ چلتا ہے۔ اور یہ سلسلہ صرف حیوانات میں ہی نہیں نباتات میں بھی پایا جاتا ہے۔ کچھ درخت تو ایسے ہیں جن کا عام انسانوں کو بھی علم ہوتا ہے۔ مثلاً کھجور اور انار کے درخت نر بھی ہوتے ہیں اور مادہ بھی، جب پھل لگنے کا موسم ہوتا ہے تو ہوائیں نر درختوں کا بیج اٹھا کر مادہ درختوں پر پھینک دیتی ہیں۔ تو مزید

وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٦﴾ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۚ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿٣٧﴾ وَ
الشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿٣٨﴾ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ

بھی اور ان چیزوں کے بھی جنہیں یہ جانتے بھی نہیں (۳۶) اور ان کے لئے ایک نشانی [۳۵] رات (بھی) ہے جس کے اوپر سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں تو ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔(۳۷) اور سورج اپنی مقررہ گزرگاہ پر چل [۳۶] رہا ہے۔ یہی زبردست علیم ہستی کا مقرر کردہ اندازہ ہے۔(۳۸) اور چاند کی ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں تا آنکہ وہ کھجور کی

پیدائش عمل میں آتی ہے۔ اور نباتات کی ہر قسم میں یہ نر و مادہ کا سلسلہ موجود ہے خواہ اس کا ابھی تک انسان کو علم ہوا ہو یا نہ ہو۔ پھر یہ سلسلہ جمادات حتیٰ کہ مادہ کے ایک ذرہ کے اندر بھی پایا جاتا ہے۔ اس میں بھی مثبت اور منفی قوتیں موجود ہوتی ہیں۔ جو آپس میں ایک دوسرے کے لئے کشش رکھتی ہیں۔ دوسرے زوج کا لفظ آپس میں مماثلت رکھنے والی چیزوں کے لئے بھی آتا ہے۔ مثلاً ایک جوتا دوسرے جوتے کا زوج ہوتا ہے۔ اور اس معنی میں بھی یہ لفظ قرآن میں موجود ہے جیسے فرمایا: وَاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ (۳۸:۵۸) (یعنی اس سے ملتی جلتی دوسری چیزیں) اور ازوج کا تیسرا معنی ایک دوسرے کے مخالف اشیاء جیسے دن رات کا زوج ہے اور رات دن کا یا سایہ دھوپ کا اور دھوپ سایہ کا یا روشنی تاریکی کی زوج اور تاریکی روشنی کی گویا یہ زوج کا سلسلہ اتنا وسیع ہے جو نباتات اور حیوانات کے علاوہ بھی تمام اشیاء میں پایا جاتا ہے۔ خواہ تمہیں اس کا علم ہو یا نہ ہو سکے۔

اس آیت کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے سبحان الذی کا لفظ استعمال فرمایا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی ہی ایک ایسی ذات ہے جو ہر قسم کے زوج سے پاک ہے۔ نہ اس کا کوئی مقابل ہے اور نہ مماثل۔ کیونکہ مقابلہ یا مماثلت ان چیزوں میں ہو سکتی ہے جو کسی درجہ میں فی الجملہ اشتراک رکھتی ہوں مگر خالق اور مخلوق کا کسی حقیقت میں اشتراک نہیں ہوتا اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ دنیا میں شرک کی جتنی بھی اقسام پائی جاتی ہیں ان میں سے ہر قسم میں اللہ تعالیٰ اس کی ذات میں کسی نہ کسی کمی، کمزوری، عیب یا نقص کا الزام ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سبحان کا لفظ کہہ کر مشرکوں کے ہر قسم کے شرکیہ عقیدہ کی تردید فرما دی۔

[۳۵] ❁ رات کا ذکر دن سے پہلے اور فطری تقویم:۔ قرآن کریم نے جب دن اور رات کا ذکر فرمایا تو پہلے رات کا ذکر فرمایا۔ اس سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے کہ ایک یہ کہ فطری تقویم یہ ہے کہ دن رات کی (یعنی ایک دن یا ۲۴ گھنٹے) کی مدت کا شمار ایک دن سورج غروب ہونے سے لے کر دوسرے دن سورج غروب ہونے تک ہے۔ اور یہ مدت ہمیشہ ۲۴ گھنٹے ہی رہتی ہے خواہ گرمیوں کا موسم ہو یا سردیوں کا اور اس میں ایک سیکنڈ کا بھی فرق نہیں پڑتا اور دوسرے یہ کہ اصل چیز رات اور تاریکی ہی تھی یہ اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لئے سورج پیدا فرما کر روشنی کا بھی انتظام فرما دیا۔ اور اس میں تمہارے لئے اور بھی بے شمار فائدے رکھ دیئے۔ حتیٰ کہ اگر اللہ تعالیٰ رات اور دن کا یہ انتظام نہ فرماتے تو اس زمین پر نہ کوئی نباتات اگ سکتی تھی اور نہ ہی کوئی جاندار زندہ رہ سکتا تھا۔

[۳۶] اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جس طرح فضا میں دوسرے تمام سیارے اپنے اپنے مدار پر گردش کر رہے ہیں اسی طرح سورج بھی اپنے مدار یا اپنی مقررہ گزرگاہ پر چل رہا ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ جو ہر چیز پر غالب اور اپنی مخلوقات کے تمام تر حالات سے واقف ہے' چاہے گا یہ سورج اسی طرح اپنی مقررہ گزرگاہ پر چلتا رہے گا جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

❁ سورج کا عرش الٰہی کے نیچے سجدہ ریز ہونا:۔ ایک دفعہ خود رسول اللہ ﷺ نے سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: "جانتے ہو کہ سورج غروب ہونے کے بعد کہاں جاتا ہے؟" سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: "اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں"

الْقَدِيمِ ﴿٣٩﴾ لَا الشَّمْسُ يَنبَغِي لَهَا أَن تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۚ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ﴿٤٠﴾

پرانی ٹہنی کی طرح[۳۷] رہ جاتا ہے۔(۳۹) نہ تو سورج سے یہ ہو سکتا ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ ہی رات دن[۳۸] پر سبقت لے جاسکتی ہے۔ سب اپنے اپنے مدار پر تیزی سے رواں دواں[۳۹] ہیں۔(۴۰)

آپ ﷺ نے فرمایا: "سورج غروب ہونے پر اللہ تعالیٰ کے عرش کے نیچے سجدہ ریز ہوتا ہے اور دوسرے دن طلوع ہونے کا اذن مانگتا ہے تو اسے اذن دے دیا جاتا ہے پھر ایک دن ایسا آئے گا کہ اس سے کہا جائے گا کہ جدھر سے آیا ہے ادھر ہی لوٹ جا۔ پھر وہ مغرب سے طلوع ہوگا۔ پھر آپ ﷺ نے یہی آیت پڑھی" (بخاری۔ کتاب التوحید۔ باب وکان عرشه علی الماء)

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ سورج اور اسی طرح دوسرے سیاروں کی گردش محض کشش ثقل اور مرکز گریز قوت کا نتیجہ نہیں بلکہ اجرامِ فلکی اور ان کے نظام پر اللہ حکیم و خبیر کا زبردست کنٹرول ہے کہ ان میں نہ تو تصادم و تزاحم ہوتا ہے اور نہ ہی ان کی مقررہ گردش میں کمی بیشی ہوتی ہے اور یہ سب اجرام اللہ کے حکم کے تحت گردش کر رہے ہیں دوسرے یہ کہ قیامت سے پہلے ایک ایسا وقت آنے والا ہے جب سورج مغرب سے طلوع ہوگا اس کے بعد نظامِ کائنات بگڑ جائے گا۔

آج کا مغرب زدہ طالب علم سورج کے طلوع و غروب ہونے اور عرش کے نیچے جاکر دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت مانگنے کا مذاق اڑاتا ہے اور کہتا ہے کہ سورج تو اپنی جگہ پر قائم ہے اور ہمیں جو طلوع و غروب ہوتا نظر آتا ہے تو یہ محض زمین کی محوری گردش کی وجہ سے ہے حالانکہ اللہ کا عرش اتنا بڑا ہے کہ ایک سورج کی کیا بات ہے کائنات کی ایک ایک چیز اس کے عرش کے تلے ہے اور جن وانس کے سوا ہر چیز اس کے ہاں سجدہ ریز یا اللہ کی طرف سے سپرد کردہ خدمت سرانجام دینے پر لگی ہوئی ہے۔

[۳۷] اشکالِ قمر اور منازلِ قمر:۔ سورج ہمیشہ مشرق سے طلوع ہو کر شام کو مغرب میں غروب ہو جاتا ہے۔ اور اس کی شکل بھی ایک ہی جیسی رہتی ہے لہٰذا اس کے معمول میں کبھی فرق نہیں آتا۔ جبکہ چاند کا مسئلہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ وہ کسی بھی قمری مہینے کی ابتدا میں مغرب کی سمت نمودار ہوتا ہے اور بالکل ایک پھانک سی نظر آتا ہے جسے قرآن نے کھجور کی پرانی اور خشک ٹہنی سے تشبیہ دی ہے اور اسے ہلال کہتے ہیں۔ دوسرے دن یہ ذرا موٹا بھی ہو جاتا ہے اور مشرق کی طرف ہٹ کر نمودار ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ روز موٹا ہوتا جاتا ہے اور شکلیں بدلتا رہتا ہے۔ اور چاند بنتا جاتا ہے حتیٰ کہ سات دن بعد عین سر پر طلوع ہوتا ہے اور نصف دائرہ کی شکل اختیار کرلیتا ہے پھر چودھویں دن مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور پورا گول ہوتا ہے۔ گویا ہر روز وہ نئی شکل بدلتا ہے اور ہر روز اس کی منزل جداگانہ ہوتی ہے پھر یہ گھٹنا شروع ہو جاتا ہے پھر پہلے کی طرح پھانک کی شکل اختیار کرلیتا ہے یہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے چاند کے لئے مقرر کردہ منزلیں ہیں۔

[۳۸] اس جملے کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ سورج چاند کی نسبت بڑا سیارہ ہے۔ اس کی کشش ثقل بھی چاند کی نسبت بہت زیادہ ہے تاہم یہ ممکن نہیں کہ سورج چاند کو اپنی طرف کھینچ لے نہ ہی یہ ممکن ہے کہ اس کے مدار میں جاداخل ہو۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ بھی ممکن نہیں کہ رات کو چاند چمک رہا ہو اور اسی وقت سورج طلوع ہو جائے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ دن کی مقررہ مدت ختم ہونے سے پہلے ہی رات آجائے۔ اور جتنا وقت دن کی روشنی کے لئے مقرر ہے ان میں رات یکایک اپنی تاریکیوں سمیت آموجود ہو۔

[۳۹] سورج اور چاند کی گردش اور فلک کا مفہوم:۔ سَبَحَ کے معنی پانی یا ہوا میں نہایت تیز رفتاری سے گزر جانا یا تیرنا۔ اور فلک کے معنی سیاروں کے مدارات یا ان کی گزرگاہیں (Orbits) ہیں۔ اس آیت میں پہلے صرف سورج اور چاند کا ذکر فرمایا پھر

وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿٤١﴾ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿٤٢﴾ وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ﴿٤٣﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿٤٤﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا

اور ایک نشانی ان کے لئے یہ ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی[۴۰] کشتی میں سوار کیا(۴۱) پھر ان کے لئے ایسی ہی اور چیزیں پیدا[۴۱] کیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں۔(۴۲) اگر ہم چاہیں تو انہیں غرق کر دیں پھر نہ تو ان کا کوئی فریاد رس ہو گا اور نہ وہ بچائے[۴۲] جا سکیں گے۔(۴۳) مگر ہماری رحمت[۴۳] سے ہی (پار لگ جاتے ہیں) اور کچھ مدت تک زندگی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔(۴۴) اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اس انجام سے ڈر جاؤ جو ....

کل کا لفظ استعمال فرمایا جو جمع کے لئے آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورج اور چاند کے علاوہ باقی تمام سیارے بھی فضا میں تیزی سے گردش کر رہے ہیں۔ اور چونکہ ہماری زمین بھی ایک سیارہ ہے لہٰذا یہ اب محوگردش ہے۔ البتہ زمین کی گردش کے متعلق چند مخصوص وجوہ کی بنا پر استثناء ممکن ہے اور زمین کی گردش کے متعلق آج تک چار نظریے بدل چکے ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے میری تصنیف الشمس والقمر بحسبان)

[۴۰] بھری ہوئی کشتی سے مراد وہ کشتی ہے جو سیدنا نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق طوفان سے پہلے بنائی تھی۔ جس میں سیدنا نوح علیہ السلام کے علاوہ تمام ایماندار، ان کا سامان خورد و نوش، ہر قسم کے جاندار کا ایک ایک جوڑا لدا ہوا تھا۔ جس سے یہ کشتی بھر گئی تھی اور اس میں گویا پوری بنی نوع انسان لدی ہوئی تھی وہ یوں کہ جتنے بھی انسان موجود ہیں سب کے سب ان کشتی میں سوار لوگوں کی اولاد ہیں۔

[۴۱] من مثلہ سے مراد یہ بھی لی جا سکتی ہے کہ سیدنا نوح علیہ السلام کی کشتی جیسی کشتی بنانا انسان نے سیکھ لیا جس کی تعلیم اللہ نے دی تھی۔ اس لحاظ سے سیدنا نوح علیہ السلام ہی کشتی یا جہاز کے موجد ہیں اور یہ مراد بھی لی جا سکتی ہے کہ کشتی جیسی کوئی اور چیز یا چیزیں بھی پیدا کیں اور اس سے مراد وہ تمام سواریاں لی جا سکتی ہیں جو سمندر یا خشکی یا فضا میں چلتی ہیں اور انسان ان پر سوار ہوتا ہے۔

[۴۲] ۞ سمندر میں غرقابی کا حسرتناک منظر:۔ سمندر میں انسان کے کشتی پر سوار ہو کر سفر کرنے کے منظر کو قرآن نے متعدد مقامات پر اپنی نشانی کے طور پر پیش کیا ہے اگر کسی نے سمندری سفر کیا ہو تو وہی اس منظر کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ سمندر کے عین درمیان جہاز چل رہا ہے اوپر دیکھیں تو صرف نیلا آسمان نظر آتا ہے کوئی پرندہ تک نظر نہیں آتا، نیچے دیکھیں تو حد نگاہ تک سیاہ پانی نظر آتا ہے۔ پھر جب سمندر کی موجیں اور تیز ہوائیں جہاز کو ڈگمگا دیتی ہیں تو ہر مسافر سہما سہما نظر آنے لگتا ہے۔ نزدیک کوئی خشکی نہیں، کوئی بستی نہیں جہاز میں سوار تمام مسافروں کی زندگی کا انجام بس اتنا ہی ہوتا ہے کہ ایک شدید جھٹکا لگے جو جہاز کو الٹ دے تو تمام مسافروں کی لاشیں سمندر کی اتھاہ گہرائیوں تک پہنچ کر دم لیں یا کسی آبی جانور کا لقمہ بن جائیں اور اس حال میں جان دیں کہ ان کے لواحقین کو خبر تک بھی نہ ہو سکے۔

[۴۳] یہ بس اللہ کی رحمت ہی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ سمندر اور ہواؤں کی سرکشی اور بے پناہ قوت کو کنٹرول میں رکھتا ہے اور مسافر اور تاجر اکثر اوقات صحیح و سلامت دوسرے کنارے پر جا اترتے ہیں۔ اگر اللہ کی رحمت شامل حال نہ ہو تو بنی نوع انسان کی ایک کثیر تعداد سمندر کا لقمہ اجل بن جائے۔

مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٤٥﴾ وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿٤٦﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ

تمہارے سامنے[۴۴] ہے یا پیچھے گزر چکا ہے تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (تو اس کی کچھ پروا نہیں کرتے)(۴۵) اور جب بھی ان کے پاس ان کے پروردگار کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی[۴۵] آتی ہے تو وہ اس سے اعراض ہی کر جاتے ہیں(۴۶) اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اللہ نے تمہیں رزق دیا ہے اس میں سے (اس کی راہ میں) خرچ کرو۔ تو کافر ایمان والوں کو یوں جواب دیتے ہیں کہ: "کیا ہم اسے کھلائیں جسے اگر اللہ چاہتا تو خود[۴۶]

[۴۴] اس آیت کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ سابقہ قوموں کا یہ انجام بھی تمہارے سامنے ہے اور تم خود بھی ایسے ہی انجام کی طرف جا رہے ہو کیونکہ جس قوم نے اللہ کی نافرمانی اور سرکشی کی راہ اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کا زور توڑ کے رکھ دیا اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ آئندہ تم سے تمہارے اعمال کا محاسبہ کیا جانے والا ہے اس کو بھی مدنظر رکھو اور ان اعمال کو بھی جو تم کر چکے ہو۔ اگر تم اپنے برے انجام سے ڈر گئے اور کچھ سبق حاصل کر لیا تو پھر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اللہ تم پر مہربانی فرمائے گا۔

[۴۵] نشانی سے مراد خرق عادت یا معجزہ بھی ہو سکتا ہے اور قرآن کی آیات بھی کہ قرآن کی ہر آیت بذات خود ایک معجزہ ہے۔ اور آفاق و انفس کی آیات بھی یعنی جب بھی کوئی نشانی ان کے سامنے آتی یا لائی جاتی ہے تو اس میں غور و فکر کرنا بلکہ اسے توجہ سے سننا یا دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔

[۴۶] ❁ مشیت کا سہارا اس وقت لیا جاتا ہے جب جرم اپنا ہو:۔ یہ ہے ان کج بحث اور ہٹ دھرم لوگوں کی "خوئے بد را بہانہ بسیار" والی بات یعنی وہ خوب جانتے ہیں کہ غریبوں کی مدد کرنا بڑا اچھا اور نیک کام ہے۔ امیری ہو یا غریبی اللہ ہر حال میں سب کی آزمائش کرتا ہے۔ امیروں کی اس طرح کہ وہ غریبوں کو کچھ دیتے ہیں یا نہیں اور غریبوں کی اس طرح کہ وہ اس حال میں صبر اور اللہ کا شکر کرتے ہیں یا نہیں۔ اصل مشیت تو اللہ کی یہ ہے کہ کسی کو امیر اور کسی کو غریب بنا کر دونوں کی آزمائش کرے جبکہ ان لوگوں کا استدلال یہ ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو انہیں خود ہی اپنے پاس سے دے دیتا۔ اور ان کی واضح گمراہی یا ان کا یہ استدلال باطل اسی لحاظ سے ہے کہ مشیت الٰہی کا سہارا اس وقت لیتے ہیں جب یہ خود مجرم ہوں اور جب کوئی دوسرا مجرم ہو اور ان کی حق تلفی ہو رہی ہو تو کبھی مشیت الٰہی کا سہارا نہ لیں گے۔ مثلاً اگر کوئی ڈاکو ان سے مال چھین لے جائے تو اس وقت اس کے خلاف پوری چارہ جوئی کریں گے اور اس وقت کبھی نہ کہیں گے کہ ڈاکو کا کوئی قصور نہیں یا ہمیں سب کچھ برداشت کر لینا چاہئے کیونکہ اللہ کی مشیت یہی تھی۔ واضح رہے کہ یہ مطلب اس لحاظ سے ہو گا جب ﴿إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ﴾ کو اللہ کا فرمان سمجھا جائے۔ اور اگر اس جملہ کو صدقہ نہ دینے والے کافروں کا کلام سمجھا جائے اور اس کے مخاطب مسلمان ہوں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ مسلمانو! تمہاری گمراہی بڑی واضح ہے کہ جن لوگوں کا اللہ پیٹ بھرنا نہیں چاہتا تم ایسے لوگوں کا پیٹ بھرنا چاہتے ہو۔

يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۷﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾
مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى
اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا
مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً

ہی کھلا سکتا تھا؟'' تم تو صریح گمراہی میں پڑ گئے ہو۔(۴۷) نیز وہ کہتے ہیں کہ: ''اگر تم سچے ہو تو یہ وعدہ (قیامت) کب پورا ہوگا؟''(۴۸) وہ صرف ایک دھماکے کا انتظار کر رہے ہیں جو انہیں آپکڑے گا جبکہ یہ آپس میں[۴۷] جھگڑ رہے ہوں گے۔(۴۹) اس وقت وہ نہ تو وصیت کر سکیں گے اور نہ ہی اپنے گھروں کو واپس[۴۸] جا سکیں گے۔(۵۰) اور (جب) صور پھونکا جائے گا تو وہ فوراً اپنی قبروں سے (نکل کر) اپنے پروردگار کی طرف دوڑ پڑیں گے(۵۱) کہیں گے: ''افسوس! ہمیں ہماری خواب گاہ سے کس[۴۹] نے اٹھا کھڑا کیا؟'' یہ تو وہی چیز ہے جس کا رحمٰن[۵۰] نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں نے سچ کہا تھا(۵۲) وہ بس ایک ہی گرجدار آواز ہوگی

وقف لازم

[۴۷] قیامت دفعتاً آجائے گی:۔ قیامت جب آئے گی تو وہ آہستہ آہستہ نہیں آئے گی جسے تم دیکھ کر سمجھ لو کہ آرہی ہے اور کچھ سنبھل جاؤ۔ بلکہ اس وقت تم اپنے اپنے کام کاج میں پوری طرح منہمک ہوگے، کوئی کاروبار کر رہا ہوگا، کوئی سودا بازی کرتے ہوئے جھگڑ رہا ہوگا، اس وقت اچانک ایک زور کا دھماکہ ہوگا اور جو شخص جس حال میں بھی ہوگا وہیں دھر لیا جائے گا۔ چنانچہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ قیامت اس حال میں آئے گی کہ دو آدمی اپنا کپڑا بچھائے بیٹھے ہوں گے وہ اس کی سودا بازی اور کپڑا لپیٹنے سے ابھی فارغ نہ ہوں گے کہ قیامت آجائے گی اور آدمی اپنی اونٹنی کا دودھ لے کر چلے گا۔ ابھی اس کو پئے گا نہیں کہ قیامت آجائے گی اور کوئی آدمی اپنا حوض لیپ پوت رہا ہوگا پھر ابھی اس کا پانی پیا نہیں جائے گا کہ قیامت آجائے گی اور ایک آدمی کھانے کا نوالہ منہ کی طرف اٹھا رہا ہوگا اور ابھی کھایا نہ ہوگا کہ قیامت آجائیگی۔'' (بخاری۔ کتاب الرقاق۔ باب بلا عنوان)

[۴۸] قیامت آگئی تو پھر انہیں اتنی مہلت نہیں ملے گی کہ وہ کچھ وصیت ہی کر سکیں یا جو باہر ہیں وہ اپنے گھر واپس جا سکیں بلکہ جہاں کہیں بھی کوئی موجود ہوگا وہیں اس کا کام تمام کر دیا جائے گا۔

[۴۹] دوسری مرتبہ صور پھونکنے کا اثر:۔ نفخہ صور اول سے تمام لوگ بے ہوش ہو جائیں گے اور اسی بے ہوشی کے عالم میں ہی ان کی موت واقع ہوگی۔ پھر جب دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو وہ قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس وقت انہیں یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ کیا حادثہ پیش آیا تھا اور وہ اس وقت کہاں کھڑے ہیں۔ جیسے کسی شخص کا بس سے ایکسیڈنٹ ہو جائے تو وہ بے ہوش ہو جائے۔ اور اسے ہسپتال پہنچا دیا جاتا ہے۔ پھر جب وہ کچھ مدت بعد ہوش میں آتا اور آنکھیں کھولتا ہے تو اس وقت وہ یہ دیکھتا ہے کہ میں اس وقت کہاں ہوں اور کیسے یہاں پہنچ گیا ہوں؟ اسے اپنی بے ہوشی کی بھی کچھ خبر نہیں ہوتی یہی حال ان لوگوں کا ہوگا۔ وہ بالکل اجنبی اور دہشت ناک ماحول دیکھ کر پہلی بات جو کریں گے وہ یہ ہوگی: ہم تو آرام سے پڑے سو رہے تھے ہمیں کس نے جگا دیا ہے؟ انہیں کچھ اپنی موت سے پہلے کی کوئی خبر ذہن میں آئے گی نہ عذاب قبر کی۔ وہ قیامت کی ہولناکیوں کے مقابلہ میں اسے بھی بس ایک خواب ہی سمجھیں گے۔

[۵۰] اس جملہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ جب وہ اس ماحول کو سمجھنے کیلئے اپنے ذہن پر زور ڈالیں گے تو انہیں از خود یہ معلوم ہو جائے گا کہ یہ تو

وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿٥٣﴾ فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٥٤﴾
اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِيْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ﴿٥٥﴾ هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ﴿٥٦﴾ لَهُمْ
فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ ﴿٥٧﴾ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴿٥٨﴾ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٥٩﴾

پھر وہ فوراً سب کے سب[۵۱] ہمارے حضور پیش کر دیئے جائیں گے (۵۳)

آج کسی پر ذرہ بھر بھی ظلم نہ کیا جائے گا اور تمہیں ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا جیسے تم عمل کرتے رہے۔(۵۴) آج اہل جنت مزے اڑانے میں مشغول ہوں گے (۵۵) وہ اور ان کی بیویاں چھاؤں میں تختوں پر تکیہ لگائے ہوں گے۔(۵۶) وہاں انہیں کھانے کو میوے بھی ملیں گے اور جو کچھ وہ طلب کریں گے[۵۲] وہ بھی ملے گا (۵۷) مہربان پروردگار فرمائے گا (تم پر) سلامتی[۵۳] ہو۔(۵۸) اور اے مجرمو! آج تم الگ[۵۴] ہو جاؤ (۵۹)

وہی چیز ہے جو رسول ہمیں کہا کرتے تھے اور ہم اس کا انکار کر دیا کرتے تھے۔ اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان کی اس سراسیمگی کی حالت میں اہل ایمان یا فرشتے انہیں مطلع کریں گے کہ یہی وہ دن ہے جس کا اللہ نے تم لوگوں سے وعدہ کیا تھا اور جب بھی رسول تمہیں اللہ کے اس وعدہ اور اس قیامت کے دن سے ڈراتے تھے تو ہر بار تم یہی کہہ دیتے تھے کہ وہ کب ہوگا سو آج اپنی آنکھوں سے وہ دن دیکھ لو۔

[۵۱] جب انہیں صحیح صورت حال کا علم ہو جائے گا تو فرشتے انہیں دھکیل کر میدان محشر کی طرف لے جائیں گے اور وہ مجرموں کی طرح اللہ کے حضور جواب دہی کے لئے پیش کر دیئے جائیں گے۔ اور ساتھ ہی انہیں یہ بتا دیا جائے گا کہ تم دنیا میں جیسے اعمال کر کے آئے ہو ویسا ہی تمہیں بدلہ دیا جائے گا تاہم یہ یقین رکھو کہ تمہیں تمہارے جرائم سے زیادہ سزا نہیں دی جائے گی۔

[۵۲] یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق مجرموں کے ساتھ اپنے فرمانبرداروں کا اور ان کے حسن اجر کا ذکر فرمایا اور ساتھ ہی یہ فرما دیا کہ مجرموں سے ابھی جواب طلبی اور حساب لینے کا کام باقی ہوگا مگر اس وقت اہل جنت، جنت میں داخل ہو چکے ہوں گے۔ ان میں سے کچھ ایسے ہوں گے جو بلا حساب کتاب جنت میں داخل ہوں گے اور بعض دوسروں سے آسان اور سرسری سا حساب لے کر انہیں جنت میں داخل کیا جا چکا ہوگا۔ وہاں وہ خوشحال زندگی گزار رہے ہوں گے۔ ٹھنڈی چھاؤں میں ان کے تخت بچھائے گئے ہوں گے وہ اور ان کی بیویاں آمنے سامنے تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ ہر قسم کے میوے اور پھل ان کے پاس حاضر ہوں گے۔ علاوہ ازیں جس چیز کی بھی وہ آرزو کریں گے فوراً حاضر کر دی جائے گی۔

[۵۳] ان اہل جنت کے مہربان پروردگار کی طرف سے انہیں سلام کہا جائے گا۔ خواہ یہ اللہ کی طرف سے سلام فرشتوں کی وساطت سے ہو۔ یا بلاواسطہ اللہ تعالیٰ ان سے خطاب فرمائیں۔ کیونکہ عالم آخرت کے احوال عالم دنیا جیسے نہیں ہوں گے۔ اس دنیا میں کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتا۔ مگر جنت میں اہل جنت اللہ تعالیٰ کو یوں دیکھ سکیں گے جیسے یہاں ہم چاند کی طرف دیکھ سکتے ہیں اور ہمیں راحت محسوس ہوتی ہے۔ اس دنیا میں اللہ کو کسی نے نہیں دیکھا البتہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے براہ راست بلاواسطہ کلام ضرور کیا ہے۔ لہٰذا عالم آخرت میں اللہ تعالیٰ کا اہل جنت سے اور اہل جنت کا اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونا بدرجہ اولیٰ ممکن ہوگا۔

[۵۴] اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ دنیا میں مجرم اور فرمانبردار سب ملے جلے رہتے ہیں اور ایسا ہی ممکن ہے کہ باپ

أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ۖ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٦٠﴾ وَأَنِ اعْبُدُونِي ۚ هَٰذَا
صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٦١﴾ وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا ۖ أَفَلَمْ تَكُونُوا تَعْقِلُونَ ﴿٦٢﴾ هَٰذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي
كُنتُمْ تُوعَدُونَ ﴿٦٣﴾ اصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿٦٤﴾ الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ

اے بنی آدم! کیا میں نے تمہیں تاکید نہیں کی تھی کہ شیطان کی عبادت [۵۵] نہ کرنا وہ تمہارا صریح دشمن
ہے۔(۶۰) اور میری ہی عبادت [۵۶] کرنا۔ یہی سیدھا راستہ ہے (۶۱) وہ تو تم میں سے ایک گروہ کثیر کو گمراہ [۵۷]
کر چکا ہے کیا تم سوچتے نہیں؟ (۶۲) یہ ہے وہ جہنم جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا (۶۳) آج اس میں داخل ہو جاؤ
کیونکہ تم کفر کیا کرتے تھے۔ (۶۴) آج ہم ان کے منہ بند [۵۸] کر دیں گے اور ان کے ہاتھ کلام کریں گے اور

مجرم اور بیٹا اللہ کا فرمانبردار ہو اور وہ ایک ہی جگہ رہتے ہوں۔ وہاں یہ صورت نہیں ہوگی۔ نہ وہاں نسب کا لحاظ ہوگا۔ بلکہ مجرموں کو حکم دیا جائے گا کہ وہ اللہ کے فرمانبرداروں سے الگ ہو جائیں اور جن لوگوں کا وہ دنیا میں مذاق اڑایا کرتے تھے بچشم خود دیکھ لیں کہ آج ان کو کیسی کیسی نعمتیں اور آرام مہیا ہیں۔ اور دوسرا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اے گروہ مجرمین! تم باہم مل کر نہ رہو۔ بلکہ الگ الگ کھڑے ہو جاؤ۔ کیونکہ تم سے انفرادی طور پر ٹھیک ٹھاک باز پرس ہونے والی ہے۔

[۵۵] ۞ شیطان کی عبادت کیسے ہوتی ہے؟ اس آیت میں عبادت کا لفظ دو معنی ادا کر رہا ہے۔ ایک یہ کہ عبادت بمعنی اطاعت لیا جائے۔ کیونکہ شیطان کی عبادت تو کوئی کیا کرے گا اس پر تو سب لعنت ہی بھیجتے ہیں اور دوسرا معنی یہ ہے کہ آج تک اللہ کے سوا جتنے بھی معبودوں کی عبادت کی جاتی رہی ہے شیطان کے بہکانے کی وجہ سے ہی کی جاتی رہی ہے۔ لہٰذا فی الحقیقت یہ شیطان ہی کی عبادت ہوئی۔

[۵۶] ۞ عبادت کا مفہوم:۔ سیدھے راستہ کی تفصیل میں جائیں تو اس سے مراد تمام تر شریعت ہے اور انتہائی مختصر الفاظ میں سیدھے راستہ کی تعریف کی جائے تو وہ یہ ہے کہ ”صرف ایک اللہ کی عبادت کی جائے“

اس جملہ میں شرک کی تمام تر اقسام کی تردید ہو گئی۔ پھر عبادت کا مفہوم بھی بہت وسیع ہے۔ عبادت سے عموماً ارکان اسلام کی بجا آوری مراد لی جاتی ہے تو یہ عبادت کی صرف ایک معروف قسم ہے۔ کسی کو اپنی حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لئے پکارنا بھی عبادت ہے۔ پھر عبادت کا لغوی معنی بندگی اور غلام ہے وہ بھی تذلل کے ساتھ اور غلام ہر وقت غلام ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں کتاب و سنت کے تمام اوامر و نواہی کی بجا آوری بھی آجاتی ہے۔

[۵۷] باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم سے عہد لیا تھا، اور یہ عہد أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ تھا، پھر اللہ نے سمجھنے سوچنے کے لئے تمہیں عقل بھی دی تھی، پھر اللہ تعالیٰ اس عہد کی یاددہانی کے لئے اپنے رسول اور کتابیں بھی بھیجتا رہا پھر بھی شیطان بنی آدم کی ایک کثیر تعداد کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لہٰذا اے عہد فراموش مجرمو! تم نے اپنی عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا تو اب اس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ جہنم تمہاری منتظر ہے۔ رسولوں کی دعوت سے انکار اور ضد کی سزا یہی ہے کہ اب اس جہنم میں داخل ہو جاؤ۔

[۵۸] کٹر قسم کے مجرم جب اللہ کے حضور پیش ہوں گے تو اپنے جرائم کا اعتراف کرنے کی بجائے وہاں بھی حسب عادت جھوٹ بولنا شروع کر دیں گے اور اپنے گناہوں سے مکر جائیں گے۔ پھر ان پر شہادتیں قائم کی جائیں گی تو ان شہادتوں اور

وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٦٥﴾ وَلَوْ نَشَاءُ لَطَمَسْنَا عَلَىٰ أَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَأَنَّىٰ
يُبْصِرُونَ ﴿٦٦﴾ وَلَوْ نَشَاءُ لَمَسَخْنَاهُمْ عَلَىٰ مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوا مُضِيًّا وَلَا يَرْجِعُونَ ﴿٦٧﴾ ع وَمَنْ

پاؤں گواہی دیں گے جو کچھ وہ کیا کرتے تھے (۶۵) اگر ہم چاہیں تو ان کی آنکھیں مٹا دیں پھر وہ راہ کی طرف آگے بڑھیں تو کیونکر [۵۹] دیکھ سکیں گے (۶۶) اور اگر ہم چاہیں تو ان کی جگہ پر ہی انہیں مسخ کر دیں۔ پھر نہ یہ آگے چل سکیں اور نہ ہی پیچھے لوٹ سکیں گے۔ (۶۷)

گواہوں کو بھی جھٹلا دیں گے اور یہی کچھ انہوں نے اس دنیا میں سیکھا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ ان کا یہ علاج کریں گے کہ ان کی زبانوں سے قوتِ گویائی سلب کر لیں گے۔ اور ان کے ہاتھوں اور پاؤں کو قوت گویائی عطا کر دی جائے گی تو ان کے یہ اعضا جن سے انہوں نے گناہ کے کام سرزد کئے ہوں گے ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ اور سورہ حم السجدہ کی آیت نمبر ۲۰ کے مطابق ان کے کان، ان کی آنکھیں اور ان کے چمڑے بھی ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ جب ان کے اپنے اعضاء کی گواہیوں کے مطابق ان کے جرم ثابت ہو جائیں گے تو وہ اپنے ان گواہی دینے والے اعضاء کو مخاطب کر کے کہیں گے کہ ظالمو! ہم نے تمہیں بچانے کے لئے ہی تو جھوٹ بولا تھا۔ پھر تم نے یہ کیا ظلم ڈھا دیا؟ تو اعضاء انہیں جواب دیں گے کہ ہمیں اس اللہ نے قوت گویائی بخشی تھی جس نے ہر چیز کو بخشی ہے" (۴۱: ۲۱) پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم صحیح صحیح گواہی نہ دیتے؟

❁ اعضاء وجوارح کی گواہی کیسے ہوگی؟ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ مجرموں کے اعضاء سے ان کے خلاف زبردستی گواہی نہیں لیں گے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ اس بات پر بھی قادر ہے مگر یہ بات اس کی صفت عدل کے خلاف ہے کہ اگر وہ زبردستی ان کے خلاف شہادت چاہتا تو خود ان سے اور ان کی زبانوں سے بھی لے سکتا تھا۔ بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ انسان سے جو اقوال، اعمال اور افعال سرزد ہوتے ہیں تو اس کے اثرات (جسے سورہ یٰسین میں اٰثَارَھُمْ کہا گیا ہے) فضا میں مرتسم ہوتے جاتے ہیں اور خود انسان کے اعضا پر بھی مرتسم ہوتے ہیں جدید تحقیق کے مطابق بنی آدم سے لے کر آج تک پیدا ہونے والے تمام انسانوں کے اقوال اور آوازیں بدستور فضا میں موجود ہیں۔ مگر وہ آپس میں ملی جلی اور گڈمڈ ہیں اور انسان تاحال اس بات پر قادر نہیں ہو سکا کہ کسی خاص شخص کے مثلاً کسی نبی کے تمام تر اقوال الگ کر کے سن سکے۔ البتہ انسان اس بات پر بھی قادر ہو چکا ہے کہ تین چار گھنٹے کے اندر اندر کسی مجرم کے اعضاء کا خوردبینی مطالعہ کر کے یہ معلوم کر سکے کہ اس شخص نے واقعی یہ جرم کیا ہے یا نہیں؟ اور اللہ تعالیٰ تو خود ہر چیز کا خالق اور ہر چیز کی فطرت اور حقیقت کو سب سے بڑھ کر جاننے والا ہے۔ لہٰذا جب مجرم لوگوں کے ان اعضاء کو قوت گویائی دی جائے گی تو وہی حقیقت وہ بیان کریں گے جو ان پر گناہ کے دوران ثبت ہوئی تھی وہ برملا بول اٹھیں گے کہ اس شخص نے ہم سے فلاں اور فلاں گناہ کا کام کیا تھا اور فلاں فلاں وقت کیا تھا۔

[۵۹] ❁ فوراً سزا دینا اللہ کی مشیت کے خلاف ہے:۔ ایسے کٹر مجرموں کو اگر ہم چاہیں تو اس دنیا میں بھی سزا دے سکتے ہیں۔ ان کی بینائی سلب کر سکتے ہیں کہ وہ چاہیں بھی تو گناہوں کے کاموں کی طرف آگے بڑھ ہی نہ سکیں اور انہیں کچھ بھی سجھائی نہ دے۔ اسی طرح اگر چاہیں تو ان پر فالج گرا کر ان کو اپاہج بنا سکتے ہیں کہ اپنی جگہ سے حرکت کر ہی نہ سکیں، نہ آگے بڑھ سکیں نہ پیچھے جا سکیں۔ بس اپنے بستر پر ہی ہاتھ پاؤں رگڑتے رہیں۔ یا ان کا حلیہ ہی بگاڑ سکتے ہیں کہ ان کی دوسری بھی کئی قوتیں ختم

نُعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ؕ أَفَلَا يَعْقِلُونَ ﴿٦٨﴾ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِي لَهٗ ؕ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ

اور جس شخص کو ہم زیادہ عمر دیتے ہیں اسے خلقت میں ہی الٹ دیتے ہیں کیا یہ سوچتے[۶۰] نہیں۔(۶۸) ہم نے اس (نبی) کو شعر کہنا نہیں سکھایا[۶۱] اور یہ اس کے لئے مناسب[۶۲] بھی نہ تھا۔ یہ تو ایک نصیحت اور واضح ....

ہو جائیں۔ مگر مجرموں کو فوری طور پر پکڑنا ہماری مشیت کے خلاف ہے اور یہ لوگ اس مہلت کا بڑا عذ استعمال کر رہے ہیں۔

[۶۰] بڑھاپے میں بچپنے کی حالت:۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اس کی تمام تر قوتیں ترقی پذیر ہوتی ہیں۔ لیکن جب جوانی سے ڈھل جاتا ہے تو ان تمام قوتوں میں انحطاط آنا شروع ہو جاتا ہے۔ بچپن میں وہ چلنے میں سہارے کا محتاج تھا تو بڑھاپے میں بھی محتاج ہو جاتا ہے۔ اس کی طاقت، اس کی ہمت، اس کا عزم، اس کی عقل غرضیکہ ہر چیز میں اس قدر زوال آ جاتا ہے کہ وہ بچوں جیسا ہو جاتا ہے۔ اور اس سارے عمل میں انسان خود مجبور محض ہوتا ہے۔ کیا پھر بھی اسے سمجھ نہیں آتی کہ اگر ہم چاہیں تو اسے اندھا بھی کر سکتے ہیں۔ اسے اپاہج بھی بنا سکتے ہیں اس کا حلیہ بھی بگاڑ سکتے ہیں اور وہ چاہے یا نہ چاہے ہم اسے دوبارہ زندہ کر کے اس کے گناہوں کی اسے سزا بھی دے سکتے ہیں۔

[۶۱] آپ کے لئے شاعری اس لئے مناسب نہیں کہ شاعروں کے کلام میں جب تک جھوٹ اور مبالغہ کی آمیزش نہ ہو اس کے کلام میں نہ حسن پیدا ہوتا ہے اور نہ دلکشی اور نہ ہی کوئی ان کے اشعار کو پسند کرتا ہے۔

(مزید برآں ان کے تخیلات خواہ کتنے ہی بلند ہوں ان کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ شاعروں کی عملی زندگی عموماً ان کے اقوال کے برعکس ہوتی ہے اور تیسری وجہ یہ ہے کہ ان کے انداز فکر کے لئے کوئی متعین راہ نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک بے لگام گھوڑے کی طرح ہر میدان میں ہرزہ سرائی کرتے نظر آتے ہیں۔ شعر میں اگر کوئی چیز پسندیدہ ہو سکتی ہے تو وہ اس کی تاثیر اور دل نشینی ہے اور یہ چیز قرآن میں نثر ہونے کے باوجود بدرجہ اتم پائی جاتی ہے گویا شعر میں جو چیز کام کی تھی یا اس کی روح تھی وہ پوری طرح قرآن میں موجود ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ عرب جنہیں اپنی فصاحت و بلاغت پر ناز تھا۔ اور اسی وجہ سے وہ غیر عرب کو عجمی کہتے تھے۔ قرآن کو شعر یا سحر کہنے لگتے تھے اور حامل قرآن کو شاعر اور ساحر۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ شعر اور سحر کو قرآن سے کوئی نسبت نہیں کیا کبھی شاعری یا جادو کی بنیاد پر دنیا میں قومیت وروحانیت کی ایسی عظیم الشان اور لازوال عمارت کھڑی ہو سکتی ہے جو قرآنی تعلیم کی اساس پر قائم ہوئی اور آج تک قائم ہے۔

آپ کا وزن توڑ کر شعر پڑھنا:۔ آپ ﷺ کی اللہ تعالیٰ نے طبیعت ہی ایسی بنائی تھی کہ آپ ﷺ شعر کو موزوں نہیں کر سکتے تھے اور اگر کبھی کسی دوسرے شاعر کا کوئی شعر پڑھتے تو اس کا وزن توڑ دیتے تھے۔ چنانچہ سیدنا رافع بن خدیج کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جنگ ہوازن کے اموال غنیمت میں سے ابوسفیان بن حرب اور صفوان بن امیہ، عیینہ بن حصین اور اقرع بن حابس کو سو سو اونٹ دیئے اور عباس بن مرداس (انصاری) کو کچھ کم دیئے تو اس نے چند شعر کہے جن کا پہلا شعر یہ تھا۔

اتجعل نهبي و نهب العبيد :بين العيينة والاقرع (یعنی کیا آپ ﷺ میرا اور میرے گھوڑے عبید کا حصہ عیینہ اور اقرع کو دے رہے ہیں) جب آپ کو اس شکوہ کی خبر ملی تو آپ ﷺ نے صرف انصار کو ایک خیمہ کے نیچے اکٹھا کیا پھر ان سے پوچھا کہ تم میں سے کسی نے یہ شعر کہا ہے اور جب آپ ﷺ نے مندرجہ بالا شعر پڑھا تو اسے یوں پڑھا۔ اتجعل نهبي و نهب

مُّبِيْنٌ ﴿۶۹﴾ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۰﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ

پڑھی جانے والی کتاب ہے (۶۹) تاکہ جو زندہ ہے وہ اسے ڈرائے اور انکار کرنے والوں [۶۳] پر حجت قائم ہو جائے۔ (۷۰)
کیا وہ دیکھتے نہیں کہ جو چیزیں ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہیں ان میں سے ان کے لئے چوپائے [۶۴] پیدا تو

العبید بین الاقرع والعیینۃ گویا آپ ﷺ نے دوسرے مصرعہ کا وزن توڑ دیا تو یہ سن کر ایک صحابی کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے کہ ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ﴾ (مسلم۔ کتاب الجہاد والسیر۔ باب فتح مکۃ عن ابی ہریرہ)

آپ نے زندگی بھر میں دو تین شعر کہے جنہیں اگر شعر کے بجائے منظوم کلام کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ وہ دراصل نثر کے ٹکڑے ہوتے جو بے ساختہ منظوم بن جاتے تھے اور وہ یہ ہیں۔

۱۔ ۞ آپ کے اشعار:۔ سیدنا جندب بن عبداللہ بجلی فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ جہاد کے دوران آپ ﷺ کو ٹھوکر لگی جس سے آپ ﷺ کے پاؤں کی انگلی خون آلود ہو گئی اس وقت آپ ﷺ نے اس انگلی کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھا:

هَلْ أَنْتِ اِلَّا اِصْبَعٌ دَمِيْتِ …… وَ فِی سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا لَقِيْتِ

"تو ایک انگلی ہی تو ہے جو خون آلود ہو گئی۔ اگر تو اللہ کی راہ میں زخمی ہو گئی تو کیا ہوا" (بخاری کتاب الادب۔ باب مایجوز من الشعر)

۲۔ جنگ حنین میں ایک موقعہ ایسا آیا جب بہت سے صحابہ میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ اس وقت آپ ایک سفید خچر پر سوار بڑے جوش سے دشمن کی طرف بڑھ رہے تھے اور ساتھ ہی یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

اَنَا النَّبِیُّ لَاکَذِبْ ……… اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ

"اس میں کوئی جھوٹ نہیں کہ میں نبی ہوں۔ میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں" (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب قولہ تعالیٰ یوم حنین اذ أعجبتکم کثرتکم)

[۶۲] ۞ آپ کو شعر کیوں نہیں سکھایا گیا؟ ہم نے آپ ﷺ کی طبیعت شاعرانہ اس لئے نہیں بنائی کہ یہ قرآن کتاب ہدایت ہے۔ جس میں دنیا و آخرت کی زندگی کے ٹھوس حقائق مذکور ہیں۔ جبکہ شاعری نری طبع آزمائی اور خیالی تک بندیاں ہوتی ہیں تو جب قرآن کی شاعری سے کوئی نسبت نہیں تو حامل قرآن کی طبیعت قرآن کے مزاج کے موافق ہونی چاہئے۔ نہ کہ شاعر کے موافق۔

[۶۳] یعنی جس شخص کا ضمیر ابھی مردہ نہیں ہوا اور وہ ہدایت کا طالب ہے آپ اسے اس کے انجام سے آگاہ کریں۔ تاکہ ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں پر حجت پوری ہو سکے اور یہ کام تب ہی ممکن ہے کہ قرآن اور حامل قرآن کا مزاج شاعرانہ نہیں بلکہ حکیمانہ اور ناصحانہ ہو۔

[۶۴] مثلاً گائے، بیل، بھیڑ، بکری، اونٹ، گھوڑے، گدھے یہ سب قسم کے جانور الگ الگ انواع ہیں۔ اور سب انسان کے فائدے کے لئے اللہ نے بنائی ہیں ان کی نسل بھی ایسے ہی نطفہ سے چلتی ہے جیسے انسان کی چلتی ہے۔ اور نطفہ بے جان مادوں سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ چیزیں انسان کی مملوک نہیں تھیں۔ اللہ نے انسان کو عقل دی۔ عقل کے ذریعہ اس نے چوپایوں کو اپنے قابو میں کیا۔ پھر ان میں اپنے لئے فوائد دیکھے تو انہیں اپنے گھروں میں پالنا شروع کر دیا اور آپس میں ان کی خرید و فروخت شروع کر دی اور ان کے مالک بن بیٹھے۔

أَيْدِيْنَآ أَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿٧١﴾ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَأْكُلُوْنَ ﴿٧٢﴾ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ
وَمَشَارِبُ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٧٣﴾ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٧٤﴾ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ

ہم نے کیے اور اب یہ ان کے مالک ہیں۔(۷۱) اور ہم نے ان مویشیوں کو ان کا مطیع[۶۵] بنا دیا ہے کہ ان میں کسی پر تو سوار ہوتے ہیں اور کسی کا گوشت کھاتے ہیں(۷۲) نیز ان سے انہیں اور بھی کئی فوائد اور مشروب حاصل ہوتے ہیں کیا پھر بھی یہ شکر ادا[۶۶] نہیں کرتے۔(۷۳) اور انہوں نے اللہ کے علاوہ کئی الٰہ بنا رکھے ہیں (اس امید پر) کہ ان کی مدد کی جائے(۷۴) (حالانکہ) وہ ان کی کچھ مدد نہ کر سکیں گے بلکہ وہ ان کے لشکر (مخالف) کی حیثیت[۶۷] سے

[۶۵] مویشیوں سے حاصل ہونے والے فوائد:۔ انسان کی سرشت اللہ تعالیٰ نے یہ بنائی کہ اپنی عقل سے کام لے کر ہر قسم کے جانوروں کو اپنے قابو میں لائے اور چوپایوں کی سرشت یہ بنادی کہ انسان کے مطیع فرمان بن جائیں ورنہ ان چوپایوں میں اکثر ایسے ہیں جو انسان سے بہت زیادہ طاقتور ہیں۔ ایک گھوڑا انسان کو دولتی مار کر اسے موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے۔ ایک اونٹ انسان کی کھوپڑی میں اپنے دانت گاڑ کر اور ایک ہاتھی اسے اپنے پاؤں تلے مسل کر انسان کو فنا کر کے اس سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ مگر انسان پر اللہ تعالیٰ کی یہ خاص مہربانی ہے کہ اونٹوں کی ایک لمبی قطار کو ایک کم عمر بچہ نکیل پکڑ کر جدھر چاہے لے جا سکتا ہے۔ پھر وہ بے جان چیزوں کی طرح اپنے سے بہت عظیم الجثہ اور طاقتور جانداروں کو بھی مطیع بنا کر ان سے کئی طرح کے فوائد حاصل کرتا ہے۔ یہ چوپائے انسان کی سواری کے کام بھی آتے ہیں اور اس کی خوراک بھی بنتے ہیں۔ ان کے بالوں سے وہ لباس بھی تیار کرتا ہے۔ ان سے دودھ بھی حاصل کرتا ہے۔ جس سے دہی، مکھن، بالائی، گھی وغیرہ بنتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان چوپایوں کے مرنے یا ذبح ہونے کے بعد بھی ان کی کھالوں، ہڈیوں اور دانتوں کو اپنے کام میں لاتا ہے۔

[۶۶] یہ سب قسم کے احسانات تو انسان پر اللہ تعالیٰ نے کیے۔ اب بجائے اس کے کہ وہ اللہ کا شکر ادا کرتا اس نے انہیں جانوروں کی قربانیاں بتوں کے نام پر کیں اور استھانوں میں کیں۔ بتوں کے نام پر جانور آزاد چھوڑے۔ جن کا ان جانوروں کی پیدائش میں اور ان کو انسان کے مطیع فرمان بنانے میں کچھ بھی عمل دخل نہ تھا۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی کفران نعمت اور نمک حرامی ہو سکتی ہے؟

[۶۷] ۞ معبودانِ باطل کی دنیا اور آخرت میں بے بسی:۔ انسان نے جس چیز کی بھی عبادت کی ہے۔ یا فریاد کی ہے یا اس کے آگے نذریں نیازیں پیش کی ہیں تو اس لئے کہ وہ معبود ان کی مشکل دور کریں گے یا کوئی حاجت پوری کر دیں گے۔ یا اگر وہ روز آخرت پر بھی ایمان رکھتا ہے تو اس لئے کرتا ہے کہ وہ قیامت کو سفارش کر دیں گے یا عذاب سے بچا لیں گے اور ان سب باتوں میں مدد کا پہلو شامل ہے۔ اور مدد کے لفظ میں یہ سب باتیں آجاتی ہیں۔ اب اس مدد کے دو پہلو ہیں ایک دنیا میں، دوسرے آخرت میں۔ دنیا میں ان کی مدد کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے عابدوں کی مدد تو کیا کریں گے وہ تو اپنی بقاء اپنی حفاظت اور اپنی ضروریات کے لئے ان کے محتاج ہیں کہ وہ ان کے آستانوں میں اور قبروں پر جھاڑو دیں۔ ان کو چمکا کر رکھیں، روشنی کا انتظام کریں۔ اگر ان عابدوں کے یہ لشکر نہ ہوں تو ان کی خدائی ایک دن بھی نہیں چل سکتی۔ یہ خود ان کے حاضر باش غلام بنے ہوئے ہیں۔ ان کے آستانے اور بارگاہیں تعمیر کرتے اور سجاتے ہیں۔ ان کے لئے پروپیگنڈا کرتے ہیں تاکہ خلق خدا کو ان کا گرویدہ

وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۶﴾ اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا
خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۷﴾ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ

پیش کیے جائیں گے (۷۵) لہٰذا ان کی باتیں آپ کو غمزدہ نہ کریں۔ ہم یقیناً جانتے ہیں جو کچھ وہ چھپاتے [۶۸] ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔ (۷۶)

کیا انسان دیکھتا نہیں کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا ہے پھر وہ (حقائق سے اعراض کر کے) صریح [۶۹] جھگڑالو بن گیا۔ (۷۷) وہ ہمارے لئے تو مثال بیان کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے، کہتا ہے کہ "ہڈیاں جب بوسیدہ ہو چکی ہوں گی تو انہیں کون زندہ [۷۰] کرے گا؟" (۷۸)

بنائیں۔ یہ خود تو ان کی حمایت میں لڑتے اور جھگڑے ہیں۔ تب کہیں جا کر ان کی خدائی چلتی ہے۔ ان معبودوں کے عابدوں کا لشکر اگر ان کی یہ خدمات سرانجام نہ دیں تو ان کی خدائی ایک دن بھی نہ چلے۔ اور آخرت میں ان کی مدد کا یہ حال ہو گا کہ جب اللہ تعالیٰ ان عابدوں کو ان معبودوں کے ساتھ اپنے سامنے لا کھڑا کریں گے تو یہی معبود ان کے دشمن بن جائیں گے اور ایسے دلائل دیں گے کہ خود تو بچ جائیں مگر انہیں گرفتار کرا کے چھوڑیں گے۔ اس وقت ان عابدوں کو پتہ چل جائے گا کہ جن معبودوں کی حمایت میں وہ زندگی بھر لڑتے بھڑتے رہے وہ آج کس طرح انہیں آنکھیں دکھا رہے ہیں اور ڈٹ کر ان کے خلاف گواہی دے رہے ہیں۔

[۶۸] اگر یہ لوگ اپنے پروردگار اور منعم حقیقی کے معاملہ میں اس قدر ناانصاف اور ظالم واقع ہوئے ہیں تو آپ ﷺ کو بھی ان کے اس معاندانہ رویہ پر غمزدہ نہ ہونا چاہئے۔ یہ لوگ ظاہر تو یہ کرتے ہیں کہ آپ کاہن ہیں، دیوانہ ہیں، جادوگر ہیں، اللہ پر افترا باندھتے ہیں۔ اور دوسرے لوگوں کو یہ باتیں اس لئے کہتے ہیں کہ جیسے بھی بن پڑے اسلام کو اور آپ کو دبا سکیں۔ لیکن یہی لوگ اپنی نجی محفلوں میں اس بات کا اعتراف کرتے تھے اور پوری طرح سمجھتے تھے کہ جو الزامات یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لگا رہے ہیں وہ سراسر غلط اور بے بنیاد ہیں۔ لہٰذا آپ ﷺ کو پریشان اور غمزدہ نہ ہونا چاہئے۔ حق کے مقابلہ میں ان کا یہ جھوٹا پروپیگنڈہ زیادہ دیر نہ چل سکے گا۔

[۶۹] انسان کی حقیقت یہ ہے کہ وہ اس نطفہ سے پیدا کیا گیا ہے جو بے جان چیزوں سے بنا تھا۔ پھر اللہ نے اس میں روح پھونکی تو نہ صرف یہ کہ وہ دوسرے جانداروں کی طرح چلنے پھرنے، کھانے پینے اور پرورش پانے لگا بلکہ اس میں عقل و فہم، قوت استنباط، بحث و استدلال اور تقریر و خطابت کی وہ قابلیتیں پیدا ہو گئیں جو دوسرے کسی جاندار کو حاصل نہ تھیں۔ اور جب وہ اس منزل پر پہنچ گیا تو اپنے خالق کے بارے میں کئی طرح کی بحثیں اور جھگڑے اٹھا کھڑے کئے۔

[۷۰] یعنی وہ اپنے پروردگار کو عام مخلوق کی طرح عاجز سمجھتا ہے کہ جب انسان کسی مردے کو زندہ نہیں کر سکتا تو ہم بھی نہیں کر سکتے۔ وہ ایک بوسیدہ ہڈی کو دکھا کر اور اپنے ہاتھوں سے اسے مسل کر اور چورا چورا کر کے کہتا ہے کہ بتاؤ یہ زندہ ہو سکتی ہے؟ اس وقت اسے یہ بات یاد نہیں رہتی کہ جس نطفہ سے وہ خود پیدا ہوا ہے وہ بھی بے جان غذاؤں سے بنا تھا۔ اگر وہ اس بات پر غور کرتا تو کبھی ایسا اعتراض نہ کرتا۔

رَمِيْمٌ ﴿۷۸﴾ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُۨ ﴿۷۹﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ
الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ﴿۸۰﴾ اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓي اَنْ
يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ڲ بَلٰى ۤ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۱﴾ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۸۲﴾ فَسُبْحٰنَ

آپ اسے کہئے کہ: "اسے وہی زندہ کرے گا جس نے اسے پہلی بار پیدا کیا تھا اور وہ ہر قسم کا پیدا[۷۱] کرنا جانتا ہے (۷۹) وہی ہے جس نے تمہارے لئے سرسبز درخت سے آگ پیدا[۷۲] کر دی جس سے تم آگ سلگاتے ہو۔(۸۰) کیا وہ ذات جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا[۷۳] کیا اس بات پر قادر نہیں کہ وہ ان جیسوں کو پیدا کر سکے۔ کیوں نہیں۔ وہی تو سب کچھ پیدا کرنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔(۸۱)
اس کا کام تو صرف یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسے حکم دیتا ہے کہ "ہو جا" تو وہ ہو جاتی[۷۴] ہے۔(۸۲)

[۷۱] اللہ کی تخلیق کے مختلف طریقے:۔ یعنی ایک بیج سے تناور درخت بنا کھڑا کرنے کی سورت اور ہے۔ بے جان غذاؤں سے نطفہ اور نطفہ سے حیوانات اور انسان کو پیدا کر دکھانے کی صورت اور ہے۔ اور کسی مردہ انسان کے گلے سڑے اجزاء کو ملا کر اکٹھا کر کے ان کو زندہ کھڑا کر دینے کی صورت اور ہے۔ غرضیکہ کائنات میں تخلیق کئی صورتوں سے ہو رہی ہے اور اللہ چونکہ خود ہر چیز کا خالق ہے۔ لہٰذا وہ ان سب طریقوں اور صورتوں کو پوری طرح جانتا ہے اور انسان جو ان صورتوں میں کوئی ایک صورت بھی نہیں جانتا نہ جان سکتا ہے وہ اپنے خیال اور اپنی محدود عقل کے مطابق ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے۔

[۷۲] اللہ نے ہر مردہ میں زندہ اور زندہ میں مردے کی خاصیت رکھ دی ہے:۔ یعنی درخت کو پانی سے پیدا کیا۔ پھر آخر میں اسے ایندھن بنا کر اس سے آگ نکالی۔ درخت کا آغاز پانی سے ہوا اور انتہا آگ پر ہوئی اور یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی ضد بلکہ ایک لحاظ سے ایک دوسرے کی دشمن ہیں۔ آگ تھوڑی مقدار میں ہو تو پانی اس کا وجود ختم کر دیتا ہے۔ اور پانی کم مقدار میں ہو تو آگ اسے آبی بخارات میں تبدیل کر کے اسے ختم کر دیتی ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ ایک ہی چیز کے آغاز اور انجام میں متضاد صفات پیدا کر سکتے ہیں تو پھر ایک ہی چیز کو زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ کیوں نہیں بنا سکتے۔ یہ تو عام درختوں اور پودوں کا حال ہے۔ پھر کچھ درخت ایسے بھی ہیں جن کی ٹہنیاں رگڑنے سے اس طرح آگ پیدا ہو جاتی ہے جس طرح چقماق پتھر سے پیدا ہوتی ہے۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کی ٹہنیاں موم بتی کی طرح جلتی ہیں۔ کیونکہ ان میں روغن خاصی مقدار میں موجود ہوتا ہے۔ غرضیکہ ہر درخت اور پودا جو پانی سے پیدا ہوا ہے اس کے اندر بھی آتش گیری کی صفات رکھ دی گئی ہیں۔ بالکل اسی طرح ہر مردہ میں زندہ ہونے اور زندہ میں مرنے کی صفت بھی فطری طور پر رکھ دی گئی ہے۔

[۷۳] درختوں کے فائدے اور آگ کا حصول:۔ آسمانوں اور زمین جیسی عظیم مخلوق کو بھی دیکھ لو اور اپنے آپ پر بھی نظر ڈال کر دیکھ لو کہ ان کے مقابلہ میں تمہاری یا تم جیسوں کی کیا حیثیت اور حقیقت ہے؟ پھر جب اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے تو کیا تمہیں ہی وہ دوبارہ پیدا نہ کر سکے گا حالانکہ وہ تخلیق کے تمام طریقوں کو خوب جانتا ہے۔

[۷۴] اللہ کے کلمہ کن کہنے کا مفہوم:۔ کن یا "ہو جا" کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ کوئی چیز عدم سے وجود میں آجائے۔ ایسے امور میں بالعموم اللہ کا قانونِ تدریج کام کرتا ہے جیسا کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو چھ ایام (یا چھ ادوار) میں بنایا۔ اگرچہ اس

ع ٥

الَّذِیۡ بِیَدِہٖ مَلَکُوۡتُ کُلِّ شَیۡءٍ وَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۳﴾

پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ ہر [٧٥] چیز کی حکومت ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔(٨٣)

کی قدرت سے یہ بھی مستبعد نہیں کہ فوراً کسی چیز کو عدم سے وجود میں لے آئے۔ اور اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کو اللہ نے کسی کام اور جس مقصد کے لئے بنایا ہے وہ چیز فوراً وہ کام شروع کر دے۔ اس کے لئے صرف اللہ کے امر کی ضرورت ہے اور وہ کام اسی وقت ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اللہ کے اس امر کو ہم روح بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور اس کی مثال یوں سمجھو کہ جیسے کسی کارخانے میں بڑی بڑی دیو ہیکل برقی مشینیں نصب ہوتی ہیں۔ مگر وہ اس وقت تک بے حس و حرکت کھڑی رہتی ہیں جب تک ان میں برقی رو نہ گزاری جائے یا سوئچ آن نہ کیا جائے۔ سوئچ آن کرنے کی دیر ہوتی ہے کہ وہ فوراً متحرک ہو کر اپنا وہ کام کرنا شروع کر دیتی ہیں جس کام کے لئے بنائی گئی تھیں۔ بالکل یہی صورت اللہ تعالیٰ کے امر ''کن'' کی ہے ادھر اللہ نے ارادہ کیا ادھر وہ چیز بن گئی جو مطلوب تھی۔ مقصد یہ ہے کہ تمام انسانوں کی دوبارہ پیدائش بھی فقط اللہ کے ایک اشارے یا ارادے یا امر کن کی محتاج ہے۔ ادھر اللہ تعالیٰ ارادہ کرے گا تو فوراً تمام انسان زندہ ہو کر اللہ کے سامنے حاضر ہو جائیں گے اور انسانوں کے لئے یہ اضطراری امر ہوگا جس کے بغیر انہیں کوئی چارہ نہ ہوگا۔

[٧٥] ہر چیز پر حکومت و تسلط، ہر چیز پر تصرف و اختیار تو اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر یہ مشرکین اللہ کے اختیارات دوسروں میں بانٹ کر اللہ پر جو کئی طرح کے عیوب، کمی، نقص وغیرہ کا الزام لگاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات مشرکوں کی ایسی تمام بے ہودگیوں سے پاک ہے۔

۱۸۲ آیاتہا — سُوْرَۃُ الصّٰفّٰتِ مَکِّیَّۃٌ — رکوعہا ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ﴿١﴾ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ﴿٢﴾ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ﴿٣﴾ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ﴿٤﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ

کلمات ۸۷۳ آیت ۱۸۲ (۳۷) سورہ صافات مکی ہے (۵۶) رکوع ۵ حروف ۳۹۵۰

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

صف بستہ کھڑا ہونے والوں (فرشتوں) کی قسم (۱) پھر ان کی جو ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں (۲) پھر ان کی جو ذکر (قرآن) کی تلاوت کرنے والے[۱] ہیں (۳) بلاشبہ تمہارا الٰہ ایک ہی[۲] ہے (۴) جو آسمانوں اور زمین کا پروردگار

[۱] ❁ صفیں باندھے ہوئے فرشتے:۔ تمام مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس سورہ کی ابتدائی تین آیات میں جن کی قسم اٹھائی گئی ہے ان سے مراد فرشتے ہیں اور اس بات کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم لوگ اس طرح صف باندھا کرو جس طرح فرشتے بارگاہ الٰہی میں صف بستہ رہتے ہیں۔ تم لوگ سب سے پہلے اگلی صف پوری کیا کرو اور صف میں خوب مل کر کھڑے ہوا کرو“ (مسلم۔ کتاب الصلوٰۃ۔ باب الامر بالسکون فی الصلوٰۃ)

پہلی آیت میں ان فرشتوں کا ذکر ہے جو اللہ کے احکام کے منتظر اور اس کے دربار میں ہر وقت صف بستہ کھڑے رہتے ہیں اور یہی ان کی عبادت ہے کہ ادھر اللہ کا حکم ہو تو ادھر فوراً اسے بجا لائیں۔ دوسری آیت میں ان فرشتوں کا ذکر ہے جو تدبیر امور کائنات پر مامور ہیں اور ڈانٹ ڈپٹ اس لئے کرتے ہیں کہ جلد سے جلد اللہ کا حکم بجا لائیں۔ ڈانٹنے ڈپٹنے سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اسی دوسری قسم کے فرشتوں میں وہ گروہ بھی شامل ہے جو مجرموں اور نافرمانوں پر لعنت اور پھٹکار کرتے ہیں۔ اور انسانوں پر جو حوادث یا عذاب آتے ہیں انہی کے واسطہ سے آتے ہیں۔ اور تیسرے گروہ سے مراد وہ فرشتے ہیں جو خود بھی اللہ کے ذکر میں مشغول رہتے ہیں اور انسان کی روحانی غذا یا ہدایت کا واسطہ بھی بنتے ہیں۔ پیغمبروں پر اللہ کا حکم لاتے ہیں اور نیک لوگوں کے دلوں میں القاء و الہام کرتے ہیں۔

[۲] ❁ قرآن اللہ کا کلام اور کائنات اس کا فعل ہے ان دونوں میں تضاد ناممکن ہے:۔ ان تینوں قسم کے فرشتوں کی قسم اٹھا کر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”کہ تمہارا معبودِ حقیقی ایک ہی ہے“ یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ یہ کائنات اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور ذکر یا قرآن اللہ تعالیٰ کا قول یا کلام ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے قول اور فعل میں نہ اختلاف ہو سکتا ہے اور نہ تضاد۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کا کلام پڑھ کر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ معبودِ حقیقی صرف ایک ہی ہو سکتا ہے تو لامحالہ اس کائنات کے مربوط اور منظم نظام پر غور کرنے کے بعد بھی ہم اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں اور یہ دونوں چیزیں ایک دوسری کی تائید و توثیق کرتی ہیں اور ان میں پوری ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ نظامِ کائنات میں وہ کیا کیا قابلِ غور باتیں ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ معبودِ حقیقی یا پروردگار صرف ایک ہی ہو سکتا ہے، قرآن میں بے شمار مقامات پر مذکور ہیں جن میں سے چند باتوں کا ذکر آگے بھی آ رہا ہے۔

وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ۝ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ۨالْكَوَاكِبِ ۝ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ

ہے اور ان چیزوں کا بھی جو ان دونوں کے درمیان ہیں اور مشرقوں[۳] کا بھی پروردگار ہے(۵) بلاشبہ ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں کی زینت سے مزین[۴] کیا ہے۔(۶) اور اسے ہر سرکش شیطان سے محفوظ بنا دیا ہے(۷) وہ عالم بالا کی باتیں سن ہی نہیں سکتے اور ہر طرف سے ان پر (شہاب) پھینکے[۵] جاتے ہیں(۸) تاکہ وہ بھاگ کھڑے ہوں اور ان کے لئے پیہم عذاب ہے۔(۹)

[۳] مشارق و مغارب کتنے ہیں؟ مشارق سے مراد بے شمار مشرق ہیں۔ سورج ہمیشہ عین مشرقی سمت سے ہی طلوع نہیں ہوتا بلکہ گرمیوں میں اس کا مشرق شمال کی طرف سرکتا جاتا ہے اور سردیوں میں جنوب کی طرف۔ سورج کے مشرق کا زاویہ ہر روز جداگانہ ہوتا ہے اس لحاظ سے سورج کے سال بھر میں ۳۶۵ مشرق ہوئے۔ پھر اس کائنات میں صرف سورج ہی گردش نہیں کر رہا اور بھی ہزاروں سیارے محو گردش ہیں۔ اور ان کے اپنے اپنے مشرق یا طلوع ہونے کے مقامات ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے مشرقوں میں بھی سورج کے مشرقوں کی طرح تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس لحاظ سے مشرقوں کی تعداد ہمارے حساب سے باہر ہو جاتی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کے رب المشارق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام سیاروں کی نقل و حرکت کا وہی مالک ہے اور ان پر اسی کا کنٹرول ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ مشارق کا مالک ہے مغارب کا بھی ہے۔ مغارب کا یہاں تو ذکر نہیں تاہم سورہ معارج کی آیت نمبر ۴۰ میں مغارب کا بھی ذکر آ گیا ہے۔

[۴] آسمانوں کا وجود ایک ٹھوس حقیقت ہے:۔ نیلے آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے اس میں ہیرے اور زمرد جڑے ہوئے ہیں۔ اور اس خوشنما منظر کو دیکھنے سے ہی انسان راحت محسوس کرتا ہے۔

موجودہ دور کے ہیئت دان کسی آسمان کے قائل نہیں۔ ان کے خیال کے مطابق آسمان صرف حد نگاہ کا نام ہے۔ جبکہ کتاب و سنت میں صراحت سے مذکور ہے کہ آسمان ایک ٹھوس حقیقت ہے اور ان کی تعداد سات ہے۔ آج کے ماہرینِ فلکیات کئی ستاروں کا زمین سے لاکھوں اور کروڑوں میل کا فاصلہ بتاتے ہیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ ان ستاروں کی روشنی ذاتی نہیں ہوتی بلکہ انعکاس روشنی کے اصول کے تحت سورج کی روشنی سے ہی یہ منور اور روشن اور چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بلکہ ہمارے چاند کی روشنی بھی سورج کی روشنی ہی کی مرہونِ منت ہے۔ اب قرآن یہ کہتا ہے کہ ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں سے مزین کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان ماہرین کی تمام تر تحقیقات تاحال آسمان دنیا کے بھی نیچے ہیں۔ اور باقی آسمانوں کی تو اس کے بعد ہی باری آسکتی ہے۔ جو شاید انسان کی بساط سے باہر ہے۔

[۵] دورِ نبوی میں کہانت کا چرچا:۔ دورِ نبوی ﷺ میں عرب میں کہانت کا بڑا چرچا تھا اور کاہنوں کو معاشرہ میں ایک معزز مقام حاصل تھا۔ ان کے متعلق مشہور یہ تھا کہ جن اور شیطان کاہنوں کے قبضہ میں ہوتے ہیں جو انہیں غیب کی خبریں مہیا کرتے ہیں۔ اچھے بھلے لوگ ان کے ہاں آتے اور ان کی خدمات حاصل کرتے تھے حتیٰ کہ بعض دفعہ

وَاصِبٌ ﴿۹﴾ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴿۱۰﴾ فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴿۱۱﴾ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً

تاہم اگر کوئی شیطان کوئی بات لے اڑے تو ایک تیز شعلہ اس کا تعاقب[۶] کرتا ہے۔(۱۰)(اے نبی!) آپ ان سے پوچھئے کہ کیا ان کی پیدائش زیادہ مشکل ہے یا جو کچھ ہم پیدا کر چکے ہیں۔ ہم نے انہیں لیسدار[۷] گارے سے پیدا کیا ہے۔(۱۱) آپ کو تو (اللہ کی ایسی قدرتوں پر) تعجب[۸] ہے اور یہ لوگ ان کا مذاق اڑاتے ہیں(۱۲) اور جب سمجھایا جائے تو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔(۱۳) اور جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو تمسخر کرتے ہیں۔(۱۴)

اپنے مقدمات کے فیصلے کے لئے ان کے ہاں آتے تھے۔ ایسے ہی ایک کاہن کا واقعہ احادیث میں بھی مذکور ہے۔ قرآن جب نازل ہوا تو اس میں کچھ سابقہ انبیاء واقوام کے حالات تھے اور کچھ آئندہ کی خبریں بھی تھیں۔ پھر آپ ﷺ نے لوگوں کو یہ بھی بتایا تھا کہ آپ ﷺ کے پاس فرشتہ آتا ہے جو آپ ﷺ پر یہ کلام نازل کرتا ہے۔ ان ساری باتوں سے ان لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ شاید وہ دوسرے کاہنوں کی طرح آپ ﷺ کے پاس بھی کوئی جن یا شیطان آتا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ بیمار ہوئے تو دو تین راتیں تہجد کی نماز کے لیے اٹھ نہ سکے تو ابولہب کی بیوی آپ ﷺ کے پاس آکر کہنے لگی۔ میں سمجھتی ہوں کہ تیرے شیطان نے تجھے چھوڑ دیا ہے۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ تفسیر سورہ والضحیٰ) اور اسی وجہ سے وہ لوگ آپ ﷺ کو کاہن ہی سمجھتے تھے۔ اگلی دو آیات میں ان کے اسی غلط نظریہ کی تردید کی گئی ہے۔

[۶] ❁ **شہاب ثاقب:۔** اس آیت کی تفسیر کے لئے درج ذیل حدیث ملاحظہ فرمائیے:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: ”ایک دفعہ آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعتاً ایک ستارہ ٹوٹا اور روشنی ہو گئی۔ آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا: ”دورِ جاہلیت میں جب ایسا واقعہ ہوتا تو تم کیا کہتے تھے؟“ صحابہ کہنے لگے: ”ہم تو یہی کہتے تھے کہ کوئی بڑا آدمی مر گیا یا پیدا ہوا ہے“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ کسی کی زندگی یا موت کے سبب سے نہیں ٹوٹتا بلکہ ہمارا پروردگار کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو حاملانِ عرش تسبیح کرتے ہیں پھر آسمان والے فرشتے جو ان سے قریب ہوتے ہیں پھر ان سے قریب والے تسبیح کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ سبحان اللہ کی آواز ساتویں آسمان تک پہنچتی ہے پھر چھٹے آسمان والے ساتویں آسمان والوں سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے پروردگار نے کیا فرمایا۔ وہ انہیں خبر دیتے ہیں۔ اسی طرح نیچے آسمان والے اوپر کے آسمان والوں سے پوچھتے جاتے ہیں یہاں تک کہ یہ خبر دنیا کے آسمان تک پہنچتی ہے اور شیطان اچک کر سننا چاہتے ہیں تو ان کو مار پڑتی ہے اور وہ کچھ بات لا کر اپنے یاروں (کاہنوں وغیرہ) پر ڈال دیتے ہیں۔ وہ خبر تو سچ ہوتی ہے مگر وہ اسے بدلتے اور گھٹا بڑھا دیتے ہیں۔ (ترمذی۔ ابواب التفسیر)

نیز اس سلسلہ میں سورۂ حجر کی آیت نمبر ۱۸ کا حاشیہ نمبر ۹ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

[۷] ❁ **مٹی کی مختلف حالتیں جن سے آدم کا پتلا بنایا گیا' ڈارون کے نظریہ کا اِبطال:۔** مٹی کو جن سات مختلف

يَسْتَسْخِرُوْنَ ﴿١٤﴾ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٥﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿١٦﴾ اَوَاٰبَآؤُنَا

اور کہتے ہیں کہ: "یہ تو صریح جادو[۹] ہے(۱۵) بھلا جب ہم مر کر مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا پھر ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟(۱۶) اور کیا ہمارے آباء و اجداد بھی اٹھائے جائیں گے"!(۱۷)

حالتوں سے گزار کر انسان کو پیدا کیا گیا ان کی تفصیل یہ ہے (۱) تراب بمعنی خشک مٹی (۴۰: ۶۷) (۲) ارض بمعنی عام مٹی یا زمین (۷۱: ۱۷) (۳) طین بمعنی گیلی مٹی یا گارا (۶: ۲) (۴) طین لازب معنی لیسدار یا چپکدار مٹی (۳۷: ۱۱) (۵) حماٍ مسنون بمعنی بدبودار کیچڑ (۱۵: ۲۶) (۶) صلصال بمعنی ٹھیکرا یعنی حرارت سے پکائی ہوئی مٹی (۱۵: ۲۶) (۷) صلصال کالفخار بمعنی ٹن سے بجنے والی ٹھیکری (۵۵: ۱۴) یہ مٹی یا زمین کی مختلف شکلیں ہیں۔ کسی وقت مٹی میں پانی کی آمیزش کی گئی تو بعد میں حرارت کے ذریعہ پانی کو خشک کر دیا گیا۔ قرآن نے مختلف مقامات پر ان مختلف حالتوں میں سے کسی بھی ایک یا دو حالتوں کا ذکر کر دیا ہے۔ اور جس حالت کا بھی نام لیا جائے وہ سب درست ہے۔ اس بیان سے ڈارون کا نظریہ ارتقاء کا رد ہو جاتا ہے جس کی رو سے انسان نباتات اور حیوانات کی منزلوں سے گزر کر وجود میں آیا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے جو سات مختلف حالتیں بیان کی ہیں وہ سب کی سب جمادات یا مٹی میں ہی پوری ہو جاتی ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو مزید باتیں ارشاد فرمائیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ جو عظیم الجثہ اور محیر العقول مخلوقات پیدا کر چکا ہے اس کے مقابلہ میں انسان کی حیثیت ہی کیا ہے کہ اس کی تخلیق اس کے لئے کچھ مشکل ہو اور دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مٹی ہی کی سات مختلف حالتوں سے گزار کر پیدا کیا ہے۔ پھر وہ مر کر مٹی میں مل کر مٹی ہی بن جائے گا۔ تو کیا جس نے مٹی کی اتنی حالتوں سے گزار کر انسان کو پہلے پیدا کیا تھا اب دوبارہ مختلف حالتوں سے گزار کر پیدا نہ کر سکے گا؟ (ڈارون کے نظریہ ارتقاء کی تفصیل کے لئے دیکھئے ۱۵: ۲۹، حاشیہ ۱۹)

[۸] یعنی آپ ﷺ کو اللہ کے ایسے عظیم تخلیقی کارنامے سن کر تعجب ہوتا ہے مگر یہ لوگ نہایت بے فکری اور لاپروائی سے ایسی محیر العقول نشانیوں کا مذاق اڑا دیتے ہیں یا آپ کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کس قدر بے حس اور ناانصاف لوگ ہیں کہ اللہ کی ایسی واضح قدرتیں بھی ان پر کچھ اثر نہیں کرتیں۔

[۹] بلکہ عجیب باتیں تو یہ لوگ بناتے ہیں جو اللہ کی ان آیات کو کسی طلسماتی دنیا کی باتیں سمجھتے ہیں کہ جب ہم مر جائیں گے تو پھر دوبارہ جی اٹھیں گے۔ پھر ہم سب کے سب اللہ کی عدالت میں پیش ہوں گے پھر لوگوں کے اعمال کے فیصلے ہوں گے۔ پھر ایک طرف جہنم ہوگی جس کے یہ اور یہ اوصاف ہوں گے۔ اور ایک طرف جنت ہوگی جس کے یہ اور یہ اوصاف ہوں گے۔ ایسی باتیں کسی خیالی دنیا کے متعلق تو کی جا سکتی ہیں۔ بھلا ایک بھلا چنگا اور درست عقل والا آدمی ایسی باتیں کیسے کہہ سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس پر کسی نے جادو کر دیا ہے جو یہ یک لخت ایسی تصوراتی اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔

الْاَوَّلُوْنَ ﴿۱۷﴾ قُلْ نَعَمْ وَاَنْتُمْ دٰخِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا
هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۲۰﴾ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۱﴾ اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَ ع

آپ ان سے کہئے: ہاں [۱۰] (ایسا ضرور ہوگا) اور تم بالکل بے بس ہو گے۔(۱۸) وہ تو بس ایک ڈانٹ [۱۱] ہو گی جس پر وہ فوراً (سب کچھ) دیکھنے لگیں گے (۱۹) اور کہیں [۱۲] گے: "ہائے ہماری بدبختی! یہ تو جزا و سزا کا دن ہے" (۲۰) (پھر انہیں کہا جائے گا) یہی فیصلہ کا دن ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے (۲۱) ان ظالموں کو اور ان کے ہم جنسوں [۱۳] کو اور (معبودوں کو) سب کو اکٹھا کرو

[۱۰] ❁ انسان کی دوبارہ زندگی کیسے؟ کفار مکہ کے اس اعتراض اور انکار کو قرآن میں بہت سے مقامات پر ذکر کیا گیا ہے اور اس کا جواب بھی کئی طرح سے دیا گیا ہے اس مقام پر بھی مذکور ہے کہ انسان کی پیدائش مٹی سے ہوئی ہے۔ پھر وہ زندہ ہو کر مٹی یا زمین سے جدا نہیں ہوا بلکہ اس کی تمام تر ضروریات مٹی یا زمین ہی سے وابستہ ہیں۔ مر کر بھی وہ اس مٹی میں دفن ہو گا تو جب گل سڑ کر مٹی بن کر مٹی میں مل جائے گا تو زمین اس کے تحلیل شدہ اجزاء نکال کر باہر نہیں پھینک دے گی۔ بلکہ سنبھال کر اپنے اندر محفوظ رکھے گی پھر انہیں تحلیل شدہ اجزاء کو اللہ تعالیٰ پھر سے اکٹھا کر کے ان اجزاء کو اپنی پہلی حالت میں لے آئے گا۔ اس کی روح پہلے ہی مرتے وقت قبض کر لی تھی۔ اور یہی روح اس کا اصل تشخص ہے جو پہلے ہی اللہ کے قبضہ میں ہے۔ یہی روح اس کے جسم میں ڈال کر اسے پھر سے اٹھا کھڑا کیا جائے گا۔ رہی یہ بات کہ ان کے آباء و اجداد جو مدتوں پہلے مر چکے ان میں سے کوئی بھی زندہ ہو نہ ان کے پاس واپس آیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ زمین میں پڑا ہوا بیج پڑا ہی رہتا ہے۔ جب اس کے اگنے کا موقع آتا ہے۔ اگتا وہ اسی وقت ہے پہلے نہیں اگتا۔ اسی طرح جب تمہارے دوبارہ جی اٹھنے کا وقت یا موسم آئے گا اسی وقت تم بھی اور تمہارے آباء و اجداد بھی جی کر زمین سے نکل آؤ گے پہلے نہیں۔ اور دوسری بات یہ کہ دوبارہ زندہ ہو کر تمہارے پاس نہیں آئیں گے بلکہ تم بھی اور وہ بھی اللہ کے حضور حاضر ہو جاؤ گے۔

[۱۱] یعنی تمہارے دوبارہ جی اٹھنے کا موسم یا وقت وہ ہو گا جب دوسری بار صور پھونکا جائے گا۔ صور کی آواز بالکل ایک ڈانٹ کی طرح ہو گی۔ جیسے کوئی شخص سوئے ہوئے آدمی کو ڈانٹ کر کہتا ہے اب اٹھتے کیوں نہیں ہو اتنا دن چڑھ آیا ہے۔ تو وہ خواہ کیسی گہری نیند لے رہا ہو، بیدار ہو جاتا ہے۔ یہی تمہاری کیفیت ہو گی۔ اور تمہاری یہ کیفیت اختیاری نہیں بلکہ اضطراری ہو گی۔ یعنی جس طرح تمہاری پیدائش اور تمہاری موت میں تمہاری اپنی مرضی کا کوئی عمل دخل نہ تھا اسی طرح تم دوبارہ جی اٹھنے پر بھی مجبور اور بے بس ہو گے۔

[۱۲] یہ کہنے والے مجرم خود بھی ہو سکتے ہیں جو ایک دوسرے سے یوں ہم کلام ہوں گے۔ فرشتے بھی ہو سکتے ہیں اور اہل ایمان بھی۔ بلکہ اس دن ہر کوئی یہ پکار اٹھے گا کہ "یہی وہ انصاف کا دن ہے جسے اے مجرمو! تم جھٹلاتے ہی رہے"

[۱۳] ❁ زوج کے تینوں معانی اکٹھے مراد ہیں:۔ ازواج کا لفظ تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور اس مقام پر تینوں معنی دے رہا ہے۔ ایک معنی یہ ہے کہ مرد بیوی کا اور بیوی مرد کی زوج ہے۔ اس لحاظ سے معنی یہ ہو گا کہ فرشتوں کو حکم ہو گا کہ ظالموں اور ان کی بیویوں کو جو بغاوت میں ان کی شریک تھیں سب کو گھیر لاؤ۔ زوج کا دوسرا

كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿۲۲﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴿۲۳﴾ وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ ﴿۲۴﴾ مَا لَكُمْ
لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴿۲۵﴾ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ

جس کی یہ اللہ کے سوا عبادت کیا[۱۴] کرتے تھے۔(۲۲) پھر انہیں جہنم کی راہ پر چلا دو۔(۲۳)

اور (دیکھو) انہیں ذرا ٹھہرائے رکھو، ان سے کچھ پوچھا جائے گا(۲۴) ''تمہیں کیا ہو گیا (آج) تم ایک دوسرے کی مدد کیوں نہیں[۱۵] کرتے؟''(۲۵) بلکہ آج وہ بالکل مطیع و منقاد بن جائیں گے۔(۲۶) اور ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر باہم سوال کریں گے(۲۷) (کمزور لوگ بڑوں سے) کہیں گے: تم تو

معنی اس کے مماثل ہوتا ہے۔ جیسے ایک جوتا دوسرے کا زوج ہے۔ اس لحاظ سے معنی یہ ہو گا ظالموں کی جتنی اقسام ہیں ان سب کو گھیر کر لے آؤ۔ اور زوج کا تیسرا معنی اس کی ضد ہے جیسے رات دن کا زوج ہے اور دن رات کا، یا تاریکی روشنی کا زوج ہے۔ اور روشنی تاریکی کا۔ اس لحاظ سے معنی یہ ہو گا۔ معبودوں اور ان کے عبادت گزاروں سب کو گھیر گھار کر ہمارے سامنے لا حاضر کرو۔

[۱۴] معبودانِ باطل کی تین اقسام:۔ اللہ کے سوا معبودوں کی بڑی قسمیں دو ہیں۔ ایک غیر ذوی العقول، ان میں بت، ستارے، شجر و حجر اور حیوانات وغیرہ مثلاً گائے، بیل اور سانپ وغیرہ سب کچھ آ جاتا ہے۔ دوسرے ذوی العقول جیسے انبیاء، فرشتے، اولیاء اور بزرگ۔ پھر انسانوں اور جنوں میں سے کچھ ایسے معبود ہیں جو خود بھی چاہتے تھے کہ اللہ کے مقابلہ میں ان کی اطاعت کی جائے یا ان کی خدائی اور خدائی اختیارات تسلیم کیے جائیں۔ ان سب میں سے صرف فرشتے، انبیاء اور وہ بزرگ جہنم میں نہیں جائیں گے جو خود شرک سے منع کرتے رہے۔ باقی سب معبودوں کو اکٹھا کر کے جہنم میں پھینک دیا جائے گا اور اس کی وجہ پہلے کئی جگہ درج کی جا چکی ہیں۔

[۱۵] مطیع اور مطاع کا قیامت کے دن مکالمہ:۔ ایسے عابد اور معبود جنہیں جہنم میں داخل کر دینے کا حکم دیا جائے گا۔ فرشتوں کو حکم ہو گا کہ انہیں ذرا روک لو پہلے ان سے ایک بات تو پوچھ لیں۔ ان مجرموں میں ہر قسم کے عابد اور ہر قسم کے معبود ہوں گے۔ مشرکین اور ان کے معبودوں کا تو پہلے ذکر ہو چکا۔ ان میں چودھری اور رئیس بھی ہوں گے اور ان کے پیروکار بھی، سیاسی لیڈر بھی اور ان کی پارٹی کے لوگ بھی۔ خدائی کا دعویٰ کرنے والے اور خدائی کو منوانے والے بھی اور ماننے والے بھی۔ گوروجی اور ان کے چیلے چانٹے بھی، اعلیٰ حضرت بھی اور ان کی شفاعت پر بھروسہ کرنے والے مریدان باصفا بھی۔ اور یہ سب جوڑے اس دن ایک دوسرے سے بیزاری کا اظہار کر رہے ہوں گے۔ ان سے پوچھا جائے گا کہ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ آج تم ایک دوسرے سے بے تعلق کیوں ہو گئے ہو۔ اور وہ تمہاری شیخیاں اور تمہارے بلند بانگ دعوے کہاں گئے' دنیا میں جو تم نے آپس میں مل کر جتھے بنا رکھے تھے یا ایک دوسرے کی مدد کے دعوے کیا کرتے تھے۔ آج وہ تمہارے وعدے کہاں گئے انہیں پورا کیوں نہیں کرتے؟

تَأْتُونَنَا عَنِ الْيَمِينِ ﴿٢٨﴾ قَالُوا بَل لَّمْ تَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ﴿٢٩﴾ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُم مِّن سُلْطَانٍ ۖ بَلْ كُنتُمْ قَوْمًا
طَاغِينَ ﴿٣٠﴾ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَا ۖ إِنَّا لَذَائِقُونَ ﴿٣١﴾ فَأَغْوَيْنَاكُمْ إِنَّا كُنَّا غَاوِينَ ﴿٣٢﴾ فَإِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي
الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ﴿٣٣﴾ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ ﴿٣٤﴾ إِنَّهُمْ كَانُوا إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ

ہمارے پاس دائیں [۱۶] (اور بائیں) سے آتے تھے (۲۸) (بڑے لوگ) کہیں گے۔ (بات یوں نہیں) بلکہ تم خود ہی ایمان لانے والے نہیں تھے (۲۹) اور ہمارا تم پر کچھ زور [۱۷] بھی نہیں تھا بلکہ تم خود سرکش تھے۔ (۳۰) ہمارے پروردگار کا قول (آج) ہم پر صادق آگیا کہ ہم عذاب کا مزا چکھنے والے ہیں۔ (۳۱) ہم نے تمہیں گمراہ کیا کیونکہ ہم خود بھی گمراہ تھے۔ (۳۲) آج کے دن وہ سب (کمزور اور بڑے لوگ) عذاب میں برابر کے شریک ہوں گے (۳۳) واقعی ہم مجرموں سے ایسا ہی سلوک کیا کرتے ہیں۔ (۳۴) انہیں جب یہ کہا جاتا ہے کہ "اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں" تو وہ اکڑ [۱۸] بیٹھتے تھے۔ (۳۵)

[۱۶] ❁ لفظ یمین کے مختلف معنی اور ان سب کا اطلاق:۔ یمین کا لفظ بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً (۱) یمین بمعنی دایاں ہاتھ بھی اور دائیں طرف بھی اور (۲) اصحاب الیمین کے معنی دائیں ہاتھ یا دائیں جانب والے بھی اور اصحاب خیر و برکت بھی (مفردات القرآن) (۳) پھر جس طرح ید کا لفظ قوت اور قبضہ کے معنوں میں آتا ہے یمین اس سے بھی زیادہ وسیع معنوں میں آتا ہے۔ کیونکہ قوت اور کارکردگی کے لحاظ سے دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ سے افضل اور بہتر ہے۔ اور ملک یمین اس چیز کو کہتے ہیں جس پر پورا قبضہ اور اختیار ہو اور محاورۃ یہ لفظ لونڈی اور غلام کے معنوں میں آتا ہے۔ (۴) علاوہ ازیں اہل عرب کی عادت تھی کہ اپنے عہد و پیمان اور قسم کو مضبوط تر بنانے کے لئے اپنا ہاتھ مخاطب کے ہاتھ میں دیتے تھے یا مارتے تھے۔ لہٰذا یہ لفظ قسم کے معنوں میں بھی استعمال ہونے لگا یعنی ایسی قسم جو عہد و پیمان کو پختہ کرنے کے لیے اٹھائی جائے۔

اس آیت میں یمین کا لفظ تقریباً اپنے سب معانی کے لحاظ سے درست ہے۔ مثلاً کمزور یا پیروی کرنے والے لوگ اپنے بڑے بزرگوں سے کہیں گے کہ (۱) تم لوگوں نے ہم پر کچھ ایسا دباؤ ڈال رکھا تھا کہ ہم تمہاری باتیں ماننے پر مجبور ہو گئے تھے۔ یا (۲) تم لوگوں نے یہ پروپیگنڈا کر رکھا تھا کہ جو راہ ہم نے اختیار کر رکھی ہے وہی خیر و برکت کا راستہ ہے لہٰذا ہم تمہارے بھرّے میں آگئے یا (۳) تم لوگوں نے قسمیں کھا کھا کر ہمیں یقین دلایا تھا کہ ہم فی الواقع تمہارے خیر خواہ ہیں۔ اس طرح تم نے ہمیں بھٹکا کر اپنے ساتھ لگا لیا تھا اور ہم تمہاری اطاعت کرنے لگے تھے۔ اور ان سب مطالب کا خلاصہ یہی ہے کہ ہمیں اس انجام بد سے دو چار کرنے والے اور گمراہ کرنے والے تم ہی لوگ ہو۔

[۱۷] اس کے جواب میں ان کے قائد، لیڈر اور پیشوا حضرات یہ جواب دیں گے کہ تم خود مجرم ضمیر تھے تم نے اپنا فائدہ اسی میں دیکھا تھا کہ ہمارے ساتھ لگ جاؤ۔ ہم نے زبردستی تمہیں اپنی اطاعت پر مجبور نہیں کیا تھا نہ ہم میں کوئی ایسا زور اور طاقت تھی۔ آج تم خواہ مخواہ ہمیں مورد الزام ٹھہرا رہے ہو۔ لہٰذا جیسے مجرم ہم ہیں ویسے ہی تم بھی مجرم ہو۔ اگر ہم گمراہ تھے تو ایک گمراہ سے بجز گمراہی کی طرف بلانے کے اور کیا توقع ہو سکتی ہے ہم نے وہی کچھ کیا جو ہمارے حال کے مناسب تھا۔ مگر تمہیں اپنی عقل اور عاقبت اندیشی سے کام لینا چاہئے تھا۔ آج تو ہم سب کو اپنی غلط کاریوں کا مزہ چکھنا ہو گا۔

[۱۸] ❁ خوشحال لوگوں کے اکڑنے کی تین وجوہ:۔ ان کے تکبر کی کئی وجوہ تھیں، ایک یہ کہ جب انہیں یہ بتایا جاتا کہ اللہ کے

يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ﴿٣٦﴾ بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ

اور کہتے تھے: "کیا ہم ایک دیوانہ شاعر[۱۹] کی خاطر اپنے معبودوں کو چھوڑ سکتے ہیں؟" (۳۶) حالانکہ وہ (رسول) حق لے کر آیا اور اس نے رسولوں[۲۰] کی تصدیق کی تھی (۳۷)

سوا کوئی حاجت روا اور مشکل کشا نہیں تو تم اس میں اپنے بتوں اور معبودوں کی بھی توہین سمجھتے تھے، اپنی بھی اور اپنے آباء واجداد کی بھی لہٰذا وہ اکڑ بیٹھتے تھے دوسری یہ کہ مشرکانہ رسوم کے رواج سے جو کچھ دنیوی مفادات حاصل کر رہے تھے اس سے انہیں دستبردار ہونا پڑتا تھا لہٰذا وہ اکڑ بیٹھتے تھے، تیسری یہ کہ اگر وہ لا الہ الا اللہ کا دل سے اقرار کرتے تو انہیں اپنی چودھراہٹوں اور سرداریوں سے دستبردار ہو کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرنا پڑتا تھی۔ لہٰذا وہ اکڑ بیٹھتے تھے۔

[۱۹] ۞ شاعر اور نبی کا فرق:۔ تمام پیغمبروں کو اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو بھی شاعر اور مجنون کے القابات سے نوازا جاتا رہا ہے۔ شاعر کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ فصیح اور منظوم زبان میں اپنے تخیل کی بلندی اور نکتہ آفرینی یوں پیش کرتا ہے کہ اس سے سننے والے پر عارضی اور وقتی طور پر ایک وجدانی سی کیفیت آجاتی ہے۔ قرآن کریم گو بحر اور اوزان سے مبرا ہے لیکن دل میں اتر جانے کے لحاظ سے اس میں شعر سے بھی زیادہ تاثیر پائی جاتی ہے۔ اسی وجہ مماثلت کی بنا پر آپ کو شاعر بھی کہا جاتا رہا ہے۔ حالانکہ شاعر اور نبی میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ شاعر کے کلام میں جب تک جھوٹ، مبالغہ اور غلو شامل نہ ہو اس میں کچھ دلکشی پیدا نہیں ہوتی۔ جبکہ اللہ کا کلام ایسی تمام بے ہودگیوں سے پاک ہوتا ہے۔ شاعر کے تخیل کی پرواز کا میدان زندگی کا ہر اچھا یا برا پہلو ہوتا۔ ماحول کا تاثر اس کی طبیعت پر غالب رہتا ہے اور معاشرہ کی اکثریت چونکہ گمراہ ہوتی ہے لہٰذا اس کا تخیل بھی انہی راستوں پر پرواز کرتا ہے۔ جبکہ اللہ کے کلام کا بنیادی موضوع صرف ایک ہے اور وہ ہے انسان کو حکیمانہ اور ناصحانہ انداز میں ہدایت کی راہ دکھانا۔ مزید برآں شاعر کے قول اور فعل میں نمایاں تضاد ہوتا ہے جبکہ ایک پیغمبر جو کچھ کہتا ہے سب سے پہلے اس پر خود عمل کر کے دکھاتا ہے۔ پھر دوسروں کو دعوت دیتا ہے۔

۞ مجنون اور نبی کا فرق:۔ پیغمبروں کو کفار اور بالخصوص وہ لوگ جو آخرت اور جزا و سزا کے منکر ہوتے ہیں دیوانہ اس لحاظ سے کہتے ہیں کہ ان کے خیال میں مرنے کے بعد جی اٹھنا، اللہ کی عدالت میں پیش ہونا اور روز قیامت کے ہولناک مناظر اور جنت و دوزخ سب طلسماتی اور افسانوی قسم کی باتیں ہیں۔ لہٰذا وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے حواس ٹھکانے نہیں رہے۔ حالانکہ نبی ہر ایک کا ہمدرد، عہد کا پابند، پاکیزہ سیرت و کردار کا مالک ہوتا ہے۔ جبکہ دیوانوں کا نہ کوئی اخلاق ہوتا ہے نہ سیرت و کردار حتیٰ کہ وہ ساری ہی باتیں بہکی بہکی کرتے ہیں۔ اور لوگ ان کی دیوانہ وار حرکتوں سے خائف رہتے ہیں اور ان سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اور کافروں کی ناانصافی یہ ہوتی ہے کہ ان کے زعم کے مطابق محض ایک وجہ مماثلت کی بنا پر پیغمبروں کو شاعر اور مجنوں کہہ دیتے ہیں جبکہ بے شمار پہلوؤں میں وہ شاعروں اور دیوانوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ اور ان کے دل ان سب باتوں کی گواہی بھی دیتے ہیں۔ مگر صرف پیغمبروں سے مخالفت کی بنا پر انہیں ایسے ناموزوں القابات سے نوازتے ہیں اور ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ بھلا ہم ایسے شاعروں اور دیوانوں کے کہنے پر اپنے معبودوں کو چھوڑ سکتے ہیں۔

[۲۰] ۞ بُعد زمانی کے باوجود مماثلت نبی کی تعلیم کے برحق ہونے کا ثبوت ہے:۔ رسول جو کچھ کلام پیش کرتا ہے وہ نہ

الْمُرْسَلِينَ ﴿٣٧﴾ إِنَّكُمْ لَذَائِقُو الْعَذَابِ الْأَلِيمِ ﴿٣٨﴾ وَمَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٣٩﴾ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿٤٠﴾ أُولَٰئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ ﴿٤١﴾ فَوَاكِهُ ۖ وَهُم مُّكْرَمُونَ ﴿٤٢﴾ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٤٣﴾ عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ﴿٤٤﴾ يُطَافُ عَلَيْهِم بِكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ ﴿٤٥﴾ بَيْضَاءَ لَذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ ﴿٤٦﴾ لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا هُمْ

(پھر انہیں کہا جائے گا) آج تمہیں یقیناً دردناک عذاب چکھنا پڑے گا۔(۳۸)اور تمہیں ایسا ہی بدلہ دیا جائے گا جیسے تم کام کرتے رہے(۳۹) مگر اللہ کے مخلص بندے (اس انجام سے محفوظ رہیں گے)(۴۰) ان کے لئے ایسا رزق ہوگا جو انہیں معلوم[۲۱] ہے۔(۴۱) یعنی لذیذ[۲۲] میوے اور وہ وہاں معزز ہوں گے(۴۲) نعمتوں والے باغات میں،(۴۳) ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر[۲۳] بیٹھے ہوں گے(۴۴)ان کے لئے شراب خالص کے جام[۲۴] کا دور چلے گا(۴۵) جو نہایت شفاف اور پینے والوں کے لئے لذیذ ہوگا(۴۶) جس سے نہ انہیں سر درد[۲۵] ہوگا

طلسماتی باتیں ہیں اور نہ افسانے اور تمثیلی داستانیں ہیں بلکہ اس کی تعلیم ٹھوس حقائق پر مبنی ہے۔ نبی اپنے سے پہلے رسولوں کی بھی تصدیق کرتا ہے اور ان کی تعلیم کی بھی حالانکہ ان کے زمانہ میں سینکڑوں سال کی مدت حائل ہوتی ہے۔ اس بعد زمانی کے باوجود رسولوں کی تعلیم میں مماثلت ہی ان کی اور ان کی تعلیم کے حق ہونے کا بڑا قوی ثبوت ہے۔

[۲۱] ۞ جنت کے رزق کی خصوصیات:۔ یعنی وہ رزق جو کتاب و سنت میں جابجا مذکور ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ ہر قسم کے اور آپس میں ملتے جلتے پھلوں پر مشتمل ہوگا۔ جبکہ ان کا مزا بالکل ایک دوسرے سے جداگانہ ہوگا۔ نیز انہیں ہر وہ چیز مہیا کی جائیگی جس کی وہ خواہش کریں گے۔ اس رزق کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ باعزت طور پر دیا جائے گا۔ ایک یہ ہے کہ وہ کبھی ختم نہ ہوگا نہ اس کا سلسلہ منقطع ہوگا۔ ایک یہ کہ جو رزق انہیں دیا جائے گا اسے اس دنیا میں پوری طرح سمجھا بھی نہیں جاسکتا کیونکہ ویسی چیزیں نہ کسی نے دیکھی ہیں، نہ سنی ہیں اور نہ کسی کے حاشیہ خیال میں آسکتی ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ رزق صرف لذت حاصل کرنے کے لئے کھایا جائے گا۔ بھوک لگنے کی بنا پر نہیں کھایا جائے گا۔ یعنی اس لئے نہیں کہ محنت مشقت کی وجہ سے بدن کے کچھ اجزاء تحلیل ہو چکے ہیں تو ان کی تلافی کے لئے یا اپنی زندگی کی بقا کے لئے وہ رزق کھایا جائے۔

[۲۲] ۞ فواکہ کیسے پھل ہیں؟ یہاں فواکہ کا لفظ آیا ہے اور فواکہ ایسے پھلوں کو کہتے ہیں جن سے لذت و سرور حاصل ہو۔ (مقاییس اللغۃ) اور اس لفظ کا اطلاق عموماً خشک پھلوں پر ہوتا ہے۔ اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل جنت کو جو رزق دیا جائے گا وہ بطور غذا نہیں بلکہ لذت کے حصول کے لئے دیا جائے گا۔

[۲۳] آیت نمبر ۴۲، ۴۳، ۴۴ میں ﴿رزق کریم﴾ یعنی باعزت طور پر روزی ملنے کی ہی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

[۲۴] ۞ کأس کا لغوی مفہوم:۔ کَأْسٌ کا لفظ صرف شراب سے بھرے ہوئے پیالہ یا گلاس کے لئے مستعمل ہے، جسے ہماری زبان میں جام یا ساغر کہتے ہیں۔ دودھ یا پانی سے بھرے ہوئے پیالہ کو کَأْسٌ نہیں کہہ سکتے اور اگر یہ پیالہ خالی ہو اور شیشے کا ہو تو اسے قَدَحٌ کہتے ہیں، چمڑے کا ہو تو عَلْبَۃٌ اور مٹی کا ہو تو مُوْکِنٌ اور مَعِیْنٌ دراصل صاف شفاف نتھرے، خوش ذائقہ، میٹھے اور ٹھنڈے پانی کو کہتے ہیں۔ مگر جب معین کے ساتھ کأس کا لفظ آئے تو معین سے مراد یہی صفات رکھنے والی شراب ہوگی۔ کیونکہ کأس کا لفظ شراب کے بھرے ہوئے پیالہ کے لئے ہی مخصوص ہے۔

[۲۵] ۞ شراب کے تین نقصان اور ایک فائدہ:۔ دنیا میں جو شراب تیار کی جاتی ہے۔ وہ کچھ مخصوص پھلوں یا غلوں کو گلا سڑا

عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ﴿۴۸﴾ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿۴۹﴾ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ
يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۵۰﴾ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ﴿۵۱﴾ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ﴿۵۲﴾ ءَاِذَا

اور نہ وہ بدمست ہوں گے (۴۷) ان کے پاس نگاہیں نیچی رکھنے والی [۲۶] اور موٹی موٹی آنکھوں [۲۷] والی عورتیں ہوں گی۔ (۴۸) (ایسی نازک) جیسے انڈے کے چھلکے کے نیچے چھپی [۲۸] ہوئی جھلی۔ (۴۹) یہ لوگ بھی ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر سوال کریں گے (۵۰) ان میں سے ایک کہے گا: (دنیا میں) میرا ایک ہم نشین [۲۹] تھا (۵۱) جو مجھے کہا کرتا تھا: "کیا تم بھی تصدیق کرنے والوں میں شامل ہو گیا؟ (۵۲) بھلا

کر اور ان میں خمیر اٹھا کر بنائی جاتی ہے۔ اور ایسی شراب میں تین نقص ہوتے ہیں اور ایک فائدہ ہوتا ہے۔ نقص یہ ہیں کہ وہ پینے کے بعد کڑوی محسوس ہوتی ہے، دوسرا یہ کہ وہ سر کو چڑھ جاتا ہے جس سے بعض دفعہ سر چکرانے لگتا ہے اور تیسرا یہ کہ اسی وجہ سے انسان بہکی بہکی باتیں کرنے لگتا ہے۔ اور نشہ زیادہ چڑھ جائے تو کئی طرح کے غلط کام بھی کر بیٹھتا ہے۔ شراب کے ساتھ اول فول بکنا اور فحاشی کے کام عموماً لازم و ملزوم بن جاتے ہیں اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ پینے والے کو وقتی طور پر کچھ سرور حاصل ہوتا ہے۔ جنت میں اہل جنت کو جو شراب دی جائے گی وہ مندرجہ بالا تمام نقائص سے تو پاک ہوگی۔ مگر اپنی لطافت، پاکیزگی اور لذت کے لحاظ سے دنیا کی شرابوں سے بہت افضل ہوگی۔

[۲۶] ❁ قصر کا لغوی مفہوم: قَصَرَ کے معنی کسی چیز کی لمبائی یا اس کی انتہا کو نہ پہنچنا۔ نیز کم کرنا، چھوٹا کرنا، یا کوئی کام جتنا کرنا تھا اتنا نہ کرنا اور قصر الطرف یعنی جتنی دور نگاہ جا سکتی ہے اتنی دور تک نہ دیکھنا، یا نظر بھر کر نہ دیکھنا بلکہ صرف نیچے نظر رکھنا۔ اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کی اشیاء خورد و نوش کے بعد ان کی عائلی زندگی کا ذکر فرمایا کہ انہیں عورتیں ایسی دی جائیں گی جو اپنے خاوندوں کے سوا کسی کو دیکھنے کی بھی روادار نہ ہوں گی۔

[۲۷] عین بمعنی آنکھ اور عیناء اس عورت کو کہتے ہیں جس کی آنکھیں بڑی اور موٹی موٹی ہوں اور عیناء کی جمع عین آتی ہے۔ موٹی آنکھیں چہرے کی خوبصورت کو دوبالا کر دیتی ہیں۔ گویا اہل جنت کی عورتوں میں دوسری صفت یہ ہو گی کہ ان کی آنکھیں موٹی اور خوبصورت ہوں گی۔

[۲۸] ❁ بیض کی مختلف تعبیریں:۔ اس آیت کی کئی تعبیریں کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کی رنگت سفید ہوگی یعنی گورے رنگ کی ہوں گی اور جلد بالکل بے داغ ہوگی۔ دوسری یہ کہ یہاں انڈوں سے مراد شتر مرغ کے انڈے ہیں جو نہایت خوش رنگ ہوتے ہیں۔ اور اس تعبیر کی تائید اس آیت سے بھی ہو جاتی ہے ﴿كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ﴾ (۵۵:۵۸) (یعنی اہل جنت کی عورتیں یاقوت اور مرجان کی طرح ہوں گی) اور تیسری تعبیر وہ ہے جو ماثور ہے۔ چنانچہ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے جب اسی آیت کی تفسیر رسول اللہ ﷺ سے پوچھی تو آپ ﷺ نے فرمایا: کہ ان کی نرمی و نزاکت اس جھلی جیسی ہوگی جو انڈے کے چھلکے اور اس کے گودے کے درمیان ہوتی ہے (ابن جریر) اسی تعبیر کو معتبر سمجھ کر ترجمہ اس کے مطابق درج کیا گیا ہے۔ یہ اہل جنت کی عورتوں کی تیسری صفت ہوئی۔

مِتۡنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيۡنُوۡنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ هَلۡ اَنۡتُمۡ مُّطَّلِعُوۡنَ ﴿۵۴﴾ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ
فِىۡ سَوَآءِ الۡجَحِيۡمِ ﴿۵۵﴾ قَالَ تَاللّٰهِ اِنۡ كِدۡتَّ لَتُرۡدِيۡنِ ﴿۵۶﴾ وَلَوۡلَا نِعۡمَةُ رَبِّىۡ لَـكُنۡتُ مِنَ
الۡمُحۡضَرِيۡنَ ﴿۵۷﴾ اَفَمَا نَحۡنُ بِمَيِّتِيۡنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّا مَوۡتَتَنَا الۡاُوۡلٰى وَمَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِيۡنَ ﴿۵۹﴾ اِنَّ

جب ہم مر کر مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا ہمیں سزا و جزا بھگتنا[۳۰] پڑے گی؟" (۵۳) پھر کہے[۳۱] گا: "کیا تم اس کا حال معلوم کرنا چاہتے ہو؟" (۵۴)

پھر جب وہ جھانکے[۳۲] گا تو اسے جہنم کے عین درمیان دیکھے گا (۵۵) اور کہے گا: اللہ کی قسم! تم مجھے ہلاک کر کے ہی چھوڑتے (۵۶) اور اگر مجھ پر میرے اللہ کا احسان نہ ہوتا تو میں بھی (مجرموں کی طرح) حاضر کیے ہوئے لوگوں[۳۳] میں شامل ہوتا۔ (۵۷) (پھر وہ خوشی سے اپنے دل میں کہے گا) کیا اب تو ہمیں موت نہیں آئے گی؟ (۵۸) ہمیں پہلی بار ہی مرنا تھا (جو مر چکے) اور اب ہمیں عذاب بھی نہیں ہوگا (۵۹) یقیناً

[۲۹] قرین ایسے ساتھی یا دوست کو کہتے ہیں جو اپنا ہم عمر ہو یا بہادری، قوت اور اسی طرح کے دیگر اوصاف میں ہمسر ہو اور اس لفظ کا استعمال عموماً برے معنوں میں ہوتا ہے۔

[۳۰] یعنی کیا تمہاری بھی ایسی مت ماری گئی ہے کہ تم اس قسم کے بعید از عقل باتوں کو تسلیم کرنے لگے ہو۔

[۳۱] یہ جملہ اللہ تعالیٰ کا کلام بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ جب اہل جنت آپس میں محوِ گفتگو ہوں گے اور ان میں سے ایک اپنے دنیادار ساتھی کی سرگزشت سنائے گا تو اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا: کیا تم اس کے حالات معلوم کرنا چاہتے ہو؟ اور سرگزشت بیان کرنے والے کا اپنا کلام بھی ہو سکتا ہے اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آؤ ذرا اس کا حال تو معلوم کریں۔

[۳۲] ❁ عالمِ آخرت میں سمعی اور بصری قوتوں میں بے پناہ اضافہ:۔ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عالم آخرت میں جو سمعی و بصری قوتیں عطا کی جائیں گی وہ اس دنیا کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوں گی۔ ہم اس دنیا میں بھی ہزاروں میل دور بیٹھے آدمیوں کی آوازیں سنتے اور انہیں دیکھتے ہیں۔ مگر صرف ان لوگوں کی جو ٹیلیویژن سنٹر میں ہوتے ہیں اور براڈ کاسٹ کرتے ہیں۔ عالمِ آخرت میں ہر شخص دوسرے سے گفتگو کر سکے گا اور اسے دیکھ بھی سکے گا۔ خواہ یہ فاصلہ ہزاروں بلکہ لاکھوں میل کا ہو۔ اور کسی آلہ کے واسطہ کے بغیر سن اور دیکھ سکے گا۔

[۳۳] سرگزشت بیان کرنے والا جب دوزخ کی طرف جھانکے گا تو اسے اس کا ساتھی دوزخ کے عین وسط میں پڑا دکھائی دے گا۔ اس وقت وہ اس سے کہے گا: ارے کم بخت! اگر میں تیری باتوں میں آجاتا تو تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے ڈوبتا اور میرا بھی وہی حشر ہوتا جو تمہارا ہو رہا ہے۔ یہ تو مجھ پر اللہ کی خاص مہربانی ہوئی جو میں تیرے بہکاوے میں نہ آیا اور اس عذاب سے بچ گیا ورنہ تو نے تو مجھے گمراہ کرنے میں کسر نہ چھوڑی تھی۔

هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٦٠﴾ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴿٦١﴾ اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ﴿٦٢﴾
اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ﴿٦٣﴾ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ﴿٦٤﴾ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ

یہ بہت بڑی کامیابی[۳۴] ہے(۶۰) ایسی ہی کامیابی کے لئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنے چاہئیں۔(۶۱)
(بتاؤ) ایسی مہمانی[۳۶] اچھی ہے یا تھوہر کے درخت[۳۷] کی؟(۶۲) جسے ہم نے ظالموں کیلئے ایک آزمائش بنادیا(۶۳) وہ
ایسا درخت ہے جو جہنم کی تہ[۳۸] سے نکلتا ہے۔(۶۴) اس کے شگوفے ایسے ہیں جیسے شیطانوں[۳۹] کے سر(۶۵)

[۳۴] یہ باتیں وہ اللہ تعالیٰ کے احسان کے شکر کے طور پر اپنے آپ سے کہے گا اور سنا دراصل اپنے دنیادار ساتھی کو رہا ہوگا۔ تاکہ اس کی کوفت اور جلن میں مزید اضافہ ہو۔ یعنی عالمِ آخرت میں موت نہیں آئے گی۔ اہلِ جنت کے لئے یہی خبر انتہائی خوش کن ہوگی۔ جبکہ اہلِ دوزخ کے لئے یہی خبر انتہائی تکلیف دہ ہوگی۔

[۳۵] ❁ افضل اعمال کونسے ہیں؟ درج ذیل دو احادیث میں ان اعمال کا ذکر ہے جنہیں رسول اللہ ﷺ نے افضل الاعمال بتایا ہے:

۱۔ سیدنا ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ صحابہ نے آپ ﷺ سے پوچھا: "کون سا عمل افضل ہے؟" فرمایا: "اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا" صحابہ نے پوچھا: "پھر کونسا؟" فرمایا: "اللہ کی راہ میں جہاد کرنا" پھر پوچھا: "اس کے بعد کون سا؟" فرمایا: "حج مبرور" (بخاری۔ کتاب الایمان۔ باب من قال ان الایمان هو العمل)

۲۔ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے آپ سے پوچھا: "اللہ تعالیٰ کو کون سا کام سب سے زیادہ پسند ہے؟" فرمایا: "نماز کو اپنے وقت پر ادا کرنا" میں نے پوچھا "پھر کون سا کام؟" فرمایا: "ماں باپ سے اچھا سلوک کرنا" میں نے پوچھا: "پھر کون سا؟" فرمایا: "اللہ کی راہ میں جہاد کرنا" آپ ﷺ نے یہ تین باتیں بیان کیں اگر میں اور پوچھتا تو آپ اور زیادہ بیان فرماتے" (بخاری۔ کتاب مواقیت الصلوٰۃ۔ باب فضل الصلوة لوقتها)

[۳۶] ایسی مہمانی سے مراد اہل جنت کی مہمانی ہے۔ جیسا کہ سابقہ آیات میں ان کی لذیذ خوراک، صاف اور پاکیزہ مشروب اور نہایت خوبصورت عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے اور کفار مکہ سے پوچھا یہ جارہا ہے کہ آیا اہل جنت کی ایسی مہمانی بہتر ہے یا اہل دوزخ کی جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

[۳۷] اہل جنت کی خوراک لذیذ پھل تھے اور اہل دوزخ کی خوراک تھوہر کا درخت ہوگا، جس کے پتے چوڑے اور خاردار ہوتے ہیں۔ بوناگوار اور ذائقہ کڑوا ہوتا ہے۔ اور اس میں سے جو سفید قسم کا سیال مادہ یا دودھ نکلتا ہے وہ اگر انسان کے جسم پر لگ جائے تو ورم ہو جاتا ہے۔

[۳۸] ❁ اللہ کی محیر العقول مخلوق:۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو کافروں نے خوب مذاق اڑایا کہ بھلا آگ میں درخت کیسے پیدا ہو سکتا یا برقرار رہ سکتا ہے۔ اور یہ اعتراض محض ان کی کم عقلی اور کم عملی کی بنا پر تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی صورتیں بعض دفعہ بڑی نرالی اور حیران کن ہوتی ہیں۔ مثلاً جس فصل کے اوپر سے پانی گزر جائے۔ خواہ وہ پانی سیلاب کا ہو اور زیادہ بارش کا وہ فصل برباد ہو جاتی ہے۔ پودوں اور درختوں کا بھی یہی حال ہے مگر سمندر کی تہہ میں درخت اگتے ہیں۔ پھر ایسی جمادات بھی ہیں جو درختوں کی طرح پھلتی پھولتی ہیں۔ اور ان کی نشوونما پانی میں ہوتی ہے۔ جیسے مرجان۔ اور یہاں تو آگ میں صرف تھوہر کا درخت یعنی نباتات اگنے کا ذکر ہے۔ جبکہ آگ میں جاندار بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ جیسے آگ کا کیڑا سمندر جو آگ میں ہی زندہ رہ سکتا ہے۔

[۳۹] ❁ شیطان کے مختلف مفہوم:۔ شیطان دراصل ہر بد روح کو کہتے ہیں جو اپنی سرکشی اور نافرمانی کی بنا پر حق سے دور

الشَّيٰطِيْنِ ﴿۶۵﴾ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۶۶﴾ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ
حَمِيْمٍ ﴿۶۷﴾ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ﴿۶۸﴾ اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ ﴿۶۹﴾ فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ
يُهْرَعُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۷۱﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿۷۲﴾

(اہل دوزخ) اسی کو کھائیں گے اور اس سے اپنے پیٹ بھریں گے (۶۶) پھر اس پر انہیں پینے کو پیپ[۴۰] ملا کھولتا ہوا پانی ملے گا (۶۷) پھر انہیں دوزخ[۴۱] کی طرف لوٹنا ہوگا (۶۸) انہوں نے اپنے آباء واجداد کو گمراہ ہی پایا (۶۹) تو انہیں کے نقش قدم[۴۲] پر دوڑنے لگے (۷۰) حالانکہ ان سے پہلے بہت سے گزشتہ لوگ گمراہ ہو چکے تھے۔ (۷۱) بلاشبہ ہم نے ان میں ڈرانے والے بھیجے تھے۔ (۷۲)

ہو چکا ہو۔ اور جنوں میں سے جو خبیث، موذی اور بدکردار قسم کے جن ہوں انہیں ہی شیطان کہا جاتا ہے۔ پھر اس کا اطلاق ہر ایسی صفات رکھنے والی چیز پر ہونے لگا۔ خواہ وہ جن ہو یا انسان ہو یا کوئی جانور ہو۔ اور سانپ کو اس کی ایذا ہی کی وجہ سے شیطان کہتے ہیں۔ (منجد) اور اس معنی کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ جب تم گھر میں کوئی سانپ دیکھو تو اسے مارنے سے پہلے یہ کہہ دو کہ اگر وہ کوئی جن یا شیطان ہے تو چلا جائے۔ اگر پھر بھی نہ جائے تو اسے مار ڈالو۔ (مسلم۔ باب قتل الحیات، بخاری۔ کتاب بدء الخلق۔ باب قول اللہ تعالیٰ و بث فیھا من کل دابۃ)

گویا اس آیت میں شیطان کے سر سے مراد سانپوں کے سر یا ناگ پھن ہیں۔ اور اس پودے کے شگوفے ایسے ہی ہوں گے اور یہ بھی ممکن ہے یہ تشبیہ محض بدصورتی کی بنا پر ہو جیسے ہم اپنی زبان میں بعض ان دیکھی چیزوں سے تشبیہ دے دیتے ہیں۔ جیسے وہ عورت ایسی خوبصورت ہے جیسے پری یا وہ ایسی بدصورت ہے جیسے چڑیل یا بھتنی یا ڈائن۔ حالانکہ پری، چڑیل، بھتنی یا ڈائن کو کسی نے بھی دیکھا نہیں ہوتا۔

[۴۰] یہ تو تھی دوزخیوں کی خوراک اور مشروبات کا یہ حال ہوگا کہ زخموں کا دھوون جس میں پیپ اور لہو سب کچھ شامل ہوتا ہے وہ پینے کو ملے گا اور اس میں گرم کھولتا ہوا پانی بھی شامل کر لیا جائے گا۔

[۴۱] اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دوزخی جب بھوک سے بے تاب ہو جائیں گے تو انہیں جہنم کے اس علاقہ کی طرف لے جایا جائے گا جہاں بہت سے تھوہر کے درخت اگے ہوئے ہوں گے۔ وہ بھوک کے مارے اسے کھانے کی کوشش کریں گے تو وہ حلق میں پھنس جائے گا۔ جس پر انہیں پانی کی طلب ہوگی تو پیپ ملا کھولتا پانی پینے کو دیا جائے گا اس طرح ان کی بھوک کا علاج کیا جاوے گا اس مہمانی کے بعد انہیں پھر ان کے اصل ٹھکانوں تک لے جایا جائے گا۔

[۴۲] ❁ تقلید آباء کی مذمت:۔ انہوں نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا ہی نہ کی کہ جو کچھ ان کے آباء واجداد کرتے آرہے ہیں۔ وہ درست ہے یا غلط ہے۔ جس راہ پر انہیں چلتے دیکھا اسی پر دوڑنے لگے، کنواں کھائی کچھ نہ دیکھا اور اگر ان کے پاس رسول آئے تو انہیں بھی جھٹلا دیا۔ اور اپنی آبائی رسوم کی حمایت میں رسولوں کی مخالفت پر اتر آئے حالانکہ اگر وہ سابقہ اقوام کی روش سے اور ان کے انجام سے کچھ سبق حاصل کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۷۴﴾ وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ﴿۷۷﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۷۸﴾ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۹﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّهٗ

پھر دیکھ لو، جنہیں ڈرایا گیا تھا ان کا انجام کیا ہوا۔(۷۳) (ان میں سے) صرف اللہ کے مخلص بندے ہی محفوظ رہے۔(۷۴) اور ہمیں نوح نے پکارا[۴۳] تو (دیکھو) ہم کیا خوب[۴۴] دعا قبول کرنے والے ہیں(۷۵) اور انہیں اور ان کے گھر والوں کو شدید بے چینی سے نجات دی۔(۷۶)

اور صرف انہی[۴۵] کی اولاد کو باقی رکھا(۷۷) اور بعد میں آنے والی نسلوں میں ان کا ذکر خیر[۴۶] چھوڑ دیا۔(۷۸) ساری دنیا میں نوح پر سلام ہو(۷۹) ہم نیکی کرنے والوں کو ایسے ہی صلہ دیا کرتے ہیں(۸۰) بلاشبہ وہ

[۴۳] ❁ نوح علیہ السلام کی بددعا اور اس کی قبولیت:۔ سیدنا نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال اپنی قوم سے سر کھپایا۔ ان کو دلائل سے سمجھایا اور مختلف پیرایوں میں سمجھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مگر ان لوگوں نے ان کی ایک نہ مانی۔ الٹا ان کا مذاق اڑاتے اور ایذائیں پہنچاتے رہے۔ اس طویل عرصہ میں معدودے چند آدمی آپ پر ایمان لائے۔ پھر جب آپ اپنی قوم سے قطعی طور پر مایوس ہو گئے کہ اب باقی لوگوں میں سے کوئی بھی ایمان لانے والا نظر نہیں آتا اور سب میرے اور میرے ساتھیوں کے درپے آزار ہیں تو اس وقت آپ علیہ السلام نے اللہ کے حضور فریاد کی کہ یا اللہ! مجھے ان لوگوں نے دبا لیا ہے اب تو ہی ان سے بدلہ لے اور مجھے ان ظالموں سے نجات دے۔

[۴۴] یعنی ہم نے سیدنا نوح علیہ السلام کی فریاد سنی تو ان کی فریاد رسی کر دی۔ ان کی مصیبت کا ازالہ کر دیا، انہیں ظالموں سے نجات دے دی۔ کیونکہ یہ بات ہمارے ذمہ ہے کہ حق و باطل کے معرکہ میں ہم ایمانداروں کی فریاد رسی کیا کرتے ہیں۔ اور انہیں ظالموں سے بچا لیتے ہیں۔

[۴۵] ❁ کیا نوح آدم ثانی ہیں؟ یہاں صرف اتنا ہی مذکور ہے کہ طوفان نوح علیہ السلام کے بعد نسل انسانی صرف نوح کے تین بیٹوں (حام۔ سام اور یافث) سے چلی (اور چوتھا بیٹا یام کافر تھا جو طوفان میں غرق ہو گیا تھا) اور اس کی تائید ترمذی کی درج ذیل حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ سیدنا سمرہ سے روایت ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ نوح کے تین بیٹے تھے۔ حام' سام' یافث' حام حبش کا باپ' سام عرب کا اور یافث روم کا (ترمذی۔ ابواب التفسیر) مگر بعض دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ طوفان نوح کے بعد نسل سیدنا نوح علیہ السلام کی اولاد اور ان لوگوں کی اولاد سے چلی تھی جو کشتی میں آپ کے ساتھ سوار تھے۔ (سورۂ بنی اسرائیل آیت نمبر ۳) اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت میں اجمال اور دوسری میں تفصیل ہے۔

[۴۶] یعنی رہتی دنیا تک سیدنا نوح علیہ السلام کا نام بھلائی سے لیا جاتا رہے گا۔ چنانچہ اس وقت دنیا میں جتنی بھی قومیں آباد ہیں۔ سب اپنا سلسلہ نسب سیدنا نوح علیہ السلام سے ملاتی اور اس میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ نیز اکثر اقوام انہیں اپنا مذہبی قائد تسلیم کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ ایران کے مجوسی اور صابی بھی انہیں اپنا نبی تسلیم کرتے ہیں۔

مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۱﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۸۲﴾ وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ﴿۸۳﴾ اِذْ جَآءَ

رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۴﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۸۵﴾ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ﴿۸۶﴾

فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ ﴿۸۸﴾ فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴿۸۹﴾ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ﴿۹۰﴾

وقف لازم

ہمارے ایماندار بندوں سے تھے۔(۸۱) پھر ہم نے باقی لوگوں کو غرق کر دیا۔(۸۲) اور اسی (نوح) کے پیروؤں [۴۷] میں سے ابراہیم بھی تھے (۸۳) جبکہ وہ اپنے پروردگار کے ہاں صاف [۴۸] دل لے کر آئے (۸۴) جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے پوچھا: ”تم کن چیزوں کی عبادت کرتے ہو؟ (۸۵) کیا تم اللہ کو چھوڑ کر جھوٹ موٹ گھڑے ہوئے الٰہ چاہتے ہو؟ (۸۶) پھر تمہارا پروردگار عالم کی نسبت کیا [۴۹] خیال ہے؟ (۸۷) پھر (ایک دفعہ) انہوں نے ستاروں میں نظر ڈالی۔(۸۸) تو کہا کہ میری طبیعت کچھ خراب ہے (۸۹) چنانچہ وہ لوگ انہیں پیچھے [۵۰] چھوڑ کر چلے گئے (۹۰)

[۴۷] ❁ شیعہ کا لغوی مفہوم:۔ یہاں لفظ شیعہ استعمال ہوا ہے۔ شیعہ ایسے فرقہ یا پارٹی کو کہتے ہیں جن کے عقائد آپس میں ملتے جلتے ہوں مگر دوسروں سے مختلف ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ توحید اور معاد کے بارے میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بھی وہی عقائد تھے جو سیدنا نوح علیہ السلام کے تھے۔ اور یہ تو واضح سی بات ہے کہ تمام انبیاء کی اصولی تعلیم ایک ہی جیسی رہی ہے۔ اور اسی اصولی تعلیم کا نام دین ہے۔

[۴۸] یعنی اپنے معاشرہ، اپنے ماحول، اپنے گھر والوں سب قسم کے لوگوں کے عقائد و رسومات سے بالکل خالی الذہن ہو کر اپنے آپ کو اپنے پروردگار کے حوالے کر دیا کہ جو کچھ تیری طرف سے ہدایت یا حکم ملے میں اسے بلا چوں و چرا تسلیم کروں گا اور سر تسلیم خم کر دوں گا۔

[۴۹] ❁ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ستارہ پرست قوم:۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا اصل وطن عراق کا شہر بابل تھا۔ یہ لوگ ستارہ پرست تھے۔ اور بالخصوص سات مشہور سیاروں سورج، چاند، زہرہ، عطارد، مشتری، مریخ اور زحل کی چال سے خوب واقف تھے۔ علاوہ ازیں یہ لوگ ان سیاروں کے انسانی زندگی پر اثرات کے بھی سختی سے قائل تھے۔ انہیں سیاروں کے الگ الگ مندر تعمیر کر رکھے تھے۔، جن میں ان سیاروں کے خیالی مجسمے یا بت رکھے جاتے تھے۔ وہ خود ہی زائچے تیار کرتے اور اس کے مطابق ان سیاروں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ان کے مجسموں کے سامنے نذریں نیازیں پیش کی جاتی تھیں۔ انہیں زائچوں کے ذریعہ وہ آئندہ سے متعلق اپنی اپنی قسمت کا حال معلوم کرتے تھے۔۔ ان کے ستاروں کے اثرات پر اعتقاد کا یہ حال تھا کہ ان میں ہر شخص زائچہ تیار کرنے کے بغیر بھی سیاروں کی چال پر غور کر کے اپنا پروگرام بناتا تھا۔ اس قدر مشرک تھی یہ قوم جس میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ انہوں نے جب بالکل خالی الذہن ہو کر اور یکسو ہو کر اپنے آپ کو اپنے پروردگار کے حوالہ کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت عطا فرمائی۔ اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اپنی مکمل فرمانروائی اور ان سیاروں اور ان کے مجسموں کے بالکل بے اختیار اور مجبور محض ہونے کی حقیقت واضح کر دی۔

❁ دعوت توحید کا آغاز اپنے باپ سے:۔ چنانچہ آپ علیہ السلام نے توحید کی دعوت کا آغاز اپنے گھر سے کیا۔ سب سے پہلے باپ کو

فَرَاغَ اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۹۱﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ ﴿۹۳﴾

فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ﴿۹۴﴾ قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴿۹۵﴾ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ قَالُوا ابْنُوْا

تو ابراہیم چپکے سے ان کے معبودوں کی طرف جا گھسے اور کہنے لگے: تم کھاتے کیوں نہیں؟(۹۱) تمہیں کیا ہو گیا، تم تو بولتے بھی نہیں(۹۲) پھر ان پر پل پڑے اور دائیں ہاتھ سے خوب ضربیں[۵۱] لگائیں(۹۳) (واپس آکر انہوں نے جو یہ صورت حال دیکھی) تو دوڑتے ہوئے ابراہیم کے پاس آئے(۹۴) انہوں نے کہا: کیا تم ایسی چیزوں کو پوجتے ہو جنہیں تم خود ہی تراشتے ہو(۹۵) حالانکہ اللہ ہی نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور ان چیزوں[۵۲] کو بھی جو تم بناتے ہو(۹۶) وہ کہنے لگے: اس کے لئے ایک الاؤ تیار کرو ....

اس حقیقت سے روشناس کرایا وہ خود شاہی مندر کا پروہت، بت تراش اور بت فروش تھا وہ آپ کی اس نصیحت پر بگڑ بیٹھا تو آپ اپنی قوم کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ کا اپنے باپ اور اپنی قوم سے سوال یہ تھا کہ تم یہ بت اپنے ہاتھوں سے بناتے ہو پھر خود ہی انہیں خدائی اختیارات بانٹ دیتے ہو کہ فلاں سیارہ کی روح یا مجسمہ اگر ہم سے خوش رہے تو ہمیں مال و دولت زیادہ ملے گا۔ فلاں کی عبادت کی جائے تو علم نصیب ہوگا۔ اور فلاں کو خوش کیا جائے تو فصل بہت اچھی ہوگی۔ یہ سب اختیارات تو تم نے ان میں تقسیم کر دیئے۔ اب بتاؤ کہ جس ہستی نے اس کائنات اور ان سیاروں کو پیدا کیا ہے اور اس کا ان پر کنٹرول ہے اس کے پاس بھی کوئی اختیار تم نے چھوڑا ہے یا نہیں؟ کیا اب وہ بالکل بے بس ہو چکا ہے؟ آخر اس کے متعلق تم کیا سمجھتے ہو؟

[۵۰] ❁ قوم ابراہیم اور جشن نوروز:۔ جب سورج برج حمل میں داخل ہوتا تو اس دن یہ قوم جشنِ نوروز مناتی تھی۔ اس پکنک کے لئے زور شور سے تیاریاں شروع ہو گئیں۔ علی الصبح لوگوں نے اچھے اچھے کھانے پکائے کچھ کھائے کچھ مندروں میں بتوں کے سامنے نیاز کے طور پر رکھ دیئے۔ اور نور کے تڑکے میلہ میں شمولیت کے لئے روانہ ہونے لگے تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اس میں شمولیت کی دعوت دی بلکہ ساتھ لے جانے پر اصرار کیا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام ان کی بے ہودگیوں میں قطعاً شامل نہ ہونا چاہتے تھے۔ آپ کو فوراً ایک ترکیب سوجھی جو قوم کے مزاج کے موافق تھی۔ آپ نے ستاروں میں نظر ڈالی پھر کہنے لگے کہ میں تو آج بیمار ہونے والا ہوں۔ قوم نے اپنے اعتقاد کے مطابق اس عذر کو معقول سمجھا اور انہیں چھوڑنے پر رضامند ہو گئے۔

[۵۱] ❁ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا بتوں کو توڑ پھوڑ دینا:۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کتنی مدت سے ایسے موقعہ کے منتظر تھے۔ ادھر قوم کے لوگ میلہ منانے چلے گئے ادھر آپ سب سے بڑے مندر کا دروازہ کھول کر اس میں داخل ہو گئے۔ بتوں کی طرف غصہ سے متوجہ ہو کر کہنے لگے۔ بد بختو! تمہارے سامنے مٹھائیاں اور کھانے پڑے ہیں انہیں کھاتے کیوں نہیں؟ کچھ بولو تو سہی، کچھ جواب تو دو؟ ان بے جان پتھروں نے کیا جواب دینا تھا۔ اس پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اور بھی زیادہ غصہ آیا۔ ایک کلہاڑا لیا۔ اور سب بتوں کو خوب جی بھر کے ضربیں لگانا شروع کیں۔ سب کو توڑ پھوڑ دیا۔ البتہ سب سے بڑے بت کو چھوڑ دیا۔ اس کے کندھے پر کلہاڑا رکھ دیا تاکہ یہ معلوم ہو کہ یہ سب اس بڑے بت کی کارستانی ہے پھر مندر کا دروازہ بند کر کے باہر نکل آئے۔

[۵۲] ❁ سیدنا ابراہیم سے قوم کا سوال و جواب:۔ میلہ سے واپسی پر قوم نے جب اپنے معبودوں کا یہ حشر دیکھا تو ان کا پارا

لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ ﴿۹۷﴾ فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿۹۹﴾ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ

اور اسے آگ میں پھینک دو (۹۷) انہوں نے تو ابراہیم کے خلاف [۵۳] تدبیر کی تھی۔ مگر ہم نے انہیں ہی نیچا دکھا دیا۔ (۹۸) نیز ابراہیم نے کہا: میں اپنے پروردگار کی طرف جاتا ہوں [۵۴] وہی میری رہنمائی کرے گا (۹۹) اے میرے پروردگار! مجھے ایک صالح (بیٹا) عطا فرما (۱۰۰) چنانچہ ہم نے انہیں ایک بردبار بیٹے کی بشارت [۵۵] دی (۱۰۱) پھر جب وہ بیٹا ان کے ہمراہ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک دن)

بہت چڑھ گیا وہ پہلے ہی جانتے تھے کہ ہمارے بتوں کی مخالفت صرف ابراہیمؑ ہی کرتا رہتا تھا اور وہ پیچھے بھی رہ گیا تھا۔ لہٰذا یہ اسی کا کارنامہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ان کے پاس دوڑتے آئے اور معبودوں سے اس طرح کی بدسلوکی کی وجہ پوچھی تو آپؑ نے کہا کہ بڑے بت سے کیوں نہیں پوچھتے۔ جس کے کندھے پر کلہاڑا ہے۔ شاید اس نے ہی اپنے چھوٹوں سے ناراض ہو کر ان کا یہ حشر کر دیا ہو۔ پھر ساتھ ہی کہہ دیا کہ یہ پتھر کے بے جان جو اپنی حفاظت نہیں کر سکتے تمہارا کیا سنوار سکتے ہیں اور تم لوگ جو ان کی عبادت کرتے ہو اس کا فائدہ کیا ہے۔ پھر یہ بت تم نے خود ہی تراش رکھے ہیں علاوہ ازیں تم کو اور اس پتھر کو بھی اللہ نے پیدا کیا ہے اور یہ بت تو مخلوق در مخلوق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور عبادت کی مستحق تو وہ ہستی ہو سکتی ہے جو خالق ہو۔ یہ مخلوق در مخلوق کیسے مستحق ہو سکتی ہے؟

[۵۳] سیدنا ابراہیمؑ کو آگ کے الاؤ میں پھینکنا:۔ سیدنا ابراہیمؑ کے دلائل کا جواب تو کسی کے پاس تھا نہیں۔ لہٰذا وہ اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے اور کہنے لگے، اپنے معبودوں کے گستاخ کو ایسی قرار واقعی سزا دو جس سے دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔ چنانچہ بالاتفاق طے ہوا کہ ایک بہت بڑا الاؤ تیار کیا جائے اور اس میں سیدنا ابراہیمؑ کو پھینک کر زندہ جلا دیا جائے۔ چنانچہ ان لوگوں نے حسب تجویز بہت بڑا الاؤ تیار کیا اور سیدنا ابراہیمؑ کو اس میں پھینک دیا۔ اللہ نے آگ کو حکم دیا کہ ابراہیمؑ کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچنے پائے۔ چنانچہ آپ صحیح سلامت اس آگ سے باہر نکل آئے۔ اس طرح آپ تو اس بھاری آزمائش میں پوری طرح کامیاب ہو گئے اور قوم کو پہلے سے بھی زیادہ رسوا ہونا پڑا۔

[۵۴] شام کی طرف ہجرت:۔ جب آپ کا باپ اور آپ کی ساری قوم آپ کی جانی دشمن بن گئی تو آپ نے ترکِ وطن کا فیصلہ کر لیا کہ اب یہاں سے نکل جانا ہی بہتر ہے۔ نکلتے وقت یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کہاں جانا ہے۔ فقط اتنا کہا کہ میں اللہ کی خاطر ہجرت پر روانہ ہوا ہوں۔ مجھے کہاں جانا چاہئے یہ بات میرا پروردگار مجھے خود ہی بتائے گا اور میری رہنمائی فرمائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو شام کی طرف جانے کا حکم ہوا اور آپ اپنی بیوی اور بھتیجا یا چچا زاد بھائی سیدنا لوط سمیت شام کی طرف چلے گئے اس وقت تک صرف سیدنا لوط ہی آپ پر ایمان لائے تھے۔ اور آپ کی اس وقت تک کوئی اولاد بھی نہ تھی۔

[۵۵] سیدنا اسماعیل کی بشارت:۔ آپ گھر بار اور عزیز و اقارب چھوڑ کر شام کے علاقہ میں آ گئے۔ کافی عمر ہونے کے باوجود ابھی تک اولاد نہ تھی لہٰذا اللہ سے دعا کی کہ مجھے ایک صالح بیٹا عطا فرما جو میرے گھر کی رونق بنے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو

السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا
تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۰۲ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝۱۰۳ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ

ابراہیم نے کہا: بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا کہ میں تمہیں ذبح کر[۵۶] رہا ہوں اب بتاؤ تمہاری کیا رائے[۵۷] ہے؟ بیٹے نے جواب دیا: ابا جان! وہی کچھ کیجئے جو آپ کو حکم[۵۸] ہوا ہے آپ ان شاءاللہ مجھے صبر[۵۹] کرنے والا ہی پائیں گے (۱۰۲) پھر جب دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے بیٹے کو پیشانی کے بل[۶۰] گرا دیا (۱۰۳) تو ہم نے اسے پکارا:

جس بیٹے کی بشارت دی اس کی نمایاں صفت حلیم تھی اور اس صنعت میں سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کے قربانی کے واقعہ اور اس موقع پر ان کے بردبار ہونے کی طرف لطیف اشارہ پایا جاتا ہے۔

[۵۶] ❁ بیٹے کو ذبح کرنے کے متعلق خواب:۔ سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام جب اس عمر کو پہنچے جب وہ اپنے باپ کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹا سکتے تھے تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو ایک اور بہت بڑی آزمائش میں ڈالا گیا۔ آپ علیہ السلام کو تین راتیں مسلسل خواب آتا رہا جس میں آپ دیکھتے تھے کہ آپ اسی بیٹے کو جسے آپ نے اللہ سے دعا کر کے لیا تھا اور جو آپ کے بڑھاپے میں آپ کا سہارا بن رہا تھا، ذبح کر رہے ہیں چنانچہ آپ نے سمجھ لیا کہ یہ اللہ کی طرف سے حکم ہے۔

[۵۷] ❁ بیٹے سے سوال:۔ چنانچہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے نوجوان بیٹے کو یہ خواب بتا کر ان کی رائے دریافت کی۔ آپ علیہ السلام نے یہ رائے اس لئے دریافت نہیں کی تھی کہ اگر بیٹا اس بات پر آمادہ نہ ہو یا وہ انکار کر دے تو آپ علیہ السلام اللہ کے اس کے حکم کی تعمیل سے باز رہیں گے بلکہ اس لئے پوچھا تھا کہ آیا یہ فی الواقع صالح بیٹا ثابت ہوتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ آپ علیہ السلام نے جو دعا کی تھی وہ صالح بیٹے کے لئے کی تھی۔

[۵۸] ❁ نبی کا خواب وحی ہوتا ہے:۔ اس سے معلوم ہوا کہ خواب سن کر سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام بھی اسی نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اللہ کا حکم ہے جس سے یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے اور اس کی تائید بعض دوسری آیات اور احادیث سے بھی ہو جاتی ہے۔

[۵۹] ❁ بیٹے کی بے مثال فرمانبرداری:۔ سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام اس قدر خندہ پیشانی اور فراخ دلی سے قربان ہونے کو تیار ہو گئے جس کی دوسری کوئی مثال دنیا میں مل نہیں سکتی وہ ایک نہایت صالح اور انتہائی فرمانبردار بیٹے ثابت ہوئے۔ کیونکہ بیٹے کی قربانی دینے کا حکم تو باپ کو ہوا تھا۔ بیٹے کو قربان ہو جانے کا حکم نہیں ہوا تھا۔ بیٹے نے اپنے والد کا فرمان بلا چون و چرا تسلیم کر کے اپنے والد کی بھی انتہائی خوشنودی حاصل کر لی اور اپنے پروردگار کی بھی۔

[۶۰] ❁ قربانی کا منظر:۔ سیدنا ابراہیم نے اپنے بیٹے کو پیشانی کے بل اس لئے لٹایا کہ کہیں پدرانہ شفقت تعمیل حکم الٰہی میں آڑے نہ آ جائے۔ اور چھری چلاتے وقت ہاتھ میں لغزش نہ واقع ہو۔ منہ کے بل لٹانے سے نہ بیٹے کا چہرہ نظر آئے گا نہ پدرانہ جذبات برانگیختہ ہوں گے۔ کہتے ہیں کہ سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام نے اسی مصلحت کے پیش نظر خود اپنے والد محترم کو ایسا مشورہ دیا۔

يَا إِبْرَاهِيمُ ﴿١٠٤﴾ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا ۚ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿١٠٥﴾ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ﴿١٠٦﴾ وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ﴿١٠٧﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ﴿١٠٨﴾ سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ﴿١٠٩﴾

"ابراہیم (۱۰۴) تم نے خواب کو سچ [۶۱] کر دکھایا' ہم یقیناً نیکی کرنے والوں کو ایسے ہی [۶۲] صلہ دیا کرتے ہیں" (۱۰۵) بلاشبہ یہ ایک صریح [۶۳] آزمائش تھی۔ (۱۰۶) اور ہم نے ایک بڑی قربانی بطور فدیہ [۶۴] دے کر اسے (بیٹے کو) چھڑا لیا (۱۰۷) اور پچھلے لوگوں میں اس کا ذکر خیر چھوڑ دیا (۱۰۸) ابراہیم پر سلام ہو (۱۰۹)

[۶۱] ❁ **باپ بیٹے کا امتحان میں سرفراز ہونا:۔** جب باپ اور بیٹا دونوں نے اللہ کی فرمانبرداری کی بے نظیر مثال قائم کر دی تو اس وقت رحمت الٰہی جوش میں آگئی۔ اور فوراً سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر وحی ہوئی کہ بس بس اس سے زیادہ کچھ نہ کرو۔ ہمیں تو صرف تمہارا امتحان لینا مقصود تھا۔ اور وہ ہو چکا جس میں تم پوری طرح کامیاب اترے ہو۔ ہمارا یہ مقصود ہرگز نہ تھا کہ تم فی الواقع بیٹے کو ذبح کر ڈالو۔ واضح رہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جو خواب دیکھا تھا وہ یہ تھا کہ "میں ذبح کر رہا ہوں" یہ نہیں دیکھا تھا کہ "میں نے ذبح کر دیا ہے" اور جتنا خواب آپ نے دیکھا تھا اتنا کام ہو چکا تو آگے ذبح کر دینے سے اللہ تعالیٰ نے روک دیا۔

[۶۲] یعنی ہمارا دستور ہے کہ ہم نیکوکار لوگوں کو آزمائش میں ڈالتے ہیں پھر جب وہ اس آزمائش میں پورے اترتے ہیں، تو ان کے درجات بلند کرتے ہیں۔ ان کو فضیلت عطا کر دیتے ہیں۔ پھر جس آزمائش میں ہم انہیں ڈالتے ہیں اس سے نکلوا بھی دیتے ہیں۔ جیسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو آگ کی آزمائش میں ڈالا وہ وہاں سے سلامت نکال بھی لائے اور ان کا مرتبہ بھی بلند کیا اسی طرح بیٹے کی قربانی کی آزمائش میں ان کے بیٹے کو بھی بچا لیا اور درجات بھی بلند کیے۔

[۶۳] بھلا جس آزمائش کے متعلق اللہ تعالیٰ خود فرمائیں کہ وہ ایک بہت بڑی آزمائش تھی اس کے بڑی آزمائش ہونے میں کیا شک کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کا تصور یوں کیا جا سکتا ہے ایک بوڑھا باپ، ہو جس کا ایک ہی نوجوان بچہ ہو۔ وہی اس کا سہارا ہو اور اسے بھی اس نے اللہ سے دعائیں کر کر کے لیا ہو۔ پھر اسے اضطراری موت نہ آئے بلکہ اس باپ سے کہا جائے کہ میری راہ میں قربان کر دو تو اس کے دل پر کیا گزرتی ہے۔

[۶۴] ❁ **بیٹے کی قربانی کا فدیہ:۔** یہ ذبح عظیم ایک سینگ دار مینڈھا تھا جسے فرشتوں نے عین موقع پر لا کر حاضر کر دیا اور کہا تھا کہ بیٹے کی جگہ اسے قربان کر دو۔ یہی جانثار بیٹے کا فدیہ تھا جسے اللہ نے بھیجا تھا۔ اس لحاظ سے یہ عظیم قربانی تھی اور اس کے عظیم ہونے کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ قیامت تک کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ سنت جاری کر دی کہ اسی تاریخ کو دنیا بھر کے اہل ایمان جانور قربان کریں۔ اور وفاداری اور جان نثاری کے اس عظیم واقعہ کی یاد تازہ کرتے رہیں۔

❁ **ذبیح اللہ سیدنا اسماعیل تھے یا سیدنا اسحاق علیہما السلام:۔** بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ذبیح اللہ سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام نہیں بلکہ سیدنا اسحٰق علیہ السلام تھے۔ ان کا نظریہ درج ذیل وجوہ کی رو سے درست معلوم نہیں ہوتا۔

۱۔ اسی سورہ میں پہلے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے اس بیٹے کا ذکر آیا جو فی الواقع ذبیح اللہ تھے اور اس کے بعد سیدنا اسحٰق کا ذکر اسی سورہ کی آیت نمبر ۱۱۲ میں آ رہا ہے۔

۲۔ جب سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کی بشارت دی گئی تو اس کے ساتھ حلیم کی صفت مذکور ہے۔ اور اس کا تعلق قربانی سے ہے۔ اور

كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۰﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ

ہم نیکی کرنے والوں[۶۵] کو ایسے ہی بدلہ دیا کرتے ہیں (۱۱۰) بلاشبہ وہ ہمارے ایماندار بندوں سے تھے (۱۱۱) اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق کی بشارت[۶۶] دی جو صالح لوگوں میں سے نبی ہوگا (۱۱۲)

جب سیدنا اسحٰق علیہ السلام کی بشارت دی گئی تو اس کے ساتھ صفت علیم ذکر کی گئی (۱۵: ۵۳، ۵۱: ۲۸) اور اس صفت کا قربانی سے کچھ تعلق نہیں۔ نیز جب سیدنا اسحٰق علیہ السلام کی بشارت دی گئی تو ساتھ ہی یہ بتا دیا گیا کہ اسحٰق علیہ السلام کے بعد ان کا بیٹا یعقوب بھی پیدا ہوگا۔ (۱۱: ۷۱) اور ظاہر ہے جس بیٹے کے پوتے کی بھی بذریعہ وحی بشارت دی جا چکی ہو اس کے متعلق نوجوانی میں ہی قربانی کی وحی آنا محال ہے۔ کیونکہ پوتے کی بشارت پہلے دی جا چکی تھی۔

۳۔ تورات میں یہ تصریح موجود ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اپنے اکلوتے اور محبوب بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور یہ بھی مسلم ہے کہ سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام، سیدنا اسحٰق علیہ السلام سے عمر میں بڑے تھے پھر سیدنا اسحٰق علیہ السلام سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کی موجودگی میں اکلوتے کیسے ہو سکتے ہیں؟

۴۔ قربانی کی یادگار اور اس سے متعلقہ رسوم بنی اسرائیل میں بطور وراثت مسلسل منتقل ہوتی چلی آئی ہیں حتیٰ کہ دور نبوی میں بھی موجود تھیں۔ یہ بات بھی اس بات کی قوی دلیل ہے کہ ذبیح اللہ سیدنا اسمٰعیل تھے نہ کہ سیدنا اسحٰق علیہ السلام۔

۵۔ ❁ احسان کا وسیع مفہوم:۔ قربانی اور اس سے متعلقہ رسوم مثلاً سعی صفا و مروہ وغیرہ کا تعلق مکہ سے ہے۔ اور یہ سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کا وطن تھا۔ سیدنا اسحٰق علیہ السلام کا اصل وطن ملک شام تھا۔

[۶۵] مُحْسِنِيْنَ کا ترجمہ اردو میں ایک دو لفظوں میں ادا کرنا بہت مشکل ہے۔ لہٰذا عموماً اس کا ترجمہ نیکی کرنے والے یا نیکوکار کر دیا جاتا ہے۔ اِحْسَانٌ کا مطلب دراصل کسی کام کو بہتر سے بہتر طریق پر سرانجام دینا ہے۔ جیسا کہ حدیث جبریل علیہ السلام سے واضح ہوتا ہے کہ جب سیدنا جبریل علیہ السلام نے آپ ﷺ سے یہ سوال کیا کہ اِحْسَانٌ کیا چیز ہے۔ تو اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: ”تو اللہ کی عبادت ایسے کرے جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اتنا تو سمجھے کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے“ (متفق علیہ) اور احسان میں کم از کم تین باتوں کا ہونا ضروری ہے (۱) جو کام کیا جائے پوری خلوص نیت سے اور رضائے الٰہی کے لئے کیا جائے۔ (۲) حکم کی تعمیل محض اطاعت کے جذبہ سے نہ ہو بلکہ اس میں مطاع کی محبت کا جذبہ بھی شامل ہو۔ اور (۳) کام کے آداب و ارکان کو اس طریقہ پر سرانجام دیا جائے جو بہتر سے بہتر ہو سکتے ہیں۔

اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے چونکہ ہر کام احسان کے ساتھ کیا تھا۔ لہٰذا اللہ نے دنیا میں انہیں دو طرح سے بدلہ دیا ایک یہ کہ رہتی دنیا تک ان پر سلامتی کی دعائیں کی جایا کریں۔ جیسا کہ ہم ہر نماز میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کی آل پر بھی درود و سلام کی دعا کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ اکثر مذاہب والے انہیں اپنا روحانی پیشوا تسلیم کرتے ہیں۔ ان سے نسبت جوڑنے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور ان کا ذکر اچھے الفاظ میں ہی کرتے ہیں۔

[۶۶] معلوم ہوا کہ پہلی خوشخبری کا تعلق سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام سے ہی ہے۔ اور قصہ ذبح کا تعلق انہی سے ہے۔ اس کے بعد دوسری بار سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو سیدنا اسحٰق علیہ السلام کی خوشخبری دی گئی۔

الصّٰلِحِيْنَ ﴿١١٢﴾ وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ ؕ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ﴿١١٣﴾ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿١١٤﴾ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿١١٥﴾ وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿١١٦﴾ وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ﴿١١٧﴾ وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿١١٨﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِى الْاٰخِرِيْنَ ﴿١١٩﴾ سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿١٢٠﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٢١﴾ اِنَّهُمَا مِنَ

اور ہم نے ابراہیم اور اسحاق دونوں پر برکت نازل کی۔ اور ان دونوں کی نسل[٦٧] میں کچھ تو نیک لوگ ہوئے اور کچھ اپنے آپ پر صریح ظلم کرنے والے تھے (١١٣) نیز ہم نے موسیٰ اور ہارون پر بھی بڑا احسان[٦٨] کیا۔ (١١٤) اور انہیں اور ان کی قوم کو شدید بے چینی سے نجات دی۔ (١١٥) اور ان کی مدد کی تو بالآخر وہی[٦٩] غالب ہوئے (١١٦) اور انہیں نہایت واضح کتاب دی (١١٧) اور انہیں راہِ راست[٧٠] پر چلایا (١١٨) اور ان کا ذکر خیر پچھلی نسلوں میں چھوڑ دیا (١١٩) موسیٰ اور ہارون پر سلام ہو۔ (١٢٠) ہم نیکو کاروں کو ایسے ہی صلہ[٧١] دیا کرتے ہیں۔ (١٢١) وہ دونوں

[٦٧] ذُرِّيَّتِهِمَا میں تثنیہ کی ضمیر سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے اور سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام اور سیدنا اسحٰق علیہ السلام کی طرف بھی۔ جن سے دو بڑی قومیں پیدا ہوئیں۔ ایک بنی اسمٰعیل اور دوسرے بنی اسرائیل۔ بنو اسمٰعیل میں صرف نبی آخر الزمان مبعوث ہوئے جبکہ بنی اسرائیل میں بے شمار انبیاء پیدا ہوئے۔ اور اچھے اور برے لوگ ان دونوں قوموں میں موجود رہے۔

[٦٨] یعنی انہیں نبوت عطا فرمائی۔ معجزات بھی دیئے اور اپنی مدد کا وعدہ دے کر انہیں فرعون کے پاس بھیجا تاکہ وہ اپنی قوم کو فرعون کی غلامی اور طرح طرح کی تکلیفوں سے نجات دلائیں۔

[٦٩] ۞ مصر میں بنی اسرائیل کی حالت زار:۔ مصر میں بنی اسرائیل کی حالت ہندوستان کے شودروں سے بھی بدتر تھی۔ وہ صرف ایک محکوم قوم ہی نہ تھے۔ بلکہ ذلیل اور رسوا بھی سمجھے جاتے تھے۔ آل فرعون ان سے طرح طرح کی بیگار بھی لیتے تھے۔ پھر ان کی نسل کو ختم ہی کر دینے کے درپے ہو گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کی مدد صرف یہی نہیں کی کہ ان کے پنجے سے انہیں نجات دلائی بلکہ ان کے سامنے اس ظالم کو سمندر میں غرق کر کے نیست و نابود بھی کر دیا۔

[٧٠] فرعون اور آل فرعون کی غرقابی کے بعد ہی طور سینا کے مقام پر سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل ہوئی۔ اس سے پیشتر سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر بھی صحیفے ہی نازل ہوتے رہے۔ تورات پہلی آسمانی کتاب ہے جس میں بنی اسرائیل کو زندگی سے متعلق واضح احکام دیئے گئے تھے۔ پھر اسی کتاب کی روشنی میں ان دونوں نبیوں نے بنی اسرائیل کی رہنمائی کی۔

[٧١] یعنی ان دونوں نبیوں نے بھی راہِ حق میں بے شمار قربانیاں دی تھیں۔ وہ اللہ کے حکم کے تحت اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر فرعون جیسے جابر اور ظالم فرمانروا کے پاس پہنچ گئے تھے۔ جبکہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام خود ان کے مجرم بھی تھے۔ پھر انہوں نے فرعون سے دعوت توحید کے بعد جو مطالبہ کیا تھا وہ بھی اسے بیخ پا کر دینے والا تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے آزاد کر کے انہیں ہمارے ہمراہ روانہ کر دو۔ اور بنی اسرائیل کی نجات کے بعد انہوں نے اس بگڑی قوم کو سنوارنے کے لئے مقدور

عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ

ہمارے ایماندار بندوں میں سے تھے۔(۱۲۲) اور الیاس بھی بلاشبہ رسولوں میں سے تھے (۱۲۳) جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم (اللہ سے) ڈرتے نہیں (۱۲۴) تم بعل[۷۲] کو تو پکارتے ہو اور احسن الخالقین[۷۳] کو چھوڑ دیتے ہو؟(۱۲۵) اس اللہ کو جو تمہارا اور تمہارے پہلے آباء واجداد[۷۴] کا پروردگار ہے؟ (۱۲۶) مگر ان لوگوں نے انہیں جھٹلا دیا لہٰذا وہ سب

بھر کوششیں کی تھیں۔

ان کے ایسے ہی کارناموں کا صلہ ہم نے انہیں یہ دیا کہ رہتی دنیا تک انہیں بھلائی سے یاد کیا جائے۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ اور مسلمان ہی سب سے بڑی قومیں ہیں اور یہ سب سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو سچا نبی و روحانی پیشوا سمجھتے ہیں۔

[۷۲] سیدنا الیاس کا مرکزِ تبلیغ اور بعل کی پرستش:۔ سیدنا الیاس علیہ السلام، سیدنا ہارون علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ ان کا زمانہ نبوت نویں صدی قبل مسیح ہے۔ ان کا مرکز تبلیغ بعلبک نامی شہر تھا جو شام میں واقع تھا۔ آپ کی قوم بعل نامی بت کی پرستار تھی اور یہی بعل ہی ان کا دیوتا تھا۔ بعل کا لغوی معنی مالک، آقا، سردار اور خاوند ہے اور قرآن میں بعل کا لفظ متعدد مقامات پر خاوند کے معنوں میں استعمال ہوا ہے مگر قدیم زمانے میں سامی اقوام اس لفظ کو الٰہ یا خداوند کے معنوں میں استعمال کرتی تھیں۔ ان لوگوں نے ایک خاص دیوتا کو بعل (یعنی دوسرے دیوتاؤں یا معبودوں کا سردار) کے نام سے موسوم کر رکھا تھا۔ بابل سے لے کر مصر تک پورے شرق اوسط میں بعل پرستی پھیلی ہوئی تھی بنی اسرائیل جب فرعون سے نجات پا کر مصر سے فلسطین آکر آباد ہوئے اور ان لوگوں سے شادی بیاہ ہوئے تو یہ مرض ان میں بھی پھیل گیا۔ بعل کے نام کا ایک مذبح بھی بنا ہوا تھا جس پر قربانیاں کی جاتی تھیں۔ عوام تو در کنار فلسطین کی اسرائیل ریاست بھی بعل پرستی میں مبتلا ہو گئی تھی۔

[۷۳] یعنی اللہ کے علاوہ خالق اور بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً انسان میدہ، گھی اور چینی کی آمیزش اور ترکیب سے کئی قسم کی مٹھائیاں وجود میں لاتا ہے اور مادے کے خواص معلوم کر کے نت نئی قسم کی ایجادات کو وجود میں لاتا ہے۔ اسی طرح ایک مصنف چند کتابیں یا تحریریں سامنے رکھ کر ایک نئی کتاب کو وجود میں لاتا ہے۔ یہ سب تخلیقی کارنامے ہیں۔ مگر یہ سب کارنامے ایسے ہیں جن کا مواد پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تخلیق نہ مادہ کی محتاج ہے نہ اس کے اوصاف کی کیونکہ مادہ میں وصف پیدا کرنے والا وہ خود ہے پھر اس کے تخلیقی کارنامے اس لحاظ سے انسان کی بساط سے باہر ہیں کہ وہ روح پھونک کر جیتی جاگتی اور نشوونما پانے والی اشیاء تیار کرتا ہے۔ پھر اس کے تخلیقی کارنامے ایسے ہیں جنہیں انسان کا بنانا تو در کنار انسان سمجھ بھی نہیں سکتا۔ مثلاً انسان کی اندرونی ساخت اور اس کے اعضاء و جوارح کے وظائف اور وہ قوتیں جو انسان میں رکھ دی گئی ہیں ایک آنکھ کے نور ہی کو لیجئے کہ وہ کیا چیز ہے اور کیسے پیدا ہوتا ہے اور اگر ضائع ہو جائے تو کیا کوئی بڑے سے بڑا ڈاکٹر اسے بحال کر سکتا ہے؟ اب سب باتوں کا جواب نفی میں ہے۔ لہٰذا احسن الخالقین صرف اللہ کی ذات ہی ہو سکتی ہے۔

[۷۴] یعنی سیدنا الیاس علیہ السلام نے ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ یہ بعل دیوتا کا بت تو تم نے خود گھڑا ہے۔ یہ پتھر کا

لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۲۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰٓى
اِلْ يَاسِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَاِنَّ
لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا
الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَبِالَّيْلِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ ع ۴

(عذاب کے لئے) حاضر کئے جائیں گے(۱۲۷) بجز اللہ کے مخلص بندوں[۷۵] کے(۱۲۸) اور پچھلی نسلوں میں اس کا ذکر خیر چھوڑ دیا(۱۲۹) الیاسین[۷۶] پر سلام ہو(۱۳۰) ہم نیکو کاروں کو ایسے ہی صلہ دیا کرتے ہیں۔(۱۳۱) یقیناً وہ ہمارے ایماندار بندوں میں سے تھے۔(۱۳۲) اور لوط بھی بلاشبہ ہمارے رسولوں میں سے تھے(۱۳۳) جب ہم نے انہیں اور ان کے سب گھر والوں کو نجات دی(۱۳۴) سوائے ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں[۷۷] میں سے تھی۔(۱۳۵) پھر باقی لوگوں کو ہم[۷۸] نے تباہ کر دیا(۱۳۶) اور تم تو ان (کی اجڑی[۷۹] بستی) پر شب و روز گزرتے ہی رہتے ہو۔(۱۳۷) پھر کیا تمہیں سمجھ نہیں آتی؟(۱۳۸) اور یونس بھی بلاشبہ رسولوں سے تھے(۱۳۹)

بے جان بت ہے جس کے خالق تم خود ہو۔ اس کی حفاظت بھی تم ہی کرتے ہو۔ پھر اسی کی عبادت بھی کرنے لگتے ہو۔ تمہیں چاہئے تو یہ تھا کہ اس کی عبادت کرتے جس نے تم کو بنایا ہے۔ پھر تمہیں صرف بنا ہی نہیں دیا بلکہ تمہاری پرورش بھی کرتا ہے۔ تمہارے آباء واجداد کا بھی وہی خالق اور رازق ہے۔ ایسے بہترین خالق کو چھوڑ کر اپنے گھڑے ہوئے پتھر کے سامنے سر بسجود ہوتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔

[۷۵] مگر بعل کے ان پرستاروں کو الیاس علیہ السلام کی دعوت راس نہ آئی۔ انہوں نے اپنے نبی کی دعوت کو جھٹلا دیا اور اس کے در پے آزار ہو گئے۔ ایسے سب لوگوں کو ان کے گناہوں کی سزا مل کے رہے گی۔ اور اس سزا سے وہ لوگ بچے جو سیدنا الیاس علیہ السلام پر ایمان لے آئے اور اللہ کے فرمانبردار بن کر رہے۔

[۷۶] ۞ الیاسین اور الیاس ایک ہی بات ہے:۔ الیاس اور الیاسین ایک ہی بات ہے۔ الیاسین بھی سیدنا الیاس علیہ السلام ہی کا دوسرا نام ہے اور تلفظ کی ایسی کمی بیشی تقریباً سب زبانوں میں پائی جاتی ہے۔ قرآن میں اس کی دوسری مثال طور سینا ہے جسے سورہ والتین میں سینین کہا گیا ہے۔

[۷۷] ۞ سیدنا لوط اور ان کی قوم:۔ سیدنا لوط علیہ السلام کی بیوی جو اپنے شوہر کی خائن تھی۔ اس کی تمام وفاداریاں مجرم قوم کے ساتھ تھیں۔ گھر میں کوئی مہمان آ جاتا تو وہ ان مجرموں کو خفیہ اشارے کرتی تھی۔ ہجرت کے وقت سیدنا لوط علیہ السلام کو خصوصی ہدایت تھی کہ وہ تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔ بلکہ مجرموں جیسا ہی اس کا بھی حشر ہو گا۔

[۷۸] یعنی سدوم اور اس کے مضافات کا پورا علاقہ ہی بلندی پر لے جا کر اور الٹا کر زمین پر پٹخ دیا گیا اوپر سے پتھروں کی بارش برسائی گئی۔

[۷۹] یہ علاقہ اس شاہراہ پر واقع تھا جہاں سے کفار مکہ کے تجارتی قافلے مکہ سے شام اور شام سے واپسی پر گزرتے تھے اور اس اجڑے ہوئے علاقہ کے تاریخی حالات بھی معلوم تھے۔ بسا اوقات دیکھتے بھی رہتے تھے۔ لیکن یہ سوچنے کی کبھی زحمت ہی گوارا

الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۴۰﴾ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴿۱۴۲﴾ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ فَنَبَذْنٰهُ

جب وہ ایک بھری ہوئی کشتی کی طرف بھاگ[۸۰] نکلے (۱۴۰) پھر قرعہ[۸۱] ڈالا تو انہوں نے زک[۸۲] اٹھائی۔(۱۴۱) چنانچہ مچھلی نے انہیں نگل لیا[۸۳] اور وہ ملامت زدہ[۸۴] تھے (۱۴۲) اب اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے (۱۴۳) تو تا روز قیامت مچھلی کے پیٹ[۸۵] میں ہی پڑے رہتے (۱۴۴) پھر ہم نے انہیں ایک چٹیل میدان میں

نہ کرتے تھے کہ یہ علاقہ کیوں ہلاک کیا گیا تھا؟ اور اگر ہم بھی اللہ کے نافرمان اور سرکش بن کر رہیں تو ہم پر بھی عذاب الٰہی نازل ہو سکتا ہے۔

[۸۰] سیدنا یونس کی بلااذن الٰہی ہجرت:۔ اَبَقَ کا لفظ بالخصوص ایک غلام کا اپنے آقا کے ہاں سے بھاگ کھڑا ہونے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ سیدنا یونس علیہ السلام بھی چونکہ اللہ کے حکم ہجرت کے بغیر اپنی قوم کے لوگوں سے بھاگ آئے تھے اس لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا اس میں لطیف اشارہ یہ ہے کہ ہر شخص حتیٰ کہ ہر نبی بھی اپنے پروردگار کا ہمہ وقتی غلام اور بندہ ہوتا ہے۔

[۸۱] کشتی میں قرعہ اندازی:۔ سیدنا یونس علیہ السلام اہل نینوا کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ بھاگ کر ساحل سمندر پر پہنچے تو دیکھا کہ کشتی کھچا کھچ بھری ہوئی ہے۔ آپ علیہ السلام کے کہنے پر کشتی والوں نے آپ کو بھی سوار کر لیا، روانہ ہوئے ہی تھے کہ کشتی آگے بڑھنے کے بجائے چکر کھانے لگی۔ کشتی والوں نے اپنے تجربہ کی بنا پر کشتی پر سوار لوگوں سے کہا کہ ایسا معاملہ ہمیں اس وقت پیش آتا ہے جب کوئی بھاگا ہوا غلام کشتی پر سوار ہو۔ انہوں نے قرعہ ڈالا تو سیدنا یونس علیہ السلام کے نام قرعہ نکلا۔ دوبارہ سہ بارہ قرعہ ڈالنے سے بھی سیدنا یونس علیہ السلام ہی کا نام نکلا اور یہ سب کچھ اللہ کی مشیت کے مطابق ہو رہا تھا۔

[۸۲] سیدنا یونس مچھلی کے پیٹ میں:۔ چنانچہ کشتی والوں نے سیدنا یونس علیہ السلام کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا۔ ایک بہت بڑی وہیل مچھلی پہلے ہی منہ کھولے کھڑی تھی۔ اس نے فوراً سیدنا یونس علیہ السلام کو ایک ہی لقمہ بنا کر نگل لیا۔ اس طرح سیدنا یونس علیہ السلام جیتے جاگتے مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے۔

[۸۳] مُلِیْم کا معنی وہ شخص ہے جس کا ضمیر خود ہی ملامت کر رہا ہو کہ وہ واقعی مجرم ہے اور کوئی ملامت کرے یا نہ کرے۔ اور سیدنا یونس علیہ السلام کو اپنی اجتہادی غلطی کا احساس بھاگنے کے فوراً بعد ہی ہو گیا تھا۔ اور قرعہ میں ہر بار آپ کا نام نکلنے پر اس کا یقین ہو گیا۔

[۸۴] چنانچہ آپ علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں چلے جانے کے بعد اپنے پروردگار کے حضور توبہ استغفار میں مشغول رہنے لگے۔ مچھلی کے پیٹ کی تاریکیوں میں آپ علیہ السلام کا وظیفہ یہ ہوتا تھا۔ ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ جیسا کہ سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۸۷ میں مذکور ہے۔ اگر آپ علیہ السلام یہ کلمات تسبیحات نہ پڑھتے رہتے تو ہمیشہ مچھلی کے پیٹ میں ہی رہتے یعنی اس کی غذا بن کر اس کے جسم میں تحلیل ہو جاتے۔

[۸۵] مچھلی کے پیٹ سے باہر آنا:۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی توبہ واستغفار کو قبول فرمایا اور مچھلی کو حکم دیا کہ وہ انہیں ساحل کے کنارے پر پھینک دے۔ چنانچہ مچھلی نے جیسے آپ کو نگلا تھا ویسے ہی صحیح وسالم ایک چٹیل میدان کے قریب اگل دیا۔ آپ اس وقت سخت نحیف و ناتواں تھے۔ جلد بھی بہت نرم ونازک بن گئی تھی۔ اس وقت آپ کی وہی حالت تھی جیسے ایک بچہ کی ماں کے پیٹ سے نکلنے کے بعد ہوتی ہے۔

بِالْعَرَاۗءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ۝۱۴۵ۚ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ۝۱۴۶ۚ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ
يَزِيْدُوْنَ ۝۱۴۷ۚ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۝۱۴۸ۭ فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ۝۱۴۹ۙ اَمْ خَلَقْنَا

پھینک دیا جبکہ وہ بیمار تھے۔(۱۴۵) اور ان پر ایک بیل دار[۸۶] درخت اگا دیا(۱۴۶) اور (اس کے بعد) انہیں ایک لاکھ[۸۷] یا اس سے زیادہ لوگوں کی طرف بھیجا(۱۴۷) چنانچہ وہ لوگ ایمان لے آئے تو ہم[۸۸] نے انہیں کچھ مدت زندگی سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا۔(۱۴۸) آپ ان لوگوں سے پوچھئے: کیا آپ کے پروردگار کے لئے تو بیٹیاں ہوں اور ان کے لئے بیٹے؟ (۱۴۹) یا ہم نے فرشتوں کو عورتیں[۸۹] ہی پیدا کیا

[۸۶] آپ کی رہائش اور خوراک کا بندوبست:۔ یَقْطِیْنٌ کا اطلاق ہر اس پودے پر ہوتا ہے جس کا تنا نہ ہو مثلاً کدو، ککڑی، تربوز وغیرہ اور بالخصوص اس کا اطلاق پیٹھا کدو کی بیل پر ہوتا ہے۔ اور مفسرین کی اکثر رائے کے مطابق یہی پودا وہاں اگ آیا تھا۔ اس کے پتے چوڑے ہوتے ہیں جو دھوپ وغیرہ سے سایہ کا کام دیتے ہیں۔ نیز کہتے ہیں کہ مکھی اس پودے کے نزدیک نہیں آتی۔ آپ کی خوراک کا اللہ تعالیٰ نے کیا انتظام فرمایا؟ کتاب و سنت میں اس کی کوئی صراحت نہیں۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ روزانہ ایک ہرنی آتی جس کا آپ علیہ السلام دودھ پی لیتے تھے۔ تاآنکہ چند دنوں میں آپ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے۔

[۸۷] اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو اسی قوم کے ہاں جانے کا حکم دیا۔ جس سے آپ علیہ السلام بھاگ آئے تھے۔ ان کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی۔ انہوں نے جس آہ و زاری سے توبہ کی تھی اللہ نے ان کی توبہ قبول کر کے ان سے عذاب کو ٹال دیا تھا اور وہ کسی رہنمائی کرنے والے کے منتظر تھے۔ سیدنا یونس علیہ السلام کو تلاش کرتے رہے۔ مگر وہ کہیں نہ ملے۔

[۸۸] سیدنا یونس کا اپنی قوم میں واپس آنا:۔ جب سیدنا یونس علیہ السلام اپنی قوم کے پاس پہنچے تو وہ پہلے ہی آپ کے منتظر بیٹھے تھے۔ وہ فوراً آپ پر ایمان لے آئے۔ اور پھر سے ان پر اللہ تعالیٰ کے انعامات و اکرامات ہونے لگے۔ چونکہ اس واقعہ میں سیدنا یونس علیہ السلام کے ایک کمزور پہلو کی نشاندہی ہوتی ہے۔ غالباً اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتاکید فرمادیا کہ تمام انبیاء نبی ہونے کے لحاظ سے برابر ہیں اور کسی نبی کو دوسرے پر فضیلت نہیں۔ ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ "مجھے یونس بن متی پر فضیلت نہ دو" اور دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ جس نے مجھے یونس بن متی پر فضیلت دی اس نے جھوٹ بولا" (مسلم۔ کتاب الفضائل۔ باب من فضائل موسیٰ علیہ السلام)

دراصل یہ یونس علیہ السلام کی ایک اجتہادی غلطی تھی۔ اور یہ ہر انسان حتی کہ انبیاء سے بھی ممکن ہے۔ لیکن مقربین کی چھوٹی سی غلطی اور لغزش بھی اللہ کے ہاں بڑی اور قابل مواخذہ ہوتی ہے۔ اسی بنا پر انبیاء پر بھی اللہ کی طرف سے عتاب نازل ہوتا ہے۔

[۸۹] قریش کا فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دینا:۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کی انکار آخرت کے علاوہ دوسری بڑی گمراہی کا ذکر فرمایا ہے۔ جو شرک فی الذات یا شرک کی سب سے بڑی اور بدترین قسم سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ بھی صاحب اولاد ہے۔ اور یہ اتنا بڑا گناہ ہے جس کے بارے میں بہت سخت الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ پھر اس عقیدہ میں بھی وہ کئی طرح کی بے انصافیاں کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ پھر ان کے خیالی مجسمے اور بت بنا کر ان کی پوجا بھی کرتے تھے۔ ان میں تین مجسموں کا ذکر قرآن میں مذکور ہے۔ (۱) لات یہ الٰہ کا مونث ہے یعنی لات کا استھان یا آستانہ طائف میں تھا اور بنی ثقیف اس کے معتقد تھے، (۲) عزیٰ۔ عزیز سے مونث ہے بمعنی عزت والی۔ یہ قریش کی خاص

الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّهُمْ
لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۵﴾ اَمْ لَكُمْ
سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵۶﴾ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۷﴾ وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ۭ وَ
لَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۰﴾

تھا اور یہ اس وقت موجود تھے؟(۱۵۰) یاد رکھو! یہ لوگ جھوٹ گھڑ کر یہ بات کہتے ہیں(۱۵۱) کہ "اللہ کی اولاد ہے" اور یہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں(۱۵۲) کیا اللہ نے بیٹوں کے بجائے بیٹیوں کو پسند کیا؟(۱۵۳) تمہیں کیا ہو گیا۔ یہ تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟(۱۵۴) کچھ بھی ہوش نہیں کرتے؟(۱۵۵) یا تمہارے پاس کوئی صریح سند ہے؟(۱۵۶) اگر تم سچے ہو تو ایسی[۹۰] تحریر لا کر دکھاؤ(۱۵۷) نیز ان لوگوں نے اللہ اور جنوں کے درمیان رشتہ داری بنا ڈالی۔ حالانکہ جن خوب جانتے ہیں کہ وہ (مجرم کی حیثیت سے) پیش[۹۱] کئے جائیں گے(۱۵۸) اللہ تعالیٰ ان سب باتوں سے پاک ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں(۱۵۹) سوائے اللہ کے مخلص بندوں[۹۲] کے (جو ایسے اتہام نہیں لگاتے)(۱۶۰)

دیوی تھی اور اس کا آستانہ مکہ اور طائف کے درمیان وادی نخلہ میں حراص کے مقام پر واقع تھا، (۳) منات کا آستانہ مکہ اور مدینہ کے درمیان بحر احمر کے کنارے قدید کے مقام پر واقع تھا۔ بنو خزاعہ، اوس اور خزرج اس کے معتقد تھے۔ گویا مشرکین عرب وہ بڑا ظلم ڈھاتے تھے ایک اللہ کی اولاد قرار دینے کا، دوسرے شریک بھی ایسے جنہیں وہ اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ جبکہ وہ اپنے لئے بیٹیوں کو کبھی پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ انہیں زندہ در گور کر دیتے تھے۔

[۹۰] دعویٰ کے اثبات کیلئے دو طرح کے دلائل، عینی شہادت اور نقلی دلیل:۔ کسی دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے دو طرح کے دلائل ہی کام دے سکتے ہیں۔ ایک عینی شہادت جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے مشرکین عرب سے پوچھا کہ جب ہم نے فرشتوں کو پیدا کیا تھا تو اس وقت تم موجود تھے اور یہ دیکھا تھا کہ انہیں عورتیں بنا کر پیدا کیا گیا ہے؟ ظاہر ہے کہ مشرکین عرب کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا اور حقیقت یہ ہے کہ فرشتوں میں نر و مادہ کی تمیز ہے ہی نہیں اور دوسری دلیل کوئی نقلی دلیل بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی کسی آسمانی کتاب میں یہ لکھا ہو کہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے عورتیں بنا کر پیدا کیا ہے اور وہ اس کی بیٹیاں ہیں۔ اگر مشرکین عرب کوئی ایسی تحریر بھی نہ دکھا سکیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان کے عقائد من گھڑت، لغو اور باطل ہیں۔

[۹۱] جنوں اور اللہ تعالیٰ میں سسرالی رشتہ:۔ مشرکین عرب سے جب پوچھا جاتا کہ اگر فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں تو ان کی مائیں کون ہیں؟ تو وہ کہہ دیتے کہ "جنوں کی عورتیں" اس طرح گویا وہ ایک اور ظلم ڈھاتے تھے اور جنوں اور اللہ تعالیٰ میں دامادی اور سسرال کا رشتہ قائم کر دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب یوں دیا کہ جن ایک مکلف مخلوق ہے۔ جو اپنے اعمال کی جوابدہی کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کئے جائیں گے۔ پھر ان کی اکثریت جہنم میں جائے گی اور تم نے انہیں اللہ کا سسر بنا ڈالا ہے۔ تمہاری بے ہودگی کی کوئی انتہا ہے؟ کیا تم یہ گوارا کرتے ہو کہ اپنے داماد کو آگ میں جھونک دو یا جس کو تم آگ میں جھونکتے ہو اسے اپنا داماد بنانا گوارا کر سکتے ہو؟ آخر اللہ کے بارے میں تمہاری عقلوں میں اتنا فتور کیوں آ جاتا ہے؟

[۹۲] یعنی اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے نہ اللہ کے حضور گرفتار کر کے پیش کئے جائیں گے اور نہ انہیں عذاب ہو گا۔

فَإِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ ﴿١٦١﴾ مَا أَنتُمْ عَلَيْهِ بِفَاتِنِينَ ﴿١٦٢﴾ إِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيمِ ﴿١٦٣﴾ وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ
مَقَامٌ مَّعْلُومٌ ﴿١٦٤﴾ وَإِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُّونَ ﴿١٦٥﴾ وَإِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُونَ ﴿١٦٦﴾ وَإِن كَانُوا لَيَقُولُونَ ﴿١٦٧﴾
لَوْ أَنَّ عِندَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْأَوَّلِينَ ﴿١٦٨﴾ لَكُنَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿١٦٩﴾ فَكَفَرُوا بِهِ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿١٧٠﴾

بلا شبہ وہ اور جن کی تم پوجا کرتے ہو (۱۶۱) ان (مخلص بندوں) کو اللہ کے خلاف فتنہ میں نہیں ڈال سکتے۔ (۱۶۲) سوائے اس کے جو جہنم میں داخل [۹۳] ہونے والا ہو۔ (۱۶۳) اور ہم (فرشتوں) میں سے ہر ایک کا ایک معلوم مقام ہے (۱۶۴) اور ہم صف بستہ رہنے والے (۱۶۵) اور تسبیح کرنے والے ہیں [۹۴] (۱۶۶)

اور یہ لوگ تو کہا کرتے تھے کہ: (۱۶۷) اگر ہمارے پاس پہلے لوگوں کی کتاب (الٰہی) ہوتی (۱۶۸) تو ہم اللہ کے مخلص بندے ہوتے (۱۶۹) (اور جب قرآن آگیا) تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا [۹۵]۔ اب جلد ہی انہیں (اس کا نتیجہ) معلوم ہو جائے گا (۱۷۰)

[۹۳] یعنی اے مشرکینِ عرب! تم اور تمہارے معبود مل کر بھی شرک اور شرکیہ عقائد کی مدافعت میں اور اسلام کا راستہ روکنے میں جتنے ہتھکنڈے استعمال کر سکتے ہو۔ اور جتنی سازشیں تیار کر سکتے ہو کر لو۔ اللہ کے مخلص بندوں کو تم اپنے دام فریب میں پھنسا نہیں سکتے۔ تم صرف ایسے شخص کو ہی پھنسا سکتے ہو جو تمہارا ہی ہم جنس ہو اور اس نے جہنم میں جانے کا تہیہ کر رکھا ہو۔

[۹۴] ❁ **اللہ اور جبرئیل کے درمیان نور کے ستر (۷۰) حجاب:۔** مشرکین عرب فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں اور اپنا معبود قرار دیتے تھے۔ ان تین آیات میں فرشتوں کی زبان سے اصل حقیقت بیان کی گئی ہے۔ یعنی تمہارے اس شرکیہ عقیدہ کے مقابلہ میں فرشتوں کا اپنا بیان یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک فرشتہ کا ایک مقررہ درجہ اور مقام ہے جس سے آگے ہم بڑھ نہیں سکتے۔ چنانچہ ترمذی کی ایک روایت کے مطابق ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا تم نے کبھی اپنے پروردگار کو دیکھا ہے؟ تو جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا کہ میرے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان نور کے ستر (۷۰) حجاب ہیں اگر میں اپنے مقام سے ذرا بھی آگے بڑھنے کی کوشش کروں تو جل جاؤں۔" (ترمذی۔ بحوالہ مشکوٰۃ۔ باب بدء الخلق و ذکر الانبیاء)

اور ہمارا تو یہ حال ہے کہ ہم ہر وقت اللہ کی بارگاہ میں صف بستہ کھڑے تسبیح و تہلیل کرتے رہتے ہیں اور ہمہ وقت اس کے حکم کے منتظر رہتے ہیں۔

[۹۵] ❁ **قریش کا دعویٰ کہ اگر ہمارے پاس نبی آیا ہوتا تو ہم اللہ کے مخلص بندے ہوتے:۔** سیدنا شعیب علیہ السلام کے بعد حجاز میں کوئی نبی نہیں آیا تھا۔ یہ لوگ جب سنتے کہ فلاں علاقہ میں فلاں نبی مبعوث ہوا ہے تو بسا اوقات یہ آرزو کیا کرتے کہ اگر ہمارے پاس بھی کوئی نبی آتا اور اللہ کی کتاب نازل ہوتی تو ہم اللہ کے ایسے فرمانبردار بندے بنتے جو دوسرے لوگوں کے لئے ایک مثال ہوتی۔ پھر جب ان کے پاس نبی آخر الزمان آگیا تو اپنے ایسے سب قول و قرار بھول گئے۔ نبی کی تکذیب کی اور اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ﴿۱۷۱﴾ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنصُورُونَ ﴿۱۷۲﴾ وَإِنَّ جُندَنَا لَهُمُ
الْغَالِبُونَ ﴿۱۷۳﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿۱۷۴﴾ وَأَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُونَ ﴿۱۷۵﴾ أَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ﴿۱۷۶﴾ فَإِذَا
نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنذَرِينَ ﴿۱۷۷﴾ وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿۱۷۸﴾ وَأَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُونَ ﴿۱۷۹﴾ سُبْحَانَ

اور ہمارے بندے جو رسول ہیں ان کے حق میں پہلے ہی حکم صادر ہو چکا ہے(۱۷۱) کہ یقیناً ان کی مدد کی جائے گی(۱۷۲) اور یقیناً ہمارا لشکر[۹۶] ہی غالب رہے گا(۱۷۳) سو آپ کچھ مدت ان سے اعراض کیجئے(۱۷۴) اور انہیں دیکھتے رہئے، یہ خود بھی جلد ہی دیکھ لیں گے(۱۷۵) کیا یہ ہمارے عذاب کے لئے جلدی مچا رہے ہیں؟(۱۷۶) جب وہ عذاب ان کے آنگنوں میں اترے گا تو وہ صبح ان کے لئے بہت بری[۹۷] ہوگی جنہیں ڈرایا گیا ہے۔(۱۷۷) اور ان سے کچھ مدت اعراض کیجئے(۱۷۸) اور دیکھتے رہئے وہ بھی جلد ہی دیکھ لیں گے(۱۷۹)

[۹۶] اللہ کے غلبہ سے مراد روحانی اور اصول دین کا غلبہ ہے:۔ ہمارا لشکر سے مراد رسول اللہ ﷺ اور ان کے جانثار مومنین بھی ہو سکتے ہیں۔ فرشتے بھی جو اللہ تعالیٰ نے چند غزوات میں مومنوں کی مدد کے لئے بھیجے اور وہ غیبی قوتیں بھی جو مومنوں کی مددگار ثابت ہوئیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ پہلے طے کر چکا ہے کہ اللہ حق و باطل کے معرکہ میں اپنے انبیاء اور ایمانداروں کی مدد کر کے حق کو ہی غالب کرے گا۔ لیکن اس غلبہ سے مراد صرف سیاسی غلبہ ہی نہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات انبیاء اور ان کے متبعین کو وہاں سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ اللہ نے ان کو عذاب اور مجرم قوم کے ظلم و ستم سے بچالیا لیکن انہیں سیاسی غلبہ حاصل نہ ہوا۔ بلکہ بعض دفعہ انبیاء کو قتل بھی کر دیا گیا۔ جبکہ اس سے مراد اخلاقی اقتدار اور دین کی اصولی باتوں کا غلبہ ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن قوموں نے حق کی مخالفت کی وہ بالآخر تباہ و برباد ہو کے رہیں۔ جہالت و ضلالت کے جو فلسفے بھی لوگوں نے گھڑے اور زندگی کے جو بگڑے ہوئے اطوار بھی زبردستی رائج کیے گئے وہ سب کچھ مدت تک زور دکھانے کے بعد آخر کار اپنی موت آپ مر گئے مگر جن حقیقتوں کو ہزارہا برس سے اللہ کے نبی حقیقت و صداقت کی حیثیت سے پیش کرتے رہے ہیں وہ پہلے بھی اٹل تھیں اور آج بھی اٹل ہیں۔ انہیں اپنی جگہ سے کوئی نہیں ہلا سکا۔

[۹۷] ۞ کفار مکہ پر جو عذاب آتے رہے:۔ جس عذاب کے لئے کفار مکہ جلدی مچا رہے ہیں وہ آئے گا ضرور مگر اپنے مقرر وقت پر آئے گا۔ اور اس طرح آئے گا کہ ان کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ کس طرف سے ان کی جڑ کٹ رہی ہے۔ چنانچہ جنگ بدر کے موقع پر ابو جہل کے سوا اکثر سرداروں کا یہ خیال تھا کہ ہمارا تجارتی قافلہ محفوظ نکل گیا ہے تو اب ہمیں جنگ نہ کرنا چاہئے مگر ابو جہل اکیلا اس بات پر مصر تھا کہ ہم میدان میں نکل آئے ہیں تو ہمیں اب اسلام کا سر کچل کے دم لینا چاہئے۔ مگر اس کا یہی اصرار اس کی اپنی موت اور کفر کی کمر توڑنے کا سبب بن گیا بالکل ایسی ہی صورت حال جنگ احزاب کے موقع پر پیش آئی اور فتح مکہ تو حقیقتاً کفر کی موت تھی۔ اس کے بعد اعلان براءت نے رہی سہی کسر بھی نکال دی۔ اتنی دفعہ تو ان لوگوں پر رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں عذاب آیا اور جوں جوں یہ لوگ عذاب سے دوچار ہوتے گئے۔ عذاب کے لئے جلدی مچانے کی باتیں از خود ہی ان کے دماغوں سے محو ہوتی گئیں۔ پہلا عذاب ہی دیکھنے کے بعد انہوں نے پھر کبھی عذاب مانگنے کا نام نہ لیا۔ پھر

رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝۱۸۰ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝۱۸۱ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۸۲ ع ۵ ۹

آپ کا پروردگار جو عزت کا مالک ہے ان باتوں سے پاک[۹۸] ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔(۱۸۰) اور رسولوں پر سلام ہو(۱۸۱) اور سب تعریف اللہ رب العالمین کے لئے (ہی سزاوار) ہے۔(۱۸۲)

آپ ﷺ کی زندگی کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے دین حق کو اور بھی زیادہ فتح و نصرت عطا فرمائی۔ اور یہ فتح سیاسی بھی تھی اور اسلامی اقدار کی بھی۔

[۹۸] یہ اس سورہ کا تتمہ ہے۔ مشرکوں کے شرکیہ عقائد کی مدلل تردید کے بعد نتیجہ یہ پیش کیا گیا ہے کہ اللہ کی ذات و صفات کے متعلق ان لوگوں نے جو باتیں گھڑ رکھی ہیں اور جن سے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں کچھ عیوب اور نقص لازم آتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات ایسے تمام عیوب اور نقائص سے پاک ہے۔ رسولوں پر سلامتی ہو کہ وہ اپنی اپنی قوموں سے دکھ سہہ سہہ کر بھی خالص توحید کی دعوت مسلسل پیش کرتے رہے۔ انہوں نے صرف اللہ کی عیوب سے پاکیزگی کا سبق ہی نہیں دیا بلکہ یہ تعلیم بھی دی کہ ہر طرح اچھی صفات، خوبیاں اور تعریف کی مستحق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ کیونکہ وہی تمام کائنات کا پروردگار ہے۔

۸۸ آیاتھا سُوْرَةُ صٓ مَكِّيَّةٌ رکوعھا ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ ① بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ② كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ③ وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۡ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ

کلمات ۷۳۸ آیت ۸۸ (۳۸) سورہ ص مکی ہے (۳۸) رکوع ۵ حروف ۳۱۰۷

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

ص۔ قرآن کی قسم جو سراسر نصیحت ہے۔(۱) بلکہ یہ کافر[۱] ہی تکبر اور مخالفت میں پڑے ہوئے ہیں(۲) ان سے پہلے ہم کئی قومیں ہلاک کر چکے ہیں (عذاب کے وقت) انہوں نے چیخ و پکار شروع کر دی۔ حالانکہ تب مخلصی کا وقت[۲] نہ رہا تھا(۳) کافر اس بات پر متعجب ہیں کہ انہی میں سے[۳] ایک ڈرانے والا ان کے پاس آیا ہے اور کافر کہنے لگے کہ: "یہ تو جادوگر[۴]

[۱] نصیحت والے قرآن کی قسم اٹھانے کے بعد بل کے لفظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہاں کچھ عبارت محذوف ہے جسے پڑھنے اور سننے والے کی فہم و بصیرت پر چھوڑ دیا گیا ہے اور یہ عبارت یوں بنتی ہے کہ اس سراسر نصیحت والے قرآن کی قسم کہ اس کی عبارت میں کوئی پیچیدگی نہیں، اس کے دلائل بھی عام فہم ہیں اور اس کے مطالب سمجھنے میں بھی کسی کو کوئی دشواری نہیں مگر کافر پھر بھی اس پر طرح طرح کے اعتراض کر رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ انہیں سمجھ نہیں آ رہی بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ اس کی تعلیمات کو تسلیم کرنے میں اپنی، اپنے آباء و اجداد کی اور اپنے معبودوں کی ہتک محسوس کرتے ہیں۔ لہٰذا اڑ کر اس کی مخالفت پر اتر آئے ہیں۔

[۲] سابقہ اقوام نے بھی یہی کچھ کیا تھا۔ پھر جب ان پر اللہ کا عذاب آ گیا اس وقت وہ اللہ سے فریاد کرنے لگے اور ایمان کا اقرار کرنے لگے۔ حالانکہ توبہ و استغفار اور ایمان لانے کا وقت گزر چکا تھا۔ وہ تو عذاب کے نزول یا موت سے پہلے پہلے ہی ہوتا ہے۔ بعد میں کوئی بات کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔

[۳] ۞ تعجب کی بات تو تب تھی کہ نبی کوئی اجنبی یا فرشتہ ہوتا: ان کی عقل پر کچھ اس طرح پتھر پڑ گئے ہیں کہ انہی میں سے ایک ڈرانے والا آیا ہے جو ان کی زبان جانتا ہے، انہی کی زبان میں انہیں سمجھاتا ہے، تو انہیں اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ ہم جیسا ہی ایک آدمی رسول بن بیٹھا ہے۔ حالانکہ تعجب کی بات تو تب تھی کہ کوئی اجنبی ان میں نبی بنا کر بھیج دیا جاتا جس کی زبان نہ یہ سمجھتے نہ وہ ان کی زبان سمجھتا۔ یا کوئی فرشتہ نبی بنا کر ان پر مسلط کر دیا جاتا جو ان کے انکار پر ان کی گردنیں توڑ کر رکھ دیتا۔

[۴] کافر آپ کو جادوگر ان معنوں میں کہتے تھے کہ آپ ﷺ اللہ کا جو کلام پیش کرتے تھے۔ اس میں اس قدر شیرینی اور تاثیر تھی کہ جو کوئی سنتا وہ آپ کا گرویدہ ہو جاتا اور آپ ﷺ ہی کا ہو کر رہ جاتا تھا۔ خواہ اسے اس راستہ میں کتنی ہی مشکلات پیش آتیں اور جھوٹا اس لحاظ سے کہتے تھے کہ آپ جو تعلیم پیش کر رہے تھے وہ ان کے معتقدات کے خلاف تھی۔

كَذَّابٌ ۝ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝۵ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَ اصْبِرُوْا عَلٰۤی اٰلِهَتِكُمْ ۚۖ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ۝۶ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚۖ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا

ہے بڑا جھوٹا“ (۴) اس نے تو سب خداؤں کو ایک ہی الٰہ بنا ڈالا۔ یہ کیسی عجیب بات ہے“ (۵) اور ان کے سردار چل کھڑے ہوئے (اور کہنے لگے کہ) ”چلو اور اپنے خداؤں کی عبادت [۵] پر ڈٹے رہو۔ یہ بات تو کسی اور ہی ارادہ [۶] سے کہی جا رہی ہے“ (۶) جو ہم نے زمانہ قریب کے دین [۷] میں کبھی نہیں سنی۔ یہ تو بس ایک من گھڑت بات ہے۔ (۷)

وہ تو یہ سوچنے کے لئے قطعاً تیار نہ تھے کہ ہمارے معتقدات بھی غلط ہو سکتے ہیں اس کے بجائے وہ آپ ﷺ کو جھوٹا کہہ دیتے تھے۔

[۵] ۞ سمجھوتہ کے لئے ایک ۲۵ رکنی وفد کا ابو طالب کے پاس آنا:۔ ان آیات کے نزول کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۰ نبوی میں ابو طالب بیمار پڑ گئے (اسی مرض سے ان کی وفات ہوئی اور اس سال ام المومنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا تھا لہٰذا اس سال کو عام الحزن کہا جاتا تھا۔ کیونکہ اس سال رسول اللہ ﷺ کو یہ دونوں بھاری صدمے پہنچے تھے) اس وقت ابو طالب کی عمر ۸۰ برس کی ہو چکی تھی نیز رسول اللہ ﷺ کی حمایت میں انہوں نے جو مصائب، اور شعب ابی طالب میں جو فاقے جھیلے تھے انہوں نے ابو طالب کو بہت کمزور کر دیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب ان کی زندگی کے دن گنے جا چکے ہیں۔ سرداران قریش کو خیال آیا کہ اگر ابو طالب کے مرنے کے بعد ہم نے اس کے بھتیجے محمد ﷺ پر زیادتی کی تو سارا عرب یہ طعنہ دے گا کہ چچا کے جیتے جی تو ان سے کچھ بن نہ پڑا اب اس کے مرنے کے بعد اسے دبانے لگے ہیں۔ لہٰذا ابو طالب کی زندگی میں ہی سمجھوتہ کی غرض سے سردارانِ قریش کا ایک ۲۵ رکنی وفد ابو طالب کے پاس آیا اور کہا کہ ”ذرا اپنے بھتیجے کو بلاؤ۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم اس کے مذہب میں مداخلت نہیں کرتے وہ اپنے مذہب کے مطابق جیسے چاہے عبادت کرے۔ لیکن یہ لوگ ہمارے مذہب میں مداخلت نہ کریں۔ نہ ہمارے معبودوں اور بزرگوں کو برا بھلا کہیں۔ وہ ہمیں ہمارے دین پر چھوڑ دیں اور ہم انہیں ان کے دین پر چھوڑ دیں“ چنانچہ ابو طالب نے آپ ﷺ کو بلایا۔ اس وقت ابو طالب کے قریب ایک آدمی کی جگہ خالی تھی۔ ابو جہل فوراً اٹھ کر وہاں جا بیٹھا تاکہ آپ ﷺ اس کے قریب نہ بیٹھ سکیں۔ خیر جب آپ ﷺ پرے ہٹ کر بیٹھ گئے تو ابو طالب نے کہا: ”یہ تمہاری قوم کے معزز لوگ ہیں اور اس قسم کی بات پر سمجھوتہ اور عہد و پیمان کرنے آئے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

۞ آپ کا جواب ایک اللہ کی عبادت کرو عرب و عجم کے مالک بن جاؤ گے: آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: ”کیا میں انہیں ایسی بات نہ بتاؤں کہ اگر وہ اسے مان لیں تو سارا عرب ان کے تابع فرمان ہو جائے اور عجم پر ان کی بادشاہت قائم ہو جائے اور وہ انہیں جزیہ ادا کریں؟“ یہ سن کر ابو جہل کہنے لگا: تمہارے باپ کی قسم! ایسی ایک بات کیا، دس باتیں بھی پیش کرو تو ہم ماننے کو تیار ہیں“ آپ ﷺ نے کہا: ”تم لوگ لا الٰہ الا اللہ کہو اور اللہ کے سوا جن جن کو پوجتے ہو

انہیں چھوڑ دو" اس بات پر ان سب نے ہاتھ پیٹ پیٹ کر کہا: محمد ﷺ! سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا! یہ تو بڑی عجیب بات ہے" پھر آپس میں کہنے لگے: اٹھو یہاں سے اور اپنے آباء کے دین پر ڈٹ جاؤ۔ یہ شخص تمہاری کوئی بات ماننے کو تیار نہ ہوگا۔ اسی موقع پر اس سورہ ص کی ابتدائی سات آیات نازل ہوئیں (ابن ہشام) ۱: ۴۱۷ تا ۴۱۹) اسی واقعہ کو امام ترمذی نے مختصراً یوں روایت کیا ہے:

"ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ابو طالب بیمار ہوئے تو قریش اس کے پاس آئے اور نبی اکرم ﷺ بھی ان کے پاس آئے اور ابو طالب کے پاس ایک ہی آدمی کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ ابو جہل اٹھا کہ آپ ﷺ کو وہاں بیٹھنے سے روک دے۔ پھر ان لوگوں نے ابو طالب سے آپ ﷺ کے متعلق شکایت کی۔ ابو طالب آپ ﷺ سے کہنے لگے: "بھتیجے! تم اپنی قوم سے کیا چاہتے ہو؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "صرف ایک کلمہ: اگر وہ اسے قبول کر لیں تو عرب کے حاکم بن جائیں اور عجم سے جزیہ لیں" ابو طالب نے کہا: "صرف ایک کلمہ؟" آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں صرف ایک کلمہ" پھر فرمایا: "چچا جان! آپ ﷺ لوگ یہ تسلیم کر لیں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں" قریش کہنے لگے: "کیا ہم صرف ایک ہی خدا کی عبادت کریں (باقی سب چھوڑ دیں) یہ تو بڑی عجیب بات ہے ہم نے زمانہ قریب کے دین میں تو یہ بات کبھی سنی ہی نہیں۔ یہ تو محض من گھڑت بات ہے" انہیں لوگوں کے حق میں یہ آیات نازل ہوئیں" (ترمذی۔ کتاب التفسیر)

عرب میں قبیلے قبیلے کا جدا جدا بت تھا۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ہر قبیلے کا بت اس قبیلے کے لوگوں کی مشکلات کو دور کرتا اور ان کی حاجات پوری کرتا ہے۔ اور بڑا خدا یا رب العالمین صرف ان کی نگرانی کر رہا ہے۔ لہٰذا انہیں یہ بات دور از قیاس بلکہ محال معلوم ہوتی تھی کہ ایک ہی پروردگار تمام جہان کے لوگوں کی ضروریات کو پورا کرے۔

[۶] ۞ قریش کا خیال کہ یہ نبی اقتدار چاہتا ہے:۔ یعنی اس دعوت میں ضرور کچھ کالا ہے اس نبی کی اصل غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ اکیلے خدا کا نام لے کر ہم سب کو اپنا تابع اور محکوم بنالے اور اپنی حکومت قائم کرے۔ ہم بھلا اس کی یہ بات چلنے دیں گے؟ ہم تو یہ بات کسی قیمت پر قبول نہیں کر سکتے۔ بعض مفسرین نے اس کا یہ مطلب بھی لیا ہے کہ محمد ﷺ جس عزم و استقلال کے ساتھ اپنی دعوت پیش کر رہے ہیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ کسی طرح اس سے ہٹنے والے نہیں اور ایسا انقلاب آ بھی سکتا ہے لہٰذا جہاں تک ہو سکے اپنے آبائی دین کی حفاظت پر ڈٹ جاؤ۔

[۷] یعنی قریب کے زمانہ میں ہمارے اپنے بزرگ بھی گزرے ہیں یہودی اور عیسائی بھی ہمارے ملک اور آس پاس کے ملکوں میں موجود ہیں۔ ایران، عراق اور مشرقی عرب مجوسیوں سے بھرا پڑا ہے۔ کسی نے بھی ہم سے یہ نہیں کہا کہ انسان بس ایک اللہ کو مانے اور کسی کو نہ مانے۔ اللہ کے پیاروں کے تصرفات کو تو ایک دنیا مان رہی ہے اور ان سے فیض پانے والے بتا رہے ہیں کہ ان درباروں سے فی الواقع لوگوں کی مشکل کشائی اور حاجت روائی ہو جاتی ہے۔ پھر آخر اللہ اکیلے پر کون اکتفا کرتا ہے؟ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض ایک من گھڑت بات ہے اور اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہم ان کی تابعداری کریں اور یہ ہمارا حاکم بن جائے۔

اخْتِلَاقٌ ۝۷ ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا ۭ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِيْ ۚ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ ۝۸
اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَاۗىِٕنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيْزِ الْوَهَّابِ ۝۹ اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا
بَيْنَهُمَا ۣ فَلْيَرْتَقُوْا فِي الْاَسْبَابِ ۝۱۰ جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ ۝۱۱ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ

کیا ہم میں سے یہی ایک شخص[۸] رہ گیا تھا جس پر ذکر نازل کیا گیا؟" میرے ذکر کے بارے میں ہی شک میں[۹] پڑے ہیں اور یہ اس لیے کہ انہوں نے ابھی تک میرا عذاب[۱۰] نہیں چکھا۔(۸) یا ان کے پاس آپ کے پروردگار کی رحمت کے خزانے[۱۱] ہیں جو ہر چیز پر غالب اور سب کو عطا کرنے والا ہے(۹) یا یہ آسمانوں، زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کے مالک ہیں (اگر یہ بات ہے تو) یہ رسیاں تان کر اوپر چڑھ[۱۲] جائیں(۱۰) یہ تو بڑے بڑے لشکروں میں ایک معمولی سا لشکر ہے جو اسی جگہ[۱۳] شکست کھا جائے گا۔(۱۱) ان سے پہلے قوم نوح،

[۸] ۞ قریش کا قول کہ کیا نبوت کے لئے یہی شخص رہ گیا تھا؟: دنیادار لوگوں کے نزدیک کسی شخص کی عظمت کو ماپنے کا پیمانہ مال و دولت ہوتا ہے یا جاہ منصب۔ اسی خیال سے کفار مکہ کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اگر اللہ نے ہم میں سے کسی بشر کو ہی رسول بنانا تھا تو کیا اللہ تعالیٰ کو یہی شخص رسالت کے لئے ملا تھا کیا سرداران قریش مر گئے تھے؟ اگر بنانا ہی تھا تو مکہ اور طائف کے لوگوں میں سے کسی رئیس کو اپنا رسول بناتا۔ بالفاظ دیگر ان کا اصل اعتراض یہ تھا کہ اللہ میاں نے رسالت کا منصب سونپتے وقت ہم سے مشورہ کیوں نہیں لیا؟۔

[۹] بات یوں نہیں بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ یہ لوگ سرے سے آپ ﷺ کی رسالت ہی کے منکر ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرا کلام بھی ان کے نزدیک مشکوک ہو گیا ہے اور اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رسالت سے پیشتر کفار مکہ آپ ﷺ کی راستبازی کے قائل تھے۔ اب جو آپ ﷺ کی رسالت کے دعویٰ میں ان کی جانب سے آپ ﷺ کی راستبازی پر بھی شک کیا جانے لگا ہے اور اس ہستی کو کذاب کہنے لگے ہیں جسے وہ ہمیشہ سے راستباز سمجھتے آئے ہیں تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انہیں میرے ذکر، میرے کلام اور میرے پیغام میں شک ہے۔

[۱۰] ان کے ایسے بیہودہ اعتراض کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ابھی تک انہوں نے میری مار کا مزا نہیں چکھا۔ ایک دفعہ انہیں میری مار پڑ گئی تو ان کے سب کس بل نکل جائیں گے اور آئندہ ایسی باتیں بنانے کا انہیں ہوش ہی نہ رہے گا۔

[۱۱] ۞ جواب: کیا یہ اپنے آپ کو اللہ کی رحمت کا ٹھیکیدار سمجھتے ہیں: اللہ کی رحمت کے خزانوں کے یہ تو مالک نہیں کہ جس کو چاہیں اسے رسالت کے منصب پر فائز کر دیں۔ اور جس سے چاہیں چھین لیں۔ یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کا ہے جو ہر ایک کو دے رہا ہے اور جونسی نعمت جسے چاہتا ہے اسے ہی دیتا ہے۔ اس کے کاموں میں کسی کو مداخلت کی ہمت نہیں۔

[۱۲] اور دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا یہ زمین و آسمان کی چیزوں کے مالک ہو گئے ہیں جو یہ خدائی اختیارات اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں؟ اگر ایسی بات ہے تو انہیں چاہئے کہ تمام اسباب کو بروئے کار لا کر آپ ﷺ پر وحی کا سلسلہ بند کر دیں۔ اور جسے یہ رسالت کے لئے منتخب کرنا چاہتے ہیں وحی کا رخ ادھر موڑ دیں۔

[۱۳] اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں بڑھ بڑھ کر باتیں بنانے والے گروہوں میں سے یہ کوئی اتنا بڑا جتھا نہیں ان سے بڑے بڑے جتھے

نُوحٍ وَّعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ ﴿۱۲﴾ وَثَمُوْدُ وَقَوْمُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ لْئَيْكَةِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الْاَحْزَابُ ﴿۱۳﴾ اِنْ

ع كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ﴿۱۴﴾ وَمَا يَنْظُرُ هٰٓؤُلَاۗءِ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ

فَوَاقٍ ﴿۱۵﴾ وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۱۶﴾ اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ

عاد اور میخوں والا[۱۴] فرعون جھٹلا چکے ہیں(۱۲) نیز ثمود، قوم لوط اور اصحاب[۱۵] ایکہ بھی (جھٹلا چکے) یہ واقعی[۱۶] بڑے لشکر تھے۔(۱۳) ان سب نے رسولوں کو جھٹلایا تو ان پر میرا عذاب واجب ہو گیا(۱۴) یہ لوگ بس ایک دھماکہ کے منتظر ہیں جس میں کوئی وقفہ[۱۷] نہیں ہو گا(۱۵) اور کہتے ہیں: ''پروردگار! ہمیں ہماری چارج شیٹ جلدی کر کے روز حساب[۱۸] سے پہلے ہی دے دے''(۱۶) آپ ان کی باتوں پر صبر کیجئے

پہلے گزر چکے اور مات کھا چکے ہیں۔ یہ کفار مکہ کی تو ایک معمولی سی جمعیت ہے جو اسی مقام پر یعنی مکہ میں ہی جہاں یہ بیٹھے باتیں بنا رہے ہیں، اپنی مکمل شکست دیکھ لیں گے۔ یہ گویا کفار مکہ کے حق میں ایک پیشین گوئی تھی جو چند ہی سال بعد حرف بحرف پوری ہو کے رہی۔

[۱۴] میخوں والا فرعون:۔ اگر محاورۃً اس کے معنی لئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ ایک بڑی مضبوط سلطنت کا مالک تھا۔ تاہم اس کے لفظی معنی بھی لئے جا سکتے ہیں۔ فرعون کا دستور یہ تھا کہ جس شخص کو سولی پر چڑھانا ہوتا تو اسے تختے کے ساتھ کھڑا کر کے اس کے ہاتھوں اور پاؤں میں چار میخیں ٹھونک دیا کرتا تھا اسی وجہ سے وہ ذِی الْاَوْتَادِ یعنی میخوں والا مشہور ہو گیا تھا۔ مزید تشریح سورۂ فجر کی آیت نمبر ۱۰ کے حاشیہ میں دیکھئے۔

[۱۵] اصحاب الایکہ:۔ لفظی معنی ''بن والے'' ان کا علاقہ ایک سطح مرتفع پر واقع تھا۔ ان کی طرف شعیب علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ ان کا حال پہلے گزر چکا ہے۔

[۱۶] بڑی طاقتیں اور قومیں جو تباہ ہو چکیں ہیں:۔ ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے سابقہ اقوام میں سے چھ قوموں کے نام گنوا کر کفار مکہ کو خبردار کیا ہے کہ وہ فی الواقع بڑے مضبوط جتھے تھے۔ قد و قامت میں 'زور و قوت میں، مال و دولت کی فراوانی اور خوشحالی میں ان سے بہت آگے تھے ان کی تعداد بھی کفار مکہ سے بہت زیادہ تھی۔ مگر جب انہوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا تو میرا عذاب ان پر نازل ہوا تو انہیں ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔ اب تم کس کھیت کی مولی ہو کہ میرے رسول کی تکذیب کرنے کے بعد صحیح و سلامت بچے رہو گے۔

[۱۷] فواق کا لغوی معنی:۔ فواق دراصل دودھ دوہتے وقت گائے کا ایک دفعہ تھن نچوڑنے اور دوسری دفعہ وہی تھن نچوڑنے کے درمیان کے وقفہ کو کہتے ہیں۔ اور اس سے مراد انتہائی قلیل مدت لی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جب یہ دھماکہ یا کڑکا ہو گا تو یہ اس وقت تک مسلسل ہوتا رہے گا جب تک سارے مجرم ڈھیر نہ ہو جائیں اور اس میں معمولی سا وقفہ بھی نہ ہو گا۔ اور دوسرا مطلب یہ کہ انہیں ہلاک کرنے کے لئے ایک کڑکا ہی کافی ہو گا دوسرے کی نوبت یا حاجت ہی پیش نہ آئے گی۔

[۱۸] کفار کا مطالبہ ہمارا اعمال نامہ ابھی دیا جائے:۔ چونکہ کفار مکہ بعث بعد الموت، روز آخرت، اعمال نامہ اور حساب کتاب سب باتوں کے منکر تھے۔ اس لئے از راہ مذاق جس طرح یہ کہتے تھے کہ جس عذاب کی تم دھمکی دیتے ہو وہ لے کیوں نہیں

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۷﴾ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ
وَالْاِشْرَاقِ ﴿۱۸﴾ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ۭ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۹﴾ وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ﴿۲۰﴾

اور ہمارے بندے داؤد[۱۹] کو یاد کیجئے۔ بلا شبہ وہ[۲۰] صاحب قوت اور (ہماری طرف) رجوع[۲۱] کرنے والا تھا۔(۱۷)
ہم نے پہاڑوں کو مسخر کر دیا تھا کہ وہ صبح و شام ان کے ساتھ (مل کر) تسبیح کرتے تھے(۱۸) اور پرندوں کو بھی جو
جمع ہو جاتے تھے وہ سب ان کی تسبیح کی طرف متوجہ[۲۲] ہو جاتے تھے۔(۱۹) ہم نے ان کی سلطنت کو مضبوط بنا دیا
تھا، ہم نے انہیں حکمت عطا کی اور مقدمات[۲۳] کے فیصلہ کی اِستعداد بخشی تھی۔(۲۰)

آتے؟ اسی طرح یہ بھی کہتے تھے کہ ہمارا اعمال نامہ جو ہمیں قیامت کے دن ملنا ہے ابھی ہمارے حوالے کر دیں اور ہمارے حصے جو شامت لکھی ہوئی ہے وہ اس دنیا میں ہی ہم سے حساب لے لے۔

[۱۹] وَاذْکُرْ کا دوسرا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا قصہ دوسروں سے بیان کیجئے۔

[۲۰] ۞ یداور ذوالاید کا لغوی مفہوم:۔ ذَا الْاَیْدِ کا لفظی معنی ہاتھوں والا ہے اور تقریباً ہر زبان میں ایسے لفظ بول کر قوت اور طاقت مراد لی جاتی ہے۔ صاحب قوت سے مراد جسمانی قوت بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ آپ سے متعلق منقول ہے کہ بچپن میں جب آپ بکریوں کا ریوڑ چرایا کرتے تھے تو جب کوئی درندہ ان پر حملہ آور ہوتا آپ اس کے ایک جبڑے کو پکڑ کر دوسرے کو اس زور سے کھینچتے تھے کہ اسے چیر دیتے تھے پھر یہ بھی آپ کی جسمانی قوت ہی تھی کہ آپ نے میدانِ کارزار میں جالوت کو مار ڈالا تھا۔ اور فوجی اور سیاسی قوت بھی مراد ہو سکتی ہے کہ آپ نے گرد و پیش کی مشرک قوموں کو شکست دے کر ایک مضبوط اسلامی سلطنت قائم کر دی تھی۔

[۲۱] ۞ آپ کے اعلیٰ درجہ کے اوصاف:۔ ان کے رجوع الی اللہ اور عبادت گزاری کا یہ حال تھا کہ آپ نے بادشاہی پر ہمیشہ فقیری کو ترجیح دی۔ آپ کی تعریف میں بہت سی صحیح احادیث وارد ہیں۔ آپ نے اپنے ذاتی اخراجات کا بار بیت المال پر نہیں ڈالا تھا بلکہ اپنے ہاتھ کی کمائی سے اپنا خرچ چلاتے تھے۔ آپ ایک دن روزہ رکھتے، دوسرے دن روزہ نہ رکھتے 'زندگی بھر یہی دستور رہا۔ رات کا تہائی حصہ عبادت میں گزارتے تھے۔ آپ نے دن رات کے چوبیس گھنٹوں کو اپنے اور اپنے بال بچوں میں کچھ اس طرح تقسیم کر رکھا تھا کہ کوئی وقت ایسا نہ گزرے جبکہ آلِ داود میں سے کوئی شخص اللہ کی عبادت میں مصروف و مشغول نہ ہو۔ آپ نے یہ التزام بھی کر رکھا تھا کہ ہر تین دنوں میں ایک دن اللہ کی عبادت کے لئے تھا۔ ایک دن لوگوں کے مقدمات کے فیصلہ کے لئے اور ایک دن امور سلطنت کے انتظام و انصرام میں صرف کرتے تھے۔

[۲۲] ۞ سیدنا داؤد کی خوش الحانی:۔ اللہ نے آپ علیہ السلام کو ایسی سریلی آواز بخشی تھی کہ اس میں ایسی شیرینی اور تاثیر تھی کہ جب آپ ہر روز پہلے پہر اور پچھلے پہر اللہ کی حمد کے ترانے گاتے تو پوری فضا مسحور ہو جاتی تھی۔ پہاڑوں کی وادیوں میں ایسی گونج پیدا ہو جاتی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ پہاڑ بھی آپ کے ساتھ اللہ کی حمد و ثنا میں شریک ہو گئے ہیں۔ اور پرندوں تک آپ کے گرد و پیش میں جمع ہو کر آپ کے نغمات نہایت توجہ سے سنتے اور چہچہا کر آپ کے ہم آہنگ ہو جاتے تھے۔ آپ کی اس خوش الحانی کا ذکر پہلے سورہ المومنون کی آیت ۷۹ میں بھی گزر چکا ہے۔ اور سورہ سبا کی آیت نمبر ۱۰ میں بھی۔

[۲۳] اس کا مطلب تو ترجمہ سے واضح ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ خطاب یا تقریر یا باہمی گفتگو کے درمیان آپ کا انداز

وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ﴿۲۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۚ
خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَآ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ ﴿۲۲﴾ اِنَّ
هٰذَآ اَخِيْ ۫ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ۫ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ﴿۲۳﴾

وقف لازم

بھلا آپ کے پاس ان مقدمہ [۲۴] والوں کی خبر پہنچی ہے جو دیوار پھاند کر محراب میں جا پہنچے تھے۔ (۲۱) جب وہ داؤد کے پاس آپہنچے تو وہ انہیں دیکھ کر گھبرا [۲۵] گئے۔ وہ کہنے لگے ڈرو نہیں۔ ہم مقدمہ کے دو فریق [۲۶] ہیں جن میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے لہٰذا ہمارے درمیان انصاف سے فیصلہ کیجئے۔ اور زیادتی نہ کیجئے اور ہمیں سیدھی راہ بتایئے۔ (۲۲) یہ میرا بھائی ہے۔ اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک ہی دنبی ہے۔ اب یہ کہتا ہے کہ وہ بھی مجھے دے دے اور گفتگو میں بھی اس [۲۷] نے مجھے دبا لیا ہے۔ (۲۳)

گفتگو ایسا مدلل، سادہ اور عام فہم ہوتا تھا کہ مخاطب آسانی سے آپ کا مافی الضمیر سمجھ جاتا تھا۔

[۲۴] ۞ خصم کا لغوی مفہوم:۔ خصم بمعنی دعویدار، مدعی اور مدعا علیہ، دونوں یا ان دونوں میں سے کوئی ایک۔ فریق مخالف۔ خواہ ایک فرد ہو یا زیادہ ہوں۔ نیز ایسا جھگڑا یا مقدمہ بھی جس میں فریقین کے حقوق زیر بحث ہوں۔

[۲۵] ایک دن آپ علیہ السلام عبادت میں مصروف تھے اور یہ دن آپ کی عبادت کا دن تھا۔ اس دن آپ خلوت میں رہتے اور دربان کسی کو آپ کے پاس نہ آنے دیتے تھے۔ ناگہانی طور دو شخص دیوار پھاند کر آپ کے پاس آن کھڑے ہوئے۔ سیدنا داؤد علیہ السلام یہ ماجرا دیکھ کر گھبرا گئے کہ یہ آدمی ہیں یا کوئی اور مخلوق ہے؟ آدمی ہیں تو انہیں اس وقت آنے کی کیسے ہمت ہوئی۔ دربانوں نے انہیں کیوں نہیں روکا۔ اتنی اونچی دیواروں کو پھاند کر کس نیت اور کس غرض سے آئے ہیں۔ اچانک یہ عجیب اور مہیب واقعہ دیکھ کر گھبرا گئے۔

[۲۶] ۞ دیوار پھاند کر اندر آنے والے دو شخص اور مقدمہ کی نوعیت:۔ اکثر مفسرین کا یہ خیال ہے کہ یہ آدمی نہیں بلکہ فرشتے تھے جو انسانی شکل میں آئے اور انہیں اللہ تعالیٰ نے سیدنا داؤد علیہ السلام کے پاس تنبیہ کے طور پر بھیجا تھا۔ جیسا کہ اگلے بیان سے واضح ہوتا ہے۔ انہوں نے آپ علیہ السلام کی گھبراہٹ کو محسوس کر لیا تو کہنے لگے کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ ہم دونوں میں ایک جھگڑا ہے۔ وہ سن کر آپ ہمارے درمیان انصاف سے فیصلہ کر دیجئے تاکہ کسی فریق پر زیادتی نہ ہونے پائے۔

[۲۷] اس تمہیدی مشترکہ بیان کے بعد مدعی نے اپنا مقدمہ پیش کیا کہ یہ (مدعا علیہ) میرا بھائی ہے (بھائی سے مراد یہ نہیں کہ وہ رشتے سے بھائی ہو، بلکہ دینی بھائی بھی مراد ہو سکتا ہے اور کسی کاروباری اشتراک کی بنا پر بھی) اس کے پاس ننانوے دنبیاں تو پہلے ہی موجود ہیں اور میرے پاس صرف ایک ہے۔ اب یہ کہتا ہے کہ وہ بھی مجھے دے دے اور مجھے اس سے اپنے حق کی حفاظت کے لئے بات کرنے کی بھی ہمت نہیں۔ مجھے ایسی بات کرنے ہی نہیں دیتا اور دبا جاتا ہے۔

قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَاۗءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰي بَعْضٍ

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ ۭ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا

داؤد نے جواب دیا کہ اس شخص نے تیری دنبی کو اپنی دنبیوں میں ملانے کے لئے اس کا سوال کر کے تجھ پر ظلم کیا ہے۔ اور اکثر خلیط[۲۸] ایک دوسرے پر زیادتی[۲۹] کرتے ہی رہتے ہیں سوائے ان لوگوں کے جو ایماندار ہوں اور نیک عمل کرتے ہوں اور ایسے لوگ تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ اب داؤد کو خیال آیا کہ (اس مقدمہ سے) دراصل ہم نے اس کی آزمائش[۳۰] کی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے پروردگار سے معافی مانگی اور رکوع میں گر گئے

[۲۸] خُلَطَاء خَلِیْط کی جمع ہے اور خلیط کا معنی جزوی شریک کار ہے۔ یعنی ایسی کاروباری شراکت جس میں شریک کام کاج کے کچھ پہلوؤں میں تو آپس میں شریک ہوں اور کچھ پہلوؤں میں آزاد ہوں۔ مثلاً زید اور بکر دونوں کے پاس الگ الگ ریوڑ ہے جو ان کی اپنی اپنی ملکیت ہے لیکن ان کی حفاظت کے لئے جگہ مشترکہ طور پر کرایہ پر لے رکھی ہے۔ چرواہے کو مل کر معاوضہ ادا کرتے ہیں۔ تو ایسے شریک ایک دوسرے کے خلیط کہلاتے ہیں۔

[۲۹] مدعی کا بیان سننے کے بعد جب مدعا علیہ خاموش رہا اور اس نے مدعی کے بیان پر کوئی تنقید یا اس کی کوئی تردید نہ کی تو سیدنا داؤد علیہ السلام نے سمجھا کہ مقدمہ کی نوعیت وہی ہے جو مدعی نے بیان کی ہے۔ لہٰذا آپ نے مدعی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: کہ واقعی مدعا علیہ نے اس قسم کا سوال کر کے تم پر ظلم اور زیادتی کی ہے۔ اسے ہرگز ایسا نہ کرنا چاہئے تھا۔ مگر اکثر دنیادار شرکائے کار ایک دوسرے پر ایسی زیادتیاں کرتے ہی رہتے ہیں الا یہ کہ وہ ایماندار ہوں اور اللہ سے ڈرنے والے ہوں۔ مگر ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں۔

[۳۰] ❁ **سیدنا داؤد اور اسرائیلیات:۔** جب فریقین مقدمہ آپ کا یہ فیصلہ سنتے ہی رخصت ہو گئے اور انہوں نے اس فیصلہ کے نفاذ کا بھی مطالبہ نہ کیا تو سیدنا داؤد علیہ السلام شش و پنج میں پڑ گئے۔ سوچنے پر انہیں خیال آیا کہ یہ مقدمہ ان فریقین مقدمہ کا نہ تھا۔ بلکہ یہ ان کا اپنا مقدمہ تھا۔ اور یہ شخص آپ کے پاس تنبیہ کے طور پر آئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے خود سیدنا داؤد کو ایک آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی انہوں نے اپنے پروردگار سے معافی مانگنی شروع کر دی۔ یہ آزمائش کیا تھی؟ اس کے متعلق اسرائیلیات میں بہت لغو اور شرمناک باتیں مذکور ہیں جنہیں ہمارے بعض مفسرین نے بھی نقل کر دیا ہے کہ سیدنا داؤد علیہ السلام کی اپنی ننانوے بیویاں تھیں۔ اس کے باوجود آپ اپنے ایک فوجی افسر ''اوریاحتی'' کی بیوی پر عاشق ہو گئے اور بعض روایات کے مطابق آپ نے نعوذ باللہ اس سے زنا بھی کیا پھر اس فوجی افسر کو کسی مہم پر بھیج دیا جہاں وہ مارا گیا۔ یا آپ نے خود اسے قتل کروا دیا۔ اس کے بعد اس کی بیوی سے نکاح کر لیا۔ اسرائیلیات میں جس طرح انبیاء کی عصمت کو داغدار کیا گیا ہے یہ اس کی ایک بدترین مثال ہے اسی لئے اکثر مفسرین نے اس واقعہ کی پرزور تردید کی ہے۔ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ تو یہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص ایسی ہرزہ سرائی کرے گا میں اس کو ایک سو ساٹھ کوڑے لگاؤں گا۔ کیونکہ قذف کی حد اسی کوڑے ہے اور کسی نبی پر تہمت کی حد دگنی ہونی چاہئے۔

❁ **سیدنا داؤد کی آزمائش کیا تھی:۔** اب سوال یہ ہے معاملہ کی اصل نوعیت کیا تھی تو قرآن کے انداز بیان سے ہی اس کی

السجدۃ ۱۰ وَاَنَابَ ۩ ﴿۲۴﴾ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ۭ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۲۵﴾ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ

خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ

ع ۲ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴿۲۶﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاۗءَ

اور اس کی طرف رجوع [۳۱] کیا۔ (۲۴) تب ہم نے ان کی یہ غلطی معاف کر دی اور ہمارے ہاں یقیناً اسے بڑا قرب ملے گا اور اچھی بازگشت [۳۲] ہو گی (۲۵) (ہم نے ان سے کہا) اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین میں نائب بنایا ہے لہٰذا لوگوں میں انصاف سے فیصلہ کرنا اور خواہشِ نفس کی پیروی [۳۳] نہ کرنا ورنہ یہ بات تمہیں اللہ کی راہ سے بہکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بہک جاتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے کیونکہ وہ روزِ حساب [۳۴] کو بھول گئے۔ (۲۶) اور ہم نے آسمان،

حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ یہ مقدمہ سیدنا داؤد ؑ کی خواہش نفس سے تعلق رکھتا تھا۔ اور اس مقدمہ کا حاکمانہ اقتدار کے نامناسب استعمال سے بھی تعلق تھا جیسا کہ مدعی نے کہا تھا کہ وہ مجھے بات میں دبا لیتا ہے اور میں اس کے سامنے بات بھی نہیں کر سکتا۔ اور یہ بھی مسلّم ہے کہ سیدنا داؤد ؑ کی ننانوے بیویاں تھیں۔ اور یہ بھی مدعی نے یوں کہا تھا کہ یہ میرا بھائی مجھ سے میری ایک دنبی بھی لے لینا چاہتا ہے۔ اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ میری دنبی اس نے مجھ سے چھین لی ہے۔ پھر فوراً ہی سیدنا داؤد ؑ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ ان باتوں کی روشنی میں جو صورتِ حال سامنے آتی ہے وہ یہ ہے۔ کہ داؤد ؑ نے اوریا حتی کی بیوی کے اچھے عادات و خصائل کا کہیں سے ذکر سن لیا تو انہیں دل میں خیال آ گیا ہو گا کہ اگر یہ عورت میرے نکاح میں ہوتی تو کیا اچھا تھا۔ بس اس خیال کا آنا تھا کہ ادھر اللہ کی طرف سے گرفت ہو گئی۔ اگرچہ ایسے خیالات کا آنا عام لوگوں کے لئے کوئی قابلِ مؤاخذہ بات نہیں مگر انبیاء کا مقام اور ہے۔ لہٰذا ان کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں پر بھی اللہ تعالیٰ انہیں فوراً اور بروقت تنبیہ فرما دیتے ہیں۔

[۳۱] اس آیت پر سجدہ ہے۔ یعنی جس طرح سیدنا داؤد ؑ اللہ کے حضور رجوع ہو گئے تھے۔ عام مسلمانوں کو بھی اس کام میں ان کا ساتھ دینا چاہئے۔ البتہ ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ سورہ ص کا سجدہ کچھ تاکیدی سجدوں میں سے نہیں اور میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس میں سجدہ کرتے دیکھا ہے۔ (بخاری' کتاب الصلوٰۃ۔ باب ماجاء فی سجود القرآن)

[۳۲] یعنی اس غلطی سے ان کے تقرب اور مرتبہ میں کچھ فرق نہیں آیا۔ صرف تھوڑی سی تنبیہ کر دی گئی۔ کیونکہ مقربین کی چھوٹی سی غلطی بھی بڑی سمجھی جاتی ہے۔

[۳۳] یعنی تمہارا مقام عام لوگوں سے بہت بلند ہے کیونکہ تم ہمارا نائب ہونے کی حیثیت سے لوگوں میں فیصلے کرتے ہو۔ لہٰذا تمہارے کسی بھی معاملہ میں یا فیصلہ میں اپنی خواہشِ نفس کا شائبہ تک نہ ہونا چاہئے کیونکہ یہی چیز اللہ کی راہ سے بہکانے والی ہوتی ہے۔

[۳۴] یعنی انسان بہکتا اس وقت ہے جب اپنی خواہشِ نفس کے پیچھے لگ جائے اور اپنی خواہشِ نفس کے پیچھے اس وقت لگتا ہے جب اللہ کے حساب کا دن یاد نہ رہے۔ اگر اللہ کے سامنے جواب دہی کا تصور آنکھوں کے سامنے رہے تو انسان خواہش نفس کی قطعاً پروا نہیں کرتا۔ اور جو شخص یوم الحساب کو بھول گیا تو لازماً اپنی زندگی شترِ بے مہار کی طرح گزار دے گا جس کا لازمی

وَّالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۭ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ۝۲۷ۭ
اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۝۲۸
كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۲۹ وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ۭ

زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے یہ چیزیں فضول[۳۵] ہی پیدا نہیں کر دیں۔ یہ تو ان لوگوں کا گمان ہے جو کافر ہیں اور ایسے کافروں کے لئے دوزخ کی آگ سے ہلاکت ہے۔(۲۷) کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان لوگوں کی طرح کر دیں گے جو زمین میں فساد کرتے پھرتے ہیں؟ یا ہم پرہیز گاروں اور بدکاروں کو یکساں[۳۶] کر دیں؟(۲۸) جو کتاب ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے بڑی برکت والی[۳۷] ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں غور و فکر کریں اور اہل عقل و دانش اس سے سبق حاصل کریں۔(۲۹) اور داؤد کو ہم نے سلیمان عطا کیا[۳۸]۔

نتیجہ اسے عذاب شدید کی صورت میں بھگتنا پڑے گا۔

[۳۵] روزِ جزا پر عقلی دلیل: دنیا کھیل تماشا نہیں: یعنی ہم نے اس کائنات کو محض کھیل کے طور پر پیدا نہیں کر دیا جس کا کوئی مقصد، کوئی غرض اور کوئی حکمت نہ ہو اور کسی کے اچھے یا برے فعل کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو اور اس کائنات میں انسان کو اس لئے نہیں پیدا کیا کہ بے لگام ہو کر جو کچھ جی چاہے کرتا پھرے اور اس سے کوئی باز پرس نہ ہو۔ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے اور جو شخص روز آخرت اور جزا و سزا کا قائل نہیں وہ دراصل اس دنیا کو ایک کھلونا اور اس کے بنانے والے کو کھلنڈرا سمجھتا ہے اس کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا بنا کر اور انسان کو پیدا کر کے نعوذ باللہ ایک عبث فعل کا ارتکاب کیا ہے۔ سو ایسے آخرت کے منکروں کیلئے آگ کا عذاب تیار ہے مرنے کے بعد جب وہ دوزخ میں پڑیں گے اس وقت انہیں معلوم ہوگا کہ ان کے پیدا کرنے کی کیا غرض تھی؟

[۳۶] دوسری دلیل عدل کا تقاضا:۔ یعنی یہ آیت ہر انسان کو اس کے اچھے اور برے اعمال کا بدلہ دیئے جانے کی ضرورت یا آخرت کے قیام پر ایک عقلی دلیل ہے۔ سوال یہ ہے کہ اے روز آخرت سے انکار کرنے والو! کیا تمہارے خیال کے مطابق یہ درست ہے۔ کہ ایک نیک انسان کو اس کی نیکی کا کوئی معاوضہ یا بدلہ نہ ملے، نہ بدکار کو اس کی بدکاری کی سزا ملے؟ اس دنیا میں اگر کوئی شخص ساری زندگی دوسروں کے حقوق غصب کرتا رہے اور ان پر ظلم و زیادتی کرتا رہے پھر مر جائے تو اسے کوئی سزا نہ دی جائے یا ایک انسان خود تکلیف اٹھا کر بھی دوسروں سے بھلائی اور ہمدردی کرتا رہا ہے اور ساری زندگی دکھوں میں گزار کر مر گیا ہے تو اسے اس کے نیک اعمال کا کچھ بدلہ نہ دیا جائے اور انجام کے لحاظ سے دونوں برابر ہو جائیں؟ ظاہر بات ہے کہ اگر آخرت کا قیام اور انسان کے اعمال کا محاسبہ نہ ہو تو اس سے ایک تو اللہ کی حکمت اور عدل کی نفی ہو جاتی ہے دوسرے یہ کائنات کا پورا نظام ایک بے کار اور اندھا نظام بن کر رہ جاتا ہے۔

[۳۷] برکت والی اس لحاظ سے ہے کہ وہ انسان کو اس کے انجام سے پوری طرح خبردار کرتی ہے اور دلائل سے ہر بات سمجھاتی ہے پھر اخروی فلاح کے طریقے بھی بتاتی ہے۔ اور انسانی زندگی کے ہر پہلو میں اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ اور اس کی پیروی میں انسان کا فائدہ ہی فائدہ ہے اور نقصان کا کوئی احتمال نہیں۔ اور اگر صاحب عقل و دانش اس میں کچھ غور و فکر کریں تو صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں اور اس کتاب کی خیر و برکت سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

[۳۸] بات یہاں سے چلی تھی کہ خواہش نفس کی پیروی وہی لوگ کرتے ہیں جو روزِ آخرت کے محاسبہ کا خیال نہیں رکھتے۔

نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ۝۳۰ اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ۝۳۱ فَقَالَ اِنِّىْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ
الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ۝۳۲ رُدُّوْهَا عَلَيَّ ۭ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَ
الْاَعْنَاقِ ۝۳۳ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰي كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ۝۳۴ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ

وہ بہت اچھا بندہ اور (اپنے پروردگار کی طرف) بکثرت رجوع کرنے والا تھا۔(۳۰) جب پچھلے پہر ان کے سامنے عمدہ نسل کے تیز رفتار[۳۹] گھوڑے پیش کئے گئے (۳۱) تو کہا: میں نے اس مال کو اپنے پروردگار کی یاد کی بنا پر پسند کیا ہے۔ حتیٰ کہ وہ رسالہ آپ کے سامنے سے[۴۰] او جھل ہو گیا۔(۳۲) (آپ نے حکم دیا کہ) کہ ان گھوڑوں کو میرے پاس واپس لاؤ تو آپ ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔(۳۳) نیز ہم نے سلیمان کو آزمائش میں ڈالا اور اس کی کرسی پر ایک جسد لاکر ڈال[۴۱] دیا پھر اس نے رجوع کر لیا(۳۴) آپ نے کہا: ''اے میرے پروردگار: مجھے معاف کر دے

پھر روز آخرت پر دو دلائل دینے کے بعد اسی قصہ کی طرف رجوع کیا جا رہا ہے۔ کہ ہم نے داؤد علیہ السلام کو سلیمان علیہ السلام (جیسا بیٹا) عطا فرمایا جو انہی کی طرح نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی۔ اور انہی کی طرح اللہ کے عبادت گزار بھی تھے۔

[۳۹] ۞ صافنات کا لغوی معنی:۔ صافنات، صافن کی جمع ہے اور صَفَنَ (الفرس) بمعنی گھوڑے کا تین ٹانگوں پر اس طرح کھڑا ہونا کہ چوتھے کھر کا صرف سرا زمین پر ٹکا رہے اور اس سے چاک و چوبند گھوڑا مراد لیا جاتا ہے۔ اور جیاد، جَیِّد کی جمع ہے۔ اور جاد الفرس یعنی گھوڑے کا سبک اور تیز رفتار ہونا ہے۔ یہ ان گھوڑوں کی صفات ہیں جو سیدنا سلیمان علیہ السلام نے جہاد کی خاطر رکھے ہوئے تھے۔

[۴۰] ۞ سیدنا سلیمان کے ہاں پیش کئے جانے والے گھوڑے:۔ توارت میں واحد مونث کی ضمیر کس طرف راجع ہے؟ اس میں اختلاف کی وجہ سے اس آیت کی تفسیر میں بھی خاصا اختلاف واقع ہوا ہے۔ ﴿تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ﴾ سے بعض مفسرین نے یہ مراد لی ہے کہ جب گھوڑوں کا رسالہ نظروں سے چھپ گیا۔ اور بعض نے یہ مراد لی ہے کہ جب سورج غروب ہو گیا۔

پہلے معنی کے لحاظ سے تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ ایک دن پچھلے پہر سیدنا سلیمان علیہ السلام اپنے گھوڑوں کا معائنہ کر رہے تھے پھر ان کی دوڑ کرائی تا آنکہ وہ نظروں سے او جھل ہو گئے چونکہ یہ سارا سلسلہ جہاد کی خاطر تھا اس لئے آپ اس شغل سے بہت محظوظ ہوئے اور کہنے لگے کہ میں نے اپنے پروردگار کی یاد کی وجہ سے ہی یہ شغل پسند کیا ہے۔ پھر گھوڑے اپنے پاس طلب کئے اور شفقت سے ان کی گردنوں اور ان کی پنڈلیوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

دوسرے معنی کے لحاظ سے تفسیر یہ ہے کہ آپ علیہ السلام گھوڑوں کے شغل میں اتنے محو ہوئے کہ سورج ڈوب گیا اور اس شغل نے آپ علیہ السلام کو اللہ کی یاد یعنی نماز سے غافل کر دیا۔ اس واقعہ سے آپ علیہ السلام کو بہت دکھ ہوا۔ آپ علیہ السلام نے گھوڑوں کو طلب کیا اور ان کی گردنیں اور پنڈلیاں کاٹنا شروع کر دیں اور چند گھوڑے کاٹ کر ان کا گوشت محتاجوں میں تقسیم کر دیا۔ چونکہ آپ علیہ السلام نے یہ کام اللہ کی محبت کی خاطر کیا تھا اس لئے اللہ نے آپ علیہ السلام کو یہ صلہ دیا کہ ہواؤں کو آپ علیہ السلام کے تابع کر دیا اور آپ علیہ السلام کو گھوڑوں کے رسالے کی اتنی احتیاج ہی نہ رہی جتنی پہلے تھی۔

[۴۱] اس آیت کے تحت بعض مفسرین نے درج ذیل حدیث درج کی ہے:

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ سیدنا سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ میں آج رات اپنی نوے بیویوں کے پاس جاؤں گا اوران سے ہر ایک 'ایک سوار جنے گی جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے گا آپ کے کسی ساتھی نے کہاان شاءاللہ کہو مگر انہوں نے یہ بات نہ کہی توان میں سے کوئی بھی حاملہ نہ ہوئی ماسوائے ایک کے اور وہ بھی ادھورا بچہ جنی۔ اس پروردگار کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے اگر وہ ان شاءاللہ کہہ لیتے تو سب کے ہاں بچے پیدا ہوتے اور سوار ہو کر اللہ کی راہ میں جہاد کرتے" (بخاری۔ کتاب الایمان والنذور۔ باب کیف کانت یمین النبی) لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث کا اس آیت کی تفسیر سے کچھ تعلق نہیں اوراس کی وجوہ درج ذیل ہیں:

۱۔ یہ حدیث بخاری کے علاوہ دوسری کتب حدیث میں موجود ہے لیکن کسی محدث نے اپنی کتاب التفسیر میں اس حدیث کو اس آیت کی تفسیر میں درج نہیں کیا۔

۲۔ امام بخاری نے اس حدیث کو چار مختلف مقامات پر درج کیا ہے جو یہ ہیں (کتاب بدء الخلق۔ کتاب الانبیاء، کتاب الایمان والنذور۔ باب کیف کانت یمین النبی علیہ السلام، اور باب الکفارۃ قبل الحنث اور کتاب التوحید، باب فی المشیئة والارادة) مگر کتاب التفسیر میں درج نہیں کیا۔

۳۔ اگرچہ اس حدیث میں لفظی اختلاف موجود ہے۔ مگر کسی متن میں بھی یہ الفاظ موجود نہیں ہیں کہ یہ ادھورا بچہ دایہ نے یا لوگوں نے سیدنا سلیمان علیہ السلام کے تخت یا کرسی پر ڈال دیا تھا۔ یہ مفسرین کا اپنی طرف سے اضافہ ہے۔ حالانکہ سیدنا سلیمان علیہ السلام کی آزمائش کا تعلق اسی بات سے ہے۔

۞ سیدنا سلیمان کو اللہ نے کس آزمائش میں ڈالا تھا:۔ اس کے علاوہ بھی بعض مفسرین نے کچھ باتیں نقل کی ہیں لیکن وہ بالکل ہی بے سروپا، غیر معقول اور لایعنی ہیں قرآن سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا سلیمان علیہ السلام کی آزمائش کا تعلق ایک بے جان دھڑ سے تھا جو آپ کی کرسی پر ڈال دیا گیا تھا۔ اس پر آپ کو معلوم ہوا کہ آپ تو آزمائش میں پڑ چکے ہیں پھر اسی وقت اللہ کی طرف رجوع ہوئے اپنے قصور کی معافی مانگی اور ساتھ ہی یہ دعا کی مجھے ایسی بادشاہی عطا فرما جو میرے بعد کسی کے شایان نہ ہو۔ چنانچہ آپ علیہ السلام کا یہ قصور بھی معاف کر دیا گیا اور دعا بھی قبول ہوگئی کہ ہواؤں اور جنوں کو آپ کے لئے مسخر کر دیا گیا جیسا کہ آگے مذکور ہے اور درج ذیل حدیث اسی کی وضاحت کرتی ہے:

۞ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھڑنے والا جن:۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "گزشتہ رات ایک دیو ہیکل جن مجھ سے بھڑ پڑا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ یا کوئی ایسا ہی کلمہ کہا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر غالب کر دیا۔ میں نے چاہا کہ مسجد کے ستونوں میں سے کسی ستون کے ساتھ اسے باندھ دوں تاکہ صبح تم اسے دیکھ سکو پھر مجھ کو اپنے بھائی سلیمان علیہ السلام کی دعا یاد آگئی کہ :اے میرے پروردگار! مجھے ایسی حکومت عطا فرما جو میرے بعد اور کسی کے شایان نہ ہو۔ روح راوی نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جن کو ذلت کے بعد بھگا دیا۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر) نیز کتاب الصلوۃ باب الاسیر او الغریم یربط فی المسجد) اور یہ ایسی فضیلت ہے کہ جو آپ کے بعد (یا پہلے) نہ کسی نبی کو حاصل ہوئی اور نہ بادشاہ کو۔ رہی یہ بات کہ اصل آزمائش تھی کیا؟ اور بے جان دھڑ سے کون سے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ اس کی کوئی معقول توجیہ نہ مجھے کہیں سے ملی ہے اور نہ ہی میرے ذہن میں آسکی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۳۵﴾ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّیْحَ تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً
حَیْثُ اَصَابَ ﴿۳۶﴾ وَالشَّیٰطِیْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ﴿۳۷﴾ وَّاٰخَرِیْنَ مُقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ ﴿۳۸﴾ هٰذَا عَطَآؤُنَا
فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۳۹﴾ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰی وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۴۰﴾ ع وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَیُّوْبَ ۘ اِذْ

اور مجھے ایسی حکومت عطا فرما جو میرے بعد کسی کے شایاں نہ ہو، بلاشبہ تو ہی سب کچھ عطا کرنے والا ہے۔(۳۵)

چنانچہ ہم نے ہوا کو ان کے تابع کر دیا۔ جہاں آپ کو پہنچنا ہوتا وہ آپ کے حکم پر نرمی کے ساتھ[۴۲] چلتی تھی۔(۳۶) اور شیطان بھی مسخر کر دیئے تھے جو سب معمار اور غوطہ زن[۴۳] تھے۔(۳۷) اور کچھ دوسرے جو زنجیروں میں جکڑے[۴۴] ہوئے تھے (۳۸) (ہم نے ان سے کہا) یہ ہماری بخشش ہے۔ اب کسی پر احسان کر دیا[۴۵] اپنے پاس رکھو، کوئی حساب نہیں۔(۳۹) بلاشبہ انہیں ہمارے ہاں قرب[۴۶] اور عمدہ مقام ہے۔(۴۰) اور ہمارے بندے ایوب کا ذکر کیجئے۔ جب انہوں نے

[۴۲] اس کی تفسیر کے لئے دیکھئے سورہ انبیاء کی آیت ۸۱ کا حاشیہ نمبر ۶۹

[۴۳] جن آپ علیہ السلام کے حکم کے تحت بلند و بالا عمارتیں تعمیر کرتے تھے۔ دریاؤں میں غوطہ لگا کر ان سے ہیرے جواہرات موتی وغیرہ نکالتے تھے۔ دوسرے کام جو عام انسانوں کی طاقت سے زیادہ ہوتے تھے وہ آپ جنوں سے لیا کرتے تھے۔ مزید تفصیل کے لئے سورہ انبیاء آیت نمبر ۸۲ اور سورہ سبا آیت نمبر ۱۲ کے حواشی۔

[۴۴] اور جو جن آپ علیہ السلام کے حکم سے سرتابی کرتے یا شرارتیں کر کے کام میں رکاوٹ ڈالتے یا دوسروں کو تنگ کرتے تھے، انہیں آپ زنجیروں میں جکڑ کر قید خانہ میں ڈال دیتے تھے۔

[۴۵] ۞ جنوں پر سیدنا سلیمان کی حکمرانی:۔ یعنی جنوں کے معاملہ میں آپ کو مکمل اختیارات حاصل تھے کسی سے کام لیں یا نہ لیں۔ کسی کو معاوضہ دیں یا نہ دیں۔ یہ معاوضہ تھوڑا دیں یا زیادہ دیں۔ یہ سب کچھ آپ کی صوابدید پر منحصر تھا۔ اور اگر اس آیت کو عام سمجھا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے آپ کو بے پناہ مال و دولت عطا کی تھی۔ اور کہہ دیا تھا کہ اسے جیسے چاہو خرچ کرو آپ سے اس کا کچھ مؤاخذہ نہ ہوگا۔ اب ایک طرف اللہ تعالیٰ کے انعامات کا یہ حال ہے کہ بے حساب مال و دولت دے کر فرمایا کہ جیسے چاہو خرچ کرو آپ سے کوئی حساب نہیں لیا جائے گا۔ دوسری طرف سیدنا سلیمان علیہ السلام کا یہ حال تھا کہ اپنی ذاتی ضروریات کے لئے بیت المال سے ایک پیسہ بھی نہیں لیتے تھے بلکہ اپنے والد بزرگوار کی طرح اپنی کمائی سے کھاتے تھے۔ سیدنا داؤد علیہ السلام تو زرہیں بنایا کرتے تھے اور آپ تانبے کی مصنوعات تیار کرتے تھے۔

[۴۶] یعنی ان کی سلطنت اور فرمانروائی ہماری عبادت گزاری کے آڑے نہ آسکی۔ شاہی میں فقیرانہ زندگی بسر کرنا بھی ایک بڑی آزمائش ہے جس میں وہ پورے اترے لہٰذا اللہ نے انہیں مقربین میں شامل کر لیا اور بلند درجات عطا فرمائے۔

نَادٰی رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ؕ﴿۴۱﴾ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّ شَرَابٌ ﴿۴۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰی لِاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۴۳﴾ وَخُذْ بِیَدِكَ

اپنے پروردگار کو پکارا کہ : شیطان [۴۷] نے مجھے سخت تکلیف اور عذاب میں ڈال دیا ہے (۴۱) (تو ہم نے انہیں حکم دیا کہ) اپنا پاؤں (زمین پر) مارو۔ یہ ہے ٹھنڈا پانی نہانے [۴۸] کے لیے اور پینے کے لیے (۴۲) اور ہم نے انہیں ان کے اہل و عیال عطا کئے اور اپنی مہربانی سے ان کے ساتھ اتنے اور بھی دیئے [۴۹] اور یہ اہل عقل و خرد کیلئے ایک نصیحت [۵۰] ہے۔ (۴۳) اور (ہم نے انہیں کہا کہ) اپنے ہاتھ

[۴۷] برے ایمان کی نسبت شیطان کی طرف:۔ ہر مسلمان کے عقیدہ میں یہ بات شامل اور اس کے ایمان بالغیب کا ایک جزء ہے کہ رنج ہو یا راحت، برائی ہو یا بھلائی سب کچھ اللہ کی مشیت کے تحت ہوتا ہے۔ لیکن اس مشیت کا انحصار بھی بعض دفعہ انسان کے اپنے قصور یا شیطانی وساوس سے کسی نہ کسی درجہ میں ضرور ہوتا ہے۔ اور قرآن کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جن امور میں کوئی پہلو شر ' ایذا یا کسی صحیح مقصد کے فوت ہو جانے کا ہو ان کو اللہ کے مقرب بندے ادب کے نقطہ نظر اور تواضع کی خاطر کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کرتے بلکہ اسے اپنے نفس یا شیطان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ جیسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مرض کو اپنی طرف منسوب کیا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یوشع بن نون نے مچھلی کے سمندر میں چلے جانے کی بات کو شیطان کی طرف منسوب کیا، اسی طرح ایوب علیہ السلام نے بھی اپنی بیماری اور تکلیف کو شیطان کی طرف منسوب کیا ہے اور اس کا مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ سیدنا ایوب علیہ السلام طویل بیماری اور تکلیف کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی صحیح طور پر عبادت گزاری سے قاصر رہے تھے تو اس قصور کا باعث شیطانی وساوس کو قرار دیا ہو۔

[۴۸] سیدنا ایوب علیہ السلام کا واقعہ پہلے سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۸۳، ۸۴ کے حواشی میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔ وہ ملاحظہ کر لیے جائیں۔

[۴۹] اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی جو بیویاں اور بچے بیماری کی حالت میں آپ کا ساتھ چھوڑ گئے وہ واپس آ گئے۔ پھر اللہ نے مزید اولاد بھی عطا فرما دی۔ اور یہ بھی سب کچھ اللہ تعالیٰ نے نئے سرے سے عطا فرمایا ہو، اولاد بھی اور مال و دولت بھی اور جس معجزانہ طریقے سے اللہ نے آپ کو مال و دولت عطا فرمایا اس کا اندازہ کچھ درج ذیل حدیث سے بھی ہوتا ہے۔

سیدنا ایوب پر اللہ کے انعامات:۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب ایوب علیہ السلام ننگے نہا رہے تھے تو آپ پر سونے کی ٹڈیوں کی بارش ہوئی جنہیں آپ اپنے کپڑے میں اکٹھا کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں پکارا کہ "اے ایوب علیہ السلام! کیا میں نے تمہیں ان ٹڈیوں سے بے نیاز نہیں کر دیا؟" انہوں نے عرض کیا، ٹھیک ہے لیکن اے پروردگار! میں تیری برکت سے کیسے بے نیاز ہو سکتا ہوں" (بخاری۔ کتاب التوحید۔ باب یریدون ان یبدلوا کلام اللہ) نیز کتاب الغسل۔ باب من اغتسل عریانا)

[۵۰] صبر ایوب:۔ وہ نصیحت یہ ہے کہ ہر ایماندار اور صاحب عقل کو چاہیے کہ وہ خوشحالی کے دور میں اللہ کا شکر ادا کرے اور اگر ابتلا میں پڑ جائے اور اس پر تنگی ترشی کا دور آئے تو سیدنا ایوب علیہ السلام کی طرح صبر کا مظاہرہ کرے۔ اس طرح عین ممکن ہے کہ جس طرح سیدنا ایوب علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے انعامات کی بارش فرمائی تھی۔ اللہ تعالیٰ اسے بھی اپنے ایسے ہی انعامات سے نوازدے۔

ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ؕ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۴۴﴾ وَاذْكُرْ عِبٰدَنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ وَ

میں تنکوں [۵۱] کا ایک مٹھالے، اس سے مارلو اور قسم نہ توڑ۔ ہم نے ایوب کو صابر پایا، بہترین بندے جو ہر وقت (اپنے پروردگار کی طرف) رجوع کرنے والے ہیں۔ (۴۴) اور ہمارے بندوں ابراہیم، اسحاق اور

[۵۱] سیدنا ایوب کا اپنی بیوی کو سزا دینا:۔ آپ کی طویل بیماری (جو صحیح روایات کے مطابق ۱۳ سال پر محیط ہے) کے دوران آپ کی سب بیویاں اور اولاد آپ کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ کیونکہ تنگدستی بھی تھی اور بیماری بھی۔ آپ کی صرف ایک بیوی نے اس طویل عرصہ میں آپ کا ساتھ دیا۔ اس بیوی نے بھی ایک دن کوئی ایسی بات کہہ دی جس سے اللہ کی ناشکری ظاہر ہوتی تھی۔ سیدنا ایوب علیہ السلام کو بیوی کی اس بات پر طیش آگیا اور کہنے لگے کہ جب میں تندرست ہوگیا تو تمہاری اس ناشکری کی بات کی پاداش میں تمہیں سو لکڑیاں ماروں گا۔ اب یہ تو ظاہر بات ہے کہ ہر دکھ درد میں آپ علیہ السلام کی شریک بیوی سے اگر کوئی ایسی بات نکل بھی گئی ہو تو وہ اتنی قصور وار نہ تھی کہ اسے سو لکڑیاں ماری جائیں۔ یہ تو صرف سیدنا ایوب علیہ السلام کی غیرت ایمانی کا تقاضا تھا اور اللہ تعالیٰ تو ہر ایک کو اس کی وسعت کے مطابق ہی تکلیف دیتا ہے۔ چنانچہ سیدنا ایوب علیہ السلام تندرست ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے خود انہیں تدبیر بتائی کہ ایک جھاڑو لو جس میں سو تنکے ہوں۔ اس سے بس ایک ہی معمولی سی ضرب لگاؤ۔ اور اس طرح اپنی قسم پوری کرلو۔ اس طرح سیدنا ایوب علیہ السلام کی قسم بھی پوری ہوگئی اور اس وفادار بیوی پر اللہ کی مہربانی کا تقاضا بھی

پورا ہوگیا۔

شرعی حیلہ کس صورت میں جائز ہے:۔ یہاں ایک بحث یہ چل نکلی ہے کہ آیا شرعاً حیلہ کرنا جائز ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اپنی ذات سے یا کسی دوسرے سے ظلم کو دفع کرنا مقصود ہو تو اس وقت شرعاً حیلہ کرنا جائز ہے اور اس کی دلیل ایک تو یہی آیت ہے۔ دوسرے اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو خود ایسی تدبیر بتائی تھی کہ جس سے ان کا چھوٹا بھائی بنیامین اپنے سوتیلے بھائیوں کے ظلم وستم سے محفوظ رہے اور تیسرے درج ذیل حدیث بھی یہ وضاحت کرتی ہے:

سعید بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سعد بن عبادہ (یعنی سعید راوی کے باپ) ایک ناقص الخلقت بیمار شخص کو پکڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے کہ وہ محلّہ کی لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ زنا کر رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھجور کی ایک بڑی ٹہنی پکڑ کر جس میں سو چھوٹی ٹہنیاں ہوں اور ایک مرتبہ اس کو مارو" (شرح السنہ بحوالہ مشکوۃ۔ کتاب الحدود الفصل الثانی)

اور یہ حیلہ آپ نے اس لئے اختیار کیا کہ وہ سو درے کھانے کی تاب نہ رکھتا تھا۔ اور اس صورت میں اس کا مرجانا یقینی امر تھا۔

رہے ایسے حیلے جن سے کوئی شرعی حکمت یا مقصد فوت ہو رہا ہو تو ایسے حیلے قطعاً ناجائز بلکہ حرام ہیں جیسے زکوۃ کو ساقط کرنے کے لئے یہ حیلہ کرنا کہ سال پورا ہونے سے پہلے مال کا کچھ حصہ کسی دوسرے کو ہبہ کردیا جائے پھر سال گزرنے پر اس سے وہی چیز اپنے حق میں ہبہ کرالی جائے۔ یا کسی عورت کو جبراً اپنے نکاح میں لانے کے لئے عدالت میں جھوٹی شہادتیں بھگتا کر اپنے حق میں فیصلہ لے لیا جائے اور ایسے بہت سے حیلے ہدایہ کی کتاب الحیل میں مذکور ہیں۔ امام بخاری نے ان کا تعاقب بھی کیا ہے کہ ان میں اکثر حیلے ناجائز بلکہ حرام ہیں۔

إِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ أُولِي الْأَيْدِي وَالْأَبْصَارِ ﴿٤٥﴾ إِنَّا أَخْلَصْنٰهُم بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ﴿٤٦﴾ وَإِنَّهُمْ عِندَنَا
لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْأَخْيَارِ ﴿٤٧﴾ وَاذْكُرْ إِسْمٰعِيلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ۖ وَكُلٌّ مِّنَ الْأَخْيَارِ ﴿٤٨﴾ هٰذَا
ذِكْرٌ ۚ وَإِنَّ لِلْمُتَّقِينَ لَحُسْنَ مَآبٍ ﴿٤٩﴾ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْأَبْوَابُ ﴿٥٠﴾ مُتَّكِـِٔينَ فِيهَا

یعقوب کو یاد کیجئے جو بڑی قوتِ عمل رکھنے والے[۵۲] اور صاحبانِ بصیرت تھے۔(۴۵) ہم نے انہیں ایک خاص صفت کی بنا پر برگزیدہ کیا تھا وہ دار آخرت کی یاد[۵۳] تھی۔(۴۶) ہمارے ہاں وہ یقیناً نیک اور برگزیدہ لوگوں میں سے تھے۔(۴۷) اور اسمٰعیل، الیسع[۵۴] اور ذوالکفل کا بھی ذکر کیجئے۔ ان میں سے ہر ایک نیک تھا۔(۴۸) یہ تو ان کا ذکر ہے (جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سب) پرہیزگاروں[۵۵] کے لئے اچھا ٹھکانہ ہے۔(۴۹) (یعنی) ہمیشہ رہنے والے باغ جن کے دروازے[۵۶] ان کے لئے کھلے ہوں گے(۵۰) وہ ان میں تکیہ لگائے ہوں گے اور وہاں بہت سے

[۵۲] یعنی یہ تینوں پیغمبر اپنی پوری قوت سے دین کی سربلندی کے لئے جدوجہد کرتے رہے اور معصیت کے کاموں سے بچتے رہے۔ نیز وہ اللہ تعالیٰ کی ہر سو بکھری ہوئی آیات میں اور اللہ تعالیٰ کے احکام میں غور و فکر کرتے اور بصیرت حاصل کرتے تھے وہ حقیقت شناس تھے۔ اندھوں کی طرح نہیں چلتے تھے۔ بلکہ آنکھیں کھول کر علم و معرفت کی روشنی میں ہدایت کا سیدھا راستہ دیکھتے ہوئے چلتے تھے۔

[۵۳] یعنی آخرت کی یاد رکھنا ہی وہ نسخہ کیمیا ہے جو انسان کو اللہ کا برگزیدہ بنا دیتا ہے۔ ان برگزیدہ ہستیوں نے اس دنیا کو بس ایک مسافر خانہ کی طرح سمجھا اور آخرت کا گھر ہی ہمیشہ ان کا مطمح نظر رہا۔

[۵۴] ۞ الیسع اور ذوالکفل کا ذکر:۔ سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام تو معروف ہیں اور ان کا ذکر قرآن میں بہت جگہ آیا ہے۔ الیسع سیدنا الیاس علیہ السلام کے نائب اور خلیفہ تھے ان کا سلسلۂ نسب چوتھی پشت پر جا کر سیدنا یوسف علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔ بعد میں آپ کو نبوت بھی عطا ہوئی تھی۔ آپ کا حلقہ تبلیغ شام کا علاقہ تھا۔ اور ذوالکفل ان کے خلیفہ کا لقب ہے نام نہیں۔ اور ذوالکفل کا معنی صاحب نصیب ہے۔ آپ کا نام بشیر ہے اور سیدنا ایوب علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ آپ الیسع کے خلیفہ تھے بعد میں نبی ہوئے شام کا علاقہ ہی آپ کی تبلیغ کا مرکز رہا۔ عمالقہ شاہ وقت بنی اسرائیل کا سخت دشمن تھا۔ آپ نے اس سے بنی اسرائیل کو آزاد کرایا پھر وہ بادشاہ بھی مسلمان ہو گیا اور حکومت آپ کے سپرد کی جس کے نتیجہ میں شام کے علاقہ میں پھر ایک دفعہ اسلام خوب پھیلا۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے بہت سے انبیاء کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ سب ہی بہترین لوگ تھے۔ قرآن نے ان انبیاء کا اور بھی بہت سے مقامات پر ذکر فرمایا ہے اور ہر مقام پر قرآن انبیاء کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتا ہے۔ جبکہ بائیبل نے بہت سے اولوالعزم انبیاء پر اتہام لگائے اور ان کی کردار کشی کی ہے۔ جن انبیاء پر بائیبل میں اتہام لگائے گئے ہیں وہ یہ ہیں: سیدنا نوح، سیدنا لوط، سیدنا یعقوب، سیدنا ہارون، سیدنا داؤد، سیدنا سلیمان اور سیدنا عیسیٰ علیہم السلام تفصیل کے لئے دیکھئے سورہ انعام کی آیت نمبر ۸۶ پر حاشیہ نمبر ۸۷۔ الف)

[۵۵] یعنی اللہ کے انعامات صرف نبیوں اور پیغمبروں تک محدود نہیں بلکہ اللہ سے ڈر کر زندگی گزارنے والے کو اچھا ٹھکانا ملے گا۔ اگرچہ ان کے اعمال کے مطابق ان کے درجات میں فرق ہوگا۔

[۵۶] ۞ جنت کے کھلے ہوئے دروازے:۔ یعنی اہل جنت بلا روک ٹوک اپنے اپنے گھروں میں آ جا سکیں گے اور دروازوں

يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّشَرَابٍ ﴿٥١﴾ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ﴿٥٢﴾ هٰذَا مَا
تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿٥٣﴾ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴿٥٤﴾ هٰذَا ؕ وَاِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ﴿٥٥﴾
جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿٥٦﴾ هٰذَا ۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ﴿٥٧﴾ وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ ﴿٥٨﴾
هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ ؕ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ﴿٥٩﴾ قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ ۟ لَا مَرْحَبًۢا بِكُمْ ؕ

لذیذ میوے اور مشروب طلب کریں گے۔(۵۱) نیز ان کے پاس نگاہیں جھکائے رکھنے والی ہم عمر[۵۷] بیویاں بھی ہوں گی۔(۵۲) یہ وہ چیزیں ہیں جن کا روز حساب کیلئے تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔(۵۳) بلاشبہ یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔(۵۴) یہ (تو تھا پرہیزگاروں کا انجام) اور سرکشوں کیلئے بہت برا ٹھکانا ہوگا(۵۵) یعنی دوزخ، جس میں وہ داخل ہوں گے جو بہت بری جگہ ہے۔(۵۶) یہ ہے ان کا انجام اب وہ مزا چکھیں کھولتے ہوئے پانی کا اور پیپ[۵۸] کا(۵۷) اور ایسی ہی کئی قسم کی دوسری چیزوں کا(۵۸) (دیکھو) یہ ایک اور لشکر[۵۹] (تمہارے پیروؤں کا) تمہارے ساتھ گھسا چلا آرہا ہے انہیں کوئی خوش آمدید نہیں یہ بھی دوزخ میں آرہے[۶۰] ہیں(۵۹) (آنے والے پہلوں کو) کہیں گے۔ نہیں بلکہ تمہارے لئے ہی خوش آمدید نہ ہو۔

کے کھلے ہونے یا رہنے کی تین صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ دروازے ہر وقت کھلے رہیں دوسری یہ کہ دروازے بند ہوں مگر جب اہل جنت گزرنا چاہیں تو وہ از خود کھل جائیں۔ اور تیسری یہ کہ جب اہل جنت گزرنا چاہیں تو فرشتے فوراً دروازے کھول دیں۔ سورہ الزمر کی آیت نمبر ۷۳ سے اسی تیسری صورت کی تائید ہوتی ہے۔

[۵۷] ۞ اتراب کا لغوی مفہوم۔ اتراب بمعنی ایسی ہم عمر عورتیں جن کے مزاج میں ہم آہنگی بھی پائی جاتی ہو۔ اس کی پھر دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ عورتیں باہم ہم عمر ہوں، دوسرے یہ کہ وہ اپنے خاوندوں کی ہم عمر ہوں اور یہ دونوں صورتیں ممکن ہیں۔

[۵۸] ۞ غساق کا لغوی مفہوم:۔ غساق کا معنی عموماً پیپ یا بہتی پیپ کر لیا جاتا ہے جس میں خون کی بھی آمیزش ہو جبکہ صاحب منجد، فقہ اللغہ اور منتہی الارب سب نے اس کے معنی انتہائی ٹھنڈا اور بدبودار پانی بتائے ہیں۔ قرآن میں دو مقامات پر غساق کا لفظ حمیم کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے ایک اس مقام پر اور دوسرے سورہ نبا کی آیت نمبر ۲۵ میں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنی شدید ٹھنڈا اور بدبودار پانی ہی کرنا زیادہ مناسب ہے۔

[۵۹] یہاں ازواج کا لفظ ہم مثل چیزوں کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی اسی طرح کی اور بھی کئی گندی اور ناگوار چیزیں انہیں کھانا یا پینا پڑیں گی یا ایسی چیزوں سے انہیں عذاب دیا جائے گا۔

[۶۰] ۞ اہل جہنم کا باہمی مکالمہ اور ایک دوسرے پر الزام:۔ یہ اہل دوزخ کے دوزخ میں داخل ہونے کے وقت کا ایک مکالمہ پیش کیا گیا ہے پہلا گروہ تو بڑے لوگوں اور سرداروں اور پیشواؤں کا ہوگا۔ انہیں فرشتے جہنم کے کنارے لا کھڑا کریں گے۔ پھر ان کے بعد ان کے پیروکاروں کی عظیم جماعت کو لایا جائے گا۔ سردار حضرات اس عظیم جماعت کو دیکھتے ہی کہنے لگیں گے۔ یہ ایک اور جماعت جہنم میں داخل ہونے کے لئے بیتابی سے آگے بڑھتی چلی آرہی ہے۔ ان پر اللہ کی مار اور پھٹکار یہ کہاں

أَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوهُ لَنَا ۖ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٦٠﴾ قَالُوا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هَٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِي النَّارِ ﴿٦١﴾
وَقَالُوا مَا لَنَا لَا نَرَىٰ رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِنَ الْأَشْرَارِ ﴿٦٢﴾ أَتَّخَذْنَاهُمْ سِخْرِيًّا أَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ
الْأَبْصَارُ ﴿٦٣﴾ إِنَّ ذَٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ أَهْلِ النَّارِ ﴿٦٤﴾ قُلْ إِنَّمَا أَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا اللَّهُ ع ۴/۱۴

تم ہی ہمارے لیے اس (عذاب) کے پیش روبنے جو اتنی بری قرار گاہ ہے۔(۶۰) پھر وہ دعا کریں گے: "اے ہمارے پروردگار! ہمارے لئے جو اس عذاب کا پیش رو بنا اسے [۶۱] دوزخ میں دگنا عذاب دے" (۶۱) نیز وہ کہیں گے: "کیا بات ہے کہ ہمیں وہ آدمی نظر نہیں آرہے جنہیں ہم برے لوگوں [۶۲] میں شمار کرتے تھے۔(۶۲) کیا ہم یونہی ان کا مذاق اڑاتے رہے؟ یا اب ہماری نگاہیں ہی ان سے [۶۳] پھر گئی ہیں؟" (۶۳) یہ بات یقیناً سچی ہے کہ دوزخی باہم ایسے ہی جھگڑتے [۶۴] ہوں گے (۶۴) آپ ان سے کہئے کہ: میں تو محض ایک ڈرانے والا ہوں [۶۵]: اللہ کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں۔

سے آگئے؟ جب پچھلی جماعت پہلوں کی یہ بات سنے گی تو وہ کہیں گے کہ اللہ کی مار اور پھٹکار تم پر ہو۔ تمہیں تو ہمارے پیشوا تھے اور یہاں جہنم میں لانے کا سبب بنے ہو۔ اور اب تم ہی ہم پر لعنت اور پھٹکار بھی کہہ رہے ہو۔

[۶۱] پھر یہ پیروی کرنے والا گروہ اپنے پیشواؤں سے توجہ ہٹا کر اپنے پروردگار سے درخواست کرے گا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ہماری گمراہی اور ہمیں یہاں جہنم میں لانے کا باعث بنے تھے۔ لہٰذا اے پروردگار! انہیں ہم سے دگنا عذاب دے" لیکن ان کی یہ التجا محض ایک طفل تسلی اور دل کی حسرت مٹانے کے طور پر ہوگی۔ جس کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

[۶۲] یہاں برے لوگوں سے مراد وہ کمزور مسلمان ہیں جنہیں سرداران قریش حقیر اور کمتر درجہ کے لوگ سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ بیٹھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے اور رسول اللہ ﷺ سے کہتے تھے کہ اگر لوگوں کو اپنے ہاں سے اٹھا دو۔ تو ہم آپ کی بات توجہ سے سنیں گے۔ اور وہ تھے سیدنا بلال حبشی رضی اللہ عنہ، صہیب رومی رضی اللہ عنہ، سلمان فارسی رضی اللہ عنہ خباب بن ارت رضی اللہ عنہ، عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ اور اسی طرح کے دوسرے مخلص مسلمان۔

[۶۳] یعنی چودھری اور سردار قسم کے لوگ آپس میں کہیں گے کہ جن لوگوں کو ہم حقیر اور کمتر درجہ کے لوگ سمجھا کرتے تھے کیا بات ہے وہ ہمیں آج کہیں دکھائی نہیں دے رہے۔ اب اس کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں ایک یہ کہ شاید وہ یہیں کہیں ہوں اور ہماری نظروں سے اوجھل ہوں اور دوسری یہ کہ ممکن ہے کہ ہم غلطی پر ہوں جو انہیں حقیر سمجھ کر ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے، اور وہ حقیقتاً اچھے لوگ ہوں اور وہ اس عذاب سے بچ گئے ہوں۔

[۶۴] اگرچہ روز محشر کی ہولناکیاں اتنی شدید ہوں گی کہ کسی کو دوسرے کی طرف توجہ کرنے کا ہوش تک نہ ہوگا۔ تاہم یہ ایک یقینی بات ہے اور اہل دوزخ ایک دوسرے کے سر الزام دیں گے اور آپس میں جھگڑ رہے ہوں گے یہ دو قسم کے لوگ ہوں گے۔ ایک بڑے لوگ جن میں حکمران، سیاسی لیڈر، چودھری، رئیس جھوٹے پیشوایان دین اور ہر ایسا شخص شامل ہوگا جس کی دنیا میں کسی نہ کسی رنگ میں اللہ کے مقابلہ میں اطاعت کی جاتی رہی اور دوسرا فریق کمزور یا مرید قسم کے لوگ ہوں گے جو اپنے بڑوں کی اطاعت حتیٰ کہ عبادت کرتے رہے۔

[۶۵] یعنی میرا کام صرف تمہیں تمہارے برے انجام سے آگاہ کر دینا اور سمجھا دینا ہے۔ تمہیں زبردستی پکڑ کر راہ راست پر

الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۶۵﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿۶۶﴾ قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ﴿۶۷﴾
اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ﴿۶۸﴾ مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۶۹﴾ اِنْ يُّوْحٰٓى اِلَيَّ
اِلَّآ اَنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۰﴾ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ﴿۷۱﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ
وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۷۲﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۷۳﴾ اِلَّآ اِبْلِيْسَ

وہ یکتا ہے اور سب کو دبا کر رکھنے والا ہے۔(۶۵) وہ آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا پروردگار ہے، غالب ہے[۶۶]، معاف کرنے والا ہے(۶۶) آپ ان سے کہئے کہ: یہ ایک بہت بڑی خبر ہے(۶۷) جس سے تم اعراض[۶۷] کر رہے ہو(۶۸) مجھے تو عالم بالا[۶۸] کے متعلق کچھ علم نہ تھا جب وہ جھگڑ رہے تھے۔(۶۹) مجھے تو صرف اس لیے وحی کر دی جاتی ہے کہ میں کھلا کھلا ڈرانے والا ہوں(۷۰) جبکہ آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں مٹی سے ایک انسان بنانے والا ہوں(۷۱) تو جب میں اسے ٹھیک ٹھاک کر دوں اور اس میں اپنی (پیدا کی ہوئی) روح پھونک دوں تو تم اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا۔(۷۲) چنانچہ سب فرشتوں نے مل کر اسے سجدہ کیا۔(۷۳) سوائے ابلیس کے،

لے آنا میرا کام نہیں۔ اگر میری بات مان لو گے تو اس میں تمہارا فائدہ ہے اور نہ مانو گے تو اپنا انجام خود دیکھ لو گے اور یاد رکھو کہ حقیقی الٰہ صرف اللہ اکیلا ہے جو تمہیں سزا دینے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔

[۶۶] اس سے پہلی آیت میں اپنی صفت قہاری کا ذکر فرمایا۔ جبکہ مخاطب کافر تھے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز کو دبا کر رکھنے والا ہے۔ کافر اس کی گرفت سے کسی وقت بھی بچ نہیں سکتے۔ اور اس آیت میں اپنی صفت غفاری کا ذکر فرمایا یعنی جو بندے ایمان لے آئیں اور اس کے بندے بن کر رہیں ان کے گناہوں کو معاف کر دینے والا ہے۔

[۶۷] یعنی قیامت کی خبر کوئی معمولی خبر نہیں جس کا تم مذاق اڑاتے اور بار بار پوچھتے رہتے ہو کہ کب آئے گی، آ کیوں نہیں جاتی؟ ہمارا حساب کتاب ابھی ہمیں کیوں نہیں دے دیا جاتا؟ اگر تم اس کی حقیقت کو سمجھ لو۔ اور اس دن کے ہولناک مناظر کو اپنے سامنے لاؤ تو یہ اتنی بڑی چیز ہے کہ تمہارے طرز زندگی کا رخ موڑ سکتی ہے۔

[۶۸] ۞ عالم بالا میں فرشتوں کی بحثیں:۔ عالم بالا سے مراد فرشتوں کا مستقر ہے۔ ان میں بھی کبھی کبھار کوئی بحث چھڑ جاتی ہے۔ انہیں میں سے ایک بحث وہ ہے جو سیدنا آدم علیہ السلام کی پیدائش کے وقت ہوئی تھی اور جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ خطاب ہے۔ کہ آپ ان کافروں سے کہہ دیجئے کہ عالم بالا میں جو کچھ بحثیں وغیرہ ہوتی ہیں۔ مجھے ان کا قطعاً کچھ علم نہیں ہوتا صرف اسی بات کا علم ہوتا ہے۔ جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے اور میں چونکہ لوگوں کو ان کے انجام سے خبردار کرنے والا ہوں لہٰذا مجھے صرف انہی بحثوں کے متعلق وحی کی جاتی ہے جن کا تعلق انسانوں کی ہدایت سے ہوتا ہے۔

اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٧٤﴾ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ۭ اَسْتَكْبَرْتَ

اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ﴿٧٥﴾ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۭ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿٧٦﴾ قَالَ

فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿٧٧﴾ وَّاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿٧٨﴾ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ

جو اکڑ بیٹھا اور کافروں سے [۶۹] ہو گیا۔(۷۴) اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا: اے ابلیس! جس انسان کو میں نے اپنے ہاتھوں [۷۰] سے بنایا اسے سجدہ کرنے سے تجھے کس بات نے روک دیا؟ کیا تو بڑا بننا چاہتا ہے یا تو ہے ہی اونچا درجہ رکھنے والوں [۷۱] میں سے؟(۷۵) کہنے لگا: "میں اس سے بہتر ہوں (کیونکہ) مجھے تو تو نے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے"(۷۶) اللہ تعالیٰ نے فرمایا": نکل جا یہاں سے یقیناً تو مردود ہے"(۷۷) اور روز قیامت تک تجھ پر میری لعنت [۷۲] رہے گی"(۷۸) وہ کہنے لگا: "میرے پروردگار! پھر مجھے اس وقت تک مہلت دے دے

[۶۹] فرشتوں کو سیدنا آدمؑ کو سجدہ کا حکم:۔ اللہ تعالیٰ کے آدمؑ کو مٹی سے بنانے، اس میں اپنی روح پھونکنے، فرشتوں کو آدمؑ کو سجدہ کا حکم دینے ابلیس کی حقیقت اور اس کے آدمؑ کو سجدہ سے انکار کرنے کی تفصیل پہلے کئی مقامات پر گزر چکی ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ کا چوتھا رکوع، سورہ حجر کی آیات ۲۵ تا ۴۳، سورہ اعراف آیات ۱۱ تا ۱۵، سورہ بنی اسرائیل آیات ۶۱ تا ۶۵، سورہ کہف آیت نمبر ۵۰، سورہ طٰہٰ آیات نمبر ۱۱۶ تا ۱۲۳ میں گزر چکی ہے۔ اور نظریہ ارتقاء کی تردید کے لئے سورہ حجر کا حاشیہ نمبر ۱۹ ملاحظہ فرمائیے۔

[۷۰] ❁ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پاؤں: اللہ تعالیٰ نے بڑی صراحت سے فرمایا کہ آدم کے پتلے کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔ اس سے کائنات کی تمام اشیاء پر آدم علیہ السلام اور بنی آدم کا شرف اور فضیلت ثابت ہوئی۔ دوسرے اس سے ڈارون کے نظریہ ارتقاء کا رد ہوا۔ تیسرے ان لوگوں کا جو اللہ کے ہاتھ، آنکھیں اور پاؤں وغیرہ ہونے کے یکسر منکر ہیں۔ ان کی بنائے استدلال یہ ہے کہ اللہ کی ذات ہر جگہ موجود ہے تو اس کے ہاتھ پاؤں کیسے ہو سکتے ہیں لامحالہ ایسی آیات اور ایسے الفاظ کی تاویل کرنا ضروری ہے۔ جس کا جواب یہ ہے کہ اللہ اپنی صفات علم اور قدرت وغیرہ کے لحاظ سے ہر جگہ موجود ہے لیکن اس کی ذات عرش پر ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ خود اپنے ہاتھ، پاؤں اور آنکھوں کا صراحت سے ذکر کرتا ہے تو دوسرا کون اس سے بڑھ کر اس کی تنزیہہ کر سکتا ہے۔ خواہ اس نے اپنے ہاتھ، پاؤں وغیرہ کا ذکر ہمارے سمجھانے کے لئے کیا ہو تاہم کیا تو ہے۔ رہی یہ بات کہ اس کے ہاتھ، آنکھیں اور پاؤں کیسے ہیں۔ تو یہ بات ہم سمجھنے کے نہ مکلف ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں ہماری عافیت بس اسی میں ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ فرمائے اسے جوں کا توں تسلیم کر لیں۔

[۷۱] کیا تو اب بڑا بننا چاہتا ہے یا پہلے سے ہی یہ سمجھتا ہے کہ میں دوسروں سے کوئی برتر مخلوق ہوں۔

[۷۲] یعنی قیامت تک تو اللہ، اس کے فرشتے، تمام انسان حتیٰ کہ ابلیس کی پیروی کرنے والے بھی اس پر لعنت پھٹکار کرتے رہیں گے پھر اس کے بعد ابدالآباد ابلیس اور اس کی آل اولاد کو عذاب میں مبتلا رکھا جائے گا۔

إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿۷۹﴾ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ﴿۸۰﴾ إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ﴿۸۱﴾
قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۸۲﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴿۸۳﴾ قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ
أَقُولُ ﴿۸۴﴾ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكَ وَمِمَّن تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۸۵﴾ قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ
وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ ﴿۸۶﴾ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ ﴿۸۷﴾ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ ﴿۸۸﴾ ع

جب لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے" (۷۹) فرمایا: "اچھا! تمہیں مہلت دی جاتی ہے۔ (۸۰) اس دن تک جس کا وقت (مجھے) معلوم [۷۳] ہے۔ (۸۱) وہ کہنے لگا: "تیری عزت کی قسم! میں سب (انسانوں) کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ (۸۲) بجز تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے خالص کر لیا [۷۴] ہے۔ (۸۳) فرمایا: "حق بات یہ ہے اور میں حق ہی کہا کرتا ہوں (۸۴) کہ میں جہنم کو تجھ [۷۵] سے اور ان سب لوگوں سے بھر دوں گا جو تیری پیروی کریں گے (۸۵) آپ ان سے کہہ دیجئے کہ: میں اس تبلیغ پر تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا۔ نہ ہی میں تکلف کر (کے نبی بن) رہا [۷۶] ہوں (۸۶) یہ قرآن تو جملہ اہل عالم کے لئے نصیحت ہے۔ (۸۷) کچھ مدت بعد تمہیں (خود ہی) اس خبر (کی صداقت) معلوم [۷۷] ہو جائے گی۔ (۸۸)

[۷۳] ابلیس اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اس پورے مکالمہ کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے حوالہ کیلئے دیکھئے اسی سورہ کی آیت نمبر ۷۸ کا حاشیہ۔

[۷۴] یہ مطلب نہیں کہ ابلیس اللہ کے مخلص بندوں کو بہکانے کی کوشش ہی نہیں کرے گا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے دام فریب میں نہ آ سکیں گے۔

[۷۵] "تجھ سے" مراد ابلیس، اس کی اولاد اور اس کا پورا لاؤ لشکر ہے جو بنی آدم کو مختلف طرح کی گمراہیوں میں مبتلا کرنے میں مصروف ہے۔ انہیں صرف اپنے گناہوں کا ہی عذاب نہیں دیا جائے گا بلکہ بنی آدم سے جن لوگوں نے ان کی پیروی کی اور گناہ کرتے رہے ان کے گناہوں کا حصہ رسدی بھی انہیں بھگتنا ہو گا۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کو مخاطب کرتے ہوئے یہ قصہ آدم و ابلیس اس لئے سنایا کہ وہ سوچ لیں کہ اللہ کی نافرمانی کرنے پر ابلیس کا کیا حشر ہوا اور اب جو وہ اللہ کے رسول کی نافرمانی کر رہے ہیں، تو وہ بھی اپنے لئے ایسے ہی انجام کی امید رکھیں۔

[۷۶] یعنی میں بالکل بے لوث ہو کر تمہیں اللہ کا پیغام پہنچا رہا ہوں۔ اس کا نہ تم سے کوئی صلہ مانگتا ہوں اور نہ ہی میری کوئی ذاتی غرض اس سے وابستہ ہے اور نہ میں ان لوگوں میں سے ہوں کہ اپنی بڑائی قائم کرنے کے لئے جھوٹے دعوے لے کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور اس بات پر شہادت میری سابقہ تمام زندگی ہے جسے تم خوب جانتے ہو۔

لاعلمی کا اعتراف کر لینا بھی عالم ہونے کی دلیل ہے:۔ لفظ متکلفین کے معنی درج ذیل حدیث سے بھی واضح ہوتے ہیں: مسروق کہتے ہیں کہ ہم عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ہاں گئے۔ انہوں نے کہا: لوگو! جو شخص کوئی بات جانتا ہو تو اسے بیان کرے اور اگر نہ جانتا ہو تو کہہ دے کہ "اللہ ہی بہتر جانتا ہے" کیونکہ ایسا کہنا بھی کمال علم کی دلیل ہے۔ اللہ عزوجل نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: کہ میں اس (تبلیغ) پر تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگتا اور نہ ہی میں دل سے باتیں بنانے والوں سے ہوں" (بخاری۔ کتاب التفسیر)

[۷۷] یعنی قرآن کریم جس بات کی خبر دے رہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسلام سربلند ہو کے رہے گا اور اس کی دعوت کے مخالفوں کو مغلوب اور ذلیل و خوار ہونا پڑے گا۔ کافروں میں سے جو لوگ زندہ رہے وہ تو اپنی آنکھوں سے یہ انجام دیکھ لیں گے اور جو مر گئے ان کو موت کے دروازے سے گزرتے ہی اس حقیقت کا پتہ چل جائے گا کہ قرآن نے جو خبر دی تھی وہ ٹھوس حقیقت پر مبنی تھی۔

الحمدللہ تیسری جلد تمام ہوئی۔

سرٹیفکیٹ

میں نے اس تفسیر کے متن، ترجمہ، حاشیہ کو اپنی مقدور بھر کوشش کے مطابق حرفاً حرفاً پڑھا ہے اور میں تصدیق کرتا ہوں کہ اس میں اب کوئی غلطی نہیں ہے۔ ان شاء اللہ

پروفیسر نجیب الرحمٰن کیلانی
خریج جامعہ الملک سعود۔ الریاض

قارئین سے گزارش!

قارئین سے بصد ادب گزارش ہے کہ ہم نے اس ترجمہ اور تفسیر کو غلطیوں سے مبرا تیار کر کے آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود اگر کسی بشری لغزش کی بنا پر آپ اس میں کسی جگہ کوئی کوتاہی یا غلطی محسوس کریں تو اولین فرصت میں ہمیں اس کی اطلاع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح کی جا سکے۔ اگر آپ کو کسی طباعتی کوتاہی کی بنا پر غلط نسخہ ملا ہو تو بھی ہم سے رابطہ کر کے اس کو تبدیل کروا سکتے ہیں۔

ہم علمائے کرام سے بھی اس سلسلے میں علمی تعاون اور کسی تسامح کی نشاندہی کی گزارش کرتے ہیں۔

ناشر: مکتبۃ السلام

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمہ اللہ کی تصنیفات کا مختصر تعارف

1 تیسیر القرآن (جلد اول): سورۃ الفاتحہ تا الانعام۔ زیور طبع سے آراستہ ہو کر خاص و عام سے قبولیت کی سند حاصل کر چکی ہے۔ 500 روپے

تیسیر القرآن (جلد دوم): سورۃ الاعراف تا سورۃ الکہف (مطبوع) 500 روپے

تیسیر القرآن (جلد سوم) سورۃ مریم تا سورۃ ص۔ (مطبوع) 500 روپے

تیسیر القرآن (جلد چہارم): سورۃ الزمر تا سورۃ الناس۔ (مطبوع) 500 روپے

2 مترادفات القرآن: قرآن کریم کی ذیلی فرق کو مستند کتب لغت اور قرآنی آیات سے واضح کیا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ پورے عالم اسلام میں اس موضوع پر اپنی نوعیت کی منفرد تحقیق ہے۔ 450 روپے

3 رسول اکرم ﷺ بحیثیت سپہ سالار: اس کتاب میں سیرت نبوی ﷺ کی زندگی کا جہادی پہلو بیان کیا گیا ہے۔ جہاد اور اس کی اہمیت ایک عظیم جرنیل کے ذاتی اوصاف، اسلام اور بین الاقوامی قوانین جنگ کا تقابل پیش کیا گیا۔ 150 روپے

4 محمد رسول اللہ ﷺ صبر و ثبات کے پیکر اعظم: اس کتاب میں سیرت نبوی ﷺ کا دعوتی پہلو بیان کیا گیا ہے۔ آپ کی مخالفت کے اسباب آپ ﷺ پر مختلف اوقات میں قاتلانہ حملوں اور سازشوں کا احوال، خوبصورت و دیدہ زیب ٹائٹل۔ 120 روپے

5 آئینہ پرویزیت: فتنہ انکار حدیث اور عقائد باطلہ کا تفصیلی رد، خصوصاً پرویزیت کے جواب میں ادارہ طلوع اسلام کی تصنیفات کی روشنی میں ایک مدلل اور لاجواب کتاب ہے۔ نئی کمپوزنگ جاذب نظر ٹائٹل و طباعت۔ 400 روپے

6 شریعت و طریقت: تصوف کی تاریخ پر بحث کی گئی ہے۔ نیز وحدت الوجود، وحدت الشہود اور حلول کیا ہے۔ طریقت کا باطنی نظام کیا چیز ہے؟ کیا طریقت شریعت کے تابع ہے؟ یا اس کے متوازی یا اس سے متصادم ایک الگ دین ہے؟ 250 روپے

7 خلافت و جمہوریت: جمہوریت عصر حاضر کا سب سے بڑا بت ہے۔ کتاب و سنت سے ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام اور جمہوریت دو متضاد چیزیں ہیں۔ جن میں اتحاد ناممکن ہے۔ خوبصورت چار رنگا ٹائٹل، اعلیٰ طباعت۔ 180 روپے

8 الشمس والقمر بحسبان: اس کتاب میں علم ہیئت، ہجری اور عیسوی تقویم میں دن میں معلوم کرنے کے طریقے اور 622ء (1ھ) سے لے کر 2522ء (1680ھ) تک کی تقابلی تقویم پیش کی گئی ہے۔ 160 روپے

9 تجارت کے احکام و مسائل: لین دین کے معاملات میں کئی ایسے امور شامل ہو گئے ہیں جو شرعاً ناجائز ہیں۔ اکل حلال کی اہمیت واضح کرنے کے بعد دور حاضر کے جدید معاشی مسائل پر کتاب و سنت کی روشنی میں محاکمہ کیا گیا ہے۔ 200 روپے

10 عقل پرستی اور انکار معجزات: قرآن مجید میں مذکور معجزات کا عقل کی بنیاد پر رد کرنے والوں کی تاویلات اور ان کے عقائد پر بحث کی گئی ہے۔ عقل پرست فرقوں یعنی جہمیہ اور معتزلین کا رد۔ 250 روپے

11 روح، عذاب قبر اور سماع موتی: متعلقہ موضوع پر نہایت اہل اور معلوماتی کتاب ہے مختلف مکاتب کے افکار و نظریات کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔ زندگی اور موت کے چاروں مراحل کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ 65 روپے

12 احکام ستر و حجاب: اس کتاب میں تہذیب حاضر کا پس منظر، ستر و حجاب کا فرق، چہرہ اور ہاتھوں کا پردہ اور مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات پر بحث کی گئی ہے۔ 50 روپے

13 اسلام میں مصارف دولت: اس میں زائد از ضرورت دولت کی جائز اور ناجائز صورتیں، نیز اسلام میں جاگیرداری کی کہاں تک گنجائش ہے اور مزارعت کن صورتوں میں جائز ہے؟ (نئی کمپوزنگ و خوبصورت ٹائٹل) 50 روپے

14 قرآن نافہمی کے اسباب اور اس کا حل: ایک مختصر کتابچہ جس میں قرآن نافہمی کے اسباب تفصیلاً بیان کیے گئے ہیں۔ 1000 روپے فی سینکڑہ

تیسیر القرآن

قرآنی علوم ومعارف کی خدمت کا اولین اعزاز عربی زبان کے مفسرین کرام کو حاصل ہے۔ عربی زبان کے بعد یہ سعادت اردو زبان کے حصے میں آئی۔ تراجم وتفاسیر کا جو عظیم الشان ذخیرہ بیسویں صدی میں اردو زبان میں پیش کیا گیا وہ اپنی علمیت' افادیت اور وسعت کے اعتبار سے گذشتہ تمام صدیوں پر بھاری ہے۔ ہر چند اس عہد کی بعض اردو تفاسیر میں تفسیر ماثور کے منہج اور اسلوب سے انحراف بھی دکھائی دیتا ہے جس کے باعث ذہن میں انتشار اور قلب میں اضطراب رہتا ہے۔

فضیلۃ الشیخ مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید سے ایک خصوصی شغف عطا کیا تھا۔ آپ بیک وقت کاتب قرآن' مترجم قرآن' محشی قرآن اور مفسر قرآن کے منصب جلیل پر فائز دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی مبارک زندگی میں پچاس سے زائد قرآن مجید کے نسخوں کی کتابت کا شرف حاصل کیا۔ نیز اہم ترین علمی' دینی' تاریخی' معاشی' معاشرتی اور سیاسی موضوعات پر لکھتے رہے مگر حق تعالیٰ نے ان کی زندگی کے انتہائی آخری حصے میں ان سے جو کام لیا وہ تفسیر قرآن کی تکمیل ہے جو ''تیسیر القرآن'' کے عنوان سے شائع ہو رہی ہے۔

مولانا کیلانی کی یہ تفسیر بیسویں صدی عیسوی کے اختتام پر اردو زبان میں سلفی منہج اور تفسیر ماثورہ کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ آیات قرآنی کی تشریح وتفسیر میں قرآن مجید کی آیات کے علاوہ صحیح احادیث سے مدد لی گئی ہے۔ عصر حاضر میں جو مسلکی تعصب نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ یہ تفسیر اس شدت اور افراط وتفریط میں ایک راہ اعتدال کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ طالبان حق کے لیے قرآن مجید کی یہ تفسیر ایک محکم استدلال اور موزوں اسلوب کی حامل ہے۔ اس کے ترجمہ میں معانی کو مجروح کئے بغیر سلاست دکھائی دیتی ہے۔ تفسیر میں ایک عام فہم اسلوب کے باعث یہ کوشش علمائے کرام' خطیب حضرات اور عامۃ الناس کے لیے یکساں افادیت کی حامل ہے۔ اللہ تعالیٰ مفسر مرحوم کی اس کاوش کو مقبول اور مسلمانوں کے علم وعمل کے لیے نافع بنائے۔ (آمین)

پروفیسر عبدالجبار شاکر
ڈائریکٹر بیت الحکمت لاہور

12 ستمبر 2000ء